رجسٹر نمبر (M 8950
ٹیلیفون نمبر ۲۲۰۹
نشان ٹپہ آصفیہ (۱۵۳)

ریڈیو نمبر

یعنی

ادارہ ادبیات اردو کے ماہنامہ

سب رس

کا

سالگرہ نمبر بابتہ جنوری ۱۹۴۱ء

زیر نگرانی

ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور

مجلس ادارت

صاحبزادہ میر محمد علی خان میکش
خواجہ حمید الدین شاہد

سکینہ بیگم
عبدالحفیظ صدیقی (بی ایس سی)

خواجہ حمید الدین شاہد کے اہتمام سے اعظم اسٹیم پریس میں چھپکر دفتر ادارہ رفعت منزل خیرت آباد سے شائع ہوا۔

سب رس کے مقاصد و قواعد

(۱) یہ ادارۂ ادبیات اردو کا ماہوار علمی و ادبی رسالہ ہے جس میں اردو زبان اور ادب کے مختلف شعبوں اور پہلوؤں پر بحث ہوگی۔

(۲) مضامین متعلقہ سیاسیات حاضرہ اور مذہبی مباحث کسی صورت میں قابلِ اشاعت متصور نہ ہوں گے۔

(۳) اردو مطبوعات پر بے لاگ تنقید کرکے اردو تصنیف و تالیف کا ذوق صحیح پیدا کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

(۴) غیر زبانوں کے شاہکار مضامین کو اردو میں منتقل کرکے اردو کے علمی و ادبی سرمایہ میں اضافہ کیا جائے گا۔

(۵) یہ رسالہ کم از کم (۶۴) صفحات اور زیادہ سے زیادہ (۹۶) صفحات پر ہر ماہ عیسوی کے پہلے ہفتہ میں شائع ہوا کرے گا۔

(۶) رسالہ نہ پہنچنے کی اطلاع پندرہ تاریخ تک دفتر میں پہنچ جانی چاہیے۔

(۷) جواب طلب امور کے لئے جوابی پوسٹ کارڈ یا لفافہ آنا ضروری ہے۔

(۸) خط و کتابت کرتے وقت نمبر خریداری کا حوالہ ضرور دیا جائے۔

(۹) اشتہارات کی اجرت پیشگی لی جائے گی۔ دوچرپا وی پی کے ذریعے سے وصولی منظور نہیں کی جائے گی۔

سب رس کی قیمت

سالانہ	شش ماہی	فی پرچہ
چار روپے آٹھ آنے	دو روپے بارہ آنے	سات آنے

بچوں کے سب رس کی قیمت

سالانہ	شش ماہی	فی پرچہ
ایک روپیہ آٹھ آنے	بارہ آنے	دو آنے

جلد (۴) شمارہ (۱) | سب رس | جنوری ۱۹۴۱ء
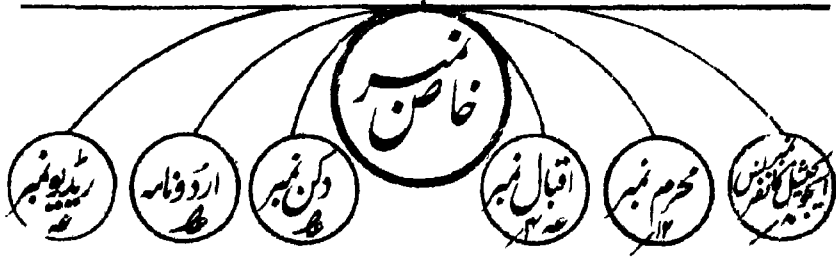
فہرست تصاویر

(۱) مولوی محبوب علی سابق ناظم لاسلکی
(۲) " میر حسن ایم اے (شعبۂ تقاریر نشرگاہ حیدرآباد)
(۳) " محمد عبدالرؤف (عثمانیہ) (شعبۂ موسیقی نشرگاہ حیدرآباد)
(۴) " ممتاز علی (شعبۂ اطفال نشرگاہ حیدرآباد)
(۵) لاہور ریڈیو اسٹیشن کے ایک اناؤنسر مسٹر عبدالحمید
(۶) لاہور ریڈیو اسٹیشن کا اسٹوڈیو نمبر (۵)
(۷) لاہور ریڈیو اسٹیشن کا اسٹوڈیو نمبر (۱)
(۸) لاہور ریڈیو اسٹیشن سے رنگا رنگ پروگرام نشر ہو رہا ہے۔

فہرست مضامین

	مضمون	مضمون نگار	صفحہ
۱	اداریہ	میکش	۵
۲	نشرگاہ حیدرآباد	شاہد	۷

آواز کی دنیا

	مضمون	مضمون نگار	صفحہ
۳	آواز کی دنیا	محمد فضل الرحمن بی اے ڈپٹی کنٹرولر محکمہ نشریات لاسلکی سرکار عالی	۹
۴	ایتھر	ڈاکٹر حاجی غلام محمد ایم اے (عثمانیہ) ڈی ایس سی (الٰہ آباد)	۱۳
۵	ریڈیو اور نشریات	میر حسن ایم اے (عثمانیہ)	۱۷
۶	ریڈیو اور پروپگنڈا	بیابانی	۲۵
۷	اردو نشری خبریں	مرزا رزاق بیگ بی اے (عثمانیہ)	۲۸
۸	ریڈیو اور دیہات سدھار	محمد عبدالقوی بی اے اڈیٹر گاؤں سدھار	۳۰
۹	ریڈیو کی آواز کا پیام (نظم)	ماہر القادری	۳۳
۱۰	ریڈیو اور موسیقی	محمد عبدالرؤف (عثمانیہ)	۳۴
۱۱	ریڈیو اور اردو زبان	رفعت النساء شوق	۳۶
۱۲	ریڈیو اور سننے والے	"ایک سننے والا"	۳۸
۱۳	ریڈیو اور شعر	صاحبزادہ محمد علی خاں میکش	۴۲
۱۴	ریڈیو کی زبان	ماہر القادری	۴۷

زبان اور ادب

	مضمون	مضمون نگار	صفحہ
۱۵	جدید ادب	اشفاق حسین ایم اے (ریسرچ اسکالر)	۴۹
۱۶	ادبیات کا مستقبل	محمد عبدالحفیظ صدیقی (بی ایس سی)	۵۳
۱۷	دہلی میں اردو شاعری کی ابتدا	سید محمد ایم اے (لکچرار سٹی کالج)	۵۶
۱۸	اردو شاعری کا تاریک پہلو	نیاز فتح پوری ایڈیٹر رسالہ نگار	۶۰
۱۹	نظم اور غزل پر کچھ خیالات	علی اختر	۶۶
۲۰	شعر و شاعری	شوکت علی خاں فانی بی اے ایل ایل بی	۷۰
۲۱	حیدرآباد کے پرانے اردو رسالے	نواب مرزا سیف علی خاں	۷۲
۲۲	جدید عربی (مصر میں)	ڈاکٹر راحت اللہ خاں ایم اے پی ایچ ڈی (لندن)	۷۷
۲۳	فارسی زبان اور ہندوستان	قاری سید کلیم اللہ حسینی ایم اے پی ایچ ڈی (لندن)	۸۱
۲۴	سنسکرت شاعری اور اسکی بلاغت	پنڈت ہری ہر شاستری صدر شعبۂ سنسکرت جامعہ عثمانیہ	۸۳
۲۵	انگریزی زبان	پروفیسر فضل حق ایم اے	۸۷

علوم عمرانی

	مضمون	مضمون نگار	صفحہ
۲۶	تاریخ پڑھیے	عبدالمجید صدیقی ایم اے ایل ایل بی استاذ تاریخ جامعہ عثمانیہ	۸۹
۲۷	فرانسیسی جمہوریت کا زوال	نواب علی یاور جنگ بہادر معتمد [illegible] سرکار [illegible]	[illegible]

۲۸ معاشیات — حبیب الرحمٰن بی ایس سی آنرز (لندن) ناظم معلومات عامہ سرکار عالی — ۹۰
۲۹ سود — ناصر علی ایم اے لکچرار جامعہ عثمانیہ — ۱۰۲
۳۰ بین الاقوامی سیاسیات — ہارون خاں شروانی ایم اے (آکسن) بیرسٹرایٹ لا صدر شعبۂ تاریخ جامعۂ عثمانیہ — ۱۰۶
۳۱ نئی اور پرانی طب — ڈاکٹر حیدر علی خاں ایف آر سی ایس ناظم سررشتۂ طبابت و صحت عامہ سرکار عالی — ۱۱۰

پیشے

۳۲ پیشے کا انتخاب — حبیب احمد فاروقی — ۱۱۲
۳۳ پیشۂ ملازمت — نواب اکبر یار جنگ بہادر — ۱۱۷
۳۴ پیشۂ معلمی — سجاد مرزا ایم اے (کنٹب) — ۱۲۰
۳۵ گداگری — ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم ایم اے پی ایچ ڈی — ۱۲۳
۳۶ طب کا علم اور پیشہ — ڈاکٹر لطیف سعید — ۱۲۷

ادبِ لطیف

۳۷ دوست بیوی کی نظر میں — ناکارہ حیدرآبادی — ۱۳۲
۳۸ بولتی مزار — بدر شکیب بی اے ایل ایل بی — ۱۳۶

مشاعرے

(پہلا مشاعرہ)

۳۹ نغمۂ شاعر — علی اختر — ۱۳۹
۴۰ پھر آگئے ہیں بہار کے دن — وہاج الدین احمد شمیم — ۱۴۰
۴۱ متاعِ جوانی — بیکس — ۱۴۰
۴۲ غزل — نظر حیدرآبادی — ۱۴۱
۴۳ حسیات — امیر احمد خسرو — ۱۴۱

(دوسرا مشاعرہ)

۴۴ رباعیات — فانی بدایونی بی اے ایل ایل بی — ۱۴۲
۴۵ اے خوشا وہ دن — مخدوم محی الدین ایم اے — ۱۴۳
۴۶ پیامِ عید — علی اختر — ۱۴۴
۴۷ ساقی نامۂ عید — ماہر القادری — ۱۴۵
۴۸ بہارِ عید — امیر احمد خسرو — ۱۴۵

حیوانیات

۴۹ انسان کا اصلی پیٹ کا کیچوا — ڈاکٹر محمد بابر مرزا صدر شعبۂ حیوانیات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ — ۱۴۶
۵۰ مکھی — مہدی علی ایم ایس سی — ۱۴۸

تعلیم اور نئی نسل

۵۱ اندھوں کی تعلیم — شہریار کاؤس جی بی اے (عثمانیہ) — ۱۵۳
۵۲ ہندوستانی بچہ — جیونت راؤ — ۱۵۶
۵۳ بچوں کے جھوٹ — ملک سردار علی لکچرار (عثمانیہ ٹریننگ کالج) — ۱۵۸

(اطلاع)

جن اصحاب کا چندہ ختم ہوگیا ہے براہ کرم وہ بذریعہ منی آرڈر روانہ کردیں۔ ایک ہفتہ انتظار کے بعد وی پی روانہ خدمت کیا جائے گا۔

اداریہ

زندگی کی آواز ہی آواز ہے ——

آواز ہمیشہ زندگی کا سہارا رہی ہے۔ گونگوں کے اشارے بھی بعض وقت بے معنی آوازوں کی مدد ہی سے مفہوم ادا کرتے ہیں۔ اس طرح اگر دنیا سے آواز چھین لی جائے تو وہ ایک ایسا ڈراؤنا قبرستان بن جائے گی جہاں لاشیں حرکت کر رہی ہوں۔ سانس بھی ایک آواز ہے۔ دل کی دھڑکن بھی ایک آواز سانس کی آمد و شد اور دل کی دھڑکن کے بغیر زندگی کا کوئی تصور باقی نہیں رہتا۔ زندگی کے تیقنات میں آواز سب سے آگے ہے۔ اور اس کی دوڑ کو کسی طرح نہیں روکا جا سکتا —— کیونکہ حرکت آواز پیدا کرتی ہے۔

آواز کی پہونچ ——

آواز کی پہونچ' انسان اور اس کی نگاہ کی پہونچ سے بھی بہت آگے ہے۔ ٹیلیفون' ٹیلیگراف اور لاسلکی نے آواز کو غیر محدود کر دیا ہے۔ اور دنیا اب دیکھنے سے زیادہ سن رہی ہے۔ "شنیدہ کے بود مانند دیدہ" کے خلاف سب سے پہلی آواز آواز کی یہ غیر محدود وسعت ہے جس نے ساری دنیا کو ایک صوتی مرکز کے گرد جمع کر دیا ہے۔ اس طرح دوری اور اجنبیت کو آواز نے ختم کر کے ایک عالمی برادری پیدا کی ہے۔

ریڈیو ——

ریڈیو' آواز کا بلند ترین مظہر ہے —— اور اس سے وہ سارے کام لیے جا رہے ہیں جن کو میکانی ذرایع کے بغیر انسانی آواز کی پرواز انجام نہیں دے سکتی۔ دنیا کی تمام قومیں اپنے مقاصد کے لئے اسے استعمال کر رہی ہیں اور شاید یہ کہا جا سکتا ہے کہ ریڈیو کسی قوم کا سب سے بڑا سرمایہ ہے۔ وہ تفریح ہے۔ وہ تعلیم ہے' وہ پروپاگنڈہ ہے' وہ پیام ہے وہ اس انسانی آواز کا جس میں ذہنی تخیلات کے عکس نظر آتے ہیں' ہر ایک گوشہ ہے۔ اس لئے "ریڈیو" کی آواز کو محفوظ کر لینا' گویا تمدن کے مختلف مظاہر کو نمایاں کرنا ہے۔ اسی خیال کے پیش نظر "سب رس" نے ہندستان میں پہلا قدم اٹھایا ہے۔

یہ کیوں ——

نشرگاہ سرکار عالی نے اردو زبان و ادب کی جو گراں بہا خدمت انجام دی ہے' اس کا خراج تحسین ادا کرنا ہر اس شخص کا فرض ہے جو اردو کو قومی زبان سمجھتا ہے۔ زبان و ادب کی اشاعت عوام میں ایک ذہنی شعور پیدا کرتی ہے۔ اور اسی ذہنی شعور سے مستقبل بنتا ہے۔ نشرگاہ سرکار عالی نے تقریباً دو سال کے عرصے میں یہ ثابت کر دیا ہے کہ اس کا وجود نہ صرف ان کے لیے جو تفریح کے ساتھ ساتھ تعلیم حاصل کرنا چاہتے ہیں' مفید ثابت ہوا ہے بلکہ ان کے لئے بھی جو علم کی روشنی سے بہت دور تھے وہ ایک معلم کا کام دے رہی ہے۔ ہم نشرگاہ سرکار عالی کو اس کی علمی و ادبی فتوحات پر دلی مبارکباد دیتے ہیں۔

سب رس کے اس خاص نمبر میں ان تقریروں کا انتخاب ہے جو نشرگاہ سے نشر ہو چکی ہیں۔ انتخاب میں صرف اس خیال کو پیش نظر رکھا گیا ہے کہ وہ ہمارے بنائے ہوئے ابواب کے تحت آ سکیں۔ ایسی بہت سی تقریریں شایع نہ ہو سکیں جن کی

افادیت اور دلچسپی سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اس کی بڑی وجہ عدم گنجائش ہے۔ جنگ کی وجہ سے صحافتی سامان اس قدر گراں ہوگیا ہے کہ ہمیں مجبوراً موازنہ کے خیال کو صحافت پر ترجیح دینی پڑی۔ بہرحال یہ جو کچھ ہے' اس کے متعلق بھی ہم کہہ سکتے ہیں کہ وہ شاید ہی کسی اردو رسالے میں مل سکے۔ ہم ان تمام مقرر صاحبان کا شکریہ ادا کرتے ہیں جنھوں نے اپنی تقریروں کو چھاپنے کی اجازت دی اور محکمۂ نشریات سرکار عالی کے تعاون کا اعتراف کرتے ہیں۔

اس مجموعہ میں آپ کو سائنس سے متعلق کوئی باب نہیں ملے گا۔ حالانکہ موجودہ زمانے میں سائنس کی اہمیت ایک عامی کی نگاہ میں بھی نمایاں ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ہم نے دانستہ طور پر اس کو نظر انداز کردیا۔ اس کی وجہ یہ نہیں کہ نشرگاہ سے سائنس کے متعلق تقریریں نشر نہیں ہوئیں بلکہ یہ ہے کہ ادارۂ ادبیات نے میر حسن صاحب ایم اے کی مرتبہ کتاب "سائنس کے کرشمے" شایع کردی ہے' اس کتاب میں ان تقریروں کا انتخاب ہے جو نشرگاہ سے سائنس کے متعلق نشر ہو چکی ہیں۔

شروع میں ایک حصہ ریڈیو سے متعلق شریک کیا گیا ہے اور کوشش کی گئی ہے کہ ریڈیو کے مختلف پہلوؤں پر روشنی پڑ سکے۔ اس سلسلے میں ہمیں افسوس ہے کہ اکثر اہل قلم حضرات نے جن سے خواہش کی گئی تھی کہ مخصوص عنوانوں پر مضامین تحریر فرمائیں، توجہ ہی نہیں فرمائی یا وعدہ وفا نہیں کیا۔ اس سلسلے میں ہمیں غیروں سے زیادہ اپنوں کا شکوہ ہے۔

آل انڈیا ریڈیو:-

ہم نے چاہا تھا کہ اس نمبر میں ہندوستان کی تمام نشرگاہوں کے متعلق معلومات اور تصویریں شایع ہوں لیکن افسوس ہے کہ لاہور ریڈیو اسٹیشن نے صرف تصویریں بھیجیں اور نشرگاہ حیدرآباد سے کچھ معلومات مل سکیں۔ ہم ان دونوں نشرگاہوں کا شکریہ ادا کرتے ہیں۔ کیا اچھا ہوتا کہ آل انڈیا ریڈیو اور نشرگاہ حیدرآباد دونوں ہماری گزارشوں پر خاص طور پر توجہ کرتے اور ہم اپنے ناظرین تک ہندستان کی نشری سرگرمیوں کا ایک خاکہ پیش کرنے میں کامیاب ہو سکتے۔

"میکش"

نشرگاہِ حیدرآباد

حیدرآباد میں نشریات کا آغاز خانگی طور پر ۱۹۳۳ء میں شروع ہوا۔ ۱۹۳۵ء میں حکومتِ سرکارِعالی نے خانگی نشرگاہ کو خرید لیا۔ تمام ضروری انتظامات کی اطمینان بخش تکمیل کے بعد نئی نشرگاہ یکم جولائی ۱۹۳۹ء میں کھولی گئی۔

نشرگاہِ حیدرآباد کا پروگرام عام طور پر تین سرخیوں کے تحت تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

(۱) موسیقی (۲) تقاریر (۳) خبریں، جن کا مجموعی دوران روزآنہ ساڑھے چار گھنٹے ہوتا ہے۔ اس وقت میں روزآنہ آدھا گھنٹہ بچوں کے لئے وقف کر دیا گیا ہے۔ ان چار گھنٹوں میں سے اردو اور انگریزی خبریں پچاس منٹ لے لیتی ہیں۔ پندرہ منٹ کی ایک تقریر روزآنہ نشر کی جاتی ہے اور باقی وقت جو تین گھنٹوں کے لگ بھگ ہوتا ہے موسیقی کے لئے وقف ہے سوائے مہینے میں تین چار دنوں کے جب کہ نشری ڈرامے اور فیچر آدھا گھنٹہ لے لیتی ہیں۔ ان کے علاوہ ہفتہ میں ایک انگریزی تقریر بھی نشر کی جاتی ہے۔ جس کا دوران پندرہ منٹ ہوتا ہے۔

بچوں کے پروگرام میں ہفتہ دو روز فیچر نشر کئے جاتے ہیں اور دوسرے دنوں میں دلچسپ معلوماتی اور تعلیمی تقریریں قصے کہانیاں اور "بات چیت" نشر کی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ گانے اور سازی موسیقی اور ریکارڈز سنائے جاتے ہیں۔

پچھلے سال عام تقریری پروگرام میں جملہ (۱۱۴) مقرروں نے حصہ لیا اور کل (۱۷۱) تقریریں نشر کی گئیں۔

علاوہ بریں مختلف موضوعات پر (۱۳۵) تقریریں نشر کی گئیں جن میں اخباری تبصرے اور افسانے بھی شامل ہیں۔

پچھلے سال تعلیمی اور معلومات آفریں تقریروں کے تین سلسلے "تہذیب و تمدن" "پیشے" اور "وباؤں" سے متعلقہ شریک پروگرام کئے گئے۔ ان میں سے ہر ایک عنوان کے تحت آٹھ آٹھ تقریریں نشر کی گئیں جن کو ریاستِ حیدرآباد اور برطانوی ہند کے سننے والوں نے عام طور پر پسند کیا۔

مشاعرے بھی یہاں کے اسٹوڈیوز سے نشر کئے گئے جن میں سربرآوردہ شاعروں کے ساتھ ساتھ نوعمر اور نوخیز شاعروں نے بھی حصہ لیا۔

جنگ کی وجہ سے نشرگاہ کے پروگرام کے مختلف اجزا کے دوران میں کچھ تبدیلیاں کی گئیں۔ مثلاً جنگ کے شروع ہونے سے پہلے اردو اور انگریزی خبروں کا مجموعی دوران ۳۰ منٹ تھا لیکن بعد کو اضافہ کر کے اسے روزآنہ پچاس منٹ تک پہونچا دیا گیا۔

نشرگاہ کی اردو خبریں زبان اور الفاظ کی سلاست اور سادگی کی بدولت ان تمام مقامات میں مقبول ہوئیں جہاں کہ یہ نشریات سنی جاتی ہیں۔ علاوہ بریں محکمہ لاسلکی نے متعدد توضیحی اور حالاتِ حاضرہ سے متعلقہ خبریں تیار کر کے خبروں کے بعد نشر کرائیں جن سے نشرگاہ کے سننے والوں کے ذہن میں ایسا پس منظر پیدا ہو گیا جس میں خبریں آسانی سے سمجھی جا سکتی ہیں۔

اس سال استادی اور عام پسند دونوں قسم کی موسیقی کو پروگرام میں مناسب جگہ دی گئی۔ سال بھر میں مختلف راگوں اور راگنیوں کے خیال ۵۹۴ دفعہ گوائے گئے۔ ہلکے اور

ہند کے پروگرام میں ۱۷۰۰ غزلیں، ۴۳۰ ٹھمریاں، ۲۵۵ دادرے، ۲۱۰ گیت، ۲۰ دوگانے، سات غنائیے اور ایک آپرا شریک کیا گیا۔

کل ۱۷۰ گانے والوں اور ۴۴ گانے والیوں نے نشرگاہ حیدرآباد سے اپنے گانے نشر کیے اور نشرگاہ حیدرآباد کے اسٹوڈیو آرکسٹرا نے ۲۹۲ گتیں سنائیں جن میں سے (۱۱۷) استادی گتیں تھیں اور (۱۷۵) عام پسند تھیں۔ ان میں سے اکثروں کو سننے والوں نے عام طور پر پسند کیا۔

ریڈیو کے شوقینوں کی دلچسپیوں، ان کے مذاق اور رائے سے نشرگاہ کو واقف کرانے میں سننے والوں کے خط بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ ریاست حیدرآباد اور ہندوستان کے دوسرے علاقوں سے نشرگاہ کو جو خط وصول ہوتے ہیں ان کی تعداد میں برابر اضافہ ہو رہا ہے جو اس امر کا ثبوت ہے کہ حیدرآباد پروگرام سے سننے والوں کی دلچسپی بڑھتی جا رہی ہے۔

ان خطوں سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہاں کا پروگرام ہندوستان کے تقریباً تمام حصوں میں سنا جاتا ہے۔ بیرون ہند سے آئے ہوئے سارے خطوط اور مقامی خطوں کی ایک بڑی تعداد اس وقت تک ستایشی رہی ہے۔ گاہے ماہے مقامی سننے والے نشرگاہ کو تنقیدی خط بھی بھیجتے ہیں جن کے جوابات نشرگاہ نے مائکروفون پر دیے ہیں یا تحریر کے ذریعے اپنی مشکلات کو سمجھانے کی کوشش کی ہے۔

نشرگاہ حیدرآباد کے نیم ماہی پروگراموں کی تفصیل ایک پرچہ کی صورت میں چھپتی ہے جو بالفعل تمام مقامی سننے والوں کی خدمت میں مفت روانہ کیا جاتا ہے۔

نشرگاہ حیدرآباد کے ارباب کار تعلیمی اور تفریحی دونوں قسم کا تجربہ رکھتے ہیں چنانچہ ان میں سے بعض بحیثیت معلم دیرینہ عملی تجربے کے حامل ہیں اور کئی علمی و ادبی کتابوں کے مصنف بھی۔ یہی وجہ ہے کہ نشرگاہ حیدرآباد کے پروگرام میں تفریح کے ساتھ ساتھ تعلیمی عنصر کا بھی خاص لحاظ رکھا جاتا ہے۔

شاہد

مسٹر ممتاز علی
ریڈیو کے ماموں جان

مولوی محبوب علی صاحب
سابق ناظم لاسلکی نشرگاہ سرکار عالی

آواز کی دُنیا

"آواز کی دنیا" بہت ہی دلچسپ سُرخی ہے۔ لیکن اس کا مفہوم ذرا مبہم سا ہے۔ اِن الفاظ کو سُننے کے بعد فوراً ہی یہ نہیں پتہ چلتا کہ آواز سے یہاں کیا مُراد ہے اور آواز کی دُنیا سے کس کی طرف اِشارہ ہے۔ یہ تو سبھی جانتے ہیں کہ یہ دنیا جس میں آپ اور ہم رہتے سہتے ہیں آواز ہی کی دُنیا ہے۔ جس میں دن رات ہزاروں قسم کی آوازیں سُنائی دیتی ہیں۔ اِنسانوں کی آوازیں جس میں ہر ملک اور ہر قوم کی زبانیں شامل ہیں۔ جانوروں کی آوازیں جس میں جنگل کی ساری مخلوق اور ہوا میں اُڑنے والے تمام پرندے حصہ لیتے ہیں۔ اور پھر بے جان چیزوں کی آوازیں اگر آواز کی دنیا سے یہ مفہوم لیا جائے تو پھر مجھے ساری کائنات پر تقریر کرنی پڑے گی۔ جس کے لئے میں تو کیا اگر دُنیا بھر کے سائنس داں اور فلسفی بھی سر جوڑ کر تقریر تیار کرنا چاہیں تو خاطر خواہ کامیابی نہ ہوگی۔ اگر وہ تقریر تیار بھی کرلیں تو پندرہ منٹ کیا معنی پندرہ برس میں وہ ختم نہ ہو سکے گی۔

آواز کی دنیا کا دوسرا مفہوم نسبتاً محدود ہے۔ یعنی وہ دُنیا جو ریڈیو کی دنیا کہلاتی ہے۔ جس کو وجود میں آئے چند ہی سال ہوئے ہیں۔ اور جس کے اندر پچھلے چند مہینوں سے میں بھی سانس لینے لگا ہوں۔ اِس دُنیا کو آواز کی دنیا اِسلئے کہا گیا ہے کہ اِس دنیا میں سوائے آواز کے اور کچھ نہیں۔ اس دنیا میں بھی ہماری دنیا کی طرح لوگ بات چیت کرتے ہیں۔ اچھی بُری خبریں سُناتے ہیں، گاتے ہیں، ہنستے ہیں، روتے ہیں دوسروں کی نقلیں اُتارتے ہیں اپنی اصلیت دکھاتے ہیں۔ لیکن یہ سب کچھ اِس خوبی کے ساتھ کہ سُننے والوں کو صرف آواز سُنائی دیتی ہے بولنے والوں کی صورت نہیں دکھائی دیتی۔ اور نہ اُن کی چال ڈھال، لباس، وضع قطع، ڈیل ڈول کا علم ہو سکتا ہے۔ آواز کی دنیا اس مفہوم میں جو میں نے ابھی بیان کیا واقعی آواز کی دُنیا ہے۔ جہاں ہر جاندار اور بے جان چیز سے اُس کی آواز چھین کر بالکل علٰحدہ کر دی جاتی ہے۔ اور پھر اُسے سیکڑوں ہزاروں میل تک شہر اور گاؤں میں، جنگل اور پہاڑ کی چوٹیوں تک پہنچایا جاتا ہے۔ یہ آوازیں دن رات ایسے کمروں سے نکلتی ہیں جہاں سے عام حالات کے اندر کوئی آواز نہیں نکل سکتی۔ اور جنہیں اسی مناسبت سے ساؤنڈ پروف اسٹوڈیو کہا جاتا ہے۔ اور پھر ان کمروں سے نکل کر انسانی خیال کی تیز رفتاری کے ساتھ ساری دنیا میں پھیل جاتی ہیں۔

اِس موقع پر میں اس حیرت ناک اِیجاد کی سائنٹیفک ماہیت نہیں بتانا چاہتا۔ اِس لئے کسی انجینیر یا ماہرِ لاسلکی کی ضرورت ہے۔ اور اگر کوئی ماہر اس پر تقریر بھی کرے تو یقین جانئے وہ پندرہ منٹ میں آپ کو اس کے اُصول نہیں سمجھا سکتا۔ البتہ چند موٹی موٹی باتیں شاید وہ آپ کو بتا سکے۔ وہ شاید آپ کو یہ کہے کہ آواز کو نشر کرنے کے لئے ضروری ہے کہ ناشر مائکروفون کے آگے تقریر کرے یا گائے یا ساز بجائے۔ اس مائکروفون کے ذریعہ ہوا کی موجیں بجلی کی موجوں میں بدل جاتی ہیں اور پھر یہ بجلی کی موجیں پہلے تو ٹرانسمیٹر تک پہنچائی جاتی ہیں اور پھر فضا میں دور دور تک انھیں پھیلایا جاتا ہے۔ اور اگر وہ زیادہ علمی رنگ پیدا کرنا چاہیں تو آپ کو برق تنفاطیس امپلی فائر، لیسوننگ سٹ اور لاؤڈ اسپیکر کے بارے میں بھی کچھ نہ کچھ مفید معلومات ضرور بتائے گا اور آپ اس کو غور سے سنیں گے اور مقرر کو بعد میں یقین دلائیں گے کہ تقریر بہت ہی دلچسپ اور پر از معلومات تھی۔ اور یہ کہ بجلی واقعی حیرتناک

قوت ہے۔ اس حد تک تو آپ یقیناً سمجھ جائیں گے۔ اس کے
آگے شاعر کے اِس مصرع پر اکتفا کرنی پڑے گی۔

مگر اُن کا کہا یہ آپ سمجھیں یا خدا سمجھے

جب یہ حال ہے کہ نہ میں سمجھنے کے قابل اور نہ آپ
سمجھنے کے لئے تیار تو پھر ایسی بحث ہی کیوں چھیڑی جائے،
جس کا تعلق تمام تر ریڈیو انجینئرنگ سے ہے۔ برخلاف اس کے
اگر میں ریڈیو کے غیر فنی پہلو پر کچھ روشنی ڈالوں تو کم سے کم
اِتنی توقع ضرور پیدا ہوگی کہ اِس بارے میں میں کچھ کہہ سکوں گا۔
اور آپ کچھ سن سکیں گے۔ کئی دن پہلے کی بات ہے کہ میرے
ایک پڑوسی مجھ سے ریڈیو کے بارے میں اکثر چیزیں دریافت
کیا کرتے تھے۔ پروگرام کس طرح تیار ہوتا ہے۔ ریہرسل کیونکر
لئے جاتے ہیں۔ نشر کے انتظامات کیسے ہوتے ہیں اور اسی طرح
کے سوالات۔ میں ان کو واقعات سمجھاتا اور ساتھ ہی ساتھ
ریڈیو کی تعریف میں ہونٹ منہ سکھاتا اور وہ میری گفتگو
توجہ سے سنتے۔ میں کہتا کہ "دیکھئے ریڈیو بھی کیسی دلچسپ اور
مفید ایجاد ہے کہ اس کے ذریعہ آپ گھر بیٹھے دور دور کے ملکوں
کی خبریں سُنتے ہیں۔ وہاں کے مشہور مقررین کے خیالات
سے فیض پاتے ہیں اور بڑے بڑے استادوں کی موسیقی
سے لُطف اُٹھاتے ہیں۔ اس کی بدولت آپ کی تفریح ہوجاتی
ہے۔ آپ کے بچوں کی تعلیم کا بھی انتظام ہوجاتا ہے اور
جب عورتوں کا پروگرام ہو تو آپ کی بیوی کام کاج سے فارغ
ہوکر کچھ اپنی دلچسپی کا سامان کرسکتی ہیں۔ اور تو اور آپ کے
نوکر بھی دیہاتی پروگرام کی مدد سے اپنی معلومات میں اضافہ
کرسکتے ہیں۔ غرض سارا گھر اس سے فائدہ اُٹھا سکتا ہے۔
ہم بدنصیب ہندوستانی اس لاجواب ایجاد کی جیسی چاہیے
قدر نہیں کرتے۔ انگلستان کو دیکھئے نو لاکھ ریڈیو سٹ
وہاں موجود ہیں۔ یعنی تقریباً ہر گھر میں ایک سٹ ہے۔ اور
پھر نشریات پر وہاں سالانہ سات کروڑ روپیہ خرچ ہوتا ہے۔
غور کیجئے۔ سات کروڑ روپیہ سالانہ۔ امریکہ میں آٹھ سو ریڈیو
اسٹیشن ہیں۔ یعنی ساری دنیا میں جتنے ریڈیو اسٹیشن ہیں ان کی
آدھی تعداد صرف اِس ایک ملک میں ہے۔ اور پھر پروگرام
بھی کیسے کہ سننے والے عش عش کر جائیں۔ کبھی مس روز
سُریلی آواز میں آپ کا دل لُبھا رہی ہیں۔ کبھی پروفیسر سیم
دُنیا کی سیاسیات سے متعلق آپ کے ہوش اُڑا رہے ہیں۔
کبھی ایک بے نظیر ڈرامہ ہو رہا ہے کہیں ایک بے مثال آپیرا
سُنائی دے رہا ہے۔ کسی نشر گاہ سے گھوڑ دوڑ کے چشم دید واقعات
بیان کئے جا رہے ہیں۔ کبھی فٹ بال میچ کی تفصیل
سُنائی جا رہی ہے۔

مختصر یہ کہ ایتھر کی موجوں میں ایک طوفان بپا ہے۔
اور ہر موج خواہ وہ تین سو میٹر لمبی ہو یا تیس میٹر بس ایک ہی
کوشش میں سرگرداں ہے یعنی اپنے شہر کی آواز دوسرے
شہروں تک پہنچائے۔

یہ تو حالت ہے دنیا کی اور ہم ہندوستانی اس سے
بالکل غافل حسب عادت خاموش زندگی بسر کر رہے ہیں کس قدر
اُفسوس کا مقام ہے کہ ۳۵ کروڑ آبادی کے لئے اَسّی ہزار
ریڈیو سٹ کا اوسط ہو یہ نہیں کہ ہمارے ہاں نشر گاہیں نہیں۔
خدا کے فضل سے ایک چھوڑ دس بارہ ریڈیو اسٹیشن موجود
ہیں۔ رونا تو بس اس کا ہے کہ سننے والوں کی تعداد
کم ہے۔

میری گفتگو کا رفتہ رفتہ میرے پڑوسی پر اثر ہونے لگا۔
ایک دن کیا دیکھتا ہوں کہ صبح سویرے فجر کی نماز کے پہلے وہ میرے
ہاں دوڑے دوڑے تشریف لائے۔ چہرہ خوشی سے تمتما رہا تھا۔

منھ سے برابر بات نہیں نکل رہی ہے۔ کہنے لگے "میں نے . . . میں نے . . . ایک ریڈیو سٹ خرید لیا ہے" بس اتنا کہا اور پھر زبان جذبات کے اثر سے رک گئی۔

میں نے انھیں مبارکباد دی۔ اور گلے سے لگا لیا۔ پھر ہم دونوں کچھ دیر تک سٹ کی قیمت ماڈل وغیرہ سے متعلق گفتگو کرتے رہے یہاں تک کہ میرے پڑوسی مجھے اپنے گھر گھسیٹ لے گئے تاکہ میں سٹ چلانے۔ آواز کو گھٹانے بڑھانے، سوئی گھمانے اور پروگرام لینے کے طریقے بتا دوں۔ جب یہ سارے اصول اُن کی سمجھ میں آگئے اور بطور تجربہ اُنھوں نے دو ایک جگہ کا پروگرام بھی لیا تو میں اُن سے یہ کہہ کر رخصت ہوا کہ "کل کے لئے ایک ضروری مضمون تیار کرنا ہے اجازت دیجئے" مضمون نہایت دماغ شکست تھا یعنی مجھ سے فرمائش کی گئی تھی کہ ایک ہی مضمون میں جو پانچ صفحوں سے زیادہ نہ ہو معاشیات، سیاسیات، ادب، تاریخ، فلسفہ، نفسیات اور اخلاق کے تمام اصول اس طرح بیان کروں کہ اَن پڑھ سے اَن پڑھ کی سمجھ میں آجائے۔ میں کاغذ پنسل لے کر اس مہم کو سر کرنے بیٹھا ہی تھا کہ پڑوس سے آواز آنے لگی "ہم دلی سے بول رہے ہیں ابھی آپ ولایت خاں صاحب کا گانا سن رہے تھے اب آپ کو چند فلمی ریکارڈ سنائے جائیں گے" اس آواز پر میں چونکا پنسل ہاتھ سے خود بخود چھوٹ گیا۔ اور میں فلمی گانے سننے میں محو ہو گیا۔ مجھے سینما سے یوں بھی دلچسپی ہے، اور گانے بھی اچھے تھے خیال ہوا کہ گانے ختم ہونے کے بعد مضمون شروع کرونگا۔ آخر ایسی کیا جلدی ہے۔ پندرہ بیس منٹ میں جب یہ ایٹم ختم ہو گیا تو میں نے پھر کاغذ پنسل سنبھالا اور سوچنے لگا کہ مضمون کس طرح شروع کروں کہ اتنے میں آواز آئی "اب آپ کو خبریں سنائی جائیں گی" جنگ کا زمانہ، بھلا کون مرد دل ایسا ہوگا جو ان دنوں دنیا کی خبریں کان دھر کے نہ سنے میں نے پنسل رکھ دیا اور خبروں کا اردو اور انگریزی بلیٹن پڑھے جانے تک خاموش دیوار کی طرف ٹکٹکی باندھے ہوئے سوچتا رہا۔ خبروں کے بعد پھر کچھ گانے سنائی دیئے اور دو ایک تقریریں بھی ہوئیں۔ پھر کچھ سوئی بدلنے کی گڑگڑاہٹ سی محسوس ہوئی جس کے بعد مجھے یقین ہو گیا کہ میرے پڑوس کی طبیعت سیر ہو چکی ہے۔ اور وہ اب اپنا سٹ بند کرنے والے ہیں۔ میں دماغ کے پراگندہ خیالات کو یکجا کرکے مضمون کی طرف توجہ کو زبردستی پھیرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ آواز آگیا "یہ لنڈن ہے" میں پھر رک گیا۔ اور یہ سمجھ کر کہ جہاں صبح ہندوستانی پروگرام سننے میں صرف ہوئی وہاں اگر شام انگریزی پروگرام میں گذر جائے تو کیا ہرج ہے۔ تنوع بھی ہو جائے گا اور توازن بھی قائم رہے گا۔ چھت کو دیدے لگائے ہوئے رہا۔

اَب میرے سر میں ہلکا سا درد محسوس ہونے لگا تھا۔ اور چونکہ ایک اہم مضمون تیار کرنا تھا میں نے اسپرین کی دو گولیاں کھائیں اور سوچتا رہا کہ جب ذرا درد کم ہولے اور رات کو سب لوگ سو جائیں اور پڑوس کا ریڈیو سٹ بند ہو جائے تو میں رت جگا کرکے اپنا مضمون تیار کر لونگا۔ اس موقع میں انگلیوں پر گھڑیاں گنتا رہا یہاں تک کہ رات کے گیارہ بج گئے اور مجھے پورا یقین ہو گیا کہ اب کچھ دیر میں خاموشی کا عالم طاری ہو جائیگا۔ لیکن میری یہ توقع بیجا تھی۔ پڑوس کا سٹ برابر چالو تھا۔ جب انگریزی پروگرام ختم ہو گیا تو یورپ کی دوسری زبانوں کے الفاظ سنائی دینے لگے جنھیں میں سمجھنے سے قاصر تھا۔ پھر چینی اور جاپانی زبان کی باری آئی۔ پھر آفریقہ کا راگ شروع ہوا۔ رات گذرتی جا رہی تھی اور میں بستر پر کروٹیں بدل رہا تھا۔ مضمون رہا ایک طرف یہاں تو جان پر آبنی تھی۔ دن کا چین تو حرام ہو ہی چکا تھا اب رات کی نیند بھی غائب تھی۔ دل ہی دل میں دعائیں کر رہا تھا کہ یا تو سٹ میں کوئی خرابی ہو جائے یا میرے کان کے پردے پھٹ جائیں تاکہ پھر ایک دفعہ سکون نصیب ہو۔ اس واقعہ کو چھ مہینے گذر چکے ہیں

میرے پڑوسی کا اسٹ آب بھی چالو ہے۔ اب مجھے یقین ہے کہ جب تک آواز کی دُنیا قائم ہے یہ سٹ یونہی چالو رہے گا۔ میں اُن کا دل ریڈیو کی طرف سے پھیرنے کی کوشش کر رہا ہوں جب موقع ملتا ہے میں اُن سے کہتا ہوں کہ" ہندوستانی موسیقی میں کیا دَھرا ہے۔ وہی خیال ٹھمری اور ٹپہ وہی غزل گیت قوالی اور بھجن۔ لے دیکے یہی چار چھ چیزیں رہ گئی ہیں جو دن رات دُھرائی جاتی ہیں۔ نہ ان میں کوئی تنوع پیدا کیا جاتا ہے نہ جدت۔ کبھی کبھار یکسانیت کو کم کرنے کے لئے دوگانہ یا ایسی ہی کوئی اور چیز پروگرام میں شریک کر دیجاتی ہے لیکن اس سے کیا فائدہ چاہئے تو یہ کہ فن موسیقی کو ترقی دی جائے جذبات کی صحیح ترجمانی کی صلاحیت کی طرف توجہ ہو۔ اس میں نئی نئی باتیں نکالی جائیں۔ بدقسمتی سے یہ اُس وقت تک ممکن نہیں جب تک تعلیم یافتہ طبقہ اس کام کا بیڑا نہ اُٹھائے۔ تمام ملک میں موسیقی کے اسکول اور کالج نہ کھولے جائیں۔ اور اس فن کے دوبارہ زندہ کرنے کے لئے دل کھول کر روپیہ صرف نہ ہو۔ روپے کا جہاں سوال آتا ہے وہاں سب کی ہمتیں لوٹ جاتی ہیں مجھے تو اس کا مستقبل بہت تاریک نظر آتا ہے۔ میری باتوں کا اُن پر مطلق اثر نہیں ہوتا۔ وہ ہمیشہ یہی کہتے ہیں کہ آپ ہندوستانی موسیقی کے خلاف جو کچھ بھی زہر اُگلیں مجھے تو اسی میں مزا آتا ہے۔

پھر میں اپنے دوست کو انگریزی موسیقی سے بدظن کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ میں کہتا ہوں کہ" خیر ہندوستانی موسیقی ہماری اپنی میراث ہے لیکن یہ مغربی سازوں کی ٹوں ٹوں اور ٹاں ٹاں سے نہ تو دین ہی کا فائدہ ہے نہ دنیا کا۔ مانا کہ یورپ نے موسیقی کو بحیثیت فن کے کمال کو پہنچا دیا ہے۔ مانا کہ وہاں کے ماہرین فن اپنے دلنواز نغموں سے ساری قوم کی رُوح کو جگا دیتے ہیں پھر بھی مشرق ہے اور مغرب مغرب۔ اور یہ دونوں کبھی نہیں مل سکتے۔ جب یہ حربہ بھی بیکار ثابت ہوا تو پھر میری طرف سے تقاریر، خبروں اور ڈراموں پر وار شروع ہوتے ہیں۔ یہ کہتا ہوں کہ یونہی جب مقرر سامنے ہو اور سارے مجمع کے جذبات ہماری شخصیت پر اثر ڈالیں تو دس پانچ منٹ سے زیادہ کسی کی تقریر سُننے کو جی نہیں چاہتا۔ حالانکہ ایسے وقت میں خود جلسے کے اَندر دلچسپی کے کئی سامان ہوتے ہیں ایسی صورت میں ایک کمرے میں تنہا بیٹھ کر گھنٹوں کسی غائب مقرر کی سوکھی ساکھی تقریر سے لطف اُٹھانا کیسے ممکن ہے۔ آخر ان تقریروں میں کونسی نئی بات ہوتی ہے۔ وہی جو باوا آدم کے زمانہ سے سنتے آئے ہیں خبروں کی بھی یہی بلکہ اس سے بدتر حالت ہے۔ دن رات کے جھوٹے جھگڑے بار بار دُہرائے جاتے ہیں۔ فلاں جگہ فلاں شخص مارا گیا۔ فلاں ملک نے فلاں ملک پر چڑھائی کر دی۔ اتنی عورتیں جان سے ماری گئیں اور اتنے بچے زندہ دفن ہو گئے۔ ایسی خبریں روز سُننے سے صحت پر برا اَثر پڑتا ہے۔ دل پر مایوسی چھا جاتی ہے۔ اس باخبر رہنے سے تو بے خبر رہنا کہیں بہتر ہے"۔ میں لاکھ سمجھاتا ہوں میرے پڑوسی کے سمجھ میں خاک نہیں آتا اُنھیں ریڈیو کا چسکا لگ گیا ہے۔ اور اب کوئی طاقت اُنھیں پروگرام سننے سے باز نہیں رکھ سکتی۔ نہ صرف ان زبانوں کے پروگرام جنھیں وہ سمجھتے ہیں بلکہ ایسی زبانیں بھی جیسی کہ چینی، جاپانی، ولندیزی وغیرہ جن کا ایک حرف کسی کے سمجھ میں نہیں آتا۔ وہ نہایت عقیدت مندی کے ساتھ گھنٹوں ان ممالک کے پروگرام سُنا کرتے ہیں اور جی ہی جی میں خوش ہوتے ہیں کہ میں نے ہالینڈ لگایا ہے۔ یا چین تک پہنچ گیا ہوں یا جاپان کی خبر لایا ہوں بعض وقت مجھے خیال آتا ہے کہ اگر میرے دوست اسی طرح کچھ دن اور آواز کی دنیا میں راج کرتے رہیں تو اغلب ہے وقت سے بہت پہلے مجلے والے اِس دنیا سے رخصت ہو جائیں گے۔

محمد فضل الرحمٰن

ایتھر

ہمیں اپنے اِردگرد بے شمار چیزوں کی موجودگی کا احساس ہوتا ہے۔ اُن میں سے بہت سی چیزیں ایسی ہوتی ہیں جن کو ہم چھو کر محسوس کرتے ہیں اور بعض ایسی بھی ہیں کہ جن کی موجودگی ہم آواز سن کر معلوم کرتے ہیں کئی چیزیں ایسی بھی ہوتی ہیں جن کو ہم بغیر چھوئے یا سُنے معلوم کرسکتے ہیں۔ چاند سورج ستارے وغیرہ سب ہمیں دیکھنے ہی سے معلوم ہوتے ہیں۔ اگر ہم میں دیکھنے کی قوت نہ ہوتی تو شاید ان چیزوں کا ہمیں کچھ علم نہ ہوتا۔ نیز اپنی قوتِ شامہ یا سُونگھنے کی قابلیت سے ہمیں بغیر چھُوئے سُنے یا دیکھے ہی بہت سی چیزوں کی موجودگی کا علم ہوتا ہے۔ مثلاً خوش ذائقہ کھانا پھُول عطر وغیرہ کو ہم دُور ہی سے سونگھ کر معلوم کرلیتے ہیں۔ ایسی تمام چیزیں جن کی موجودگی ہم براہِ راست اپنے ایک سے زیادہ حواس کے ذریعہ محسوس کرسکتے ہیں' مادّہ کہلاتی ہیں۔ مادّہ اپنے اَندر چند طبعی خواص بھی رکھتا ہے۔ مثلاً ٹھوس پن سختی لَچک وغیرہ۔ یہ مادّہ کے چند طبعی خواص ہیں۔

لیکن کائنات کا ایک بہت بڑا حصہ ایسا بھی ہے جہاں مادہ موجود نہیں ہے۔ ایسی خالی جگہ یا فضا کو ہم خلا کہتے ہیں۔ خلا کا مفہوم سمجھنے کے لئے ایک مثال پر غور کیجئے۔ اگر کسی برتن میں پانی بھرا ہو تو ہم کہتے ہیں کہ وہ پانی سے بھرا ہوا ہے۔ لیکن اگر کُل پانی پھینک دیا جائے تو ہم کہتے ہیں کہ برتن خالی ہے۔ حالانکہ اس برتن میں ہوا (جو ایک مادی چیز ہے) موجود ہوتی ہے۔ اَب اگر ہوائی پمپ کے ذریعہ سے برتن کے اَندر کی ہوا کو بھی خارج کردیا جائے تو اس وقت ہم کہتے ہیں کہ برتن کے اندر خلا ہے۔ یعنی اُس میں کوئی ایسی چیز موجود نہیں ہے جسے ہم مادہ کہہ سکیں۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر یہ خلا کیا ہے؟ کیا یہ محض ایک خالی جگہ ہے؟ جس میں صرف لمبائی چوڑائی اور بلندی ہی کی خاصیت موجود ہے یا اُس میں بھی کوئی ایسی شئے موجود ہے جو مادے سے تو بالکل مختلف ہے لیکن ایک حقیقت ضرور ہے۔ صدیوں کی تحقیقات کے بعد ہم اِس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ خلا بھی ایک حقیقی شئے سے پُر ہے۔ اسی حقیقت کے لئے سب سے پہلے نیوٹن نے ایتھر کا نام تجویز کیا تھا۔

گو ایتھر کو ہم اپنے حواس کے ذریعہ سے براہِ راست محسوس نہیں کرسکتے۔ یعنی نہ ہم اُس کو دیکھ سکتے ہیں نہ چھُو سکتے ہیں نہ سُن سکتے ہیں نہ سُونگھ سکتے ہیں تاہم ایتھر میں کئی ایسی تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں جن سے ہمارے حواس متاثر ہوتے ہیں اور اُنہیں اثرات کے بغور مطالعے سے ہم ایتھر کی موجودگی سے آگاہ ہوتے ہیں۔ اِس بات کے بخوبی سمجھنے کے لئے اِس تمثیل پر غور کیجئے۔ غالباً ہر شخص کو ہوا کے وجود کا اِقرار ہوگا باوجود اس کے کہ ہوا اس کو کبھی نظر نہیں آتی۔ جب ہم کسی بند کمرے میں چند لمحوں کے لئے سانس روک کر چپ چاپ کھڑے ہوجاتے ہیں تو ہم ہوا کو محسوس کرنے نہیں پاتے لیکن جب ہم سانس لینا شروع کرتے ہیں تو یکایک ہوا کی ساکن حالت جاتی رہتی ہے یعنی ہوا کی حالت میں ایک قسم کی تحریک یا تبدیلی پیدا ہوتی ہے اور یہی تبدیلی ہے جس کی وجہ سے ہمیں ہوا محسوس ہونے لگتی ہے۔ اگر ہوا میں اس قسم کا تغیر نہ ہوتا تو غالباً ہم ہوا کو محسوس نہ کرسکتے۔ پھر جب ہم اپنے بند کمرے سے نکل کر کسی ایسی جگہ جاتے ہیں جہاں ہوا زور سے چل رہی ہو یعنی جہاں ہوا میں بہت زیادہ تغیر واقع ہورہا ہو تو ہم ہوا کو بہت شدت سے محسوس کرتے ہیں۔ غرض اِس طرح ہم نے نظر نہ آنے والی ہوا کو اپنی چھونے کی طاقت سے محسوس کرکے اس کے وجود کا اعتراف کیا۔

اس مثال سے ہم یہ نتیجہ اَخذ کرتے ہیں کہ کسی میڈیم یا واسطہ کی موجودگی کا پتہ صرف اسی وقت چلتا ہے جب اِس واسطہ میں ایسی تبدیلیاں ہوں جو کسی طرح ہمارے حواس کو متاثر کرسکیں۔

اب چونکہ ایتھر ایک غیر مادی شئے ہے جسے ہم براہ راست محسوس نہیں کرسکتے۔ اس لئے محض اس کے اندر پیدا ہونے والے تغیرات یا اثرات کو مادہ کی وساطت سے محسوس کرکے اس کی موجودگی کا اعتراف کرتے ہیں۔ مثلاً نیوٹن نے معلوم کیا کہ ہر مادی چیز دوسری مادی چیز کو اپنی طرف کھینچتی ہے جب کوئی چیز اوپر کی طرف پھینکی جاتی ہے تو زمین اسے اپنی طرف کھینچ کر نیچے لے آتی ہے ہمارا جسم ہر وقت زمین کے ساتھ لگا رہتا ہے جب ہم اوپر اچھلتے ہیں تو زمین ہمیں اپنی طرف کھینچتی ہے۔ نیوٹن اس بات سے متحیر تھا کہ آخر اس کشش کی وجہ کیا ہے۔ اس کے خیال کے مطابق دو چیزوں کا بلا وسیلے کے ایک دوسرے کو جذب کرنا یعنی کھینچنا ناممکن ہے پس اس نے تصور کیا کہ تمام جہاں پر ایک نہ محسوس ہونے والا میڈیم یا واسطہ چھایا ہوا ہے اور یہ کشش اس کا ایک ادنیٰ کرشمہ ہے، یعنی مادی چیزوں کی باہمی کشش ایتھر کی ایک خاصیت ہے۔

اب سوال ہوتا ہے کہ اگر ایتھر کو بھی کسی برتن سے ہوا کی طرح خارج کردیا جائے تو کیا اس ایتھر سے خالی فضا میں مادی چیزیں ایک دوسرے کو جذب کرنا چھوڑ دیں گی۔ اس بات کی تحقیق ہم تجربہ سے نہیں کرسکتے کیونکہ ایتھر ہر جگہ سمایا ہوا ہے۔ یہاں تک کہ مادے کے بھی بیچ سے ایسی آسانی سے گزرتا ہے جیسا کہ ہوا درختوں کے جھنڈ میں سے۔ کسی جگہ کو ایتھر سے خالی کرنا تا حال ایک ناممکن امر ہے۔ کیونکہ مادی آلات کے ذریعہ ہم اس کی چیر پھاڑ نہیں کرسکتے۔ بلکہ ہم صرف اس کی تبدیلیوں ہی کا مشاہدہ کرسکتے ہیں۔ ایک اور مثال لیجئے۔

آپ نے دیکھا ہوگا کہ جب پانی کی سطح پر ایک پتھر پھینکا جاتا ہے تو اس سطح پر موجیں پیدا ہوکر چاروں طرف پھیلتی جاتی ہیں۔ اسی طرح تمام روشن چیزیں مثلاً چراغ دہکتا ہوا کوئلہ سورج ستارے وغیرہ بھی ایتھر میں ایسی موجیں پیدا کرتی رہتی ہیں۔ جو ہماری آنکھ کو متاثر کرتی ہیں یعنی ہم میں دیکھنے کا احساس پیدا کرتی ہیں۔ یہ موجیں ایتھر میں ایک قسم کے تغیرات ہیں۔ جس طرح ہوا میں آواز کی موجوں سے متاثر ہوکر ہمارے کان ہوا کے وجود کا پتہ دیتے ہیں اسی طرح ایتھر کی موجوں سے متاثر ہوکر ہماری آنکھیں ایتھر کی موجودگی کا اعتراف کرتی ہیں۔

ایتھر کی موجودگی کا علم ہونے پر محققین نے اکثر قدرتی مظاہر کے سمجھنے میں ایتھر سے مدد لینی چاہی۔ اس کوشش میں کامیاب ہونے کے لئے ضروری تھا کہ وہ ایتھر کے خواص معلوم کرتے چونکہ مدت دراز سے انسانی تجربہ محض مادی چیزوں کے مطالعہ سے فراہم ہوا تھا اس لئے لوگوں نے ایتھر میں بھی مادے ہی کے چند خواص فرض کئے اور قدرتی مظاہر کے سمجھانے کے لئے متعدد نظریے پیش کئے۔ لیکن رفتہ رفتہ جب ان نظریوں کی چھان بین کی گئی تو ان سے ایسے نتیجے بھی حاصل ہوئے جو بالکل لغو اور ناممکن تھے۔ غرض کہ اسی طرح کے بہت سے نظریے بنانے اور بگاڑنے کے بعد آخر کار ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ ایتھر میں مادی خواص کا پایا جانا ایک ناممکن بات ہے۔

ایتھر کے خواص سمجھنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ ہم تھوڑی دیر کے لئے مادی تخیلات کو ذہن سے الگ کردیں اس لئے کہ ایتھر ایک غیر مادی شئے ہے۔ ایتھر کے اہم خواص میں سے چند یہ ہیں

(۱) ایتھر ایک انتہائی شفاف اور انتہائی غیر منتشر واسطہ ہے شفاف سے مراد یہ ہے کہ ایتھر میں روشنی بہ آسانی گزر سکتی ہے اور یہ اس کو قطعاً جذب نہیں کرتا۔ یہی وجہ ہے کہ ہم بہت دور دور کے ستارے دیکھ سکتے ہیں۔ غیر منتشر سے مراد یہ ہے کہ روشنی جو مختلف رنگوں پر مشتمل ہے ایتھر میں سے گزرنے کی وجہ سے علیحدہ علیحدہ رنگوں میں بکھر نہیں جاتی کیونکہ ایتھر میں روشنی کے تمام رنگ ایک ہی رفتار کے ساتھ چلتے ہیں اور اس لئے کبھی منتشر نہیں

ہونے پاتے۔ روشنی صرف اسی وقت بکھرتی ہے جب یہ کسی مادی شفاف
جسم میں سے گزرے۔

(۲) ایتھر ایک مسلسل واسطہ ہے۔ یعنی وہ ذرات یا جواہرات
کا مجموعہ نہیں ہے۔ یہ خاصیت بھی مادے میں نہیں پائی جاتی۔ تمام
مادی چیزیں ذرات یا جواہرات کا مجموعہ ہیں۔ جب کبھی کوئی جسم
مادی واسطہ میں سے گذرتا ہے تو مادے کے ذرات اس جسم کے
ساتھ ٹکرا ٹکرا کر اس کی توانائی چھینتے رہتے ہیں برخلاف اس کے
ایتھر میں سے جب کوئی جسم گزرتا ہے تو اس کی توانائی پر کوئی اثر
نہیں پڑتا۔ اور نہ اس کی رفتار میں کسی قسم کا فرق آتا ہے۔ چونکہ
ایتھر ذرات کا بنا ہوا نہیں ہے اس لئے اس میں آواز کا پیدا ہونا
بھی ایک ناممکن امر ہے۔ اگر ایتھر بھی ہوا کی طرح غیر مسلسل ہوتا تو
اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا کہ سورج یا دیگر ستاروں وغیرہ کے بھڑکتے
ہوئے مہیب شعلوں سے جو ہنگامہ خیز شور پیدا ہوتا وہ ہمارے
کانوں کو اس قدر متاثر کرتا کہ ہم ہر وقت مخبوط الحواس ہی رہتے۔

(۳) ایتھر میں لزوجت مطلق نہیں۔ یعنی یہ کہ جب کوئی
جسم اس میں سے گزرتا ہے تو وہ اس جسم کی حرکت کو قطعاً نہیں
روکتا۔ خود ایتھر میں بھی حرارت یا روشنی پیدا نہیں ہوتی۔ سورج
چاند ستارے سب ایتھر میں ایک عرصہ دراز سے گھوم رہے ہیں،
لیکن ان کی رفتار میں کوئی فرق نہیں آیا۔ یہ بھی ایک غیر مادی
خاصیت ہے۔ اس لئے کہ اگر کوئی جسم مادہ میں حرکت کرے تو
مادہ مزاحمت پیش کرتا ہے اور جسم کی حرکت گھٹتے گھٹتے بالآخر
وہ ساکن ہو جاتا ہے۔

(۴) جب کسی جسم کو برقایا جاتا ہے یعنی اس پر برق لادی
جاتی ہے تو اس کے اردگرد کا ایتھر ایک نئی حالت اختیار کر لیتا ہے
اس میں ایک قسم کا بگاڑ یا تبدیلی پیدا ہو جاتی ہے۔ اور اس
برقی اثر کے میدان میں جو مظاہر پیدا ہوتے ہیں وہ ایتھر ہی کی
بگڑی ہوئی حالت کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ اور یہی آس پاس کا ایتھر
تمام برقی توانائی کا گھر ہوتا ہے۔ اسی طرح مقناطیس بھی اپنے
اطراف کے ایتھر کی حالت میں ایک طرح کا بگاڑ پیدا کرتا ہے اور وہ
تمام مقناطیسی مظاہر جو ایک مقناطیس نمایاں کر سکتا ہے وہ بھی
ایتھر کی بگڑی ہوئی حالت کی وجہ سے ہوتے ہیں۔ اور جملہ مقناطیسی
توانائی بھی ایتھر ہی میں مجتمع رہتی ہے۔

(۵) اگر پانی میں ایک پتھر پھینکا جائے تو جس جگہ یہ پتھر گرتا ہے
وہاں پانی کی سطح پر ایک قسم کا ہیجان پیدا ہوتا ہے اور اسی جگہ سے
موجیں پیدا ہو کر ہر طرف پھیلنی شروع ہو جاتی ہیں۔

ایتھر کی حرکت کی وجہ سے اس میں جو توانائی تھی وہ اب
موجوں کی شکل میں پانی کی سطح پر نمودار ہو گئی ہے۔ اسی طرح
جب کسی برقی مشین کے ذریعہ سے برقی شرارہ پیدا کیا جاتا ہے
تو یہ شرارہ ایتھر میں ایک قسم کا ہیجان پیدا کرتا ہے اس ہیجان
سے ایتھر میں موجیں پیدا ہوتی ہیں جو روشنی کی رفتار سے یعنی
(۱۸۶۰۰۰) میل فی ثانیہ سے ایتھر میں ہر طرف پھیلتی جاتی
ہیں۔ ان موجوں کی توانائی شرارے کے پیدا کرنے سے ایتھر
میں موجود ہو جاتی ہے اور یہ مقناطیسی توانائی برقی توانائی کا
مجموعہ ہوتی ہے جسے ہم برقی مقناطیسی توانائی کہتے ہیں اشعاعی
حرارت روشنی لاشعاعیں لاسلکی موجیں اور توانائی کی دیگر
قسمیں سب کی سب برقی مقناطیسی توانائی ہی کی مختلف شکلیں
ہیں یہاں یہ بتا دینا ضروری ہے کہ ایتھر نہ تو برقی مقناطیسی
توانائی پیدا کرتا ہے اور نہ اسے جذب کرتا ہے۔ بلکہ یہ صرف
اس کی اشاعت کرتا رہتا ہے۔ توانائی پیدا یا جذب کرنا مادے
کا کام ہے۔ چنانچہ انتہائی چھوٹے مادی ذرات جنھیں ہم جوہر
کہتے ہیں، ایتھر میں ہر وقت برقی مقناطیسی موجیں پیدا کرتے
رہتے ہیں اور یہ موجیں ایتھر میں حیرت انگیز پھرتی سے کبھی

اِس جوہر [illegible] کبھی اس جوہر پر ضرب لگاتی رہتی ہیں۔

(۶) کششِ ثقل اور کیمیائی عمل کی توجیہ بھی ایتھر ہی کی ایک قسم کی بگڑی ہوئی حالت سے ہوتی ہے۔ جوہر کے اندر کی خالی فضا میں جو ایتھر ایک خاص جکڑی ہوئی حالت میں موجود ہوتا ہے غالباً وہی مقیدا ایتھر مختلف حالات میں مختلف کیمیاوی عمل کا بانی ہوتا ہے۔

(۷) ایتھر ایک ہمیشہ قائم رہنے والی شئے ہے۔ اِس کو کبھی زوال نہیں آتا۔ برخلاف اِس کے مادّے میں ہر وقت مستقل تغیر ہوتا رہتا ہے۔ یعنی مادہ اشعاع میں تبدیل ہوتا رہتا ہے۔ اندازہ لگایا گیا ہے کہ آفتاب میں تقریباً ۲۵ لاکھ ٹن مادہ فی منٹ تباہ ہوکر روشنی اور حرارت میں تبدیل ہوتا رہتا ہے۔ کائنات میں کئی ستارے ابھی اپنی پیدایش ہی کے دور میں ہیں۔ کئی شباب پر ہیں یعنی پورے زور اور شان سے چمک رہے ہیں اور کئی بوڑھے ہو چکے ہیں یعنی چمک چمک کر اَب ماند پڑ چکے ہیں۔ مادے کے جواہر کی ساخت برقیوں اور قلیوں پر مشتمل ہے۔ یہ اکٹھے ہو ہو کر ایک عرصۂ دراز کے بعد جواہر بناتے ہیں۔ بعض جواہر میں اُن کی تعداد کم ہوتی ہے اور بعض میں زیادہ جب کسی جوہر میں اُن کی تعداد بہت زیادہ ہو جاتی ہے تو اُس جوہر میں مضبوطی یا استواری باقی نہیں رہنے پاتی اور یہ برقیے اور قلیے ٹوٹ ٹوٹ کر علحدہ ہونے لگتے ہیں اور اسی جوہر کو جو ایک عرصۂ دراز میں تیار ہوتا ہے زوال آنا شروع ہوتا ہے۔ اِس طرح مادی دنیا کے کھیل بن بنکر بگڑتے رہتے ہیں لیکن ایتھر اپنی ہستی ہمیشہ برقرار رکھتا ہے۔

(۸) زندگی کا مظہر یعنی روح کا مادے کے ساتھ تعلق پیدا کرکے مادّے پر کچھ دیر کے لئے حکومت کرنا اور پھر اس سے علحدہ ہو جانا ایک ایسا راز ہے جو اَب تک افشا نہیں ہوا۔ کہتے ہیں کہ اس کی توجیہ بھی شاید اسی بنیادی شئے یعنی ایتھر ہی کی کسی نہ کسی خاصیت سے ہو سکے گی۔ اِن مسائل کو سرِدست محض خیال آرائیوں کی حد تک ہی رکھنا مناسب ہے۔

ایتھر کی موجودگی کا علم ہمیں چند ہی صدیوں سے ہوا ہے لیکن کہتے ہیں کہ ہندوستان کے برہمن بہت پہلے ہی اِس راز سے آشنا تھے۔ چنانچہ ذکر کیا جاتا ہے کہ ایک دفعہ اپولینوس نے برہمنوں سے دریافت کیا کہ کائنات کی تکوین کن کن چیزوں سے ہوئی ہے۔ برہمنوں نے جواب دیا "پانچ عناصر سے"۔

اِس جواب سے اپولینوس سخت متحیر ہوا کیونکہ مشہور یونانی حکیم انباذقلس کے زمانے سے یہ سمجھا جاتا تھا کہ تمام مادی اشیا کی ساخت محض چار عناصر یعنی مٹی، پانی، ہوا اور آگ ہی سے ہوئی ہے اپنی حیرت کو دُور کرنے کے لئے اُس نے پھر یہ سوال کیا کہ "پانچواں عنصر کس طرح ممکن ہو سکتا ہے"۔

برہمنوں نے جواب دیا کہ "یہ ایتھر ہے" اور مزید وضاحت کی خاطر یہ کہا "اس کو ہمیں ایسا عنصر فرض کرنا چاہیئے کہ جس سے دیوتا بنائے گئے ہیں کیونکہ جس طرح فانی جانور ہوا سے سانس لیتے ہیں اُسی طرح غیر فانی اور مادی ہستیاں ایتھر سے سانس لیتی ہیں۔

حاجی غلام محمد

مسٹر میر حسن ایم اے
ٹاکس سپرنٹنڈنٹ

مسٹر محمد عبد الرؤف
میورک سپرنٹنڈنٹ

ریڈیو اور نشریات

برقی مقناطیسی لہروں کے وجود کو سب سے پہلے جیمس کلارک میکسول نے ۱۸۶۴ء میں ثابت کیا۔ ان لہروں کے دریافت کرنے میں اُسے کامیابی نہیں ہوئی لیکن اس کی یہ ناکامی کامیابی کی ابتدائی منزل تھی، کیونکہ اسی کے تجربوں پر دوسرے سائنس دانوں نے اپنی تلاش اور تحقیقات کی بنیادیں قائم کیں۔

اس کے بعد لاسلکی کے بارے میں تحقیقات بہتیرے تجربہ خانوں میں بڑے زور شور سے شروع ہوئیں۔ اور ۱۸۸۶ء میں ڈائسر نے پہلا لاسلکی ٹیلیفون تیار کیا۔

سر لیورلاج اور مارکونی نے برقی مقناطیسی موجوں سے پیام رسانی کا کام لینے کے مسئلہ پر قابلِ قدر تحقیقات کیں۔ گیارہ سال بعد مارکونی کو لاسلکی پیام ۳۴ میل تک بھیجنے میں کامیابی ہوئی۔ اس سے پہلے لوس اپنا پیام صرف دس میل تک بھیج سکا تھا۔ اس کامیابی نے مارکونی کے حوصلے بڑھا دئے۔ اور اُس نے لاسلکی ٹیلیگراف کی ایک کمپنی قائم کر دی۔ لاسلکی پیام رسانی کا طریقہ ۱۸۹۹ء میں جنوبی آفریقہ کی جنگ میں پہلی دفعہ استعمال کیا گیا۔ بیسویں صدی کے آغاز کے ساتھ ہی ریڈیو کی ترقی کی رفتار یکایک تیز ہو گئی۔ ۱۹۰۱ء میں مارکونی نے (۱۹۶) میل تک لاسلکی پیامات بھیجے۔ ۱۹۰۲ء میں پہلا ڈاکا ایک پیام نیوفاؤنڈلینڈ میں اچھی طرح سنا گیا۔ اس کے ایک سال بعد پریزیڈنٹ روزولٹ صدر جمہوریہ امریکہ نے کیپ ٹاؤن سے شہنشاہ ایڈورڈ ہفتم کے نام مبارکباد کا پیام روانہ کیا۔

THERMIONIC VALVE. کی دریافت نے لاسلکی کی نشری صلاحیتوں کو بہت وسیع کر دیا۔ چنانچہ اسی کی بدولت لاسلکی تقریر اور موسیقی کی نشر ممکن ہو سکی۔ اور ساتھ ہی ۱۹۲۳ء سے لاسلکی نشریات کا دور شروع ہوا۔

انگلستان میں پہلی نشرگاہ چیمسفرڈ میں کھولی گئی۔ ۲۳/ فروری ۱۹۲۰ء کو لاسلکی کی تاریخ میں بڑی اہمیت حاصل ہے۔ یہی وہ مبارک دن تھا جب کہ روزانہ آدھا گھنٹہ موسیقی کی نشر کا آغاز ہوا۔

چیمسفرڈ کی نشرگاہ کے قیام کے تقریباً تین مہینے بعد مئی ۱۹۲۰ء میں ایک طاقتور نشرگاہ ہیگ میں قائم ہوئی۔ اس ولندیزی نشرگاہ کے قیام کے چھ ماہ بعد بہ مقام پٹس برگ پہلی امریکی نشرگاہ تعمیر ہوئی

بی۔ بی۔ سی یعنی برٹش براڈکاسٹنگ کارپوریشن ۳۱/ ڈسمبر ۱۹۲۶ء میں قائم ہوئی۔ ۱۹/ ڈسمبر ۱۹۳۵ء سے اس کی مملکتی نشریات شروع ہوئیں۔

پچھلے چند سال میں لاسلکی نشرگاہیں دنیا کے تمام مشرقی اور مغربی متمدن ممالک میں خاصی تعداد میں قائم ہوئیں اور اُن کی ترقی کی رفتار بھی بہت تیز رہی۔

بی۔بی۔سی | انگلستان کے محکمۂ نشریات کو بی، بی، سی (برٹش براڈکاسٹنگ کارپوریشن) کہتے ہیں۔ بی، بی، سی نہ تو سرکاری محکمہ ہے اور نہ تجارتی کمپنی۔ یہ ایک پبلک شخصیہ (کارپوریشن) ہے جس کا قیام ایک سرکاری فرمان کے ذریعے عمل میں آیا۔ اور جس کا مقصد منافع حاصل کرنا نہیں ہے۔ نشرگاہوں کو جاری رکھنے کے لئے بی، بی، سی کو قانونی اختیارات ایک معاہدہ کی رُو سے حاصل ہیں جو پوسٹ ماسٹر جنرل اور بی، بی، سی کے درمیان طے پایا ہے اور جس میں بعض ایسی شرائط بھی شریک ہیں کہ نشری سرویس کس نوعیت کی ہونی چاہیے۔

بی، بی، سی سے پہلا پروگرام ۲۳/ فروری ۱۹۲۰ء کو مارکونی کمپنی نے نشر کیا۔ ۱۹۲۲ء تک متعدد فرموں نے اپنے طور پر علحدہ علحدہ نشرگاہیں قائم کرنے کے لئے پوسٹ ماسٹر جنرل کے پاس درخواستیں بھیجیں۔ ان فرموں کو ترغیب دی گئی کہ وہ سب مل کر

برٹش براڈکاسٹنگ کمپنی کے نام سے ایک مشترک اِدارہ قائم کرلیں۔ اِس ادارے نے اپنی نشرگاہ واقع اسٹرونڈ (لندن) قائم کی۔ اور پہلی روزانہ نشریات ۱۴/ نومبر سے شروع کی سنہ ۱۹۲۲ء کے اواخر تک ملک میں اجازت یافتہ سننے والوں کی تعداد (۳۵۷۷۴) تک پہنچ گئی۔

پچھلے سال برطانیہ عظمیٰ اور شمالی آئرستان میں لاسلکی اجازت ناموں کی تعداد (۹۰۰۰۰۰۰) نوے لاکھ تک پہنچ گئی۔ جس کے لحاظ سے سننے والوں کی تعداد کا اندازہ (۳۲۰۰۰۰۰۰) تین کروڑ بیس لاکھ تک کیا گیا ہے۔

پچھلے سال بی' بی' سی کی مجموعی سالانہ آمدنی ۳۵ لاکھ اور ۴۰ لاکھ پاؤنڈ کے درمیان تھی۔

پچھلے سال بی' بی' سی کے پاس کل ۲۵ ترسیلی آلے تھے' جن میں سے چھ شارٹ ویو ہیں اور دو ٹیلیویژن کے۔

سنہ ۱۹۳۶ء میں کل برطانوی نشرگاہوں کی مجموعی نشریات کا دَوران (۱۱۵۰۵۰) گھنٹے رہا۔ ملک کے مختلف حصوں میں جملہ (۹۱) اِسٹوڈیوز تھے اور عملہ کی تعداد چار ہزار سے کچھ زیادہ تھی جن میں تقریباً (۸۰۰) آدمی براڈکاسٹنگ ہاؤز لندن میں کام کرتے تھے اِس سال اُس تعداد میں اور اِضافہ ہوگیا شعبہ ریکارڈز میں (۶۰۰۰۰) ساٹھ ہزار سے زیادہ ریکارڈز ہیں براڈکاسٹنگ ہوز پر روزانہ تقریباً (۴۳۰۰) ٹیلیفون آتے ہیں یا دئے جاتے ہیں۔

ریڈیو کا اِستعمال اور اس کے فائدے

لاسلکی ایک نہایت مفید اور کارآمد اِیجاد ہے اِس سے پیام رَسانی کے علاوہ تعلیم اور تفریح کا کام بھی لیا جاسکتا ہے اور لیا جا رہا ہے سمندری جہازوں' ہوائی جہازوں' ریلوں' موٹروں اور دوسری قسم کی سواریوں میں بھی موصولی اور ترسیلی آلے لگائے جاتے ہیں جن سے تفریحی اور معلوماتی ہر قسم کے مقاصد حاصل ہوتے ہیں۔ اِس انتظام کی وجہ سے کئی جہاز تباہی سے بچ گئے اور لاسلکی کے تفریحی پہلو نے سفر کی دلچسپیوں میں اضافہ کردیا ہے۔ پولیس کو بروقت اطلاع کے ذریعہ جرائم کی روک تھام بھی بڑی حد تک ریڈیو کی بدولت ممکن ہوگئی ہے۔

جنگ کے زمانہ میں ریڈیو کی مانگ اور اس کی اِفادیت اور قوت بڑھ جاتی ہے۔ پچھلی جنگِ عظیم میں تو ریڈیو سے فوجی پیام رسانی سے آگے کوئی کام نہیں لیا جاسکا۔ لیکن موجودہ جنگ میں فریقین اِس ایجاد سے پُورا پُورا فائدہ اُٹھارہے ہیں۔ غیر جانب دار ملکوں کو اپنا طرفدار بنانے کے لئے مخالفین اور جرمنی دونوں کی عالمی نشریات بڑے زور شور کے ساتھ جاری ہیں۔

باہر کی زبانوں میں ساری دُنیا کے لئے پروگرام بھیجنا پہلے پہل روس نے شروع کیا۔ فرانس' ہالینڈ' جرمنی' جاپان اور امریکہ نے بہت جلد اس کی پیروی کی۔ موجودہ جنگ کے آغاز سے پہلے اطالیہ کی حکومت نے لاسلکی کو سیاسی اغراض کے تحت اِستعمال کیا۔ باری کی نشرگاہ کے عربی پروگرام کا مقصد مشرق قریب میں بعض ایسے خیالات کی اِشاعت تھی جو اطالیہ کے حق میں مفید ثابت ہوں۔ اِن نشریات نے کچھ ہی عرصہ میں مشرقِ قریب میں ایسی اہمیت حاصل کرلی کہ اِن کا توڑ کرنے کے لئے اِنگلستان کو بھی عربی نشر کے ذریعہ عربوں کو صحیح صحیح واقعات سمجھانے پڑے۔

دنیا میں اَمن قائم رکھنے میں لاسلکی سے جو کام لیا جاسکتا ہے وہ اور کسی اِیجاد سے نہیں لیا جاسکتا۔ آج سے پندرہ سال پہلے بین قومی اور عالمی نقطۂ نظر سے لاسلکی کو اتنی اہمیت حاصل نہیں تھی اس کی وجہ یہ ہے کہ اس وقت لاسلکی کی مصروفیات بہت بڑی

حد تک محدود اور مقامی قسم کی تھیں۔ اَسّی کیلومیٹر سے زیادہ فاصلہ پر آواز نہیں پہنچ سکتی تھی۔ اس کے بعد جلد ہی لاسلکی نے قومی شکل اختیار کر لی۔ اور ہر ملک کی آواز اُس کے تقریباً ہر ہر گوشے میں پہنچنے لگی۔ اور اَب تو انتہائی سرعت کے ساتھ لاسلکی نے بین قومی رسائی حاصل کر لی ہے۔ زیادہ تر شارٹ ویو پر دُنیا کے دوسرے ملکوں کے لئے نشریات اب اکثر نشرگاہوں کے پروگرام کا ایک مستقل جزو بنگئی ہیں اور پھر فنی اور دوسرے اعتبار سے روز افزون ترقی ہی ہوتی جا رہی ہے۔

بین قومی نشر کے اس میدان میں بی، بی، سی بعض دوسری قوموں کی بہ نسبت دیر میں داخل ہوئی۔ غیر زبان میں بی، بی، سی سے پہلی سروس آج سے دو سال پہلے شروع ہوئی اور اس وقت ایسی آٹھ سرویسیں قائم ہیں۔

یہ ایک واقعہ ہے کہ قوموں کی دشمنی جو بالآخر جنگ کا باعث ہوتی ہے غلط فہمیوں اور ایک دوسرے کے خیالات اور جذبات سے ناواقفیت پر مبنی ہوتی ہے۔ تاریخ میں اس کی کئی مثالیں ملیں گی، اور پچھلی بڑی جنگ کے اسباب یہی تھے۔ اور موجودہ جنگ کے اصل اسباب بھی یہی ہیں کیونکہ دنیا کی کوئی قوم لڑنا نہیں چاہتی تھی۔ اِس کے باوجود جنگ شروع ہو کر رہی۔ اگر لاسلکی کے ذریعے تمام قوموں کو ایک دوسرے کے سمجھنے کا موقع دیا جائے اور نشریات کے بین قومی تبادلے کے لئے ایک عالمی ہم آہنگی کی داغ بیل ڈالی جائے تو آئندہ جنگ کے اِمکانات کم سے کم ہو جائیں گے۔ اس سلسلے میں بین قومی انجمن لاسلکی کے کارناموں کا تذکرہ ضروری ہے۔ اِس انجمن کا حال مختصر الفاظ میں مسٹر آرتھر اریروز کے الفاظ میں سُنیے جو اس کے معتمد ہیں۔

بین قومی انجمن لاسلکی | موجودہ صدی کے اوائل میں رسل و رسائل کے نئے ذریعوں اور سائنس کی حیرت انگیز ترقیوں نے وقت اور فاصلہ کے بارے میں اِنسانی تخیل میں انقلاب پیدا کر دیا ہے۔ جوں جوں اُن وسائل کا اِستعمال وسیع ہو رہا ہے دُنیا سکڑتی جا رہی ہے۔ سائنس کے یہ جدید وسائل اگر اُنھیں جائز طور پر اِستعمال میں لایا جائے تو دُنیا کی قوموں کے باہمی تعلقات کو بہتر بنانے اور ایک عالمی مفاہمت پیدا کرنے میں بہت مفید ثابت ہو سکتے ہیں۔ اِن جدید ترقیوں کی وجہ سے جو مسائل پیدا ہو گئے ہیں ضرورت ہے کہ اُن کی جانچ ایک بین قومی اور عالمی اساس پر کیجائے۔

ظاہر ہے کہ اگر ہوائی جہازوں کے اُترنے کے مقامات پرواز کی بلندی اور راستوں وغیرہ کے بارے میں بین قومی معاہدے نہ کر لئے جاتے تو دنیا میں سیول ہوابازی اس قدر ترقی نہ کر سکتی۔

نشریات کے مسئلہ میں بھی بین قومی سمجھوتہ ضروری ہے۔ ایک لحاظ سے تو اس کی ضرورت سیول ہوابازی کی بہ نسبت زیادہ ہے۔ جب تک کسی نشرگاہ کے طول موج کے بارے میں کوئی بین قومی تصفیہ نہ کر لیا جائے اُس کی نشریات کامیابی کے ساتھ دوسرے ممالک میں تو ایک طرف خود اپنے ملک میں بھی اچھی طرح سُنی نہیں جا سکتیں۔ اس کی وجہ یہ ہے نشرگاہیں چاہے جغرافی اعتبار سے ان کا مابین فاصلہ کتنا ہی کیوں نہ ہو ایک دوسرے کے پروگراموں میں دراندازی کر سکتی ہیں۔ اگر جن طول موج پر وہ چلائی جا رہی ہیں اُن کا اِنتخاب حکمیاتی طور پر اور بین قومی تصفیہ کے مطابق نہ کیا گیا ہو اور اس پر سختی سے عمل نہ ہو رہا ہو۔

اِس بین قومی اتحاد اور مفاہمت کی ضرورت کو محسوس کر کے یورپی ارباب نشر نے بین قومی انجمن لاسلکی ۱۹۲۵ء میں قائم کی۔ اُس زمانہ میں جو نشرگاہیں قائم تھیں اُن کے پروگرام بیرونی ممالک کی آوازوں میں بُری طرح ضم ہوئے جاتے تھے

جو اگرچہ بڑی نیک دلی کے ساتھ اُسی طول پر پروگرام نشر کر رہے تھے جس کا بین قومی طور پر تصفیہ ہوچکا تھا، لیکن اُس کا تعین عملیاتی طور پر عمل میں نہیں آیا تھا۔ بیئور رامبر کی تحریک پر سویٹزرلینڈ میں اِس اَمر کی کوشش شروع ہوچکی ہے کہ نہ صرف اَربابِ نشریات کو بلکہ سننے والوں کے نمائندوں اور سارے نشریات سے دلچسپی رکھنے والوں کو ایک بین قومی جلسے میں بلایا جائے۔ یہ تحریک ناقابلِ عمل سمجھی گئی اور اس سے متوقع مقاصد کے حاصل ہونے کے اِمکانات بھی کم نظر آئے۔ اس لئے ۱۹۲۵ء میں جب کہ باہمی نشریاتی دراندازیوں کی وجہ سے حالات بد سے بدتر ہوتے جارہے تھے، بی بی سی کے سابق جنرل منیجر سر جان رایت نے لندن میں اہلِ نشر کی ایک تحقیقاتی کانفرنس بلائی۔ بین قومی چارۂ کار کی فوری ضرورت کا احساس اس شدت کے ساتھ ہوا کہ تیسری اپریل کو جنیوا میں ایک افتتاحی جلسہ مقرر کیا گیا۔ اور یکم مئی ۱۹۲۵ء میں بمقام جنیوا ایک صدر دفتر کا قیام عمل میں آیا۔

انجینیروں کی پہلی بین قومی کانفرنس

لاسلکی انجینیروں کی پہلی یورپی کانفرنس جنیوا میں ۱۹۲۵ء بلائی گئی تھی۔ اس کانفرنس کے اجلاس کے بعد جاری اسٹیشنوں کی فہرست مرتب کرنے اور اُن کی دقتوں کی جانچ کی غرض سے برسلز اور جنیوا میں باضابطہ تحقیقی کام شروع ہوا۔ اس گوشوارہ کی اساس پر یورپی نشریات کی فوری ضروریات کا حکمیاتی طور پر مطالعہ کیا گیا اور ۱۹۲۶ء میں انجمن کے ارکین نے طول موج کی وہ تجویز جو تجویز جنیوا کے نام سے مشہور رہی ہے، اپنی حکومتوں کے آگے اِنفرادی توثیق کے لئے پیش کی۔ اس تجویز کی وجہ سے یورپی نشریات میں مکمل طور پر تو نہیں لیکن وسیع پیمانہ پر ترقی ہوئی۔ ۱۹۲۸ء میں اس انجمن کے فنی شعبے نے ایک "موج پیما" تجویز کیا تاکہ ارکین کو اپنی نشریات کی خوبی کو قائم رکھنے میں مدد ملے۔ یہ موج پیما برسلز میں تیار ہوئے نشرگاہوں کی تعداد اور قوت کی روز افزونی کی وجہ سے دو سال بعد ایک نئی اسکیم کی ضرورت ہوئی۔ یہ اسکیم برسلز میں تشکیل پائی اور "تجویز برسلز" کہلاتی ہے لیکن ابھی پوری طرح اس کی تکمیل بھی نہ ہونے پائی تھی کہ یورپی حکومتوں نے بین قومی لاسلکی سے خواہش کی کہ غیر سرکاری تجویز سے ہٹ کر ایک سرکاری تجویز کے لئے کوئی اساس تیار کی جائے۔ تجویز برسلز پراگ میں ڈاک اور تار برقی کے یورپی اربابِ اقتدار کی ایک کانفرنس میں خفیف سی ترمیمات کے بعد "تجویز پراگ" بن گئی، جو پہلی سرکاری موجی تجویز ہے۔ تجویز پراگ بھی اس سے پہلے کی غیر سرکاری تجویزوں کی طرح نظرِ ثانی کی محتاج تھی۔ چنانچہ چار سال کے اندر ہی ۱۹۳۳ء میں "تجویز لیوکرین" نے اس کی جگہ لے لی۔ آج یورپ میں "طول موج" کی صورتِ حال پر اسی تجویز کی عملداری ہے۔ لیوکرین پلان پر اب مونٹریو (سویٹزرلینڈ) میں دوبارہ نظرِ ثانی کی جارہی ہے اور چند ماہ کے اندر ایک نئی موجی تجویز نافذ ہوجائے گی۔

۱۹۲۹ء کی پراگ کانفرنس میں بین قومی انجمن لاسلکی کو یورپی منطقہ میں سارے یورپی اربابِ نشر کے لئے بین قومی نشریات کے فنی مسائل کے بارے میں مشیر نامزد کیا گیا۔ بلجیم کی حکومت کے وسیلہ سے اس تجویز کی نگرانی کے لئے بھی بین قومی انجمن لاسلکی کو مدعو کیا گیا۔ اس وقت سے برسلز میں ایک عملہ جو نشریاتی (Frequency measurement) کی پیمائش اور پروگرام کی ساخت کا ماہر ہے سارے یورپ کی لاسلکی صورتِ حال پر شبانہ کان لگائے رہتا ہے۔ ہم کہہ چکے ہیں کہ یورپی طول موج کا مسئلہ اولین اور خاص اہمیت رکھتا ہے۔ اسے اب بھی اتنی ہی اہمیت ہے اور باقی رہے گی۔ اس وقت تک جب تک کہ یورپی نشرگاہوں کی تعداد اور دائرہ نشر بڑھتا جائے گا۔ اب چند اعداد و شمار سنئے جن سے معلوم ہوتا ہے کہ صورتِ حال کس قدر ترقی پر ہے اور رہے گی۔

یوروپی منطقہ	سال	نشرگاہوں کی تعداد	مجموعی قوت
	۱۹۲۶ء	۱۷۰	۲۷۰ کیلوواٹ
	۱۹۳۰ء	۲۴۰	۱۸۱۵ "
	۱۹۳۴ء	۲۵۵	۱۹۳۴ "
	۱۹۳۸ء	۳۹۰	۱۸۰۰ "

حال میں متعدد ممالک نے اپنی نشریاتی سرحدوں کی توسیع کے ارادے ظاہر کئے ہیں دوسرے فنی مسائل بھی بین قومی انجمن لاسلکی کے زیرِ غور رہے ہیں۔ دوسرا اہم مسئلہ موسیقی کے بین قومی ریلے کے انتظامات سے متعلق تھا۔ اس خصوص میں بین قومی انجمن لاسلکی کی سفارشات اس قدر مفید ثابت ہوئیں کہ چار سال کے اندر اندر یہ کام مختلف یورپی مراکز میں کامیابی کے ساتھ شروع ہوگیا۔

برقی دراندازیوں کی ماہیت کی دریافت، صدابندی کے مختلف مسائل اور بین قومی (Relays) کی مزید توسیع کے بارے میں بھی انجمن لاسلکی کے

فنی شعبہ اور دوسری سرکاری اور غیر سرکاری بین قومی جماعتوں میں اشتراک عمل شروع ہوگیا ہے۔

اس وقت تک بین قومی انجمن لاسلکی کی فنی مصروفیات کا ذکر تھا لیکن اس انجمن کی مصروفیات یہیں تک محدود نہیں رہیں۔

غیر فنی مسائل | ۱۹۲۵ء میں بین قومی انجمن لاسلکی کے ابتدائی جلسوں ہی میں یہ صاف ظاہر ہوگیا کہ اگر لاسلکی نشر کو دنیا کی زیادہ سے زیادہ آبادی کے لئے مفید بنانا ہو تو دوسرے بہت سے ایسے سوالات ہیں جن کی بین قومی نقطۂ نظر سے جانچ ضروری ہے۔ یہ مسائل انتظامی، حسن کارانہ اور قانونی ہیں۔ اولین ضروریات میں سے ایک ضرورت یہ تھی کہ لاسلکی کو کسی ایسے طریقہ پر استعمال نہ کیا جائے جس سے دنیا کے دوسرے ممالک میں ناخوش گوار جذبات پیدا ہونے کا اندیشہ ہو۔ دوسری ضرورت یہ تھی کہ ایسے طریقے معلوم کئے جائیں جن سے لاسلکی نشر دوسری قوموں کے تمدنی مفادات اور زندگی کے مسائل کو منظر عام پر لا سکے۔ ثانی الذکر تحقیقات جاری ہیں کیونکہ سارے اداروں کے اراکین پوری طرح محسوس کرتے ہیں کہ نشر یاتی وسیلۂ اظہار خیال کے نتائج کس قدر زبردست اور دوررس ہوسکتے ہیں۔ انجمن نے وقتاً فوقتاً "قومی راتیں" یوروپی سنگیت (Concerts) اور عالمی سنگیت قائم کئے اور "نئے سال" کے مظاہروں اور نوخیزوں کے گانوں کی عالمی نشر کے انتظامات کئے۔ اس کی بدولت "تقاریب موسیقی" بین قومی اسپورٹز کے اہم مقابلوں اور غیر سیاسی تقریروں کے ریلینر میں اضافہ ہوا۔ اس کی کامیابی کا ثبوت ان اعداد سے ملتا ہے جن سے پچھلے چند سال میں بین قومی انجمن لاسلکی کے اراکین کے نشر کردہ بین قومی ریلینر کی تعداد میں اضافہ ظاہر ہوتا ہے۔ ۱۹۳۰ء میں ریلینر کی تعداد (۴۴۷) تھی ۱۹۳۶ء میں (۱۵۸۱) ہوئی اور ۱۹۳۸ء میں (۲۰۳۷) تک پہونچ گئی۔ بین قومی انجمن لاسلکی نے اپنے آپ کو بین قومی نشر کے سیاسی پہلوؤں سے بے تعلق رکھا کیونکہ اس کے نزدیک ان مسائل کا حل حکومتوں ہی کے دائرۂ اختیار میں ہے۔

ماہرین ریڈیو کی کانفرنس | بین قومی انجمن لاسلکی کی حسن کارانہ مصروفیات میں ایک تازہ اضافہ لاسلکی مصروفیات کے خاص شعبوں کے ماہرین کی کانفرنسیں طلب کرنا ہے۔ اس قسم کی اولین کانفرنس جو جولائی ۱۹۳۶ء میں اوچی لاسین میں منعقد ہوئی "ماہرین تقاریر" کی کانفرنس تھی۔ اس اجلاس میں پہلی دفعہ مختلف ممالک کے انہی مسائل سے متعلقہ ارباب سے گفت و شنید ہوئی بحثیں تین روز تک جاری رہیں جس کے بعد پتہ چلا کہ کس نوعیت کے مسائل مشترک قسم کے ہیں اور اس کے برخلاف کس طرح بعض مسائل انفرادی قوموں یا قوموں کی جماعتوں کے لئے خصوصی اہمیت رکھتے ہیں جن کا تصفیہ بین قومی بحثوں کے ذریعہ نہیں ہوسکتا۔ ۱۹۳۸ء میں بمقام برسلز یوروپی لاسلکی کے خارجی تعلقاتی (Liaison) عہدہ داروں کا ایک جلسہ ہوا، جس کا مقصد ہر یوروپی ملک کے پروگرام کے ایسے مواد کی جانچ تھی جو قریبی مستقبل میں بین قومی استعمال کے لئے موزوں اور قابل حصول ہو۔ یہ جلسے آئندہ ہر سال دو دفعہ ہوا کریں گے۔ اس سال گرما میں سینٹ مارٹز میں ریڈیو ڈراموں کو پیش کرنے والے ماہرین کی بھی ایک بین قومی کانفرنس منعقد ہوئی۔

لاسلکی ہندوستان میں | ہندوستان میں پہلی نشر گاہ ۱۹۲۳ء میں یعنے آج سے سترہ سال پہلے بمبئی میں قائم ہوئی اُس کے ایک سال بعد کلکتہ میں ایک اور نشر گاہ تعمیر ہوئی۔ اِن دونوں نشر گاہوں کا تعلق خانگی کمپنیوں سے تھا۔

۱۹۲۹ء میں یعنی آج سے دس سال پہلے برطانوی ہند کی حکومت نے نشر گاہوں کو اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ دلی کی نشر گاہ ۱۹۳۵ء میں قائم ہوئی۔ اس کے بعد آل انڈیا ریڈیو کے نام سے ایک نیا محکمہ قائم کیا گیا جس کے تحت لاہور، پشاور، مدراس، ڈھاکہ ترچناپلی میں مزید نشر گاہیں کھولی گئیں۔ سوال بند اجراء کے پروگرام کی ترتیب میں مشورہ لیا گیا۔ ساتھ ہی ایک مجلس اس غرض سے بنائی گئی کہ برطانوی ہند کے مختلف حصوں کا دورہ کر کے اُن کی نشری ضرورتوں کے بارے میں

اپنی سفارشات پیش کرے۔ مختلف نشرگاہوں کے ڈائرکٹروں کی ایک کانفرنس اِس غرض سے منعقد کی گئی کہ ریڈیو پر گانے بجانے والوں کے لئے منطقے مقرر کئے جائیں۔ تاکہ ایسا ہونے پائے کہ ایک ہی آرٹسٹ آج لکھنو سے گائے تو کل دِلّی سے اور پرسوں بمبئی سے۔ کیونکہ اِس سے سننے والوں کی دلچسپی متاثر ہوتی تھی۔ اور گانے بجانے والوں کا بہتیرا وقت سفر میں صرف ہوتا تھا۔ ڈائرکٹروں نے مِل کر منطقے مقرر کردئے جس سے اُس میں کوئی شبہ نہیں کہ آل انڈیا ریڈیو کے گانے کے پروگرام زیادہ دلچسپ ہوگئے۔

آل اِنڈیا ریڈیو کے ارباب نے اِس کے علاوہ اِس امر کا اِنتظام بھی کیا ہے کہ مختلف نشرگاہوں کے خاص خاص قسم کے پروگراموں کا وقت نہ لڑ جائے۔ مثلاً دِلّی سے ہندوستانی میں خبریں اور تقریریں جس وقت نشر ہوں لکھنو، بمبئی اور دوسری نشرگاہوں سے ہندوستانی میں خبروں اور تقریروں کی نشر کا وقت اِس سے مختلف رہے۔ اِس سے بھی سننے والوں کی دلچسپی کا دائرہ وسیع ہوگیا۔

خبروں کی حد تک جنگ کی ابتداء سے یہ اِنتظام ہوگیا ہے کہ سارے آل اِنڈیا اسٹیشنوں کے لئے دِلّی سے خبریں بہ یک وقت نشر کی جاتی ہیں۔

برطانوی ہند کی طرح حیدرآباد میں بھی لاسلکی نشر کا آغاز خانگی طور پر ہوا۔ حیدرآباد میں خانگی تجرباتی نشرگاہ ۱۹۳۳ء میں یعنی آج سے سات سال پہلے قائم ہوئی۔ آزمائشی مقامی نشریات کے بعد یکم فروردی ۱۳۴۴ف کو بہ اِتباع فرمانِ خسروی محکمہ لاسلکی سرکارِ عالی کا قیام عمل میں آیا۔

ابتداً محکمۂ لاسلکی اُمورِ عامہ کے تحت تھا بعد کو حسبِ فرمان خسروی مشرشدہ ۱۶/جمادی الثانی ۱۳۵۵ھ محکمۂ اُمورِ دستوری کے تحت کردیا گیا۔ لیکن لاسلکی بورڈ اور نواب عقیل جنگ بہادر صدرالمہام اَفواج سے اِس کا تعلق باقی رکھا گیا۔

ابتداً نشرگاہ حیدرآباد کی قوت ½ کلو واٹ تھی جو خود حیدرآباد کی ضروریات کے لئے بھی ناکافی تھی۔ اِس لئے ایک جدید طاقتور نشرگاہ کی تعمیر کی تجویز منظور ہوئی۔ اور سرورنگر میں ایک مقام منتخب ہوا جہاں تعمیر خورداد ۱۳۴۵ف سے شروع ہو کر تیر ۱۳۴۶ف کو ختم ہوئی۔

ساتھ ہی ساتھ یہ بھی طے پاگیا کہ ریاست فرخندہ بنیاد کے اضلاع کی آبادی کے لئے اورنگ آباد، ورنگل اور گلبرگہ میں تین علاقہ واری نشرگاہیں مقامی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے کھولی جائیں گی۔ چنانچہ اِس سلسلہ میں اورنگ آباد میں نشرگاہ کی تعمیر کا کام اردی بہشت ۱۳۴۶ف سے شروع ہوگیا۔

اِس کے ایک سال بعد یعنی ۱۳۴۷ف میں محکمہ معتمدی اُمورِ دستوری نے ریاست میں لاسلکی کی ہمہ جہتی ترقی کے لئے ایک وسیع اور مفید اسکیم تیار کی۔ جس کی جانچ پڑتال سرکارِ عالی کی جانب سے قائم شدہ وائرلس کمیٹی نے کی اور چند ترمیموں کے ساتھ اُسے منظور کرلیا۔ اِس کے بعد یہ تجویز وائرلس بورڈ کے آگے پیش ہوئی جو اس زمانہ میں ریاست کی ساری لاسلکی مصروفیات پر نگرانی کرتا تھا۔

سرورنگر کی نشرگاہ جدید ترین قسم کی ہے۔ یہ ایک میڈیم ویو اسٹیشن ہے جو ۴۱۱ میٹر پر پروگرام دیتا ہے۔ اِس کی فری کوئینس ۷۳۰ کلو سائیکلز ہے اور ایریل پاور پانچ کلو واٹ ہے۔

ریڈیو نے اپنی مختصر سی عمر میں اپنی وسعت ہمہ گیری اور اِفادیت کی بدولت جو عالمی اہمیت حاصل کرلی ہے اُس کی مثال مشکل سے مِل سکے گی۔ نشری پروگراموں کی اہمیت کا عالمگیر اِحساس روز بروز بڑھتا جارہا ہے اور اُس کے ساتھ ہی نشری پروگرام کی ترتیب تشکیل اور پیش کشی کے طریقوں کو ترقی دینے کی

کوششیں بھی بڑے زور شور سے جاری ہیں۔

نشری پروگرام عام طور پر دو عناصر پر مشتمل ہوتے ہیں۔ ایک موسیقی اور دوسرے غیر موسیقی۔ غیر موسیقی اجزا جن میں تقاریر خبریں۔ فیچر۔ ڈرامے وغیرہ سب شامل ہیں۔

ریڈیو کی ایجاد سے پہلے موسیقی زیادہ امیروں اور صاحب ثروت لوگوں کی تفریح کا ذریعہ تھی لیکن نشریات نے اب اس کو ایک قومی بلکہ بین قومی دولت بنا دیا ہے۔ روزانہ صبح اور شام اُستادی اور عام پسند گانے اور سازی موسیقی اکثر نشرگاہوں سے نشر کی جاتی ہے جن سے لوگ کثیر تعداد میں لطف اُٹھاتے ہیں۔ ریڈیو پر مشرق اور مغرب کی بیشتر نشرگاہوں کے پروگرام سُنے جاتے ہیں اس لئے ایک قوم کی موسیقی دوسری قوم کی موسیقی پر اثر انداز ہو رہی ہے۔ مثال کے طور پر رفیق غزنوی کے بعض گانوں میں آپ کو مصری اور عربی موسیقی کی جھلکیاں نظر آئیں گی۔

ریڈیو کی ایجاد سے پہلے غزلوں ٹھمریوں گیتوں اور خیروں کا انتخاب گانے والوں اور گانے والیوں ہی پر چھوڑ دیا جاتا تھا لیکن آج کل اَرباب نشر گانے والوں کے لئے اَدبی اور اخلاقی اعتبار سے اچھی اچھی چیزوں کا انتخاب کرتے ہیں اور اُن کے سوا دوسری چیزوں کی نشر کی اجازت نہیں دیتے۔

نشریات کے غیر موسیقی عناصر یعنے تقریروں، بحثوں یا فیچروں اور ڈراموں کے ذریعہ تفریح کے ساتھ ساتھ عوام کی تعلیم اور اصلاح کا کام کامیابی کے ساتھ آگے بڑھایا جا سکتا ہے۔ لیکن اِس خصوص میں اَرباب نشر پر بہتری اخلاقی سماجی اور سیاسی ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں۔

نشریات کی سماجی اَخلاقی اور سیاسی ذمہ داریاں

سویڈن کی نشرگاہ نے آج سے تین سال پہلے (The man who lived his life Again) نامی سویڈش ڈرامہ نویس کا نشریہ نشر کیا۔ اِس نشر کا ہیرو عالم تصور میں وہی جرم کرتا ہے جس کا اُس نے کئی سال پہلے اِرتکاب کیا تھا۔ یعنے اپنے معشوق کو ہلاک کر دیتا ہے۔ یہ واقعہ سویڈن کی نشرگاہ کے منتظم تقاریر مسٹر اِم وائی ہیوگولے بیان کیا ہے۔ اور لکھا ہے کہ اِس ڈرامہ کی نشر کے دو روز بعد سویڈن کے ایک علاقہ میں ایک ایسے ہی جرم کی واردات ہوئی۔ اگرچہ دریافت سے یہ امر ثابت ہو گیا کہ جس نوجوان نے زندگی کے اس حزینہ میں پارٹ کیا تھا اُس نے [illegible] کا ڈرامہ نہیں سُنا تھا۔ تاہم یہ غور کرنا ضروری ہے کہ کیا اِس قسم کی نشر ایسے اضطرابی اَفعال کا باعث ہو سکتی ہے؟

اِس واقعہ سے اُن اخلاقی اور سماجی ذمہ داریوں پر روشنی پڑتی ہے جو ہر ملک کے ارباب نشر پر عائد ہوتی ہیں۔ نشریات اپنے ملک اور اس کے باہر کے سُننے والوں کی ذہنی اور جذباتی زندگی اور اُن کے عمل کو متاثر کرتی ہیں۔ ریڈیو پر سُنا ہوا ایک جملہ (چاہے سُننے والے نے اس کا مطلب صحیح سمجھا ہو یا غلط) ایسے اَفراد کے مستقبل کا فیصلہ کر سکتا ہے جو آسانی سے متاثر ہو جاتے ہیں اور ہندوستان کی حد تک سُننے والوں کی زیادہ تعداد ایسے ہی اَفراد پر مشتمل ہے۔ اس کے بھی قوی اِمکانات ہیں کہ مقرر کے الفاظ اور جملوں کے معنے سُننے والوں کے نزدیک اُن کی اہلیت اور ماحول کے تحت کچھ اور ہی ہو جائیں اِس لئے زبان اور طرز بیان کی سلاست اور حکمہ صحت کا مقرر اور ارباب نشر جس قدر زیادہ خیال رکھیں اُسی قدر بہتر ہوگا۔ نہ صرف یہی بلکہ کسی نشری تقریر، فیچر یا ڈرامے کو لکھ لینے کے بعد مقرر کا فرض ہے کہ اُس کے سارے لفظوں یا جملوں کے مفہوم کی اِس نقطۂ نظر سے جانچ کر لے کہ کہیں کوئی اِیہام تو نہیں پیدا ہو گیا ہے۔ کوئی لفظ ایسا تو نہیں ہے جو سُننے والے کے ذہن کو کسی غلط راستہ پر ڈال دے گا یا ڈال سکتا ہے۔ اَرباب نشر کو بھی مسودوں کی جانچ میں اِس امر کا خیال رکھنا چاہیے۔ اِس موقعہ پر ایک دلچسپ واقعہ ثبوت کے

طور پر پیش کیا جاتا ہے، جو یہ ہے کہ کسی نشرگاہ کے معلن نے ایک بڑی تقریب کے موقع پر وہاں کے چشم دید حالات بیان کئے۔ اس تقریب میں خواتین بھی شریک تھیں۔ معلن نے سارا حال دلچسپ انداز میں بیان کیا جس کی سبھوں نے تعریف کی لیکن خواتین کے رنگا رنگ لباس کا ذکر اکثر سننے والوں کو پسند نہیں آیا۔ اس پسند نہ آنے کی وجہ غور و خوض کے بعد بھی سمجھ میں نہ آ سکی۔ لیکن ہوسکتا ہے کہ معلن نے غیر شعوری طور پر کوئی ایسا لفظ یا جملہ استعمال کیا ہو جس کے کوئی اور معنے ہوسکتے تھے۔ یا بعض سننے والوں کے ذہن میں پہلے ہی سے موجود تھے۔

بہر حال اس واقعہ سے پتہ چلتا ہے کہ نشری مسودوں کے الفاظ اور جملوں کی ہر زاویہ سے جانچ ضروری ہے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اگر اس قسم کی بہت سی اور بہت سخت شرطیں لگا دی جائیں تو نشریات کا حسن کارانہ پہلو بُری طرح متاثر ہوتا ہے۔ یہ اعتراض اس جماعت کا ہے جو یہ سمجھتی ہے کہ آرٹ کو اخلاقی یا سماجی نقطۂ نظر سے نہیں جانچنا چاہیے" آرٹ آرٹ کے لئے" یا خالص آرٹ موجودہ زمانہ میں ماضی کی ایک گمراہ کرنے والی یادگار سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔ اس لئے کہ در اصل وہ آرٹ آرٹ ہی نہیں جو زندگی سے دور ہو اور جس کا مقصد انسانیت کا استحکام، اصلاح اور ترقی نہ ہو۔ موجودہ آرٹ کو اخلاقی سماجی اور سیاسی ہر نقطۂ نظر سے ممتاز اور مفید ہونا چاہیے۔ اس کے سوا جو کچھ ہو وہ آرٹ کے دائرے سے خارج ہے۔ خاص طور پر نشریات کی دنیا میں تو بے مقصد آرٹ کے لئے کوئی جگہ نہیں۔ اس لئے کہ ریڈیو کا مقصد قوم کی تعلیم ہر جہتی اصلاح اور بین قومی خیر سگالی کو آگے بڑھانا ہو اگر ارباب نشر کسی "نام نہاد" حسن کارانہ ڈراما فیچر یا بات چیت کو نشر کرنے سے انکار کردیں تو ان کا یہ فعل پوری طرح حق بجانب ہوگا۔ اس لئے کہ محکمۂ نشریات کے فرائض میں اصلاح اور تعلیم کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے۔

ریڈیو عوام کی جامعہ اور خبروں کی ایجنسی بھی ہے، اس کو زیادہ تر ایسی اخلاقی اصلاحی اور تفریحی چیزیں پیش کرنی چاہئیں جو ممکن ہے "حسن کاری" کے اعلیٰ ترین معیار پر اُتر نہ سکیں۔ ممکن ہے ہندوستان میں وہ دور بھی آجائے جب کہ یہاں کی اکثریت آرٹ کی طرف توجہ کرسکے۔ اور اسے سمجھ سکے۔ موجودہ زمانہ میں تو نشرگاہوں کا فرض ہے کہ کام کی باتیں نشر کریں۔ یہی وہ خیال ہے جس کے پیش نظر حیدرآباد کے پروگرام میں آئے دن مفید اور صحت مند باتیں شریک کی جاتی ہیں۔ تقریریں اور خبریں قابل اعتماد اور مستند مواد پر مشتمل ہونی چاہئیں لیکن یہ صاف ظاہر ہے کہ ارباب نشر سارے واقعات کو خود ہی نہیں جانچ سکتے اُنہیں وقتاً فوقتاً ماہرین سے مدد لینی پڑتی ہے یورپ کے اکثر ملکوں کے تقاریر کے شعبوں میں ایسی کمیٹیاں قائم ہیں جن سے فنی تقریروں کے بارے میں مشورہ کیا جاتا ہے۔

جنگ یا بدامنی کے زمانہ میں روزانہ سچ بولنا اور سچ کے سوا کچھ نہ بولنا ذرا مشکل ہے۔ لیکن ایسے موقعوں پر ارباب نشر کی کوشش یہی رہتی ہے کہ جہاں تک ہوسکے اپنے سننے والوں کے اعتماد کو برقرار رکھیں۔ اگر ملک میں کسی مسئلہ کے بارے میں اختلاف آرا ہو تو دونوں فریقین کی رائیں نشر کی جانی چاہئیں تاکہ سننے والے برائی اور بھلائی کا اپنے طور پر اندازہ کرسکیں۔ اس طرح سننے والے دوسروں کی رائے سننے کے بھی عادی ہوجاتے ہیں جس سے جماعتی مخالفت کا رنگ پھیکا پڑ جاتا ہے۔ اور لوگ اپنے مخالفوں کی باتیں سننے اور اُن پر غور کرنے کے عادی ہوجاتے ہیں۔

میر حسن

اسٹوڈیو نمبر (۵) لاہور

نشرگاہ لاہور کے عملہ کے ایک رکن ایک انگارے کی پیش کشی کے سلسلے میں صدابند صوتی اثرات کے کام میں مصروف ہیں

مسٹر عبدالحمید

نشرگاہ لاہور کے ایک معلی صدابند موسیقی کا ایک پروگرام نشر کر رہے ہیں

ریڈیو اور پروپاگینڈا

اگر بیسویں صدی میں عجائباتِ عالم کی ایک فہرست اَز سرِ نَو مرتب کی جائے تو ریڈیو کا نام سرِ فہرست ہوگا اس لئے کہ ریڈیو سائنس کا ایک بڑا محیر العقل کرشمہ ہے۔ انسان نے آگ اور پانی پر تو اقتدار حاصل کر لیا تھا لیکن ابھی اُس کا یہ اقتدار ناکمل تھا کیونکہ فضائے بسیط پر اس کی پُوری طرح حکمرانی نہ تھی۔ ریڈیو کی ایجاد نے اس کمی کو پورا کر دیا اور اس طرح انسان نے فضا کو بھی مسخر کر لیا۔

ریڈیو کا موجد ایک اطالوی سائنس داں مارکونی (Marconi) ہے انسانیت پر اس سائنس داں کا اتنا بڑا احسان ہے کہ رہتی دنیا تک اس کا نام فراموش نہیں کیا جا سکتا اور اس طرح اُس کو بقائے دوام حاصل ہوگئی۔ ریڈیو خبروں کی نشر و اشاعت کا اہم ترین ذریعہ بن گیا ہے اُس کی ایجاد سے قبل اخبارات ہی تشہیر کا واحد اور موثر ذریعہ خیال کئے جاتے تھے لیکن ریڈیو نے تشہیر کے ذرایع کو وسیع سے وسیع تر کر دیا ہے اور اَب اخبارات کی وہ پہلی سی اہمیت باقی نہیں رہی۔

تشہیر کی خواہش انسان کا ایک فطری جذبہ ہے، اور اس جذبے سے حکومتیں بھی متاثر ہیں اور سچ تو یہ ہے کہ کسی مہذب و منظم حکومت کے لئے تشہیر ایک بہت ضروری عنصر ہے۔ سیاست، تدبر، قوانین کے اُصول اور اَمن و انصاف اور اپنے اقتدار کو قائم رکھنے کے لئے بیسویں صدی میں کوئی حکومت کامیاب نہیں کہلائی جا سکتی۔

پروپاگنڈا کا لفظ سیاسی معنوں میں بہت بعد میں استعمال کیا جانے لگا۔ گزشتہ جنگِ عظیم کے دَوران میں اس لفظ نے سیاسی اہمیت اختیار کر لی۔ لفظ پروپاگنڈا کا استعمال سب سے پہلے کلیسائے روما نے کیا تھا لیکن اُس وقت اِس لفظ میں سیاسی مفہوم نہ تھا بلکہ وہ صرف مذہبی اغراض کے لئے استعمال کیا جاتا تھا۔ چنانچہ کائنات کے متعلق اعتقادات اور اُس کا خدا سے تعلق اور اسی قسم کی مابعد الطبیعاتی تصورات کی تشہیر و تبلیغ کرنا پروپاگنڈا کہلاتا تھا۔ لیکن ۱۹۱۴ء و ۱۹۱۸ء کے دوران میں اور اُس کے بعد اس لفظ میں بڑی وسعت پیدا ہوگئی چنانچہ یہ لفظ ہر ایسے موقع پر جب کہ کسی خاص نقطۂ نظر کو بالواسطہ یا بلاواسطہ عوام سے تسلیم کرایا جانا مقصود ہوتا اور اُن میں متعلقہ حکومتوں کے عزائم و مقاصد کی تشہیر پیش نظر رہتی تو اس مقصد کے لئے مختلف ذرایع اختیار کئے جاتے وہ ذرایع تحریر، تقریر، اور مظاہروں تک محدود تھے اَب اُن میں لاسلکی کا بھی اضافہ ہوگیا۔ کسی حکومت کا اپنے نقطۂ نظر کی وضاحت کے لئے اِن ذرایع کا استعمال کرنا پروپاگنڈا کہلایا جانے لگا۔ اِس ذریعے کی کامیابی سے متاثر ہو کر نہ صرف حکومتیں بلکہ تجارتی، سماجی، معاشرتی اور قومی ادارے بھی اس کو اپنے اپنے مقاصد کے تحت تشہیر کے لئے استعمال کرنے لگے۔ سچ تو یہ ہے کہ موجودہ دور میں پروپاگنڈا حکومت کا خواہ وہ جمہوری ہو یا عمومی نازی ہو یا فاچستی اشتراکی ہو یا اِشتمالی ایک زبردست حربہ بن گیا ہے جس کے ذریعے عوام کو اپنا ہم خیال و ہم نوا بنا لیا جاتا ہے اور اُن کے دل و دماغ پر اس بات کو بٹھا دیا جاتا ہے کہ اُن ہی کی طرزِ حکومت دیگر حکومتوں کے مقابلے میں زیادہ منصف مزاج، منفعت بخش اور رعایا پرور ہے۔

غرض پروپاگنڈے نے انسانی تہذیب کی راہوں کا نقشہ سرے سے بہت آگے بڑھا دیا ہے۔ پروپاگنڈا کو ہم ایک

معلوماتی ادارہ تصور کرسکتے ہیں لیکن اس ادارے کی دیانت
اور صداقت کے بارے میں قطعی طور پر کچھ نہیں کہا جا سکتا
اس لئے کہ اکثر اوقات پروپاگنڈا کرنے والا فریق اس بات
کی کوشش کرتا ہے کہ وہ اپنے خیالات و نقاطِ نظر کو دوسروں
تک بہ ہر صورت پہونچا دے خواہ اُن اصولوں اور نظریوں
میں کتنا ہی نقص کیوں نہ ہو اس لئے پروپاگنڈا ابھی ایک
آرٹ بن گیا ہے کہ اُس کو اس طریقہ پر انجام دیا جائے
کہ سُننے والا سچ باور کرنے لگے۔ پروپاگنڈے کے ساتھ مخالف
پروپاگنڈا بھی لگا ہوا ہے۔ اس طرح کے پروپاگنڈے میں
اس بات کا خاص طور پر لحاظ رکھا جاتا ہے کہ جہاں اپنے نقاطِ
نظر کی صداقت اور استحکام کو پیش کیا جائے وہیں مخالفین کے
اصول و نقطۂ نظر کو سامعین یا ناظرین کے روبرو ایسے مضحکہ
خیز انداز میں بیان کیا جائے جس سے فریقِ مخالف کی کمزوریاں
پوری طرح واضح ہوجائیں اور اس طرح عوام کو بدظن کیا جائے۔
ایسے موقعوں پر بعض اوقات صداقت کے دامن کو چھوڑ دینا
اور مبالغہ کی امداد حاصل کرنی پڑتی ہے ایسے پروپاگنڈے کے
لئے ریڈیو سے زیادہ کامیاب اور کوئی حربہ نہیں ہے اس لئے
کہ بار است لوگوں کو مخاطب کرلیا جاتا ہے اور اس طرح سُننے
والے یقین کرنے لگتے ہیں کہ جو کچھ سُن رہے ہیں وہ واقعی
صحیح ہوگا۔ لیکن ایسے پروپاگنڈے کی کامیابی کے لئے خاص
مہارت کی ضرورت ہوتی ہے۔ ورنہ اگر عوام پر اُس کا راز
کھل جائے تو پروپاگنڈا کرنے والے کی بھی ساکھ جاتی رہتی ہے
اس قسم کے پروپاگنڈے میں فریقِ مخالف کی معمولی سے معمولی
کمزوری سے بھی بہت بڑا فایدہ اُٹھایا جاتا ہے اور اُس کی تردید
ایسے انداز میں کی جاتی ہے کہ فریقِ مخالف کے پروپاگنڈے
کا عوام پر اُلٹا اثر پڑے۔ اس قسم کا پروپاگنڈا صرف حکومتیں
ہی نہیں بلکہ خانگی ادارے، تجارتی مراکز، مذہبی سوسائٹیاں
اور سماجی و سیاسی ادارہ جات بھی کرتے ہیں لیکن خصوصاً جنگ
کے موقعہ پر ہر حکومت کے لئے ایسا پروپاگنڈا ضروری ہے
بغیر مخالف پروپاگنڈے کے عوام پر اپنے اصولوں کی صداقت
و استحکام کا سکہ جمانا محال ہے۔

موافق و مخالف پروپاگنڈے کا موجودہ زمانہ میں بہترین
ذریعہ نشرگاہیں ہیں۔ ان نشرگاہوں سے دورانِ امن میں
قومی تعمیر اور اصلاحی اغراض کی تشہیر ہوتی ہے اور جنگ
کے زمانے میں فریقین اپنے اپنے مفادات کو پیشِ نظر
رکھتے ہوئے اپنی موافقت میں ایک دوسرے کی کمزوریوں
کو بڑھا چڑھا کر ظاہر کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ریڈیو سے پروپاگنڈا
کرنے میں سب سے بڑی سہولت یہ ہے کہ وقتِ واحد میں بار است
ساری دنیا میں تشہیر کی جاسکتی ہے پریس کی راہ میں زبان
اور رسم الخط کی دقتیں سدِ راہ ہیں لیکن ریڈیو میں ساری
دقتیں حل ہوجاتی ہیں اس طرح کہ اخبارات کے لئے مختلف
ممالک تک اپنی آواز پہونچانا محال ہے اس لئے کہ کوئی ایسا
پریس قائم کرنا مشکل ہے جس میں ساری دُنیا کی زبانیں
استعمال کی جاتی ہوں لیکن ریڈیو ان مشکلات سے بے نیاز ہے
صرف سماعت اور گویائی دو ہی ذریعے ہیں جن سے ساری
دنیا باخبر ہوجاتی ہے۔ اس طرح کہ نشرگاہوں میں نشرواشاعت
کے لئے مختلف زبانوں کے ماہرین (Announcer)
کی خدمات حاصل کرتے ہیں جو اپنے اپنے مقررہ اوقات میں
اپنی زبانوں میں حکومت کے مقاصد و اُصول کی اس انداز
میں وضاحت کرتے ہیں کہ سامعین کے دل پر اُن کا اثر ہوتا ہے
چونکہ مختلف ممالک کے سننے والوں کو اُن کی اپنی زبان میں
سادہ و سلیس انداز میں خبریں سُنائی جاتی ہیں اور مضامین

اِس طرح نشر کئے جاتے ہیں کہ اُن کی دلچسپی برقرار رہے اِس لئے وہ مقررہ اوقات پر مختلف ممالک کی نشرگاہوں سے خبریں سُنا کرتے ہیں۔ اگر کسی حکومت کو مشرقِ بعید میں یعنی عرب، مصر، شام، عراق، فلسطین میں ریڈیو کے ذریعہ پروپاگنڈا مقصود ہو تو عربی یا فرانسیسی زبان کام میں لائی جاتی ہے۔ یورپی ممالک کے لئے انگریزی یا لاطینی اور ہندوستان کے لئے سلیس اُردو نشرگاہیں استعمال کرتی ہیں غرض ریڈیو کو قطعاً لسانی مشکلات سے دوچار ہونا نہیں پڑتا۔ ریڈیو اور پریس کے پروپاگنڈے میں ایک بڑا فرق یہ بھی ہے کہ اخبارات صرف تعلیم یافتہ طبقہ تک ہی اپنی آواز پہونچاتے ہیں لیکن ریڈیو عوام و خواص دونوں تک بار است پہونچتا ہے اسی نقطۂ نظر کو پیش رکھتے ہوئے ریڈیو میں (Mass Psychology) یعنی عوام کی نفسیات کا خاص طور پر لحاظ رکھا جاتا ہے اور اسی لئے اُن کے جذبات و رجحانات، احساسات و اعتقادات سے فایدہ اُٹھایا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ریڈیو عوام میں مقبول ہوتا جا رہا ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ خبریں نشر ہوتے وقت ہوٹلوں اور پارکوں میں عوام کے ٹھٹ کے ٹھٹ لگے ہوئے ہوتے ہیں۔

ہر نشرگاہ سے بڑوں کے ساتھ ساتھ بچوں کے لئے بھی خاص پروگرام نشر کئے جاتے ہیں۔ بچوں کے لئے پروگرام کی خاص خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ اُن میں تعلیمی اور تفریحی دلچسپیوں کے ساتھ ساتھ ملک و قوم کے مستقبل اور اُن کی اپنی آیندہ زندگی کے بعض اہم مسائل کو قصّوں، کہانیوں، ڈراموں اور خاکوں کی شکل میں اِس طرح سے پیش کیا جاتا ہے کہ اُن میں جذبۂ ایثار اور حُب الوطنی ابتدا ہی سے پیدا ہو۔ چونکہ آج کے بچے آیندہ آنے والی نسل کے اہم افراد ہوتے ہیں اسی بنا پر اُن کی قومی تعمیر کے سلسلے میں ایسے ذرایع اختیار کئے جاتے ہیں جو تعمیری ہوں اور ان میں کوئی تخریبی عنصر شامل نہ ہونے پائے اِسی نقطۂ نظر سے بچوں کے پروگرام میں بچوں کے نفسیاتی پہلو کا خاص طور پر خیال رکھا جاتا ہے۔ اِنسان بالطبع دیکھ کر یا سُن کر متاثر ہوتا ہے اور یہ مقصد ریڈیو سے پورا ہو جاتا ہے۔ غرض ریڈیو نہ صرف پروپاگنڈا کرنے میں بلکہ قومی تعمیر اور سماجی اِصلاح کا ایک بڑا موثر ذریعہ ہے بشرطیکہ اُس کا صحیح استعمال کیا جائے۔ سب سے آخر میں ہم مشہور مدبر برک نے پریس کے بارے میں جو کچھ کہا تھا اُس کو نقل کئے دیتے ہیں (Press Fourth state) اگر اس زمانہ میں یہ مدبر زندہ ہوتا تو یقینی ریڈیو کو (First state) کے نام سے یاد کرتا۔ اور حقیقت میں یہ پریس سے زبردست حربہ ہے۔

بیابانی

اُردو نشری خبریں

خبریں معلوم کرنے کے لئے عام طور پر اخبار پڑھتے ہیں، مگر اخباروں میں طول طویل، ضروری اور غیر ضروری باتیں بہت ہوتی ہیں۔ آج کل دُنیا بہت زیادہ کاروباری ہوگئی ہے۔ ہر چیز مختصر اور مفید ہونی چاہیے۔ نشری خبریں اسی تعریف میں آتی ہیں۔ صبا رفتار سواریوں نے دنیا میں بسنے والوں کو ایک دوسرے سے بہت زیادہ قریب کردیا ہے۔ گویا جادو سے دنیا کی طنابیں کھنچ گئی ہیں۔ دُنیا کے ایک گوشے کا واقعہ دنیا کے دوسرے حصہ پر اثر انداز ہوتا ہے، اِس لئے باخبر اور چوکنے رہنے کی ضرورت ہے۔ کسی لاسلکی نشرگاہ سے خبریں سُن لینا اچھا ہے۔ تھوڑے وقت میں زیادہ اور بہتر خبریں معلوم ہوسکتی ہیں۔

جنگ کی وجہ سے نشری خبروں کی اہمیت اور بڑھ گئی ہے، گھنٹے دو گھنٹے پہلے کے واقعات لاسلکی نشرگاہ سے سُنے جاسکتے ہیں، سارا یورپ جنگ کے شعلوں میں لپٹ گیا ہے۔ کیا عجب ہے کہ ہمارا ملک بھی اُس لپیٹ میں آجائے، اِس لئے نشرگاہ سے روزانہ ۱۵، ۲۰ منٹ خبریں سننے میں کیا ہرج ہے۔

نشری خبروں کا دوسرا پہلو بھی بہت دلچسپ ہے۔ یعنی جو خبریں انگریزی سے ترجمہ ہوکر اُردو میں نشر ہوتی ہیں، اُنھیں کئی مرحلے طے کرنے پڑتے ہیں، خود مادری زبان کا صحیح بولنا اور لکھنا بہت مشکل ہے، غور کیجئے انگریزی جیسی وسیع زبان کو اپنانے میں مترجم کو کیسی کیسی دقتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہوگا، لفظ بلفظ ترجمہ کرنے سے کام نہیں چلتا، آرام کرسی پر بیٹھ کر خبریں سننے والے اور جھنکا چلانے والے، دونوں کا یکساں خیال رکھنا پڑتا ہے۔ مترجم کے لئے نہ صرف اُردو زبان سے کافی واقفیت کی ضرورت ہے بلکہ اُسے انگریزی زبان پر بھی کافی عبور رکھنا چاہیے، انگریزی زبان تقریباً بین قومی زبان کا درجہ رکھتی ہے، ادائے مطلب کے لئے اس میں ایک نہیں سیکڑوں الفاظ مل جاتے ہیں، اُردو زبان اِتنی وسیع نہیں ہے مگر پھر بھی وہ اتنی مفلس نہیں ہے کہ زمانہ کا ساتھ نہ دے سکے، یعنی میرا مطلب یہ ہے کہ اُس میں اِتنی لچک موجود ہے کہ وہ زمانہ کا ساتھ دینے کی کافی صلاحیت رکھتی ہے۔

انگریزی خبروں کے ایڈیٹر کا بھی ترجمہ پر کافی اثر پڑتا ہے، اگر وہ انگریزی میں آسان، عام فہم الفاظ، چھوٹے چھوٹے جملے، مختصر اور مفید فقرے، ترجمہ کے لئے دے تو اُردو میں ترجمہ اِتنا ہی سہل، آسان اور اچھا ہوگا، کیونکہ مقررہ وقت میں مترجم کو اچھے سے اچھا ترجمہ کرنے کی فکر رہتی ہے۔

اِس کے بعد مترجم کو ڈکشنری سے سابقہ پڑتا ہے، ڈکشنری سے کافی مدد لی جاتی ہے، مگر حقیقت یہ ہے کہ مترجم کا تجربہ ڈکشنری سے زیادہ کام دیتا ہے، ایک انگریزی لفظ کے بیسیوں اُردو معنی مل جاتے ہیں، مگر مطلب کو ادا کرنے کے لئے مترجم کو اپنے ذاتی تجربہ ہی سے کام لینا پڑتا ہے۔ بہرحال ترجمہ کے لئے ایک موزوں ڈکشنری کی ضرورت ہے اور بابائے اُردو ڈاکٹر عبدالحق نے ایک جامع انگریزی اُردو ڈکشنری مرتب کرکے اُردو زبان پر بہت بڑا احسان کیا ہے۔

کتابی ترجمے، اخباری ترجمے اور نشری ترجمے میں بہت زیادہ فرق ہے، مترجم کو تحریری زبان کی بجائے تقریری زبان سے زیادہ کام لینا پڑتا ہے، جب خبریں پڑھی جائیں تو ایسا معلوم ہو جیسے بات چیت ہورہی ہے۔ ساتھ ہی خبریں

پڑھنے والے کا طرزِ بیان بھی اچھا ہو، ورنہ خبروں کے ایڈیٹر اور مترجم دونوں کی محنت اکارت جائے گی۔ جس طرح اچھا پڑھنے والا شعر کے لطف کو دوبالا کر دیتا ہے اُسی طرح خبریں اچھی طرح پڑھنے والا ترجمہ میں جان ڈال دیتا ہے۔

خبروں کا نشر ہونے سے آدھ گھنٹہ پہلے خبریں پڑھنے والے کی نظر سے گذرنا ضروری ہے، ورنہ غلطیاں ہونے کا اندیشہ رہتا ہے، خبریں پڑھنے والے کی سہولت کے لئے اِس اور اُس کے فرق کے لئے زیر اور پیش بھی لکھنا ضروری ہو جاتا ہے، کیونکہ نشر ہونے کے بعد زبان، الفاظ اور جملے تنقید اور اعتراض کی زد میں آجاتے ہیں مترجم کو اس کا بڑا خیال رکھنا پڑتا ہے کہ لفظوں میں لچک، نرمی اور مٹھاس ہو اور ایک بڑی اکثریت اُس سے فائدہ اُٹھا سکے الفاظ سننے والوں کے دماغ پر اَثر کریں اور پھر وہ دماغ سے اُن کے دل میں اُتر جائیں۔

ترجمہ کرنے کے بعد ہی ترجمہ کی خوبی معلوم نہیں ہوتی بلکہ اُن کے نشر ہوتے وقت ہی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ مترجم نے کس حد تک تقریری زبان میں ترجمہ کرنے کی کوشش کی ہے اس کے علاوہ مترجم کو فارسی اور عربی ترکیبوں کے اِستعمال میں بھی اِحتیاط کرنی پڑتی ہے، بلا وجہ غیر مانوس الفاظ اِستعمال کرنا بھی کچھ ٹھیک معلوم نہیں ہوتا، یہ ہے مختصر داستان اُردو نشری خبروں کی جو آپ ۱۱۴ میٹر پر نشرگاہِ حیدرآباد سے ۸ بجے شام سُنتے ہیں۔

مرزا رزاق بیگ

ریڈیو اور دیہات سدھار

دیہات سدھار کی اسکیم علی العموم تین اہم اُمور پر مشتمل ہوتی ہے۔ بہتر زراعت، بہتر معالجت، اور بہتر معاشرت اور جب کبھی کسی ضلع یا تعلقہ یا دیہات کے متعلق یہ کہا جائے کہ وہاں دیہات سدھار یا گاؤں سدھار کی اسکیم بہت ہی کامیابی کے ساتھ چل رہی ہے یا تنظیم دیہی کا کام بہت ہی اعلیٰ پیمانہ پر ہو رہا ہے تو فوراً یہ سمجھ لینا چاہیے کہ اس مقام پر کسان کے نہ صرف مادی وسائل کو باحسن الوجوہ وسیع کیا جا رہا ہے بلکہ کسان کی جسمانی و روحانی، ذہنی و اخلاقی نشو ونما کا بھی بدرجۂ غایت خیال کیا جا رہا ہے۔ اور کسان کو اس کے روایاتی ذہنی انحطاط اور غربت و افلاس کی کشاکشی سے آزاد کیا جا رہا ہے۔ یہ ایک واضح حقیقت ہے کہ جب تک کسان کی معاشی حالت کو بہتر نہ بنایا جائے بہتر معاشرت کا کوئی لائحۂ عمل خواہ وہ کتنا ہی اطمینان بخش کیوں نہ ہو کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا۔ سماجی اور تہذیبی ترقی سے پہلے مادی اور معاشی ترقی کا ہونا حد درجہ ضروری ہے۔ جب تک کسان کا معیار زندگی بلند نہ ہو اور جب تک اس کی مالی حالت مستحکم اور اطمینان بخش نہ ہو صفائی حفظان صحت طبّی امداد اور تعلیم جیسے مسائل کا کامیابی کے ساتھ حل کرنا بہت مشکل ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ریڈیو کے ذریعہ کون کون سی سہولتیں کسان کے لئے بہم پہونچائی جا سکتی ہیں اور بہتر زراعت بہتر معالجت اور بہتر معاشرت کی اسکیم کو کامیابی کے ساتھ رُوبہ عمل لانے اور کسان کی معاشرتی حالت کی اصلاح کے لئے ریڈیو کی کس حد تک ضرورت ہے۔

بہتر زراعت | ریڈیو بجائے خود کسانوں کے لئے عجائبات سے کم نہیں۔ پھر جب یہ جادو کا صندوق بولنے لگے گا اور کام کی باتیں کرنے لگے گا تو دیہی طبقے کا اُس سے متاثر ہونا یقینی ہے۔ ہندوستان کے دیہات میں اور بالخصوص ہماری سلطنت کے مختلف اضلاع و قصبہ جات میں تو اس کی بے حد ضرورت ہے مراکز ترقیات دیہی و دیگر مواضعات پر ریڈیو کی تنصیب کسان کی معاشی حالت پر بہت مفید اثرات مرتب کرے گی۔

ہندوستانی کسان ناخواندگی اور جہالت کی وجہ سے سائنس کی موجودہ ترقیوں سے بالکل بے بہرہ ہے وہ دُنیا کے حالات اور نت نئی تغیرات سے قطعاً ناواقف ہے۔ موجودہ ترقی یافتہ دنیا میں آج کل کیا ہو رہا ہے اور زراعت و کاشتکاری میں اقوام عالم نے کہاں تک ترقی کی وہ بالکل نہیں جانتا۔ ریڈیو کے ذریعہ سے وہ اُن ساری چیزوں سے روشناس ہو سکتا ہے۔ وہ یہ معلوم کر سکتا ہے کہ بہتر بیج کہاں اور کس قیمت پر دستیاب ہوتا ہے۔ اُس کے فوائد کیا ہیں اور اُس سے کہاں کہاں تجربے کئے گئے اور کیا کیا نتائج برآمد ہوئے۔

الحاصل کسان زراعت کے متعلق جملہ اُمور سے اپنی فرصت کے اوقات میں پوری طرح واقف ہو سکتا ہے اس طرح ریڈیو کسان کے لئے نہ صرف ایک تفریح کا سامان مہیا کرتا ہے بلکہ تفریح کے ساتھ ساتھ بعض کام کی باتیں بھی سُنا دیتا ہے جو رفتہ رفتہ کسان کے ذہن میں ایک انقلاب پیدا کر دیتی ہیں اور وہ ترقی یافتہ اُصولوں کو قبول کرنے اور اُن کو برُوئے کار لانے کی عادت ڈال لیتا ہے۔ اِس سے زراعت کے طریقوں میں یک گونہ ترقی ہوتی ہے۔

موجودہ جنگ نے تو ریڈیو کی اہمیت و ضرورت میں بہت کچھ اضافہ کر دیا ہے۔ بھلا وہ غریب کسان جس کی کُل

کائنات بجز مویشی کے سوا کچھ نہ ہو اور جس کو عمر بھر میں اپنے کھیت کے باہر جانے کا بہت کم اتفاق ہوا ہو کس طرح جنگ کے معاشی اثرات کا اندازہ لگا سکتا ہے؟

اور کس طرح اُن نتائج کا تجزیہ کر سکتا ہے جو دو ملکوں کی سیاسی کشمکش کے دوران میں رُونما ہوتے ہیں۔ ہندوستانی کسان اور خصوصاً حیدرآباد کا زراعت پیشہ طبقہ عام طور پر ناخواندہ ہے اور یہی اُس کی بڑی کمزوری ہے معاشی نقطۂ نظر سے علاقہ تلنگانہ کے لوگ تو خیر سے ہوشیار ہو چلے ہیں مگر مرہٹواڑی کا رہنے والا اَب بھی اُن ابتدائی معاشی اُصول سے ناواقف ہے جن کا جاننا ہر کاشتکار کے لئے ضروری ہے۔ بہتر بیج کا استعمال بہتر پیداوار اور اُس کی نکاسی، بہتر آلات کا استعمال وغیرہ یہ ایسی چیزیں ہیں کہ اُس سے ہر کسان کا واقف ہونا ضروری ہے۔ موجودہ جنگ نے ریڈیو کے سُننے والوں کی ضروریات اور دلچسپیوں کے لئے ایک نئی راہ پیدا کی ہے۔ اور ایسے پرآشوب زمانے میں کاشتکاروں کو دنیاوی معاملات سے بالکل بے تعلق رکھنا نہ صرف خلافِ مصلحت ہے بلکہ اُصولِ انسانیت کے منافی اور قومی استحکام کے لئے نقصان دہ ہے۔ ریڈیو سے نہ صرف کسانوں کے تفریحی مشاغل میں اضافہ ہوگا بلکہ اس سے خبررسانی اور تعلیم کا بھی کام لیا جا سکتا ہے۔ حیدرآباد میں لاسلکی کی ضرورت واہمیت بہت دیر سے محسوس کی گئی۔ اِس کی وجوہ خواہ کچھ ہی ہوں مگر واقعات نے بہت کچھ پلٹا کھایا ہے اور اَب ممالک محروسہ میں ریڈیو کی اتنی ہی ضرورت ہے جتنی کہ دوسرے متمدن ممالک میں۔

اورنگ آباد میں لاسلکی نشرگاہ کے قیام کی منظوری حاصل ہو کر تقریباً پانچ سال کا عرصہ ہوتا ہے اور اب تو اضلاع میں اُس کی ضرورت کئی گُنا زیادہ ہو گئی ہے۔ ضرورت ہے کہ دیہات میں ریڈیو کے دائرۂ افادیت کی توسیع کی جائے۔ ہماری گورنمنٹ نے احساس کر لیا ہے اور غالباً عنقریب اس کی ایک حد تک تکمیل کر دی جائے گی۔

ریڈیو کے ذریعہ انجمن ہائے تنظیم دیہی کے اغراض و مقاصد کی باحسن الوجوہ تکمیل ہو سکتی ہے۔ مثلاً زراعت کی ترقی کے لئے ممکنہ وسائل اختیار کرنے اور بالخصوص کاشت کے نئے طریقوں کی تعلیم اور بہتر آلات زراعت کے استعمال ضروریات زراعت مثلاً تخم اور کھاد وغیرہ اور ضمنی کاروبار مثلاً گھی اور مسکہ بنانے اور مرغبانی کے اختیار کرنے کی ترغیب و تعلیم دینا۔ اعلیٰ قسم کے مویشی رکھنے کی ترغیب اور ان کی پرورش کے صحیح طریقوں کی تعلیم مشترکہ طور پر کاشت کرنے کے فوائد، دیہی دستکاری کو فروغ دینے کی تدابیر فن زراعت و علاج حیوانات کے متعلق مفید معلومات بہم پہونچانا یہ سارے کام کاشتکار کی روزمرہ زندگی سے متعلق ہیں اور انہی پر اُس کی خوشحالی اور مالی ترقی منحصر ہے اس لئے اگر ریڈیو کے ذریعہ مندرجہ بالا عنوانات پر بہت ہی سادہ اور سلیس زبان میں مضامین نشر کئے جائیں تو کسان کے لیے اس کی فرصت کے اوقات میں بہت ہی دلچسپی کا سامان مہیا کریں گے۔

بہتر معاملت بہتر معاملت کی اسکیم کو کامیاب بنانے اور کاروبار کی اصلاح و ترقی کے لئے بھی ریڈیو کی سخت ضرورت ہے۔ معاملتی یا تجارتی نقطۂ نظر سے ہندوستانی کسان دوسرے ممالک کے کسانوں سے ابھی بہت پیچھے ہے۔ اِس کی سب سے بڑی وجہ ابتدائی تعلیم کا فقدان ہے۔ آج کل کے تجارتی اُصول اور بیع و شریٰ کے نئے اور ترقی یافتہ طریقے جو زیادہ تر یورپ کی تقلید میں شروع کئے گئے ہیں ہمارے کسان کے حق میں معمہ بن کے رہ جاتے ہیں۔ وہ اپنے دقیانوسی آلاتِ زراعت سے اجناس تو پیدا کر لیتا ہے مگر وہ کوئی ایسی تجارتی مارکٹ سے واقف نہیں جہاں اُس کی پیداوار کے لئے اچھے خریدار فراہم ہو سکیں۔ غلہ گودام کے کاروبار سے وہ قطعاً واقف نہیں۔ اس کو مقامی مہاجن یا ساہوکار کے سوا دنیا میں کوئی دوسرا قرض دینے والا نظر ہی نہیں آتا۔ کیونکہ اُس کو اس کا علم ہی نہیں ہے کہ انجمن ہائے امداد قرضہ خود اُسی کے گاؤں میں موجود ہے

جہاں سے وہ مقابلتاً کم شرح سود پر قرض لے سکتا ہے۔ حیدرآبادی کاشتکار منڈیوں کے وجود سے کوئی فائدہ نہیں اُٹھا سکتے۔ اُن کی قابلِ رحم حالت پر ترس کھانا اور اُن کو مہاجنوں اور بنیوں کے چنگل سے چھڑانا ہر تعلیم یافتہ کا فرض ہے۔ کسانوں کو دور دراز مقامات پر منڈیوں کی قیمت کا پورا پورا علم نہیں ہوتا۔ منڈی کی قیمت کا علم عموماً صرف اُن لوگوں کے ذریعہ ہوتا ہے جو اپنا مال منڈی میں فروخت کرکے واپس آتے ہیں مقامی بنیے کے لئے بہت ذرائع موجود ہیں لیکن وہ ان قیمتوں کے علم کا استعمال اپنے فائدہ کی حد تک کرتے ہیں اور غلط خبر مشہور کرنے سے بھی باز نہیں رہتے۔

پہلے تو ممالک محروسہ سرکار عالی کے اضلاع میں اخبار نہیں ہیں اور یہ ایک افسوس ناک حقیقت ہے کہ ہفتہ وار "رعیت" اور "مشیر دکن" کو چھوڑکر بلدہ حیدرآباد سے نکلنے والے اخباروں میں سے کسی اخبار نے بھی بازار کی خبروں کی جانب توجہ نہیں کی۔ حالانکہ انگریزی اخباروں میں بازار کی خبریں بہت اہمیت رکھتی ہیں۔ بفرض محال اگر حیدرآباد کے اخباروں نے اپنے قیمتی کالموں کا کچھ حصہ بازار کی خبروں کے لئے وقف کردیا تب بھی اس کا امکان نہیں کہ کسانوں کی اکثریت اس سے کماحقہٗ فائدہ اٹھائے کیونکہ کسانوں کی اکثریت ناخواندہ اور تعلیم سے بے بہرہ ہے۔

دیہات میں ریڈیو کے ذریعہ کم ازکم اجناس و روئی وغیرہ کی تھوک فروشی کی خبریں نشر کریں تو اُن کی قیمتوں میں بہت فرق پیدا ہو جائے گا۔ مثلاً حیدرآباد و ناندیڑ میں چاول یا روئی کی اوسط قیمت اندرونِ ملک بذریعہ ریڈیو ہو جائے تو کاشتکار فوراً اپنا مال بڑی منڈی میں لاکر فروخت کرنے پر آمادہ ہو جائیں گے اگر وہ مال نہ بھی لائیں تو مقامی بنیے سے زیادہ قیمت حاصل کرسکتے ہیں۔ ریڈیو کے ذریعہ کسان کو ان تمام اُمور سے جو اُس کی زندگی سے قریبی تعلق رکھتے ہیں بہت جلد بہرہ ور کیا جاسکتا ہے۔

بہتر معاشرت دیہات سدھار اسکیم میں سب سے اہم مسئلہ کسان کی روزی کا ہے یعنی زراعت اور تجارتی کاروبار کی ترقی معاشرتی ترقی سے زیادہ ضروری ہے کیونکہ ایک بھوکا کسان محض تعلیم و تربیت سے فوراً اپنا پیٹ نہیں بھر سکتا۔ مگر اسے فطرت کی ستم ظریفی کہیے یا کسان کی بدقسمتی کہ اُس کی ساری زندگی کا انحصار ایک بہتر ترقی یافتہ اور متمدن معاشرت ہی پر ہے ریڈیو کے ذریعہ سے دیہات میں اصلاح معاشرت کی اسکیم بہت جلد کامیابی کے ساتھ رُوبہ عمل لائی جاسکتی ہے علمی اور فنی تقاریر ریڈیو کے ذریعہ سے نشر کی جاسکتی ہیں۔ مواضعات میں مفید اور موزوں رکارڈ، موسیقی اور ریڈیو ڈرامہ کے ذریعہ کسانوں کے لئے دلچسپی کے سامان فراہم کئے جاسکتے ہیں۔

جملہ امراض متعدی علی الخصوص ملیریا، چیچک، ہیضہ اور طاعون کے اسباب اُن کے انسداد کی مناسب اور فوری تدابیر اور اس کے علاوہ ضبط تولید کے متعلق معلومات کی اشاعت ریڈیو کے ذریعہ سے باحسن الوجوہ کی جاسکتی ہے۔ صفائی اور حفظانِ صحت کے اصول ہر روز کسانوں کو سمجھائے جاسکتے ہیں۔ توہمات قدامت پرستی اور مضر رسوم علی الخصوص نشہ بازی کا انسداد غیر منفعت بخش اغراض کے لئے قرضہ لینے کے مضر نتائج اور اُن کا انسداد کاروبار زراعت کے لئے انجمن امداد باہمی سے قرضہ حاصل کرنے کی ترغیب آپس کے نزاعات کا انسداد اور دیہاتی نوجوانوں میں اتحادی ذہنیت کی ضرورت، یہ اور اسی قبیل کے دوسرے اُمور جو کسان کی معاشرتی زندگی سے بالواسطہ یا بلاواسطہ تعلق رکھتے ہیں، ریڈیو کے ذریعہ بہت ہی آسانی کے ساتھ تکمیل پاسکتے ہیں

یورپ اور خصوصاً انگلستان اور جرمنی میں پختہ عمروں کی تعلیم کے لئے ریڈیو کا کثرت سے استعمال کیا جاتا ہے۔ انگلستان میں دور دراز مواضعات میں عام طور پر جو تعلیمی دشواریاں پیش آتی تھیں وہ لاسلکی سے بہت کچھ رفع ہوگئی ہیں۔ اور اس کی بدولت مختلف اُمور پر عوام کی معلومات میں اضافہ ہوتا جارہا ہے۔ مثلاً حفظانِ صحت، حفاظتِ اطفال، شہریت کے اُصول

اور روزمرہ کے معاشی مسائل وغیرہ۔ علاوہ بریں اُن کو روزانہ گھر بیٹھے اعلیٰ درجے کی موسیقی سننے کا بھی موقع ملتا ہے آخر میں دیہات میں ریڈیو کے پروگرام کے متعلق بھی چند اُمور غور طلب رہ جاتے ہیں۔ مختصراً اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ اِس قسم کے پروگراموں میں زبان سادہ سلیس اور عام فہم ہونی چاہیے اور خاص طور سے اُن میں تنوع اور مقامی رنگ کا خیال رکھنا چاہیے۔ بازار کی خبریں۔ مفید معلومات ضروری اور مفید مضامین اور دیگر مفید معلومات اُردو زبان کے علاوہ مقامی زبانوں میں بھی نشر کئے جانے چاہئیں۔

محمد عبد القوی

ریڈیو کی آواز کا پیام

فضائیں میرے قبضے میں، ہوائیں میری مٹھی میں　　مری دُنیائے دِل محدود، لندن میں نہ دہلی میں

مری سعیِ عمل دوش ہوا پر رقص کرتی ہے　　مری فطرت فضا میں اور دب دب کر اُبھرتی ہے

میں شعلہ بھی ہوں شبنم بھی، میں نغمہ بھی ہوں ماتم بھی　　میں نشتر کا اثر ہوں، اور سپرِ تسکین مرہم بھی

سیاست کی زباں جب مجھ سے اپنا کام لیتی ہے　　تو قدرت خود بخود میرا گریباں تھام لیتی ہے

فضا کے برق پارے مجھ سے کترا کر گذرتے ہیں　　مری باتوں پہ اربابِ محبت وجد کرتے ہیں

لبوں کی جنبشِ پیہم سے قایم زندگی میری　　نفس کے شعلہ ہائے گرم سے تابندگی میری

میں سچی ہوں، امانت میں خیانت کر نہیں سکتی
میں کھو سکتی ہوں موجوں میں ولیکن مر نہیں سکتی

ماہر القادری

ریڈیو اور موسیقی

جب میرے عزیز دوست صاحبزادہ میر محمد علی خاں صاحب میکش نے مجھ سے خواہش کی کہ میں سب رس کے ریڈیو نمبر کے لئے "ریڈیو اور موسیقی" پر اپنے خیالات کا اظہار کروں تو میں ان کی خواہش سے زیادہ اپنی مصروفیتوں کا محاسبہ کرنے لگا۔ بدقسمتی یا خوش قسمتی سے میں فطرتاً موسیقی کا دلدادہ ہوں اور موسیقی میری زندگی کا نصب العین رہی ہے۔ شاید شاعرانہ مبالغہ سمجھا جائے اگر میں یہ کہوں کہ میں زندگی کو موسیقی اور موسیقی کو زندگی سمجھتا ہوں۔ لیکن مجھے یہ بتا دینا چاہیئے کہ میں شاعر نہیں ہوں البتہ بہ حد امکان شعر کو موسیقی میں ڈھالنے کی کوشش ضرور کرتا ہوں۔ بہرحال شاعر اور مطرب کا ساتھ کبھی نہیں چھوٹتا۔ اس لئے ایک شاعر کی خواہش کو رد کرنا ایک مطرب کے بس کی بات نہیں تھی۔

دُنیا کی تمام نشرگاہوں میں پروگراموں کا زیادہ حصہ موسیقی سے پر کیا جاتا ہے' اس لئے کہ انسانی فطرت موسیقی سے ازلی لگاؤ رکھتی ہے۔ ہندوستان میں بھی موسیقی پر خاص توجہ کی گئی، اور اس فن میں ایسے ایسے اساتذہ پیدا ہوئے جن پر ہندوستان ناز کرسکتا ہے' لیکن افسوس ہے کہ اس فن نے وسعت حاصل نہیں کی۔ اس کے کافی وجوہ ہیں۔ فنِ موسیقی کے ماہرین زمانہ کی کروٹوں کو اب تک نہیں سمجھ سکے ہیں۔ ان میں گھرانے ہیں، اور ہر گھرانہ دوسرے گھرانے پر اپنے تفوق کا اظہار کرتا ہے۔ اور اس طرح ان گھرانوں میں فروعی اختلافات کی اس قدر کثرت ہے کہ کوئی متعدہ راہِ ترقی نظر نہیں آتی۔ اس کے علاوہ ہر اُستاد فن کو اپنے سینے میں محفوظ رکھنا چاہتا ہے اور اسے گوارا نہیں ہوتا کہ دوسرے بھی اُس سے مستفید ہوں۔ نتیجہ یہ ہے کہ اس کا فن اس کے ساتھ ہی قبر میں دفن ہو جاتا ہے۔ شاگرد ان سے جو کچھ سیکھتے ہیں وہ اَدھورا ہوتا ہے اور اُس اَدھورے پن میں بھی اختلافات کا وہی عکس نظر آتا ہے جس کی طرف میں نے اشارہ کیا ہے۔ فنِ موسیقی سے ہٹ کر عام پسند موسیقی نے زمانہ کی کروٹوں کے ساتھ ساتھ نئی نئی شکلیں اختیار کیں۔ اور اس میں کئی مکاتیب پیدا ہوگئے۔ بنگالی مکتب موسیقی رفتہ رفتہ مغربی موسیقی کے انداز کو جذب کر رہا ہے۔ پنجابی مکتب موسیقی اپنی دلکشی کے باعث مقبول ہوتا جا رہا ہے۔ مرہٹی مکتب موسیقی میں زیادہ تر فنی ٹھیراؤ کا خیال رکھا جاتا ہے۔ اور بعض نغموں میں مصری اور عربی طرز بھی جذب ہوتی جارہی ہے۔ مکاتیب گراموفون' گویا فلموں اور ریڈیو کے باعث ہر جگہ اپنا اثر ڈال رہے ہیں۔ اور سمجھا جاسکتا ہے کہ سننے والوں کی پسند آخر کار کسی ایک مکتب کو بہت آگے بڑھا دے گی۔ اور یہی مکتب ہوگا جس کو موجودہ ہندوستانی موسیقی کا ترجمان کہا جاسکے۔

بلاشبہ گراموفون' فلم اور ریڈیو موسیقی کے ذوق کو عام کر رہے ہیں لیکن ایک بات ہے جو ریڈیو کو گراموفون اور فلم سے الگ کر دیتی ہے۔ گراموفون ریکارڈز خراب ہوں تو لوگ انہیں نہیں خریدتے' فلم گھٹیا قسم کے ہوں تو لوگ اُنھیں نہیں دیکھتے لیکن ریڈیو کا ہر پروگرام ہر شخص سنتا ہے اور اپنی پسند اور اپنے ذوق کے مطابق اُس پر رائے زنی کرتا ہے۔ نشریات کا پروگرام بنانے والوں کو اس کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔ پھر بھی وہ ایک وقت میں ایک ہی چیز سے ہر ایک کو خوش نہیں کرسکتے۔ یہ ایک پرانا مقولہ سہی کہ "کوئی شخص ہر شخص کو خوش نہیں کرسکتا" لیکن نشریات میں اس کی فرسودگی اپنے سارے حقائق کے ساتھ اب بھی تازگی رکھتی ہے۔ بعض لوگ فنی موسیقی سے ناک بھوں چڑھاتے ہیں تو بعض عام پسند موسیقی کو سُن کر کانوں پر

ہاتھ رکھ دیتے ہیں۔ نشرگاہ والے دونوں کے اعتراضات کا شکار ہوتے ہیں لیکن دونوں کی فرصت کے لمحات کو خوشگوار بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔

محفلوں میں جو گانا ہوتا ہے اُس میں آواز کے ساتھ ساتھ مطرب کی حرکت وادابھی خراجِ تحسین حاصل کرنے میں مدد دیتی ہے، لیکن ریڈیو کے ذریعہ سے جو آواز بلند ہوتی ہے وہ صرف آواز ہی آواز ہوتی ہے۔ یہاں مطرب کا کمال یہ ہے کہ وہ دوسرے وسائل کے بغیر صرف آواز سے لوگوں کے دلوں میں جگہ حاصل کرے۔ ریڈیو چونکہ ہر شخص سنتا ہے اس لئے وہ ہر ذوق اور ہر پسند کو اپنی طرف کھینچے اور اس طرح خوش دلی کا ایک ماحول پیدا کرے۔ اس لحاظ سے ریڈیو کے مطرب کی ذمہ داریاں بہت بڑھ جاتی ہیں۔ وہ اسٹوڈیو میں بیٹھے ہوئے یہ اندازہ نہیں کرسکتا کہ سننے والے اس کی موسیقی سے کیا اثر قائم کر رہے ہیں۔ ایک طرف تو اُس کو اپنی شہرت کی برقراری کا خیال رکھنا پڑتا ہے اور دوسری طرف پروگرام کے تنوع کی خاطر اُس کا کمال کارکنانِ نشرگاہ کے تابع ہوتا ہے۔

ریڈیو پر موسیقی صحیح طور سے جاذبیت حاصل نہیں کرسکتی جب تک کہ مطرب اور سازوں کی سیٹنگ (setting) کا خیال نہ رکھا جائے۔ اگر سازوں کی آواز زیادہ ہوجائے اور مطرب کی آواز اس میں دب جائے یا مطرب کی آواز اور سازوں کی آواز میں کوئی توازن نہ ہو تو سننے والے کسی کمی کو محسوس کرتے ہیں۔ اور واقعہ یہ ہے کہ موسیقی کا صحیح لطف مطرب کی آواز اور سازوں کے توازن سے پیدا ہوتا ہے، یہ کسی نشرگاہ کے کارکنوں کا فرض ہے کہ وہ اپنی فنی معلومات کے پیشِ نظر اسٹوڈیو میں سیٹنگ (setting) کا صحیح اہتمام کریں۔

ایک غرض مطربوں اور کارکنانِ نشرگاہ میں مشترک ہے اور وہ یہ ہے کہ موسیقی میں جدت پیدا کی جائے۔ انسان فطرتاً تغیر پسند واقع ہوا ہے اور وہ ہر وقت تنوع چاہتا ہے۔ وہ مستقل طور سے کسی بات کو ایک طویل عرصہ تک برداشت نہیں کرتا۔ آج کل گراموفون ریکارڈز، فلموں اور ریڈیو کی وجہ سے موسیقی میں کافی جدتیں پیدا کی جا رہی ہیں۔ اگرچہ اُن میں سے بعض "ایجادِ بندہ" بن کر رہ گئی ہیں تاہم صحت بخش جدتوں کی ابھی بہت گنجائش ہے۔ موسیقی اپنے آپ میں کافی لچک رکھتی ہے اور آواز کو جس طرح چاہے استعمال کیا جاسکتا ہے۔ عام طور سے یہ مشہور رہا ہے کہ مطرب اپنی موسیقی کو شروع کرتے ہی پوری طرح مکمل کر نہیں گا نے سکتا۔ بلکہ اپنی آواز میں ایک قسم کا لبھاؤ اور کمال پیدا کرنے کے لئے وہ کچھ وقت چاہتا ہے۔ یہ واقعہ بھی ہے۔ لیکن ریڈیو پر ایسا نہیں ہوسکتا۔ اس کو کچھ وقت ملتا ہے۔ اِس محدود وقت میں اس کو اپنی ساری صلاحیتوں کا مظاہرہ کرنا پڑتا ہے۔ ریڈیو کا ہوشیار مطرب پہلے ہی سے اس کی تیاری کرلیتا ہے لیکن جو ایسا نہیں کرتا اُس کی آواز برقی لہروں کی شکل اختیار کرکے ریڈیو سٹ سے بلند ہوجاتی ہے اور وہ پھر اُسے واپس لاکر اصلی کمال کے ذریعہ ظاہر نہیں کرسکتا۔

اپنی مصروفیتوں کے باعث میں نے تفصیلی طور پر لکھنے سے احتراز کیا تاہم اس مختصر مضمون میں بعض بنیادی باتیں آگئی ہیں۔ وقت ملتا تو میں یہ بتانے کی کوشش کرتا کہ ریڈیو کے ذریعہ سے موسیقی کے مستقبل کو کس طرح بلند بنایا جاسکتا ہے۔

محمد عبد الرؤف

ریڈیو اور اُردو زبان

نشریات میں زبان کا مسئلہ کافی اہمیت رکھتا ہے۔ نشریات چونکہ انفرادی مفاد نہیں رکھتیں بلکہ اُس کے پیشِ نظر اجتماعی مفاد ہوتا ہے اس لئے نشریات کے لئے وہی زبان استعمال کی جاتی ہے جس کو اس کے زیادہ سے زیادہ سننے والے سمجھ سکیں۔ ہر ملک کی نشرگاہ اپنے لئے وہی زبان اختیار کرتی ہے جو قوم کی زبان ہو۔ اب سوال یہ ہوتا ہے کہ ہندوستان میں کونسی زبان نشریات کے لئے سب سے زیادہ موزوں ہے؟ یوں تو ہندستان کے مختلف ممالک سے مقامی زبانوں میں بھی کچھ نہ کچھ نشر ہوتا ہے لیکن مقامی نقطۂ نظر سے ہٹ کر جب سارے ہندوستان کے سامعین کا خیال کیا جائے تو لازمی طور پر ایک ہی زبان کا تصور کیا جا سکتا ہے جس کو ہندوستان کے ہر گوشے میں سمجھا جا سکے۔

یہاں اس تلخ حقیقت کو پھر دہرانا پڑے گا کہ ہندوستان میں زبان کا مسئلہ ابھی تک سیاسی خارزار میں اُلجھا ہوا ہے، اگرچہ اب جنگ کے موقتی اثر نے اس قسم کے مسائل کو پس منظر میں ڈال دیا ہے، لیکن ایک مشترکہ خطرے نے بھی اہلِ ہند میں اتحاد کی اسپرٹ نہیں پیدا کی ہے اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ جو مسائل ہنگامہ آرائی کا نتیجہ بنے ہوئے تھے، وہ دلوں کے گوشے میں اب بھی موجود ہیں۔ لیکن فائدہ یہ ہوا کہ بحثا بحثی سے ہٹ کر ہر مسئلہ اپنے مقام پر اپنی لچک کے مطابق آگے بڑھ رہا ہے۔ اُردو بھی ترقی کر رہی ہے اور ہندی بھی آگے بڑھ رہی ہے۔ "ہندی ہندستانی" قسم کا کوئی تیسر درمیان میں حائل نظر نہیں آ رہا ہے۔ ترقیوں کی یہی متوازی رفتار انجام کار وقت کے دھارے پر ایک جگہ مل جائے گی اور زمانہ خود بخود بتا دے گا ہندستان کی مشترکہ زبان کیا تھی اور کیا ہے؟

کچھ سال پہلے آل انڈیا ریڈیو نے اپنے سننے والوں سے ایک سوال کیا تھا کہ وہ کس زبان میں نشریات چاہتے ہیں؟ زیادہ تر سننے والوں نے اُردو کو پسند کیا۔ اِس سے ایک مشترکہ زبان کا صحیح تصور قائم کیا جا سکتا ہے۔ بہرحال آل انڈیا ریڈیو کی نشریات کا زیادہ تر حصہ اُردو ہی پر مشتمل ہے۔ یہ اور بات ہے کہ ہندستانی کے نام سے زبان میں ہندی الفاظ بھی ملا دئے جائیں۔

حیدرآباد ہمیشہ سے اُردو کی سرپرستی کرتا رہا ہے اور کون نہیں جانتا کہ اُردو کے اولین کارنامے بھی اِسی سرزمین پر اُجاگر ہوئے اور آج بھی "جامعۂ عثمانیہ" کی صورت میں اُس کی انتہائی ارتقائی صورت اسی سرزمین پر موجود ہے۔ حیدرآباد نے اُردو کو دفتری زبان کی حیثیت سے سرکاری معاملات میں جگہ دی اُسے ذریعۂ تعلیم بنا کر علم کو غیر مانوس زبانوں سے آزاد کیا اور اُس کو ذریعۂ نشر قرار دے کر اُسے گھر گھر پہنچایا۔ اُردو سے حیدرآباد کا یہ اُنس بلاوجہ نہیں ہے بلکہ اُس کے پیچھے ایک ناقابلِ انکار حقیقت کام کر رہی ہے۔ حیدرآباد میں اُردو کو ہر ایک بولتا ہے اور اگر بولتا نہیں تو سمجھتا ضرور ہے۔ یہ لکھتے وقت ہم اِس کا اچھی طرح احساس رکھتے ہیں کہ یہاں مقامی طور پر تلنگی، مرہٹی اور کنڑی زبانیں بھی بولی جاتی ہیں اور بعض لوگوں کا یہ اعتراض ایک حد تک درست ہے کہ تلنگی، مرہٹی اور کنڑی میں بھی نشریات ہونی چاہئیں شائد ہم میں سے اکثروں کے علم میں محکمہ لاسلکی کی وہ اسکیم ہے جس کے تحت صوبہ جاتی نشرگاہیں اورنگ آباد، ورنگل اور گلبرگہ میں بننے والی ہیں اور جہاں سے زیادہ تر مرہٹی، تلنگی اور کنڑی میں نشریات ترسیل کی جائیں گی۔ کوئی اسکیم ایک دم عملی طور پر صورت پذیر نہیں ہو جاتی۔ اس کو غور او تعمیر سے عمل تک پہنچنے میں کافی منزلیں طے کرنی پڑتی ہیں۔ بہرحال آج نہیں تو کل یہ اعتراضات خود بخود ختم ہو جائیں گے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ ایک مرہٹا ایک

تلنگے سے آخرکس زبان میں گفتگو کرتا ہے یا ایک کنڑی بولنے والے اور ایک تلنگی بولنے والے میں کونسی زبان ذریعۂ اظہار رہتی ہے؟ ہم میں سے ہر ایک جانتا ہے کہ وہ صرف اُردو ہی ہے۔ اِس لئے اگر مقامی نشرگاہ اُردو میں نشریات ترسیل کرتی ہے تو اُس پر اعتراض کرنا حقیقت سے اِحتراز کرنا ہے۔

سمندر پار کی بعض نشرگاہیں بھی ہندستانیوں کے لئے خاص طور پر ہندستانی پروگرام نشر کرتی ہیں۔ اور اُن کا پس پردہ مقصد "پروپاگنڈہ" ہے۔ ظاہر ہے کہ پروپاگنڈے میں جاذبیت اور دلکشی کے علاوہ وہ سب کچھ ہونا چاہیے جس کو سب قبول کرنے کے قابل ہوسکیں۔ یہ حقیقت دلچسپ ہے کہ سمندر پار کی تمام نشرگاہیں سوائے جاپانی کے جو ہندی میں پروگرام ترسیل کرتی ہے، ہندوستانیوں کے لئے اُردو میں پروگرام نشر کرتی ہیں۔ اُن لوگوں کو جو اُردو سے خار کھائے بیٹھے ہیں سوچنا چاہیے کہ ہندستان کی مشترکہ زبان کو سمجھنے میں اُنھوں نے آخر کیوں ایک "ہمالیائی غلطی" کی۔ ہمیں یقین ہے کہ اگر ذرا بھی اُنہیں اُردو کے مشترکہ زبان ہونے پر شبہ ہوتا تو وہ اسی زبان کو ذریعۂ نشر بناتے جو ہندستانیوں کے لئے عام طور سے عام فہم ہونے کی صلاحیت رکھتی۔ اِس لئے کہ اِس معاملے میں اُن کا غلط اندازہ اُن کے مقصد کی ہلاکت کا باعث ہوتا۔

جب یہ معلوم ہوگیا کہ ہندستان کے لئے اُردو ہی سب سے زیادہ موزوں ذریعۂ نشر ہے تو ایک سوال باقی رہ جاتا ہے کہ نشری زبان کیسی ہو؟ جواب یہ ہے کہ نشری زبان وہی ہو جس کو عوام آسانی کے ساتھ سمجھ سکیں۔ اِنتہا پسندی تحریر میں گوارا کی جاسکتی ہے اِس لئے کہ تحریر ہر ایک کے لئے نہیں ہوتی لیکن بول چال میں فطری طور پر اِنتہا پسندی ختم ہو جاتی ہے۔ کوئی شخص بات چیت میں تصنع نہیں پیدا کرتا۔ غیر ارادی طور پر اُس کی زبان سے وہی نکلتا ہے جس کو دوسرا سمجھ سکے۔ ریڈیو پر بھی جو کچھ بولا جاتا ہے وہ اصل میں ایک قسم کی گفتگو ہی ہوتی ہے۔ اِس لئے لازماً اُس میں بھی اِنتہا پسندی نہیں ہونی چاہیے۔ ریڈیو کی زبان سلیس اور عام فہم ہو تو اُس سے ایک تعلیم یافتہ بھی مستفید ہو سکتا ہے اور ایک عامی بھی۔

"آل انڈیا ریڈیو" جو اُردو زبان اِستعمال کرتا ہے وہ بعض وقت اِس قدر ہندی آمیز ہوتی ہے کہ اُسے صرف ہندی داں ہی سمجھ سکتے ہیں۔ اِس سلسلے میں کافی لکھا اور بولا جا چکا ہے، اس لئے تفصیلی طور پر کہنا بے ضرورت ہے۔

سمندر پار کی نشرگاہوں سے جیسا کچھ بولا جائے غنیمت ہے، صرف نشرگاہ حیدرآباد ہی ایسا نشری ادارہ ہے جہاں سے نشری زبان صحیح نشری معیار پر بولی جاتی ہے۔

ہمیں یاد پڑتا ہے کہ چند دن پہلے نشرگاہ حیدرآباد سے ڈاکٹر مولوی عبدالحق، خواجہ حسن نظامی، نیاز فتحپوری جیسے مستند اَدیبوں کی رائیں سُنائی گئی تھیں جن میں اُنھوں نے بتایا تھا کہ ہماری نشرگاہ اُردو زبان کی بجا طور پر خدمت کر رہی ہے۔ ایسے بلند پایہ اَدیبوں کی رائے میں ہماری طرف سے کسی اضافے کی گنجائش نہیں ہے، ہم نشرگاہ حیدرآباد کا ان تمام کی طرف سے شکریہ ادا کرتے ہیں جن کے دلوں میں اُردو زبان کی عظمت ہے۔

رفعت النسا لئیق

ریڈیو اور سُننے والے

کسی عقل مند نے کہا تھا کہ

کہے ایک جب سُن لے اِنسان دو
کہ حق نے زباں ایک دی کان دو

لیکن میں سمجھتا ہوں کہ یہ ریڈیو کی ایجاد سے پہلے کی باتیں ہیں۔ ریڈیو کی دنیا میں زبان اور کانوں میں اتنا فاصلہ رہتا ہے کہ سُننے کے بعد کہنے کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ مائیکرو فون کے سامنے بیٹھا ہوا تنہا مقرر بولے جاتا ہے اور اُس کو پرواہ نہیں ہوتی کہ اُس کے بول کوئی سُن رہا ہے کہ نہیں سُن رہا ہے۔ وہ اپنی گفتگو اُسی وقت ختم کرے گا جب اُس کا وقت ختم ہو جائے۔ چاہے سُننے والے اُس کی گفتگو کو پسند کریں یا نہ کریں۔ جس طرح بولنے والے کے لئے "قطع کلام" کرکے "معافی چاہنے والوں" کا کوئی اَندیشہ نہیں رہتا، اُسی طرح سُننے والے کے لئے بھی ریڈیو نے بڑی آسانی پیدا کر دی ہے۔ ہمیں بہت سے ایسے لوگوں سے سابقہ پڑتا ہے جن کی زبان قینچی کی طرح چلتی رہتی ہے اور جو ہماری چڑھی ہوئی تیوریوں اور بدلتے ہوئے زانوں کا کوئی خیال نہیں کرتے۔ لیکن جب کبھی ریڈیو پر کوئی بے سر و پا گفتگو شروع ہوتی ہے تو تیوری چڑھانے کی ضرورت ہے اور نہ زانو بدلنے کی۔ ریڈیو کی آواز کو ختم کر دینا ہم میں سے ہر ایک جانتا ہے۔ میں ذاتی طور پر ایسے بہت سے مقرروں کو جانتا ہوں جو ریڈیو پر بولتے ہیں لیکن اُن کی کوئی نہیں سُنتا اور ایسے سُننے والوں سے واقف ہوں جو تقریریں نہیں سُنتے لیکن ریڈیو چلاتے ہیں۔ بہرحال یہ معاملہ خود اعتمادی اور حوصلہ افزائی کا ہے، اُس سے نہ مقرروں پر اثر پڑتا ہے اور نہ سُننے والوں پر۔

سُننے والوں کی کئی قسمیں ہوتی ہیں۔ ایک سُننے والا وہ ہوتا ہے جو سُننے سے پہلے کہہ دیتا ہے، ایک وہ جو سُنتے سُنتے کہہ دیتا ہے اور کہتے کہتے سُن لیتا ہے۔ ایک وہ جو کہنے کے لئے سُنتا ہے لیکن سُننے کے لئے نہیں کہتا۔ ایک وہ جو ایک ہی وقت میں کہتا بھی ہے اور سُنتا بھی ہے۔ ایک وہ جسے کہنا آتا ہے سننا نہیں آتا۔ ایک وہ جسے سُننا نہیں آتا کہنا آتا ہے۔ ایک وہ جو سُن کر اُڑا دیتا ہے، ایک وہ جو اُڑا کر سُنتا ہے۔ ایک وہ جو کہنے والے کو سُننے پر مجبور کر دیتا ہے ایک وہ جو سُننے والے کو کہنے کا اِشتعال دِلاتا ہے۔ ایک وہ جسے ہر آواز پوری سُنائی دیتی ہے، ایک وہ جسے ہر بات دعوتِ جنگ معلوم ہوتی ہے۔ ایک وہ جو . . . . غرض "سننا" ایک عالمگیر فعل ہے جو مذہب، نسل اور رنگ کے اِمتیازات سے بالاتر ہے اگرچہ سیاست کا یہ بازی گر زمانہ کہنے سُننے اور سُننے کہنے ہی سے شُعبدے دکھا کر "جے" اور "زندہ باد" کے نعرے وصول کر لیتا ہے۔ بہرحال میں بازی گری اور شُعبدے بازی کو ایک ہُنر سمجھتا ہوں جس کو سُننے سے زیادہ دیکھنے میں اور دیکھنے سے زیادہ سُننے میں لُطف آتا ہے۔ اور اکثر جہاں کہیں سیاست کی ڈُگڈگی بجتی ہے تو ایسے بھاگتا ہوں جیسے بلّی کے گلے کی گھنٹی سے چوہے بھاگے تھے۔

آپ کسی محفل کا تصور کریں جہاں بھیرویں بائی گا رہی ہوں۔ سفید فرش پر گاؤ تکیے لگے ہوں۔ بڈھے اونگھتے اونگھتے جاگ رہے ہوں۔ جوان جھُوم رہے ہوں، نوجوان شرما رہے ہوں، اور بچے لڑ رہے ہوں۔ اور ہاں عورتیں چلمنوں سے خفا ہو کر جھانک رہی ہوں اور جھانک کر خفا ہو رہی ہوں۔ اِس محفل میں کیا نہیں ہوتا ہے گانا "دیکھا" بھی جاتا ہے۔

"سنا" بھی جاتا ہے۔ کان بہرے ہو جاتے ہیں، آنکھیں سننے لگتی ہیں۔ گانے سے زیادہ گانے والی کو داد ملتی ہے۔ اس لئے کہ محفل محض گانے کی نہیں ہوتی۔ اس محفل کے مقابلے میں آپ ایک دوسری محفل کا اندازہ کیجئے جہاں "ریڈیو" چل رہا ہو۔ بڈھے اپنے بیٹوں کی شکایت کر رہے ہوں۔ جوان سگریٹ پی رہے ہوں۔ نوجوان سازش کر رہے ہوں، بچے حسب معمول لڑ رہے ہوں، اور عورتیں چھالیہ کتر رہی ہوں۔ ایسی محفل میں آپ موسیقی کی توہین کے سوا کچھ بھی نہیں دیکھیں گے۔ ریڈیو چلتا رہے گا لیکن نہ تو نیاز میں گرم جوشی ہوگی اور نہ ناز میں بے نیازی۔ جاندار محفل میں بے جان موسیقی بڈھوں کی کھانسیوں، جوانوں کے قہقہوں اور بچوں کی سسکیوں میں کچھ اس طرح مل جائے گی کہ دونوں میں فرق کرنا مشکل ہو جائے گا۔ موسیقی کتنی ہی دل آویز کیوں نہ ہو، اُس کا اثر گانے والے کی صورت اور سننے والے کے جذبے سے بڑھ جاتا ہے اور آپ تو جانتے ہی ہیں کہ "بے ذوقِ نظر" "بزم تماشا" نہیں ہو سکتی۔ ایک ایسی محفل کا حال مجھ سے بھی سن لیجئے۔ محفل شروع ہوتی ہے۔

"آج گانا کس کا ہے؟"

"کسی کا نہیں"

"افسوس ہے"

"ریڈیو لگا دوں؟"

"ہوں۔ لگا دیجئے"

(کھانسی۔ گپ شپ۔ قہقہے)

"چھلبلیا نے توڑی ہے چمپا کلی"

"کون گا رہا ہے یہ"

"آ آ آ چمپا کلی"

"جی خیال خاں۔ !؟"

"او او او توڑی ہے"

"اِن کو گانا بھی آتا ہے"

(کھانسی)

"چھلبلیا"

"بند کر دیجئے اس کو"

"اوں اوں اوں" (بچہ روتا ہے)

"توڑی ہے آ آ ـــ"

"دوسری جگہ سے لگائیے۔"

"بھئی دستر خوان بچھ گیا ہے"

"چمپا کلی"

"چلئے اُٹھئے"

"توڑی ہے"

(گڑبڑ۔ ریڈیو بند)

یہ تو کسی محفل کا حال ہوا۔ اب ذرا "تنہائی" میں "ریڈیو" سننے والے کا حال دیکھیے وہ بے چارہ جی بہلائی کے لئے ریڈیو کھولتا ہے اور سوئی پھرانا شروع کرتا ہے۔

(۱) آنکھوں کا تھا کسور چھری دل پہ چل گئی

(کھٹ کھٹ)

(۲) پپیہا کُو کُو کا شور مچائے ہے۔

(کھٹ کھٹ)

(۳) افسوس ہے کہ آج کوئی تازہ خبر وصول نہیں ہوئی۔

(کھٹ کھٹ)

بابا امی جان بلا رہے ہیں۔

چائے خانے میں ریڈیو اسی طرح ضروری ہے جس طرح

"آج نقد کل اُدھار" والا تختہ۔ یہ نہ ہو تو غلّے کا صندوق خالی ہے اور وہ نہ ہو تو گاہکوں سے چائے خانہ بے نیاز ہو جائے۔ چائے خانے میں کچھ یوں شروع ہوتا ہے ریڈیو۔

(کھٹ کھٹ)

چائے گرمیوں میں ٹھنڈی اور سردیوں میں گرم ہوتی ہے۔ تھکن اُتارنے کے لئے چائے کی ایک پیالی کافی ہے۔

"گانا لگاؤ"

"ایک پتی پان۔ بغیر ملائی کی دو پیالیاں"

"دوسری جگہ سے ملاؤ"

"اچھی تقریر ہو رہی ہے رہنے دو نا"

"کون سنے یہ 'اجاڑ تقریر'"

"ہم تو تقریر ہی سنیں گے"

"ہم گانا سنیں گے"

"ہم تقریر"

"ہم گانا"

"جانے دو نا بھائی کیوں جھگڑتے ہو"

(گڑ بڑ۔ خاموشی)

"ابھی آپ "چائے" پر ایک تقریر سن رہے تھے۔ اب گانا سنیئے"

"محمد شاہ رنگیلے"

"واہ آواز میں کتنا درد ہے"

"مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بے چارے کو درد ہو رہا ہے"

"کیا اچھا گوّا لگایا بھئی"

"بھونک رہا ہے یہ تو"

"اسے واہ"

"یوں ہی مرجائے گا گاتے گاتے"

"کیا کہنے"

"کان کے کیڑے مرگئے"

"گانا سننے کی تمیز ہے تم کو"

"منہ سنبھال کر بات کرو"

"خاموش"

"ہوں۔ دیکھو مزا"

(گڑ بڑ۔ خاموشی)

ہمیں اب پرسوں صبح تک کے لئے اجازت دیجئے آداب عرض۔

بہر حال انسان نہ تو بے روزگاری سے مطمئن ہے اور نہ جاہلیت سے اس لئے وہ بعض وقت واقعات سے لڑتا ہے اور بعض وقت تصورات سے۔ اسی لڑائی میں اس کی زندگی ختم ہو جاتی ہے۔ چنانچہ ریڈیو سٹ سے جو آواز سنائی دیتی ہے، وہ پسند بھی کی جاتی ہے اور اعتراضات کی زد میں بھی آتی ہے۔ بعض سننے والے اچھی چیزوں کو سن کر اُڑا دیتے ہیں اور بُری چیزوں پر پنجہ مارتے ہیں اور بعض سننے والے جب سنتے ہیں آستین چڑھا کر سنتے ہیں اُن کا بس چلے تو ہر گانے یا بولنے والے کو قتل کر کے خود خودکشی کرلیں۔ چونکہ اُن میں قتل کرنے کا حوصلہ ہوتا ہے اور نہ خودکشی کی "اخلاقی جرات" اس لئے وہ سنتے ہیں اور نہیں سننا چاہتے۔

یہ کوئی ضروری نہیں کہ ہر بات ہر شخص کو پسند آئے اور نہ یہ ضروری ہے کہ کوئی بات ہر شخص کو ناپسند ہو۔ نشر گاہ والے سب کا خیال رکھتے ہیں اس لئے ہر ایک کے لئے کچھ نہ کچھ دیتے ہیں۔ اب یہ سننے والوں کا کام ہے کہ وہ پروگرام سے

اپنی پسند کا حصہ چن لیں اور ناپسند حصہ اُن کے لئے چھوڑ دیں جن کو وہ پسند ہو۔ یہ کوئی قانونی فرض نہیں ہے کہ کسی نشرگاہ کا پورا پروگرام سنا جائے۔ یہ اور بات ہے کہ بیوی نے ریڈیو سٹ پر قبضہ کر لیا ہو اور شوہر مجبور کیا جا رہا ہو کہ . میرا مطلب یہ ہے کہ بیوی کی پسند انجام کار شوہر کی پسند ہو جاتی ہے۔ یا کسی مہمان کے ہاتھ میں ریڈیو سٹ کی سوئی آگئی ہو اور اخلاقاً ہم مسکرا رہے ہوں۔

اکثر سننے والوں کو پوری طرح سے ریڈیو چلانا بھی نہیں آتا۔ وہ گانے یا کہنے والے کی آواز کو بعض وقت اس قدر کم کر دیتے ہیں کہ وہ نزع کی حالت میں معلوم ہوتا ہے اور پھر اس طرح ابرو میں گرہ ڈالتے ہیں جیسے کفن دفن کا انتظام اُن ہی کو کرنا ہے۔ اور بعض وقت اس قدر بلند کر دیتے ہیں کہ جیسے کہیں آگ لگ گئی ہو اور بے سہارا انسان مدد کے لئے چلا رہا ہو یا راکھشس دانت پیس رہے ہوں اور پھر اس طرح خیال فرمایا جاتا ہے کہ اُس کے حلق میں چار سوراخ ہیں۔ غرض جب تک سننے والوں میں ذوقِ سماعت نہ پیدا ہو اور وہ ریڈیو سٹ پر آواز کے حجم کو صحیح طور سے موصول کرنے کے قابل نہ ہوں۔

تھرتھری آواز کو یا تو نشرگاہ کی فنی خرابی سمجھا جائے گا یا ریڈیو سٹ کا نقص۔

ایک سُننے والا

حیاتِ محمد قلی قطب شاہ

حضرت مولانا عبد الماجد صدق میں تحریر فرماتے ہیں:- "قدرت نے اس کام کے لئے ڈاکٹر زور کو چن لیا۔ اور انھوں نے اس موضوع پر لکھنے کا حق ادا کر دیا۔ خادمِ زبان و ادب ہونا تو ان کا پہلے ہی سے مسلّم تھا۔ مورخ وہ اب نکلے۔ کتاب قابلِ دید ہے۔ مفصل بھی، جامع بھی، اور بہ قدر امکان مستند بھی۔ مورخانہ شان، ادبی آن، دونوں موجود۔ ہر عبارت سلجھی ہوئی اور شستہ، ہر بحث سنجیدہ اور شائستہ۔"

مولانا نیاز فتحپوری نے "نگار" میں لکھا ہے:- "پروفیسر زور کی یہ تالیف دونوں حیثیتوں سے مکمل ہے۔ یہ تصنیف فن سیرت و انتقاد کے موجودہ اصول کو سامنے رکھ کر مرتب کی گئی ہے۔ ہر حیثیت سے معیاری چیز ہے۔ جس محنت و سلیقہ سے کام کیا ہے اس کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔"

مولوی حکیم یوسف حسن صاحب نے "نیرنگ خیال" میں لکھا کہ:- "یہ علمی کتاب دیکھ کر دل کی آنکھیں روشن ہو گئیں۔ ہمارے خیال میں اردو زبان میں اتنی اچھی کتاب سالوں میں شائع نہیں ہوئی ہوگی۔ تذکرہ اس مدلل و مفصل علمی پیرایہ میں پیش کیا ہے کہ بے اختیار داد دینے کو دل چاہتا ہے۔ تیاری میں بلاشبہ سیکڑوں پرانی کتابوں کا مطالعہ کیا ہوگا اور کئی سال اس کی تیاری میں صرف کر دیئے ہوں گے۔

ہمارے خیال میں تذکرہ سلطان محمد قلی سنہ ۱۹۴۰ء کی بہترین تصنیف ہے۔"

مولوی قاضی عبد الغفار صاحب "پیام" میں لکھتے ہیں:- "سوانح حیات لکھنے کا ایک نیا طرز اسلوب اختیار کیا ہے اور اس لحاظ سے ہم سمجھتے ہیں کہ یہ اپنی قسم کی پہلی کتاب ہے۔ ... تحقیقاتی کوشش اہل علم اور نیز عوام کے حلقوں میں قدر کی نظر سے دیکھی جائے گی۔"

ریڈیو اور شعر

شعر اور ترنم سے موسیقی پیدا ہوتی ہے اس لئے موسیقی کا تصور شعر کے بغیر ایک بے معنی تصور رہ جاتا ہے۔ اگرچہ موسیقی کے بعض مقامات شعر کے محتاج نہیں رہتے لیکن ان کی تعریف سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ جہاں تک محض "فن" کا تعلق ہے، اس قسم کے مقامات کی قدر وقیمت باقی رہ سکتی ہے لیکن جہاں اثر کا سوال پیدا ہوتا ہے، وہاں شعر بھی اسی قدر ضروری ہے جس قدر کہ موسیقی۔ آواز میں سریلا پن ہو لیکن سُر کا خیال رکھا جائے تو شعوری یا غیر شعوری طور پر جو لے کبھی پیدا ہوتی ہے یا سُر کی بلندی رہ کو ایک کرخت آواز جس طرح سمع خراش بن جاتی ہے اسی طرح شعر کے بغیر موسیقی صرف کانوں کو لبھا سکتی ہے اور ممکن ہے بعض وقت دلوں کو بھی گدگدا دے لیکن انسانی حیات پر اس کا گہرا اثر نہیں پڑ سکتا۔ صرف سرگم الاپ کر یہ دعویٰ نہیں کیا جا سکتا کہ انسانی جذبات کو متاثر کیا گیا ہے۔ یہاں یہ اعتراض ہو سکتا ہے کہ انسانی وجدان تو ایسی آوازوں پر بھی جھوم جاتا ہے جن کا کوئی مفہوم نہیں ہوتا۔ بانسری کی آواز سے اس کے لہو میں کیوں بجلیاں بہنے لگتی ہیں؟ یا سمندر کی مترنم لہریں کیوں اس کو ایک عالمِ کیف میں کھو دیتی ہیں؟؟۔ یہ بلاشبہ بانسری کے لئے اور لہروں کے ترنم میں محسوس کرنے والے کے لئے ایک اثر ہے۔ لیکن اس کو صرف موسیقی کی تاثری دنیا کا ایک گوشہ سمجھا جا سکتا ہے اس کا مکمل اثر صرف اس کی صوتی کیفیت میں نہیں ہے بلکہ جب وہ الفاظ کا سہارا لے کر کسی کیفیت کی ترجمانی کرتی ہے تو سمجھئے کہ اس میں جذباتِ انسانی گم ہو گئے۔ محض آواز کے ذریعے پیدا ہونے والی موسیقی ہوا میں تحلیل ہو جاتی ہے لیکن وہ موسیقی جو شعر کے روپ میں بلند ہوئی ہو، آواز کو گم کر کے الفاظ چھوڑ جاتی ہے اور یہ الفاظ اپنے میں موسیقی کے ارتسامات بھی رکھتے ہیں۔ ہر شخص "تان" نہیں لگا سکتا لیکن ہر شخص شعر یاد رکھ سکتا ہے۔ بہرحال اس بحث سے قطع نظر کہ شعر موسیقی کا تابع ہے یا موسیقی، شعر کی محکوم، یہ ماننا پڑتا ہے کہ شعر اور موسیقی میں غیر منقطع تعلق ہے۔ اس لئے محض شعر یا محض موسیقی سے وہ اثر پیدا نہیں ہوتا جو شعر و موسیقی کی ہم آہنگی سے پیدا ہوتا ہے۔ فنِ شاعری کے وہ "استاد" جو ترنم کے ساتھ اپنا کلام سنانے والے شاعروں کا مضحکہ اڑاتے ہیں یا موسیقی کے وہ ماہر جو ناقابلِ فہم آوازوں کے ذریعے سے راگ راگنی ادا کرتے ہیں، صرف ان ہی کو متاثر کر سکتے ہیں جو ایک "خشک تنقید" کو اپنا سرمایۂ ذوق سمجھتے ہوں۔ لیکن حُسن کاری کا بلند مقام محض "فن" کی تلخیوں میں پرورش نہیں پاتا بلکہ وہ براہِ راست انسان کے جمالیاتی ذوق کے سامنے آتا ہے۔ اور اس کی یہ صلاحیت کہ وہ سننے والے کو اپنے آپ میں جذب کر کے ہر ایک پر خواہ وہ فن داں ہو یا فن سے بیگانہ اثر انداز ہوتی ہے۔

موجودہ دنیا کے میکانکی ذرائع نے بہت سی چیزوں کو عالمگیر بنانے میں کافی مدد دی ہے۔ موسیقی، پہلے زمانے میں کسی طرح پھیلی ہو لیکن آج کل گراموفون ریکارڈز، فلموں اور ریڈیو کے ذریعے اس کا چلن عام ہو گیا ہے۔ اور اب "اہتمامِ جشن" یا "انتظارِ دعوت" کے بغیر اس سے لطف اندوز ہونے کے مواقع حاصل ہو گئے ہیں۔ اس لئے عمرانی نقطۂ نظر سے یہ غور کرنے کی ضرورت ہے کہ موسیقی کے لئے کیسے شعروں کی ضرورت ہے۔

علامہ اقبال نے فرمایا ہے کہ ع

شعر سے بڑھ کر نہیں دنیا میں تفسیرِ حیات

میں ان ہزاروں شعراء کو جن کی آواز مشاعروں میں خراجِ تحسین حاصل کرتی ہے چیلنج کرتا ہوں کہ وہ اپنے شعروں میں حیات کا کوئی پہلو بتائیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اب شاعروں کا ایک گروہ ایسا پیدا ہو گیا ہے جس نے تصوری دنیا سے ہٹ کر واقعات کی دنیا میں قدم رکھا ہے لیکن ان بے شمار خوش فکروں کی آواز تو ابھی کم نہیں ہوئی جو ناقابلِ فہم زندگی میں ابھی تک مبتلا ہیں۔ جن کی محبت کا معیار، یاروں کی ٹھوکروں، معشوقوں کی گالیوں، اور خود کی رسوائیوں سے بنتا ہے اور جو زندگی میں مر جاتے ہیں، اور مرنے کے بعد معشوق کی شکایت کرتے ہیں۔

آپ کسی ایسی محفل میں جائیے جہاں کوئی مطرب گا رہا ہو یا ریڈیو سیٹ کی سوئی گھما کر کسی ہندستانی نشرگاہ کا پروگرام سنئے۔ آپ کو زیادہ تر ایسے ہی شاعروں کا کلام سنائی دے گا جو ایک اخلاقی نزع میں سسکیاں بھرتے ہوئے آپ کو بھی اپنے جہنم کی طرف بلا رہے ہیں۔ یہ کیا تماشا ہے کہ ہم بازاری محبت کی داستان سنتے ہوئے شرماتے ہیں لیکن جب کبھی وہ شعر کے ذریعے سنائی جاتی ہے تو ہماری زبان سے "واہ" نکل جاتی ہے۔ کم سواد شاعروں کی گندگی، نادان مطربوں کے ذریعے اچھلتی ہے اور ہم اسے پھول سمجھ کر اپنے دامن میں رکھ لیتے ہیں۔ کیا اس مشرق کا یہی معیارِ اخلاق ہے جس نے جائز محبت کو بھی ایک "گناہ" بنا دیا ہے۔ کسی "عورت" کی طرف دیکھنا جہاں ناقابلِ معافی جرم ہو، وہاں بے حساب شاعروں کی سوقیانہ محبت کے چرچے ملے پڑھائے جاتے ہیں۔ کوئی بوس و کنار میں مبتلا ہے۔ کوئی دیوار کے سائے میں بیٹھا آہیں بھر رہا ہے، کوئی گلیوں میں خاک چھان رہا ہے۔ کوئی رقیبوں کے ساتھ کشتی لڑ رہا ہے اور ہم ان کے کارناموں کو جھوم جھوم کر سن رہے ہیں۔ ان دیوانوں کو چھوڑیئے جو گریبان چاک کرکے صحرا کی طرف نکل گئے ہیں اور ان زندہ لاشوں کو بھی دفنا دیجیے جن کے معشوق زلف بکھرائے ہوئے سوگوار نظر آرہے ہیں اور جن کے سرہانے شمع بجھ رہی ہے لیکن ان سورماؤں کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے جن کا درجہ قیس و فرہاد سے کسی طرح کم نہیں ہے؟ —— کیا آپ نے کبھی ایسی محبت کی ہے۔ یا آپ کی نظر میں کوئی ایسا ہے جس نے اس قسم کی محبت کی ہو! —— تو پھر یہ سب کچھ کیا ہے؟ ایک اخلاقی پستی ہے جس کا ہماری دنیا میں کوئی مقام نہیں۔ فرضی محبت کی ہڈیوں کو چنچوڑنے والے یہ تو سمجھیں کہ اب وہ خود بے وقوف بن کر دنیا کو بے وقوف نہیں بنا سکتے۔

دنیا کی بہت سی مفید چیزوں کو جہاں غلط طور سے استعمال کیا گیا ہے، وہاں ہندستان میں "شعر اور شعر کے ذریعے موسیقی کو بھی اسی طرح برباد کیا جا رہا ہے۔ ایسے شعر اور ایسی موسیقی کا زہر عام نہ ہوتا اگر گراموفون ریکارڈ، بولتے فلم اور ریڈیو ان کی اشاعت میں مدد نہ دیتے۔ افسوس ہے کہ اکثر گراموفون کمپنیاں اور فلم ساز ادارے ابھی تک ایسے ہاتھوں میں ہیں جن کی نگاہیں اپنے مالی مفاد سے آگے بڑھنے نہیں پاتیں۔ اس لئے اس بارے میں ان سے کچھ کہنا بے کار ہے۔ لیکن ہندستانی نشرگاہوں کا تو یہ فرض ہے کہ وہ اپنے سننے والوں کے کانوں کو ہر مخربِ اخلاق آواز سے آلودہ نہ کریں۔ ریڈیو کو ہر شخص سنتا ہے اس لئے کون نہیں جانتا کہ اس کی وجہ سے کردار اور ذوق متاثر ہو رہے ہیں۔ میں یہ جانتا ہوں کہ ہندستانی نشرگاہوں کے پروگراموں کے بعض اجزا یقیناً عوام میں ایک ذہنی شعور پیدا کر رہے ہیں۔ ان سے معلوماتی تقریریں نشر ہو رہی ہیں وہ حالاتِ حاضرہ سے واقف کرکے محدود دنیا میں زندگی بسر کرنے والوں کو ایک وسیع دنیا کی طرف لے جا رہے ہیں۔ وہ علم و ادب کا ذوق عام کر رہے ہیں۔ ان سے ایک قومی خدمت ہو رہی ہے لیکن اپنی نشرگاہوں کے اس ادبی پہلو سے ہٹ کر جب موسیقی کے پروگراموں پر نظر ڈالی جائے تو ہمیں وہی گری ہوئی حالت دکھائی دیتی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ نشرگاہوں نے یا تو موسیقی اور شعر کی اہمیت کو محسوس نہیں کیا ہے یا انھوں نے اس طرف توجہ نہیں کی۔ مجھے یقین ہے کہ نشرگاہ کا کوئی کارکن کسی عورت کسی بچے اور کسی اجنبی کے سامنے

پیا ہنس بنوا اور جگ جاؤ بکھرے ہوئے موتی جوبن کے

کہنا گوارا نہیں کرے گا۔ لیکن وہ اس قسم کے خیالات کو گواتا ہے اس کو ہزاروں بچے اور ہزاروں عورتیں سنتی ہیں۔ یہ کیسی بربادی ہے!!

اس سلسلے میں، میں کارکنانِ نشرگاہ کی دقتوں سے اچھی طرح واقف ہوں۔ بدقسمتی سے موسیقی کے فن کاروں کی زیادہ تعداد ان پڑھ ہے۔ ان میں اچھے اور برے کو سمجھنے کی تمیز ہی نہیں۔ اس لئے وہ جو کچھ رٹ لیتے ہیں، اسی کو دہراتے پھرتے ہیں۔ جب نشرگاہ کے کارکن ان کو اچھے کلام کی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں تو انہیں دو بنیادی دقتوں سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ پہلی دقت تو خود کلام کا انتخاب ہے، اور دوسری دقت، اس انتخاب کو فن کاروں کی زبان تک پہنچانے

اداکرہ امار اردو شاعری کا زیادہ حصہ خرافات سے بھرا ہوا ہے۔ جو کلام اچھا ہے، اس میں غنائی کیفیت نظر نہیں آتی۔ اچھے معیار کے ساتھ غنائی کیفیت رکھنے والا کلام بہت ہی کم ہے۔ اور جب وہ اس مسئلے کو طے کرتے ہیں تو پھر ان کے سامنے اس سے بڑا مرحلہ ہوتا ہے جس کی دشواری سے وہی واقف ہیں جنھوں نے "حسن کاری" کو کھوٹے سکے کی صورت میں کاروباری تلخیوں سے الجھتے ہوئے دیکھا ہے۔ ان پڑھ فن کار ایک پروگرام کی خاطر نئے کلام کو یاد کرنے کی دردِ سری قبول نہیں کرتے اور قبول بھی کرتے ہیں تو نشر گاہ کے کارکنوں کو ایک ہی پروگرام کی بہتری کے لئے بہت زیادہ وقت صرف کرنا پڑتا ہے۔ یہ دشواریاں بلاشبہ ہیں لیکن کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ اچھے مقرروں اور اچھے ڈراما نویسوں کے ساتھ ایسے اچھے شاعروں کی خدمات بھی حاصل کی جائیں جو عصری رجحانات کو پیشِ نظر رکھ کر گانے کے لئے خاص طور پر کلام تصنیف کر سکیں۔ اگر نشر گاہیں متوجہ ہوں تو قدیم اور جدید شاعروں کے کلام کا ایک ایسا حصہ بھی ضرور ہاتھ آئے گا جو بلند تر مقاصد میں کام آ سکے۔ اور ایسا کلام لکھوایا بھی جا سکے گا جس کی افادیت کردار کو بنانے، ذوق کو بلند کرنے اور ایک ادبی شعور پیدا کرنے میں مدد دے سکے۔ فن کاروں کو تیار کرنے کی دشواری ضرور باقی رہے گی لیکن نشر گاہوں سے چونکہ ان کا اقتصادی مفاد وابستہ ہے، اس لئے اب نہیں تو کچھ عرصے کے بعد ترغیب اور تحریص انہیں آمادہ کر دے گی۔ اس طرح اچھا کلام گایا جائے گا اور اچھا کلام سنا جائے گا۔

نظم بدقسمتی سے موسیقی میں غزلوں کو ایسی مقبولیت حاصل ہو گئی ہے کہ نظموں کی طرف توجہ نہیں کی گئی۔ واقعہ یہ ہے کہ اردو کی بہت سی غزلیں اچھی ہیں، لیکن ان میں معیاری نظموں کا کافی ذخیرہ موجود ہے۔ بہت سی ایسی نظمیں بھی ملیں گی جو اپنے مترنم الفاظ اور مترنم لہجہ کی وجہ سے گائی جا سکتی ہیں اثر پیدا کر سکتی ہیں۔ بعض نظمیں ایسی ہیں جن کے ہر شعر میں قافیے بدل جاتے ہیں لیکن ان کی غنائی صلاحیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اس لئے ضرورت ہے کہ موسیقی میں ایسی تمام نظموں کو رواج دیا جائے اور غزلوں کے اثر کو کم کیا جائے۔ چند غزلوں کے سوا تمام غزلوں میں محبت کی داستانیں ہیں۔ بلاشبہ محبت کی جا سکتی ہے اور محبت ہو سکتی ہے۔ محبت کسی دور میں ختم نہیں ہوئی لیکن محبت کو بدنام کرنے سے کوئی فائدہ نہیں۔ محبت ایک روحانی جذبہ ہے جو اپنی دنیوی پستیوں کے باوجود اس قابل تو نہیں کہ اسے روندا جائے۔ محبت کے متعلق بھی ایسے اشعار گوائے جا سکتے ہیں جن میں عریانی نہ ہو اور جو کسی دوسری دنیا کی محبت کا ناقابلِ فہم تخیل پیش نہ کریں۔

گیت اردو کی موجودہ شعری بدہضمی نے شاعروں کو گیتوں کی طرف زیادہ متوجہ کر دیا ہے۔ چونکہ ہر شاعر کی فکرِ سخن شہرت کی خواہش رکھتی ہے، اور اب سٹریلوں کی مدد سے ریڈیو، گراما فون اور فلموں کے ذریعے اپنے کلام کو مشہور کرنے میں آسانی ہو گئی ہے اس لئے گیتوں کی طرف ان کا متوجہ ہونا تعجب خیز بات نہیں۔ لیکن سطحی شاعروں کے ہاتھوں، گیت کا بھی وہی حشر ہوا جو دوسری اصنافِ سخن کا ہوا تھا، ہزاروں ایسے گیت عام ہو گئے ہیں، جنھوں نے گری ہوئی غزلوں سے زیادہ عوام میں بدمذاقی پیدا کر دی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ چند الفاظ ہیں (جیسے پریم، پنگھٹ، ساجن، کوئل، پپیہا، وغیرہ) اور ان ہی کو تقلیدی انداز سے جما دینے کا نام "گیت" پڑ گیا ہے۔ چونکہ گیت اپنے غنائی بہاؤ کی وجہ سے موسیقی کے لئے زیادہ کارآمد ہوتے ہیں اور ان کی چلتی ہوئی طرزیں عوام میں بہت جلد مقبول ہو جاتی ہیں اس لئے ان کی طرف بہت زیادہ توجہ کی ضرورت ہے۔ طرزوں سے فائدہ اٹھا کر بلند مقاصد میں گیتوں سے کافی فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔ جو لوگ عوام کے ذوق کا قریب سے مطالعہ کرتے ہیں، وہ جانتے ہیں کہ عوام ان گیتوں کے علاوہ جو ادنیٰ جذبات کو مشتعل کرتے ہیں

ایسے گیتوں کو بھی بہت زیادہ پسند کرتے ہیں جن کی دل آویز طرز ہوتی ہے۔ وہ الفاظ سے زیادہ طرز کو پسند کرتے ہیں لیکن طرز کی وجہ سے رفتہ رفتہ الفاظ سے بھی وہ فائدہ اٹھانے لگتے ہیں۔ مجھے اپنے دوست کے ایک ملازم کا واقعہ معلوم ہے جس نے "آؤ ساجن جی بہلائیں" کو گنگنا گنگنا کر آخر کار ایک مالن سے ایسی ہی خواہش کر دی تھی اور مالی سے پٹا تھا۔ ایسے گیت جو چلتی ہوئی طرز پر منطبق ہو سکتے ہوں، تعمیری مقصد کے لیے لکھے جائیں تو یقیناً عوام میں ان کا بڑا اچھا اثر ہوگا۔ مثلاً اس گیت کو لیجیے جو فلم بندھن میں گایا گیا ہے "چل چل رے نوجوان"۔ اس گیت کے بعض بند بڑے اچھے ہیں اگرچہ اس کو اور اچھی طرح لکھا جا سکتا تھا۔ رفتہ رفتہ یہ گیت کافی مقبول ہوگیا ہے۔ چونکہ اس میں ایک پیام ہے۔

دور ترا گاؤں ٭ اور تھکے پاؤں
پھر بھی تو ہر دم ٭ آگے بڑھا قدم
رکنا ترا کام نہیں چلنا تری شان
چل چل رے نوجوان

تو آگے بڑھے جا ٭ آفت سے لڑے جا
آندھی ہو یا طوفاں ٭ پھٹتا ہو یا آسمان
رکنا ترا کام نہیں چلنا تری شان
چل چل رے نوجوان

اس لئے کون کہتا ہے کہ غیر شعوری طور پر نوجوان ذہنیتوں پر اس کا اثر نہیں پڑ رہا ہے۔ ان گیتوں سے قطع نظر جن کو شاعروں کی بدمذاقی نے غلط طریقے سے پیش کیا کچھ گیت بہت اچھے مل سکتے ہیں اور اچھے گیت لکھوائے بھی جا سکتے ہیں۔

دوگانے | دوگانے سے ایک شعری مکالمہ مراد ہے جو موسیقی کے ذریعے ادا کیا جاتا ہے۔ ایسے تمام دوگانے جن کو ہندستانی موسیقی نے پیش کیا ہے ابھی تک پست محبت سے آگے نہیں بڑھ سکے ہیں۔ اس مکالمہ کا مقصد بھی اظہار محبت ہی سمجھا گیا ہے۔ حالانکہ دو آدمیوں میں صرف محبت ہی پر گفتگو نہیں کی جاتی۔ ایسے ہزاروں موضوع ہیں جو بہ آسانی شعری سانچوں میں ڈھالے بھی جا سکتے ہیں اور جن کے متعلق گفتگو بھی ہو سکتی ہے۔ علامہ اقبال کا لکھا ہوا وہ مکالمہ ہی لیجیے جس میں ابلیس اور جبرئیل" بات چیت کرتے ہیں۔ اس مکالمہ کو حیدرآباد ہی میں کئی دفعہ اسٹیج پر پیش کیا جا چکا ہے اور مجھے یاد پڑتا ہے کہ وہ کسی ہندستانی نشرگاہ سے نشر بھی ہو چکا ہے۔ حیدرآباد سے بچوں کے پروگرام میں "بی بی اور بابو" کے دوگانے کے نام سے ایک مکالمہ نشر ہوا تھا، جس میں ناروں سے متعلق بچوں کی معصوم گفتگو کو شعر و موسیقی کا جامہ پہنایا گیا تھا۔ اس قسم کے دوگانے جن کا کوئی تعمیری مقصد ہو یقیناً تھوڑے دنوں میں چل نکلیں گے اور "ساجن سجنی" یا "پیارے' پیاری" کے سارے بندھن ٹوٹ جائیں گے جن کا ٹوٹنا، ریاکاری کی ہلاکت کے برابر ہے۔

آپرا اور غنائیے | غنائیہ (Musical Features) گیتوں کے ذریعے سے ایک مربوط کہانی کو پیش کرتا ہے، لیکن جس میں مختصر مکالمے گیتوں میں ایک تسلسل پیدا کرتے ہیں۔ حیدرآباد سے جو غنائیے اب تک نشر ہوئے ہیں، انھوں نے کافی مقبولیت حاصل کی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ شعر اور ڈراما دونوں ہی سننے والوں کے لئے کافی جاذبیت رکھتی ہے۔ جس طرح ڈرامے کے ذریعے سے ایک ذہنی انقلاب پیدا کیا جا سکتا ہے، اسی طرح غنائیے کے ذریعے سے بھی ممکن ہے۔ اردو میں مطبوعہ غنائیے میری نظر کے سامنے نہیں ہیں اور میں سمجھتا ہوں کہ وہ اتنے کم لکھے گئے ہیں جن کو نہ ہونے کے برابر کہا جا سکتا ہے۔ میں یہاں مثال کے طور پر ایک غنائیے "اندھی بھکارن" پر نظر ڈالوں گا۔

"اندھی بھکارن" میں سماج کا ایک ایسا گوشہ پیش کیا گیا ہے جو ہمیشہ ہماری نگاہوں کے سامنے رہتا ہے لیکن جس کی طرف ہم توجہ نہیں کرتے۔ ایک اندھی بھکارن ٹھوکریں کھاتی ہوئی راستے پر بھیک مانگتی ہے۔ رہرو اس کو دھتکارتے ہیں۔ لوگوں کی گالیاں سنتی ہے۔ اور اپنی خالی جھولی لئے ہوئے چلاتی ہے

خالی ہے یہ ٹاٹ کی جھولی ٭ آن دیکھا سپنا ہے ڈولی
یوں ہی جیوں یہ قسمت بولی ٭ کوئی ساتھ نہ ساجن ہا!
کوئی ساتھ نہ ساجن

شام چھا جاتی ہے۔ لیکن وہ اندھی ہے۔ سورج کی کرن اور چاند کی چاندنی، اس کے لئے نہیں۔ وہ اندھیرے کی رہنے والی اندھیرے ہی میں رہتی ہے۔ راستہ اسے سجھائی نہیں دیتا۔ دیواروں کا سہارا لیتی ہے ایک ٹوٹے ہوئے دروازے پر اس کا ہاتھ پڑتا ہے، اور مایوسی کے سیلاب میں اسے امید کا ایک تنکا نظر آتا ہے۔ وہ پکارتی ہے ـــــ لیکن یہ ٹوٹا ہوا گھر ایک بھکاری کا ہوتا ہے "بد کار، بھکارن کو" یا بھیک دے سکتا تھا۔ صرف سہارا ـــــ ہاں ـــــ ایک غریب کی بھیک ایک غریب کے لئے سہارا ہی تھا۔ اس قسم کے غنائیے سننے والوں کے احساسات میں غیر شعوری طور پر ایک مقدس حرکت پیدا کر دیتے ہیں۔ یہ ضروری نہیں کہ ہر غنائیہ سنجیدہ موضوعوں ہی سے متعلق لیکن اس میں پست تخیلات نہ ہوں تو کافی ہے۔

یوں تو اردو میں عامیانہ سطحوں کی کمی نہیں ہے۔ اچھی اور معیاری مثنویاں موجود ہیں لیکن ان تمام میں غنائی صلاحیتیں مفقود ہیں۔ ایک ہی بحر کی وجہ سے ان کو آپرا کے طور پر پیش کرنے میں دقتیں ہوتی ہیں۔ اکثر مثنویاں قدیم زمانے میں لکھی گئی ہیں اس لئے ان میں ادب کے موجودہ رجحانات کا کوئی عکس دکھائی نہیں دیتا۔

حال حال میں مغربی ادبی رجحانات کے اثر نے اردو میں بھی اس کی ضرورت کی طرف ہمارے ادیبوں کو متوجہ کیا ہے۔ اور بعض مطبوعہ آپرا ہمارے ہاں موجود ہیں۔ لیکن میں نے نہ تو دیکھا ہے اور نہ سنا ہے کہ کہیں ڈرامے کی طرح کوئی اردو آپرا اسٹیج کیا گیا ہے۔ یا فلمایا گیا ہے۔ ترقی یافتہ زبانوں نے اس کی طرف خاص طور پر توجہ کی ہے۔ اور آپ کو حیرت ہوگی یہ محسوس کرکے کہ حیدرآباد کی بعض مقامی زبانیں بھی آپرا کو اسٹیج کے لئے تیار کرتی ہیں۔ تلنگی کے آپرا زدیہاتوں میں بڑے شوق سے سنے جاتے ہیں۔ ان سب کے مقابلہ میں اردو کی یہ تہی مائیگی عبرتنجز ہے۔

میری نگاہوں کے سامنے اس وقت دو آپراز ہیں جو حیدرآباد کے دو ادیبوں کے افکار کا نتیجہ ہیں۔ "فاؤسٹ" اور "عمر خیام"۔ لیکن ان دونوں میں علمیت کے بوجھ نے غنائی لطافت کو بری طرح پامال کر دیا ہے اور یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس میں موسیقی نے ڈرامے کی ترجمانی کی ہے۔ علامہ اقبال کی نظم "ابلیس کی مجلس شوریٰ" بھی تحت اللفظ طریقے سے پیش کی جا سکتی ہے۔ اس کو اگر موسیقی کے ذریعے سے پیش کیا جائے تو میرے خیال میں اس کی اسپرٹ ہی ختم ہو جائے گی۔ بہرحال ضرورت اس امر کی ہے کہ غنائیوں اور آپراز کی طرف ہمارے شعرا خاص طور پر توجہ کریں۔ ریڈیو کی دنیا میں ان کی اثر پذیری کے لئے کافی راہیں کھلی ہوئی ہیں۔

اس مضمون میں میں نے دانستہ طور پر "منتخب کلام اور مشاعروں" سے بحث نہیں کی اس لئے کہ ان کے متعلق میرے خیالات وہی ہیں جن کا اظہار میں نے بار بار کیا ہے۔ میں نہ تو ایسے منتخب کلام کو اور نہ ایسے مشاعرے کو جو محض "واہ واہ" کی بھیک مانگے، اپنے دل میں کوئی جگہ دے سکتا ہوں اور نہ قوم اور ملک کے لئے اس تضیع اوقات میں کوئی فائدہ دیکھتا ہوں۔

میکش

ریڈیو کی زبان

فردوسی نے صدیوں پہلے جو کہا تھا کہ :-

ہمین است رسمے برائے فریب گہے بر فراز و گہے بر نشیب

تو آج دنیا "نشیب و فراز" کی انتہائی خوفناک وادی سے گزر رہی ہے۔ اور کون کہہ سکتا ہے کہ آگ اور خون کے اس ڈرامے کا "ڈراپ سین" انقلاب کا کونسا منظر ہوگا! ہم جو کچھ آج دیکھ رہے ہیں، کل وہی باتیں "تاریخ" بن جائیں گی، اور آنے والے مورخوں کے قلم حق و باطل کا فیصلہ کرنے میں آزاد ہوں گے۔

قدیم زمانے میں تیر، خنجر، نیزے اور تلواریں قسمتوں کا فیصلہ کرتی تھیں، اور اس بیسویں صدی عیسوی میں بم کے گولے اور گیس "تاریخ تقدیر" کے اوراق الٹ رہی ہیں۔ پچھلے زمانے میں، مہینوں کی معرکہ آرائیوں اور آویزشوں کے بعد تھوڑی بہت انسانی جانیں تلف ہوتی تھیں، اور آج چند گھنٹوں میں انسانوں کی وسیع آبادیوں کو "بحر موت" میں تبدیل کیا جا سکتا ہے۔ خدا کی سب سے زیادہ محترم اور معزز مخلوق کو اتنی دردناک تباہی سے شاید کبھی دوچار ہونا نہیں پڑا۔ پولینڈ اور فلینڈرس کے میدانوں میں جس بے باکی کے ساتھ انسانی خون سے ہولی کھیلی گئی ہے، اس کی نظیر دنیا کی تاریخ میں مشکل سے ملے گی،

تو یہ "سائنس زدہ دور" نہایت ہی تیز اور شدید انقلابات کا دور ہے۔ انسانوں اور کبوتروں کی نامہ بری کا زمانہ گزر گیا، اب تو ہوائیں نامہ بری کر رہی ہیں، اور زمین پر چلنے والا انسان فضائے آسمانی میں دوڑ لگا رہا ہے۔ اس دور کی سب سے بڑی خصوصیت ذرائع معاملات (Means of communication) کی ارزانی اور نت نئی ایجادیں ہیں۔ یہ آپ کا "ریڈیو" جس کے ذریعے آپ گھر بیٹھے ہوئے سات سمندر پار کی خبریں، مزیدار کہانیاں اور سُریلے بول سنتے ہیں، ان "انقلابی ایجادات" کی ایک نہایت ہی اہم کڑی ہے۔

(وقت کا اہم ترین مسئلہ)

ماہرین نفسیات جانتے ہیں کہ انقلاب کا پہلا بیج "ذہن و فکر" کی کیاری میں بویا جاتا ہے۔ اسی بیج سے پودا اگتا ہے، یہاں تک کہ لوگ کہنے لگتے ہیں کہ "انقلاب آگیا"! اور ہاں! کہنے کیا لگتے ہیں، انقلاب اپنے وجود کو خود ان سے محسوس کرا کے چھوڑتا ہے۔ مطلب عرض کرنے کا یہ ہے کہ سب سے پہلے ذہنی انقلاب پیدا ہوتا ہے، عملی انقلاب اسی ذہنی انقلاب کا پیش خیمہ اور مقدمۃ الجیش ہے۔ تو آج اسی "ریڈیو" کو ذہنی انقلاب کے لئے آلۂ کار بنایا جا رہا ہے۔ اور مکانوں کی چھتوں اور منڈیروں پر گڑے ہوئے بانس (ایریل) سچ مچ لنکا ڈھا رہے ہیں۔

ادبی انقلاب ریڈیو کے ذریعہ جس طرح سیاسی اعتبار سے ذہنیتیں منقلب ہوتی ہیں، اسی طرح ریڈیو "ادبی انقلاب" بھی پیدا کر سکتا ہے، اور زبان و ادب کی نشر و اشاعت کے لئے اس سے بہتر چیز آج تک وجود میں نہیں آئی۔

زبان، کونسل ہالوں اور کلب گھروں میں نہیں بنتی، اس عمارت کی پہلی اینٹ "گھر" میں رکھی جاتی ہے۔ اسی گھریلو زبان کو مادری زبان کہتے ہیں۔ گھروں سے نکل کر زبان بازاروں میں پہونچتی ہے، اور وہاں سے چل کر کانٹتی ہوئی، دفتروں، ادبی اداروں، اسکولوں، کالجوں اور دانش گاہوں میں داخل ہو جاتی ہے، ہر زبان پر اتنے دوروں کا گزرنا لازمی ہے۔ تو یہ "ریڈیو" گھریلو زبان کو متاثر کرتا ہے۔ اور اس طرح زبان و ادب کے مسئلہ میں ریڈیو کی اہمیت بہت زیادہ بڑھ جاتی ہے۔

بچے کو گھر میں سب سے زیادہ قربت ماں کی نصیب ہوتی ہے۔ اور وہ نفسی طور پر ماں کی باتوں سے بہت زیادہ متاثر ہوتا ہے۔ گاؤں والے ان ہی نفسیاتی تاثرات کو "ماں کے دودھ کے اثر" سے تعبیر کرتے ہیں۔ ماں کی بول چال، بچہ کی "معلم اول" ہوتی ہے۔ بچہ ماں کی بولی ٹھولی کی پوری پوری نقل اتارنے کی کوشش کرتا ہے، یہاں تک کہ وہ بچہ سے جوان اور جوان سے بوڑھا ہو جاتا ہے

لیکن مادری زبان کے اثرات زائل نہیں ہوتے۔

پردہ نشین عورتوں کی دنیا تو ان کے گھر ہی ہوتے ہیں، لیکن بے پردہ عورتیں بھی مردوں کے مقابلہ میں زیادہ وقت گھر ہی میں گزارتی ہیں۔ مغربی تہذیب نے آزادی کی حدود کو بہت کچھ وسیع کر دیا ہے، پھر بھی مردوں کی طرح "آوارہ بازی" کرنے کیلئے عورتیں آزاد نہیں ہیں۔ اس لئے بے پردہ عورتوں کو بھی گھروں میں زیادہ سے زیادہ وقت صرف کرنے کے سبب "ریڈیو" سے استفادہ کرنے کے بہت زیادہ امکانات ہیں۔ اس طرح ریڈیو کا "مادری زبان" سے بڑا گہرا اور قریبی تعلق ہو گیا ہے۔

اردو دشمنی | اردو کے مخالفین، اردو کے مٹانے کا بیڑا اٹھا کر اور خم ٹھونک کر میدان میں آئے ہیں، ان کے پاس سلم قوت ہے، یک جہتی ہے، روپیہ کی بہتات، دفتروں، کچہریوں اور حکومت کے اداروں میں ان کے آدمی ہیں، جن کے ذریعہ دفتروں اور کچہریوں سے اردو زبان کو دیس نکالا دلوایا جا رہا ہے۔ اب رہ گئی گھریلو اور مادری زبان، سو اس کے بگاڑنے کی ریڈیو کے ذریعہ کوشش کی جا رہی ہے۔ غزلوں اور نظموں کی جگہ ٹھمریوں اور گیتوں کی بھرمار، آریائی موسیقی کی آڑ میں ہاجات کے تمدن کا احیا ــــ یہ سب کچھ ایک منظم اور خوب سوچی سمجھی ہوئی قوت اور نظریہ کے تحت ہو رہا ہے اور ہمارا یہ حال ہے کہ محض تھوڑی دیر کی چٹخاروں اور کہانیوں کی لذتوں کی خاطر سب کچھ گوارا کرتے چلے جا رہے ہیں۔ اس حرابی کے اثرات آج محسوس نہیں کر سکتے، اگر چند دن اسی طرح اور گزر گئے تو محسوس ہوگا کہ ریڈیو کی مسخر کی ہوئی ہواؤں نے ہمارے کانوں کے راستے سے ہمیں زہر پلایا تھا، اس نے ہمارے ذہن و فکر کو مسموم کر دیا۔

اردو زبان کا تہذیبی، تمدنی اور سیاسی تعلق ہر قلعہ معلی کے سوگوار بام و در، اردو کے ذکر پر بے اختیار پکار اٹھتے ہیں کہ :-

اسی گھر میں جلایا ہے چراغ اردو رسول

اسی دلی کے ریڈیو اسٹیشن سے اردو زبان کو مسخ کرنے اور بگاڑنے کی جو افسوس ناک کوششیں کی گئی ہیں، وہ سب پر ظاہر ہیں، مرکزی انجمن ترقی اردو نے اپنے نیم ماہی آرگن "ہماری زبان" میں آل انڈیا ریڈیو اسٹیشن کے اس طرز عمل پر بار بار احتجاج کیا اور خود دہلی ریڈیو اسٹیشن کو انفرادی طور پر لوگوں نے توجہ دلائی، لیکن خداوندان ریڈیو نے "آبدوز" کو "ڈبکنی کشتی" اور "وزیر اعظم" کو "بڑے وزیر" کہا اور یہ کر کے رہا۔

کوئی شک نہیں کہ "وزیر اعظم" عربی کے دو لفظوں سے مرکب ہے، لیکن یہ مرکب لفظ ملک میں اتنا رواج پا گیا ہے کہ گاؤں کا چمار بھی اس لفظ کو بولتا اور سمجھتا ہے۔ اسی بنی بنائی ترکیب کی "بڑے وزیر" کہہ کر مٹی پلید کی جا رہی ہے۔ میں آج ایک بات کی پیش گوئی کر رہا ہوں، مستقبل آپ کو بتا دے گا کہ سب رس کے مستقل مضمون نگار نے جو نقوش کھینچے تھے، وہ کہاں تک صحیح ثابت ہوئے! وہ بات یہ ہے کہ اردو کے یہ جانی دشمن "وزیر اعظم" کو "بڑے وزیر" سے بدل کر دم نہ لیں گے، اس سازش کا دوسرا قدم "بڑے منتری" ہوگا، اور آخر کار "بڑے منتری" بھی "مہا منتری" میں تبدیل ہو جائے گا۔

آل انڈیا ریڈیو اسٹیشن کا آرگن "آواز" آپ نے پڑھا ہوگا، اس میں پہلی اور دوسری نشست کو "پہلی سبھا" اور "دوسری سبھا" لکھا جاتا ہے۔ حالانکہ اردو زبان میں "اندر سبھا" کے مخصوص مفہوم کے علاوہ "سبھا" کا لفظ نشست، جلسہ، محفل اور میٹنگ (meeting) کی جگہ نہیں بولا جاتا۔ ناچ رنگ اور سرود و نشاط کے جلسوں کو بھی "محفل" کہا جاتا ہے۔ یو، پی کے دیہات کے پنڈت، کایستھ، بنیے یہاں تک کہ ڈھیر، چمار بھی گانے بجانے کے جلسوں کو "ناچ کی محفل" کہتے ہیں۔ لیکن اردو زبان کے "کرم فرما" جو عداوت و تعصب کے "ہسٹریا" میں مبتلا معلوم ہوتے ہیں، محفل، جلسہ اور نشست کو "سبھا" کہہ رہے ہیں!

میں اس خصوص میں ایک ضروری بات عرض کر دینا چاہتا ہوں، اگر کبھی حیدرآباد کی نشرگاہ کا پروگرام آل انڈیا ریڈیو کے پروگرام کے ساتھ چھپنے لگے تو نشرگاہ حیدرآباد کو اپنے پروگرام کے ساتھ "سبھا" کا لفظ لکھے جانے پر کسی طرح رضامند نہیں ہونا چاہیے۔ اردو کے مخالفین دہلی، لکھنؤ اور لاہور میں من مانی کارروائیاں کر سکتے ہیں، لیکن حیدرآباد میں ان کا چراغ نہیں جل سکتا۔ اب اردو کے مخلص بہی خواہوں کو خوب سوچ سمجھ کر ان ریڈیو اسٹیشنوں کے خلاف قدم اٹھانے کی ضرورت ہے، جو "اردو" کو تباہ اور برباد کر رہے ہیں۔ منکرین کی ہمارے یہاں کمی نہیں ہے، مگر صرف فکر و خیال سے تو انقلاب پیدا نہیں ہو سکتا۔ اردو کی جان بچانے کیلئے ہم کو سب کچھ لٹا دینا ہوگا۔

ماہر القادری

جدید ادب

ادب زندگی کا پروردہ اور آئینہ دار ہے۔ زندگی کی سطح پر جو لہریں اٹھتی رہتی ہیں، وہ ادب پر بھی اپنا اثر چھوڑ جاتی ہیں۔ ادب کی اہمیت اس وجہ سے ہے کہ وہ زندگی کی تعمیر بھی کرتا ہے۔ ادبی عمل کے لئے سوسائٹی دریا کی تہہ کی طرح ہے جس پر انسانی زندگی کا دھارا بہتا رہتا ہے کبھی تو ادب اس دھارے کے ساتھ رہتا ہے اور کبھی بڑھ کر اس کا رُخ بدل دیتا ہے۔

مشاہدہ ادب کی بنیاد ہے، مگر قدیم ادب میں اس کی حدیں بہت محدود تھیں اور ادب ایک مخصوص طبقے اور گروہ کی سرگرمیوں اور جذبات و خیالات کا ترجمان تھا۔ قدیم یونانی تہذیب کا ادب اعلیٰ طبقہ کا ادب ہے، اس میں پست طبقے، غلاموں، اور عورتوں کا کہیں ذکر نہیں ہے۔ سامراجی روم کا ادب طبقۂ امرا کی نمایندگی کرتا ہے۔ قرونِ وسطیٰ کے یورپی ادب میں بھی اس طبقے کی رزم و بزم کی داستانیں درج ہیں۔ پیدایشِ دولت کے ذرائع کی باگ جس طبقے کے ہاتھ میں رہی وہ زندگی کی ساری سماجی قوتوں پر چھایا رہا۔ ادب بھی ایک سماجی قوت ہے اور یہ بھی صدیوں تک صاحبِ اقتدار طبقہ کا آلۂ کار بنا رہا۔ اس میں کبھی دیوی دیوتاؤں کی برتری اور انسانی کمتری کے گیت گائے گئے تو کبھی تلوار پر تلوار چلنے کے مناظر پیش کئے گئے۔ کبھی یہ حسن و عشق کی ٹھنڈی چھاؤں میں پرورش پاتا رہا تو کبھی دنیا سے بیزارگی اور زندگی سے گریز کے سبق پڑھاتا رہا۔ انسانی تہذیب و تمدن کے ارتقا کے ساتھ اس کا بھی ارتقا ہوا۔ جاگیری نظام میں امرا دادِ عیش دیتے تھے اور غریب قناعت اور پسماندگی میں زندگی بسر کرتے تھے، اور شاعر اور ادیب زندگی کی حقیقتوں سے منہ موڑ کر امیروں کی عیش بھری زندگی سے ادب کا مسالہ جمع کرتے تھے۔ جاگیری نظام کی جگہ جب سرمایہ دارانہ نظام نے لی تو سماج اور معاشرہ کی قدیم بندھنیں ٹوٹنے لگیں۔ صنعتی انقلاب ہوا تو خاندان کی مشترکہ زندگی میں انتشار پیدا ہو گیا۔ اخلاق و آداب کے نئے معیار قایم ہوئے۔ محبت اور شادی بیاہ کا فلسفہ بدل گیا۔ اونچے طبقے کے اوقات جو جاگیری نظام میں بیکاری میں گزرتے تھے اب حصولِ دولت کیلئے وقف ہو گئے۔ ادب اور سیاست کی باگ متوسط طبقے کے ہاتھ میں آئی معاشی تعلقات کی اس تبدیلی سے ادب بھی متاثر ہوئے۔ اب ادب میں متوسط طبقے کی سماجی سرگرمیوں کا ذکر ہونے لگا۔ زندگی سے قریب ہو کر نئے نئے موضوعوں پر لکھا جانے لگا۔ سرمایہ دارانہ نظام کا شکنجہ جب زیادہ سخت ہونے لگا اور پیدایشِ دولت کے ذرایع محدود ہو کر ایک ہی طبقے کے ہاتھ میں آگئے تو دولت اور حصولِ دولت کے خلاف ایک نئی تحریک ادب میں شروع ہوئی۔ یہ انیسویں صدی کا رومانوی ادب ہے۔ یہ "ادب صرف ادب کے لئے" کی تحریک تھی جس میں ادب کے حسن کارانہ پہلو پر زیادہ زور دیا گیا۔ شعرا مادی زندگی کی حقیقتوں سے گھبرا کر، فطرت کے لازوال چشموں کی طرف دوڑے اور وہاں اپنی پیاس بجھائی۔ ادھر سو سال سے سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف جو تحریک اٹھی، اس نے ادب کو طبقۂ متوسط کے ہاتھ سے چھین کر ادنیٰ طبقے کے ہاتھ میں دیدینے کا بیڑا اٹھایا۔ اب ادب کا نظریہ یہ تھا کہ وہ زندگی کے لئے ہے اور اس کا مقصد صرف جماعتی مفاد ہے۔ زندگی کا روحانی پہلو یکسر ختم کر دیا گیا، مذہبی تصورات اور حسن کارانہ جذبات ادب سے

صنعتوں سے مشادیئے گئے۔ طبقاتی کشمکش کی لہریں ادب میں بھی اٹھتی رہیں اور جب طبقاتی جنگ ختم ہوئی تو ادب بالکلیہ ادنیٰ طبقے کے ہاتھوں میں آگیا۔ انسانی زندگی کا ایک نیا دور شروع ہوا۔ ملکیت اور جنسی تعلقات میں ایک زبردست انقلاب ہوا۔ اخلاق کے اصول و آئین بدل گئے، مذہب اس تمدنی زندگی سے رخصت ہو گیا اور اب ادب ایک انقلاب کا پیغامبر تھا جو ساری دنیا کو ایک نئے نظام زندگی کی طرف آنے کی دعوت دیر ہا تھا۔ اس معاشی نظام کے خلاف ایک اور تحریک اٹھی جس نے اس کی ماہ و لت پر ایک کاری ضرب لگائی اور اس کے بڑھتے ہوئے اثرات کو روک دیا۔ یہ فاشستی تحریک تھی جس نے اشتراکیت اور جمہوریت کی بنیادوں کو ہلا دیا۔ فاشزم کے اس اثر کو دیکھ کر ۱۹۳۵ء میں میکسم گورکی کی سرپرستی میں دنیا کے سارے ادیبوں کی ایک کانفرنس پیرس میں ہوئی، جس میں یہ طے ہوا کہ ادیبوں کی ایک بین قومی انجمن بنائی جائے جو عالمی تہذیب و معاشرت کو فاشزم کے اثر سے بچائے، شہری حقوق کی آزادی اور ادیبوں کے معاشی معاملات کی نگہداشت کرے اور ان جلا وطن ادیبوں کی جو فاشستی ممالک سے نکال دیئے گئے تھے، مدد کی جائے۔ دوسری کانفرنس ۱۹۳۶ء میں لندن میں ہوئی۔ اس کانفرنس میں یہ تجویز پیش کی گئی کہ تحریک کو زیادہ عملی بنانے کے لیئے یہ ضروری ہے کہ عالمی تہذیب و تمدن کی ایک انسائیکلو پیڈیا تیار کی جائے اور اس میں مشرق و مغرب کی تہذیب پر تفصیل کام کیا جائے اور جدید فلسفۂ انسانیت کی تعمیر کی جائے اور جو انسانی علوم کے تمام شعبوں یعنی سائنس، سیاسیات، معاشیات اور جمالیات پر حاوی ہو۔ اس تجویز پر بڑی بحث ہوئی، ایچ، جی، ویلز نے اس کی بڑی مخالفت کی اور اس کی عملی دشواریوں کو گنایا اور کہا کہ اس کام کے لیئے تقریباً تیس کروڑ پونڈ خرچ کرنے ہوں گے، جس میں تین جنگی جہاز خریدے جاسکتے ہیں یہ تجویز عمل میں نہ آسکی، کیونکہ اس کے بعد ہی اسپین کی جنگ شروع ہوگئی ۱۹۳۷ء میں پھر تیسری بار یہ کانفرنس میڈرڈ میں ہوئی۔ اس میں فاشستی مظالم اور دست درازیوں کے خلاف مشترکہ طور پر جذبات نفرت کا اظہار کیا گیا۔

جدید ادب کی ان تحریکوں سے ہندوستانی ادب بھی متاثر ہوا ہے۔ انجمن ترقی پسند مصنفین، جدید ادب کی علمبردار ہے۔ اس میں متوسط طبقہ کے ایسے نوجوان ادیب شامل ہیں جنھیں موجودہ نظام زندگی میں معاشی آسودگی کا موقع نہیں ملا۔ اس تحریک کا مقصد یہ ہے کہ سامراجی اور سرمایہ داروں کے خلاف ایک محاذ قایم کیا جائے اور ماضی کے منتشر تاروں کو جوڑ کر حال کے ساتھ ملایا جائے اور ایک مشترکہ قومی معاشرت کی تشکیل کی جائے۔ اس تحریک نے بہت سارے بے روزگار نوجوانوں کو اپنی طرف متوجہ کرلیا ہے۔ مزدور، کسان اور غریب طبقے کی معاشری زندگی اس ادب کا موضوع ہیں۔ اس گروہ کا شاعر، سرمایہ داری کے خلاف، مزدور کی زبان میں انقلاب کا نعرہ لگاتا ہے۔ اگرچیکہ عملی طور پر وہ کسان اور مزدور کی جدوجہد سے بہت دور ہے۔ اس طرح اصل میں وہ اپنی زندگی کی ناکامی کا بدلہ لینا چاہتا ہے۔ ممکن ہے آگے چل کر اس میں اپنے مقصد سے متعلق خلوص بھی پیدا ہو جائے اور وہ اپنے بیان میں فن کارانہ ضابطہ بھی حاصل کرے۔

جنگ عظیم کے بعد سے دنیا ایک عجیب کشمکش میں مبتلا ہے۔ معاشی تباہی، طبقاتی جنگ ہر طرف سے یاس اور ناامیدی کے بادل امنڈ امنڈ کر آرہے ہیں۔ بیکاری اور بے روزگاری

بڑھ گئی ہے۔ مزدور پریشان اور سیاست داں گھبرائے ہوئے ہیں
ہر وقت عالمگیر جنگ کا خطرہ لگا ہوا ہے۔ بین قومی اتحاد کی ساری
کوششیں بے کار ثابت ہو رہی ہیں، اور قومیت کا بھوت امن عالم
کی دھجیاں اڑانے کے لئے بڑھا چلا آ رہا ہے۔ جمہوریت جو
بڑی امیدوں کا سہارا بنی ہوئی تھی اب فاشزم کے حملوں
سے اپنا وقار کھو بیٹھی ہے۔ جمہوری ممالک کے ادیب اور شاعر
زندگی کی اس بے یقینی اور معاشی نظام کی تباہی کو دیکھ رہے
ہیں زندگی کی تنقید کے لئے ان کے قلم کی نوک تیز ہو گئی ہے،
مگر ان کے دماغ کوئی ایسا حل پیش نہیں کر سکتے جو عالمی امن
کا ضامن ہو۔ وہ موجودہ نظام کے اس لئے قائل ہیں کہ وہ فرد کی
آزادی کو برقرار رکھتا ہے، اور اس کے مخالف اس لئے ہیں
کہ وہ انسانی دماغ اور روح کی تربیت اس طرح کرنا چاہتا
ہے جس میں اکثریت کا فائدہ ہو۔ چاہے وہ اکثریت کیسی
ہی کودن اور جاہل ہو۔ جمہوریت کا ادب ایک مضطرب
اور بے چین دل و دماغ کا ادب ہے۔ اور تعمیری پہلو کی
بہ نسبت اس کا تنقیدی پہلو زیادہ زبردست ہے۔ ادب جدید
کا علمبردار میکسیم گورکی کہتا ہے کہ "ادب انسانیت کا نقاد
ہے، وہ اس کی کج روی کو ظاہر کرتا اور اس کی خام کاریوں
کو بے نقاب کرتا ہے۔ اس کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ
انسان کی حیات مستعار کو دائم و قائم بنا دے۔ ادب کی بے
کلی اور تڑپ اس لئے ہے کہ آدمی کو سمجھائے کہ وہ حالات
کا غلام نہیں ہے بلکہ حالات اس کے غلام ہیں۔ وہ آدمی کو
بتلانا چاہتا ہے کہ وہ آپ اپنی زندگی کا مالک ہے اور اسے
جس روش پر چاہے لے جا سکتا ہے۔ اس لحاظ سے ادب
تغیر پسند، قدامت شکن، اور دورِ جدید کا پیش رو ہے۔" مگر

موجودہ دور کے معاشری اور سیاسی انتشار نے ادب میں
بھی انتشار پیدا کر دیا ہے۔ دنیا کی تاریخ کا یہ دور بڑی کشمکش
اور بے چینی کا دور ہے۔ سماجی قوتیں اور معاشی و سیاسی
تحریکیں ایک دوسرے سے دست و گریباں ہیں۔ ایک طرف
سامراجی قوت ہے جو غریبوں کے خون ہمیشہ سے اپنے سطوت
و جبروت کی نذر لے رہی ہے۔ دوسری طرف جاگیری نظام ہے
جہاں زندگی صدیوں پہلے کی طرح اب بھی رینگ رہی ہے۔
جمہوریت نے سیاست کی کمزوریوں کو واضح کر دیا ہے اشتراکیت
ساری دنیا کو معاشی مساوات کا سبق دے رہی ہے۔ انسانیت
کا روحانی پہلو، مادی پہلو پر قربان کر دیا گیا ہے۔ اس کا رد عمل
فاشستی تحریک نے کیا ہے جو اپنی ہوس ملک گیری میں سارے
دنیا کے امن اور تہذیب و تمدن کو خطرے میں ڈالے ہوئے
ہے۔ اب ادب کا فرض یہ ہے کہ وہ انسانیت کو اس کشمکش
اور گمراہی سے نکال کر بلند مقام پر پہنچا دے۔

مشرق صدیوں پہلے مغرب کو اپنی روحانیت سے
نور پہنچا چکا ہے۔ اب بھی دنیا کے دو بڑے شاعر اقبال اور
ٹیگور مشرق ہی نے پیدا کئے ہیں۔ اس ساری کشمکش اور بے چینی
کا حل، مغرب کو اقبال کے یہاں مل سکتا ہے، بشرطیکہ وہ اس نوع
کے خیالات کی روشنی میں اس کا مطالعہ کرے، جو پروفیسر میکنزی
نے اپنی کتاب "عمرانی مطالعہ کی تمہید" میں بیان کئے ہیں۔
"کامل انسان کے بغیر سوسائٹی معراج کمال پر نہیں پہنچ سکتی۔
اس غرض کے لئے محض عرفان اور حقیقت سے آگاہی ہی
کافی نہیں بلکہ ہیجان اور تحریک کی قوت کی ضرورت ہے۔
جیسے یوں کہنا چاہیے کہ یہ معمہ حل کرنے کے لئے ہم نور و حرارت
دونوں کے محتاج ہیں۔ عہد حاضرہ کے معاشری مسائل کا فہم

ادراک بھی وقت کی اہم ترین ضرورت ہے۔ ہمیں آج رسکن، کارلائل، اور ٹالسٹائے جیسے لوگوں کی ضرورت ہے جو ضمیر کو زیادہ مستعد اور سخت گیر بنانے اور فرائض کے دائرے کو زیادہ وسیع کرنے کی صلاحیت رکھتے ہوں۔ غالباً ہمیں مصلح سے زیادہ عہدِ نو کے شاعر کی ضرورت ہے۔ جو شاعری اور رہبری کی دوگانہ صفات رکھتا ہو۔ عہدِ ماضی کے شاعروں نے ہمیں فطرت سے محبت کرنے کی تعلیم دی ہے۔ انھوں نے ہمیں اس قدر ژرف نگاہ بنا دیا ہے کہ ہم بظاہر فطرت میں انوار ربانی کا مطالعہ کرسکتے ہیں۔ لیکن اب ہم ایک ایسے شاعر کے منتظر ہیں جو ہمیں اس فصاحت کے ساتھ پیکر انسانی میں صفاتِ الٰہی کے جلوے دکھا دے۔ اُسنے نے ازراہِ تفنن اپنے آپ کو روح القدس کا سپاہی کہا تھا۔ ہمیں ایسے شخص کی ضرورت ہے جو حقیقت روح القدس کا سپاہی ہو، جو اس حقیقت پر ہماری آنکھیں کھول دے کہ ہمارے بلند ترین نصب العین ہمارے روزمرہ کی زندگی میں پورے ہو رہے ہیں۔ اگر اس زندگی کو ترقی دینے کی کوشش کی جائے تو ہمیں صرف راہبانہ ریاضت اور نفس کشی ہی کا موقع نہیں ملے گا بلکہ ایک ایسا ارفع و اعلیٰ مقصد حاصل ہو جائے گا، جو تمام خیالات، تمام جذبات اور تمام مسرتوں کو ترقی کے بلند مقام پر پہنچا سکتا ہے۔

سید اشفاق حسین

مغربی تصانیف کے اردو تراجم:۔ یہ کتاب ادارہ کے شعبۂ تالیف و ترجمہ کی طرف سے شایع ہوئی ہے۔ اس کتاب کے مصنف مولوی میر حسن صاحب ایم۔ اے نے ان تمام انفرادی اور اجتماعی کوششوں کو ایک جگہ جمع کر دیا ہے جو مدتوں سے اردو زبان کو مالا مال کرنے کے لئے دوسری زبانوں کی کتابوں کو اردو میں منتقل کرنے کے سلسلے میں کی جاتی رہی ہیں۔ یہ تذکرہ نہایت ہی محنت اور تحقیق سے لکھا گیا ہے اس لئے مستند بھی ہے اور مفید بھی۔ نقد ادب اور تاریخی طریقۂ تنقید کے علاوہ ماخذوں کے متعلق معلومات حاصل کرنے میں ایسی کتابوں کی خاص اہمیت ہوتی ہے ۱۸۰۰ء سے ۱۹۱۴ء تک کے اردو ادب کا یہ پہلو ہر اُس کے لئے باعثِ دلچسپی ہوگا جو اردو کی ترقی کا متمنی ہے۔ اردو تراجم کے تاریخی اور تدریجی نشو و نما پر ایک مستقل تالیف ہے۔ دیباچہ میں اس کتاب کے ماخذوں کی فہرست بھی دی گئی ہے۔

چھوٹی تقطیع ۱۸۴ صفحات قیمت مجلد ۱۲؍

سرگزشت غالب:۔ اردو اور فارسی کے مشہور شاعر و ادیب مرزا اسد اللہ خاں غالب کی حیات، کارناموں اور اعزہ و احباب کا ایک مجمل تذکرہ ہے جس کو ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور ایم۔ اے پی ایچ ڈی (لندن) پروفیسر ادبیات جامعہ عثمانیہ نے نہایت تحقیق اور محنت سے مرتب کیا ہے۔ طلبا اور ادب کا مطالعہ کرنے والوں کے لئے بے حد مفید ہے غالب کی تصویر اور خاندانی شجرے بھی شایع کئے گئے ہیں یہ چھوٹی سی کتاب سالہا سال کی تحقیقات اور غالب کی تصنیفات اور ان کے متعلق جو کچھ ادب اب تک شایع ہوا ہے اس کے تنقیدی مطالعہ کا نچوڑ ہے

بڑی سائز۔ صفحات ۶۴۔ کتابت و طباعت و کاغذ اعلیٰ۔ قیمت ۸؍

ادبیات کا مستقبل

زندگی اور ادب دو مختلف چیزیں نہیں، بلکہ اصل میں ایک ہی ہیں ادب کو چاند کی طرح ایک معطل جسم سمجھ لینا' جو محض سورج کی کرنوں کا محتاج ہے' بہت بڑی غلطی ہے ادب زندگی کا آئینہ ہے ادب اور زندگی میں صرف یہی رشتہ نہیں بلکہ ان دونوں میں اس سے بہت زیادہ گہرا تعلق ہے زندگی کسی سادہ اور ابتدائی حیوان مثلاً امی با' یا بدلو کی طرح ہمیشہ متغیر رہتی ہے' اور ہر گھڑی ایک نئے روپ میں ظاہر ہوتی رہتی ہے ادب اس امی با' سے زور آزمائی کرتا ہے اس کی یہ کوشش ہوتی کہ اِس متغیر جسم کو کسی ایک شکل میں قایم کر لے اور اس کے راز سے واقف ہو جائے لیکن امی با' پھر کھڑا ہو جاتا ہے اور نئے سرے سے وہی قصہ دہرانے لگتا ہے اب زندگی جو شکل اختیار کرے گی اس کا پہلے سے اندازہ لگانا بہت مشکل ہے اگر اس کی موجودہ شکل سے پوری پوری واقفیت ہو تو صرف اسی صورت میں کچھ اندازہ لگانا ممکن ہے اسی لئے ادب کے متعلق پیش گوئی کرنی ہو تو سب سے پہلے یہ دیکھنا ضروری ہے کہ ادبیات پر اس وقت زندگی کس طرح اثر انداز ہو رہی ہے۔

ان اثرات میں سے اس وقت صرف سیاسیات' انقلابات اور حکمی اختراعات قابلِ ذکر ہیں سیاسیات اصل میں مل جل کر رہنے سہنے کا علم ہے یا کم از کم اس کے یہی معنی ہونے چاہئیں یہاں ممکن ہے یہ سوال کیا جائے کہ اس علم کو غریب مصنف سے کیا سروکار' جو اپنے کمرے میں بیٹھا کچھ لکھ رہا ہے اس بےچارے کو تو اپنے پیٹ کی فکر ہے اگر سلطنتیں تباہ ہوں یا اجتماعی زندگی برباد ہو تو اس سے مصنف کو کیا واسطہ لیکن یہاں یہ یاد رہے کہ مصنف کوئی عزلت نشیں حیوان نہیں ہوتا اسے اپنے وقت کی قیمت کا اندازہ ہے اور اس سے زیادہ اپنے پیٹ کا خیال اس میں شک نہیں کہ وہ انفرادیت پسند ہوتا ہے لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ وہ ہمیشہ اپنی سماج کا ترجمان بھی ہوتا ہے چنانچہ جب کسی جماعت کو زوال آتا ہے یا وہ کسی تغیر کی صعوبتوں سے گزر رہی ہے تو وہ اس کا ترجمان ہوتا ہے اور بہ حیثیت فرد کے جو کچھ محسوس کرتا ہے' اس کا برابر اظہار کر دیتا ہے صرف یہی نہیں بلکہ اسے کچھ اور زیادہ بےچینی بھی محسوس ہوتی ہے' اور اس وقت جب کہ مل جل کر رہنا سہنا دشوار ہو جاتا ہے' تو مصنف کی توجہ سیاسیات کی طرف ہو جاتی ہے اس کے علاوہ اسے کوئی اور راستہ نظر نہیں آتا اسے کوئی ایسی راہ دکھائی نہیں دیتی' جس پر چل کر وہ اپنی جماعتی ذمہ داری سے سبکدوش ہو سکے چنانچہ اکثر حساس مصنفوں نے یہی راہ اختیار کی ہے۔

جس دور سے ہم گزر رہے ہیں اس کا غالب رنگ سیاسی ہے یہی وجہ ہے کہ مصنف زندگی کی پرانی ساخت کو فرسودہ سمجھتے ہیں اور یہ محسوس کرتے ہیں کہ وہ نئے تغیرات کا ساتھ نہیں دے سکتی لیکن اس کے ساتھ ساتھ مصنف کو یہ بھی یقین نہیں آتا کہ پرانی ساخت میں ضروری تبدیلیاں کرنا صرف اہلِ سیاست ہی کا کام ہے اسی لئے وہ میدانِ عمل میں بھی قدم رکھنا چاہتا ہے لیکن اہلِ قلم کو انگلستان کے مشہور مصنف ڈی۔ ایچ۔ لارنس سے بھی ایک سبق ملا ہے۔ لارنس نے پچھلی جنگ عظیم کے بعد چند لوگوں کو اپنے گرد جمع کرنے کی کوشش کی تھی لیکن اسے ناکامی ہوئی حالانکہ وہ بڑا آدمی تھا' اور اس کی ذات میں بڑی کشش تھی اس سے مصنف چوکنے ہو گئے' کہ کوئی گروہ' جو کسی فرد کے گرد جمع ہو جائے

آج کل کامیاب نہیں ہوسکتا یہی وجہ ہے کہ نوجوان لکھنے والے جان بوجھ کر یا بے جانے بوجھے کسی عالمگیر تحریک سے، جس کی بنا کسی خاص فرد پر نہیں بلکہ عام لوگوں پر ہو، وابستہ ہوتے جارہے ہیں۔ اس لئے ادبیات کے متعلق پہلی پیش گوئی تو یہ ہوسکتی ہے کہ اگر طبقات کا باہمی اختلاف زیادہ بڑھ جائے اور ظاہر ہوجائے تو لکھنے والے کسی ایک نقطۂ خیال کی طرف ہوں گے اگر ایسا ہوجائے تو ظاہر ہے کہ ادبیات کی غرض وغایت کا ایک نیا تصور پیدا ہوجائے گا۔ ادبیات کو افراد کے باہمی تعلقات سے زیادہ طبقوں اور جماعتوں کے روابط وتعلقات سے سروکار ہوجائے گا اس طرح ممکن ہے کہ ادب سے عمل کی تنقید کی بجائے عمل کی رہنمائی کا کام لیا جاسکے۔ ظاہر ہے کہ ادب کشمکش حیات میں اس وقت کسی ایک فریق کا ساتھ دے گا یعنی ادب سبق سکھائے گا، اور تلقین کرے گا۔

ایک مہذب خیال یہ بھی ہے کہ تہذیب وتمدن حیاتِ قومی کا پھول ہے، نہ کہ اس کی جنگ آزمائیوں کا ہتیار دوسرے الفاظ میں بعض کا خیال ہے کہ جس طرح بھی بن پڑے قومی تہذیب وتمدن کو محفوظ رکھا جائے لیکن یہ امر بڑے غور وفکر کا محتاج ہے۔ اگر کوئی زندہ جسم مرجائے تو ایک سائنس داں اس جسم سے دل کو نکال کر، یا کسی عضو کے چھوٹے سے حصے کو کاٹ کر اسے بہت دیر تک زندہ رکھ سکتا ہے لیکن کیا اس زندگی کے کوئی معنی ہیں؟ اسی طرح اگر کسی تہذیب وتمدن کو جسم اجتماعی کی بربادی کے بعد مصنوعی طور پر زندہ رکھا جائے تو اس کے یقیناً کوئی معنی نہیں ہوسکتے اور نہ اس کا کوئی مقصد ہوسکتا ہے۔

اب رہا لکھنے والوں کا ایک دوسرا گروہ جس کو ادب اور سیاسیات کا تعلق ناپسند ہے اس گروہ کے لئے صرف ایک ہی راہ ہے اور وہ نفسیات کی ہے فرائڈ نے انسان کو اپنی غیر شعوری زندگی کی طرف متوجہ کرکے ایک اہم عمل کا آغاز کیا تھا، اور بہت ممکن ہے کہ اس کے نتائج صنعتی انقلاب یا امریکہ کی دریافت سے بھی زیادہ اہم ثابت ہوں جب فرائڈ نے اپنے عظیم الشان کام کی ابتدا کی تو اس وقت مصنف سماجی زندگی کے انتشار کو محسوس کر رہا تھا، اور یہ چاہتا تھا کہ اپنے آخری مقام یعنی خود اپنی ذات میں پناہ لے لے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ مختلف افراد کے باہمی تعلق اور تصادم کی جگہ ادب کو ذہن انسانی کی اندرونی کشاکش سے زیادہ لگاؤ ہوگیا۔ چنانچہ آج کل کے نوجوان مصنفوں میں اسی قسم کے لکھنے والوں کی زیادہ قدر ہے، انگلستان میں جائیس اور ایلیٹ اور ہندوستان میں حجاب امتیاز علی، مجنوں اور نیاز وغیرہ ان کے بعد کے لکھنے والے کبھی ادھر ہیں اور کبھی ادھر ان کے دل میں کبھی تو سیاسی ہمدردیاں پیدا ہوجاتی ہیں، اور کبھی غیر شعوری زندگی کی خدمت کی خواہش بہت سے مصنف ایسے بھی ہیں جو چند دنوں سیاست سے تعلق رکھنے کے بعد، بالآخر نفسیات کی طرف آگئے چونکہ فرائڈ نے نفسی زندگی کے باب میں فرد پر بہت زور دیا ہے اس لئے آج کل لبرل فلسفے کا سب سے بڑا حامی اسی کو سمجھنا چاہیے یہ بھی ممکن ہے کہ لبرل فلسفۂ زندگی جو کچھ عرصے سے حالتِ جمود میں ہے، اور جسے لوگ سمجھتے ہیں، کہ سیاسی میدان جنگ میں کام آچکا، وہ شاید ادب اور نفسیات کے اسی تعاون سے پھر حیاتِ نو حاصل کرلے اور سچ تو یہ ہے کہ ادب بغیر آقا کے زیادہ دن تک خوش نہیں رہ سکتا چنانچہ آج بھی ادب کے سامنے یہ سوال ہے کہ وہ کس آقا کی خدمت کرے، انقلابی تحریک کی، یا فرائڈ کے لبرل فلسفے کی۔

لکھنے والوں کا ایک تیسرا گروہ بھی ہے، جس سے یہ سوال پیچیدہ ہوگیا ہے، جو میدان پہلے خالص ادب کا سمجھا جاتا تھا،

اب اس میں مشینی اختراعات بھی مداخلت کر رہی ہیں جس کا نتیجہ یہ ہے کہ طباعت کا ایک بے پناہ طوفان آتا جا رہا ہے لیکن ادب کی غیر ضروری فراوانی سے اتنا فائدہ ضرور ہے کہ سنجیدہ اور تفریحی تحریروں میں آسانی کے ساتھ امتیاز ہو جاتا ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اب لوگوں کو تفریحی تحریروں کی جگہ اختراعات سے دلچسپی ہوتی جا رہی ہے تفریحی تحریریں دو وجہ سے اثر رکھتی ہیں یا تو اس لئے کہ وہ حقیقت کے بہت زیادہ مطابق ہوتی ہیں یا پھر وہ ایسی دنیا کی تصویر پیش کرتی ہیں جسے حقیقت سے کوئی واسطہ نہیں ہوتا یہ کام (cinema) سینما اور لاسلکی اس وقت بھی اچھی طرح انجام دے رہے ہیں جب دور بینی کے آلات زیادہ مکمل ہو جائیں گے اور ٹاکیز کی طرح "ہکسلے" (Huxley) کی زبان میں فیلیز (Feelies) کا رواج ہو جائے گا تو پھر حقیقت کی مطابقت میں یہ ہمارے حقیقت نگاروں سے بھی آگے ہوں گی اور اگر بعید از حقیقت مناظر پیش کرنے کی ضرورت ہو تو ہماری تفریحی تحریروں کی نسبت کہیں زیادہ بعید از حقیقت چیزیں پیش کر سکیں گی ممکن ہے ایک دن ایسا بھی آ جائے کہ ہم کسی مشین پر کتاب رکھ دیا کریں اور اس میں جو کچھ ہو اس کا جیتا جاگتا منظر ہمارے سامنے آ جائے اپنے گھروں میں آرام سے بیٹھے ہوئے ہم ان اشخاص کو دیکھ اور سن سکیں گے جن کی تصویر مصنف نے پیش کی ہے لیکن اسے ادب کہا جا سکے گا یا نہیں اور جو کام ہم کو کرنا پڑے گا اس پر پڑھنے کا اطلاق ہو سکے گا یا نہیں اس کا جواب دینا کم از کم میرے تخیل سے باہر ہے، اصل میں مشینی اختراعات سے ادب مجبور کیا جا رہا ہے، کہ اپنے اصلی کام کے متعلق فیصلہ کر لے یعنی یہ کام وہ ہے جو چھپے ہوئے الفاظ سے، اور باتوں کی بہ نسبت بہتر طریق پر لیا جا سکتا ہے غالباً ادب کا پہلا مورچہ، جو اس کے حریفوں کے ہتھے چڑھ جائے گا، وہ حقیقت نگاری ہے اور سچ پوچھئے تو ناول نگاری کی عمر اب بارہ چودہ برس سے زیادہ کی نہیں معلوم ہوتی۔

ادبیات میں جو چیز دیرپا ہے، اور جس میں باقی رہنے کی سب سے زیادہ صلاحیت ہے، وہ شعر ہے شعر اور پریوں کی کہانیاں، ادب کی سب سے سادہ شکلیں ہیں شاعری اپنے توازن اور ترنم کے باعث قلب انسانی کی ان گہرائیوں تک پہنچ جاتی ہے جہاں اور کسی چیز کی رسائی نہیں ہو سکتی پریوں کی کہانیوں یعنی تمثیلی قصوں کے باقی رہنے کا، اس لئے زیادہ امکان ہے کہ یہ تعلیم کا بے مثل ذریعہ ہیں پروپیگنڈے وعظ و پند، اور حکمی کتابوں کا اثر صرف ذہن شعوری پر پڑ سکتا ہے، لیکن چونکہ تمثیلی قصے کہانیاں نہایت ابتدائی قسم کی ہوتی ہیں، سب کے لئے ہوتی ہیں، اور ان میں دلیل و براہان سے کام نہیں لیا جاتا، اس لئے یہ ہماری عقل کے پاس سے چپکے سے نکل جاتی، اور ہمارے غیر شعوری ذہن سے، براہ راست تعلق پیدا کر لیتی ہیں لیکن، اس امر کی ضرورت ہے کہ، شاعری اور افسانے کی، اصلی سادگی قائم رکھی جائے اور ساتھ ہی اس کی ظاہری اور سطحی نفاست میں اضافہ کیا جائے کیونکہ نئی پود کا پیچیدہ ذہن، آرٹ کے اصلی، سادہ معنی سے اپنے آپ کو اسی وقت متاثر ہونے دیتا ہے جب اس میں بظاہر قدرت و نفاست موجود ہو۔

تصنیف و تحریر کا مستقبل، جماعت کے مستقبل پر منحصر ہے لیکن اس کے ساتھ یہ کہنا بھی صحیح ہوگا، کہ کوئی نظام اجتماعی بھی بروئے کار آئے، ادب کی حیثیت، روز بروز زندگی کے رہبر کی ہوتی جائے گی اور ادب اور اخلاق کی عارضی مغائرت ختم ہو جائے گی۔ ادبیات میں انقلاب شروع ہو چکا ہے لیکن جماعتی زندگی کا انقلاب، ادبی انقلاب سے کہیں زیادہ اہم ہے اور اگر یہ نہ ہو تو اس کا ہونا نہ ہونا ایک ہے۔

عبدالحفیظ صدیقی

دہلی میں اردو شاعری کی ابتدا

ہندوستان کے فاتحِ اعظم سلطان محمود غزنوی نے متعدد معرکہ آرائیوں کے بعد ۱۰۲۱ء میں صوبہ پنجاب کو فتح کرکے اپنی سلطنت میں شامل کر لیا اور اس نئے مفتوحہ علاقے میں جس کا صدر مقام لاہور تھا، اپنے عظیم الشان لشکر کے کئی دستے ملک کی حفاظت اور قیامِ امن کے لئے متعین کر دیئے۔ اس فتح کے بعد سے پنجاب میں مسلمانوں کی درآمد کا سلسلہ شروع ہوا اور بہت قلیل عرصے میں یہ صوبہ ایک اسلامی علاقہ بن گیا۔ اہلِ لشکر کے علاوہ بہت سے مسلمان خاندان ایران اور افغانستان سے روزگار کی تلاش اور حصولِ معیشت کے لئے یہاں آ کر بس گئے۔ اس زمانے میں پنجاب میں جو پراکرت زبان بولی جاتی تھی وہ اصطلاحاً آج کل قدیم پنجابی کے نام سے موسوم کی جاتی ہے۔ نو واردوں کی زبان فارسی تھی۔ اہلِ پنجاب کے ساتھ ان کے میل جول اور روزمرہ کاروبار کی ضروریات کے تحت بالکل قدرتی طور پر بلا کسی خاص سعی و کوشش کے ایک ملی جلی یا کھچڑی زبان عالمِ وجود میں آئی۔ یہی مشترک زبان جس میں کچھ الفاظ فارسی کے تھے اور کچھ قدیم پنجابی کے اردو کی بالکل ابتدائی صورت ہے۔ اگرچہ بادی النظر میں یہ محض قیاسی بات معلوم ہوتی ہو لیکن اردو زبان کی اصل اور ابتدا کے بارے میں محققین کی حالیہ تحقیقات نے اس کو نہایت معقول اور مدلل طریقے پر ثابت کر دیا ہے۔

پنجاب پر تقریباً ساٹھ سال تک غزنویوں کی حکومت رہی اور محمود غزنوی کی اولاد نے اس کو ہر طرح کے حملوں سے محفوظ رکھا۔ اس عرصے میں مسلمانوں کی آبادی برابر بڑھتی رہی۔ اور مسلمان زیادہ سے زیادہ تعداد میں آ آ کر یہاں آباد ہونے لگے۔ ۱۱۸۶ء میں سلطان محمود غزنوی نے جو اس سے پہلے غزنی اور اس کے آس پاس کے تمام علاقے فتح کر چکا تھا، ایک بڑا لشکر لے کر پنجاب پر حملہ کیا اور اس کو محمود غزنوی کی اولاد سے چھین لیا۔ غزنوی فوج کے منتشر سپاہی بھی تمام کے تمام غوریوں کی ملازمت میں آ گئے۔ اس واقعہ کے چھ سال بعد محمد غوری کے سپہ سالار قطب الدین ایبک نے لاہور میں اپنی پوزیشن ہر طرح مستحکم کر کے ۱۱۹۳ء میں دہلی پر چڑھائی کی اور دہلی اور اس کے اطراف کے علاقے کو فتح کر کے اپنی اسلامی ریاست میں شریک کر لیا۔ محمد غوری کی وفات کے بعد ہندوستان میں وہی اس کا جانشین ہوا۔ چنانچہ اس نے ۱۲۰۶ء میں دہلی کو اپنا پایۂ تخت قرار دے کر اپنی خود مختاری کا اعلان کیا۔ اس تاریخ کے بعد سے دہلی ہی جدید اسلامی ریاست کی راج دھانی بنی رہی۔ اردو زبان جس کی بنیاد صوبۂ پنجاب میں وہاں کے ہندوؤں اور مسلمانوں کے باہمی میل جول سے قائم ہو چکی تھی، مسلمانوں کے ساتھ دہلی پہنچی۔ یہاں اس زمانے میں جو زبان بولی جاتی تھی وہ کھڑی بولی یا کھری بولی کہلاتی تھی اور یہ اس عہد کی قدیم پنجابی سے کچھ بہت زیادہ مختلف نہیں تھی۔ دہلی میں اس زبان کے ساتھ میل کھا کر اردو زبان کی نشو و نما شروع ہوئی۔ لیکن عام طور پر اب تک یہ سمجھا جاتا رہا ہے کہ اردو زبان برج بھاشا کے میل سے بنی ہو۔ اردو کے بعض تذکرہ نویسوں نے اس خیال کو پھیلایا ہے لیکن حالیہ تحقیقات نے اس خیال کو بالکل غلط ثابت کر دیا ہے برج بھاشا اور اردو دونوں میں بعض ایسے بنیادی فرق ہیں جن سے خود اس خیال کی تردید ہوتی ہے۔ اردو کو جنم دینے اور اس کی بناوٹ لینے میں جن ہندی زبانوں کا حصہ رہا ہے

اسٹوڈیو نمبر (۱) لاہور

(ڈراما اور انگارے)
ایک مذہبی نشریہ کے کردار جو کچھ عرصہ پہلے نشرگاہ لاہور سے پیش کیا گیا

رنگارنگ پروگرام

نشرگاہ لاہور سے تفریحی خاکے گانے اور نظمیں اکثر پیش کی جاتی ہیں۔ امتیاز علی تاج کے لکھے ہوئے پروگرام "بھٹارہ" اور ضیافت طبع، خاص طور پر کامیاب رہے۔

وہ صرف قدیم پنجابی یا صرف دہلی کی کھڑی بولی یا کھری بولی ہو۔ برج بھاشا کے جو اثرات بعد کو اردو زبان پر پڑے وہ دوسری زبانوں کی طرح بالکل خارجی تھے۔ زبان کی ساخت اور بناوٹ سے ان کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ غرض دہلی میں کھڑی بولی کے ساتھ میل کھا کر پنجاب سے آئی ہوئی نئی زبان نے نشو و نما پانا شروع کیا۔ چونکہ یہ اہلِ لشکر کی ضروریات سے پیدا ہوئی تھی اور انہی کی ضروریات دہلی میں بھی اس کے رواج اور نشو و نما کا باعث ہوئیں اس سے ایک مدت کے بعد جب اس کے لئے الگ نام کی ضرورت پڑی تو اس کو زبانِ اردو یا صرف اردو کے نام سے موسوم کیا گیا کیونکہ اردو کے معنی لشکر یا فوج کے تھے۔

مسلمانوں کے دہلی فتح کرنے کے تقریباً ایک سو سال بعد جلال الدین خلجی کے اولوالعزم بھتیجے علاء الدین خلجی نے دکن پر حملہ کیا اور دیوگڑھ (موجودہ دولت آباد) کی ریاست فتح کر لی۔ علاء الدین کے عہد میں اس کے سپہ سالار ملک کافور نے دکن پر متعدد حملے کئے اور جنوبی ہندوستان کے انتہائی نشیبی اور ساحلی حصوں تک اس کی ترکتازیوں کا سلسلہ جاری رہا۔ انہی حملوں کے ساتھ اردو زبان دکن میں پہنچی۔ خلجیوں کے بعد تغلق بادشاہوں نے بھی دکن کو اپنے قبضہ و تصرف میں لانے کے لئے کئی مرتبہ کوشش کی۔ بالآخر محمد تغلق نے دکن کو فتح ہی نہیں کیا بلکہ دیوگڑھ کو دولت آباد کا نام دے کر دہلی کی بجائے اس کو اپنا پایۂ تخت قرار دیا اور دہلی کے تمام باشندوں کو بلا استثنا اس نئے پایۂ تخت میں آباد ہو جانے کا حکم دیا۔

دہلی ایک بار بالکل اجڑ گئی اور ساری اردو بولنے والی آبادی دکن میں منتقل ہو گئی۔ اس واقعہ کی وجہ سے دکن میں اردو زبان کی بنیاد ہمیشہ کے لئے مستحکم ہو گئی۔ اور اردو نے اپنے قدم اس ملک میں اس طرح جمائے کہ باوجود یہاں کی [illegible] زبانوں کے عام رواج کے اردو یہاں برابر بڑھتی گئی۔ اگرچہ محمد تغلق نے بہت جلد اپنا حکم واپس لے لیا اور پھر دہلی کو اپنا پایۂ تخت قرار دے کر اہلِ دہلی کو دکن سے واپس ہو جانے کی اجازت دے دی لیکن بہت سے خاندان دوبارہ دولت آباد سے دہلی تک سفر کی تکلیفوں کا خیال کر کے دہلی نہیں گئے اور یہیں رہ پڑے۔ دکن کچھ دنوں تک سلطنت دہلی کا ایک صوبہ بنا رہا اور تغلق کے صوبہ دار یہاں حکومت کرتے رہے لیکن بہت جلد یہاں مسلمان امرائے دہلی کی سلطنت سے اپنا تعلق منقطع کر لیا اور دکن میں ایک جداگانہ اسلامی سلطنت کی بنا ڈالی۔ یہی دکن کی مشہور سلطنت بہمنیہ ہے۔ اس کا صدر مقام پہلے گلبرگہ تھا۔ پھر بیدر میں منتقل کیا گیا۔ بہمنی سلطنت کی بنیاد ہی ہندو مسلمانوں کے باہمی ملاپ سے پڑی تھی اور ابتدا ہی سے ہندو اس کے مختلف عہدوں پر مسلمانوں کے ساتھ ساتھ مامور رہے ہیں۔ اس کے علاوہ شمال مغرب سے ایرانی اثرات کی درآمد کا جو سلسلہ دہلی کی سلطنت میں جاری رہا وہ یہاں نہیں تھا۔ بہمنی سلطنت کے طویل دور میں دکن میں اردو زبان کی نشو و نما نہ صرف برابر جاری رہی بلکہ اس ملک میں جہاں تلنگی، مرہٹی اور کنڑی زبانیں بولی جاتی تھیں اردو بھی ایک مشترک زبان کی حیثیت رکھتی تھی اور اس حیثیت سے اس کا رواج اور مقبولیت روز بروز بڑھنے لگی۔ بہمنی حکومت کے آخری زمانے میں اس میں تصنیف و تالیف بھی شروع ہوئی۔ صوفیا اور بزرگانِ دین نے اپنی تعلیم و تلقین کے لئے اس عام پسند زبان کو اختیار کیا اور اردو کی ابتدائی تحریرات انہی بزرگوں کی تعلیمات پر مشتمل ہیں۔ صوفیا اور بزرگانِ دین کے علاوہ ملکی اور مقامی شاعروں نے بھی فارسی کی بجائے اس زبان کو اپنی جولانیٔ طبع کے لئے پسند کیا۔ اور اس طرح عام طور پر شعر و شاعری کا

تصنیف وتالیف کا رواج ہوا۔

جب بہمنی سلطنت کے زوال کے بعد دکن میں پانچ اسلامی ریاستیں قایم ہوئیں تو اس سے اگرچہ سیاسی اقتدار میں انتشار پیدا ہوا اور ملک کی یک جہتی اور سیاسی استحکام ختم ہوگیا لیکن یہ چیز اردو کے حق میں بہت زیادہ مفید ثابت ہوئی ان پانچوں ریاستوں نے اس زبان کی سرپرستی کو اپنے لئے ضروری سمجھا اور اس خصوص میں ایک دوسرے پر سبقت لے جاتے میں کوشاں رہیں ان میں بیجاپور کی عادل شاہی ریاست اور گولکنڈہ کی قطب شاہی ریاست نے خاص طور پر اس زبان کی غیر معمولی سرپرستی کی۔ اردو ادب جو کچھ ابتدائی دور میں پیدا ہوا وہ انہی کی سرپرستی کا رہین منت ہے۔ دوسری ریاستوں کے مقابلے میں یہ ریاستیں نہ صرف یہ کہ بڑی اور زیادہ طاقت ور تھیں بلکہ ان کے اولوالعزم بادشاہ خاص طور سے اس زبان کے دل دادہ تھے۔ ان میں سے بعض نے اس کی یہاں تک سرپرستی کی کہ فارسی کی بجائے اس کو درباری اور سرکاری زبان کا درجہ بھی دیا۔ ان کے درباروں میں شروع ہی سے فارسی کے بڑے بڑے اساتذۂ سخن کے پہلو بہ پہلو اردو کے خوش گو شاعروں کی بھی قدر و منزلت ہوتی رہی۔ بعض بادشاہ خود بھی اس زبان میں شعر کہتے تھے مثلاً محمد قلی قطب شاہ بانیٔ حیدرآباد جس کا کلیات ڈیڑھ دو ہزار صفحات پر حاوی ہے۔ شاہانہ توجہات نے اس زبان کو عوام الناس میں اور بھی زیادہ مقبول بنا دیا۔ سارے دکن میں اردو شاعری کے چرچے تھے اور ہر کہہ و مہ اس زبان سے دلچسپی لیتا تھا۔ اس عہد میں دکن میں اردو کے بڑے بڑے شعرا پیدا ہوئے۔ ان کے اکثر و بیشتر کارنامے آج تک بھی صرف قلمی کتابوں کی صورت میں پوشیدہ ہیں۔ اور ابھی ان کی ادبی خوبیاں پورے طور پر ظاہر نہیں ہوئیں۔ رزم و بزم، مدح و ہجو، مرثیے اور مبارک بادیاں غرض جملہ اصنافِ سخن میں ان اساتذہ نے اپنے کمالات دکھائے ہیں۔ اس طرح نثر میں بھی متعدد کتابیں لکھی گئیں۔

اس طویل عرصہ مدت میں جب کہ دکن میں اردو زبان نے ادبی زبان کی حیثیت حاصل کر لی تھی اور اس میں ہر طرح کی کتابیں لکھی جا رہی تھیں، شمالی ہند میں اردو صرف بول چال تک محدود تھی اور کسی قسم کی ادبی تصانیف اس زبان میں نہیں ہوئیں۔ دہلی کئی سلطنتوں کی راج دھانی رہی خلجی، تغلق، سادات اور لودھی سب ہی خاندانوں نے اس کو اپنا مستقر بنایا۔ مغلوں نے بھی ابتدائی دور سے قطع نظر اپنے عروج و اقبال کے زمانے میں اسی کو اپنا دارالسلطنت قرار دیا۔ شاہ جہاں صاحب قران نے اس کو نئے سرے سے آباد کیا اور لال قلعہ اور دوسری عمارتیں بناکر اس کو ہندوستان کا لاجواب شہر بنا دیا لیکن جہاں تک اردو کا تعلق ہے وہ بول چال کی زبان سے آگے نہ بڑھ سکی۔ سرکار دربار میں فارسی کا چلن تھا۔ ہر قسم کی تصنیف و تالیف فارسی میں ہوتی تھی حتیٰ کہ معمولی خط و کتابت اور روزمرہ کے نامہ و پیام کے لئے بھی فارسی ہی استعمال کی جاتی تھی۔

۱۶۸۶ء میں اورنگ زیب نے دکن پر حملہ کیا۔ اولاً بیجاپور کی ریاست فتح کی۔ پھر دوسرے سال گولکنڈے کی قطب شاہی حکومت کا خاتمہ کیا۔ دونوں ریاستوں کے فرمانروا قید کر لیے گئے۔ ان کے آباد اور سر سبز علاقے سلطنت مغلیہ کے جزو بن گئے۔ کروڑوں روپے کی دولت، لعل و جواہر اور شاہی کتب خانوں کی بیش قیمت اور نادرۂ روزگار کتابیں سب کی سب دہلی پہنچیں۔ بیجاپور اور گولکنڈہ جو اردو کے سب سے بڑے مرکز تھے، بالکل اجڑ گئے۔ شعرا و مصنفین کا کوئی

قدرداں اور سرپرست باقی نہیں رہا۔ حکومت کا مرکز منتقل دہلی منتقل ہوجانے کی وجہ سے اب اربابِ کمال اور صاحبانِ ہنر کے لئے سوائے دہلی کے اور کوئی شہر مرکز توجہ نہیں رہا۔ دکن سے بہت شعرا اور دوسرے باکمالوں نے قدردانوں کی تلاش میں شمالی ہند کا سفر کیا اور دہلی پہنچ کر اپنے کمالات کی داد و تحسین حاصل کی۔

اورنگ زیب کے عہد سے پہلے شمالی ہند کے جن شعرا کا ذکر ملتا ہے وہ سعدی اور نوری ہیں لیکن ان میں سے اول الذکر کی ایک غزل کا پتہ چلا ہے اور آخر الذکر کا صرف ایک شعر تذکروں میں ملتا ہے یہ غزل بھی اردو نہیں کہی جاسکتی بلکہ امیر خسرو کی پہیلیوں اور کہہ مکرنیوں کی طرح اس میں ایک مصرع ہندی اور ایک مصرع اردو کا ہے۔ عہد اورنگ زیب میں دو ایسے شاعر شمالی ہند میں پیدا ہوئے جو فارسی کی بجائے اردو یا ریختہ میں شعر کہتے تھے۔ یہ افضل میرٹھی اور میر جعفر علی ہیں۔ ان کے جو اشعار تذکروں میں ملتے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی شاعری اردو سے زیادہ برج بھاشا سے تعلق رکھتی ہے۔ میر جعفر علی کے کلام کو ایک حد تک اردو کہا جاسکتا ہے لیکن ادبی حیثیت سے وہ زیادہ بلند مرتبہ نہیں۔ اور اردو شاعری کے معمار یعنی مرزا مظہر جانِ جاناں، مرزا رفیع سودا اور میر تقی میر وغیرہ انہی کے شاگرد، پیرو اور متبع ہیں۔

سید محمد

اردو شاعری کا تاریک پہلو

اس مرتبہ لکھنؤ سے حیدرآباد تک کا سفر بیک وقت تکلیف دہ بھی تھا اور دلچسپ بھی۔ تکلیف دہ اس لئے کہ گرمی شدید تھی اور دلچسپ اس لئے کہ ایک بہت پرتکلف قسم کے ہم سفر ہاتھ آ گئے۔ جس وقت جھانسی میں مدراس اکسپرس پہونچا تو معلوم ہوا کہ حیدرآباد جانے والے ڈبے میں صرف ایک نشست اوپر کی خالی ہے۔ رات کا وقت، تپتی ہوئی چھت قریب، پنکھا دور، سوال لیٹنے کا بھی نہ تھا، سونا کیسا۔ تاہم کروٹیں لیتا رہا اور معلوم نہیں کس وقت آنکھ جھپکی۔

نو بجے کے قریب آنکھ کھلی تو دیکھا کہ نیچے ایک نشست پر کوئی فوجی گورا پڑا ہوا سو رہا ہے اور دوسری نشست پر ایک سرخ و سفید رنگ کے، نہایت باریک کترا ہوا نقشہ رکھنے والے خوبصورت نوجوان صاف ستھرا دسترخوان بچھائے ہوئے پراٹھے اور کباب کا ناشتہ کر رہے ہیں۔ میں کھانسا بھی کھنکھارا بھی، لیکن انھوں نے کوئی توجہ نہیں کی اور بدستور اطمینان سے کھانا کھاتے رہے۔ ریل کے سفر میں اگر کوئی اپنا ساتھی نہ ہو تو پھر میرا بہترین شغلہ یہ ہوتا ہے کہ ہم سفر لوگوں کے حرکات و سکنات کا بغور مطالعہ کرتا رہوں۔ چنانچہ کھانے کے دوران میں اور اس کے بعد بھی میں ان کی ہر حرکت کو دیکھتا رہا۔ یہ صاحب حیدرآباد کے ایک نوجوان تھے جو دہلی سے آ رہے تھے۔ مجھے ان کا نام معلوم ہے، بکس کے ایک لیبل پر مندرج تھا، لیکن آپ کو بتاؤں گا نہیں۔ ہاں تو میں ان کو نہایت غور سے دیکھتا رہا اور اس نتیجہ پر پہونچا کہ آدمی نہایت سلیقہ کے ہیں لیکن الگ تھلگ رہنا زیادہ پسند کرتے ہیں۔ سفر میں بے تکلفی کی رسم قایم کرنا مجھے بھی پسند نہیں، لیکن چونکہ میں نیچے کی نشست پر آنا چاہتا تھا اس لئے ان کو مانوس کرنے کا خیال پیدا ہوا اور پوچھا "حضرت کیا وقت ہے" انھوں نے مجھے ایک بار دیکھا اور ہاتھ بڑھا کر کلائی کی گھڑی میرے سامنے کر دی۔ مدعا یہ کہ میں آپ سے بات کرنا نہیں چاہتا۔ مجھے کچھ غصہ بھی آیا اور ہنسی بھی لیکن پھر خاموشی کے ساتھ ان کا مطالعہ کرنے لگا۔ چند منٹ کے بعد انھوں نے اپنا بستر و تکیہ صاف کیا اور قمیص کی جیب سے ایک کاغذ نکالا اور پنسل سے اس پر کچھ لکھنے لگے، لکھنے کا انداز یہ تھا کہ کبھی کھڑکی کے طرف دیکھ کر کچھ سوچنے لگتے، کبھی پنسل منہ میں دبا لیتے، کبھی سر کھجانے لگتے، یہاں تک کہ رفتہ رفتہ ان کی بے چینی بڑھنے لگی اور وہ ادھر ادھر چہل قدمی فرمانے لگے۔ ان کے چہرے کے اتار چڑھاؤ سے اور کبھی کبھی کاغذ کو دیکھ کر گن گنانے سے میں سمجھ گیا کہ یہ شاعر ہیں اور اس وقت شاعری کا نہایت زبردست دورہ ان پر پڑا ہے۔ تھوڑی دیر تک تو میں ان کی بے قراری دیکھتا رہا، لیکن پھر ضبط نہ ہو سکا۔ ایک تو مجھے اس بات کا غصہ کہ انھوں نے ناشتہ تنہا کر لیا اور مجھے پوچھا تک نہیں، دوسرے یہ کہ گھڑی گھڑی ادھر ادھر کھڑکیوں کے سامنے آ کر ہوا کو روک رہے تھے۔ میں نے پوچھا "کیوں حضرت خیر تو ہے طبیعت کیسی ہے کہیں درد تو نہیں جو آپ اس قدر بے چین نظر آتے ہیں" انھوں نے مجھے غضب آلود نگاہوں سے دیکھا اور بولے "معلوم ہوتا ہے جناب کو علم غیب میں بھی غیر معمولی ید طولیٰ حاصل ہے" ان کا یہ جواب سن کر میں گھبرا اٹھا، وہ عربی کے ثقیل اور وزنی الفاظ استعمال کر کے مجھ پر رعب ڈالنا چاہتے تھے، میں نے جواب دیا "جی نہیں، عالم غیب ہونے کا ادعائے سفیہانہ تو نہیں رکھتا، لیکن جناب کے اس بیتابانہ قیام و قعود اور کرب آمیز نشی و وقوف سے میں

یہ اندازہ ضرور کیا ہے کہ شاید جناب کے امعاء مستقیم سے ریاح یا سوری اعلیٰ کی طرف صعود کر کے یا تو فم معدہ پر منکاشف ہو رہے ہیں یا دماغ میں کیفیت ضغطہ پیدا کر رہے ہیں" یہ سن کر ان کا چہرہ سرخ ہوگیا اور کچھ سوچ کر بولے کہ "نیچے تشریف لائیے" ان کے تیور ایسے تھے جیسے کوئی یہ کہے کہ "ادھر آ تو بتاؤں" میں نے عرض کیا کہ "میں نیچے آنے میں اپنے لئے خطرہ محسوس کر رہا ہوں" یہ سن کر وہ مسکرا پڑے اور بولے کہ "نہیں، ایک شاعر سے کیا خطرہ!" میں نے کہا کہ "آہاہ، آپ شاعر ہیں، درست ہے، میں یہ تو سمجھ گیا تھا کہ جناب اس وقت شاعری فرما رہے ہیں، لیکن یہ اب تک نہیں سمجھ سکا کہ جناب شاعر ہیں، یا شویعر، تشاعر ہیں یا خنذیذ" وہ خنذیذ کو خنزیر سمجھے اور پھر چہرہ سرخ ہوگیا۔ میں نے کہا کہ "معاف فرمائیے، آپ نے خنزیر سمجھا، حالانکہ میں نے خنذیذ کہا تھا" وہ خاموش ہوگئے، نہ انھوں نے خنذیذ کے معنے مجھ سے پوچھے نہ میں نے بتائے۔ اس کے بعد جب وہ اپنی جگہ چین سے بیٹھ گئے تو میں نے اس خیال سے کہ سفر میں لڑائی ٹھیک نہیں عرض کیا کہ "مجھے جناب کا کلام سننے کا بڑا اشتیاق ہے، اگر حرج نہ ہو تو......" میں اتنا ہی کہنے پایا تھا کہ ان کے چہرے سے مسرت کے آثار ظاہر ہونے لگے اور بولے کہ "ضرور، نیچے تشریف لے آئیے"۔ ایک شاعر کو رام کرنے کا اس سے بہتر کوئی طریقہ نہیں کہ آپ اس کی شاعری سے دلچسپی کا اظہار کیجئے۔ میں اتر کر اس عاشق و شاعر کے ریشمی گدے پر بیٹھ گیا اور انھوں نے اپنا بکس کھول کر بیاض نکالنا چاہی، میں نے خیال کیا کہ اگر انھوں نے کہیں اس بیاض کے ذریعہ سے مجھ سے انتقام لینا چاہا تو بس کام ہی تمام ہے۔ اس لئے کہا کہ "حضت میں تو صرف تازہ ترین کلام سننا چاہتا ہوں جو اس سفر کے دوران میں ہوا ہے۔" شکر ہے کہ وہ کہنا مان گئے اور جیب سے کاغذ

نکال کر فرمایا کہ یہ نظم ہے اور اس کا عنوان "مکتوب بہ جاناں" ہے۔ میں نے کہا کہ "مکتوب بجاناں!" میں یہ محاورہ سمجھ نہیں سکا۔ بولے کہ "مکتوب بہ جاناں یعنے محبوب کے نام ایک خط" اور اس کے بعد وہ ہلکے لحن کے ساتھ پڑھنے لگے۔ اس نظم میں انھوں نے محبوب کو خطاب کرتے ہوئے وہی جذبات ظاہر کئے تھے جو عام طور پر ظاہر کئے جاتے ہیں یعنی فراق میں خواب و خور حرام ہوگیا ہے، ساری رات اختر شماری میں گزر جاتی ہے، سوکھ کر کانٹا ہوگیا ہوں وغیرہ وغیرہ۔ میں یہ سنتا جاتا تھا اور دل ہی دل میں سوچ رہا تھا کہ وہ شخص جو رات بھر پاؤں پھیلا کر نرم گدے پر چین سے سویا ہے، جس نے کامل آدھ گھنٹے تک لذیذ کھانے کا ناشتہ کیا ہے جس کے چہرے سے صحت و شباب کی سرخی ٹپکی پڑتی ہے، جس کی ریشمی قمیص پر ہاتھ رکھنے سے پھسل جاتا ہے، کیا ایسی غلط بیانیوں سے اسے شرم نہیں آتی، اور کیا اس کا محبوب اس بات کا یقین کر سکتا ہے کہ واقعی وہ پریشان حال ہے۔ ایک مصرع اس نظم کا یہ بھی تھا کہ "کوہ و صحرا کی خاک چھانی ہے" میں نے سن کر دل میں کہا "درست ہے لیکن سکنڈ کلاس میں بیٹھ کر!" خیر، اس کے بعد تو مجھ سے ان سے حیدرآباد تک کوئی بات نہیں ہوئی، لیکن میں دیر تک یہی سوچتا رہا کہ ہماری اردو شاعری ہے کیا! آپ ولی سے لے کر بلکہ اس سے پہلے ہی کوئی قطب و ابدال قسم کا شاعر ہوا ہے تو اس کے عہد سے لے کر اس وقت تک کے اس جدید انقلابی شاعر تک جو افضل گنج کے پل پر قصر امارت و سرمایہ داری میں آگ لگا دینے والی نظم گنگناتا چلا جا رہا ہے، نگاہ ڈالی جائے تو صداقت کا عنصر آپ کو ہر دور میں بہت ضعیف نظر آئے گا۔ جو دل میں نہ ہو وہ کہنا، یا جو نہ کر سکتے ہوں اس کا دعویٰ کرنا یہ ہے ہمارے شاعروں کی وہ خصوصیت

جو بلا استثنا ہر زمانے میں پائی جاتی ہے۔

اصنافِ سخن میں آپ قصاید کو تو خیر چھوڑئیے کہ میں اسے ضرورت کی درباری شاعری کہتا ہوں اور ایسے شاعروں کو اربابِ سخن سے زیادہ اربابِ نشاط میں شامل کرنا زیادہ موزوں ہے لیکن دیگر اصنافِ سخن کو لیجئے تو ان میں ہر جگہ یہی خصوصیت نمایاں نظر آئے گی مثلاً غزل کو لیجئے جو بالکل انفرادی قسم کی جذباتی چیز ہے اور فیصلہ کیجئے کہ شروع سے اس وقت تک کتنے مشہور شاعر گزرے ہیں اور ان میں سے کتنے ایسے تھے جو واقعی عشق و محبت کی لذت سے آگاہ تھے۔ تذکروں میں آپ شاعروں کے حالات پڑھیے تو آپ کو ان کا نسب نامہ، ان کے سیر و سیاحت ان کی باہمی نوک جھونک یہ سب کچھ معلوم ہو جائے گا، لیکن اس کا پتہ نہ چلے گا کہ ان کی شاعری کا موضوع کیا تھا۔ انھوں نے غزل کیوں کہی اور کس کے لئے کہی۔ انھوں نے کس کے فراق و وصال کی داستانیں بیان کیں، کس کے عشق میں در در کی خاک چھانی، اور کس کے ہجر میں دامن و گریباں چاک کیا۔ بات یہ ہے کہ اول تو کسی شاعر نے ایسی حقیقی شاعری کی ہی نہیں، اور اگر اتفاق سے کوئی شاعر ایسا ہوا بھی کہ واقعیت کی بنا پر اس نے شاعری کی ہو تو اس کے محبوب کو چھپانے کی ہمیشہ کوشش کی گئی میر کا دیوان درد و سوز کی حکایت سے لبریز ہے، لیکن اس کا پتہ مطلق نہیں چلتا کہ ان کے دل کی آگ بھڑکانے والا کون تھا۔ خود شاعر نے بھی اس کے اظہار کو معیوب سمجھا اور تذکرہ نویسوں نے بھی، اور یہی وہ چیز تھی جس نے شاعری کے ہر دور میں اور بہتر سے بہتر غزل گو شاعر کے کلام میں وہ اسقام پیدا کر دیے جنھیں بعد کو آرٹ کہہ کر گوارا بنانے کی کوشش کی گئی، لیکن فی الحقیقت یہ آرٹ کیا ہے۔ ناگوار مبالغہ، مکروہ قسم کی رعایت لفظی، رکیک تاویلیں، غیر فطری میلانات، الفاظ کی طلسم بندی اور لا یعنی موشگافیاں!

غضب خدا کا ولی کے زمانے کی سادگی و سادگی پرستی کو دیکھیے اور اس کے ساتھ اس تصنع کو کہ

خوبیِ اعجازِ حسنِ یار گر انشا کروں بے تکلف صفحۂ کاغذ ید بیضا کروں

دکھا تجھ قد کا اے نازک بدن باعثِ خمیازۂ آغوش ہے

آغوش میں آنے کی کہاں تاب ہے ہم کو کرتی ہے نگہ جس قدِ نازک پہ گرانی

لکھنؤ اسکول اور ناسخ تو ناحق بدنام ہے، حقیقت یہ ہے کہ اردو کی غزل گوئی میں ابتدا ہی سے اس بے راہ روی کے جراثیم موجود تھے اور اس کا سبب صرف یہ تھا کہ شاعر بننا اور اپنے آپ کو شاعر کہلانا زیادہ تر طلبِ شہرت کے لئے تھا اور پھر اس کے بعد دربار تک پہونچنے کا ذریعہ۔ ولی کے دور میں سراج اورنگ آبادی بہت سلجھا ہوا غزل گو تسلیم کیا جاتا ہے، لیکن اس کے یہاں بھی ہم کو اس رنگ کے اشعار نظر آتے ہیں۔

دوڑے نہیں ہیں سرخ تری چشمِ مست میں
شاید چڑھا ہے خون کسی بے گناہ کا

ہائے رہ گئی دل میں دامن گیریوں کی آرزو
سبزۂ تربت مرا ہے پنجۂ گیرا ہنوز

تکلف و تصنع اور غیر متغزلانہ رنگِ تغزل ان زمینوں میں اور زیادہ چمک اٹھتا ہے جہاں مقصود صرف قافیہ پیمائی ہوتی ہے یا دیوان پورا کرنے کے لئے حروفِ تہجی کے لحاظ سے کسی مخصوص ردیف کا التزام مثلاً سراج کا شعر ہے۔

عجب وہ سروِ گلزارِ ادا خوش قد ہوا واقع
پر بلبل نہالِ گل کو دستِ رد ہوا واقع

آپ ہی انصاف کیجئے کہ اس واقع والی مکروہ ردیف و زمین میں واقفیت کی شاعری کیونکر ممکن ہے۔ اس آرٹ و صنعت نے

عارف الدین خاں عاجز کو جن مزخرفات نگاری میں مبتلا کیا اس کی مثال بھی ملاحظہ فرمائیے۔

عاجز ہوں شاہ ملک جنوں میرے واسطے
سورج کلاہ و چتر فلک ہے زمیں ہے تخت

جب سے اے رنگین ادا تیرا ہے رنگ گل میں نقش
تب سے میری آہ کا ہے سینۂ بلبل میں نقش

عاجز بھی شمع آہ جلاتا ہے باغ میں
روشن اگر گلوں سے ہوا ہے چراغ باغ

اس کاوش بیجا کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس قسم کے جذبات شکن النزام سے ہٹ کر بھی جو کچھ وہ کہتے تھے وہ اس لوع کی کراہتوں سے خالی نہ ہوتا تھا۔

عشق سے خوش قامتوں کی سبز پوشی کر پسند
سرو کے بوٹے قبا پر اب بھی چھپوائے ہیں ہم

اس حنائی ہاتھ کی تعریف خون دل سے لکھ
رشک نخل قلم کو پنجۂ مژگاں کروں

ہمارا اشک خونیں یاد میں گلرو کے بہہ بہہ کر
نگہ کو رشتہ و تسبیح یاقوتی بناتا ہے

یہ حال تھا شعرائے متقدمین کے اولین دور کا۔ اس کے بعد شاہ مبارک آبرو، شیخ شرف الدین مضمون، میر محمد شاکر ناجی، مصطفیٰ خاں یک رنگ، شاہ حاتم اور فغاں کا زمانہ آیا جس میں زبان ضرور صاف ہوئی طرز ادا میں بھی کچھ نکھار پیدا ہوا، لیکن حاتم اور فغاں کے یہاں بھی جو اپنے معیاری تغزل کے لحاظ سے بہت مشہور ہیں ایسے ایسے اشعار نظر آتے ہیں۔

بے مدد زلفوں کے اس کے حسن نے قیدی کیا
صید دل بے دام کرنا صنعت استاد ہے

اس کے بعد طبقۂ متوسطین کے دور اول میں مرزا مظہر جان جاناں، سودا، میر تقی میر، درد، سید محمد میر سوز، قایم، یقین اور بیان جیسے بزرگ نظر آتے ہیں، لیکن ان کے کلام میں بھی اس صنعت و تکلف کی مثالیں آسانی سے مل سکتی ہیں۔ اس دور میں میر اور درد دونوں کا رنگ تغزل اس وقت بھی نمونہ و مثال کی صورت سے پیش کیا جاتا ہے، مگر غیر صداقت کے عنصر سے ان کا کلام بھی بالکل پاک نہیں ہے۔ وقت کم ہے ورنہ میں مثالیں بھی پیش کرتا۔

ان کے بعد مصحفی، حسرت، جرأت و انشا وغیرہ کا زمانہ آیا۔ ان میں صرف جرأت و انشا دو شاعر ایسے تھے جنھوں نے جنسی میلانات کو کھلم کھلا ظاہر کرنا شروع کیا، لیکن یہ صداقت نگاری بہت عامیانہ سطح پر نمودار ہوئی اور بجائے اس کے کہ اخلاقی بلندی اس سے ظاہر ہوتی، ذلت و رکاکت پھیلنے لگی اور یہی اصل بنیاد تھی اس تخریب ذہنی کی جو بعد کو لکھنؤ اسکول کی شاعری سے تعبیر کی گئی اور جس نے شاہ نصیر کی وساطت سے دہلی کے شعرا کو بھی بڑی حد تک متاثر کیا۔ بعد کے آنے والے شعرا میں مومن غالب کو بڑی شہرت حاصل ہوئی اور لکھنؤ میں ناسخ و آتش کو لیکن غیر صداقت کا جو عنصر پہلے سے اردو غزل گوئی میں پایا جاتا تھا اس نے ناسخ کے کلام میں تو خیر اس قدر عجیب و غریب شکل اختیار کی کہ اس کا بیان کرنا بھی شرمناک ہے، لیکن حیرت تو یہ ہے کہ مومن و غالب بھی اس سے نہ بچ سکے اور گو ان کے کلام میں وہ شرمناک حد تک تو نہیں پہونچا لیکن اہمال کے حدود میں ضرور آ گیا اور یہ اہمال صرف مشکل الفاظ ہی کا نہ تھا بلکہ انداز بیان کا بھی تھا۔ مجھے حیرت ہوتی ہے جب غالب کا یہ شعر پڑھتا ہوں۔

نقش کو اس کے مصور پر بھی کیا کیا ناز ہیں کھینچتا ہے جس قدر اتنا ہی کھنچتا جائے ہے

صرف کھینچنے اور کھنچنے کے ابہام پر سارے شعر کی بنیاد قایم ہے۔ اس کے بعد اردو شاعری کا جو دور آیا وہ انتہائی ذلت و پستی کا دور تھا، جس میں سوائے پوست کے مغز کا کہیں پتہ نہ تھا، اور یہیں سے ردِ عمل شروع ہو کر شاعری کے اس دور کا آغاز ہوتا ہے جو مغربی خیالات سے متاثر ہوا اور جسے نظم نگاری کے دور سے موسوم کیا جاتا ہے۔

اس رنگ کے کہنے والے اردو شاعری میں بہت پیدا ہوئے اور ہو رہے ہیں، لیکن اکثر وہی ہیں جو صرف نقالی کرتے ہیں اور کمتر وہ ہیں جو خود براہِ راست متاثر ہو کر کہتے ہیں۔ اسی سلسلۂ نظم نگاری میں غزل گوئی کا بھی رنگ کچھ بدلا اور وہ فحاشی یا چھچھوراپن جو پہلے پایا جاتا تھا کم ہونے لگا، لیکن اب غزل گوئی کو ایک اور روگ لگ گیا، اس روگ کا نام فلسفہ و تصوف ہے۔ یعنی اگر پہلے عدم صداقت کی کوئی شرعی تاویل ممکن نہ تھی تو اب وہ بھی ممکن ہو گئی، یا بالفاظ دیگر یوں سمجھئے کہ پہلے اگر ہم اہمال کہہ سکتے تھے تو اب اس کی بھی گنجایش باقی نہ رہی۔ مجاز نے حقیقت کی شکل اختیار کر لی معشوق ایک ہادی مرشد کی اور شراب نام ہو گیا کوثر و سبیل کا، وحدت الوجود نے آئینۂ حسن کی پشت و رو کو ایک کر دیا۔ ہر عاشق اپنے اندر مشاہدۂ محبوب کرنے لگا اور ہر محبوب رگِ جاں سے قریب ہو کر "قاب قوسین او ادنیٰ" کے حدود میں داخل ہو گیا گویا وداع و وصل کی لذت جس کی بنا پر "ہزار بار برو صد ہزار بار بیا" کا نعرہ بلند کیا جاتا تھا ہمیشہ کے لئے ختم ہو گیا۔ افسوس ہے کہ اردو کا ہر اچھا شاعر اخیر میں اس رنگ پر آجاتا ہے، جس کا سبب غالباً یہ ہے کہ جب مضمون کھانے والی چیز باقی نہیں رہتی تو اسی "اہمال کدہ" میں آکر پناہ ملتی ہے۔ الہام اور اہمال میں صرف حرفوں ہی کی تو الٹ پھیر ہے!

چند سال سے نظم نگاری کے ذوق میں بھی تغیر پیدا ہوا ہے جس کا نام انقلابی شاعری ہے۔ اس میں زیادہ تر مزدور و کسان کو مخاطب کیا جاتا ہے اور قصرِ سرمایہ داری کو ڈھانے کی دعوت دی جاتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ اسی اشتراکیت کا پروپگنڈا ہے، لیکن اس کی حقیقت بھی قریب قریب ویسی ہی ہے جیسے غزل گوئی کی، یعنی جس طرح بغیر محبت کئے ہوئے غزل کہی جاتی ہے، اسی طرح اشتراکیت و اشتمالیت کو سمجھے بغیر اس پر رائے زنی کرنا ہر محفل کتب کا شعار بنا ہوا ہے۔ چند مخصوص الفاظ ہیں، چند بندھی ٹکی ترکیبیں ہیں جن کو بار بار استعمال کیا جاتا ہے اور انھیں پر قصرِ آزادی کی تعمیر قایم کی جاتی ہے۔ پرولتاری طبقہ جس کی نبض فقر و فاقہ سے ڈوبی جا رہی ہیں، کدال اور پھوڑا لے کر نکلتا ہے، بورژوا طبقہ کے مکانوں کو دیکھتا ہے اور ان کی بنیادیں ہلا دینے، ان میں آگ لگا دینے کا نعرہ لگاتا ہوا نکل جاتا ہے۔ اسی تنگ سرمایہ پر ہماری انقلابی شاعری کی بنیاد قایم ہے اور لطف یہ کہ انقلابی شاعری کرنے والوں میں فی ہزار ایک بھی ایسے نہیں ہیں جن کے دل میں ملک و وطن کی محبت کا صحیح جوش ہو یا پرولتاری و بورژوا طبقوں کی حقیقت اور ان کے باہمی تعلقات کی تاریخ کا علم رکھتے ہوں۔ یہ نتیجہ ہے صرف بے روزگاری کا۔ اگر اس قسم کے شاعروں کو زیادہ نہیں صرف اتنا دے دیا جائے کہ بغیر محنت کئے ہوئے گپ لڑاتے رہیں تو پھر ان کے منہ سے لفظ انقلاب کبھی سننے میں بھی نہ آئے۔ یہ جماعت وہ ہے جو بغیر کام کئے ہوئے بغیر پاؤں ہلائے عیاشیاں کرنے کی تمنا رکھتی ہے۔

الغرض ہماری اردو شاعری پر شروع سے اس وقت تک

کوئی زمانہ ایسا نہیں گذرا جس نے ہماری تعمیر تربیت یا اصلاحِ تمدن میں کوئی حصہ لیا ہو۔ بلکہ میں تو یہ دیکھتا ہوں کہ ہمیشہ اس نے تخریب ہی کی۔ غزل میں سوز و گداز کو ضروری خیال کیا گیا اور سوز و گداز نام قرار پایا صرف ہائے ہائے کا، نتیجہ یہ ہوا کہ ہمارے ذہنوں میں ایک سوگوارانہ کیفیت پیدا ہو کر حیات کا صرف تشائم (pessimistic) پہلو ہمارے سامنے آگیا!

مسلمان قوم یوں بھی توکل پر ہاتھ پاؤں توڑ کر بیٹھ جانے کی عادی تھی، شاعری کی ان غم انگیزیوں نے اور بیکار کر دیا۔ بعد کو جب تصوف و فلسفہ شاعری کا جزو قرار پایا تو "یوم الست" کے تصور اور من و تو کے اتصال نے اور بھی دنیا سے بےنیاز کر دیا۔

کچھ توقع نظم نگاروں سے پیدا ہوئی تھی۔ سو وہاں بھی احساسِ صحیح کا فقدان نظر آیا، ان کی نبضیں صرف زبان ہی کی کانپتی ہیں، خون کی گردش و التہاب سے ان کا کوئی تعلق نہیں۔ "انقلاب انقلاب" کی آواز تو ہر طرف سے آرہی ہے، لیکن "اکتساب و عمل" کا ولولہ کسی میں پیدا نہیں۔ گویا یہ آواز عالمِ احتضار کی سی کراہ ہے۔

ہوسکتا ہے کہ زبان و ادب پر اردو شاعری کا کچھ احسان ہو لیکن انسان و انسانیت کے ساتھ اس نے کوئی اچھا سلوک نہیں کیا۔ کسی چیز کی افادیت معلوم کرنے کا اچھا طریقہ یہ نہیں کہ ہم اس پر طلب و فراہمی کا اصول منطبق کر کے اندازہ کے لحاظ سے اس کے مفید ہونے پر حکم لگائیں ورنہ اس طرح چین اور ہندوستان میں افیون کی افادیت کو تسلیم کرنا پڑے گا۔

بلکہ صحیح طریقہ یہ ہے کہ ہم ایک چیز کو اپنے میں سے بالکل علیحدہ کر کے غور کریں کہ اس کے نہ ہونے سے کیا نقصان پہونچا۔ غور کیجئے کہ اگر اس وقت ہندوستان کے تمام اردو شاعر فنا ہو جائیں تو ہم کو کیا نقصان پہونچ سکتا ہے۔ غالباً کچھ نہیں! انہیں کا خیال ہے کہ مادی حیثیت سے شاعری کی ضرورت یا عدمِ ضرورت پر حکم لگانا صحیح نہیں بلکہ اخلاقی و روحانی حیثیت سے اس کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ اگر ہم اس اصول کو تسلیم کرلیں تو بھی اردو شاعری میں ہم کو قحط الرجال نظر آتا ہے، میں نفسِ شاعری یا جذبۂ شاعرانہ کو برا نہیں سمجھتا، کیونکہ شاعری نام ہے احساسِ حسن کا، حسن بھی کیسا؟ بسیط، مجرد! اور یہ ایک ایسی فطری ودیعت ہے جو اعترافِ افادیت یا عدمِ افادیت سے بالاتر ہے۔ لیکن اردو شاعری میں اس کو زیادہ تر ایک فن کی حیثیت دے دی گئی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ شاعری آبِ حیات نہ رہی بلکہ محض "فاعلاتن فاعلاتن فاعلات" بن گئی۔

نیاز فتحپوری

سنگِ گوہر — یہ ایک چھوٹا سا منظوم ڈرامہ ہے جس کو مولوی جلال الدین صاحب اشک بی۔ اے ایل ایل بی نے تصنیف کیا ہے۔ اور یقین ہے کہ یہ حسین و جمیل مختصر ڈراما بھی اہلِ ذوق سے ضرور خراجِ تحسین حاصل کرے گا۔

باکمال شاعر نے اس کی تصنیف و ترتیب میں چند خاص ادبی نظریوں کو پیشِ نظر رکھا ہے جن کی اہمیت اس ڈرامے کے مطالعے کے بعد ہی واضح ہوسکتی ہے۔ نہایت دیدہ زیب شائع ہوا ہے اور قیمت بہت ہی کم یعنی صرف چار آنے رکھی گئی ہے۔

نظم اور غزل پر میرے خیالات

کچھ دن قبل ہندوستان میں ایک بڑی دلچسپ بحث "نظم اور غزل" سے متعلق شروع کی گئی تھی۔ جس میں ملک کے ممتاز ادیبوں اور شاعروں نے حصہ لیا تھا غزل گو شعرا یہ ثابت کرنے کی کوشش کر رہے تھے کہ شاعری یا وہ آرٹ جسے شاعری سے موسوم کیا جاتا ہے صرف غزل میں ہے اور شاعری کی دوسری قسمیں محض اضافی ہیں جن کا آرٹ سے کوئی تعلق نہیں اسی طرح وہ شاعر جنھیں نظم سے دلچسپی ہے غزل کے عیب ظاہر کرنے میں اپنا پورا زور صرف کر رہے تھے۔

جہاں تک میں سمجھا ہوں نظم والے غزل کے سرے سے مخالف نہیں ہیں۔ بلکہ ان کی گفتگو مبنی ہے اس پر کہ جس نہج پر غزل کہی جاتی ہے اس کو تبدیل ہونا چاہیے۔ ان کے خیال میں "وصل و ہجر" "یار و اغیار" "وفا و جفا" کے بغیر بھی غزل ہو سکتی ہے، لیکن یہ واقعہ ہے کہ غزل گو حضرات ان شعراء کو شاعروں میں شمار نہیں کرتے جنھوں نے نظم کو اظہار خیال کا ذریعہ قرار دیا ہے۔ چنانچہ بعض مشہور غزل گو شاعروں سے مجھے گفتگو کا موقع ملا ہے اور میں نے انہیں یہی کہتے ہوئے سنا کہ نظم بھی کوئی چیز ہے جسے شعر کی ردا پر جگہ دی جائے۔ اسی بنا پر یہ لوگ علامہ سر اقبال مرحوم کی عظمت شاعرانہ کا اعتراف نہیں کرتے۔ اور دوسرے قابل ذکر نظم نگار بھی ان کی نظر میں "طفلانہ پن" کی حد سے آگے نہیں بڑھے۔ اصل میں یہی تھا جس میں اختلافات کے اس ہنگامہ کی تعمیر کی۔ اور نظم والوں کو غزل اور غزل گویوں سے کھلی ہوئی بغاوت پر آمادہ کیا۔ میں جانتا ہوں کہ بعض ایسے شعراء بھی ہیں جنھوں نے اگرچہ غزل پر زیادہ توجہ صرف کی ہے لیکن وہ نظم بھی کہتے ہیں اور نظم کو "آرٹ" سے خارج نہیں سمجھتے۔

غزل کے خلاف اس الحاد و انکار کی بنا، اصل میں مولانا حالیؔ مرحوم نے ڈالی تھی۔ انھوں نے "مقدمۂ شعر و شاعری" میں اس نوع کی شاعری کے بے بنیاد اور غیر مفید ہونے پر سیر حاصل بحث کی ہے اس سے ہم سب واقف ہو چکے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ انھوں نے مسدس کے مختصر دیباچہ میں اپنے عہد غزل گوئی کو غفلت اور بے خبری کے عہد سے تعبیر کیا ہے۔ اور پھر مسدس میں صاف صاف کہہ دیا ہے کہ ؎

یہ شعر اور قصائد کے ناپاک دفتر عفونت میں سنڈاس سے ہیں جو بدتر

اس کے بعد انھوں نے خود مختلف قسم کی نظمیں کہیں۔ اور نوجوان طبقے میں غزل سے بے زاری اور نظم گوئی کے شوق کی بنیاد رکھ دی۔

اس سے مولانا حالی مرحوم کا مقصد اس میں کچھ شک نہیں کہ مصلحانہ تھا۔ وہ سر سید مرحوم کے تعمیری پروگرام کے سب سے بڑے حامی تھے۔ وہ دیکھ رہے تھے کہ مے و معشوق کے ذکر کی ہمہ گیری نے قوم کے نوجوانوں کی سیرت و اخلاق کو کس درجہ گرا دیا ہے۔ اس لیے جہاں انھوں نے ان معایب کے چہرے کو بے نقاب کر دیا جو مذہب کی آڑ میں قوم کے افراد کو نا اہلی نارسائی، فریب و ریا کی تعلیم دے رہے تھے وہاں انھوں نے شاعروں کے جوہر فطری کو بھی صیقل کرنا چاہا اور انہیں تصورات کی دنیا سے نکال کر حقائق کے جانب رخ کرنے کی دعوت دی۔

یہ تھی وہ آواز جس نے ہماری شاعری میں آرٹ کی ایک نئی روح کو بیدار کر دیا۔ اور یہ تھے وہ خیالات جنھوں نے ہمیں اپنی حدود سے آگے بڑھنے اور کھلے میدانوں میں دوڑنے کی آزادی عطا کی۔ اور اصل یہ ہے کہ اسی نے ہمیں عربی ہندی اور مغربی آرٹ کے مطالعہ پر متوجہ کیا۔ اور فن شعر پر تنقید کی صحیح راہیں

دکھائیں۔

مجھے اس سے انکار نہیں کہ جہاں تک محبت کی والہانہ کیفیات کا تعلق ہے اور جس حد تک داخلی جذبات واحساسات کی گرفت ہوسکتی ہے ہماری شاعری کا کوئی جزو تشنہ نہیں تھا۔ لیکن اس میں صنعت اور آورد کے عنصرِ غالب نے اس کے خد وخال بھی بگاڑ کر رکھ دئے تھے ہرچند کہ شاعری اور موسیقی مشرقی فنون ہیں ان میں خصوصاً ایران کی فارسی اور ہندوستان کی ہندی شاعری کا ساری کائنات میں کوئی جواب نہیں۔ تاہم اردو میں شاعری کا جو انداز اختیار کیا گیا تھا وہ مبنی تھا دوسری زبانوں کے چند اصولوں پر جو مستعار لے لئے گئے تھے۔ اس لئے ہماری شاعری میں نہ فارسی کی لطافت تھی نہ ہندی کا سوز وگداز اور نہ مغربی استعارات کی دل آویزی اور نہ عربی کی سادگی اور واقعیت۔ انہی خیالات کو پیشِ نظر رکھ کر میں نے اپنی ایک نظم میں کہا ہے ؎

حسن رازِ زشتیِٔ اعمال ہے تیرے لئے ٭ عشق اک بازیچۂ اطفال ہے تیرے لیئے

ہماری شاعری حسن وجمال کی ان کیفیات کو نمایاں کرنے کی حامی نہیں تھی جو انسان کو سیرت واخلاق کی بلندی احساس وخیال کی لطافت اور فکر ونظر کی گہرائیوں سے آشنا کرتی ہو۔ بلکہ ہم حسن کے بیان میں اپنا سارا زور "شاہدانِ بازاری" کی پست اور ذلیل ذہنیت کی تصویر بنانے میں صرف کرتے تھے عشق نام تھا ہوس کاریوں کی ان گندگیوں کا جنھیں سنجیدہ طبقے میں زبان سے لگانا بھی گناہ سمجھا جائے گا۔

شعر کے الفاظ بلکہ خیالات تک کو متعین کر لیا گیا تھا اور کسی بڑے اور مشہور شاعر کی شاگردی اور اتباع پر بڑے فخر وناز کا اظہار کیا جاتا تھا۔ دنیا بھر کی دور از کار باتوں کو شعر میں جمع کر دینے کا نام نازک خیالی اور معنی آفرینی تھا۔ اس کا ایک قدرتی نتیجہ ہوا کہ اربابِ علم وفضل نے شاعری کی جانب توجہ کم کر دی اور شعر ایسے ہاتھوں میں چلا گیا جنھیں نہ مشرقی ادب سے واقفیت اور نہ جو مغربی اصولِ فن سے آشنا تھے۔ اور اس طرح شاعری کی تباہی میں جو کسر رہ گئی تھی اسے بھی پورا کر دیا گیا۔ باور کیجئے کہ اگر اردو کی اور خصوصاً غزل کی خوش قسمتی سے ہندوستان میں غالب نے آنکھ نہ کھولی ہوتی اور عام راستے سے ہٹ کر ایک نئی دنیا آباد نہ کی ہوتی ایسی دنیا جس میں عالمانہ شکوہ کے آثار بھی تھے اور فنی لطافتوں کے مناظر بھی۔ جس کی بنیاد اگرچہ قطعی طور پر مشرقی اصولِ شعر پر رکھی گئی تھی لیکن جس کی فضاء میں ادب اور آرٹ کی ہمہ گیر وسعتوں کے لئے ہر قسم کی گنجائش موجود تھی تو نہ کوئی حالی ہوتا اور نہ اقبال اور نہ وہ آگے کے شاعر جو ہندوستان کے مختلف گوشوں میں جھلکتے نظر آتے ہیں۔

میں بعض اوقات اس آئینِ فطرت پر حیران ہو جاتا ہوں کہ وہی غالب جو فارسی میں نظیری اور ظہوری کے ساتھ چلنے کی کوشش میں سرگرداں ہوتا ہے اردو میں بالکل ایک "نوع" کی حیثیت اختیار کر لیتا ہے۔ اس کی عظیم شاعرانہ فطرت زمانے کی ناقدرشناسی کو محسوس تو کرتی ہے لیکن اس کے سامنے سر ڈال دینا گوارا نہیں کرتی۔ غرض یہ ایک حقیقت ہے کہ اردو غزل گوئی میں نئے نئے مضامین کی تخلیق لطیف تر استعارات اور تشبیہات کا استعمال اور معنی آفرینی کا جدید اسلوب ہمیں غالب نے سکھایا اور مجھے اس کا یقین ہے کہ حالی کے ذوق کی تربیت بھی غالب ہی نے کی تھی (اگرچہ بظاہر مولانا کی اصلاحی اور اخلاقی نظموں اور غالب کے اصولِ شاعری میں نمایاں فرق ہے)

میں نے اب تک جو کچھ بیان کیا ہے اس سے میرا مفہوم غزل گوئی کی مخالفت یا ان اساتذۂ فن کے کمالات کا انکار نہیں ہے

جنھوں نے ادب و شعر کی تعمیر میں اپنی عمریں صرف کر دی تھیں۔ میں یقیناً غزل کا مخالف نہیں ہوں۔ اور نہ مجھے اس کے اظہار میں کوئی تامل ہے کہ سوسائٹی، زمانہ اور ماحول کے لحاظ سے پہلے کے لوگوں نے جو کچھ کیا وہ یکسر نظر انداز کرنے کے قابل ہے۔ میں نے یہ تفصیل صرف اسی لئے کی ہے کہ غزل سے بیزاری کے عام وجوہ سامنے آجائیں۔

اب میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ شاعری کے لحاظ سے نظم و غزل کا اپنی اپنی جگہ کیا مرتبہ ہے اور دونوں میں کوئی ہم آہنگی اور ربط ہے یا دونوں ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں۔ یہ امر تو بالکل واضح ہے کہ ابتداً اردو میں شاعری کا ہر انداز فارسی سے مستعار لیا گیا تھا۔ یہاں تک کہ فن شعر میں جن تلمیحات اور اشارات سے کام لیا جاتا ہے وہ بھی بالکل وہی اختیار کر لئے گئے جو فارسی میں رائج تھے۔ اس لئے پہلے یہ دیکھنا ضروری ہے کہ فارسی میں نظم رائج سمجھی جاتی تھی یا نہیں اور وہاں کے شعرا غزل کے مقابلے میں اس کا کیا مرتبہ سمجھتے تھے فارسی کا ایک مشہور قطعہ ہے۔

در شعر سہ کس پیمبرانند　　　ہر چند کہ لا نبی بعدی
ابیات و قصیدہ و غزل را　　　فردوسی و انوری و سعدی

اس قطعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ فارسی میں ابیات یعنی نظم کا بھی وہی درجہ تھا جو قصیدہ اور غزل کا سمجھا جاتا تھا۔ ورنہ قصیدہ اور غزل کے ساتھ ابیات اور فردوسی کی پیمبری کا ذکر نہ کیا جاتا۔ جس کا سرمایۂ شعر صرف شاہنامہ ہے اور جو تمام نظم ہے۔ اصل یہ ہے کہ فارسی میں غزل کے ساتھ نظم کا میدان بھی بہت وسیع تھا" رباعی، مسدس، مخمس، قطعہ بند، مثنوی، قصیدہ وغیرہ یہ سب نظم ہی کی مختلف شکلیں ہیں اور جب کوئی شاعر کسی قابلِ ذکر واقعہ کو نظم کرنا چاہتا تھا تو انہی اصناف میں سے کسی صنف کو اختیار کرتا تھا لیکن ان سب میں خصوصاً مثنوی اظہارِ خیال کا بڑا ذریعہ سمجھی جاتی تھی چنانچہ ایران اور ہندوستان کے اساتذۂ فن میں کوئی ایسا نہیں ہے جس نے فردوسی کے کمال کا اعتراف نہ کیا ہو غالب اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں کہ" شاعر کا کمال یہ ہے کہ وہ فردوسی ہو جائے"۔

اسی طرح سعدی، نظامی، جامی اور خسرو کے قبول عام میں ان کی مثنویوں ہی کو زیادہ دخل ہے۔ سعدی کی غزلیات کے چار دیوان ہیں بلکہ پانچ اور کچھ شک نہیں کہ سادگی لطافت اور درد و اثر کے لحاظ سے ان کی غزلیں لاجواب ہیں لیکن کتنے ہیں جو اس سے واقف ہوں کہ سعدی غزل بھی کہتے تھے۔ عام طور سے ان کی گلستان اور بوستان کو ہر شخص جانتا ہے اور ان میں جو چھوٹے چھوٹے قطعات انھوں نے نظم کئے ہیں ان میں سے اکثر زبان زدِ عام ہیں۔ ایک طرح سے فارسی کے نظم گو شعرا کو جو رتبۂ بلند حاصل ہوا وہ صرف غزل کہنے والوں کو نصیب نہ ہو سکا۔ چنانچہ نظیری اور حافظ فارسی کے فنِ غزل گوئی میں عدیم المثال سمجھے جاتے ہیں تاہم فردوسی، نظامی اور سعدی سے ان کا مرتبہ بلند نہیں ہے۔ لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ غزل کا شاعری میں کوئی مقام نہیں ہے اور جو خطوط غزل کے متعین کئے گئے ہیں وہ تمام تر غیر فطری اور مبالغہ آمیز ہیں غزل حقیقت میں جذبات و احساسات کی ترجمانی کا ایک لطیف تر پیرایہ ہے۔ اور میری ہمیشہ سے یہ رائے ہے کہ اگر غزل کی حد بندیاں باقی نہ رہیں اور ہر شاعر کو اس میں آزادانہ فکر کا موقع حاصل ہو تو غزل میں وہ سب کچھ ہے جو ہمیں دوسرے اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کے لئے مجبور کرتا ہے۔ شاعری

کی تعریف میں ہر عہد کے حکماء نے حصہ لیا ہے اور ہر شخص نے بقدر ذوق اس کی تعریف کی ہے۔ ان سب کا خلاصہ میرے نزدیک یہ ہے کہ شاعری نام ہے مشاہدہ اور تخیل کے ذہنی نتائج کا اور اس طور پر میرے خیال میں شاعری کی دو ہی قسمیں ہیں۔ داخلی اور خارجی۔ داخلی سے میری مراد جذبات اور واردات ہیں جیسے محبت، نفرت، غیظ و التفات وغیرہ۔ اور خارجی شاعری مناظر و مظاہر پر محیط ہوتی ہے لیکن یاد رکھیئے کوئی شعر کبھی مکمل نہیں ہوتا جب تک کہ اس میں یہ دونوں کیفیات دوش بدوش نہ ہوں اصل چیز ہے مشاہدہ۔ مشاہدہ ہمیں تخیل دیتا ہے اور تخیل کو اگر مناسب الفاظ مل جائیں تو یہی شعر ہے۔ شعر اگر محض خیال پر مبنی ہو تو یقیناً اس میں آورد اور صنعت ہوگی اور اگر صرف مشاہدہ کا نتیجہ ہو تو درد و اثر سے خالی ہوگا۔ اس لئے ایسی نظم کو نظم کہنا ہی غلط ہے جس میں سوز و گداز درد و اثر اور رنگینی و رعنائی نہ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ فارسی میں خاقانی اور اردو میں ذوق کامیابی کے درجے تک نہ پہونچ سکے اس لئے کہ ان دونوں کی شاعری میں مشاہدہ تو ہے لیکن قلب کی گہرائیوں سے جو کیفیت اُٹھتی ہے، وہ بہت کم ہے یا بالکل نہیں ہے۔ اس مختصر توضیح کے سایہ میں آپ سمجھ سکتے ہیں کہ نظم ہو یا غزل جب تک اس میں شاعرانہ لطافتیں نہ ہوں شعر کہلانے کی مستحق نہیں ہوتی۔ اور اگر یہ کیفیات ہوں تو پھر دونوں کا مقام ایک ہے۔ اور دونوں اپنی اپنی جگہ آرٹ کا مفہوم پورا کرتی ہیں۔

علی اختر

نمودِ زندگی۔ جناب سید علی منظور صاحب حیدرآبادی کے کلام کا دوسرا مجموعہ ہے جو نہایت سلیقہ سے ترتیب دیا گیا ہے۔ اس میں (۱۰۱) نظمیں (۱۷) غزلیں اور (۵) رباعیات ہیں۔ سید علی منظور صاحب حیدرآباد کے پختہ مشق مشہور شاعروں میں سے ہیں۔ ان کی شاعری کے قدر دان دور دور پھیلے ہوئے ہیں اردو کا کوئی مشہور و مستند رسالہ ایسا نہیں جس میں آئے دن ان کی غزلیں اور نظمیں نہ چھپتی ہوں اور پھر یہ نظمیں ایک رسالے سے دوسرے رسالے میں نقل کی جاتی ہیں۔ علی منظور عہدِ حاضر کے ان چند کامیاب شاعروں میں سے ہیں جنھوں نے اپنے کلام میں زندگی کی صحیح ترجمانی کی اور اس میں کامیابی بھی حاصل کی۔

صفحات (۲۱۲) قیمت عہ

گریہ و تبسم۔ صاحبزادہ میکش مدیر سب رس کی نظموں اور غزلوں کا بہترین مجموعہ ہے۔ جناب میکش حیدرآباد کے نوجوان شعرا میں ایک خاص امتیاز کے مالک ہیں اور ان کا کلام بہت مقبول ہے۔ عالیجناب ڈاکٹر زور صاحب کا دیباچہ عمومی اور جناب پروفیسر عبدالقادر صاحب سروری کا مقدمہ بھی اس کے ساتھ شائع ہوا ہے۔ شاعری سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے اس کا مطالعہ دلچسپی سے خالی نہیں۔

صفحات (۱۹۲) طباعت و کتابت نفیس

کاغذ اعلیٰ قسم جلد پر سنہری نام

(قیمت عا)

شعر و شاعری

شعر و شاعری کا موضوع جتنا وسیع ہے اتنا ہی پامال بھی ہے۔ عربوں نے اس میں باتیں کی ہیں اور عجمیوں نے اپنی گویائی کا ثبوت دیا ہے۔ ہمارے ہاں اس پر مولانا حالی نے مقدمہ لکھا مولانا شبلی نے موازنہ کیا اور ڈاکٹر اقبال نے اس کو نعیبی نقطۂ نظر سے دیکھا اور نہ معلوم اور کس کس انداز سے کہا اس لئے اب اس موضوع پر کہاں تک کوئی کہے اور کہے تو کیا کہے۔ اعادہ بے لطف ہے اور اضافہ محال مگر چونکہ آج مجھے اس موضوع پر تقریر کی دعوت دی گئی ہے اس لئے اس مختصر وقت میں جو میری تقریر کے لئے معین کیا گیا ہے شعر اور لوازم شعر کے متعلق جو کچھ میری ذاتی رائے ہے عرض کئے دیتا ہوں۔

میں شعر اور نظم محض میں فرق کرتا ہوں۔ اگرچہ نظم کے خد و خال اکثر و بیشتر شعر سے ملتے جلتے ہیں لیکن ضروری نہیں کہ ہر نظم شعر کا مرتبہ پا سکے۔

عموماً شعر کلام موزوں کو کہتے ہیں موزونیت ہر شعر کا لازمہ سمجھا جاتا ہے مگر میری رائے میں شعر کے لئے جو سب سے زیادہ ضروری چیز ہے وہ شعریت ہے سب سے زیادہ میں اس لئے کہتا ہوں کہ اگر شعر شعریت سے عاری ہو تو موزونیت اس کی تلافی نہیں کر سکتی ہاں اسے صرف نظم کا درجہ دیا جا سکتا ہے۔ میرا دعویٰ بظاہر ایک امر مسلمہ کا غیر ضروری اعادہ معلوم ہوگا یعنی یہ کہنا کہ شعر میں شعریت ضروری ہے بالکل ایسا ہی ہے جیسا یہ کہنا کہ آدمی میں آدمیت بھی ضروری ہے مگر نہیں میں یہ کہوں گا کہ جس طرح آدمی میں آدمیت عموماً نہیں ہوا کرتی اسی طرح ہر شعر میں شعریت بھی نہیں ہوتی جس طرح آج انسانی ترقی کی انتہا یہ سمجھی گئی ہے کہ وہ محض ایک مشین بن کر رہ جائے اسی طرح شعر بھی صرف آرٹ ہو کر رہ گیا ہے چنانچہ دورِ حاضر کے اکثر شعرا اس پر فخر ہی نہیں بلکہ سر دھنتے ہیں کہ ان کا شعر آرٹ کا ایک بہترین نمونہ ہے۔

جب کہ جذبات اور تاثراتِ حسیاتِ قلبی اور کیفیاتِ دلی انسانی کمزوریاں سمجھی جاتی ہوں تو ان کا شمار محاسن میں نہیں بلکہ عیوب میں ہونا ہی چاہیے تھا۔ چنانچہ ہو رہا ہے اور شعریت جو ان نازک حسیات اور ان لطیف کیفیات پر مشتمل ہے مفقود ہوتی جاتی ہے۔ جس شعر سے شعر کا صحیح مفہوم ادا ہو جائے جس میں شعریت ہو جو دل سے نکل کر دلوں سے ٹکرا جائے وہ اگرچہ ہزار دو ہزار نادر دانی کے باوجود ابھی دنیا سے مٹ نہیں گیا مگر اب اس حالت میں ہے کہ شاید اس کا مٹ جانا ہی شعر اور خود شاعر کے لئے بہتر تھا۔

بہرحال میں موزونیت کو لوازم شعر میں دوسرا درجہ دیتا ہوں۔ بالفاظ دیگر میں موزونیت کو شعر میں اتنا ضروری نہیں سمجھتا جتنا شعریت۔ آپ سمجھیں گے کہ میں اصل موضوع سے جدا ہو رہا ہوں (حالانکہ ایسا نہیں ہے) اگر میں یہ کہوں کہ کلام ناموزوں بھی شعر ہوتا ہے بشرطیکہ وہ مظہر کیفیاتِ قلب ہو۔ بعض فقرے بعض جملے اور بعض الفاظ بھی مکمل شعر ہو سکتے ہیں۔ ایک آہ ایک اف اور شاید کیا یقیناً بعض حالات میں ایک نگاہ بھی شعریت کی حامل ہوتی ہے۔ بہرصورت شعر کو جانچنے کا صحیح معیار صرف شعریت ہے اور بس۔

اگر شاعر کا صرف ایک شعر اس معیار پر ٹھیک اتر جائے تو وہ یقیناً شاعر ہے اور اس کو شاعر کہلائے جانے کا حق حاصل ہے۔ برخلاف اس کے اگر کوئی شاعر دو سو اشعار روزانہ ڈھال لینے کی قدرت رکھتا ہے اور اس طرح اس کے کلام کا مجموعہ

صرف تولا جاسکتا ہے شمار نہیں کیا جاسکتا تو اس کی قدر صرف اس طرح کی جاسکتی ہے کہ وہ مجموعہ نذر آتش کر دیا جائے کیونکہ اسے شعر کی دنیا کو ضرورت نہیں۔ ایسا شعر خود اس کاریگر شاعر کے لئے مالی اعتبار سے مفید ہو تو ہو لیکن یہ وہ خاموش مگر قاتل زہر ہے جو ملک اور قوم کو بالآخر تباہ کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

میں نے جو کچھ اب تک شعر سے متعلق عرض کیا اس کی اگر صحیح تعریف یہی ہے تو شعر کو کسی خاص غیر شاعرانہ مقصد کے حصول کے لئے آلۂ کار نہیں بنایا جاسکتا۔ خواہ وہ مقصد کچھ ہی کیوں نہ ہو۔ مقصد کی بلندی یا اہمیت سے اس اصول میں کوئی فرق نہیں آسکتا۔

شعر کا حاصل خود شعر ہے اور بس۔ شعر کا تعلق کسی ملک کسی قوم یا کسی خاص شعبۂ زندگی تک محدود نہیں رہ سکتا۔ وہ بنی نوع انسان بلکہ تمام عالم موجودات کے وجود اور اس کی غیر محدود کشاکشِ حیات سے تعلق رکھتا ہے۔ یہی تو وہ درس جو فطرت جب چاہتی ہے اور جسے چاہتی ہے خود سکھاتی ہے۔ اور جب تک فطرت خود نہ سکھائے کوئی شاعر شاعر کہلانے کا مستحق نہیں ہوتا۔ زید و عمرو کے آگے (خواہ وہ خود کتنے ہی بڑے استاد ہوں) زانوئے شاگردی تہہ کرنے سے کوئی شخص حقیقی معنی میں شاعر نہیں ہوسکتا۔ شاعری کا صحیح مرتبہ یہ ہے کہ وہ جزو پیغمبری ہو اور خدا کی شاگردی کے بغیر یہ مرتبہ حاصل ہونا محال ہے۔ جو شعرا صحیح معنی میں شعرا تھے یا ہیں وہ شعر کو اس کے صحیح درجہ سے گرانے کے لئے نہ کسی قیمت سے خریدے جا سکتے ہیں اور نہ کسی قوت سے مرعوب ہوسکتے ہیں۔ وہ ہر مصیبت کو جو اس مسلک کی بدولت ان پر ٹوٹتی ہے خندہ پیشانی سے برداشت کرتے رہے ہیں اور برداشت کرتے رہیں گے۔

اسی زمانے پر موقوف نہیں ہر زمانے میں اور اس ملک یا اس ملک پر موقوف نہیں ہر ملک میں جس قوم سے جو شاعر (میری مراد صرف حقیقی شاعر سے ہے) اٹھا اس نے فطرت کی اس امانت میں کبھی خیانت نہیں کی۔ ممکن ہے کہ اس کی وجہ یہ ہو کہ وہ خیانت کر ہی نہیں سکتا ہو فطرت خود اپنی امانت کی محافظ ہے اور اس لئے جسے یہ امانت سپرد کی جاتی ہے اس سے شاید بہ نظر احتیاط خیانت کی استعداد ہی سلب کرلی جاتی ہے۔ بہر حال جو کچھ ہو نتیجہ ایک ہی ہے۔

میں ابھی عرض کرچکا ہوں حقیقی شاعری کوئی افادی پہلو نہیں رکھتی اس لئے شاعر کو مصائب کا شکار ہونا لازمی ہے۔ حقیقی شاعری کی قدر شناسی الشاذ کالمعدوم کا حکم رکھتی ہے۔ دنیا شاعری کے حقیقی مفہوم سے آج نہیں کبھی آشنا نہ ہوئی۔ جب کوئی حقیقی شاعر دنیا کے سامنے آیا دنیا نے اسے کبھی نہیں پہچانا۔ اس کی زندگی میں اس کے ساتھ دو طرح کا سلوک ہوا کیا۔ بعض نے اسے آدمی تو سمجھا گر ذلیل و حقیر اس لئے کہ اس کا وجود دنیاوی اعتبار سے، افادی نقطۂ نظر سے بیکار محض تھا۔

بعض جنھوں نے اس کی بلندیٔ تخیل اور پروازِ خیال کی اپنے نزدیک بہت کچھ قدر فرمائی اسے آدمی سے بالاتر سمجھا۔ اسے کوئی فرشتہ یا کوئی مجسمۂ روح تصور فرمایا ان کے نزدیک چونکہ اس کی زندگی صرف روحانی زندگی تھی اس لئے وہ یہ نہ سمجھ سکے کہ اس کو بھی اپنی زندگی انسانوں کی طرح بسر کرنے کی ضرورت ہے۔ ان کو اس کا یقین ہی نہ آیا کہ وہ کھانے پینے اوڑھنے جاگنے گرمی اور سردی سے محفوظ رہنے کے سامان سے بے نیاز نہیں ہیں۔ ان کے پاس یہ باور کرلینے کی کبھی کوئی معقول وجہ نہ تھی کہ شاعر بھی دنیاوی تکالیف سے متاثر ہوسکتا ہے۔

ان قدر شناسوں کے نزدیک اس کی زندگی ایک مقدس قسم کا تماشا تھا جسے وہ دور سے دیکھ دیکھ کر دل ہی دل میں کچھ اثر لیتے رہے۔ اس کا دم نکلتے دیکھا مگر سمجھے کہ اس پر تمام عمر نزع

کی کیفیت طاری رہنا ہی ضروری ہے اس لئے کہ شاعر کی عظمت کا انحصار یوں ہی دم توڑتے رہنے پر ہے۔ ان کے نزدیک ان جاں گداز اذیتوں کے بغیر وہ حقیقی شاعر نہیں ہو سکتا وہ یہی فرماتے رہے کہ شعر مصیبت ہی کی حالت میں وارد ہوتا ہے۔ مصیبت و درد شعر کے لئے ضروری ہیں۔ فطرت چاہتی ہے کہ شاعر مصائب کا شکار رہے اس کے مصائب کے دفعیہ کا اقدام فطرت کے منشار کے خلاف اور اس لئے گناہ ہے۔ غرض کہ ہر حالت میں خواہ اسے ایک ذلیل و حقیر انسان سمجھا گیا یا ایک فرشتہ، اسے اس کی حیات میں پہچانا نہ گیا۔ مرنے کے بعد بھی کافی مدت درکار ہوتی ہے تب جاکر کہیں حقیقی شاعر کی پہچان شروع ہوتی ہے۔

یہ سب کچھ کیوں ہوتا ہے اس کے متعلق مجھے یہ عرض کرنا ہے کہ اس عجیب طرزِ عمل میں دنیا کچھ زیادہ قابلِ الزام نہیں ہے۔ شاعر جس ماحول میں پیدا ہوتا ہے (وہ کسی ملک کسی قوم یا کسی زمانہ کا شاعر ہو) وہ اس کا ماحول نہیں ہوا کرتا۔ جس دنیا میں اس کا ظہور ہوتا ہے وہ دنیا اس کی اپنی دنیا سے بہت پیچھے کی دنیا ہوا کرتی ہے۔ وہ زمانۂ مستقبل کا انسان ہوتا ہے جو اپنے زمانہ سے بہت پہلے کسی مصلحت خداوندی کی بنا پر پیدا کر دیا جاتا ہے۔ جب اس کی وہ دنیا ہی نہیں ہوتی تو اسے پہچانے کون اور جب نہ پہچانے تو قدر کیونکر کرے۔ ہاں اس کے مر جانے کے بعد جب اس کی اپنی دنیا کا ظہور ہوتا ہے تب وہ پہچانا جاتا ہے اور جب ہی اس کی قدر کا بھی امکان ہے۔ اس کے علاوہ بقول ایک یوروپین شارح کے (جس کا نام مجھے یاد نہیں آتا) حقیقی شاعر کی شناخت کے لئے فصلِ زمانی یعنی وقت کا فصل درکار ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ہر محسوس شئے کے صحیح خد و خال معلوم کرنے کے لئے آنکھ میں بصارت کے سوا دیکھنے والے اور دیکھے جانے والے میں فطرت نے ایک مقررہ فاصلۂ مکانی ضروری قرار دے دیا ہے صحیح پرسپکٹیو اور صحیح فوکس کسی شئے کو صحیح طور پر نمایاں کرنے کے لئے ضروری ہیں۔ اسی طرح حقیقی شاعر کی پہچان بھی ایک مقررہ فصل چاہتی ہے جو مکانی نہیں زمانی ہوا کرتا ہے۔ جب ضروری فصل ہو چکتا ہے تو شاعر کی قدر خود ہونے لگتی ہے کیونکہ اب وہ ظاہر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

میں نے شاعری کے افادی پہلو سے جو انکار کیا ہے۔ اس سے میری مراد مادی افادیت سے ہے۔ اس کے یہ معنی ہرگز نہیں کہ حقیقی شعر عطیۂ فطرت ہونے کے باوجود بیکار محض ہے۔ فطرت نے کوئی چیز بیکار خلق نہیں فرمائی۔ مقاصد وجود البتہ جدا جدا ہیں ایک نہیں۔ "ہر یکے را بہر کارے ساختند" چنانچہ حقیقی شاعری کا بھی ایک مقصد ہے اس مقصد کی مکمل تعریف اور توضیح الفاظ میں نہیں کی جا سکتی ہاں اشارتاً اس قدر کہنا شاید کافی ہوگا کہ حقیقی شعر اہلِ دنیا کی آنکھوں سے خود ان کی نگاہوں کا حجاب اٹھانے کے لئے خلق کیا گیا ہے۔ جو لوگ دیکھتے ہیں مگر دیکھتے نہیں انہیں دیکھنے پر مجبور کر دینا اس کا مقدس مشن ہے۔ اہلِ دنیا کے سامنے دنیا کا وہ رخ جو روشن ہے مگر محسوس نہیں جو حقیقی ہے مگر نمایاں نہیں پیش کر دینا شعر کے فرائض میں سے ہے۔ یہ مقصد ظاہر ہے کہ ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ تک رہے گا اس میں کوئی رد و بدل ممکن نہیں۔ اس اعلیٰ مقصد پر جو فطرت کے عین منشار کے مطابق ہے انقلاباتِ عالم کبھی اثر انداز نہیں ہوئے اور نہ ہو سکتے ہیں۔ حقیقی شاعری کبھی زمانے کے ساتھ نہیں بدلتی ہاں زمانے کو کبھی کبھی بدل دیا کرتی ہے۔

شوکت علی خاں فانی

حیدرآباد کے پرانے اردو رسالے

کسی ملک کی تعلیمی ترقی اور علم و ادب کا ذوق علمی اور ادبی رسالوں کی اشاعت سے ظاہر ہوتا ہے۔ تعلیمی ترقی کے ذرایع میں ان رسالوں کی جو ضرورت اور اہمیت ہے وہ محتاجِ بیان نہیں۔ یہ رسالے دراصل ذہن اور دماغ کی تیاری کے مکتب ہیں۔ تعلیم کی ترقی کے ساتھ ان کی ضرورت بڑھتی جا رہی ہے

ہمارا ملک حضرت سلطان العلوم خلد اللہ ملکہ کے روشن زمانے میں برسوں کی ترقی مہینوں میں کر رہا ہے۔ ہماری یونیورسٹی نے اپنی چھوٹی سی عمر میں ملک کی تعلیمی ترقی کو جو چار چاند لگائے ہیں ان کی روشنی سارے دکن کو جگمگا رہی ہے یونیورسٹی قایم ہونے سے پہلے جہاں تعلیم یافتہ لوگوں کی تعداد بہت کم تھی اب وہاں اس میں دن دونی اور رات چوگنی ترقی ہو رہی ہے۔

پرانے رسالوں میں چھپے ہوئے مضمونوں کے پڑھنے سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ ہماری زبان نے کہاں تک ترقی کی ہے اور اب ہم کس حد تک صحت اور روانی کے ساتھ بولنے اور لکھنے لگے ہیں یوں تو ہمارا ملک برسوں سے علم و ادب کا گہوارہ رہا ہے، مگر ہمارے موجودہ بیدار مغز، تعلیم کا صحیح ذوق رکھنے والے فرماں روا کے مبارک زمانے میں ہم نے تیزی کے ساتھ تعلیم کے جو زینے طے کئے ہیں اور اپنے دماغوں کو علم و ادب کے نور سے جس طرح منور کیا ہے اس کی مثال دکن شاید ہی کبھی پیش کر سکے۔

ملک کی تمدنی معاشرتی اور اخلاقی ترقی کا ادب ہی حال ہے کسی ملک کے ادب کے مطالعے سے اس کی پوری تاریخ لکھی جا سکتی ہے۔ اس کے پڑھنے سے اسلاف کے کارنامے ان کے عروج و زوال کی داستانیں اور گزری ہوئی تہذیب اور تمدن کے افسانے دہرائے جا سکتے ہیں۔

آج ہم اپنے سننے والوں کی خدمت میں صرف ان ہی پرانے رسالوں کے نام ان کی زندگی کے مختصر حالات کے ساتھ پیش کرتے ہیں جو کبھی ملک کے تمدن، ادب اور اخلاق کے آئینہ دار تھے اور جن میں سے بعض اس پایہ کے تھے کہ ہمیشہ کے لئے اپنا نام چھوڑ گئے۔ ان رسالوں کے پڑھنے سے پتہ چلتا ہے کہ عام طور پر علم و ادب کا ذوق ملک کے طول و عرض میں کس حد تک بتدریج ترقی کرتا گیا اور پھر عہدِ عثمانی میں کس طرح پروان چڑھا۔

پرانے رسالوں میں سب سے پرانا رسالہ جو ہمیں ملا وہ "حسن" ہے یہ رسالہ اب سے کوئی اڑتالیس سال پہلے سنہ ۱۸۹۲ء میں حسن بن عبداللہ نواب عماد نواز جنگ کی نگرانی میں چھپتا تھا۔ اس کا اپنا پریس تھا مگر معلوم نہیں کیا سبب ہوا کہ ایک سال بعد مفید عام پریس آگرہ میں چھپنے لگا۔ اس سو صفحوں کے رسالے کا سالانہ چندہ بارہ روپے تھا اس میں اسلامی صنعت، تجارت و حرفت، ایجادات، تاریخِ دکن، فلکیات، سائنس، سوانح اور سفرناموں سے متعلق مضمون درج ہوتے تھے اس کے لکھنے والوں میں شمس العلماء مولانا ذکاء اللہ مرحوم دہلوی، نواب نیر الملک مرحوم، راجہ مرلی منوہر آنجہانی، نواب عماد نواز جنگ مرحوم وغیرہ تھے۔ اس کے پڑھنے سے پچاس سال پہلے کی زبان، ادب، تمدن، خیالات اور اخلاق کا رنگ معلوم ہوتا ہے۔

اس رسالے کے بعد "دبدبۂ آصفی" کا نمبر آتا ہے، اس رسالہ کو ملک کے مشہور ادب نواز مہاراجہ سرکشن پرشاد شادؔ آنجہانی کی سرپرستی کا شرف حاصل تھا۔ یہ رسالہ سنہ ۱۳۱۵ھ میں محبوب پریس سے چونتیس ۳۴ صفحوں پر شائع ہوتا تھا۔ اس کا چندہ چار روپے سالانہ تھا، اس میں جو مضمون لکھے جاتے تھے ان میں سے ہر نمبر کے سب سے اچھے مضمون کو ایک اشرفی انعام ملتی تھی۔ اس میں علمی، ادبی، تاریخی، اور اخلاقی نظم و نثر کے مضمون مہاراجہ شادؔ آنجہانی، علامہ

سید امداد الدین، دبیر الدولہ فصیح الملک داغ دہلوی، منشی ممتاز علی آہ وغیرہ لکھا کرتے تھے۔

اسی زمانے میں ایک اور بتیس صفحوں کا رسالہ "جلوۂ محبوب" غلام صمدانی خاں گوہر کی ادارت میں مطبع فخر نظامی سے نکلنا شروع ہوا۔ اس میں برائے نام ایک آدھ مضمون ہوتا تھا۔ زیادہ تر مشہور شاعروں کی طرحی غزلیں درج ہوتی تھیں جن میں کاظم حسین شیفتہ کنتوری، محمد علی تشنہ، میر محمد حسین فاضل، نوازش علی لمعہ، ناصر علی برہ، محمد تقی کامل قابل ذکر ہیں۔

جلوۂ محبوب کی طرح غزلوں کا ایک اور اڑتیس صفحوں کا رسالہ "ملوک الکلام" علی الدین احمد منتظم شاعرہ کی نگرانی میں مطبع رکاب سعادت سے نکلتا تھا اس کی خصوصیت یہ تھی کہ اس کو حضرت غفران مکان آصف سادس کی سرپرستی کا فخر حاصل تھا۔ بارگاہ خسروی سے ہر مہینہ اس کو طرح مصرع عطا ہوتا تھا۔ کلام خسروی کے علاوہ مہاراجہ شاد آنجہانی، راجہ مرلی منوہر رنعت، اقبال یار جنگ اقبال، نعمان اللہ ولی، خواجہ قمرالدین خاں راقم مترجم "بتان خیال" وغیرہ کی طرحی غزلیں اس میں درج ہوتی تھیں اور رسالے کے آخری صفحوں میں غیر طرحی اردو، فارسی کلام بھی ہوتا تھا۔

چند سال بعد ۱۳۱۱ھ میں مہاراجہ شاد آنجہانی کی سرپرستی میں "محبوب الکلام" علاقۂ چنیکاری کے محبوب پریس سے جاری ہوا۔ اس بتیس صفحوں کے چھوٹے سے رسالے کا چندہ چھ روپے بہت زیادہ تھا۔ اس میں شمالی ہندوستان اور دکن کے مشہور شاعروں کا کلام درج ہوتا تھا۔ اس کے مہتمم رائے ہیرالال نشاط تھے۔

اسی زمانے میں مولانا ظفر علی خاں حیدرآباد پریس سے "افسانہ" نکالنے لگے اس کا چندہ سالانہ ساڑھے تین روپے اور حجم پچاس صفحے تھا اس میں انگریزی ناولوں کے ترجمے چھپتے تھے اس کی ابتدا رینالڈز کے مشہور ناول "مسٹریز آف لندن" کے ترجمے سے ہوئی جس کا ترجمہ "فسانۂ لندن" کے نام سے خود مولانا کرتے تھے۔

اس کے دو تین سال بعد مولانا نے ایک اور رسالہ "دکن ریویو" مہاراجہ شاد آنجہانی کی سرپرستی میں اختر دکن پریس سے نکالا۔ اس کا حجم سوا سو صفحوں کا تھا اور چندہ صرف تین روپے سالانہ تھا حجم اور مضمونوں کے لحاظ سے یہ اس زمانے کا سب سے اچھا اور سستا رسالہ تھا۔ اس میں اعلیٰ درجہ کے ادبی اور تاریخی مضمونوں کے علاوہ صنعتی اور تجارتی مضمون بھی چھپتے تھے۔ اس کے لکھنے والوں میں دکن اور شمالی ہندوستان کے مشہور انشا پرداز شریک تھے۔ مثلاً خواجہ الطاف حسین حالی، خان بہادر سید اکبر حسین الہ آبادی، سید کرامت حسین بیرسٹر، ڈاکٹر اقبال، خان بہادر مرزا سلطان احمد، عزیز مرزا، قاضی کبیرالدین بیرسٹر، نواب ضیا یار جنگ ضیا، ضامن کنتوری وغیرہ۔ کچھ عرصہ بعد رسالہ "فسانہ" اس میں ضم ہو گیا۔

۱۹۱۰ء میں ظفر یاب خاں کی ادارت میں اختر دکن پریس سے "ادیب" نکلنا شروع ہوا یہ کوئی ساٹھ صفحوں کا ادبی پرچہ تھا۔ حجم کے اعتبار سے اس کا چندہ بھی دو روپے چھ آنے بہت کم تھا۔ اس میں زیادہ تر تاریخی مضمون چھپتے تھے۔ اس کے لکھنے والوں میں حکیم سید شمس اللہ قادری، رابعہ بیگم وغیرہ تھے۔

آج سے کوئی اٹھائیس سال پہلے ۱۳۳۱ھ میں ایک مختصر سا رسالہ "الہادی" غلام حسین داد کی نگرانی میں نکلتا تھا۔ اس کی کل کائنات اٹھارہ صفحے تھے۔ اور چندہ سالانہ ایک روپیہ تھا۔ بچوں کی تعلیم و تربیت کے متعلق زیادہ تر خواتین کے مختصر مضمون اس میں لکھے جاتے تھے لکھنے والوں میں جسودہ بائی ایم اے، زبیدہ خاتون، صغرا بانو، شہر بانو، اختر النسا بیگم، نفیس دلہن، صدیقہ خاتون، خیر النسا بیگم، جوہری بیگم، آبرو بیگم، زہرہ بیگم، ناظم النسا بیگم، فاطمہ وغیرہ شریک تھیں۔

غلام محمد انصاری وفا مالک تاج پریس اور شیش ساؤبی اے کی مشترکہ ادارت میں باتصویر تاج ۱۹۱۱ء میں مفید دکن پریس سے

جاری ہوا۔ اس میں مختصر افسانوں کے علاوہ تاریخی، اخلاقی، فلسفیانہ اور تمدنی مضمون بھی درج ہوتے تھے۔ یہ رسالہ چھوٹی تقطیع کے بتیس صفحوں پر نکلتا تھا۔ چندہ ایک روپیہ سالانہ تھا۔ اس میں سید ناصر نذیر فراق دہلوی، نادر دہلوی، غلام مصطفیٰ ذہین حیدرآبادی، ثاقب بدایونی، امجد حیدرآبادی، نادر علی برتر، حکیم نوازش علی غالب، رضی الدین حسن کیفی، توفیق حیدرآبادی جیسے اچھے لکھنے والوں کے مضمون اور نظمیں چھپتی تھیں۔ اس میں رگھوناتھ راؤ درد کے مختصر اخلاقی افسانے بہت دلچسپ ہوتے تھے اس مختصر سے رسالہ کو اتنے اچھے لکھنے والے ملے کہ جس کی وجہ سے یہ رسالہ ملک میں کافی مقبول ہوگیا تھا۔

الہ آباد کے "مشہور ادیب" اور لکھنؤ کے "العصر" کی شان کا ایک بالتصویر رسالہ کسی زمانے میں دکن سے بھی نکلتا تھا۔ یہ "ذخیرہ" تھا جس کو سید نظر الحسن ہوش بلگرامی بڑے سلیقے سے مرتب کرتے تھے۔ سنہ ۱۹۱۵ء میں اس نے دکن میں جنم لیا تھا مگر بہت چھوٹی عمر پائی تھی۔ اس کا کاغذ لکھائی چھپائی تصویریں مضمون نظمیں اور افسانے سب کے سب دلکش تھے چندہ چار روپے سالانہ تھا۔ ہندوستان اور دکن کے مشہور ادیب اور انشا پرداز اپنے جواہر پاروں سے اس کے پچاس صفحوں کو مالا مال کرتے تھے علمی ادبی اخلاقی مضمونوں کے علاوہ ٹھوس اداریے، سائنس، فلکیات، اور منطق کے متعلق تحقیقی مقالے، ادبی سوانح، مشاہیر کے حالات، عمدہ عمدہ اخلاقی نظمیں اور غزلیں اس میں درج ہوتی تھیں۔ اس کے لکھنے والوں کی طویل فہرست میں سے چند کے نام ہیں۔ سید علی حیدر طباطبائی، عزیز لکھنوی، حضرت جلیل، نواب عمدۃ الملک، مہاراجہ شادؔ نجہانی، خان بہادر مرزا سلطان احمد، منشی پیارے لال شاکر میرٹھی ایڈیٹر رسالہ العصر، منشی پریم چند، اعجاز لکھنوی، شیفتہ کنتوری، سلطان حیدر جوش، عشرت لکھنوی، رسا ہمدانی، علیقی دہلوی، فدا علی خنجر لکھنوی وغیرہ۔

انجمن ثمرۃ الادب کے معتمد نصیر الدین ہاشمی کے اہتمام سے محمد عبدالواسع صفا کی ادارت میں بتیس صفحوں کا "ثمرۃ الادب" سنہ ۱۳۳۶ھ میں نکلنا شروع ہوا۔ اس کا چندہ تین روپے سالانہ تھا۔ اس میں علمی، معاشرتی، تاریخی اور مذہبی مضمون چھپتے تھے۔ اس کو چند اچھے لکھنے والے مثلاً حضرت جلیل، مولوی عبدالحق، امجد حیدرآبادی، خان بہادر مرزا سلطان احمد وغیرہ ملے تھے۔

محمد افضل شریف کی ادارت میں بوئن پلی سکندرآباد سے ایک چھوٹا سا رسالہ "ترقی تعلیم" سنہ ۱۳۴۲ھ میں نکلتا تھا۔ اس کا حجم بتیس صفحے اور چندہ دو روپے چھ آنے تھا۔ اس میں امجد حیدرآبادی، ذہین حیدرآبادی، طاہر علی خاں متکلم، اسد اللہ شریف، سید عبدالرحیم وغیرہ کی عمدہ رباعیاں نظمیں، تعلیمی، صنعتی اور تجارتی مختصر مضمون چھپتے تھے۔

غالباً اس رسالہ کے بند ہونے کے بعد اس کے ایڈیٹر محمد افضل عنبر نے انوار پریس سکندرآباد سے "ارتقاء" جاری کیا یہ پرچہ "ترقی تعلیم" سے بہتر تھا۔ اس کو چند اچھے لکھنے والے ملے تھے دکن کے مشہور ادیب ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور، پروفیسر عبدالقادر سروری، تمکین کاظمی، عبدالقادر صدیقی، وغیرہ کے مضمون اس میں درج ہوتے تھے۔ حجم ساٹھ صفحے اور چندہ چار روپے سالانہ تھا۔

انجمن خواتین دکن کی سرپرستی میں بیگم ہمایوں مرزا کی ادارت میں تاج پریس سے سنہ ۱۳۳۲ھ میں چھوٹی تقطیع کے بتیس صفحوں کا ایک رسالہ "النساء" نکلتا تھا۔ اس کا چندہ تین روپے سالانہ تھا اس میں خانہ داری اور پکوان کے طریقے حفظان صحت کے اصول مختصر کہانیاں اور اخلاقی نظمیں چھپتی تھیں۔ لکھنے والوں میں زیادہ تر خواتین کے نام نظر آتے ہیں مثلاً سادہ بیگم، بلقیس بیگم، لطیف النساء بیگم، شاہزادی بیگم، جہاں بانو بیگم وغیرہ۔ دکن میں

اپنی زندگی کے دن پورے کرنے کے بعد اب لاہور میں "زیب النساء" کے روپ میں دوبارہ جنم لیا ہے۔ "النساء" کی صورت میں اس کی لکھائی چھپائی اور مضمونوں کا معیار بہت کم درجہ کا تھا اپنے اس دوسرے جنم میں اس نے کافی ترقی کی ہے۔

اس زمانے میں بیگم پروفیسر ولی الدین احمد کی ادارت میں ایک مختصر رسالہ "خادمہ" عورتوں کی فلاح و بہبود، امور خانہ داری اور بچوں کی تعلیم و تربیت سے متعلق چھوٹے چھوٹے مضمون لیے سولہ صفحوں پر سلے ہوئے دکن کے مشہور چھاپے خانے اعظم اسٹیم پریس سے نکلتا تھا۔

ان دونوں پرچوں سے بہت اچھا ایک تیسرا نسوانی رسالہ "ہمجولی" عمدہ کاغذ اور صاف ستھری لکھائی چھپائی کے ساتھ ساٹھ صفحوں پر بیگم خورشید کی ادارت میں عہد آفریں پریس سے نکلتا تھا۔ اس کا چندہ چار روپے سالانہ تھا۔ مضمونوں کا معیار بہت اچھا تھا۔ مضمون نگاروں کے ناموں سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ وہ کس پایہ کے ادیب اور انشا پرداز تھے۔ مثال کے طور پر چند نام پیش کیے جاتے ہیں۔ حضرت جلیل، جوش ملیح آبادی، خواجہ عبدالرؤف عشرت لکھنوی، ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور، مرزا فرحت اللہ بیگ دہلوی، علی اختر، حکیم آزاد انصاری، مرزا فدا علی خنجر لکھنوی، مرزا سلیم بیگ دہلوی، پروفیسر عبدالحمید خاں، بیگم صاحبزادہ آباد احمد خاں، جہاں بانو بیگم وغیرہ۔

اس کے ایک سال بعد ۱۳۵۲ھ میں ایک اڑتالیس صفحوں کا نسوانی پرچہ "سفینۂ نسواں" صادقہ قریشی کی ادارت میں مسعود دکن پریس میں چھپنا شروع ہوا۔ اس کو بھی چند اچھے لکھنے والے ملے تھے۔ حضرت شاد صوفی، نواب رفعت زمانی بیگم، ملکہ راسپود جہاں بانو بیگم، ساغر نظامی، حمیدہ بانو، اکبر النساء بیگم سلطانہ، سرور جہاں بیگم رعنا، رابعہ خاتون تنہا وغیرہ اپنے رشحات قلم سے اس کے صفحوں کو مزین کرتے تھے۔

ملک کے مشہور انشا پرداز محمد عبدالقادر سروری پروفیسر عثمانیہ یونیورسٹی کی ادارت میں ایک اچھا علمی، ادبی پرچہ "مکتبہ" مکتبۂ ابراہیمیہ پریس سے ۱۹۲۶ء میں نکلنا شروع ہوا۔ کئی سال تک خوش اسلوبی کے ساتھ نکلتا رہا۔ اس میں مختصر اچھے اچھے افسانے نظمیں مختصر سوانح علمی اور ادبی مقالے درج ہوتے تھے۔ احمد حسین امجد حیدرآبادی، مہندر راج سکسینہ، جمیل احمد خاں کوکب، حکیم آزاد انصاری، سید علی اختر، سید علی شبیر، محسن خاں متین، وغیرہ اس کے لکھنے والوں میں تھے۔ حجم چونسٹھ صفحے اور چندہ چار روپے سالانہ تھا۔

اسی زمانے میں ابوالفتح سید محمد باقر حسینی طارق نے ایک بتیس صفحوں کا رسالہ "السیر" مطبع منظری سے نکالا اس کا چندہ ڈھائی روپے سالانہ تھا۔ اس میں دکن کے مشہور حبر ولعزیز واغ، سید بادشاہ حسینی، مولانا حسرت موہانی، حضرت جلیل، عبدالقدیر صدیقی، سید اشرف علی اشرف وغیرہ کے علمی، ادبی اور تاریخی مضمون اور نظمیں چھپتی تھیں۔

بچوں کے لئے کسی زمانے میں ساٹھ صفحوں کا ایک رسالہ "نونہال" عماد پریس سے چھپ کر نکلتا تھا اس کے ایڈیٹر مرغوب الدین بی اے تھے۔ چندہ ڈھائی روپے سالانہ تھا۔ اس میں تاریخی اور اخلاقی مضمون، بچوں کے ڈرامے اور حفظان صحت کے اصول لکھے جاتے تھے لکھنے والوں میں جوش ملیح آبادی اور امجد حیدرآبادی قابل ذکر ہیں۔

مرزا سیف علی خاں

جدید عربی (مصر میں)

آج میں آپ حضرات سے مصر میں جدید عربی کے متعلق مختصراً کچھ عرض کروں گا لیکن نفسِ مضمون کے آغاز سے قبل ضروری سمجھتا ہوں کہ عربی زبان کے متعلق چند ضروری اور کھلی حقیقتوں کو آپ کے سامنے پیش کردوں۔ عربی زبان اس عہد سے جس سے کہ اس کا تاریخ میں پتہ چلتا ہے آج تک اپنی اصلی اور اسی بلند پایہ علمی شان میں جلوہ گر ہے۔ اس زبان کی تاریخ ابتدا سے اس وقت تک متصل اور غیر منقطع ہے۔ اس میں نہ تو زوال کی کوئی علامت پیدا ہوئی اور نہ انحطاط رونما ہوا۔ نظم و نثر "معانی و بیان" بلاغت و اعجاز علم و فن کے ان گنت علمی ادبی کارنامے تاریخ ادب عربی کا مایۂ افتخار سرمایہ ہیں۔ لیکن اس زبان کا بے نظیر اور اعلیٰ ترین شاہکار وہ الٰہی قرآن مجید ہے" جو قطع نظر اس علمی تعلیم کے جو اس نے مسلمانوں اور بالعموم ساری دنیا کے سامنے پیش کی اپنی فصاحت و بلاغت اپنے اسلوب بیان اور اعجاز بیان اپنی ترکیب کی بندش اور الفاظ کے شکوہ" غرض اپنے علمی و ادبی معیار کے اعتبار سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ناقابل تقلید اور رہرو فت اور ہر زمانے میں علماء و ادباء کے لئے شمع ہدایت اور باعثِ اتباع رہا ہے۔ یہی عربی زبان کی پہلی کتاب ہے جو سب سے پہلے مدون کی گئی اور یہیں سے گویا عربی زبان کی کتابوں کی تاریخ کا آغاز ہوتا ہے۔ اسی کی بدولت عہد جاہلیت کا روایتی ادب محفوظ اور کتاب کی شکل میں نمودار ہوا۔ اسی کی بدولت زبان کو وہ تقویت حاصل ہوئی کہ بعد میں چل کر باوجود اجنبی تمدنوں اور اجنبی زبانوں کے امتزاج و اثرات کے عربی زبان مذہب اور حکمت علم و فن عوام و خاص کی مستند علمی و سرکاری زبان قرار پائی۔

عربی زبان اپنی خاص خصوصیات کی بدولت دنیا کی ساری زبانوں میں ممتاز حیثیت رکھتی ہے۔ اس کا لفظی ذخیرہ اپنے اندر انتہائی وسعت لئے ہوئے ہے۔ اسماء و افعال میں تعریف و اشتقاق کی خوبی اضداد و مرادفات کی کثرت حسنِ ترکیب اور حسنِ اسلوب" اور طرزِ بیان کی پختگی و روانی وغیرہ غرض ان خصائص کی بدولت دقیق سے دقیق تخیل اور ادق سے ادق مضمون عمدگی کے ساتھ مختلف طریقوں پر بسہولت ادا کیا جاسکتا ہے۔

زبان اور تمدن" ضروریات اور ماحول کے تابع نہیں۔ کسی زبان کا وجود و عدم اہل زبان کے وجود و عدم کا مرادف ہے۔ زبان خود بخود معرض وجود میں نہیں آتی اور اس کا لفظی ذخیرہ خود بخود نہیں بڑھتا جب تک کہ اس کی ترقی اور اضافہ کے اسباب موجود نہ ہوں۔ تمدن کی وسعت، فکر اور خیال کا ارتقاء، حاجتوں اور ضرورتوں کا ازدیاد، زبان کی ترقی اور الفاظ کی تکوین کا باعث ہوتا ہے۔ ہر قوم اور ہر عہد کا پیدا کردہ ادب اس قوم اور اس عہد کے تمدن اور عقلی زندگی کا آئینہ ہوتا ہے۔ علوم و فنون کی ترقی" ماحول اور تمدن کے اثرات سے زبان متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی اور یہی اثرات اس عہد کے ادب کی نمایاں خصوصیات شمار کی جاتی ہیں موجودہ زمانے میں ماحول اور تمدنِ جدید کے اثرات کے تحت کسی عالم" کسی ادیب یا شاعر کے لئے ناممکن ہے کہ وہ اپنے آپ کو اس ماحول میں محسوس کرے جو عہد جاہلیت کے لئے مخصوص تھا۔ زمانہ مائل بہ ارتقاء ہے اور علوم و فنون اور زندگی کے ہر شعبے میں اس کا لازمی نتیجہ جدت اور تغیر ہے لہٰذا جدید عربی سے یہ خیال نہ پیدا ہونا چاہیے کہ شاید عربی زبان کی اصلیت میں فرق آگیا ہے نہیں اور قطعاً نہیں۔ بلکہ اس سے وہ لفظی ذخیرہ، وہ ادائے بیان، وہ اسلوب اور وہ تبدیلیاں مراد ہیں جو موجودہ زمانے میں علوم جدیدہ اور تمدن جدید کے تحت زبان میں دخیل ہوئیں اور سرایت کر گئیں۔

مصر میں اس جدید ارتقائی دور کا آغاز انیسویں صدی میں محمد علی الکبیر کے عہد سے ہوتا ہے۔ دولتِ عربیہ کو مختلف دوروں اور مختلف حکومتوں سے سابقہ رہا۔ زوالِ بغداد کے بعد تاتاریوں کے ہاتھ میں عنانِ حکومت تھی۔ بالآخر ترک اس حکومت کے مالک ہوئے۔ اس دورِ حکومت میں واقعہ ہے کہ ادب و علم پر ایک جمود کا عالم طاری تھا۔ مصر دنیا کی ترقیوں سے بے خبر، علمی، فنی اور صنعتی اعتبار سے گمنامی اور کس مپرسی کے عالم میں تھا۔ محمد علی مصر کے تخت پر جلوہ افروز ہوتا ہے اور اس کی بصیرت افروز نگاہیں اولاً اس خامی کو محسوس کرتی ہیں۔ جدید اصلاحات اور ایک جدید نظام کا نفاذ عمل میں آتا ہے۔ زندگی اور علوم و فنون کے ہر شعبے میں بیداری رونما ہوتی ہے اور ترقی کی روح سرایت کرنے لگتی ہے۔ یا تو مشرق سے علم کی چنگاری مغرب میں پہنچی تھی یا اب مغرب سے ترقی یافتہ مشرق میں رواج پانے لگے ہیں۔ مغرب ہر اعتبار سے اور ہر شعبے میں شاہراہ ترقی پر گامزن تھا۔ دنیا کے سامنے ایک جدید تمدن اور اس تمدن کے تحت علوم اور جدید اختراعات کا ایک بیش بہا ذخیرہ پیش کر رہا تھا۔ مشرق کے لئے ضروری تھا کہ اپنی بقا اور اقوامِ عالم کا ساتھ دینے کے لئے مغرب سے فیض حاصل کرے۔ مصر ہی سے اس بیداری اور اس ارتقاء کے سلسلے کا آغاز ہوتا ہے۔ مشرق اور مغرب کے اس میل ملاپ اور امتزاج کا عہد محمد علی ہی سے شروع ہوتا ہے اور محمد علی ہی کی ذات مصر کی علمی، قومی اور سیاسی ترقی کا باعث بنتی ہے۔ قابل اشخاص اور طلبہ تحصیل علم کے لئے یورپی ممالک بھیجے جاتے ہیں اور اس سلسلے کو دوامی طور پر قائم رکھا جاتا ہے تاکہ وہ علوم جدید میں کمال حاصل کریں، وہ ان علوم کو عربی زبان میں منتقل کریں اور اس طرح مصر اور عربی زبان کو علمی ذخائر سے مالا مال کر دیں۔ تعلیمی نظام اور طرز تعلیم میں تبدیلی ہوتی ہے۔ یورپی طرز پر مدارس کا قیام عمل میں آتا ہے۔ ابتدائی تعلیم کی اصلاح کی طرف خاص طور پر توجہ کی جاتی ہے کیونکہ یہیں سے قوم کی اخلاقی اور علمی تعمیر کی بنیاد پڑتی ہے۔ فنی اور صنعتی مدارس کا افتتاح ہوتا ہے اور تمام علوم، سیاسی، مدنی، بحری، طبیعات، کیمیا، ریاضیات، طب، اقتصادیات، اجتماعیات، عمرانیات، زراعت، ادبیات، تاریخ، جغرافیہ، طبقات الارض وغیرہ وغیرہ —— کی تعلیم کا باقاعدہ انتظام عمل میں آتا ہے۔ مصر سے وفود وقتاً فوقتاً یورپی ممالک کو روانہ کئے جاتے ہیں تاکہ وہ علمی مجالس میں شرکت کریں اور مصر اور یورپ کے درمیان ایک علمی رابطہ قائم ہو۔ اس طرح اس عہد سے مغربی تمدن اور مغربی علوم کا اثر مصر اور عربی زبان میں سرایت کرنے لگتا ہے۔ طباعت اور صحافت کی ابتداء ہوتی ہے۔ پہلا حکومتی جریدہ "الوقائع المصریہ" کے نام سے شائع ہونے لگتا ہے۔ مطبع بولاق کا قیام عمل میں آتا ہے اور یہاں سے عربی زبان کے قدیم ادب اور ذخائر علمیہ جو قلمی نسخوں کی شکل میں مخصوص ہاتھوں اور مخصوص کتب خانوں وغیرہ میں محفوظ تھے طبع ہو کر منظرِ عام پر آتے ہیں اور عامۃ الناس کو ان کے پڑھنے اور ان میں غور و فکر کرنے کا موقع ملتا ہے۔ ترجمہ و تالیف کا آغاز ہوتا ہے اور علوم و فنون کا ایک کثیر ذخیرہ اس طرح عربی زبان اور عربی ادب کا نمایاں جزو بنتا ہے۔

محمد علی نے نظامِ حکومت اور علوم و فنون کی اصلاح و تنظیم کی جو بنیادیں رکھی تھیں وہ اسمٰعیل پاشاہ کے عہد میں مستحکم اور پایۂ تکمیل کو پہنچی ہیں۔ اس وقت مصر علوم و فنون کا آماجگاہ بنتا ہے اور ہر شعبہ اپنی پوری قوت کے ساتھ اور آگے بڑھتا نظر آتا ہے۔ محمد علی کے عہد تک جامعہ ازہر جو دنیا کی قدیم ترین جامعہ ہے، علوم عربیہ و اسلامیہ کی واحد محافظ اور علمبردار تھی۔ وہاں کا نظامِ تعلیم اپنے قدیم طرز پر جاری تھا۔ مغربی علوم کی یہاں نہ تو رسائی تھی اور نہ مغربی زبانوں کی

واقفیت حاصل کرنے کے اسباب ۔ عموماً تراجم سے کام لیا جاتا تھا جو اکثر غلطی اور غلط فہمی کا باعث ہوا کرتے تھے ۔ جدید علوم اور جدید تمدن کا اس سے تصادم ہوتا ہے اور بالآخر اس میں جدید اصلاحات اور علوم جدیدہ کا نفاذ عمل میں آتا ہے ۔

اس موقع پر مستشرقین کی بے لوث خدمات کا ذکر بیجا نہ ہوگا ۔ انھوں نے خاص طور پر عربی علوم اور ادب عربیہ سے دلچسپی لی ۔ عربی زبان کے ان انمول ذخائر کو جو زمانہ نے ان کے قبضے میں پہنچا دیے تھے ، تحقیق اور تنقید کے ساتھ طبع اور دنیا کو ان سے روشناس کرایا ونیز اس طرح تالیف و طباعت کے یورپی طرز سے مشرق کو آگاہی بخشی ۔ ان کی شایع کردہ کتابیں عربی زبان کی بہترین یادگاریں ہیں اور عربی زبان ان کے خدمات اور احسانات کی معترف ہے ۔ مصر میں طباعت کے آغاز کے بعد عام طور پر طباعت میں تجارتی پہلو کو پیش نظر رکھا گیا برخلاف اس کے مغربی طباعت بالعموم علمی پہلو پر مبنی تھی چنانچہ مصر کی شایع کردہ کتابیں ان علمی خوبیوں ، ان تحقیقوں اور ان سہولتوں سے جو مستشرقین کی شایع کردہ کتابوں میں پائی جاتی ہیں معرا ہوتی تھیں ۔ ان مستشرقین کے سکھلائے ہوئے اصول تحقیق و تالیف کی بدولت آج مصر کی شایع کردہ کتابیں بلحاظ حسن طباعت نہایت بڑھیا اور ان تمام خوبیوں اور محاسن کی حامل ہوتی ہیں جو مستشرقین اور یورپ کی شایع کردہ کتابوں میں موجود ہیں ۔

طباعت اور صحافت کا آغاز اور ان کی ترقی " عربی زبان کے ارتقاء میں بیحد مدد و معاون ثابت ہوئی ۔ عرب دنیا اپنے بہترین علمی ذخائر سے واقف ہوئی اور ان پر غور و فکر کرنے لگی ۔ قوت فکر کے نتائج مباحث اور تالیفات کی شکل میں رونما ہوئے اور ان مباحث و تالیفات نے اس طرح عربی ادب کو مالا مال کر دیا ۔ یہی حال صحافت کا تھا ۔ رفتہ رفتہ رسائل اور اخبارات کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا ۔ آج بے شمار اخبار و رسائل عربی زبان میں مصر سے شایع ہوتے ہیں جو فنی " علمی اور ادبی کے سوا قومی ' سیاسی ' اجتماعی اقتصادی و تجارتی غرض ہر قسم کی ضروریات کی نمایندگی اور تکمیل کا باعث ہیں ۔

ترجمہ و تالیف کے آغاز کے ساتھ رفتہ رفتہ کئی علمی اور ادبی انجمنوں اور فنی اداروں کا وجود عمل میں آیا ۔ فنی اصطلاحات کا ایک کثیر ذخیرہ عربی زبان میں منتقل ہوا ۔ یورپی طرز پر دوائر المعارف کی تیاری عمل میں آئی جو اس سے قبل عربی زبان میں مفقود تھے ۔ یورپی ادب اور یورپ کی علمی و ادبی کاوشوں کی واقفیت نے عربوں کے خیال اور قوت فکر کو متاثر کیا ۔ ادب قدیم کی باضابطہ تحقیق اور تنقید کی جانے لگی ۔ جدید مضامین اور جدید عنوانات معرض بحث میں آنے لگے " طبع آزمائی کے لئے ایک وسیع میدان ہاتھ آیا ۔ نتیجہ یہ ہوا کہ قدیم اسلوب اور ادائے بیان میں تبدیلی واقع ہوئی ۔ زبان سجع اور قافیہ پیمائی کی پابندیوں سے آزاد ہوئی ۔ ایک نئے انداز پر زبان میں سلاست و روانی کا زور ہوا جو قدیم و جدید اسالیب کے تصادم کا لازمی نتیجہ تھا ۔ علمی رائے کو پختگی حاصل ہوئی ۔ استدلال اور فکر میں منطقی طرز رونما ہوا ۔ موضوعات کی باقاعدہ ترتیب اور تقسیم عمل میں آئی ۔ اس طرح عربی زبان میں ایک خاص لٹریچر کا اضافہ ہوا جو اس سے قبل موجود نہ تھا ۔

جدید تمدن اور علوم جدیدہ کے اثرات اور مشرق و مغرب کے اس امتزاج کے مدنظر یہ ضروری تھا کہ کوئی ایسا ادارہ قایم کیا جائے جو اس کی کماحقہ خدمت اور نمایندگی کر سکے بیسویں صدی کے اوائل میں دو اہم ادارے وجود میں آئے ۔ ایک تو جامعہ مصریہ ہے اور دوسرا مجمع اللغتہ العربیہ الملکی ۔ یہ اقدام ادب عربیہ اور عربی زبان کے لئے ایک مبارک اور زبردست اقدام تھا ۔ اعلیٰ تعلیم کے لئے جامعہ مصریہ میں یورپی طرز اختیار

کیا گیا اور سارے علوم و فنون کا درس عربی زبان میں دیا جانے لگا۔

آج یہ جامعہ اپنی اعلیٰ تعلیم اور اس کے مفید نتائج کے مدنظر مشہور یورپی جامعات کی مدمقابل ہے اور ملک و قوم اور عربی زبان کی خدمت بہترین طریق پر انجام دے رہا ہے۔ مجمع اللغۃ العربیۃ الملکی کی تکوین علمی اور فنی اصطلاحات کے ایک کثیر ذخیرہ کا باعث ہوئی۔ یوں تو پہلے ہی سے بعض ادارے اس کام میں مصروف تھے لیکن بے شمار دقتیں ان کی راہ میں حائل تھیں۔ اس سرکاری ادارے کے قیام کی بدولت یہ دقتیں جاتی رہیں۔ اس ادارے نے اصطلاحات کی اصلاح کی طرف خاص توجہ کی اور جدید اصطلاحات کو ایسا عربی جامہ پہنایا اور پہنا رہا ہے کہ وہ آج عربی زبان میں عام طور پر رائج ہیں۔ معلمین و مصنفین، خاص و عام بلا تکلف ان کا استعمال کر رہے ہیں۔

جنگ عظیم کا آغاز ہوتا ہے اور دنیا مصائب و آلام میں مبتلا ہو جاتی ہے۔ لیکن باوجود اس مصیبت کے ادب عربیہ کی ارتقائی رفتار میں وقفہ بہت پہلے نہیں ہوتا۔ جنگ عظیم کے بعد دنیا اپنے آپ کو ایک نئے اثر اور ایک نظام جدید کے تحت پاتی ہے۔ بیداری وارتقا کے آثار بہت پہلے ہی سارے مصر میں رونما ہو چکے ہیں لیکن جنگ عظیم کے بعد ان کی رفتار تیز ہو جاتی ہے۔ قومی اور سیاسی جد و جہد کے ساتھ ساتھ حریتِ شخصی اور حریتِ خیال کا دور دورہ ہو جاتا ہے۔ انفرادی اور اجتماعی طور پر شخصیتوں اور حیاتِ عامہ کی تحلیل کی جاتی ہے۔ خالص عربی ادب اور عربی علوم میں کمال حاصل کیا جاتا ہے۔ ان کا بہ نظرِ غائر مطالعہ کیا جاتا ہے اور پھر اجنبی علوم اور اجنبی ادب سے ان کا تقابل ہوتا ہے۔ اس طرح مفید اور بارآور نتائج اخذ کئے جاتے ہیں۔ تحقیق و تنقید کی صحیح راہیں کھل جاتی ہیں۔ اس دور میں جس ادب کا عربی زبان میں اضافہ ہوتا ہے اور جو لٹریچر تیار ہوتا ہے وہ اپنے اندر ایک عجیب شانِ حریت لئے ہوئے ہے اور اپنے خاص خصوصیات کی بدولت تاریخ ادب میں ایک ممتاز حیثیت رکھتا ہے یہ ناممکن ہے کہ اس تھوڑے سے وقفہ میں انفرادی طور پر مصر کے علماء و ادباء کے تفصیلی خدمات اور ان کے فنی، علمی و ادبی تصانیف پر کامل روشنی ڈالی جا سکے۔ ان میں سے چند ممتاز ہستیوں کے نام آپ کے سامنے پیش کئے جاتے ہیں۔

حمدی بکری، مصطفیٰ مختار، شیخ رفاعہ الطہطاوی، شیخ حسین المرصفی، شیخ حمزہ فتح اللہ، محمود سامی البارودی، جمال الدین افغانی، شیخ محمد عبدہ، سعد زغلول، شیخ ابراہیم الیازجی، الجبرتی، بطرس البستانی، ابراہیم المویلحی، علی پاشا مبارک، محمد مختار پاشا، احمد حسن الرشیدی، عیسیٰ حمدی پاشا، مصطفیٰ پاشا کامل، طلعت حرب پاشا، احمد لطفی السید بک، عبدالخالق ثروت پاشا، یعقوب صروف، جرجی زیدان، المنفلوطی، حافظ، شوقی، مطران، ہیکل، طٰہٰ حسین، عقاد، احمد امین وغیرہ وغیرہ ان شخصیتوں کی قومی، سیاسی، علمی، فنی اور ادبی خدمات کی آج دنیا معترف ہے۔ ان کی بے شمار خدمتوں نے مصر کی دنیا پلٹ دی اور ان کے کارنامے عربی زبان اور ادب کی تاریخ کا ایک زریں ورق ہیں۔ ان کے دماغی و فکری کاوشوں نے عربی زبان اور عربی ادب کو ہر لحاظ اور ہر اعتبار سے مالامال کر دیا اور کر رہا ہے۔ اس ارتقائی دور میں ان ضروریات کی تکمیل ہو گئی جن کی عربی زبان کو ضرورت تھی۔ قدیم تمدن اور ادب قدیم کے محاسن کو روشناس کرایا گیا۔ اس کے موقتی ناواقف عناصر کی اصلاح کی گئی اور جدید تمدن اور ادب جدید سے کما حقہ اقتباس کیا گیا۔ آج عربی زبان بجا طور پر اس کا دعویٰ کر سکتی ہے کہ وہ علم و ادب کی بہترین زبان ہے۔ اس کے لفظی ذخیرہ کی وسعت اس کی تراکیب اور اسلوبِ بیان کی سہولت و نزاکت ہر اجنبی خیال اور ہر اجنبی اصطلاح کو صحیح عربی جامہ پہنانے کی ہر طرح قابل اور اس پر قادر ہے۔

مصر میں عربی زبان کے جدید ارتقائی دور کا یہ مختصر بیان ہے اور عربی زبان کی اس ترقی اور تکمیل کے سلسلہ میں مصر اور اہلِ مصر لائقِ صد تحسین و صد مبارک باد ہیں۔

راحت اللہ خاں

فارسی زبان اور ہندوستان

فارسی یا ایرانی زبان دنیا کی شیریں ترین زبانوں میں شمار کی جاتی ہے اس لئے اس زبان سے واقفیت دلچسپی اور ذوق سے خالی نہیں اردو زبان میں مہارتِ تامہ حاصل کرنے کے لئے بھی تھوڑی فارسی جاننے کی ضرورت ہے۔ مسلمانوں کو اس زبان کا سیکھنا اس لئے بھی ضروری ہے کہ اس میں بزرگانِ دین و علماء محققین نے مختلف علوم و فنون مثلاً تصوف فلسفہ اخلاق حکمت اور تاریخ وغیرہ میں بہت سی مفید اور اہم کتابیں تصنیف و تالیف کی ہیں جب کسی زبان کا ذکر کیا جائے تو اس کے ادب کا ذکر بھی ضمناً آجاتا ہے ورنہ اس کا ایک علٰحدہ عنوان قائم کیا جانا چاہیے۔

تصوف فارسی شاعری کی جان ہے صوفیانہ مضامین اس قدر کثرت کے ساتھ غالباً کسی دوسری زبان میں نہیں مل سکتے۔ مثنویٔ مولانا روم، مخزنِ اسرار نظامی، منطق الطیر عطار، گلشن راز شبستری، کشف المحجوب ہجویری، رباعیاتِ ابوسعید ابوالخیر، قطعات ابن یمین اور دیوانِ حافظ مثال کے طور پر پیش کئے جا سکتے ہیں رزمیہ مثنوی شاہ نامہ الیڈ اور مہابھارت کا ہم پلہ تصور کی جاتی ہے، حافظ و سعدی جیسے شاعر دنیا کی مہذب و ترقی یافتہ زبانوں کے بڑے بڑے شاعروں کے ہم رتبہ ہیں تاریخ جہاں کشائے جوینی، جامع التواریخ، تاریخ گزیدہ، حبیب السیر بڑی بڑی زبانوں کی مستند تاریخوں کے مماثل ہیں۔

ایرانی زبان صرف ایران تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ ممالکِ یورپ و امریکہ میں بھی اس کے جاننے والوں اور قدردانوں کی کافی تعداد موجود ہے اور وہاں ایسے مستشرقین گزرے اور ہیں جنہوں نے فارسی زبان و ادبیات پر اپنی دولت اور عمریں صرف کر دی ہیں فرانسیسی مستشرقین سیفر بلوشہ وغیرہ مشہور ہیں روسی مستشرقین وکنڈ روزن والنٹن ژوکوفسکی اور بارٹاہ کے کارناموں سے ادبی دنیا واقف ہے۔ جرمن مستشرقین وستنفیلڈ تولڈکیے براکلمن مارکوات مشہور آفاق ہیں اور انگلستانی مستشرقین مسٹر رونسن ارسں، نکلسن ایلس اسٹوری ایتھے اور ریو کے کارناموں سے بہت کم لوگ ناواقف ہوں گے۔ پروفیسر براؤن کو تو ادبیات ایران سے اس قدر شغف تھا کہ اس نے اپنی دولت اور زندگی اس کے لئے وقف کر دی تھی اور اتنی تصنیفیں و تالیفیں یادگار چھوڑی ہیں کہ کسی ایرانی علامہ نے بھی کم لکھی ہوں گی۔ یہ ہیں فارسی زبان و ادبیات کی اہمیت و جاذبیت کے اثرات۔

جب مسلمان بادشاہ افغانستان و ایران سے ہندوستان آئے تو ان کی مادری زبان فارسی تھی پہلی مرتبہ سلطان محمود غزنوی کے زمانہ میں سنہ ۱۰۰۰ عیسوی کے ربع اول میں فارسی زبان سے شمالی ہندوستان کے باشندوں کے کان آشنا ہوئے مغلیہ سلطنت کے بانی ظہیر الدین بابر کے عہد یعنی سولھویں صدی عیسوی کے ربع اول میں مستقل طور پر ہندوستان میں اس کا رواج عام ہونے لگا اور اس زبان شیریں نے ہندوستانیوں کے دلوں کو موہ لیا اور ہندوستان اس کا دوسرا گھر بن گیا مسلمان و ہندو دونوں نے اس کو اپنا لیا۔ بابر کے جانشین ہمایوں کا زمانہ اس کا عہد طفلی تھا لیکن اکبر و جہانگیر کے عہدِ حکومت میں وہ معراجِ کمال پر پہنچ گئی چونکہ ہر زمانے میں حکومت کی زبان میں کمال حاصل کرنا اور اس کو اظہارِ خیال کا ذریعہ بنانا فیشن بلکہ قابلِ فخر تصور کیا جاتا ہے اس لئے تعلیم یافتہ طبقے نے اس نئی زبان کو سیکھا اور بعض نے اس میں کمال حاصل کیا

دفاتر سرکاری میں، معاشرتی جلسوں میں، خط و کتابت میں، تصنیف و تالیف میں، غرض کہ ہر جگہ فارسی بولی اور سمجھی جانے لگی۔ اکبر و جہانگیر کے عہد حکومت میں صدہا شاعر ادیب و مورخ پیدا ہوئے اور سیکڑوں کتابیں مختلف علوم و فنون میں تصنیف و تالیف ہوئیں۔

شاہجہاں کے عہد میں جب اردو زبان کی داغ بیل ڈالی گئی اور بعد کے مغلیہ دور میں اس کی ترقی ہوئی تو اس نئی زبان کے متعلق بھی جو کچھ لکھا جاتا وہ اکثر فارسی زبان ہی میں ہوتا تھا چنانچہ اردو کے شاعروں کے تذکرے فارسی میں لکھے گئے مثلاً تذکرۂ گلشن بے خار مصنفہ مصطفیٰ خاں شیفتہ، چمنستانِ شعرا لچھمی نراین شفیق، تذکرۂ ہمیشہ بہار کشن چند اخلاص اور تاریخی کتابیں اسی زبان میں لکھی گئیں مثلاً بادشاہ نامہ عبدالحمید لاہوری، اقبال نامۂ جہانگیری معتمد خاں، تاریخ فیروز شاہی ضیاء الدین برنی، تاریخ ظفر دکن گردھاری لال، گلستانِ ہند راجہ درگا پرشاد اور دوسرے فنون میں بھی تصنیف و تالیف فارسی میں ہوئی مثلاً خزینۃ الاصفیاء غلام سرور، ریاض الاولیا بختاور خاں، سفینۃ الاولیاء داراشکوہ ترجمہ مہابھارت، علامہ ابوالفضل ترجمہ رامائن امر سنگھ اور تذکرۂ صوفیہ اشکی بن وقوان مثلاً ال غلسی وغیرہ۔ علاوہ ازیں امیر خسرو دہلوی فیضی ابوالفضل اور نعمت خان عالی اور متاخرین میں غالب و اقبال مشتے از خروارے ہیں۔

علامہ شبلی مرحوم نے شعرالعجم لکھ کر ایران والوں اور ایرانی زبان و ادب پر بڑا احسان کیا۔ ان کی یہ تصنیف ایران میں بھی بڑی قدر کی نظر سے دیکھی گئی۔ چنانچہ میرے قیام طہران کے زمانے میں طہران یونیورسٹی کے پروفیسر آقائے سعید نفیسی نے رودکی کے حالات کا جو شبلی مرحوم نے شعرالعجم میں لکھے ہیں، مجھ سے فارسی میں ترجمہ کرایا اور اپنی تالیف "احوال و اشعار رودکی" میں شامل کیا ہے۔ پروفیسر براؤن نے تاریخ ادبیات ایران میں بعض جگہ شعرالعجم کے حوالے سے بعض شاعروں کے متعلق شبلی مرحوم کی رائے کے اقتباسات درج کئے ہیں۔ شعرالعجم کی اہمیت کے لحاظ سے اس کا ترجمہ ایران میں ہوا ہے اور ایک حصہ طبع بھی ہو چکا ہے۔

مغل بادشاہوں کے زمانے میں یوں تو فارسی زبان پایۂ تخت کے علاوہ مختلف صوبوں میں رائج تھی لیکن بعض صوبوں میں اس کو اعلیٰ مدارج حاصل ہوئے کشمیر میں تو مقامی مسلمانوں کی زبان تقریباً وہی تھی۔ اور ہندو اور ان کے پنڈت بھی اس میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔ بیجاپور میں عادل شاہی بادشاہوں کی علم پروری و فیضان کے انوار ہر طرف چھائے ہوئے تھے۔ تاریخ عادل شاہی مصنفہ نوراللہ، تاریخ بیجاپور ابراہیم زبیری اس زمانے کی یادگار ہیں اور ملا ظہوری کا نام ہمیشہ ان بادشاہوں کی یاد تازہ کرتا رہے گا۔

قطب شاہی بادشاہوں کی درباری زبان بھی فارسی تھی۔ سلطان محمد قلی قطب شاہ کو فارسی زبان سے خاص لگاؤ تھا۔ اس نے شاعروں انشا پردازوں اور عالموں کا ایک حلقہ بنا رکھا تھا۔ اس بادشاہ کا فارسی دیوان موجود ہے۔ یہ فارسی میں قطب شاہ تخلص کرتا تھا۔

جمشید قطب شاہ بڑا عالم، علم کا سرپرست اور اچھا شاعر تھا۔ جمشید تخلص کرتا تھا۔ بعض وقت شعر فی البدیہہ کہا کرتا تھا۔ اس کی فارسی غزلیں و قصیدے سلاست و لطافت کا اچھا نمونہ ہیں۔

سلطان قطب شاہ بھی فارسی کا اچھا شاعر تھا اور ظل اللہ تخلص کرتا تھا۔ کلام سے بلند خیالی اور پختگی ظاہر ہوتی ہے۔ اس بادشاہ کی طرف چند تالیفیں و تصنیفیں جو فارسی زبان میں ہیں منسوب کی جاتی ہیں مثلاً قدرت نامہ، روح القدس وغیرہ اور تاریخ قطب شاہی، تاریخ سلاطین دکن اور تاریخ دکن اس دور کی یادگار ہیں۔

عبداللہ قطب شاہ کا دور بھی علمی سرگرمیوں کا منبع تھا۔ دربار میں علماء جمع رہتے تھے۔ مختلف علوم و فنون میں تصنیفیں و تالیفیں ہوئیں جس سے قطب شاہی خاندان کو بڑا امتیاز حاصل ہے۔ اسی عہد میں

جامع عباسی کے حواشی لکھے گئے کتاب المصباح کا ترجمہ فارسی میں ہوا خرفتہ العلماء ۶ جلدوں میں ابن عماد نے لکھی جن میں مختلف علوم و فنون مدون کئے گئے ہیں برہان قاطع بھی اسی عہد میں لکھی گئی۔

قطب شاہی بادشاہوں کے عہد کے علاوہ ان کے ہندو وزیروں کو بھی فارسی زبان سے خاص دلچسپی تھی گویا بادشاہوں کے خیالات کا عکس ان میں پایا جاتا تھا چنانچہ اکنا وزیر کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اس کو فارسی شعر و سخن سے خاص لگاؤ تھا اور اس زمانہ کے اور ہندو خاندانوں میں بھی اس کا ذوق موجود تھا۔

سلاطین آصفیہ کی علمی سرپرستیوں نے فارسی زبان کی وسعت و ترقی اور شاعروں، ادیبوں اور علماؤں کی قدر دانی و حوصلہ افزائی کی اسی کا نتیجہ تھا کہ وزراء اور امیروں میں بھی ان چیزوں سے دلچسپی پیدا ہوئی چنانچہ امیروں سے بعض مثلاً صمصام الملک صارم صمصام الدولہ شاہ نواز خاں شہید کے فرزند آصفجاہ ثانی کے زمانہ میں اور خواجہ بہاؤ الدین علام جنگ وار اسکندر جاہ بہادر کے زمانہ میں گزرے ہیں گرامی بیگم معروف بہ نوسبری علی قلی خاں والہ داغستانی کی دختر اعتماد الدولہ غازی الدین خاں نبیرۂ آصفجاہ کی حرم محترم تھیں جو فارسی کی ماہر اور مشہور شاعرہ کے کلام پر خود اچھے شعر کہا کرتی تھیں۔ آصفجاہی دور حکومت میں فارسی زبان کے سیکڑوں شاعر ادیب و علماء پیدا ہوئے جن میں سے بعض کے لئے تو مستقل عنوان درکار ہیں ان میں سے چند یہ ہیں۔ فضلی شاہ فضل اللہ اورنگ آبادی، مومن میر مومن رحمۃ اللہ علیہ دونوں مشہور عالم بزرگ اور شاعر ہوئے ہیں۔ عاجز شاہ تجلی، عشرتی، درد مند، سراج جن کا فارسی کلام بھی اردو کی طرح بہت اچھا ہے گرامی استاد اعلیٰ حضرت مغفور اور فصاحت جنگ جلیل قابل ذکر ہیں آغا سید علی شوستری طوطی استاد اعلیٰ حضرت مغفور عربی و فارسی میں یگانہ روزگار تھے ان کی وجہ سے فارسی کا ذوق اہل حیدرآباد میں بہت ترقی پایا انہیں کے معاصر خوشہ چینوں میں مرحوم سید اشرف شمسی اور جمال الدین نوری وغیرہ تھے۔

آصفجاہی عہد میں نہ صرف مسلمانوں میں فارسی زبان کا ذوق تھا بلکہ ہندو بھی برابر کے حصہ دار تھے۔ دولت رائے دبیر مولف تاریخ آصفی راجہ گھنشام پرشاد باقی مولف کنز التاریخ پیرایۂ عروض کلیات یادگار باقی اور لچھمی نرائن شفیق متعدد کتابوں مثلاً مآثر آصفی تذکرہ گل رعنا چمنستان شعراء وغیرہ کے مولف و مصنف ہیں دکن کے فارسی گو شعرائے ہنود کے لئے بھی ایک مستقل عنوان کی ضرورت ہے۔

حکومت آصفجاہی کی دفتری زبان بھی ابتداء میں فارسی رہی تھی یہاں بلا امتیاز مذہب و ملت جس کا اس وقت کوئی سوال نہ تھا یہی زبان خط و کتابت مراسلت فرامین و تصنیف و تالیف کا ذریعہ تھی۔ کایستھ خاندانوں میں خصوصاً اور دیگر ہندو خاندانوں میں بھی ابتدائی تعلیم کے ساتھ فارسی تعلیم بھی ضروری سمجھی جاتی تھی۔

حیدرآباد دکن میں دار العلوم علوم مشرقیہ کی عرصہ دراز تک ضیا پاشی کرتا رہا اس کا تعلق پنجاب یونیورسٹی کے شعبۂ مشرقی سے تھا اور اس درسگاہ کے فارغ التحصیل بڑے بڑے علماء گزرے ہیں جن میں سید اشرف شمسی جمال الدین نوری عبد القدیر صدیقی حسرت وغیرہ ہوئے اور ہیں۔

تقریباً پچاس ساٹھ سال ہوئے کہ دفتری زبان فارسی کی جگہ اردو نے لی اور فارسی کا اثر و نفوذ کم ہوتا چلا تھا اور وہ کس مپری کے عالم میں تھی کہ خدائے تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے اس غرق ہونے والی کشتی کا ناخدا پیدا کر دیا اعلیٰ حضرت سلطان العلوم نواب میر عثمان علیخان بہادر آصف سابع خلد اللہ ملکہ و سلطنتہ کی سرپرستی و علم پروری نے فارسی زبان کو پھر سے زندہ کر دیا اور اپنے فارسی کلام لصاحت التیام سے مردہ جسموں میں تازہ روح پھونک دی جس سے بے اختیار زبان پر یہ شعر آتا ہے۔

زندہ کردی چوں مسیحا علم و فن را در دکن   زندہ بادا اے میر عثمان علی خاں زندہ باد

مہاراجہ سرکشن پرشاد یمین السلطنت سورگ باشی کا اسم گرامی فارسی کے محسنوں میں شمار ہوگا جن کا دربار ہمیشہ شعراء علماء و فضلا کا ماویٰ و ملجا رہا کرتا تھا خود فارسی کے شاعر تھے علاوہ شعرا کی جو قدر و منزلت شاعروں اور داد و دہش وغیرہ سے کی ہے اس کا ایک نتیجہ دیوان حسن سنجری دہلوی ہے جس کو فاضل محترم مولوی مسعود علی محوی نے نہایت کاوش و جانفشانی سے مرتب کیا اور اس پر فاضلانہ مقدمہ لکھا اور مہاراجہ بہادر کے الطاف سے زیور طبع سے آراستہ ہوا۔

اعلیحضرت سلطان العلوم نے جامعہ عثمانیہ کے قیام سے جہاں قدیم و جدید علوم و فنون کی حفاظت و ترقی کا استحکام فرما دیا ہے زبان فارسی کی ترقی و ترویج بھی اعلیحضرت خلد اللہ ملکہ کے عہد ہی سے ہے اور آئندہ اس جامعہ سے بہت سی امیدیں وابستہ ہیں۔

قاری سید کلیم اللہ حسینی

سنسکرت شاعری اور اُسکی بلاغت

اس دنیائے فانی میں جس میں کہ جاندار اور بے جان چیزوں کے
چوراسی لاکھ بھید (اقسام) ہیں اور جن کی تعداد رشی منیوں (پیغمبروں)
نے مندرجۂ ذیل طریق پر قایم کی ہے یعنی انسان کی چار لاکھ قسمیں ہیں
اور حیوان کی تیس لاکھ آبی جانور نو لاکھ قسم کے اور پرندے دس لاکھ
طرح کے نیز کیڑے کوڑے گیارہ لاکھ اور درندے بیس لاکھ طرح کے ہیں۔
ان سب میں انسان ہی اشرف المخلوقات ہے۔ انسانی قالب بے شمار
نیکیوں سے حاصل ہوتا ہے۔ جیسا کہ ایک مستند شاعر کا قول ہے کہ

नरत्वं दुर्लभं लोके विद्या तत्र सुदुर्लभा ।
कवित्वं दुर्लभं तत्र शक्तिस्तत्र सुदुर्लभा ॥१॥

یعنی اول تو انسانی جسم حاصل کرنا مشکل ہے اور جو متعدد نیکیوں کی وجہ سے
انسان بن بھی گیا تو علم کا حاصل کرنا بڑا کٹھن ہے۔ اور اگر قابلیت اور
محنت کی مدد سے علم حاصل ہو بھی گیا تو فن شاعری کا آنا دشوار ہے کیونکہ وہ
شکتی (قوت شاعری) جو فن شاعری کے لئے نہایت ضروری ہے ہر
شخص کا حصہ نہیں۔ حضرات! وہ قوت انسان میں ایک فطری طریق پر
موجود رہتی ہے اور اس میں وقتاً فوقتاً اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ ایک
مستند بلاغت داں کی رائے میں

शक्तिर्निपुणता लोक शास्त्र काव्याद्यवे-
क्षणात् । काव्यज्ञशिक्षयाभ्यास इति हेतुस्तदुद्भवे ॥२॥

وہ شکتی اس وقت پیدا ہوتی ہے جب انسان دنیوی معاملات کا اور
مختلف علوم و فنون کا مطالعہ کرتا رہتا ہے اور کسی ماہر فن سے تعلیم
حاصل کرکے اس کی بار بار مشق کرتا ہے۔ بعض اصحاب فن شاعری کو
کوئی بہت بڑا فن خیال نہیں کرتے لیکن سنسکرت کی حد تک میں آپ کو
یقین دلاتا ہوں کہ شاعری سے بڑے بڑے فوائد ہیں۔ ان میں سے چند
ملاحظہ ہوں۔

काव्यं यशसेऽर्थकृते व्यवहारविदे-
शिवेतरक्षतये । सद्यः परनिर्वृतये का-
न्तासम्मिततयोपदेशयुजे ॥३॥

مثلاً مہاتما والمیکی، مہاکوی کالی داس، شری ہرش وغیرہ شعراء کی طرح
شاعر کامل کو شہرت حاصل ہوتی ہے۔ ملک الشعرا پان بھٹ، کلہن وغیرہ کے
مانند دولت بھی ملتی ہے۔ متعدد طرز و طریق سے واقفیت ہوتی ہے خرابیاں
دور ہوتی ہیں طرح طرح کی نصیحتیں حاصل ہوتی ہیں یہاں تک کہ شاعر کو
روحانی نجات جیسی دولت بھی حاصل ہوئی۔ دنیا کو شاعری سے بے حد
فائدہ ہے۔ دیکھئے شاعری کی بدولت ہی آج سنسکرت ادب میں کافی
اضافہ نظر آرہا ہے۔ بڑے بڑے اصولوں کو منظم کرنے سے بآسانی انسان
مختلف مضامین کو ذہن نشین کر لیتا ہے۔ جو بات نثر میں متعدد جملوں
سے ادا ہوتی ہے وہ بڑی سہولت سے چند اشعار سے بخوبی واضح کردی
جاتی ہے۔ علاوہ ان باتوں کے شاعری کا موسیقی سے بڑا گہرا تعلق ہے۔
گویا یہ لازم ملزوم امور ہیں۔ شلوک یا شعر کو جب تک ترنم کے ساتھ نہ
پڑھا جائے اس وقت تک شاعری کا حقیقی لطف حاصل نہیں ہوتا۔
یہی وجہ ہے کہ شاعری سے حیوان تک خوش ہوتا ہے۔ یوں تو شاعری
کی ابتدا ویدوں کے زمانے سے شمار کی جاتی ہے اور شاعری کا سب سے
پہلا کارنامہ رگ وید ہے جو گایتری، اُشنک، انشٹپ وغیرہ مختلف چندوں
(بحروں) سے لبریز ہے۔ اور یہ بات تو عام ہے کہ تیسرا وید جس کا نام
سام وید ہے وہ تو تمام موسیقی پر ہی مبنی ہے۔ یہ رہیں ویدک شاعری
کی خصوصیات۔ اب میں آپ کو لوکک (लौकिक ۔
دنیوی) شاعری کی طرف متوجہ کرتا ہوں اس کا آغاز مہارشی والمیکی
کی مبارک زبان سے سب سے پہلے فطری طور پر ہوا۔ اس نے ایک شعر
کہا جس کا مطلب یہ ہے۔

मा निषाद प्रतिष्ठां त्वमगमः शाश्वतीः-
समाः । यत्क्रौञ्चमिथुनादेकमवधीः-
काममोहितम् ॥४॥

کسی شکاری کو مخاطب والمیکی نے بد دعا دی ہے کہ اے شکاری تجھے کبھی عزت و راحت نصیب نہ ہوگی کیونکہ تو نے پرندہ ہرنِل کے جوڑے میں سے ایک کو مار ڈالا۔ بس اسی روز سے سنسکرت شاعری کا آغاز ہوا اور والمیکی راماین جیسا عظیم الشان اور بلیغ کارنامہ جس میں کہ تریتا (त्रेता.) جگ کے راجہ رام چندر جی کی مکمل سوانح عمری لکھی ہوئی ہے دنیا میں آیا۔ اس کے بعد تو پھر دواپر (द्वापर) اور کلجگ (कालियुग) کے متعدد رشی منیوں اور مہاتما وید ویاس وغیرہ بڑے بڑے علما نے اسی چھوٹی بحر انشٹپ (अनुष्टुप.) میں مہابھارت، اٹھارہ پران، اٹھارہ سمرتیاں (دوم شاستر) اور بھی متعدد علوم و فنون کی کتب لکھی ہیں۔ سنسکرت میں اور وید میں بھی اس بحر کے بتیس ۳۲ حروف ہوتے ہیں۔ ایک شلوک (سطر) آٹھ آٹھ حروف کے چار چرنوں (اجزاء) میں منقسم ہوتا ہے۔ گویا ہر شلوک میں دو مصرع ہوتے ہیں۔ سنسکرت عروض (Orosody) کے لحاظ سے بعض بحریں حروف یا ماتراوں پر مبنی ہوتی ہیں۔ اور بعض گن (ارکان) پر منحصر ہیں۔ لیکن ارکان پر زیادہ مبنی ہیں یہ بات مہارشی پنگلاچاریہ کے ایک بلیغ شلوک سے ظاہر ہے جس میں ارکان کو شمار کرایا گیا ہے۔ اور بتایا گیا ہے کہ کس طرح

म्यर स्तजभ्न गैर्लान्तेरेभिर्दशभिरक्षरैः।
समस्त वाङ्मयं व्याप्तं त्रैलोक्यमिव विष्णुना॥

م، ی، ر، س، ت، ج، بھ، ن، گ، ل، یہ دس حروف تمام دنیا پر محیط ہیں جیسے کہ خدا محیط عالم ہے۔

سنسکرت عروض کا میدان بہت وسیع ہے۔ مگن، یگن، رگن وغیرہ آٹھ ارکان میں بعض مبارک ہوتے ہیں اور بعض منحوس۔ یہ اصول ایک شاردول وکریڈت (शार्दूलविक्रीडित.) نامی بحر طویل سے بخوبی ظاہر ہے۔

मोभूमिः श्रियमातनोति यजलं वह्निस्त्वा-
ग्निर्मर्त्ति सोवायुः परदेशदूरगमनं -
व्यो प्रशून्यं फलम्।
जः सूर्यो रुजमाद धाति विपुलं मेन्दुर्यशो -
निर्मलं नो नाकश्रय फल प्रदः फलमिदं -
प्राहुर्गणानां बुधाः ॥८॥

شاعری کرتے وقت شاعر کو یہ بات یقیناً مدنظر رکھنی پڑتی ہے کہ اس کی شاعری میں خصوصاً نظم کی ابتدا میں کوئی منحوس گن (رکن) نہ پڑ جائے۔ یہ تو ہوئی بحروں کے متعلق بات۔ اب میں مختصراً سنسکرت بلاغت کے بھی چند اصول پیش کرتا ہوں کیونکہ شاعری کا بلاغت سے خاص تعلق ہے۔ بلاغت کے موجد وید ویاس جی ہیں۔ لیکن مہامنی بھرت بھی اس کے موجد ہیں ان کو دو ہزار سال سے کچھ زیادہ عرصہ گزرا۔ اس کے بعد تو پھر گیارھویں صدی میں ممٹاچاریہ اور چودھویں صدی میں پنڈت وشوناتھ نیز سترھویں صدی میں پنڈت راج جگناتھ وغیرہ بڑے بڑے مستند بلاغت داں گزرے ہیں۔ جنھوں شاعری کی تعریف جامع الفاظ میں کی ہے۔

तददोषौ शब्दार्थौ सगुणावनलङ्कृती पुनः क्वापि. (ممٹ)

वाक्यं रसात्मकं काव्यम्. (وشوناتھ)

रमणीयार्थ प्रतिपादकः शब्दः काव्यम् (جگناتھ)

جن کا مختصر مطلب یہ ہے کہ کاویہ (شاعری) اسے کہتے ہیں جس کے الفاظ و معنی بغیر کسی عیب کے خوبی رکھتے ہوں اور مرصع ہوں یا رسیلا اور پُر اثر کلام ہی شاعری کی تعریف میں آسکتا ہے وغیرہ وغیرہ۔

رس (جذبات) گُن (خوبیاں) اور النکار (صنائع بدائع) یہ تینوں شاعری کے حقیقی اجزا ہیں۔ شرنگار (جذبۂ عشقیہ) ہاسیہ (جذبۂ ظرافت) کرُن (جذبۂ رنج و الم) وغیرہ رس کہلاتے ہیں اور سلاست، وضاحت اور الفاظ کی بندش وغیرہ خوبیوں کو گُن کہتے ہیں۔ نیز النکار تو سیکڑوں کی تعداد میں ہیں۔ لیکن اُپما (تشبیہ) تمام النکاروں کی سردار کہلاتی ہے کیونکہ اس پر دیگر بہت سے النکار مبنی ہیں۔ کالی داس جو بھارتی ادب

وغیرہ مستند شعرا نے اپنی تصانیف میں اس کا زیادہ استعمال کیا ہے علاوہ اُپما (تشبیہ) کے اُت پریکشا (उत्प्रेक्षा) (حسن تعلیل) روپک (استعارہ) ویر ودہ (تکرار) وغیرہ وغیرہ اور بھی متعدد النکار (صنائع بدائع) موجود ہیں۔ اس وقت صرف اُپما (تشبیہ) کے متعلق چند ضروری باتیں عرض کرتا ہوں۔

سنسکرت بلاغت میں شبد النکار (صنعت الفاظ) ارتھ النکار (صنعت معنی) اور ابھیا النکار (صنعت الفاظ و معنی) اس طرح سے النکار تین قسم کے ہیں۔ اُپما (تشبیہ) ارتھ النکاروں میں شمار کی گئی ہے مکمل تشبیہ کے لئے چار باتیں ضروری ہیں یعنی اُپمان (مشبہ بہ) اُپمیہ (مشبہ) سادھارن دھرم (خاصیت کی یکسانیت یا وجہ تشبیہ) اور چوتھا ایک شبد (حرف تشبیہ) بغیر ان چار چیزوں کے تشبیہ کا وجود ناکمل ہے۔ مثال کے طور پر صرف ایک شعر کا ترجمہ پیش ہے۔

गता नाशं तारा उपकृतमसाधाविव जने वियुक्ताः कान्तेन स्त्रिय इव न राजन्ति ककुभः। प्रकामान्तस्तप्तं त्रिदशपतिशस्त्रस्य शिखिना द्रवीभूतं मन्ये पतति जलरूपेण गगनम्॥७॥

اس شعر کے نصف اول میں دو تشبیہات ہیں اور نصف آخر میں حسن تعلیل ہے۔ اس کا مختصر مطلب یہ ہے کہ رات کے وقت بادلوں کی گھٹاؤں کی وجہ سے آسمان میں تاریکی چھائی ہوئی ہے جس سے تمام ستارے غائب ہوگئے ہیں۔ جیسے کسی بدانسان کے ساتھ کی ہوئی نیکی برباد جاتی ہے اور سمات ایسی خراب معلوم ہوتی ہیں جیسے اپنے شوہروں کی مفارقت زدہ نازنیں وغیرہ وغیرہ۔

ہری ہر شاستری

اردو مثنوی کا ارتقاء:۔ بڑی عالمانہ و محققانہ کتاب ہے جس کے افادہ اور معیار کے اظہار کے لئے صرف اس کے مصنف پروفیسر عبدالقادر صاحب سروری کا نام ہی کافی ہے سروری صاحب کی نظر اردو شاعری کی تاریخ پر اتنی وسیع اور باریک بیں ہے کہ اس خصوص میں عہد حاضر کے کسی محقق و ادیب کو ہمسری نصیب نہیں۔ اردو شاعری کی تاریخ سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے یہ کتاب ایک نعمت غیر مترقبہ ہے جو اپنے موضوع اور اہمیت کے لحاظ سے سب سے پہلی کامیاب ترین کوشش ہے۔ یہ کتاب دس ابواب پر مشتمل ہے جن سے اس کی اہمیت اور تلاش و جستجو کا اندازہ ہو سکے گا۔

بڑی سائز صفحات (۱۴۳) قیمت ۱۲/

انگریزی زبان

انگریزی زبان دنیا کی وسیع ترین زبانوں میں سے ہے۔ وہ دنیا کے سارے براعظموں میں اور اکثر ممالک میں بولی جاتی ہے۔ امریکہ میں اس کا رواج عام ہے۔ آسٹریلیا میں بھی یہ عام طور پر بولی جاتی ہے اور ایشیا کے اکثر حصوں میں اس کے بولنے اور سمجھنے والے موجود ہیں۔ اس لئے اس وقت یہ دنیا کی سب سے اہم زبان سمجھی جاتی ہے۔ یہ بات نہ یورپ کی کسی زبان کو حاصل ہے اور نہ ایشیا کی

زبان کی ابتدا کے متعلق اگر کھوج کی جائے تو ظاہر ہوگا کہ اس کا آغاز بہت معمولی طور پر ہوا۔ انگلو سیکسن بولی جواب قدیم انگریزی زبان کہلاتی ہے موجودہ انگریزی ٹیوٹانی زبانوں کے گروہ سے تعلق رکھتی ہے۔ ٹیوٹانی زبانوں کی تین شاخیں ہیں جن میں سے ایک مشرقی جرمن اب ناپید ہو گئی ہے۔ دوسرے اسکینڈے نے وین زبان جس سے آئس لینڈی اور ڈینی زبانیں نکلی ہیں۔ تیسری شاخ مغربی جرمن زبان ہے۔ انگریزی زبان کا تعلق اسی سے ہے۔ لیکن خود ٹیوٹانی زبانیں آریائی یا ہند یورپی زبانوں کی شاخیں ہیں جو ہندوستان سے لے کر آئرستان تک کی تمام زبانوں پر مشتمل ہیں۔ ان میں سنسکرت فارسی یونانی۔ لاطینی اور کلتی کے علاوہ چند اور زبانیں بھی شامل ہیں۔

انگریزی اور دوسری آریائی زبانوں کی قواعد ان کی ساخت اور الفاظ کا ایک بڑا مشترک ذخیرہ ان کے آپس کے تعلق کو اچھی طرح واضح کرتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ اپنے اصلی وطن سے دور ہو جانے اور مقامی اثرات کی وجہ سے ان زبانوں میں بہت سے نئے الفاظ داخل ہوتے گئے۔ اور بعض ترک کر دیے گئے۔ کئی ایسے ہیں جن کے تلفظ بدل گئے ہیں۔ لیکن ان تبدیلیوں کے باوجود ہم زبانوں کے آپس کے تعلقات کو سمجھ سکتے ہیں

انگریزی زبان نے تبدیلیوں کے ایک باقاعدہ نظام کے تحت اپنی ابتدائی حالت سے ترقی کی۔ ابتدائی زبان میں موجودہ جرمن زبان کی طرح تین جنسوں یعنے مذکر مونث اور بے جان کے علاوہ چار حالتیں اور تعریف کی کئی صورتیں تھیں۔ صفات اسما کے مطابق ہوتیں اور ان کی گردانیں اسم کی طرح ہوتی تھیں۔ افعال کی گردان میں موجودہ کے مقابلے میں تقریباً دوگنی صورتیں اور بھی تھیں۔ جواب متروک ہو گئی ہیں پہلے کے مقابلہ میں موجودہ انگریزی بہت سادہ ہو گئی ہے اور اوپر بیان کی ہوئی تبدیلیوں کو ظاہر کرنے کے لیے موجودہ زبان میں دوسرے اور آسان ذرائع مہیا کر لئے گئے ہیں۔

تبدیلیوں اور گردانوں کی اس پیچیدگی کو دور کرنے کے معاملے میں انگریزی زبان تمام یورپی زبانوں سے آگے ہے۔

انگریزی زبان کی یہ کوشش رہی کہ ہر خیال کو ایک علٰحدہ لفظ کے ذریعہ ظاہر کیا جائے۔ کئی خیالات کو ظاہر کرنے کیلئے اگر ایک ہی لفظ استعمال کیا جائے تو اس سے زبان میں جو پیچیدگیاں پیدا ہو سکتی ہیں ظاہر ہیں۔ زبان کی سادگی تہذیب اور تمدن کی ترقی کا لازمی جز ہوتی ہے۔ تصورات اور خیالات کے اجزا کی تقسیم اور ان کے لئے الفاظ کا وضع کرنا درحقیقت ذہن انسانی کی ترقی کی ایک بڑی علامت ہے۔ انگریزی زبان میں حرف جار اور امدادی افعال وغیرہ کے استعمال کی زیادتی دراصل خیال اور تصور کو زیادہ واضح طور پر ادا کرنے کی کوشش کا نتیجہ ہے۔ قدیم زبان میں جو پیچیدگیاں پیدا ہو جاتی ہیں اور زبان سیکھنے والوں کو جن دقتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے اس کا اندازہ وہ حضرات بخوبی کر سکتے ہیں جنھیں فرانسیسی یا جرمن زبان سیکھنا پڑا ہے۔

قواعد کی ان تبدیلیوں کے علاوہ موجودہ انگریزی زبان بہت سے غیر ضروری اشکال اور آخری علامت کو دور کرنے میں بھی یورپ کی دوسری زبانوں کے پیش پیش ہے۔ سب سے نمایاں چیز انگریزی میں قواعد کی جنس کا نہ ہونا ہے۔ اس کی وجہ سے انگریزی زبان میں جو آسانیاں پیدا ہو گئی ہیں ان کا اندازہ کرنا مشکل ہے۔ ایسی چیزیں جن میں جنس کا فرق فطرتاً موجود نہیں ہے، ان میں جنس کا امتیاز قائم کرنا قطعاً نامناسب ہے۔ بعض زبانوں میں کبھی کبھی جانداروں کے لئے غلط یا من مانی جنس کے استعمال کا دستور پڑ جاتا ہے۔ یہ دراصل ہماری قدامت کی یادگار ہے اور اس سے حافظے پر غیر ضروری بار پڑنے کے سوا اور کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔

جنس کے استعمال کی آسانیوں کے علاوہ صفات کی گردان کے قاعدے کو موقوف کر دینے سے بھی انگریزی زبان نے بڑی سہولت پیدا کرلی ہے۔ ایک اور آسانی ضمیروں کا استعمال ہے۔ بعض زبانوں میں ضمیروں کا استعمال ضرورت سے زیادہ ہوتا ہے مثلاً فرانسیسی میں "میری بیوی اور بچے" کے لئے "میری بیوی اور میرے بچے" کہنا پڑتا ہے۔ ذہنی اور مادی ترقی کا ایک نتیجہ یہ ہونا چاہیئے کہ انسان کم سے کم وسیلوں سے زیادہ فائدہ اٹھا سکے۔

موجودہ انگریزی زبان کی ایک دوسری نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ اس میں فاعل و مفعول کا فرق قواعد کی تبدیلیوں کے ذریعہ ظاہر کرنے کی بجائے ان کی ترتیب سے ظاہر کیا گیا ہے۔ جیسے یہ جملہ ہے "زید نے بکر کو مارا" اس میں اسمار کو باہم تبدیل کر دیں تو معنی بالکل الٹے ہو جائیں گے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ انگریزی میں فاعل اور مفعول کا تعین ان کی ترتیب کے لحاظ سے ہوتا ہے۔ فاعل معمولی صورتوں میں ہمیشہ فعل سے پہلے اور مفعول فعل کے بعد آتا ہے یہی اردو زبان میں بھی ہوتا ہے۔ فرق صرف اس قدر ہے کہ انگریزی میں فعل کا تطابق فاعل سے ہوتا ہے اور اردو میں مفعول سے۔

دوسری زبانوں میں فاعل اور مفعول کا اظہار قواعدی تبدیلیوں کے ذریعہ کیا جاتا ہے۔ فاعل اور مفعول کی علامتیں الگ الگ ہوتی ہیں جو اسمار کے ساتھ مل کر بعض وقت ان کی اصل صورت کو اس قدر بگاڑ دیتی ہیں کہ ان کا سمجھنا مشکل ہوتا ہے۔

یہ تبدیلیاں اور آسانیاں ایسی نہیں ہیں جو انگریزی زبان ہی کے ساتھ مخصوص ہوں۔ بلکہ یہ تمام یوروپی اور دنیا کی اکثر زبانوں میں ایسا ہوتا رہا ہے کیونکہ سہولت زبان کے ارتقا کا مطمح نظر ہوتی ہے۔ انگریزی زبان میں یہ سہولتیں اتنی جلد جلد پیدا ہوتی گئیں کہ یورپ کی دوسری زبانیں اس کا ساتھ نہ دے سکیں۔ اس کا سبب یہ نہیں ہے کہ انگریز قوم دوسری یورپی قوموں کے مقابلے میں غیر معمولی طور پر روشن دماغ واقع ہوئی ہے یا یہ کہ وہ ذہنی ارتقار میں دوسری قوموں سے بہت اونچی ہوگئی ہے، بلکہ یہ درحقیقت انگریز قوم کی ذہنی خصوصیت کا نتیجہ ہے۔ تعلیم و تربیت اور روشن دماغی دوسرے امور میں تو فائدہ مند ثابت ہوتی ہے لیکن زبان کے معاملہ میں یہی چیزیں ایک ضد اور قدامت پرستی کا جذبہ پیدا کرتی ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ زبان کی ان تبدیلیوں اور سہولتوں کی ابتدار کی تحقیق کرنے کے لئے ہم کو تعلیم یافتہ گروہ اور علما سے زیادہ عوام اور جہلا کی بات چیت کو ٹٹولنا چاہیے۔ ان کی بول چال کا اصل اصول قواعد نہیں بلکہ سہولت اور اظہار خیال میں زیادہ سے زیادہ قطعیت کا احساس ہے۔ علما قواعد کے اصول کی کسی ترمیم کو کبھی برداشت نہیں کر سکتے۔

فضل حق

تاریخ پڑھئے

کسی شخص سے یہ کہنا کہ تاریخ پڑھئے شاید خوشگوار نہ ہو۔ غالباً شاعری اور فنونِ لطیفہ کے مطالعہ کی ترغیب زیادہ خوشگوار ثابت ہوتی ہے کیونکہ یہ مشہور ہے کہ تاریخ ایک خشک مضمون ہے اور اسی وجہ سے طلبہ تو اس سے اپنا دامن چھڑانے کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن تاریخ کی حقیقت اس بات میں چھپی ہوئی ہے کہ تاریخ کیوں پڑھئے اور کس طرح پڑھئے؟ اگر تاریخ کی اصل غایت کہ یہ مضمون پڑھنے سے کیا فائدہ ہے اور دوسرے اس مضمون کے پڑھنے کا طریقہ کیا ہے اچھی طرح ذہن نشین کرایا جائے تو مطالعہ تاریخ کی ہدایت ہرگز ناگوار نہیں گزرے گی۔ اصل بات یہ ہے کہ ہم لوگ تاریخ کی حقیقت سے واقف نہیں ہیں۔ ہمارے ذہن میں یہ بات جمی ہوئی ہے کہ تاریخ چند خشک واقعات کے مجموعہ کا نام ہے اور عامی لوگ تو یہ پوچھتے ہیں کہ ان بے جوڑ واقعات کے یاد کرنے سے آخر حیاتِ انسانی کو کیا فائدہ پہنچتا ہے۔ اس کے علاوہ مطالعۂ تاریخ کا طریقہ ہی اس حقیقت کو واضح کرتا ہے۔ لوگ اس وجہ سے تاریخ سے دور بھاگتے ہیں کہ ان کو غیر دلچسپ واقعات یاد کرنا پڑتا ہے، ان سے کہا جاتا ہے کہ یہ چند واقعات ذہن نشین کر لینا تاریخ کا تمام مدعا ہے اور اس طرح یقین ہے کہ یہ مضمون خشک ہو جائے۔

بات یہ ہے کہ تاریخ کو ایک بدمزہ داستان اور خشک واقعات کا مجموعہ سمجھنا صحیح نہیں ہے بلکہ وہ ایک بہت بڑا عمرانی علم ہے اور زمانۂ حال میں اس نے کچھ ایسی علمی شان اختیار کر لی ہے کہ دوسرے علوم کی طرح اس کو بھی سائنس کا درجہ دیا جا رہا ہے۔ در اصل تاریخ بنی نوعِ انسان کی اجتماعی زندگی کا مرقع ہے اور اس قانونِ قدرت کے مطالعہ سے جس کے تحت دنیا کی قومیں اجتماعی زندگی کی منزلیں طے کرتی ہیں اور مقصدِ حیات پورا کرتی ہیں۔ اگر اس کو ایک محدود معنی میں لیا جائے تو یہ ایک قوم یا ملک کی عمرانی زندگی کی تصویر ہے جس کے ذریعہ اس کی تہذیب آنکھوں کے سامنے آ جاتی ہے۔ گویا یہ ایک قوم کا پس منظر ہے، جس میں اس کے ماضی کے نقوش ملتے ہیں اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ شروع سے زمانۂ حال تک اس نے کیا کام کئے، خود اپنی قوم و ملک کی کس طرح تعمیر کی اور دوسری قوموں کو کیا سبق دیا۔ اور یہ واقع میں ایک دلچسپ مطالعہ ہے کہ ایک قوم نے کسی جغرافیے میں کب جنم لیا اور اپنی اجتماعی زندگی میں اپنی ذہنی اور اخلاقی قوتوں سے تہذیب کی کس حد تک تعمیر کی۔

اگرچہ کہ ہر ملک کی تاریخ میں ایسے شواہد نہیں مل سکتے کہ فلاں قوم نے دنیا میں کب جنم لیا تھا۔ عمرانی زندگی تو اس وقت سے شروع ہو جاتی ہے جب قوم کے افراد مل جل کر رہنے لگتے ہیں۔ لیکن ان کو ابتدا میں اپنی اجتماعی زندگی کے متعلق صحیح شعور نہیں ہو سکتا۔ جب تک یہ شعور نہیں پیدا ہوا کسی قوم نے اپنے اسلاف کے کارناموں کو محفوظ رکھنا ضروری نہیں سمجھا۔ ظاہر ہے کہ اس زمانے کے متعلق اینٹ اور پتھر کے آثار سے کام لینا پڑتا ہے اور انہیں سے ان کی ذہنیت کا اندازہ لگایا جاتا ہے۔ لیکن اگر ان ابتدائی شاہدوں کو نظر انداز بھی کر دیا جائے جو تاریخ کی دسترس سے باہر ہیں تو تاریخ کا ہر مواد لکھا ہوا ہو یا اثریات کی صورت میں ہو ایک قوم کا بڑا سرمایہ ہے جس کی کوئی قیمت نہیں۔ ظاہر میں نظریں ملک کی وسعت اور مادی دولت کو اپنا سرمایۂ حیات سمجھتی ہیں اور انہیں پر بھروسہ کرتی ہیں۔ لیکن سچ تو یہ ہے کہ تاریخ اس سے کہیں زیادہ ہے۔ یہ ایسی دولت ہے کہ اس کے بغیر کسی ملک کا

اجاگر ہونا ناممکن ہے تاریخ مستقبل کی نقیب ہے کیونکہ مادی دولت اور ذرائع سے حقیقی استفادہ اس وقت ہو سکتا ہے جب کہ اس کے رہنے والوں میں بیداری ہو اور یہ کام تاریخ کرتی ہے۔

بات یہ ہے کہ تاریخ جو ماضی کا مرقع ہے کسی طرح سے حال اور مستقبل کی رہنمائی کرتی ہے اور کوئی قوم اس کی رہنمائی کے بغیر اپنی زندگی نہیں سنوار سکتی۔ اس کی ایک غایت یہ ہے کہ اسلاف کے پچھلے تجربے آنکھوں کے سامنے رہیں۔ کیونکہ قومیں اپنی رفتارِ ترقی میں ہر قدم پر نت نئے تجربے حاصل کرتی رہیں جو بظاہر آنکھوں سے اوجھل ہو جاتے ہیں لیکن ان تجربوں کا مجموعہ قوموں کا بڑا سرمایہ حیات ہے جو ہر عمل میں ان کی رہنمائی اور ہر لغزش میں ان کی دستگیری کرتا ہے، اور سچ تو یہ ہے کہ اہلِ تاریخ اسی کے لئے اپنی عمر صرف کرتے ہیں۔ پچھلے واقعات چنتے اور جمع کرتے جاتے ہیں تاکہ یہ آئندہ عملی زندگی میں کام آئیں اور کوئی چیز ضائع نہ ہو۔ انہی تجربوں کی روشنی میں آئندہ لائحہ عمل تیار ہوتا ہے جس قوم کے ساتھ زمانۂ قدیم کے یہ قیمتی ذخیرے نہ ہوں ان کا آگے بڑھنا مشکل ہے۔ اگر آج یہ تجربے دنیا سے چھین لئے جائیں تو تمام قومیں بے دست و پا ہو کر رہ جائے گی۔ کیونکہ مطالعے اور مشاہدے سے جو معلومات پیدا ہوتی ہیں وہ نظری ہیں اور ان تجربوں کے بغیر بیکار ہیں۔ ان نظریوں کو روبہ عمل لانے کے لئے ان کا صحیح راستہ معلوم ہونا چاہئے اور یہ تاریخ کی روشنی میں ہی دریافت ہو سکتا ہے۔ اس کے علاوہ حال و مستقبل کا صحیح اندازہ جو زندہ قوموں کی دلیل ہے تاریخ کی مدد کے بغیر نہیں قائم ہو سکتا ہے دنیا میں وہی قومیں زندہ رہ سکتی ہیں جو حال اور مستقبل کا صحیح اندازہ قائم کر کے اپنا ایک نصب العین مقرر کریں جس قوم کے سامنے کوئی نصب العین نہیں بین الاقوامی کشمکش میں اس کا زندہ رہنا ناممکن ہے اس کے لئے ملک کا تمام ماضی اور اس کی تمام روایتیں آنکھوں کے سامنے ہونے چاہئیں تاکہ اہل ملک کی صحیح ذہنیت اور طبعی معلومات روشنی میں آجائیں۔ یہ معلوم ہو سکے کہ قوم کا صحیح رجحان کس طرف ہے اور اس کی حقیقی ضرورتیں کیا ہیں۔ جس طرح ایک فرد اپنی پیش قدمی کے لئے نظر بازپسیں کا محتاج ہے اسی طرح ایک قوم بھی محتاج ہے۔ اگر ماضی سے آنکھیں بند ہو جائیں تو حیاتِ انسانی خشک ہو کر رہ جائے گی اور حیوانی زندگی سے بہتر نہ ہوگی۔ قوم کی اجتماعی زندگی دراصل ان روایتوں کے مجموعے کا نام ہے جو اس کو اسلاف سے ورثے میں ملتی ہیں، اور یہی تاریخ ہے جو قوموں کو گرماتی اور جذبۂ وطنیت پیدا کر کے ان کو آگے بڑھاتی ہے۔

ذرا وسعتِ نظر سے دیکھا جائے تو تاریخ اصل میں دنیا کے ارتقائے تمدن کا مطالعہ ہے۔ قدرت کا منشا یہ ہے کہ دنیا کا تمدن ہر روز بڑھے اور اس میں ہر روز اضافہ ہو۔ چونکہ ایک ملک یا ایک قوم تہذیب عالم کی تعمیر نہیں کر سکتی، اس لئے اس میں مختلف قوموں کے اشتراکِ عمل کی ضرورت ہے۔ چنانچہ قدرت کے منشا کے مطابق ہر قوم اس میں حصہ لیتی ہے اور اپنا سرمایہ شریک کرتی ہے۔ جب ایک قوم کی زندگی ختم ہو جاتی ہے تو دوسری قوم اس کی جگہ لیتی ہے اور گذشتہ سرمایے سے فائدہ اٹھا کر اپنے اضافے کرتی ہے۔ جب سے دنیا پیدا ہوئی ہے۔ اسی طرح قومیں اور قبیلے قانونِ قدرت کی اس تکمیل کے لئے آگے بڑھاتے رہے اور آئندہ نسلوں کے لئے اپنا ورثہ چھوڑا۔ پیچھے آنے والوں نے یہ امانت اپنے پاس رکھی اور مختلف طریقوں سے سنوارا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہر قوم کا یہی فرضِ منصبی ہے، جو قدرت کی طرف سے ودیعت ہوا ہے۔ غالباً سب سے قدیم زمانے میں وادیٔ فرات اور وادیٔ نیل کے رہنے والوں نے

اس کی ابتدا کی۔ اس کے بعد وادیٔ سندھ والوں کی باری آئی۔ اور پھر اہلِ چین اس کاروان میں شریک ہوئے۔ پھر ان کے بعد آریا قوم کا درجہ ہے، جس نے یورپ سے لے کر ہندوستان تک اپنا سکہ بٹھا دیا اور دنیا کے تمدن کی بہت بڑی خدمت کی۔ غالباً اس زمانے میں اس قوم کا زیادہ حصہ ہے۔ قرونِ وسطیٰ میں مسلمانوں نے یہ منصب پورا کیا۔ اور بالآخر یہ چنگاریاں ایشیا سے اڑ کر یورپ گئیں اور دنیا کو روشن کر دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہمارے سامنے آج تمدن کی ایک بہت بڑی عمارت کھڑی ہوئی ہے۔ جس کی بے شمار منزلیں ہیں تاریخ یہ چاہتی ہے کہ ہم غور کے ساتھ اسی عمارت کا مشاہدہ کریں کہ اس عمارت میں کس قوم کی کونسی تعمیر ہے۔ ظاہر ہے کہ اس عمارت میں بنیادیں کسی قوم کی ہیں اور اس کی مختلف منزلیں دوسری قوموں کی چنی ہوئی ہیں۔ اس طریق سے یہ مطالعہ نہ صرف دلچسپ بلکہ بہت ضروری ہے اور ذہنی تربیت کا بہت بڑا سامان ہے۔

اب رہا یہ سوال کہ تاریخ کس طرح پڑھئے خود حل طلب ہے، اور سچ تو یہ ہے کہ تاریخ کی اصل حقیقت اس بات میں چھپی ہوئی ہے کہ تاریخ کس طرح پڑھی جائے۔ کیونکہ کچھ اس وجہ سے یہ مضمون بدنام ہے اور خشک سمجھا جاتا ہے کہ اس کا اسلوب اچھا نہیں ہوتا۔ اول تو یہ سمجھنا صحیح نہیں ہے کہ تاریخ کا مطالعہ صرف کتابوں سے ہی ہو سکتا ہے بلکہ اس کے مطالعہ کے بہتیرے ذرایع ہیں۔ جہاں تک کتابوں کا تعلق ہے یہ ضروری ہے کہ یہ تاریخ کے منشا کو پورا کریں۔ تاریخ نگاری ہی ایک بہت بڑا فن ہے چند اوراق میں واقعاتِ تاریخ کو بے ربط قلمبند کر دینا تاریخ نہیں ہے۔ یہ واقعات اس طریقے سے نہیں قلمبند کئے جاتے جس طریقے سے ادب، طبیعات، کیمیا لکھی جاتی ہیں بلکہ اس کی خاص ترتیب ہے۔ جس زمانے کے واقعات ہوں اسی کی روشنی میں ان کو مرتب کرنا چاہئے کہ گویا ارتقائے تمدن کا ایک زندہ مرقع بنایا جا رہا ہے۔ واقعات کے ساتھ اس کا تمام ماحول پیش کرنا ضروری ہے جس میں نہ صرف جغرافیہ بلکہ تمام سیاسی اور معاشرتی فضا جمع ہو جائے۔ کیونکہ ایک نرا واقعہ اس کے ماحول اور اس کی ذہنیت کے بغیر بالکل بے جوڑ اور خشک ہو جائے گا اور حقیقت یہ ہے کہ تاریخ کچھ اس وجہ سے بدمزہ ہو جاتی ہے کہ اس کے واقعات ان کے ماحول سے جدا کر کے معلق پیش کئے جاتے ہیں نہ ان کی فضا معلوم ہوتی ہے اور نہ اس زمانے کی ذہنیت کا پتہ چلتا ہے۔

کتابوں سے ہٹ کر دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ تاریخی مقامات، قدیم آثار، کتبے اور سکے زندہ تاریخ ہیں اور کتابوں سے زیادہ یہ حقیقت کی نشاندہی کرتے ہیں اور اپنی زبان سے بولتے ہیں۔ کتابوں کے مطالعے سے ایسا صحیح نقشہ آنکھوں کے سامنے نہیں آتا جیسے تاریخی مقامات کے مشاہدے سے آتا ہے، دہلی کے کھنڈروں سے ہندوستان کی جو تاریخ آنکھوں کے سامنے آتی ہے۔ وہ کتابیں پڑھنے سے نہیں آتی۔ اگر کتاب تاریخ پڑھنا ضروری ہے تو اس کے ساتھ آثار کا معاینہ بھی ضروری ہے تاکہ اپنے مشاہدے سے تاریخ کا صحیح نقشہ آنکھوں کے سامنے کھنچ جائے کچھ اسی وجہ سے زمانۂ قدیم کے کنکر پتھر جوڑے جاتے ہیں اور پرانے در و دیوار کی حفاظت کی جاتی ہے۔ اور تاریخی مقامات کی حفاظت کر کے کسی تحریر یا علامت سے اس جگہ کا خاص واقعہ ظاہر کر دیا جاتا ہے تاکہ آنے جانے والے اس کو یاد رکھیں۔ غالباً پہلی نظر میں یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ پرانی قبریں اکھاڑنے اور بوسیدہ دیوار کی حفاظت سے آخر کیا فائدہ ہے جس میں

سیکڑوں روپیہ اور دماغ صرف ہو رہے ہیں اس کا مقصد یہ ہو کہ ان ذرائع سے ماضی کو زندہ کیا جائے کہ لوگ اپنے اسلاف کے کارناموں کو نہ بھولیں اور تاریخ کو اپنی جگہ رکھ دیکھیں ؎

نام نیک رفتگاں ضائع مکن　：　تا بماند نام نیکت برقرار

یہی تمام تاریخ کا نچوڑ ہے اور جو لکڑ پتھر جمع کر کے اور آثار قدیمہ کو روشنی میں لا کر پچھلی تاریخ یاد دلاتے ہیں وہ بنی نوع انسان کے بڑے محسن ہیں۔ بعض قومیں قدیم اور قرون وسطیٰ میں ایسی گذری ہیں جنہوں نے کوئی تاریخ نہیں لکھی۔ وادیٔ نیل اور فرات کی قدیم قوموں نے تمدن کی بہتری خدمت کی لیکن ان کی لکھی ہوئی کوئی تاریخ دستیاب نہیں ہوئی ابھی وادیٔ سندھ کی کھدائیوں سے معلوم ہوا ہے کہ ہندوستان کی دراوڑی قومیں بہت بڑے تمدن کی حامل تھیں کیونکہ ان کے بنائے ہوئے دو بڑے شہر ہڑپا اور موہنجو دارو زمین سے نکل آئے جن میں تمدن کے بے شمار نقوش پائے جاتے ہیں ظاہر ہے ان قوموں کی تاریخ کے لئے انہیں آثار قدیمہ پر انحصار کرنا پڑتا ہے اور انہیں سے نتایج اخذ کرنے پڑتے ہیں۔ کیونکہ ان کی لکھی ہوئی کوئی تاریخ نہیں ہے بعض موقعوں پر جب تاریخی مقامات بالکل برباد ہو جائیں تو عجائب خانوں سے یہ ضرورت پوری کی جا سکتی ہے ان میں جگہ جگہ تاریخی نوادر جو اپنی جگہ صحیح سالم نہیں رہ سکتے عجائب خانوں میں جمع کر دیے جاتے ہیں تاکہ تاریخ جاننے والے ان کو دیکھ کر پرانے زمانے کی یاد تازہ کریں اور حقیقت یہ ہے کہ یہ ذرائع کتب تاریخ سے زیادہ اہمیت رکھتے ہیں۔

جس طرح اخلاقیات میں یہ بات دہرائی جاتی ہے کہ نیکی اور خیرات پہلے اپنے گھر سے شروع ہوتی ہے اسی طرح تاریخ کے متعلق بھی یہ مسلمہ بات ہے کہ یہ بھی اپنے گھر سے شروع ہونی چاہیئے اس کا مطلب یہ ہے کہ تاریخ پڑھنے والے پہلے اپنے ملک کی تاریخ پڑھیں جو خود ان کی آپ بیتی ہے اور اس کے بعد پھر دوسری قوموں کی داستان پڑھنے کی جرأت کریں کیونکہ پہلی بات یہ ہے کہ تاریخ کا مفہوم اس وقت ذہن میں آتا ہے جب اہلِ تاریخ کی صحیح ذہنیت بھی ہمیں معلوم ہو جائے ورنہ بغیر اہلِ تاریخ کی ذہنیت سے واقف ہوئے اصل حقیقت کا پتہ چلنا مشکل ہے اور اس طرح یہ ایک محض . . . . اور خشک حقیقت ہو کر رہ جائے گی۔ اور سچ تو یہ ہے کہ جس طرح ہم اپنے اسلاف کی صحیح ذہنیت کا اندازہ لگا سکتے ہیں دوسرے نہیں لگا سکتے کیونکہ تقریباً وہی ذہنیت اور جذبات ہم میں بھی متوارث ہیں جو ہمارے اسلاف میں بھی تھے۔ اور اگر سیاسی اور معاشرتی ماحول کو دیکھو تو تقریباً وہی ماحول بعض تغیرات کے ساتھ ہمارے ساتھ رہتا ہے اس لئے ایک ملک کے رہنے والوں کے لئے اپنے ملک کی تاریخ سمجھنا کچھ دشوار نہیں ہے بلکہ یہ ان کے لئے روزمرہ کی چیز ہے۔ جب ہمارے دماغ خود اپنی تاریخ کے عادی ہو جائیں تو اس کے بعد ہی اپنے ہمسایوں کی تاریخ اور اس کے بعد دوسرے ممالک کی تاریخ پڑھنی چاہیئے اور اسی روشنی میں اس کا مطالعہ کرنا چاہیئے جس طرح ہم خود اپنی تاریخ پڑھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ خود اپنے ملک کی تاریخ پڑھنا ہمارا سب سے پہلا فرض ہے ہیوم نے کہا تھا کہ اپنے ملک کی تاریخ جاننا ہر ذی کا پہلا فرض ہے اور ایک بڑی حقیقت ہے جو شہری اپنے ملک کی تاریخ نہیں جانتا وہ شہری اوصاف سے خالی ہے اور ملک پر اس کا کوئی حق نہیں ہے کیونکہ بغیر تاریخ کے اس کا اپنے ملک سے گہرا ربط نہیں پیدا ہو سکتا اور اس میں جذبۂ وطنیت جو قوموں کی ترقی کا راز ہے وہ نہیں پیدا ہو سکتا۔ افراد اور قومیں محض اپنی تاریخ کے زور سے آگے بڑھتی ہیں کیونکہ وہ اسی کی روشنی میں مستقبل کا پتہ لگاتی ہیں جو لوگ اپنے ملک کو چھوڑ کر دوسروں کی تاریخ پڑھتے ہیں وہ گم کردہ راہ سے زیادہ نہیں ہیں اور غالباً وہ عملی زندگی میں صحیح راستے پر نہ پہنچ سکے۔

عبد المجید صدیقی

فرانسیسی جمہوریت کا زوال

اتفاقِ زمانہ ہے کہ جہاں فرانس کی تیسری جمہوریت ایک بڑی بھاری شکست کے بعد ایک فرانسیسی سپہ سالار کے ہاتھوں قائم ہوئی تھی وہاں اب اس سے بھی زیادہ تباہ کن فوجی شکست کے بعد وہ ایک دوسرے فرانسیسی سپہ سالار کے ہاتھوں ختم ہوئی۔

فرانس کی جمہوری روایات نپولین اعظم کی عطا کی ہوئی مرکزیت اور اس کے وضع کردہ قوانین کے ساتھ عودِ شاہی کی شاہ پرستی اور شہنشاہی کے بونا پارٹی رجحانات کے باوجود بھی زندہ رہیں چنانچہ آزادی مساوات اور اخوت کے اصول فرانسیسیوں کے نزدیک محض سیاسی تصورات ہی نہیں بلکہ سیاسی زندگی خود تیسری جمہوریت کے دستور میں اس کے زوال کے اسباب موجود تھے۔ فرانسیسیوں میں کبھی تنظیم کا مادہ نہیں رہا۔ ان کی ذہنیت ہمیشہ عقلی استدلال اور منطقی موشگافیوں کے لئے ممتاز رہی جو سیاسی زندگی میں سمجھوتے نہیں پیدا کر سکتیں یہی ذہنیت وہاں کی بے شمار سیاسی جماعتوں میں بھی کارفرما رہی۔ ان میں سے کئی جماعتیں چند تفصیلات کی نسبت اختلافِ رائے رکھنے کے باوجود ایک مشترک نظامِ عمل رکھتی تھیں لیکن فردی مسائل کو سامنے رکھتے ہوئے اور مشترک مقاصد کو پسِ پشت ڈال کر ہر جماعت اپنی شانِ انفرادیت برقرار رکھنے کی خواہشمند تھی۔ بالغرض اگر ملک کے لیڈر مثلاً دارالوکلاء کے ارکان اور صوبہ واری اداروں کے مقامی ارکان وہ اوصاف بھی رکھتے جو کسی جمہور کے نمائندوں کے اوصاف ہونے چاہئیں؛

تب بھی یہ امر مسلم ہے کہ سیاسی جماعتوں کی بے دریغ کثرت خود جمہوریت کے نظام کو کمزور کر رہی تھی اور خصوصاً جنگِ عظیم کے بعد جو فرانس کی تاریخ کا اہم ترین دور تھا ان متعدد اور مختلف جماعتوں نے وزراء اور حکومتوں کی دم بدم تبدیلی کا ایک عجیب و غریب منظر پیش کیا تھا پیرس جو غالباً دنیا کا سب سے بڑا علمی مرکز ہے وزراء اور حکومتوں کی اس مسلسل آمد و رفت پر لوگ مضحکہ اڑاتے تھے اور خود وزراء جو ایک ماہ کی مدتِ وزارت کے بعد بھی وظیفے کے مستحق ہو جاتے تھے ایک ایسے فرسودہ نظامِ حکومت کے اجزاء سمجھے جانے لگے جس کی زندگی ختم ہو چکی تھی۔ ادھر عوام کے نمایندے عہدوں پر اپنے اپنے عزیزوں کو جمانے اور رشوت لینے میں مصروف تھے ملک کی سرکاری ملازمت جو نپولین کے عہد کی شاندار یادگار تھی اور جو تدبیرِ مملکت اور ملکی نظم و نسق میں وزارتی تغیرات کے باوجود ایک حد تک تسلسل قائم رکھتی تھی باغرض لیڈروں اور ایسے وزراء کی باہمی کھینچ تان کا شکار بن رہی تھی جو اپنی وزارتوں کے دن گنتے تھے۔

پھر ایسی جماعتیں اور انجمنیں بھی موجود تھیں جو خود جمہوری روایات کی سخت ترین مخالف تھیں۔ دستورِ ملک کی خامیوں اور نقائص سے فائدہ اٹھا کر یہ جماعتیں اور انجمنیں روز بروز قوت پکڑ رہی تھیں۔ مثلاً اشتراکیوں کی جماعت نے ہڑتالیں برپا کر رکھی تھیں اور اسلحہ کے کارخانوں سے لے کر ہوٹلوں تک مزدور اور ملازمین اسی جماعت کے قابو میں تھے اس جماعت کی ساری کوشش یہ تھی کہ ملک کے اس دستور کی بیخ کنی کرے جو متوسط طبقے کے اغراض کے لئے قایم کیا گیا علاوہ دوسری طرف کرنل ڈی لاراک کی سرکردگی میں رضاکاروں کی ایک جماعت کام کر رہی تھی جو

بڑی حد تک فاسٹی خیالات رکھتی تھی۔ اس کا مقصد صرف یہی نہیں تھا کہ اشتراکیوں کی سرگرمیوں کا توڑ کرے بلکہ وہ ساتھ ساتھ ملک کے جمہوری نظام حکومت پر بھی ضرب لگانا چاہتی تھی۔ ان کے علاوہ موسیو لاوال جیسے چالاک لیڈر بھی تھے جن کی چالاکی کے ثبوت میں فرانسیسی مذاق میں کہتے تھے کہ اپنا نام تک ایسا رکھا کہ اس کا الٹا تلفظ کیا جا سکتا تھا یعنی ل اوال یہ لیڈر جمہوریت کے خلاف رجحانات رکھتے تھے اور جرمنی اور اطالیہ سے اتحاد کے معتقد تھے۔

مسٹر ہیبوسلین نے جو پیرس کے برٹش انسٹیٹیوٹ میں سر تھیوڈور ماریسن کے جانشین مقرر ہوئے حال ہی میں لکھا ہے کہ فرانس نے صرف دماغی تدابیر پر اکتفا کیا اور انہیں ایسے بوڑھے فوجیوں کے سپرد کیا تھا جو ان تبدیلیوں کو سمجھ نہیں سکتے تھے جو سائنس نے فن جنگ میں پیدا کر دی تھیں۔ اس کے برعکس جرمنی نے ۱۹۱۸ء کی شکست کے بعد اور درحقیقت اسی شکست کی وجہ سے اپنے قدیم فوجی نظام کو برخاست کر دیا تھا۔ فرانس میں فن جنگ کے تاریخی اصول یعنی قومی بھرتی اور کثرت تعداد پر زور دیا جاتا رہا۔ گو اس اعتبار سے بھی جرمنی کی آبادی فرانس سے تقریباً دوگنی تھی لیکن یہ خیال جا رہا کہ جلد ایسے اشخاص کی بھرتی سے جو پچاس برس کی عمر سے کم ہوں یعنی ایک مسلح قوم سے فرانس کی خاطر خواہ مدافعت کی جا سکے گی۔ برخلاف اس کے جرمنی نے اس انقلاب کو اچھی طرح سمجھ لیا جو نئی ایجادات کی وجہ سے فن جنگ میں رونما ہو رہا تھا۔ چنانچہ جرمنی کی نئی فوجی تنظیم کی بنیاد تعداد کے اصول پر قائم نہیں کی گئی تھی بلکہ اسی اصول پر کہ یہ ایک اعلیٰ تربیت یافتہ امدادیشنوں کی قوت سے مسلح فوج سے زیادہ موثر ثابت

ہو سکتی ہے۔ ہوائی جنگ کی اہمیت کو دونوں فریق اچھی طرح سمجھتے تھے لیکن اس کی حد تک بھی جرمنی اپنی بہتر تنظیم اپنے قوی تر نظام اور اپنے ان سارے انتظامات کی وجہ سے جو آنے والی جنگ کی تیاری کے لئے ایک زمانے سے عمل میں آ رہے تھے فرانس سے بہت آگے بڑھ گیا تھا۔ جمہوریت بالعموم مشکل سے کسی کثیر صرفہ کو منظور کرتی ہے اور فرانس نے اگرچہ مشیر نیولائن کی قلعہ بندیوں کی تعمیر کے لئے کافی روپیہ صرف کیا تھا لیکن اس سے زیادہ فوجی مصارف کے لئے وہاں کوئی تیار نہ تھا۔

جب جرمنی نے آسٹریا پر اچانک قبضہ کر لیا تو ساری قوم کی آنکھیں کھل گئیں اور عام طور پر خطرے کا احساس پیدا ہو گیا۔ لیکن جہاں اس نوبت پر بھی جنگی تیاریوں کے لئے انگلستان میں بعض سہولتیں موجود تھیں وہاں وہ فرانس کو نصیب نہ ہوئیں۔ انگلستان کے دستور میں استحکام تھا اکیس میل کا سمندری فاصلہ انگلستان کو براعظم یورپ سے جدا کرتا تھا اس کی محافظت کے لئے دنیا کا سب سے بڑا بحری بیڑہ موجود تھا اور اس کی ساری تنظیم وسیع صنعتی بنیادوں پر قائم تھی۔ برعکس اس کے فرانس کا دستور متزلزل تھا یہاں تک کہ جس وقت آسٹریا پر جرمنوں کا قبضہ ہوا اس وقت فرانس میں کوئی وزارت برسر اقتدار نہ تھی۔ پھر پریذیڈنٹ ولسن کی وجہ سے سپہ سالار فوش اور وزیر اعظم کلمنو کی وہ تمام کوششیں ۱۹۱۹ء ہی میں ناکام ہو چکی تھیں جن کی غرض یہ تھی کہ فرانس کے حدود رائن تک بڑھ جائیں تاکہ وہ وسیع دریا جرمنی اور فرانس کے درمیان پانی کا فاصلہ پیدا کر دے۔

پھر اطالوی بیڑہ جس کو میسولینی جلد جلد تیار

کر رہا تھا، بحر روم میں فرانس کے بیڑے کے مدِمقابل بنتا جا رہا تھا۔ اور ان سب کے علاوہ برخلاف انگلستان کے فرانس ایک زراعت پیشہ ملک تھا جب بالآخر آسٹریا کے واقعہ نے فرانسیسیوں کو فوجی تیاریوں پر آمادہ کر دیا تو واقعات کی رفتار اتنی تیز ہو چکی تھی کہ ان تیاریوں کا وقت بھی نہیں ملا اندرونی انتشار بھی انتہا کو پہنچ چکا تھا اس سے قبل ہی اشتراکیوں کی مدد سے عام محاذ حالات کی اصلاح کی غرض سے قائم کیا گیا تھا تو اس کی وزارت نے الٹے فرانس کو اور بھی تباہ کیا۔ عہدہ چھوڑنے سے پہلے اس وزارت نے فرانسیسی مزدوروں کے اس مطالبے کو مان لیا تھا کہ ہفتہ میں صرف چالیس گھنٹے کام لیا جائے اور اس طرح فرانسیسی صنعت اور خصوصاً جنگی صنعتیں تجارت اور جنگی تیاریوں کے لئے بیکار ہو گئیں۔

ایک اہم واقعہ یہ بھی ہے کہ عام طور پر ملک جنگ سے بیزار تھا لیکن فرانس نے اپنے بے شمار حلیفوں کی امداد کا بھی ذمہ لے رکھا تھا۔ مشرقی یورپ کے ان دوستوں کی اعانت کا بار بھی اس پر تھا اس لئے کہ جرمنی کو گھیرے رکھنے کی غرض سے اس نے ان کے ساتھ اتحاد کر لیا تھا۔ اس طرح پولینڈ اور چیکوسلواکیہ کی دفاعی امداد بھی فرانس کے ذمہ تھی لیکن اس کے پیرانہ سال فوجی عہدہ داروں نے صرف دماغی تدابیر اختیار کر لے کے علاوہ اور کوئی تیاری نہیں کی تھی اور عام طور پر خود فرانسیسی بھی ان معاہدات کو محض تاریخی دستاویزات سمجھنے لگے تھے۔ جب چیکوسلواکیہ کا مسئلہ چھڑا تو انگریزوں نے اس قیاس پر عمل کیا کہ فرانس ضرور چیکوسلواکیہ کے لئے لڑے گا۔ خود انگلستان پر اس کے علاوہ اور کوئی ذمہ داری نہیں تھی کہ فرانس پر حملہ کی صورت میں وہ اس کی مدد کرے۔ لیکن جب چیکوسلواکیہ کے

معاملے نے انتہائی نازک صورت اختیار کر لی تو یہ پتہ چلا کہ فرانس چیکوسلواکیہ کی خاطر جرمنی سے لڑنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا۔ معاہدہ میونخ کا اصل مقصد اس اچانک انکشاف کا مقابلہ کرنا اور فرانس کو ایک بڑی ذلت سے بچانا تھا۔ واقف کار حلقوں کا بیان تھا کہ اہلِ فرانس چیکوسلواکیہ کی خاطر جرمنی سے لڑائی مول لینے کو حد درجہ خطرناک سمجھتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ فرانس کو اپنے ملک کی مدافعت میں تو ضرور لڑنا چاہئے لیکن اور کسی صورت میں لڑائی کا قدم نہ اٹھانا چاہیے۔ پولینڈ کے معاملے میں بھی فرانسیسیوں کی عام رائے یہی تھی خود فرانسیسی کابینہ کے اندر اختلافات تھے ایک مشہور فرانسیسی اخبار نویس نے اپنے دوستوں سے بیان کیا کہ اگر موسیو دلادیر کوئی ایسی تجویز پیش کریں جس سے فرانس کے مبتلائے جنگ ہونے کا اندیشہ ہو تو بڑے بڑے بااثر حلقے ان کی مخالفت کریں گے ایک فرانسیسی مدبر نے اپنی گفتگو میں صاف صاف کہا کہ فرانس کسی حالت میں حملے کے لئے تیار نہیں ہے بلکہ اپنی مدافعت بھی ٹیڑھی کھیر ہو گی۔ آخر میں دو مکتبِ خیال غالب رہے ایک کہتا تھا کہ پولینڈ سے جو معاہدے کئے گئے تھے ان کو موثر طور سے پورا کیا جا سکتا ہے اور دوسرے گروہ کا خیال تھا کہ ایفاءِ عہد پر بظاہر آمادگی ہی ہٹلر کے حوصلوں کو پست کر دے گی اور وہ جنگ سے گریز کر جائیں گے۔ وزیرِ اعظم موسیو دلادیر اس دوسرے مکتبِ خیال کے تھے بنا بریں اخباروں اور سیاست دانوں پر اور خصوصاً انگلستان کے اربابِ حل و عقد پر ہر طرح کا اثر ڈالا گیا لیکن عوام کے لیڈروں میں سے جن کا کہنا موثر ہو سکتا تھا کسی نے بھی آواز بلند نہ کی اس طرح جنگ پر آمادگی کے اظہار سے ... ممکن ہے کام چل جاتا اگر برلن میں اس کی حقیقت کا علم

نہ ہوتا لیکن ہر شخص جیسے پیرس کے حلقوں میں ذرا بھی رسوخ رکھتا تھا حقیقتِ حال کو اچھی طرح جان سکتا تھا۔ اکثر لوگ اس رائے کے تذکرے کیا کرتے تھے جو اس بارے میں وزیر اعظم نے اپنے حلقوں میں ظاہر کی تھی۔ چنانچہ جرمنی کو بھی اس کا پورا علم ہو گیا اس لئے یہ کوئی تعجب کی بات نہ تھی کہ ہٹلر نے اپنے مطالبات اور بھی سخت کر دئے اور ان پر بے باکی سے اصرار کرنا شروع کیا۔ جائے حیرت ہے کہ اس کے باوجود فرانس کے سفیر مقیم برلن نے ۳۱ راگست ۱۹۳۹ء کو جب کہ جنگ سر پر آ چکی تھی وزیر اعظم دلادیر کو لکھا کہ اگر فرانس اسی طرح مستقل مزاجی کا ثبوت دیتے رہے تو جرمنی کے قدم رک جائیں گے اس لئے کہ ہٹلر محض دھمکیاں دے رہا ہے واقعہ یہ تھا کہ ہٹلر اچھی طرح جانتا تھا کہ خود فرانس محض دھمکیوں سے اسے مرعوب کرنا چاہتا ہے۔ اگر فرانس ایک اعلیٰ درجہ کا منظم ملک بھی ہوتا اور فرانس قوم کامل طور سے متحد بھی ہوتی تو وہ غالبًا اس بے پناہ سیلاب کا مقابلہ نہ کر سکتی جو گزشتہ مئی کے مہینے میں فرانس کو بہا لے گیا۔ تنظیم و اتحاد شاید مدافعت کے سلسلے کو چند روز اور قائم رکھتا لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس وقت کی حالت کا لحاظ کرتے ہوئے فرانسیسی فوج کی تعریف کرنی پڑتی ہے کہ بلجیم پر حملہ کرنے کے بعد جرمنی کو پیرس پر قبضہ کرنے کے لئے ایک ماہ کی مدت درکار ہوئی۔

فرانس پر جرمنی کا حملہ ایک فوجی ہی نہ تھا بلکہ اس نے لوگوں کے خیالات اور رائے عامہ پر بھی قبضہ کرنے کی کوشش کی۔ جرمنوں کے پروپگنڈے نے نہ صرف جنگ سے عام بیزاری کے رجحان کو تقویت دی بلکہ ہر اس تحریک کو قوت پہنچانے کی کوشش کی جو ملک میں انتشار پیدا کر سکتی تھی۔ اشتراکی جماعت کے ارکان اور بڑی بڑی صنعتوں کے مزدور ہڑتالیں کرنے اور صنعت و تجارت کے کام میں رکاوٹیں پیدا کرنے کے لئے بظاہر فرانسیسوں ہی کے ہاتھوں جرمنی کا روپیہ کھا رہے تھے۔ رضاکاروں کی تنظیم کو بھی اسی طرح امداد دی جا رہی تھی۔ یہ پروپگنڈا ایک دو دن کا نہ تھا لیکن امریکہ کے برخلاف جہاں اس کی روک تھام کے لئے تحقیقات کی جا رہی ہے فرانس کی کسی حکومت نے اسے روکنے کی کوئی تدبیر اختیار نہیں کی چنانچہ اسی پروپگنڈے کا اثر تھا کہ ابھی جنگ شروع ہوئی تھی کہ بعض جماعتوں کی جانب سے علٰحدہ صلح کر لینے کا مطالبہ کیا جانے لگا۔ فرانسیسی فوج کے ارباب اقتدار نے بھی اپنی غلطیوں اور فروگزاشتوں سے شکست کے اسباب مہیا کر دیے تھے موسیو ... نے فوج کو جدید ایجادات اور انجنوں سے مسلح کرنے کے لئے کئی سال ہوئے بہت ہاتھ پیر مارے لیکن سپہ سالاروں کے جمود نے ان کی ایک نہ چلنے دی۔ جنرل ڈی گال نے بھی بہت کہا کہ فرانس اور بلجیم کی درمیانی سرحد تک میجنو لائن کی قلعہ بندیوں کی توسیع کی جائے لیکن ان کی آواز بھی بے اثر رہی، حالانکہ اگر اس مشورہ پر عمل کیا جاتا تو غالبًا جرمن فوجیں اس آسانی سے فرانس کے اندر نہ آ سکتیں۔ پھر لڑائی کے پہلے چند مہینوں کو یوں ہی ضائع جانے دیا گیا۔ یہاں تک کہ فرانسیسی سپاہی میجنو لائن میں بیٹھے بیٹھے بیکار ہی تھک گئے ادھر جرمنی نہ صرف اپنی زیگفریڈ لائن کی قلعہ بندیوں سے فوجی صورت حال کا مطالعہ بلکہ اپنے مال غنیمت کا امتحان بھی کر رہا تھا چنانچہ جنگ کے اس ابتدائی زمانے میں جب چند فرانسیسی ٹینک اس کے ہاتھ لگے تو اس نے فورًا اسی قسم کے ٹینک چکوسلواکیہ کے اسکوڈا کی گرنیوں میں جو حال ہی میں جرمنی کے قبضے میں آئی تھیں بنوا لئے۔ اسی طرح جب بلجیم

کی راہ سے جرمن فوجیں فرانس میں گھس پڑیں تو فرانسیسیوں کو اپنے
ہی بہترین ہتیار کا مقابلہ کرنا پڑا۔

اس فوجی نااہلی اور روس کے مابین جو اتحاد جرمنی کو شرق
اور مغرب دونوں جانب سے روکے ہوئے تھا اسی نااہلی کی وجہ سے
ضائع ہوا اور جرمنی ایک مخالف ملک کو غیر جانب دار بنانے اور
اس طرح اپنی مشرقی سرحد سے خطرے کو مٹانے میں کامیاب رہا۔
اِدھر فرانس کو نہ صرف جرمنی بلکہ اطالیہ کی طرف سے بھی خوف
لگا ہوا تھا جس کی وجہ سے اس کو سمندری ایلپس کی طرف بھی
فوجیں متعین کرنا پڑیں۔ پیرس پر قبضے کے بعد اطالیہ کی شرکت جنگ
نے نازک صورتِ حال کو نازک تر بنا دیا لیکن فرانس اس سے
پہلے ہی جنگ ہار چکا تھا یعنی جب لیوپولڈ بادشاہ بلجیم نے اپنے
متحدین کا ساتھ دفعتاً چھوڑ دیا اور فرانسیسی کمانڈر دریائے سوم
کے پل توڑنا بھول گئے اور سچ پوچھئے تو پہلے ہی سے فرانسیسیوں نے
اپنے باہمی اختلافات اور بد نظمی سے اس قسمت آزمائی کا فیصلہ
جرمنی کے موافق کر دیا تھا۔ جرمن مطالبات کی تکمیل کے متعلق
موسیو لاوال کے خیالات کچھ ہی ہوں اور ہم کو یہ معلوم ہے
کہ موسیو لاوال کی رائے ہمیشہ سے یہ رہی ہے کہ شام کے علاقے
کو اپنے قبضے میں رکھنے سے فرانس کو نقصان ہی نقصان ہے۔
لیکن یہ یقین نہیں آتا کہ پچھلی جنگ عظیم میں وردون کا فاتح یعنی
مارشل پتیان فرانس یا اس کے قلمرو کی غلامی پر کبھی راضی
ہوگا۔ ممکن ہے کہ اب فرانس کا شمار دنیا کی طاقتور قوتوں میں
نہ ہو سکے لیکن اب بھی اگر جرمنی اسے ناقابلِ قبول مطالبات
پیش کرے تو فرانسیسی ہر ہٹلر کے پہلو میں خار بن کر اب بھی اسے
اذیت دے سکتے ہیں۔ مارشل پتیان سے کسی کو اس بنا پر
شکایت نہیں ہے کہ اس نے جرمنی اور اطالیہ کے ساتھ کیوں
عارضی صلح کر لی خاص کر جب کہ غالباً فرانس کی رائے عامہ خود ایسی
صلح کی خواہشمند تھی لیکن یہ شکایت ضرور ہے کہ جہاں فرانس کے
حلیف نے علٰحدہ صلح کی اجازت دینے اور اتحاد کی پابندیوں سے
بری الذمہ کرنے کے لئے یہ شرط عاید کی تھی کہ عارضی صلح کی گفت و
شنید کے دوران میں فرانسیسی بحری بیڑا برطانوی بندرگاہ پر
پہنچا دیا جائے تو اس نے اس ضروری شرط پر عمل نہیں کیا۔ جرمنی
کی بدعہدی خود اس بات کی ضامن تھی کہ عارضی صلح کے
شرائط میں اس ظاہری شرط کے باوجود کہ وہ فرانس کا بحری بیڑا
اپنے اغراض کے لئے استعمال نہ کرے گا وہ کسی نہ کسی وقت
فرانس کے بحری بیڑے کو انگلستان کے خلاف جنگ میں حصہ
لینے پر مجبور کرے گا۔ اور اگر اس بیڑے کو دشمن کے لئے
بیکار کر دینے کی غرض سے وہ کارروائی نہ کی جاتی جو بعد میں کی
گئی تو یقین ہے کہ اس کا وجود انگلستان ہی نہیں بلکہ ساری
برطانوی شہنشاہی کے لئے خطرۂ عظیم بن جاتا۔ یورپ کے نئے
سیاسی نظام میں اس وقت عارضی طور سے فرانس کو خواہ کوئی
جگہ ملے لیکن اس میں شک نہیں کہ ہر فرانسیسی قلب شکست کی ذلت کو محسوس
کر رہا ہوگا۔ فرانس کے ایک بڑے حصے پر اس کے قدیم دشمن کا قبضہ، اس کی حکومت
کا حاکم جرمنی کے اشارے پر مجبوراً یہی کام کرنا اور جمہوری نظام حکومت کی جگہ
ایک فاسٹی طرز حکومت کا قیام یہ باتیں ایسی نہیں ہیں جس سے فرانسیسی جذبات کو صدمہ نہ پہنچے
اپنی حالیہ ملاقاتوں میں ہر ہٹلر مارشل پتیان سے وہ سب کچھ نہ حاصل کر سکے جو وہ حاصل
کرنا چاہتے تھے اور وہ اس حقیقت کا مزید ثبوت ہے کہ فرانس کا قومی ضمیر اب تک
زندہ اور برطانوی کامیابی کا منتظر ہے کیونکہ اس کامیابی میں اسے خود اپنے ملک
کی نجات اور اپنی گم شدہ آزادی کی بازیافت کی واحد امید نظر آتی ہے۔

علی یاور جنگ

معاشیات

معاشیات کے مطالعہ کا مقصد دنیا میں جس قدر علوم موجود ہیں علاوہ ازیں کہ وہ انسان کی تمدنی زندگی سے متعلق ہوں یا کائنات کی دوسری بے شمار اشیاء سے ان کا تعلق ہو ان میں سے ہر ایک کا کچھ نہ کچھ عملی فائدہ ضرور موجود ہے۔ بعض مثلاً کیمیا، طبعیات، ریاضی، حیاتیات کے عملی فوائد تو بالکل بدیہی ہیں۔ مغربی طب کی موجودہ حیرت ناک ترقی کا مدار بہت کچھ کیمیا اور حیاتیات ہی پر ہے۔ انجنیری کے فن میں دنیا نے جو عجیب و غریب ترقی کی ہے وہ علم ریاضی کے بغیر محال تھی۔ ٹیلیفون، ریڈیو اور برقی قوت کی گوناگوں کرشمہ سازیاں ہمیں علم طبعیات ہی کی بدولت نظر آتی ہیں۔ غرض صنعت و حرفت زراعت و تجارت، ذرائع حمل و نقل، ان تمام شعبوں میں آج کل بمقابل سابقہ زمانوں کے جو غیر معمولی چہل پہل نظر آتی ہے وہ سب انسانی معلومات کے اس غیر محدود اور روز افزوں ذخیرے کا نتیجہ ہے جو مختلف علوم کی شکل میں ملبند کر لیا گیا ہے۔ اس کے برعکس بعض دوسرے علوم مثلاً تاریخ، قانون، سیاسیات، اخلاقیات اور معاشیات کے فوائد اس قدر بدیہی نہیں ہیں۔ لیکن وہ بھی بلحاظ اہمیت کے اول الذکر علوم کے فوائد سے کسی طرح کم نہیں ہیں۔ گزشتہ نسلوں کے تجربات سے فائدہ اٹھانا، انسانی جماعتوں کی زندگی کو پر امن بنانا، حفاظت حقوق کا انتظام کرنا، بہتر سے بہتر اخلاقی معیار قائم کرنے کی کوشش کرنا یہ سب انہی علوم عمرانی کی بدولت ممکن ہو سکتا ہے۔ لیکن قبل اس کے کہ انسان دنیا میں کسی قسم کی مادی یا غیر مادی ترقی کر سکیں ضروری ہے کہ وہ اپنے لئے وسائل معاش کا کوئی معقول انتظام کریں۔ ظاہر ہے کہ جب تک کھانے کے لئے غذا، پہننے کے لئے کپڑا اور رہنے کے لئے مکان نصیب نہ ہو انسان کو کسی قسم کی ترقی کا موقع نہیں مل سکتا لہٰذا انسان کے تمام مشاغل سے مقدم اس کی وہ جد و جہد ہے جو اپنی احتیاجات رفع کرنے کی خاطر کرتا ہے معاشیات کو انسانی جماعتوں کی زندگی کے اسی اہم پہلو سے سروکار ہے۔ معاشیات کے نزدیک ہر شخص گویا اسی فکر میں لگا ہوا ہے کہ اپنی کثیر سے کثیر احتیاجات کو بہتر سے بہتر طریقے پر پورا کرنے کے ذرائع مہیا کرے۔ پس انسانی جماعتوں کی مادی زندگی کو زیادہ خوش حال بنانا ہی معاشیات کے مطالعہ کی اصلی غرض و غایت ہے۔

معاشیات کے اہم شعبے معاشیات کے اس مقصد کی تکمیل کے لئے سب سے پہلے دولت کی ضرورت ہے کیونکہ دولت ہی سے انسان کی ہر احتیاج پوری ہوتی ہے۔ کسی قوم میں دولت کی جس قدر بہتات ہوگی اسی قدر افراد قوم آرام کی زندگی بسر کر سکیں گے۔ اور اسی مناسبت سے ملک میں دوسری ترقیوں کا امکان پیدا ہوتا جائے گا۔ اس کے برعکس جس قوم کو افلاس میں زندگی بسر کرنا پڑتی ہے اس کے افراد کے لئے ترقی کی تمام راہیں بند رہتی ہیں اور ان کی ساری عمر ایک ادنیٰ درجے کی زندگی کے ذرائع مہیا کرنے میں گزر جاتی ہے۔ پس دولت معاشیات کے تمام مباحث کا مرکز ہے اور اس علم کے اہم شعبوں کی تقسیم بھی دولت ہی کے عنوان کو پیش نظر رکھ کر کی جاتی ہے۔ چنانچہ اس کے مباحث کو بالعموم چار اہم شعبوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ ایک پیدائش دولت دوسرے تقسیم دولت تیسرے مبادلۂ دولت اور چوتھے صرف دولت۔

پیدائش دولت آغاز آفرینش سے اب تک اور خاص کر گزشتہ ڈیڑھ سو سال کے اندر انسان نے جو غیر معمولی ترقی کی

وہ ظاہر ہے۔سرزمین، سمندر، ہوا اور قدرت کے دوسرے مظاہر پر اس کا تصرف روز بروز بڑھ رہا ہے۔ بجلی کی طاقت سے آج عجیب وغریب کام لئے جارہے ہیں۔ غرض اپنی آسایش کے اسباب مہیا کرنے میں انسان نے جو حیرت انگیز ترقی کی ہے اس پر وہ بجا طور پر فخر کرسکتا ہے۔ لیکن باوجود ان تمام کارناموں کے اگر ذرا غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ قدرت کے اس عظیم الشان تماشا گاہ میں انسان کی حیثیت ایک معمولی تماشائی سے زیادہ نہیں ہے۔ انسان کی کارگذاری صرف اس بات تک محدود ہے کہ وہ قدرت کی عطا کی ہوئی چیزوں میں طرح طرح سے تغیر کرتا اور انہیں اپنے منشار کے مطابق بنالیتا ہے تاکہ ان سے اپنی قسم قسم کی احتیاجات پوری کرے۔ انسان دنیا میں جتنی چیزیں پیدا کرتا ہے اگر ان میں سے ہر ایک کی ماہیت پر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ درحقیقت وہ کوئی نئی چیز نہیں پیدا کرتا بلکہ جو اشیا پہلے سے موجود ہیں ان کی شکل ان کی ترکیب یا ان کا مقام بدل کر ان میں رفع احتیاجات کی صلاحیت پیدا کردیتا ہے۔ زراعت، صنعت، تجارت ہر ایک کی جدوجہد کا نتیجہ بس اسی قدر ہے کہ قدرت کے عطیات میں نئے نئے افادے پیدا کئے جاتے ہیں جن سے انسان کی مختلف احتیاجات کما حقہ پوری ہوسکیں۔ کسی چیز کو نیست سے ہست کرنا یا بالفاظِ دیگر کوئی نیا مادہ پیدا کرنا انسان کی طاقت سے باہر ہے۔ اسی بنا پر یہ کہا جاتا ہے کہ پیدایشِ دولت سے مراد تخلیقِ مادہ نہیں بلکہ تخلیقِ افادہ ہے۔ زراعت صنعت وحرفت اور تجارت ہر ایک میں شب وروز سیسوں مثالیں ہماری نظروں سے گذرتی ہیں جن سے اس قول کی پوری پوری تصدیق ہوتی ہے۔

تقسیم دولت یہ تو ظاہر ہے کہ جب تک دولت پیدا نہ ہو انسانوں کی احتیاجات پوری نہیں ہوسکتیں لیکن ساتھ ہی پیدا کی ہوئی دولت سے کما حقہ فائدہ حاصل نہیں ہوسکتا جب تک کہ وہ پیدا کرنے والوں میں ٹھیک طور پر تقسیم نہ ہو۔ چنانچہ اگرچہ چند ملکوں میں پیدایشِ دولت کی کمی سے سخت افلاس پھیلا ہوا ہے تو بعض دوسرے ملکوں میں تقسیم دولت کے نقائص بھی کچھ کم تباہی کا باعث نہیں ہیں۔ مثال کے طور پر انگلستان کو لیجئے۔ جنگ کے غیرمعمولی حالات سے قطع نظر امن کے زمانے میں انگلستان میں ہر سال جو عظیم الشان دولت پیدا ہوتی ہے، دنیا کے بہت کم ملک اس کا مقابلہ کرسکتے ہیں لیکن باوجود اس کے افلاس انگلستان سے نابید نہ ہوسکا اور اب تک اس کی بدترین مثالیں وہاں نظر آتی ہیں۔ کم وبیش یہی حال دوسرے مغربی ممالک کا ہے۔ دولت تو روز افزوں مقدار میں پیدا ہورہی ہے لیکن ناقص تقسیم کی وجہ سے اس کی بہت بڑی مقدار تو چند افراد کے ہاتھوں میں رہ جاتی ہے اور بہت تھوڑی مقدار مقابلۃً کثیر تعداد میں منقسم ہوتی ہے۔ دولتمند مزید دولتمند بنتے جاتے ہیں اور مفلسوں کو اپنے افلاس سے نجات نہیں ملنے پاتی۔ اس میں شک نہیں کہ تعلیم کی عام اشاعت اور جمہوریت کی ترقی سے سرمایہ داری کے ان رجحانات کی بہت کچھ روک تھام ہورہی ہے تاہم انگلستان وامریکہ جیسے ملکوں کی عظیم الشان دولت کا لحاظ کرتے ہوئے یہ کہا جاسکتا ہے کہ اگر دولت کی تقسیم ناقص نہ ہوتی تو وہاں افلاس کا باقی رہنا ناممکن تھا۔ تعلیم اور جمہوری خیالات کی اشاعت کا یہ اثر ہوتا ہے کہ آبادی کے جو طبقے ملک کی دولت میں اپنے واجبی حصہ سے محروم رہ جاتے ہیں ان میں اپنی غیر اطمینان بخش حالت کا احساس اور ایک طرح کی بددلی اور بے چینی ہوجاتی ہے اور جیسے جیسے یہ احساس قوی ہوتا جاتا ہے وہ اپنی حالت کی اصلاح کے لئے عملی تدبیریں اختیار کرنے لگتے ہیں۔ چنانچہ یورپ میں ایک مدت سے اشتراکیت اور اسی نوعیت کی جو مختلف تحریکیں مختلف ناموں سے نمودار ہوتی رہی ہیں وہ سب

اسی احساس کا نتیجہ ہیں۔

مبادلۂ دولت معاشیات کے تیسرے شعبہ کا نام مبادلۂ دولت ہے۔ غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ انسانی زندگی کے ابتدائی مدارج میں مبادلۂ دولت کی چنداں ضرورت نہ تھی لوگوں کا طرزِ زندگی ہی کچھ ایسا تھا کہ وہاں تبادلۂ اشیا یا خرید و فروخت کی کوئی گنجائش نہ تھی۔ انسانی جماعتیں چھوٹے چھوٹے منتشر دیہات میں زندگی بسر کرتی تھیں۔ ہر خاندان اپنے افراد کی جملہ ضروریات کا خود کفیل تھا۔ احتیاجات بالکل گنی چنی تھیں اور انھیں پورا کرنیکے ذرائع نہایت محدود تھے۔ جب ہر شخص یا ہر خاندان اپنی ضرورت کی تمام چیزیں خود ہی مہیا کر لیتا تھا تو ظاہر ہے کہ پھر چیزوں کے مبادلے کا کوئی موقع نہ تھا۔ لیکن جب انسان نے اس ابتدائی حالت سے آگے قدم بڑھایا اور بہ تدریج تقسیم عمل کا رواج شروع ہوا تو ساتھ ہی مبادلۂ دولت کا وجود میں آنا بھی لازمی تھا کیونکہ تقسیم عمل کے معنی ہی یہ ہیں کہ ہر شخص بجائے ہر کام کرنے کے صرف ایک یا چند کام اپنے ...... ذمہ لے لے مثلاً کسی گاؤں میں بجائے اس کے کہ ہر خاندان زراعت بھی کرے کپڑا بھی بُنے برتن بھی بنائے اور مکانات بھی تعمیر کرے، مناسب یہ ہے کہ کچھ لوگ کپڑا بُننے کے لئے مخصوص ہو جائیں، کچھ برتن بنانے کے لئے کچھ مکانات تعمیر کرنے کے لئے اور کچھ اس قسم کے دوسرے ضروری کاموں کے لئے لیکن اس طریقے کے مطابق جو چیزیں تیار ہوں گی اُن میں رفعِ احتیاجات کی صلاحیت اس وقت تک مکمل نہ ہوگی جب تک کہ وہ تیار کرنے والوں کے ہاتھوں سے نکل کر استعمال کرنے والوں کے ہاتھوں میں نہ پہنچ جائیں۔ اشیاء کے اس طرح ہاتھوں ہاتھ بدلنے ہی کو اصطلاح میں مبادلۂ دولت کہتے ہیں۔

اب انسان کی معلومات اور تمدن کی ترقی کے ساتھ ساتھ تقسیم عمل میں بھی برابر ترقی ہوتی گئی اور جس قدر تقسیم عمل کو ترقی ہوتی مبادلۂ دولت کے کاروبار بھی برابر پھیلتے اور پیچیدہ ہوتے گئے۔ اول اول تو لوگ اپنی اپنی چیزوں کو براہِ راست دوسروں کی چیزوں سے مبادلہ کرتے تھے چنانچہ انگریزی لفظ (بارٹر) سے اس قسم کا مبادلہ مراد ہے لیکن جب تقسیم عمل کی روز افزوں توسیع کی بدولت مختلف اشیاء کی باہمی قدر و قیمت کا اندازہ کرنا بہت دشوار ہوگیا تو مبادلے کی آسانی کے لئے ایک تیسری چیز بطور واسطے کے مستعمل ہونے لگی جسے اصطلاح میں زر کہتے ہیں زر کے استعمال کا نتیجہ یہ ہوا کہ اب کوئی چیز براہِ راست دوسری چیزوں سے نہیں بدلی جاتی بلکہ ہر چیز سب سے پہلے زر کے ساتھ بدلی جاتی ہے اور یہ زر بعد ازاں دوسری چیزوں سے بدلا جاتا ہے گویا زر کی بدولت بارٹر کا طریقہ موقوف اور مبادلہ دو جداگانہ افعال میں منقسم ہوگیا جن میں سے ایک کو خرید اور دوسرے کو فروخت کہتے ہیں۔ جب کوئی شخص اپنی چیز دوسرے کو دے کر اس سے معاوضہ میں زر لے تو اس کا یہ فعل فروخت کہلاتا ہے اور جب کوئی شخص دوسرے کو زر دے کر معاوضے میں اس کی کوئی چیز حاصل کرے تو یہ خرید ہے۔

موجودہ زمانے میں تقسیم عمل کی ترقی جس انتہائی نقطے پر پہنچ گئی ہے اس کی تفصیل کی اس وقت گنجائش نہیں ہے۔ ہاں یہ معلوم ہونا چاہیے کہ آج کل ہر ملک کی تجارت داخلہ اور دنیا کی عظیم الشان تجارت خارجہ کا سارا مدار اسی پر ہے۔ اسی ترقی کا یہ نتیجہ ہے کہ زر کی بھی وہی قدیم اور سیدھی سادی حیثیت نہیں برقرار رہی بلکہ اس میں وقتاً فوقتاً طرح طرح کی جدتیں کرنا پڑیں جن کے بغیر تقسیم عمل کی ترقی میں رکاوٹ پیدا ہونے کا اندیشہ تھا۔ زر، بنک، اعتبار اور مبادلاتِ خارجہ کے مسائل دراصل انھیں جدتوں کی تشریح ہیں۔

صرف دولت پیدائش اور تقسیم اور مبادلہ جب یہ تینوں مرحلے طے ہو جاتے ہیں تب کہیں دولت سے احتیاج رفع کرنے کی صورت نمودار ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر کسی نجار کو لیجئے جو کسی کارخانے میں کام کر کے روزی کماتا ہے۔ نجار روزانہ میز، کرسی، پلنگ، الماریاں اور قسم قسم کا چوبی سامان تیار کرتا ہے بالفاظ دیگر نجار تقسیم دولت کے اصول کے مطابق اپنی پیدا کردہ دولت کا بالواسطہ طور پر ایک حصہ حاصل کرتا ہے۔ نجار کو اس طور پر جو اجرت ملتی ہے اس سے وہ اپنی ضرورت کے مطابق غلہ، کپڑا، تمباکو خریدتا ہے مکان کا کرایہ ادا کرتا ہے اور اس طرح کی دوسری ضروریات حاصل کرتا ہے۔ بالفاظِ دیگر وہ اپنی اجرت کا ان چیزوں سے مبادلہ کرتا ہے جب یہ تینوں مدارج گذر جاتے ہیں تو اس کی احتیاجات رفع ہونے کی نوبت آتی ہے۔ معاشیات کے ان مباحث کے لئے جو رفعِ احتیاجات کے مسئلے سے متعلق ہیں ایک جداگانہ شعبہ مخصوص ہے جس کو صرفِ دولت کہتے ہیں اس شعبے کے مطالعے سے ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ انسان کو کس کس قسم کی احتیاجات لاحق ہوتی ہیں۔ ان احتیاجات کی کیا کیا خصوصیات ہیں اور ان کی تکمیل میں انسان غیر محسوس طریقہ پر کن کن قوانین کی پیروی کرتا ہے۔ زمانۂ حال کے مستند معاشیین صرفِ دولت کو بقیہ تینوں شعبوں سے زیادہ اہم مانتے ہیں کیونکہ دولت خواہ کتنی ہی کثرت سے پیدا ہو اور اس کی تقسیم خواہ کیسے ہی اچھے اصول پر ہو اگر وہ ٹھیک طور پر استعمال نہ ہو تو معاشیات کا اصلی مقصد فوت ہو جانے کا اندیشہ رہتا ہے۔ جو لوگ اپنی آمدنی فضول اور مضر چیزوں پر صرف کرتے اور اپنی زندگی عیش پرستی میں گذارتے ہیں وہ صرف ذاتی طور پر نقصان اٹھاتے اور تباہ ہوتے ہیں بلکہ بسا اوقات اپنی قوم کی ہلاکت اور ادبار کا باعث ہوتے ہیں لہذا جب تک کہ صرفِ دولت کے صحیح اصولوں سے بھی اچھی طرح واقفیت حاصل نہ ہو جائے قومی زندگی کو خوشحال بنانے کا اہم مقصد کما حقہ پورا نہیں ہوتا۔

حبیب الرحمن

مقدمۂ تاریخ دکن یہ کتاب پروفیسر عبدالمجید صاحب صدیقی نے نہایت تحقیق اور محنت سے مرتب کی ہے اس میں انھوں نے سرزمین دکن کے پچیس۲۵ حکمران خاندانوں کے آغاز ارتقا عروج اور زوال کے متعلق تعارفی معلومات کے علاوہ حکمرانوں کا پورا شجرۂ نسب اور حکمرانوں کی تاریخیں قلمبند کر دی ہیں اس طرح مختلف خاندانوں کے سات سو افراد اس کتاب کے ذریعے سے روشناس ہو گئے ہیں۔ اس کتاب کے آخر میں ایک مبسوط اشاریہ بھی ہے۔

کتاب کو چار حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے پہلے حصے میں قدیم دور کے دس حکمران خاندانوں کے شجرے اور ان کے متعلق معلومات ہیں دوسرے حصے میں دورِ وسطیٰ کے آٹھ ہندو اور مسلمان حکمرانوں کا تذکرہ ہے۔ تیسرے میں دورِ حالیہ کے تین خاندانوں کا اور چوتھے میں نوابان کرناٹک، سدہوٹ اور ساونور کا تذکرہ ہے ابتداء میں ایک مقدمہ ہے جو بجائے خود دکن کی ایک مختصر سی تاریخ ہے یہ کتاب پروفیسر مرزا حسین علیخان صاحب کی تحریک پر لکھی گئی ہے متوسط تقطیع ۲۴۴ صفحات ۵ر قیمت

سود

آج کی تقریر میں معاشی نظر سے سود کے متعلق ہم یہ معلوم کریں گے کہ (۱) سود کس چیز کا معاوضہ ہے (۲) سود کیوں ادا کیا جاتا ہے (۳) شرح سود کیوں کر معین ہوتی ہے (۴) شرح سود میں اختلافات کیوں پائے جاتے ہیں (۵) سود عارضی ہے یا دائمی (۶) سودی لین دین کا طریق مفید ہے یا مضر۔ پہلے ہم اس جز کو لینگے کہ سود کس چیز کا معاوضہ ہے۔ واضح رہے کہ جب ہم کوئی شے دوسروں سے استفادہ کی خاطر حاصل کرتے ہیں تو عام طور پر اس شے کے استعمال کا کچھ نہ کچھ معاوضہ ضرور ادا کرتے ہیں۔ مثلاً اگر ہم کسی شخص کے مکان یا موٹر یا سیکل سے استفادہ کریں تو ہم شخص مذکور کو اس کے مکان یا موٹر یا سیکل کے استفادہ کا معاوضہ ادا کرتے ہیں جس کو روزمرہ کی اصطلاح میں کرایہ کہا جاتا ہے۔ اسی طرح جب کوئی شخص اپنی احتیاج کو پورا کرنے کے لئے کسی ساہوکار یا بنکر سے سرمایہ حاصل کرتا ہے تو وہ اس ساہوکار یا بنکر کو مستعار سرمایہ کے استعمال کا معاوضہ یعنی کرایہ ادا کرتا ہے۔ سرمایہ کے استعمال کا یہی معاوضہ یعنی کرایہ سود ہے۔

پہلے جز کی توضیح کے بعد اب ہم یہ معلوم کریں گے کہ سود کیوں ادا کیا جاتا ہے۔ اس کی تشریح مثال کے ذریعہ نسبتاً آسانی کے ساتھ کی جاسکتی ہے۔ ہوا کو لیجئے یہ ہماری بقائے حیات کے لئے کس قدر ناگزیر ہے۔ اس کے بغیر ہم چند سکنڈ سے زاید زندہ نہیں رہ سکتے۔ ہوا کی اس غیر معمولی اہمیت کے باوجود اس کے استعمال کا کوئی معاوضہ نہیں ادا کرتے۔ اس کے برخلاف سینڈھی اور شراب کو لیجئے، یہ چیزیں ہماری بقا کے لئے ناگزیر نہیں بلکہ ان کے استعمال کا الٹا اثر ہماری صحت اور قوائے جسمانی پر پڑتا ہے، لیکن اس کے باوجود ہم ان کے استعمال کا معاوضہ تو ادا کرتے ہیں مگر ہوا کے استعمال کا کوئی معاوضہ یا قیمت ادا نہیں کرتے۔ اس فرق کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ ہوا کی مقدار غیر محدود ہے اور سینڈھی شراب کی مقدار محدود۔ اس طرح سرمایہ کے استعمال کا معاوضہ یعنی سود اس لئے ادا کیا جاتا ہے کہ سرمایہ سے ایک تو ہماری احتیاج پوری ہوتی ہے اور دوسرے اس کی مقدار معین یا محدود ہے۔ یعنی یہ کہ سرمایہ خاص خاص افراد کی ملک ہے اگر ہوا کی طرح اس کی مقدار بھی غیر معین ہو تو ہم اس کے استعمال کا کوئی معاوضہ یعنی کوئی سود ادا نہیں کریں گے۔ سود کے متعلق ان دو امور کی توضیح کے بعد اب ہم یہ معلوم کریں گے کہ شرح سود کیونکر معین ہوتی ہے۔ شرح سود کا تعین ٹھیک انہی حالات کے تحت ہوتا ہے جن حالات کے تحت اشیاء کی قیمتیں معین ہوتی ہیں۔ بازار میں ہم دیکھتے ہیں کہ ایک خریدار ہوتا ہے اور دوسرا فروشندہ یعنی بیچنے والا خریدار اس امر کی کوشش کرتا ہے کہ جہاں تک ہو سکے چیزوں کو کم سے کم قیمت پر خریدے۔ برعکس اس کے فروشندہ اس امر کی کوشش کرتا ہے کہ جہاں تک ہو سکے اپنی چیزوں کو زیادہ سے زیادہ قیمت پر فروخت کرے۔ اس مقصد کے حاصل کرنے کے لئے خریدار اور فروشندہ اپنے حقیقی خیالات کو ایک دوسرے سے چھپائے رکھتے ہیں۔ خریدار یہ ظاہر کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ اسے شے کی خریدی کی چنداں مجبوری نہیں علیٰ ہذا القیاس فروشندہ یہ ظاہر کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ وہ بھی فی الفور اس چیز کے فروخت کرنے پر مجبور نہیں۔ پھر تو خریدار اور فروشندہ میں کشمکش برابر جاری رہتی ہے۔ لیکن بالآخر قیمت کی ایک حد ایسی آتی ہے جس پر خریدار شے کے خریدنے اور فروشندہ فروخت کرنے پر راضی ہو جاتا ہے۔ قیمت معین ہوتی ہے اور سودا انجام پا جاتا ہے۔ واضح رہے کہ فروشندہ شے کی جو کم سے کم قیمت لینے کے لئے تیار ہوگا وہ بالعموم اس شے کے تیار کرنے کے مصارف کے مساوی ہوگی۔

اسی طرح خریدار شے کی جو زیادہ سے زیادہ قیمت ادا کرنے کے لئے تیار ہوگا وہ بالعموم اس افادہ کے مساوی ہوگی جو اس کو اس شئے کے استعمال سے حاصل ہوگا۔ شرح سود کے تعین کے بارے میں بھی رجحان سرمایہ کے خریدار اور فروشندے کا ہوتا ہے۔ سرمایہ کے خریدار سے مراد وہ شخص ہے جو قرض دینے اور سود لینے کے لئے تیار ہو۔ قرض لینے والے اور قرض دینے والے کی باہمی کشمکش سے شرح سود معین ہوتی ہے۔ قرض لینے والا جو زیادہ سے زیادہ شرح سود ادا کرنے کے لئے تیار ہوگا وہ بالعموم اس افادے کے مساوی ہوگی جو اس کو سرمایہ کے استعمال سے حاصل ہوگا۔ قرض دینے والا جو کم سے کم شرح سود قبول کرنے کے لئے تیار ہوگا وہ بالعموم ان مصارف کے مساوی ہوگی جو اس نے اس سرمایہ کی فراہمی میں کئے ہیں۔ لیکن یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ قرض دہندہ کو اصل کی فراہمی میں کس قسم کے مصارف لاحق ہوتے ہیں۔ بات یہ ہے کہ اصل کی فراہمی کا مدار معین اندازہ پر ہے اور معین اندازہ کے لئے یہ ضروری ہے کہ لوگ خرچ سے اجتناب یا پرہیز سے کام لیں۔ معین اندازہ کرنے والوں کا یہ فعل کہ وہ اپنے موجودہ اخراجات میں سے بعض کو ترک کرکے آئندہ اپنی رقم کے استعمال کا کچھ معاوضہ حاصل کرنا چاہتے ہیں، اجتناب کہلاتا ہے۔ اجتناب بھی درحقیقت اصل کی فراہمی کے ابتدائی اور اولین مصارف ہیں لہٰذا قرض دہندہ کم از کم اس قدر سود طلب کرے گا کہ جس کی بدولت اسے اجتناب کے ذریعہ سرمایہ جمع کرنے کی ترغیب ہو۔ بہرطور مذکورہ توضیح کے مطابق قیمت کا تعین اور شرح سود کا تعین مماثل حالات کے تحت ہوتا ہے۔ شرح سود کے متعلق جب ہم یہ کہتے ہیں کہ اس کا تعین ٹھیک اسی طرح ہوتا ہے جس طرح کہ قیمت معین ہوتی ہے تو پھر یہاں پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ قیمت کی طرح شرح سود بھی ایک وقت میں ایک بازار کے اندر ایک کیوں نہیں ہوتی۔ واقعہ یہ ہے کہ شرح سود کے تعین میں نہ صرف اجتناب کے معاوضے کو ملحوظ رکھا جاتا ہے جس کا ذکر ہم ابھی کر آئے ہیں بلکہ دوسرے امور کا لحاظ بھی ضروری ہے۔ مثلاً اجتناب کے ذریعہ رقم پس انداز کرنے کے بعد قرض کے کاروبار چلانے کے لئے مختلف قسم کے اخراجات لاحق ہوتے ہیں اور ان اخراجات کا تناسب طریق پر شرح سود میں شامل کرنا ضروری ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں قرض لینے والوں کی ساکھ کا بھی شرح سود پر بہت گہرا اثر پڑتا ہے۔ چنانچہ جن افراد کی ساکھ اچھی ہوتی ہے انھیں نسبتاً کم شرح پر قرض ملتا ہے۔ جن افراد کی ساکھ ٹھیک نہیں ہوتی انھیں زیادہ شرح پر بھی بڑی دقت سے قرض ملتا ہے۔ شخصی ساکھ یا اعتبار کے علاوہ کفالت کی نوعیت کا بھی شرح سود پر بہت اثر پڑتا ہے۔ مثلاً سونے چاندی کی ٹھوس اشیا کی کفالت پر کم شرح پر قرض مل سکتا ہے۔ برعکس اس کے پارچہ یا اسی قسم کی دوسری اشیا کی کفالت پر شرح سود زیادہ وصول کی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ جن اغراض کے لئے قرض حاصل کیا جاتا ہے ان کی مالیت کا بھی شرح سود کی زیادتی اور کمی پر نمایاں اثر پڑتا ہے اگر قرض آور کاروبار اور بالخصوص ایسے کاروبار کے لئے حاصل کیا جائے جن میں سرمایہ کے تلف ہونے کے بہت کم امکانات ہیں تو سود کی شرح کم لی جائے گی۔ اس کے برخلاف پرخطر کاروبار میں لگانے یا مسرفانہ طور پر صرف کرنے کے لئے قرض لیا جائے تو شرح سود نسبتاً زیادہ ہوگی۔ مختصر یہ کہ شرح سود میں اختلافات اس لئے نظر آتے ہیں کہ اس کے تعین میں نہ صرف اجتناب کا معاوضہ شامل ہوتا ہے بلکہ قرض کے

کاروبار چلانے کے مصارف قرض لینے والے کی ساکھ اور جن کاروبار کے لئے قرض لیا گیا ہے ان کی نوعیت کا لحاظ بھی ضروری ہے۔ چونکہ عام قرض دینے والوں کے انتظامی اخراجات اور عام قرض لینے والوں کی ساکھ اور قرض کے مقاصد یکساں نہیں ہوتے اس لئے شرح سود بھی سب افراد کے لئے یکساں نہیں ہو سکتی۔ ان حالات کے تحت شرح سود میں اختلافات کا پایا جانا ضروری ہے۔

یہاں تک تو ہم نے سود کے متعلق یہ معلوم کیا کہ سود کس چیز کا معاوضہ ہے سود کیوں ادا کیا جاتا ہے، شرح سود کیونکر معین ہوتی ہے، شرح سود میں کیوں اختلاف پائے جاتے ہیں۔ اب ہم یہ دریافت کریں گے کہ سود عارضی ہے یا دائمی۔ دوسرے الفاظ میں ہم یہ معلوم کریں گے کہ سود ہر وقت ملتا رہے گا یا ایک وقت ایسا آئے گا جب کہ سود کا ملنا بند ہو جائے گا

ماہرین میں اس کے متعلق بہت کچھ اختلاف رائے پایا جاتا ہے ایک طبقے کا یہ کہنا ہے کہ سود عارضی نہیں بلکہ دائمی ہے۔ چنانچہ اس خیال کے حامی کہتے ہیں کہ جوں جوں سرمایہ کی مقدار میں اضافہ ہوتا جائے گا دولت پیدا کرنے کے مختلف طریقے بھی معلوم ہوتے جائیں گے۔ سرمایہ کی طلب برقرار رہے گی۔ اور سود برابر ملتا رہے گا اس کے برخلاف دوسرے گروہ کا خیال ہے کہ سود دائمی نہیں ہے بلکہ عارضی ہے اس خیال کے حامیوں کا کہنا ہے کہ زمانۂ موجودہ میں پس اندازی کا رجحان نہایت سرعت کے ساتھ بڑھتا جا رہا ہے . . . . .

. . . . اور اسی تناسب سے سرمایہ بھی جمع ہوتا جا رہا ہے۔ لہذا ایک وقت ایسا آئے گا جب کہ سرمایہ کی فراہم کردہ مقدار اس کی مطلوبہ مقدار سے بہت بڑھ جائے گی۔ سرمایہ کی کثرت ہو جائے گی۔ سرمایہ مفت ملنے لگے گا اور شرح سود غائب ہو جائے گی۔ میرے خیال میں یہ ادعا کہ شرح سود بالآخر غائب ہو جائے گی درست نہیں۔ سود عارضی نہیں بلکہ دائمی ہے۔ سود خواہ کم مقدار میں سہی لیکن ہر وقت ملتا رہے گا۔ مخالف کا یہ خیال کہ شرح سود بالآخر غائب ہو جائے گی، اس مفروضہ پر مبنی ہے کہ سرمایہ کی فراہم کردہ مقدار اس کی طلب یعنی مطلوبہ مقدار کے مقابلہ میں بڑھ جائے گی۔ لیکن ہمیں یہ معلوم ہونا چاہئے کہ وہ وقت آنے ہی نہ پائے گا جب کہ سرمایہ کی رسد اس کی طلب سے بڑھ جائے کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ پس انداز کرنے والوں میں بہت سے افراد ایسے ہیں جو محض معاوضہ کی خاطر سرمایہ جمع کرتے ہیں جب وہ یہ محسوس کریں گے کہ انھیں پس انداز کا بہت کم معاوضہ ملے گا، یا کوئی معاوضہ ملے گا ہی نہیں تو سرمایہ کی پس اندازی میں یا تو بہت کمی کر دینگے یا پس انداز کرنا ترک کر دیں گے۔ پس انداز کرنے والوں کا یہ طرزِ عمل سرمایہ کی رسد کو اس کی طلب کے مقابل بڑھنے نہ دے گا اور اس طرح شرح سود بھی غائب نہ ہو سکیگی البتہ شرح سود اس حد تک گھٹے گی جس پر پہنچنے کے بعد سود کی مقدار اس قدر ہو کہ لوگوں کو پس اندازی کی ترغیب ہو سکے۔ مقدار سود گو کم سہی لیکن بہرحال اس کا ملنا یقینی ہے۔

آخر میں ہم اس امر کی وضاحت کریں گے کہ سودی لین دین کا طریق مفید ہے یا مضر۔ قدیم زمانہ میں جب کہ دولت پیدا کرنے کے کاروبار نہایت ہی محدود تھے اور جب کہ رقم بیشتر غیر پیدائشی کاروبار کے لئے قرض دی جاتی تھی سود خواری کو بری نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ لیکن زمانے نے جوں جوں ترقی کی دولت پیدا کرنے کے کاروبار میں بھی غیر معمولی اضافہ ہو گیا۔ ان حالات کے تحت سود کے متعلق عوام کے خیالات میں تبدیلی ہوئی اور سودی لین دین کے طریق کو مفید اور ضروری خیال کیا جانے لگا۔ وجہ یہ بتلائی گئی کہ کاروباری افراد چونکہ قرض حاصل کر کے مختلف کاروبار جاری کرتے ہیں

اور چونکہ انہیں قابلِ لحاظ آمدنی ہوتی ہے لہٰذا وہ اس آمدنی کا ایک حصہ سرمایہ دار کو بھی بطور معاوضہ ادا کرتے ہیں۔ اس طرح سودی لین دین کی بدولت اگر ایک طرف پس انداز کرنے والوں کا فائدہ ہوتا ہے تو دوسری طرف قرض لینے والے بھی فائدے میں رہتے ہیں۔ نہ صرف یہ بلکہ درمیانی اشخاص یعنی بنکروں کو بھی فائدہ پہنچتا ہے۔ اس لحاظ سے سودی لین دین مفید معلوم ہوتا ہے لیکن جب ہم ایسے قرضوں پر غور کرتے ہیں جو غیر پیدائشی اغراض کے لئے مثلاً فضول خرچی وغیرہ کی خاطر یا مجبوری کی صورت میں شدید ضرورت کو پورا کرنے کے لئے حاصل کئے جاتے ہیں تو پھر ایسی صورت میں سود پر یہ اعتراض کہ وہ ناعاقبت اندیش اور مجبور افراد سے ناجائز استفادہ کرنے کا ایک ذریعہ ہے، بجا معلوم ہوتا ہے۔ بہرطور ان تشریحات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کاروباری نوعیت اور لین دین کی ماہیت کا لحاظ کرتے ہوئے سودی لین دین کا طریق بعض مرتبہ مفید ہے تو بعض مرتبہ مضر۔ سود پر سب سے زبردست اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ وہ ایک ایسی آمدنی ہے جو خاطر خواہ محنت کئے بغیر یہ آسانی حاصل ہوتی ہے اور اس کی وجہ سے سرمایہ دار کو تقویت ہوتی ہے۔ سرمایہ دار اس آلہ کے ذریعہ مجبور افراد کا خون چوستے، خود آرام سے رہتے اور دوسروں کو غربت کا شکار بناتے ہیں۔ یہ اعتراض بالکل درست ہے۔ لیکن ہمیں یہ معلوم ہونا چاہئے کہ محض سودی لین دین کے طریق کو اٹھا کر دینے سے سرمایہ داری دنیا سے اٹھ نہیں جائے گی۔ اس طریقے کو اٹھا دیا جائے تو بڑے بڑے کاروبار چلانے کے لئے جو کثیر سرمایہ بہ آسانی فراہم ہو جاتا ہے، نہ ہو سکے گا۔ اور اس سے دولت پیدا کرنے کے کاروبار کو سخت نقصان پہنچے گا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ معیشت موجودہ یعنی خاندانی توریث اور خانگی ملکیت کے تحت سودی لین دین کا طریق ناگزیر ہے۔ موجودہ معاشی نظام میں اس طریق کی بدولت اگر ایک طرف قابلِ لحاظ فوائد حاصل ہوتے ہیں تو دوسری طرف قابلِ لحاظ نقصانات بھی ہوتے ہیں۔ بحالت موجودہ ہمارے لئے بہتر اور مناسب یہی ہے کہ ہم اس طریق کے فوائد سے پورا پورا استفادہ کریں لیکن مختلف تدبیروں کے ذریعہ اس کے برے اثرات کو جہاں تک ہو سکے کم کرنے کی کوشش کریں۔

ناصر علی

بین الاقوامی سیاسیات

آج کل کے اندوہگیں زمانے میں جب انسان خونخوار درندوں کی طرح دوسروں کے ملکوں پر حملہ کرنے کا امن و اماں سے رہنے والے مردوں، عورتوں، بچوں کی زندگی کو خطرے میں ڈالنے اور انہیں بے دردی سے ختم کرنے، حکمیات اور فطرت کے مادی مصداق خود اپنے ہم جنسوں کو ہلاک کرنے میں لگا ہوا ہے جب خود ہمارے ملک ہندوستان میں بے اعتمادی کی آگ بھڑک رہی ہے، بین الاقوامی سیاسیات کے موضوع پر تقریر کرنا بظاہر صدا بصحرا سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا لیکن آج کل کی زندگی کے زمانے ہی میں اس کی ضرورت ہے کہ ہم کبھی کبھی شیخ شیراز رحمۃ اللہ علیہ کے اس عالی مطمح نظر کو سامنے رکھ لیا کریں جہاں انہوں نے کہا ہے ؎

بنی آدم اعضائے یک دیگر اند کہ در آفرینش ز یک جوہر اند

چو عضوے بدرد آورد روزگار دگر عضوہا را نماند قرار

یعنی اس تخیل کو بھی کبھی اپنے دل میں جگہ دے لیا کریں جس کی بنا ہمارا اعلیٰ ترین مقصد یہ ہونا چاہئے کہ ہم اپنے مفاد کے ساتھ ہی نوع انسان کی فلاح و بہبود کو بھی مدنظر رکھیں جس طرح ہم ایسے شخص کو جو صرف اپنے ذاتی عیش و عشرت میں لگا ہوا ہو اور دوسروں کے دکھ درد کی پرواہ نہ کرتا ہو نفرت کی نگاہ سے دیکھیں گے اسی طرح ہمیں ان قوموں کو بھی نفرت کی نگاہ سے دیکھنا چاہئے جو محض اپنے ہی لئے جیتی ہیں اور اپنے مادی مفاد کو اپنا مقصد حیات بنائے ہوئے ہیں جس کے حصول کے لئے وہ دوسروں کو دھوکا دے کر یا ان پر جبر و زیادتی کر کے انہیں مغلوب کرنے کے درپے ہیں۔

یہ ایک ناقابل انکار واقعہ ہے کہ حکمیات یعنی سائنس والوں نے مادی حقائق فطری کا تجسس کر کے بین الاقوامی یا خالص انسانی تخیل کو بجائے ترقی دینے کے ایک نے بر رستہ دھکا لگایا ہے۔ اب جب کہ فاصلے اور وقت کا سوال اتنا اہم نہیں اور ہم ہزاروں میل پرے کی بات چشم زدن میں اپنے کانوں سے سن سکتے ہیں اور سیکڑوں میل فی گھنٹہ کی رفتار سے دنیا کے چاروں طرف چار روز کے اندر اڑان کر سکتے ہیں، ہونا یہ چاہئے تھا کہ ہر شخص کے دل میں بین الاقوامی احساس پیدا ہو جائے۔ اور کالے گورے، شرقی مغربی، ایشیائی یورپی کا فرق باہمی صلح و آشتی میں کسی قسم کا نقص پیدا نہ کرے اس کے برعکس حکمیاتی انکشافات کا نتیجہ بظاہر اس سے زیادہ نہیں نکلا کہ انسان نے اپنی انتہائی ترقی کا ماحصل یہ قرار دے لیا ہو کہ دوسروں کو جانے دیجئے خود اپنے ہی رنگ روپ، اپنے ہی مذہب، اپنے ہی تمدن والوں کو بیگانہ بنا دے اور اپنے جوع ارضی کی خاطر تمام اعلیٰ تصورات کو روند ڈالے۔ غور سے دیکھا جائے تو بین الاقوامی تخیل ایک روحانی اور اخلاقی تخیل ہے، اور اس میں محض مادی حکمیاتی انکشافات ہیں دور کا بھی واسطہ نہیں۔ چنانچہ ہم ان انکشافات کو باہمی یکجہتی کے بجائے باہمی منافرت بڑھانے کے کام میں لا رہے ہیں۔

ایک شخص یا ایک قوم کی حرص و آز کی وجہ سے دنیا میں کشت و خون کا جو بازار گرم ہے اس کے باوجود آج بھی بہت سے ایسے ہیں جو اس جنگ کے ختم ہونے پر دنیا کی حالت کو بہتر بنانے کی فکر میں ہیں مثلاً ابھی چار پانچ مہینے کا عرصہ ہوا کہ لندن کی ایک انجمن کے ایک معزز صاحب نے جو انجمن نیابت متناسب (Propor-tional representation society) کے معتمد ہیں اس بارے میں ایک گشتی مراسلہ چند ممالک کے مفکروں کے پاس بھیجا تھا اور ساتھ ہی میری بھی ناچیز رائے دریافت کی تھی کہ جنگ کے بعد دنیا کا سیاسی ڈھانچہ کس طرح بنایا جائے کہ بنی نوع انسان کے درمیان جو تناقض ہے وہ مٹ جائے۔ ہر جنگ میں ایک دو نہیں ہزاروں بے قصور عورتیں بیوہ ہو جاتی ہیں لاکھوں غریب بچے یتیم ہو جاتے ہیں کروڑوں اپنے گھر مسمار ہوتے ہوئے اور جو کچھ اپنا سمجھتے تھے اسے برباد ہوتا ہوا دیکھتے ہیں اور ان سے بھی زیادہ محض وہ لے کر جو اپنے کندھوں پر اٹھا سکیں باقی سب کچھ چھوڑ کر کسی دوسرے شہر اور دوسرے ملک کو

ہجرت کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس ہیبت ناک صورت حال کے خلاف ہر جنگ کے بعد ایک ردِ عمل ضرور ہوتا ہے جس کا فوری نتیجہ لڑنے والے فریقوں کے درمیان مصالحت کی شکل میں رونما ہوتا ہے۔ اگر جنگ عالمگیر ہو تو عام خواہش ہوتی ہے کہ کسی طرح آئندہ جنگ کے تخیل ہی کا خاتمہ کر دیا جائے اور مستقل امن و امان صلح و آشتی کی سبیل نکالی جائے۔

اس سے بھی زیادہ مبارک ایسے لوگوں کے نتایجِ فکر ہیں جو بغیر ایسے ردِ عمل کے ہی اس کوشش میں لگے رہتے ہیں کہ انسان میں کس طرح انسانی جذبہ قائم ہو سکے۔ اور وہ اپنے بھائی کا خون پینے سے کیسے باز رہ سکے۔ دنیا میں یہ جذبہ کہ بنی آدم میں خواہ کہیں رہتے ہوں کسی نسل سے پیدا ہوں کسی رنگ و روپ کے ہوں یگانگت ہونی چاہیے بار بار کارفرما رہا ہے اور ہمیشہ اس کی کوشش ہوتی رہی ہے کہ ایسے قوانین بن سکیں جن کے ذریعے سے انسان میں اپنے بھائی کے خلاف شیطانی جذبات میں کچھ کمی پیدا ہو جائے۔ یہی وہ قواعد ہیں جنہیں مجموعی طور پر بین اقوامی قانون کا لقب دیا جاتا ہے اور جنہیں ہماری آنکھوں دیکھتے جاپان، اٹلی اور جرمنی کے اقدامات نے بالکل نیست و نابود کر دیا ہے۔

نظری اعتبار سے سب سے پہلا شخص جس نے بین الاقوامی سیاسیات اور بین الاقوامی قانون کو ایک جداگانہ فن کا رتبہ دیا وہ ولندستان کا باشندہ گروتیوس تھا جس نے سنہ ۱۶۲۵ء میں اپنی کتاب "قانون جنگ و امن" لکھ کر ایک نیا اور وسیع میدان قائم کر دیا۔ گروتیوس کا زمانہ یورپ میں مذہبی جنگوں کا زمانہ ہے جب ہندوستان میں اکبر اعظم فتحپور سیکری کے دیوانِ خاص کی اونچی نشست پر بیٹھ کر وہ جو ہندوستان کی بین قومی صلح و آشتی کے زمانے پر آٹھ آٹھ آنسو بہانے کے لئے آج تک باقی ہے، تمام مذاہب کے سرگروہوں سے اپنے اپنے مذہبی عقاید کے موافق دلائل و براہین ٹھنڈے دل سے سنتا۔ اس زمانے میں براعظم یورپ دو بلکہ تین عظیم الشان کیمپوں میں بٹا ہوا تھا اور بیسیوں سال تک مذہب کے نام پر بھائی بھائی کا گلا کاٹ رہا تھا۔ گروتیوس پر جنگوں اور ان جنون آمیز خوں ریزیوں کا بہت بڑا اثر پڑا۔ اور اس نے محسوس کیا کہ گو جنگ کا خاتمہ تو ممکن نہیں اس کی شدت کو کم ضرور کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ اس نے اسی احساس کے تحت بین اقوامی نظریہ کی بنیاد رکھی۔

مفکرین کے خیالات کو نظرانداز کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ لڑنے والوں کے درمیان کسی نہ کسی طرح کا سلوک ہمیشہ سے ہوتا رہا ہے۔ قدیم یونان بیسیوں چھوٹی چھوٹی شہری مملکتوں میں منقسم تھا۔ اور ایک مملکت کا دوسری سے جو برتاؤ رہتا تھا وہ فی الجملہ خوشگوار تھا۔ اگر جنگ کا موقع آتا تو پہلے باضابطہ اعلان جنگ کر دیا جاتا اور بعض اشخاص و اردات مثلاً نرما اور پیغامبر محفوظ سمجھے جاتے تھے۔ یونان کے بعد روما کا زمانہ آتا ہے۔ گو روما کی سلطنت کے حدود ایک طرف ایران سے تو دوسری طرف اسکاٹستان سے ٹکر کھاتے تھے اور مشکل سے قرب و جوار کا کوئی ملک ایسا ہوگا جس پر اس سلطنت کا پرچم نہ لہراتا ہو تاہم یہاں بھی جنگ و امن کے لئے خاص خاص ضابطے مقرر تھے۔ رومن لوگ قوانین کے بڑے دلدادہ تھے، چنانچہ انھوں نے جنگ جیسے ادارے کو بھی قانونی جامہ پہنا دیا تھا اور یہ اصول قرار دے دیا تھا کہ جنگ صرف اس صورت میں جائز سمجھی جائیگی کہ کوئی قوم رومن سرحدوں یا سفیروں پر حملہ کرے یا عہدناموں کو توڑے یا رومنوں کے دشمنوں سے جا ملے۔ اگر رومنوں کو ہتھیار اٹھانے پڑتے تو جنگ کا خاتمہ صرف اس طرح ممکن تھا کہ رومن دشمن کے ملک پر قبضہ کریں ورنہ فریق ثانی ہتھیار ڈال دے۔ یا پھر وہ رومنوں کا حلیف بن جائے۔

سنہ واری اعتبار سے رومن قانون کے بعد قانونِ اسلام کا زمانہ آتا ہے اور جیسے اسلام نے ہر دوسرے انسانی ادارے میں عظیم الشان انقلاب برپا کیا ویسے ہی بین اقوامی طرزِ عمل میں بھی بدیہی تبدیلیاں کیں جس زمانے میں دنیا کے سامنے اسلامی اصول پیش کئے گئے ہیں وہ ایسا زمانہ تھا کہ نہ صرف عرب بلکہ تمام عالم جنگ آزما قوموں، فرقوں، کشمکشوں اور طبقوں میں بٹا ہوا تھا۔ ایسی حالت میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے پیروؤں کو صرف اس وقت جنگ کی اجازت دی گئی کہ مخالفین ان پر ظلم و تعدی کریں

اور حکم دیا گیا کہ جنگ صرف ان لوگوں کے خلاف لڑی جائے جو مسلمانوں پر
مظالم ڈھائیں۔ نیز یہ بھی ہدایت کی گئی کہ فتنے کے ختم ہوتے ہی تلوار نیام
میں ڈال دی جائے۔ جو غیر مسلم مسلمانوں کے حلیف ہوں ان سے کسی
صورت میں عہد شکنی کی ابتدا نہ کی جائے اور انہیں اپنا دوست سمجھا جائے۔
اسلام نے جو اصلاح جنگی قیدیوں کے ساتھ سلوک میں کی وہ بنی آدم پر
اس کا بڑا بھاری احسان ہے۔ جنگ بدر پہلی لڑائی ہے جس میں اس
قاعدے کی ابتدا کی گئی کہ جنگی قیدیوں کو آرام و آسائش سے رکھنا
چاہئے۔ اور ایک قلیل معاوضے یا معمولی سی خدمت لے کر انہیں چھوڑ دیا
جائے۔ (انسانیت کا یہی سبق تھا جسے سیکھ کر وہی عرب جن کے مرد و
عورت بھی زخمیوں پر ترس نہ کھاتی تھیں اور مقتولوں کے ناک کان
کاٹنے اور ان کا کلیجہ نکال کر چبا جانے میں مضائقہ نہ سمجھتی تھیں۔ ایسے
شریف مزاج بنا دئے گئے کہ جب پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم اپنے
دس ہزار جاں نثاروں کے ساتھ مکہ میں فاتحانہ انداز سے داخل
ہوئے تو انھوں نے اپنے مقدس پیشوا کے احکام کی اطاعت پر ان
ظالموں میں سے کسی کو ہاتھ تک نہ لگایا جنھوں نے آٹھ سال پہلے
ان پر انتہائی ظلم ڈھا کر ان کے جنم بھوم سے نکال دیا تھا)

جہاں تک یورپ کا تعلق ہے رومی نظام کا ڈھانچہ جزوی
تبدیلیوں کے ساتھ پندرھویں صدی عیسوی تک قائم رہا۔ لیکن اس
صدی کے وسط میں فرانس، انگلستان، اسپین اور ایسی ہی دوسری
مملکتوں کے قیام کی وجہ سے عالمگیر سلطنت کے تخیل کو بڑا دھکا لگا۔
نپولین نے تقریباً تمام یورپ فتح کر لیا تھا۔ اور اس کے زوال کے
بعد جنگ کے خلاف ایک رد عمل شروع ہوا چنانچہ زار روس نے ایک مقدس
"معاہدے" کی بنیاد ڈالی۔ انیسویں صدی کے خاتمے سے سنہ ۱۹۱۴ء تک کا
زمانہ بین اقوامی تحریک میں ترقی کا زمانہ تھا۔ زار روس کے طلب پر
سنہ ۱۸۹۹ء اور سنہ ۱۹۰۷ء میں ہالینڈ کے پائے تخت ہیگ میں
جو بین اقوامی کانفرنسیں ہوئیں انھوں نے ایک بین اقوامی ثالثی کا
محکمہ قائم کیا۔ سنہ ۱۹۰۷ء میں جنگ روس و جاپان کے بعد اسی مقام پر
ایک تیسری کانفرنس ہوئی جس میں قانون جنگ پر مفصل بحث ہوئی۔
اور انگلستان کی دعوت پر سنہ ۱۹۰۹ء میں لندن میں ایک اسی طرح کی
کانفرنس نے بحری جنگ کے متعلق قواعد بنائے۔ اسی زمانے میں
بہت سے بین الاقوامی ادارے بھی قائم ہوئے جیسے سنساری اتحاد تار
برقی، سکوں، اوزان، پیمانوں وغیرہ کی یکسانی کے محافظ صلیب احمر
اور ہلال احمر کی بین اقوامی انجمن اور ایسے ہی دوسرے ادارے۔

جنگ عظیم کے دوران میں بین اقوامی ہیئتوں کو بڑا دھکا لگا۔
اور ان میں اکثر ادارے کالعدم ہو گئے۔ وڈرو ولسن کے مشہور (۱۴) نکات جو
مغلوب اور پست جرمنی کے سامنے پیش کئے گئے تھے سب کو معلوم ہیں۔ ان میں
شاید سب سے اہم نقطہ ایک ایسی انجمن کے قیام کی تحریک پر مشتمل تھا جس کے ذریعے
ولسن کے زعم میں تمام ملکوں کی سیاسی آزادی اور علاقہ جاتی خود مختاری
کی ضمانت ممکن تھی۔ کسی زمانے میں اس انجمن کا بڑا زور شور تھا گو امریکہ
والوں نے اپنے صدر کا ساتھ نہیں دیا۔ اور اس انجمن سے الگ رہے
لیکن اس ملک کے علاوہ وقتاً فوقتاً دنیا کی ہر مملکت اس میں شریک
رہی اور اس میں شرکت ایک فخر کی بات سمجھی جانے لگی۔ اسکی ادارات
میں ایک کونسل بمنزلہ کابینہ، ایک اسمبلی بمنزلہ مقننہ، ایک معتمدی اور
ایک عدالت تھی اور یہ خیال پیدا ہو چلا تھا کہ بین اقوامی ہیئت
ملکی سیاسی ہیئت کی طرح ہو جائے گی اس کا موازنہ تقریباً دو کروڑ
روپئے سالانہ کا تھا جو ہر مملکت کے اعتبار سے تقسیم کیا جاتا تھا۔ خود ہمارا
ہندوستان اس کا رکن ہے اور شاید اب بھی کئی لاکھ روپئے سالانہ چندہ
ادا کرتا ہے۔ اس انجمن نے مفتوحہ ممالک کے حصے بخرے کر کے یورپ
میں ایک حد تک قومیت کے اصول پر ان کی تقسیم کر دی۔ اور یورپ سے
باہر انھیں اپنے بڑے بڑے موئدوں یعنی انگلستان، فرانس، جاپان
اور بلجیم کے درمیان تقسیم کر دیا۔ لیکن اس انجمن کے ڈھانچے میں سب سے
بڑی کمزوری یہ تھی کہ خود اس کے ارکان میں خود غرضی بھری ہوئی تھی۔

اور بہت جلد یہ محسوس ہونے لگا کہ بین اقوامی مفاد کو کسی فوری قومی خطرے پر قربان کیا جاسکتا ہے۔ جب جاپان نے بغیر کسی واقعی سبب کے منچوریا پر قبضہ کرلیا تو سوائے ایک تحقیقاتی کمیشن بھیجنے کے انجمن اقدام نے کچھ نہ کیا۔ اس سے منافقوں کے حوصلے بڑھ گئے اور اٹلی نے حبش کے خلاف فوج کشی کرکے دنیا کی اس نہایت قدیم سلطنت کا خاتمہ کردیا۔ معاشی مقاطعے کی تہدیدیں عائد کرنے پر بڑی بڑی تقریریں ہوئیں۔ اور قراردادیں منظور کی گئیں۔ لیکن عمل کے فقدان کی وجہ سے اٹلی پر ذرہ برابر اثر نہیں ہوا۔ اب پہلے جاپان پھر اٹلی اس کے بعد جرمنی انجمن اقوام سے علحدہ ہوگئے۔ اور اس کی رکنیت کو بجائے اپنے لئے طرۂ امتیاز سمجھنے کے اپنی توہین تصور کرنے لگے اس کے بعد جو ہوا وہ حال کے واقعات ہیں۔ آسٹریا، چیکوسلوفاکیہ، پولستان، فنلستان، بلجیم، ولندستان، ڈنمارک، ناروے کس کس کا قصہ دہرایا جائے۔

اب سنا ہے کہ انجمن کے معاشی اور طبی ادارے امریکہ منتقل ہوگئے ہیں سیاسی اداروں کا علم نہیں کہ کہاں ہیں۔

حقیقت میں جیسا ایک بڑے عالم نے کہا ہے۔ بین اقوامی قانون صرف اسی وقت قائم رہ سکتا ہے جب کسی مملکت کو کسی دوسری مملکت پر غیر معمولی تفوق نہ ہو۔ اور بین اقوامیت کا احساس اسی وقت ممکن ہے جب عمومیت کا رواج ہو اور مختلف مملکتیں ایک ہی اخلاقی معیار پر پہنچ جائیں۔ آمریت ایک غیر ذمہ دار ادارہ ہے جس کے ساتھ بین اقوامی ذمہ داری کا احساس باقی نہیں رہتا۔ بین اقوامی سیاسیات کا دارومدار باہمی رواداری باہمی مساوات اور اخلاقی برتری پر ہے اور اس وقت تو ان میں سے ایک چیز بھی نظر نہیں آتی۔

ہارون خاں شیروانی

تاریخ گولکنڈہ

حیدرآباد کے مورخ اور جامعہ عثمانیہ کے معلم تاریخ پروفیسر عبدالمجید صاحب صدیقی

ایم اے ایل ایل بی نے سلاطین قطب شاہیہ کی نہایت مستند اور مبسوط تاریخ قلمبند کی ہے جس میں گولکنڈہ اور اس کے آس پاس کی سلطنتوں کے تعلقات دکن کا تمدنی ارتقاء بادشاہوں اور امیروں کے حالات، لڑائیاں، علم و فضل کی سرپرستی غرض ہر پہلو پر قدیم نادر اور قلمی تاریخوں کی مدد سے روشنی ڈالی ہے اپنے موضوع پر پہلی کتاب ہے جو اس اہتمام اور محنت سے لکھی گئی ہے۔ اس کے مولف نے تاریخ دکن کے متعلق خاص تحقیقات کی ہیں اور ان کی ایک اور کتاب "بہمنی تمدن" بھی عنقریب شایع ہوکر منظر عام پر آجائے گی۔

تاریخ گولکنڈہ باتصویر ہے اور اس کی تصویریں بھی اس کے مواد کی طرح قدیم تاریخی ماخذوں سے حاصل کی گئی ہیں۔ قیمت ہے

نئی اور پرانی طب

فن طب کا حضرت مسیح سے پانچ ہزار سال قبل مصر میں پتہ چلتا ہے جہاں ایتھوتس مصر کا بادشاہ خود طبیب تھا اور جس نے عمل تشریح کا بیان لکھا ہے۔ مصر میں مردوں کا پیٹ چیر کر اور اس میں دوا بھر کر ان کو اب تک محفوظ رکھا ایک اہم عمل ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس زمانے میں صرف دواؤں کا علم اچھی طرح حاصل تھا بلکہ تشریح کی بھی معلومات کافی تھیں۔

طب قدیم

ہندی طب | مورخین کا خیال ہے کہ علاج تشریح اور جراحی کا علم آریائی نسلوں میں قدیم زمانے ہی میں ترقی پا چکا تھا چنانچہ ابتدائی ہندی طب میں چرک اور سشرت دو بڑی نامور ہستیاں گزری ہیں۔ چرک نے علم طب پر ایک بڑی کتاب "چرک سمہتا" لکھی ہے۔

بارہویں صدی عیسوی میں گولکنڈہ میں ایک نامور طبیب مادھو آچاریہ گزرا ہے جس کی کتاب "مادھو ندان" مستند مانی جاتی ہے۔

ہندی آیوروید نے علم طب میں اور خاص کر جڑی بوٹیوں اور دھاتوں کے ذریعہ علاج میں بہت ترقی کی۔

چینی طب | (۲۶۹۸) سال قبل مسیح چینی شہنشاہ ہوانگ ٹی کے زمانے میں چین میں دوائیں رائج ہوئیں۔ قدیم چینی اطبا نبض شناسی اور تشخیص میں خاص واقفیت رکھتے تھے مگر وہ تشریح اور جراحی کے علم سے چنداں واقف نہ تھے۔

بابلی طب | لندن کے عجائب خانہ میں بابل اور نینوا کے کھنڈروں کی ایک خشتی کتاب موجود ہے جو سات سو سال قبل مسیح کی ہے۔ کہتے ہیں کہ قدیم مصریوں نے اہل بابل ہی سے علم طب سیکھا تھا۔

مصری طب | مصری طب کی ابتدا اوہام پرستی اور تعویذ گنڈوں سے ہوئی رفتہ رفتہ توہمات کم ہو کر علم طب کو فروغ حاصل ہوا۔ مصری کھنڈروں سے برآمد شدہ کتبوں اور گوندل کے کاغذ پر لکھی ہوئی کتاب میں سولہ سو سال قبل مسیح کی ایک تحریر سے مصری طب کی قدامت کا پتہ چلتا ہے۔

یونانی طب | یونانی طب کی ابتدا بھی خرافات پرستی سے ہوئی۔ طبی دیوتا اپولو کا بیٹا اسقلی بیوس ایک نامور طبیب تھا دراصل یونانی طب میں عملی نظام کے آثار پانچ سو سال قبل مسیح سے پائے جاتے ہیں۔ یونانیوں نے عراق عرب اور مصریوں سے قدیم طبی معلومات حاصل کیں۔ بقراط (۴۶۰) سال قبل مسیح جزیرہ قاس میں پیدا ہوا اس نے زبانی طبی روایات کو قلمبند کیا اور طب کی مختلف شاخوں پر کتابیں لکھیں۔ بقراط کی تعلیمات "ذخیرۂ بقراط" کے نام سے محفوظ ہیں ان میں سے چھ کتابیں فن جراحت پر ہیں۔

بقراط کے بعد ارسطو یونان کا مشہور حکیم اور فلاسفر (۳۸۴) سال قبل مسیح گزرا ہے۔ ارسطو کو تشریح کی بعض معلومات حاصل تھیں اس نے چوزہ کے نمونے کا مطالعہ کیا اور حیاتیات کے اصول بنائے۔ آٹھویں اور نویں صدی عیسوی میں ارسطو کی تعلیمات حنین بن اسحاق کے ذریعہ عربی میں منتقل ہوئیں اور پھر لاطینی میں ترجمہ ہو کر یورپ تک پہونچیں۔

ارسطو کی وفات کے بعد اسکندریہ میں ایک بڑے طبی مدرسہ کی بنا پڑی جس میں ہیروفیلوس، ایراسیس طراسوس اور آمرسیس نامور حکیم موجود تھے ہیروفلوس تین سو سال قبل مسیح تشریح کا ماہر اعظم سمجھا جاتا ہے یہ پہلا تشریح داں تھا جس نے انسانی لاش کو برسر عام چیرا۔

رومی طب | یونانی تہذیب روما میں منتقل ہوئی تو وہاں علم طب کو بھی عروج ہوا۔ حکیم اسقلی بیوس نے یونانی طب کا پایہ روما میں جمایا۔

حکیم سیلسوس پہلی صدی عیسوی میں ایک نامور رومی طبیب گزرا ہے جس کی "تاریخ طب" ایک مشہور کتاب ہے۔ اس نے جلدی پیوند کے عملے ایجاد کئے۔

جالینوس (۱۳۱ء سے ۲۰۱ء) یونانی نسل کا نامور طبیب اسکندریہ میں تعلیم پا کر روما میں آیا اور بہت مشہور رہا اس نے بقراط کی طب کو مدون اور مرتب کیا اور علم علاج "فعلیات" اور تشریح میں عالیشان بلندی پیدا کر دی۔

جالینوس کے بعد یونانی طب تین صدی تک حالت جمود میں رہی مگر بیزنطینی طبیبوں میں پولوس ایجنیا میں ایک نامور جراح گزرا ہے اس کی کتابوں کو بعد میں عربی حکیم علی ابن عباس نے اپنی کتاب "الملکی" میں اور زہراوی نے اپنی جراحی تصانیف میں آزادی کے ساتھ استعمال کیا۔

عربی اور اسلامی طب فتح مصر کے بعد عربوں کے ذریعہ یونانی طب میں بہت ترقی ہوئی۔ اس زمانے کے نامور مصنفین کی تعداد چار سو سے زیادہ بتائی جاتی ہے ان میں سے یوحنا ماسویہ خلیفہ ہارون الرشید کا مشہور طبیب تھا عیسیٰ بن علی " الکندی " جو خلیفہ المامون کا مشہور طبیب تھا رازی جو بغداد میں ایک نامور عربی مصنف اور ماہر سریریات مشہور تھا۔

شیخ الرئیس ابن سینا جس کی پیدائش بخارا میں ہوئی سب سے زیادہ مشہور ہے اس کی تعلیمات کا دور دورہ یورپ میں تیسری صدی تک رہا۔ اس کی مشہور ترین کتاب " قانون شیخ " ہے جسے فرانسیسی علما نے کلید عقل و دانش " کا نام دیا ہے۔ یہ کتاب پندرھویں صدی عیسوی تک یورپ کے طبی نصاب میں شامل رہی۔ اس کے بعد اور بہت سے مشہور عربی اطبا اور فلاسفہ گزرے۔

خلافت مغربی اندلس میں عربی طب نے بہت ترقی کی یہاں کے نامور مصنفین میں ابوالقاسم زہراوی ایک مشہور عالم طب اور جراح گزرا ہے۔ جس کی کتاب " التصریف " طب و جراحیات کی ایک عظیم الشان قاموس ہے اس میں تشریح فعلیات اور غذائیات کے علاوہ ذاتی تحقیقات کے نتائج کے ساتھ جراحی آلات اور اوزاروں کا بیان اور تصویریں درج ہیں۔

(اس کتاب کا یوربی زبانوں میں ترجمہ ہوا)

اس کے علاوہ اور بہت سے اہل کمال مثلاً داؤد انطاکی علی بن عیسیٰ قرشی، سمرقندی، ارزانی وغیرہ نامور طبیب گزرے ہیں جن کے عربی طب پر بڑے بڑے احسانات ہیں۔ تاریخ شاہد ہے کہ عربوں نے یونانی طب کے ترجموں کے علاوہ طب میں نہایت مفید ایجادیں اور اضافے کئے اور یونانی طب اور جراحی کو ترقی دے کر یورپ تک پہنچایا۔ مشہور مورخ گبن لکھتا ہے کہ ایک زمانہ میں بغداد میں (۸۶۰) سند یافتہ طبیب اور کثیر التعداد شفا خانے تھے خلفاء بغداد کی علمی سرپرستی اور ان کے زمانے کے طبی تجربے مشہور ہیں۔ رازی، علی عباس اور ابن سینا کی علمی خدمات کو یورپ نے تسلیم کیا اور ان سے بہت فائدہ اٹھایا۔

تصدڑیک آف طوگنا کا خواب آور نسخہ عربی نسخوں سے ماخوذ ہے اور عمل جراحی کے لئے بیہوشی کا خیال عربوں ہی سے یورپ کو حاصل ہوا۔ قرطبہ کا دارالعلوم علوم و فنون کے لئے اس وقت عیسائی دنیا کے نزدیک بڑی کشش رکھتا تھا۔

طب جدید اور نئے طبی علوم

قدیم طبی ذخیرہ کی جو بیشتر عربوں کے ذریعہ منتقل ہو کر یورپ کو پہنچا تھا سولھویں صدی کی ترقی پذیر سائینٹفک طب نے جگہ لی۔ نئے ممالک (امریکہ، شرق الہند وغیرہ) کی دریافت چھاپے کی ایجاد اور ترقی اور اس زمانے میں پھیلی ہوئی وباؤں نے تحقیق و ترقی طب کی رفتار کو تیز کر دیا۔

حسن کاری اور " آرٹ کے " شوق نے جسم انسان کی تفصیلی تشریح کو ضروری سمجھا چنانچہ ۱۵۴۳ء میں ویسالیوس نے پڈوا کے طبی مدرسہ میں انسانی تشریح کی سائینٹفک بنیاد ڈالی۔ کہتے ہیں کہ اس نے خود ایک سو لاشیں چیری تھیں۔ نئے تشریحی علم سے جراحی کے کام میں بھی کایا پلٹ شروع ہو گئی۔ فرانسیسی سرجن ایمرائی پاری نے جراحی میں بہت نام پیدا کیا مگر اس زمانے میں اندرونی طب نے زیادہ ترقی نہیں کی اور علاجی طریقے زیادہ تر قدیم نظریۂ اخلاط کے تحت جاری رہے لیکن رفتہ رفتہ ترقی کی راہیں کھل گئیں بقراط کے زیادہ صحیح مسودات تلاش کئے گئے۔ ملکوں کی دریافت سے قرابادین میں نئی نئی دواؤں کا اضافہ ہونے لگا۔ وبائی امراض کی ماہیت دریافت میں اضافہ کی کوشش کی گئی۔

سترھویں صدی کے آخر میں علم فعلیات میں ترقی ہونے لگی۔ پڈوا کے ایک پروفیسر سنکٹوریس نے تپش پیما اور نبض پیما ایجاد کیا اور استحالہ کی بنیاد قائم کی۔

جراحی کے طریقے اب تک زیادہ تر قدیم اصول پر ہی رائج تھے مگر آتشک کا علاج جو عرب پارہ کے ذریعہ کیا کرتے تھے وہ اب دوبارہ رائج ہوا۔ زچگی کے متعلق زیادہ علمی اور سائینٹفک طریقے رائج ہوئے اور زچگی کرانے کا چمٹا جو عرصے تک خاندانی راز بنا رہا اب عام طور پر استعمال ہونے لگا۔ ولیم ہنٹر دایہ گری میں بہت مشہور رہا اور جراحی کو محض ایک دستکاری کے درجے سے بڑھا کر علمی پایہ کو پہنچا دیا اور جراحیاتی نمونوں کا ایک عجائب خانہ لندن میں قائم کیا۔ ایسے عجائب خانے اب ہر مہذب ملک میں موجود ہیں۔

بیسویں صدی عیسوی کے وسط میں انگلستان اور یورپ میں دواخانوں اور شفاخانوں کا رواج عام ہو گیا اور طبی امداد کا ایک جال چاروں طرف پھیل گیا اور تیمارداری اور نرسنگ کے انتظام میں ترقی ہونے لگی جیچک کے

ٹیکہ کا رواج بڑھا اور چیچک میں کمی ہونے لگی۔

انیسویں صدی میں طب جدید کے تحت امراض کو ان کے مخصوص شعبوں میں تقسیم کرنے کا رواج بڑھنے لگا اور خاص خاص امراض کے مخصوص ماہرین معالج ہونے لگے۔ وائنا میں خاص طور پر خصوصی تعلیم طب کا انتظام قائم ہوا۔ طب کی بنیاد زیادہ تر عملیات اور امراضیات پر قائم ہونے لگی۔ انسانی جسم کی دقیق ساخت کے علم پر زور دیا جانے لگا۔ جینیات کے علم میں فان بائر ولیم ہنٹر، بالفور، منو وغیرہ نے بہت ترقی کی۔ تجرباتی عملیات میں ہولر لیگ، لڈوگ اور کلاڈ برنارڈ نے حیرت انگیز انکشافات کئے۔ چارلس بیل اور ہال نے مرکزی نظام اعصاب و اعصاب کے متعلق بلند پایہ تحقیقات کیں۔ جسمانی افعال کے دماغی مرکز متعین کئے گئے۔ بیسویں صدی کا طبی عروج دنیا کی آنکھوں کو چکا چوند کئے ہوئے ہے۔ آج کل علم طب کے متعدد شعبے ہیں اور ہر شعبہ میں عالمگیر ترقی ہو رہی ہے۔ ہزاروں ہی دوائیں، بے شمار اوزار اور آلات، لاشعاعیں، برقی علاج، نازک تشخیصی آلات رائج ہو چکے ہیں۔ مختلف شعبوں کی ترقیوں کی تفصیل کے لئے ایک مستقل دفتر کی ضرورت ہے۔ جراحی کے معجزانہ عملیات آئے دن انجام دئے جا رہے ہیں۔ مخصوص معالجین کا دور دورہ ہے۔ جلدی، وریدی اور نخاعی راستوں سے پچکاریوں اور ٹیکہ کے طریقے ترقی پذیر ہیں۔ تاب نگار سے قلب، افعال اور خرابیوں کی نوعیت جانچی جاتی ہے۔ مختلف طریقوں سے جسم کے ہر حصے کی تصویریں اور عکس لئے جا سکتے ہیں۔ خوردبین کی اعلیٰ طاقتوں نے غائب چیزوں کو حاضر کر دکھایا۔

جراحی جراحی کی ابتداء کا پتہ ان کھوپریوں سے ملتا ہے جو فرانس اور جاپان میں نکلی ہیں۔ ان میں عمل جراحی کا سوراخ موجود ہے اور چونکہ ان میں سے بعض کے سوراخ مندمل پائے گئے۔ اس لئے اس سے یہ ثبوت ملتا ہے کہ عمل جراحی کے بعد بھی یہ مریض زندہ رہے۔ اس زمانہ میں یہ عمل صرف اس خیال کے تحت کیا جاتا تھا کہ مریض کے سر میں شیطان سما گیا ہے اسے نکالا جائے اور آج کل یہ عمل دماغ کا دباؤ کم کرنے کی غرض سے کیا جاتا ہے۔

ہندوستانی جراحی کا زمانہ ایک ہزار سال قبل مسیح سے سنہ ۸۰۰ء تک شمار کیا جاتا ہے۔ یہاں چرکا اور سسروتا اس وقت کے مشہور جراح تھے۔ اس زمانہ میں مختلف طریقوں سے جراحی کا عمل ہوتا رہا۔ ٹوٹی ہوئی ہڈی کو بانس باندھ کر درست کرنا اور کٹی ہوئی ناک کا درست کرنا اس زمانہ کا عمل ہے۔

اس کے بعد ایران اور چین میں طب کا پتہ چلتا ہے اور اس کے بعد یونان میں طب نے بہت ترقی کی۔ جالینوس اور بقراط یہیں کے مشہور طبیب ہیں۔ نویں صدی عیسوی میں عربی جراحی نے طب کو حالت نزع سے نکال کر فروغ بخشا۔ محمد ذکریا، ابوبکر رازی، ابن سینا، علی ابن عباس اور زہراوی نے جراحی کو مختلف طریقوں سے ترقی دی۔ پہلے زمانہ میں عمل جراحی کی ناکامی کے دو وجوہ تھے۔ ایک عمل جراحی کے وقت مریض کو تکلیف کا ہونا اور دوسرے اس عمل کے بعد زخم کا سڑ جانا۔ اڈنبرا میں سر جان سمپسن نے بے ہوشی کے لئے کلوروفارم ایجاد کیا جس سے مریض کو عمل جراحی کا احساس مفقود ہو گیا۔ اس کے ساتھ ہی گیاس و ایتھر کا استعمال ہونے لگا اور اس کے بعد ریڑھ میں پچکاری کے ذریعہ جسم کے نچلے حصہ کو بے حس کیا جانے لگا۔ حال میں پچکاری کے ذریعہ مریض کو بے ہوش کیا جاتا ہے جس سے عمل جراحی بہت ہی آسان ہو گیا۔ پاسچر نے ۱۸۲۲ء سے ۱۸۹۵ء جراثیم کا انکشاف کر کے اور لسٹر نے ۱۸۲۷ء سے ۱۹۱۲ء کاربالک ایسڈ کے ذریعہ اینٹی سپٹک سرجری کی بنا ڈالی۔ اس طرح عمل نے جراحی کو حیرت انگیز ترقی بخشی۔ فن طب حضرت مسیح سے صدیوں بعد بھی ابتدائی حالت میں رہا۔ ایشیا، آفریقہ اور یورپ کی طبیں بارہویں صدی عیسوی تک اگرچہ کہ بہت ترقی یافتہ ہو چکی تھیں لیکن اصلی سائنٹفک طب جدید کا آغاز سولہویں صدی عیسوی ہی سے ہوا۔ اس لحاظ سے طب کے دو بڑے تاریخی دور مانے جاتے ہیں۔ ایک طب قدیم اور دوسرا طب جدید۔

الغرض ہر شعبہ میں ترقی اور عروج ہوا اور یہ ترقی آئے دن جاری ہے اور روز نئی ایجادات ہو رہی ہیں۔ علم طب اس قدر وسیع ہو گیا ہے کہ اس کی تفصیلات پر عبور حاصل کرنا شخص واحد کے لئے محال ہو گیا ہے۔ جراثیمی امراض طاعون، خسرہ کی بیماری، سندھی بخار، سرسام بخار، دق، گرم ممالک کے امراض نیز کی ماہیت اور علاج معالجہ میں انتہائی ترقی ہو گئی ہے جن کی تفصیل کے متعلق یہ کہا جا سکتا ہے کہ "عمر کوتاہ و قصہ طولانی"

حیدر علی خاں

پیشے کا اِنتخاب

"کونسا پیشہ میرے ذاتی، خاندانی اور سماجی حالات کے لحاظ سے موزوں ہوگا؟"

"کونسا پیشہ میری ذاتی خوبیوں اور کمزوریوں کے مدِنظر مُناسب ہوگا؟"

"مجھے ثانوی تعلیم کے ختم پر ہی پیشے میں داخل ہوجانا چاہیے یا اعلیٰ تعلیم کے بعد؟"

"ہر پیشے میں مشکلات پریشانیاں اور مقررہ کام کے خشک مَراحل ہوتے ہیں۔ اپنی طبیعت کی اُفتاد کے لحاظ سے میں اُن چیزوں کو کس پیشے میں آسانی سے برداشت کرسکونگا؟"

یہ ہیں چند سوالات جو آج کل ہر نوجوان کو پریشان کر رہے ہیں۔ اُن کا جواب دینے سے وہ قاصر ہے۔ اُن کا جواب نہ والدین دے سکتے ہیں نہ اساتذہ۔ بیچارہ نوجوان کسی معقول اور باعتماد حل سے مایوس ہوکر اپنے مستقبل کو اتفاقات کے حوالے کر دیتا ہے۔ اِسی طرح جس طرح کہ اسکے اگلوں نے کیا تھا۔ عمر رسیدہ افراد سے پُوچھیے تو اُنہیں خود یقین نہیں کہ اُنہوں نے جو پیشہ اختیار کیا تھا وہ اُن کے لئے موزوں تھا۔ وکیل صاحب اپنی ناکامی کا حال بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں "ملازمت کے زمرہ میں داخل ہوتا تو آج عہدہ دار ہوجاتا۔ مقررہ وقت پر مقررہ کام کرکے زندگی آرام و اطمینان سے گذارتا" عہدہ داروں کو آپ آزاد پیشے کی خوبیوں اور آسائشوں کو حسرت سے بیان کرتے ہوئے سنیں گے۔ بہرحال ہر شخص یہی کہتا ہے کہ کاش وہ کچھ اور ہوتا مگر وہ نہ ہوتا جو وہ ہوا۔ خلاصہ یہ کہ کوئی بھی اپنے پیشے کو اپنی طبیعت اور میلانات کے مطابق نہیں پاتا۔ اور ایسا ہونا بھی چاہیے کیونکہ پیشے میں داخل ہونے سے پہلے یہ کب غور کیا جاتا ہے کہ فرد کو پیشے سے مناسبت ہے بھی یا نہیں۔

حال یہ ہے کہ اکثر افراد کا پیشہ گہوارے ہی میں متعین ہوجاتا ہے۔ لوہار کا بیٹا لوہار، سنار کا بیٹا سنار اور درزی کا بیٹا درزی ہوتا ہے۔ آبائی حکیم ہونا ذاتی قابلیت سے قطع نظر بڑے درجے اور شہرت کی ضمانت ہے۔ ع

میراثِ پدر خواہی علمِ پدر آموز

وکیل صاحب کا لڑکا وکیل ہی ہوگا۔ خواہ اُس میں وہ لسانی اور ضروری ذہنی قابلیتیں ہوں یا نہ ہوں۔ ڈاکٹر صاحب کے بیٹے کے لئے کسی اور پیشے کا خیال بھی مشکل سے آتا ہے خواہ اُس میں ضروری قابلیت اور عملی صلاحیت ہو یا نہ ہو۔ حکیم صاحب کا اکلوتا اگر طب کے سوا کوئی اور پیشہ اِختیار کرے تو پھر اُن خاندانی نسخوں کا کیا حشر ہوگا، جو صرف سینہ بسینہ ہی منتقل ہوسکتے ہیں۔

دوسرے درجے پر وہ نوجوان ہیں جن کے لئے والدین اور اعزہ پیشہ منتخب کر دیتے ہیں اس کی بنیاد عموماً اُن کی چند غلط فہمیاں ہوتی ہیں یا شخصی رغبت و تنفر۔

ایک کامیاب تاجر کی یہی خواہش ہوتی ہے کہ اس کا لڑکا تاجر ہی بنے۔ عام اس سے کہ اس میں ضروری قابلیتیں ہوں یا نہ ہوں۔ ایک ناکام تاجر اپنے لڑکے کو تاکید کرتا ہے کہ وہ تجارت نہ کرے خواہ اس میں ایسی صلاحیتیں ہوں، جن سے وہ تجارت میں کامیابی حاصل کرسکتا ہے بعض

بزرگوں کو یہ پسند نہیں ہوتا کہ ان کے لڑکے وردی پہنیں۔ ایسی متعدد مثالیں ہیں جہاں بہت سے نوجوان باوجود مناسبت اور رغبت کے فوج اور پولیس میں شریک نہ ہو سکے کیونکہ ان کے والدین کو یہ گوارا نہ تھا کہ ان کے لڑکے وردی پہنے ہوئے نظر آئیں۔ اس طرح بزرگوں کا مشورہ اکثر ان کی شخصی رغبت و نفرت پر مبنی ہوتا ہے۔ یا پھر چند مروجہ خیالات پر۔

بعض غلط فہمیاں اس قدر عام ہوگئی ہیں کہ ان کی وجہ سے موزوں پیشے کے انتخاب کی اہمیت کا ہمیں اندازہ نہیں ہونے پاتا۔ ایک عام خیال یہ ہے کہ تمام افراد مساوی قابلیتیں رکھتے ہیں۔ مساوات کا یہ دل خوش کن تخیل محض خیال ہی خیال ہے۔ تجربہ شاہد ہے کہ اس میں کوئی اصلیت نہیں۔ چنانچہ بعض قدیم اقوال بھی اس کی تردید کرتے ہیں مثلاً۔ ع

ہر کسے را بہر کارے ساختند

یا ع خدا پنج انگشت یکساں نہ کرد

علم نفسیات کا ایک جدید اور اہم شعبہ انفرادی اختلافات ہے۔ اس جدید شعبہ کی تحقیقات نے ثابت کر دیا ہے کہ افراد میں بہت سے اختلافات پائے جاتے ہیں۔ پس یہ خیال ہرگز درست نہیں کہ ہر شخص میں اتنی استعداد ہوتی ہے کہ وہ خواہ کوئی پیشہ اختیار کرلے اس میں کامیاب ہو سکتا ہے۔

ایک عام خیال یہ بھی ہے کہ محض لگاتار کوشش ہی ہر پیشے میں کامیابی حاصل کرنے کے لئے کافی ہے۔ بعض مشہور آدمیوں نے محنت کرکے معمولی حالت سے ترقی کی اور بڑے درجے پائے۔ ان کی زندگی بھی بظاہر اس خیال کی تائید کرتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ مگر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر صرف محنت ہی کامیابی کا راز ہوتی تو ہم بہت سے سخت محنت کرنے والوں کو ادنیٰ حالت میں نہ پاتے اس سلسلے میں ایک اور غلط فہمی یہ ہے کہ صرف پرجوش ارادہ ہی کسی کو بڑے رتبہ پر پہنچا سکتا ہے۔ مگر یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ کسی پیشے میں کامیابی حاصل کرنے کی قابلیت کو محض دلی خواہش سے کوئی تعلق نہیں

جب نوجوان کسی بزرگ سے اپنے مستقبل کے متعلق مشورہ لیتا ہے تو وہ بعض وقت اپنی بے مائگی کو محسوس کرتے ہوئے ٹال دینے کی کوشش کرتا ہے۔ اس اہم ذمہ داری کو اپنے سر لینے کے عوض وہ اس کا بوجھ خود نوجوان کے کندھوں پر ڈال دیتا ہے۔ بات یوں بنائی جاتی ہے کہ یہ شخصی مسئلہ ہے اس میں خود فرد کو چاہیے کہ اپنی ذاتی خواہش اور رجحانات و میلانات کے لحاظ سے پیشے کا انتخاب کرے۔ بات تو بظاہر معقول معلوم ہوتی ہے اور اس میں خود اعتمادی کی بھی اچھی تلقین ہے۔ مگر یہ ایسی ہی بات ہے کہ ایک ڈوبتا ہوا شخص آپ کی مدد مانگے اور آپ اس کو خود اعتمادی کی اہمیت جتاتے ہوئے کہیں کہ جس سمت میں چاہو دس بیس ہاتھ مارو اور کنارے کے کسی موزوں حصے تک خود پہنچ جاؤ۔

نوجوانوں کی ذاتی خواہش کو بھی پیشے کے انتخاب میں زیادہ اہمیت نہیں دی جانی چاہیے۔ بعض صورتوں میں ایسی خواہشوں کی نفسی بنیاد طفلانہ ہوتی ہے۔ ایک نوجوان معمار بننا چاہتا تھا۔ حالانکہ اس میں اس پیشے کی

کوئی صلاحیت نہ تھی۔ کھوج کرنے سے معلوم ہوا کہ اِس خواہش کی نفسی بنیاد یہ واقعہ ہے کہ اس کا ایک متمول چچا متجارتی کاروبار کا ماہر تھا۔ ایک ۱۴ سالہ لڑکا کاروباری ایجنٹ بننا چاہتا تھا۔ حالانکہ اس کو اس کام سے مطلق مناسبت نہ تھی۔ دریافت کرنے سے پتہ چلا کہ دور دور تک پیدل چلنے اور مختلف شہروں کی سیر کرنے کا اس کو بہت شوق ہے۔ پھر کسی نوجوان سے یہ توقع رکھنا بھی درست نہیں کہ وہ اپنی صلاحیتوں سے پوری طور پر واقف ہو۔ معمر اور تجربہ کار افراد بھی اپنی صلاحیتوں سے باخبر نہیں ہوتے۔

کسی نوجوان کو اگر مجبور ہی کر دیا جائے کہ اپنا پیشہ خود منتخب کرے تو وہ عموماً ایک بڑی غلطی کا شکار ہوگا۔ وہ ایک ایسا پیشہ منتخب کرے گا جس سے اُس کو فوراً مالامال ہوجانے کی توقع ہو۔ اس کے پیشِ نظر شاید دو ایک واقعات ایسے ہوتے ہیں کہ فلاں شخص نے معمولی حالت سے تجارت شروع کی مگر آج وہ لکھ پتی ہوگیا ہے۔ والدین بھی اس انتخاب پر صاد کرتے ہیں۔ وہ تو پہلے ہی سے چاہتے ہیں کہ کسی طرح ان کا سپوت کمانے لگے۔ اور وہ اس کی ذمہ داری کے بوجھ سے سبکدوش ہوجائیں۔

غرض یہ کہ پیشے کے انتخاب میں نوجوانوں کو کوئی صحیح رہبر نہیں ملتا۔ نتیجہ یہ ہے کہ ہر سال متعدد نوجوان ایسے پیشوں میں بھرے چلے جا رہے ہیں جن سے انہیں مطلق مناسبت نہیں ہوتی۔ اس سے پیشے اور ملک کی عام کارکردگی متاثر ہو رہی ہے۔ خود یہ افراد بھی غیر موزوں پیشہ اختیار کر لینے کی وجہ سے بے لطفی کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔

پیشے کی محض اقتصادی نہیں بلکہ تمدنی اور اخلاقی اہمیت بھی ہے ہم اپنے پیشے کے فرائض کی ادائیگی میں جو ۶ - ۷ گھنٹے صرف کرتے ہیں اُن کا اثر ہماری ذہنی اور علمی دلچسپیوں پر پڑتا ہے۔ ہماری سیرت کا رنگ اور ہمارا نظریۂ حیات بھی اسی کام کی بدولت معین ہوتا ہے ہم پیشہ افراد کی گفتگو خیالات اور عادتیں ہمیں متاثر کرتی ہیں۔ ہماری خانگی زندگی پر بھی اُن امور کا ردِ عمل ہوتا ہے۔ بقول پروفیسر آرشیر انگر "ہر پیشہ انسان کے لئے نوشتۂ تقدیر بن جاتا ہے۔ چند سال کے عرصہ میں وہ انسان کے رگ و پے میں سرایت کر جاتا ہے۔ اور اس کی سیرت کی تشکیل کرتا ہے۔ صرف پیشہ ہی ہمارا نہیں ہوتا بلکہ ہم بھی پیشے کے ہوجاتے ہیں"۔

زندگی کی اس اہم گتھی کو سلجھانا ایک بڑی انسانی خدمت ہے۔ اس خصوص میں اہلِ مغرب نے جو طریقے اختیار کئے ہیں وہ ہمارے لئے مشعلِ ہدایت کا کام دے سکتے ہیں۔

آج سے کوئی (۲۵) سال پہلے یورپی ممالک کا بھی یہی حال تھا۔ وہاں بچوں کو ان کی صلاحیتوں اور میلان کے لحاظ سے موزوں تعلیم دینے کا رواج نہ تھا۔ البتہ زراعت اور تجارت کی تعلیم کے لئے علٰحدہ مدارس اور کلیے قائم تھے۔ لڑکیوں کو صرف ضروریاتِ خانہ داری کی تعلیم دی جاتی تھی۔ انفرادی رجحانات کا لحاظ نہ ہونے سے ہزارہا افراد غیر موزوں پیشوں میں داخل ہو کر پریشانی اور اضطراب کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ ماہرینِ تعلیم نے اس اہم مسئلے میں نفسیات والوں سے مدد لی۔

ایک زمانہ تھا جبکہ نفسیات میں فلسفیانہ تخیل کو ساری اہمیت حاصل تھی جب تک نفسیات اور نے فلسفے کی اس گرفت سے چھٹکارا نہ پایا وہ عملی پیرائے میں کوئی انسانی خدمت نہ کر سکے پھر ایک دور آیا جب کہ نفسیات میں بھی طبعی علوم کی طرح تجربے کئے جانے لگے جس طرح طبیعیات اور کیمیا کے تجربوں کے عملی استعمال سے صنعت نے ترقی کی اسی طرح نفسیات کے تجربوں سے بھی تعلیمی، طبی اور صنعتی فوائد حاصل کئے جانے لگے ابتدا میں نفسیات کا مقصد ایسے عام قوانین معلوم کرنا تھا جو تمام انسانوں کے لئے صحیح ہوں اس زمانے میں انفرادی اختلافات کو نظر انداز کر دیا جاتا تھا مگر اب ان اختلافات کو غیر معمولی اہمیت حاصل ہو گئی ہے چنانچہ نفسیات کا ایک جدید ترین شعبہ انفرادی اختلافات کا مطالعہ کرتا ہے اسی کے عملی استعمال سے پیشے کی نفسیات کی ابتدا ہوئی۔

ہر لڑکے کا مستقبل ایک انفرادی مسئلہ ہوتا ہے پیشہ نما ماہر اپنا فیصلہ صادر کرنے سے پہلے اس کے متعلق وافر مواد حاصل کر لیتا ہے۔

پہلے لڑکے کے والدین اساتذہ اور ہم جماعتوں کی رائے معلوم کی جاتی ہے والدین کی رائے کا صرف قابل اعتماد حصہ احتیاط کے ساتھ نوٹ کر لیا جاتا ہے ماہرین جانتے ہیں کہ والدین عموماً اس قدر لاپروا ہوتے ہیں کہ اپنے لڑکے کے متعلق مختلف موقعوں پر مختلف رائیں ظاہر کرتے ہیں۔

دوسرا اہم قدم لڑکے کی جسمانی حالت اور صحت کے متعلق تفصیلی معلومات بہم پہنچانا ہے۔ یہ امتحان عام طبی امتحانوں سے کسی قدر مختلف ہوتا ہے۔ عام طور پر جب کسی لڑکے کے متعلق طبی رائے یہ ہو کہ "اس کی صحت اچھی ہے" تو اس سے صرف یہ مطلب ہوتا ہے کہ وہ کسی مرض میں مبتلا نہیں ہے۔ پیشہ نمائی اغراض کے لئے ایسی رائے کارآمد نہیں ہو سکتی۔ یہ ممکن ہے کہ ایک لڑکا بیمار نہ ہو مگر اس کی نشو و نما ٹھیک نہ ہوئی ہو یا وہ سخت محنت کے قابل نہ ہو۔ پیشہ نمائی کے لئے جو طبی رائے ہوتی ہے اس میں ایسی تفصیلات ہوتی ہیں مثلاً "یہ لڑکا ایسے پیشے کے لئے موزوں نہیں ہے جس میں پھرتی درکار ہو البتہ ایسے کام کے لئے موزوں ہے جس میں محنت زیادہ ہو خواہ فرصت کم ہی ہو"

"یہ لڑکا ایسے پیشے سے دور ہی رہے جس میں بلندیوں پر چڑھنا یا زینوں پر بہت زیادہ چڑھنا اترنا پڑتا ہو"

اگر لڑکا کم عمر ہو تو اس کو کھیل کے کمرے میں بھیج دیا جاتا ہے جہاں وہ اپنے ہم عمروں کے ساتھ کھیلتا ہے کھیل کے دوران میں اس کے کردار اور سماجی قابلیت کا اندازہ کر لیا جاتا ہے۔ اس کے بعد نفسیاتی نقطۂ نظر سے اس پر چند تجربے کئے جاتے ہیں جن سے اس کی قابلیتوں اور کمزوریوں کا صحیح اندازہ ہو جاتا ہے

پہلے ذہانت کی آزمایش کی جاتی ہے۔ ذہانت کا درجہ ہی اساسی اہمیت رکھتا ہے۔ اسی سے معلوم ہو سکتا ہے کہ وہ اپنے پیشے میں کس حد تک ترقی کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ بہت سے معیاری جدول بنائے گئے ہیں، جن سے ہر پیشے کے لئے ذہانت کے حدود معین ہیں۔ اہل امریکہ نے بڑے پیمانے پر آزمایش کرنے کے بعد پیشوں کی تحلیل کی ہے اور معلوم کیا ہے کہ ہر پیشے کے لئے کس درجہ ذہانت کی ضرورت ہے۔

ذہانتی پیمایش کے بعد خاص قابلیتوں کی پیمایش کی جاتی ہے اس سلسلے میں بیسیوں قسم کی آزمایشیں مرتب کی گئی ہیں ہر آزمایش سے ایسی قابلیتوں کا اندازہ لگایا جاتا ہے جو مختلف قسم کے پیشوں کے لئے ضروری ہیں ایسی تمام آزمایشات کے بعد نتائج پر غور کر کے ماہر پیشہ نمائی معلوم کر لیتا ہے کہ لڑکا کس میدان عمل کے لئے موزونیت رکھتا ہے۔

اب مالی حالت . . . .

شخصی رجحانات و میلان طبیعت کا لحاظ کرتے ہوئے وہ اپنا فیصلہ صادر کرتا ہے۔ پیشہ نما رہبروں کے مشوروں سے مغرب کے نوجوانوں کو بہت فائدہ پہنچا۔ اب وہاں کے نوجوانوں نے صحیح راہ پا لی اور متفکر والدین کی پریشانیاں بھی رفع ہو گئیں ہمارے ملک کے نوجوان بھی پیشہ نما رہبروں کی مدد سے اپنا مستقبل زیادہ خوشگوار اور کامیاب بنا سکتے ہیں۔

حبیب احمد فاروقی

پیشۂ ملازمت

چند ماہ پہلے جناب مہتمم صاحب نشرگاہ نے "پیشۂ وکالت" پر ایک تقریر مجھ سے نشر کرائی تھی۔ اب پھر اصرار ہے کہ "پیشۂ ملازمت" پر بھی میں اپنے خیالات کا اظہار کروں۔ مزے تو میں دونوں معزز پیشوں کے چکھ چکا ہوں اس لئے میرے لئے کوئی دشوار بات نہیں ہے اپنے بکھیڑوں میں الجھے رہنے کی وجہ سے اس کام کے لئے وقت نکالنا مشکل تھا مگر اس مشکل پر بھی میں نے قابو پا لیا ہے اس لئے مہتمم صاحب کی فرمایش کی تعمیل میں معزز "پیشۂ ملازمت" کے متعلق چند جملے کہہ دیتا ہوں۔

میں نے اپنی پچھلی تقریر میں پیشوں کے پیدا اور جاری ہونے کے متعلق جو کچھ بیان کیا تھا وہ پورے کا پورا "پیشۂ ملازمت" سے بھی یکساں طور پر متعلق ہے اس تقریر میں میں نے یہ واضح کیا تھا کہ سوسائیٹی میں حقوق و فرائض کا تصور کس طرح پیدا ہوتا ہے اور ان حقوق کی حفاظت و نگہداشت کے مسئلہ سے "پیشۂ وکالت" کا تعلق ظاہر کرتے ہوئے میں نے یہ کہا تھا کہ "سوسائٹی اپنے حقوق و فرائض کا نفاذ ایسے گروہ کے ذریعہ سے کرتی ہے جس کو قوت دیجاتی ہے یا حاصل ہوتی ہے۔

میرا انشاء اس فقرے سے یہ تھا کہ حکومت یا تو جبر و تسلط کے ذریعہ حاصل کیجاتی ہے یا جمہوریت کے طور پر باہمی انتخاب و رضامندی کے ساتھ کسی خاص شخص یا گروہ کے سپرد کی جاتی ہے اور ہر حال میں ملک کی حکومت ہی سوسائٹی یا گروہ رعایا کے حقوق و فرائض کی حفاظت و نگرانی کرتی ہے۔ گویا خود سوسائٹی ہی حکومت کا سرچشمہ اور اس کو قائم کرنے والی ہوتی ہے اور اس طرح سے حکومت گروہ رعایا کے حقوق و فرائض کی حفاظت کی ذمہ دار ہوتی ہے اور اس ذمہ داری سے عہدہ برا ہونے کے لئے حکومت اپنے معتمد علیہم اشخاص کا تعاون حاصل کرتی ہے اور ان کے ذریعہ سے اپنے اختیارات کا استعمال کرتی ہے۔ یہ اشخاص اجیر ہوا کرتے ہیں جو اپنی خدمات کا معاوضہ کسی نہ کسی شکل میں حکومت سے پاتے ہیں۔ یہ معاوضہ خواہ نقدی ہو یا غیر نقدی لیکن ہر صورت میں معین و موقت ہوتا ہے یعنی ماہواری یا سالانہ۔

پس یہ گروہ پیشہ ور ملازمین کا گروہ ہوتا ہے اور جب ہم "پیشۂ ملازمت" سے کوئی بحث کرتے ہیں تو زیر نظر یہی سرکاری ملازمین کا گروہ ہوتا ہے۔ ورنہ ملازمتیں خانگی بھی ہوتی ہیں جن کا میرے اس مضمون سے کوئی تعلق نہیں۔

سرکاری ملازمت کیا بلحاظ اپنے تعلق و نسبت کے اور کیا بلحاظ مخلوق کی خدمت کے بلاشبہ قابلِ احترام اور یقیناً عزت و عظمت کی مستحق ہے لیکن جو خیال عزت و عظمت کا ہمارے دلوں میں جاگزین ہے وہ درحقیقت عزت و عظمت نہیں بلکہ خوف و رعب کے دور ہوتے ہی اس کے ساتھ ہی چلا جاتا ہے۔ ادھر ملازمت سے کوئی شخص علحدہ ہوا ادھر اس کے رعب داب کا وہم دلوں سے جاتا رہا۔ پھر ہمارے دلوں میں نہ اس کی کوئی عزت باقی رہتی ہے نہ عظمت۔ اور ہمارے نوجوان محض اس سراب کے حاصل کرنے کے لئے ملکی ملازمت کے خواہشمند نظر آتے ہیں ورنہ ملک یا قوم کی بے لوث خدمت کا بہت ہی کم

جوش یا شوق نظر آتا ہے ۔ دراصل سرکاری ملازمین نے خواہ وہ ادنیٰ و اعلیٰ درجہ کے ہوں خواہ متوسط درجہ کے اپنے عمل سے لوگوں کو اس اعتقاد پر ڈال دیا ہے کہ محض ملازمت سرکاری ہی بڑی عزت و عظمت کی چیز ہے نہ کہ خدمتِ خلق ۔ چونکہ عام طور پر سرکاری ملازمین خدمتِ خلق کے جذبہ سے محروم ہیں لیکن باوجود اس کے اپنی پشت پر حکومت یا سلطنت کی قوت رکھتے ہیں جو کہ جا و بے جا ان کی حمایت کے لئے حرکت میں آتی رہتی ہے اس لئے قوت سے مرعوب ہونے کی فطری کمزوری نے عام طور پر یہ خیال پیدا کر دیا ہے کہ صرف سرکاری ملازمت ہی بڑی عزت کی چیز ہے ۔ اور اس خوف و رعب کو جو سرکاری قوت کے خیال سے پیدا ہوتا ہے، ہم لوگ عزت کہتے ہیں ۔ ورنہ درحقیقت ملازمت عزت کی چیز نہیں ہے ۔ جو چیز قابلِ عزت و عظمت ہے وہ مخلوقِ خدا کی خدمت ہے ۔ اور یہ خدمت خواہ ملازمت کے ذریعہ سے کیجائے خواہ بغیر ملازمت کے ہر حال میں مستحقِ عزت ہے ۔

ایک طرف تو حکومت کی قوت کا خوف رعب داب پیدا کرتا ہے دوسری طرف معقول مشاہرہ اور تنخواہ لوگوں کی نظر میں عزت و عظمت کی ایک علامت ہوتی ہے ۔ اس طرح پر یہ دونوں چیزیں مل کر لوگوں کی نظروں میں ایک ایسی چکاچوند پیدا کر دیتی ہیں، کہ ملازمت کی اصل حقیقت کو سمجھنے نہیں دیتی ۔ سرکاری ملازمت صرف اسی وقت واقعی عزت و عظمت کا باعث بن سکتی ہے جبکہ ملازمِ سرکار اپنی ذاتی شخصیت، آبائی اور ہر قسم کے تعصبات سے بالاتر ہو کر مخلوقِ خدا اور ملک کی واقعی خدمت کے جذبہ سے سرشار ہو کر اپنے فرائضِ مفوضہ کو انجام دے ۔

فرض شناسی اور اس کی کما حقہ ادائی بجائے خود ایک خاص عزت و عظمت کی مستحق ہے اور "پیشۂ ملازمت" میں بھی ایک نقطۂ علویت ایک ایسا مقامِ عظمت ہے جس کی ہر شخص کو آرزو کرنا چاہیئے ۔ ورنہ ملازمت کا پیشہ فی نفسہ اس غلامی کے مشابہ ہے جو قوی اور قاہر آقاؤں کے طفیل بڑی بڑی اصلی و حقیقی عزتوں پر غالب آجاتی ہے ۔ اور تاریخ سے ظاہر ہے کہ قوی و قاہر شہنشاہوں کے غلاموں کے سامنے بڑے بڑے ذی عزت و صاحبِ مناصب ارکانِ سلطنت دم نہیں مار سکتے تھے ۔ موجودہ زمانہ میں ہمارے ملک میں تاریخی غلبۂ غلامی کی جگہ ملازمت کے اثر و ہیبت نے لے رکھی ہے ۔

موجودہ جدید تمدن نے ہماری نظروں میں ترقی کا صرف ایک ہی معیار باقی رکھا ہے اور وہ یہ ہے کہ :-

"جسم پر فاخرانہ غیر ملکی لباس اور منہ میں سگریٹ اور ہاتھ میں موٹر کا اسٹیرنگ ہو اور بس"

جب ہماری ترقی کا یہ معیار ٹھہرا تو کون نوجوان ہوگا جو ایسی سرکاری ملازمت کا دلدادہ نہ ہوگا جو ان ذرائع فخر و مباہات کو آسانی تنخواہ کے ذریعہ نہیں تو قرض و رعایا کے عطایا و ہدایا ہی سے سہی لیکن بہرحال پورا ضرور کر دیتی ہے اور کوئی بزرگ یا عزیز دوست اس ترقی یا فتہ نوجوان کو روک ٹوک نہیں سکتا ۔ تنخواہ کے علاوہ اس قسم کی دوسری آمدنی تو بالائی سمجھی جاتی ہے ۔ اگر ملازمت کی تنخواہ (ماصہ) ایکسو پچاس یا (ماٰر) دو سو ہو تو بالائی کم از کم ہزار، بارہ سو ہو ہی جاتی ہے جس کی بدولت

سرکاری ملازمت اس طرح آسانی سے چل جائے وہ دیگر کاروبار کی طرف توجہ ہی کیونکر کر سکتا ہے اس لئے اس کو حکومت کے نشہ میں سارے کاروبار خواہ کتنے ہی منفعت بخش ہوں ذلیل و حقیر نظر آتے ہیں اور عام طور پر انہیں مزیداریوں کی بدولت سرکاری ملازمت کو پر عزت و عظمت پیشہ سمجھا جاتا ہے۔ یہ ہے ہمارا موجودہ پیشۂ ملازمت۔

یہ تو ہے ادنیٰ یا اوسط درجہ کی ملازمت کا نقشہ۔ اعلیٰ ملازمت کی کیفیت یہ ہے کہ اس کا نقشہ ہی دوسرا ہے۔ اختیارات چونکہ وسیع و اعلیٰ ہوتے ہیں اس لئے اگر دل میں خدا کا خوف رعایا کی فلاح و بہبود کا خیال اور نظروں کے سامنے ملک کے قوانین اور اصول نہ رہیں تو جو کچھ نہ کر دیا جائے وہ تھوڑا ہے اس اعلیٰ درجہ کی کارفرمائی کی کیفیت کا اندازہ اس شعر سے ہو سکتا ہے۔

زبر سم سمند سوار سبک عنان
پامال گشت ملک و غبارے نہ دید کس

لیکن جو اعلیٰ حکام خدا کا خوف، رعایا کی بھلائی، ملک کے قوانین و انصاف کو پیش نظر رکھتے ہیں وہ ملک کے لئے ایک رحمت ہیں جن کے سایہ میں ملک واقعی اور حقیقی ترقی کی جانب ...... قدم بڑھا سکتا ہے۔ یہ مختصر سا خاکہ اس معزز ترین پیشۂ ملازمت کا ہے جس پر مجھے اپنے خیالات کے اظہار کے لئے مدعو کیا گیا ہے۔ اس کی تفصیلات میں جانے کا نہ موقع ہے نہ ضرورت ہے۔ پیشۂ ملازمت کے مفہوم کو میں نے واضح کر دیا ہے باقی رہیں تفصیلات وہ عالم آشکارا ہیں عیاں راچہ بیاں۔

اصل حقیقت یہ ہے کہ انسان کے اپنے اختیاری افعال دنیا کے لئے نعمت الٰہی بھی بن سکتے ہیں اور عذاب بھی۔ اس میں کسی پیشے یا نوعیت خدمت کی خصوصیت نہیں ہے۔

مئے نہ اندر ہر سرے شر می کند
ہم چنان را ہم چنان تر می کند

مختصر یہ ہے کہ لوگ ملازمت کو صرف اپنی معاش کا ایک ذریعہ سمجھتے ہیں وہ ملازمت ہی کے ذریعہ ملک و قوم و خدا کی خوشنودی حاصل کر لیتے ہیں اور ان کے جملہ اعمال ملازمت عبادت کا درجہ حاصل کر لیتے ہیں جس طرح دوسرے پیشوں میں پیشہ ور کیساں اخلاق و حالات کے نہیں ہوتے ہیں۔ یہی کیفیت اس "پیشہ ملازمت" میں ہے اگر ایک طرف ان نیک خیال و خیر سگال ملازمین کا گروہ ہے جن کے اعمال ملازمت عبادت ہو جاتے ہیں تو دوسری طرف ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جن کی نسبت کہا گیا ہے

عاملاں در زمان معزولی ۔ بشر حافی و بایزید شوند
چوں بیایند باز بر سرکار ۔ شمر ذی الجوشن و یزید شوند

پیشہ ملازمت کے متعلق ان اشارات کے ساتھ مجھے اپنے سابقہ مضمون "پیشہ وری" کا ایک فقرہ بھی سنا دینا چاہئے۔ جو یہ تھا کہ :۔

"چونکہ زمانۂ موجودہ میں ہمارا کوئی خاص و مختص تمدن نہیں ہے"
"ہم ایک ایسے تمدن کی پیروی کر رہے ہیں جو نہ کبھی ہمارا تھا"
"اور نہ ابھی ہمارا ہوا ہے اس لئے گویا ہم ایک نقلی اور بے جان"
"تمدن کے تعلق سے اپنی سوسائٹی کے ہر شعبہ میں خواہ وہ پیشہ وری کا"
"ہو یا کوئی اور پیشہ، اصلی تمدن اقوام کے پیشوں سے وہی"
"نسبت رکھتے ہیں جو ایک نقل کو اصل سے ہوتی ہے"

پیشۂ ملازمت کے تعلق سے میرا یہ مقولہ انگلستان کی وزارت کے حالیہ واقعات سے بخوبی واضح ہو جاتا ہے مسٹر چرچل و مسٹر چیمبرلین کی وزارت کا آسان سے آسان تر بلکہ خوشگوار تغیر ملک و قوم کی خدمت کے اصلی جذبات کی کیسی اچھی مثال بلکہ تصویر ہے جس کو دیکھ کے آپ کو اصلی و نقلی "پیشہ ملازمت" میں فرق صاف طور پر نظر آ جائے گا۔

والسلام علی من اتبع الھدیٰ

اکبر یار جنگ

پیشۂ معلّمی

دنیا میں سینکڑوں پیشے ہیں اور تمدن کی ترقی کے ساتھ ساتھ ان میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ بلکہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ کسی ملک کے تمدن کی جانچ کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ وہاں کے پیشوں کی تعداد دیکھی جائے، جتنے زیادہ پیشے ہوں گے اتنا ہی زیادہ تمدن ہوگا۔ انسان جیسے جیسے ترقی کرتا ہے اسی کے دوش بدوش تقسیم کار اور تخصیصِ کار بھی ہوتا جاتا ہے۔

مثلاً ریڈیو کو لیجئے اس کی جدید ترین خصوصیات کے باعث ایک زمانے نئے پیشے وجود میں آ گئے اور ایک محکمہ جو کئی ماہرین پر مشتمل ہے قائم ہو گیا۔ اگر ہم دنیا کے تمام قدیم اور جدید پیشوں پر نظر ڈالیں تو یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ ہمارا پیشۂ معلمی قدیم ترین بھی ہے اور جدید ترین بھی۔ یہ کیوں آپ کو آگے چل کر معلوم ہوگا۔ اس پیشے کی ایک اور بھی خصوصیت ہے اور وہ یہ کہ آپ اس کے متعلق بالکل متضاد باتیں سنیں گے۔ کوئی کہتا ہے کہ معلمی شریف ترین پیشہ ہے کوئی کہتا ہے کہ اس سے زیادہ ذلیل کوئی اور پیشہ نہیں ہو سکتا۔ کوئی کہتا ہے کہ معلم عقلمند اور روشن خیال ہوتا ہے کوئی کہتا ہے وہ بیوقوف جاہل اور تنگ خیال ہوتا ہے۔ کوئی کہتا ہے کہ معلم ملک و ملت کا خادم ہوتا ہے کوئی کہتا ہے کہ وہ خود غرض اور لالچی ہوتا ہے غرض یہ کہ جتنی زبانیں اتنی باتیں۔ اور طرفہ تماشا یہ ہے کہ یہ متضاد باتیں کسی خاص دور یا زمانہ یا ملک سے مخصوص نہیں ہیں۔ پرانے لوگ بھی ایسی باتیں کیا کرتے تھے اور اس چودھویں یا بیسویں صدی میں بھی ایسی ہی باتیں کیا کرتے ہیں۔ آج کل معلمین کے متعلق جو کچھ کہا سنا جاتا ہے اس سے تو تھوڑے بہت ضرور واقف ہیں اس لئے میں ایسے گئے گزرے زمانے کا مختصر سا ذکر کرتا ہوں جس کو ہم ہندوستانی عموماً بڑی عزت کی نظر سے دیکھنے کے عادی ہیں۔ آپ نے غالباً یہ تو سنا ہوگا کہ ایک زمانے میں معلم کی ایسی عزت تھی کہ خلیفہ کے چہیتے بیٹے اپنے استاد کے جوتے سیدھے کرتے لیکن شاید آپ نے یہ نہ سنا ہو کہ ایک مشہور عرب مصنف نے معلم کے متعلق یہ لکھا ہے کہ مرد کے مقابل میں عورت کی عقل چالیس درجے کم ہوتی ہے مگر معلم کی عقل عورت سے بھی کم ہوتی ہے۔ ایک اور عرب مصنف نے معلموں کی بیوقوفیوں اور حماقتوں کے اتنے واقعات جمع کر دیے ہیں کہ ایک مستقل کتاب ہو گئی ہے۔ میرے ایک مرحوم دوست مجھ سے ہمیشہ کہا کرتے تھے کہ میں بھیڑ میں بھی مدرس کو پہچان لیتا ہوں۔ میں نے پوچھا وہ کیسے؟ مسکرا کر بولے جس کو روتی صورت دیکھو یقین کر لو کہ اس کا پیشہ معلمی ہے۔

اچھا تو ان متضاد باتوں کی وجہ کیا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ زمانۂ قدیم سے معلمین کی برائی میں جو کچھ آپ سنتے ہیں وہ کم و بیش خود معلمین کی کارستانی ہے وہ اپنی تعریف آپ کرتے ہیں۔ اپنے کو عقلمند، عالم، روشن خیال اور خادم ملک و ملت ظاہر کرتے ہیں اپنی لاچاری، تنگدستی اور غربت کو ایثار کے پردے میں چھپاتے ہیں۔ غرض جن کو ان سے سابقہ پڑتا ہے وہ ان کو بیوقوف جاہل تنگ دل خود غرض اور لالچی بتاتے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود ان کو ناگزیر سمجھتے ہیں اور اپنے بچوں کو تعلیم کے لئے ان ہی کے سپرد کرتے ہیں۔

ایک مشہور مقولہ ہے کہ (   ) معلم پیدائشی ہوتا ہے۔ تیار نہیں کیا جا سکتا۔ اس کی مثال بالکل شاعر کی سی ہے جس کے متعلق بھی یہی کہا جاتا ہے۔ اگر ہم اس مقولے کو صحیح مان لیں تو دیکھنا یہ ہوگا کہ ایسے کتنے پیدائشی معلم مل سکتے ہیں۔ جو نئی نسل کی تعلیم و تربیت کا کام کر سکیں گے شاید ہمارے دور میں ایک بھی ایسا نہ ملے تو پھر کیا ہوگا۔ کیا اس کے انتظار میں مکتب و مدرسے بند کر دئے جائیں؟ نہیں ہرگز نہیں دنیا کے روزمرہ کے کام صرف ایسے پیدائشی لوگوں سے نہیں چلتے۔ بیشک یہ ایک اعلیٰ معیار قائم کرتے ہیں لیکن کام چلانے والے اوسط درجے کے لوگ ہوا کرتے ہیں۔ معلمی کے پیشہ کا معیار اصل میں پیدائشی معلم کا قائم کیا ہوا ہے اور ہر معلم بجا طور پر معلم کی تعریف و توصیف کر سکتا ہے لیکن غیر جب خود اس معلم کی جانچ کسی کے مقررہ معیار کے لحاظ سے کرتے ہیں تو اس کے بالکل خلاف رائے قائم کرتے ہیں اور یہی وجہ اُن متضاد باتوں کی ہے جن کا میں نے ذکر کیا۔

تو اب دیکھنا یہ ہے کہ اس نیک نام یا بدنام پیشۂ معلمی کا انتخاب کرتے وقت کن باتوں کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے تاکہ زندگی اطمینان، کامیابی اور مسرت کے ساتھ بسر ہو سکے اور وہ حاصل ہی مقصد کسی پیشے کے اختیار کرنے سے ہوا کرتا ہے۔

(۱) سب سے پہلے تو یہ یاد رکھنا چاہئے کہ اگر کوئی پیشۂ معلمی کو ذلیل نہ سہی کمتر یا گھٹیا خیال کرتا ہو تو دیانتداری کا تقاضا یہ ہے کہ وہ اس کی طرف رخ نہ کرے بعض اس پیشے کو

صرف اس نیت سے اختیار کرتے ہیں کہ کسی دوسرے پیشے میں آسانی سے منتقل ہو جائیں یہ بھی ایک قسم کی بے ایمانی ہے کسی تعلیم یافتہ کو ہرگز ایسا نہ کرنا چاہئے ۔

(۲) جس کو دولت کمانے کی تمنا ہے اس کو یاد رکھنا چاہئے کہ پیشۂ معلمی میں دولتمند بننے کا کوئی موقع نہیں ہے عام طور پر ایک معلم کے اخراجات ساوی آمدنی کے دوسرے ملازم سے زیادہ ہوا کرتے ہیں مثال کے لئے ساوی ماہوار کے ایک اہلکار اور مدرس کو لیجئے ۔ مدرس کو نہ صرف اپنے مدرسے کے مختلف زائد نصاب مصروفیتوں پر خرچ کرنا پڑتا ہے بلکہ اس کو اخلاقی طور پر ہونہار نادار بچوں کی مدد بھی کرنی پڑتی ہے اچھے مدارس میں ایک پورفنڈ ضرور ہوتا ہے ۔ کونسا ایسا مدرس ہے جو اس کے لئے اپنی ماہوار پر ایک دو پائی فی روپیہ چندہ نہ دیتا ہوا اہلکار اور مساوی ماہوار کے دوسرے ملازم اس قسم کے اخراجات سے بالکل محفوظ رہتے ہیں

(۳) جو سخت محنت اور ایک ہی قسم کے مسلسل کام سے گھبراتا ہو اس کو پیشۂ معلمی کا خیال بھی نہ کرنا چاہئے معلم کو مقررہ اوقات کے پہلے اور بعد بھی کام کرنا پڑتا ہے مدرسے کے اوقات ۱۰ سے ۴ اور ۸ سے ۱۲ ہوا کرتے ہیں یعنی موسم سرما اور برسات میں پانچ گھنٹے اور رمضان اور موسم گرما میں چار گھنٹے لیکن ہوم ورک کی تصحیح، کمزور لڑکوں کی تدریس اور گیمس وغیرہ کے باعث نہ صرف ایام کار میں کم سے کم دو چار گھنٹے زیادہ کام کرنا پڑتا ہے بلکہ تعطیلات میں بھی زائد مصروفیات کے لئے وقت دینے پر مجبور رہتا ہے ۔

سال بسال ایک ہی مضمون کو پڑھانا، ایک ہی قسم کی مشقوں کی جانچ کرنا ایسی نوعیت کے کام ہیں جن سے جی اکتا جاتا ہے ۔ یہ کام وہی عمدگی سے کر سکتے ہیں جن کو اپنے فرائض سے دائمی دلچسپی ہوتی ہے ۔

(۴) جو کمزور اور مریض ہو وہ پیشۂ معلمی کے لئے بالکل ناموزوں ہے اس پیشے کے فرائض انجام دینے کے لئے صحت ضروری ہے ماہرین تعلیم نے تکمیل تعلیم کے لئے چودہ یا پندرہ سال مقرر کئے ہیں ۔ دس یا گیارہ سال مدرسہ اور تین یا چار سال کالج کی تعلیم کے لئے ۔ اسی لحاظ سے ہر سال کا نصاب تقسیم کر دیا گیا ہے اگر معلم کی صحت ٹھیک نہ رہے تو کام میں ہرج ہونا لازمی ہے جس سے ہوگا اور وہ مقررہ مدت میں اپنی تعلیم کی تکمیل نہ کر سکیں گے بعض ممالک اس بات کا اتنا خیال کرتے ہیں کہ معلمین کو رخصت اتفاقی کا حق نہیں دیتے ۔

اگر کوئی یہ سمجھتا ہے کہ وہ پیشۂ معلمی کو اچھا اور باعزت خیال کرتا ہے اس کو دولتمند بننے کی خواہش نہیں ہے، وہ سخت محنت اور ایک ہی قسم کا کام کرنے تیار ہے اور صحت مند اور تندرست ہے تو اس پیشہ میں کامیابی کے لئے چند اور خصوصیات کا ہونا بھی ضروری ہے ۔

یہ کیا خصوصیات ہیں' ان کے تدریجی مدارج کے متعلق ماہرین تعلیم میں اختلاف ہے لیکن وہ سب اس امر پر متفق ہیں کہ اقل ترین خصوصیات یہ ہیں

(۱) انسان بلکہ حیوان سے ایک فطرتی ہمدردی ہونی چاہئے جس کے دل میں درد نہ ہو وہ اچھا معلم یا مدرس نہیں بن سکتا ۔

(۲) جس کے دل میں بچوں سے انس و محبت نہ ہو وہ درس و تدریس کا کام انجام نہیں دے سکتا ۔ بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں جو بچوں سے گھبراتے ہیں ان کے سوالوں کی بوچھار اور حرکتوں سے پریشان ہو جاتے ہیں ۔ بگڑتے ہیں غصے میں آ جاتے ہیں ۔ مار توڑ پر آمادہ ہو جاتے ہیں ۔ یہ ہرگز اپنے فرائض پوری طرح انجام نہیں دے سکتے ۔

(۳) ہر شخص عالم نہیں ہو سکتا لیکن علم کا ذوق رکھنا دوسری بات ہے ۔ جس کو خود مطالعہ کا شوق نہ ہو وہ بھلا بچوں میں مطالعہ کا شوق کیسے پیدا کر سکتا ہے وہی مدرس کامیاب مدرس ثابت ہوتا ہے جو تمام عمر طالب علم رہنا چاہتا ہے ۔

(۴) ایک ایسے ملک میں جہاں مختلف مذاہب اور عقائد کے لوگ یہاں ایک ساتھ رہتے ہوں مدرس میں رواداری نہایت ہی ضروری ہے جب تک یہ خصوصیت اس میں نہ ہو وہ نہ اچھی تعلیم دے سکتا ہے اور نہ رواداری کا جذبہ اپنے شاگردوں میں پیدا کر سکتا ہے جو موثر تعلیم، امن و امان اور ملک کی ترقی کے لئے ضروری ہے ۔

(۵) ہر پیشہ میں کامیابی کے لئے اس پیشے کی فنیت سے پوری واقفیت ضروری ہے ۔ فن تعلیم اب ایک سائنس ہو گیا ہے جب تک اصول تعلیم و طریقۂ تعلیم سے پوری طرح واقفیت حاصل نہ کر لی جائے یعنی ٹریننگ یا تربیتی نصاب کی تکمیل نہ کی جائے اس پیشے میں کامیابی حاصل نہیں ہو سکتی ۔

یہ ظاہر ہے کہ انسان کوئی پیشہ اپنے اور اپنے متعلقین کے پیٹ پالنے کے لئے اختیار کرتا ہے اس لئے اپنی معروضہ ختم کرنے سے پہلے میں یہ بتلانا چاہتا ہوں کہ ہماری ریاست میں اس نقطۂ نظر سے کیا مواقع حاصل ہیں۔

ہماری ریاست ابد مدت کے سررشتہ تعلیمات کے قواعد کے لحاظ سے مستقل سرکاری ملازمت کے لئے ٹریننگ لازمی ہے۔ مدرسین کی چار قسمیں ان کی اسنادی قابلیت کے لحاظ سے قرار دی گئی ہیں۔

(۱) مڈل یا ڈپلوما ٹرینڈ۔ یعنی امتحان کامیاب یا جدید اسکیم کے تحت ورسکنڈری یا ثانویہ ادنیٰ کامیاب۔ ان کے لئے دو سالہ ٹریننگ کا نصاب تجویز کیا گیا ہے سرکاری مدارس میں ان کو (۳۰) تا (۴۰) کا گریڈ ملتا تھا۔ ولکلفنڈ کے مدارس کے گریڈ میں ناظم صاحب تعلیمات دقت کی کوشش سے اصلاح ہوگئی ہے اور اب ابتدائی ماہوار (۳۰) تا (۴۰) کر دی گئی ہے۔

(۲) میٹرک کامیاب ٹرینڈ۔ اس کے لئے پرانا گریڈ (۵۵) تا (۸۰) تھا اب (۵۰) تا (۸۰) ہوگیا ہے۔

(۳) ایف اے ٹرینڈ کا گریڈ (۹۰) تا (۱۲۰) ہے لیکن جدید تنظیم میں (۸۰) تا (۱۲۵) قرار دیا گیا ہے۔

(۴) بی اے ٹرینڈ۔ ان کا گریڈ (۱۵۰) تا (۲۰۰) تھا لیکن جدید تنظیم میں (۱۱۰) تا (۱۳۵) مقرر ہوا ہے۔ چند مخصوص گزیٹیڈ گریڈ سے کے لئے بی۔ اے ٹرینڈ ہی کو منتخب ہونے کا موقع ہے اور یہ فرسٹ گریڈ یعنی آٹھ سو ہزار کے گریڈ تک پہنچ سکیں گے۔

ہماری حکومت نے ٹریننگ کے لئے تین نارمل اسکول اور ایک کالج قائم کیا ہے نارمل اسکولوں کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ ملکی زبانوں یعنی مرہٹی تلنگی اور کنڑی کی تعلیم کا خاص انتظام کرتے ہیں اور مدارس تحتانیہ کے لئے خاص طور پر مدرسین تیار کرتے ہیں۔ امیدوار ٹریننگ کے لئے سالانہ اخراجات ڈیڑھ سو کے قریب ہوتے ہیں۔ ٹریننگ کالج میں مدارس ثانویہ کے لئے مدرسین کی تربیت ہوتی ہے۔

سجاد مرزا

اردو دانی کی کتابیں

ان کتابوں کو ملک کے مشہور ماہر تعلیم مولوی سجاد مرزا صاحب ایم۔ اے (کنٹب) نے اپنی نگرانی میں مرتب کرایا ہے یہ کتابیں جدید ترین اصول تعلیم کے مطابق تیار کر کے چھاپی گئی ہیں۔ جو اصحاب اردو کی توسیع و اشاعت اپنا فرض منصبی سمجھتے ہیں وہ یقیناً ان کتابوں کو دیکھ کر بہت خوش ہوں گے اور اپنے بچوں اور عزیزوں اور ملازمین کو اردو سکھانے کے لئے ان سے بہتر کتابیں نہیں مل سکیں گی۔ قیمت حصہ اول صرف ۲ر ۶م حصہ دوم صرف ۴ر ۶م

گداگری

گداگری کے معنی ہیں بھیک مانگنے کا پیشہ جیسے زرگری آہن گری سوداگری وغیرہ پیشے ہیں اسی طرح گداگری بھی ایک پیشہ ہے۔ ہر ایک پیشے والا کچھ نہ کچھ بناتا یا سنوارتا ہے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ گداگر کیا بناتا یا سنوارتا ہے، پیسہ یا روٹی طلب کرتا ہے تو اس کے بدلے میں کیا خدمت پیش کرتا ہے۔ گداگری کا پیشہ تمام پیشوں سے الگ نوعیت کا ہے۔ دوسرے پیشوں کے ساتھ اس کو یہ مناسبت تو ضرور ہے کہ یہ بھی ایک فن ہے بغیر سیکھے سکھائے نہیں آتا۔ اور بڑا وسیع فن ہے۔ اس میں کامل ہونے یا کامیاب ہونے کے لئے ماہر نفسیات ہونے کی ضرورت ہے موقع شناسی، مردم شناسی، مصلحت شناسی، استقلال، ثابت قدمی، ارادے کی پختگی اور ہمت سے اور جوہر اس پیشے کے لئے دوسرے پیشوں کے مقابلے میں بہت زیادہ درکار ہیں۔ عام خیال یہ ہے کہ بیمار اور کمزور اور اپاہج لوگ گداگر ہوتے ہیں لیکن معاملہ اس کے برعکس ہے۔ گداگری کے لئے بہت اچھی صحت اور اچھی خوراک درکار ہے۔ صبح سے شام تک چلتی گاڑیوں کے پیچھے میلوں دوڑ دوڑ کر ایک ایک پیسہ وصول کرنا بڑی ہمت اور قوت کا کام ہے۔ ہر وقت چوکنا رہنا کسی موقع کو ہاتھ سے نہ جانے دینا بڑی ہشیاری کا کام ہے۔

لیجئے بھیک دوڑ کر گر ہے گداگری کا یہ

جس سے لے جہاں لے جو لے اور جب لے

اس طبقے کے متعلق کوئی صحیح رائے قائم کرنے سے پیشتر یہ مناسب ہوگا کہ پہلے ذرا جائزہ لے لیں کہ بھکاریوں کی کتنی قسمیں ہیں اور بھیک مانگنے کے کتنے وجوہ ہو سکتے ہیں ہر قسم کا عمل اور ہر پیشہ کسی نہ کسی ضرورت سے پیدا ہوتا ہے۔ اس لئے یہ بھی دیکھنا چاہئے کہ کن وجوہ سے کوئی شخص بھیک مانگنے پر آمادہ ہوتا ہے۔ پہلی صورت یہ ہو سکتی ہے کہ ایک شخص بیماری یا کسی اور وجہ سے لاچار اور بیکار ہو گیا ہے۔ کوشش کے باوجود بھی کچھ کما نہیں سکتا۔ زندہ رہنے کے لئے قوت لایموت درکار ہے وہ دیکھتا ہے کہ بدقسمتی سے میں نان شبینہ کا محتاج ہوں۔ اور دوسروں کے پاس وافر سامان موجود ہے۔ وہ اپنی نوع کے سامنے دست سوال دراز کرتا ہے۔ اس کو برا سمجھتا ہے، اسے شرم آتی ہے۔ لیکن مجبور ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ صورت قابلِ رحم اور قابلِ امداد ہے۔ تمام خلق عیال اللہ ہے ایک انسان کا دوسرے انسان پر ایک عام حق ہے اس لئے ایسی صورت میں کسی کا کسی سے کچھ طلب کرنا گناہ نہیں۔ اور کسی کو کچھ دے دینا کچھ احسان نہیں اس لئے قرآن کریم نے فرمایا ہے کہ فقرا اور مساکین کا تمہارے اوپر حق ہے۔ کسی جماعت کے پاس جو رزق یا سامان موجود ہے وہ جماعت کی مشترکہ کوششوں کی پیداوار ہے اس لئے لازمی ہے کہ ایک جماعت اپنے تمام افراد کی ابتدائی ضرورتیں مہیا کرے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ کوئی شخص ایسے حالات میں مبتلا ہو جائے کہ اس کو آسانی سے کافی روزی میسر نہیں آتی۔ خاص طور پر کام کاج کے مرغوب تلاش کرے اور ادنیٰ قسم کے کام اور مشقت کے کام کرنے پر آمادہ ہو جائے۔ تو اپنا اور گھر والوں کا پیٹ پال سکتا ہے۔ لیکن وہ زحمت سے گریز کرتا ہے۔ اور آسان راستے تلاش کرتا ہے تلاشِ رزق کے دو آسان راستے ہیں ایک چوری اور دوسرے بھیک مانگنا۔ اپنے ماحول اور اپنی فطرت کی مناسبت سے ایسے حالات میں بعض لوگ چور بن جاتے ہیں اور بعض گدا۔ لیکن چوری کا یہ حال ہے کہ چوری کے سمندر میں موتی بھی ملتے ہیں اور مگرمچھ بھی۔ کبھی غوطہ لگانے سے موتی مل گیا اور کبھی غوطہ زن نہنگ قانون کے جبڑوں میں آگیا۔ کچھ ہمت کا شائبہ طبیعت میں موجود ہو تو لوگ چور یا ڈاکو ہو جاتے ہیں۔ اور اگر بے ہمتی طاری ہو تو گداگری زیادہ محفوظ طریقہ ہے۔

بلیاد منافع بے شمار است　؎　وگر خواہی سلامت برکنار است

کوئی خوددار شخص تنگ دستی میں نہ چوری پر آمادہ ہوگا نہ گدائی پر۔ جب تک کوئی طریقہ بھی کسی قسم کی محنت سے اجرت حاصل کرنے کا باقی ہے، وہ اس کے لئے تیار نہ ہوگا۔ امیر عبدالرحمٰن خاں شاہ افغانستان کی زندگی عجیب و غریب حوادث اور انقلابات میں گزری۔ ایک زمانہ اس پر ایسا بھی گزرا جب وہ اپنی اصل حیثیت کو چھپا کر افغانستان اور روس کے علاقوں میں مارا مارا پھرتا تھا۔ نہ اس کے پاس کوئی سامان تھا نہ یار و مددگار۔ بڑی جستجو کے بعد قسمت نے

پلٹا کھایا۔ تو وہ تختِ کابل پر متمکن ہوا۔ وہ بادشاہ بھی تھا سپہ سالار بھی اور قاضی بھی۔ روزانہ دربار میں خود مقدمات کا فیصلہ کرتا تھا۔ ایک روز ایک مجرم پیش ہوا کہ یہ چوری میں پکڑا گیا ہے۔ امیر نے دریافت کیا کہ تم نے چوری کیوں کی۔ اس نے جواب دیا کہ بھوکوں مر رہا تھا پیٹ سے مجبور ہو کر چوری کی۔ امیر نے کہا کہ عذر نا قابلِ قبول ہے۔ بھوک فقط بد اخلاق آدمی ہی کو چوری پر مجبور کر سکتی ہے۔ مجھ پر افغانستان کے موسم سرما میں ایک زمانہ ایسا آیا کہ میرے پاس کھانے کو کچھ نہیں تھا میرے پاس ایک قیمتی لحاف باقی تھا۔ اگر اس کو بیچ دوں تو سردی میں ٹھٹھر جانے کا اندیشہ تھا۔ لیکن میں نے اس مصیبت کو قبول کیا اور وہ لحاف ایک سوداگر کے پاس چند روپیوں میں گرو رکھ دیا۔ یہ پیسہ بھی ختم ہو گیا۔ تو پھر روٹی کی فکر دامن گیر ہوئی۔ لیکن میرے ضمیر نے نہ چوری کی طرف توجہ کی اور نہ گداگری کی طرف۔ دیکھا کہ ایک جگہ عمارت بن رہی ہے میں مزدوروں میں شامل ہو گیا۔ تمام دن اینٹ اور پتھر اپنی پیٹھ پر لاد لاد کر حلال کی روزی مہیا کرتا تھا۔ اور خدا کا شکر ادا کرتا تھا بھوک صرف رذیل انسان کو چوری یا گدائی پر آمادہ کرتی ہے یہ کہنے کے بعد حکم دیا کہ اس پر حد جاری کی جائے۔

رسولِ کریم کی زندگی کا ایک واقعہ ہے کہ ایک شخص آپ کی خدمت میں سوالی بن کر حاضر ہوا اور محتاجی کی بنا پر بطور گدا کچھ طلب کیا۔ آنحضرت نے پوچھا کہ کیا تمہارے پاس کچھ سامان نہیں اس نے کہا کہ ایک چمڑے کا ٹکڑا ہے۔ فرمایا کہ وہ لے آؤ۔ وہ لے آیا۔ تو فرمایا کہ اس کو فروخت کر کے ایک کلہاڑی خرید اور جنگل سے لکڑی کاٹ کر شہر میں فروخت کر۔ پھر کچھ روز کے بعد میرے پاس آنا۔ اس نے ایسا ہی کیا کچھ روز کے بعد آیا تو آنحضرت نے دریافت فرمایا کہ کیا حال ہے۔ اس نے جواب دیا کہ خدا کا شکر ہے حلال کی روزی میسر آتی ہے اور میں گدائی کی ذلت سے بچ گیا ہوں۔

اوّل تو سوال کرنا خودداری کے منافی ہے دوسرے بوقت ضرورت سوال کر کے کچھ مہیا کر لینے میں خطرہ یہ ہے کہ رفتہ رفتہ سائل کو یہ چسکا پڑ جاتا ہے اور وہ سمجھنے لگتا ہے کہ بغیر خدمت اور محنت کے محض سوال کرنے سے اچھی خاصی روزی مہیا ہو سکتی ہے۔ اس کے بعد وہ پیشہ ور گدا ہو جاتا ہے اور کسی کام کرنے پر آمادہ نہیں ہوتا۔

گداگری کا ایک تیسرا اہم سبب غلط قسم کی مذہبیت ہے۔ اسلام سے قبل تقریباً تمام مذاہب میں رہبانیت کو اعلیٰ درجے کی روحانیت تصور کیا جاتا تھا۔ دنیا اور اس کے کاروبار ذلیل تصور ہوتے تھے جو شخص مذہب کو پیشہ بنا لیتا وہ روحانی اعتبار سے بہت برگزیدہ شمار ہوتا تھا۔ جماعت کا فرض تھا کہ ان گوشہ نشینوں کی ضروریات کو پورا کرے۔ عیسائی راہب، بدھ بھکشو اور ہندوستانی سادھو اسی نظریہ سے پیدا ہوئے۔ ان میں سے اکثروں نے اپنا دین بھی خراب کر دیا۔ اور سوسائٹی میں نکموں کا اضافہ بھی کیا۔ اسلام نے واضح طور پر اس کے خلاف تعلیم دی لیکن پہلی تہذیبوں کے اثرات سے مسلمانوں میں بھی کثیر تعداد مذہبی گداگروں کی پیدا ہو گئی ہندوستان میں سادھوؤں اور فقیروں کی تعداد چالیس لاکھ سے کم نہ ہو گی۔ جب کبھی ان کے انسداد کا مسئلہ پیش ہوتا ہے تو غلط قسم کی مذہبیت آڑے آتی ہے اور حکومت اگر چاہے بھی لوگوں کے مذہبی جذبات کو مدنظر رکھتے ہوئے کوئی اہم اقدام نہیں کر سکتی۔

اس قسم کی مذہبیت سے گداگری کی بڑی ہمت افزائی ہوتی ہے۔ ضعیف الاعتقاد لوگوں کو خیال ہوتا ہے کہ سادھو کے سوال کو رد کیا تو کوئی بڑی آفت آ جائے گی اسی لئے مانگنے والا اس دھڑلے سے مانگتا ہے کہ گویا وہ مقروض سے اپنا قرض واپس لینا چاہتا ہے۔ ہندوستان میں قدیم زمانے سے ایک دستور چلا آتا ہے کہ سادھو دھرنا دے کر بیٹھ جاتے ہیں یہ گدائے بیرم قصائے مبرم ہوتا ہے۔ سادھو کہتا ہے کہ جب تک میرا سوال پورا نہیں کیا جائے گا میں دروازے سے نہیں ہلوں گا بھوکا اور پیاسا مر جاؤں گا سردی میں ٹھنڈا ہو جاؤں گا۔ نہ دینے والا خود اور اس کے اہل و عیال کئی جنموں تک اس پاپ کی پاداش بھگتتے رہیں گے یہ سادھو بڑا ستیاگرہی ہوتا ہے۔ سیاسی اغراض کے حصول کے لئے عدم تشدد کے ساتھ ستیاگرہ کا طریقہ اسی قدیم رسم سے اخذ کردہ ہے۔ کوئی سیاسی

لیڈر اس کا موجد نہیں۔ نئی بات صرف اتنی ہے اس کو سنیاسی گداگری میں استعمال کیا گیا ہے، اس فن کے ماہرین اور کاہیں گداگروں کے طبقے میں ملتے ہیں۔ یہ لوگ دنیا کو ترک کر کے دنیاداروں سے زیادہ مزے کی زندگی بسر کرتے ہیں تمام ملک میں ریلوں میں مفت سفر کرتے ہیں آج تک کبھی کسی سادھو نے ٹکٹ نہیں خریدا، جہاں کسی تنقیح کرنے والے نے اعتراض کیا اور سخت سست کہا وہیں اگلے اسٹیشن پر اتر گئے اور بعد میں آنے والی ریل میں سوار ہو گئے، بعض ٹکٹ چیک کرنے والے ان سے چشم پوشی بھی کرتے ہیں اور سرکاری آمدنی کو نقصان پہنچا کر ثواب کما لیتے ہیں۔ میں ایک مرتبہ رات کے وقت ہندوستان کے کسی اسٹیشن سے سوار ہوا ڈبہ خالی تھا میں خوش ہوا کہ تنہائی میں چین سے سوؤں گا، بستر ابرتھ پر بچھا دیا، جب ٹرنک کو برتھ کے نیچے ڈھکیلنے لگا تو اس کو کسی چیز سے ٹھوکر لگی اور ایک انسان کی آواز نکلی دیکھا تو برتھ کے نیچے ایک سادھو چھپ کر اس انداز سے لیٹا ہے کہ کسی شخص کا وہم و گمان بھی اس طرف نہیں جا سکتا، ٹرنک سے ٹھوکر کھا کر وہ اٹھا اور اپنے تارک الدنیا ہونے کا ہم پر احسان جتا کر اتر گیا، لیکن اس امر کو فراموش نہیں کرنا چاہئے کہ گداگری کے بارے میں تمام تر قصور ان افراد کا نہیں ہے جو گداگری کرتے ہیں اس کی بہت کچھ ذمہ داری جماعت کے معاشی نظام پر عائد ہوتی ہے۔ اگر جماعت کا معاشی نظام اس قسم کا ہے کہ اس میں بیماروں، ناداروں اور بیکاروں کا کوئی خاطر خواہ انتظام نہیں تو ان کے اندر گداگری کا موجود ہونا لازمی ہے، اکثر مغربی ممالک میں گداگری جرم قرار دیا گیا ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ بیماروں کی دیکھ بھال کا بڑے وسیع پیمانے پر انتظام ہے، اگر کسی شخص کو واقعی کوئی کام نہیں مل سکتا تو اس کو مملکت کی طرف سے قوت لا یموت ملتی ہے، جہاں پر بیماروں اور بیکاروں کی اتنی کثیر تعداد ہو جتنی ہندوستان جنت نشان میں ہے، جن کے متعلق مملکت کوئی ذمہ داری محسوس نہیں کرتی اور معاشی نظام میں کوئی اساسی تبدیلی کرنے پر تیار نہیں، وہاں لاکھوں گداگروں کا موجود ہونا کونسی تعجب کی بات ہے، مغربی ممالک میں بھی جہاں کا نام سرمایہ داری کا نظام ہے گدائی مختلف قسم کے بھیس بدل کر موجود رہتی ہے۔ لندن میں جابجا ایسے بڈھے بڈھیاں یا بیمار ملتے ہیں جو سر بازار دیاسلائیوں کے بکس سامنے رکھ بیٹھتے ہیں، ہر رہ گیر کو معلوم ہے کہ یہ بھیک مانگ رہے ہیں لیکن پولیس ان کو منع نہیں کر سکتی اس لئے کہ وہ بظاہر کچھ فروخت کر رہے ہیں، خیرات کرنے والے ان سے دیاسلائی کی بکس لے کر زائد قیمت دے دیتے ہیں۔ میں نے ایک اسی قسم کے دیاسلائی بیچنے والے کو کچھ پیسے دئے اور کہا کہ یہ لے لو، میں دیاسلائی نہیں لیتا، اس نے اصرار کیا کہ تم کو دیاسلائی لینا پڑے گی ورنہ اپنے پیسے واپس لے لو۔

گداگری کے جرم ہونے کے باوجود مغربی ممالک میں بھی بعض گداگر بڑے صاحبِ فن ہوتے ہیں اور اس پیشے سے بڑی بڑی دولتیں جمع کر لیتے ہیں، دس سال قبل کا واقعہ ہے میں پیرس میں ایک ڈنر میں مدعو تھا، میزبان ایک انگریز شہزادی تھیں جن کو اسلام سے دلچسپی تھی، اسی رابطے سے میں اس ڈنر میں شریک ہوا، وہاں گداگری کا ذکر چھڑا تو ایک اعلیٰ طبقے کی انگریز خاتون نے اپنا ایک قصہ بیان کیا، وہ فرمانے لگیں کہ پیرس کی ایک محفل میں گداگری پر گفتگو ہوئی، حاضرین میں سے بعض نے کہا کہ ان کی حالت بڑی قابلِ رحم ہوتی ہے۔ بعض نے اس کے برخلاف کہا کہ گداگری بڑا منفعت بخش پیشہ ہے اور اس میں بڑی آمدنی ہوتی ہے۔ اس خاتون نے فرمایا کہ خود میری بھی رائے تھی کہ یہ لوگ خوب کماتے ہیں، سننے والوں نے کہا کہ ایک روز گداگری کر کے دیکھو تو پتہ چل جائے گا کہ کس ذلت اور مصیبت سے سوکھی روٹی ملتی ہے۔ میں اس تجربے پر آمادہ ہو گئی، گھر کی صفائی کرنے والی نوکرانی سے میلے کچیلے پھٹے پرانے کپڑے مانگ کر پہن لئے اور ان نلی نسے میں جو پیرس کی بہترین سیرگاہ ہے ایک ہوٹل کے سامنے کھڑی ہو گئی اور صبح سے شام تک ایک فقرہ دہراتی رہی کہ اللہ کے نام پر کچھ دو۔ وقتاً فوقتاً پولیس والے مجھ کو وہاں سے ہٹا دیتے تھے، میں چند قدم دور جا کر کھڑی ہو جاتی تھی، کسی نے مجھ کو ایک نیک سوالی سمجھ

دو کسی نے پانچ بھی دئے اور بعض امریکن سیاحوں نے دس دس فرنک بھی دئے۔ رات کو گھر واپس آکر پوری رقم گنی تو گیارہ سو فرنک بنے۔ میں نے معترض نقادوں کو اکٹھا کیا اور وہ رقم ایک روز کی کمائی ان کے سامنے رکھ دی وہ حیران رہ گئے اور بعض تمسخر کرنے لگے کہ شاید تمہاری صورت کی قیمت بھی اس میں داخل ہو۔ یہ بڑا عجیب و غریب تجربہ تھا اس خاتون نے بیان کیا کہ بازی جیت کر میں نے یہ تمام رقم غربا اور مساکین میں تقسیم کر دی۔

قصہ مختصر یہ کہ گداگری کا وجود اخلاقی اور معاشی بیماریوں میں سے ہے جس جماعت میں یہ موجود ہو اس کی معاشرت صحت سے معرا ہے۔ روس والوں نے کوشش کرکے گداگری کا کامل انسداد کر دیا ہے۔ اور غالباً اس وقت روس ہی ایک ایسا ملک ہے جہاں کسی رنگ میں کوئی شخص گداگری نہیں کرتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ گداگری کے جتنے اسباب ہو سکتے ہیں وہ سب دور کر دئے گئے ہیں۔ اب وہاں نہ مذہبی فقیری ہو سکتی ہے نہ معاشی فقیری۔ نوع انسان کا ایک بڑا گروہ اس ذلت سے بچ گیا ہے جس سوسائٹی میں ناجائز جلب منفعت کرنے والے طبقے موجود ہوں گے جو مملکت کی تمام پیداوار کو لپیٹ کر آپس میں بانٹ لیتے ہیں وہاں گداگری کا انسداد نہیں ہو سکتا۔ جو سلطنتیں قارون کے خزانے انسانوں کے تباہ کرنے کے سامان مہیا کرنے اور چند افراد کے لئے سامانِ عشرت پیدا کرنے میں صرف کرتی ہیں ان سے جب گداگری جیسی ذلت کے دور کرنے کے لئے کہا جائے تو اکثر یہ جواب ملتا ہے کہ اس میں بڑا روپیہ خرچ ہو گا جس کی مملکت متحمل نہیں ہو سکتی۔ میں سمجھتا ہوں کہ سب سے زیادہ گداگر ہندوستان میں ملتے ہیں جس کے اسباب میں ابھی بیان کر چکا ہوں مگر گداگری مذہب کا لازمی جزو سمجھا جائے اور ہندوستان اس قسم کے مذہب پر ہٹ دھرمی قائم رہے تو اس مرض کا کوئی علاج نہیں لیکن اگر اس کو ایک معاشی اور اخلاقی مسئلہ تصور کیا جائے تو کوئی وجہ نہیں کہ قوم کی توجہ سے اس کا خاطر خواہ علاج نہ ہو سکے اب تو یہ حال ہے کہ ایک ایک موٹر نشین کے گرد چار پانچ سات سات خبیث بیماریوں میں مبتلا ہو کر بھیک مانگنے جمع ہو جاتے ہیں اور اصرار کرتے ہیں کہ سب کام چھوڑ کر پہلے ہم سے نبٹ لو وہ سفید پوشوں کا دامن پکڑنے سے بھی گریز نہیں کرتے خدا جانے کتنے جراثیم ان کی وجہ سے روزانہ امرا کے طبقے میں منتقل ہوتے رہتے ہیں۔

بہت سے یتیم خانے ایسے ہیں جو یتیموں کو بھیک مانگنا سکھاتے ہیں اس کا نام چندہ وصول کرنا ہے وہ دروازوں پر آکر پیشہ ور گداؤں کی قسم کے آوازے لگاتے ہیں گا گا کر مانگتے ہیں ایسے یتیم خانے چلانے والے ثواب کی بجائے عذاب کے مستوجب ہیں بچوں کو گداگری کا ایسا فن سکھاتے ہیں اور ایسا چسکا لگانے پر وہ تمام عمر کوئی اور کام نہیں کریں گے۔

خلیفہ عبدالحکیم

طب کا علم اور پیشہ

طب کی تعریف میں بعض ایسے علوم کا جاننا داخل ہے جو صحت کے دوران میں انسانی جسم کے مختلف حصوں کی ساخت اور ان کے اعمال سے تعلق رکھتے ہیں۔ اور بیماری کی حالت میں ان کے اندر جو تبدیلیاں ہوتی ہیں ان کی نوعیت پر روشنی ڈالتے ہیں۔ فن یا پیشۂ علاج کے لئے اس علم کا استعمال بھی طب کہلاتا ہے۔

دوسرے تمام حیوانی جسموں کی طرح انسانی جسم بھی ان تمام عنصروں سے ترکیب دیا گیا ہے جو قدرت کے کارخانے میں پائے جاتے ہیں انسانی جسم خود ایک چھوٹی سی کائنات ہے۔ اس لئے صرف حکیم ہی طبیب بن سکتا ہے یہی وجہ ہے کہ متمدن ملکوں میں طبیب یا جراح تو بڑی بات ہے دانتوں یا آنکھوں کا معالج بننے سے پہلے بھی حکیم یعنی ماہرِ علوم ہونا ضروری ہے۔

علم طب کی تاریخ دراصل انسانی علم کے نشو ونما اور ارتقا کی تاریخ ہے۔ افسوس ہے کہ ۱۵ منٹ کی تقریر میں مجھے بے حد اختصار سے کام لینا پڑیگا۔

قدیم میسوپٹیمیا (Mesopotamia) مصر اور ایران کے دقیانوسی طب کے قطع نظر باقاعدہ طب کی حقیقی ابتدا یونانی ہندوستانی اور عربی طب میں پائی جاتی ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ یونانی اور ہندوستانی اصولوں میں غیر معمولی مماثلت ہے۔ عربی علم طب میں تو صرف یونانی طبی اصول ہی کو وسعت اور ترقی دی گئی ہے بہر حال ان تمام ملکوں، خاص طور پر یونان اور ہندوستان کے طبی اصولوں میں علمی طور پر طبی معلومات حاصل کرنے کی کوشش کے ساتھ ساتھ توہم اور جادو کے چند حیرت میں ڈالنے والے پرانے عقیدے بھی پائے جاتے ہیں۔ اس سلسلے میں مذہبی پیشوا کے طریقۂ علاج کو بھی بہت اہمیت حاصل تھی۔ یہاں میں قدیم زمانہ کی صرف ایک یا دو ممتاز شخصیتوں کا ذکر کرتا ہوں۔ یونان میں بقراط (Hippocrates) اور جالینوس (Galen) ہندوستان میں چرکا (Charaka) عربستان میں رازی اور بوعلی سینا بہت بلند مرتبہ حکیم گذرے ہیں۔ بقراط "علم طب کا باپ" کہلاتا ہے ایک بلند پایہ طبیب کی حیثیت سے حکمت فلسفہ اور علم الاخلاق میں اب تک بقراط سے کوئی بھی نہیں بڑھ سکا۔ اس کے چند اقوال سنئے۔

۱۔ وہ طبیب جو فلسفی بھی ہو اس میں الوہیت کی سی صفت پائی جاتی ہے
۲۔ طب کے تمام علم اور عمل کا مقصد یہ ہے کہ بیمار صحت پا جائے۔ ۳۔ زندگی کم اور علم بہت ہے۔ وقت تیزی سے گزر رہا ہے تجربہ خطرناک اور فیصلہ مشکل ہے۔ طبیب کو نہ صرف اس بات کے لئے تیار رہنا چاہئے کہ خود اپنے فرائض انجام دے بلکہ اس کا یہ بھی فرض ہے کہ وہ علاج میں بیمار اس کی تیمارداری کرنے والے اور ان کے ماحول ان سبوں سے پورا پورا فائدہ اٹھائے۔

بقراط کے اقوال میں سے صرف ایک دو ہی بیان کئے گئے ہیں لیکن بقراط کے مضامین میں اس مضمون کو بہت اہمیت حاصل ہے جس کا عنوان "حلف" یا "قسم" ہے اس مضمون میں جو صداقت خلق اور انسانی اخلاق کا سبق دیا گیا ہے وہ اس قدر بلند و برتر ہے کہ آج تک اس سے بہتر تعلیم کا نمونہ کوئی دوسرا حکیم پیش نہ کر سکا۔

وہ "قسم" یہ ہے۔

میں Asclepius کی قسم کھا کر وعدہ کرتا ہوں کہ میری قابلیت اور سمجھ کے مطابق میں اس "قسم" اور عہد کا پابند رہوں گا جس نے مجھے یہ علم سکھایا ہو اسے اپنے ماں باپ کے برابر سمجھوں گا اور اپنی کمائی سے اس کا حق ادا کروں گا میں اس طبی اصول کو اختیار کروں گا جو میرے نزدیک مریض کے لئے مفید ہو مضر اور نقصان پہنچانے والی چیزوں سے پرہیز کروں گا کسی کے مانگنے پر بھی میں زہریلی دوا دونگا اس کے متعلق مشورہ۔ کسی عورت کو حمل گرانے کے لئے "دم آلہ" نہیں دوں گا۔ اپنی زندگی پاکی اور پارسائی سے گزاروں گا۔ میں چاہے کسی کے گھر جاؤں وہاں صرف بیمار کی بھلائی کے لئے داخل ہوں گا۔ ہر اس کام سے پرہیز کروں گا جو نقصان پہنچانے اور خرابی پیدا کرنے والا ہو۔ مردوں یا عورتوں آزادوں یا غلاموں کو نہیں بہکاؤنگا میں اپنے پیشے کے سلسلے میں کسی اور طرح انسانوں کی زندگی سے متعلق ایسی باتیں سنوں یا دیکھوں جن کا باہر ذکر کرنا مناسب نہ ہو تو میں ان کی باتوں کو فاش نہیں کروں گا۔ بلکہ انہیں چھپاؤں گا جب تک کہ میں اس قسم پر قائم رہوں اس وقت تک خدا کرے کہ میں زندہ رہوں اور اس علم سے

لوگوں کو فائدہ پہنچاؤں جسے لوگ عزت کی نظر سے دیکھتے ہیں اور جس روز اس قسم کو توڑ دوں خدا کرے کہ میں اس دنیا سے اٹھ جاؤں"۔

اس کے بعد بو علی سینا کی ممتاز شخصیت ہے جنہیں ہمارے حکیم نہایت عزت و محبت سے "شیخ" پکارتے ہیں بنیادی طب کے سلسلے میں کئی اور طبیبانہ مضامین کے علاوہ (Cancer) جس کے متعلق شیخ کی تحقیق اور مستند بیان طبی دنیا میں ہمیشہ باقی رہیں گے اس کی نبض کی تشریح میں آج تک بھی کسی قسم کا اضافہ نہیں کیا جا سکا۔

عام طور پر بیماری کو ناگزیر سمجھا جاتا ہے لیکن حقیقت میں ایسا نہیں ہے۔ اور یقیناً یہ خدا کی طرف سے نہیں آتی انجیل میں ایک جگہ لکھا ہے کہ "وہ شخص جو اپنے خالق کا گناہ کرتا ہے طبیب کے ہاتھ میں گرفتار ہوجاتا ہے" تمام بیماریوں کا اصلی سبب غلط طریقۂ زندگی ہے خدا مخلوق کو پیدا کرتا ہے ہلاک نہیں کرتا ہم اپنے ہاتھوں تکلیف اٹھاتے اور موت سے پہلے مرجاتے ہیں صرف بڑھاپے میں موت کا آنا یقینی ہے لیکن ایسی موت سہل اور آسان ہوتی ہے۔ طبعی اور فطری موت کی مثال ایک ایسے چراغ کی سی ہے جو اچھا تیل اور اچھی بتی جل جانے کے بعد بجھ جاتا ہے اس کے برخلاف غیر فطری غیر طبعی اور قبل از وقت موت کو ایک ایسے چراغ سے تشبیہ دی جاسکتی ہے جو ہوا کے جھونکے سے بجھ گیا ہو۔ یا جس کی بتی اور تیل خراب ہونے کی وجہ سے تیل کے بہاؤ میں رکاوٹ پیدا ہوکر گل ہوگیا ہو ظاہر ہے کہ ان میں سے کوئی سبب بھی لازمی نہیں ہے اور ہر سبب کا انسداد ممکن ہے۔

بیماریاں جب آتی ہیں یا تو قابل علاج ہوتی ہیں یا ناقابل علاج۔ اس لئے بڑے سے بڑے طبیب کی قابلیتیں بھی محدود ہیں۔ طبیب کا یہ فریضہ ہے کہ جہاں ممکن ہو جان بچائے اور جہاں یہ ناممکن ہو دکھ درد کو دور کرے یا کم از کم اس میں انتہائی کمی کرنے کی کوشش کرے۔ مریض کو بھی چاہئے کہ طبیب کی مجبوریوں کا لحاظ رکھے۔ کاش انگریزی لفظ (Sympathy) کا ہم معنی اردو میں بھی کوئی لفظ ہوتا۔

طب جدید کی ترقی میں بعض نمایاں چیزیں ہیں جن کو میں یہاں بالترتیب بیان کرتا ہوں (۱) سترھویں صدی کے آغاز میں انسان اور حیوانات کے دوران خون کا انکشاف۔ (۲) خوردبین کی ایجاد جس کے ذریعہ جسم کے اعضاء اور رگ پٹھوں کی باریک ساخت کا ٹھیک مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔ (۳) جراثیم اور طفیلیوں کے باعث جو بیماریاں پیدا ہوتی ہیں ان کا انکشاف (۴) اس انکشاف کی وجہ سے جراثیم کی زندگی اور خصائل کے علم کی ترقی (۵) علم جراثیم کی ترقی کے باعث ایسی جراحی کا رواج جس کے بعد پیپ پیدا ہونے کا خطرہ ہی نہ رہا اور جس کی وجہ سے عمل جراحی محفوظ اور بے خطر ہوگیا ہے۔ ان کارناموں نے اگر ایک طرف پیشۂ طب کی تحصیل و تجربہ کو آسان بنا دیا ہے تو دوسری طرف اس کے نصاب کو طویل اور محنت طلب کر دیا ہے۔ جس وجہ سے طبی تعلیم و تربیت کی ضروری مدت چھ بلکہ سات سال ہوگئی ہے، جو تمام پیشوں میں سب سے زیادہ ہے۔ طبی تعلیم کا نصاب ان مضامین پر مشتمل ہوتا ہے۔ کیمیا اور طبیعیات۔ نباتات اور حیوانات کا علم، علم تشریح البدن و علم اعضاء، بیماری سے متاثر اعضاء اور جراثیم کا علم۔ علم و عمل جراحی۔ عورتوں اور بچوں کی بیماریاں۔ حمل اور زچگی میں عورتوں اور بچوں کی دیکھ بھال۔ آنکھ کان ناک اور حلق کی بیماریاں جلدی امراض اور دیگر بیماریاں۔ ان مضامین کا مطالعہ صرف نظری ہی نہیں ہوتا بلکہ اس میں نہایت نازک قسم کا عملی اور تجرباتی کام بھی شامل رہتا ہے۔ اس کے علاوہ آخری تین سالوں میں بیماریوں کی تشخیص اور ان کا علاج، تیمارداری وغیرہ یہ سب شفاخانے ہی میں سکھائے جاتے ہیں۔

پیشۂ طبابت کے لئے اس طویل مکمل اور سائنٹفک طریقۂ تعلیم کو پیش نظر رکھتے ہوئے نیم حکیموں کے ساتھ جو رواداری برتی جاتی ہے ظاہر ہے کہ اس کا سبب جہالت کے سوا اور کچھ نہیں۔ طب کا صرف ایک ہی نظام ہوسکتا ہے یعنی وہ جو متعلقہ علوم جدیدہ کے مطالعہ پر مبنی ہو۔ اس لئے ایسی حب الوطنی جو علوم جدیدہ کے مطالعہ پر مبنی ہو۔ اس لئے ایسی حب الوطنی جو علوم جدیدہ کے مطالعہ کو محض اس لئے نظرانداز کردے کہ ان کا تعلق اپنے دیس سے نہیں ہے، حب الوطنی نہیں بلکہ گمراہی ہے۔ اس طویل لیکن ضروری تمہید کے بعد اب میں اصل مضمون کے متعلق کچھ کہوں گا

جسے سننے کے لئے آپ منتظر ہوں گے ۔

مرض کی ماہیت بیمار اور اس کی تکالیف، ڈاکٹر اور اس کے فرائض، طبی پیشے کی اچھائیاں اور برائیاں، غرض ڈاکٹری پیشے کے کل کاروبار جس کو ساری دنیا کے لوگوں نے تمام پیشوں میں ممتاز تسلیم کیا ہے، ان کے متعلق کچھ سن لیجئے۔

مرض یا تو قابلِ علاج ہوگا یا ناقابلِ علاج۔ بہت سی بیماریاں تو معمولی ہوتی ہیں اور ان کے مریض بغیر علاج کئے کیا بلکہ بعض دفعہ باوجود علاج کے اچھے ہو جاتے ہیں۔ زیادہ تر انہی معمولی بیماریوں کی وجہ سے اناڑی اور دغاباز ڈاکٹر اور حکیم مشہور ہو جاتے ہیں لیکن بعض بیماریاں بڑی خطرناک ہوتی ہیں جن کا بڑی احتیاط سے علاج کرنا پڑتا ہے۔ دواؤں سے زیادہ صفائی اور احتیاط سے تیمارداری کرنی پڑتی ہے اور پرہیز کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔ جہاں کہیں بھی اس طریقے سے علاج نہیں ہوتا وہاں بیماروں کی جان کے لالے پڑ جاتے ہیں۔ اس صورت میں "قسمت" یا "خدا" یا دونوں کو الزام دیا جاتا ہے۔ سرطان، ذیابیطس یا دل کی بعض بیماریاں، دانتوں کی بیماری یا خون کے دباؤ کی زیادتی کے خوفناک علامات ان سبوں سے صحت مستقل طور پر بگڑ جا سکتی ہے۔ مگر یہ تمام بیماریاں ایک طویل مدت تک ایک غلط طریقے سے زندگی بسر کرنے کا نتیجہ ہوتی ہیں۔ چونکہ مرض کی علامات ظاہر ہونے میں عرصہ لگتا ہے اس لئے بیمار بہت دیر میں ڈاکٹر کے پاس جاتے ہیں۔ اس وقت ان کے علاج سے سوا عارضی آرام کے اور کچھ نہیں ہو سکتا۔ ایسے بیمار جلد یا دیر میں گھل گھل کر یا اچانک اس دنیا سے چل بستے ہیں۔

اب بیمار کے متعلق بھی چند باتیں سن لیجئے۔ مرض کی حالت میں بیماروں کا برتاؤ ان کی خصلت اور مزاج کے مطابق ہوتا ہے۔ غل مچانے والے بیماروں کو جنہیں معمولی بیماریوں میں بھی اپنے رشتہ داروں کے احساسات کا خیال نہیں ہوتا، ڈاکٹر کے احساسات کی کیا پرواہ ہو سکتی ہے۔ ایسے بیمار چیختے چلاتے رہتے ہیں اور اپنے برتاؤ سے ہر ایک کو غمگین بنا دیتے ہیں "ہائے ہائے مر گیا جی ڈاکٹر صاحب" جیسے الفاظ سے ڈاکٹر کا استقبال کرتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ ایسے برتاؤ سے ڈاکٹر کو کچھ ہمدردی پیدا ہو جائے گی مگر ان کا یہ خیال غلط ہے۔

مہذب قسم کے بیمار بھی ہوتے ہیں (یہاں مہذب سے میری مراد تعلیم یافتہ ہی نہیں کیونکہ مجھے غیر تعلیم یافتہ لوگوں میں بھی ایسے مہذب بیماروں سے سابقہ پڑا ہے) اس قسم کے بیمار بڑی سے بڑی تکلیف میں بھی اپنا دکھ نہایت اطمینان اور سادگی سے بیان کرتے ہیں اور باقی سب کچھ ڈاکٹر پر چھوڑ دیتے ہیں۔

حقیقت میں یہی بیمار ہیں جو ڈاکٹر کی ہمدردی اور توجہ کے مستحق ہوتے ہیں اگر ان کی بیماریوں کو کسی طرح اچھا نہیں کیا جا سکتا یا ان کی جان نہیں بچائی جا سکتی تو ڈاکٹر کو دلی صدمہ ہوتا ہے اور بیمار کو دلاسہ دینے کے لئے ڈاکٹر کو روزانہ نئی نئی علامات کے اسباب سمجھانے اور بعض دفعہ صریح جھوٹ بھی بولنا پڑتا ہے اور یہ سلسلہ اس وقت تک جاری رہتا ہے جب تک کہ موت نہ آجائے اور بیمار اور ڈاکٹر دونوں کو ایک کو جسمانی اور دوسرے کو روحانی تکلیف سے نجات دے۔

عام طور پر بیمار صرف اس بات کے اطمینان کی خواہش کرتے ہیں کہ ڈاکٹر ان کا توجہ سے علاج کرے۔ اگر ایک مرتبہ ان کو اس کا یقین ہو جائے تو پھر ڈاکٹر کو وہ بار بار تکلیف نہیں دیتے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ مریض کو اس ممتاز پیشے کے اراکین یعنی ڈاکٹروں سے ایسی توجہ کی امید رکھنے کا ہر طرح حق حاصل ہے۔

بیماروں کی ایک اور قسم ہے، جو زیادہ تر ادھیڑ عمر کے ہوتے ہیں یا بعض وقت بڑے۔ یہ صرف اچھا ہی رہنا نہیں چاہتے بلکہ ہمیشہ ایسی صلاحیت اور طاقت حاصل کرنے کی فکر میں رہتے ہیں جن سے وہ اپنی تمام خواہشات کو پورا کر سکیں۔ ایسے لوگ

نہ تو سمجھتے ہیں اور نہ تسلیم کرتے ہیں کہ ایسی خواہشیں عمر کے ساتھ ساتھ گھٹتی جاتی ہیں یا غائب ہو جاتی ہیں۔ وہ نیم حکیموں کی ہر قسم کی اشتہاری دوائیں نگلتے رہتے ہیں۔ یا مقوی دوائیوں کے لئے ڈاکٹروں کو ستاتے ہیں۔ کسی اچھے ڈاکٹر کو ایسے بیماروں سے ہمدردی کرنا چاہئے اور نہ ان کی ہمت افزائی۔ ایسے ادھیڑ اور معمر لوگوں کے حالات سے مجھے ایک اسکاٹسمن (Scotsman) کی قبر کے کتبہ کی یاد تازہ ہوئی جس پر یہ الفاظ لکھے ہوئے تھے

"میں اچھا تھا اگر مجھے اور اچھا ہونے کی خواہش ہوئی نتیجہ یہ ہوا کہ میں یہاں پہنچا"

اب اس مقام پر خود "طبیب" کے متعلق کچھ بیان کرنا نامناسب نہ ہوگا۔ یہ ایک افسوس ناک لیکن عام غلطی ہے کہ اپنے پیشے کا غلط انتخاب کیا جاتا ہے۔ قدیم زمانہ میں استاد اور شاگرد کے درمیان ذاتی ربط سے طب کے لئے موزوں طلباء کا انتخاب ممکن اور آسان بنادیا تھا۔ جدید مہذب ممالک میں بھی ناگوار عناصر کو یہ ثابت ہو جانے کے بعد چھانٹا جاتا ہے کہ ان میں یہ پیشہ اختیار کرنے کی صلاحیت نہیں ہے۔ اپنے پیشے میں افتخار حاصل کرنے کے لئے طبیب کو ایک مثالی انسان ہونا چاہئے کیونکہ علوم جدیدہ سے واقفیت کے ساتھ اس میں اخلاق وانسانیت کے جوہر کا وجود بھی کم سے کم اتنا ہی ضروری ہے۔ طبیب بننے سے پہلے اسے ایک مکمل انسان بننا چاہئے۔ اس میں بعض اوصاف کا پایا جانا بھی لازمی ہے کیونکہ اکثر اوقات اسے قدیم زمانے کے کاہن اور طبیب کی دوہری خدمت انجام دینا پڑتی ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ اپنے مریضوں کو سکون پہنچانے اور اخلاقی طور پر ترغیب دلانے کے لئے کہ بیماری کو پھیلانے یا جان لینے کے گناہ کا ارتکاب نہ کیا جائے۔ اس کا طریقہ اعتقادی باتوں، جادو، ٹونا یا مذہبی رسوم پر مشتمل نہیں ہوتا۔ طبیب کو "دل و دماغ" دونوں کے اوصاف سے متصف ہونا چاہئے۔ بیماری کے دوران میں جسم کے اعضاء میں جو تغیرات ہوتے ہیں ان سے گہری واقفیت کے ساتھ ساتھ اس کے لئے مشاہدہ اور قوتِ فیصلہ کی بھی سخت ضرورت ہے۔

مثلاً بعض علامات جیسے "درد" "کھانسی" یا "تنفس کی دشواری" ان علامات کی صحیح وجہ دریافت کرنے کے لئے نہایت گہرا مطالعہ کرنا پڑتا ہے۔ جس کے بغیر مرض کی صحیح تشخیص ناممکن ہے۔ اور جب تشخیص ممکن نہیں تو مریض کے اچھا ہوسکنے یا نہ ہوسکنے کے متعلق کیسے رائے قائم ہوسکتی ہے۔ عام انسانی محاسن جیسے ہمدردی اور ہمدردی کے ساتھ ایک طبیب کو ہر حالت میں اپنا اطمینانِ قلب قائم رکھنا چاہیئے اسے بڑے سے بڑے خطرے کے وقت بھی پریشان خاطر نہ ہونا چاہیے مریض کی بھلائی کے سوائے اس کو کوئی اور خیال نہ رکھنا چاہیے۔ چاہے اس پر بے رحمی کا الزام ہی کیوں نہ لگایا جائے۔ اسے بعض موقعوں پر اپنی کمزوریوں پر خاص نظر رکھنی چاہیے۔ ایسا کرنے سے اس میں عجز (Humility) کا ضروری احساس جو ایک طبیب میں سب سے بڑی خوبی مانی گئی ہے خود بخود پیدا ہوتا جائے گا۔ اسے راست یا بواسطہ اپنے کام کی تشہیر نہیں کرنی چاہیے بلکہ نہایت صبر و تحمل کے ساتھ صرف اپنے کام اور کردار کی بدولت شہرت اور نیکنامی کا انتظار کرنا چاہیے۔ طبی اخلاق وہی اطوار و آداب ہیں جنہیں تمام پیشوں کے ذی عزت اصحاب اپنے لئے اختیار کرتے ہیں۔

پیشہ ورانہ رازداری کے متعلق بقراط کی "قسم" خاطر خواہ رہبری کرتی ہے۔ ڈاکٹر کو چاہیے کہ انتہائی رازداری سے کام لے لیکن مفادِ عامہ اور جرم کو روکنے کی خاطر افشائے راز بھی اس کا فریضہ ہے۔ ایک معمولی پیشہ ور طبیب زیادہ تر دوائیوں کے ذریعہ اچھا کرنے کی فکر کرتا ہے لیکن ایک حقیقی طبیب صرف بیماری ہی کو دور کرنے کا خیال نہیں کرتا بلکہ زیادہ تر مریض کا علاج کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

اب میں پیشۂ طبابت کے کاروباری پہلو کے متعلق کچھ بیان

کروں گا۔ ایک طبیب کو نیک نام اور مشہور ہونے میں بہت دیر لگتی ہے لیکن ایک اچھے طبیب کو اس کا انتظار کرنا چاہیے۔ جلد شہرت حاصل کرنے کے لئے اسے عوام کے توہمات اور قیاسات کی ہمنوائی نہیں کرنی چاہیے اگرچہ ایسا کرنے میں اس کا مالی فائدہ ضرور ہے۔ ایک بڑے طبیب کا بیان ہے کہ اسے روٹی کمانے کے لئے دس سال لگے۔ روٹی کے ساتھ مکھن کمانے کے لئے اور دس سال ہوئے۔ اور شراب و کباب کے لئے مزید بیس سال محنت کرنی پڑی۔ ایک بڑے شہر میں تین مشہور طبی مشیر رہتے تھے۔ پہلا شخص اچھا طبیب تھا اور دغاباز نہیں تھا۔ دوسرا طبیب نو ایسا ویسا ہی تھا لیکن دغاباز تھا۔ اور تیسرا بڑا طبیب بھی تھا اور بڑا دغاباز بھی پہلے شخص کو جو ایک اچھا طبیب تھا اور دغاباز نہیں تھا بسو سائٹی اور پیشے میں تو سب سے زیادہ کامیابی حاصل ہوئی لیکن مالی نقطۂ نظر سے وہ بہت کامیاب نہ ہو سکا۔ اس لئے یاد رکھو کہ ایمانداری سے ایک مٹھی بھر کھانا اور اطمینان کی زندگی بسر کرنا بہتر ہے بہ نسبت اس کے کہ ذلت تکلیف اور پریشانی اٹھا کر دونوں مٹھیوں سے کمایا جائے۔

آخر میں مجھے یہ کہنے کی اجازت دیجئے کہ مستقبل میں انسدادی طب (Preventive Medicine) ہی کا بول بالا ہو کر رہے گا۔ اس لئے تمام طبیبوں کو چاہیے کہ بیماری کے علاج سے زیادہ بیماری کے مستقل انسداد کی طرف اپنی توجہ کو ہمیشہ قائم رکھیں۔

طبیب کے لئے صرف دو راستے کھلے ہوتے ہیں ایک راستہ مشکل اور غیر دلکش ہے اور زیادہ پر منفعت نہیں ہے لیکن جیسا کہ میں نے بیان کیا ہے باعزت ضرور ہے دوسرا راستہ اپنے ذاتی اغراض کو پورا کرنا۔ ایک مقدس پیشے کو ذلیل کاروباری پیشہ سمجھ لینا اور اپنے ہم جنسوں کو تجارت کا آلۂ کار بنانا ہے۔ ایسا کرنے کے معنی ایک عظیم الشان ورثے کے پیدائشی حق کو بیچنے، "محب انسان" کے شکل سے حاصل کئے ہوئے لقب کو بدنام کرنے۔ اور ایک معزز پیشہ کی روایات کو تباہ کر دینے کے ہوتے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ میرے ہم پیشہ بھائیوں کو اپنے راستے کا انتخاب کرنے میں کوئی دشواری نہ ہوگی۔

لطیف سعید

دوست بیوی کی نظر میں

یہ موضوع اتنا وسیع ہے کہ کچھ نہ پوچھئے۔ یہ تو آپ جانتے ہیں کہ دوست اور بیوی دونوں کی قسمیں حدِ شمار سے باہر ہیں اور اس لئے یہ بتانے کے لئے کہ شوہر کے دوست کو بیوی کس نظر سے دیکھتی ہے وقت بہت چاہیے۔ یعنی اگر میں یہاں دوست اور بیوی کی ایک ایک قسم پر مختصری بحث بھی کروں، تو اندیشہ ہے کہ کہیں آپ آج کے گانوں سے محروم نہ ہو جائیں درآنحالیکہ میں چاہتا ہوں کہ میری تقریر کے بعد آپ گانا ضرور سنیں۔ اس لئے کہ دوست یا بیوی یا دونوں کا ذکر سننے کے بعد سکونِ خاطر پانے کا ذریعہ موسیقی سے بہتر کوئی نہیں۔

خیر تو میں ابتدا شادی سے کروں گا۔ کیونکہ شادی سے پہلے کے دوست کی دوستی سے ہمیں یہاں سروکار نہیں۔ دوست کی آزمائش تو شادی کے بعد ہوتی ہے۔ آج کل کی سوسائٹی میں سچا دوست وہ ہے جو ساتھ برات میں بھی رہے اور گھر کے پل صراط پر بھی۔ لیکن اگر دوست اس کا اہل نہیں تو پھر اس کے خلوص اور نیک نیتی پر شبہ کیا جا سکتا ہے۔ اکثر دیکھنے میں آیا ہے کہ شادی سے پہلے دوستوں کی تعداد زیادہ ہوتی ہے اور شادی کے بعد حیرت انگیز طور پر گھٹ جاتی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ امتحان اتنا سخت ہوتا ہے کہ کمزور دوست بھاگ کھڑے ہوتے ہیں۔

ہاں تو میں کہہ رہا تھا دلہن آئیں، بے دست و پا بن کر شرماتی رہیں۔ دوسروں کے سہارے چلتی پھرتی رہیں لیکن گھونگھٹ کی آڑ سے سسرال کا جائزہ برابر لیتی رہیں۔ ساس کس قماش کی عورت ہیں؟ ان کی سیرت کے کمزور پہلو کیا ہیں؟ سسرے کا کیا رنگ ہے؟ خود شوہر صاحب کتنے پانی میں ہیں؟ مشاغل کیا ہیں؟ اور سب سے بڑھ کر ان کے دوست کتنے ہیں؟ (آخری سوال تو باہر جانے والی چونے کی پیالیوں یا پان کے بیڑوں سے بآسانی حل ہو جاتا ہے) ان کے نام کیا ہیں؟ کہاں رہتے ہیں؟ کیا کرتے ہیں؟ شادی شدہ ہیں یا نہیں؟ شادی شدہ ہیں تو کیا کہنا کہ بیویوں کی سرکردگی میں ایک نظم، باقاعدگی ان کی زندگی میں بڑی حد تک ہوگی۔ شادی شدہ نہیں ہیں تو اس کی وجہ؟ بے روزگار ہیں یا ملازم؟ وغیرہ وغیرہ۔

ادھر تحقیقات پایۂ تکمیل کو پہنچتی گئی، (امداد اگر خدا مبالغہ کی اجازت ہے) دوستوں کا شجرۂ نسب ازبر ہوتا گیا، ادھر عنانِ حکومت بتدریج ہاتھ میں آتی گئی۔ اس نوبت پر کتابِ زندگی کا ایک نیا اور طویل باب کھلا جس کا عنوان ہے "گھونگھٹ اٹھ جانے کے بعد" اب شوہر سے گفتگو کے دوران میں دوستوں کا ذکر غیر محسوس طریقے پر کیا جانے لگا۔ اگلی منزلیں کچھ اس قسم کی ہوں گی۔

(۱) آپ دفتر سے جلد آ جایا کریں تو بہتر، جی نہیں لگتا۔ (۲) آپ آج باہر گئے تھے اور دو گھنٹے کے اندر چار دوست آ کے گئے۔ (۳) روز شام کو دوستوں سے ایسی کیا باتیں ہوا کرتی ہیں جو آپ آٹھ بجے سے پہلے گھر نہیں آتے؟ (۴) آپ کے دوستوں کا گھر بار نہیں ہے کیا؟ (۵) دوست ایسے بھی کیا کہ آٹھوں پہر ساتھ لگے رہتے ہیں اور وقت گنواتے ہیں! (۶) کھیل تماشہ کا تو فقط بہانہ ہے، میں سب جانتی ہوں آپ لوگ کہاں کہاں جایا کرتے ہیں۔

نیا نوکر اور شوہر کا دوست اس لحاظ سے بدقسمت ہیں کہ دونوں سوء ظن کا شکار ہوتے ہیں۔ اُس سے آقا بدظن رہتا ہے اور اس سے اس کی منہ بولی بھابی۔ نوکر پھر بھی اپنی حسنِ کارگزاری سے آقا کو مجبور کر سکتا ہے کہ اس پر اعتماد کرے۔ لیکن شوہر کا دوست بیوی کے نزدیک معتوب علیہ شاذ و نادر ہی بنتا ہے۔ کبھی کبھی وہ اچھے کام بھی کر گزرتا ہے، اس امید میں کہ شاید بھابی صاحبہ اس سے متاثر ہوں۔ مگر عموماً نیکی برباد جاتی ہے اور گناہ لازم آتا ہے کیونکہ سمجھا جاتا ہے کہ اس میں بھی کچھ مخفی ہے۔

اب دوسرے پہلو پر غور کیجئے۔ نوکر نا اہل یا بد اطوار ہو تو اس کو نوٹس دے دی جاتی ہے لیکن شوہر کا دوست اپنی کمزوریوں کے

باوجود "قطب" بنا رہتا ہے۔ کیونکہ شوہر اس کی پشت پناہی کرتا ہے اور بیوی ہیں (باوجود اس کے کہ اس کے خیالات دوست کی نسبت ناگفتہ ہیں) اتنی طاقت نہیں کہ اس کو شوہر کی دوستی سے برطرف کرے۔

لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ کوئی بیوی میاں کے دوستوں کے خلاف ضابطہ کی کارروائی نہیں کر سکتی۔ واقعہ یہ ہے کہ شوہر کے دوستوں کو طرح دینے کا فن ایک مشکل فن ہے جس میں صرف نیک دل اور ایثار پیشہ بیویاں کامیاب رہتی ہیں، ورنہ ایسی ضابطہ پرست اور سخت گیر بیویوں کی کمی نہیں جن سے ان کے شوہر اور شوہر کے دوست یکساں ڈرتے ہیں۔ آپ ایسے شوہروں کے چہرے اداس پائیں گے، اور دیوان خانے سنسان، اس کی وجہ یہ کہ ایسی بیویوں کی عملداری میں گھر میں دفعہ ۱۴۴ نافذ رہتی ہے یعنی دوستوں کا جمع ہونا ممنوع۔ دوست یقیناً ہوں گے۔ مگر ملاقاتیں چوری چھپے ہوا کریں گی لیکن بیوی صاحبہ سمجھتی رہیں گی کہ شوہر صاحب کی اصلاح ہو گئی۔ دوستوں کا قصہ ختم ہو گیا۔ اور شوہر اس اثر کو قائم رکھنے کے لئے کہتے رہیں گے کہ سچا دوست واقعی دنیا میں کوئی نہیں ہے۔

خیر ایسی بیویوں اور شوہروں کو چھوڑئیے کہ وہ حد درجے مہذب ہیں۔ ہمیں تو یہاں بحث ہے ان بیویوں سے جن کی معاملہ فہمی حد سے تجاوز نہیں کرتی، اور ان شوہروں سے جن کے دروازے دوستوں پر بند نہیں۔ بیوی جانتی ہیں کہ شوہر کے دوست ہر سائز اور قسم کے ہیں۔ دفتر ہو تو شام کو اور تعطیل ہو تو صبح ہی کو نازل ہو جاتے ہیں کھاتے ہیں، پیتے ہیں، برج کھیلتے ہیں، گپ شپ میں اپنے جوہر دکھاتے ہیں، قہقہے لگاتے ہیں، ریڈیو سنتے ہیں اور بھولے سے گھر یاد آیا تو دوسرے روز آنے کا وعدہ کر کے رخصت ہوتے ہیں، یا پھر صاحب خانہ ہی کو ساتھ لے کر سیر و تفریح کو نکل جاتے ہیں۔

بیوی بیچاری سوچتی ہیں ان دوستوں میں آخر کیا سرخاب کے پر لگے ہیں جو شوہر صاحبان ہر اس طرح جان چھڑکتے ہیں۔ دوست نام بیوی کی حق تلفی کرنے والے کا۔ جو وقت انھوں نے بیکار دوستوں کے ساتھ گذارا وہ میرے ساتھ گذارا جاتا۔ کچھ کہو تو بگڑ جاتے ہیں اور دوستوں کی حمایت میں تقریریں کرنے لگتے ہیں گویا کہ انہیں فکر نہیں۔ بس وہ ہیں اور ان کے دوست۔ دوست کس کے نہیں ہوتے؟ لیکن یہ دوست تو دنیا سے نرالے ہیں۔ ایسے دوست تو خدا دشمن کو بھی نہ دے۔ کھاتے ہیں اور غراتے ہیں۔ آخر یہ کیا ڈھنگ ہیں؟ شوہر کو بیوی سے برگشتہ کرنے میں آخر انھیں کیا مزا ملتا ہے ٹمری بائی اور خیال جان کی تعریف آج کل کیوں ہو رہی ہے فلم سٹار مس غمزہ اور عشوہ دیوی کی تصویریں کمروں میں کیوں لگائی گئی ہیں؟ پرستان پارک دوسرے تیسرے کیوں جاتے ہیں؟ ہائے! ان دوستوں نے کہیں کا نہ رکھا!

تو جناب! بددعاؤں میں رفتہ رفتہ دوستوں کے نام بھی شامل ہونے لگے۔ دوستوں کی خاطر تواضع میں فرق آنے لگا۔ شوہر نے سب کچھ دیکھا اور محسوس کیا۔ نزلہ دوستوں پر گر رہا ہے، حالانکہ بیچارے بالکل نیک اور شریف ہیں۔ ایسے دوستوں کو کیسے چھوڑ سکتے ہیں؟ زندگی کی دلچسپی تو انھیں کے دم سے قائم ہے دوستی کا عہد کیسے توڑا جائے، شاعر کیا خوب کہہ گیا ہے ؎

دردِ دل پاسِ وفا جذبۂ ایماں ہونا۔ آدمیت ہے یہی اور یہی انساں ہونا

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس شاعر کے دوست بہت سے تھے اور اس نے ان سب سے وفا کی۔ واقعی دوست نہ ہوں تو انسان فرشتہ نہ بن جائے! اور فرشتوں کی اوقات معلوم! مختصر یہ کہ شوہر بیچارے اس کشمکش میں مبتلا ہوں گے اور دوست ادھر بھابی کے متعلق اپنی رائے پر نظر ثانی کرنے لگیں گے، اس لئے کہ مدارات میں اب وہ اگلی سی بات نہیں رہی، اور مشرقی معیار اخلاق و مہماں نوازی کو ترک کیا جا رہا ہے۔

لیکن ہوشیار دوست ہر ناگوار صورت حال سے بہت جلد [illegible]

کے ذریعے ڈھونڈ نکالتا ہے۔ گھریلو زندگی میں میاں بیوی میں اکثر شدید اختلاف آرا کی نوبت آتی ہے، اس قدر شدید کہ گھر کے نوکر عیش کرتے ہیں اور ہمسائے کے کان کھڑے کرتے ہیں۔ ایسے موقع پر ہوشیار دوست جا و بے جا بیوی کی حمایت کرنے لگتا ہے۔ یعنی کھاتا ہے شوہر کی اور گاتا ہے بیوی کی۔ یہ نسخہ ایسا مجرب ہے کہ اس دوست کا مستقبل محفوظ ہو جاتا ہے کیونکہ بیوی اس کی معقول پسندی سے متاثر ہوتی ہے اور دل میں کہتی ہے، واقعی ان کے سے دوست کئے نہیں۔ نتیجہ یہ کہ دوست کی چائے میں بالائی کالی پڑنے لگتی ہے اور پان میں چونا تیز نہیں ہونے پاتا۔

ایک اور تدبیر ہے جو شرارت پسند دوست اختیار کرتے ہیں بیوی کو بد اخلاق ہوتا دیکھ کر وہ شوہر کی نسبت خبریں پھیلانے لگتے ہیں کہ ضرورت سے زیادہ مہذب بن گیا ہے یعنی بیوی سے دبنے لگا ہے ہم نہیں سمجھتے تھے کہ زن مریدی کے جراثیم اس میں بھی ہوں گے یا یہ کہ اس کی بیوی اتنی کنجوس ہوگی۔ ورنہ کیا معنی کہ ہم اس کے گھر جائیں اور ایک پان تک ہمیں نصیب نہ ہوا۔ اس ساحرانہ چال کا جو اثر ہوتا ہے اس کا تصور آپ کر سکتے ہیں۔

اب تک جو کچھ کہا گیا، اس سے موضوع زیر بحث کے معاشی پہلو پر بالواسطہ کچھ روشنی ضرور پڑی ہے۔ کہتے ہیں جو ہاتھ پنگوڑا ہلاتا ہے وہی حکومت بھی کرتا ہے۔ پنگوڑا ہلانا تو خیر بعد کی بات ہے لیکن سب سے پہلے تو وہ ہاتھ نقدی کے قلمدان کی کنجی مضبوطی سے تھامے رہتا ہے۔ اب غور کیجئے۔ بیوی شوہر کے دوستوں پر اعتراض کرتی ہے تو اس کا مطلب یہ نکلتا ہے کہ چائے کی پتی کا خرچ زیادہ ہو گیا ہے مہینہ بھر کی شکر مہینے ہی دن میں ختم ہو گئی۔ میوہ اور بسکٹ کی مد پھیلتی جا رہی ہے۔ سگرٹ کا خرچہ دگنا ہو گیا ہے۔ ریڈیو گھنٹوں چلتا رہتا ہے اور اس کے نتیجے میں بجلی کا بل زیادہ آنے لگا ہے اور بار بار ریڈیو کی درستی کی اجرت بھی الگ دینی پڑ رہی ہے۔ وغیرہ وغیرہ

ایک صاحب ہیں۔ مہذب قسم کے آدمی ہیں یعنی بیوی کے زیر اثر ہیں۔ لیکن ہیں اتنے دیدہ دلیر کہ دوستوں کے سامنے بڑے مزے سے کہتے رہتے ہیں کہ بیوی سے ڈرنے میں ایک خاص قسم کی لذت ہے اس کو سب تھوڑی محسوس کر سکتے ہیں! للتِ بادہ ندانی بخدا تا نہ چشی۔ فضول خرچ آدمی ہیں۔ تقریباً ہر مہینہ آٹھ دس روپے تنخواہ سے کٹ جاتے ہیں۔ بیوی اس کی وجہ دریافت کرتی ہیں تو دو تین دوستوں میں سے کسی ایک کا نام لے دیتے ہیں، کہ ان صاحب کو قرض دیا ہے۔ کیا کروں؛ بیچارے کی آمدنی کم ہے، ایک بیوی اور کئی بچے ہیں ضبط تولید کے حامی بھی نہیں ہیں۔ قرضہ سر سے اونچا ہو گیا ہے۔ تنگی ترشی سے بسر ہوتی ہے۔ انھوں نے روپے قرض مانگے۔ مجھے انکار کرتے نہ بنا — غرض یہ کہ قرض دینے اور لینے کا یہ سلسلہ جاری ہے۔ لیکن ادائی کے آثار بالکل نہیں۔ اور ہوں بھی کیسے؟ اب ایسی صورت میں بیوی نے ان دوستوں کے متعلق جس قسم کے خیالات قائم کئے ہوں گے، ان کو میں یہاں بیان نہ کر سکوں تو آپ کو مجھ سے شکایت نہ ہونی چاہیے۔

مختصر یہ کہ شوہر جس صحبت میں بیٹھتا ہے وہ بیوی کی نظر میں اتنی ہی بری قرار پاتی ہے جتنی اپنے بھائی بندوں کی اچھی۔ ایک شعر ہے ؂

صحبتِ صالح ترا صالح کند۔ صحبتِ طالح ترا طالح کند

یا پھر یہ شعر

پسرِ نوح با بداں بنشست — خاندانِ نبوتش گم شد

یہ نصیحت پہلے بزرگ کیا کرتے تھے اور اب بیوی۔ وہ اپنے خاندان والوں کا حوالہ دے کر کہتی ہیں۔ دیکھو! میرے بڑے بھائی کے دوست کتنے شریف اور سمجھ دار ہیں۔ دولھا بھائی کا تو کوئی دوست ہی نہیں۔ گھر بھلا آپ چلے۔ پھوپا جان کے بھائی کے سالے کے ساڑو صاحب کے بھی دوست ہیں، مگر کیسے نیک! کیسے تمیز دار! اگر ہمارے ہی گھر کا باوا آدم نرالا ہے۔ یہ طعنے شوہر صاحب سنتے ہیں اور دل ہی دل میں شوہریت کے فلسفہ پر غور کرنے لگتے ہیں۔ آخر ایک روز بھڑک اٹھتے ہیں شوہر کا

دکھتی رگ دوست ہے تو بیوی کی کمزوری سہیلی! چنانچہ جو ڈراما ئی مکالمہ ایسے موقع پر ہوتا ہے اس کا ایک اقتباس سنئے:۔

میاں: جی ہاں! ہمارے ہی دوستوں میں دنیا بھر کی خرابیاں بھری پڑی ہیں۔ اور جناب کی سہیلیاں جو ہیں ماشاءاللہ ان کے گن بڑے اچھے ہیں نا!

بیوی: (تیز ہوکر) دیکھئے۔ آپ میری سہیلیوں کا نام نہ لیجئے۔ ورنہ برا ہوگا۔ آپ کے دوستوں کو میری سہیلیوں سے کیا نسبت! چہ نسبت خاک را بہ عالمِ پاک!

میاں: (طنز سے قہقہہ لگا کر) دیکھا! سہیلیوں کا نام آتے ہی چراغ پا ہوگئیں۔ دوسرے کے دوستوں کو چاہے جتنی گالیاں دو، مگر اپنی سہیلیوں کو کچھ نہ کہو۔ بڑی فرشتہ خصلت سہیلیاں ہیں نا! اپنی اور اپنے خاندان کی بڑائی کرنے میں یکتا۔ دوسروں کی غیبت کرنے کے فن میں طاق۔ شوہروں کو ناک چنے چبواتے ہیں۔

بیوی: (بات کاٹ کر) دیکھئے دیکھئے! منہ سنبھال کر بات کیجئے۔ واہ! یہ بھی کوئی بات ہے: ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اے ہے دوسروں کی سہیلیوں کی برائیاں گنانے والے! اپنے دوستوں کو دیکھئے، مطلبی، غرض کے بندے، دسترخوان کے بلاوڑ!

اس نوبت پر دستک کی آواز آتی ہے۔ یہ سن کر بیوی کہتی ہیں۔ "جائیے جائیے" یارِ غار آگئے۔ اب آپ کا گھر میں کیا کام؟ ناک میں دم آگیا۔ دن ہے نہ رات۔ دوست! دوست! جائیے نا دیر ہو رہی ہے۔ ہا! دیکھئے دوستوں کے آتے ہی منہ پر کیسی رونق آگئی گویا دولت مل گئی! اس کا انجام یہ کہ یا تو بیوی میکے کا رخ کرتی ہیں یا پھر شوہر صاحب ساڑیوں کی دوکان کی طرف منہ کرکے بھاگتے ہیں!

بہر حال ۱۵ منٹ کی بحث کے بعد بھی نتیجہ وہی نکلا۔ یعنی یہ کہ اس دنیا میں دوست اور بیوی سے مفر نہیں۔ دیکھئے نا اس وقت بھی آپ دوستوں یا بیوی کے ساتھ ریڈیو سن رہے ہوں گے۔ اور میرے دوست مکان میں میرے منتظر ہوں گے۔ اب اجازت دیجئے۔ لیکن آپ سے ایک استدعا ہے۔ وہ یہ کہ براہ کرم کہا سنا معاف کردیں!

ناکارہ

بولتی مزار

آج سے چند سال قبل کے ایک واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے میں ایک گھبراہٹ سی محسوس کر رہا ہوں اس لئے نہیں کہ اس کا تعلق کسی مافوق الفطرت امر سے ہے بلکہ اس لئے کہ میں اپنے ایک دوست کے راز کو بھی آشکار کر رہا ہوں جس کے متعلق مجھ سے قطعی وعدہ لیا گیا تھا کہ میں کسی پر ظاہر نہیں کروں گا۔

چار پانچ سال قبل میرے ایک دوست تسلیم ایک ایسی لڑکی کی محبت میں گرفتار تھے جو ان کے نام اور ان کی صورت سے تک ناآشنا تھی۔ سنا کہ کوئی صاحب ان کے محلے میں ایک کرایہ کا مکان لے کر ٹھہرے تھے اور کسی طرح آرک جاوک میں تسلیم نے ان کی اکلوتی لڑکی سلطانہ کو دیکھ لیا تھا۔ تسلیم نے اس لڑکی سے شادی کرنے کی بہتیری کوشش کی لیکن وہ ہمیشہ ناکام رہے۔ اور اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ وہ بے روزگار تھا۔ اور آج کل باوجود تعلیم کے ملازمت اور اچھی ملازمت ملنا آسمان سے تارے توڑ کر لانے کے برابر ہے۔ جب سے محبت کا جنون سوار ہوا تسلیم نے ملازمت کی کوشش بھی ترک کردی۔ تسلیم ہر طرف سے مایوس ہو چکا تھا۔ معلوم نہیں کس نے اس کو ایک شاہ صاحب کا پتہ بتلایا جو قصبے میں نئے نئے وارد ہوئے تھے۔ اور تسلیم ان کی خدمت میں مصروف ہو گیا۔ شاید اس خیال سے کہ شاہ صاحب کے توسط سے وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو جائیگا۔

شاہ صاحب ایک بڑے پہنچے ہوئے آدمی تھے۔ ان کے قبضہ میں موکل ہونا بیان کیا جاتا تھا۔ اور سب سے بڑی کرامت جو ان کی مانی جاتی تھی یہ تھی کہ وہ مردوں سے باتیں کرتے ہیں۔ چنانچہ آبادی سے دور قبرستان کے قریب ایک ٹیلہ پر کسی بزرگ کا مقبرہ تھا۔ اور شاہ صاحب ان سے باتیں کرتے تھے۔ اور پورے قصبے میں اس کا چرچا تھا۔ جب ایک روز تسلیم نے مجھ سے شاہ صاحب کی محیرالعقول کرامات بیان کیں اور پورے وثوق کے ساتھ تو مجھے بھی ان سے ملنے کا اشتیاق ہوا۔

ایک روز تسلیم نے بڑی دھوم کی نیاز کی اس کے کنبہ کے تمام لوگ مدعو تھے اور مجھے بھی ایک قریبی دوست کی حیثیت سے طلب کیا گیا تھا۔ یہاں پہلی مرتبہ میری شاہ صاحب سے ملاقات ہوئی۔ ان کی عمر پچاس سال کے قریب ہوگی۔ گٹھے جسم کے آدمی تھے۔ سیاہ فام، میانہ قد، اور داڑھی منڈھے۔ بڑے تپاک سے انہوں نے ملاقات کی۔ نیاز بڑے اہتمام سے کی گئی تھی۔ مزار کے لئے ایک ریشمی غلاف بھی سلایا گیا تھا اور پھولوں کی ایک بہترین قسم کی چادر لائی گئی تھی۔ غلاف اور پھول چڑھانے کے بعد شاہ صاحب نے مزار پر فاتحہ پڑھی۔ اور اس کے بعد ہم سب لوگوں کو حسب مراتب باری باری سے صاحب مزار سے تعارف کرانے لگے۔ یہاں یہ بیان کردینا ضروری ہے کہ مزار ایک چھوٹے سے کمرے میں تھی جس پر گنبد بنا دیا گیا تھا۔ سب سے پہلے شاہ صاحب نے تسلیم کے والد کا تعارف کرایا۔ جو بیٹے سے زیادہ شاہ صاحب کے معتقد تھے۔ اور اپنی تمام عمر میں انھیں ایسی کرامت سے سابقہ نہیں پڑا تھا جوں ہی تسلیم کے والد نے مقبرے کی دہلیز میں قدم رکھا السلام علیکم کی ایک آواز نے ان کی پیشوائی کی جس کے ساتھ ہی وہ سجدے میں گر گئے۔ اور قبر سے آواز آنے لگی کہ تمہاری دلی تمنائیں بر آئیں گی۔ میں مقبرے کے دروازے سے پانچ سات قدم کے فاصلے پر کھڑا تھا۔ شاہ صاحب مزار کے پائنتی کھڑے رہ کر ہر شخص کا تعارف کرا رہے تھے دوپہر کا وقت تھا لیکن اس کے باوجود ہم لوگوں کے دلوں پر ایک ہیبت سی طاری تھی۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ کسی باجبروت دربار میں ہم کھڑے ہیں اور دربار کا رعب ایسا چھایا ہوا ہے کہ ہم ایک دوسرے کی صورت دیکھنا تو کجا یہ بھی نہیں سوچ سکتے تھے کہ صاحب مزا

کے سامنے ہم اپنے دل میں کیا خیالات لے کر جائیں۔ ہر شخص کی صورت سوال بنی ہوئی تھی۔ ایک عجیب سکتہ کا عالم طاری تھا تسلیم کے والد کے بعد خود تسلیم ان کے بھائی اور بہنوی ایک ایک کرکے پیش ہوئے اور ان میں سے ہر ایک نے بڑے حضرت کی اتباع میں مزار کے سامنے سجدہ کیا۔ میں اپنی جگہ پر پریشان کھڑا تھا گو میں کوئی مذہبی آدمی نہیں ہوں لیکن اتنا ضرور جانتا ہوں کہ اسلام میں قبر پرستی کی اجازت نہیں ہے۔ بجز خدا کے سجدے کا کوئی مستحق نہیں لیکن کیا ایک ایسے بزرگ کے لئے بھی سجدہ حرام ہے جنہیں وصال کئے معلوم نہیں کتنی صدیاں گزر چکیں مگر وہ اب بھی زندہ ہیں اور دنیا والوں سے بات چیت بھی کرتے ہیں خیالات کی رو میں میں بہا جا رہا تھا کہ شاہ صاحب نے مجھے آواز دی اور میں دبکا ہوا ایک مجرم کی طرح دروازے کے اندر داخل ہوا۔ دل پر امید و بیم کی ایک کیفیت طاری تھی مجھے کچھ سجھائی نہیں دیتا تھا۔ میں نے آنکھیں بند کرلیں۔ سجدہ تو میں نے نہیں کیا البتہ کھڑے کھڑے فاتحہ پڑھ دیا اور الٹے پاؤں واپس ہوگیا۔ مجھ پر اتنی ہیبت طاری تھی کہ مجھے آج تک نہیں معلوم کہ صاحب مزار نے میرے متعلق کیا فرمایا۔

اس کے بعد ہم کھانے پر بیٹھے یہاں میں نے شاہ صاحب کے تیور کو بدلا ہوا پایا سجدہ نہ کرنے کی وجہ سے شاید وہ مجھ سے خفا تھے انھوں نے مجھ سے کچھ نہیں کہا۔ میں اپنی جگہ بیٹھا کنکھیوں سے انھیں دیکھ رہا تھا اور ان کی باتیں غور سے سن رہا تھا کہ وہ کتنا سچ کہہ رہے ہیں۔ یہاں ایک اور چیز قابل ذکر ہے وہ یہ کہ صاحب مزار سے گفتگو کرکے جب شاہ صاحب باہر نکلے تو میں نے دیکھا کہ وہ پسینہ میں نہائے ہوئے ہیں اور ان کا سانس پھولا ہوا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کسی بڑی مہم کو سر کرکے لوٹے ہیں اور ہسنا رہے ہیں۔ یہ چیز میری سمجھ میں نہیں آئی۔

شاہ صاحب کی شہرت میں روز بروز اضافہ ہونے لگا۔ اور تسلیم کو سلطانہ کے حصول کی امید بندھ گئی۔ خود تسلیم کا بیان تھا کہ جب سے شاہ صاحب سے ملاقات ہوئی ہے سلطانہ کے والد اس کی طرف مائل نظر آتے ہیں اسی زمانے میں تسلیم ایک دفتر میں ملازم بھی ہوگئے۔ یہ بھی شاہ صاحب کی کرامت تھی۔ لیکن بچاس روپے ماہوار میں سلطانہ کو بیاہنا کوئی کھیل نہ تھا۔ لیکن تسلیم کو شاہ صاحب پر اتنا اعتماد تھا کہ وہ ایک سلطانہ کیا اس کے جیسی ہزار سلطانہ سے بیاہ کرسکتا تھا۔ میں نے اسے لاکھ سمجھایا کہ وہ اس خیال خام سے باز آئے۔ اور اگر اسے شادی ہی کرنا ہے تو کسی متوسط خاندان کی لڑکی سے کرے۔ اونچے گھرانوں میں شادی کرنا عمر بھر کا جنجال مول لینا ہے۔ اگر تھوڑی دیر کے لئے سلطانہ سے اس کی شادی بھی ہوگئی تو شادی اس کے لئے وبال جان بن جائے گی۔ لیکن وہ اندھا ہوگیا تھا اس کو کچھ سجھائی نہ دیتا تھا اور شاہ صاحب کا جادو اس پر اتنا چل چکا تھا کہ وہ کہنے لگا کہ اگر میرے سوا سلطانہ کی شادی کسی اور سے ہوگئی تو عین شادی کے روز اس کو شاہ صاحب کے موکل کے ذریعہ سے اڑا نہ لوں تو میرا نام تسلیم نہیں۔ وہ بوالہوسی میں مبتلا تھا اور میں یہ محسوس کر رہا تھا کہ اگر شاہ صاحب کا اثر فوری زائل نہ کیا جائے تو تسلیم کا دماغ چل جائے گا۔ اور اس سے ہاتھ دھونا پڑے گا لیکن شاہ صاحب سے ٹکر لے تو کون۔ میں نہ عامل نہ جادوگر۔ شاہ صاحب کے متعلق میرے اپنے شکوک تھے لیکن تنہا اس سے مقابلہ میرے بس کی بات نہ تھی۔ میں نے یہ ساری باتیں اپنے ایک دوست سے بیان کیں۔ جو ایک جید عالم تھے انھوں نے شاہ صاحب اور ان کی کرامات کا مضحکہ اڑایا۔ میں نے باصرار اپنے ان دوست کو آمادہ کیا کہ وہ میرے ساتھ شاہ صاحب سے ملاقات کریں

شام کا وقت تھا سورج غروب ہوگیا تھا۔ افق مشرق سے سیاہی بلند ہوکر آسمان پر پھیلتی جا رہی تھی۔ مقبرے کے سامنے صحن پر شاہ صاحب کے معتقدین بیٹھے تھے اور تھوڑے تھوڑے وقفے سے وہ مغرب کی طرف دیکھتے جاتے تھے۔ بالآخر اپنے معتقدین سے مخاطب ہوکر کہنے لگے حضرت نے ابھی مغرب کی نماز مکہ شریف میں پڑھی ہے اور بغداد سے ہوتے ہوئے آرہے ہیں وہ چار منٹ کے بعد انھوں نے ہاتھ کے اشارے سے ہم سب لوگوں کو کھڑے رہنے کیلئے کہا۔ ہم سب تعظیما کھڑے ہوگئے اس کے بعد شاہ صاحب "السلام علیکم" کہہ کر مقبرے میں داخل ہوئے۔ انھیں سلام کا جواب ملا جس کو ہم سب لوگوں نے سنا۔ صاحب مزار کے آنے سے پہلے میرے عالم دوست نے شاہ صاحب سے تنہائی میں گفتگو کی تھی اور ان کی اس کرامت پر انھیں مبارکباد دی اور یہ بھی کہا کہ تاریخ اسلام میں یہ پہلا واقعہ ہے [illegible]

ہوگیا ہے کہ ہر شخص اپنے گزرے ہوئے عزیز سے شاہ صاحب کے توسط سے باتیں کرسکتا ہے۔ اس گفتگو سے شاہ صاحب کچھ چوکنے سے ہوگئے تھے اور ان میں خلافِ معمول کچھ بوکھلاہٹ سی نمایاں تھی جس کی وجہ سے صاحب مزار کی گفتگو بھی صاف سنائی نہیں دیتی تھی۔ میرے عالم دوست کی ایک اور حرکت نے شاہ صاحب کو برافروختہ کردیا وہ یہ کہ وہ مقبرے کے اندر گھس گئے۔ اور مزار کے سرہانے بیٹھ کر شاہ صاحب کا منہ تکنے لگے۔ شاہ صاحب اس حرکت کی تاب نہ لاسکے کیونکہ وہ مزار کے پائینتی کھڑے ہوکر صاحب مزار سے گفتگو کرتے تھے چنانچہ شاہ صاحب غضبناک ہوکر باہر نکل آئے۔ اور تسلیم پر برسنے لگے کہ:

کون آدمی ہے۔ صاحب مزار خفا ہوگئے ہیں اور معلوم نہیں ہم پر کیا آفت آتی ہے۔ شاہ صاحب کے معتقدین مجھ پر برسنے لگے کہ میں ہی اسے ساتھ لایا شاہ صاحب پہلے ہی سے مجھے بدعقیدہ سمجھتے تھے یہ سن کر آگ بگولہ ہوگئے اور گالیاں سنانے لگے۔ اتنے میں میرے عالم دوست آگئے اور انھوں نے شاہ صاحب سے مخاطب ہوکر کہا۔

"میں نے مزار کے سرہانے بیٹھ کر ابھی ایک عجیب بات دیکھی ہے اور مجھ پر انکشاف ہوا ہے کہ قبر پر سارا ڈھونگ رچا کر صاحب مزار کی روح کو مقید سمجھایا جارہا ہے یعنی یہ تھا کہ شاہ صاحب آپے سے باہر ہوگئے اور مغلظات پر اتر آئے۔

میرے عالم دوست کو بھی غصہ آگیا اور وہ کہنا چاہتے تھے کہ میں نے قطع کلام کرکے یہ تجویز پیش کی کہ اگر شاہ صاحب واقعی صاحب مزار سے گفتگو کرتے ہیں تو وہ ہمارے پاس بیٹھ کر کریں تاکہ ہم یہاں سے سن سکیں اور ہم بعض سوالات کرنا چاہتے ہیں وہ صاحب مزار سے دریافت کریں۔ اس تجویز کی معقولیت سے کسی کو انکار نہیں ہوسکتا تھا چنانچہ تسلیم کے ایک غیر مسلم دوست نے بآواز بلند کہا۔

"اگر شاہ صاحب یہاں بیٹھ کر بات کریں اور ہم مطمئن ہوجائیں تو ابھی مسلمان ہوجاتا ہوں۔

اس پر میں نے کہا—

"کیا تم شاہ صاحب کو جھوٹا سمجھتے ہو۔ شاہ صاحب ابھی یہاں بیٹھ کر بات کرتے ہیں اور تم کو نیچا دیکھنا پڑے گا۔

شاہ صاحب کبھی ہر شخص کی صورت دیکھ رہے تھے۔ وہ پسینہ میں شرابور تھے ان کا سانس پھولا ہوا تھا اور ان پر ایک جذبہ طاری تھا۔

"مجھکو آزماتا ہے مجھکو آزماتا ہے" کہہ کر شاہ صاحب میرے عالم دوست کی طرف لپکے اور ان کو مارنے کے لئے ایک بڑا سا پتھر اٹھالیا۔ تسلیم نے ہم سے منت سماجت کی کہ ہم یہاں سے چلے جائیں۔

شاہ صاحب کا کھیل بگڑ گیا جتنے ان کے معتقدین تھے، ان کے مخالف بن گئے اور ہر شخص نے بتلایا کہ کس طرح شاہ صاحب نے کسی سے بیس کسی سے تیس کسی سے کچھ اور کسی سے کچھ روپے حاصل کئے تھے اب ہر شخص میرا ممنون تھا۔ اس کے بعد شاہ صاحب کا کچھ پتہ نہ چلا۔ کچھ دنوں کے بعد معلوم ہوا کہ ناگپور میں پولیس نے انھیں کیمیاگر ہونے کے شبہہ میں گرفتار کیا ہے۔ لیکن کچھ ہو شاہ صاحب کی کرامت کا بھید آج تک کسی پر بھی نہیں کھلا۔ میں تو اپنی حد تک اس کو وہ فن

سمجھتا ہوں جس کے ذریعہ انسان دوہری آواز نکالنے میں کمال حاصل کرتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ مشق کے بعد یہ حالت ہوجاتی ہے کہ ایک کونہ میں بیٹھ کر آپ جہاں سے چاہیں آواز نکال سکتے ہیں اور اگر وہاں کوئی شخص بیٹھا ہو تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ باتیں کر رہا ہے۔

مجھے شاہ صاحب کے بے نقاب ہونے کی اتنی خوشی نہیں جتنا اس بات کا رنج ہے کہ تسلیم سلطانہ کے حصول میں ناکام رہا۔

بدر شکیب

پہلا مشاعرہ

نغمۂ شاعر

محبت کے اسرار سمجھا رہا ہوں　　تڑپ کر زمانے کو تڑپا رہا ہوں
چھڑا تھا جو نغمہ دمِ آفرینش　　اُسے ہر نفس میں نہاں پا رہا ہوں
خرد نے سنوارا ہے زلفوں کو جس کی　　اسی حُسنِ مستی پہ اِترا رہا ہوں
بڑے لطف کا ہے فسانہ یہ دنیا　　سمجھتا ہوں، دھوکے مگر کھا رہا ہوں
جنوں کے لطیف و سبک بازوؤں پر　　حقیقت کی جانب اڑا جا رہا ہوں
وہ گم کردگانِ رہِ عقل و دانش　　انھیں اصل مرکز پہ اب لا رہا ہوں
بھرا اجزائے ہستی کی بیداریوں سے　　جبینِ حقایق کو چمکا رہا ہوں
مرا عالمِ کیف !! کیونکر بتاؤں　　کہ میں فرش سے عرش تک جا رہا ہوں
نشیب و فرازِ رہِ زندگی کو　　پھر اِک سطحِ ہموار پر لا رہا ہوں
مرا ناخنِ فکر ہے رازِ فطرت　　حقیقت کے عقدوں کو سلجھا رہا ہوں
مجھے روک سکتا ہے سیلِ حوادث　　چلا جا رہا ہوں بڑھا رہا ہوں
بجا ہے مرا دعویٰ کج کلاہی　　کہ خود مٹ کے دنیا کو چمکا رہا ہوں
ازل میں سنا تھا جسے زندگی نے　　وہی گیت اُسی دھن میں پھر گا رہا ہوں

حجابِ نظر ہے مری موت اختر
کہ میں قیدِ ہستی سے شرما رہا ہوں

علی اختر

پھر آگئے ہیں بہار کے دن

پھر آگئے ہیں بہار کے دن   شجر شجر کے نکھار کے دن
وہ دھیمی دھیمی پھوہار کے دن   وہ گریۂ بار بار کے دن
دلوں کے بے اختیار نالے   وہ کوئلوں کی پکار کے دن
فریبِ قول و قرار یعنی   وہ رات کے انتظار کے دن

پھر آگئے ہیں بہار کے دن

گئی بہاریں پھر آ رہی ہیں   ہوائیں امرت لٹا رہی ہیں
زمیں کے شانے ہلا رہی ہیں   نمو کا جادو جگا رہی ہیں
کسی کے دامن سے ہیں الجھیں   کسی کا آنچل اڑا رہی ہیں
نئی جوانی کی ہیں ترنگیں   پیئے ہوئے ہیں، پلا رہی ہیں

گئی بہاریں پھر آ رہی ہیں

وہ جھومتی جھامتی گھٹائیں   وہ لڑکھڑاتی ہوئی ہوائیں
یہ تر دماغوں کی آرزوئیں   وہ تشنہ کاموں کی التجائیں
امنڈتی حسرت، مچلتے ارماں   کہ جیسے بجلی بھری گھٹائیں
رگیں تو رستے جگر میں ڈالیں   اٹھیں تو طوفان اک اٹھائیں

وہ جھومتی جھامتی گھٹائیں

گلابی پھولوں پہ کالے بادل   نشیلی آنکھوں میں جیسے کاجل
گھٹائیں بوجھل، ہوائیں چنچل   وہ ہلکی ہلکی جھڑی مسلسل
سہاگنوں کی وہ رنگ رلیاں   بروگنوں کے دلوں کی ہلچل
وہ صورتِ خوشدلی مجسّم   یہ ایک تصویرِ غم مکمل

گلابی پھولوں پہ کالے بادل

وہ بھیگی راتیں، وہ دن سہانے   پتے کی باتیں، مزے کے گانے
گرج سے ڈرنے کے وہ زمانے   قریب آنے کے وہ بہانے
پھر آپ ہی کچھ جھجک جھجک کر   وہ روٹھ جانے کے شاخسانے
جھکی نگاہوں کے کچھ اشارے   گلابی ڈوروں کے کچھ فسانے

وہ بھیگی راتیں، وہ دن سہانے

پھر آگئے ہیں بہار کے دن

وہاج الدین احمد شمیم

متاعِ جوانی

بہاروں کے صدقے میں آکو جوانی   جنوں مل گیا حاصلِ زندگانی
مسلسل محبت غمِ جاودانی   ملی بھی تو ایسی ملی زندگانی
ان آنکھوں نے دیکھا ہی جب تک نہ آئے   چھپا چاند مرجھا گئی رات رانی
مجھے لغزشوں سے بچائے نہ کوئی   ان ہی لغزشوں سے بنی ہے جوانی
سنائی ہے دل تھام کر میں نے اکثر   ترا نام لے لے کے اپنی کہانی
نہ بن جائے ملاح کے دل کی دھڑکن   سفینے سے ٹکرا کے دریا کا پانی
شرابِ محبت کو پی پی کے میکش
لٹائے چلا جا متاعِ جوانی

میکش

غزل

حسن کے حوصلے بڑھا حسن کی بیکلی نہ دیکھ — آنکھ جھکی ہوئی تو دیکھ آنکھ اٹھی ہوئی نہ دیکھ
درد مقامِ عشق ہے درد ہی جانِ عشق ہے — درد کی منزلوں کو دیکھ درد کی گمرہی نہ دیکھ
حسن کی جلوہ باریاں عشق کی خام کاریاں — دونوں کی آرزو سمجھ دونوں کی بیخودی نہ دیکھ
میں تو وفا شعار ہوں میری طلب ترا کرم — اپنے پہ اعتماد رکھ میری طرف کبھی نہ دیکھ
تیرا مقام ہمنشیں عرش سے بھی بلند تر — حسرتِ آگہی بڑھا منزلِ آگہی نہ دیکھ
دل کی تڑپ سے کام لے دل کی طرف نگاہ کر — دل ہی مقامِ عقل ہے عقل کی نارسی نہ دیکھ
بارِ الم اٹھائے جا درد میں مسکرائے جا — تیری حیات موت ہے موت میں زندگی نہ دیکھ

کچھ نہ دیا تو کیا نظرؔ درد کی لذتیں تو دیں
حسن کی بخششوں کو دیکھ حسن کی بے رخی نہ دیکھ

نظرؔ حیدرآبادی

حیات

گریباں کے ٹکڑے اڑائے چلا جا — جنونِ محبت بڑھائے چلا جا
کہانی ہے غم کی سنائے چلا جا — محبت میں آنسو بہائے چلا جا
جھلک آرزو کی دکھائے چلا جا!! — مری حسرتوں کو بڑھائے چلا جا
نہ کر شکوۂ جور خاموش اے دل — جفائے محبت اٹھائے چلا جا!!
محبت کی سرشار صہبا پلا دے — غمِ زندگانی مٹائے چلا جا
جفا کی شکایت نہیں تجھ سے لیکن — وفا بھی مری آزمائے چلا جا
اگر خواہشِ ہستی جاوداں ہے — محبت میں خود کو مٹائے چلا جا

یہی حاصلِ زندگانی ہے خسروؔ
غمِ زندگانی اٹھائے چلا جا

امیر احمد خسرو

دوسرا مشاعرہ

رباعیات

ہاں بعد خزاں بہار آجاتی ہے
اک لمحۂ عیش بعد غم لاتی ہے
ایک اپنی ہی عید پھر نہ پلٹی ورنہ
اب تک رمضاں کے بعد عید آتی ہے

دیوانہ صفت گزار بے ہوش گزر
پستی و بلندی سے ہم آغوش گزر
نیرنگ نگاہ و گوش ہے ہر ذرہ
حیران گزر اس راہ سے خاموش گزر

عالم بدلا فضائے عالم بدلی
ہر شئے بے اختیار و پیہم بدلی
ہاں اک مری تقدیر کہ بدلی ہی نہیں
اک میری طبیعت کہ بہت کم بدلی

ترکِ غم سے خوشی کی حسرت نہ مٹی
صورت کے بدل جانے سے صورت نہ مٹی
غم لاکھ غلط کیا مگر پھر غم تھا
انکارِ حقیقت سے حقیقت نہ مٹی

تھا باغ مرقعِ تمنا اپنا
صحرا سو وہ اک نقشِ جنوں تھا اپنا
ہم بزم جو اس میں اکیلے ہی رہے
دیکھا کئے دور سے تماشا اپنا

وہ یاد جو محوِ ہوش باقی ہے مجھے
چونکا کے عجب سماں دکھاتی ہے مجھے
ہر بو میں جھلکتا ہے رخِ یار کا رنگ
ہر رنگ سے بوئے یار آتی ہے مجھے

بندے ان کی رضا کے ہیں لیل و نہار
تکتی ہے انہیں کا منہ خزاں ہو کہ بہار
تدبیر تو فانی ہے پھر آخر تدبیر
تقدیر کو ہے ان کی مشیت درکار

دل میں خلشِ دردِ نہاں جاری ہے
دل پر اثرِ سود و زیاں جاری ہے
مرجاؤں تو اعتبار آئے شاید
جب تک جیتا ہوں امتحاں جاری ہے

کیا جانئے کس کی جستجو جاری ہے
اک عمر سے رسم آرزو جاری ہے
کچھ اپنی زباں میں دل کہے جاتا ہے
بے سمجھی ہوئی سے گفتگو جاری ہے

دل ہو ہمہ جوشش زندگانی یہ ہے
مایوس نہ رہیے کامرانی یہ ہے
ہر فتح کی بنیاد ہے انکار شکست
مانوس ہو غم سے شادمانی یہ ہے

ہر شئے میں نگاہِ شوق پاتی ہے تجھے
دوری گویا قریب لاتی ہے تجھے
پھولوں کی مہک یاد دلانے والے
پھولوں کی مہک یاد دلاتی ہے تجھے

اے فتنۂ روزگار آہستہ گزر
آشوبِ دلِ فگار آہستہ گزر
نازک ہے بہت دماغِ اربابِ جنوں
اے نکہتِ زلفِ یار آہستہ گزر

فانی بدایونی

اے خوشا وہ دن کہ جب تجھ سے ملاقاتیں نہ تھیں
ایسے مشکل دن نہ تھے ایسی کٹھن راتیں نہ تھیں
جب دلِ ناداں یوں بے طرح بھر آتا نہ تھا
آتشِ غم تیز کرنے والی برساتیں نہ تھیں
شب کے سناٹے میں چپ کے چپکے رو لینا نہ تھا
آنکھ میں آنسو نہ تھے لب پر مناجاتیں نہ تھیں
جب حریمِ دل میں روشن ہی نہ تھے غم کے چراغ
چاندنی راتیں تھیں ایسی چاندنی راتیں نہ تھیں

تو نے کس دل کو دکھایا ہے تجھے کیا معلوم
کس صنم خانہ کو ڈھایا ہے تجھے کیا معلوم
ہم نے ہنس ہنس کے تری بزم میں اے پیکرِ ناز
کتنی آہوں کو چھپایا ہے تجھے کیا معلوم

مخدوم محی الدین

پیام عید

غم کی ادا سیاں نہ ہوں خال و خد بہار میں ۔ ایسی لطافتیں کہاں سیرتِ روزگار میں
کارِ حیات نام ہے کشمکشِ حیات کا ۔ گوشِ سحر پہ ہو گراں کیوں نہ فسانہ رات کا
دیکھ چکی ہیں ملتیں کیفِ نشاط کا مآل ۔ بھولی نہیں ہیں عبرتیں پیچ و خمِ رہِ زوال

دل ہو خزاں نصیب اگر لالہ و گل کی دید کیا
روح جو محوِ خواب ہو صبحِ بہارِ عید کیا

شوخیٔ موجِ رنگ ہی رازِ چمن، خزاں نہیں ۔ تجھ کو سکوں کی ہے تلاش اور سکوں یہاں نہیں
سوزِ دروں ہی زندگی تلخ سہی، گراں سہی ۔ یہ جو نہیں تو کچھ نہیں عشرتِ جاوداں سہی
مجھ سے قفس گرفتہ سے قصۂ آشیاں نہ سن ۔ میری زباں سے ہمنشیں! عید کی داستاں نہ سن
اتنی کھلی ہوئی شکست رزم گہِ حیات میں ۔ تیری کوئی جگہ نہیں عرصۂ کائنات میں
ارض و سما سے ہے بلند تیری حیات کا مقام ۔ رازِ الست کے امین ارض و سما ترے غلام
حسنِ ازل ہے بے نقاب پردۂ جانِ پاک میں ۔ دونوں جہاں کی وسعتیں ہیں تری مشتِ خاک میں
درد کے آنسوؤں کو اٹھ غنچۂ یاسمن بنا ۔ آئے گی خود بخود بہار پہلے مگر چمن بنا

ہر نفسِ حیات میں وعدہ بھی ہے وعید بھی
میرا پیام ہی نہیں، ہے یہ پیامِ عید بھی

علی اختر

ساقی نامۂ عید

عید آئی ہے مئے ہوش ربا دے ساقی — عقل و دانش کی کشاکش سے چھڑا دے ساقی
دے نہ اس طرح مجھے بادۂ گلرنگ کے جام — اس میں کچھ مست نگاہوں سے ملا دے ساقی
اور بھڑکا مرے سینے میں دہکتی ہوئی آگ — کون کہتا ہے لگی دل کی بجھا دے ساقی
تشنگی ہی سبب نالہ و فریاد ہوئی — دل سے گزری ہوئی باتوں کو بھلا دے ساقی
مست آنکھوں سے پلا کر مجھے الفت کی شراب — بادۂ ناب کے بھی ہوش اڑا دے ساقی
شور تکبیر سے دنیا کی فضا گونج اٹھی — تو بھی آواز میں آواز ملا دے ساقی
پردۂ نشہ و مستی بھی رہے کیوں حائل — آج تو سارے حجابات اٹھا دے ساقی
روزہ داروں کی نگاہوں میں ہے جو کیف و سرور — تو اسے عشرت جاوید بنا دے ساقی
تو نے کس عالم مستی میں مجھے چھوڑ دیا — میں کہاں ہوں مجھے اتنا تو بتا دے ساقی
جس مسرت سے مسلمان گلے ملتے ہیں — اس طرح ان کے دلوں کو بھی ملا دے ساقی
وہ مہ عید ہوا جلوہ فگن پردہ کشا — تو بھی ایسے میں کوئی جلوہ دکھا دے ساقی

تشنۂ جنبش مضراب ہے ساز ہستی
پھر وہی نغمۂ توحید سنا دے ساقی

ماہر القادری

بہار عید

گھٹا سرشاریوں کی چھا رہی ہے — ہزاروں مستیاں برسا رہی ہے
گلوں سے اپنے دامن کو بسائے — نسیم جانفزا اترا رہی ہے
سرور و کیف کی لہروں پہ گویا — تمنا ہے کہ بہتی جا رہی ہے
تبسم، کیف، مستی، پھول، نغمے — بہار عید کیا کیا لا رہی ہے
مگر میرے دل درد آشنا کو — خدا معلوم کیوں تڑپا رہی ہے
مری آنکھوں سے کیوں بہتے ہیں آنسو — لبوں پر آہ کیوں تھرا رہی ہے
جنوں انگڑائیاں کیوں لے رہا ہے — خرد کو نیند سی کیوں آ رہی ہے
نگاہیں کس لئے ویراں ہیں میری — جہاں میں بے کسی کیوں چھا رہی ہے
ہلال عید بھی پیغام غم ہے — کسی کی یاد خسرو آ رہی ہے

امیر احمد خسرو

انسان کا طفیلی پیٹ کا کیچوا

انسان سیکڑوں طفیلیوں کا شکار ہوتا ہے۔ بعض طفیلی تو انسان کے جسم و اعضاء میں اپنی زندگی بسر کر کے اس کی صحت کو خراب کرتے ہیں اور بعض انسان کو ہلاک ہی کر دیتے ہیں۔ ہر شخص کو انسان کے نہایت ہی عام طفیلیوں کی سوانح عمری سے واقفیت حاصل کرنی چاہیے۔ ہندوستان میں شاید ہی کوئی ایسا ہوگا جس نے اپنی زندگی کے ایک حصے میں بچپن میں پیٹ کے کیچوے خارج نہ کئے ہوں۔

پیٹ کا کیچوا سفیدی مائل ہوتا ہے یہ معائے مستقیم میں رہتا ہے اور فضلے کے ساتھ خارج ہوتا ہے۔ اس کی مادہ بہ نسبت نر کے زیادہ لمبی ہوتی ہے۔ نر کو یوں بہ آسانی پہچان سکتے ہیں کہ اس کی دُم کا پچھلا حصہ مڑا ہوا ہوتا ہے۔

اگر آپ اس کا مقابلہ زمینی کیچوے سے کریں تو دونوں میں بیّن فرق پائیں گے۔ پہلے تو بڑا فرق دونوں کی حرکت میں پایا جائے گا۔ زمینی کیچوا اپنے اگلے جسم کے حصہ کو پہلے آگے کھینچ کر لمبا کرتا ہے اور پھر اس سے زمین کی گرفت کر کے اس حصہ کو سکیڑتا ہے جس کی وجہ سے جسم کا پچھلا حصہ گھسیٹتا ہوا آگے کو بڑھ آتا ہے۔ پیٹ کا کیچوا اپنے جسم کو صرف لہرا سکتا ہے۔ یہ زمین پر چل نہیں سکتا۔ اس کے منہ کے اطراف تین لب ہوتے ہیں ایک ظہری جانب اوپر کو اور دو بازوؤں میں ہر بازو پر ایک سفید دھاری جسم کی لمبائی پر دکھائی دیتی ہے۔

ہم کو اس کیڑے کا علم قبل از عیسیٰ مسیح ۱۶ صدی سے ہے۔ ہندوستان میں اب تک یہ خیال ہے کہ یہ کیڑا انسان کو کسی قسم کا نقصان نہیں پہونچاتا۔ اس کی سوانح عمری سے واقف ہو کر آپ کو تعجب ہوگا کہ پیٹ کا کیچوا کس قدر نقصان دہ ہو سکتا ہے۔ بچوں کی کثیر تعداد اس کا شکار ہوتی ہے اور یہ ہمارے ملک کے ہزاروں دیوں کو ہر سال بجھا دیتا ہے۔

پیٹ کے کیچوے کی مادہ کے رحم میں کسی ایک وقت ڈھائی کروڑ ستر لاکھ انڈے گنے جا چکے ہیں۔ مادہ دو لاکھ انڈے روز دیتی ہے انڈے نہایت ہی سخت جان ہوتے ہیں۔ ان کا خول ایسا مضبوط ہوتا ہے کہ انڈوں کے اندرونی حصہ پر نہ تو سخت گرمی، جاڑے یا بارش ہی کا اثر ہوتا ہے اور نہ تیزاب کا۔ بعض اوقات تو ان عناصر و اشیاء کا الٹا اثر ہو جاتا ہے اور بچے تیزی سے تیار ہونے لگتے ہیں۔

آپ کو معلوم ہے کہ انسان کے جسم کی حرارت ۹۸ ڈگری فارن ہائٹ ہوتی ہے۔ پیٹ کے کیچوے کے انڈوں میں بچے تیار ہونے ۹۲ ڈگری حرارت نہایت کامیاب ثابت ہوتی ہے۔ اس حرارت کے زیر اثر ایک چھوٹا سا تار کی طرح لپٹا ہوا کرم نو تا تیرہ دن میں پیدا ہو کر خول کے اندر محفوظ رہتا ہے۔ اس حالت میں انڈے پانچ تا چھ سال تک گندی زمین میں رہ سکتے ہیں اور کرم کو کوئی نقصان نہیں پہونچتا البتہ اگر حرارت ۱۰۵ ڈگری فارن ہائیٹ ہو جائے تو کرم انڈوں کے اندر مر جاتے ہیں۔ انڈے فضلے کے ساتھ خارج ہوتے ہیں۔ فضلہ خشک ہونے کے بعد یہ بچے دار انڈے ہوا سے اڑ کر خاک میں مل جاتے ہیں۔ ہمارے ملک میں حاجت ہر جگہ رفع کی جاتی ہے چنانچہ یہ انڈے اڑ کر ساگ پات پر چپک جاتے ہیں۔ ہوا ان کو اڑا کر پانی میں بھی ڈال دیتی ہے ہمارے بچے خاک سے کھیلتے ہیں، مٹی کھاتے ہیں۔ ہم ساگ پات کو بغیر دھوئے کھاتے ہیں چنانچہ یہ انڈے منہ کے ذریعہ معدے میں جا پہونچتے ہیں۔ معدے کے اس انڈوں کے خول پر ایسا اثر کرتے ہیں کہ دو یا دو سے کچھ زیادہ گھنٹوں میں جب انڈے غذا کے ساتھ

آنتوں میں پہونچتے ہیں تو ان کے خول ٹوٹ جاتے ہیں۔ کرم کے اطراف ایک باریک جھلی ہوتی ہے جو ان کے نکلنے سے قبل ہی یا کچھ بعد پھٹ جاتی ہے اور کرم آنت میں نکل آتے ہیں۔ انڈے صرف ایک نقطے کے برابر ہوتے ہیں۔ کرم ایک انچ کے دسویں یا نویں حصے سے زیادہ لمبے نہیں ہوتے۔ ان کے دونوں سرے نوکیلے ہوتے ہیں۔

بڑھنے سے قبل یہ کرم عموماً آنتوں کے باہر نکل کر جسم میں دورہ کرتے ہیں۔ یہ لمفی نالیاں رودی اور دہ کے ذریعہ آنت کے باہر نکل آتے ہیں اور خون کے دوران کے ساتھ دل کے داہنے حصے سے گزر کر پھیپھڑوں میں آپہنچتے ہیں۔ یہاں خون سے نکل کر پھیپھڑوں کے خانوں میں داخل ہو جاتے ہیں اور کچھ عرصے تک پرورش پا کر شعبے زخرے، مری اور پیٹ میں دورہ کرتے ہوئے پھر آنت میں پہونچ جاتے ہیں۔ اس دوران میں یہ جسامت میں بڑھتے جاتے ہیں۔ اکثر یہ بھی ہوتا ہے کہ اس دوران میں کچھ کرم طحال، عصبی نالی، جگر، گردوں یا دماغ میں رہ جاتے ہیں اور خطرناک ثابت ہوتے ہیں۔

سور میں بھی یہ طفیلی پایا جاتا ہے لیکن اس کے کرم انسان کے پیٹ میں نمو نہیں پاتے اور نہ انسان کے سور کے پیٹ میں۔ بہت کم ایسا اتفاق ہوتا ہے کہ سور کے پیٹ کے کیچوؤں کے کرم انسان کے پھیپھڑوں میں پہونچ کر سرسام کی شکایت پیدا کرتے ہیں۔ کرم اپنے میزبان کی آنت میں پہونچ کر دو یا ڈھائی مہینے میں اپنی پوری جسامت کو پہونچ جاتے ہیں اور مادہ انڈے دینا شروع کر دیتی ہے جو فضلے کے ساتھ خارج ہوتے رہتے ہیں۔ ایسا بھی ہوتا ہے کہ اگر انسان کے پیر، ہاتھ یا جسم کے کسی حصے پر زخم ہو اور اس کیڑے کا انڈا آپڑے تو کیڑا زخم میں انڈے کے باہر نکل جاتا ہے اور پھر پھیپھڑوں تک پہونچ کر اپنا دوران شروع کر دیتا ہے۔ ایسا بھی ہوتا ہے کہ کرم زمین ہی میں انڈوں کے باہر نکل آتے ہیں اور انسان کے جسم میں گھس جاتے ہیں۔

پھیپھڑوں میں پہونچ کر کرم یہاں قیام کرتے ہیں اور باہر نکلتے وقت پھیپھڑوں میں ننھے ننھے زخم کر دیتے ہیں۔ کرم اگر کم مقدار میں ہوں تو خیر کچھ نقصان نہیں لیکن اگر بہت زیادہ تعداد میں ہوں تو پھیپھڑوں کو صدمہ پہنچتا ہے اور تنفسی نظام میں خون کے سرخ و سفید جسیمے، جھلیدار بافت اور کرم خارج ہوتے ہیں۔ انسان زرد پڑ جاتا ہے اور سرسام کے آثار نمودار ہوتے ہیں۔ مثانے میں کرم پہونچ کر مثانے کی بیماری پیدا کرتے ہیں۔

بالغ کیڑے معا مستقیم میں رہتے ہیں اور نیم ہضم غذا کھاتے ہیں اگر کم تعداد میں ہوں تو انسان کو ضرر نہیں پہونچتا لیکن ایسا بھی اتفاق ہوتا ہے کہ صرف ایک ہی کیڑا ہاضمہ کو تباہ کر دیتا ہے۔ یہ کیڑے عصبی خرابیاں بھی پیدا کرتے ہیں۔ اگر یہ کثیر تعداد میں ہوں تو ان کا گچھا بن کر آنت کو بند کر دیتا ہے۔ یہ کیڑے قے کے ذریعہ یا ناک کے نتھنوں سے بھی خارج ہوتے ہیں۔ پتہ یا لبلبی نالی میں پہونچ کر یہ غدود کے رسوں کو روک دیتے ہیں۔ اندھی آنت میں گھس کر یہ اپنڈیسائٹس کی شکایت پیدا کرتے ہیں۔ انسان پیٹ کے درد سے تڑپتا ہے اور دم چھوڑ دیتا ہے اور لوگ خیال کرتے ہیں کہ پیٹ کے درد سے موت ہوئی۔ یہ آنت کی بافت کو پھاڑ کر پریٹونائٹس کی مہلک شکایت پیدا کرتے ہیں۔ اگر کسی کے پیٹ سے کیچوے خارج ہوں تو اسے چاہیے کہ فوراً کسی ہوشیار ڈاکٹر سے رجوع ہو۔

گورنمنٹ کو چاہیے کہ ملک میں ایک بڑا محکمہ کھولے تاکہ اس فن کے ماہرین اس قسم کی بیماریوں کو دور کرنے کے سامان کریں۔

محمد بابر مرزا

مکھی

مکھی زیادہ تر گرم ممالک میں پائی جاتی ہے اور ایسے مقامات پر اس کی بہتات ہوتی ہے، جہاں سڑی ہوئی ترکاریاں پھل، گوشت اور دوسری کھانے کی چیزیں ہوں۔ یوں تو ہر موسم میں یہ دکھائی دیتی ہیں لیکن برسات میں ان کی تعداد لاکھوں تک پہونچ جاتی ہے انسانوں کا یہ دشمن دسترخوان پر ان گنت تعداد میں حملہ کرتا ہے۔ اکثر زہریلے کیڑے ہمارے جسم پر حملہ کرتے ہیں۔ لیکن مکھی کا حملہ ہماری غذا پر ہوتا ہے اور غذا ہی کے ذریعہ ہم تک مختلف بیماریوں کے جراثیم پہونچتے ہیں۔ عجیب بات ہے کہ مکھی اپنی بہتات کے باوجود اٹھارویں صدی تک سائنس دانوں کی توجہ سے بچتی رہی، عام طور پر اس کو بے ضرر کیڑا خیال کیا جاتا رہا لیکن سنہ ۱۷۹ء میں فان گلیشن نے نورمبرگ میں پہلی مرتبہ عوام سے مکھی کے خطرناک ہونے کا ذکر کیا اس کے بعد ریمر نے سنہ ۱۷۳۳ء میں اور ہیوٹ نے سنہ ۱۹۱۴ء میں تفصیل کے ساتھ اس کے دورِ زندگی اور اس سے پھیلنے والی بیماریوں کو بیان کیا۔ اس نے یہ بھی بتلایا کہ مکھی کے جسم کی بناوٹ بیماریوں کے جراثیم کو منتقل کرنے میں بہت مدد دیتی ہے مکھی کے جسم پر باریک باریک بال پائے جاتے ہیں اس لئے۔ جب کبھی کسی متاثرہ غذا پر بیٹھتی ہے تو جراثیم ان بالوں سے لگ جاتے ہیں اور جب یہ اڑکر دوسری تازہ غذا پر بیٹھتی ہیں تو یہ جراثیم اس غذا کو متاثر کر دیتے ہیں۔ غذا کو متاثر کرنے کا ایک طریقہ تو یہ ہوا دوسرا طریقہ یہ ہے کہ مکھی تازہ غذا کو اس پر قے کرکے یا اپنا فضلہ خارج کرکے متاثر کر دیتی ہے۔ مکھی کا منہ سونڈ جیسی شکل کا ہوتا ہے جس کی وجہ سے یہ صرف پتلی غذا ہی چوس سکتی ہے۔ غذا کے ساتھ ساتھ وہ اکثر دفعہ ٹائیفائیڈ ہیضہ دق وغیرہ کے جراثیم کو بھی نگل جاتی ہے یہ جراثیم مکھی کے معدہ کے اندر کچھ مدت تک زندہ رہ سکتے ہیں اس درمیان میں مکھی جس غذا پر بیٹھے اس پر پہلے قے کر دیتی ہے اور پھر اس کو چوستی ہے اس طرح وہ جراثیم سے غذا کو متاثر کر دیتی ہے۔

مکھی سے پھیلنے والی بیماریوں کا ذکر کرنے سے پہلے اس کے دورِ زندگی پر بھی ایک نظر ڈالنا ضروری ہے مکھی کے انڈے سفید چمکدار اور چاولوں کے دانوں جیسے ہوتے ہیں یہ بہت ہی چھوٹے ہوتے ہیں اور ان کے گچھوں کے گچھے سڑی ہوئی ترکاریوں گوبر لید اور غلیظ موریوں میں دکھائی دیتے ہیں۔ ان انڈوں سے بچے نکلنے کے لئے اس مقام کا مرطوب اور کچھ گرم ہونا بھی ضروری ہے۔ مکھیاں جتھے بنا کر ایک ساتھ انڈے دیتی ہیں ایک مکھی ایک وقت میں ۱۲۰ سے ۱۵۰ تک انڈے دیتی ہے اور اپنی ساری زندگی میں دو دفعہ انڈے دیتی ہے۔ گویا ایک ہی مکھی اپنی تمام عمر میں ۶۰۰ سے ۹۰۰ تک انڈے دیتی ہے شکر ہے کہ ان سارے انڈوں سے مکھیاں نہیں نکلتیں کیونکہ ان انڈوں کی پرورش کے لئے غلاظت کا تازہ رہنا ضروری ہے۔ اس کے سوا غلاظت کی مقدار اور گرمی سردی کا بھی ان پر اثر ہوتا ہے۔ اکثر کیڑوں کے انڈوں سے راست طور پر پورا کیڑا حاصل نہیں ہوتا اس کو مکمل بننے کے لئے تین دور سے گزرنا پڑتا ہے انڈے سے کیڑے کے نکلنے کے لئے ۸ سے ۲۴ گھنٹوں کی مدت درکار ہے۔ پہلے دور میں کیڑا سفید رنگ کی مکھی نما شکل ہوتا ہے اس دور میں یہ نہایت سرعت کے ساتھ غذا کھانا شروع کرتا ہے کیونکہ یہ غذا اس کو نہ صرف پہلے دور میں کام آتی ہے بلکہ دوسرے دور میں بھی کام آئے گی جب کہ اس کی حرکات رک جاتی

ہیں اس کا جسم سکڑ جاتا ہے اور کیڑا اپنے اطراف ایک غلاف بنا لیتا ہے جس کے اندر وہ بند ہو جاتا ہے دوسرے دور میں داخل ہونے سے قبل کیڑا اپنے اصلی مقام کو چھوڑ کر خشک مقام تک ہٹ آتا ہے۔ اور کچرے وغیرہ کے نیچے دبا رہتا ہے۔ اس دور میں اس کا رنگ پہلے زرد پھر سرخ اور آخر کار سیاہ ہو جاتا ہے۔ کیڑے کا دوسرا دور دو سے چار دن تک قایم رہتا ہے اگر حالات موافق نہ ہوں تو دو سے چار ہفتوں تک یہ دوسرا دور بڑھ جاتا ہے۔ اس زمانے میں غلاف کے اندر کیڑے کے پر، پیر، سر، جسم وغیرہ مکمل ہو جاتے ہیں ان حصوں کی تکمیل کے بعد غلاف پھٹ جاتا ہے اور مکھی نکل آتی ہے۔ اس طرح انڈے سے مکھی کے نکلنے تک صرف ۸ سے ۹ دن لگتے ہیں اس چھوٹی سی مدت میں ہزاروں انڈوں کے تباہ ہو جانے کے بعد بھی لاکھوں مکھیاں نکل آتی ہیں انڈے سے نکلنے کے ساتھ ہی یہ بھوکی مکھیاں اس انسانی فضلہ پر ٹوٹ پڑتی ہیں جہاں ان کی پرورش ہوتی ہے گویا اپنی زندگی کے پہلے ہی دن سے یہ جراثیم سے متاثر ہو جاتی ہیں پھر اگر یہ کہیں چلی بھی جائیں تو انڈے دینے کے لئے انہیں وہیں آنا پڑتا ہے۔ اور یہ اس طرح متاثر ہوتی رہتی ہیں اس وجہ سے گساد کہتا ہے کہ "مکھی اپنی زندگی کی ابتدا سے انتہا تک کبھی جراثیم سے خالی نہیں رہ سکتی۔

ان ہی متاثرہ مکھیوں سے مختلف اقسام کی بیماریاں پھیلتی ہیں۔ ڈاکٹر کوبر پہلا شخص ہے جس نے ۱۸۹۵ء میں یہ تلایا کہ ٹائیفائڈ کے جراثیم فضلہ سے انسانی غذا تک مکھی ہی کے ذریعہ پہونچتے ہیں۔ ۱۸۹۸ء میں امریکہ میں اسپین والوں کی ایک جنگ ہوئی تھی اس جنگ میں کل فوج کا (⅕) حصہ صرف ٹائیفائڈ کی وجہ سے ضایع ہوا۔ بیان کرتا ہے کہ اس نے "تازہ انسانی فضلہ پر لاکھوں مکھیوں کو بیٹھے ہوئے دیکھا پھر یہی مکھیاں اڑ کر فوجی باورچی خانے میں پہونچیں ان کے پیر غلاظت پر ڈالے ہوئے چونے سے بھرے ہوئے تھے اور اس چونے کے ساتھ ٹائیفائڈ کے جراثیم بھی موجود تھے جب سردیاں شروع ہوئیں تو ان کی شدت کی وجہ سے ٹائیفائڈ کی بیماری کم ہو گئی کیونکہ مکھیاں بھی بہت کم رہ گئی تھیں۔ اس واقعہ نے کوبر کے بیان کو صحیح ثابت کر دیا۔ ٹائیفائڈ ایک خطرناک بیماری ہے جو آنت میں جراثیم کے موجودگی سے ہوتی ہے اس بیماری کے خطرناک ہونے کا اندازہ یوں لگایا جا سکتا ہے کہ مریض بستر پر لیٹ جانے سے دس بارہ دن پہلے ہی سے اپنے فضلہ کے ہمراہ ٹائیفائڈ کے جراثیم کو خارج کرتا رہتا ہے۔ یہ سلسلہ نہ صرف بیماری کے دوران میں باقی رہتا ہے بلکہ صحت پانے کے بعد بھی کچھ دنوں تک مریض کے فضلہ میں جراثیم پائے جاتے ہیں۔ ان جراثیم کے ذریعہ مکان کے دوسرے رہنے والوں کے متاثر ہونے کا زیادہ اندیشہ رہتا ہے انسانی غذا میں خاص طور پر دودھ، شربت، مٹھائیاں اور عموماً دوسری تمام کھانے کی چیزیں مکھی کو بہت پسند ہیں۔ ان ہی پر بیٹھ کر وہ پہلے انھیں اور پھر بعد میں انسان کو متاثر کر دیتی ہیں۔

ایک اور خطرناک بیماری ڈائریا ہے جس کی وجہ سے ہر سال ہندوستان میں ہزارہا بچوں کی جانیں ضایع ہوتی ہیں۔

سنہ ۱۹۰۳ء میں پہلی دفعہ یہ بیان کیا گیا کہ مکھی ڈائریا کی ذمہ دار ہے سنہ ۱۹۱۱ء میں ...... کئی سال کے تجربہ کے بعد اس بیان کی تصدیق ہوئی اور یہ بھی بتلایا گیا کہ مکھی کی عمر جوں جوں بڑھتی جاتی ہے وہ زیادہ خطرناک قسم کا ڈائریا پھیلاتی ہے۔ اس بیماری میں مکھی بچوں کے ناک اور منہ کے اطراف بہنے والے گندہ پانی سے جراثیم حاصل کرتی ہے اور دودھ کو متاثر کر دیتی ہے۔ اور یہ دودھ صحت مند بچے پیتے ہیں تو وہ بیمار ہو جاتے ہیں۔

دق کی بیماری پھیلانے میں بھی کھیاں بہت بڑا حصہ لیتی ہیں بلغم مکھی کو سب سے زیادہ پسند ہے۔ مکھی کی ایک خاص عادت یہ ہے کہ وہ بے حد حریص ہوتی ہے وہ کھانے سے کبھی نہیں تھکتی وہ کتنا ہی کھا چکی ہو جب بھی دوسری غذا نظر آئے گی وہ فوراً اس کو کھانا شروع کر دیتی ہے اس کا معدہ اتنا بڑا تو ہوتا نہیں کہ جتنی غذا وہ چاہے کھا سکے اس لئے مکھی جب کبھی تازہ غذا پر بیٹھتی ہے تو فوراً قے کر دیتی ہے اس کا معدہ خالی ہو جاتا ہے پھر وہ غذا کھانے لگتی ہے۔ قے کی تعداد غذا کی نوعیت پر ہے جیسی اچھی غذا ہو گی مکھی اتنا ہی زیادہ قے کرے گی۔

گراہم اسمتھ نے معلوم کیا کہ مکھی جب شربت پر بیٹھتی ہے تو پانچ مرتبہ قے کرتی ہے جب دودھ پر بیٹھتی ہے تو نو مرتبہ قے کرتی ہے اور جب بلغم پر بیٹھتی ہے تو ستائیس مرتبہ قے کرتی ہے اس سے ٹھیک ٹھیک اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ دق کو پھیلانے میں مکھی کس قدر حصہ لیتی .... ۱۹۰۴ء میں معلوم کیا گیا کہ ہر سولہ مکھیوں میں سے دس مکھیاں دق کے جراثیم سے متاثر تھیں ۱۹۱۰ء میں گراہم اسمتھ نے معلوم کیا کہ یہ جراثیم مکھی کے پیٹ میں تین دن تک اور آنت میں چھ سے بارہ دن تک زندہ رہ سکتے ہیں۔

مصر، عراق اور ہندوستان میں آشوب چشم کی شکایت عام ہے مکھی جسم کے کھلے ہوئے حصوں سے بڑی رغبت رکھتی ہے۔ ۱۹۱۳ء میں .... مصر میں آشوب چشم کا ذمہ دار مکھی کو .... بتلایا گیا کہ مکھی آشوب زدہ بچوں کی آنکھوں پر بیٹھتی اور وہاں سے اڑ کر دوسرے صحت مند بچوں کو متاثر کرتی ہے .... آنکھوں سے بہنے والی ریزش میں پائے جانے والے جراثیم کو مکھی کے جسم پر پایا گیا اور ثابت کیا گیا کہ آشوب چشم انہیں کے ذریعہ پھیلتا ہے۔

ایک بیماری جمرہ ہے جو عموماً بھیڑ، بکری اور دوسرے چوپایوں میں ہوتی ہے اس کی وجہ سے جانور کے جسم میں زخم پڑ جاتے ہیں اگر انسان اس بیماری میں مبتلا ہے تو یہ جان لیوا ہوتی ہے قرحہ ... ... پیدا ہو جاتا ہے۔ یہ بیماری اکثر چمڑے کی دباغت کے کارخانوں کے اطراف پھیلتی ہے ۱۸۶۹ء میں ریمبرٹ نے اس بیماری کا سبب اور پھیلانے والے کا پتہ چلایا۔ بولنجر نے ۱۸۷۴ء میں مکھی کی غذائی نالی میں جمرہ کے جراثیم معلوم کئے۔ ۱۹۱۱ء میں گراہم اسمتھ نے بتلایا کہ یہ جراثیم مکھی کے جسم پر ۲۴ گھنٹے اور جسم کے اندر پانچ سے چھ دن تک زندہ رہ سکتے ہیں۔

ہیضے کے متعلق قدیم زمانے سے معلوم ہے کہ وہ مکھیوں سے پھیلتا ہے عربوں نے پہلی مرتبہ اس کو معلوم کیا تھا ہیضہ کی بیماری بہت ہی چھوٹے چھوٹے جراثیم کی وجہ سے ہوتی ہے۔ ہیضے کے بہت سارے جراثیم آپس میں مل کر ایک بستی بنا لیتے ہیں۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ صرف ایک مکھی میں جراثیم کی (۱۰۵۰۰) بستیاں تھیں ... ... ۱۸۹۴ء میں گیا صوبہ بہار کے جیل خانے میں جہاں ہیضہ پھوٹ پڑا تھا دکھایا گیا کہ مکھی سرد اور گرم دونوں دودھ کو متاثر کر سکتی ہے۔

پلیگ کی حیثیت ان بیماریوں سے مختلف ہے اس کے پھیلنے کا طریقہ بھی علحدہ ہے لیکن بعضوں کا خیال ہے کہ مکھی بھی پلیگ کے جراثیم کو ایک مریض سے دوسرے مریض تک منتقل کر سکتی ہے نٹل کہتا ہے کہ اگر مکھی کو پلیگ کے مریض کے فضلہ تک پہونچنے کا موقع مل جائے تو وہ غذا کو ضرور متاثر کرے گی۔ اس نے دیکھا ہے کہ پلیگ کے جراثیم مکھی کے جسم میں ۴۸ گھنٹوں تک زندہ رہتے ہیں اور دوسرے صحت مند انسان اس سے متاثر ہوتے ہیں۔

مکھی سے پہونچنے والے اتنے نقصانات کا علم ہونے کے بعد یہ ضروری ہے کہ وہ تدابیر بھی معلوم کی جائیں جن کے ذریعہ ہم

اس کیڑے سے چھٹکارا پاسکیں۔ اس سے چھٹکارا پانے کی دو صورتیں ہوسکتی ہیں پہلی یہ کہ مکھی کی پیدائش ہی کو روکا جائے دوسرے یہ کہ مکھی کے ذریعہ پھیلنے والی بیماریوں پر قابو پایا جائے۔

پہلی تدبیر سہل اور زیادہ کارآمد ہے کیونکہ مکھی پیدا ہوجانے کے بعد اس کو مٹانا بہت مشکل کام ہے۔ مکھی کی پیدائش کو روکنے کے لئے اس کی پرورش پانے کے مقام کو برباد کردینا چاہیے اس لئے گھوڑوں کے اصطبل گائے، بھینس اور بھیڑوں کے تھان باورچی خانوں، چائے خانوں غلاظت خانوں کو بالکل پاک صاف اور خشک رکھنا ضروری ہے لید، گوبر اور دوسری غلاظتوں کو سمنٹ کی بند کنڈیوں میں جمع کرنا چاہیے۔ قدیم وضع کے بیت الخلاء بھی بہت خطرناک ہیں۔ اس کے علاوہ لوگوں کو کھلے مقامات پر ندی نالا اور تالاب کے کنارے ضرورت سے فارغ ہونے سے سختی سے منع کرنا چاہیے۔ باورچی خانے میں گوشت اور ترکاریوں کو سڑی ہوئی حالت میں ہرگز نہیں رکھنا چاہیے۔ گھروں سے نکلنے والی موریوں کو بند رکھنا چاہیے کیونکہ یہ غلیظ موریاں مکھیوں کی عمدہ پرورش گاہ بن جاتی ہیں۔ ان مقامات کو نہ صرف صاف رکھنا بلکہ خشک رکھنا بھی ضروری ہے۔ ان مقامات کو خشک رکھنے سے انڈے پرورش پاسکتے اور لاکھوں مکھیوں کی پیدائش کو روکا جاسکتا ہے۔

مکھی پیدا ہوجانے کی صورت میں اس کو برباد کرنا مشکل ہے۔ اس کو باریک جال کی تھپکنیوں سے مارا جاسکتا ہے۔ ٹانگل فلائی کاغذ کے ذریعہ بھی مکھی کو مارا جاسکتا ہے دونوں صورتیں زیادہ کارآمد ہیں اس سے سہولت بخش ایک اور صورت ہے کہ بازاری فارملین کے دو چمچے لے کر پاؤ گیلن پانی میں ملالیں پھر اس میں دو بڑے چمچے شکر ڈالیں تو ایک عرق حاصل ہوگا اس کو رکھ چھوڑنے سے مکھیاں شکر سے رغبت کی وجہ اس میں گرنا شروع ہوتی ہیں۔

یہ سارا کام کسی ایک آدمی کے بس کا نہیں ہے کیونکہ اگر کسی نے اپنا گھر پاک صاف رکھا بھی تو دوسرے غلیظ گھر سے مکھیاں اڑکر آسکتی ہیں ضرورت اس بات کی ہے کہ برسات کے شروع ہونے سے پیشتر ہی سے وسیع پیمانے پر غلیظ مقامات کی صفائی کا انتظام شہروں میں جلد اور اضلاع و دیہات میں شعبہ حفظان صحت کی جانب سے عمل میں آئے ترکاریوں، پھلوں اور گوشت کی دوکانوں، گوداموں اور مسلخوں پر خاص نگرانی رکھی جائے ورنہ ہندوستان میں برسات کے ساتھ ہیضہ پھوٹ پڑنا گویا ضروری سا ہوگیا ہے پھر ٹائیفائڈ اور دق کے مریضوں کی تعداد مسلسل بڑھتی ہی چلی جاتی ہے۔ یورپ اور امریکہ کی طرح یہاں بھی اس کیڑے کے برباد کرنے کی وسیع کوشش کی جانی چاہیے اس لئے کہ انسانی زندگی مکھیوں سے کہیں زیادہ قیمتی ہے۔

مہدی علی

عقل و جنون

جدید مدرسۂ فکر کے، جواں سال حیدرآبادی شاعر

حکیم میر کاظم علی برق موسوی کی نظموں کا مجموعہ

برقؔ موسوی کی شاعری اکتسابی نہیں۔ یہ وقتِ فکر دماغ سے زیادہ، دل سے کام لیتے ہیں۔ اس مجموعہ میں آپ کو زہر بصفت تغزل اور نوم آور رومان کے سوا، وہ سب کچھ ملے گا، جس کی ہندوستانی ادب کو ضرورت ہے۔

حجم ۸۶ صفحات، سائز فل اسکیپ۔ قیمت مجلد (عمہ)

ملنے کا پتہ

(۱) سب رس کتاب گھر خیریت آباد حیدرآباد دکن
(۲) مکتبہ ابراہیمیہ عابد روڈ حیدرآباد دکن
(۳) کتاب خانہ عابد روڈ حیدرآباد دکن

تپ دق کی طرح "پائریا" کے تین درجے ہیں

اول:- دانتوں کی عام تکالیف اور مسوڑھوں سے خون آنا۔

دوم:- مسوڑھوں میں پیپ پڑنا

سوم:- معدہ ماؤف ہو کر دنیا کے ۹۰ فیصدی مہلک امراض کی پیدائش

کچھ بھی ہو اگر آپ کو واقعی دو باتوں کا احساس ہے

یعنی

بحالتِ صحت ! حفاظت

بحالتِ مرض ! نجات

تب اپنے پتہ سے مطلع کرنے میں تامل نہ کریں۔

عائی جیا انڈسٹریز (انڈیا) انبالہ چھاؤنی

سائنس کے کرشمے

:- مرتبہ مولوی میر حسن صاحب ایم اے صفحات ۱۱۲ قیمت مجلد عہ۔ اس کتاب میں سائنس کے بعض ایسے مسائل کے متعلق دلچسپ مفید معلومات یکجا کردی گئی ہیں جن کا جاننا ہر شخص کے لئے ضروری ہے مثلاً پانی، بجلی، ہوا اور پرواز۔ یہ مقالات ماہرین فن اور لائق اساتذہ کے لکھے ہوئے ہیں۔ زبان آسان اور پیرایۂ بیان عام فہم ہے۔ اس کتاب کا مطالعہ عوام اور بالخصوص سائنس کے طالب علموں کے لئے بہت کارآمد ثابت ہوگا۔

سب رس کتاب گھر خیریت آباد سے مل سکتی ہے

اندھوں کی تعلیم

دنیا آنکھ والوں کی ہے اور ایک اندھا شخص ہماری سماج میں غیر موزوں تصور کیا جاتا ہے۔ اندھوں کی فطری صلاحیتوں کا کبھی صحیح اندازہ نہیں لگایا گیا جس کی وجہ سے وہ ہمیشہ سے ایک طفیلی زندگی بسر کرنے پر مجبور رہے ہیں۔ ان کی نشو و نما انہیں دنیا کے کاروبار سے ناواقف رکھتی ہے اور باوجود قوت کلام کے جو ان کی اس کمی کو دور کر سکتی ہے، ہمارے مخلوط طرز عمل یعنی ضرورت سے زیادہ شفقت یا نفرت نے ان کی زندگی کو ناقابل برداشت بنا دیا ہے اور باضابطہ تعلیم کی کمی کی وجہ سے بھیک ان کا واحد پیشہ اور سہارا بن گئی ہے۔ مختصر یہ کہ اندھے سوا ان کے جنھوں نے خوش قسمتی سے اچھے گھرانوں میں جنم لیا ہو، ہمیشہ گداگری ہی میں الجھے ہوئے رہے ہیں۔

ایسی صورت میں اندھے ایک منظم جماعت اور ایک وبا کی شکل میں ہماری سماج میں داخل ہو گئے ہیں۔ ان کی معذوری اور لاچاری ہمارے دل کو پگھلا دیتی ہے اور ہم ان کے ساتھ فیاضی (داری) برتنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ لیکن ہماری یہ بے ربط ہمدردی اور سخاوت ان کو اپنی گری ہوئی حالت سے بلند نہیں کر سکتی جب کہ ایک دفعہ انھوں نے بھیک کا مزا چکھا ہو۔

جو کوشش ان کی حالت کو سدھارنے کے لئے کی گئی ہیں، ان میں سب سے مفید وہ طریقہ کار معلوم ہوتا ہے جو مسلمانوں نے اپنے اندھوں کے لئے اختیار کیا ہے یعنی یہ کہ اکثر مسلمان اندھوں کو حفظ کلام اللہ کے کام پر لگایا جاتا ہے تاکہ وہ اس کی مدد سے نہ صرف اپنا پیٹ ہی بھر لیں بلکہ مسجدوں میں بچوں کو کلام اللہ کی تعلیم بھی دیں۔ بے شک باضابطہ تعلیم کے نہ ہونے کی صورت میں یہ طریقہ کار ان کے لئے کافی مفید ہے۔ لیکن یہاں بھی کوئی اندھا گداگری سے پاک نہیں رہتا۔

تعداد کے اعتبار سے اندھے نظر انداز کر دیے جانے کے قابل ہیں۔ لیکن ہماری سماج کا ایک ضروری جزو ہونے کے اعتبار سے انھوں نے سماجی اہمیت حاصل کر لی ہے۔ اور ان کی حالت درست کرنا سماج کا فرض ہے۔ اس کی اصل وجہ تو ایک طرف وہ چند حقیقی قابل اندھے ہیں اور دوسری طرف اس لاچار اکثریت کی متاثر کر دینے والی صدائیں جنھیں ہم روز آنہ راستوں پر بھیک کے محتاج دیکھتے ہیں۔ اس مسئلہ کا ایک ہی حل ہے یعنی جدید اصولوں پر باضابطہ تعلیم۔

اندھوں کی تعلیم کی ابتدا یورپ میں اٹھارویں صدی کے اواخر میں ہوئی۔ سنہ ۱۷۸۴ء میں ویلنٹن ہاوے نامی ایک فرانسیسی شخص نے اندھوں کی گداگری اور تباہ حالت سے متاثر ہو کر پیرس میں اندھوں کا پہلا مدرسہ قایم کیا۔ شہر کے گلی کوچوں سے اندھے بچوں کو جمع کر کے اس نے اپنے صرفہ سے انھیں تعلیم دینی شروع کی اور کئی تجربے کئے۔ لکھنے پڑھنے کے لئے اس نے لکڑی پر ابھرے ہوئے حروف استعمال کئے۔ اور جب یہ تجربہ کامیاب ہوا تو کاغذ پر اسی قسم کے حروف کے ذریعے تعلیم دینی شروع کی۔ اس کے تجربوں اور کوششوں کو عوام کی ہمدردی حاصل ہوئی اور بہت جلد یہ مدرسہ ایک اچھے سرمایہ کا مالک ہو گیا۔ جس کی وجہ سے اس کے کاروبار میں سہولت پیدا ہونے لگی لیکن مدرسہ کو مکمل کر چند ہی سال ہوئے تھے کہ فرانس پر انقلاب کے بادل ٹوٹ پڑے جس کی وجہ سے تمام تعمیری تحریکیں موقوف ہو گئیں۔ اس کا اثر اس مدرسے پر بھی پڑا اور ہاوے کو وطن چھوڑنا پڑا۔ غریب الوطنی کے زمانے میں اس نے روس اور جرمنی کا رخ کیا اور وہاں بھی یہی کوشش جاری رکھی۔ اور ماسکو اور برلن میں اندھوں کے لئے مدرسے قائم کئے۔ انقلاب فرانس کے بعد یہ تعلیم یورپ میں بہت مقبول ہو گئی اور انیسویں صدی کے اواخر تک یورپ کے [illegible]

میں اندھوں کے مدرسے قایم ہوگئے۔ امریکہ نے بھی یورپ کی تقلید کی اور وہاں بھی یہ تعلیم عام ہوگئی۔

ہندوستان میں اندھوں کی تعلیم کی ابتدا عیسائی مشنیوں کی جانب سے ہوئی اور پہلا مدرسہ دہرہ دون میں ۱۸۸۷ء میں قایم ہوا۔ اس صدی کے ختم ہوتے تک ہندوستان میں چار اور مدرسے کھلے۔ مدراس، کلکتہ، رانچی، اور بمبئی ان میں کلکتہ کے مدرسے کا عیسائی مشنیوں سے تعلق نہیں ہے۔ اس کو ایک بنگالی عیسائی لال بہاری شاہ نے قایم کیا اور یہ ادبی تعلیم میں ان تمام مدرسوں میں اپنی قدامت اور کارگزاری کے اعتبار سے امتیاز رکھتا ہے۔ رفتہ رفتہ یہ تحریک ہندوستان کے دوسرے اضلاع اور دیسی ریاستوں میں پھیل گئی اور آج ہندوستان میں اندھوں کے تقریباً پچیس مدرسے ہیں جن میں آٹھ سو سے زیادہ طلبہ تعلیم پاتے ہیں مغالبتاً طلبہ کی یہ تعداد بہت کم ہے اور اس کام کو آگے بڑھانے کے بہت امکانات ہیں۔

بینائی کی عدم موجودگی میں لمس یعنی چھو کر محسوس کرنے کی قوت ایک موزوں جانشین بن گئی ہے اور اس پر اندھوں کی تعلیم کا تمام تر انحصار ہے۔ ان کی تعلیم میں جو آلات استعمال ہوتے ہیں وہ بھی اسی حس کے اعتبار سے بنائے گئے ہیں۔ بریل رسم الخط (جس کا موجد خود ایک اندھا لوئی بریل نامی تھا) احساسِ لمس پر مبنی ہے۔ لیکن علاوہ اس کے اندھوں کی تعلیم میں بقیہ حواس کا درست رہنا ضروری ہے۔ کیونکہ احساسِ لمس ایک ایسی حس ہے جو اسی وقت کام کر سکتی ہے جب کہ دوسرے حواس درست ہوں۔

جن طریقوں پر اندھوں کی تعلیم اس وقت جاری ہے اور جو تجربات اس عرصے میں حاصل ہوئے ہیں ان سے واضح ہوتا ہے کہ اس کی رفتار ہندوستان میں اتنی تیز نہیں رہی جتنی کہ ہونی چاہیے تھی۔ تاہم عوام اور حکومتوں کے رجحان کے مدنظر ہم کو اس بات کی تشفی ہے کہ تعلیم کا رجحان کم از کم صحیح راستہ پر ہے۔ ہندوستان کے مدرسوں کا نصاب عموماً تین شعبوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ ادبی، صنعتی، موسیقی اور فی الحال انھیں میں اعلیٰ کارکردگی اچھے نتائج پیدا کرنے کے لئے کافی ہے۔

تحتانوی ادبی تعلیم جیسا کہ عام مدارس میں ہوتی ہے اندھوں کے مدارس میں بھی موجود ہے۔ کلکتہ کے مدرسے نے اس شعبے کو بہت ترقی دی ہے اور وہاں کے طلبہ کو جامعات کے امتحانوں کے لئے تیار کیا جاتا ہے۔ اس مدرسے کے چند قدیم طلبہ بنگال کے مختلف کالجوں میں پروفیسری کی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ بریل رسم خط تمام مدارس میں لکھنے پڑھنے کا ذریعہ ہے اور اس کو اکثر ہندوستانی زبانوں پر منطبق کر لیا گیا ہے۔

اسٹانڈرڈ انگلش بریل کا صوتی طریقہ بہت زیادہ مقبول ہے جس کو شریعت بریل کہتے ہیں۔

صنعتی شعبہ اندھوں کی تعلیم کا اہم اور مرکزی جزو ہے۔ تمام مدارس میں اس کا انتظام ہے اور نتائج اس لئے مفید ثابت ہوئے ہیں کہ اس کے ذریعہ تعلیم ختم کرنے کے بعد اپنے بل پر کھڑے ہو سکتے ہیں۔ فی الحال اس شعبے میں بید بافی اور پارچہ بافی کا کام سکھایا جاتا ہے لیکن اس کی توسیع کے بہت امکانات ہیں۔

موسیقی ایک ایسا فن ہے جو بینائی سے آزاد ہونے کی وجہ سے اندھوں کے لئے بہت مفید ثابت ہوا ہے۔ اسکی مدد سے اندھا اپنے احساسِ کمتری کو ایک بڑی حد تک دور کر سکتا ہے اور اس میں مہارت اس کے لئے ذریعۂ معاش بھی بن سکتی ہے۔ ہندوستان کے تمام مدرسوں نے اس امر کو محسوس کیا ہے اور ایسے مدرسے جہاں اس کی تدریس کا انتظام ہو بہت کامیاب ہیں۔

اندھوں کی تعلیم میں جسمانی، ذہنی اور اخلاقی مسائل اتنے گھتے ہوئے ہیں کہ عملاً ان کو علحدہ کرنا ممکن ہے۔ سب سے اہم اخلاقی مسئلہ ان کی حوصلہ افزائی ہے۔ ذہنی مسائل میں صحیح طرز خیال پیدا کرنا ضروری ہے اور جسمانی مسائل میں تعین صحت بہت اہم۔

اندھوں کے معلم کو سب سے پہلے اپنے شاگردوں کو صحیح اٹھنے بیٹھنے کا طرز سکھلانا ضروری ہے۔ بینائی سے محروم ہونے کی وجہ سے ایک اندھے بچے کو ان سب چیزوں کی "تعلیم" کی ضرورت ہوجاتی ہے جو دوسرے بینا بچے فطری طور پر خود بخود حاصل کر لیتے ہیں۔ مثلاً آدابِ مجلس اور کھانے پینے کا طریقہ وغیرہ۔ ایک بینا شخص کے لئے یہ بالکل بیکار ہونگے، لیکن اندھوں کی تعلیم میں ان پر عمل لازمی ہے اس کام کے لئے ہمہ وقتی توجہ ضروری ہے۔ اور یہ صرف ایک اقامتی مدرسے میں ممکن ہے۔ ہندوستان اور دوسرے ملکوں کے تمام مدرسے اقامتی ہیں اور ان کا محل وقوع شہر کے اطراف واکناف میں ہے۔

اندھوں کی تعلیم بالکل آزاد ہونی چاہیے اور ان کے مدرسوں میں کسی اور قسم کے معذورین خصوصاً گونگے بہرے شریک نہ کئے جائیں۔

آج کل ہندوستان کے چند مدرسوں میں یہ مسئلہ درپیش ہے۔ انیسویں صدی میں امریکہ اور یورپ کے مدرسوں نے بھی اس یکجائی کی وجہ سے تعلیم میں رکاوٹیں محسوس کی تھیں۔ اس کی تحقیق کے لئے کئی کمیشن اور کمیٹیاں مقرر کی گئیں اور ان کی سفارشات ہی سے ان ممالک سے اس یکجائی کو دور کر دیا گیا۔

انگلستان میں ۱۸۸۵ء کا رائل کمیشن جس کو ملکہ وکٹوریہ نے مقرر کیا تھا قابلِ ذکر ہے۔ اسی کمیشن کی سفارش کی بناء پر برطانیہ عظمیٰ میں ایسے مدرسے برخاست کر دئے گئے جہاں ایسی یکجائی پائی جاتی تھی۔ اس مسئلہ کے خلاف جو دلیلیں پیش کی جاسکتی ہیں وہ حسب ذیل ہیں۔

اندھوں اور بہرے گونگوں میں بہت کم مطابقت ہوتی ہے بلکہ یوں کہا جا سکتا ہے کہ ان میں کسی قسم کا سماجی تعلق ہی نہیں۔ ان کی نفسیات، رجحانات، خداداد ادراک اور طریقۂ تعلیم میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ اندھے بہروں کے اشارے دیکھ نہیں سکتے اور بہرے اندھوں کی بات سن نہیں سکتے۔ اس اشتراک کے بُرے نتائج اس وقت ظاہر ہوتے ہیں کہ جب کبھی اندھے بہرے گونگوں کے بے ربط کلام کو سن کر ان کی نقل کرتے ہیں اور اپنے نطق کو نقصان پہنچاتے ہیں جو ان کی تعلیم کا بہت اہم ذریعہ ہے، اسی طرح بہرے گونگے بچے بھی اندھوں کی چال اور دیگر جسمانی خصوصیات جو بینائی کے نہ ہونے کی وجہ اکثر بے ڈھب ہوتی ہیں، نقل کرتے ہیں اور اپنی جسمانی حالت کو نقصان پہونچاتے ہیں جو ان کی تعلیم کا اہم جزو ہے۔

اندھوں کی تعلیم کے ایک ماہر ڈاکٹر آر۔ ایس۔ فرنچ نے سچ کہا ہے کہ "وہ تعلیم جو کسی پیشے سے تعلق نہ رکھے صحیح معنی میں تعلیم ہی نہیں۔ ایسی تعلیم جو زندگی کے عظیم الشان سماجی اور اخلاقی مقاصد سے مطابقت نہ رکھے وہ جہالت سے بدتر ہے۔ تعلیم جو بے ربط مضامین پر مشتمل ہو وہ اپنے مقصد کو کھو دیتی ہے۔ اندھوں کی تعلیم میں سب سے زیادہ ضروری چیز یہ ہے کہ ذہن کو دوسرے ذہن سے قریبی ربط پیدا ہو تاکہ زندگی سے ہم آہنگی پیدا ہوسکے لیکن ہر طالب علم کی صلاحیت اور شخصیت بھی محفوظ رہنی چاہیے ہماری تعلیم کی طرح اندھوں کی تعلیم کا منشا بھی یہ ہے کہ اس دنیا کے حقائق سے تدریجی مطابقت پیدا ہو جس کو ہم جانتے ہیں۔ نیز اس دنیا سے بھی جو نصب العین کی دنیا کہلاتی ہے آپ جس نام سے چاہیں اس کو موسوم کر سکتے ہیں۔

شہریار کاؤس جی

ہندوستانی بچہ

تمام سماجی خدمات میں بچوں کی خبرگیری سے بڑھ کر کوئی اہم خدمت نہیں ہے۔ اور نہ اس سے بہتر کوئی اور کام ہو سکتا ہے ایسا لڑکا جس سے بے توجہی برتی جائے بڑا ہو کر سماج کے لئے ایک بوجھ بن جاتا ہے۔ کوئی شخص یہ قبول کرنے کے لئے تیار نہیں کہ ایک نوجوان مجرم ہر معاملے میں قابلِ معافی ہو سکتا ہے۔ اس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ سماج کو نقصان پہونچانے والا لڑکا سماج کی لاپروائی ہی کا شکار ہوا ہے۔ اور اس معاملے میں اصل مجرم خود سماج ہے۔

ایک معقول آدمی یہ اچھی طرح جانتا ہے کہ ایسا بچہ جو لاپروائی سے پروان چڑھے سماج کے لئے ایک خراب سودا ہے۔ لیکن فوری توجہ کی جائے تو اس خراب سودے کے نقصان کی تلافی ہو سکتی ہے۔ اور وہ کم سن لڑکا راہِ راست پر آ کر ایک سود مند اور مفید شہری ثابت ہو سکتا ہے۔ ممکن ہے خراب بچوں کی وجہ سے ابتدا میں سماج کو نقصان اٹھانا پڑے۔ مگر آگے چل کر سماج کو ان سے بہت سخت نقصان پہونچ سکتا ہے اس لحاظ سے بچے کی خبرگیری کا کام خاص طور پر بڑی قدر و قیمت رکھتا ہے۔ اور ایک بھٹکے ہوئے بچے کو راہِ راست پر لانے کے لئے جو مصیبتیں اٹھانی پڑتی ہیں وہ آگے چل کر نفع بخش ثابت ہوتی ہیں۔ مگر جب یہی بچہ ایک جوان مجرم بن جاتا ہے تو اسے سیدھے راستے پر لانے میں بڑی دیر لگتی ہے اور حقیقی کامیابی کا موقع دور جا پڑتا ہے۔

یہ بڑی حیرت کی بات ہے کہ ہندوستان کے کتنے ہی جو اپنی نام نہاد ملکی خدمات اور ہمدردانہ خصوصیات کے لئے مشہور ہیں آدمی بچوں سے زیادہ کتے اور بلی کے بچوں کی خبرگیری کرتے ہیں لاکھوں اور کروڑوں کی تعداد میں انسانوں کے بچے پریشانی اور مفلسی میں پروان چڑھتے ہیں۔ اور اس حد تک یہ بڑی عجیب و غریب بات ہے کہ ملک میں انسدادِ بے رحمی جانوران کی سیکڑوں شاخیں قائم ہیں اور ان کے بے رحم مالکوں کے خلاف چارہ جوئی کرنے کے لئے قانون بھی موجود ہے لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ بچوں کی خبرگیری کے لئے بہت ہی کم ادارے قائم ہیں اور جو ادارے کام کر رہے ہیں ان میں بھی کارکردگی اور خلوص نہیں پایا جاتا۔ البتہ بمبئی میں ایک ادارہ ہے جو بہبودی اطفال کا کام اچھی طرح انجام دے رہا ہے۔ اس ادارے کے اراکین اور بانی بہت زیادہ قابلِ مبارک ہیں۔ فیاض لوگوں نے اپنے شہریوں کی بہبودی کے لئے لاکھوں روپیہ دیا ہے لیکن بچوں کی ضروریات کا لحاظ کرتے ہوئے ان پر جو توجہ کی گئی وہ بہت ہی کم ہے۔ کیونکہ اہمیت کے لحاظ سے یہ بچے ملک کا بہترین اثاثہ ہیں۔ کئی مکانوں اور یتیم خانوں میں ہزاروں بے گھر اور بے یار و مددگار بچوں کے لئے گنجائش نکل سکتی ہے اندھوں، بہروں اور گونگوں کے لئے بھی چند ادارے ہیں لیکن بچوں کی ایک بڑی تعداد ایسی ہے جن میں ان اداروں سے باہر ہی زندگی بسر کرنی پڑتی ہے یا بسر کرائی جاتی ہے۔ اس سلسلے میں یہ معلوم ہونا چاہیے کہ یہ بچے یتیم و یسیر ہوتے ہیں یا پھر ان کے ماں باپ یا سرپرست معاوضہ لے کر انھیں فروخت کر دیتے ہیں اور ایسا بھی ہوتا ہے کہ ہندوستانی شہروں کے بازاروں میں تجارت کرنے والے ماہران بچوں کو خرید کر ان کی زندگی برباد کر دیتے ہیں قانون کے زبردست ہتھیاروں سے ابھی ان معصوم بچوں کا بچاؤ نہیں کیا گیا۔ ضرورت ہے کہ ان انسانی خون چوسنے والوں سے معصوموں کی زندگی بچائی جائے۔ یہ بھولے خاندانی افلاس اور بیوقوفی کا شکار، موروثی بیماریوں میں مبتلا، ذلت کے مارے ہوئے، سماجی تفریق اور ناانصافی کے ستائے ہوئے معصوم بچے اپنی دادرسی چاہتے ہیں۔ مگر افسوس کہ حکومت اور عوام کو سماج کی ذمہ داریوں کا ذرہ برابر احساس نہیں معلوم ہوتا۔ انہیں چاہیے کہ گزرد [illegible] ان پڑھ، ننگے اور بھوکے معصوم

بچوں کی خبرگیری کریں۔ اور ایسے چھوٹے شریر لڑکوں اور لڑکیوں کی دیکھ بھال کریں جو ناواقفی کی وجہ سے گلیوں میں اپنی زندگی برباد کررکھ ہیں اور ان سے بچائیں جو اپنا پیٹ پالنے کے لئے عمداً ان کو قانون توڑنے والے افعال کی تربیت دیتے ہیں۔

تمام دنیا کے بڑے شہروں میں سیکڑوں اداروں سے خواہش کی جاتی ہے کہ وہ لاوارث اور مظلوم بچوں کی دیکھ بھال اور ان کی تربیت کریں۔ لوگ اس سے واقف ہیں کہ غریبوں کی ... خوفناک تباہی سماجی خرابیوں میں مصیبت زدہ جماعتوں کی پرورش اور فضول پابندیوں سے احساسات مردہ ہوجاتے ہیں۔ مخالف سماج میں تنگی آجاتی ہے۔ اور بچوں کی فطری نرمی اور لطافت تباہ ہوجاتی ہے۔ آخر ان امراض کے اسباب کو کہاں ڈھونڈا جائے۔ دنیا میں سکڑوں ایسے لوگ موجود ہیں جنھیں لاکھوں غریب اور افلاس زدہ انسانوں کی تباہی کا علم نہیں ہے۔ یہ غریب ایسے ہوتے ہیں جنھیں عیش وعشرت سے کوئی سروکار نہیں ہوتا اور وہ اپنی ضروریات ہی کو سب کچھ سمجھتے ہیں۔ وہ یہ معلوم کرتے میں ناکام رہتے ہیں کہ کس طرح ایک غریب بچہ آیندہ چل کر سماج کو خواب پریشان کی طرح ستانے لگتا ہے ان غریب بچوں کے ماں باپ اور سرپرست روپے پیسے کے لالچ میں آکر اپنے بچوں کو ایسے بدمعاش اور سماجی طفیلیوں کے سپرد کر دیتے ہیں جو بچوں کی تباہی کرکے اپنا پیٹ پالتے ہیں۔ یہ سماجی طفیلی جن میں عورتیں اور مرد دونوں شامل ہیں۔ ہمارے اس ناقص معاشی نظام کی پیداوار ہیں جو لاکھوں بچوں کو بے خانماں اور بے گھر لڑکوں کے ذریعۂ زندگی بسر کرنے کے لئے چھوڑ دیتا ہے۔ بے شک وشبہ مفلسی انھیں ذلت کی زندگی بسر کراتی ہے۔ اور جب یہ بے گھر لڑکے مجرموں کی زندگی بسر کرتے ہیں تو سماج صرف اتنا کرتا ہے کہ انھیں جیل بھجوا دیتا ہے جیل سے واپس آنے کے بعد پھر آوارہ گردی میں زندگی بسر کرتے ہیں اور پھر جیل بھیج دیا جاتا ہے اس طرح جب تک ان آوارہ گردوں کا بچوں اور نوجوان مجرموں کے لئے جب تک سماج کے موجودہ ناقص ... نظام ... جائیں ...

معاشی نظام کی قربان گاہ پر لاکھوں غریبوں کی قربانی کی جاتی ہے۔ جب تک یہ مرد اور عورتیں درندوں کی طرح ان معصوموں کا شکار کرتے رہیں گے اور یہ سب کچھ انسانیت اسلئے بھگت رہی ہے کہ سماجی نظام میں بہت نقائص موجود ہیں۔

گلیوں کوچوں میں پھرنے والے اور شہر کے گندے اور تاریک محلوں میں رہنے والے بچے اس زندگی کا شکار ہوجاتے ہیں۔ یہ بچے ان تنگ وتاریک مقاموں میں یا تو دق جیسے مرض میں مبتلا ہوجاتے ہیں یا پھر مجرموں اور شرابیوں کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ شہر کے ان حصوں میں بہت ہی گرے ہوئے لوگ رہتے ہیں جہاں غلاظت بیماری جرم، مفلسی، ذلت اور پاگل پن جیسے امراض میں پرورش پاتے ہیں اگر بچپن سے لے کر سن بلوغ تک ان بچوں کی اچھی طرح تربیت کی جائے تو سمجھنا چاہیے کہ اس کی بدولت سماج کے ایک بڑے مسئلہ کے بہت چھوٹے سے حصے کو طے کیا جا رہا ہے۔

اگر ہم چاہتے ہیں کہ اس برائی کو جڑ سے اکھاڑ کر پھینک دیں تو ہمیں یہ نہ بھولنا چاہیے کہ کمسن بچوں کی بے نوائی اور غفلت کا مسئلہ ایک علحدہ چیز ہے بلکہ اس مسئلہ کو ملک کی غریب آبادی اور افلاس جیسے بڑے مسئلوں کے ساتھ حل کرنا پڑے گا۔

جب تک اس قسم کے مصیبت زدہ لوگ ایسی سماجی خرابیوں میں پرورش پاتے رہیں گے اور جب تک یہ خرابیاں موجود رہیں گی اس وقت تک لاکھوں بچے اپنے معصوم کندھوں پر موروثی خرابیوں — ماحول کی تباہ کاریوں گناہوں اور غموں کے بوجھ کو اٹھائے رہیں گے اور ان کی وجہ سے سماجی برائیاں اور معاشی خرابیاں پیدا ہوتی رہیں گی۔ انہیں کی وجہ ان کے باپ دادا کو بھی تباہ ہونا پڑا تھا اور یہی برائیاں آیندہ بھی ان کی اولاد کو پوری قوت سے تباہ کرتی رہیں گی۔ غرض ہندوستان میں بچوں کے مسئلہ نے نہایت پیچیدہ اور مشکل صورت اختیار کرلی ہے۔ اس کے لئے شہر میں کوئی ایک ... حل کی ضرورت ہے۔ دنیا کی متمدن قومیں اس برائیوں کو مٹانے کے لئے اپنی پوری قوت اور ذرائع کو کام میں لا رہی ہیں۔

جیونت راؤ

بچوں کے جھوٹ

چھوٹے بچوں کا بغور اور گہرے انہماک کے ساتھ مطالعہ کرنا از حد دلچسپی کا موجب ہوتا ہے۔ کیونکہ فطرت اپنی پوری سادگی اور بھولے پن کے ساتھ جلوہ گر پائی جاتی ہے۔ وہ قدرت کے ان کھلے غنچوں کی مانند ہیں، جو اپنی مہک سے تمام گرد و پیش والوں کو مسرور و سرشار بنا دیتے ہیں۔ اور جس قدر زیادہ ہم انھیں دیکھیں گے اسی قدر زیادہ ہم اپنے لئے روحانی مسرت و شادمانی کا سامان پیدا کریں گے۔ بدیں لحاظ یہ نہایت ضروری ہے کہ ہم انھیں بخوبی سمجھنے کی کوشش کریں کیونکہ قدیم تمدن و معاشرت میں محض ہماری اسی نافہمی کی بدولت ان بے چاروں کو بہت سے ظلم و ستم برداشت کرنے پڑے ہیں۔ اور خدا کا شکر ہے کہ اب بیسویں صدی کو بہت ہی فخر کے ساتھ یہ دعویٰ کرنے کا حق حاصل ہوا ہے کہ اس نے قدرت کے نہایت ہی انمول اور اچھوتے موتیوں کو جن سے اس محفل ہستی کی رونق قائم و برقرار ہے، بخوبی پہچان لیا ہے۔ اور سختی کا جو ناروا سلوک ان سے اکثر ہوا کرتا تھا، اس کی بجائے اب ملائمت اور نرمی اختیار کی جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اب ہر کہیں بچوں کی مناسب دیکھ بھال اور موزوں پرداخت و نگرانی کے چرچے ہوتے رہتے ہیں کیونکہ تمام مہذب دنیا نے بخوبی محسوس کر لیا ہے کہ کسی قوم کی تہذیب و تمدن کا اندازہ اس کے بچوں کی پرداخت و نگرانی کے اسلوب سے کیا جاتا ہے۔ اس لئے میں نے بچوں سے متعلق چند عنوانات کے تحت اپنی تقاریر نشر کرنے کا ارادہ کیا ہے۔ تاکہ فطرتِ طفلی سے متعلق چند اہم اور دلچسپ باتوں کو عام فہم زبان میں بیان کر کے عام طور پر تعلیم یافتہ والدین ملک سے اور خاص کر ان حضرات سے جو بچوں والے ہیں یا جنکے ذمہ بچوں کی دیکھ بھال اور تربیت کا کام ہو نیز ایسے دوستوں سے جو فطری طور پر بچوں سے زیادہ انس رکھتے ہیں۔ اپیل کروں کہ ان کی شرارت اور بچپن کے مدنظر ان سے بہتر اور عمدہ سلوک روا رکھنے کیلئے ہر طرح سعی و کوشش کریں۔

اس وقت بچوں کے جھوٹ کے متعلق میں چند باتیں بیان کروں گا سب جانتے ہیں کہ جھوٹ بولنا بہت برا اور ناپسندیدہ فعل ہے۔ بچے بھی بڑوں کی طرح جھوٹ بولتے ہیں مگر ان کے جھوٹ بہت ہی آسانی سے طشت از بام ہو جاتے ہیں۔ اور اکثر انھیں ان کی پاداش میں سخت جھڑکیاں اور دھمکیاں سننی پڑتی ہیں بلکہ بعض اوقات مارپیٹ اور سنگین سزاؤں سے بھی سابقہ پڑتا ہے۔ غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ ان بیچاروں کا اس میں زیادہ قصور نہیں ہوتا۔

بچوں کے جھوٹ کئی قسم کے ہوتے ہیں۔ پہلی قسم کے وہ جھوٹ ہیں جو ۳ تا ۵ سال کے بچوں کے خواب و خیال سے تعلق رکھتے ہیں۔ کمسن بچے بعض اوقات خواب کی شکلوں اور واقعات کو اپنے بھولے پن سے اصلیت کا رنگ دے دیتے ہیں جنھیں ان کے سرپرست جھوٹ سے تعبیر کر کے سخت ڈانٹ ڈپٹ کرنے لگتے ہیں۔ مثلاً ایک چار سال کا بچہ صبح سوتے وقت چوہے یا بلی کو خواب میں دیکھتا ہے۔ اور چونک کر نیند سے بیدار ہو جاتا اور شور مچانے لگتا ہے کہ چوہا بستر میں گھس آیا ہے۔ یہ شور سن کر ماں آتی ہے۔ مگر باوجود تلاش کے چوہا نہیں ملتا اس پر خواہ مخواہ بچے کو کوسنے لگتی ہے کہ صبح صبح ہی جھوٹ بکتا ہے۔ اسی طرح ایک پنج سالہ بچہ جو اپنے دو تین بھائی بہنوں کے ساتھ ایک کمرے میں سویا ہوا ہے، خواب میں دوسرے بھائی یا بہن سے لڑتے ہوئے یک بیک بیدار ہو جاتا ہے اور شور مچانے لگتا ہے کہ بھائی نے اسے طمانچہ رسید کیا ہے اور اپنے گال کو ہاتھ سے خوب ملتا ہے۔ ماں یہ شور و غل سن کر دادرسی کے لئے پہنچتی ہے۔ مگر معصوم بھائی کو گہری نیند میں

سویا ہوا پاکر بھڑک اٹھتی ہے کہ یہ بچہ بہت جھوٹا ہے۔ صبح سویرے ہی جھوٹ گھڑتا ہے۔ غور سے دیکھا جائے تو ان دونوں صورتوں میں بچے نے کچھ جھوٹ نہیں کہا۔ اس نے خواب میں جو کچھ دیکھا بعینہٖ کہہ دیا۔ البتہ خواب کو اصلیت کا رنگ ضرور دیا۔ اور یہ اس کے بس کی بات نہ تھی محض ناتجربہ کاری اور ناسمجھی کی وجہ سے اسے جھڑکنا یا ڈانٹ ڈپٹ کرنا صریحاً زیادتی ہے۔ ہمدرد اور تجربہ کار ماں کو تو ہنس کر اس کی غلط فہمی رفع کرنے اور مناسب تفہیم سے اس کی پریشانی دور کرنی چاہئے۔

بچوں کے جھوٹ کی دوسری قسم وہ ہے۔ جو ۵ تا ۸ سالہ بچوں سے متعلق ہے بعض اوقات جب بچے کسی شئے کو دیکھتے ہیں تو ٹھیک طور پر نہیں دیکھتے۔ یعنی اصل شئے سے بالکل علحدہ ہی اسے خیال کرتے ہیں۔ اسے نظر کا دھوکا کہنا چاہیے۔ بچہ دھندلی سی روشنی میں کسی سوکھی ہوئی بیل، رسّی یا لمبی سی ڈوری کو زمین پر پڑا دیکھ کر اسے سانپ سمجھتا ہے۔ اور اٹھ بھاگتا ہے یا کسی کپڑے یا پردے کے سایہ کو مدھم اور دھندلی سی روشنی میں کسی دیوار یا درخت کی آڑ میں پڑتے دیکھ کر اسے آدمی سمجھ کر چور چور پکارنے لگتا ہے ان سب صورتوں میں وہ جھوٹا قرار پاتا اور معقول ڈانٹ ڈپٹ سے اس کی خاطر تواضع ہوتی ہے۔ اسی طرح جب کوئی ۶ تا ۸ سالہ بچہ شام کے دھندلے میں بازی گاہ سے واپس ہوتے ہوئے سڑک کے قریب کسی سوکھے ہوئے بوسیدہ درخت کو دیکھتا ہے تو اسے عجیب و غریب ہیئت کا کالا کالا دیو یا جن سمجھ کر اٹھ بھاگتا ہے اور محلہ والوں کو یہ بیان دینے پر جھوٹا قرار دیا جاتا ہے۔ حالانکہ اس نے بالکل وہی بیان کیا تھا جو اس کے حواس نے دیکھا اور سمجھا کیونکہ گزشتہ شب جب وہ دیو یا جن کا قصہ سن رہا تھا تو اس نے اپنے ذہن میں دیو یا جن کی ایسی ہی شکل گھڑی تھی اور اب سوکھے ہوئے بوسیدہ درخت کا ڈھانچہ دیکھنے پر اس نے وہی شکل بنائی۔ صریحاً اس میں بچے کا کوئی قصور نہیں۔ محض اس کی ناتجربہ کاری اور کم فہمی کی وجہ سے اسے نظر کے دھوکے کا شکار ہونا پڑا ہے۔ اس پر سے اسے جھوٹ کا الزام دینا یقیناً بے انصافی ہے۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ بچے نے کسی رہزن، ڈاکو، چور، سانپ، جن، دیو یا بھوت کا ایک ہولناک قصہ سنا ہے۔ اور سنتے وقت ذہن میں اس کی ایک دہشت ناک شکل بھی گھڑلی ہے۔ اندھیرے یا دھندلکے میں کہیں جاتے آتے اتفاق سے وہی ذہنی شکل اس کے سامنے آجاتی ہے۔ حالانکہ حقیقت میں کوئی مادی شئے موجود نہیں ہوتی۔ اسے عام طور پر وہم کہتے ہیں۔ اب بچہ اگر کسی سے یہ بیان کرے تو اسے جھوٹ سے تعبیر کرنا کبھی درست نہیں ہوسکتا۔ سرپرستوں کو ایسے نظر کے دھوکوں اور وہم کی صورتوں میں بچوں پر بے جا خفگی کا اظہار کرنے کی بجائے انھیں مناسب طریقہ سے سمجھانا چاہیے کہ ایسے دھوکوں سے بچیں اور حقیقی واقعات کا اظہار کرکے ان کی پریشانی دور کرنی چاہیے۔ تیسری قسم میں وہ جھوٹ شامل ہیں جو مشاہدہ کی غلطیوں پر مبنی ہوتے ہیں یعنی بچہ کسی شئے یا واقعہ کو دیکھتا ہے اور دیکھ کر غلط نتیجہ نکالتا ہے۔ ایسی غلطیاں ۱۲ بلکہ ۱۵ سال کی عمر تک بھی ہوتی رہتی ہیں۔ مثلاً جماعت میں سے ایک بچے کا چاقو چوری جاتا ہے اور مدرس اعلان کرتا ہے کہ جو بچہ چور کا پتہ لگائیگا اسے انعام ملے گا۔ احمد جس نے محمود کے پاس ویسا ہی چاقو دیکھا ہے جھٹ سے مدرس کے پاس جاتا اور کہتا ہے کہ محمود نے چاقو کی چوری کی ہے۔ اس کے جیب میں مسروقہ چاقو موجود ہے۔ دیکھ لیجئے۔ مگر جب دریافت میں پایا جاتا ہے کہ محمود کے پاس اپنا ذاتی چاقو ہے جو مسروقہ چاقو سے ملتا جلتا ہے تو احمد کو جھوٹا قرار دیا جاتا ہے۔ حالانکہ خود مدرس کی غلطی ہے جس نے اچھی طرح شکایت کی چھان بین نہ کی۔ اسی طرح جب برخاست مدرسہ کی گھنٹی کے ساتھ ہی محمود جیسے کھیل کے میدان میں جانا چاہیے تھا جلدی جلدی کتابیں لئے ہوئے انھیں گھر چھوڑ آنے کے لئے بھاگتا ہوا [illegible]

بالکل بے تقریب ہے تو احمد کا سلیج شکایت کرنے پر کہ محمود بھاگ گیا ہے کیونکہ وہ کھیل میں شریک ہونا نہیں چاہتا تھا، مدرس کا بلا جرح اسے قبول کر لینا اور دریافت کرنے پر احمد کو جھوٹ بولنے کا الزام دینا درست نہیں ہو سکتا ایسی صورت میں مدرس کو چاہیے کہ نتیجہ نکالنے کی غلطی کی ہی صرف صحت و درستی کرے جھوٹ بولنے کا الزام دینا نادرست ہوگا۔

اس وقت تک میں نے جن تین قسموں کو لیا ہے۔ صاف ظاہر ہے کہ وہ جھوٹ کی تعریف میں نہیں آسکتیں۔ بڑوں کی محض زیادتی ہے جو انھیں جھوٹ کا رنگ دیتے اور خواہ مخواہ جھڑکی اور دھمکی کی بوچھاڑ کرنے لگتے ہیں۔

اب میں چوتھی قسم کو لیتا ہوں جس میں واقعی بچوں کو جھوٹ بولنا پڑتا ہے یعنی وہ جھوٹ بولنے پر مجبور کئے جاتے ہیں اس میں بھی ان کا قصور زیادہ نہیں ہوتا بلکہ اس کی تمام تر ذمہ داری بڑوں کے غیر صحیح اور نامناسب سلوک پر عاید ہوتی ہے۔ خطا کس سے نہیں ہوتی۔ چھوٹے بڑے سبھی کسی نہ کسی معاملے میں خطا کر بیٹھتے ہیں۔ خود انسان ہی خطا کا پتلا سمجھا جاتا ہے۔ پھر چھوٹے بچوں کو خطاؤں سے بالاتر تصور کرنا صریحاً خود بڑوں کی خطا ہے۔ اب معمولی معمولی سی خطاؤں پر ڈانٹ ڈپٹ کرنا یا ناروا سزا اور مار پیٹ پر اتر آنا یقیناً سلامت روی اور متانت کے خلاف ہے۔ بڑوں کو اپنا بچپن یاد میں لاتے ہوئے مناسب رواداری کا ثبوت دینا چاہیے۔ گھر کی دیوار پر بچے نے اگر چاک پنسل یا کوئلے سے اپنی نقش کشی کی تھوڑی سی مشق کر لی تو کونسا بڑا جرم ہو گیا کہ اسے ڈانٹ ڈپٹ کی جاتی ہے۔ اسی طرح اگر باغیچے سے اس نے کوئی کلی، پھول یا ٹہنی توڑ لی تو ہمارا غصے سے برہم ہو کر بھڑک اٹھنا کہاں تک ہمدرد محبت کو ثابت کر سکتا ہے۔ اور اگر بچے نے تھوڑی سی شکر طشتری میں سے اڑالی تو کیا واقعی وہ ایک طمانچے یا گھونسے کا مستحق ہے عقلمند اور ہمدرد ماں یقیناً ایسا نہیں کرے گی۔ کیونکہ ایسا کرنے میں بچوں کو اپنی ان خطاؤں کو چھپانا پڑتا ہے جن کے لئے وہ جھوٹ بولنے کو ترجیح دیتے ہیں۔ تاکہ جھڑکی، دھمکی اور سزا وغیرہ سے وہ نجات پائیں اگر ہم معمولی معمولی سی خطاؤں سے درگذر کریں اور جب بچے خود اپنی خطائیں ہم پر ظاہر کر دیں تو لعن طعن کی بجائے مناسب تفہیم و رہنمائی سے کام لیں تو اس طرح یقیناً انھیں جھوٹ بولنے کی نوبت نہ آئے گی۔

غرض کہ بچے محض سزا سے چھٹکارا پانے کے لئے جھوٹ بولنے پر آمادہ ہوتے ہیں اور جب دو چار مرتبہ انھیں اس میں کامیابی ہو جاتی ہے تو وہ پختہ طور پر جھوٹ بولنے کے عادی ہو جاتے اور زندگی بھر تک ایسا ایک موثر اور کارآمد حربہ اختیار کرنے پر مجبور ہوتے ہیں چنانچہ بے شمار برائیوں اور شرارتوں کو محض اسی کے بل بوتے پر اختیار کر لیتے ہیں کیونکہ وہ اپنی اس سپر پر پورا پورا بھروسہ رکھتے ہیں کہ اس کی آڑ میں وہ ہر طرح سے محفوظ و مامون رہیں گے۔

ملک سردار علی

بھاگ متی المخاطب بہ حیدر محل

سنہ ۹۷۴ھ تا ۱۰۱۶ھ

سلطان محمد قلی قطب شاہ اردو کے پہلے صاحب دیوان کی مشہور محبوبہ اور ملکہ

AZAM STEAM PRESS

بھاگ متی یا حیدر محل

بھاگ متی کو دکن اور خاص کر حیدر آباد کی تاریخ میں ایک خاص اہمیت حاصل ہے کیونکہ حیدر آباد جیسا فرخندہ بنیاد شہر اسی کی عشق و محبت کی دائمی یادگار ہے۔ بھاگ متی کے ساتھ محمد قلی قطب شاہ کی عشق عاشقی کا تذکرہ سب سے پہلے خود اسی کی زندگی میں تاریخ فرشتہ، طبقات اکبری، منشآت فیضی اور قطب مشتری وغیرہ کتابوں میں لکھا گیا ہے۔ قطب مشتری کے مصنف ملا وجہی نے تو اس واقعہ کے متعلق استعارہ کے پیرائے میں تفصیلی حالات بیان کر دیے ہیں۔ طبقات اکبری (سنہ ۱۰۰۲ھ) میں لکھا ہے :-

"بر پا تہرے بھاگ متی نام عاشق شدہ شہرے بنا کردہ بھاگ نگر موسوم ساخت و یکہزار سوار نوکر آں فاحشہ ساخت کہ دایم ملازم رکاب او بودند تا غایت سنہ اثنیٰ والف ہجری نہ سالت کہ حکومت می کند" صفحہ ۳۹۴ مطبوعہ منشی نولکشور

جب فیضی کو شہنشاہ اکبر نے دکن کی مہم کے لئے روانہ کیا تو اس نے اپنی ایک عرضداشت میں دکن کی خود مختار اسلامی سلطنتوں کا حال بادشاہ کی اطلاع کے لئے لکھ بھیجا تھا جس میں محمد قلی قطب شاہ سے متعلق لکھتا ہے :-

"تشیع دارد و معمورہ ساختہ و عمارات پرداختہ بھاگ نگر بنام بھاگ فاحشہ کہنہ و معشوقہ قدیمۂ اوست"

یہ عرضداشت منشآت فیضی میں درج ہے جس کا ایک نسخہ کتب خانہ آصفیہ میں موجود ہے۔ [illegible] لکھا ہے :-

"[illegible]

[illegible]

تا بطریق امرائے کبار بہ مدد یکہزار سوار [illegible] نمودہ [illegible]
و در آں ایام چوں از زبونی آب و ہوائے گولکنڈہ خلایق متنفر و پر اندوہ بودند قطب شاہ در چہار کروہی بلدہ مذکور شہرے ... ساختہ موسوم بہ بھاگ نگر گردانید" (صفحہ ۱۸۳)

محمد قلی قطب شاہ کی وفات کے بعد گولکنڈہ میں جو تاریخیں لکھی گئیں ان میں بھاگ متی کا حال درج نہیں ہے۔ البتہ بعد کی تاریخوں مثلاً حدیقۃ العالم، تاریخ قطب شاہی (قادر خاں) اور گلزار آصفی میں اس کا ذکر ملتا ہے۔ موخر الذکر تاریخ میں ابراہیم قطب شاہ کے بیان میں لکھا ہے :-

"پل دریائے موسیٰ بسبب تعشق شہزادہ مرزا محمد قلی کہ بر حسن جانفزائے بھاگ متی طوائف میلے کلی داشت تیار گردید حقیقت آں اینکہ شہزادۂ مذکور بر طبق عادت معہود کہ مواصلت خفیہ لذت بسیار میدہد ہموارہ بوقت شب از قلعہ محمد نگر بخانۂ طوائف مذکورہ در موضع چچلم کہ آبادی بلدہ حیدر آباد بر زمین ہموں موضع واقع است آمد و شدمی داشت۔ روزے موسم باراں موافق معمول خود بوقت شب قصد نمودہ چوں بر سر دریائے موسیٰ رسید دید کہ طغیانی آب از حد زیادہ است کہ فیل زد دستی کو و پیکری تواند قدم اندر روش گذارد فوراً در جذبۂ عشق و محبت اسپ سواری خود را بے اندیشہ در تلاطم تموج آب انداخت و بہ زور حفظ حقیقی بسلامت بر آمد" (صفحہ ۱۰۲، ۱۰۳)

یہ واقعہ حیدر آباد میں زبان زد خاص و عام ہے اور راقم الحروف نے اس تاریخی واقعہ کو افسانے کی شکل میں پیش کر کے "چچلم کی رقاصہ" کے عنوان کے تحت اپنی کتاب "گولکنڈہ" میں شامل کیا ہے۔

گلزار آصفی سے تقریباً پچاس سال قبل حیدر آباد میں ایک [illegible]

[illegible]

چنانچہ ہزار سوار ملازم او گردانید تا ہمچو امرائے کبار بدربار آمد و شد می نمودہ باشد۔ لہٰذا نسخت آں (شہر حیدرآباد) را بہ بھاگ نگر موسوم ساخت و مستقر سریر سلطنت خود گردانید۔" (صفحہ ۲۱۵)

بہرحال موجودہ معلومات کی بناء پر اتنا یقین سے کہا جاتا ہے کہ محمد قلی عنفوان شباب ہی میں (یعنی ۱۴ سال کی عمر میں) بھاگ متی پر عاشق ہوا اور اس کی خاطر طغیانی رود موسیٰ میں اپنا گھوڑا ڈال دیا جب اس خطرناک جرات کی خبر اس کے باپ ابراہیم قطب شاہ کو ہوئی تو اس نے ندی پر پل بنوا دیا۔ اس کے کچھ دن بعد ہی ابراہیم کا انتقال ہو گیا اور محمد قلی نے تخت نشین ہوتے ہی اپنی محبوبہ کے اعزاز و اکرام میں اضافہ کی خاطر ہزار سوار اس کے یہاں متعین کر دیئے جو ہر وقت اس کے جلوس میں رہتے اور وہ اسی شان و شوکت کے ساتھ موضع چچلم سے گولکنڈہ آیا کرتی تھی اور خود محمد قلی بھی اس کے یہاں جایا کرتا۔
اسی اثناء میں اس نے اپنی محبوبہ کے گاؤں کو ایک عظیم الشان شہر میں تبدیل کرنے کی ٹھانی اور جب یہ شہر بن گیا تو اسی کے نام پر اس کا نام بھاگ نگر رکھا۔

حیدرآباد میں خود دولت خانۂ عالی اور دیگر محلات کے بن جانے کے ساتھ ہی محمد قلی نے بھاگ متی کو اپنے حرم میں داخل کر لیا اور شادی کے بعد مشتری اور بعد کو حیدر محل کا خطاب دیا۔ اور اس کے لئے ایک خاص محل بھی بنوا دیا جس کا نام حیدر محل یا حیدر منڈ وہ رکھا گیا۔ پھر اس خطاب کی مناسبت سے بھاگ نگر کا نام بھی حیدرآباد میں تبدیل کر دیا گیا۔ بعض مورخین کا یہ خیال صحیح نہیں معلوم ہوتا کہ محمد قلی نے بھاگ متی کے انتقال کے بعد پشیمان ہو کر شہر کا نام بدل دیا کیونکہ اس نے خود اپنی نظموں میں اپنی محبوبہ حیدر محل کا ذکر کیا ہے البتہ یہ بات ظاہر ہے کہ یہ خطاب بھاگ متی ہی کو دیا جا سکتا تھا جو آخر وقت تک [illegible] کے مطابق اس کی چہیتی محبوبہ تھی۔
[illegible] ہے کہ حیدر محل کا خطاب دینے کے بعد محمد قلی نے [illegible]

کوشش کی تھی کہ بھاگ متی اور بھاگ نگر کا نام لوگوں کے ذہن سے محو ہو جائے اور حیدر محل اور حیدرآباد رائج ہو جائیں۔ چنانچہ جب وجہی نے بھاگ متی سے عشق عاشقی کا قصہ لکھا تو اس میں بھی اس نام کو چھپائے رکھا اور خود محمد قلی نے بھی اپنے کلیات میں اس نام کی بجائے جگہ جگہ حیدر محل کا نام لکھا ہے۔ ورنہ لازمی تھا کہ جب وجہی مشتری کے سامنے محمد قلی کی معشوقاؤں کا تذکرہ کرتا ہے تو بھاگ متی کا بھی ضرور ذکر کرتا لیکن اس نے تو خود بھاگ متی ہی کو مشتری کے نام سے ظاہر کیا ہے۔ اور اس مشتری یا بھاگ متی کے متعلق محمد قلی نے اپنے کلیات میں دو نظمیں اور مختلف جگہوں پر اشعار لکھے ہیں۔
یہ نظمیں کلیات کے صفحہ ۲۶۲ تا ۲۶۴ پر درج ہیں۔ ایک نظم میں وہ مشتری کو اپنی آنکھ کی پتلی کہتا ہے اور اس کو مخاطب کر کے کہتا ہے کہ:-

"سب کو تیرے جوبن سے عشق ہے۔ تیرے ہونٹ کوثر کا پیالہ پلاتے ہیں، ان پر محبت کا نشان ہے اور ان کے چومنے سے نبات شرما جاتی ہے۔ ہوشیار رہے ہوشیار اور تو میں تو ہوشیار رہے اسی لئے میں تجھے منا کر اپنے دل میں بٹھاتا ہوں وغیرہ"

ایک دوسری نظم میں وہ کہتا ہے:-

اے قطب شاہ تو اپنے معشوقوں کی سلامتی کے لئے دعا کر کیونکہ اس کے جینے سے تمام دنیا پر تیری فرمانروائی ہے۔ زندگی اسی کا نام ہے کہ جسم میں دل ہو۔ اور ہمارا دل ہمارا معشوق ہے جس میں عاشق کی ہستی ہے جس کی وجہ سے ہمارے دل میں [illegible]
اس کا [illegible] سورج کی شعاعوں [illegible]
روشن ہے [illegible]

ھیئت دیا ہے اور مشتری کے طالع کی وجہ سے ہمارے
طالع کو بقا حاصل ہے۔ اس لئے اے خدا قطب شاہ کے
اس تارے کو اپنی عنایت سے سرفراز رکھ"

ان نظموں کے علاوہ محمد قلی نے مختلف جگہوں پر حسب ذیل خیالات کا اظہار کیا ہے کہ :۔

اے قطب شاہ تو شادی و خوشی کر کہ تیرا رشتہ اس کے رشتہ
سے بندھا ہوا ہے اور مشتری تیرے لئے باعث برکت
ثابت ہو رہی ہے۔
تو ثانی سلیمان ہے اور فتح و فیروزی تیرے ہی لئے ہے
اور تو نے اپنا منظور نظر بنا کر مشتری کو بھی شرف یاب کر دیا۔

اس کے شعر ہیں ؎

رشتہ ترا اس رشتہ سوں ہے بند معانی
شادی و خوشی کر کہ اہے مشتری تجے راس
توں سلیماں ثانی ہے تجے برج فیروزی و فتح
مشتری پایا شرف تیری نظر منظور تجے

بعض شعروں میں وہ مشتری کو اپنی بزم میں رقص کناں ظاہر کرتا ہے جس سے یقین ہو جاتا ہے کہ یہ بھاگ متی ہی کا پہلا خطاب تھا :۔

ع کرے مشتری رقص مجہ بزم میں نت　ع زہرو مشتری سوں پاتر نچا جاؤ
ندا ماہ ورلی موتیاں کی تاروں بھر کر
سو زہرہ مشتری کے ہت پلا ڈلائے آج

اسی طرح حیدر محل یا حیدر پیاری کے متعلق بھی اس کے کلیات میں کئی نظمیں اور مختلف اشعار دستیاب ہوتے ہیں۔ جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ حیدر محل فن موسیقی کی ماہر تھی اور محمد قلی کو [illegible] ایک نظم میں کہتا ہے کہ :۔
حیدر محل بہت سے [illegible]

عیش و عشرت کے ساتھ عشق سے کھیل جاتی ہے۔
اس کے سرو جیسے قد پر لونتی کا جلوہ نظر آتا ہے
اور سب سوکنیں اس کو دیکھ کر تھرّاتی ہیں۔ صبح
پیشانی پر عشق کا ٹیکا (قشقہ) لگاتی ہے اور چاروں
طرف کرن کے تار بجتے ہیں وہ عشق کی چادر اوڑھ کر
بیر بہوٹی کی طرح سرخ نظر آتی ہے۔ اے قطب شاہ
تو شکر کر کہ حیدر کی غلامی کی وجہ سے تجھ کو یہ نعمتیں
ملی جس کی وجہ سے تیرے سر پر تاج سجتا ہے (دیکھو صفحہ ۱۱۰)

ایک دوسری نظم میں لکھتا ہے کہ :۔

نبی کے صدقے میں حیدر پیاری ملی ہے جس نے اپنے
مختلف انداز سے میرے دل کو اپنے دل سے باندھ
لیا ہے۔ وہ عشق کے پر اسرار راگ گاتی ہے اس
کے بالوں میں کنول کی تازگی اور آفتاب کی چمک ہے
وہ اپنی بھوؤں میں کاجل لگاتی ہے جسم میں نارنجی
رنگ کی تنگ چولی پہنتی ہے۔ اور آنکھوں کے
خمار کے ذریعے سے میرے دل پر حملہ کرتی ہے۔ (دیکھو صفحہ ۱۲۰)

ایک دوسری نظم میں جو نامکمل دستیاب ہوئی ہے لکھا ہے کہ :۔

حیدر محل محبت و عشق کا جلوہ لگائے اور [illegible]
بجائے۔ اس نے اپنے ہاتھ میں جوڑے کے لئے
کنگن پہن رکھا ہے اور اپنی آنکھوں کی تیلیوں کو
تیلیوں کی طرح نچائے وغیرہ (دیکھو صفحہ ۱۲۰)

محمد قلی نے اس حیدر محل یا حیدر پیاری کے لئے ایک محل بھی بنا دیا تھا جس کا نام حیدر محل یا حیدر [illegible] تھا اس کا ذکر آئندہ کیا جائے گا۔ اس نظم میں لکھتا ہے۔

حیدر محل ہی حیدر پیاری [illegible]
خوشی میں [illegible]

طبل بجاؤ۔ اے ساقی ہم ساقی میری بزم میں صراحی سے۔ اور پیالے کی روشنی میں مجھے اپنے سائیں کی صورت دکھا۔ (یہ قاعدہ ہے کہ جلوہ کے وقت آئینہ میں دولھا کو دلہن کی صورت دکھاتے ہیں) اور سورج کے طبق سے لے کر نقل و شراب اپنے رخساروں میں رکھو اور پیاری کی محبت کے ہار پیارے کے گلے میں ڈالو۔ اس نیک ساعت میں سینوں پر پستانیں زیب دیتی ہیں۔ دودھ اور مصری سے آبحیات کے ان گھڑوں کو بھر دو۔

اس جلوے کے وقت بادشاہ آسا اچھا نظر آتا ہے کہ پدمنیاں اور چھتینیاں سب شاہ کے روپ کی دیوانی ہو گئی ہیں۔ اے سکھیو ان کے ہاتھ سے قول کا بیڑا اٹھا کر شہ کو کھلاؤ۔ نبیؐ کے صدقے میں آج قطب شاہ کو جلوے میں بیٹھنا نصیب ہوا ہے۔ اس لئے حوروں اور پریوں کو چاہیے کہ شہ پر سے خود کو واریں۔" (صفحہ ۲۱۷)

معلوم ہوتا ہے کہ یہ نظم حیدر محل کے ساتھ شادی کرنے کی تقریب میں لکھی گئی ہے۔ اور بھاگ متی کو نکاح کے وقت ہی حیدر محل کا خطاب دیا گیا تھا۔ اور بعد کو اسی کے خطاب کے لحاظ سے بھاگ نگر کا نام حیدرآباد میں تبدیل کر دیا گیا۔

بھاگ متی نے محمد قلی کی زندگی میں ۱۰۲۰ھ سے قبل چالیس بیالیس سال ہی کی عمر میں وفات پائی۔ کیونکہ تاریخ فرشتہ اور قطب مشتری دونوں کی تصنیف کے وقت اس کا انتقال ہو چکا تھا۔ اس کے زمانۂ وفات کا یہ اندازہ اس وجہ سے صحیح نکلتا ہے کہ بعض مورخوں نے شہر کے نام کی تبدیلی کو بھاگ متی کی وفات سے لازم و ملزوم قرار دے کر بتایا ہے کہ تعمیر کے سترہ سال بعد اس کا نام حیدرآباد رکھا گیا۔[1] گویا اس سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ ۱۰۱۶ھ کے لگ بھگ گولکنڈہ کی یہ مشہور مہ جبین اپنے عاشق جانباز کو داغ مفارقت دے گئی۔

---

[1] تاریخ قطب شاہی مولفہ قادر خاں بیدری [illegible] میں لکھا ہے :-
"بعد ہفدہ سال بہ حیدرآباد موسوم گردید" (صفحہ ۱۶)

آخر میں نمونے کے طور پر خود محمد قلی کی ایک نظم کے چند شعر یہاں درج کئے جاتے ہیں۔ یہ ساڑھے تین سو سال قبل کی اُردو ہے :

حیدر محل میاتے نابات گھول ساجے [محبت سے — نبات]
دن دن انند سیتے طبلاں مدن کے باجے [سے — عشق — بجاتی ہے]

اس سروقد کے اوپر جلوہ ہے نور تن کا [اس کے]
عشق کے پاتراں سب اس کا س دیکھ لاجے [تھرکتے ہیں]

سب عاشقاں کے دل میں ہی عشق پھول جلوہ [پھول کا]
پتلیاں نین کیاں مے رمن میں انندسوں کاجے [آنکھ کی]

چادر عشق کا اوڑھے جوں بیربھوٹی دسیے [نظر آئے]
تیرے عشق کے لاجاں دیکھے میں لاجوں بھاجے

صدقے نبی شکر کر تج کوں ملی اے پاتر
حیدر غلامی سیتے تجھ سیس تاج ساجے [کی — سے — تیرے سر پہ]

سید محی الدین قادری زور

سماج

دھرا ہوا ہے جہالت کے سر پہ تاج ابھی — نہیں "عروس" کی آزادیوں کا راج ابھی
دلوں کے بھید سے واقف نہیں سماج ابھی — ہر آرزو کو کچل دو یہ ہے رواج ابھی

جو پائے حسنِ اطاعت پہ حسرتیں بیچ دو
تو والدین کی مرضی پہ زندگی تج دو

مراد یہ نہیں مغرب کے کان کاٹے ہند — خلیجِ عفت و عصمت گنہ سے پاٹے ہند
فضائے عیش و طرب میں بھرے سپاٹے ہند — جنانِ نفس پرستی کے پاؤں چاٹے ہند

مگر ضرور ہے شادی کو اذن کا سہرا
نہ یہ کہ "رعبِ ادب" کا دکھا دیا پہرا

جنھیں مراسمِ فرسودہ ناپسند نہیں — مقلدینِ قدامت ہیں ہوشمند نہیں
نہیں کسی کی تباہی سے کچھ گزند نہیں — غرض کہ بزمِ محبت میں سربلند نہیں

رواں زبانوں پہ اپنی پسند کی "لے" ہے
یہ جانتے نہیں "میلانِ طبع" کیا شے ہے

ہوا ہوں آج میں گستاخ اس کی شادی سے — بدل گئی جو مرادوں کو نامرادی سے
چرا رہا ہوں نگاہیں خوش اعتقادی سے — ٹپک رہا ہے مری "نظمِ بے ارادی" سے

سماج نقد و نظر کے لئے سنبھل جائے
سناؤں گا وہ حقیقت کہ جی دہل جائے

وہ جس نے مجھ سے کیا تھا نباہ کا وعدہ — عنایت و کرمِ بے پناہ کا وعدہ
رخِ صبیح پہ زلفِ سیاہ کا وعدہ — حکایتِ غمِ دوری پہ آہ کا وعدہ

تبسمِ لبِ رنگیں میں عہدِ دلجوئی
نگاہِ مست میں قول و قسم کی یکسوئی

جو مجھ کو مقصدِ ہستی قیاس کرتی تھی — جو دردِ سوز درونِ التماس کرتی تھی
جو مجھ سے چشمِ مروت کی آس کرتی تھی — جو میرے جذبۂ صادق کا پاس کرتی تھی

وہ ہر ادائے محبت اساس پہ مائل
میں دل سے ہدیۂ ہوش و حواس پر مائل

وہ ہم کے ساتھ رہے کمسنی کے کھیلوں میں ۔۔۔ گلاب توڑ لئے۔ جا چھپے ہیں بیلوں میں
سفر میں جھول گئے۔ کھڑکیوں پہ ریلوں میں ۔۔۔ کمر میں ہاتھ دئے پھر رہے ہیں میلوں میں
یہی کہ جن پہ ہوئی جہل کی بلا غالب
سمجھ رہے تھے ہمیں ایک جان دو قالب

تُکے ہماری تباہی پہ یہ ظلوم و جہول! ۔۔۔ خطا معاف! انہیں ٹھیک جن کی عقل کی چول
تراش رکھے ہیں ان سب نے وہ اصولِ فضول ۔۔۔ نہ جن میں حسنِ تدبر، عمق نہ عرض نہ طول
بزرگ ہیں انھیں خامی پہ ٹوکنا کیسا
بڑے ہیں ان کو ارادوں سے روکنا کیسا

"رسومِ شرق" نے مجبور کر دیا ہم کو ۔۔۔ جنونِ عشق میں مشہور کر دیا ہم کو
یگانگت سے بہت دور کر دیا ہم کو ۔۔۔ غمِ فراق سے معمور کر دیا ہم کو
نشاطِ جلوۂ دیدار و بازدید بھی بند
پیام و سلسلہ جنبانیٔ "رسید" بھی بند

لکھا یہ اس نے کہ اب زہر کھا رہی ہوں میں ۔۔۔ غمِ مآل سے پیچھا چھڑا رہی ہوں میں
غلط رویۂ شادی مٹا رہی ہوں میں ۔۔۔ تم آؤ جلد کہ دنیا سے جا رہی ہوں میں
سمجھائے جا کہ جو میں نے اُسے نشیب و فراز
گلے میں ڈال کہ باہیں کہا "قبولِ نیاز"

سماج ہم پہ تو یہ ظلم کر چکی لیکن ۔۔۔ وہ آگیا ہے زمانہ قریب ہیں وہ دن
جہاد کے لئے اٹھیں گے نوجوان ہم سِن ۔۔۔ بہے گی چار طرف سیلِ جذبۂ باطن!
نہ ہو سکے گا کہیں "اختیارِ نفس" پہ جبر
کرے گا اپنی تباہی پہ "اِذنِ بے جا" صبر

شاد عارفی

گونگی لڑکی

شہر میں بڑی بڑی عالیشان عمارتیں بھی تھیں محل بھی تھے، کوٹھیاں بھی تھیں۔ اوسط قسم کے چھوٹے بڑے نئی پرانی وضع کے کچے اور پکے مکانات بھی تھے۔ ٹوٹی پھوٹی بے کواڑ کی کوٹھریاں بھی تھیں اور گھاس پھوس کی جھونپڑیاں بھی، لیکن ایک غریب گونگی لڑکی کے لئے نہ محلوں میں جگہ تھی نہ مکانوں میں نہ جھونپڑیوں میں۔

قیمتی نفیس سامان سے آراستہ باعظمت ایوانوں اور دلکشا باغوں کی لطیف فضا میں سانس لینے والوں کے پاس دولت تھی، پیسہ تھا لیکن نظر نہ تھی اور احساس نہ تھا کہ وہ اپنی امیرانہ دلچسپیوں اور قیمتی مسرتوں کی بھول بھلیاں سے تھوڑی دیر کے لئے بھی باہر آکر اپنے گردوپیش کی کثیف فضا کو دیکھ سکتے، مفلس سسکتی ہوئی روحوں کی تکلیف اور درد کو محسوس کر سکتے اور اپنی خود غرضیوں کو جان سکتے۔ متوسط طبقے کے پاس نظر تھی کچھ احساس بھی تھا اور کچھ پیسہ بھی لیکن وہ تو اپنی ہی خواہشوں اور آرزوؤں کے گورکھ دھندے میں الجھے ہوئے تھے۔ اور انہیں اپنی اصلی حیثیت اور شخصیت پر مصنوعی خوش نما پردے ڈالنے، دولتمندوں کی ریس کرنے، ذاتی مسرتوں کے حصول کے لئے وسیلے تلاش کرنے اپنی دلچسپیوں کے لئے نئی نئی تجاویز اور پروگرام بنانے سے کب فرصت تھی کہ وہ اپنے مبہم احساس ہمدردی اور جذبۂ انسان دوستی کو زیادہ وسیع بنا سکتے اور اپنی ذاتی مسرتوں سے علٰحدہ ہو کر دوسروں کے لئے بھی کچھ سوچ سکتے اور عمل کر سکتے۔

جھونپڑیوں اور شکستہ مکانوں میں جینے والوں کے پاس نظر تھی احساس تھا، دل تھا، دل میں درد تھا۔ وہ زندگی کے طوفان میں روندی ہوئی زندہ نعشوں کو دیکھ سکتے تھے۔ ان کی آہ و بکا کو سن سکتے تھے۔ ان کے درد کو اپنے درد کی طرح محسوس کر سکتے تھے۔ بھوک کی جان لیوا تکلیف کو جانتے تھے، سمجھتے تھے۔ مگر ان کے پاس پیسہ کہاں تھا کہ وہ بھوکی روحوں کو آسودہ کر سکتے اور انھیں زندگی کے طوفان سے بچا لیتے۔

وہ خدا اور خدا کے دولتمند بندوں کی نظروں سے گری ہوئی اکیلی، بے گھر، بے سہارا بھوکی، پیاسی، خستہ تن ہستیوں کو گلیوں اور سڑکوں پر درد اور تکلیف سے کراہتے اور گھسٹتے ہوئے دیکھتے تو ان کا دل دکھتا وہ ان کی بے کسی پر دل ہی دل میں آنسو بہاتے مگر وہ ان کے لئے کیا کر سکتے تھے۔ وہ تو خود ہی دولت کی چکی میں پس رہے تھے ان میں اتنی سکت کہاں تھی کہ وہ ان کے لئے بھی روٹی فراہم کرتے اور ان کی تنہائی کی بے کسی کو دور کر سکتے۔

تاہم غریب گونگی لڑکی بالکل تنہا اور بے یار و مددگار بھی نہ تھی اگر خدا کی برتر مخلوق' انسان کی ہمدردیاں اور محبتیں اس کے لئے نہ تھیں تو نہ سہی۔ ابھی اس سرزمین پر ایسی مخلوق باقی تھی جو انسان اور خدا دونوں کی نظروں میں ذلیل و خوار سہی مگر ہمدردی اور محبت کے جذبہ سے بیگانہ نہ تھی۔

چند بے ہنگم، بدصورت، لال پیلے گلیوں میں پھرنے والے کتے اس کے دوست اور مددگار تھے۔

غریب لڑکی کے پاس زبان نہ تھی اور اس کے ساتھی بھی بے زبان تھے وہ آپس میں ایک دوسرے سے باتیں

نہ کر سکتے تھے۔ مگر ان کی نگاہیں زبان تھیں وہ ایک دوسرے کو خوب جانتے اور سمجھتے تھے۔

جب گونگی لڑکی بھوکی ہوتی تو اس کے دوست دروازوں پر جھٹکے ہوئے دستر خوانوں کے سوکھے روٹی کے ٹکڑے چن کر اس کے کھانے کے لئے لاتے اور موقعہ پاتے تو دوکانوں اور ہوٹلوں سے تازہ روٹی اور کیک بھی چرا لاتے اور جب رات تھوڑی دیر کے لئے "انسانی درندوں" کو اپنے پُرسکون گہوارے میں جھلا جھلا کر غافل کر دیتی اور گونگی لڑکی بھی دن بھر کی آوارہ گردی سے تھک کر کسی دوکان کے سامنے یا پل کے کنارے سخت پتھروں پر نیم برہنہ جسم کو صرف اپنے لانبے گھنے بالوں سے ڈھک کر سو رہتی تو اس کے وفادار ساتھی اس کی حفاظت کرتے اور اُسے ہر خطرے سے محفوظ رکھتے۔

راہرو ایک انسانی شکل کو چند ذلیل جانوروں کی ہمراہی میں سڑکوں اور گلیوں میں گھومتا دیکھتے تو ان کی پیشانیاں شکن آلود ہو جاتیں۔ بھویں سکڑ جاتیں اور وہ حقارت کے ساتھ اپنی نظریں دوسری طرف پھیر کر تیزی سے آگے بڑھ جاتے۔ دولت کی فراوانی میں پلے ہوئے بے فکر نوجوان شام کی تفریح کے لئے اپنے دوستوں کی ہمراہی میں قہقہے لگاتے، بیکار اور فضول گفتگو کرتے، قیمتی کپڑوں اور سوٹ بوٹ میں ملفوف، بار بار شیروانی کی سلوٹیں برابر کرتے۔ ٹائی کو ٹھیک کرتے آپ اپنی رفتار کی نزاکت پر اتراتے نگاہوں میں غرور و تمکنت کی جھلکیاں لئے ہوئے باہر نکلتے۔ اور گونگی لڑکی کو کتوں کے ساتھ دوکانوں کے سامنے کی گری پڑی چیزیں کھاتے دیکھتے تو ایک لمحے کے لئے ان کے شگفتہ قہقہے تھم جاتے۔ اور وہ اپنے جسموں کو انتہائی بیزاری اور نفرت کے انداز میں سکیڑ کر تیز رفتاری کے ساتھ آگے بڑھ جاتے گویا وہ ڈرتے تھے کہیں یہ نجاست انھیں نہ چھو جائے۔ لیکن کبھی ایک لمحہ کے لئے بھی ان کے دل کی نبضیں متحرک نہ ہوئیں اور وہ بھول کر بھی کبھی یہ نہ سوچتے تھے کہ زندگی کے اس کریہہ منظر کی ذمہ دار بڑی حد تک خود اُن کی ہستیاں ہیں اور انہی کی مالکانہ اور امیرانہ خود غرضیوں، عیش پسندیوں، بے فکری اور بے حسی نے ان کے ساتھی مخلوق کو حیوانوں اور جانوروں کی زندگی بسر کرنے پر مجبور کر دیا ہے۔

فیشنی، خوش نما ساڑیوں میں ملبوس نوجوان لڑکیاں خوش رنگ موٹروں میں اپنے ناز پرور دہ جسموں کو ریشمی گدیلوں کا سہارا دئے سڑک پر سے گزرتیں اور اتفاقاً کبھی اُن کی نظر گونگی لڑکی پر پڑ جاتی اور وہ اس کے بالوں کو دیکھتیں تو ایک بے اختیار جذبۂ تحسین سے بےچین ہو جاتیں لیکن یہ جذبہ دوسرے ہی لمحہ رشک و حسد میں تبدیل ہو جاتا وہ سوچتیں بھلا ایک گلیوں اور سڑکوں پر ماری ماری پھرنے والی فقیر لڑکی کو اتنے لانبے اور خوبصورت بالوں کی کیا ضرورت اور وہ قدرت کی اس بے وجہ فیاضی پر دل ہی دل میں پیچ و تاب کھاتیں اور اللہ میاں کی اس بے انصافی پر اس طرح برہم ہوتیں گویا دولت اور ثروت کی مالک بن کر وہ خدا کو بھی اپنی ملک جانتی اور سمجھتی تھیں خدا صرف امیروں کے لئے ہے غریبوں سے اُسے کیا سروکار اور وہ کیوں اس کی عنایت اور مہربانی کے مستحق قرار پائیں۔ اور شاید ان کی زندگی میں کبھی کوئی لمحہ ایسا نہ آتا جب کہ وہ اپنے اس خودغرضانہ احساس پر متاسف ہوں۔ انھیں اپنی قیمتی

مصروفیتوں سے کبھی اس کی فرصت ہی نہ ملتی تھی۔

سورج کی روشنیاں چاند کی ضیاؤں میں اور چاند کی ضیائیں سورج کی روشنیوں میں تبدیل ہوتی رہیں۔ دن گزرتے رہے۔ شہر کے شکستہ پرانے مکانات ٹوٹتے پھوٹتے اور نئی عمارتیں بنتی رہیں۔ دوکانوں پر نیا نیا مال آتا اور ہاتھوں ہاتھ فروخت ہوتا رہا۔ سربرآوردہ عہدہ داروں کی تنخواہوں میں ہر سال اضافہ اور مزدور پیشہ لوگوں کی روزی میں دن بدن کمی ہوتی رہی غرض زندگی اور مشیت کا کبھی نہ ختم ہونے والا کھیل بدستور کھیلا جاتا رہا گونگی لڑکی کے ساتھیوں میں کچھ کمی ہوئی کچھ اضافہ لیکن اس کی زندگی کے ساکن دریا میں کوئی نمایاں تلاطم پیدا نہ ہوا۔ وہ یوں ہی گلیوں اور سڑکوں پر پھرتی اور گری پڑی چیزیں کھا کر زندگی کی گھڑیاں گزار رہی تھی لیکن اسے دیکھنے والے اب اس سے اتنے بیگانہ نہ رہے تھے۔ اکثر راہروؤں کی نظریں اب اس پر پڑتیں تو تھوڑی دیر کے لئے ضرور اس کے چہرے پر ٹھہر جاتیں بلکہ اکثر آوارہ گرد، شوقین مزاج نوجوان راہ چلتے چلتے اسے دیکھ کر رک جاتے اور جلدی سے اپنی بے داغ صاف اور ملائم انگلیوں میں کوئی چمکدار سکہ پکڑ کر شوق کے ساتھ اس کے قریب پہونچنے کی کوشش کرتے۔ اس لئے نہیں کہ اس کی ناداری اور مفلوک الحالی پر ان کا دل دکھتا تھا اور وہ اس کے ساتھ ہمدردی اور نیکی کرنا چاہتے تھے بلکہ صرف اس لئے کہ بچپن اور جوانی کے معصوم امتزاج نے اب اس کی نگاہوں اور چہرے میں ایک عجیب غم آمیز دلکشی پیدا کر دی تھی۔ اور وہ مفلس جوانی کی اس اداس تحریب [illegible] نے صرف اپنی نگاہوں ہی کو سیر کرنا چاہتے تھے بلکہ اس کے تکلم کی شیرینی سے اپنے سامعہ کو بھی مسرور بنانا چاہتے تھے۔ لیکن جب وہ جانتے کہ وہ گونگی ہے اور ان کی خود غرضانہ دریا دلی کے جواب میں ہمیشہ بند رہنے والے لب متحرک نہیں ہو سکتے اور وہ انہیں کوئی دلنواز نغمہ نہیں سنا سکتی تو دل ہی دل میں اپنی فیاضی پر کسی قدر پشیمان ہوتے ہوئے واپس لوٹ جاتے۔

بہت جلد ہر ایک جان گیا کہ اس کی جوانی گونگی تھی اور اس کا حسن بے آواز اور اب پھر دنیا کی نگاہوں میں اس کی حیثیت اس تنکے کے مانند تھی جسے لوگ مسلسل پیروں تلے روندتے ہیں اور انہیں اس کی خبر بھی نہیں ہوتی۔

تین دن کی مسلسل بارش کے بعد پانی تھا تو گونگی لڑکی کانپتی، لڑکھڑاتی اپنی غیر محفوظ جائے پناہ سے باہر نکلی۔ شام بہت دلنواز تھی۔ ہواؤں میں موسم بہار کی سی تازگی اور شگفتگی پیدا ہو گئی تھی۔ مکانوں اور دوکانوں کے چھجوں سے ابھی تک پانی کے قطرے موتیوں کی جھالر کی طرح لٹک رہے تھے اور سورج کی آخری کرنیں گہرے اودے اور نیلے بادلوں کو گلابی اور سنہرا بنا رہی تھیں۔ سڑکوں پر معمول سے زیادہ ہجوم تھا۔ ہر شخص کے چہرے پر ایک نئی کیفیت تھی موسم کی دلفریبی سے ہر دل متاثر نظر آتا تھا اور متفکر چہروں پر بھی آج تبسم کی جھلکیاں تھیں لیکن گونگی لڑکی آج بہت خستہ اور پریشان تھی اس کے ساتھی پانی اور آندھی سے گھبرا کر نہ جانے کہاں چھپ گئے تھے اور وہ تنہا رہ گئی تھی۔ وہ اپنے چاروں طرف متجسس نظریں ڈالتی ہوئی آگے بڑھی کہ پانی میں بھیگے رہنے سے خون اس کی رگوں میں جم گیا تھا اور [illegible] پاؤں حرکت کی [illegible]

ہوا سے دوڑ رہے تھے۔ بالآخر وہ ایک گلی کے نکڑ پر پہونچ کر رک گئی اور ایک طرف دیوار کے سہارے کھڑی ہوکر اپنے ساتھیوں کا انتظار کرنے لگی۔ اس کا بوڑھا دوست تو ضرور آئے گا۔ اُسے اس کا یقین تھا اُسے اس کی وفاداری اور دوستی پر پورا اعتماد تھا اور محبت کے اسی اعتماد نے زندگی کی کلفتوں کو اس کے لئے بہت کچھ سہل بنا دیا تھا۔

شام کا دھندلکا بڑھتا جا رہا تھا۔ چراغ روشن ہو چکے تھے۔ لیکن گونگی لڑکی کے منتظر کانوں کو کوئی آواز سنائی نہ دی۔

بھوک کی شدت سے اس کے اعضا سنسنا رہے تھے تین دن سے اس نے کچھ بھی نہ کھایا تھا اور وہ اس ناقابل برداشت جانکاہ تکلیف سے مجبور ہوکر اپنے غلیظ پانی میں بھیگے ہوئے کپڑوں کے پھٹے ہوئے چیتھڑے نوچ نوچ کر چبا رہی تھی کہ دفعتاً ایک بالوں دار جسم کے لمس نے اسے چونکا دیا۔

یہ اس کا بوڑھا دوست تھا جو اس کے پیروں سے اپنا سر رگڑ رہا تھا۔ گونگی لڑکی نے ایک بے تاب خوشی کے ساتھ اسے اپنے سے لپٹا لیا اور بے اختیار اس کے سر اور پیٹ کے بالوں کو چومنے نہیں بلکہ چبانے لگی۔ اس کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو تھے اور وہ اپنے گرد و پیش سے بے خبر مسلسل اس کے بالوں کو چبا رہی تھی بوڑھے جانور کی آنکھیں بھی نم تھیں اور اس کے دوسرے ساتھی بھی قریب کھڑے خوشی سے اپنی دُمیں ہلا رہے تھے۔

قریب سے گذرنے والے اس کریہہ منظر کو دیکھ کر ناک بھوؤں چڑھا رہے تھے اور غریب لڑکی کو برا بھلا کہہ رہے تھے اور اس کی غلاظت پسند فطرت پر اس سے اظہار نفرت کر رہے تھے۔ لیکن گونگی لڑکی کو ان کی کیا پروا تھی

وہ اس وقت اس ہجوم اور شور و غل میں بھی اپنے چہیتے پریمی دوستوں کے ساتھ تنہا تھی۔ اسے ان دوپاؤں کے جانوروں سے بھلا کیا سروکار تھا جن کی حیوانی جنسی پریم کے راگوں سے یکسر ناآشنا تھی۔ وہ بغیر کسی خیال کے اسی طرح بوڑھے جانور کو لپٹا لپٹا کر پیار کرتی اور اس کے نرم بالوں کو چباتی رہی یہاں تک کہ اس کے بھوکے پیاسے ہیجان میں کچھ ٹھہراؤ اور سکون پیدا ہوگیا۔ پھر اس نے اپنی نمناک نگاہیں سڑک کے اس پار ہوٹل کی طرف اٹھائیں اور اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھا بے زبان جانور اس کا مطلب سمجھ گئے۔ بوڑھے کتے نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اسے تسلی دی اور دوسرے کتوں کو اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کرکے فوراً سڑک کے کنارے پہونچ گیا اور منتظر تھا کہ ذرا آمد و رفت کا سلسلہ منقطع ہو اور وہ سڑک پار کرکے ہوٹل پہونچے اور اپنی گونگی مالکہ کے لئے تازہ روٹی چرا کر لائے۔ وہ اور اس کے ساتھی اسی انتظار میں مستعد کھڑے تھے کہ اسی وقت ایک سائیکل سوار اپنی سائیکل کے پیچھے روٹیوں کا ایک بڑا سا پلندا باندھے سامنے سے گزرا۔ گونگی لڑکی اور بوڑھے جانور کی نظریں ایک ساتھ روٹی پر پڑیں اور دوسرے لمحہ جانور ایک چھلانگ میں سائیکل کے پیچھے تھا اور ایک کریک روٹی کو اپنے دانتوں کی گرفت میں لینا ہی چاہتا تھا کہ سائیکل ایک جھٹکے کے ساتھ آگے نکل گئی اور وہ لڑکھڑا کر بیچ سڑک پر گرا اور پیچھے سے آتی ہوئی ایک تیز رفتار موٹر کا پہیہ اس کے جسم پر سے گزر گیا۔

گونگی لڑکی نے جس کی نگاہیں برابر اس کا تعاقب کر رہی تھیں یہ دیکھا اور زندگی میں پہلی بار اس کے منہ سے ایک تیز چیخ نکل گئی اور وہ [illegible]

دیوانوں کی طرح اس کے قریب پہونچ گئی اور دم توڑتے ہوئے جانور کا سر اٹھا کر اپنی گود میں رکھ لیا اور اس کے زخموں سے بہتے ہوئے خون کو اپنے بالوں میں جذب کرنے لگی۔

وفادار جانور نے بڑی کوشش سے آنکھیں کھول کر آخری بار اس کی طرف دیکھا وہ اپنی ناکامی پر نادم معلوم ہوتا تھا اور اس کی آنکھوں میں رنج و تاسف کے آنسو تھے کہ وہ اپنی بھوکی مالکہ کے لئے کھانا فراہم نہ کرسکا۔ آنسوؤں کے دو بڑے بڑے قطرے اس کی آنکھوں سے نکل کر اس کے چہرے کے بالوں میں جذب ہو گئے اور پھر اس نے آنکھیں بند کر کے اپنی مالکہ کی گود میں دم توڑ دیا۔

اس وقت تک گرد و پیش لوگوں کا کافی ہجوم ہو گیا تھا۔ ہر شخص متجسس تھا اور ایک دوسرے کے شانوں پر سے اچک اچک کر دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا کہ واقعہ کیا ہے۔ موٹر بھی مجبوراً رکی ہوئی تھی۔ اور صاحب موٹر جو اپنے لباس اور وضع قطع سے کسی ذی مرتبت اور دولتمند خاندان کا سپوت معلوم ہوتا تھا چہرے پر غرور اور تنخوت کے آثار لئے۔ پیشانی پر ناگواری کی شکنیں ڈالے اپنی سیٹ پر اسی طرح سینہ تانے خاموش بیٹھا تھا اور ایک ذلیل جانور کے لئے لڑکی کی اس مجنونانہ فریفتگی پر حقارت سے مسکرا رہا تھا گونگی لڑکی نے اس کے تبسم کو دیکھا تو اس کی آنکھوں میں خوف امڈ آیا۔ یہی اس کی زندگی کے عزیز ساتھی کا قاتل تھا۔ اس نے رنج و غصہ اور جذبۂ انتقام سے بے تاب ہو کر دوسرے کتوں کی طرف دیکھا جو اس کے ساتھ ہی وہاں پہونچ گئے تھے۔ اور قریب ہی کھڑے اپنے ہمرنگ ساتھی کا خاموش ماتم کر رہے تھے۔ انہیں تو صرف اشارہ کی [illegible] آنکھوں [illegible] اپنی مالکہ کی غضبناک نظریں

دیکھیں تو دیوانہ وار وحشی درندوں کی طرح خوش پوشش نوجوان کی موٹر کی طرف جھپٹ پڑے اور قریب تھا کہ ان کے تیز دانت اس کی نرم کھال میں دھنس جاتے کہ پولیس موقعہ پر پہونچ گئی اور ان کے ڈنڈوں نے کمزور جانوروں کو مار بھگایا "یہ لڑکی دیوانی ہے' اس نے دیوانے کتوں کو پال رکھا ہے" دولتمند انسان اب ضبط نہ کرسکا اور چلا چلا کر گونگی لڑکی کو پاگل اور دیوانہ ثابت کرنے کی کوشش کرنے لگا۔

" ہاں یہ لڑکی سچ مچ پاگل ہے" "ہم نے اکثر اسے سڑکوں پر کتوں کے ساتھ پھرتے دیکھا ہے" " اور وہ آپ اپنے کپڑے چبایا کرتی ہے۔ اور کتوں کے بالوں کو بھی چباتی ہے" دولتمند انسان کی حمایت میں مجمع سے ایک ساتھ مختلف آوازیں بلند ہو رہی تھیں۔

بیچاری غریب لڑکی سوگوارانہ انداز میں مردہ جانور کے جسم کو اپنے بالوں میں چھپائے اسی طرح خاموش بیٹھی ہوئی تھی۔ مگر اس کے رنج و غم سے کسے سروکار تھا۔

ذی اثر اور باوقار ہستی کی کوششیں کامیاب ہو گئیں اس کے عقلمندانہ فیصلے نے گونگی لڑکی کو پاگل خانہ بھجوا دیا اور اس کے بقیہ ساتھی زہر دے کر مار ڈالے گئے۔

اب وہ سچ مچ پاگل ہو گئی تھی اور تمام پاگلوں میں سب سے زیادہ خطرناک سمجھی جاتی تھی۔

اس کے نوجوان چہرے پر جھریاں پڑ گئی تھیں جسم کی کھال لٹک پڑی تھی اور آنکھوں میں زندگی کی روشنیوں کی بجائے موت کی تصویر تھی اور وہ ایک بائیس سالہ لڑکی کی بجائے ایک چالیس سالہ بڑھیا

معلوم ہوتی تھی۔ اور اس کی شکل کچھ ایسی بھیانک ہوگئی تھی کہ ہر شخص اس سے خوف کھاتا تھا۔

اسے پاگل خانے میں سب سے علحدہ ایک تاریک کوٹھری میں رکھا گیا تھا اس لئے کہ وہ انسانی شکلوں کو دیکھ کر کتوں کی طرح بھونکنے لگتی تھی اور انھیں کاٹ کھانے کے لئے دوڑتی تھی۔ دوسرے پاگل بھی اس سے ڈرتے تھے اور کوئی اس کے قریب جانے کی جرأت نہ کرتا تھا حتیٰ کہ اس کا کھانا بھی اسے اس وقت پہونچایا جاتا تھا جب کہ وہ سوئی ہوتی یا اپنے بالوں کو چومتی اور چباتی ہوتی تھی جو اس کا محبوب مشغلہ تھا اور اس وقت وہ اپنے گرد وپیش سے بالکل بے خبر ہوتی تھی۔

رضیہ

غم کا روگ

دل کی دھڑکن بڑھتی جائے ۔۔۔ دکھ کی ندی چڑھتی جائے
آشا بے سدھ سوئی پڑی ہے ۔۔۔ پریم کی ناگن پاس کھڑی ہے
لب پر نالے گھوم رہے ہیں ۔۔۔ آگ کے بادل جھوم رہے ہیں
نینن میں اک باغ کھلا ہے
من کو غم کا روگ لگا ہے

دیوانہ مشہور ہوا ہوں ۔۔۔ عقل سے کوسوں دور ہوا ہوں
دنیا دیکھ کے ہنس دیتی ہے ۔۔۔ مجھ سے کیا بدلہ لیتی ہے
نیند کا دریا رک سا گیا ہے ۔۔۔ خوشیوں کا سر جھک سا گیا ہے
جینا اب مرنے سے برا ہے
من کو غم کا روگ لگا ہے

راز کا مجھ کو ہوش کہاں ہے ۔۔۔ نام کسی کا ورد زباں ہے
گانا سن کر رو دیتا ہوں ۔۔۔ زخموں کا منہ دھو لیتا ہوں
آنکھوں میں ساون آیا ہے ۔۔۔ اک پردیسی گھبرایا ہے
پی بن جینا کیا جینا ہے
من کو غم کا روگ لگا ہے

الطاف مشہدی

ہوس کا دھوکا

آج سے کوئی چھ مہینے پہلے کی بات ہے۔ یہی میاں شاہد جو اب مجنوؤں کا سا حال اٹھائے بلکتے بلبلاتے میرے سامنے بیٹھے ہیں، کلی کی طرح چٹکتے، مسکراتے میرے ہاں آئے تھے۔ وہ دن بھی یاد رہے گا اور آج کا دن بھی۔ اُس وقت ان کا یہ عالم تھا جیسے سکندر اعظم کے ساری دنیا کو فتح کرنے کے منصوبہ کو انھوں نے پورا کر دیا ہے۔ اور ساری دنیا ان کے زیر نگیں ہے اور بات کیا تھی تو صرف اتنی کہ کسی لڑکی نے ان سے بے تحاشا کہہ دیا کہ .... "میں تم سے محبت کرتی ہوں" اور شاہد اس بے چاری کی خوش ادائی، ملک خصلتی اور قدر شناسی کا قصیدہ بڑے والہانہ انداز میں میرے گوشگذار کرنے لگے۔ میں نے متوجہ ہو کر کہا۔ آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا تم کو یہ نصرتیں مبارک ہوں، لیکن اس کے انجام سے تمھیں آگاہ کر دینا ہر ناصح کا فرض ہے۔ آج سے نہیں جب سے تم میں اِس مرضِ عشق کی علامتیں رُونما ہونے لگیں ہیں میں نے تمھیں سنبھالنے کی کوشش کی ہے۔ تم ہمیشہ مجھ سے بدکتے رہے اور میں تم سے ہاتھ دھو کر رہرو راہ محبت کا خدا ہی حافظ کہہ کر چپ ہو رہا لیکن اب پانی سر سے اونچا ہوتا نظر آتا ہے۔ اس لڑکی کا اعترافِ محبت تمھیں کہیں کا نہ رکھے گا ... ... تم کیا جانو عورت کے دل کتنے ہوتے ہیں، زبانیں کتنی ہوتی ہیں"

میرے آخری جملہ پر شاہد نے اپنے کان کھڑے کیے۔ دیدے پھاڑ کر تمسخرانہ انداز میں کہا۔ "تم کیا جانو۔" مجھ پر اس کے تمسخر کا کوئی اثر نہ ہوا۔ میں نے اسی سنجیدگی سے جواب دیا ہم بہت کچھ جانتے ہیں۔ ... کیونکہ عشق کی راہیں کوئی ہم سے پوچھے ہم بہت کچھ جانتے ہیں ...... میں نے تجربہ کارانہ انداز سے گردن ہلائی اور سوچنے لگا کہ اپنی داستانِ محبت سنا دوں اسے ...... اور میرے ذہن میں اس وقت کئی بھولی بسری باتوں نے کروٹ لی ...... ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے زخموں کے انگور کسی نے نوچ ڈالے۔ 'اُف' کر کے میں چپ ہو رہا ...... ہونٹوں میں ارتعاش سا پیدا ہوا ...... اعضا میں خفیف سی لرزش دوڑ گئی ... شاہد مسکرانے لگا ... ہم بھی تو سنیں آخر کیا ہیں ترے افسانے، میں نے اپنی اضطراری کیفیت پر قابو پا لیا۔ سوچا کہ گزشتہ پر صلواۃ بھیجنا ہی بہتر ہے ...... اور پھر شاہد سے کہنے کا تو کوئی موقع ہی نہ تھا۔ اسے اپنی پڑی ہے، اور اِس منزل میں ہے جہاں ہوش و حواس چھن جاتے ہیں اور ایک سُرور کی سی کیفیت طاری رہتی ہے ...... محبت اور محبوب کے سوا کسی تیسری چیز کا دھیان ہی نہیں ہوتا ...... میں نے اپنے آپ کو مسرور و مطمئن ظاہر کرتے ہوئے کہا۔ شاہد چھوڑ و اِس قصہ کو۔ پھر کبھی کہیں گے۔ ہاں تم سناؤ سناؤ اپنے افسانے۔ شاہد تو بس چھیڑنا چاہتا تھا۔ ایک سرد لمبی آہ پوری طرح سینہ سے باہر نہیں نکلی تھی کہ زبان چلنے لگی۔ "آہ! کچھ نہ پوچھو دوست ...... لوگ کہتے تھے محبت میں مزہ ہوتا ہے ...... آج مجھے اس کا ذاتی تجربہ ہوا ہے۔ لوگ سچ کہتے تھے ...... میں نے محبت کا مزہ چکھ لیا ہے ...... محبت ایک آسمانی برکت ہے۔ سرور سرمدی ہے، کیف لازوال ہے ...... نعمت غیر مترقبہ ہے لیکن تمھیں بھی مجھ سے اتفاق ہوگا کہ ان ساری خوبیوں کا انحصار صرف مطلوب سے محبت کا جواب محبت سے ملنے میں ہے میرا مطلب سمجھ گئے نا تم ...... میں نے جواب دیا۔ ہاں سمجھا لیکن تم سمجھنے میں غلط فہمیاں نہ کر بیٹھنا ...... میں پہلے ہی

کہتا تھا اور اب بھی کہتا ہوں کہ وہ زمانہ گیا جب او تھیلو جیسے کریہہ حبشی پر کسی شہزادی کا دل آجاتا تھا۔

آپ آئینے میں اپنی صورت دیکھنا ناغہ نہ کیا کیجئے......

آج کل محبت ظاہری صورت شکل سے ہوتی ہے ہر زمانہ کا ایک ایک معیار ہوتا ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ دوست اور آئینہ کے یکساں فرائض ہیں۔ میں صاف صاف کہے دیتا ہوں کہ اس صدی کی بدصورت سے بدصورت لڑکی آپ پر ایک چھوڑ ۔۔۔ جان سے بھی عاشق نہیں ہو سکتی تم کو دھوکا دیا جا رہا ہے، تم کو الو بنایا جا رہا ہے۔ تم سے کھیلا جا رہا ہے۔ جس لڑکی نے تم سے کہا ہے کہ وہ تم سے محبت کرتی ہے وہ جھوٹ بول رہی ہے تمھاری تباہی کے درپے ہے۔ لڑکی آپ سے محبت کرتی ہے کوئی، اور وہ بھی کیسی لڑکی۔ گورا رنگ، بڑی بڑی غلافی آنکھیں سرو قامت، گداز جسم، خوش مزاج اور آپ کی صورت تو دیکھا چاہیے.... شاہد ہکا بکا میرے جذبہ تقریر کی حرکات پر غور کر رہا تھا۔ میں اس قدر جوش میں کیوں آگیا تھا۔ شاہد کے ساتھ اس قدر درشتی کیوں برت رہا تھا مجھے خود اس کا احساس نہیں۔ لیکن ہاں اس کا تو مجھے بھی اعتراف ہے کہ شاہد کی اس کامیابی پر مجھے رشک سا ہو رہا تھا۔ کیوں اس لڑکی نے اعتراف محبت کیا؟ حالانکہ میرے بارے میں تو کسی نے یہ بھی باور نہ کیا کہ مجھے ان سے محبت ہے..... میں نے شاہد سے معافی چاہ لی۔ اور وہ مایوس اور دل گرفتہ میرے ہاں سے چلا گیا۔

لیکن آپ یہ نہ سمجھئے کہ شاہد نے پھر اس قسم کا تذکرہ چھیڑا ہی نہیں۔ دوسرے ہی دن...... ہر پھر کے وہی تو محبت عجب لڑکی ہے... حسن بھی محبت بھی.....

جی چاہتا ہے کہ اس پر سے نچھاور ہو جاؤں..... تم کہتے تھے کہ صورت بری چیز ہے۔ بابا ہم تو سچی محبت کے قائل ہو گئے۔ ذرا اس سینہ کو چیر کر دیکھو...... کتنا خوبصورت دل دھڑک رہا ہے۔ اس کی نظر میری صورت پر نہیں میرے دل پر پڑی اور دل نے اپنے جوہر دکھا دیئے۔ دونوں طرف ہے آگ برابر لگی ہوئی۔ مجھے شاہد کو کھری کھری سناتے جھجک سی محسوس ہونے لگی میں نے کہا "تم بہت خوش قسمت ہو۔ خدا نے تمھاری بدصورتی کی تلافی یوں کی کہ ایک حسین چاہنے والی مل گئی۔ تم دونوں کی محبت دن پر دن استوار ہوتی جائے۔

شاہد نے فوراً ٹوکا ۔۔۔ یار پرسوں ہی کے واقعہ کو لو میں ذرا دیر سے گیا تو بس کیا دیکھتا ہوں ... حیران، پریشان.... ادھر سے ادھر اور ادھر سے ادھر ٹہل رہی ہے، کسی پہلو چین نہیں .... مجھ پر نظر پڑی تو وفور مسرت سے چہرہ دمک اٹھا۔ لیکن اس طرح منہ پھلا لیا جیسے بہت خفا ہے۔ "کہاں تھے اتنی دیر" ؟ اس انداز میں پوچھا ہے کہ میں وہیں ڈھیر ہو کر رہ گیا...... ہائے.... یہی تو زخم کلیجے کو کھائے جاتے ہیں.. ...میں نے کہا ہوئی تاخیر تو کچھ باعث تاخیر بھی تھا...... آپ کے لئے ایک ناچیز تحفہ خریدنے میں دیر ہو گئی۔ کمر پہ ہاتھ رکھے، بھویں سکیڑ لیں اور..... ناصاحب اس طرح کی خوشامدوں سے میں بہت دور بھاگتی ہوں...... بہل گئے۔ میں نے کہا اور بڑھ کر اس کی کلائی پر چھوٹی سی خوبصورت گھڑی باندھ دی بھاگ گئے نا.... میں نے ہانپتے ہوئے کہا...... جیسے بھاگ بھاگ کر آ رہا ہوں... ...اور کام کیا تھا [illegible] اس کی کلائی تھامنا...... اور گھڑی [illegible]

ہانپ گیا قسم سے..... پھر کیا ہوا..... میں نے دلچسپی کا اظہار
کرتے ہوئے کہا پھر یہ ہوا کہ رات کا کھانا ساتھ کھائے۔ بڑے
اصرار کے ساتھ روکا مجھے اور کھاتے وقت کی دلگی تو نہ
پوچھو..... اِدھر میں نوالہ اٹھاتا ہوں تو وہ بھی اٹھاتی ہے
ادھر میں منہ کھولتا ہوں تو ادھر وہ..... ہنسی تو روکے نہ رکی
اور شرارت کی انتہا ہو گئی نا.. میں ہنستا ہوں تو ادھر بھی ہنسی
لاحول ولاقوۃ بڑی شریر ہے۔ اور یہ دیکھو شاہد
نے جیب سے ایک چھوٹا سا پرزہ نکالا اور میری طرف
بڑھاتے ہوئے کہنے لگا۔ پڑھو اِسے' میں تو کوئی بیس دفعہ
پڑھ چکا ہوں چٹھی پر زنانی خط میں لکھا تھا۔

پیارے! تم مجھے بے حد یاد آتے ہو، تم بڑے بے درد ہو
میری محبت کا تمھیں اعتبار نہیں۔ میں نہیں جانتی تمھیں اس کا
کیسے یقین دلاؤں۔ تم تو مانتے ہی نہیں سچ کہتی ہوں
تمھارے بغیر نہ دن کو چین ہے نہ رات کو نیند خواب
میں بھی تمھیں کو دیکھتی ہوں.... اور اکثر یہ شعر گنگناتی ہوں۔

زندگی دردِ سر ہو گئی حاتم
کب ملے گا مجھے پیا میرا

فقط تمھاری

تو اسے سنبھال کر رکھو تاکہ سند رہے اور وقت ضرورت کام
آئے.. شاہد نے مسکراتے ہوئے چٹھی لے لی۔ ..اور
سنجیدہ بن کر پوچھنے لگا "اب کیا کروں" میں نے جواب دیا۔۔
"شادی" شادی کا نام سنتے ہی ہشاش بشاش چہرہ
ٹھٹھک کر رہ گیا... "کیوں؟" میں نے تشویش کے ساتھ
پوچھا... کچھ نہیں..... بات در اصل یہ ہے کہ وہ عجب
خیالات کی لڑکی ہے شادی کی اس کے نزدیک کوئی اہمیت
نہیں کہتی ہے کہ محبت ہو تو پھر دنیوی رسم و رسم کی پابندی

ضروری نہیں۔ میں اتنا سن کر قہقہہ مار کر ہنسنے لگا.....
ارے یہ تو اور بھی خوشی کی بات ہے۔ یار! واقعی تم پر تو
رشک آجاتا ہے۔ کس مزے میں ہو اور کیسے کیسے
چھوٹ رہے ہو لاؤ ملاؤ ذرا مرد کا ہاتھ ..... لیکن شاہد
مطمئن نہ تھا ہٹو یار تمھیں تو مذاق کی سوجھی ہے اور
یہاں تلوؤں سے لگی ہے۔ میں نے اسے چھیڑنا مناسب
نہ سمجھا... اور چپ ہو رہا۔ شاہد بھی اسی طرح خاموش
سوچتا ہوا بیٹھا رہا۔ پھر کچھ سوچ کر مسکرانے لگا.....
جیب سے ایک مخمل کی ڈبیہ نکالی.. ... اور میری طرف
بڑھاتے ہوئے کہنے لگا.. .دیکھو تو کیسی ہے... میں نے
ڈبیہ کھولی' ایک چم چم کرتی سونے کی انگوٹھی نظروں کے
سامنے تھی۔ میں نے تھوڑی دیر تک انگوٹھی کو بڑے غور سے
دیکھا خوبصورت اور قیمتی انگوٹھی تھی۔ شاہد نے پوچھا۔
محبت کو تحفے تحائف سے مالا مال کر دینا چاہیے کیوں؟ —
میں نے اسی طرح انگوٹھی کو ہیر پھیر کر دیکھتے ہوئے کہا "برا
خیال نہیں"۔

اسی طرح شاہد کی محبت تحفے تحائف..... خوشامد
برآمد اور کھلونوں کے سہارے پھلتی پھولتی رہی..... اور
میرا دوست بھلے چنگے انسان سے خاصا مجنوں بن گیا.....
سوتے جاگتے میں اسی کی باتیں..... ہچکی آئی نہیں کہ دیکھو
شاید اس نے یاد کیا..... ڈاکیہ پکارا نہیں کہ.... کیوں
بھئی میرے نام کوئی خط..... بس جب دیکھو اس کی رضا جوئی
کے لئے سرگرداں... میں بھی تماشائی کی طرح ہاتھ پہ ہاتھ
دھرے بیٹھا دیکھتا رہا کہ کون کون سے رنگ بدلے جائیں گے
کیا کیا کھیل کھیلے جائیں گے..... میں نے شاہد سے تو کچھ
نہیں کہا لیکن میرا دل کہتا تھا کہ شاہد کا ستارہ بہت گردش میں

آنے کو ہے...... میرا قیاس صحیح نکلا.. مجھے اس سے خوشی نہیں الٹا افسوس ہے۔ شاہد میاں میرے سامنے بیٹھے ہوئے ہیں بلکتے بلبلاتے ... میں بھی غمگین ہوں دردمند لہجے میں پوچھ رہا ہوں کیا ہوا؟ شاہد جواب دینا چاہتا ہے۔ لیکن جیسے حلق میں پھندا پڑ گیا ہو۔ میں نے پھر پوچھا کیا ہوا؟ ارے یہ کیا شاہد بچوں کی طرح بلک بلک کر رونے لگا۔ ارے یہ کیا بچپن ہے روتے ہو شاہد کے آنسو اس طرح ٹپاٹپ گر رہے تھے جیسے لڑھکی ہوئی کشتی میں سے گولیاں میں آگے بڑھ گیا اپنے دونوں ہاتھوں میں اس کے سر کو تھام لیا "بندہ خدا کچھ کہو بھی .. آخر کیا افتاد پڑی شاہد کے آنسو تھمنے لگے۔ ہچکیوں کو وہ پی پی جا رہا تھا لیکن خود میرا حال غیر ہونے لگا اپنے ایک عزیز دوست کی آنکھ میں آنسوؤں کو دیکھ کر میرا دل بھی بھر آیا۔ اور میری آنکھیں بھی پُرنم ہو گئیں۔ میں نے دھیمے لہجہ میں پوچھا "کیا ہوا شاہد" تو میری آواز میں بھی آنسو تھے۔ شاہد سنبھل رہا تھا میری آواز کو سن کر پھر پھوٹ بہا کوئی آدھ گھنٹہ کے بعد دونوں کے دل قابو میں آئے اور شاہد نے کہنا شروع کیا جو نہ ہونا تھا سو ہوا جس چیز کا شان و گمان بھی نہ تھا وہ حقیقت بن کر سامنے آ گئی تمہاری باتیں میرے لئے مذاق تھیں لیکن آج وہ سبھی پیشین گوئیاں ثابت ہو رہی ہیں۔ مجھ بدنصیب سے کھیلا گیا ... مجھ بدصورت کو محبت کا دھوکا دیا گیا۔ الو بنایا گیا مجھے کہیں کا نہ رکھا گیا۔ میرا دل روند دیا گیا .... مٹی میں ملا دیا گیا۔ آہ ... کون الو کا پٹھا کہتا ہے کہ محبت میں مزہ ہوتا ہے ... میں کہتا ہوں محبت ہے ہی کہاں اس

مکّار دنیا میں نہ محبت نہ مزہ۔ ہاں محبت کی کینچلیاں پہن پہن کر ناگنیں ڈستی پھرتی ہیں۔ آہ! میرا دل میرا دل کیا ہوا شاہد۔ آخر کچھ کہو بھی میرے دوست سب کچھ ہو گیا' میں زندہ بھی کیا گیا مارا بھی گیا دفنایا بھی گیا۔ اٹھایا بھی گیا اور دوزخ میں پھینک بھی دیا گیا۔ کیا ہوتی ہیں یہ لڑکیاں اور کیا ہوتی ہے ان کی محبت۔ تمہیں یاد ہے نا وہ چھچھی تمہیں یاد ہے نا اور وہ ساری باتیں جو میں نے تم سے کہی تھیں۔ وہ سب دھوکا تھا مکر تھا۔ اور تھا۔ تھا۔ میں دیوانہ۔ ارے بھئی آخر کچھ کہو نا۔ کیا ہوا۔ کیا کیا اس نے .. کیا تمہارے تحائف واپس کر دئے۔ تمہیں برا بھلا کہا۔ کیا ہوا آخر میں نے بے صبری سے پوچھا۔

اس لڑکی نے میرے ساتھ وہ سلوک کیا ہے جو کسی جلاد سے ممکن نہیں۔ خدا کرے آج ہی قیامت آ جائے۔ آسمان ٹوٹ پڑے۔ زمین شق ہو جائے۔ .... کیا اچھا صلہ ہے محبت کا۔ وفا اور انصاف تو کوئی اس سے سیکھے۔ پرسوں کی بات ہے.. چاندنی چٹکی ہوئی تھی۔ مجھے کسی طرح اس سے ملنے کا موقع مل گیا .... نارنگی کے درخت کے نیچے ہم دونوں کھڑے تھے .. نارنگی کے پھولوں کی تیز خوشبو نے مست بنا دیا..... اور پھر ان کی سیج دھج بھی آنکھوں میں کھبی جا رہی تھی۔ مستی کے عالم میں مجھ سے کونسی حرکت سرزد ہوئی۔ مجھے نہیں معلوم ہوش ٹھکانے ہوئے تو ایسا محسوس ہوا جیسے کسی نے زور کا تھپڑ میرے گال پہ مارا ہو۔ اِدھر اُدھر دیکھتا ہوں تو وہ بھی غائب۔ دیوانگی کی سی حالت میں افتاں و خیزاں گھر پہنچا۔ رات بھر کسی کروٹ چین نصیب ہوا ہو تو جیسی چاہو قسم لے لو..... صبح کیا دیکھتا

سر میں درد تھا . . . اور مریض کی طرح دنیا کی ہر چیز کو بے کیف اور اُداس دیکھ رہا تھا۔ اتنے میں کسی نے مجھے خط لادیا خط پڑھتا ہوں تو پاؤں تلے زمین نکل گئی خداوندا یہ کیا، کل تک محبت کرنے والی میرے لئے بے چین رہنے والی آج یکایک کیسے بدل گئی۔ کس طرح لکھ سکی ہوگی۔ تمہاری محبت کو آزمالیا۔ تم آئندہ سے میری دہلیز میں قدم نہ رکھنا۔ ورنہ بے عزتی کے ساتھ نکلوا دئے جاؤگے سمجھے میں نے سخت غلطی کی تھی جو تمھاری پیشقدمیوں کو طرح دے گئی۔ تمہاری صورت کی طرح تمہاری روح بھی مکروہ ہے۔ تم مردوں کی سب سے ارزل قسم ہو عورت کی تنہائی اور اس کے اعتماد سے اس طرح فائدہ اٹھانا چاہتے ہو.. شرم شرم۔ شاہد اتنا کہہ کر خاموش ہو گیا اس کے جذبات کا صحیح اندازہ لگانا بہت مشکل ہے .. اس کے صدمہ کی شدت کو وہی محسوس کرسکتے ہیں جن کے دل بھی ٹوٹے ہوں، امیدوں اور ارمانوں پر پانی پھر گیا ہو منزل کی طرف جا رہے ہوں.... لیکن پیچھے سے کوئی انھیں زخمی کردے . . . . . اڑنے کے لئے پر تول رہے ہوں اور گرفتار کرلئے جائیں، میرے دل کا حال نہ پوچھئے۔ زخمی سانپ کی طرح بل کھا رہا تھا۔ دہکتی آگ کی طرح دہک رہا تھا میں اپنے دوست کے حال پر آنسو بہا رہا تھا . اور اس سنگدل لڑکی کے لئے سوچ رہا تھا کہ اگر وہ مل جائے تو میں اس کا گلا گھونٹ دوں .... میں نے گڑگڑا کر خدا سے دعا کی کہ وہ اس کی خوشیوں کو بھی اسی طرح پامال کردے اور اس کا دل بھی اسی طرح ٹوٹے [illegible] اسی طرح آنسو بہاتی رہے سر پٹختی رہے ... اس کا بھی سکون واطمینان چھن جائے خداوندا تو اس سے اس ظلم کا انتقام لے

شاہد نے گردن اٹھائی . اس کے آنسو خشک ہوچکے تھے . وہ میری طرف ٹکٹکی باندھے دیکھ رہا تھا . ہاں شاہد نے کچھ یاد کرتے ہوئے کہا . میں نے تم سے کہا نہیں شاید آج کل ایک حسین نوجوان آنے جانے لگا ہے .. خدا جانے کیا ہونے کو ہے کچھ نہیں .. سب ٹھیک ہوگا.. قدرت انتقام لے رہی ہے . . وہ بھی ستائی جائے گی تباہ کردی جائے گی ..... اس کے سکون .. خموشی.... اور عزت کے پرزے پرزے اڑادئے جائیں گے سمجھے . میں اس جوش کے ساتھ کہہ رہا تھا۔ جیسے شاہد سے نہیں مجھ سے بے انصافی کی گئی ہے . . . . اور واقعی میں بھی تو ستایا ہوا تھا اپنی بدنصیبی کا خیال آیا تو میں خود کو سنبھال نہ سکا۔ روتا ہوا شاہد کے گلے لپٹ گیا.... اور ہم دونوں بہت دیر تک روتے رہے ....

رشید قریشی

سرگذشت ادارۂ ادبیات اردو مرتبہ خواجہ حمیدالدین شاہد شایع ہوچکی ہے۔ جو حضرات حیدرآباد کی اُردو خدمات سے واقف ہونا چاہتے ہیں صرف بارہ آنے کے اسٹامپ روانہ کرکے یہ مجلد کتاب منگوائیں جو تین سو سے زیادہ صفحات پر مشتمل ہے ۔

باپ کا ترکہ

مرحوم از قبیلۂ اہلِ نگاہ تھا — جوشِ سخا کا جس کے زمانہ گواہ تھا
ظالم کے حق میں منتقمِ بے پناہ تھا — تھا راستی میں فرد مگر کج کلاہ تھا

سنگم بنا ہوا تھا جدید و قدیم کا
زندہ مجسمہ تھا مذاقِ سلیم کا

طوفانِ غم میں اشک بہاتا نہ تھا کبھی — شکوے گلے زبان پہ لاتا نہ تھا کبھی
اہلِ دوَل کے ناز اٹھاتا نہ تھا کبھی — باطل کے آگے سر کو جھکاتا نہ تھا کبھی

آلائشِ جہاں سے رہی پاک زندگی
گزری مثالِ شعلۂ بے باک زندگی

تھا راہِ مستقیم کا جانباز شہسوار — مقبولِ خلق عاشقِ آقائے نامدار
مظلوم کا رفیق، غریبوں کا غمگسار — غیروں کا دردمند، عزیزوں کا جاں نثار

اہلِ وطن کو تحفۂ اخلاق دے گیا
گنجِ متاعِ حسنِ عمل ساتھ لے گیا

کہنے کو داغِ ہجر دیا یاد کے لئے — چھوڑا غم ایک خاطرِ ناشاد کے لئے
کچھ نونہالِ گلشنِ ایجاد کے لئے — رکھا نہ آسرا کوئی اولاد کے لئے

مردِ خدا نے دولتِ بیدار چھوڑ دی
لختِ جگر کے واسطے تلوار چھوڑ دی

سکندر علی وجد

سوانح نگاری

گذری ہوئی یادوں کو تازہ کرتے رہنا ایک فطری جذبہ ہے ہر زندگی سے ماضی کی کوئی نہ کوئی یاد ضرور وابستہ رہتی ہے جب اِس یاد سے دل میں یہ احساس پیدا ہونے لگے کہ موجودہ زندگی ہم کو ماضی سے ورثہ میں ملی ہے اور یہ ماضی کی ایک ودیعت ہے جس کو مستقبل کے ہاتھ سونپنے کی ذمہ داری ہم پر عائد ہوتی ہے تو پھر یہی یاد ہماری زندگی کا سب سے قیمتی سرمایہ بن جاتی ہے ہر دور ماضی سے کچھ افکار اور شعائر لیتا ہے اور ان کو مستقبل کے حوالے کردیتا ہے سوانح کا مقصد بھی کچھ یہی واضح کرنا ہے کہ کسی خاص شخصیت نے زمانے کو کیا افکار دیئے اور شعائر حیات میں اس نے ..... کس طرح حصہ لیا۔ سوانح نگاری کے مقاصد یہیں ختم نہیں ہو جاتے بلکہ اس کا ایک اہم مقصد اس وقت تک تشنۂ تکمیل رہ جاتا ہے جب تک کہ اس شخصیت کے کردار اور حالات کو ان کے اصلی روپ میں پیش نہ کیا جائے۔

سوانح نگار حال کے دامن کو ماضی سے باندھ دیتا ہے اس اعتبار سے مورخ اور سوانح نگار دونوں کا دائرہ عمل تقریباً ایک ہو جاتا ہے لیکن مورخ جہاں پوری ہیئت اجتماعی سے بحث کرتا ہے سوانح نگار صرف کسی خاص فرد کے ذاتی حالات اور کردار پر روشنی ڈالتے ہوئے ہیئت اجتماعی میں اس کا مقام معین کرتا ہے۔

سوانح نگاری کے بعض جدید نظریوں نے اس کے دائرہ عمل کو بہت محدود کر دیا ہے بعض کی رائے میں سوانح نگار کے فرائض صرف یہیں تک محدود ہوتے ہیں کہ وہ کسی شخصیت کے افکار، ذاتی حالات اور کردار کا ایک مکمل خاکہ پیش کردے۔ ان کے نزدیک ماحول پر روشنی ڈالنا صرف مورخ کا کام ہے اِس میں کوئی شک نہیں کہ شخصیت اور ماحول پر بیک وقت گفتگو کرنا کسی قدر مشکل ہے ایسا کرنے میں بسا اوقات شخصیت ماحول میں ضم ہو کر رہ جاتی ہے لیکن بڑی شخصیت کو ماحول سے جدا کرکے دیکھا نہیں جاسکتا۔ ہر بڑی شخصیت اپنے ماحول کو کسی نہ کسی طرح متاثر کرتی ہے یہی وجہ ہے کہ جب تک اس کے ذاتی حالات کا مطالعہ ماحول سے ملا کر نہ کیا جائے اس کی حیاتِ عمل کے سارے پہلو نمایاں ہونے نہیں پاتے

کامیاب سوانح نگار شخصی حالات میں ماحول کی تاریخ کو کچھ اس طرح پیش کردیتا ہے کہ سوانح نگاری کا یہ عیب بجائے خود ایک حسن بن جاتا ہے۔

قدیم زمانے کا سوانح نگار کسی شخصیت پر بعض محاسنِ اخلاق کو اجاگر کرنے یا اس کے برے پہلوؤں کو واضح کرنے کو ہی سوانح نگاری سمجھتا تھا خود شخصیت سے اس کی دلچسپی دوسرے درجہ کی ہوتی تھی۔ یہ خیال کہ سوانح میں کسی زندگی کی ایسی تصویر پیش کی جائے کہ اس میں سیرت و عمل کے صحیح خد و خال نظر آجائیں سترھویں صدی عیسوی سے شروع ہوتا ہے اس سے پہلے سوانح کی شخصیت اخلاقی اصولوں اور فلسفیانہ نظریوں کے دھند لکے میں بالکل مبہم ہو کر رہ جاتی ہے۔ خود پلوٹارک کی لکھی ہوئی شہرہ آفاق سوانح عمری بھی اِس خامی سے پاک نہیں ہے اس میں شک نہیں کہ سوانح نگار کو ایک ادیب اور مورخ کے دوہرے فرائض انجام دینے پڑتے ہیں لیکن سوانح نگاری کا تعلق زیادہ تر ادب سے ہی ہے ادب سے کی کوئی راست اور قطعی تعریف نہیں

تو نہیں ہوتی لیکن اس میں ایک چھپا ہوا اغایتی میلان ضرور ہوتا ہے سچا ادب وہی ہے جو نظریوں کو دماغ پر مسلط کرنے کی بجائے ان کو چپکے چپکے دلنشین کردے اور اس طرح ہمارے سیکھنے اور سمجھنے والے شعور کو جس کو آپ چاہیں تو درس گیر شعور سے تعبیر کرسکتے ہیں انجانی میں بیدار کردے

سوانح نگار کا فرض کسی زندگی کے بیتے ہوئے حالات کو من وعن بیان کردینا ہوتا ہے یہی اس کی مورخانہ حیثیت قرار دی جاسکتی ہے لیکن اس کے ساتھ جب وہ ان تاثرات کا بھی ذکر چھیڑ دیتا ہے جن کا کسی زندگی کے بنانے میں بڑا حصہ رہا ہے تو اس کا یہی جذباتی تاثر اس کی سوانح عمری کو ایک غیر فانی ادبی کارنامہ بنا دیتا ہے۔

نام رفتگاں کو باقی رکھنا اور ان کی یاد کو تازہ کرتے رہنا ایک فطری جذبہ ہے سوانح نگاری کا محرک عموماً یہی جذبہ ہوتا ہے کسی فرد کی سوانح حیات ہی سب سے زیادہ اس کے نام کی بقا کی ضامن ہوسکتی ہے مجسموں تصویروں عمارتوں اور اس طرح کی دوسری یادگاروں میں ہم زندگی کی وہ روح نہیں دیکھ سکتے جو سوانح عمری میں ہر جگہ جھلکتی ہے سوانح نگار اپنی ادبی فن کاری سے کسی شخصیت کی جیتی جاگتی تصویر پیش کردیتا ہے ایسی تصویر پیش کرنے کے لئے بڑی فن کارانہ مہارت کی ضرورت ہوتی ہے یہ نہ ہو تو آپ سمجھ لیجئے کہ اس نے کسی زندگی کی محض تاریخ لکھ دی ہے اور اس کا سوانح عمری سے جو ایک مستقل اور اہم صنف ادب ہے کوئی تعلق نہیں ہے۔ سوانح عمری کے علاوہ دوسری یادگاروں سے دل میں اس زندگی کا کوئی موہوم اور مبہم تصور تو آجاتا ہے جس کی وہ پرتو ہوں لیکن کسی اچھی سوانح حیات میں آپ اس زندگی کی اور کبھی اس کے ماحول کی دل کی دھڑکن تک سن سکتے ہیں۔

سوانح نگار کسی شخصیت کی تصویر اس کی سیرت اور عمل سے بناتا ہے۔ سوانحی مقاصد کے اعتبار سے سیرت کو جسے آپ چاہیں تو عالم افکار سے تعبیر کرسکتے ہیں اعمال سے جدا نہیں کیا جاسکتا۔ ہر انسان کے کچھ ذہنی افکارات اور فطری رجحانات ہوتے ہیں اِن ہی سے اس کی سیرت بنتی ہے عمل اِن افکار اور رجحانات کی صورت پذیری کا نام ہے وہ افکار جو اپنے آپ کو اعمال کے سانچے میں ڈھال سکیں یہ سوانح نگاری کے نقطۂ نظر سے بیکار ہیں ایسی شخصیتیں جن کے فکر وعمل میں ہم آہنگی نہ ہو سوانح کا صحیح موضوع نہیں بن سکتیں۔

بڑی شخصیتوں کے افکار اور رجحانات بھی بلند ہوتے ہیں یہ جب ایک بار عمل کے سانچے میں ڈھلنے لگتے ہیں تو ان کا اثر شخصی اور انفرادی حدود سے نکل کر پوری ہیئت اجتماعی پر پڑتا ہے سوانح نگار اپنا موضوع منتخب کرتے ہوئے یہی دیکھتا ہے کہ کسی شخصیت کے عمل نے اس کی فکر کا کہاں تک ساتھ دیا ہے اور ہیئت اجتماعی نے اس سے کیا اثرات قبول کئے ہیں ان اثرات کو واقعات اور حالات میں اپنی طرف سے ردّو بدل کئے بغیر وہ جس قدر موثر انداز میں محسوس کراسکے اسی قدر زیادہ اس کا کارنامہ غیر فانی سمجھا جائے گا۔ پڑھنے والوں کے دل میں چپکے چپکے یہ احساس پیدا کردینا کہ وہ ایک ایسی زندگی کے حالات پڑھ رہے ہیں جو بہر نوع ایک قیمتی زندگی تھی یا اس زندگی میں عام لوگوں کی توجہ اور دلچسپی جذب کرلینے کے بہت سے سامان تھے دراصل سوانح نگاری کا وہ چھپا ہوا غایتی میلان ہے جس کی طرف میں نے ابھی اشارہ کیا تھا۔

میں سمجھتا ہوں کہ اِس مختصر تشریح کے بعد آپ

مجھ سے اِس بارے میں متفق ہو چکے ہوں گے کہ سوانح کے موضوع کے انتخاب کے لئے کچھ حدود اور ضابطے معیّن کرنے ضروری ہیں۔ ادب کا مقصد اب صرف تفریحی نہیں رہا ہے آرٹ حسنِ محض کا نام نہیں ہے آج ہمارا اجتماعی وجدان آرٹ میں حسن اور حقیقت کو ہم آہنگ دیکھنا چاہتا ہے۔ اور اِس بات کا بھی مطالبہ کرتا ہے کہ وہ آرٹ کے ذریعے حقیقت سے محض واقف ہو کر نہ رہ جائے بلکہ اس کو محسوس کر کے غیر شعوری طور پر اپنی زندگی کے کچھ ایسے خاکے تعمیر کرے جو اِس میں زندگی کی تاب پیدا کر سکیں اور اس کے جذبۂ عمل کو متحرک کر سکیں۔ وہ زمانہ گیا کہ سید انشا مرحوم کسی چڑیا کی بات جو چنو نے کہی ہو ہر ایک سے پوچھتے پھرتے تھے تاکہ اس میں اپنی طرف سے نون مرچ لگا کر والیٔ شہر کو خوش کر سکیں۔ آج دنیا کو ایسے قصوں کی ضرورت ہے نہ اس کو اتنی فرصت ہے کہ اس مسابقت اور کش مکش کے دور میں اپنا وقت ان پر صرف کر سکے۔

اِس اعتبار سے سوانح حیات کی اہمیت اس دور میں یوں بڑھ جاتی ہے کہ اس کی بنیاد زندگی کی ٹھوس حقیقتوں پر رکھی جاتی ہے اور یہ حقیقتیں کچھ ایسے دلنشیں پیرایہ میں پیش کی جاتی ہیں کہ طبیعت پر گراں نہیں گزرنے پاتیں اور جی ان کو ہر نوع قبول کر لینے کو تیار ہو جاتا ہے۔

سوانح کی اِس اہمیت کو محسوس کر لینے کے بعد یہ سوال فطری طور پر دل میں پیدا ہوتا ہے کہ زندگی کی کونسی حقیقتیں ایسی ہو سکتی ہیں کہ جن کی بنا پر کسی شخصیت کو سوانح کے موضوع کے لئے انتخاب کیا جا سکے۔ میں نے آپ سے کہا ہے کہ شخصیت کو ماحول سے جدا کر کے نہیں دیکھا جا سکتا۔ ہر بڑی شخصیت ماحول کو متاثر کرتی ہے

اِسی وجہ سے اس کے حالات سے عام طور پر دلچسپی لی جاتی ہے اور اس کے حالات، افکار اور واقعات کو سوانح کے ذریعے محفوظ کر لینے کا خیال عام طور پر دل میں پیدا ہوتا ہے گویا سوانح حیات صرف انہی شخصیتوں کی مرتب کی جا سکتی ہے جنھوں نے کسی نہ کسی حیثیت سے اپنے زمانے اور ماحول کی توجہ جذب کی ہو یا اُن کی زندگی میں کچھ ایسی خصوصیتیں رہی ہوں جن کو زمانے کی عام نظر غیر معمولی قرار دے۔ معلمِ اخلاق، مصلحِ معاشرت، سیاسی رہنما، شاعر، فلسفی سب کسی نہ کسی حیثیت سے زمانے کی توجہ جذب کرتے ہیں زمانے کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ ان کے حالات، ان کے افکار اور ان کے طریقِ عمل سے آگہی حاصل کرے اور آنے والی نسلوں کے لئے ان کی یاد کو غیر فانی بنا دے سب سے پہلے سوانح نگار نے خواہ کسی غرض اور غایت سے سوانح نگاری کی ابتدا کی ہو اِس میں کوئی شک نہیں کہ اس نے اہلِ ادب کے لئے ایک مستقل شاہراہ کھول دی اور ایک بڑی اہم صنفِ ادب کی بنا ڈالی۔ اس صنف نے کیا کیا ارتقائی مدارج طے کئے اور کن کن منزلوں سے گذرتی رہی اس کے متعلق میں نے دو ایک اشارے ابھی کئے ہیں۔

سوانح کے موضوع انتخاب کے لئے جس طرح بعض شرائط اور ضابطے معیّن کئے جا سکتے ہیں ویسے اس کے طرزِ اسلوب اور طریقۂ فکر کے لئے معیّن نہیں کئے جا سکتے۔ باسول نے ڈاکٹر جانسن کے سوانح حیات لکھے، لاک ہارٹ نے اسکاٹ کی سوانح عمری تصنیف کی، رابرٹ ساوذی نے نلسن کی زندگی لکھی۔ یہ سب سوانح نگاری کے بے حد کامیاب نمونے

سمجھے جاتے ہیں لیکن آج کے سوانح نگار کے لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ ان نمونوں کی جو اپنی جگہ پر بالکل مکمل حیثیت رکھتے ہیں پیروی کرے ۔ آرٹ یا ادب کا کوئی بنا بنایا ضابطہ نہیں ہوتا بے ساختگی، اپج اور تخلیقی قوت کی بنا پر ہر ادبی کارنامہ اپنا مقام آپ پیدا کرلیتا ہے بات یہ ہے کہ زندگی کے کسی شعبے میں ترقی کی راہیں مسدود نہیں ہوگئی ہیں اسی میں سوانح نگار سے یہ توقع رکھنا بے جا ہے کہ وہ ایسے قدم ترقی بڑھائے بغیر قدیم نمونوں کی وفا شعارانہ پیروی کرے گا ۔ ایسا کرنے سے ایک طرف اگر اس کے آرٹ کے ترقی پسند رجحانات کو ٹھیس لگتی ہے تو دوسری طرف ہمارا اجتماعی شعور طرز کی یکسانی سے اکتانے لگتا ہے اور سوانح عمری کی اثر انگیزی اس سے متاثر ہوتی ہے ۔

زندہ شخصیتوں کی سوانح حیات مرتب کرنے کا رجحان آج کل بہت عام ہو چلا ہے اور ایسی سوانح عمریاں بہت مقبول ثابت ہو رہی ہیں ۔ ایسے میں اس کی مقبولیت کا راز سوانح نگاری کے فن اور خوبی سے زیادہ شخصی عظمتوں میں پنہاں ہے ۔ بہت ممکن ہے کہ ان شخصیتوں کی زندگی کے ہنگامہ پرور دور کے گذر جانے کے بعد ان کی سوانح حیات میں مستقبل کے لئے کوئی کشش باقی نہ رہے سوانح نگار کی ادبی اور فنی خام کاری ہے ہر اہم تخلیقی ادبی کارنامے کی طرح اچھی سوانح عمری وقت اور زمانے کی قید سے آزاد رہتی ہے ۔ سوانح نگاری کے مشہور معلم اور نقاد سڈنی لی کے نزدیک سوانح حیات کا مکمل ہونا اس کی کامیابی کے لئے اہم ترین شرط ہے چونکہ موت کے بغیر کوئی زندگی مکمل نہیں ہوسکتی اس لئے زندہ شخصیتوں کی سوانح بھی اس وقت تک تشنۂ تکمیل رہتی ہے جب تک ان کی زندگی اور کارناموں پر تکمیل کی مہر نہ لگادے ۔

ڈاکٹر جانسن نے کسی موقع پر کہا تھا کہ خود نوشتہ سوانح عمری یا آپ بیتی سے بہتر کوئی سوانح نہیں ہوسکتی یہ ضروری نہیں ہے کہ اس رائے سے کاملاً اتفاق کیا جاسکے لیکن بعض خاص ضرورتوں میں اس رائے کی صحت تسلیم کرنی ہی پڑتی ہے بہت کم مصنفین ایسے ہوں گے جو آپ بیتی لکھتے ہوئے اپنے جذبۂ پندار و خود نمائی کو دبا سکیں لیکن کہیں کہیں ان آپ بیتیوں میں کچھ ایسے تاثرات اور جذبات ہوتے ہیں جن کا ظاہر کرنا شاید کسی دوسرے کے بس کی بات نہیں ہوسکتی انگلستان کے مشہور مصنف ایچ جی ویلز نے ابھی ابھی ایک خود نوشتہ سوانح عمری شائع کی ہے اس میں ہم کو بعض ایسے دلچسپ اور جذباتی تاثر سے بھرے ہوئے موقعے ملتے ہیں جن کو دیکھ کر کہنا پڑتا ہے کہ ڈاکٹر جانسن نے جس وقت اپنی رائے قائم کی ہوگی اس وقت شاید اس کے ذہن میں کچھ اس طرح کی سوانح عمری کا خاکہ ہوگا ۔

ویلز نے جس تاثر اور جذبہ کے تحت یہ آپ بیتی لکھی ہے اس کا اندازہ اس کے پہلے باب کی ابتدائی سطروں سے ہوسکتا ہے اس کی ابتدا یوں ہوتی ہے " وہ دن بیت گئے وہ گھڑیاں گذر گئیں جب میں زندگی کے ہر منظر کو دلچسپ اور انوکھے انداز سے دیکھتا تھا آج میں ان بیتے ہوئے دنوں پر نظر ڈالتا ہوں تو دل میں پھر سے کچھ نئی امنگیں اٹھتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں " یہی احساس زندگی ہے جس نے ویلز کی سوانح عمری کو ایک غیر فانی کارنامہ بنا دیا ہے ۔

میں نے دو چار انگریزی کی مشہور سوانح عمریوں کا ابھی ذکر کیا ہے ان کے خصوصیات اور ان کے طرز پر گفتگو کرنے کا یہ موقع نہیں ہے تاہم باسول کی لکھی ہوئی جانسن کی

زندگی کا ذکر کرنا سوانح نگاری پر گفتگو کرتے ہوئے ناگزیر ہو جاتا ہے بعض ناقدین اِس مشہور سوانح عمری کو اس اندھی عقیدت کا نتیجہ سمجھتے ہیں جو باسول کو جانسن کی ذات سے تھی لیکن حقیقت یہ ہے کہ خواہ یہ سوانح عمری اندھی عقیدت کا نتیجہ ہو یا نہ ہو اس میں کچھ ایسی جاذبیت ہے کہ ہر دور میں اور ہر زمانہ میں اس کی مقبولیت اور دلچسپی مسلم رہی ہے اگر یہ عقیدت مندی کا ہی نتیجہ ہے تو شاید یہ کہنا پڑے گا کہ باسول سے پہلے کسی سوانح نگار نے اپنے جذبۂ عقیدت کا اس سے بہتر طرز اور پیرایہ میں استعمال نہیں کیا تھا۔

اُردو میں سوانح نگاری کی طرف بہت کم توجہ کی گئی ہے شبلی اور حالی کو چھوڑ کر بہت کم ادیبوں نے اس اہم صنفِ ادب کو مشکور کیا ہے شبلی کی سوانح عمریوں میں تاریخی پہلو بہت زیادہ نمایاں ہوتا ہے گو کہیں کہیں ان کے لطیف اسلوب بیان اور پاکیزہ طرز انشا سے ان کی سوانح عمریوں میں بڑی قوت اور زندگی پیدا ہو جاتی ہے لیکن بہ حیثیت مجموعی پڑھنے والے پر اس کا اثر ہوتا ہے کہ اس نے کسی زندگی کی تاریخ کا مطالعہ کیا ہے زندگی کا احساس ان سوانح عمریوں میں پوری قوت کے ساتھ نظر نہیں آتا۔ الفاروق اور سیرت النبی شبلی کی سوانح نگاری کا شہکار سمجھے جا سکتے ہیں کہیں کہیں تو ان کتابوں کو پڑھنے والا شبلی کے پیدا کردہ ماحول میں جذب ہو کر رہ جاتا ہے۔ حالی نے بھی سوانح نگاری کی طرف توجہ کی اور اس میں کوئی شک نہیں کہ انھوں نے سوانح عمریوں کے بعض نہایت کامیاب نمونے چھوڑے ہیں۔ اُردو کے انشا پردازوں میں حالی اپنے غیر جذباتی اور سنجیدہ طرز کے لئے مشہور ہیں اس کے باوجود حیاتِ جاوید اور یادگارِ غالب میں جذباتی تاثر کی بہت سی مثالیں موجود ہیں۔ النذیر افتخار عالم مارہروی کی تصنیف ہے اور بعض خصوصیتوں کے اعتبار سے اُردو زبان کی اچھی سوانح عمریوں میں شمار کی جا سکتی ہے۔

کسی زندگی کا ایک باب یا ایک پہلو بعض اوقات مکمل سوانح سے زیادہ موثر ثابت ہوتا ہے فرحت اللہ بیگ کا مضمون ڈپٹی نذیر احمد کی کہانی کچھ میری اور کچھ ان کی زبانی اور عبدالماجد دریا بادی کا مضمون مزار سوا اپنی نوعیت کے اعتبار سے مکمل سوانح عمریوں سے زیادہ دلچسپ واقعاتی اور اثر انگیز ہیں۔

ان قلیل قدر کارناموں کے ہوتے ہوئے بھی یہ کہا جا سکتا ہے کہ سوانحی ادب کے اعتبار سے ابھی ہماری زبان بہت تہی مایہ ہے زندگی کے کسی شعبہ میں ترقی کی راہیں بالکل مسدود نہیں ہو گئی ہیں ترقی کرنے کا گُر یہی ہے کہ گذشتہ کارناموں کی روشنی میں آئندہ کی راہیں تلاش کی جائیں یہی وہ سبق ہے جو ہم کو سوانح نگاری کے مقاصد سے ملتا ہے۔ اسی پر کاربند ہو کر ہم اپنے لئے ذہنی مسرت اور سرشاری کے لازوال خزانے اپنے لئے مہیا کر سکتے ہیں۔

عمر مہاجر

اپنے قائد سے!

مبارک اپنی قوم کی قیادت اے خجستہ خو — ہر ایک کے خیال میں بسا ہوا ہے تو ہی تو
تری نظر سے جلوہ گر مُدبّرانہ جستجو — ترے اثر سے بہرہ ور مُفکّرانہ آرزو

فلاحِ قوم کے سوا تری کچھ آرزو نہیں
جو منفعل ہو قوم سے وہ تیری جستجو نہیں

محبتِ وطن کی مے پلا کے سب کو مست کر — وفا پرست جو نہیں انھیں وفا پرست کر
مطابق اپنی رائے کے وطن کا بندوبست کر — موافقوں کو ساتھ لے مخالفوں کو پست کر

یگانگت جتائے جا تو اپنے حال و قال کی
بلندیاں دکھائے جا اسی طرح خیال کی

تجھی سے پوری قوم کی لگی ہوئی ہے آج لَو — کہ رہبرِ انقلاب کی ترے خیال کی ہے ضو
اُدھر بہا کے لے چلے یہ تیری قائدانہ رَو — جدھر تجلّیاں کرے "حیاتِ تازہ" نو بہ نَو

نظر فروز وسعتیں ہوں عرصۂ حیات کی
ضرورت آج قوم کو ہے تیرے التفات کی

ہر ایک دل میں جوشِ زن حیات کی اُمنگ کر — بنا غیور قوم کو، لحاظ نام و ننگ کر
اصابت اپنی رائے کی دکھا، عدو کو دنگ کر — بوقتِ صُلح صُلح کر بوقتِ جنگ جنگ کر

وہ کام کر جو مقتضی ہے فطرتِ بلند کا
سوال اب نہیں رہا پسند و ناپسند کا

علی منظور

وہم

ایک رومانی شام کو میں سیدھا سادا لباس زیب تن
کئے، تفریحی دھن میں، خفیف سی تبدیلی کے ساتھ اقبالؔ مرحوم
کا مصرع "حسن نسوانی ہے بجلی میری فطرت کے لئے" گنگناتا
ہوا آبادی کے ایک گنجان حصہ میں چلا جارہا تھا۔ دفعتاً میری نظر
انگریزی وضع کے ایک بنگلے کی کشادہ کھڑکی میں رکی۔ ایک دوشیزہ
حسن و شباب کی مکمل تصویر بیٹھی، البیلے انداز سے اپنے بکھرے
گیسو سنوار رہی تھی اِس بے پناہ جلوۂ حسن نے مجھ پر عالم محویت
طاری کردیا۔ کوئی دو منٹ بعد آس پاس دیکھ، راہرووں
کی نظریں بچا کھڑکی کے قریب، ایک مخفی مگر "کھڑکی نما" کنج میں
کھڑا ہوکر، میں نے اس "حسین منظر" پر اپنی نظریں جمادیں۔ ادھر
وہ اپنی دھن میں محو آرائش تھی اور ادھر میں نے مختلف
زاویہائے نگاہ سے اس کے حسن کا جائزہ لینا شروع کردیا۔
اتصال نگاہ پر کچھ مرعوب سا ہوا مگر پھر سنبھل کر موقع کو غنیمت
جان ٹکٹکی لگادی۔ اس نے بھی کچھ دیر، پلکوں کو جنبش دئے
بغیر، اپنی نگاہوں سے مجھ پر بجلیاں گرائیں، پھر دو منٹ کی
غیر حاضری کے بعد کھڑکی سے ہاتھ باہر نکال، میری طرف اشارہ
کرتے ہوئے ایک پیسہ پھینکا میری غیور و خود دار طبیعت نے اِس
بے عزتی کا تحمل نہ کیا۔ جیب سے کاغذ کا پرزہ نکال یہ جملہ
"دام کا نہیں پریم کا بھکاری" لکھا اور پیسہ پر لپیٹ
دھاگا باندھ تیزی سے کھڑکی میں پھینکا۔ اس نے جملہ کو پڑھ کر
مسکراتے ہوئے اندر کی راہ لی، کامل ایک گھنٹے کے انتظار کے
بعد بصد مایوسی "دل ہمارا لے کے رخصت ہوگئیں" گنگناتا ہوا
گھر لوٹا کرسی پر دراز ہوکر خیالات کی رو میں بہ گیا۔
اس ...... کی مسکراہٹ ضرور ...... کیا واقعی میرے
پریم بھرے جملہ نے اس کے دل میں بھی ...... ؟ نہیں ......
تو پھر مسکرانا ... ؟ ... حقارت ...... تو پھر آثار خفگی کا
عدم وجود ... ؟ شاید پہلی ہی نظر میں میری اس جسارت
پر اس کے لبوں پر بے ساختہ مسکراہٹ کھیل گئی ہو۔ اگر ایسا
ہوتا تو کھڑکی میں رہ کر میری اس "ناشائستہ" حرکت کا ....
ایں! جواب کیوں دینے چلی جب کہ میرے "پریم کی بھیک"
نے اس کے دل پر ... ٹھیک بالکل درست! اور یہی
تاثر مسکراہٹ کی صورت میں نمودار ہوا اچھا تو اس نے غائب
ہوکر پھر نمودار ہونے کا نام کیوں نہ لیا؟ ... تو پھر وہ معشوق
ہی کیا ہوا ... بصد کرب و اضطرار وقت کٹا دوسرے
دن سر شام اپنے خیال کا تائیدی یا تردیدی جواب حاصل کرنے
کے عزم مصمم سے نکلا۔ الحمد اللہ وہ کھڑکی میں بدستور موجود تھی
نظریں دوچار ہوئی ہی تھیں کہ بجلی کی سی تیزی سے غائب ہوگئی۔
میں نے سابقہ "محفوظ جائے پناہ" پر استادہ ہوکر مشغلۂ
بیکاری کے طور پر بار بار کھڑکی کی تیلیاں شمار کرنی شروع کردیں
کوئی پانچ منٹ بعد، میری پڑوسن، کریم بی کو اپنی طرف
آتے دیکھا تو سیدھا ہوکر منہ سے سیٹی بجاتا ہوا متانت سے
پوچھا "کریم بی! تم کدھر؟" اس نے کہا "میاں! میں سامنے
کے بنگلے میں ملازم ہوں، چھوٹی بیگم صاحب نے یہ چٹھی تمہیں دینے
کو کہا ہے" چٹھی دی اور چلتی بنی۔ میں نے نظر اٹھائی، کھڑکی
خالی تھی۔ پھر امید و بیم کی حالت میں چٹھی کو پڑھنا شروع کیا۔
لکھا تھا:۔

"پریم کی بھیک، معشوقوں کی طرف سے
"جوتیوں" کی شکل میں تقسیم کی جاتی ہے اگر
سر کھجلا رہا ہو تو بسم اللہ ہم بھی تیار ہیں"

ایں! "جوتیاں" ؟ ایک تھرتھرا ہوا نگاہ کھڑکی کی طرف دوڑائی تھی ......

یا وحشت! دل بانسوں اچھلنے لگا۔ جوشِ غضب نے حواس مختل کردیئے۔ غیر ارادی طور پر غیظ آمود آواز میں میری زبان سے نکلا "مگر یاد رہے! بھیک کی نوعیت پر بھکاری کی دعا یا بددعا کا انحصار ہے" بھڑکے ہوئے دل کو سنبھالتا اور اپنے مکردہ اقدام پر کڑھتا ہوا گھر پہنچا۔ محبت گئی بھاڑ میں جذبات نفرت نے دل میں ڈیرے ڈالے، طبیعت پر ظلم کرکے اس "جگر خراش واقعہ" کو صفحہ دل سے محو کردیا۔

کوئی دو ہفتے بعد ایک دن جب میں بیٹھک میں مصروف مطالعہ تھا، کریم بی گھبرائی ہوئی داخل ہوئی اور گفتگو میں مجھ سے سبقت کرتے ہوئے پریشان لہجہ میں بولی "رضیہ بی بی سخت علیل ہیں" میں نے گھبرا کر پوچھا "کون رضیہ؟" اس نے کہا "وہی جنھوں نے آج سے کچھ دن پہلے میرے ذریعے آپ پاس چٹھی روانہ کی تھی" مٹھیاں بھینچتے ہوئے میں نے دل میں کہا رضیہ۔ ناہنجار رضیہ　　　تو اس سے مطلب؟ کچھ سمجھ میں نہیں آتا فکر کے آثار چہرہ سے دور کرکے سنجیدگی سے کہا۔ "تو اس سے مجھے کیا غرض؟" کہنے لگی "میں کیا جانوں، بی بی کے حکم سے آپ کو خبر دینے آئی ہوں، بخار جنبش نہیں کھا رہا ہے ڈاکٹر عاجز آگئے ہیں"۔

یا للعجب! وہ　　　اور مجھے اپنی علالت کی خبر دے تعجب ہے! دل ہی دل میں سوچ کر "ہو نہ ہو یہ میری زبان سے نکلے ہوئے لفظ بددعا کا ہی اثر ہے۔ اوہ، عورت کی ذات بھی کس قدر وہمی ہے"۔ جذبات نفرت پر محبت غالب آنے لگی۔ میں نے کچھ غور کے بعد کہا "ان کے کان میں آہستہ سے کہہ دو کہ بھکاری کی دعا اُن کے ساتھ ہے"

کریم بی کی زبانی معلوم ہوا کہ دوسرے ہی دن بخار اتر گیا تھا۔ واہ رے اعتقاد۔

کچھ دن بعد رضیہ نے کریم بی کے ذریعہ مجھے طلب کیا۔ میں نے اپنی شانِ خودداری نباھنے کی خاطر، حقارت آمیز انداز میں وہاں جانے سے انکار کردیا۔ دوسرے ہی دن یہ چٹھی پہونچی:-

"..... آپ کے انکار سے مجھے قلبی صدمہ پہنچا میں آپ کی دعائی برکت سے اچھی ہوں۔ میں سمجھتی ہوں کہ میرے مزاحیہ حیلے نے آپ کو بددعا پر آمادہ کیا، اُف! مرد بھی کیسے جلد باز اور انتقام پسند ہوتے ہیں۔ آپ کو میری قسم آج شب کے آٹھ بجے ضرور ہمارے خانہ باغ میں تشریف لائیے۔ کیونکہ آپ سے　　-
ایک ضروری بات کہنی ہے"　　　　رضیہ

آخر "دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت" بھر آیا اور میں آواز ضمیر کی مخالفت کرتا ہوا معینہ وقت پر "حسن کی سرکار" میں پہنچا رضیہ نے میرا پُرتپاک خیر مقدم کیا مگر مجھے محو سکوت پاکر اس کے نازک چہرہ پر فکر کے آثار نمایاں ہوگئے۔ کچھ سوچ کر، متبسم لب وا کئے اور "جوتیوں" والا جملہ واپس لیتے ہوئے صفائی چاہی۔ میں نے بے ساختہ مسکراتے ہوئے اس کو معاف کردیا۔

بہت دیر تک ہم دونوں میں دلچسپ موضوعوں پر گفتگو رہی۔ دورانِ گفتگو میں اس نے لطیف اور غیر محسوس انداز میں مجھ سے نفرت کا تو نہیں مگر اپنی مجبوری کا اظہار کیا اور بپایان کار گھبراتی ہوئی کہنے لگی "ایک بات عرض کروں اگر خاطر شکنی نہ ہو" گفتگو ہی سے تاڑ گیا تھا مگر اس جملہ پر مجھے یقین کلی ہوگیا کہ یہ ضرور میری محبت کو ٹھکرائے گی۔ خیر مستقبل اللہ کے ہاتھ دل کو مضبوط کرکے میں نے کہا "بھلا آپ جیسی عقلمند میری خاطر شکنی کیوں کرنے چلیں، ہاں ہاں فرمایئے

شوق سے فرمائیے" اس نے رکتے رکتے کہا "نہیں نہیں اس سے آپ کو ...... گرمیں اسی میں .. " میں نے کہا "کبھی آخرِبات کیا ہے" شرماتے ہوئے دبی زبان سے اس نے کہنا شروع کیا۔

"میں اس ضلع کے تعلقدار صاحب کے فرزند سے منسو   وہ مجھ پر فدا ہیں اور میں بھی ان پر .   اور

. ابھی جملہ ختم بھی نہ ہوا تھا کہ میری حالت متغیر ہو گئی دل نے شدید قسم کی بے چینی محسوس کی ۔ رہا نہ گیا ۔ بہ سرعت اٹھ کھڑا ہوا اور چلتے ہوئے ہیبت زدہ آواز میں اس کی زبان سے سنا " یہ آپ چلے ؟ افسوس دل شکنی ۔ ...مگر ہاں .. بد دعا ۔

"رشید" میرا دلی دوست ہے۔ اس کا کوئی راز مجھ سے پوشیدہ نہیں ۔ اس نے کئی دفعہ اپنی بیوی کے عجیب عجیب قصے سنائے ایک مرتبہ کہا "خدا جانے میری بیوی پر کونسا بھوت سوار ہے جب کبھی بیمار پڑتی ہے، "بد دعا ' بد دعا" کی رٹ لگاتی ہے نوکروں کو حکم دے رکھا ہے کہ جیسے ہی کوئی بھکاری یا بھکارن دروازہ پر آموجود ہو' مجھے خبر کرنا ۔ وہ خود اپنے ہاتھوں انھیں خیرات دیتی اور دروازہ کی آڑ میں کھڑی ہو کر لفظ بہ لفظ ان کے دعائیہ جملے سنتی ہے"

عبدالعزیز غوثی

غزل

ہوش کی دنیا' عقل کے راگ ۔۔۔ لے بیٹھے ہو کیا کھڑاگ !
گانے والے دیپک راگ ۔۔۔ دیکھیے سُروں میں برسا آگ
بچ کر رہ اِن زلفوں سے ۔۔۔ ڈس لیں گے یہ کالے ناگ
دوش پر ہیں زلفیں اُن کی ۔۔۔ لہراتے ہیں کالے ناگ
آپ کے بس کی بات نہ تھی ۔۔۔ میری قسمت' میرے بھاگ
سوئے چمن کیوں رخ کرتی ۔۔۔ بجلی کو ہے مجھ سے لاگ
بن جاتے ہیں اشک ہوا ۔۔۔ کون بجھائے جی کی آگ !
سورج سر پر آ پہنچا ۔۔۔ سونے والے اب تو جاگ
جب ہے محبت ہی کا کال ۔۔۔ دنیا کو لگ جائے آگ

من کی دنیا' رازِ حیات
من کی دنیا کو نہ تیاگ

سلیمان اریب

لفافے بدلنا

نہ گُل چھوڑے نہ برگ و بار چھوڑے تو نے گلشن میں
یہ گلچیں ہے یا لٹس ہے گلچیں یا ہے قزاقی (حالی)

لفافے بدلنا آج کل غزل گو شعرا میں عام ہو گیا ہے اور اس طوفانِ بےتمیزی میں بڑے بڑے اساتذہ (جن کو لوگ رئیس المتغزلین فصیح البیان وغیرہ وغیرہ لکھتے ہیں) بھی بہے جا رہے ہیں۔ جہاں متقدمین کا کوئی اچھا شعر نظر آیا بس رال ٹپکنے لگی فوراً چوری کے مال کو گلا دیا (الفاظ بدل دیئے، بحر و ردیف تبدیل کر دی تخلص ٹھونس دیا) اور اپنا لیا ——— گر اس لوٹ میں چند غزل گو ایسے بھی بچے ہوئے نظر آ رہے ہیں جن کا دامن ان آلائشوں سے پاک ہے۔ جو پانی میں رہنے کے باوجود "کنول" کی طرح پانی سے علیحدہ ہیں اور جو "حریفاں بادہ ہا خوردند و رفتند" کو غلط ثابت کر دکھا رہے ہیں اور پکار پکار کر کہہ رہے ہیں :-

لگا رہا ہوں مضامینِ نو کے پھر انبار خبر کرو مرے خرمن کے خوشہ چینوں کو

لفافے بدلنے کی چند مثالیں مشہور غزل گو حضرت جگر مرادآبادی کے مطبوعہ دیوان "شعلۂ طور" سے پیش کرتا ہوں اور ساتھ ساتھ اس امر کا اظہار ضروری سمجھتا ہوں کہ مجھ کو حضرت جگر سے کوئی عناد نہیں۔

جگر (مرادآبادی)		شعرائے متقدمین		
رہروِ راہِ بے خودی ہے جگر	وہ نشیب و فراز کیا جانے	جو رہِ عشق میں قدم رکھے	وہ نشیب و فراز کیا جانے	داغ
ہم سمجھتے ہیں رازِ رامش و رنگ	زاہدِ پاکباز کیا جانے	کیفِ مئے بادہ خوار سے پوچھو	یہ مزہ پاکباز کیا جانے	〃
دامان و جیب ہو گئے نذرِ جنوں تمام	باقی کفن کے واسطے اک تار بھی نہیں	دیوانگی سے دوش پہ زنار بھی نہیں	یعنی کفن کے واسطے اک تار بھی نہیں	غالب
پھنکا جاتا ہے دل جس سوزِ غم سے	جہنم میں وہ چنگاری کہاں ہے	آتشِ دوزخ میں یہ گرمی کہاں	سوزِ غم ہائے نہانی اور ہے	〃
صورت دکھا کے پھر مجھے بے تاب کر دیا	اک لطف آ چلا تھا غمِ انتظار میں	دکھلا کے اک جھلک مجھے بیتاب کر دیا	مانوس ہو گیا تھا غمِ انتظار سے	سودا
موت اک دامِ گرفتاریٔ تازہ ہے جگر	یہ نہ سمجھو کہ غمِ عشق نے آزاد کیا	مرگ ہم قیدِ دیگری حافظ	از غمِ عشق کے شوی آزاد	حافظ
مجھی میں رہتے تھے مستور ہو کر	بہت پاس نکلے بہت دور ہو کر	در من و از نظر شوی مستور	تو قریبی و ہم نمائے دور	سعدی
دل کہ ہوتے ہوئے جاتے ہو کہاں اے موسیٰ	ان میں کچھ جلوے ہیں ایسے کہ سرِ طور نہیں	دل میں خود سوز ہے کیوں کر پہ جاؤں موسیٰ	گھر میں جو آگ ہے میرے وہ سرِ طور نہیں	شہید دہلوی
وہ لاکھ ستاتے رہیں دنیائے تمنا	بستے ہیں جیسے دل کبھی تنہا نہ رہیگے	ایک ارمان نکلتا ہے تو سو آتے ہیں	دل عجب گھر ہے کہ ہرگز نہیں ویران ہوتا	مومن
ہائے کیا چیز گلِ داغِ محبت ہے جگر	خشک ہونے پہ بھی بوئے وفا دیتا ہے	یہ گلِ داغِ محبت بھی عجب چیز ہے درد	لاکھ کملائے مگر بوئے وفا رکھتا ہے	میر درد
یہ ترکِ جستجو بھی کیا ترکِ جستجو ہے	اس میں بھی پا رہا ہوں اک شانِ جستجو کی	یہ ترکِ آرزو بھی اک آمد ہی پڑی	اس میں بھی دیکھتا ہوں اک شانِ آرزو کی	شہید
نکہتِ گل کا بھی دماغ نہیں	کتنا آزردۂ بہار ہوں میں	ہجر میں آزردئے باغ - کسے	نکہتِ گل کا ہے دماغ کسے	مصحفی
مجھے نہ چھیڑ بہت اے نسیمِ صبح کرم	تمام شوق و شکایت کا ماجرا ہوں میں	نہ چھیڑ اے نکہتِ بادِ بہاری راہ لگ اپنی	تجھے اٹھکیلیاں سوجھی ہیں ہم بیزار بیٹھے ہیں	انشا

اتنا کہوں کہ علاوہ چند اور بھی مثالیں ہیں مگر خوفِ طوالت انہی پر اکتفا کرتا ہوں کہ میرے دعوی کی دلیل کے لئے بہت کافی ہیں میں نے صرف ان ہی متقدمین کے ایسے اشعار پیش کئے ہیں جن کے مطبوعہ دواوین میں یہ سب اشعار موجود ہیں جن کی ہر صاحبِ ذوق بآسانی تحقیق فرما سکتا ہے۔

احمد علی مجاہد

سنتری

غضب کی سردی پڑ رہی تھی۔ فرانس اور جرمنی کے دریا برف سے منجمد ہو گئے تھے۔ برف باری کے خوف سے لوگ مکان سے باہر قدم رکھتے ہچکچاتے تھے۔ غریب مزدور پیٹ بھرنے کی خاطر نکلتے اور کام کرتے کرتے برف کی طرح سرد پڑ جاتے۔

ایسے خوفناک موسم میں ایک نوجوان سنتری پہرہ پر کھڑا اپنا فرض انجام دے رہا تھا کڑاکے کے جاڑے میں اس کے اعضا مفلوج ہوئے جا رہے تھے۔ لیکن وہ بت بنا کھڑا رہا۔

جب اس کی محبوبہ کو اس کا علم ہوا تو وہ بے تابانہ دوڑتی ہوئی آئی۔ ڈیرے کی مدھم روشنی میں سنتری کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ تاریکی میں آنے والے کو سنتری نے پہچان لیا۔ اور منہ موڑ کر ٹہلنے لگا۔ کہ شاید وہ اس سے واقف ہو جائے اور منت سماجت کر کے اسے اپنے فرائض سے غافل کر دے۔

آتے ہی وہ اس سے چمٹ گئی۔ اور اس کو گرمانے کے لئے اپنی نازک ہتھیلیوں سے اس کا چہرہ رگڑنے لگی اور بے ساختہ بوسوں سے اس کو پریشان کر دیا۔

لڑکی نے اس سے منت کی کہ صرف تھوڑی دیر کے لئے اس کے گھر چل کر کچھ کھا پی لے۔ مگر سنتری نے انکار کر دیا۔ وہ اس کے پیروں پر گر پڑی اور گڑگڑا کر التجا کرنے لگی۔

"صرف چند لمحوں کے لئے چلے جاؤ۔ اپنی لوسی کی خاطر"

"میں مجبور ہوں پیاری میں یہاں سے ایک انچ بھی ہٹ نہیں سکتا"

"اگر تم نہیں مانتے تو میں بھی یہیں کھڑی رہتی ہوں"

"لیکن تم [illegible] میں تو" "میں نے بھی کڑا کر لیا ہے"

"ہٹ نہ کرو۔ فرض سے ہٹنا موت کو بلانا ہے۔ ایک سپاہی کے لئے سب سے بڑی بدنامی!"

"میں بھی تمہارے ساتھ ٹھنڈی ہو جاؤں گی"

خیمے کی روشنی ٹمٹما کر خاموش ہو گئی۔ یکے دکے تارے جو چمک رہے تھے وہ بھی کہر میں چھپ گئے۔ ہوا سائیں سائیں کر رہی تھی۔ اور اس کے تھپیڑوں سے نازک لڑکی ڈگمگانے لگی -- ادھر سپاہی گرا ہی چاہتا تھا۔ لڑکی کے دل میں یکایک جوش پیدا ہوا۔ اس نے اس کے بٹن کھول کر وردی اتاری، بندوق ہاتھ سے چھین لی۔ اس نے اس کو جھنجھوڑتے ہوئے کہا "سیدھے گھر چلے جاؤ۔ میں تمہاری جگہ کھڑی رہتی ہوں" اور اس نے وردی پہن لی۔ اور لبادا اور ٹوپ اوڑھ لیا، وہ چلا گیا اور یہ اپنی فتح پر اس قدر نازاں تھی کہ موسم کی تلخی کو بھول گئی۔

اتفاقاً ایک افسر جیبی برقی روشنی ڈالتا ہوا ادھر سے گزرا۔ لڑکی نے سلامی نہیں دی۔ وہ بت بنی کھڑی تھی۔ افسر اس کے پاس آیا۔ اس نے سوالات کی بوچھاڑ کر دی لڑکی اس قدر مرعوب ہو گئی تھی کہ اس کو کوئی جواب بن نہیں پڑا۔ اور اس کی آنکھوں سے جھڑی لگ گئی۔

وہ اسے اپنے ساتھ لے گیا۔ اور آتش دان کے پاس بٹھا دیا۔ جب اس کا خوف کم ہو گیا تو اس نے رکتے رکتے تمام واقعہ بیان کر دیا۔

علی الصبح سپاہی کو طلب کیا گیا۔ لیکن وہ بے حد کمزور ہو گیا تھا۔ اس لئے اسے ڈاکٹر کے پاس رجوع کر دیا گیا۔

چوتھے روز جب اسے سزائے موت سنائی گئی تو اس صدمے سے اس کی محبوبہ کا سینہ پھٹ گیا لیکن اس نے

عزم کرلیا کہ ہر ممکن طریقے سے اسے بچانے کی کوشش کرے گی ورنہ جان دیدے گی۔

وہ پریشان حال سب افسروں سے ملی۔ اور کمانڈر کے قدموں پر گر کر اس کی جان بخشی کی التجا کرنے لگی۔

سب اسے جانتے تھے۔ اس کے بین پر کوئی بھی ایسا نہیں تھا جس کا دل نہ بھر آیا ہو۔ افسروں کی بیویوں نے بھی سفارش کی۔

بالآخر اس نے دلوں کو موم کر دیا۔ اور اس کا محبوب اُسے مل گیا۔

شبیر حسین قیس

کیفیات

مرے دلِ پُرمحن کی دھڑکن عجیب نغمہ سنا رہی ہے
سُنو کہ اس سازِ زندگی سے صدا ترنم کی آرہی ہے

عجب زمانہ تھا بے دلی کا دلِ حزیں تو غضب ہی نکلا
میں جس تمنا پہ ہنس رہا تھا وہی مجھے اب رلا رہی ہے

جسے سمجھنا تھا دل کی دھڑکن وہی ہے مضرابِ سازِ ہستی
وہ ساز جس پر تری محبت ترانۂ شوق گا رہی ہے

ہمارے نالوں کے جوش میں بھی ہے اک سکوت خوشی کا عالم
بھنور کے دامن میں کشتیٔ غم قریب ساحل کے آرہی ہے

وہ اک مرادِ نصیب دل تھا ہوا نہ جو آج تک شگفتہ
نہیں تو گلزارِ آرزو میں کلی کلی مسکرا رہی ہے

مرے دلِ مضطرب سے شعلے اگر نکلتے ہیں کیا تعجب
کہ اس کے برقِ نظر کی گرمی کمال اپنا دکھا رہی ہے

عجیب مشکل کا سامنا ہے کروں گا کس طرح عرضِ مطلب
مری تمنا ہزاروں شکلیں بنا بنا کر مٹا رہی ہے

وہ غنچۂ آرزو ہمارا جو کب کا مرجھا چکا تھا ہادی
نسیمِ امیدِ کامرانی اسی کو اب پھر کھلا رہی ہے

ہادی مچھلی شہری

ترقی پسند ادب

انسان زبان کے ذریعے سے اپنے مافی الضمیر کو ادا کرتا ہے یہ سب سے بڑی نعمت ہے جو خدائے قادر نے انسان کو عطا فرمائی ہے۔ اسی سے انسانوں اور حیوانوں میں فرق و امتیاز ہوتا ہے، رفتہ رفتہ انسان نے وہ چیز ایجاد کی جسے ہم تحریر کہتے ہیں۔ تحریر کی ایجاد ظاہر ہے کہ تمدن کی ضرورتوں کی وجہ سے ہوئی ہوگی۔ یہ ایجاد انسانی تہذیب کی سب سے اہم اور سب سے زیادہ منفعت بخش ایجاد ہے۔ تحریر ہی کے ذریعہ سے حکمائے قدیم اور عقلائے عالم کے خیالات ہم تک پہنچے ہیں۔ اور اسی سے ہمارا ترقی پسند دور آنے والے دوروں کے لئے ایک شمع ہدایت ہوگا جس کی روشنی میں وہ اپنی اور ہماری حالتوں کا موازنہ کریں گے۔ جیسا کہ آج ہم اپنی اور عہدِ سلف کی حالتوں کا موازنہ کرتے ہیں۔

ادب کیا ہے

قومیں جوں جوں ترقی کرتی ہیں ان کے خیالات میں وسعت پیدا ہوتی جاتی ہے اور تہذیب و تمدن وسیع ہوتا جاتا ہے۔ اس سے انسانی زندگی مختلف پہلوؤں میں تقسیم ہو جاتی ہے بعض طبائع جو زیادہ نازک زیادہ ارفع اور اعلیٰ ہوتی ہیں جن میں غور و خوض کا مادہ خاص طور پر زیادہ ہوتا ہے وہ اپنی ذہنی کیفیات اور قلبی واردات کو ظاہر کر دینا شروع کر دیتی ہیں کبھی یہ ہوتا ہے کہ انسان کے مشاہدے اور تجربے میں کچھ چیزیں محفوظ رہ جاتی ہیں یا فطرت ان کو ایسی قوت ودیعت کرتی ہے کہ ان میں ان مشاہدوں اور تجربوں کے محفوظ کرنے کی صلاحیت اوروں سے زیادہ ہوتی ہے مگر وہ جب اپنے خیالات، محسوسات، تجربات اور مشاہدات عمدہ پیرایے میں بیان کرتا ہے تو ہم اس کو فنونِ لطیف کہتے ہیں جس کی [illegible] ادب ہے

ارتقائے ادب

دنیا کی ہر چیز اپنی جگہ پر ایک خاص حالت میں نہیں رہتی تغیر اور تبدیلی کا سلسلہ برابر جاری رہتا ہے۔ پیدائش، نشو و نما، بلوغ، شباب، شیب اور فنا ہر چیز کے لئے ہے۔ حتیٰ کہ زمین و آسمان کے لئے بھی جب کہ ہر چیز کی فطرت کا یہی تقاضہ ہے تو پھر خیالات و محسوسات تجربات و مشاہدات کے اثرات بھی مختلف دور زندگی میں مختلف ہوں گے خود بیان کرنے والوں کے لئے بھی اور اس بیان کے سننے والوں کے لئے بھی۔ ادب پرتو ہے کسی قوم کے رجحانات کا اور جوں جوں ان رجحانات میں تغیر ہوتا جائے گا ادب میں بھی تغیر ہوتا چلا جائے گا، اذہان قومی کی سطح ایک دور میں قریب قریب یکساں رہتی ہے اس لئے اس ہر دور کا ادب بھی یکسانیت لئے ہوئے ہوتا ہے ایک جملے سے ایک مصرعہ سے تصویر کے ایک ہلکے سے عکس سے یا کسی بت کی تراش سے معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ کس دور کی پیداوار ہے۔ مثال کے طور پر ہم اردو ادب پر ایک نظر ڈالتے ہیں۔ اردو کا بالکل ابتدائی دور دیکھئے۔ اس کے بعد دکنی دور پر نظر ڈالئے۔ خصوصاً ولی اور سراج کے کارناموں پر غور کیجئے اس کے بعد دہلی میں شعر و سخن کے چرچوں کو دیکھئے۔ لکھنوی دور ادب پر نظر ڈالئے۔ میر اور سودا کی کوششیں مشکور ہوتی ہوئی دیکھئے۔ ذوق، مومن اور غالب کے جلسوں میں شرکت کیجئے اور ان سب کے بعد موجودہ دور کا مطالعہ کیجئے صاف نظر آ جائے گا کہ اردو ادب نے کیونکر بتدریج ارتقا حاصل کیا ہے اور صدیوں کی مسلسل کوششوں اور کاوشوں کے بعد کیونکر وہ ایک ایسی حد پر پہنچا ہے جس پر کہ وہ آج ہے۔

رجحانات ادبی

ادب میں ایک اہم مسئلہ یہ ہے کہ آیا ادب قومی رجحانات کا تابع ہے یا وہ قومی رجحانات کو اپنا تابع بنانا چاہتا ہے۔ [illegible]

اختلاف ہے۔ بعض کی رائے یہ ہے کہ ادب اس وقت تک مقبول نہیں ہو سکتا اور نہ مفید ہو سکتا ہے جب تک وہ قومی رجحانات کا ساتھ نہ دے اور بعض کے نزدیک وہ ادب ادب ہی نہیں جس کو مقبول ہونے کے لئے قوم کی خوشامد کرنی پڑے۔ ان کے نزدیک ادب کا کام یہ ہے کہ وہ قومی رجحانات کی رہبری کرے۔ اگر اس میں کوئی نقص اور خامی ہو تو اسے دور کرنے کی کوشش کرے۔ اگر پستی ہو تو رفعت بخشے لیکن دیکھا یہ گیا ہے کہ ادب کا زیادہ حصہ تابع ہوتا ہے قوم کے رجحانات کے اور ایسا ادب جو رجحانات و خواہشات کا تابع نہیں ہوتا، بہت کم ہوتا ہے اور اگر ہوتا بھی ہے تو اس زمانے میں نہ وہ مقبول ہوتا ہے نہ مطبوع۔ یہ ممکن ہے کہ کسی آئندہ دور میں وہ سرسبز ہو جائے۔

دنیا کی تاریخ انقلاب میں یہ عجیب بات ہے کہ انقلاب سے سالہا سال پہلے ایسے مصور، شاعر، مصنف اور فلسفی پیدا ہوئے جنھوں نے آنے والے انقلاب کے لئے راستہ صاف کیا۔ بلکہ اگر نگاہ عمیق سے دیکھا جائے تو اصلی انقلاب تو یہی لوگ کر چکے تھے بعد میں لوگ انھیں کے تاثرات سے متاثر ہوئے اور سیاسی و ادبی دنیا میں جو انقلابات ہوئے وہ دراصل نتیجہ تھے انھیں ذہنی انقلابات کے جو یہ لوگ قوم کے دماغوں میں پہلے سے پیدا کر گئے تھے۔

ترقی پسند ادب

عام طور پر اس کا مفہوم یہ ہے کہ صدیوں کی قائم شدہ روایات سے بغاوت کی جائے۔ اس کی ابتدا فرانس سے ہوئی۔ یہاں سب سے پہلے تخت سے بغاوت کی گئی۔ اس کے بعد مذہب سے۔ مذہب سے بغاوت کا سبب یہ تھا کہ کلیسا نے شہنشاہیت کی پشت پناہی کی۔ کلیسا کا قبضہ لوگوں کے دلوں پر بیٹھا ہوا تھا۔ والٹیر نے پادریوں کا اس قدر مذاق اڑایا کہ مذہبی لوگوں کی عزت و توقیر دلوں سے جاتی رہی۔ روسو نے انقلاب کا پیغام فرانس کو اور تمام دنیا کو دیا۔ اس کے بعد فرانس کے شاعر نے "رسالۂ" والی نظم لکھی جس نے فرانس کے گوشے گوشے میں آگ لگا دی۔ لوگ جوق جوق انقلابی فوج میں شریک ہوگئے جمہوریہ فرانس کے ابتدائی دور میں مذہبیات ایسا کفر تھا جس کی طرف اہل فرانس بھول کر بھی رخ نہیں کرتے تھے۔ رابس پیری کی پوجا، عقل کی دیوی کی پوجا، قوم اور ملک کی پوجا ان کا شعار تھا اور مذہب کی طرف رخ کرنا گناہ۔

فرانس کے انقلاب نے کسی ملک پر ایسا اثر نہیں ڈالا جیسا روس پر۔ ملک استبداد و انانیت کے پنجے میں گرفتار تھا۔ ظلم و ستم کا ہر طرف دَور دَورہ تھا۔ امرا اپنے فرائض سے بے خبر غریبوں کی گاڑھی محنت کی کمائی پر عیش و عشرت کرتے تھے۔ آخرکار وہاں بھی بغاوت ہوئی۔ ٹالسٹائی اور دیگر انقلاب پسند ادیبوں نے ناول ڈراما اور مختصر افسانہ نویسی کے ذریعہ عوام کو بغاوت اور انقلاب پر آمادہ کیا۔ غریبوں کی زندگی کا مطالعہ کرکے ان کی تصویریں دنیا کے سامنے پیش کیں۔ امیروں کی کھوکھلی زندگی کی ہیبتناک تصویریں منظر عام پر لائی گئیں جس نے حکومت کرنے والی ذات کا رعب ختم کر دیا۔ ٹالسٹائی سے لے کر گورکی تک اکثر مصنفین نے یہ کام انجام دیا۔

مختصر افسانہ نویسی اور اس نئے آرٹ کا شہرہ تمام دنیا میں ہوگیا اور مظلوم قوموں نے بھی اسی شاہراہ پر گامزن ہونے کی کوشش شروع کر دی۔ اپنی قوم کو بیدار کرنے تیز ان کے دماغوں میں انقلاب کا بیج بونے کے لئے افسانے اور نظمیں لکھی جانے لگیں۔ فرانس کی طرح روس میں بھی کلیسا نے تخت کی حمایت کی چنانچہ شہنشاہیت کے خلاف انقلاب پادریوں کی کوتاہ اندیشی کی وجہ سے کلیسا کے خلاف بھی انقلاب بن گیا۔

چنانچہ مذہبی لوگوں کا مذاق اڑانا اور ان پر پھبتیاں کسنا انقلاب اور ترقی پسندی کا جزو لازمی بن گیا۔

ترقی پسند ادب ہندستان میں

روس کے انقلاب کی دھوم اور ترقی پسند ادب کی اہم طاقت کے چرچے ہندستان میں بھی پہنچے یہاں ایک جماعت ایسی موجود تھی جو حکومت کے خلاف لوگوں کو آمادہ کرنا اپنا نصب العین سمجھتی تھی۔ ہمارے ملک میں جو ترقی پسند ادب کی تحریک شروع ہوئی وہ زیادہ تر کانگریس یا کانگریس سے ہمدردی رکھنے والے افراد پر مشتمل ہے کانگریس کے ایک حصے پر اشتراکی رنگ جس طرح حاوی ہوتا چلا جارہا ہے وہ ظاہر ہے۔ اشتراکیت سے دلچسپی رکھنے والے حضرات روس کی پیروی کرنا اپنے لئے ضروری سمجھتے ہیں روس میں جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے انقلاب صرف تخت کے خلاف نہیں ہوا بلکہ کلیسا کے خلاف بھی۔ اس کی تقلید میں ہمارا ہر ترقی پسند ادیب مذہب سے خفا ہے اور اس کا مذاق اڑا کر اپنے ترقی پسند ہونے کا ثبوت دیتا ہے مثال کے طور پر "انگارے" کا نام لیا جاسکتا ہے۔ جس کو پڑھ کر آپ میری رائے سے متفق ہو جائیں گے۔

کیا ترقی پسند ادب کی بقا ممکن ہے

یہ ایک ایسا سوال ہے جس کا جواب آسان نہیں۔ دنیا کا بڑا حصہ اپنے ہر قسم کے عقائد میں پختہ ہوا کرتا ہے اور اپنی زندگی میں "بدعت" کو راہ دینے سے حتی الامکان گریز کرتا ہے۔ اس چیز کو دیکھتے ہوئے کم از کم ہندستان میں تو امید نہیں کہ ترقی پسند ادب سرسبز ہو۔ دوسرا سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ بغاوت دراصل بغاوت ہے بھی یا ہم نے ارتقائی ادب کا نام ترقی پسند ادب رکھ لیا ہے۔ انسان تہذیب و تمدن ادبیات مذہب غرض ہر شئے میں بتدریج ترقی کرتے کرتے اس درجے پر پہنچا ہے کیا کوئی چیز اصل سے جدا ہو کر قایم اور زندہ رہ سکتی ہے؟ چنانچہ اب یہ صورت قایم رہ سکتی ہے یا نہیں۔ دنیا کے لئے اس کا نتیجہ اچھا نکلے گا یا برا یہ ایک پیچیدہ مسئلہ ہے جس کا حل کبھی نہ کبھی ہوگا ضرور لیکن ابھی نہیں !!!

بڑا خطرہ

ترقی پسند ادب کو بقائے دوام حاصل ہو یا نہ ہو لیکن فی الوقت تو یہ چیز ہمیں بڑے خطرے سے آگاہ کرتی ہے۔ مذہب کو سیاسی میدان میں لا کر پارٹی بازیوں کی کشاکش میں ڈالنا خطرناک ہے۔ ہمارے علماء اگر ایک سیاسی جماعت کی موافقت کریں گے تو دوسری جماعت جب کبھی برسر اقتدار ہوگی تو ظاہر ہے کہ وہ اپنے حریفوں ہی کو نہیں بلکہ علماء کو بھی اور ان کے مذہب کو بھی کچلنے کی کوشش کرے گی۔ یہ کوئی خیالی اور فرضی خطرہ نہیں۔ بلکہ فرانس، روس اور مختلف ممالک کے انقلاب کی تاریخ ہماری اس رائے کی شاہد ہے۔

بلقیس بانو

اردو فاضل (ادارۂ ادبیات اردو)
مددگار مدرسہ فوقانیہ نسواں۔ نامپلی

سجکس

عظمت اللہ خاں مرحوم

اس طرح جی کہ بعد مرنے کے ۔ یاد کوئی تو گاہ گاہ کرے

عظمت اللہ خاں مرحوم میرے عزیز بھی تھے ۔ اور عزیز دوست بھی ۔ مگر میری اور ان کی طبیعت میں زمین آسمان کا فرق تھا میں قدامت پسند ہوں ۔ اور وہ زمانے سے دو قدم آگے رہنا چاہتے تھے ۔ میں پرانے شاعروں کو اپنی تحریروں سے زندہ کرنا چاہتا ہوں اور انھوں نے اپنے ایک مضمون میں جس کا عنوان "شاعری" ہے اِس سرے سے اُس سرے تک سارے اُردو کے شاعروں کو دنیائے شاعری سے بارہ پتھر باہر کر دیا ہے میں لکیر کا فقیر ہوں اور وہ جدت پسند تھے ۔ اور جدت پسند بھی ایسے کہ باوجود اِس تن و توش اور مضبوط قویٰ کے مرے بھی تو کس مرض میں، کہ دق میں ۔

لکھنے کا انھیں ہمیشہ سے شوق تھا ۔ مگر معلوم نہیں کہ وہ لکھتے کس وقت تھے ۔ کیونکہ اُن کے پاس لوگوں کا جمگھٹا لگا رہتا ہے ایک ہے کہ اپنا مضمون سنا رہا ہے ۔ دوسرا ہے کہ شعر پڑھ رہا ہے ۔ ۔ یہ آرام کرسی پر بیٹھے واہ واہ اور سبحان اللہ سے اس کا دل بڑھا رہے ہیں ۔ اور اسی واہ واہ اور سبحان اللہ میں کچھ ایسی باتیں بھی کہہ جاتے ہیں جس سے مضمون میں اصلاح بھی ہو جائے ۔ اور پڑھنے والے کو یہ بھی نہ معلوم ہو کہ اس پر اعتراض کیا گیا ہے ۔

سب سے زیادہ تعجب کی بات یہ ہے کہ جس مقام میں وہ رہتے تھے وہاں رہ کر انسان لکھنا پڑھنا تو درکنار جی بھی کیسے سکتا ہے؟ مکان کیا تھا، خاصہ اچھا قفس تھا ۔ اول تو صحن ہی چھوٹا تھا، اس پر گملوں کی بھرمار نے اس کو اور بھی تنگ کر دیا تھا

. . . . دروازے سے گھستے ہی داہنے ہاتھ کی طرف ایک پتلا سا برآمدہ اور بہت ہی پتلا سا کمرہ تھا، کمرے کی کھڑکیاں بازار کی طرف کھلتی تھیں ۔ کھڑکیوں کے نیچے ہی موری تھی اور سڑک کے دوسرے طرف شراب خانہ، میونسپل کمیٹی کی موری کی تعریف میں کچھ لکھنا تحصیل حاصل ہے ایک طرف موری کی بو [illegible] اور دوسری طرف شراب کے بھبکے، اس کمرہ میں بیٹھنا بس عظمت اللہ خاں ہی جیسے شخص کا کام تھا ۔ اور کوئی دوسرا ہوتا تو گھر چھوڑ کر بھاگ جاتا، یہ انہی کے قویٰ تھے کہ کئی بار اس مصیبت کو برداشت کر گئے ۔ لیکن آخر کہاں تک، دق ہو گئی، اور مر گئے ۔

وہ ہر وقت کچھ نہ کچھ پڑھتے رہتے تھے ۔ کوئی ان کے ہاں بیٹھا تو انھوں نے کتاب الٹ میز پر رکھ دی اور اس سے باتیں کرنے لگے، وہ گیا اور انھوں نے کتاب اٹھائی ۔ ہاں لکھتے ہوئے میں نے ان کو کبھی نہیں دیکھا، پھر بھی انھوں نے اتنا لکھا ہے کہ چھپنے پر ان کے مضامین کی شاید دو جلدیں ہو جائیں اُن کو قطعاً شاعر ہونے کا دعویٰ نہیں تھا ۔ مگر وہ چاہتے تھے کہ اُردو شاعری کا جو رنگ پڑ گیا ہے اس کو بالکل نیا جامہ پہنا دیا جائے اس لئے انھوں نے نہ صرف ہندی بلکہ انگریزی اور فرانسیسی شاعری کا مطالعہ بھی بڑی گہری نظر سے کیا ۔ انگریزی مضمون کے ترجمے کئے، ہندی پنگل کو سائنٹیفک اصول پر ڈھالا اور ان کی محنت کا نتیجہ اب "سریلے بول" کی شکل میں آپ کے سامنے آ رہا ہے، اِن کی زندگی ہی میں لوگوں نے اِس نئے راستے پر چلنا شروع کر دیا تھا، اور اب یہ رنگ ذرا اَبتر ہو رہا ہے ۔ اگر اس رنگ میں لکھنے والا کوئی میر یا مرزا پیدا ہو گیا تو یقین جانئے کہ پرانا رنگ مدھم پڑ جائے گا اور گل و بلبل کی بجائے اُردو کے باغ میں آم پر کوئل کوکنے لگے گی ۔

عظمت اللہ خاں کے مرنے کے بعد ہی ایک مضمون "یادِ رفتگاں" کے عنوان سے چھپا تھا ۔ اس کی چند سطریں

یہاں دیتا ہوں، اس سے اُن کی تحریر اور اُن کی تعلیمی حالت کا اندازہ ہو سکے گا۔

مطالعہ کے شوق نے اُن کی معلومات کو وسعت دی۔ اُن کی تحریر میں قوت پیدا کی، اُن کے قلم میں زور دکھایا، یہی مطالعہ تھا جس سے اُن کو مختلف زبانوں کی طرزِ تحریر سے باخبر کیا۔ مختلف خیالات سے آگاہ کیا، اور بالآخر انھوں نے اپنے خیالات کا اظہار ایسے طریقے پر شروع کیا جس میں انگریزی کی متانت، فرانسیسی کی خوشی، فارسی کی ظرافت اور ہندی کے درد کی جھلک تھی۔ وہ کسی تاریخ دہلی میں پیدا ہوئے تو ہوئے ہوں انھوں نے اجمیر کالج میں کبھی بہ حیثیت طالب علم نام پیدا کیا ہو تو کیا ہو، انھوں نے انگریزی میں (ESSAY) لکھنے میں سونے کا تمغہ پایا ہو تو پایا ہو، مگر صرف دو تاریخیں ان کے نام کے ساتھ ہمیشہ زندہ رہیں گی، ایک وہ تاریخ جس روز انھوں نے اُردو ادب پر قلم اٹھایا اور دوسری وہ تاریخ جب دستِ قضا نے اُن کے ہاتھ سے قلم چھین کر ان کو ہمیشہ کے لئے خاموش کر دیا۔

اس وقت "سہ پہلو" آپ کے سامنے ہے، اس میں پہلا مضمون "شاعری" پر ہے، انھوں نے بتایا ہے کہ اُردو شاعری کیا ہے اور اس کو کیا ہونا چاہیے۔ انھوں نے شاعری کی بہترین تعریف سمجھی ہے کہ "شاعری تخیلی پیکروں کا پیدا کرنا ہے" اور اس کے دو پہلو ہیں، ایک یہ کہ جو چیز موجود ہو مگر سامنے نہ ہو اس کو لفظوں میں اس طرح دکھایا جائے کہ اصل صورت سامنے آجائے، دوسری یہ کہ جو چیز موجود نہ ہو اس کو ایک تخیلی پیکر اس طرح دیا جائے کہ ہر پڑھنے والے کے سامنے ایک ایسی تصویر کھنچ جائے کہ وہ اس کو اصلی سمجھنے لگے، اسی تاریخ کے تحت انھوں نے اپنی یہ رائے ظاہر کی ہے کہ تخیلی پیکر اُس وقت تک پیدا نہیں ہوتا جب تک نظم مسلسل نہ ہو، اور اسی بناء پر انھوں نے کہا ہے کہ ......

میں پہلے ہی کہہ آیا ہوں کہ میری اور مرحوم کی طبیعت میں اختلاف ہے میں اُردو شاعری کو اتنا ناقص نہیں سمجھتا جتنا وہ سمجھتے ہیں، اور شاعری کے لئے نظم کے مسلسل ہونے کو لازم نہیں جانتا، اردو شاعری میں "حیات انسانی کا چربہ" تو نہیں ہے لیکن اس میں انسانی احساسات کے نقشے بدرجۂ اتم موجود ہیں اور "سو سنار کی اور ایک لوہار کی" والی مثل کی طرح اس کا ایک شعر اکثر نظم مسلسل کے سو شعر پر بھاری پڑتا ہے، مثلاً غالب کا یہ شعر لیجئے ؎

قفس میں مجھ سے روداد چمن کہتے نہ ڈر ہمدم
گری تھی جس پہ کل بجلی وہ میرا آشیاں کیوں ہو

اس شعر کو پڑھ کر جو واقعات آنکھوں کے سامنے پھر جاتے ہیں ان کو اگر نظم مسلسل میں ادا کیا جائے، تو یقین مانئے شاک اثر نہ رہے گیا انسانی طبیعت کی الجھن عبدالرحمٰن خان احسان کے اس شعر سے بہتر کسی نظم مسلسل میں اس اثر کے ساتھ ظاہر کی جا سکتی ہے، لکھتا ہے ؎

دیکھیو میری طرف سچ کہیو اے اختر شناس
کیوں فلک کو تو نے دیکھا میرے اختر دیکھ کر

یہی وجہ ہے کہ اُردو کے بہت سے اشعار زبان زدِ خلائق ہو گئے، اور ہر پڑھا لکھا اور اَن پڑھ ان کو بے تکلف پڑھتا اور لطف اٹھاتا ہے۔ اگر وہ رنج میں ہے تو یہ شعر اس کے رنج میں ایک لطف پیدا کر دیتے ہیں، اگر وہ خوشی میں ہے تو یہ شعر اس کی خوشی کو دو بالا کر دیتے ہیں، مرحوم نے ہندی شاعری کی تقلید پر زور دیا ہے مگر ہندی کی کوئی نظم مسلسل ایسی موثر نہیں ہے جیسے اس کے "دوہے" دوہے ہیں [illegible]

لطف باغوں میں آرام کرسی پر لیٹ کر فرصت سے پڑھنے میں اٹھایا جا سکتا ہے۔ لیکن جہاں اُردو رائج ہے وہاں والوں کو یہ آرام کہاں نصیب ہے' یہ تو ایسے چھوٹے چھوٹے فقرے چاہتے ہیں۔ (خواہ وہ نثر میں ہوں یا نظم میں) جن کو بآسانی یاد کر لیا جا سکے' جن کو چلتے پھرتے پڑھا جا سکے' اور جن سے انسانی احساسات کی مردہ قوتوں کو جگایا جا سکے۔
لیکن باوجود اس کے مجھے یہ کہنے میں ذرا بھی تامل نہیں ہے کہ ابتک نظم مسلسل کی ہمارے ادب میں کمی ضرور تھی جو' اب ایک حد تک پوری ہو رہی ہے۔

اسی شاعری کے مضمون میں مرحوم نے علم عروض سے بھی بحث کی ہے' اور بتایا ہے کہ کس طرح بحروں کے پھندوں سے نکال کر ایک سائنٹیفک اصول پر لایا جا سکتا ہے' ہندی پنگل پر سب سے بہتر کتاب قدر بلگرامی مرحوم نے لکھی ہے میں نے اس کو بھی دیکھا ہے۔ علم عروض کی بھی کچھ کتابیں پڑھی ہیں اور انگریزی کی "پروسیڈی" کو بھی کالج والوں نے میرے دماغ میں اتارنے کی کوشش کی ہے' ان سب کے پڑھنے پڑھانے کے بعد میری وہ رائے قایم ہوئی ہے جو پانچ چھ سو سال قبل مولانا روم قایم کر چکے تھے۔

شعر می گویم بہ از آبِ حیات
من نہ دانم فاعلاتن فاعلات

یعنی یہ کہ جب تک آدمی "کن رس" نہ ہو اس وقت تک یہ پنگل اور عروض سب بیکار ہیں' اندھے شاعر ہو سکتے ہیں۔ بہرا شاعر نہیں ہو سکتا اور انسان کی طبیعت کو بحروں سے یا کسی سائنٹیفک پیمانے سے محدود نہیں کیا جا سکتا' استاد ذوق کا مقولہ تو آپ کو یاد ہوگا کہ انھوں نے ایک غزل ایسی کہی تھی جو کسی بحر میں نہیں آتی تھی' لوگوں نے اعتراض کیا جواب

دیا گیا کہ یہ ایک نئی بحر سہی' اور نتیجہ یہ ہوا کہ اس بحر کا اضافہ علم عروض میں ہو گیا' بہرحال میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ شاعر کے لئے علم عروض یا پنگل کی گھڑیوں میں جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس کا ذوق سخن ایک ایسا پیمانہ ہے جو اِن تمام پابندیوں سے بالاتر ہے' پھر بھی میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ عظمت اللہ خاں مرحوم نے جو طریقہ اشعار کے جانچنے کا قائم کیا ہے وہ ایک بہت آسان طریقہ ہے' اور اس میں سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اوزان کی کوئی حدبندی نہیں رہی ہے اس کے ساتھ ہی انھوں نے اپنی نظموں میں عملاً بتلا دیا ہے کہ یہ طریقہ کس طرح کام میں لایا جا سکتا ہے' یہ ضرور ہے کہ جو کوئی اِن نظموں کو پہلے پہل پڑھے گا اس کا دل شروع میں اچاٹ رہے گا لیکن ایک آدھ دور کے بعد اس کو اِن نظموں میں مزا آنے لگے گا' کیونکہ ہر نظم اصلیت پر مبنی ہے اور دلی جوش کے ساتھ لکھی گئی ہے' اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ "کل جدید لذیذ"

اس کتاب میں آپ بعض ایسی نظمیں بھی دیکھیں گے جو انگریزی سے ترجمہ کی گئی ہیں۔ اِس ترجمے میں روانی ایسی ہے کہ ترجمہ معلوم ہی نہیں ہوتا سبب یہ ہے کہ مرحوم نے اِن نظموں میں مکھی پر مکھی نہیں ماری ہے بلکہ جہاں ان کو اپنے ملک کے خیالات کے لحاظ سے تبدیلی کی ضرورت ہوئی وہاں بلا تکلف تبدیلی کر دی اول تو ایک زبان سے دوسری زبان میں ترجمہ ہی ایک مشکل کام ہے اور پھر نظم کو جوں کا توں نظم میں تبدیل کرنا ایک ناممکن سا کام ہے' ایسی صورت میں بہتر طریقہ یہی ہے کہ حتی الامکان نظم کا ترجمہ نظم میں کرتے وقت زیادہ ور مضمون اور مضمون کی اسپرٹ پر دیا جائے۔ تاکہ اس نظم کے [illegible]

اور تشبیہات ترجمہ میں آجائیں اور اس کے ترجمے کو لفظی ترجمہ نہ کہا جاسکے۔

بہرحال اب اس کی ضرورت ہے کہ ان لوگوں کو جنھیں شاعری سے واقعی لگاؤ ہے' اس جدید رنگ کو اختیار کرنے میں " لومتہ لائم " کی پروا نہ کرکے اور اس دھن میں لگ کر کہ ہم کو یہ جدید رنگ اردو ادب میں داخل کرنا ہے' پوری کوشش کرنی چاہیے اگر یہ رنگ اصلی ہے تو پختہ ہو کر ہمیشہ کے لئے قایم ہوجائے گا' اگر نقلی ہے تو چند دنوں کے بعد خود بخود مٹ جائے گا خود ان لوگوں کا نام دنیا میں قایم رہے گا' اردو ادب کا پھیلاو بڑھے گا' اور ساتھ ہی ساتھ [illegible] عظمت اللہ خاں [illegible] کا نام زندہ ہوجائے گا' جنھوں نے اپنی ساری عمر اس جدید رنگ سے لوگوں کو روشناس کرنے میں صرف کردی۔

نامِ نیک رفتگاں ضایع مکن
تا بماند نامِ نیکت برقرار

فرحت اللہ بیگ

رقص

جس طرح انگڑائیاں لیتی ہے شاعر کی امنگ
جس طرح بجتے ہیں کالی بدلیوں میں جل ترنگ

جس طرح دل پر اثر کرتا ہے لحنِ آبشار
جس طرح دل میں اتر جاتا ہے پھولوں کا نکھار

جس طرح ٹھنڈی ہوا سے گرم ہوجاتا ہے دل
کیفیاتِ درد میں جس طرح کھو جاتا ہے دل

جلوہ آرا جس طرح ہوتی ہے گلشن میں بہار
خواب سے جس طرح چونکاتی ہے بوندوں کی پھوار

جس طرح چھنتی ہے کالی بدلیوں سے چاندنی
فصلِ گل میں جس طرح ہوتی ہے رخشاں زندگی

یونہی' دل میں رقص سے ہوتے ہیں زندہ ولولے
روح میں تحلیل ہوجاتے ہیں شیریں زمزمے

رقص جب کرتا ہے کوئی دلبرِ شیریں صفات
بے تکلف رقص کرتی ہے یہ ساری کائنات

جھومتے ہیں نخل' گرمِ رقص ہوتی ہے صبا
مسکراتے ہیں گلستاں' وجد کرتی ہے فضا

چاند کے سینے میں جوئے شوق ہوتی ہے رواں
رقص سے معمور ہوجاتا ہے تاروں کا جہاں!

رقص کے جادو سے یوں معمور ہوتی ہے فضا
وسعتِ دل کیا بساطِ ذرہ ناچیز کیا

مسکراتی ہے زمیں سے تا بہ گردوں زندگی
نبضِ ہستی میں نظر آتی ہے جنبش رقص کی

تحسین سروری

پیار کی راتیں پیار کی باتیں

(۱)

برسات کی کالی "زلفیں" جیسی کالی راتیں۔ کمرے کے باہر
مسلسل اور موسلا دھار بارش کا شور، ہوا کا فراٹا، بوندوں کی پڑ پڑ،
پرنالوں کی بڑبڑ، نالیوں کی سرسر کمرے کے دروازے بند، اندر دو مست
مئے الفت، نیند کے ماتے پڑے محبت کے سہانے خواب دیکھتے ہیں۔ کڑاکڑکڑ
بادل گرجتا ہے، بجلی زور زور سے چمکتی ہے، ایسی چمکتی ہے کہ اس کی چمک بند کمرے
کے اندر بھی آتی ہے۔ دونوں بہ یک وقت جوانی کی متوالی نیند سے ذرا کروٹ
بدلتے ہیں اور نیم وا، خمار آلودہ، مدبھری آنکھوں سے ایک دوسرے کو دیکھتے ہیں
پھر ایک کا نازک سر ایک کا کشادہ سینہ، ایک کے لانبے لانبے بال، ایک کے
ہاتھ کی انگلیوں کا شانہ
بارش یہی مسلسل پڑ پڑ کرتی ہے، نم زمین کی خوش گوار سوندھی سوندھی بو
چاروں طرف پھیلی ہوئی ہوتی ہے، ہوا سر سر کرتی لوریاں گاتی ہے،
بوندیں پٹ پٹ کر کے تال بجاتی ہیں۔ دونوں ایک دوسرے کی آغوش
میں ایک خوشگوار خنکی محسوس کرتے ہوئے۔ ایک دوسرے پر تیز تیز گرم گرم
سانسیں چھوڑتے ہوئے پھر مست خواب ہو جاتے ہیں۔
پیار کے دن ہیں، پیار کی راتیں۔!!

(۲)

گرما کی مختصر راتیں، چاندنی کی بہاریں صحن میں چھڑکاؤ کیا ہوا،
خفیف سی خنکی پھیلی ہوئی، بیچ صحن میں۔ ایک پلنگ پر سفید چادر بچھی
ہوئی، کچھ پھول بکھرے ہوئے، فضا میں بھینی بھینی بو پھیلاتے ہوئے۔
ایک مست ناز۔ چاندنی ہر طرف چھٹکی ہوئی، صبح صادق جس کی گود میں
سوتی ہوئی، تارے ماتھے کے پسینے کی بوندوں کی طرح بکھرے ہوئے،
چاند سونے والے کو ٹکٹکی باندھ کر دیکھ رہا ہے، رشک سے حسد سے۔ پلنگ سے
ذرا دور ایک کرسی پر ایک محو نظارہ۔ ہوا چہل کرتی ہے، ٹھنڈی ٹھنڈی
فرحت بخش۔ پتے کھڑکھڑاتے ہیں۔ پھر کوئی کروٹ بدلتا ہے، چھن
ایک ہلکی، مدھم جھنکار۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کا جھونکا چلتا ہے، بھینی
کپڑوں سے معطر پسینے کو لے اڑتا ہے۔ ہوا کا جھونکا ٹھنڈا ٹھنڈا۔
روح پرور۔ روح پرور۔ جان آگیں۔ جان آگیں۔
پیار کے دن ہیں، پیار کی راتیں۔!!

(۳)

جاڑوں کی طویل۔ پہاڑ جیسی طویل راتیں۔ مگر آنکھ جھپکتے
گزرنے والی راتیں۔ رُوئی اور دُوئی کے مزے اٹھانے کی راتیں
رضائی، دلائی۔ قربت، یکجائی۔ ہوا کانٹوں کی طرح چبھتی ہے،
پانی برف بن جاتا ہے، کہر پڑتی ہے، پالا پڑتا ہے، جاڑا ہوتا ہے،
دانت بجتے ہیں۔ جاڑا ہوتا ہے؟ ہونے دو۔ دانت بجتے ہیں؟
بجنے دو۔ دو روحیں اس سے بے پروا، بے خبر۔ جوانی کا گرم خون
محبت کی گرمی، ساری سردی اور سارے جاڑے کا علاج ——
پاس انگیٹھی ہے، جسم پر رضائی ہے اور بازو۔ ایک دن کی محنت
اور مشقت کا تھکا ہارا، محبت کا مارا۔ ایک گھر میں بیٹھی اس کی
راہ دیکھنے والی، اس کے انتظار میں گھڑیاں گننے والی ——
ہو ہو ہو ہو۔ ہو ہو —— سرد ہوا چلتی ہے، سردی ہوتی ہے۔
ایک کی گردن ایک کی باہیں۔ ایک کی تیز اور گرم سانسیں۔
ایک کا قوی اور مضبوط جسم۔ دوسرے کا گداز اور نرم ——
کپکپاتا، تھرتھراتا —— آہاہاہا، آہاہاہا ——
پیار کے دن ہیں، پیار کی راتیں۔!!

ساحر

فیضی کے منشآت

مشاہیر حکما میں، حکیم مصری، حکیم عماد الدین محمود اور کمال الدین حسین وغیرہ کا ذکر کیا ہے۔ حکیم مصری کے متعلق اُس کے الفاظ یہ ہیں:۔

"دریں دیار نام حکیم مصری بسیار است و کارنامہ ہائے علاج او بے شمار الحق بایں دانائی و دقیقہ رسی و تشخیص امراض .... امروز طبیبے مثل او نشان نمی دہند"

حکیم عماد الدین محمود کے متعلق سرسری طور پر درج ہے کہ مدت ہوئی کہ یہ مشہد میں انتقال کر گیا ہے۔ دوسرے طبیب حکیم کمال الدین حسین تھے، جن کو خان احمد گیلانی نے عراق سے طلب کیا تھا، اور ان سے "قانونِ شیخ" پڑھا تھا۔ گزشتہ سال ہی یہ یہاں سے چلے گئے ہیں۔

حکیم ابو الفتح کے متعلق یہ اظہارِ خیال کرتا ہے کہ:۔

"شاگرد رشید حکیم عماد الدین محمود بود اغریب دریافتے و رسائی در ہمہ چیز داشت طبیبے یک گوشۂ فضائلِ او بودہ نادرۂ زماں بود"

آگے چل کر لکھتا ہے کہ:۔

"حکیم ہمام استاد دیدہ است و اجازت نامہ از استادانِ وا روبہ بندہ نمودہ بود کہ از علم ہمتا تکمیل و تحصیلِ او بسیار نوشتہ۔ والحق چنیں ست در غریب فطرت عالی دارد۔ نظرِ حضرت کیمیا می وجود و کمال بخشِ مستعدان است۔ خوش صاحبِ استعداد کہ آئینہ شوقت او بخاکِ ایں آستاں انجلا یابد"

لکھا ہے کہ نظام الملک (والیِ احمد نگر) کے دربار میں دو مشہور و معروف طبیب ہیں، ایک حکیم کاشی، جو مدت سے یہاں ہے، اور اپنے آپ کو گمنام کر رکھا ہے، شاید اس کو حکیم مصری پہچانتا ہو، اور دوسرا حکیم علی گیلانی، جو کہ شیراز سے ہندوستان آیا ہے۔ بقیہ ہندی اطبا میں معمولی ہندو ہیں، جن میں سے کوئی بھی خاص امتیاز نہیں رکھتا۔ علی گیلانی، حکیم فتح اللہ شیرازی کا شاگرد ہے۔

ایک زمانہ سے اس فتح اللہ شیرازی کی بڑی شہرت سنی جاتی ہے، سنا کہ سالِ گزشتہ اس کو عادل بیگ نے چالیس تومان بھیج کر شیراز سے طلب کیا تھا، اور اب وہ ٹھٹھہ میں ہے۔ اگر خانِ خاناں کے نام فرمان صادر فرمایا جائے کہ اس کو درگاہِ والا میں بھیجے تو اس بے چارے باکمال کی سرفرازی کا باعث ہوگا، اور وہاں سے شیراز کا رستہ بھی قریب ہے۔

اس کے بعد دو عرضداشتیں ہیں، جو احمد نگر سے ۵ فروردین اور ۱۰ آبان ماہ الٰہی کو لکھی گئیں، لیکن سنہ درج نہیں۔

تیسری میں لکھا ہے کہ یکایک فرمان ملنے پر فدوی جب حسب الحکم روانہ ہوا، اور ۹ جمادی الاولیٰ کو برہان پور پہنچا تو لوگ تعجب کرنے لگے کہ ۱۵ کوس کس طرح ایک ہی منزل میں طے ہو گئے۔

ان عرائض کے ختم ہونے کے بعد کتاب کا دوسرا باب شروع ہوتا ہے، چونکہ ابواب "لطائف" سے تعبیر کیے گئے ہیں، اس لیے یہ "لطیفۂ دوم" ہے، جس میں شرفا، علما اور عرفا کی مراسلت کے مکتوبات شامل کیے گئے ہیں۔

پہلے تین خطوط مولانا معین الدین محمد الہاشمی کے نام ہیں، جو عربی میں درج ہیں، چوتھا جو ان ہی کے نام فارسی میں لکھا گیا ہے، اس میں تحریر ہے کہ خود اس کے خط

میں علوم دین کے متعلق ایک غیر منقوط کتاب لکھی ہے اس کی اطلاع کے ساتھ ساتھ ان کی خدمت میں اس کو ملاحظہ کے لئے بھیجنا بھی ہے۔
ذیل کا اقتباس اس اجمال کی تفصیل کے لئے پیش ہے۔

"آں کہ در سنہ خمس وثمانین وتسعمائۃ، کتابے غیر
منقوطا، بہ علوم دین مربوط، تالیف نمودہ، موشح
بنام ہمایوں انتظام حضرت ظل اللہی خلد اقبالہ بنظر
خورشید اثر در آوردہ، بہ عربستان (کہ تجلی اسم متکلم
در آں ولایت بہ مشابہ ایست کہ پایۂ فصاحت و
بلاغت بمعراج اعجاز رسیدہ) ارسال داشتہ
بود، و بہ نشان ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ سھل وبخل قبھل ۔۔
صناوید عرب واساطین ادب ممتاز داشتہ"
"چوں آں حقایق پناہ را توجہ خاص باجائے کہ
اشعار تازہ فقیر دارد، بہ توقیع ترویج، و ترویج
بمجلس عالی (لازال مجمع الافاضل والاہالی) مرسل
داشت۔ امید کہ بہ انظار قدسیہ منظور گردد
واز بصائر شموس نظایر، پروانہ نوریابد۔ والسلام
علیکم اولاً و آخراً۔"

اس کے بعد ایک ایسا خط درج ہے، جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ علمائے عصر سے کسی نے اس کی مزاج پرسی کی ہے، تو اس کا جواب ایک پرلطف لطیفہ کے ذریعہ دیتا ہے، کہتا ہے کہ:۔

"سخن ہماں است کہ از یکے پرسیدند کہ
چطور ــــ ؟
گفت، چناں کہ می دارند
گفت ــــ چوں می دارند ؟
گفت ــــ چوں می خواہند

زیادہ بریں چہ نویسد، واز حالات ایشاں چہ پرسد۔
الحمد للہ علی کل حال، والسلام فی المبدا والمآل۔"

اس لطیفہ کے اختتام پر، مولوی شیخ جمال اللہ نامی ایک بزرگ سے مراسلت کرتا ہے۔ جس میں عضد الدولہ (غالباً شاہ فتح اللہ شیرازی) کی تاریخ وفات ۲ر شوال سنہ شنبہ، آخر روز لکھتے ہوئے بڑے ہی افسوس کا اظہار کیا ہے، لیکن سنہ ہی درج نہیں۔
اس خط کے بعد ملا ظہوری کے نام ایک محبت نامہ لکھا گیا ہے جو عجیب وغریب ہے، اس سے بہت سے نتائج ظاہر ہوتے ہیں، اور صاحبان کمال کی قدردانی کا اندازہ ہوتا ہے۔ ظہوری کو خطاب کرتا ہے کہ میں تمھاری آتش فراق میں جل رہا ہوں، لیکن تمھیں کچھ احساس بھی نہیں۔ انتہائی صداقت اور خلوص سے کہتا ہوں کہ اعلیٰ حضرت تمھیں بے حد یاد فرماتے ہیں، اور آج کل عزیمت شاہانہ بھی پورے پورے طور پر دکن فتح کرنے کی طرف مائل ہے، تم خط تو پہلے ہی سے بہت کم لکھتے رہو، اور جب جواب دیتے ہو، تو بڑی دیر سے ملتا ہے، تمھاری ان ہی باتوں پر تو دل خون ہوتا ہے۔ خط لکھنا کس قدر آسان کام ہے، پھر تم کس لئے اس معاملہ میں بخل سے کام لیتے ہو۔
فیضی کے اس خط کو پڑھ کر تعجب ہوتا ہے کہ اس کو اپنے فضل وکمال پر گھمنڈ اور غرور ہونے کے باوجود اس نے ظہوری سے اس طرح عاجزانہ مراسلت کس طرح روا رکھی۔ یا ظہوری کے دربار اکبری میں حاضر ہونے میں کوئی خاص سیاسی مصلحتیں وابستہ تھیں، یا اس کے فضل وکمال کا اس وقت اس قدر رعب بیٹھا ہوا تھا۔
ظہوری کے نام ۱۴ر محرم سنہ ۹۹۲ھ کا لکھا ہوا ایک اور خط ہے۔

جس میں وہ اشعار لکھ بھیجے ہیں جو اس نے شہزادۂ سلیم (جہانگیر) کے عقد کے موقع پر کہے تھے، جس کے ہر مصرعے تاریخ نکلتی ہے۔

"زہے عقدِ دُرپاشِ سلطان سلیم" "کہ پرتو دہد سال امید را"
"زپروردنِ آب تابِ دول" "قرانی شدہ ماہ و ناہید را"
۹۹۳ — ۹۹۳ — ۹۹۳ — ۹۹۳

وحید الدین میر شاہ میر نامی کوئی بزرگ ہیں، انھیں لکھا ہے کہ اس سے پہلے میں نے ایک غیر منقوط رسالہ جو بادشاہ کے نام سے لکھا ہے، اسے آپ کی خدمت میں بھی بھیجا تھا، شاید آپ کے مدرسہ میں اس پر درس ہوتا ہوگا۔

اس کے بعد کا خط ایک نامعلوم صاحب کے نام ہے جنھیں اپنی کتابیں تحفتہً بھیجی ہیں، لیکن ان کے نام نہیں لکھے۔

مشہور دبیر، منشی ملا عبداللطیف (برہان پوری) کو لکھتا ہے کہ اس عاجز کو آج کل طبی کتابوں کا بڑا شوق ہے، آپ کی ولایت میں جو اہلِ کمال کا منبع و ملجا ہے، اگر طب کی نایاب کتابیں دست یاب ہوسکتی ہوں تو مجھ پر کرم فرما کے میرے لئے خرید لیجیے۔ میں نے آنے جانے والوں سے سنا ہے کہ شہر احمد نگر میں معمولی اور بے کار کتابیں بھی بڑی قیمت میں فروخت ہوتی ہیں، وہاں سے بھی آپ اپنے مذاق اور انتخاب سے، جس قیمت پر بھی ہو، کتابیں خرید کر بھیجیے، قیمت کے معاملات میں تکلف کی ضرورت نہیں۔

حسبِ ارشاد جو دیوان کہ حال ہی میں مرتب اور رسنا ہوا ہے عجلت اور ضرورت کی وجہ سے بغیر کسی مقابلے کے روانہ کر دیا جاتا ہے۔

کمال الدین حسین خلاطی شیرازی کو لکھتا ہے کہ ... معلوم ہوا کہ آپ عمارات اور مزاروں کی مرمت کی خاطر آگرہ جانے کا ارادہ رکھتے ہیں لاہور کی سیر کے بعد ضرور ادھر تشریف لے جائیے۔ کیونکہ ان عمارتوں پر آپ کی توجہ کی سخت ضرورت ہے یہ خط رجب ۹۹۳ھ کا لکھا ہوا ہے۔

اس کے بعد کے خط میں شیخ جمیل الدین پور شیخ جلال ساکن کالپی کو مخاطب کرتا ہے، اور بڑی منت و سماجت کے ساتھ، ان سے تشریف آوری کی درخواست کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ میں نے حال ہی میں ۱۰ ربیع الثانی ۱۰۰۲ھ کو اپنی "بے نقط تفسیر" مکمل کر لی ہے، جو صاحبانِ فضل کو حیران کر دے گی۔ اس کے خاتمہ پر (۹۹) فقروں میں جو عبارت لکھی ہے، وہ مقاصد کو حاصل ہونے کے سوا، تبارک و تعالیٰ کے اسماء حسنہ پر مشتمل ہے، اور اس کے ساتھ ساتھ ہر فقرہ سے تفسیر کا سالِ اختتام بھی معلوم ہوتا ہے۔ حال ہی میں عراق سے میر حیدر معمائی ایک فاضل یہاں آیا ہے، اتفاق کی بات ہے، یا تائیدِ غیبی سمجھئے کہ اس نے بھی پورے سورۂ اخلاص سے تفسیر کا سالِ اتمام حاصل کیا ہے۔ بے شک یہ اتفاقات کچھ الہاماتِ غیبی ہی پر دلالت کرتے ہیں۔

اس کے بعد کا خط بھی موصوف ہی کے نام ہے۔ جس میں مندرج ہے کہ، میں نے سنا ہے کہ آپ آگرہ تشریف لا چکے ہیں، اور پھر بعد کو معلوم ہوا کہ نہیں وطنِ مالوف تشریف لے جا چکے ہیں۔ آج کل موسم اچھا ہے، اگر لاہور تشریف لے آئیے گا تو بہتر ہے۔

ربیع الثانی ۱۰۰۲ھ میں جو تفسیر مکمل ہوئی تھی، وہ اسی سال صاف بھی ہو گئی ہے، اعلیٰ حضرت نے خاص طور پر ایک قصہ لکھنے کی فرمائش کی ہے، اور "اقبال نل دمن" کو جو کہ ہندوستان کے مشہور عاشق و معشوق ہیں، پہلی مرتبہ نظم کرنے کے لئے

لکھا اور فرمایا ہے کہ ' جو بحر کہ عمدہ ہوگی ' نظم کی جائے گی۔ آگے چل کر کہتا ہے کہ :-

" چلہ کہ اربعہ خمسہ " تقسیم یافتہ ' ایں را در زمین لیلیٰ مجنوں گفتن لائق دیدہ بموجب اشارہ عالی کہ آں چہ گفتہ شود ' ماہ بماہ بعرض اقدس رسد۔ در عرض چہار ماہ ' ہزار بیت گفتہ شد معدودے ماندہ۔ دریں دو روز ' خاتمہ گفتہ می شود۔ امید کہ پسند درسیاں افتد۔ دیگر سوانح آں کہ بموجب اشارتے کہ از غیب روئے نمود۔ " فیاضی " تخلص کردہ می شود۔ و ہر دو تخلص اگر نفسے چند باقی باشد ' شعر گفتہ خواہد شد

اسامی کتب خمسہ ایں است :-

اول :- " مرکز ادوار " (کہ اکثرے در تسبیح بود) گفتہ شدہ بود

دوم :- " سلیمان و بلقیس " پیش ازیں ہفت سال ' در لاہور بنیاد کردہ بود۔

چیزے چند ازاں گفتہ۔

سوم :- " نل دمن " کہ تمام شد۔

چہارم :- " ہفت کشور " کہ در احوال ہفت اقلیم گفتہ خواہد شد ' و آن در زمین ہفت پیکر خواہد بود۔

پنجم :- " اکبر نامہ " آں ہم جستہ جستہ وقتے گفتہ بود ' چوں سخن پیش آمدہ ' بتازگی گفتہ خواہد شد۔ انشاء اللہ تعالیٰ۔

" دیگر دریں شہر ہنگامۂ شعر بسیار گرم طبائع را بلائے دیگر است ' فقیر خود ترک صحبت ہا گرفتہ ' خلوت گزیں است ' بہ خیال بیا بینیکہ ہر عمدی سرور و مخلوط خواہند رفت دیگر گوید والدعا "

کمری کا نوٹیس کہ تہمدم [illegible] تنیدہ پیچ و بے دخیل [illegible]

گرامی را ۔ نہ دہند ۔ العبد الاقل فیضی "

موصوف الصدر کے نام ایک اور خط لکھنے کے بعد ' دوسرے میں حاجی شیخ عبدالحق کو بھی اپنی تفسیر کے بارے میں لکھتا ہے ' اور ان سے بھی اس کو ملاحظہ فرمانے کی استدعا کی ہے۔ ان کے نام اور پانچ خط ہیں ' جن میں کوئی بات قابل ذکر نہیں۔

اس کے بعد کے خط میں " مولٰنا " برادر نقبائے شیرازی سے مراسلت کی ہے۔ مولٰنا غوثی کے نام دو خط درج ہیں ' پہلے میں لکھا ہے ' میری تفسیر کے آغاز کی تاریخ سید محمد شامی نے (جو احمد نگر میں ایک بزرگ تھے)

سَلَا رَطْبٍ لَا یَابِسٍ اِلَّا فِیْ کِتَابٍ مُّبِیْنٍ

سے استخراج کی تھی۔

دوسرا خط قلعہ تمورت سے ۱۰ رمضان کا لکھا ہوا ہے " سنہ درج نہیں ' ایک نظم احمد آباد (گجرات) کی حسن شکایت میں لکھی ہے ' کہتا ہے۔

منم کہ کشتۂ گجراتیانِ بیدادم	خراب کردۂ خوبانِ احمد آبادم
سہی قدے ز سرِ ناز جلوۂ نہ نمود	کہ ہم چو سروِ بہ دنبالِ او بیفتادم
بہ ہر طرف کہ خرامید ' سروِ آزادی	غلام او شدم و خطِ بندگی دادم
چو رشکِ گلشنِ فردوس ' احمد آباد است	از و مباد ' برونم کنند چوں آدم
بروں نرفتن ازاں جا تصور امکاں	چرا بروں نہ سعوم ' من ہم تو دیدادم
بہ حسنِ مردم گجرات یاد میت دلے	نمی روند جوانانِ دہلی از یادم
حدیثِ عشق تو فیضی کہ نقل مستاں است	بہ نرم جرعہ کشیدہ بلوی فرستادم

اسی ضمن میں لکھتا ہے کہ میں نے اس سفر کے حالات ایک مثنوی کی صورت میں لکھے ہیں ' جب صاف ہو جائیں گے ' تو خود ارسال خدمت کروں گا۔ خوشتہ ۳۱ شعر نقل کرنے پر اکتفا کی ہے۔ اس کے بعد لکھتا ہے کہ مولٰنا غزالی نے آج کے ماہ میں کہ وقت احمد آباد میں ' ساتویں رجب کو انتقال فرمایا " اور سر کھیج میں

دفن ہوئے۔ میں نے بھی ان کی تاریخ وفات یہ لکھی ہے۔

چوں غزالی مشہدی بہ جہاں بود از شاعرانِ نام فریب
سالِ تاریخ فوتِ آں، زاں بود می شودؔ شاعرے عوام فریب"
۹۹۱

شیخ حسن کالپی کے نام تین خط لکھے ہیں، پہلے میں شیخ صاحب کو کہا ہے کہ آپ آتے ہوئے کتاب "مقاصد الشعرا" لیتے آئیے، کیوں کہ تذکرہ (؟) کا انتظام اسی کتاب پر موقوف ہے، اور دوسری کتابیں بھی جو حاصل ہو سکتی ہوں، ساتھ لے آئیے۔

دوسرے خط میں کوئی اہمیت نہیں، البتہ تیسرے میں لکھا ہے کہ "طبقات ناصری" کے لئے آپ نے جو خط لکھا ہے وہ میرے پاس اجمیر بھیجا گیا تھا، چونکہ میں وہاں نہیں تھا اس لئے اب یہاں آیا ہے۔ خدا کی قسم مجھے معلوم نہ تھا کہ آپ نے کتاب مانگی ہے اور مشاغل کی کثرت کی وجہ سے یاد بھی نہ تھا کہ یہ کتاب میرے پاس ہے، اپنی صاحب خانہ سے دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ گزشتہ سال میرے بھائی شیخ ابوالفضل یہاں آئے تھے، اور وہ اس کتاب کو لے گئے ہیں ان کے اس یاد دلانے پر مجھے بھی خیال آیا۔ خیر آپ کسی وقت میاں ابوالخیر کو بھیج دیجئے کہ وہ آکر بھائی صاحب کی کتابوں سے اس کو تلاش کرکے نکال لیں۔ بھائی کی کچھ کتابیں تو آگرہ میں پڑی ہیں اور کچھ ان کی حویلی میں۔ اس لئے سب ایک جگہ نہیں، متفرق ہیں، جب وہ گھر آئے تھے تو عجلت میں "طبقات" کو ان کے حوالہ کر دیا تھا، لیکن آج تک واپس نہ ملی۔ جب آپ کی وجہ سے اس کتاب کی ضرورت پڑی تو یہ یاد آئی، اس یاد سے میں کچھ مضطرب سا ہو گیا ہوں، اگرچہ کتاب ضائع نہ ہوئی ہوگی، مگر ضرورت کے وقت جب نہ ہو تو اس کا نہ ہونا فوت [illegible] کے مماثل ہے، ان شاء اللہ فقیر بعد میں بھیج دے گا۔

[illegible] ایک شعبہ نقرہ لکھا ہے، اس سے

آپ جو چاہیں مطلب نکال لیجئے۔

مجموعۂ کہنہ راحق و ملکِ خود، دانستہ، و فرستادنِ آں
بیار صعب نمودہ، ملازماں ازاں دست بشوئید کہ اں
مقدار تصرف جائز است۔"

اس باب کے آخر پر دس خطا ور ہیں، جن میں کوئی ایسی خصوصیت نہیں، جو معرضِ بیان میں لائی جائے۔

تیسرے باب، یعنی لطیفۂ سوم میں حکما ء معاصر وغیرہ کے نام کل چھ خطوط ہیں۔ صفحہ (۲۰۷) پر ۳ر شوال سہ شنبہ کو جو خط حکیم عین الملک کے نام ہے، اس میں لکھا ہے کہ نواب وحید الزمانی علامۃ العلما ء شاہ فتح اللہ نے کشمیر میں سفر آخرت اختیار فرمایا۔ اعلیٰ حضرت اس طرف تقریباً ۲۰ کوس آچکے تھے، یہ خبر سنی تو نہایت افسوس فرمایا۔

۱۹ر شوال پنجشنبہ کی رات میں حکیم ابوالفتح نے بھی انتقال کیا تو حکم شاہی ہوا کہ ان کو مقام "حسن ابدال" میں سپرد خاک کیا جائے۔ اس سانحہ سے اعلیٰ حضرت کو انتہائی رنج ہوا، اور بے اختیار آنسو بھر آئے۔

"لطیفۂ چہارم" میں امرائے عظام، اور احبائے کرام کے موسومہ خطوط ہیں۔ پہلا خط راجہ علی خاں مرزبانِ خاندیس کے نام ہے، جس میں لکھتا ہے کہ۔

"بموجب استدعا سمی نماید کہ از کتاب تغلق نامہ کہ از
انفاسِ مقدسۂ امیر خسرو است چند ورق از اول
و چندے از آخر رفتہ التفات فرمودہ، و جزا از اول
و ہمیں قدر از آخر بہ یکے از خدمت گاراں امر فرمایند
کہ بہر خطے مسودہ بہ جہتہ بندہ مصحوبِ ملازمانِ [illegible]
بفرستید۔"

اس کے بعد مرزا عبدالرحیم خان خاناں کے موسومہ [illegible]

گئے ہیں، دوسرے خط میں لکھا ہے کہ یہ فقیر بادشاہ کے حکم کی بنا پر فرمانِ شاہی کو لیکر ولایتِ دکن پہنچا، اور سید عبدالقادر عیدروسی سے ملاقات کا شرف حاصل کیا، جو بڑے زبردست اور باکمال بزرگ ہیں۔

اس باب کے چھٹے خط میں جو میر محمد معصوم بکری کے نام ہے، لکھا ہے کہ برادرِ علامی (ابوالفضل) سخت علیل تھے، اور زندگی سے مایوسی ہو چکی تھی، تو عین اس موقع پر حکیم مصری یہاں ایک عطیۂ الٰہی کی طرح پہنچے، اکثر حکماء کے غلط معالجہ اور سہو کی وجہ سے ڈھائی مہینے تک سخت علالت رہی، پھر بھی مرض کی تشخیص نہ ہو سکی تھی، بالآخر حکیم مصری نے ایسا علاج کیا کہ مزاج صحت کی طرف مائل ہو گیا اور خدا نے فضل فرمایا۔

زیرِ نظر کتاب کا آخری باب "جو لطیفۂ پنجم" سے موسوم ہے، اس میں اس کی انشاء پردازی کے نمونوں کے علاوہ "والد بزرگوار و اخوانِ خلت آثار، و اقارب و معارف" کے نام مشتمل ہیں۔

پہلا خط اپنے والد "مبارک" کو لکھا ہے، دوسرے میں ابوالفضل کو خطاب کرتا ہے کہ

"دو ایک دن میں نقلِ مکان ہو جائے گا، فقیر کی کتابوں میں، کتاب مصیبت نامہ شیخ عطار ہے، اسے مطالعہ فرمائیے۔ سیورہ نامی ایک شخص ہندوی زبان کی ایک کتاب لے آیا تھا، اس کو ہیبت خاں کے پاس بھیج دیا، تو انھوں نے خرید لی، اور کہتے تھے کہ بڑی اچھی کتاب ہے۔"

۱۴ ربیع الثانی دوشنبہ کو ایک اور خط ابوالفضل کے نام لکھا ہے جس میں لکھا ہے کہ

"آپ نے کتاب ظہور الانوار کے جمع کرنے کے متعلق جو فرمایا ہے، وہ مبارک ارشاد ہے۔ فقیر نے فتح پور میں ایک رسالہ جمع کیا تھا، جس میں بارہ ابواب تھے لیکن

افسوس کہ یہ حوادثِ روزگار سے تاراج ہو گیا، کیا لکھوں بڑا تعجب ہے کہ لاہور پہنچنے تک ایک مصرعہ بھی مجھ سے موزوں نہ ہو سکا۔"

دو خط اور ہیں، آخر کے خط میں بھائی کو لکھا ہے کہ، اس نامہ کے حامل مولانا کمال کشمیری ہیں اور جو اخلاص کی وجہ سے آرہے ہیں، ان سے ملاقات فرمائیے۔

سب سے آخر پر، شیخ افضل محمد بن شیخ یوسف قادری اکروی کے نام دو خط ہیں، بعد کے خط میں اپنی تفسیر کے متعلق لکھا ہے کہ

"تفسیر سواطع الالہام کے چار جزو، میاں سدید الدین کے ہمراہ بھیجتا ہوں، اس کو بعض عامی کاتبوں نے اصل مسودہ سے نقل کیا ہے جس کا پڑھنا مشکل ہے، اگر فرصت ہو تو بیاض سے مقابلہ کر لیجیے، اور بالفعل وسیلۂ یادگار رہنے دیجیے۔"

۳

اس "لطیفۂ فیاضی" کا ایک دوسرا جزو اس کے مرتب حکیم نورالدین عبداللہ عین الملک شیرازی کے منشآت پر مشتمل ہے، حکیم صاحب نے اپنے ماموں فیضی کے رقعات کے ساتھ آخر پر اپنے بھی مکتوبات شامل کر دیئے ہیں یہ "منطوقۂ سیوم" سے موسوم ہے۔ حمد و ثنا کے بعد لکھا ہے:-

درعہدِ شاہ نورالدین جہانگیر کہ یاد از عدل او عالم منور
فراہم آمدہ رقعاتِ نامی سوادِ حرف ہا چوں مشک اذفر
ز ترتیبش بجستم سالِ تاریخ بگفت "انشائے نورالدین احقر"

"انشائے نورالدین احقر" سے سنہ (۱۰۲۲) ہجری برآمد ہوتا ہے، اور خود "لطیفۂ فیاضی" سے جو اس پورے مجموعہ کا نام ہے، جیسا کہ ہم نے ابتدا میں لکھ دیا ہے، ۱۰۳۵ھ نکلتے ہیں۔ ممکن ہے کہ نورالدین نے فیضی کے رقعات جمع کرنے سے قبل علیحدہ

طور پر اپنے خطوط اکٹھے کر لیے ہوں، اور اس وقت ہی اپنے مکاتیب کے لیے یہ تاریخ کہی ہو، اور بعد میں اس مجموعہ میں انھیں بھی شریک کر دیا ہو۔

نورالدین نے اس باب کی تمہید کے بعد ایک جگہ اپنا نام اس خط میں جو ڈھاکہ (صوبہ بنگالہ) سے غرہ شعبان ۱۰۲۲ھ کو لکھا گیا تھا، یہ لکھا ہے۔

"نورالدین محمد عبداللہ حکیم مین الملک المسمی بہ شمس الدین علی شیرازی"

اس حصہ کے خطوط میں سنہ اور ترتیب کا لحاظ نہیں رکھا گیا ہے، اس لیے یہ غیر مرتب حالت میں نظر آتے ہیں۔

ایک عرضی جو اسلام جاہ شیخ علاء الدین اسلام خاں کے نام ہے، لکھا ہے کہ صوبہ دکن میں لاحاصل محنت کے بعد کہ وہاں کے لشکر کا نفاق، بغض اور ان کی خرابیاں تو آپ پر ظاہر ہیں، بڑے ہی مشکل سے چھٹکارا پاکر نکلا، اور آپ کی خدمت میں حاضر ہونے کے ارادے سے پٹنہ تک آیا تھا کہ یہاں نواب افضل خاں سے ملاقات ہوئی۔ تو انھوں نے روک لیا ہے، اس لیے آپ میری طلب میں ایک خط ان کے نام لکھیے۔ یہاں خانِ موصوف کے اعزہ نے بڑی کوشش اور جبر سے اس پریشانی کے عالم میں، میری شادی کرا دی ہے۔

ایک خط میں اپنے پدرِ بزرگوار کو یہ حالات لکھ بھیجے ہیں کہ ۹ ذیحجہ کو میر کی پسر خواجہ جہاں شاہی فرمان کے ساتھ جس میں تقصیرات کی معافی، اور دل جوئی درج ہے، یہاں وارد ہوا ہے۔ فرمان مبارک میں یہ بھی درج ہے کہ شیخ ابوالفضل کی جاگیر سنبل پور بھاندپور وغیرہ تمھیں سرفراز کیے گئے ہیں اور شاملِ خلعت خاصہ بطور تبرک روانہ ہے، فوراً حاضرِ آستانِ عالی ہونے کی عزت حاصل کرو۔ چنانچہ حکمِ اقدس کی بنا پر عمل کر رہا ہوں۔ آیندہ کیا حشر ہوگا، خدا ہی بہتر جانتا ہے۔

۱۴ ربیع الاول غالباً ۱۰۲۰ھ کا ایک خط ہے، جس میں یہ لکھا ہے کہ اوائل صفر میں، میں آگرہ پہنچا اور ۵ صفر چہارشنبہ کو دربار میں حاضرِ خدمتِ اقدس ہوا لیکن دشمنوں کے کہنے سننے کی وجہ سے اس فدوی کی طرف توجہ نہیں ہوئی، دو دن تک تو سلام کا ہی حکم نہ ملا تیسرے دن طلب فرمایا، اور بڑی سختی سے گفتگو فرمائی، اور غنیمت ہے کہ سلامتی کے ساتھ واپس لوٹنا میسر ہوا۔

اس کے بعد کے خطوط میں کوئی اہمیت نہیں ہے مختصر ان لوگوں کے نام لکھ دیئے جاتے ہیں جن کے لیے یہ تحریر کیے گئے ہیں۔

حکیم حیدر علی ملازم و مصاحب نواب مہابت خاں۔ عموی حکیم عبدالحی۔ عموی حکیم طاہر۔ اکرم خاں پور اسلام خاں چشتی۔ شیخ عبدالصمد المخاطب کرم خاں پور معظم خاں کوکلتاش چشتی فتح پوری۔ افضل خاں۔ مرزا سیف اللہ پور قلیچ محمد خاں۔ مرزا اسداللہ۔ موسیٰ خاں چشتی المشہور مورہ شیخ ابوتراب۔ مرزا لطف اللہ، حاجی علی بیگ۔

زیرِ نظر نسخہ کے چھوٹی تقطیع پر (۲۷۰) صفحات ہیں۔ کتب خانۂ آصفیہ میں ایک اور ناقص نسخہ "انشائے فیضی" کے نام سے نمبر (۵۰) فن انشائے فارسی پر موجود ہے۔ یہ بہت مختصر اور کم ہے، بظاہر اس ناقص نسخے اور مکمل نسخے میں، جس سے یہ مضمون مرتب کیا گیا ہے، کچھ نہ کچھ اختلاف ضرور معلوم ہوتا ہے۔

اس ناقص نسخہ میں ایک مقام پر یہ عبارت درج ہے

تمت تمام شد ایں نسخہ کہ .... نسخہ است علی
ید الضعیف اقل العباد الاحد الصمد نور الدین محمد ابن
عبداللہ حکیم ولد حکمت پناہ حکیم عین الملک معاعنہم تمت
بالخیر والسعادت ۔ رقم یافت ۴ محرم الحرام ۱۱۳۵ھ

روز یکشنبہ من مقام احمد نگر "
اس ناقص نسخے کے (۹۴) صفحے ہیں، اور یہ بھی چھوٹی تقطیع
پر لکھا گیا ہے۔

معین الدین رہبر فاروقی

حیات محمد قلی قطب شاہ

صحیح حالات و واقعات کو بہم پہنچانے کے لئے موصوف نے
بڑی جانکاہی سے کام لیا ہے .... کتاب کے متعلق مزید لکھنا تحصیل
حاصل ہے۔ ڈاکٹر زور کا نام نامی اس کتاب کے ہر طرح مکمل ہونے کی
ضمانت ہے۔ ہندوستان کا گوشہ گوشہ جہاں اردو پڑھی اور
سمجھی جاتی ہے، ڈاکٹر صاحب کی اردو کی بے لوث خدمات کا معترف
ہے..... کتاب کئی حیثیتوں سے نہایت دلچسپ ہے۔ ایک شاعر
بادشاہ کی خلوت وجلوت کی داستان، اردو ادب کے ابتدائی
دور کی کہانی، سلطنت گولکنڈہ کی عظمت و شوکت کا فسانہ اردو
ادب و تاریخ سے ذوق رکھنے والے حضرات کو میرے خیال
میں اس کتاب کا مطالعہ ضرور کرنا چاہیے۔

کاروان یکم فروری ۱۹۴۱ء

کتاب اپنے موضوع کے لحاظ سے عدیم النظیر حیثیت رکھتی
ہے اور انداز بیان میں مورخانہ اسلوب کے ساتھ ساتھ افسانوی
رنگینی جلوہ گر ہے۔ زور صاحب چونکہ ادبیات کے تاریخی پہلو پر
محققانہ نظر رکھتے ہیں اس لئے اس تاریخی تصنیف میں بھی ان
کی ادیبانہ ہمہ دانی کا عنصر غالب ہے۔

عالمگیر فروری ۱۹۴۱ء

ڈاکٹر زور اردو کے ان مخلص اور سرگرم کارکنوں میں
سے ہیں جنھوں نے اردو ادب کے دامن کو ادب و شعر اور تاریخ
وسیاست سے مالا مال کر دیا ہے..... متعدد کتابوں کی چھان بین
قلمی اور مطبوعہ تواریخ کا مطالعہ، حیدرآباد کی سیکڑوں عمارتوں،
مقبروں، عاشور خانوں اور کتبوں کی تلاش۔ غرض اس تاریخ کو
قلمبند کرنے کے لئے اور صحیح حالات بہم پہنچانے کے لئے موصوف
نے بڑی جد و جہد کی ہے۔

شاعر آگرہ دسمبر ۱۹۴۰ء

نمود زندگی

یہ جناب سید علی منظور صاحب حیدرآبادی کی ایک سو ایک نظموں
اور غزلوں اور رباعیوں کا دو سرا بیش بہا مجموعہ ہے۔ جناب ممدوح
حیدرآباد کے مشہور و معروف اور پختہ مشق شاعر ہیں اردو کا شاید ہی
کوئی ایسا بلند پایہ رسالہ ہوگا جو آپ کے کلام کی اشاعت سے
محروم رہا ہو..... علی منظور صاحب قدیم و جدید رنگ شاعری
کی معتدلانہ روش پر نہایت استقلال کے ساتھ چل رہے ہیں اور
آپ اس رنگ میں جو کچھ کہتے ہیں خوب کہتے ہیں صوفیانہ
جذبات کی سادگی اور مشق سخن کی پختگی آپ کے کلام کی نمایاں
خصوصیات ہیں..... ہمیں امید ہے کہ ادارہ ادبیات اردو کا
یہ مبارک تحفہ دنیائے ادب میں مقبولیت کا درجہ حاصل کرے گا۔

سہیل گیا
جنوری ۱۹۴۱ء

اردو کی نئی کتابیں

۱۔ پاکستان اور ہندوستان۔ (تحریک پاکستان کی تشریح) از عبدالقدوس ہاشمی ۲۳۶ صفحات قیمت مجلد عا؎ پتہ محبوبیہ کارخانہ جلد سازی حیدرآباد دکن۔

۲۔ واردات (مسلمانوں کی عہد گزشتہ و حاضرہ کی سرگزشت) از حسرت خاں آزاد قیمت ۲؎ مکتبہ ابراہیمیہ حیدرآباد دکن۔

۳۔ فلاحِ دین و دنیا (اسلامی انسائیکلوپیڈیا) ساتواں ایڈیشن ۶۰۰ صفحات قیمت للعہ خواجہ بکڈپو، دہلی۔

۴۔ رہبرِ اختیاری ریاضی (میٹرک کے گیارہ سال کے پرچوں کا حل) از شاہ حامد صدیقی ۱۵۶ صفحات قیمت عہ دکن بٹن فیاکٹری حسینی علم حیدرآباد دکن۔

۵۔ حیاتِ اویس قرنی (عہد عالمگیری کی ایک فارسی کتاب کا ترجمہ) از منظور حسن رضوی ۱۶۸ صفحات قیمت عہ مہتمم کتب خانہ مطبع رنگی دہلی۔

۶۔ شہید کربلا قرآن کی روشنی میں۔ از ابو مصلح ۲۷۲ صفحات قیمت ؎ ادارہ عالمگیر تحریک قرآن مجید۔ حیدرآباد۔

۷۔ راجپوت گوتیں (راجپوت قوم کی تاریخ) از چودھری محمد افضل خاں ۳۲ صفحات قیمت عہ منیجر اخبار مسلم راجپوت لاہور۔

۸۔ خوفناک دنیا حصہ اول و دوم (افریقہ بورنیو وغیرہ کے جنگلوں کے حالات) ۴۱۲ صفحات قیمت عا؎ ۔ ڈاکٹر سنیر وارثی۔ ڈشل کالج چوک آرہ۔ صوبہ بہار۔

۹۔ یارانِ میکدہ (مختلف لوگوں کے کردار مزاحیہ انداز میں) از عبدالشکور ۱۵۱ صفحات۔ مکتبہ جامعہ دہلی۔

۱۰۔ ٹروٹسکی کا بیان (خود نوشت سوانح) مترجمہ ایم ایم جوہر صفحات قیمت ۔ مکتبہ جامعہ دہلی۔

۱۱۔ یادِ اقبال (نظمیں) مرتبہ غلام سرور نگار ۱۲۰ صفحات عہ اقبال اکیڈیمی۔ لاہور۔

۱۲۔ پھلوں سے علاج۔ از حکیم محمد عبداللہ ۵۲ صفحات قیمت مہ منیجر العلاج ۔ روڑی۔ ضلع حصار۔

۱۳۔ حلفیہ مجربات (مجرب نسخے حلف کے ساتھ) از حکیم محمد عبداللہ ۱۲۸ صفحات قیمت ؎ منیجر العلاج روڑی ضلع حصار۔

۱۴۔ فولادتن اسٹالن (سوانح) از شانتی نرائن ۲۸۶ صفحات مرکنٹائیل پریس۔ لاہور۔

۱۵۔ ابنِ سعود (سوانح) از محمد عبداللہ ۳۱۱ صفحات تعلیمی پرنٹنگ پریس۔ لاہور۔

۱۶۔ حور ایران (تاریخی ناول) از محمد صادق حسین ۴۸۲ صفحات تعلیمی پرنٹنگ پریس لاہور

۱۷۔ تواریخ ٹاک کھشتریہ از جھنڈا سنگھ ۸۴۲ صفحات فرید ہند پریس امرتسر۔

۱۸۔ تاریخ جموں از حشمت اللہ خاں ۴۴۹ صفحات محمد تیغ بہادر پریس۔ لکھنؤ۔

۱۹۔ جدید قانون قبضہ اراضی صوبہ متحدہ از زائن پرشاد ۲۰۰ صفحات محمد تیغ بہادر پریس۔ لکھنؤ۔

۲۰۔ خوشنما زندگی کا ساز (طبی نسخے) از بابا بیج لال ۲۲۶ صفحات مرکنٹائیل پریس۔ لاہور۔

مرزا سیف علی خاں

تنقید و تبصرہ

نازو اور دوسرے افسانے :۔ از اختر انصاری بی اے آنرز ناشر کتبۂ جہاں نما دہلی صفحات ۱۷۴ قیمت ایک روپیہ۔

اختر انصاری صاحب اچھے لکھنے والوں میں سے ہیں۔ اور ان کے چھوٹے چھوٹے افسانے اکثر اردو رسائل میں چھپتے اور شوق سے پڑھے جاتے ہیں۔ یہ ان کے چودہ مختصر قصوں کا مجموعہ ہے جن میں سے اکثر جاں گداز داستانیں ہیں اور سماج کی تلخیوں کی بے تکلف تصویریں۔ اسلوب بھی دلچسپ ہے۔ توقع ہے کہ کتاب مقبول ہوگی۔

بیدر کا ظالم ہمایوں اور اس کی ملکہ :۔ از احمد اللہ خاں صاحب منصور ۴۰ صفحات قیمت چار آنے۔

کسی ملک کی تاریخ کا ذوق اس وقت تک عام نہیں ہو سکتا جب تک کہ ٹھوس تحقیقی کتابوں کے علاوہ ایسی چھوٹی چھوٹی دلچسپ کتابیں نہ لکھی جائیں جن میں تاریخی واقعات کو دلکش اسلوب میں نہ بیان کیا جائے۔ خاص کر دکن کی تاریخ سے متعلق ابھی بہت کچھ کام کرنے کی ضرورت ہے۔ منصور صاحب نے یہ چھوٹی سی کتاب بیدر کے ایک بہمنی بادشاہ کے متعلق سبق آموز پیرایے میں لکھی ہے۔ اور بچے اس کے مطالعے سے ضرور فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

عربوں کی گزشتہ تجارت اور انگلستان کی صنعت و حرفت مرتبہ مولوی مجیب احمد صاحب تمنائی صفحات ۸۰ قیمت آٹھ آنے۔

یہ کتاب ایک عرصہ قبل اس وقت شائع ہوئی تھی جب کہ ہندستانی مسلمان تجارت اور صنعت و حرفت کو حقیر نظروں سے دیکھا کرتے تھے اب اس کا دوسرا ایڈیشن مصنف کے دوست حاجی محمد خاں صاحب نے شائع کیا ہے۔ کیونکہ سفر حج کے اثنا میں جب انھوں نے حرم شریف کے اکثر و بیشتر باشندوں کی نکبت و افلاس کی حالت دیکھی تو ان پر بڑا اثر ہوا کیونکہ ایک زمانہ وہ تھا کہ عربوں کی تجارت دور دور تک پھیلی ہوئی تھی اور ان کے شوق جستجو کے آگے بڑے سے بڑے سمندر بھی کوئی حقیقت نہ رکھتے تھے۔ اسی کے اسباب و علل اور عروج و زوال کے حالات اس کتاب میں قلمبند کئے گئے ہیں اور اس کا دوسرا ایڈیشن اس لئے شائع کیا گیا ہے کہ اس کی آمدنی سے حرم شریف کے باشندوں کی امداد کی جائے۔

نمودِ زندگی :۔ مجموعہ کلام سید علی منظور۔ ناشر ادارۂ ادبیات اردو ۲۱۲ صفحات قیمت ایک روپیہ بارہ آنے۔

یہ مولوی سید علی منظور صاحب حیدرآبادی کے کلام کا دوسرا مجموعہ ہے۔ منظور صاحب پختہ مشق اور مشہور شاعروں میں سے ہیں۔ ان کی مقبولیت کا سب سے بڑا راز ان کی سادگی اور پرکاری میں پوشیدہ ہے۔ وہ عہد حاضر کے ان کامیاب شاعروں میں سے ہیں جنھوں نے زندگی کی ترجمانی کو اپنا اہم مقصد قرار دے رکھا ہے۔ جدید رنگ کے انقلابی شاعروں کی طرح علی منظور جذبات کی رو میں بہنا نہیں چاہتے بلکہ جذبات کو اپنے قابو میں رکھ کر ایک پختہ گام سالک کی طرح آگے بڑھتے رہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری نوجوانوں کے کلام کی طرح مجذوب کی بڑ نہیں معلوم ہوتی۔ وہ جو کچھ کہتے ہیں خود بھی سمجھتے ہیں اور دوسروں کو بھی سمجھنے کا موقع دیتے نہیں۔ اس مجموعہ میں ان کی سو سے زیادہ نظمیں ہیں اور چند غزلیں اور رباعیاں بھی شریک ہیں لیکن وہ اصل میں ایک نظم گو شاعر ہیں اور نظمیں ہی ان کے کمال سخن کی بہترین نمائندہ ہیں [illegible] ادبیات [illegible] یہ مبارک تحفہ دنیائے ادب میں مقبولیت کا درجہ حاصل کرے گا۔

تسہیل گیا
[illegible]

...حات شریک ہیں جن سے حجم میں کافی اضافہ ہو گیا ہے۔
...ں دواؤں کے اشتہارات اس قابل نہ تھے کہ شریک کئے جاتے
...لمگیر لاہور کا سالنامہ ۱۹۴۱ء کے خاص نمبر کے نام سے
...ائع کیا گیا ہے۔ اس میں جو علمی اور تحقیقی مضامین شریک ہیں
...ہت اچھے ہیں۔ چند رنگین تصویریں بھی ہیں جو زیادہ تر
...وام کے مذاق کو ملحوظ رکھ کر منتخب کی گئی ہیں۔ مضمون نگاروں
...ں شبلی بی کام، ماہر القادری، اکبر شاہ خاں نجیب آبادی۔
...وفیسر حامد حسن، میرزا ادیب، بادشاہ حسین۔ اور احسان علی
... اور شاعروں میں، جلیل، سیماب، امجد، احسن اور شاکر
...ٹی قابل ذکر ہیں۔ کتابت طباعت اور کاغذ اور ترتیب کے
...اظ سے یہ سالنامہ ساقی اور ادب لطیف سے بہت پیچھے ہے
...س کے صفحات کی تعداد ۲۰۶ ہے لیکن درمیان میں دواؤں وغیرہ
...متعدد اشتہار بھی شریک ہیں۔ جن میں سے ایک دو ایسے بھی ہیں
...ن کو قطعاً شریک نہ کرنا چاہیے تھا۔

...ہیل افسانہ نمبر۔ رسالہ سہیل گیا کا خاص نمبر ہے۔ جو افسانوں کے لئے وقف کر دیا گیا ہے اور ماہ اکتوبر ۱۹۴۰ء میں شائع ہوا اس میں چند اصحاب کی تصویریں بھی شریک ہیں اور متعدد اچھے افسانوں کے علاوہ فن افسانہ سے متعلق معلوماتی اور تنقیدی مضامین بھی درج ہیں یہ ایک کامیاب کوشش ہے اور اس کے بعض افسانے اور نظمیں اردو ادب میں اضافہ سمجھے جا سکتے ہیں۔

ہمایوں لاہور۔ یہ ۱۹۴۱ء کا سالگرہ نمبر ہے جو صرف ۲۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس سالنامے میں صرف میاں بشیر احمد ایڈیٹر کا مضمون اردو ۱۹۴۰ء میں اتنا اہم اور پر از معلومات ہے کہ بجائے خود ایک کتاب معلوم ہوتا ہے۔ اس مضمون کو اگر اور تفصیل کے ساتھ لکھا جاتا تو صرف یہی ایک موضوع ایسا تھا جو پورے سالنامے کے لئے کافی ہوتا۔ لیکن یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ ہمایوں کے سالگرہ نمبر میں جو دوسرے مضامین نظم و نثر شامل ہیں وہ کوئی کم درجہ کے ہیں پورا پرچہ خاص توجہ اور سلیقہ کے ساتھ مرتب کیا گیا ہے۔ اگر دوسرے رسالوں کے مدیر صاحبان بھی اسی طرح ہر سال اپنے سالناموں میں گزشتہ سال کی اردو خدمات کا جائزہ پیش کرتے رہیں اور اپنے اپنے نقطہ نظر سے دوران سال کی کاوشوں پر تبصرہ کریں تو اردو سے متعلق ہر سال تعمیری مواد جمع ہوتا رہے گا۔

بشیر احمد صاحب کی اس قابلِ تقلید پیش قدمی کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔

اطلاعیں

اردو لائبریری نیا سنسار (کتاب گھر) بانکی پور پٹنہ کی طرف سے ایک زبردست ادبی اسکیم تیار کی گئی ہے۔ اِس قسم کی کوششوں کی اردو کو بڑی ضرورت ہے تاکہ ادب کا ذوق عام ہو اور کم دام میں اچھی کتابیں فراہم ہو سکیں۔ اِس اسکیم کی تفصیل یہ ہے :-

۱- اِس سیریز میں کم سے کم ایک کتاب ہر مہینے شایع ہوگی۔

۲- ہر کتاب کم سے کم (۹۶) صفحوں کی ہوگی۔

۳- ہر کتاب کی قیمت آٹھ آنے ہوگی۔

۴- کتابیں ادبی، تنقیدی، نفسیاتی، معاشرتی، معاشیاتی اور سیاسی موضوعات پر ہوں گی۔

۵- ہر کتاب مختصر، مکمل، مستند اور عام فہم ہوگی۔

۶- سردست ذیل کے موضوعات پر کتابیں تیار ہیں :-

اردو افسانہ نگاری، اردو ادب، نئے زاویہ نگاہ سے، نفسیاتی خاکے، میکسم گورکی کی کہانیاں، سیاسی نظریے، ریبہ، ایک بنگالی ناول۔

مجلس احیاء خوش نویسی اِس نام سے حیدرآباد میں ایک انجمن قائم ہوئی ہے جس کے صدر نواب بکر یار جنگ بہادر معتمد میر لطیف علی صاحب اور اراکین نواب بہادر یار جنگ بہادر، ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور، سید احمد محی الدین صاحب ایڈیٹر رہبر اور خواجہ محمد احمد صاحب ہیں۔ اِس مجلس کی خواہش ہے کہ فن خوش نویسی کو از سر نو نمایاں کیا جائے چنانچہ فی الحال ایک کل ہند مقابلہ خوش نویسی مقرر کیا گیا ہے جس میں ماہرین فن سے بہترین نمونے طلب کر کے ان نمونوں کے لئے جو مقابلۃً سب سے بہتر ثابت ہوں انعامات دئے جائیں گے تاکہ اِس فن کی جانب دوسروں کو رغبت پیدا ہو۔ اِس غرض کے لئے فی الحال چھ سو (۶۰۰) روپے کے انعامات منظور کئے گئے ہیں جو حسب ذیل نمونہ ہائے خطاطی کے لئے مقابلہ کنندگان کو دئے جائیں گے۔

(۱) خطِ نسخ پہلا انعام (۱۰۰) ایک سو روپے، دوسرا انعام (۵۰) پچاس روپے (۲) خطِ نستعلیق۔ پہلا انعام (۱۰۰) ایک سو روپے دوسرا انعام (۵۰) پچاس روپے۔ (۳) خطِ کوفی۔ پہلا انعام ایک سو روپے، دوسرا انعام، پچاس روپے۔ (۴) طغرا پہلا انعام 〃 〃 〃 〃 〃 〃 مزید معلومات معتمد حسینی محلہ مکان مرزا حیدر حسین بیگ صاحب حیدرآباد سے مل سکتی ہیں۔

مرکز انسداد بیکاری غالب صاحب حیدرآبادی نے گول بنگلہ حیدرآباد میں ایک مرکز قائم کیا ہے جہاں ہر قسم کے ملازم (تعلیم یافتہ وغیر تعلیم یافتہ فن داں وغیر فن داں) اندرون تین یوم فراہم کر دئے جاتے ہیں۔ جو لوگ ملازمت چاہتے ہیں یا جن اصحاب کو ملازمین کی ضرورت ہے وہ اس پتے پر مراسلت کریں۔ یہ مرکز کامیاب ہو سکتا ہے اگر دونوں قسم کے ضرورتمند اصحاب اس کے ساتھ تعاون کریں۔

افتتاحیہ شاخ بلارم

۵ر فروری کو صدر بازار بلارم میں ادارہ کی شاخ کا افتتاح کرتے ہوئے پروفیسر سروری صاحب نے حسب ذیل تقریر فرمائی ۔

سب سے پہلے میں اس مایوسی میں، آپ کے ساتھ شریک ہونے کا اظہار کرتا ہوں جو اس وقت ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور کی ہر دلعزیز شخصیت کی بجائے ایک گم نام شخص کو اپنے سامنے دیکھ کر، آپ کے دلوں میں پیدا ہوئی ہوگی ۔ ڈاکٹر صاحب ایک اور اہم علمی خدمت کے سلسلے میں، شہر سے باہر گئے ہوئے ہیں ۔ اسی لئے ادارۂ ادبیات اردو کی شاخ کے افتتاح سے متعلق خدمت مجھ کو انجام دینی پڑ رہی ہے ۔

آپ میں سے اکثر حضرات واقف ہوں گے کہ ادارۂ ادبیات اُردو دس سال سے حیدرآباد میں، نہایت خاموشی کے ساتھ، اردو زبان اور ادب کی خدمت انجام دے رہا ہے ۔ اور اس نے اب تک ستر کے قریب کتابیں مختلف علوم و فنون کی شایع کی ہیں جن میں سے بعض، اردو زبان کی نہایت اہم کتابوں میں شمار ہونے لگی ہیں ۔ اس کے خدمت گذاروں کا حلقہ وسیع ہوتا جا رہا ہے ۔ اور ریاست کے کئی اضلاع میں اس کی شاخیں قایم ہو چکی ہیں ۔ اس کا کام کئی شعبوں پر تقسیم ہے، جن میں سے شعبۂ زبان، شعبۂ تاریخ دکن، شعبۂ شعرا و مصنفین دکن شعبۂ تنقید، شعبۂ اطفال، شعبۂ طلبہ، شعبۂ خواتین اور شعبۂ اردو امتحانات نے اب تک نمایاں کام انجام دیئے ہیں ۔ ان شعبوں کی مختلف مجلسوں میں آپ کو ملک بھر کے بہترین علمی خدمت گذاروں کے نام نظر آئیں گے جو مختلف علمی کام انجام دے رہے ہیں ۔

ادارہ کا قیام اور اس کی ترقی در اصل، ڈاکٹر زور کی ان تھک محنت کا نتیجہ ہے ۔ قیام یورپ سے واپسی کے بعد ڈاکٹر صاحب نے محسوس کیا کہ حیدرآباد میں مصنفین اور مولفین کے لئے ایک ایسے مرکز کی شدید ضرورت ہے، جو نہ صرف ان کی اچھی اچھی کتابوں کو شایع کرے، بلکہ بضرورت ان کے کام میں مشورے بھی دے سکے اور ان کے باہمی ربط اور تبادلۂ خیال کے لئے مرکز فراہم کرے، اُردو کے چند پُر خلوص خدمت گذار فوراً اُن کے ساتھ شامل ہو گئے اور اپنے عطیوں سے، کام کے آغاز کا موقع فراہم کر دیا آج نہ صرف حیدرآباد میں ادارہ کو مرکزی حیثیت حاصل ہے، بلکہ ہندوستان کے طول و عرض میں، اس کے کام کی شہرت ہے اور اس کی کتابیں قدر کی نگاہوں سے دیکھی جا رہی ہیں ۔

ادارہ کو یہ فخر حاصل ہے کہ حضرت والاشان اعظم جاہ بہادر شہزادۂ برار و ولی عہد سلطنت آصفیہ، اس کے سرپرست اعلیٰ اور رائٹ آنریبل سر اکبر حیدر نواز جنگ بہادر صدر اعظم دولت آصفیہ اور راجہ شام راج بہادر وغیرہ اس کے سرپرست اور نواب مہدی یار جنگ بہادر صدر المہام سیاسیات اس کے صدر ہیں ۔

ادارہ کے ماہوار آرگن یعنے رسالہ "سب رس" کو آپ حضرات پڑھ چکے ہوں گے، یہ نہ صرف حیدرآباد کا بہترین رسالہ ہے بلکہ ہندوستان بھر میں اردو کے بہترین اور مقبول رسالوں میں شمار ہو رہا ہے ۔ اس کے علاوہ، ایک رسالہ، بچوں کے لئے "بچوں کا سب رس" بھی جاری ہے ۔

ادارہ میں اردو زبان کی تمام مطبوعات فراہم کر کے ایک مرکزی کتب خانہ بھی قایم کیا گیا ہے ۔ جو کتب خانۂ آصفیہ، اور کتب خانۂ عالی جناب نواب سالار جنگ بہادر کو چھوڑ کر حیدرآباد میں اردو کا سب سے وسیع کتب خانہ ہے، جس میں ہر علم کی مطبوعات اور مخطوطات کی اتنی تعداد موجود ہے [illegible]

تاریخ، تمدن، ادبی ارتقا اور اردو زبان کے عام مسائل پر
تحقیق کرنے والوں کے لئے کافی گنجایش موجود ہے، چنانچہ
حیدرآباد سے باہر کی جامعات سے علماء آتے اور اس کتب خانے
سے استفادہ کرتے رہتے ہیں ۔ ابھی جامعہ بمبئی کے ریسرچ اسکالر
مسٹر میستری یہاں آکر استفادہ کرگئے ہیں ۔

ادارہ کی شاخیں اس وقت گلبرگہ، کلیانی، جالنہ،
محبوب نگر، کشتگی وغیرہ میں قایم ہیں اور اردو کی نشر و اشاعت
میں نہایت قابل قدر کام انجام دے رہی ہیں ۔

ادارہ کے اردو امتحانات یعنے سند اردو دانی، اردو عالم
اور اردو فاضل، خوش نویسی اور خطاطی و کتابت، حیدرآباد کے
لئے ایک نعمت ثابت ہوئے ہیں۔ ہم میں بہت سے ایسے اصحاب
اور خواتین ہیں جو کسی مدرسہ یا کالج میں شریک ہو کر تعلیم حاصل نہیں
کرسکتے اور اسی لئے، آئندہ ذہنی اور علمی ترقی کے موقعوں سے
باز رہ گئے ہیں ان کے لئے ادارہ نے تین مدارج کے امتحانات مقرر
کئے ہیں، ان امتحانات کو ریاست اور بیرون ریاست میں جو
مقبولیت حاصل ہوئی اس کا اندازہ اس واقعہ سے ہوسکے گا کہ
پہلے ہی سال امتحانات میں تین سو سے زیادہ امیدوار شریک ہوئے
بمبئی میں پروفیسر نجیب اشرف ندوی، پونا میں ڈاکٹر عبداللہ
چغتائی اور مدراس کے جامعہ دارالسلام عمرآباد میں ان امتحانات
کی ترویج کی کوشش کی جارہی ہے ۔

ادارہ کی شاخ قایم کرنے سے، دراصل زیادہ سے
زیادہ علمی خدمت گذاروں کو ادارہ کی علمی برادری میں شریک
کرنا مقصود ہے ۔ اس کے قواعد و ضوابط، آپ حضرات مطالعہ
فرماچکے ہوں گے۔ ان سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ وہ ادارہ کے
اغراض و مقاصد یعنے اردو مطالعہ خانے اور کتب خانے قایم کرنا، بالغوں
کے لئے تعلیم کا انتظام کرنا اور اردو امتحانات کے لئے امیدوار
کو تیار کرنا، مولفین اور مصنفین کی مشوروں اور دوسرے طریقوں سے
امداد کرنا، اردو زبان کی خدمت اور صحیح ادبی اور علمی ذوق کو
نشو و نما دینا ۔

ــــ ان تمام اغراض کی تکمیل میں ادارے سے متعلق تمام اصحاب
ہمیشہ آپ کی مدد اور تعاون کے لئے ہر وقت تیار ہیں۔ ایک فوری
فائدہ آپ کو یہ حاصل ہے کہ ادارہ کی تمام مطبوعات آپ کے کتب خانے
کے لئے نصف قیمت پر مل جائیں گی ۔

میں اس ریاست گیر اور جو خدا نے چاہا تو ہندوستان گیر علمی
برادری میں آپ کی شرکت کے لئے آپ کو مبارک باد دیتا ہوں اور
اس گرد و نواح کے لئے آپ کی شاخ کو فال نیک سمجھتا ہوں مجھے
توقع ہے کہ اس علمی مشعل سے جسے چند خاموش کارگذاروں نے
شہر حیدرآباد میں روشن کیا ہے، آپ ایک برقی قمقمہ روشن کریں گے
اور اس کی ضیا سے اطراف و اکناف کو منور کردیں گے ۔

بلارم کی شاخ کے معتمد مولوی شیخ عبداللہ صاحب منتخب ہوئے
ہیں اور سرگرمی کے ساتھ ادارہ کا کام انجام دے رہے ہیں ۔

عبدالقادر سروری

کپل میں ادارہ کی شاخ

۲۳ فروری کو مولوی سرفراز علی صاحب بی اے ڈپ ایڈ پرنسپل مدرسہ
کپل کی توجہ سے ایک جلسہ عام منعقد ہوا جس میں ادارہ
کی شاخ قایم کرنے کی تحریک منظور ہوئی اور حسب ذیل
عہدہ داروں کا انتخاب عمل میں آیا :-

معتمد مولوی محمد حسین صاحب۔ شریک معتمد مولوی محمد عبدالرزاق صاحب۔ منتظم
مولوی امین الدین صاحب۔ قاضی کپل اور اراکین میر سعادت علی صاحب کپل
سید امین الدین حسینی صاحب کپل۔ سراج الحسن صاحب قادری تاجر عبدالرشید صاحب
سید اسمٰعیل صاحب علوی، بشیر الدین صاحب۔ شرف الدین صاحب

سید نبی اللہ صاحب۔ عبدالسبحان صاحب۔ پنڈت بشنو پنت۔

اس شاخ نے اُردو عالم اور اُردو دانی کی جماعتیں کھول دی ہیں اور ان جماعتوں میں تعلیم پانے والوں میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے۔ اس وقت تک تیئیس اُردو عالم اور چالیس اُردو دانی کی تعلیم حاصل کر رہے ہیں اور توقع ہے کہ اس سال پیل میں ایک زنانہ مرکز امتحان بھی قایم کرنا پڑے گا۔

دوسری نئی شاخیں

عثمان آباد اور رخانہ پور میں بھی شاخیں قایم ہوئی ہیں جن کی تفصیل آئندہ شمارہ میں درج رہے گی۔

پربھنی میں اُردو امتحانات کا جلسۂ تقسیم اسناد

۲۴ جنوری ۱۹۴۴ء کو ادارہ ادبیات اُردو شاخ پربھنی کے زیر اہتمام ایک جلسۂ عام مولوی ولی حسن صاحب اول تعلقدار ضلع پربھنی کی صدارت میں مارکیٹ پویلین ہال میں منعقد ہوا جس میں جملہ مقامی عہدہ دار مثلاً راجہ ڈھونڈے راج بہادر ناظم عدالت، شرف الدین احمد صاحب منصف، حبیب الرحمن صاحب زائد ناظم عدالت، شیو کمار لال صاحب مہتمم پولیس، ابرار حسین صاحب صدر مدرس، عارف الدین حسن صاحب مہتمم آبکاری، احمد عبدالحی صاحب مددگار مہتمم پربھنی اور دیگر اصحاب نے شرکت کی، احمد عبدالحی صاحب کی تحریک اور معتمد شاخ حمید اللہ خاں شیدا کی تائید سے صدر جلسہ نے کرسی صدارت کو زینت بخشی گل پوشی کے بعد معتمد شاخ پربھنی نے اسناد، تمغے اور تین عدد سر گذشت ادارہ جناب صدر کی خدمت میں پیش کئے جس کی ایک ایک کاپی راجہ ڈھونڈے راج بہادر اور سید عارف الدین حسن صاحب کو جناب صدر نے منجانب صدر ادارہ عطا کی اور کامیاب طلبہ اُردو عالم کو اسناد و تمغہ تقسیم کرنے کے بعد نہایت بصیرت افروز تقریر فرمائی، راجہ ڈھونڈے راج بہادر ناظم عدالت نے طلبہ سے خطاب کرتے ہوئے نہایت دلچسپ تقریر کی اور کامیاب طلبہ سے کہا کہ کامیابی کی اسناد لینے کے بعد تمہارا کام ختم نہیں ہوا بلکہ اب علمی کام ختم ہوا اور عملی کام باقی ہے جس کا پورا کرنا تمہارا فرض ہے۔ میں امید کرتا ہوں کہ تم لوگ اپنے بعد کے آنے والوں کے لئے راہبر ثابت ہوں گے۔ اس کے بعد مولوی ابرار حسین صاحب نے بھی نہایت دلچسپ تقریر فرمائی جس میں موصوف نے طالب علم اور متعلم کے فرق کو نہایت وضاحت سے بیان فرمایا اور طلبہ کو نصیحت کی معتمد شاخ نے یہ تحریک پیش کی کہ ادارۂ ادبیات اُردو شاخ پربھنی کے نائب صدر مولوی جلال الدین صاحب اشک کا تبادلہ ہو جانے کی وجہ سے اس جگہ پر کسی کا انتخاب ابھی تک عمل میں نہیں آیا جس کے لئے مولوی ابرار حسین صاحب بہ اتفاق آرا نائب صدر منتخب ہوئے۔ یہ معلوم کرکے بڑی مسرت ہوئی کہ موصوف نے نہایت سرگرمی سے حصہ لینے کا وعدہ فرمایا ہے۔ ادارۂ ادبیات اُردو شاخ پربھنی کے خاموش اور سرگرم رکن مولوی عبدالواحد صاحب ایم ایس سی مددگار مدرسہ فوقانیہ درس و تدریس میں سرگرمی سے حصہ لے رہے ہیں اور وعدہ فرمایا ہے کہ معلومات سائنس اُردو فاضل کو بھی پڑھائیں گے جس کے لئے ہم موصوف کے ممنون ہیں۔

مولوی ابرار حسین صاحب کی تقریر کے بعد حمید اللہ خاں شیدا معتمد نے روئداد ادارہ مرتبہ جناب علی اکبر صاحب صدر امتحانات شعبہ پڑھ کر سنائی جس سے حاضرین ادارے کی کارگذاریوں سے واقف ہوئے۔ آخر میں ادارے کی قابل فخر ہستی مولوی سید عارف الدین حسن صاحب نے صدر جلسہ کے توسط سے یہ اعلان فرمایا کہ سال [illegible] کے ہونے والے امتحان اُردو فاضل، اردو عالم اور اُردو دانی میں پربھنی سے اول آنے والے طالب علموں کو ایک ایک مڈل عطا کیا جائے گا جو "عطیہ عارف الدین حسن" ہوگا شکریہ کے بعد آخر میں مولوی میر احمد علی شاہ صاحب [illegible] نے دعا فرمائی کہ خداوند کریم ہمارے بادشاہ ذی [illegible]

کو مزید اقبال میں ترقی عطا کرے جن کی بدولت آج اردو ترقی کے اعلیٰ سے اعلیٰ زینے طے کر رہی ہے -

پربھنی میں اُردو کی نمائش

عرس کے موقع پر پربھنی میں جو نمائش منعقد ہوئی تھی اس میں نہایت نمایاں جگہ پر ادارۂ ادبیات اُردو شاخ پربھنی کا اسٹال اعلیٰ پیمانے پر سجایا گیا تھا اس کے لئے آٹھ یوم کی مسلسل کوششوں سے چند چارٹ اور تصاویر وغیرہ بنائے گئے تھے - پربلی سے اشرف الدین صاحب فیضی بھی آگئے تھے اور انھوں نے کام میں بڑی مدد کی - اُردو کے قدیم شعرا٬ جدید شعرا - اُردو کے بہترین نثر نگار - اُردو جرائد کے ایڈیٹروں کی تصویریں - ادارہ ادبیات اُردو کے تمام شعبوں کو تقسیم کیا جا کر تفصیل کار اور کارکنانِ ادارہ کی سرگرمی کو زیادہ سے زیادہ عام کرنے کی کوشش کی گئی - ہندستان کے نقشے میں اردو کے ابتدائی دَور اور مرکزوں کو بھی تبلایا گیا تھا - دکن میں اردو کی ترقی کے سلسلے میں ادارے نے جو خدمات انجام دی ہیں ان کی تفصیل وغیرہ کے چارٹ بنائے گئے تھے - بہر حال اسٹال نہایت خوبصورت سجایا گیا تھا جس کو تقریباً پانچ ہزار لوگوں نے دیکھا اور نہایت اچھے تاثرات لے گئے - ادارے کا لٹریچر بھی تقسیم کیا گیا - عوام کو اردو امتحانات میں شرکت کرنے کی طرف توجہ دلائی گئی - امید ہے کہ اس مرتبہ زیادہ سے زیادہ طلبہ شریک ہوں گے - ہماری یہ کوشش بہت کامیاب رہی چنانچہ اسٹال کو دیکھ کر کمیٹی نمائش نے ایک نقرئی مڈل اور ایک سند عطا کی جس کو فریم کرکے ادارے کے مطالعہ گھر میں لگا دیا گیا ہے - اس نمائش کے موقعہ پر اسٹال وغیرہ کی ترتیب میں مولوی عارف الدین حسن صاحب نے بڑی سرگرمی سے حصہ لیا اور مولوی محمد فاروق صاحب دوم تعلقدار نے بھی مدد کی جو لائق شکریہ ہیں - دیگر اراکین میں خاص طور پر [illegible] صاحب جلالی٬ مرزا عزیز بیگ صاحب٬ ناصر بن حبیب اور اشرف الدین صاحب فیضی نے خاص طور پر حصہ لیا - اس خصوص میں ہم عبد السلام صاحب کے شکرگذار ہیں کہ موصوف نے اپنی قیمتی تصاویر اور کتب خانہ وغیرہ عطا کئے -

ادارہ کے نئے رکن

حسب ذیل خواتین و حضرات نے ادارہ کی رکنیت قبول فرما کر اپنی اردو دوستی کا ثبوت دیا ہے جس کے لئے ان کا شکریہ ادا کیا جاتا ہے -

رکن دوامی - محل مرزا مہدی خاں کوکب مرحوم

رکن الف - بلقیس بانو صاحبہ٬ بشیر النساء بیگم صاحبہ٬ اعظم النساء بیگم صاحبہ٬ عزت بیگم صاحبہ٬ رابعہ بیگم صاحبہ٬ محمد اکرام الدین صاحب تحصیل بلغواپ سید میر صاحب (دستور آباد) الحاج قاسم خاں صاحب (خانہ پور)

رکن ب - جیلانی بیگم صاحبہ٬ وحیدہ بانو صاحبہ -

رکن شعبۂ طلبہ - اکرام حسین صاحب (خانہ پور) محمد قطب الدین صاحب (خانہ پور) عزیز احمد صاحب (خانہ پور) المحمود علی صاحب (خیرت آباد) عبد المجید قریشی صاحب (نظام شاہی) مظفر علی خاں صاحب (خیرت آباد) عارف علی خاں صاحب (خیرت آباد) خدا بخش صاحب٬ عبد الرزاق صاحب٬ رشید احمد صاحب٬ محمد مزمل حسن صاحب٬ مجید احمد صاحب فاروقی٬ حسن الدین علی صاحب٬ برہان الدین صاحب٬ محمد معین الدین صاحب -

اِدارہ کا معاینہ

یوں تو ایسا کوئی دن نہیں گذرتا جب کہ ادارہ کے معاینہ اور استفادہ کے لئے کوئی نہ کوئی صاحب تشریف نہ لاتے ہوں٬ لیکن گذشتہ دو تین ماہ میں ہز اکسلنسی سر اکبر حیدری٬ آنریبل راجہ دھرم کرن بہادر اور آنریبل سید عبد العزیز کے علاوہ مختلف علم دوست اصحاب مثلاً غلام احمد خاں صاحب٬ ہاشم علی خاں صاحب٬ سید محی الدین صاحب٬ سید تقی الدین صاحب٬ احمد محی الدین صاحب انصاری اور انوار اللہ صاحب وغیرہ نے ادارہ کے کتب خانے اور کام کا دلچسپی سے معاینہ کیا -

ادارے کے شعبے

ادارے کے مختلف شعبے برابر سرگرم کار ہیں جن میں چند کی روئدادیں ذیل میں درج کی جاتی ہیں۔

شعبۂ زبان

اس اثنا میں اس شعبہ کے دو جلسے ہوئے جن میں سے صرف ایک کی روئداد یہاں درج ہے۔ یہ جلسہ ۱۳ر دسمبر ۱۹۴۹ء کو منعقد ہوا

حاضرین:۔ مولوی قاضی عبدالغفار صاحب، ڈاکٹر رضی الدین صاحب صدیقی، ڈاکٹر جعفر حسن صاحب۔ ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور مولوی سید محمد صاحب، مولوی عبدالقادر صاحب سروری پنڈت دتشی دھر صاحب۔ ڈاکٹر محمد راحت اللہ خاں صاحب

سابقہ جلسے کی روئداد پڑھی گئی اور اراکین نے اس کی توثیق فرمائی۔

(۱) حسب ذیل امور بغرض تصفیہ پیش ہوئے:۔

۱۔ دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ سرکار عالی کی مراسلت اراکین کے روبرو پیش کی گئی۔ دارالترجمہ کی جانب سے ادارۂ ادبیات اردو کو چند کتابیں بطور تحفہ اس شرط کے ساتھ ارسال کی گئیں کہ ان پر تنقید نہ کی جائے۔ اسی سلسلے میں بالاتفاق طے پایا کہ یہ شعبہ اپنا فرض سمجھتا ہے کہ وہ ارباب متعلقہ کو یہ بتادے کہ اس کے حق تنقید پر اس طرح کی پابندی کسی صورت میں گوارا نہیں کی جاسکتی اور یہ امر افسوسناک ہے کہ حکام متعلقہ نے ایسی شرط قایم کرنے کو مناسب خیال فرمایا۔ یہ شعبہ بہرحال ضروری سمجھتا ہے کہ دارالترجمہ کی جن کتابوں پر ضرورت ہو آزادانہ تنقید کرے۔

(۲) مدرسہ کور و کرو کنگ، کے نام کی تبدیلی کے سلسلے میں بالاتفاق طے پایا کہ جناب ناظم صاحب تعلیمات کی مراسلت کے حوالہ و نقل کے ساتھ محکمہ سرکار کو اس طرف توجہ دلائی جائے۔

(۳) دکھنی محاوروں کہاوتوں وغیرہ کے سلسلے میں محترمہ جہاں بانو بیگم صاحبہ و محترمہ احمد النساء بیگم صاحبہ ثریا جبیں کی مرسلہ فہرستیں مولوی قاضی عبدالغفار صاحب کے سپرد کی گئیں تاکہ عام محاوروں سے دکھنی محاوروں کو علحدہ کرلیا جائے اور طے پایا کہ بعد ازاں یہ فہرست بغرض تشریح مولوی ضیاء الدین احمد صاحب انصاری کے پاس روانہ کی جائے۔

(۴) شعبہ کی جانب سے اس کا انتظام کیا گیا تھا کہ تحریک استحکام و وقار زبان سرکاری بدفاتر سرکاری کے سلسلے میں رکن شعبہ مولوی سید محمد صاحب انجمن طیلسانین کے مشترکہ وفد میں نمائندگی فرمائیں۔ اراکین نے اس انتظام کی توثیق فرمائی۔

(۵) حسب قرارداد نمبر ۱۲ اجلاس منعقدہ ۸ر امرداد ۱۳۵۹ف صحافتی الفاظ اور اصطلاحوں کے اردو ترجموں میں یکسانیت پیدا کرنے اور ان کو معیاری بنانے کے لئے طے پایا کہ ایک مجلس مقرر کی جائے جو مندرجۂ ذیل اراکین پر مشتمل ہوگی:۔

(۱) مولوی قاضی عبدالغفار صاحب (۲) مولوی عبدالقادر صاحب سروری (۳) ڈاکٹر یوسف حسین خاں صاحب (۴) مولوی ضیاء الدین احمد صاحب انصاری (۵) پنڈت دتشی دھر صاحب

اس مجلس کے اجلاس ہر فصلی ماہ کے دوسرے اور چوتھے جمعہ کو شام کے ساڑھے چار بجے دفتر روزنامۂ پیام میں منعقد ہوا کریں گے۔

(۶) بالاتفاق حسب ذیل قراردادیں منظور کی گئیں اور طے پایا کہ مقامی اخبارات میں ان کی اشاعت کا انتظام کیا جائے:۔

(۱) اردو کی ہمہ جہتی ترقی کے لئے [illegible]

لسانیات کے مسلمہ اصول کے مطابق غیر زبانوں کے جو
الفاظ اردو میں داخل ہو گئے ہیں اور جن کا تلفظ بھی
اُردو زبان کی فطرت اور اُردو دانوں کی کثرت استعمال
سے بدل گیا ہے ان کو مروجہ طریقہ پر لکھا اور بولا جائے
نہ کہ اصل زبان کے تلفظ کے مطابق مثلاً ستمبر اور دسمبر
نہ کہ سپٹمبر اور ڈسمبر۔ ادارہ کا یہ شعبہ تمام انجمنوں اداروں
اخباروں اور دفتروں سے یہ اپیل کرتا ہے کہ اردو میں
غیر زبانوں کے مروجہ لفظوں کو نہ صرف اردو صرف و نحو کے
مطابق استعمال کریں بلکہ ان کا تلفظ بھی اردو طریقہ سے کریں
(۲) اردو کتابوں کی افادیت بڑھانے کے لئے بہت
ضروری ہے کہ ہر کتاب کے آخر میں مضمون واری اور
نام واری اشاریہ (انڈکس) شایع کیا جائے تاکہ
حوالوں کی تلاش اور مطلوبہ موضوع سے متعلقہ عبارت
معلوم کرنے میں سہولت ہو۔ یہ شعبہ تمام ناشروں سے
عام طور پر اور جامعہ عثمانیہ، انجمن ترقی اردو، ہندوستانی
اکاڈیمی، دارالمصنفین اور جامعہ ملیہ کے ارباب سے
خاص طور پر اپیل کرتا ہے کہ آئندہ اپنی ہر کتاب کے
ساتھ اشاریہ (انڈکس) ضرور شایع کریں۔

شعبۂ نسواں

شعبۂ نسواں کا سولھواں اجلاس بمقام جوبلی ہال بتاریخ ۱۹ جنوری ۱۹۴۱ء شام کے
ساڑھے پانچ بجے منعقد ہوا اور ذیل کی خواتین نے شرکت کی:—
(۱) رابعہ بیگم صاحبہ (۲) جہاں بانو بیگم صاحبہ (۳) بشیر النساء بیگم صاحبہ
(۴) معتمد شعبہ۔

یہ دیکھ کر افسوس ہوا کہ اکثر خواتین نے باوجود اعلان اور
[illegible] پرچۂ دستخط پر اپنے نہ آسکنے کی اطلاع نہ دی۔ ہم
[illegible]ت کرتے ہیں کہ اتنی تکلیف وہ ہماری خاطر گوارا
کریں تاکہ دوسروں کو زحمت انتظار نہ ہو۔ اگر انھیں فاصلے پر
اعتراض ہے تو کوئی ایسی جگہ مقرر کی جائے جہاں انھیں آنے
میں سہولت ہو۔

اجلاس میں جن امور پر غور کیا گیا ان میں سب سے زیادہ
اہم مدرسۂ بالغات واقع اڈک میٹ کے قیام کا سوال تھا
تصدق فاطمہ بیگم کی غیر موجودگی میں اس کے بند کرنے کا سوال
ملتوی رکھا گیا اور یہ تجویز ہوئی کہ تا وقتیکہ دوسرا مدرسہ کسی محلہ
میں قایم نہ کرلیا جائے یہ مدرسہ بدستور قایم رہے۔
طالبات کی کمی اگر محسوس ہو تو دوبارہ اعلان کروایا جائے۔
مسز باقر علی خاں سے استدعا کی جائے کہ وہ وقتاً فوقتاً مدرسہ
کو اپنی بیش بہا رائے سے مستفید ہونے کا موقع دیں۔
مسز حسن لطیف سے دریافت کیا جائے کہ آیا وہ
سوزن کاری سکھانے میں ہماری مدد کریں گی یا نہیں۔ اور
ان کی آمادگی پر طالبات کو ہفتہ میں ایک بار انہی کے گھر بھجوانے
کا انتظام کیا جائے۔

۲۔ شعبے نے سردست ایک لڑکیوں کا مدرسہ بھی
اڈک میٹ میں قائم کر رکھا ہے، جس کی نگرانی بھی رابعہ بیگم صاحبہ
کے ذمہ ہے۔ اس کے لئے قبل ازیں امداد کی درخواست
صدر مہتمم کو دی گئی تھی۔

۳۔ اراکین کی رائے ہوئی کہ اضلاع پر شعبہ کی شاخوں
کا قیام زیادہ کارآمد ثابت ہوگا چنانچہ نرمل، ناندیڑ، محبوب نگر
ورنگل وغیرہ میں ان کے قیام کے متعلق تجویز عمل میں آئی۔
بشیر النساء بیگم صاحبہ نے نلگنڈہ میں ایک شاخ قائم کرنے
کی اور جہاں بانو بیگم صاحبہ نے کلکتہ میں قایم کرنے کی رائے
اور اس کے متعلق کوشش کرنے کا ذمہ لے لیا۔
۴۔ یہ طے پایا کہ بشیر النساء بیگم صاحبہ کا کلام شعبہ

...ت سے شائع کرنے کا انتظام کیا جائے اور بشیر النساء بیگم صاحبہ سے استدعا کی گئی کہ وہ اپنا کلام چھپوانے کی ہمیں اجازت دیں۔

شعبۂ شعراء و مصنفین دکن

۱۷؍ جنوری ۱۹۴۱ء کو اس شعبہ کا ایک اجلاس منعقد ہوا جس میں مولوی سید محمد صاحب معتمد شعبہ کے علاوہ مولوی نصیر الدین صاحب ہاشمی اور ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور نے شرکت کی۔ تاریخ ادب عربی مرتبۂ مولوی ابو الفضل صاحب ... کی نسبت طے پایا کہ یہ کتاب مولف کو نظر ثانی کے لئے دی جائے تاکہ وہ اس کو مختصر کریں اور مصر کی مطبوعہ تاریخ مولفہ کے طور پر بی۔ اے کے نصابی معیار کے مطابق مرتب کریں۔

صاحبزادہ میر محمد علی خاں میکش کے مجموعۂ نظم "کھوئے ہوؤں کی جستجو" کی اشاعت کی اس شرط کے ساتھ سفارش کی گئی کہ شاعر اپنی ان تاریخی نظموں پر مختصر سے نوٹ تحریر کردیں تاکہ ان کی افادیت اور لطف اندوزی میں اضافہ ہو۔

مرقع نثر کی ترتیب سے متعلق تبادلۂ خیال کیا گیا اور طے پایا کہ اس کی تفصیل آئندہ مجلس میں پیش ہو۔

مولوی علی اختر صاحب کے مجموعۂ کلام "انوار" کو جلد شائع کرنے کی طرف توجہ دلائی گئی۔

دکنی آثار کا معائنہ

ادارہ کی طرف سے ہر چھٹی یا فرصت کے موقع پر ان مقامات کا معائنہ کیا جاتا ہے جو حیدرآباد کے اطراف و اکناف تاریخی یا ادبی نقطۂ نظر سے قابل معائنہ ہیں چنانچہ اس عرصے میں بھی ... [illegible] میر محمد مومن کی بنائی ہوئی ... [illegible]

مولوی میر عباس علی صاحب (نبیرۂ میر محمد مومن) اور مولوی صدیق ... صاحب نے دو بار سیدآباد (موجودہ سیدآباغ) کی بستی مسجد اور سرائے کا معائنہ کیا اور مسجد میں میر محمد مومن کا لگایا ہوا جو کتبہ موجود ہے اس کے چربے لئے گئے۔ ان کی تصویریں آئندہ کسی موقع پر سب رس میں شائع کی جائیں گی۔

سیدآباد میں میر صاحب نے جو سرائے بنائی تھی وہ کسی زمانہ میں بڑی آباد ہوگی۔ کیونکہ یہ شاہی راستے پر واقع تھی۔ ۔اب بھی اس کے کچھ بچے کھچے کمرے غریبوں کے مکان بن گئے ہیں اور اس طرح سے یہ سرائے آباد ہے۔

مسجد کے عقبی حصے کی طرف اس سرائے کی جملہ کمانیں اس وقت تک محفوظ ہیں۔ حالانکہ اس کو بن کر آج تین سو چھیالیس سال کا عرصہ ہو چکا ہے۔ اس میں جملہ چھپن کمرے بنائے گئے تھے۔ عقبی حصہ کو چھوڑ کر بقیہ تینوں پہلوؤں کے وسط میں دروازے تھے۔ اور ان دروازوں کے دونوں طرف سات سات کمانیں تعمیر کی گئی تھیں۔ سرائے کے عقبی حصہ میں پتھر کی بڑی بڑی سلیں چھت سے باہر نکال کر جو خوبصورت چھجا بنایا گیا تھا اس کے اہتمام اور مضبوطی کو دیکھ کر اس بات کا بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے کہ یہ سرائے کس عمدہ پیمانے پر بنائی گئی تھی۔

سیدآباد کے معائنے کے بعد میر محمد مومن کے بنائے ہوئے ایک دوسرے گاؤں میرپیٹھ کا معائنہ کیا گیا۔ چنانچہ پہلی بار ۲؍ فروری ۱۹۴۱ء کو مولوی سید محمد صاحب ایم اے اور ڈاکٹر زور صاحب نے ظل اللہ گوڑہ (موجودہ جل اللہ گوڑہ) اور میرپیٹھ کا سفر کیا وہاں کے تالاب مسجد اور کتبہ وغیرہ کے دیکھنے کے ... [illegible] میر محمد مومن ہی کے ... [illegible] کی طرف سے تاریخی

ادارہ ادبیات اردو حیدرآباد دکن کا ماہ نامہ

زیر نگرانی
ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور
مجلس ادارت
خواجہ حمید الدین شاہد
سکینہ بیگم
عبدالحفیظ صدیقی بی ایس سی

نشان پتہ آصفیہ ۱۵۳
نشان پتہ برطانیہ M 3950
ٹیلیفون نمبر ۲۲۰۹
چندہ سالانہ چار روپے آٹھ آنے
بچوں کا سب رس ایک جلد آٹھ آنے

جلد ۴	بابت اپریل ۱۹۴۱ء	شمارہ ۴

نمبر	عنوان	مصنف	صفحہ
۱	کارلائل کی بلومین	نیلم راجہ رام (ترجمہ حفیظ صدیقی)	۳
۲	غزل	نواب معین الدولہ بہادر معین	۷
۳	مطربہ سے (نظم)	اختر ہوشیار پوری بی اے۔ ایل ایل بی	۸
۴	غزل	نواب عزیز یار جنگ بہادر عزیز	۸
۵	پھول (نظم)	پنڈت ونشی دھر	۹
۶	جدید افسانہ	عبدالقادر سروری ایم اے۔ ایل ایل بی	۱۰
۷	سماج کے دلنشیں محل میں (نظم)	سلام مچھلی شہری	۱۵
۸	فلسفی سے	مظفر الدین ظفر (عثمانیہ)	۱۶
۹	ایک گلاس پانی (افسانہ)	رشید قریشی بی اے	۱۷
۱۰	فانی	حفیظ قتیل بی اے	
۱۱	گوالن (افسانہ)	عبدالواسع عصری	۲۸
۱۲	تبسم	علی شاکر ایم اے	۳۳
۱۳	غزل	اختر رضوانی	۴۳
۱۴	کلام وحید	سکندر علی وجد [illegible]	۴۳
۱۵	مرہٹی زبان میں افسانوی لٹریچر	[illegible]	۴۴
۱۶	گل بوٹے	باغبان	۴۸
۱۷	[illegible] (نظم)	[illegible]	۵۰

نمبر	مضمون	مصنف	صفحہ
۱۸	اردو کی نئی کتابیں	مرزا سیف علی خاں	۵۱
۱۹	تنقید و تبصرہ	شعبۂ تنقید	۵۲
۲۰	افسانے بدلتا (ایک تنقیدی نظر)	مصطفیٰ کمال خاں شروانی	۵۶
۲۱	ادارہ کی خبریں	ادارہ	۵۷
۲۲	اردو امتحانات	"	۵۷
۲۳	تعلیم کا انتظام اور تقریریں	"	۵۷
۲۴	ادارے کے شعبے	"	۵۷
۲۵	شعبۂ زبان	"	۵۷
۲۶	شعبۂ زبان کی ذیلی مجلس	"	۵۸
۲۷	شعبۂ امتحانات	"	۵۸
۲۸	شعبۂ انسائیکلوپیڈیا	"	۵۹
۲۹	شعبۂ تالیف و ترجمہ	"	۵۹
۳۰	شاخیں	"	۶۰
۳۱	کتب خانہ	"	۶۱
۳۲	ادارۂ سب رس	"	۶۱
۳۳	اردو امتحانات کی تقریریں	"	
۳۴	ادارہ کی سرگذشت	"	

سب رس کے مقاصد و قواعد

(۱) یہ ادارۂ ادبیات اُردو کا ماہوار علمی و ادبی رسالہ ہے جس میں اردو زبان اور ادب کے مختلف شعبوں اور پہلوؤں پر بحث ہوگی۔

(۲) مضامین متعلقہ سیاسیات حاضرہ اور مذہبی مباحث کسی صورت میں قابلِ اشاعت متصور نہ ہوں گے۔

(۳) اردو مطبوعات پر بے لاگ تنقید کر کے اردو تصنیف و تالیف کا ذوق صحیح پیدا کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

(۴) غیر زبانوں کے شاہکار مضامین کو اردو میں منتقل کر کے اردو کے علمی و ادبی سرمایہ میں اضافہ کیا جائے گا۔

(۵) یہ رسالہ کم از کم (۶۴) صفحات اور زیادہ سے زیادہ (۹۶) صفحات پر ہر ماہ عیسوی کے پہلے ہفتے میں شائع ہوا کرے گا۔

(۶) رسالہ نہ پہنچنے کی اطلاع پندرہ تاریخ تک دفتر میں پہنچ جانی چاہیے۔

(۷) جواب طلب امور کے لئے جوابی پوسٹ کارڈ یا لفافہ آنا ضروری ہے۔

(۸) خط و کتابت کرتے وقت نمبر خریداری کا حوالہ ضرور دیا جائے۔

(۹) اشتہارات کی اجرت پیشگی لی جائے گی۔ [illegible] کے ذریعے سے وصول [illegible] کی جائے گی۔

لیڈی ڈب بٹرب (مسمی حلک ، وزیر اعظم کی والدہ)

مدعو ڈیوک بکنگھم حلک

کارلائل کی "بلومین"

حیدرآباد میں رزیڈنسی کے قریب موٹر بس کا ایک اسٹانڈ ہے جس کا نام "پتلی باؤلی" ہے کیونکہ یہاں اس نام کی ایک خوش نما باولی تھی جس میں لوگ سیڑھیوں کے ذریعے اتر سکتے تھے۔ یہ باولی جو ایک صدی سے زیادہ عرصے تک لوگوں کو فائدہ پہنچاتی رہی، اب بند کر دی گئی ہے اور آج کسی دیکھنے والے کے لئے اس سے زیادہ کوئی اہمیت نہیں رکھتی کہ شہر سے آنے والی سڑک کا ایک حصہ اسی کے نام سے موسوم ہے ایک کتبے کے مطابق اس باولی کو حیدرآباد کے مشہور رزیڈنٹ میجر کلیس کرک پٹرک نے ۱۸۰۳ء میں تعمیر کیا تھا اور یہ اس تقریب کی یادگار میں کہ اسے ایک لڑکی پیدا ہوئی تھی۔ یہ بچی بعد کو اس قدر حسین نکلی کہ خود انگریزی ادب میں اس نے اپنے لئے جگہ پیدا کر لی چنانچہ اسے کارلائل نے اپنی مشہور ناول "ریبی نی سس" میں "کٹی کرک پٹرک" اور "سارٹر رسارٹس" میں "بلو مین" کے نام سے پیش کیا ہے۔ مشہور مصنف اسکاٹ نے اس لڑکی کو ایک جگہ ان الفاظ میں یاد کیا ہے :- "وہ نصف بیگم تھی اور اس میں ایک تمثیلی انگریز عورت کا حسن بھی جھلکتا تھا" وہ کس طرح کارلائل کی دوست بن گئی اور کس طرح اس کردار نگار نے اس کی تصویر پیش کی، اس چیز کا مطالعہ آج بڑی دلچسپی رکھتا ہے اور اس کے ساتھ ہی ہمارا ذہن اس زمانے تک پہنچ جاتا ہے جب کہ ہندوستان میں ایسٹ انڈیا کمپنی کا راج تھا اور یہ وہ زمانہ ہے جب کہ اہل یورپ ہندوستان کے بڑے گھرانوں کی لڑکیوں سے آزادی کے ساتھ میل جول بڑھاتے تھے۔

خیر النساء

اٹھارویں صدی عیسوی کے آواخر میں حیدرآباد کے رزیڈنٹ میجر جیمس کلیس کرک پٹرک تھے اور یہ حضور نظام علی خاں کا عہد حکومت ہے ان کے لایق اور تجربہ کار مدار المہام ارسطو جاہ بھی خاص طور پر قابل ذکر ہیں ان دونوں کے ساتھ میجر کرک پٹرک نے بڑے اچھے تعلقات قایم کر لئے تھے چنانچہ انھوں نے اپنی آٹھ سال کی مدت ملازمت میں حیدرآباد کے ساتھ تین معاہدے بھی طے کئے۔ انہی میں ایک وہ معاہدہ بھی تھا جس کی رو سے حضور نظام نے فرانسیسی فوجی دستے کو اپنی ملازمت سے نکال دیا اور انگریزوں کے ساتھ ایک معاہدۂ اتحاد طے کیا میجر کرک پٹرک جو حشمت جنگ کے خطاب سے سرفراز کئے گئے تھے، قدیم تزک و احتشام کے ساتھ رہتے تھے اور انھوں نے خیر النسا نامی ایک مسلمان لڑکی سے شادی بھی کر لی تھی خیر النساء سید گھرانے سے تعلق رکھتی تھی اور ایک اچھے ایرانی خاندان کی لڑکی تھی اور اس کے نانا انگریزی فوجی دستے کے بخشی تھے۔ اس عہدے کی وجہ سے بہت سے انگریز اُن کے گھر آیا کرتے اور ان کی دعوتیں بھی ہوتی رہتیں۔ میجر کرک پٹرک بھی ان آنے جانے والوں میں شامل تھے اور چونکہ وہ نوجوان اور خوبرو تھے، ان کے مردانہ حسن کے چرچے گھر کی عورتوں میں بھی ہونے لگے تھے۔ جب خیر النساء نے ان کو پہلی مرتبہ اپنے نانا کے گھر میں پردے کے پیچھے سے دیکھا تو وہ ان سے محبت کرنے لگی اور ایک بڑھیا کو پیام سلام کے لئے مقرر کیا۔ کرک پٹرک نے اپنے بڑے بھائی کے نام جو خط لکھے ہیں ان میں اس امر کا تذکرہ کیا ہے کہ وہ ایک مرتبہ اپنے مکان میں تنہا بیٹھا تھا کہ ایک بڑھیا آئی اور اس سے کہنے لگی کہ ایک مرتبہ خیر النساء نے تمھیں دیکھ لیا ہے اور تم سے محبت کرنے لگی ہے بڑھیا نے اس سے یہ بھی التجا کی کہ تم اس کی درخواست کو منظور کر لو لیکن کرک پٹرک نے اسے ٹکا سا جواب دے دیا۔ بعد میں وہ ذیل

مرتبہ بھیجا آئی، اور اسی طرح واپس کر دی گئی۔

بالآخر ایک رات کو خود خیر النساء کرک پیٹرک کے پاس آئی اور اس نے بذات خود اپنی درخواست پیش کی۔ کرک پیٹرک نے اس نوجوان حسینہ سے بحث و تمحیث کا سلسلہ شروع کیا مگر آخر میں اسے ناکام ہونا پڑا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسلامی اصول کے مطابق ایک معاہدہ نکاح طے پا گیا حضور نظام نے بھی جنھوں نے اس شادی کی اجازت دی تھی اپنی طرف سے نوشہ کو بہت سے قیمتی چڑھاوے دئے اور اسے "فرزند محبت پیوند" کے خطاب سے بھی سرفراز کیا۔ لیکن اس شادی کے بعد شہر حیدرآباد میں ایک ہلچل مچ گئی اصل میں کمپنی کی حکومت کو یہ پسند نہ تھا کہ اس کے ملازم ہندستانی عورتوں کے ساتھ راہ و رسم پیدا کریں کیونکہ اسے ڈر تھا کہ کہیں یہ لوگ ہندستانیوں کے زیر اثر نہ ہو جائیں۔ حیدرآباد میں میجر کرک پیٹرک کے بہت سے دشمن بھی تھے۔ انھوں نے گورنر جنرل کے پاس یہ رپورٹ کی کہ کرک پیٹرک مداخلتوں کا مرتکب ہے۔ لیکن جب گورنر نے تحقیقات کی اور کرک پیٹرک کے خلاف جو الزامات لگائے گئے تھے انھیں بے بنیاد پایا تو اس نے کرک پیٹرک کو بحال کر دیا اور اس کی بہت ستائش بھی کی کہ وہ اس کے مسلک کے مطابق بہت کامیابی کے ساتھ کام کر رہا ہے۔

اُن کے بچے

حیدرآباد میں رزیڈنسی کی عالی شان عمارت کے نقشے کی ترتیب اور اس کی تعمیر کرک پیٹرک ہی کے زمانے میں ہوئی۔ اس وسیع رقبے میں اپنی بیوی کے لئے ایک زنانہ حصے کی بھی تعمیر کی تھی اور اس میں مصنوعی چشمے بنوا کر اسے بہت فرحت بخش بنا دیا تھا۔ عمارت کے اس زنانہ حصے کی دیواروں پر رنگ برنگ کے پھول، میوے، پودے، پرند اور دیگر جانور اتارے گئے تھے اور یہ حصہ اس قدر خوش رنگ ہو گیا تھا کہ اس کا نام "رنگ محل" رکھا گیا۔ مگر یہ عمارت ۱۸۶۰ء میں گرا دی گئی۔

خیر النساء سے کرک پیٹرک کو دو بچے ہوئے جن میں سے ایک لڑکا تھا اور ایک لڑکی۔ ان دونوں کو جب کہ ان کی عمریں ۴ اور ۳ سال کی تھیں ان کی ماں کی رضامندی سے انگلستان بھجوا دیا گیا تا کہ وہاں ان کی تعلیم و تربیت ہو۔ یہ بچے انگلستان میں اپنے دادا کے ساتھ رہنے لگے لیکن جب اس کا انتقال ہو گیا تو پھر یہ اپنی چچا زاد بہن کے زیر نگرانی رکھے گئے لیکن انگلستان جانے کے بعد ان بچوں کو پھر اپنے ماں باپ سے ملنا نصیب نہ ہوا کیونکہ ان کی روانگی کے تھوڑے ہی عرصہ بعد یعنی ۱۸۰۵ء میں میجر کرک پیٹرک کا کلکتہ میں انتقال ہو گیا اور خیر النساء حیدرآباد واپس آ گئی ہندستانی ماں نے اپنی لاڈلی بچی کا نام صاحب بیگم بی بی صاحبہ رکھا تھا لیکن اب یہ نام بدل گیا اور وہ کیتھرین آرورا یا جیسا کہ عام طور پر مشہور ہے کٹی کرک پیٹرک کے نام سے موسوم ہو گئی۔ اس نے ۷۸ برس کی عمر پائی اور اس کے کئی بچے بھی ہوئے لیکن اس کا بھائی جوان مر گیا۔ اس کی ایک بیوہ اور تین لڑکیاں تھیں۔

کارلائل سے دوستی

جب کارلائل نے اپنی جامعہ کی زندگی ختم کی تو اس کے سامنے بہت سی مشکلیں تھیں۔ چنانچہ اسی کا اثر ہے کہ اس نے چرچ مدرسہ اور قانون سب کو چھوڑ دیا۔ ۱۸۲۲ء میں اس نے اپنے دوست ایڈورڈ ارونگ کے توسط سے مسز بلر تک رسائی حاصل کر لی اور ان کے بچوں کا اتالیق ہو گیا۔ موصوف جو بہت مالدار آدمی تھے ایسٹ انڈیا کمپنی کے محکمہ مالگذاری میں ایک بڑے عہدے پر فائز تھے اور اب انھوں نے وظیفہ حاصل کر لیا تھا۔ بلر خاندان کی بدولت کارلائل سماج کے ایک ایسے دولتمند

مہذب اور متمدن طبقے سے روشناس ہوا جس کے ساتھ ملنے جلنے کا اسے اب تک اتفاق نہ ہوا تھا۔ جب وہ اپنے وارڈ کے ساتھ لندن آیا تو یہاں مسز بلر نے اس کو اپنی بہن مسز اسٹراچی سے ملا دیا اور یہی لڑکی ہے جس کے متعلق بعد میں کارلائل نے "عورتوں میں ہیرا" کے الفاظ استعمال کئے۔ یہ دونوں بہنیں ولیم کرک پٹرک کی لڑکیاں تھیں جو کٹی کا چچا تھا۔ کارلائل نے کٹی سے پہلی مرتبہ ایڈورڈ ارونگ کے مکان پر ملاقات کی اور اس "نازک سیاہ آنکھوں اور بھورے بالوں والی ساحرہ" سے بہت متاثر ہوا۔ "کٹی اپنے دلفریب حسن کے لحاظ سے آپ اپنا جواب تھی اس کا لوٹا سا قد تھا سیاہ آنکھیں تھیں، بھورے بال تھے، گندمی رنگ تھا بہ کثرت بہت خوش مزاج بھی تھی اور میرا خیال ہے کہ وہ زندگی بھر کسی دوسرے پر کبھی خفا نہ ہوئی تھی۔ وہ خود مختار تھی اور پچاس ہزار پونڈ کی دولت کے ساتھ دولت حسن کی بھی مالک تھی لیکن اس کے باوجود اس میں غرور و تمکنت نام کو نہ تھی بلکہ وہ بہت منکسر المزاج واقع ہوئی تھی"۔ چند روز بعد جب کارلائل اور کٹی زیادہ ملنے جلنے لگے تو یہ ایک دوسرے سے وابستہ ہو گئے چنانچہ ۱۸۲۴ء میں یہ دونوں پندرہ دن کے لئے پیرس بھی ہو آئے۔ لیکن اسی زمانے میں کارلائل نے یہ سنا کہ مسز اسٹراچی اپنی اینگلو انڈین بہن کے لئے ایک اچھے بر کی تلاش کر رہی ہیں اس سے کارلائل بہت متاثر ہوا چنانچہ اپنی کمپنی میں اس نے لکھا ہے "مجھے یہ چیز اب زیادہ تکلیف دیتی ہے گو اس وقت بھی میں اس سے متاثر تھا مسز اسٹراچی چاہتیں تو وہ آسانی سے اپنی بہن کے لئے میرا انتخاب کر سکتیں اور پھر ہم دونوں ہمیشہ انہی کے ساتھ رہتے" لیکن حالات ناموافق ہو گئے اور دونوں نے مختلف راہیں اختیار کیں۔ پیرس سے واپس آنے کے چند ہی مہینے بعد کارلائل کی شادی جین ولش سے ٹھیر گئی جو "ایک تیز نظر اور چرب زبان دوشیزہ تھی"۔ اسی طرح کٹی کے لئے بھی جیمس ڈنسلو فیلپس کا انتخاب ہو گیا جو ساتویں حسار کا کپتان تھا۔ کارلائل نے اس شادی کے بعد کٹی کے فوجی شوہر پر جس نے ہندستان میں اپنی خدمت انجام دی تھی، اس طرح چوٹ کی ہے "کٹی سپاہیوں کے کسی سابق کپتان کو انعام میں دے دی گئی"۔

کارلائل کی تصانیف میں اس کا تذکرہ

کٹی کا کوئی خاکہ پیش کرنے میں کہ اس کے مشرقی حسن و جمال کا کیا عالم تھا ان الفاظ کا حوالہ ناگزیر معلوم ہوتا ہے جن میں کارلائل نے اس کی تصویر کھینچی ہے اس نے اس کی تصویر یوں پیش کی ہے "وہ ایک انوکھی رنگت کی دوشیزہ تھی۔ اس کی بھوری آنکھیں تھیں، وہ بہت خوبصورت تھی اور اس کے حسن میں ایک دلکشی تھی، اس کی آواز میں ترنم اور موسیقیت تھی اور وہ واقعی مسز اسٹراچی کی بہن معلوم ہوتی تھی" ایک جگہ یوں لکھا ہے "اس حسینہ کے چرچے ہر جگہ ہوتے تھے۔ اس کا حسن، اس کے اوصاف اور اس کی طبیعت کی رنگینیاں ہر محفل میں بار بار دہرائے جاتے تھے، اس کی آنکھوں میں نور تھا اور اس کے عارض گلگوں پر ایک طرف کاکل سیاہ سے پرچھائیں پڑتیں تو دوسری طرف نور کی متبسم شعاعیں اڑ آتی تھیں"۔ ایک اور موقع پر کارلائل کے جذبات ان الفاظ میں پھوٹ پڑتے ہیں "جب کبھی بلومین اپنی معصومیت کے ساتھ چھوٹی بڑی عورتوں کی صف میں کھڑی ہو جاتی تو ایسا معلوم ہوتا کہ دنیا کے ٹمٹماتی شمعوں میں ایک آسمانی تارا ٹوٹ آیا ہے" اپنی پرانی ملاقاتوں کی یاد میں کارلائل لکھتا ہے "اس کے تبسم میں ایک جادو تھا اور اس کی ہر بات ہنسی کا پہلو لئے ہوئے ہوتی تھی۔ اس کے لب نازک کا داہنا گوشہ ترحم کھایا ہوا تھا۔

اس کے سر اور آنکھوں کی حرکت میں ایک دلربائی تھی۔ جب وہ اپنے لب نازک کو جنبش دیتی تو ایسا معلوم ہوتا کہ دھیمے سروں میں نغمے نکل رہے ہیں جو اپنے ساتھ تبسم لئے ہوئے ہیں۔ وہ بہت ملنسار اور محبت آگیں تھی وہ ایک پیکر لطافت اور اس کے ساتھ ساتھ جاذب نظر بھی تھی۔ اس کی زیر لب سریلی آواز دل میں اتر جاتی تھی اور اس کی ہر آواز لطیف و معنی خیز ہوتی تھی۔"

غرض کارلائل نے اپنے خاص جوشیلے انداز میں ایک ایسی لڑکی کے متعلق اپنے اندرونی جذبات اور احساسات کا اظہار کیا ہے جس کی ماں حیدرآباد کی ایک مسلمان خاتون تھی وہ کبھی "بلومین" کی دلربا شکل اختیار کرتی ہے اور کبھی "کٹی کرک پیٹرک" کے نام سے ہمارے سامنے آتی ہے اور ظاہر ہے کہ یہ ان لوگوں کے لئے جو انگریزی ادب کے دلدادہ ہیں بڑی دلچسپی کا سرمایہ ہے۔

نیلم راجہ رام

(ترجمہ حفیظ صدیقی)

تاریخ گولکنڈہ

فاضل مولف نے ہر حصہ کو مختلف ابواب میں تقسیم کیا ہے اور اس صورت میں تاریخ کا کوئی پہلو بھی نظرانداز نہیں ہوسکا ہے۔ قطب شاہی عمارات و سلاطین کی تصویروں نے اور بھی اس کی زینت بڑھادی ہے۔ کتاب ہر پہلو سے مفید اور دلچسپ ہے۔ زبان میں سلاست اور ادب کی چاشنی بھی موجود ہے۔ تاریخ سے دلچسپی رکھنے والوں کو چاہیے کہ وہ اس کتاب کا ضرور ضرور مطالعہ فرمائیں اور اس کی موجودگی سے اپنی لائبریری کی قدر و قیمت بڑھائیں۔ جناب عبدالمجید صاحب صدیقی اور ادارۂ ادبیات اُردو اس گراں قدر تصنیف کے لئے شکریہ کے مستحق ہیں۔ **"سہیل" گیا - جون ۱۹۴۰ء**

گولکنڈے کو جو تاریخی اہمیت حاصل ہے وہ ہر شخص کو معلوم ہے۔ گولکنڈہ دکن کا دل ہے اور اس کی تاریخ کے مطالعہ کے بغیر دکن کی سیاست و تمدن کو کماحقہ سمجھ لینا تقریباً امر ناممکن ہے۔ جناب عبدالمجید صدیقی نے یہ معرکہ آرا تاریخ لکھ کر نہ صرف گولکنڈہ کے تاریخی حقایق بیان کئے ہیں بلکہ دکن کی تمام تاریخ بھی پیش کردی ہے۔ جو کچھ انھوں نے لکھا ہے مستند مواد کی حیثیت رکھتا ہے۔ **"ادب لطیف" - ستمبر ۱۹۴۰ء**

کتاب بہت محنت اور تحقیق کے ساتھ لکھی گئی ہے اور گولکنڈے سے متعلق غالباً اپنے پائے کی پہلی اور آخری کوشش ہے۔ قطب شاہی سلطنت کی تاسیس و بنیاد سے لے کر اس کے عروج و زوال تک کے تمام حالات پوری روشنی میں دکھائے گئے ہیں۔ کتاب کے آخری حصے میں گولکنڈے کے تمدنی، سیاسی، معاشرتی و معاشی حالات، بادشاہوں کی علمی سرپرستی اور شہر و عمارت کی تاریخ بھی شامل ہے۔ کتاب مجلد ہے اور اس کی جاذبیت میں تصویروں نے بھی نمایاں حصہ لیا ہے۔ **"البیان" مئی ۱۹۴۰ء**

گولکنڈہ کا آخری بادشاہ ابوالحسن قطب شاہ ہوا ہے۔ جسے عرف عام میں تانا شاہ کہتے ہیں۔ مغل مورخین نے اس کی شخصیت اور کیرکٹر کو بہت مذموم رنگ میں پیش کیا ہے۔ لیکن فاضل مصنف نے مستند حوالوں سے کام لے کر مغل مورخین کے تمام الزامات رفع کرنے کی کوشش کی ہے اس کوشش میں وہ کہاں تک کامیاب ہوئے ہیں اس کا حال کتاب کے مطالعہ سے ظاہر ہوگا۔ کتاب محنت سے لکھی گئی ہے۔ **"زمانہ" جنوری ۱۹۴۱ء**

نہایت جامع اور دلچسپ تاریخ اور اس عہد کے تمدن و معاشرت اور سیاسی حالات کا ایک نہایت کامل اور دیدہ زیب مرقع ہے۔ یہ بلند پایہ کتاب اہل ذوق کے پڑھنے کے قابل ہے۔ **"ہمایوں" مارچ ۱۹۴۱ء**

غزل

پوچھنا کیا اس کا جو دن رات میخانے میں ہے
ذوق و کیفِ زندگی بس ایک پیمانے میں ہے

اس کی دلچسپی نہ آبادی نہ ویرانے میں ہے
کیسی دنیا بھر کی وحشت تیرے دیوانے میں ہے

لوگ میرے ساتھ ان کو بھی کیا کرتے ہیں یاد
ان کا افسانہ بھی شامل میرے افسانے میں ہے

موجِ مے کی لرزشیں ہیں دل کی بیتابی کا راز
مے نہیں ہے بلکہ میری جان پیمانے میں ہے

میکدے میں صرف اتنی سی ہے میری کائنات
تھوڑی شیشے میں ہے باقی تھوڑی پیمانے میں ہے

جان میری لے کے پچھتانا پڑے گا آپ کو
شمع کی رسوائی پروانے کے جل جانے میں ہے

یا اُدھر ہو یا اِدھر اس کشمکش سے فائدہ
لب ہیں صرفِ توبہ دل لبریز پیمانے میں ہے

شمع اس سے کچھ جو واقف تھی تو جل کر رہ گئی
کس قدر سوز و گدازِ عشق پروانے میں ہے

ہوں وہ سرمستِ ازل میں کہہ نہیں سکتا معینؔ
کون میخانے کے باہر کون میخانے میں ہے

معین الدولہ بہادر معینؔ

مطربہ سے

اپنی دھن میں مست ہو کر جس گھڑی گاتی ہے تو
اک جہاں کو رودِ موسیقی بنا جاتی ہے تو

نشہ کے بادل سے چھا جاتے ہیں فرش و بام پر
دل مچل جاتا ہے اک کیفیتِ بے نام پر

آتے ہیں دوشِ فضا پر مستیوں کے کارواں
پیدا ہو جاتا ہے نشہ کا جہاں اندر جہاں

رقص کرنے کے لئے بیتاب ہو جاتا ہے دل
پھول کی مانند کھل جاتا ہے قلبِ مضمحل

وجد ہو جاتا ہے طاری پرسکوں ذرات پر
خلد کا ہوتا ہے دھوکا بزمِ موجودات پر

ذرے ذرے سے ابل پڑتا ہے دریائے سرور
منجمد خاموشیوں کا ٹوٹ جاتا ہے غرور

وادیوں میں دل کی گاتے ہیں سریلے آبشار
کھلتے ہیں نغمات کے غنچے قطار اندر قطار

اک بہشتِ رنگ و بو میں جا کے کھو جاتا ہے دل
زمزموں کی نکہتوں میں جا کے سو جاتا ہے دل

یہ گماں ہوتا ہے گردوں پر اڑا جاتا ہوں میں
سیل اک جادو کا ہے جس میں بہا جاتا ہوں میں

خود بخود کھلتے ہیں دل پر رازہائے زندگی
دینے لگتے ہیں صدائیں سازہائے زندگی

ننگ سے نغموں کی جل جاتا ہے جب روحوں کا زنگ
دل میں اک بیدار ہو جاتی ہے وجدانی امنگ

ایک کیفِ سرمدی کو ہر طرف پاتا ہوں میں
مجھ میں کھو جاتی ہے تو اور تجھ میں کھو جاتا ہوں میں

اختر ہوشیارپوری

غزل

پیری میں اور قوتِ طبعِ رواں بڑھی
یعنی عزیزؔ تیزیٔ تیغِ زباں بڑھی

محمل کا اِس غبار میں کیونکر پتہ چلے؟
ہر ہر قدم پہ گردِ پسِ کارواں بڑھی

کِھلنے نہ پائے تھے ابھی غنچے کہ ہائے ہائے
اوراقِ گل اُڑانے کو بادِ خزاں بڑھی

دم توڑنا فراق میں دشوار ہو گیا
کم طاقتی کچھ ایسی دلِ ناتواں بڑھی

تقدیر جب خراب ہو تدبیر کیا کرے؟
اشکوں سے اور آتشِ سوزِ نہاں بڑھی

ملنا تھا بات بات پہ تکرار کا مزہ
عشقِ ادا شناس کی یوں داستاں بڑھی

دروازہ میکدہ کا نہ کر بند ساقیا!
میخوار کیا کریں گے جو مے کی دوکاں بڑھی

صبحِ شبِ فراق بڑھی آن بان سے
آہِ شرر فشاں طرفِ آسماں بڑھی

بجلی بھی تیز گام گھٹائیں بھی بے لگام!
آندھی بھی ساتھ ساتھ لئے سو آفتیاں بڑھی

دل کے خمیر میں تھی محبت کی چاشنی!
ہمت اِسی سے اپنی دمِ امتحاں بڑھی

کیونکر نہ اُس کے نام پہ دل ہو فدا عزیزؔ
جس کے قدم سے رونقِ کون و مکاں بڑھی

عزیز یار جنگ بہادر عزیزؔ

پھول

ہے پھول کہاں تو بھٹکا
کن کانٹوں میں آ اٹکا
ہیں سوکھی سوکھی ڈالیں
اپنے میں تجھے چھپالیں

(۲)

سندرتا (حسن) ایسی دے کر
پتوں کا دیا تجھے گھر
کیا الٹا ہوا ودھاتا (خدا)
جو جوڑا ایسا ناتا

(۳)

کیا تیری مدھر ہنسی ہے
کن کن (ذرہ ذرہ) میں شری (حسن) بھری ہے
جب اِدھر اُدھر تو ہلتا
آنکھوں کو جیون ملتا

(۴)

یہ رنگت اور کہاں ہے
جو تجھ میں بھری یہاں ہے
توچپ ہوکر وہ کہتا
کوئی جسے نہ کہہ کہہ سکتا

(۵)

کیا ہے جادو تجھ میں
یہ آتا نہیں سمجھ میں
ہیں چیتن جڑ ہو جاتے
اور جڑ چیتن (جان دار / بے جان) ہو جاتے

(۶)

دیکھا ہے جب سے تجھ کو
کچھ نہیں سہاتا مجھ کو
بس ایسا مست ہوا ہوں
دنیا کو بھول گیا ہوں

(۷)

اب آتا ہے یہ جی میں
تیرے ہی پاس رہوں میں
نہیں ایک پلک بھی جھپکوں
تجھ کو ہی دیکھوں دیکھوں

پنڈت ونشی دھر ودیالنکار

جدید افسانہ

ادب زندگی کا عکس ہوتا ہے لیکن زندگی اس قدر وسیع اور پیچیدہ ہے کہ بعض وقت کسی زمانے کے ادیبوں کے کارناموں میں اس کے مظاہر کی تلاش دشوار ہوجاتی ہے حالی سے پہلے کے انشا پردازوں اور شاعروں کا یہی حال ہے لیکن محض اس بنا پر ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ اس زمانے کے ادب کو زندگی سے کوئی واسطہ نہیں تھا۔

یہ صحیح ہے کہ اس زمانے کے صناعوں نے ایک نہایت رسمی اور استعارے کا طریقہ اپنے خیالات کے اظہار کے لئے اختیار کرلیا تھا۔ تاہم وہ اپنے زمانفے کے علمی خیالات اور معاشی اثرات سے بیگانہ نہیں تھے۔

جدید افسانوں کو اچھی طرح سمجھنے کے لئے بھی یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ ان کی پیدائش اور ان کے نشوونما کے پیچھے حالات اور خیالات کا ایک وسیع پس منظر ہے۔ جب تک ہم ان حالات اور خیالات کو ذہن نشین نہ کرلیں اس زمانے کے افسانوں کو پورے طور پر سمجھ نہیں سکتے۔

لیکن ہم اس وقت صرف مختصر قصوں کا ذکر کریں گے کیونکہ افسانے کی اصطلاح عام اور وسیع ہے۔ اس میں داستان حکایت ناول مختصر قصے غرض ادب کا وہ تمام ذخیرہ شامل ہوجاتا ہے جس کو قصے سے کسی نہ کسی طرح کا تعلق ہو۔ اس زمانے میں داستانیں اور حکایتیں نہیں لکھی جاتیں۔ یہ مختصر قصوں اور ڈراموں کا دور ہے۔ ناول کی طرف بھی اب بہت کم توجہ کی جاتی ہے۔

مختصر قصے کے لئے انگریزی میں " " کی اصطلاح رائج ہے۔ اردو میں عام طور پر اسے مختصر افسانہ اور بعض وقت محض افسانہ کہتے ہیں۔ لیکن جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں افسانہ وسیع مفہوم رکھتا ہے۔ اس کو انگریزی اصطلاح " " کے ہم معنی سمجھنا چاہیے۔ افسانے کی ایک خاص شکل کے لئے عام اصطلاح استعمال کرنا مناسب نہیں معلوم ہوتا۔ اسی سے دقتیں پیدا ہوجاتی ہیں۔ اسی سے بچنے کے لئے ہندی ادیبوں نے اس صنف کے لئے "کہانی" کا نام اختیار کیا ہے۔ کہانی " " کا ترجمہ ہے۔ لیکن مختصر قصہ نہ تو افسانہ ہے اور نہ کہانی۔ اس کا فن ان سب سے الگ اور اسی کے ساتھ مخصوص ہے۔ نئی ادبی شکل کا نیا نام ہونا چاہیے۔ اسی لئے اس کو مختصر قصہ کہنا زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔

مختصر قصہ ہماری زبان میں انگریزی کی توسط سے پہنچا۔ ایشیائی قوموں کی مخصوص ذکاوت کو قصہ گوئی سے بہت قدیم اور فنی تعلق رہا ہے۔ اسی لئے یورپ کی اس ادبی شکل سے ہم اس قدر جلد مانوس ہوگئے کہ وہ ہمارے ادب کا ایک مقبول جز بن گئی ہے۔

یورپ کی زبانوں میں بھی مختصر قصہ فنی حیثیت سے بہت بعد میں پیدا ہوا اس کی ترقی دراصل موجودہ زمانے کی مصروف اور میکانکی زندگی کے آغاز کے ساتھ ہوئی۔ یورپ کے اہم ملکوں جیسے انگلستان، فرانس، جرمنی، اطالیہ روس اور امریکہ میں صنعتی ترقیوں کے بعد سے عام زندگی کی کش مکش اس قدر بڑھ گئی کہ درمیانی اور ادنیٰ طبقوں کو قدیم زمانے کے لوگوں کی طرح بڑے بڑے ناول اور ڈرامے پڑھنے کا وقت کم ملتا تھا۔ لیکن اس کے ساتھ ذہنی اور دماغی تفریح کی ضرورت گھٹی نہیں۔ بلکہ اور شبہ گئی۔

اسی لئے ایک ایسی ادبی صنف کے نشو ونما کی ضرورت ہوئی جو مصروف لوگوں کی فرصت کے چند لمحات کو پُر کر سکے اور ایک مکمل تفریح ثابت ہو۔

یورپ کی گزشتہ جنگِ عظیم تک اس فن کو ناول اور ڈرامے کے ساتھ ساتھ ترقی ہوتی رہی۔ پہلے پہل اکثر ناول نگار اس کو ایک وقتی تفریح کے طور پر استعمال کرتے تھے۔ تاہم ان کے سرانجام میں وہ بڑے قصوں کی طرح محنت کرتے اور اپنے مقصد کو نمایاں کرنے میں وہ قدیم قصہ گوئی کے سارے لوازم صرف کر دیتے تھے اسی لئے ان کے مختصر قصے بھی کافی طویل اور قصہ گوئی کے پورے لطف سے پُر ہوتے تھے۔ ان کے موضوع عموماً ادبی اور خیالی ہوتے تھے۔

لیکن جنگ کے بعد سے جو اہم تبدیلیاں یورپ کی سیاسی اور معاشی، سماجی اور علمی زندگی میں رونما ہوئیں ان کی وجہ سے یورپی ادب میں بہت بڑا انقلاب ہوگیا ہے۔

ان اثرات سے ہندوستان بھی نہ بچ سکا۔ اردو کے موجودہ مختصر قصوں میں بھی ہم وہ تمام ظاہری اور معنوی خصوصیات دیکھ سکتے ہیں جو یورپی قصوں میں عام طور پر پائی جاتی ہیں۔ ہمارے قصوں کا بہت بڑا ذخیرہ ایسا ہے جو یورپی زبانوں سے ترجمہ کے ذریعہ منتقل ہوا ہے۔ اس کے علاوہ کچھ حصہ ماخوذ ہے اور کچھ اسی نمونے پر ڈھالا گیا ہے۔ ملکی ذہنیت بھی اب اس پر اس قدر قابو پا چکی ہے کہ اپنی ذکاوت کے مناسب اس میں تصرف بھی کرنے لگی ہے۔ اسطرح ہمارے مختصر قصوں میں ایک طرف مابعد جنگ اثرات موجود ہیں تو دوسری ان پر یورپ کے خاص خاص ملکوں جیسے انگلستان، فرانس، جرمنی اور خاص طور پر روس کے باکمال قصہ نگاروں کے مخصوص قومی اور شخصی رجحانات کے گہرے اثرات بھی کام کر رہے ہیں۔ یہ یورپی قصہ نگار زیادہ تر ایسے ہیں جو جنگ سے پہلے کے زمانے سے تعلق رکھتے ہیں گویا ہمارے قصے جنگ سے پہلے کے ادبی تخیلات اور اس کے بعد کے اثرات کا مجموعہ ہیں۔

روسی قصہ نگاروں میں تورگنیف، ڈوستووسکی، چیخوف میکسم گورکی اور خاص طور پر ٹالسٹائی کے اثرات بہت نمایاں ہیں۔ کئی رسالے اور کتابیں ان کے قصوں اور ان کی صناعی کو سمجھانے کے لئے اردو میں شایع کی گئی ہیں۔ نوجوان انشا پردازوں کی ایک خاصی تعداد ایسی ہے جس کا مقصد روسی ادب اور خیالات کی اشاعت ہے۔ ان میں سعادت حسن منٹو، کامریڈ فیروز الدین منصور، شاہد لطیف، وغیرہ بہت پیش پیش ہیں۔ پروفیسر محمد مجیب اور اختر حسین رائے پوری کے افسانے بھی روسی اثرات ہی کے مظہر ہیں۔

تورگنیف اور ڈوستووسکی روسی ادب میں حقیقت اس افسانہ نگار گروہ کے پیرو تھے جس کا نشو ونما گوگول اور فرانسیسی مختصر قصہ نگار ژورژ ژرسان ڈ کے اثرات کے تحت ہوا۔ اسی دبستان کی خصوصیات ہم عصر روسی زندگی کے صحیح نقشے پیش کرنا سماجی مسئلوں سے دلچسپی اور ان پر تنقید اور عجائبات اور رومانیت کی افراط و تفریط سے کنارہ کشی ہے۔ یہ لوگ ایسے اسلوب بیان پر زور دیتے تھے جو سادہ اور واضح ہو اور چیزوں کی سچی تصویر پیش کرے۔ تورگنیف اس اسکول کی غیر فانی یادگار ہے۔ اس کے قصے سماجی مسائل سے تعلق رکھتے ہیں اور کردار وں میں اس کے مرد عموماً کمزور اور عورتیں طاقتور ہوتی ہیں اس کا

اسلوب حقیقت پر مبنی ہونے کے با وجود تہذیب سے نہیں گرتا اور جوش کے بغیر شاعرانہ ہے۔ ڈوستووسکی غریب اور دیہاتی طبقوں کی زندگی پیش کرتا ہے۔ "غریب منشی" اس کے مشہور کردار بن گئے ہیں۔

ٹالسٹائی اردو میں سب سے زیادہ مقبول ہے۔ اس کی عظمت کی بنیاد اس کے قصوں کا انسانی عنصر ہے۔ وہ بنی نوع انسان کی اخلاقی بہتری چاہتا تھا۔ اس مقصد کے لیئے اس نے ایک نئی اخلاقی عیسائیت کا پرچار کیا۔ سب سے بڑھ کر اس کا بے مثل سادہ اندازِ بیان ہے جس میں لفاظی اور علمی نمائش کو بالکل دخل نہیں ہے۔

چیخوف کے کارنامے اس پستی کے مظہر ہیں جو ۱۸۸۰ء اور ۱۹۰۵ء کے درمیان روسی ادب پر طاری رہی۔ اس کے بہترین افسانے اس کے زمانے کے ذہین لوگوں کی فریب خوردگی اور بے کاری کے مرقعے ہیں۔

کارل مارکس کے عقائد کی نشر و اشاعت سے روس میں جو نئی روح پیدا ہوئی اس کی یادگار میکسم گورکی ہے۔ وہ نہایت غریب گھرانے میں پیدا ہوا تھا اور اس کی ابتدائی زندگی کا ایک بڑا حصہ بیکاری اور آوارہ گردی میں بسر ہوا تھا۔ اس نے اپنے قصوں میں آوارہ گردوں کی جو نفیس تصویریں کھینچی ہیں وہ حقیقی ہونے کے باوجود رومانیت سے پُر ہیں۔ یہی وہ خصوصیات ہیں جن کی بدولت اس کے قصے ساری دنیا میں مقبول ہیں۔ جنگِ عظیم کا اثر روس میں بولشویک انقلاب کی صورت میں نمودار ہوا۔ اس عہد میں ملکی سیاست کی جو پابندیاں ادیبوں پر عائد ہوگئی ہیں ان کے اثر سے ادب میں یکسانیت، میکانیت اور پروپگنڈے کی خصوصیت بڑھ گئی ہے۔ اسی لیئے موجودہ زمانے میں عالمی شہرت کا کوئی قصہ نگار پیدا نہ ہوسکا۔

فرانس کے باکمال قصہ نگاروں میں یوں تو بلزاک سے لیکر رومین رولاں تک سب کے اچھے قصے اردو میں ترجمہ ہوچکے ہیں لیکن ماپساں کی سی مقبولیت کسی کو حاصل نہ ہوئی۔ ماپسان فرانسیسی ادب میں حقیقت نگار گروہ سے تعلق رکھتا ہے۔

اس نے اپنے زمانے کے عیش پسند فرانس کی سچی اور حسن کارانہ تصویریں پیش کی ہیں۔ اس کے اکثر قصے صنفی تعلقات کے وسیع پہلوؤں سے بحث کرتے ہیں۔ اس کا اسلوب بیان حقیقت اور صناعی کی آمیزش کا دلنواز مجموعہ ہے۔ اردو کے بعض قصہ نگار جن میں جلیل قدوائی خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں اسی سے متاثر ہیں۔ اس کے بہترین قصوں کا اردو میں ترجمہ ہوچکا ہے۔

جنگِ عظیم سے فرانس کے نوجوان ادیبوں کی مصروفیتوں میں رخنہ پڑگیا۔ ان میں سے بعض تو جنگ میں کام آئے جو بچ رہے ان میں جوشِ اظہار قابلِ دید ہے۔ اس زمانے کے کارنامے جذبات کی صداقت وطنی جوش اور قومی شجاعت کے ولولوں سے بھرے ہوئے ہیں۔ جنگ کا خطرہ دور ہوجانے پر وہ جوش تو کم ہوگیا لیکن نوجوان ادیبوں نے اس طرح کام شروع کیا گویا انھیں اگلے ادیبوں سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔ انھوں نے ایک نئی دنیا بسانے کی کوشش کی لیکن انھیں جلد محسوس ہوگیا کہ وہ اگلے لوگوں کے اثر سے نہیں بچ سکتے۔ موجودہ قصہ نگاروں کے رجحانات قابلیتوں کے اختلافات اور ان کے مقصد اتنے ہی وسیع ہیں جتنے موجودہ اردو

قصہ نگاروں کے نظر آتے ہیں۔ ان کی فکر میں اتحاد کم ہے اور ہر شخص اپنے طبعی میلان کی پیروی کرتا ہے۔ اسی لئے ان کی گروہ بندی کی کوشش دشوار نظر آتی ہے۔ تاہم ایک چیز جو ان میں مشترک ہے وہ نفسیاتی تجسس ہے۔ یہ چیز بعض موجودہ اردو قصوں میں بھی دیکھی جا سکتی ہے۔

اطالوی قصہ نگاروں کا اثر یورپی ادب پر کافی پڑا ہے۔ اردو میں بھی جستہ جستہ قصوں کے ترجمے ہو چکے ہیں جن میں بوکاچیو سے لے کر میکاویلی باندیلو کارلوگوزی اور گریزیا ڈلیڈا جیسے حال کے قصہ نگاروں کے قصے تک شامل ہیں۔ لیکن ان قصوں کا کوئی خاص اثر اردو لکھنے والوں پر نہیں پڑا۔ یہی حال جرمن قصوں کا بھی ہے۔

گرم پال ہائزشا نزلر وغیرہ کے کچھ قصے اردو میں ترجمہ ہوئے ہیں لیکن ان میں کوئی نمونہ نہیں بن سکا۔ جرمنی کے صاحب فکر ادیبوں جیسے گوئٹے شلر ہیگل کانٹ اور شوپنہار کے اثرات فرانس انگلستان روس اور دنیا کی دوسری زبانوں کے ادیبوں پر وقتاً فوقتاً پڑتے رہے۔ لیکن اردو میں ان کا کوئی راست اثر سوائے اقبال کے کلام کے کسی اور جگہ کم نظر آتا ہے۔ گوئٹے کے شاہکار "فاوسٹ" کا ترجمہ ڈاکٹر عابد حسین نے کیا ہے اس کا بھی کوئی معین اثر اردو میں ظاہر نہیں ہوا حالانکہ یہ کارنامہ نہایت معرکۃ الآرا رہا ہے۔

یہ صحیح ہے کہ یورپی قصوں کے اثرات اردو میں زیادہ تر انگریزی زبان کی توسط سے پہنچے لیکن یہ بات خاص طور پر دیکھنے کی ہے کہ انگریزی قصہ نگاروں مثلاً کپلنگ ساقی چسٹرٹن اچ جی ویلز اور گالز ورذی کا اثر بھی ہمارے قصہ نگاروں پر بہت زیادہ نمایاں نہیں ہے۔ کپلنگ اچ جی ولز اور گالز ورذی کے اکثر قصے اردو میں منتقل ہو چکے ہیں۔ انگریزی قصوں کے زیادہ مقبول نہ ہونے کا سبب ممکن ہے یہ ہو کہ انگریزوں کی مخصوص ذکاوت مزاج اور لطف گفتار کا ہم پورا حظ نہ اٹھا سکتے ہوں۔ اس کے برخلاف فرانسیسی اور روسی قصے جو انگریزی کی توسط سے ہم تک پہنچتے ہیں۔ ترجمے میں اپنی بہت سی انفرادی خصوصیات کھو دیتے ہیں۔ اسی کا ایک ثبوت امریکی قصے بھی ہیں۔ واشنگٹن ارونگ کے قصے ہمارے پاس او ہنری اڈگر ایلن پو مارک ٹوین اور برٹ ہارٹ کے قصوں سے زیادہ مقبول ہوئے۔ اور ان میں زیادہ تر وہ قصے ہیں جو اسلامی اسپین سے تعلق رکھتے ہیں۔ اردو میں ترجمہ ہوتے ہوتے یہ مشرقی لباس اختیار کر لیتے ہیں اس کا اندازہ نیاز فتحپوری کی نگارستان کے قصوں کو پڑھنے سے بخوبی ہو سکتا ہے۔

اردو کے تمام موجودہ قصوں پر اس وقت تبصرہ کرنا ممکن نہیں اس لئے ہم صرف نمایاں دبستانوں کے ذکر پر اکتفا کرتے ہیں۔

سب سے پہلا اور نمایاں دبستان معاشرتی اور قومی قصہ نگاروں کا ہے۔ اس کی بنیاد منشی پریم چند نے رکھی تھی۔ سدرشن علی عباس حسینی اعظم کریوی اس طرز کے مشہور پیرو ہیں۔ ان کے قصے ہندستان کی سادہ دیہاتی زندگی کے مرقعے ہوتے ہیں۔ زبان اور اسلوب میں بھی یہ بےحد سادگی پسند کرتے ہیں۔ قاضی عبدالغفار کا موضوع بھی معاشرت ہے۔ لیکن ان کے قصے زیادہ پیچیدہ اور ان کا اسلوب نفسیاتی ہوتا ہے۔

دوسرا گروہ رومانی اور نفسیاتی قصہ نگاروں کا ہے

جن کے موضوع عام زندگی سے ہٹے ہوئے اور شاعرانہ ہوتے ہیں اسلوب کے لحاظ سے یہ دبستان یورپ کے موجودہ " " کے مماثل ہے۔ ان کا کمال تخیل کی مدد سے غیر محسوس کو محسوس بنانا ہے۔ اس طرز کے مشہور لکھنے والے سجاد حیدر یلدرم، نیاز فتح پوری، مجنوں گورکھپوری اور حجاب امتیاز علی ہیں۔ پروفیسر محمد مجیب اور اختر حسن رائے پوری کے قصے نفسیاتی تجزیہ کے ساتھ ساتھ صداقت اور سادگی کی طرف زیادہ مائل ہیں۔

تیسرا مکتب مزاحیہ قصہ نگاروں کا ہے جس میں عظیم بیگ چغتائی سب سے پیش پیش ہیں ان کے قصے مختصر قصوں کے تمام اجزا پر حاوی بھی ہوتے ہیں۔ دوسرے مزاحیہ نگار مثلاً مرزا فرحت اللہ بیگ، رشید احمد صدیقی، پطرس بخاری، شوکت تھانوی، ایم اسلم اور ملا رموزی وغیرہ شکل یا صنف کے پابند رہ کر نہیں لکھتے۔ لیکن ان کے مضامین کبھی کبھی مختصر قصے کی شکل بھی اختیار کر لیتے ہیں۔

چوتھا اور آخری گروہ وہ ہے جس میں زیادہ تر ترجمین شامل ہیں۔ یہ جلیل قدوائی، منصور احمد مرحوم، عابد سلیمان، سعادت حسن منٹو اور ان کے ساتھیوں پر مشتمل ہے۔ منصور احمد نے دنیا کی مشہور زبانوں کے بعض قصوں کا ترجمہ دنیا کے بہترین افسانے کے نام سے شائع کیا تھا۔ جلیل قدوائی نے موپاساں کے کئی قصوں کا ترجمہ کیا اور سعادت حسن منٹو اور ان کے شریک کار روسی ادب اور مختصر قصوں کو اردو سے روشناس کرنے کی کوشش میں مصروف ہیں۔

جنگ سے پہلے کے قصوں کا ہمارے پاس بہت زیادہ ذخیرہ نہیں ہے لیکن جو کچھ موجود ہے یا پھر یورپ کے اگلے اساتذۂ فن سے حاصل ہوا ہے اس کا مقابلہ موجودہ زمانے کے قصوں سے کرنے پر یہ ظاہر ہوگا کہ قدیم قصہ نگاروں کا بڑا کمال ذوق قصہ گوئی میں ظاہر ہوتا تھا۔ لیکن بعد کے قصوں میں یہ چیز ان کے آرٹ یعنی صناعی کے مقابلہ میں کم نمایاں ہے۔ موجودہ قصہ نگار نہایت ایمائی اشاروں سے کام لیتا ہے۔ اس کا رجحان ایجاد یعنی اختصار کی طرف بھی زیادہ ہوگیا ہے ہمارے زمانے میں حیاتیات نفسیات اور سائنسی علوم کو جو ترقی ہوئی ہے اس کا ذخیرہ بھی موجودہ قصہ نگار کے پشتے کے طور پر موجود ہے۔ جدید قصوں میں اکثر ایسے ہیں جن میں نہایت مجمل طور پر نفسیاتی تجزیہ سے کام لیا گیا ہے۔ اس زمانے کے سماجی معیاروں اور صنفی خیالات میں جو بھاری انقلاب ہوگیا ہے اس کے اثرات بھی قصوں میں جا بجا دیکھے جا سکتے ہیں۔ موجودہ لکھنے والے اپنے پیش رو اساتذہ کے مقابلہ میں بھی زیادہ غیر رسمی نظر آتے ہیں۔ ان کے موضوع پہلے سے زیادہ وسیع ہوگئے ہیں اور ان کے لئے کوئی چیز ناگفتنی نہیں رہی ہے۔ وہ ادب کا کمال صناعی سمجھتے ہیں موضوع تو لاکھ کچھ بھی ہو۔ یہ وہ عام رجحانات ہیں جو یورپی قصوں کی طرح اردو قصوں میں بھی دیکھے جا سکتے ہیں۔

عبدالقادر سروری

سماج کے دلنشیں محل میں

ندی کے پورب میں، فاصلے پر "سماج کے دلنشیں محل میں"
بڑی عقیدت سے گا رہی ہو   ستار لے کر دعا کے گانے
خیال یہ ہے کہ پا رہی ہو   "پتی" کو اپنے اسی بہانے
سماج ہی کو سُنا رہی ہو   سماج کے ظلم کے فسانے
ہنسی میں عورت کی کھو نہ جائے تمھاری پوجا حسیں محل میں

پرستشوں کی ہر ایک شئے پر   تمھارے غم خوار ہنس رہے ہیں
بھجن کی اس باخلوص لَے پر   ستار کے تار ہنس رہے ہیں
کرشن جیسے تمھاری لَے پر   ندی کے اُس پار ہنس رہے ہیں
یہی کہ مذہب کے جھوٹے معنی کوئی بھی دیوتا نہیں سکھاتا
کسی کو دوشیزگی کے رنگیں دنوں میں "بیوا" نہیں بناتا!

کسی نے بچپن کے دن سے مانا   تمھاری شادی کا فیصلہ تھا
تمھاری معصومیت کا بدلہ   سماج کا ایک قہقہہ تھا

مگر تصور بھی اب نہیں ہے!
کہ کس سے باندھا تھا ماں نے رشتہ
تمھیں بتاؤ، تمھیں یقیں ہے
کہ "وہ" ہیں اس مورتی میں زندہ!

قسم ہے تم خود سمجھ رہی ہو، قسم ہے تم کو یقیں نہیں ہے
میں جانتا ہوں تمھاری خاطر یہ مورتی دلنشیں نہیں ہے
مگر پرستش کی کوششوں میں خیال اپنا بٹا رہی ہو
سمجھ رہی ہو "دعا کے گانے" بڑی عقیدت سے گا رہی ہو
تمھارا کہنا کہ "یہ ہے مذہب" تمھارا کہنا "سماج یہ ہے"
تمھارا کہنا کہ "عورتوں کے بلند رتبے کی لاج یہ ہے"
غلط ہے، دھوکا ہے، عورتوں پر یہ قہر ہے، ظلم ہے، ستم ہے

معاف جس کو نہ کر سکے گی کبھی بھی "انسانیت" قسم ہے!!

اگر ضروری ہے" ایسی صورت　　اور اس پہ یہ گیروا دوشالہ"
اگر ضروری ہے" یہ نزاکت　　اور اس پہ اتنی طویل مالا"
اگر ضروری ہے" یہ عبادت　　تمھاری خواہش کا پاٹ شالا"

تو آؤ مالا یہ توڑ بھی دو
کہ "پھول کا ہار" آگیا ہے!
تو آؤ مندر کو چھوڑ بھی دو
تمھیں بتاؤں دھرا ہی کیا ہے
ندی کے پورب میں، فاصلے پر "سماج کے دلنشیں محل میں"

سلام (مچھلی شہری)

فلسفی سے

تو عقل سے ہے طالبِ اسرار و معارف
اس راہ میں ہے پیکِ جنوں پختہ و چالاک

تو زیست کے اسرار سے واقف ہو تو کیونکر
گم کردہ منزل ہے تری خامئ ادراک

ہر ذرہ ہے آسودۂ اسرارِ کم و کیف
ونسرو وسمن ہوں کہ ہجومِ خس و خاشاک

گو اوجِ فلک پر ہیں چمکتے ہوئے تارے
ان تاروں سے خالی نہیں یہ انجمنِ خاک

ہر چند رہا صیدِ ستم ہائے زمانہ
پھر بھی مری فطرت رہی آشفتہ و بیباک

منزل مری احساس کی حد سے بھی بڑھ گئی
اور تو ہے ابھی گم شدۂ جادۂ ادراک

جینے کا مزہ غم سے ہے غم ڈھونڈ رہا ہوں
آنکھیں مری آلام کے اشکوں سے ہیں نمناک

اے کاش کہ آگاہ ہو تو لذتِ غم سے
فطرت تجھے دے اک دلِ گرم و نگہِ پاک

ظفر (عثمانیہ)

رکھنا ہے۔ میں اپنا دکھڑا کیسے روؤں! کبھی دبی زبان میں کچھ
کہتا بھی ہوں تو جواب ملتا ہے کہ "یہ ہمارے خاندان کا طریقہ
نہیں"۔ اب اُن سے کون کہے "منہ پھٹ" ہو کر کہ ہمارے
پاس سوپشت سے یہی دستور چلا آتا ہے کہ بیوی گھر کی' اور
گھر والے کی ذمہ دار ہوتی ہے... دونوں کا خیال سب پر
مقدم ہے..... مگر کون کہے؟ ..

ان کے راج میں گھر کا نقشہ بھی دیکھ لیجئے کہ کس طرح
کا ہے۔ جہیز کا سامان اس طرح منتشر پڑا ہے جیسے اب
ان کا نیلام کیا جائے گا... کوئی چیز قرینہ سے سجی ہوئی نہیں
دیوانخانے کا سامان باورچی خانہ میں... میرے کمرے کا
سامان کچھ گودام میں کچھ سودی خانے میں... ان کا مطلب
شاید یہ ہو کہ میں آپ ہی جھک مار کر سب کچھ سلیقہ سے رکھ
لوں گا.... مگر ع رگوں میں میرے خوں ہے پانی نہیں ہے
گھر پھونک کر تماشہ دیکھوں لیکن وضع داری پر آنچ نہ آنے
دوں... گھر کل کا بگڑنے کا آج بگڑتا ہے۔ بگڑا کرے
مجھے کیا... سوچ لیا ہے کہ کسی نہ کسی دن وہ مجھے الزام دیں گی
ضرور۔ اس وقت سمجھ لوں گا.... ایسی خبر لوں گا کہ یاد کرتی
رہیں گی... فی الحال تو ہم دونوں خاموش ہیں۔ میں تو خیر اس لئے
بھی خاموش ہوں کہ ابھی روزگار سے نہیں لگا.... اور شاید وہ
بیچاری بھی سوچ کر خاموش ہوں کہ جب یہ کما کر لائیں گے' تب ہی
پیر پھیلائیں گے....

دنیا کا دستور ہے کہ چاہے کسی کی شادی ہو یا نہ ہو'
دوست احباب' ملنے جلنے والے' اس کے گھر آتے ہیں۔ کچھ
دیر بیٹھتے ہیں... صاحب خانہ مقدرت رکھتا ہو تو تواضع
بھی کرتا ہے... اور خلوص کے رشتہ کو اور بھی مضبوط بناتا
ہے.... خود ہم اپنے کئی دوستوں کے یہاں وقت بے وقت
جا دھمکتے ہیں' خدا کے فضل سے وہ بھی شادی شدہ ہیں...
ہمارے آنے کی خبر سن کر سو کام چھوڑ کر ملنے چلے آتے ہیں۔
خوش خوش نظر آتے ہیں۔ بیوی کی طرف سے کوئی اندیشہ
دل میں نہیں رہتا... الٹا اس کی تعریف میں ان کے ہونٹ
سوکھ جاتے ہیں... پان آتے ہیں... کہلوایا جاتا ہے کہ
دولہے میاں کے دوست آئے ہیں' تو سلام آتا ہے۔ کچھ
مٹھائی بھی بھیج دی جاتی ہے... اپنے خاوند کے دوستوں
کی عزت اور تواضع بیوی کا اولین فریضہ ہے... لیکن یہاں
کا تو باوا آدم ہی نرالا ہے۔ دوست تو دوست رشتہ دار
بھی آجائیں تو چڑھی تیوری اترنے کا نام ہی نہیں لیتی..
لاکھ سمجھاتا ہوں کہ عزت اور وقار کا سوال ہے.... جھوٹے منہ
تو ہنس بول لیا کرو۔ لیکن ایک "اونہہ" ہزار "اونہہ"۔ حسن کا
میں پہلے ہی سے روادار نہیں ہوں۔ میں تو سلیقہ شعاری اور حسن سیرت
کا شیدا تھا... پردہ کا رواج نہ ہوتا تو شاید لوگ مجھے خوش قسمت
سمجھتے کہ ایک حسین بیوی کا شوہر ہوں۔ اب تو رونا ہی رونا ہے
گھر کا ڈھنگ ایسا بیوی کی طبیعت ایسی .. جو بھی دیکھے گا نام رکھے گا
.. کوئی ملنے آتا ہے تو پہلے تو صاف چلے جانے کو کہا جاتا ہے۔
کوئی مارے خلوص کے ڈھیٹ بنا کھڑا ہی رہے تو مجھے تاکید
کی جاتی ہے کہ "فوراً اس سے پیچھا چھڑاؤ"۔ جناب چاہے
وہ شخص کتنی ہی دیر بیٹھا رہے۔ اندر سے نہ تو پان آتے ہیں
نہ کچھ اور۔ الٹا بار بار ماما ٹپکتی رہتی ہے کہ "اندر بیگم صاحبہ
بلا رہی ہیں....."... گھر چھوڑ کر ہی بھاگ جاؤں گا تب
انہیں ہوش آئے گا۔

پرسوں کے واقعہ سے تو دل پر ایسا گھاؤ پڑا ہے کہ
ڈوب مرنے کو جی چاہتا ہے... بچپن کا ایک دوست مجھ سے
ملنے آیا... مجھے اس سے مل کر بڑی خوشی ہوئی۔ جی چاہتا تھا کہ

اسے دو تین دن روک رکھوں، اور موقع سے اس کے گلے لپٹ کر خوب جی بھر کر رؤں... خوب خاطر تواضع کروں، اور اس کا بھی تقاضا تھا کہ "شادی کی دعوت دو..."... مگر... خیر... باتوں ہی باتوں میں کامل ایک گھنٹہ گزر گیا، اندر سے نہ تو پان آتے رہیں اور نہ چائے... بے چارے نے ادھر اُدھر دیکھ کر کہا "بھئی ذرا پانی تو منگا دو..." میں نے ماما کو آواز دی... وہ باہر آئی۔ میں نے کہا "ایک گلاس میں پانی تو لا"... وہ اندر گئی تو گویا چھاپ بن کر اڑ گئی... ہم دونوں کی نظریں دروازہ پر لگی ہیں کہ اب آتا ہے پانی اور اب... آخر مایوس ہو کر اس نے باتوں کا سلسلہ چھیڑا... "کہو یار مزے میں تو ہو نا شادی کی زندگی واقعی بڑے مزے کی ہوتی ہے" میں خون کے گھونٹ پی رہا تھا... دل میں تو آیا کہ چیخ چیخ کر کہوں... "نہیں نہیں، شادی میرے لئے لعنت ثابت ہوئی۔ بیوی بلائے ناگہانی۔ اور شادی کی زندگی... سکرات سے بڑھ کر تکلیف دہ..." مگر پھر یہ سوچ کر خاموش ہو رہا کہ کہنے کو تو کہہ دوں گا... لیکن نتیجہ کیا۔ جگ ہنسائی کے سوا اور ہوگا کیا! ...خود کو بڑے "احتیاط" سے ہشاش بشاش بنالیا۔ چہرہ پر شرم آلود مسرت طاری کرلی... "ہاں بھئی۔ بڑی پرلطف زندگی ہے شادی... خوشیوں اور مسرتوں کی کیاری ہے سمجھو... اور بیوی کا کیا کہنے میں بیوی کے... سراپا دولہن... سراپا ناز سراپا حسن... مجھے مبارک باد دو... قسمت کا دھنی ہوں..."

اتنے میں ماما اندر سے پانی لے آئی۔ مگر نہیں وہ تو چائے لارہی تھی۔ میرا دل بلیوں اچھل رہا تھا... کیا وہ اتنی سمجھ دار ہوگئی ہیں... چند گھنٹوں میں انھیں عقل سلیم نصیب ہوگئی۔ سلیقہ شعاری پر کمر باندھ لیا ہے انھوں نے... میرا دوست پانی منگا رہے... اور بھیج رہی ہیں چائے... میں نے فرط مسرت سے بے اختیار ہو کر کہا "لا۔ لا" لیکن ماما چہرہ کو سوہنگ سے بگاڑے کچھوے کی رفتار سے آرہی تھی میرے دوست نے اپنی قلبی کیفیت کو چھپاتے ہوئے، ازراہ تکلف کہا... "ارے یہ کیا، بھئی یہ بھی کوئی وقت ہے چائے کا... اور پھر میں ابھی ابھی گھر سے چائے پی کر آرہا ہوں..." "نہیں صاحب یہ تو نہیں ہوسکتا۔ چائے آپ کو پینا ہی پڑے گی... نہ جانے جلدی میں کیسی بنی ہے... مگر میاں چائے بنانے میں ہماری بیوی کمال کرتی ہیں اور اس معاملہ میں تو وہ سب سے بڑھی چڑھی ہیں۔ بے وقت چائے سے تواضع کرتی رہتی ہیں۔ وہ تو کہو تمھاری قسمت ذرا خراب ہے ورنہ خوان پر خوان خالی کرنے پڑتے۔ لاکھ سمجھاتا ہوں کہ آخر اس "تواضع" سے مطلب کیا ہے تمھارا۔ لوگ آنا چھوڑ دیں گے... مگر وہ تو جیسے قسم کھا رکھی ہیں کہ میرے ہر دوست کو بغیر کچھ کھلائے پلائے جانے ہی نہ دیں گی..." "مجھے افسوس ہے کہ تم اتنے دنوں بعد آئے۔ اور صرف چائے پر ٹالے جارہے ہو... اور دیکھنا چائے بھی کیسی نکلتی ہے۔ میں نے کہا نا جلدی میں تیار ہوئی ہے..." میرے دوست نے پھر کہا... "نہیں صاحب مجھے معاف ہی کرو تو بہتر ہے... تمھارا... بھابی جان کا لاکھ شکریہ... پھر کبھی سہی..." مگر میرے دل میں تو خوشی کا ایسا طوفان لہریں مار رہا تھا کہ دوست کو پچھاڑ کر اس کے حلق میں چائے انڈیلنے کو تک تیار تھا... میرا حال اس فقیر کا سا تھا جو صدا لگاتے ہی "لے جاؤ شاہ صاحب" کا جواب سنتا ہے... "چائے نہیں پئیں گے، کیونکر نہیں پئیں گے" "پینا ہی پڑے گی... اور لکھ دینا پڑے گا کہ" میں نے چائے پی..." اور میں سب دکھاتا پھروں گا کہ کیوں خواہ مخواہ میری بیوی کو بدنام کرتے

پھر آپ ہی دیکھئے میرا ایک دوست کیا کہتا ہے..." میں نے چائے پی۔
اس سال... میری بیوی نے... میری شریک حیات نے میری
فرمائش پر دوست کے لئے چائے بنوائی۔ اپنے ہی نازک نازک
ہاتھوں سے بنا کر...

لڑکی پیروں پر جیسے ریت کے تھیلے بندھ گئے ...
یوں آرہی تھی جیسے ہوا اسے ڈھکیلتی لارہی ہے... مگر اس کی
یہ سست رفتاری بھی بے سبب نہ تھی۔ وہ چائے لا رہی تھی۔ بس یہی
کافی تھا... اگر اسی طرح چائے کی پیالی دکھاتی دور ہی دور کھڑی
رہتی تو بھی میری خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ رہتا.... میں نے مسکراتے
ہوئے اپنے دوست کی طرف دیکھا تو وہ خود کو چائے پینے کے لئے
تیار کر رہا تھا۔ اور چہرے پر اس کیفیت کو طاری کر رہا تھا جو چائے
پینے سے پہلے طاری ہوا کرتی ہے یعنی سراپا ممنونیت سراپا خلوص
...احسان کے چہرے پر چائے کا لطف اور ذائقہ ابھی سے اپنی
پرچھائیاں ڈال رہے تھے۔ وہ قریب آئی تو میں نے اس انداز
سے کہا.... جیسے ہر دوست کی آمد پر ایسی ہی خاطر تواضع ہوتی
ہو اور یہ کہ یہ تو ایک بالکل معمولی بات ہے۔ "دے دو صاحب کو
ہے" اور وہ پیالی کو میرے دوست کے ہاتھ میں پکڑا کر تیزی
سے اندر چلی گئی.... کچھ دیر ٹھہرتی تو میرا ارادہ۔ بغیر طشتری کے
پیالی لانے پر اسے ڈانٹ ڈپٹ کرنے کا تھا.... لیکن وہ تو
جا چکی تھی۔ اب میں اپنے دوست کی طرف پلٹ کر دیکھتا ہوں
تو وہ کاغذ کی طرح سفید.... اور ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ۔
ابھی میں سوچ ہی رہا تھا کہ اس نے غٹاغٹ پیالی کو خالی کر دیا
اور اسے تیزی سے رکھ دیا.... میں نے آگے جھک کر پیالی کے
اندر دیکھا تو.... خون خشک ہو گیا... چائے تو کسی حال اس میں
نہ تھی بلکہ چائے تو ایک ہی گھونٹ میں سب کی سب کیسے پی
جاتا؟ پیالی کی تہ میں چائے کا رنگ کیوں نہیں؟ میرا چہرہ شرم سے
سرخ ہو گیا... ایسا معلوم ہونے لگا جیسے مجھ پر گھڑوں پانی پڑ گیا۔
میری آنکھیں جھک گئیں... میرا دوست نہ جانے کس حال میں تھا۔
کافی دیر ہو چکی تھی۔ اس لئے وہ جانے کے لئے اٹھا... اور جانے
کی اجازت طلب کی۔ میں نے گردن اٹھانی چاہی تو ایسا محسوس
ہوا جیسے کمرہ کی چھت کا سارا بوجھ میرے سر پر دھرا ہے... اسی طرح
گردن جھکائے میں نے گلوگیر آواز میں کہا۔ "خدا حافظ"....
اور یہ تک نہ دیکھا کہ میرا دوست کب کا چلا گیا۔ میں وہاں سے
پیچ و تاب کھاتا اٹھا.... اور نیچی گردن کئے۔ آہستہ آہستہ
قدم اٹھاتا... اندر داخل ہوا غم و غصہ کی چنگاریاں میرے تن
بدن میں چمک رہی تھیں.... "کہاں ہے وہ لاکی بچی" میں نے
داخل ہوتے ہی پوچھا۔ وہ باورچی خانہ سے باہر آئی۔ "جی" اس نے
مجھے سر سے پیر تک گھورتے ہوئے کہا۔ "جی.... کیوں ری
تو ہمارا نمک کھاتی ہے اور ہماری ہی عزت کے در پے ہے"...
"میں نے کیا کیا سرکار"....

"تو نے کچھ نہیں کیا۔ ارے تو نے تو ہماری عزت پر پانی
پھیر دیا۔ جی چاہتا ہے کہ تجھے گھر سے باہر کر دوں۔ تو کمبخت
...ہے یا چڑیل..." میرے اس جملہ پر وہ سچ مچ چڑیل کی
طرح تیز ہو کر بولی۔ آخر میں نے ایسا کیا قصور کیا ہے جو آپ
مجھے "غیر غلط" بول رہے ہیں... بیگم صاحب بھی مجھے آج تک
تم سے تو نہیں بولے..." "ارے کمبخت ہی... پانی پلانے کا
یہ کوئی طریقہ ہے، پیالی میں پانی لاتے ہیں شریف آدمی کو
... پیالی میں... آخ..." اتنے میں وہ بھی آ گئیں... "کیا
ہو رہا ہے... بے چاری پر خواہ مخواہ کیوں بگڑ رہے ہو"....
"آئیے آپ بھی کچھ سنئے... میرے دوست نے پانی مانگا تو

اس... اس نے... چار پیسے کی پیالی میں لا دیا... گھر میں ایک چھوڑ ہزار گلاس ہوں گے... مگر... اب تم ہی کہو اس نے ہمارے گھر کے متعلق کیا رائے قائم کی ہوگی۔ تمہارے متعلق اس نے کیا سوچا ہوگا... ؟ میرے متعلق... مجال ہے کسی کی... میرے متعلق کوئی سوچے گا... کیا سوچے گا؟" .. میں غصہ سے کانپنے لگا۔ ان کے اس سوال کا جواب حلق تک تھا کہ " وہ تم کو دنیا بھر کی سلیقہ شعار۔ گھر گرہستی... منتظم ... اور جانے کیا کیا سمجھتا ہوگا"۔ لیکن میرے منہ سے ان جملوں کو سن کر ان کا دل پاش پاش ہو جاتا۔ کلیجہ چھلنی ہو جاتا خموشی بہتر تھی۔ اور یہی میں نے اختیار کی... انھوں نے ماما کی طرف مخاطب ہو کر پوچھا...

" کیوں ری کیا گھر میں گلاس نہیں ہیں۔" ماما چھوٹتے ہی بولی۔ " بیگم صاحب ہوتے تو کیا میں نہ دیتی.. آپ ہی کے ہاتھ سے سات کو دو گلاس ٹوٹے... گھر میں ایک گلاس بھی نہیں ہے... اس میں میرا کیا قصور ہے۔ بھلا... گلاس سنگوا دیجئے۔ گلاس ہی میں پانی جائے گا..." ...

" چلو جانے دو، اتفاق کی بات ہے... ہر گھر میں ایسے اتفاقات پیش آتے ہی رہتے ہیں..." " نہیں مجھے بے حد رنج ہے... وہ اں تم ہوتیں تو میری حالت کو دیکھ کر تمھیں رونا آجاتا.. اتنی شرمندگی تو آج تک اٹھانی نہ پڑی۔"

" چلو بس جانے دو.. اری دیکھتی کیا ہے... جا سرکار غصہ میں ہیں، ذرا ٹھنڈا پانی تو لا۔ اور وہ اُٹھی وہی کمبخت پیالی .... دل نے کہا کہ چلو سے پانی پینا منظور لیکن اس نامراد پیالی کو دیکھنا گوارا نہیں.. پیالی کو زمین پر دے مارنا چاہتا تھا... چور چور کر دینا چاہتا تھا.. لیکن خود انھوں نے اپنے ہاتھ سے اسے میرے ہونٹوں تک پہنچایا... اور جب میں ایک دو گھونٹ اپنے کانٹوں بھرے حلق سے نیچے اتار چکا تو وہ کھلکھلا کر ہنسنے لگیں۔ مجھے آج بڑی شرمندگی اٹھانی پڑی" میں نے بچہ کی طرح بسورتے ہوئے کہا۔ " دوستوں کو آنے ہی نہ دو... چلو جھگڑا ختم... " ... ع ہائے میں کیا کروں کہاں جاؤں.. دوستوں کے بغیر میری زندگی کیونکر گزرے گی... اور بیوی کی " تحویل " میں میرا کیا حشر ہونے والا ہے... اس کا علم خدا ہی کو ہے... ایک دن اسی مسئلہ پر حقیقت سی " تو تو میں میں " کا خیال ہے۔ پھر اس کے بعد بھی ان کا طرز عمل یہی رہا تو کوئی بھی ملاقاتی آئے... دروازہ پر جاؤں گا... سلام علیک کر کے اس دوست سے کہوں گا کہ " میں گھر پہ نہیں ہوں" وہ اس پر بھی نہ ٹلا تو " میں مر گیا ہوں " کہتا ہوا اندر چلا آؤں گا..

رشید قریشی

فانی

دورِ حاضر کے غزل گو شعرا میں فانی ایک ممتاز حیثیت رکھتے ہیں۔ کیا بلحاظ تخیل اور کیا بلحاظ اسلوبِ بیان وہ ایک طرز خاص کے مالک ہیں۔ اس کے باوجود کہ ان کے ہاں میر کی قنوطیت ہے غالب کی دقت پسندی ہے۔ مومن کی نزاکت ہے پھر بھی ان کی انفرادیت گم نہیں ہوتی۔ اس لئے کہ فانی نے اپنے پیشروؤں سے اکتسابِ فیض ضرور کیا ہے لیکن اپنے کو کسی میں ضم کر دینے کی ذلت گوارا نہیں کی اور دنیائے ادب میں ایسے ہی لوگ زندہ رہتے ہیں جو خود اپنا ایک مستقل مقام رکھتے ہیں۔ جو خصوصیت فانی کو اور شعرا سے خاص طور پر ممتاز کرتی ہے ان کی غایت درجہ کی قنوطیت ہے۔ ان کا ہر شعر ایک دردمند دل کی آواز معلوم ہوتا ہے۔ خود انھیں کے الفاظ میں ان کے اشعار ان کے دل کے داغ ہیں۔ چنانچہ باقیات کے سرورق پر یہ شعر لکھا ہے کہ

کیوں اہلِ حشر ہے کوئی نقادِ سوزِ دل
لایا ہوں دل کے داغ نمایاں کئے ہوئے

اسی لئے رشید احمد صاحب نے فانی کو "یاسیات کا امام" اور عندلیب شادانی نے "مرگھٹ کا رونے والا" کہا ہے۔ ان خطابات سے فانی کی افتادِ طبع سے زیادہ صاحبانِ سخن کی شوخیٔ طبع جھلکتی ہے۔ فانی کے یہاں ایسی قنوطیت نہیں جو دل و دماغ کو مضمحل اور زندگی کو بے کیف کر دیتی ہے۔ ان کی قنوطیت میں کرب و اضطراب کی بجائے ایک اطمینان و سکون ہے اور یہ ایسی نعمتِ عظمیٰ ہے جو انھیں کے عقیدے کے مطابق صرف قسمت کے دھنی پاتے ہیں۔

غم وہ راحت جسے قسمت کے دھنی پاتے ہیں

جب کسی پر تابڑ توڑ مصیبتیں پڑتی ہیں اور ایسی بے کسی کے عالم میں تنکے کا سہارا بھی نصیب نہیں ہوتا تو وہ (لاتقنطوا من رحمۃ اللہ) کے عہدِ محکم سے بھی مایوس ہو جاتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں اس کی مایوسیاں اس کو کفر والحاد کے حدود تک پہنچا دیتی ہیں چنانچہ مرزا غالب جو ممکن ہے اپنے بیان کے مطابق پوشیدہ ولی ہوں گے کیونکہ غیب کا حال تو خدا کو معلوم ہے لیکن ساتھ ہی جیسا کہ اپنے کھلے کافر ہونے کا بھی اعتراف کیا ہے آئے دن کی مصیبتوں سے تنگ آکر کہہ اٹھے۔

زندگی اپنی جو اس شکل سے گزری غالب
ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

اسی طرح کی مصیبتیں جب فانی پر پڑتی ہیں تو ملول وہ بھی ہوتا ہے اور یہ انسانیت کا تقاضا ہے لیکن خدا سے مایوس نہیں ہوتا۔ کبھی پیمانۂ صبر چھلک بھی اٹھتا ہے تو زیادہ سے زیادہ یہی کہتا ہے کہ

یارب تری رحمت سے مایوس نہیں فانی
لیکن تری رحمت کی تاخیر کو کیا کہئے

جب اس کو اپنی تدبیر میں ناکامی ہوتی ہے تو وہ غم و غصہ کے جذبات کی رو میں بہہ نہیں جاتا بلکہ ٹھنڈے دل سے ناکامی کے اسباب پر غور کرتا ہے اور بالآخر اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ انسان کی سعی و کوشش کیسی ہی مکمل کیوں نہ ہو کامیابی کی ضامن نہیں ہو سکتی کیونکہ تدبیر کی کامیابی اور ناکامی کا انحصار محض اسباب و علل پر نہیں بلکہ اس قوت پر ہے جو نامعلوم طور پر اسباب و علل کے ساتھ ساتھ کارفرما ہے جس کو عرفِ عام

میں تقدیرِ الٰہی کہتے ہیں۔

حسن تدبیر نہ رسوا ہو جائے
رازِ تقدیرِ الٰہی کو، نہ پوچھ

لیکن اپنے کو اس طرح مجبورِ محض سمجھ لینے کے بعد معاً اس کا ذہن مسئلہ خیر و شر کی طرف منتقل ہو جاتا ہے کیونکہ مجبوریٔ محض کو تسلیم کر لینے کے لئے جزا و سزا کا تخیل ایک واہمہ بن جاتا ہے۔ اب وہ پھر نئے سرے سے اپنے ارادۂ عمل اور ان کے نتائج کا جائزہ لیتا ہے تو اس مجبوری میں بھی ایک ایسا اختیار پاتا ہے جو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا اور کہتا ہے کہ

فانی ترے عمل ہمہ تن جبر ہی سہی !!
سانچے میں اختیار کے ڈھالے ہوئے تو ہیں

ہر انتا و فانی کے لئے ایک دعوتِ فکر ہوتی ہے۔ اور جب یہ غور و فکر اس کو ایمان و ایقان کی بدولت سرفراز ہوتا ہے تو وہی مصیبتیں اور ناکامیاں جو کوتاہ ظرف انسانوں کو تشکیک والحاد کی گمراہیوں کا شکار کر دیتی ہیں فانی کو خدا کے افضال و اکرام معلوم ہونے لگتی ہیں۔ اب اس مقولہ کو "اپنے ارادوں کے فسخ ہونے سے میں نے خدا کو پہچانا" ذہن میں رکھ کر فانی کا یہ شعر سنئے۔

تیرا انعام سمجھتا ہوں ان ارمانوں کو
میری کوشش کا جو حاصل نہیں ہونے پاتے

یہی وجہ ہے کہ فانی کی قنوطیت سکون پرور ہے۔ قنوطیت تو میر پر بھی چھائی ہوئی ہے لیکن ایسی قنوطیت جو پڑھنے والے کو مضمحل اور افسردہ کر دے۔ برخلاف اس کے فانی کا پڑھنے والا متاثر ضرور ہوتا ہے لیکن اطمینانِ قلب نہیں کھوتا۔ اس لئے کہ اس کے نظریے محض سلبی ہی نہیں بلکہ ایجابی بھی ہیں۔ جب اس کا دل دکھتا ہے تو فطرتِ انسانی کے تقاضا کے مطابق وہ آنسو بہانے پر مجبور ہو جاتا ہے لیکن ساتھ ہی اس دکھے ہوئے دل کو دولت دو جہاں سے زیادہ قیمتی بھی سمجھتا ہے۔ اردو کا ایک اور بلند پایہ شاعر جن کا کلام غم و اندوہ کا مرقع ہے میر انیس ہیں لیکن ان کا رنج و غم محض اعتقادی ہے۔ وہ اس لئے روتے ہیں کہ ان کے آنسو میزانِ حشر میں موتیوں کے ساتھ تولے جائیں۔ ایسی صورت میں ان کا یہاں ذکر ہی عبث ہے۔

ولی سے لیکر داغ تک بلکہ خود فانی کے ہمعصر شعراء کا کلام دیکھیے تو بائے بسم اللہ سے تائے تمت تک سارا دفترِ محبت کے شکوؤں سے بھرا پائیں گے۔ گویا شکوہ و شکایت عشق کا لازمہ ہو گئے ہیں بلکہ غزل کی ساری کائنات شبِ ہجر کے دکھڑے۔ معشوق کی رقیب نوازیوں پر سینہ کوبی، اپنی تیرہ بختی کا ماتم اور فلک کج رفتار کی عداوت جیسے اعلیٰ مضامین ہی تک محدود معلوم ہوتی ہے۔ محبوب کے جفا کارانہ کردار کو اس طرح چھڑک چھڑک کر پیش کرتے ہیں کہ ہلاکو خاں اور نیرو کی ستم رانیوں کا رنگ پھیکا پڑ جاتا ہے۔ کیا واقعی اس قسم کے جذبات محبت کا لازمہ ہیں ایک ایسا سوال ہے جو لازماً غزل کا نفسیاتی تجزیہ کرنے والے کے ذہن میں پیدا ہوتا ہے۔ اور یہ امر ذرا غور طلب ہے۔ عاشقی ذرا صبر طلب ہی ہوتی ہے کیونکہ محبوب کی طرف سے ہمیشہ بے نیازی اور تغافل ہی برتا جاتا ہے۔ اور عاشق فطرتاً مضطرب اور مستعجل ہوتا ہے اس تضاد اور کشمکش کا لازمی نتیجہ عاشق کی دل شکستگی اور برہمی ہے تنگ آمد بجنگ آمد۔ لیکن بے چارہ کچھ کر تو سکتا نہیں دل کا غبار نکالنے کے لئے شکایت و ملامت

کا علمبردار بنا دیتا ہے۔ لیکن یہ حقیقت بھی بہت دلچسپ ہے کہ عاشق جس قدر کوتاہ ظرف ہوتا ہے اسی قدر جلد افتادِ محبت سے گھبرا اٹھتا ہے۔ اسلئے وہ جس قدر محبوب کی بدسلوکی کا مظاہرہ کرتا ہے اسی قدر اپنی کوتاہ ظرفی اور زبوں ہمتی کا اعلان کرتا جاتا ہے۔ اب ذرا فانی کی ہمت کا عالم دیکھیے۔ مشقِ ستم اس پر بھی ہوتی ہے۔ قدم قدم پر ناکامی ہوتی ہے مصیبت پر مصیبت آتی ہے۔ سر پر قیامت ٹوٹ پڑتی ہے لیکن وہ رضا و تسلیم کا پیکر بنا ہوا خندہ پیشانی سے ہر تلخی کو گوارا کرتا چلا جاتا ہے۔ اس کا جنونِ وفا تو محبوب کی جفا کو جفا بھی سمجھنے نہیں دیتا۔

ان کی کسی ادا پہ جفا کا گماں نہیں
شوخی ہے جو بسلسلۂ امتحاں نہیں

اگر کبھی جفا کو جفا سمجھ بھی لیتا ہے تو وفاؤں کی عزت کا پاس دامن گیر رہتا ہے۔

ظالم کا نہ شکوہ کر ظلموں کی نہ پروا کر
تو اپنی وفاؤں کی عزت پہ فدا ہو جا

اگر کوئی تمنا بھی کرتا ہے تو شیوۂ تسلیم کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتا۔ دیکھیے کس حسین انداز میں کرم کی التجا کرتا ہے۔

فانیٔ زار پر کرم تیری رضا کے ہے سپرد
ایک نگاہ اور بھی یہ بھی نہیں، نہیں سہی

اردو شاعری میں محبوب کا کردار جیسا کچھ سوقیانہ ہے محتاجِ بیان نہیں۔ ایسے بازاری حسن کے طلب گار دلوں کی محبت کا معیار بھی ظاہر ہے۔ پھر انشا، جرات اور داغ جیسے رنگین مزاج شعرائے کرام کی گندہ ذہنی نے تو غزل کو کلنگ کا ٹیکا لگا دیا۔ کم و بیش ہر شاعر کے ہاں ایسے سوقیانہ مضامین ملیں گے جو خود شاعر کی رکاکتِ نفس پر دلالت کرتے ہیں لیکن فانی ہی ایک ایسا شاعر ہے جس نے آدابِ محبت میں سرمو فرق آنے نہیں دیا اس کے ایک ایک شعر سے محبوب کی عظمت ٹپکتی ہے اور اس کا یہ جذبۂ احترام اس کے محبوب سے زیادہ خود اس کی عظمت کا نقش دل پر بٹھاتا ہے۔ جب وہ اپنے محبوب کو سرکار اور حضور جیسے شایانِ شان الفاظ سے مخاطب کرتا ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک غلام اپنے عالی مرتبت آقا کی بارگاہ میں سہما ہوا کھڑا ہے اور نہایت تعظیم و تکریم کے ساتھ عرضِ حال کئے جا رہا ہے۔

بیداد پہ کہیئے اف نہ کریں کم کہیئے تو تڑپ کر دم دے دیں
کچھ ڈھنگ ہمیں بھی آتے ہیں سرکار کا دل بہلانے کے

سرکار پاسِ وضعِ جفا چاہتا ہوں میں
یہ بھی اگر وفا ہے تو اچھا نہ کیجیے!

دنیا کا بہ نظرِ غائر مطالعہ کرنے والا ہمیشہ مقصدِ حیات کی تحقیق اور زندگی کے مفہوم کی تعیین میں سرگرداں رہتا ہے۔ کبھی جبر و قدر کی پر پیچ گتھی کو سلجھانے کی کوشش کرتا ہے۔ کبھی خیر و شر کے مسئلہ کو حل کرنا چاہتا ہے۔ کبھی وحدت و کثرت کے صوری تضاد میں گم نظر آتا ہے۔ یہی حال فانی کا ہے۔ یوں تو زندگی کا مفہوم سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش غالب نے بھی کی ہے۔ حضرت اصغر نے بھی جگہ جگہ اس عقدہ کی گرہ کشائی فرمائی ہے لیکن جو جامعیت اور حقیقت فانی کے ہاں ہے وہ اوروں کے پاس مشکل ہی سے نظر آتی ہے۔ مگر بڑی دقت یہ ہے کہ ہم ایک کے خیال کا دوسرے کے خیال سے موازنہ بھی نہیں کر سکتے۔ اول تو ایک ہی شاعر کی تعریفوں میں تنوع بلکہ کہیں کہیں

؎ یہ صحیح نہیں

تضاد بھی ہے۔ دوسری دشواری یہ ہے کہ ہر شخص کا زاویۂ نگاہ جدا ہوتا ہے۔ ایسی صورت میں مقابلہ کس قدر مشکل ہے۔ اس لئے یہاں فانی کے چند شعر نقل کر دئے جاتے ہیں ناظرین خود اندازہ کریں۔

مائیہ اوراکِ ہستی ہوں تکلف برطرف
زندگی میری دروغِ مصلحت آمیز ہے

تجلیاتِ وہم ہیں مشاہداتِ آب وگل
کرشمۂ حیات ہے خیال وہ بھی خواب کا

ہر مژدۂ نگاہ غلط جلوہ خود فریب
عالم دلیل گمرہی چشم و گوش تھا

نہ ابتدا کی خبر ہے نہ انتہا معلوم
رہا یہ وہم کہ ہم ہیں سو وہ بھی کیا معلوم

زندگی خود کیا ہے فانی یہ تو کیا کہیے مگر
موت کہتے ہیں جسے وہ زندگی کا ہوش ہے

اکثروں کا خیال ہے کہ فانی کی زبان وبیان میں بڑی ثقالت اور تکلف ہے۔ والہانہ بے ساختگی جس کو وہ اپنے خیال میں آرٹ سمجھتے ہیں فانی کے یہاں مفقود ہے رشید احمد صاحب کے خیال کے مطابق ان حضرات کا تعلق اسی گروہ سے ہے جو یہ سمجھتا ہے کہ "جو کچھ دل میں آئے وہ زبان پر نہ آسکے تو نہ آسکے اسے صفحۂ قرطاس پر آجانا چاہیے۔ یہی کمال انشا پردازی ہے جس میں تغیر وتبدل آرٹ کا خون کرنا ہے ان بزرگوں کے نزدیک ان کی ہر لغزش یا برہنگی کا جواز آرٹ میں مل سکتا ہے"۔ شاعر کا آرٹ یہ ہے کہ شعریت کو برقرار رکھتے ہوئے اپنے خیال کو بہ احسن وجوہ اس طرح ادا کر دے کہ اس سے زیادہ جامعیت اور حسن کے ساتھ اظہار کرنا ممکن نہ ہو۔ فانی کا سطحی نظر سے مطالعہ کرنے والے یہ نہیں دیکھتے کہ وہ کیسے پیچ در پیچ خیال کو کس قادر الکلامی کے ساتھ ادا کر جاتا ہے یہ واقعہ ہے کہ جس کا تخیلہ قوی ہوتا ہے زبان کی پونجی اس کی فکر کی اڑان کا ساتھ نہیں دے سکتی۔ بے چارے غالب ہی کا حال دیکھ لیجئے جب اردو کے محاورے اور ترکیبیں اس کے تخیل کی رفعت اور نزاکت کی ترجمانی سے قاصر ہو جاتے ہیں تو فارسی اضافتوں کے ردے چڑھانا جاتا ہے۔ پھر بھی مطلب شاعر در بطن شاعر ہی رہ جاتا ہے۔ لیکن فانی کے ہاں باوجود علوِ تخیل کے نامانوس ترکیبیں اور غیر مطبوع اضافت در اضافت نہیں۔ جہاں خیال الجھا ہوا ہوتا ہے فانی بھی فارسی کا سہارا لیتا ہے لیکن اس حسن سے کہ شعر سے اردو پن جانے نہیں پاتا۔

ہوں اسیرِ فریب آزادی
پر ہیں اور مشقِ حیلۂ پرواز

انسان کو جو نام نہاد اختیار دیا گیا ہے۔ اسیر فریب آزادی سے زیادہ حسین اور جامع انداز میں پھر اس حسن اختصار کے ساتھ ادا کرنا تقریباً ناممکن ہے۔ اور تدبیر کو جو نامعلوم طور پر تقدیر الٰہی کے اشاروں پر چلتی ہے کسی بلاغت کے ساتھ مشق حیلۂ پرواز کہا ہے۔

دادِ مظلوم نگاہی بھی تو لے لینے دے۔
ٹھہر اے موت کہ قاتل کو پشیماں کر لیں

دادِ مظلوم نگاہی کی بلاغت کے قطع نظر قوتِ سامعہ کو صحیح حکم تسلیم بھی کر لیا جائے تو کون صاحب ذوق کہہ سکتا ہے کہ یہ ترکیب سماعت پر گراں گزرتی ہے میں نے مثالاً دو ایک شعر دے دئے ہیں اور ہر جگہ یہی کیا ہے تاکہ مضمون میں غیر ضروری

طوالت نہ پیدا ہو۔

بالعموم فانی صرف اشارے کنائے میں وسیع سے وسیع مضمون ادا کر جاتے ہیں مگر ایسا نہیں کہ شعر چیستاں بن جائے۔ بلکہ معمولی غور سے مدعا سمجھ میں آجاتا ہے اور وہی اشارے کنائے شعر کا حسن اور شعریت کی جان بن جاتے ہیں۔ یہ قدرت بیان کی کوتاہی نہیں بلکہ قادر الکلامی کی دلیل ہے۔

آج پہلو میں کیوں ہے سناٹا
کیا ہوئی آہ آہ کی آواز!

محشر میں بھی وہ عہد وفا سے مکر گئے
جس کی خوشی تھی اب وہ قیامت نہیں رہی

جانے دل کے لہو پہ کیا گزری
رنگ اشکوں کا زرد رہتا ہے

معنی آفرینی اور نزاکت بیان فانی کی ایسی نمایاں خصوصیات ہیں کہ ان کی تصریح تحصیل حاصل ہے۔ رسماً ایک دو شعر پیش کئے جاتے ہیں۔

مدعا ہے کہ مدعا نہ کہیں
پوچھتے ہیں کہ مدعا کیا ہے

وہ بالعموم متضاد صورت سے ایسے موافق اور لطیف معنی پیدا کرتے ہیں کہ سننے والا پھڑک اٹھتا ہے۔

امید عفو ہے ترے انصاف سے مجھے
شاہد ہے خود گناہ کہ تو پردہ پوش تھا

یہ ایک کھلی حقیقت ہے کہ اگر خدا محض انصاف سے کام لے تو شاید ہی کوئی بخشش کا مستحق نکلے۔ لیکن فانی کی شوخی دیکھنا کہ وہ انصاف ہی سے امید عفو کہتے ہیں۔ لیکن مصرع ثانی کا حسن استدلال انھیں حق بجانب کر دیتا ہے۔

اسی سلسلہ میں ان کے انداز بیان کی ایک اور خصوصیت پر روشنی ڈالنا ضروری ہے۔ جن شعرا کے ہاں خیال مقدم ہوتا ہے ان کے کلام میں لفظی محاسن ڈھونڈنا ہی فضول ہے۔ جن کے ہاں معنوی حسن مفقود ہوتا ہے۔ وہ الفاظ کے حسن اور زبان کے چٹخارے سے کلام کو چمکانا چاہتے ہیں۔ اس کے یہ معنے نہیں کہ فانی کا کلام سرے سے محاسن لفظی سے عاری ہے۔ محاسن لفظی بھی ہیں مگر کم اور وہ بھی خیال کے تابع اور زور بیان کی رو میں بہہ کر چلے آئے ہیں۔ البتہ تکرار کے ساتھ اس کے متضاد لفظ کی بھی تکرار کرتے چلے جاتے ہیں۔ تقریباً ہر شعر کا یہی عالم ہے۔ لیکن باوجود اس کثرت کے یہ طرز بدنما نہیں معلوم ہوتا۔ کہیں ایک آدھ شعر "کا فقدان" بن گیا ہو تو بن گیا ہو ورنہ فانی کے کلام کی یہ خصوصیت ہر جگہ حسین معلوم ہوتی ہے

ان کی دل نوازی میں کوئی شک نہیں لیکن
ان کی دل نوازی کو لاگ ہے تمنا سے

تم سے ملنے کی آرزو ہی سہی
تم سے ملنے کی آرزو تو کریں

سنتے تھے محبت آساں ہے۔ واللہ بہت آساں ہے مگر
اس سہل میں جو دشواری ہے وہ مشکل سی مشکل میں نہیں

حفیظ قتیل

گوالن

انسانیت کی قدر، خلوص اور محبت آج کل کے پڑھے لکھے لوگوں میں کہاں، یہ نعمتیں اُن لوگوں کا حصہ ہیں جن کو مہذب طبقہ، گنوار، قریہ باش کہتا اور نظرِ حقارت سے دیکھتا ہے۔

اُس زمانے میں جب کہ میسور پر پالیگاروں کی حکومت کا پرچم لہرا رہا تھا، انسانوں کے خون سے ہولی کھیلی جارہی تھی، رحم وکرم کی جگہ بربریت اور غارتگری کا دور دورہ تھا، انسانوں کا شکار محض دل کا بہلاوا خیال کیا جارہا تھا، ایسے وحشت خیز دور میں چند ایسی ہستیاں خدا نے پیدا کردیں جن کا وجود ایک دیوتا یا فرشتے سے کم نہ تھا۔

میسور کا ملک اس وقت پہلوانوں کا اکھاڑا تھا، کوئی دن، کوئی ساعت، ایسی نہ گزرتی جس میں انسانوں کا خون پانی کی طرح نہ بہایا جاتا ہو۔ ہر زبردست اور یہی چاہتا تھا کہ کمزور کی ہستی کو نیست و نابود کردے درندوں کی طرح لڑتے رہنا، مچھلی کی طرح کمزور کو مار کر اپنی آتشِ شکم کو بجھانا اور اپنی کامیابی پر اکڑنا معمولی مشغلہ تھا، اس وقت ایسا کرنا ناگوار بھی نہیں سمجھا جاتا تھا کیونکہ عام فضا یہی تھی۔ حیرت تو یہ ہے کہ آج کل کے جیسے شائستہ زمانے میں ایسی ناشائستہ حرکتیں اچھی نظر سے دیکھی جارہی ہیں۔ بھلا یہ کونسا انصاف ہے کہ ہم اپنے زمانے میں بربریت کو اپنی آنکھوں سے دیکھیں تو کچھ نہ کہیں اور گزرے ہوئے لوگوں کی برائیوں کو طشت از بام کریں۔

چتل درگ کا ایک ایک معمولی راجا تھا لیکن چند معرکوں میں اس کی کامیابی نے بہت زیادہ مغرور بنادیا تھا۔ آس پاس کے معمولی قلعہ دار ملا پر اس کی بہادری کی دھاک بیٹھ چکی تھی، اپنی کامرانی کے بعد اس نے یہاں کے پہاڑ پر ایک مضبوط قلعہ بنایا، یہ قلعہ پہاڑ کی چوٹی پر ہے۔ اس کے چاروں طرف پتھر کی مضبوط فصیل ہے۔ پہاڑ کے دامن میں ایک جھیل ہے جو پہاڑ کے تین چوتھائی حصے کو گھیری ہوئی ہے، قلعے میں پہنچنے کے لئے سنگین سیڑھیاں بنائی گئی ہیں اور جگہ جگہ رہنے کے لئے سنگین مکان ہیں اور ان مکانوں میں پتھر کے بت رکھے گئے ہیں۔ پہاڑ کی چوٹی پر سنگین محل اور محل سے تھوڑی دور پر ایک چھوٹا سا تالاب ہے جس میں بارش کے موسم میں پانی زیادہ رہتا ہے۔ پہاڑ پر کچھ دور چڑھنے کے بعد قلعے کا صدر دروازہ ملتا ہے جو بہت بلند اور پتھر کا بنا ہوا ہے۔ صنعت و کاریگری کا تو نام و نشان نہیں نظر آتا لیکن ایک سیاح کا دماغ اس وقت کے لوگوں کی طاقتوں کا اندازہ آسانی سے کرسکتا ہے۔ معمولی پتھر کے سادہ اور اونچے ستون کھڑے کردئے گئے ہیں۔ صدر دروازے سے پہاڑ کی چوٹی تک دو ایک دروازے اور ملتے ہیں۔ ان دروازوں کے درمیان کھنڈر ہی کھنڈر ہیں جہاں کسی زمانے میں شاندار عمارتیں ہونگی لیکن اب تو ان پر اُلو بول رہے ہیں۔ جابجا ٹوٹی پھوٹی دیواریں، ان میں بھیڑیوں اور گیدڑوں اور ابابیلوں نے اپنا مسکن بنالیا ہے۔ درخت اور خاردار جھاڑیاں جابجا اگی ہیں، وہ بھی شبابِ رفتہ کا نوحہ کرتی ہوئی نظر آرہی ہیں۔ اسی کھنڈر کے درمیان درختوں کے جھرمٹ میں ایک چشمہ ہے جس کا شفاف پانی آبِ حیات سے بھی سوا ہے۔ یہ پانی پہاڑ کی ایک ٹوٹی ہوئی چٹان سے نکلتا ہے۔ گڑھے میں جمع رہتا ہے اور وہاں سے ایک نالے کی صورت میں آہستہ آہستہ بہہ کر نیچے دامن میں آتا اور ایک سرنگ سے گزرتا ہے۔ اس سرنگ کے قریب کئی کئی چٹانیں ہیں اور ان چٹانوں کے درمیان کئی گھنے درخت ہیں، خار دار جھاڑیوں نے اس سرنگ کو اور بھی محفوظ بنادیا ہے۔ ان چٹانوں میں گزرنے کے لئے ایک پگڈنڈی بنائی گئی ہے جس کے نیچے اوپر چٹانیں ہی چٹانیں ہیں

اکثر چیتے اور بھیڑیے رہتے ہیں۔ لیکن اگلے زمانے میں یہی پگڈنڈی قلعے میں پہنچنے کے لئے "چور راستہ" کہلاتی تھی۔

جب حکومت بیجاپور نے نواب حیدر علی خاں کو سرا (رستم آباد) کا گورنر بنایا اور آس پاس کے راجاؤں سے خراج وصول کرنے کا انہیں اختیار دیا تو حیدر علی نے ان بالیگاروں سے خراج وصول کرنا شروع کیا۔ لیکن جب جتل درگ کے نایک سے خراج کی طلبی ہوئی تو اس نے نواب کی درخواست کو ٹھکرایا ہی نہیں دیا بلکہ جنگ کا اعلان کردیا اب تو نواب کو بھی مجبوراً اس کی سرکوبی کرنا پڑی۔ نواب اپنے لشکر کے ساتھ سرا سے نکلے اور دو ایک مقام کے بعد جتل درگ کا محاصرہ کرلیا۔ کئی دنوں تک نواب کی فوجیں پڑی رہیں مگر قلعہ فتح نہ ہوا سپاہی ہر روز قلعے پر چڑھنے کی کوشش کرکے ناکام رہتے اس لئے کہ محصور فوجیں جن کے دلوں میں تعصب اور انتقام کی آگ بھڑکی ہوئی تھی، فصیل پر چڑھنے والے سپاہیوں کو تیروں کا نشانہ بناتی، آگ پھینکتی یا گرم گرم تیل انڈیلتی تھیں۔ چڑھنے والے سپاہی نشانہ لگاتے ہوئے پرندوں کی طرح نیچے گرتے اور وہیں ڈھیر ہوجاتے تھے۔

کئی دن تک یہی حال رہا، لاشوں کے انبار لگ گئے، بہت سی لاشیں سڑ گئیں، ان کی بدبو نے گاؤں والوں کو ہراساں کردیا تھا، گاؤں والوں سے ایسی بیرحمی کب تک دیکھی جاتی، وہ بھی تنگ آگئے تھے مگر کسی کو یہ ہمت نہ تھی کہ نواب کی فوجوں سے مل کر قلعے کے خفیہ راستوں سے آگاہ کردے اکثر لوگ ان راستوں کو جانتے بھی نہ تھے اور جو جانتے تھے وہ راجا کے ہی خواہ تھے یا اس سے زیادہ خوف زدہ۔

قلعے سے ایک میل دور نواب کی فوجوں نے قیام کیا تھا وہاں ایک چھوٹا سا قریہ بھی تھا، رتنا اسی قریہ میں رہتی تھی۔ اس گاؤں میں ادھر ادھر چند جھونپڑیاں تھیں، سامنے کھنڈل سے لگے ہوئے دو مٹی کے گھر تھے جن میں پٹیل اور پٹواری رہا کرتے تھے، رتنا کی جھونپڑی سے لگی ہوئی ایک دوسری جھونپڑی تھی جس میں رتمو رہتا تھا، ان دونوں جھونپڑیوں کا ایک ہی آنگن تھا۔ رتمو کی جھونپڑی سے بالکل قریب کئی سایہ دار درخت تھے اور درخت کے نیچے ایک ٹوٹی پھوٹی چارپائی پڑی رہتی تھی۔ رتنا نے آنگن میں کئی قسم کی ترکاریوں کی بیلیں لگائی تھیں اور ان کے لئے چھوٹے چھوٹے منڈھے بھی بنائے تھے۔ درختوں سے لگا ہوا ایک گئوشالہ تھا جس میں رتنا اپنے گائے بیل باندھتی تھی۔ پٹیل کے مکان کے سامنے کنواں تھا جس سے گاؤں کے تمام لوگ پانی لیتے تھے۔ رتمو کے بیوی بچے مر چکے تھے، وہ تنہا اپنی زندگی گزار رہا تھا۔ اس کا ایک کھیت تھا اور چند گائے بیل۔ گو رتمو مسلمان تھا اور رتنا ہندو۔ ان دونوں کا تعلق باپ بیٹی کا سا تھا۔ ایک روز صبح کو سورج کی کرنیں درختوں کے پتوں سے چھن چھن کر آنگن میں گر رہی تھیں، رتنا بیٹھی دودھ دوہ رہی تھی، بوڑھا رتمو کمبل اوڑھے، کھانستا ہوا ہاتھ میں چلم لے کر جھونپڑی سے باہر نکلا اور رتنا کی جھونپڑی کے پاس آکر پکارا، رتنا نے دوہتے ہوئے جواب دیا، کیا ہے ــــ ! باوا جی ! ــــ

بوڑھے نے پلٹ کر دیکھا اور کہا: بٹیا تو دودھ دوہ رہی ہے، چولہے میں آگ ہے کہ نہیں؟ ہو تو ذرا چلم بھر لوں ــــ ہوگی باوا جی! اندر جاکر لے لو، دھوپ نکل چکی ہے کلے کو جانا ہے، دیر ہو جائے گی رتنا نے کہا ــــ بوڑھا رتمو دعائیں دیتا ہوا اندر گیا، آگ لی اور باہر آکر چارپائی پر بیٹھ گیا۔ بوڑھا حقہ پیتا اور کھانستا جاتا تھا، سامنے رتنا دودھ دوہ رہی تھی۔ کام ختم کرلینے کے بعد رتنا چارپائی کے پاس آئی، دودھ سے بھرے ہوئے لوٹوں کو سامنے رکھ کر

قریب ہی بیٹھ گئی۔ بوڑھے نے پوچھا کیوں رتنا ابھی نہیں جائے گی تو؟ ــــ جا تو رہی ہوں باوا جی! مگر آج تم سے چند باتیں کرنا ہیں ــــ رتنا نے کہا۔ وہ کیا بیٹا! ــــ باوا جی نواب کی فوج والے کتنے بھلے آدمی ہیں کہ وہ غیر عورتوں کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھتے بھی نہیں۔ آج تک انھوں نے نہ ہمارے کھیت اجاڑ کئے، نہ گھر لوٹے ــــ میں تو باوا جی شام سویرے وہیں سے آتی جاتی ہوں مگر انھوں نے ڈانٹا تک نہیں، کیا باوا جی یہ ہمارے دشمن نہیں ہیں؟ رتنا نے حیرت سے پوچھا ــــ بوڑھے نے ہنستے ہوئے جواب دیا، وہ ہمارے دشمن کیوں ہوتے رتنا! ہم گریبوں نے نواب صاحب کا کیا بگاڑا ہے؟ دشمن ان کا راجا ہوگا، اس کے گرور کا بدلہ اسے ملے گا، ہمارے لئے تو سب ایک ہیں، ہم کیا جانیں کون نواب کون راجا ــــ ٹھیک ہے باوا جی پھر ــــ رتنا یہاں ٹھیر گئی اور پھر کہا ــــ باوا جی! وہ جو پچھلے سال اِلگنڈہ کے پالیگار پر اس ہمارے راجا نے لڑائی کی تھی تو کتنے ستم توڑے تھے، گھر بار سب جلا دئے، لوگوں کے کھیت اس نے ہاتھ پر ٹیکا لگایا، جالم کہیں کا، اسی لڑائی میں تو میرے پتی نے بھی جان دی، میری آرجوؤں کا ستیاناس ہوا، میرا سہاگ لٹ گیا، پر یہ لوگ ایسے نہیں، میرے دل میں تو ان کے لئے پریم ہے، یہ دکھی ہیں، میں ان کو کس دکھ سے بچانا چاہتی ہوں، دیوانی ہوئی ہے تو رتنا! عورت جات ان سورماؤں کے دنگل میں کیا کر سکتی ہے، دن رات گولیوں کی آواجوں سے کان پھٹے جا رہے ہیں، آدمی کتوں کی طرح مر رہے ہیں، دیکھتی نہیں آنکھوں سے تو، ہم بھی رحم کھاتے ہیں مگر آخر ــــ تم کر جو، تیرا ہے کوئی نہیں، چپ رہ، بول مت، راجا کو کھبر ہوگی تو تیری جان جائے گی ــــ اے باوا! اب ہے کون، جو روئے، جب میرا پتی مرا، میں تمھاری آڑ میں جی رہی ہوں، ساری آگ بجھ چکیں۔ گر میں ان دکھیوں کو پاپیوں کے جلم سے ضرور بچاؤں گی ــــ رتنا! تو دھن کی پکی ہے، کسی کی نہیں مانتی، جو من میں آئے کر، مگر اس بوڑھے کو اپنے کرتوت سے بچائے رکھنا ــــ مانےگی کہ نہیں، رتنا چپ تھی، بڈھے نے پھر کہا، بولتی کیوں نہیں، بھگوان دیا کرے تجھ پر ــــ اچھا! باوا جی کل پھر آتی ہوں ــــ رتنا نے رمو سے اجازت لی اور وہ لیکر قلعے کی طرف چلی گئی۔

دھوپ تیز ہو چکی تھی، نواب کے سپاہیوں نے قلعے پر دھاوا بول دیا تھا، وہ ہر چند قلعے میں پہنچنے کی کوشش کرتے تھے جان کھوتے تھے مگر کامیاب نہ ہوتے تھے، رتنا یہ سب کچھ دیکھتی تھی دل بھرآتا تھا مگر بے بس تھی، وہ جلد جلد قدم اٹھاتی ہوئی جھاڑیوں میں غائب ہو گئی، نواب کی فوج والوں نے دیکھا مگر خیال نہ کیا، وہ چور دروازے سے قلعہ میں پہنچی، دودھ دیا، اور قلعے کی فصیل کے پاس آئی جہاں راجا کے سپاہی تیل اور آگ انڈیل رہے تھے۔ انھوں نے کہا ــــ کیوں ڈر گئی تو رتنا ــــ جاتی نہیں ــــ ہاں بھیا! کیسے جاؤں، لڑائی جو رکی ہو رہی ہے، دشمن کی فوجوں نے راستے بند کر دیے ہیں، رتنا نے جواب دیا ــــ راستے بند کر دیے ہیں، ان میں سے ایک نے اس جملے کو حیرت سے دہرایا ــــ اچھا!! آج رات دیکھنا دشمن کی فوجوں کا خون ندی، نالے کی طرح بہیگا۔ رتنا خاموش رہی، جواب دینا پسند نہ کیا، باہر نکل گئی۔ آنکھ بچاتی، چھپتی چھپاتی گاؤں میں پہنچ گئی۔ ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیل رہی تھی، مگر کبھی کبھی اس کے چہرے پر پریشانی کے آثار نمودار ہوتے تھے۔ بوڑھا رمو، درختوں کے سایے میں چارپائی پر لیٹا ہوا تھا۔ گرمی زوروں کی تھی، گاؤں کے تمام لوگ کھیتوں کو چلے گئے تھے، چند بوڑھی عورتیں، گھروں کے باہر چھپر تلے پڑی سو رہی تھیں۔

بچے درختوں کی ٹھنڈی ٹھنڈی چھاؤں میں کھیل رہے تھے۔

رتنا جھونپڑی میں گئی، لوٹے دھوئے اور برتن میں چپاتیاں لیکر بوڑھے رمّو کو آواز دی ــــ روٹی کھاؤ گے باواجی! ــــ رتنا تو آگئی؟ بوڑھے نے اٹھتے ہوئے جواب دیا ــــ ہاں ابھی ابھی آئی ہوں باواجی! کیا حال ہے کچھ سناؤ، بوڑھے نے جھونپڑی میں جاتے ہوئے کہا ــــ سناتی ہوں باواجی! پہلے روٹی تو کھالو۔ رتنا نے کہا ــــ بوڑھا ہاتھ منہ دھوکر آیا اور روٹی کھانے لگا۔ رتنا نے روٹی توڑتے ہوئے کہا ــــ باواجی! راجا کے سپاہی آج رات کو نباب کی فوج پر حملہ کرنے والے ہیں: سپاہی کہتا تھا دیکھ آج رات کو دشمن کا خون ندی نالوں کی طرح بہیگا۔ باواجی! یہ سن کر میں سہم گئی، نباب صاب کو اس کی خبر کر دیں تو بہتر ورنہ وہ ناحق مارے جائیں گے ــــ تیرا کہنا تو ٹھیک پر بہت مشکل ہے رتنا! تو جائیگی کیسے؟ ــــ نہیں باواجی میں تو آج ضرور جاؤں گی، رتنا نے جوش اور غصے سے کہا ــــ

بوڑھے نے سر اٹھایا، رتنا کا چہرہ سرخ تھا، کوئی جذبہ بھڑک چکا تھا، اس کے چہرے سے استقلال ظاہر ہو رہا تھا، رمّو نے زیادہ بولنا مناسب نہ سمجھا۔ اچھا، کہہ کر کھانے میں مشغول ہو گیا، کیونکہ وہ رتنا کی پھرتی اور عزم سے واقف تھا۔ رمّو کھانے کے بعد باہر آکر چارپائی پر لیٹ گیا۔ رتنا نے برتن باہر لاکر دھوئے، اندر گئی اور پھر چولہا جلا کر کھانا پکانے میں مشغول ہو گئی۔

دن ڈھل رہا تھا، دھوپ کم ہوتی جا رہی تھی، پرندوں کی بولیاں شام کی خبر دے رہی تھیں۔ دور، بہت دور چرواہے بانسری بجا بجا کر جانوروں کو جمع کر رہے تھے، کھیتوں کو گئی ہوئی نوجوان عورتیں، تیتریوں کی طرح تھرکتی ہوئی، کبھی نالوں میں، کبھی مینڈھوں پر، کبھی جوار کے پودوں میں چھپتی چھپاتی، جلد جلد قدم اٹھاتی ہوئی آرہی تھیں، خاموش گاؤں میں پھر زندگی کی رو دوڑ گئی۔ پرندوں نے اپنے شور سے گاؤں میں ہل چل ڈال دی، گائے بیل اپنی اپنی جگہوں میں باندھے جانے لگے۔ عورتیں، برتن، مٹکے سر اور کمر پر لیکر کنویں کی جگت پر جمع ہوگئیں کوئی پانی کھینچ رہی ہے، کوئی باتیں کر رہی ہے، چھوٹے چھوٹے بچے کنویں کے پاس کھیل رہے تھے، بوڑھا رمّو گائیوں کو آتے ہوئے دیکھ کر چارپائی سے اٹھا، رتنا کو آواز دی، جواب نہ پاکر جھونپڑی میں گیا، دیکھا، ڈھونڈا پتہ نہ پایا، چولھے کی آگ تیز تھی، کھانا پک چکا تھا۔ رتنا نہیں تھی، فکر میں ڈوب گیا، بات تو ظاہر کرنے کی نہ تھی، خدا نگہبان کہہ کر باہر آیا۔ گائے بیل باندھے، آنگن صاف کیا، حقہ جلا کر چارپائی پر بیٹھ گیا۔ تھکے ماندے کسان گھروں کو پہنچے۔ ہل رکھے، بیلوں کو باندھا اور چلم لیکر رمّو کے پاس آگئے۔ رمّو بہت فکر مند تھا، آنکھیں بند کئے ہوئے کچھ غور کر رہا تھا، جھرّی دار چہرے سے بشاشت دن کی روشنی کی طرح اڑ چکی تھی، محض بناوٹی ہنسی ہنستے ہوئے لوگوں کا حال دریافت کر رہا تھا۔ ان میں سے کسی نے پوچھا۔ باواجی! رتنا کہاں ہے؟ نجر نہیں آتی ــــ بھتیا! وہ تو پیہر گئی ہوئی اب تک نہیں آئی لڑائی جور کی ہے، نباب کی فوج کے لوگ بہت مر رہے ہیں۔ بھگوان جانے رتنا کا کیا حال ہے؟ اسی فکر میں بیٹھا ہوں، رمّو نے جواب دیا ــــ بابوا، فکر کی کوئی بات نہیں، وہ قلعے ہی میں ہوگی، اس کو بھی تو جان کی آس ہے۔ کسی نے جواب دیا اور ادھر ادھر کی باتوں میں مشغول ہوگئے۔ تھوڑی دیر کی گپ شپ کے بعد گاؤں پر سناٹا چھا گیا۔ رات بڑھتی جارہی تھی، بندوق

کی آوازیں کم ہوگئیں تھیں۔ گاؤں کی جھونپڑیوں کے چراغ جنگل میں جگنوؤں کی طرح چمک رہے تھے۔ بوڑھا رتمو اپنی چارپائی سے اٹھا، لکڑی کے سہارے کیمپ کی طرف چل دیا، کیمپ گویا ایک شہر تھا، سپاہی گھوڑوں کو دانہ چارہ دے رہے تھے، کچھ لوگ ہتھیاروں کو صاف کر رہے تھے، گھوڑے ہنہنا رہے تھے، لشکر کے قلب میں لکڑیوں کا انبار تھا، جس میں آگ لگائی جا رہی تھی۔ رتمو چادر اوڑھے، کمر پر ایک ہاتھ رکھے، لکڑی کے سہارے ادھر اُدھر دیکھتا جا رہا تھا کہ سامنے سے سفید گھوڑے پر کسی کی سواری آئی، سپاہی نے بگل بجایا، تمام سپاہی قطار باندھ کر کھڑے ہوگئے سلامی دی گئی، نواب نے فوج کا جائزہ لیا اور سب کو کچھ حکم دینے کے بعد اپنے خیمے کی طرف روانہ ہوا۔ بوڑھا رتمو بھی ساتھ ہولیا مگر کسی نے بھی اس کی طرف توجہ نہ کی۔ نواب اپنے ڈیرے کے قریب آکر ٹھیر گئے، گھوڑے سے اترے اور ابھی اندر قدم رکھنے بھی نہ پائے تھے کہ انھوں نے کسی کو اپنے قدموں سے لپٹے ہوئے دیکھا، قدموں کو جھٹک کر تلوار سے وار کرنا چاہتے تھے کہ آواز آئی، ہجور! میں آپ کی ــــ کون ــــ عورت ــــ یہاں کیوں آئی؟ جان بخشی ہو تو کچھ کہنا چاہتی ہوں ــــ اچھا جو کچھ کہنا ہے کہہ نواب نے فرمایا ــــ ہجور! آج رات کو راجا کے سپاہی آپ کی پھوج میں گھسنے والے ہیں، میں گوالن ہوں کلے کو ہر روز دودھ لے جاتی ہوں، وہاں میں نے یہ بات سنی، رتنا نے جواب دیا ــــ تو دہتی کہاں ہے؟ ــــ برابر والے گاؤں میں سرکار، اچھا!! تو باہر نہ جا، یہ کہہ کر نواب نے سپاہی کو آواز دی، سپاہی آیا، نواب نے کہا باہر کوئی اور ہے؟ ہاں حضور! کوئی بوڑھا، کمر پہ ہاتھ دھرے کھڑا ہوا ادھر اُدھر دیکھ رہا ہے ــــ اس کو اندر لاؤ،

نواب نے حکم دیا۔ سپاہی گیا اور بوڑھے کو بلا لایا، بوڑھا اندر آیا، نواب کو دیکھا، سلام کیا اور ڈیرے کے چاروں طرف حیرت سے نگاہ ڈالی، اس کی نگاہ رتنا پر پڑی تو وہ بےساختہ پکار اٹھا، رتنا! اُن دونوں کی آنکھیں لڑیں اور جو واقعات رتنا نے کہے تھے، ایک ایک کرکے رتمو کے دماغ میں آگئے۔ نواب نے دونوں کی حالت کا بغور مطالعہ کیا اور بوڑھے سے پوچھا یہ عورت تیری کون ہے۔ ہجور! یہ میری منہ بولی بیٹی ہے، میرا تو دنیا میں کوئی ہے نہیں، صرف اسی کو دیکھ دیکھ جیتا ہوں، ہر روز کلے میں دودھ دینے جاتی ہے، کوئی ذرا سا کھیت ہے، اسی میں اپنی جندگی کے دن گزار رہے ہیں۔ ہم میں پھرک ــــ ہے تو یہی کہ وہ ہندو ہے میں اللہ محمد کو یاد کرتا ہوں، بوڑھے نے ابھی یہ جملہ ختم بھی نہ کیا تھا کہ نواب نے فرمایا ــــ ایں تو مسلمان اور وہ ہندو، خوب، ــــ اچھا! تم دونوں یہاں کیوں آئے ہو، بوڑھے نے عرض کیا ہجور! رتنا کا پریم مجھے یہاں کھینچ لایا، وہ کہتی تھی، نباب سے ملوں گی اور آج رات کا ہونے والا کِتبہ سناؤں گی، وہ آج دوپہر سے غائب تھی، میرا دل دھڑکنے لگا، اس لیے ڈھونڈتا ڈھانڈتا یہاں پہنچا۔ نواب نے کہا، کیا تو سچ کہہ رہی ہے رتنا! ہجورا دھوکا بازی ہمارا کام نہیں، یہ کام ان مردوں کا ہے جو انسانوں کی کدر نہیں کرتے۔ میں عورت جات ہوں راجا کے جُلم سے تنگ آگئی ہوں، اس نے جو کھون کی ندی بہائی ہے اسے دیکھ دیکھ میرا جی کڑھتا ہے، کیا راجاؤں کے دل پتھر کے ہوتے ہیں ہجور! کھون گریب سپاہیوں کا ہو، پرجا بھوکی مر رہی ہو، تو ان کو کیا، یہ لوگ آرام سے محلوں میں رہتے ہیں، گریبوں کا کھون چوستے ہیں، سچ اتنے میرے دل میں آپ کے لیے پریم

یہ روز روز کا کھون، کنل مجھ سے دیکھا نہیں جاتا، عاجز ہو گئی ہوں، چاہے کچھ ہو۔ نواب نے اس کے چہرے پر نگاہ ڈالی اور دیکھا کہ اسکی آواز میں نہ وہ الفاظ میں صداقت ہے، دل نے شہادت دی کہ یہ واقعی بہی خواہ ہے۔ نواب نے پوچھا: اچھا تو رتنا! آپ کیا کرنا چاہتی ہے۔ حضور! کچھ نہیں، فوج کے تین ٹکڑے بنائیے، ایک کو پہاڑ کے کنارے پتھروں میں چھپا دیجئے، دوسرا ابھی یہیں رہے مگر ہشیار رہے، تیسرا دستہ میرے ساتھ بھیج دیں، اس کو جنگلوں میں چھپتی چھپاتی چور دروازے کے پاس لیجاؤنگی جب راجا کے سپاہی آپکو مارنے کیلئے قلعے سے باہر نکلنگے تو میں اس دستے کو لیکر چور دروازے سے قلعے میں گھس جاؤں گی اور راجا کے سپاہی کیمپ کے سپاہیوں کو ہشیار پاکر قلعے کے چور دروازے کے قریب ہوں گے تو آپ پہاڑ کے کنارے کے دستے کو لیکر انپر ہلہ بول دیں اور سیدھا چور دروازے سے قلعے میں گھس آنا۔ فوج تھوڑی رہ گئی، راجا پھنس جائیگا، کنل اور کھون بھی زیادہ نہ ہوگا۔ رتنا نے کہا اور فکر میں ڈوب گئی، بس میری سمجھ میں تو یہ آتا ہے حضور! نواب نے بھی اس کی باتوں پر غور کیا اور تھوڑی دیر کے بعد اس پر عمل کرنے کیلئے آمادہ ہو گئے۔ سپہ سالار کو طلب کر کے کان میں کچھ کہا۔ آگ بجھا دی گئی۔ سونے کا بگل بجا اور کیمپ پر سناٹا چھا گیا۔ رات کی تاریکی بڑھ رہی تھی، تارے آنکھ مچولی کھیل رہے تھے، ہوا ساکت تھی رتنا فوج کے ایک دستے کو لیکر چور دروازے کے قریب آئی، چٹانوں اور جھاڑیوں میں انہیں چھپا دیا۔ دشمن کو کیا خبر کہ بساط جنگ کی کایا پلٹ ہونے والی ہے، وہ نشۂ غرور میں سرشار، دبے پاؤں چور دروازے سے ایک ایک نکلے، آن کی آن میں ایک انبوہ کثیر ہتھیار باندھے میدان میں جمع ہو گیا۔ کیمپ کی طرف بڑھا، کیمپ خالی تھا، ڈیرے پر سنتری تک نظر نہ آتا تھا، انھوں نے مال غنیمت خوب لوٹا اور ہنستے خوش ہوتے واپس ہوئے۔ دشمن کی چال بازیوں سے ناواقف سردار اور فوج کے بے خبر سپاہی اپنی کامیابی پر ناز کر رہے تھے کہ چاروں طرف سے گولیوں کی سنسناتی ہوئی آوازوں نے انھیں پریشان کر دیا، یہ ادھر ادھر بھاگ ہی رہے تھے کہ نواب کی فوجوں نے گھیر لیا اور قتل و خون کا بازار گرم کر دیا اور تھوڑی ہی دیر میں راجا کے تمام سپاہی موت کے گھاٹ اتار دئے گئے۔ ادھر رتنا فوج کے دستے کو لئے ہوئے قلعے میں داخل ہوئی، وہاں جو کچھ فوج تھی، اس نے نواب کی فوج کا مقابلہ کیا، گھمسان کی لڑائی ہوئی، نواب کی فوج نے محل کا محاصرہ کر لیا، راجا نے اپنی فوج کی تباہی کا حال سنا تو خوف و الم کے آثار چہرے سے نمودار ہوئے، ہمت کر کے تلوار سونت کر باہر نکلا، تھوڑی دیر تک اپنے ساتھیوں کے ساتھ لڑتا رہا، آخر پیغام اجل آ پہنچا۔ فوج تھوڑی تھی، انمیں بھی بہت سے کٹ چکے تھے، کب تک نواب کا مقابلہ کرتا، کئی زخم کھائے، پسینے کی بجائے خون میں تر بتر ہو گیا، طاقت نے خیرباد کہی، ہمت کی جگہ یاس نے لی، لڑتے لڑتے سر چکرایا، زمین پر گرا اور ہمیشہ کیلئے سو گیا

نواب کی فوجیں رات بھر قلعے میں رہیں، صبح ہوتے ہی نقارہ پر چوٹ پڑی، سپاہی نے بگل بجایا، فوجیں قطار باندھ کر کھڑی ہو گئیں۔ نواب نے فوج کا جائزہ لیا، اسلامی علم قلعے پر لہرایا گیا، نواب کے چہرے پر بشاشت کھیل رہی تھی، پھر فکر میں ڈوب گئے، نواب نے فرمایا: رتنا کہاں ہے، حاضر کرو، فوج والوں نے سارا قلعہ چھان مارا، کہیں پتہ نہ لگا، تمام لاشوں کی شناخت کی گئی مگر وہاں بھی رتنا کا وجود نہ تھا۔ نواب اپنی غفلت پر پچھتانے لگے، افسوس کو جگہ دی، رتنا کا پتہ نہ لگنا تھا نہ ملا، اسی فکر میں ڈوبے ہوئے، رنجیدہ خاطر اپنی قیام گاہ کی طرف قدم اٹھا رہے تھے کہ رتنا دودھ لیکر قلعے میں داخل ہوئی، سپاہی نے روکا، اندر جانے سے منع کیا، نواب نے پلٹ کر دیکھا تو رتنا کو بلایا، وہ آئی اور نواب کے سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑی ہو گئی، نواب نے فرمایا، رتنا بیٹی! میری کامیابی کا سہرا تیرے سر ہے۔ حضور! یہ سب بھگوان آپکی دیا ہے، ورنہ میں خود بیچاری کیا کرتی، میں خوش ہوں کہ اب بہت سی بہنیں لوگوں کو اپنے اپنے پتی کی سیوا کرنے میں چین ملیگا اور وہ بیوہ ہونے سے بچ گئیں۔ میں بیوہ ہوں، گریب ہوں، گریبی کی قیمت اور سوگ کی تکلیف جانتی تھی، ہر روز آنکھ سے دیکھتی تھی اسلئے میں نے ایسا کیا، رتنا نے کہا۔ اچھا تو چاہتی کیا ہے؟ نواب نے پوچھا۔ میرا کون ہے حضور! جس کیلئے دھن دولت چاہوں، اکیلی پیدا ہوئی، شادی کو دو سال نہ ہوئے تھے کہ بیوہ ہوئی، اکیلی ہوں اکیلی مروں گی، ارمان، آرزوئیں کوئی بھی نہیں، پرماتما سے چاہتی ہوں یہ کہ جبتک اس جمین پر آکاش کا سایہ رہے آپ سلامت رہیں اور آپکی حکومت رہے، رتنا نے جواب دیا، کورنش بجا لائی اور روانہ ہو گئی، نواب نے بہت کچھ سمجھایا، منت کی، خوشامد کی، گر دھن کی پکی رتنا نے کوئی چیز قبول نہ کی، کیونکہ اسکو بڑا معاوضہ مل چکا تھا، انتقام کی آگ بجھ چکی تھی اور اس کا کلیجہ ٹھنڈا تھا!

عبدالواسع عمری

قاسم

یہ مضمون میرے ایک عزیز دوست قاسم سے متعلق ہے، جس نے ۱۵ اپریل ۱۹۴۹ء دوشنبہ کو انتقال کیا۔ اس میں میں نے دوسرے لوگوں کی دلچسپی کے لئے قاسم کی گفتگو کو ادبی رنگ دیدیا ہے، ورنہ مفہوم متاثر نہیں کیا۔

کام کرتا بیٹھا ہوں کہ آدمی نے خبر دی" آپ کے کسی عزیز کا انتقال ہو گیا" اور " میں ہنسا کہ میرے عزیزوں میں کون ایسا ستم آشنا ہے کہ بغیر مجھے اطلاع دئے یوں اچانک مرجائے سب ایسے ہنتے کھلتے کہ خدا نہ کرے مجھے کسی کا غم دیکھنا نصیب ہو۔ اتنے میں ایک اور صاحب نے آن کر تصدیق کی کہ "قاسم کا انتقال ہو گیا"

قاسم کا انتقال ——— !

اور سچ تو یہ ہے کہ مجھ سے ملنے والوں میں مجھے قاسم سے زیادہ عزیز اور کون ہو سکتا ہے۔

قاسم !

کتنی حسرت ناک موت ! کتنا جوانا مرگ ! — آدمی سا آدمی کہ دیکھے سے نظروں میں جچے نہ جچے پر ڈھونڈے سے ہزاروں میں نہ ملے ! خوبیاں اتنی ہی بلند، خامیاں اتنی ہی پست، اضداد کا مجموعہ، لیکن اخلاق کا مجسمہ ! گویا صحیح معنے میں انسان !

ارشادی گھرانے کا فرد، شریف النسب سید، کوئی تیس کی عمر، اوسط قد، اوسط جثہ، گندمی رنگ، ناک نقشہ بس سیدھا سیدھا گول چہرہ، دبلی صورت، ابھری پیشانی، مجموعاً بھلا سا انسان، کئی بہنوں کا بھائی، کئی بھائیوں کا ساتھی، ماں باپ حیات، گھر کا ولی عہد صاحب مقطوع، کاروبار میں پختہ، چھچھوروں میں چھچھورا، سنجیدوں میں سنجیدہ، مرنجاں مرنج، جس سے ملے خوش کر دے، ہنسنے بولنے بنانے اور خصوصیت سے بیٹا پکوئی کی طرف مائل، عشق پیشگی فطری، گزارا متوسط، مشغلہ فنی تعلیم ایک ذوق، شاعری کا شوق، غالباً سول مجسٹریٹی کے اہلکار، شادی کی بڑی آرزو، لیکن شادی کی

اور سال ڈیڑھ سال میں سدھار گئے۔ مقطوعہ تھا کافی آمدنی کا، اس لئے دہلا گہلا بچپن، ہنستی کھیلتی جوانی۔ لیکن ادھر کوئی چار پانچ سال سے مقطعے میں دوسرے دعویدار بھی پیدا ہو گئے تھے، گھر کے جھگڑے سرکار چڑھے، نسبلی آئی، اور دن ذرا بھاری ہو گئے۔ ابھی ابھی مقدمے میں جیتے تھے کہ زندگی سے ہارے۔ ادھر مقطوعہ جھگڑوں سے آزاد ہوا تھا کہ ادھر روح جسم سے آزاد ہوئی۔

یہ تو ہوا ان کا ایک ذاتی یا خانگی خاکہ جس سے مجھے کوئی دلچسپی ہے اور نہ اس سے زیادہ کبھی میں نے جاننے کی کوشش کی، اور میں سمجھتا ہوں کہ تکمیل سوانح کے لئے اتنا کافی بھی ہے۔

مجھے اس سے بحث نہیں کہ قاسم اپنے گھر میں کیا تھا، بلکہ اس سے کہ میرے ساتھ کیا تھا، اور میرے پاس کیا تھا، اس لئے میں اس کی زندگی کے اسی پہلو کو زیادہ اہمیت دوں گا، گو اندیشہ ہے کہ اس سے خود میری خودستائی یا دکانداری کا پتہ چلے گا، لیکن اگر اس سے بھی کم بیان کروں تو واقعات کی اصلیت بالکل مسخ ہو جائے گی اور یہ اصول سوانح کے خلاف ہو گا۔

مطمئن گھرانے کے لڑکے عموماً کھیل کود آرام و عیش سے فارغ ہوتے ہوتے پچیس تیس سال گزر چکے ہوتے ہیں گویا صحیح معنے میں ان کا سن بلوغ یا شعور پچیس سال سے شروع ہوتا ہے اور پھر جب ماحول بھی کچھ اسی کے موافق ملے تو گویا بلوغ کا آنا ہی ناممکن۔ مشیر آباد کا محلہ بلگرام کے محلے سے ایک خاص مناسبت رکھتا ہے۔ سنتے ہیں کہ قبر اور شیت وغیرہ میں یہ دو اس سے بڑھ کر ہیں لیکن کہا جاتا ہے کہ وہ ایسا مردم خیز خطہ ہے کہ جتنے ادبا پیدا ہوئے

اکثر یہیں سے تعلق رکھتے ہیں' اور مشیر آباد بالکل اس کے برعکس واقع ہوا ہے' ورنہ اس ایک ذیلی فرق کو ہٹا کر دیکھیں تو دونوں میں غالباً چنداں فرق نظر نہ آئے گا۔

ایسے گھر اور ایسے محلے میں پیدا ہو کر بھی سمو کوئی خاص اہلیت کا مالک ہوتا اور وہ بھی اتنی چھوٹی عمر میں' ایک عبث توقع ہے۔ لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ جو صلاحیتیں اس نے فطرتاً پائی تھیں' اگر انھیں منجھایا جاتا اور وہ انھیں بکار آمد بناتا تو یقیناً ایک نمایاں شخصیت ہوتا' اور اب اس میں یہ شوق پیدا ہو چلا تھا کہ عمر نے دغا دی۔

ادب اور خصوصاً سیاست کا بہت ذوق تھا' اکثر سیاسی بحثیں چھیڑتے' مجھے اس نام نہاد سیاست دانی جیسی کہ حیدرآباد میں ہے اور اخباری زٹلوں سے کبھی کوئی دلچسپی نہیں ہوئی قاسم صاحب میری اس خصوصیت یا خامی کو اس نظر سے دیکھتے جیسے مجھ میں کوئی انسانی صفت ہے ہی نہیں۔ اکثر افسوس کا اظہار کیا کرتے بالآخر مجھے مجبور کر دیا کہ اخبار جاری کراؤں میں نے انھیں کے لئے جاری کرا دیا' سمجھنے لگے کہ اب میں اخبار کا شوقین بھی ہو گیا ہوں' آتے اور پوچھتے کہ آج کا اخبار دیکھا؟ کیا لکھا ہے؟ میں سنجیدگی سے کہہ دیتا "جی ہاں دیکھا' لکھا ہے کہ پیالیس ٹاکیز میں "وچن" چل رہا ہے' اور زمرد محل میں "زمبو کا بیٹا" اور سلکٹ میں "لٹارو للنا" ہے۔ "زمبو کا بیٹا" اور "لٹارو للنا" عید کے خاص پروگرام ہیں۔۔ ایک بیگم صاحبہ نے اپنے شوہر کو ملکیت اور مہر کے دعوے کی نوٹس دی ہے' اور دوسری صاحبزادی نے اعلان کیا ہے کہ اگر ان کے شوہر ایک ہفتہ کے اندر ان کی خدمت میں حاضر ہو کر خلع نہ کرا لیں تو مجبوراً وہ خود انھیں طلاق دے کر کسی دوسرے شوہر کو اپنے نکاح میں لا لیں گی آئندہ جمعہ کو عبدالعزیز خاں کے پاس شاندار مہراج ہوگا۔ خریدار حضرات جمعرات کے دن معائنۂ مال فرما لیں۔۔۔۔"

ہنستے بھی اور کڑھتے بھی۔

ادب کا اچھا ذوق پایا تھا' یا یوں کہنا چاہیئے کہ ایسا ذوق پایا تھا جو مجھ سے مشترک تھا' اور سچ پوچھیے تو یہی ایک سبب ان کے اور میرے ربط کو مضبوط کرنے میں زیادہ حصہ رکھتا تھا

ادب و سیاست سے ہٹ کر بلکہ ان سے بڑھ کر عشق و عورت ان کا ایک استمراری موضوع بحث تھا۔ اکثر اس سلسلہ میں بڑی دلچسپی لیتے۔ لیکن حسن و محبت کے معاملے میں ان کا وہی نظریہ تھا جو عام نوجوانوں اور خصوصاً ایسے پھکڑ مزاجوں کا ہونا چاہیئے۔ جب کبھی سنتے کہ "محبت ایک نہایت اعلیٰ پاکیزہ و بے غرض جذبہ ہے" تو ہنسی اڑاتے کہ "پاکیزہ و اعلیٰ ہو تو کبھی ایک ہی کہی غرض اب پھکڑ باتوں پر اتر آتے' جن کا ماحصل یہ ہوتا کہ ہوس ہی کا ایک شاعرانہ نام لوگوں نے محبت رکھ لیا ہے ورنہ کہنے کوئی ایسی مثال ہی بتا دیجیئے کہ کہیں بڑھاپے میں بھی عشق ہوا ہو۔" یہ صحیح ہے کہ قاسم کہ

"There can be no love with out lust"

مگر محض اس کو سب کچھ قرار دینا زیادتی ہے۔ اس کا انحصار ہے زیادہ تر چاہنے والوں کی ذہنیتوں اور اخلاقی قوتوں پر!۔ بعض ایسی مثالیں بھی ملیں گی کہ ان کی محبت بہت ارفع و اعلیٰ ہوتی ہے۔ ""

ورنہ اگر محبت کی تشریح وہی ہوتی جو تم کہہ رہے ہو تو ایک ہی شخص کی خصوصیت نہ ہوتی۔ تم جانتے ہو نا کہ محبت اسی وقت کہلاتی ہے جب کہ وہ ایک ہی سے ہو؟ ہوس کی تکمیل تو سب ہی سے ہو سکتی ہے' پھر کسی مرد کو ایک خاص عورت سے یا کسی عورت کو ایک خاص مرد سے شغف ہونا کیا معنے دارد؟

یہ صحیح ہے کہ محبت کی بناء میں حیوانی جذبہ کو بھی دخل ہے لیکن وہ اس لئے کہ اس لطیف جذبہ کی عملی توثیق بھی ہو سکے، نہ اس لئے کہ یہی سب کچھ ہے' ورنہ تم دیکھتے کہ جہاں باہم شادی نہ ہو وہاں محبت مٹ جاتی' حالاں کہ ایسا نہیں ہوتا۔

یا یوں سمجھو کہ "لطافت بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی" اس لئے محبت سی لطیف شئے بھی ہوس سی کثیف شئے سے تعلق رکھتی ہے' جس کے معنے یہ ہوئے کہ جس طرح ایک خوبصورت اور مضبوط عمارت کی بنیاد میں سخت' کثیف اور ادنی چیزیں بھی ڈالی جاتی ہیں' اسی طرح محبت کی بناء میں بھی ہوس شامل ہے' لیکن جس طرح ساری عمارت' نہایت پاکیزہ' بلند اور خوبصورت ہوتی ہے' اسی طرح محبت کا بھی بلند اور نفیس ہونا ضروری ہے' اس کے معنے یہ نہیں ہوئے کہ محض ہوس کا نام محبت ہے اور نہ یہ کہ ایک نفیس عمارت کی بناء کثیف چیزوں پر ہی ہونا ضروری ہے۔

ایک اور بات قابل غور ہے کہ وصل کے بعد محبت نہیں ہوتی بلکہ محبت کا نتیجہ وصل ہوتا ہے' اور وہ اس لئے کہ محبت کی خواہش ہوتی ہے کہ عاشق معشوق ہمیشہ ایک دوسرے سے قریب سے قریب رہیں اور یہ خاص کر معاشرت کی پابندیوں کے تحت بغیر وصل کے ممکن نہیں' نہ اس لئے کہ صرف وصل ہی مدعائے تمام ہے۔

ہم جو کسی سے متاثر ہوتے ہیں تو اسے دیکھ کر یا سن کر جس کے معنے یہ ہوئے کہ پہلے ہماری روح متاثر ہوتی ہے' اس لئے گویا سچی محبت کا تعلق روحی ہے' نہ کہ جسمی اور تم دیکھو گے کہ وہی محبت زیادہ استوار ہوگی جس کی بناء روحانی یا اخلاقی اصول پر رکھی جائے۔ اور جن لوگوں میں محبت کا ایسا اعلیٰ جذبہ ہو وہ مرتے دم تک نہیں مٹتا' ورنہ یہ ایک فطری بات ہوتی کہ جہاں معشوق حاصل نہ ہو محبت بھی فنا ہو جائے۔

اور پھر اس پر بھی غور کرو کہ ہوس کا تقاضا تو یہ ہے کہ ایک حسین سے پیسا ہوا دوسرا حسین نظر آئے تو میلان دوسرے کی طرف ہو جائے' لیکن ایسا نہیں ہوتا' بلکہ محبت کا معیارِ حسن بھی کچھ عجیب ہوتا ہے کہ "معشوق من است آں کہ بہ نزدیک تو زشت است" بلکہ عام نظروں میں جو غیر معمولی حسین ثابت ہو وہ ایک عاشق کے نزدیک اپنے معشوق کے برے حسن کے مقابلہ میں بھی کوئی قیمت نہیں رکھتا یہیں سے محبت اور ہوس کا فرق کھلتا ہے۔

یہ اور بات ہے کہ جس طرح ہر بری بھلی چیز کے مختلف معیار ہوتے ہیں اسی طرح محبت کے بھی مختلف معیار و مدارج ہیں۔ ہوس کا نام محبت رکھ لینے سے محبت کی خوبی و عظمت میں کوئی فرق نہیں آ سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا میں محبت بہت کم یاب ہے' اور یہ بھی ایک فطری بات ہے کہ جو چیز جتنی لاجواب ہوگی اتنی ہی وہ کمیاب و نایاب ہوگی۔

اب رہا تمہارا یہ استدلال کہ بڈھا بڈھی میں عشق نہیں ہوتا' اس لئے محبت کے معنے ہوس کے ہیں' تو چونکہ بڈھا بڈھی کے اولاد بھی نہیں ہوتی' اس لئے یہ نتیجہ نکالنے کے مساوی ہے کہ عورت مرد سے اولاد نہیں پیدا ہو سکتی۔ کیا یہ صحیح ہوگا؟ — ہر چیز کا ایک وقت اور موسم ہوتا ہے۔

"یہ سب صحیح ہے خداوند' مگر ہم تو وہی ....."

"تم بڑے بیوقوف ہو قاسم' ایسی بحثیں مت کیا کرو میرے ساتھ"

"اچھی بات ہے سرکار' جانے دیجئے! اب کون نکالے آپ سے آپ ایک بلا ہیں!"

طبیعت میں خوش مزاجی بہت تھی' اس لئے غصہ بہت کم آتا تھا۔ سخت کہنے سے بھی نہیں چوکتے تھے اور سخت سننے

سے بھی نہیں بلکہ بعض دفعہ تو ایسا بھی ہوا ہے کہ جہاں محفل کچھ بدمزہ یا سونی سی معلوم ہوئی کہ خود ہو کر ہنسنے لگے، لوگوں کو گالیاں دیں، جوش میں لائے اور خاصی شگفتگی پیدا کر دی۔

مذہب کے بڑے پکے تھے، یہ وجہ من الوجوہ زیادہ تر اس لئے بھی کہ مرشد کے بیٹے تھے۔ لیکن ان کا سارا مذہب عام لوگوں کی طرح جیسے عقائد پر مبنی تھا۔ بات بات پر کفر کا خدشہ، بات بات پہ ایمان جانے کا اندیشہ۔ اس سلسلہ میں بھی مجھ سے اکثر بحثیں کیا کرتے، اور فیصلہ کرتے کہ میری صحبت میں بیٹھ کر کافر ہو جائیں گے۔ لیکن بعد کو وہ دور آیا کہ مجھی کو مرشد ماننے لگے اور چونکہ میں ہر مذہب کا طرفدار ہوں کبھی "السلام علیکم مرشد" کہتے اور کبھی "رام رام گروجی" وغیرہ کہہ کے ملتے۔

کھانے کے بہت شوقین تھے۔ چوں کہ میرے پاس کوئی تکلف نہ کرتے تھے جب کبھی بلا تا کھانے پہ آ بیٹھتے۔ اچھا ہوا تو خیر، ورنہ ناک چڑھی کہ "بھئی تمہارے پاس تو اچھا کھانا کھانے کی حسرت رہی۔ تم میں سب باتیں اچھی ہیں شاکر مگر ایک بات بہت بری ہے اور وہ یہ کہ تمہارا کھانا اچھا نہیں ہوتا..." (گویا کہ یہ بھی میری بات ہے!)

اور جب کبھی پسند آیا تو کہا "اہا ہا، آج عمر میں پہلی دفعہ تمہارے ہاں اچھا کھانا کھایا ہے۔

باتوں میں بھی ان کا یہی حال تھا۔ جب سے عقیدتمندی کا دور آ گیا تھا، انھیں میری تقریباً ہر بات پسند آنے لگی تھی پھڑکتے اور داد دیتے تو یوں کہ "واللہ" شاکر آج عمر میں تم نے پہلی دفعہ یہ کام کی بات کہی ہے!" خواہ ایسی "پہلی دفعہ" ایک ہی نشست میں کئی بار کیوں نہ آ جائے! — کبھی میں نے یاد دہی کی کہ "پرسوں بھی تو تم نے یہی کہا تھا!"

کہنے لگے ارے بھئی، پرانی باتوں میں کیا رکھا ہے، یہ البتہ نئی بات ہے جو تم نے پہلی دفعہ کہی!"

چوٹیں چلنے اور فقرے کسنے کا بڑا شوق تھا، لیکن ہر چوٹ کی انتہا یہی کہ کسی نہ کسی طرح مخاطب کو عورت بنا دیا جائے یا کتا۔

لیکن جب دیکھا کہ چوٹوں میں بھی مجھ سے ہار جاتے ہیں تو کہنے لگے "تمہاری فطرت بچھو اور کھٹمل کی سی ہے شاکر، جب تک ڈنک نہ مار دو چین کہاں سے آئے گا۔ اگر خاموش ہو جاتے تو کیا ہرج ہو جاتا۔"

چونکہ مجھے بھی ان کی خوشنودی زیادہ منظور تھی، اکثر ان کی چوٹیں سن کر بھی اس طرح خاموش ہو جاتا جیسے میں سچ مچ ہار گیا ہوں، اپنی فتح پر بہت خوش ہوتے۔

دماغ کسی قدر قانونی یا مکارانہ بھی پایا تھا، اور پھر مقطوعہ کے سلسلے میں جو مقدمات کے تجربے اٹھانے پڑے تھے انھوں نے کریلہ کو نیم چڑھا دیا تھا، اور جس طرح "پرانا مریض آدھا حکیم" ہوتا ہے، اسی طرح یہ پرانا پیروکار آدھا وکیل تو ہو ہی گیا تھا اور اب پورا وکیل بننے کی بہت آرزو تھی، چنانچہ غالباً درجۂ اول کی وکالت کا امتحان دینے والے تھے۔

میں نے شاید ایک آدھ دفعہ کہہ دیا تھا کہ "تم دیکھنا قائم میں مستقبل قریب میں کیا بننے والا ہوں!" بس یہ بات شاید ذہن میں رہ گئی تھی، دعویٰ کرنے لگے کہ تم دیکھنا شاکر دس پندرہ سال کے اندر ہی اندر میں کتنا بڑا وکیل بننے والا ہوں!"

میں نے کہا "بھئی دعوے کے ثبوت کے لئے وقفہ تو بہت مختصر رکھا ہے!"

کہا "اس لئے رکھا ہے کہ اگر بڑا نہ بن سکا تو اس وقت تک یا تو میں نہ ہوں، یا تم نہ ہو، یا پھر اتنے طویل عرصے تک تم میرے دعوے ہی کو بھول جاؤ!"

شعرگوئی کا بھی شوق تھا، لیکن چونکہ ذوق بلند تھا معمولی شعر غالباً خود کو نہ بھاتے ہوں گے، اور اعلیٰ شعر کے لئے دماغ سوزی کی ضرورت ہے، اور بھلا یہ ایسے خوش باش مستوں سے ہو سکتی ہے!

سب سے پہلے جو نظم سنائی وہ خود میری مذمت میں تھی یہ اس وقت کی بات ہے جب کہ ان میں مجھ سے ٹکر لینے کا جذبہ تھا اور ایک طرح سے وہ بھی میرے مخالف تھے۔ نظم میں مجھی سے خطاب تھا اور ردیف تھی "آپ کی" اور قافیہ غالباً "طبیعت" "عادت"، وغیرہ تھا اس میں میری بداخلاقی، خشک مزاجی و بددماغی کا رونا رویا تھا۔ نظم اچھی تھی۔ مجھے دکھانے کو تو دکھادی، لیکن میں جو خوش ہوا تو ان کی حیرت اور پشیمانی کی عجیب کیفیت تھی۔ افسوس ہے کہ وہ نظم نہیں مل رہی ہے ورنہ چند شعر لکھ دیتا، جن سے ان کے ذوق شعر کا بھی اندازہ ہو جاتا وہ نظم میں نے اپنے پاس رکھ لی تھی۔ ایک دو نظمیں اور سنائی تھیں جن میں سے ایک کا عنوان غالباً "مجھے تم سے محبت ہے، مجھے تم سے محبت ہے" تھا

دو غیر معمولی خوبیاں یہ تھیں کہ غالباً آٹھ نو سال وہ مجھ سے ملتے رہے، لیکن اس اثناء میں میں نے کبھی کسی کی شکایت یا غیبت ان کی زبان سے نہیں سنی، جس کسی کا ذکر کیا، اچھے الفاظ میں کیا۔ کسی کو بڑھتے دیکھا تو خوش ہوئے اور گرتے دیکھا تو اس طرح افسوس کیا جیسے خود کو نقصان پہنچا ہو۔ اگر کبھی زیادہ ملنے والوں میں سے کسی پر بگڑ بھی گئے تو اس کے غائبانہ میں بھی صرف اتنا کہا کہ اگر وہ سامنے ہوتا تو اس سے زیادہ کہتے اور سخت کہتے۔

وضعداری کا یہ عالم تھا کہ اتنی طویل مدت میں کبھی تعلق کو غرض سے ملوث نہیں کیا۔ یہ اور بات ہے کہ دوستانہ رنگ میں دس دفعہ انھوں نے مجھ پر احسان کیا ہوگا تو ایک آدھ دفعہ میں نے ان کی خدمت کی ہوگی سنتا تھا کہ یہ آخری پانچ چار برس ان پر کافی تنگ تھے، اس کے باوجود پاسدار ننگ تھے۔

صرف ایک دن ایسا ہوا کہ دوپہر میں میرے ہاں آگئے اور کہا "شاکر ایک آنے کے پیسے ہوں تو دو" کافی جلدی میں معلوم ہوتے تھے۔ اتفاقی بات کہ اس وقت میرے نزدیک ایک پیسہ بھی نہیں تھا۔ میں نے کہا "تم چلو!" کہنے لگے "کہاں؟" "تم چلو تو سہی!"۔ پاس ہی میرا دھوبی رہتا ہے، کہا "ارے دھوبی آپ کو ایک آنہ دیدے!"۔ عجیب کیفیت طاری ہوئی مجھے بہت غور سے دیکھا، قریب آئے، بازو تھامے اور کہا "شاکر تم میرے لئے کتنی ذلتیں اٹھاتے ہو، کیا تمھیں دھوبی سے پیسے مانگتے ہوئے شرم نہیں آئی؟"

شرم تو صرف مانگنے سے آنی چاہیے قاسم! جب یہ اٹھی تو پھر کیا دھوبی سے اور کیا رانی سے!"

"اہاہا، کیا پیاری بات بتائی، پیارے شاکر تم نے صرف ایک آنہ ہی نہیں دیا بلکہ ایک آنے کی بات بھی بتادی!"

"جی تو یہ قیمت ہے ہماری بات کی!"

"نہیں شاکر، باتیں تو تمھاری لاکھ لاکھ کی ہوتی ہیں، مگر میں اس وقت اپنی موجودہ حیثیت کے لحاظ سے قیمت لگا رہا ہوں!" پھر ذرا آگے بڑھے، اور کہنے لگے "تم چاہو کچھ ہی کہو، لیکن میرے ذہن میں تو یہی تھا کہ تم اپنے ماموں کے پاس سے منگا دوگے، یا کسی دوست کے پاس سے۔ دھوبی کا تصور تو میرے ذہن میں ہی نہ آسکتا تھا ...!"

"یہی فرق ہے تمھارے اور میرے ذہن میں! تم نے غور کیا کہ یہ جو چھوٹے لوگ ہوتے ہیں کبھی کچھ دے کر بھی خوش ہوتے ہیں کہ ہم نے "صاحب کی خدمت کی" اور بڑے لوگ

سمجھتے ہیں کہ احسان کیا۔ اب بتاؤ تم فطرتاً احسان اٹھانا چاہو گے
یا خدمت لینا پھر تم جانتے ہو کہ میں ملتا ہی بہت کم لوگوں سے
ہوں، اس پر سے غرض لے کر ملوں، اور کیا وقر رہ جائے گا۔
اس لئے میرے جتنے متعارفین ہیں سب دھوبی، حجام ہی تو ہیں

"دیکھا، دیکھا، چلتے چلتے بھی تم نے آخر ایک چوٹ
کر ہی دی! تم کیا کروگے، تمہاری فطرت ہی ایسی ہے!

نیش عقرب نہ از پئے کین است   مقتضائے طبیعتش این است

دو خامیاں بدترین تھیں، ایک تو یہ کہ زبان کے پابند
نہ تھے، دوسری یہ کہ وقت کے پابند نہ تھے۔ اگر کلام شریف بھی
سر پر رکھ کے وعدہ کریں تو پورا ہونے تک یقین کرنے کی کوئی
وجہ نہ تھی، اور وقت کا تو کیا پوچھنا کہ چٹکیوں میں بتایا اور برسوں
میں کیا۔ اس لئے میں کہا کرتا "قاسم میں ایک وجہ سے تمھیں
معشوق سمجھتا ہوں، اور ایک وجہ سے بادشاہ" زبان کی پابندی
کے اعتبار سے معشوق، اور وقت کی پابندی کے لحاظ سے بادشاہ"
کبھی جھنجھلاتے اور کبھی ہنس پڑتے۔

اور بھی جتنی خامیاں تھیں، ان کی جڑ بھی در اصل یہ
دو ہی نکلتیں۔ حافظہ کمزور تھا، اکثر ایک دفعہ کہی ہوئی بات
کو کئی کئی دفعہ دہراتے اور اس طرح گویا پہلی دفعہ کہہ رہے ہوں
بلکہ اکثر تو یہ غضب کرتے کہ ہم ہی سے سنی ہوئی کوئی دلچسپ بات
یاد رکھ لی اور کسی موقعہ میں ہمارے ہی منہ پر اس طرح
سنانے لگے جیسے انہیں کی جدت ہو۔

حسن پرستی کا تو کیا ذکر، البتہ عورت پرست کہنا
چاہیے۔ خواہ کیسی ہی عورت دیکھیں، لیکن ضرور تکیں،
اور نام اس کا رکھ لیا تھا "حسن پرستی"

قاسم کے اور میرے تعلقات جس طرح بڑھے وہ بھی
ایک عجیب و دلچسپ چیز ہے میں نے قاسم کو ہمیشہ ایک کمزور کردار
کا انسان سمجھا، لیکن پھر بھی اس سے دوستی رکھنے پر مجبور
ہوا۔ اس سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں بھی تھی، اور تھی بھی۔ عجیب
اضدادی حال! —

میں اپنے ماحول میں اپنی بددماغی یا بداخلاقی کی وجہ
سے کافی بدنام ہوں۔ اس لئے قاسم بھی ابتداً میرے
مخالفوں میں سے تھے۔ لیکن پھر بھی ملتے تھے۔ ابتداً ان کی
ملاقاتوں کا رنگ بالکل استادانہ یا حریفانہ ہوتا تھا۔
ایسا معلوم ہوتا کہ وہ میرا امتحان لینا، زک دینا یا چوٹیں
چلنا چاہ رہے ہیں۔ "میں نے کہا" "یہ بات ہے"! اسی رنگ
کو ملحوظ رکھ کے ملا کیا۔ سرشت میں چونکہ بحث و حجت بہت
شامل تھی، ایسے ایسے سوالات کرتے کہ گویا ان کی دانست
میں لاجواب ہیں مثلاً "ہوا نظر کیوں نہیں آتی؟ تاروں کو
گنا کیوں نہیں جا سکتا؟ آسمان جب دھواں ہے تو سائنسدانوں
کی آنکھوں میں کیوں نہیں گھس جاتا؟ خدا کو کیا ضرورت تھی
کہ دنیا پیدا کرے اور پھر کسی کو امیر، کسی کو غریب، کسی کو بد
بنائے اور پھر عذاب و ثواب مقرر کرے؟"

اب جتنا سمجھانے کی کوشش کیجئے، اتنی ہی منطقیں نکالیں
ان کی منطقوں پر مجھے بعض دفعہ بہت غصہ بھی آتا اور سخت
سست کہدیتا، بعض دفعہ خوشی بھی ہوتی کہ اس شخص میں
کھوج کا اتنا مادہ ہے۔

رفتہ رفتہ دبنے لگے اور یہ عالم ہوا کہ میرا ہر لفظ ان کے
لئے ایک سند اور دلچسپی بن کے رہ گیا تھا، سلام ترک کیا،
اور پاؤں پڑنے لگے۔ عمر میں مجھ سے کچھ بڑے ہی تھے، مجھے شرم
آتی، میں بری طرح ٹوکتا۔ غضب یہ کرتے کہ بھرے مجمع میں بھی
ملتے تو میرے پاؤں پڑتے اور جب تک میں سر پر ہاتھ نہ رکھ دیتا
نہ چھوڑتے۔ ایک دفعہ میں نے ڈانٹ دیا کہ "قاسم یہ کیا بدتمیزی ہے"

کہ تم لوگوں کے سامنے بھی ایسی حرکتیں کرو!......"

"شاکر کیا تم یہ سمجھے ہو کہ ان دھمکیوں سے میں تمھارے پاؤں پڑنا چھوڑ دوں گا۔ یہی تو میرا منشاء ہے کہ لوگوں کو بھی دکھاؤں کہ میں تمھارا کتنا احترام کرتا ہوں.. . وہ جلیں تو جلیں" خدا جانے انھیں مجھ سے اتنا شغف کیوں ہو گیا تھا۔ سنا ہے کہ انھیں خود ان کو برا کہنے سے اتنا ناگوار نہ ہوتا تھا جتنا کہ مجھے کچھ کہنے سے ذرا میرے خلاف کسی نے کہا اور لڑ پڑے چنانچہ ان کی یہ عادت جب معلوم ہوئی تو سنا ہے کہ بعض دوستوں نے ان کے سامنے مجھے برا کہنے اور انھیں چھیڑ کے مزہ لینے کا ایک مشغلہ ہی بنا لیا تھا۔

مجھے کبھی کسی کی خانگی باتیں معلوم کرنے کا خیال ہی نہیں ہوتا' لیکن وہ خود ہو کر اکثر خانگی باتیں سنایا کرتے اور مشورے بھی لیتے۔ میں فطرتاً ایک تنہا پسند آدمی ہوں' اس لئے لازماً مجھے ان تمام چیزوں سے نفرت ہے جن سے ایک اجتماعی تعلق پیدا ہوتا ہو' مثلاً انجمن' شہرت' دعوت وغیرہ۔

ایک رات آئے اور کہا "چلو شاکر!" کہا "کہاں؟"
آج ہمارے ہاں دعوت ہے!" "تم مجھے کیوں بلاتے ہو قاسم! تم جانتے ہو کہ میں دعوتوں سے کوئی دلچسپی نہیں رکھتا! بلکہ کتراتا ہوں' کہنے لگے "اسی لئے تو دعوت نہیں دی بلکہ وقت پہ بلائے رہا ہوں!" غرض منطق سے کہیں یا کسی اور طریقے سے مانتے ہی بنتی۔ کہتے "شاکر' تم نہیں جانتے کہ تمھاری کوئی خدمت کرتے ہوئے مجھے کتنی مسرت محسوس ہوتی ہے' ورنہ مجھے کیا پڑی ہے کہ کسی کی اتنی خوشامد و اصرار کرتا پھروں!"

حضرت کی بڑی خواہش یہ تھی کہ میں انھیں نہ بھولوں' چنانچہ اکثر کہا کرتے کہ "دیکھو شاکر تم مجھے کبھی نہ بھولنا' اور اگر تم کسی بڑے مرتبہ یا عہدے پر پہنچے بھی تو یاد رہے کہ بندہ تمھارا مددگار رہے گا!......"

میں چڑانے کو کہہ دیتا کہ "نہیں قاسم۔ میں تمھیں دوست کے اعتبار سے جتنا اچھا انسان سمجھتا ہوں' کردار کے اعتبار سے اتنا ہی خراب' اس لئے خواہ مرتبہ پر پہنچ کر نہ بھولوں' لیکن عہدہ پر پہنچ کر یاد رکھنے کی توقع ذرا کم ہے"

جھنجھلاتے کہ "دیکھا' تمھاری وہی شرارت! بھلا مجھ میں کیا خرابی ہے' اور جب ہم خراب ہیں تو پھر آپ ہم سے اتنا خلوص کیوں رکھیں صاحب؟"

"احمق' اگر خلوص و محبت کی بنا بھی کہیں صرف اچھائیوں پر رکھی جاتی تو نہ دنیا میں عشق کا تصور ہوتا' نہ ماں باپ ہی اپنی بری اولاد کو عزیز رکھتے!"

"جی! تو گویا آپ ہمارے ماں باپ ہیں؟ ۔ ہاں صاحب آپ کیا کیا نہیں بنیں گے!" "دیکھا تم نے اپنے حوصلہ کے مطابق ڈھال لیا! میں نے عشق کا بھی تو نام لیا تھا' تم نے ماں باپ ہی کیوں سمجھا' عاشق سمجھو!"

"جی' کیوں نہیں! یہ تو اور بڑا کرم ہے آپ کا! مختصر یہ کہ تم میں بدفطرتی بھری ہوئی ہے شاکر! مگر یہ سب کچھ نہیں۔ دیکھو تم کبھی بھولنا نہیں!" میں اکثر چیزیں اپنے شوق کے لئے لکھتا اور پھر لاپروائی سے کہیں ڈال دیا کرتا تھا'

نہیں معلوم قاسم کو کس طرح معلوم ہو گیا یا انھوں نے کیونکر سمجھ لیا کہ میں شعر بھی کہتا ہوں اور جیلے بھی لکھتا ہوں۔ میرا مطلب ہے' نثر بھی لکھتا ہوں' اصرار کرنے لگے کہ کچھ سناؤں رفتہ رفتہ شاید چند شعر سنائے۔ خوش ہوئے۔

ایک دن میں خالہ جان کو خط لکھتا بیٹھا ہوں کہ آپ آ گئے سمجھا کوئی ادبی چیز ہے۔ اصرار کیا' کہا خانگی خط ہے' سمجھے تکلف کر رہا ہوں۔ چونکہ کوئی بات ایسی نہ تھی سنا دیا۔ پھر تو کہنے

اس کے بعد انھوں نے معمول سا مقرر کر دیا کہ جب کبھی آنسٹی کو خط لکھوں تو انھیں سنا کر ڈالوں یا اس کی نقل ضرور رکھوں۔ اور یہیں سے ان میں سے استادانہ رنگ ہٹ کر شاگردانہ رنگ آنے لگا۔

اس اثنا میں انھوں نے کئی دفعہ مجھے مجبور کیا کہ مضامین لکھوں اور رسالوں کو بھیجوں۔ میں اس بات سے کتراتا تھا جس کی وجہ انھیں کو نہیں، بلکہ میرے اور سبھی ملاقاتیوں کو مجھ سے سخت شکایت تھی۔

ایک دن یکایک ایک نظم "سب سے نرالا اپنا فسانہ سب سے انوکھی اپنی کہانی" ذہن میں آنے لگی اور تیار بھی ہوگئی کیا بتاؤں سنا کر کیسی آفت مول لی ہے۔ ایک ایک بند بلکہ ایک ایک مصرع سنتے اور میری رانوں پر ہاتھ مارتے کبھی اچھلتے، کبھی بیٹھتے کہ "آہ شاکر کیا نظم لکھی ہے!۔۔۔" ان حضرت کا داد دینے کا طریقہ بھی کچھ عجیب تھا کہ لوگ تو شاید پھڑکتے ہیں تو اپنی رانیں ٹھونکا کرتے ہیں، مگر یہ حضرت میری رانوں کا قلع قمع کیا کرتے۔ جب یہ رنگ دیکھا تو صوفہ چھوڑ میں نے اس طرح کچھ سنانے کا طریقہ اختیار کیا کہ میز کی ایک طرف میں ہوں اور دوسری طرف حضرت! تاکہ دستِ شفقت سے محفوظ رہ سکوں۔ غرض جب نظم اور داد ختم ہوئی تو حکم ہوا کہ "فوراً کسی رسالہ کو بھیجدو!" میں نے کہا "دماغ خراب ہوگیا ہے؟ ... بگڑ گئے کہ "دیکھو شاکر! اگر آج تم نے نہ مانا تو میری تمھاری بہت بگڑ جائے گی! جو ہو سو ہو!" "ارے بھئی میری طبیعت نہیں چاہتی کہ ..." "یہ سب کچھ میں نہیں جانتا آپ کو بھیجنا ہوگا!" خیر اچھی بات ہے "مجھے نہیں اسی وقت میرے سامنے!" پیاڈ سامنے رکھا، دوات اپنے ہاتھ میں پکڑی اور قلم میرے ہاتھ میں دے کے پکڑ لیا کہ "چلو! ابھی لکھو!" "واہ یہ اچھی زبردستی ہے!" اور کیا آپ جیسوں سے "عدم تشدد" سے کام چلے گا!" "لیکن یاد رہے کہ میں ٹکٹ وغیرہ کے پیسے نہیں دوں گا!" جھک مارے آپ! میں خود لگا کے ڈالدوں گا، بلکہ اگر خط اچھا ہوتا تو نظم بھی میں خود ہی لکھ لیتا!" "لیکن کس کو بھیجو گے؟" "ساقی کو!" جب نظم لکھی کہنے لگے ایک خط بھی مدیر کو لکھو!" "ارے بھئی مجھے کیا ضرورت ہے! ویسے رسمی طور پر آپ بھی لکھ سکتے ہیں!" "ہم تو لکھ ہی سکتے ہیں لیکن ہم دیکھنا چاہتے ہیں کہ آپ بھی کچھ لکھ سکتے ہیں یا نہیں!" "کیا لکھوں؟" "جو جی میں آئے!"

سنا اور پھڑکنے لگے کہ "دیکھا اس لئے لکھوایا تھا تم کیا جانو شاکر کہ تم کیا ہو!" اکثر غور بھی کیا لیکن میری سمجھ میں نہیں آیا کہ دراصل میری ادبیات ہی میں کوئی بات ہے یا ان کی عقیدتمندی میں کوئی ایسی خوبی یا خامی تھی کہ وہ میری ہر چیز کے اس قدر گرویدہ تھے۔ نظم لے گئے، اور خود ہی ڈاک کے حوالے کر آئے!

غرض اس کے بعد ان کا ایک معمول ہی ہوگیا کہ مجھ پر جبر کر کر کے نظم و نثر لکھوائیں اور بھجوائیں۔ پھر جب دیکھا کہ مجھے عادت ہوگئی ہے تو ایسے مطمئن ہو گئے جیسے کسی باپ نے اپنے نالایق لڑکے کی بری صفات کو دور کر کے کسی اچھے ڈھرے لگا چھوڑا ہو۔

ممکن ہے یہ باتیں لوگوں کی دلچسپی کی نہ بھی ہوں لیکن اس اعتبار سے کہ وہ قاسم سے متعلق ہیں میرے لئے خاص قیمت رکھتی ہیں اور اگر کوئی ایسا وقت بھی آیا کہ میں کچھ بن سکا تو یہی باتیں ہوں گی جو یاد دلاتی رہیں گی کہ جس نامور شخص کو دنیا جانتی ہے اس کی شہرت کی بنا ایک گمنام ہستی کے ہاتھوں ڈالی ہوئی ہے، اس لئے اگر وہ نامور شخص یاد نہ

کے قابل ہے تو یہ گم نام بھی بھلانے کے لایق نہیں۔

اس چھوٹی سی گنجائش میں ساری باتیں لکھی جائیں اور لکھتے وقت ساری باتیں یاد آجائیں یہ بہت دشوار ہے، لیکن پھر بھی اتنی طمانیت ہے کہ جو کچھ برا بھلا لکھا گیا ہے وہ ایک بچھڑے ہوئے کی یاد دلانے اور ایک فانی کی یادگار بننے کے لئے بہت کافی ہے۔ فانی! جس نے فنا ہوکر بقائے دوام حاصل کی اور اپنی ہر دلعزیزی کے سبب سب سے گم ہو کر بھی سب میں موجود ہے۔

خبر نہ تھی کہ ایسی جیتی جاگتی، ہنستی کھیلتی، لبھاتی، بناتی مورت ہم سے اس طرح چھین لی جائے گی کہ کسی کو خبر بھی نہ ہو کہ قاسم کوئی بیمار ہے، اور اچانک موت کی خبر آجائے لیکن خوبی وعظمت کا یہ کھلونا نہ صرف انسانوں کو عزیز تھا بلکہ خود قدرت کو بھی فرط رحمت اور رشک محبت سے لوگوں کے ہاتھ سے اس طرح چھیننا کہ ٹھیک سے لوگوں کی نظر بھی اس پر پڑنے نہ پائے۔ قدرت نے چاہا اور آسمان نے دست ستم بڑھایا نازک جان تھا، آن کی آن میں دم توڑا۔ چرخ ستمگر کو بھی احساس ہوا کہ ایسی موہنی جان کو لے کر اس کا دل بھی شق ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا رویا اور اس قدر رویا کہ تین دن تک آنسو نہ تھمے ورنہ دار تیر کی چلچلاتی دھوپوں میں ٹکاٹک بارش کے کیا معنے ہوتے ہیں۔

اس عجوبۂ قدرت سے لوگوں کا دل اور ہلا اپنا پرایا، چھوٹا بڑا جس نے لاشے کو دیکھا رو پڑا لیکن زندہ دل قاسم کی وہی انوکھی شان کہ گو چہرہ سوتا ہوا ہے حالت بالکل بدل چکی ہے، چار ہی دن کے نمونیہ نے یہ حال کر دیا ہے کہ شکل نہ پہچانی جائے لیکن آنکھیں کچھ کھلی ہوئی ہیں اور دانت علانیہ نظر آتے ہوئے، گویا دنیا ساری روتی رہی، لیکن قاسم نے ثابت کر دکھایا کہ وہ دنیا کی خوشی وغم اور اچھے، برے سب ہی کو ایک نیم نگاہی سے دیکھتا ہے، اور سارا فلسفۂ مرگ و زیست ہنس کے نیم دیکھنے ایک انوکھے تبسم سے بڑھ کر نہیں! جیا تو مسکراتا ہوا، اور مرا تو مسکراتا ہوا! — کتنا بہادر تھا وہ! اور شاید اسی بہادری کا پرتو تھا جس نے مجھ پر بھی ڈالا تھا۔ تو نہ جانتے ہو قاسم کہ تمھاری لاش پر تمھاری ماں رو رہی ہیں، باپ رو رہے ہیں، بھائی، بہنیں رو رہی ہیں، اپنے پرائے رو رہے ہیں اور میں ہوں کہ بت بنا ہوا کھڑا ہوں! — تو کیا تم سمجھتے ہو کہ تمھاری موت کا مجھے گویا کچھ غم ہی نہیں ہوا؟

سچ تو یہ ہے کہ تم ہی نے تو میری چھوٹی عظمت کا اعتراف کر کر کے مجھے اتنا بےبس بنا دیا کہ غالباً تمھاری ہی مانی ہوئی عظمت کے خلاف سمجھ کر میں تمھاری لاش پر دو آنسو بھی نہ بہا سکا، بلکہ فی الحقیقت تمھارا بے لوث جسم اس سے بہت ارفع تھا کہ مجھ جیسے گندہ اور ادنیٰ آدمی کے آنسو تم پر گرتے! اور پھر اب تمھیں ان آنسوؤں کی پروا بھی کیا ہے!

تم میرے آنسوؤں کی پروا نہ کرو دوسروں کے غم کی تمھیں فکر ہو نہ ہو، لیکن رونا تو یہ ہے کہ تم اتنے عیش پسند انسان رہے، اور تمھیں خود اپنے عیش ومسرت کا بھی تو خیال نہ رہا۔ کیا یہی تھی تمھاری بہار عیش کہ جب غنچہ چٹکنے کو ہو تو اسے مسل دو، کیا یہی تھی تمھاری زندگی، کہ جب اس کے عروج کا وقت آئے تو تم خود غروب ہو جاؤ۔ کسی اور کا نہ سہی لیکن کم سے کم تم نے اپنی اس بھولی بیوی کا تو خیال کیا ہوتا، جس کی تم نے بارہا تعریف بھی کی اور کبھی کمزوریاں بھی گنائیں، جس کے سہاگ کے پھول کھلے ابھی پورا ڈیڑھ سال بھی تو نہیں ہوا تھا اندازہ کرو اس معصوم دل کا جو لوگوں کو روتے دیکھتی ہے، لیکن شرم دامنگیر ہے، خود اُف نہیں کر سکتی، دم گھٹتا ہے، اور مر نہیں سکتی۔ کیا تم نے اسی دن کے لئے اس سے شادی میں اتنی جلدی اور کوشش کی تھی کہ اپنے وداع کے ساتھ

اس کی دنیا ابھی اندھیر بنا جاؤ؟ یہی نما تمھارا ماحاصل عیش کر خود حسرت لے جاؤ اور اسے تڑپا جاؤ؟۔ خیر تم نے بیوی کو چھوڑا چھوڑا کبھی اس ننھی کلی کو بھی دیکھا جس کا "چٹانا" کئے تمھیں ابھی شاید ایک مہینہ بھی نہیں ہوا تھا؟ تم نے اس کی بلکتی ہوئی آواز کی بھی پروا نہ کی؟۔ تمھیں میرے پاس بیٹھتے ہوئے تو اس کے دودھ کی بڑی فکر ہوتی تھی، لیکن اب دنیا سے جاتے ہوئے خیال نہ آیا کہ اس کے دودھ کا انتظام کون کرے گا؟ اسی لئے شاید میری زبان سے نکلتا تھا کہ "تم ابھی سے اِن شادی کے جھگڑوں میں نہ پڑو قاسم!" لیکن تم کہتے کہ "ہٹاؤ شاکر تم تو نرے فلسفی ہو، کہاں کی محبت، کہاں کا فلسفہ، بس کھاؤ پیو مزے اڑاؤ شادی کرو ... اور چلتے بنو!"۔ کیا اپنی سی کر دکھائی! لیکن آخر ایک وقت اِن جھگڑوں سے تنگ آئے ہی اور کہا "ان جھگڑوں سے اب کچھ جی اکتا سا جا رہا ہے شاکر۔ جی چاہتا ہے کہ ایک بالکل الگ گھر لے کر تمھاری طرح تنہا رہوں!"۔ کتنا اچھا الگ گھر لیا تم نے! کہ نہ جھگڑے ہیں، نہ مخمصے ہیں، نہ بیوی ہے، نہ بچے ہیں، نہ غذا ہے، نہ دوا ہے، نہ خوشی ہے، نہ رنج ہے! ۔ یہ سکون کی انتہا ہے، اور وہ تم نے پالی! مگر تم جیسے زندہ دل اور بے چین فطرت آدمی کے لئے اس کی اتنی جلدی بھی کیا تھی قاسم؟

شاکر

فن تقریر

دنیا کی تاریخ بتلاتی ہے کہ جس قوم میں اچھے اچھے مقرر پیدا ہوئے وہ قوم ہمیشہ نیک نام رہی، ان کے جذبات اور احساسات ہمیشہ بیدار رہے اور انھوں نے انسانی زندگی کی تاریخ اور تمدن بنانے میں بڑا حصہ لیا ـــــ انھیں خیالات کو پیش نظر رکھ کر ادارۂ ادبیات اُردو نے "فن تقریر" کے نام سے یہ کتاب ترتیب دی جس میں بتلایا ہے کہ ایک مقرر کے لئے کن کن باتوں کا خیال رکھنا لازمی ہے۔ اور وہ کس طرح ایک کامیاب اور ہردلعزیز مقرر بن سکتا ہے۔ دیباچہ کے تحت جس میں بہت سی مفید معلومات بہم پہنچائی گئی ہیں کئی ایک تصویریں بھی ہیں۔ جن میں مقرر کو نقل و حرکت کا طریقہ بتایا گیا ہے۔ کتاب ہر لحاظ سے مفید اور قابل مطالعہ ہے۔ ضرورت ہے کہ اس قسم کی کتابیں اُردو میں زیادہ سے زیادہ منتقل ہوں۔

سہیل رگیا، جنوری سنہ ۱۹۴۱ء

یہ چھوٹی سی کتاب اپنے موضوع کی ہمہ گیری کے اعتبار سے صد درجہ اہم اور مفید ہے۔ دیباچہ میں فن تقریر کی تاریخ مختلف اقوام کے انداز خطابت کی روشنی میں بیان کی گئی ہے۔ اس کے بعد مقرر کی خصوصیات اور تقریر و خطابت کے مختلف پہلوؤں پر معلومات افزا بحث کی گئی ہے۔ اور قواعد خطابت اور مقررانہ اوصاف و خصائل وضاحت کے ساتھ بیان کئے گئے ہیں۔ کتاب قابل مطالعہ ہے۔

عالمگیر، فروری سنہ ۱۹۴۱ء

غزل

نفعاں آشنائے اثر ہو رہی ہے
مری زندگی مختصر ہو رہی ہے

قیامت یہ کیا چشم تر ہو رہی ہے
کہ ہر شام غم کی سحر ہو رہی ہے

محبت میں اب یوں گذر ہو رہی ہے
بسر کر رہا ہوں بسر ہو رہی ہے

ہر اک ضرب دل کارگر ہو رہی ہے
نظر مبتلائے نظر ہو رہی ہے

میں خود تو زمانے سے غافل ہوں لیکن
زمانے کو میری خبر ہو رہی ہے

مری انتہائے محبت سلامت
تری ہر جفا بے ضرر ہو رہی ہے

کہاں آفتاب اور کہاں ذرہ اختر
مری زیست نقش جگر ہو رہی ہے

اختر رضوانی

کلام وجد

اک پرتو دلکش ہے خیالوں کے اثر کا
خود حسن حقیقت نہیں دھوکا ہے نظر کا

اے جوش جنوں دولت دیدار مبارک
صد شکر نقاب رخ محبوب نہ سرکا

رہتی ہے نظر تشنۂ نظارۂ فطرت
شکوہ ہے تنک مایگی شام و سحر کا

ہنگام سحر قطرۂ شبنم کی ضیا میں
انجام جھلکتا ہے شباب گل تر کا

ہر شے کے خریدار تھے بازار جہاں میں
طالب نہ ملا وجد کوئی جنس ہنر کا

سکندر علی وجد

مرہٹی زبان میں افسانوی لٹریچر

جس زمانے میں جبکہ مہاراشٹر غفلت کی میٹھی نیند سو رہا تھا، وہاں کے باشندوں کے پیروں میں غلامی کی زنجیریں پڑی ہوئی تھیں اور ادب قعر مذلت میں گرا ہوا تھا، ایسے ہی تاریک زمانے میں ایک لڑکا دیا نیشور نامی، موضع آلندی میں پیدا ہوا۔ اس نے عنفوان شباب ہی سے مذہبی پرچار شروع کیا اور مہاراشٹر کے باشندوں کو خواب غفلت سے بیدار کیا۔ اس نوجوان سادھو نے دیا نیشوری لکھی جو مرہٹی ادب میں ایک ناقابل فراموش یادگار ہے۔ یہ بھاگوت گیتا کی منظوم شکل ہے اور مرہٹی زبان کی سب سے پہلی کتاب مانی جاتی ہے اس کے بعد سے اس خطہ میں کئی بڑے بڑے سنت و سادھو پیدا ہوئے جنھوں نے عوام میں بیداری کی روح پھونکی اور ادب کی ترقی میں کوشاں رہے۔ تکارام نے اپنے کلام کے ذریعہ سے لوگوں پر ایک قسم کی وجدانی کیفیت طاری کردی، رامداس سوامی نے ان میں مذہبی و سیاسی بیداری کی روح پھونکی۔ ایکناتھ نے چھوت چھات کو دفع کرنے کی کوشش کی۔ غرض اس دور میں ادب بھی ارتقائی منازل طے کرنے لگا۔

ابتداء میں عوام کا رجحان بھگتی کی جانب زیادہ مائل تھا چنانچہ تکارام، نامدیو اور جنابائی کے کلام کو لوگ بڑے شوق سے سنتے تھے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ پرانی پریم کی کتھائیں بھی بہت شوق سے سنی جاتی تھیں، رادھا کرشن، نل دمینتی اور ستی ساوتری کے واقعات لوگوں پر ایک قسم کا روحانی اثر رکھتے تھے۔ اور ان ہی قصوں سے وہ افسانوی ادب سے بہرہ ور ہوتے تھے۔

جب مرہٹوں کا عروج تمام ہندوستان میں ہو گیا۔ تو عوام کی توجہ زیادہ تر رزمیہ نظموں کی جانب مبذول ہو گئی ان کو مرہٹی میں "پواڑے" کہتے ہیں۔ ان میں بہادران قوم اور شیران وطن کے گیت گائے جاتے ہیں، عموماً یہ نظمیں سیوا جی اما جی نائک جیسے بہادروں کے کارناموں پر لکھی گئی ہیں۔ مرہٹوں کے زوال کے بعد بھی یہ صنف کافی مقبول رہی اور یہ جابجا محفلوں میں سنائے جانے لگے تاکہ لوگوں میں پھر سے وہی روح عود کر آئے، آج بھی مہاراشٹر میں پواڑے بکثرت سنے جاتے ہیں اور ان سے عوام میں بیداری پیدا کرنے کا کام لیا جاتا ہے۔

انگریزوں کی عملدرآمد کے بعد سے عوام کی توجہ انشاء لطیف کی جانب مائل ہوئی اور ان میں ناول اور افسانے تیزی کے ساتھ ترقی کرنے لگے اس وقت کی اکثر کتابیں سنسکرت یا انگریزی کی ترجمہ ہوتی تھیں مثلاً ہتوا پدیش، پنچ تنتر، یال متر وغیرہ رفتہ رفتہ ادب میں رومان کا نشو و نما ہونے لگا۔ بیتال پچیسی سنگھاسن بتیسی جیسی بے نظیر کتابوں سے لوگ اپنا دل بہلانے لگے ۱۸۶۱ء میں جب و شنو کر کی چمتکارک گوشٹی شائع ہوئی اور اسی زمانہ میں مدن منجری، رتن پربھا، کنتا مالا جیسے عشقیہ ناول شائع ہوئے جن کی بدولت ان میں کئی برس تک رومان کا زور و شور رہا۔ اور ناظرین کو ادب کی اس صنف کا خوب چسکا لگ گیا۔

۱۸۷۹ء میں مرہٹی ادب میں ایک انقلاب شروع ہوا ہری نارائن آپٹے آنجہانی نے جو مرہٹی کے مشہور ترین ناول نویس ہیں کرم نک، نامی اخبار جاری کیا اور اس کے ذریعہ اچھی ناول کی داغ بیل ڈالی۔ اس وقت اصلی اور اچھی ناولوں کا مطلق رواج نہ تھا، یہی کشش کہانی تھانت کیسو اگر غور سے کون سنا

گوارا کرے) جوان کا مشہور سماجی ناول ہے اسی اخبار میں شائع ہوا۔ اس وقت کی کہانیاں موجودہ مختصر افسانوں کی جیسی نہیں ہوتی تھیں بلکہ وہ خود ایک ناول کی سی حیثیت رکھتی تھیں۔ آپ کی اکثر کہانیاں سماجی ہیں آپ کی کہانیوں کا ایک مجموعہ "سات کہانیاں" کے نام سے شائع ہوا ہے جس کے چار حصے ہیں، ان میں تقریباً بیس کہانیاں ہیں جن میں 'احسان کا بدلہ' 'قحط تو بہت کٹھن گزرا' 'غریبی کا ستمار اور ڈپیٹیشیا' پڑھنے کے قابل ہیں۔ قحط تو بہت کٹھن گزرا ۱۸۹۷ء میں لکھا۔ اس میں انھوں نے قحط زدہ لوگوں کی دردناک تصویر کھینچی ہے 'کیسے دن گزرے' میں پونا کے ۱۸۹۹ء کے طاعون کے وحشتناک زمانے کا ذکر ہے ڈپیٹیشیا آپٹے صاحب کی مزاحی کہانی ہے۔ 'ہاتھ لگاتے ہی سونا' وغیرہ انگریزی طرز کے افسانے ہیں۔ اسلوب بیان فطری اور زوردار ہے۔ کرم نک اخبار نے مرہٹی ادب اور افسانے کی بہت خدمت کی۔ ۱۸۹۵ء سے مرہٹی افسانوی ادب میں ایک دوسرا انقلاب آتا ہے۔ کاشی ناتھ رگھوناتھ مترا آنجہانی نے 'منورنجن' رسالہ جاری کیا اس میں مختصر افسانے شائع ہوتے تھے جو زیادہ تر بنگالی زبان کا ترجمہ ہوتے تھے۔ کاشی ناتھ راؤ اور ان کے شریک مدیر و شمل سیتارام گرجر کی کہانیاں 'منورنجن' میں شائع ہوئیں۔ مترا آنجہانی نے رام کا اجودھیا لیلا اور راناماد میو وغیرہ ناول لکھے جو ٹھیٹھ بنگالی کے تراجم ہیں، گرجر صاحب نے بھی بابو جلدھر سین' بابو پربھات کمار مکرجی اور پروفیسر کالی پرسن داس گپتا وغیرہ جیسے بنگال کے مشہور انشاپردازوں کی تصانیف کے ترجمے کئے۔ آپ کی ناولوں میں پونم کا چاند، نا وندیوی، دلیا بہت مشہور ہیں آپ بنگالی افسانوں کو مرہٹی جامہ پہناتے ہیں خوب مشاق ہیں، زبان شستہ اور صاف ہے، عموماً آپ کے پیش نظر تعلیمی

اور سماجی چیزیں رہتی ہیں۔

۱۸۹۲ء میں بال گنگادھر تلک آنجہانی نے صحافت کے میدان میں قدم رکھا اور مراٹھا نامی ہفتہ وار اخبار نرسمہ چنتامن راؤ کیلکر کی مدد سے جاری کیا۔ اس وقت مہاراشٹر میں صحافت کافی ترقی کر چکی تھی چنانچہ اس وقت کے مرہٹی اخبارات 'کیسری' 'دینان پرکاش' وغیرہ تھے۔ اسی زمانے میں کیلکر، پروفیسر پرانجپے آنجہانی، کولہٹکر، پروفیسر وامن ملہار جوشی، اننت راؤ کرشناجی ٹیکاٹے وغیرہ جیسے مشہور مصنفین نے چیدہ چیدہ کہانیاں لکھیں اور اسی زمانے میں کیلکر اور کولہٹکر نے مرہٹی ادب میں (ESSAY) لکھنے کا رواج ڈالا۔ کولہٹکر کی کہانیوں میں 'مدیرہ' 'غریب بے چارہ' 'پھر گاؤ' بہترین ہیں۔ کولہٹکر نے سماج سدھار کے لئے جان توڑ کوششیں کیں چنانچہ کیلکر جیسے مشہور سدھارک اپنی سوانح حیات میں رقم طراز ہیں کہ سماج کے سدھار نے میں کولہٹکر مجھ سے بھی بازی لے گئے' ان کے افسانے کتابی شکل کے نام سے شائع ہوئے ہیں جن میں 'کیتاماؤ' 'چندر علی گرمدیں میں نے ریل گاڑی کس طرح مس کی' دلچسپ اور قابل مطالعہ ہیں۔ پلاٹ سیدھا سادہ مگر نہایت دلچسپ ہے۔ پروفیسر شیورام مہادیو پرانجپے مہاراشٹر کے مشہور مقرر اور ادیب تھے آپ کی کہانیاں زیادہ تر سیاسیات سے متعلق ہیں آپ نے افسانوں کے ذریعے ملک میں ملک کی عزت اور خدمت کے خیالات پیدا کرنے کی کوشش کی ان کے افسانوں میں ایک کارخانہ 'رام بھاؤ کی کہانی' 'ایک تیتر پھوڑنے والے کی کہانی' 'ایک جاترا' وغیرہ مشہور ہیں۔ پروفیسر وامن ملہار جوشی کے افسانوں کا مجموعہ 'لپشپ کرڈک' کے نام سے شائع ہوا ہے ان میں بعض بزرجمہر افسانے بہت عمدہ ہیں۔ اس وقت مرہٹی زبان بہت ترقی کر رہی تھی' بمنڈ اکر اور فاضلانہ

جیسے عالم و فاضل اپنی تحریروں سے اس کی خدمت کر رہے تھے۔ مشہور سیاس کرشناجی گوکھلے آنجھانی نے بھی میدان صحافت میں قدم رکھا اور اپنے افسانوں کو منورنجن میں شائع کیا، آپ عموماً انگریزی افسانوں کو مرہٹی جامہ پہناتے تھے۔ آپ کے چند افسانوں کا مجموعہ بھی شائع ہوا ہے۔ منورنجن میں بنگالی، انگریزی، گجراتی، فرانسیسی اور ہندی افسانوں کے ترجمے شائع ہوتے تھے۔

۱۹۰۶ء میں اگست کے مہینے سے واسودیو گوبند آپٹے آنجہانی نے آنند نامی ماہنامہ جاری کیا، آپ انگریزی اور بنگالی زبان کے ترجمے کرتے تھے۔ بنکم چندر چیٹرجی اور ہنری وڈ وغیرہ کے اکثر ناولوں کا ترجمہ مرہٹی زبان میں کیا ہے۔

۱۹۱۰ء کے بعد سے مرہٹی افسانہ نگاری کے میدان میں چند نئے افسانہ نگاروں نے قدم رکھا جن میں ناتھ مادھو آنجہانی، سہکاری کرشن آنجہانی، نارائن ہری آپٹے اور نارائن سیتارام پھڑکے اور سرسوتی کمار مشہور ہیں اس وقت منورنجن کے ڈھنگ پر نویگ، ادیان، مدھوکر، کرلوسکر وغیرہ ادب لطیف کے ماہنامے نکلے، اس زمانے میں انگریزی کی جاسوسی کہانیاں کثرت سے مرہٹی ادب میں منتقل ہونے لگیں پریم چندر اور ٹیگور کے افسانوں کا ترجمہ بھی اسی دوران میں کیا گیا چنانچہ پریم چند کی کہانیاں، آنند راؤ جوشی اور کتھا کد مب ایس آر مراٹھے نے جو ٹیگور کے افسانوں پر مشتمل شائع کیا۔

ناتھ مادھو مہاراشٹر کے مشہور ناول نگار تھے، آپ نے بھی چند افسانے لکھے ہیں۔ سہکاری کرشن کے چند افسانے سنسار کتھا کے نام سے کتابی صورت میں شائع ہوئے ہیں۔ سرسوتی کمار کے افسانے زیادہ تر سماجی [illegible] جو بال منڈوانے، بچپن کی شادی اور عمر رسیدہ مردوں کی شادی اور برے رسم و رواج سے متعلق ہیں۔

۱۹۲۰ء کے بعد سے مرہٹی افسانہ نگاری میں ایک انقلاب شروع ہوتا ہے۔ کئی ماہنامے مثلاً یشونت، چھورتی، ایشونت جیوتسنا، کرلوسکر، منوہر وغیرہ نکلے، جن میں افسانے بکثرت شائع ہونے لگے۔ اسی دوران میں ٹالسٹائی، ہارڈی، گالزوردی، چیخوف، گورکی، موپاساں وغیرہ کے افسانے مرہٹی زبان میں کثرت سے منتقل ہوئے، نئے نئے افسانہ نگاروں نے افسانے لکھے جن میں سے بعض اب چوٹی کے افسانہ نگار شمار کئے جاتے ہیں مثلاً پروفیسر پھڑکے، کھانڈے کر، ماڈکھول کر، اترے، ودیکر وغیرہ

پروفیسر پھڑکے، نارائن سیتارام پھڑکے مرہٹی کے ہر دلعزیز ناول نگار اور افسانہ نویس ہیں، اب تک آپ کی ۴۶ کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں جن میں ۱۲ ناول ہیں۔ ہری نارائن آپٹے آنجہانی کے بعد سے آپ ہی مرہٹی کے سب سے بڑے ناول نگار مانے جاتے ہیں۔ ان کے ناولوں میں، مسافر، آرزو، دولت، نرنجن، جادوگر وغیرہ بہت مشہور ہیں۔ افسانے بھی خوب لکھتے ہیں، آپ کے افسانے دل پذیر اور دلچسپ ہوتے ہیں، عوام کا نقشہ خوب کھینچتے ہیں، نوجوانوں کے دلوں کو گرمانے اور محبت بھری کہانیاں لکھنے میں آپ کو کمال حاصل ہے۔ آپ کے افسانوں کے تین مجموعے، پروفیسر پھڑکے کی کہانیاں (۲ جلدیں) اور لولا اور دیگر افسانے شائع ہوئے ہیں۔ شانتا دنیا میں پہلا قدم، بھالچندر کی شکار میں آپ نے بچہ، عورت اور مرد کی نفسیات کا نہایت خوبی سے تجزیہ کیا ہے، کالج کی شرارتیں میں کالج کی شرارتوں کو نہایت عمدگی سے بیان کیا ہے، دیگر افسانوں میں لکشمی پوجن، لولا، وتسلا وغیرہ پڑھنے کے قابل ہیں۔ آپ کے افسانوں کا پلاٹ عموماً بہت دلچسپ ہوتا ہے۔ اور قارئین کی دلچسپی افسانے کے ساتھ ساتھ بڑھتی ہی جاتی ہے۔ اسلوب بیان نہایت دلچسپ

اور زبان کسی قدر سلیس ہوتی ہے۔

کھانڈے کر۔ وشنو سکھارام کھانڈے کر مرہٹی کے مشہور افسانہ نویس اور ناول نگار ہیں آپ کی تصانیف کی تعداد تقریباً ۴۳ بتائی جاتی ہے جن میں آٹھ ناول اور گیارہ افسانوں کے مجموعے ہیں۔ آپ کے ناولوں میں سفید بادل دل کی پکار، ہرلا پریم بہت مشہور ہیں۔ افسانے کے مجموعوں میں پھول اور پتھر، لوجن، سادھی پر کے پھول، گرمی اور بارش وغیرہ بہت مقبول ہیں۔ کھانڈے کر کو مرہٹی زبان کی افسانہ نگاری میں وہی درجہ حاصل ہے جو اُردو زبان میں منشی پریم چند مرحوم یا ڈاکٹر اعظم کریوی کو، آپ کے افسانوں میں بھی منشی پریم چند یا ڈاکٹر اعظم کریوی کے افسانوں کی طرح کوئی نہ کوئی پیغام ہوتا ہے، چند سال قبل مرہٹی ادب میں آرٹ اور زندگی کی بحث خوب چھڑی، کھانڈے کر اس خیال کی تائید میں تھے کہ آرٹ زندگی کے لئے ہے اور پروفیسر پھڑکے کا خیال تھا کہ آرٹ آرٹ کے لئے، چنانچہ اس طرح مہاراشٹر میں دو اسکول پیدا ہو گئے ایک کھانڈے کر کا دوسرے پھڑکے کا۔ کھانڈے کر کا قول ہے کہ وہ ادب یا آرٹ بالکل بیکار ہے جو زندگی کے لئے کارآمد نہ ہو چنانچہ ان کی ہر تحریر میں یہی چیز کارفرما دکھائی دیتی ہے

کھانڈے کر کی افسانہ نگاری کا میدان بہت وسیع ہے وہ بہت بڑا مصلح ہے اس کے پیش نظر ہر افسانہ لکھتے وقت کوئی نہ کوئی آئیڈیل ہوتا ہے، چنانچہ اس کے آنسوؤں میں وہ موجودہ لیڈروں اور مقرروں کی دھوکا بازی کو نہایت عمدگی سے بیان کرتا ہے۔ مردوں کا پریم، میں اس نے مردوں کی عیاری کو ظاہر کیا ہے، وہ مزدوروں، غریبوں اور دکھی انسانوں کا بہت بڑا ہمدرد ہے۔ چنانچہ انصاف، دکھی انسان، پھٹا ہوا پیسہ اس کی بہترین مثالیں ہیں۔ کھانڈے کر بہت بڑا ماہر نفسیات ہے

چنانچہ یتیم لڑکی، ٹھہرو وغیرہ میں اس نے بچوں کی نفسیات کا نہایت خوبی کے ساتھ تجزیہ کیا ہے، عورتوں کی افسانوں میں بیرون خانہ، دوسری بیوی، ڈھلکتے ہوئے آنسو، پڑھنے کے قابل ہیں۔

کھانڈے کر کی زبان نہایت سلیس اور شگفتہ ہوتی ہے۔ افسانے نہایت ستھرے اور پاکیزہ ہوتے ہیں۔ پلاٹ عمدہ درجہ دلکش ہوتا ہے تشبیہیں اور استعارے بکثرت ہوتے ہیں۔ بعض تشبیہیں تو اتنی عمدہ ہوتی ہیں کہ انسان سر دھننے لگتا ہے۔ افسانوں میں مزاح کی چاشنی بھی نہایت ہی لطیف پیرایہ میں ہوتی ہے حقیقت میں مرہٹی زبان کی خوش قسمتی ہے کہ اس کو اتنا بڑا آرٹسٹ ملا۔　　(باقی آئندہ)

امجد علی خاں یوسف زئی (عثمانیہ)

سرگذشت

ادارۂ ادبیات اردو ــــــ مرتبہ خواجہ حمید الدین شاہد

ادارہ کی دس سالہ سرگذشت نہایت ہی محنت اور سلیقہ سے مرتب کر کے شائع کی گئی ہے۔ اس میں ادارۂ ادبیات اردو کی ہر جہتی علمی و ادبی خدمات کو اس انداز سے پیش کیا گیا ہے کہ یہ ایک مستقل کتاب ہو گئی ہے۔ اس کے مطالعہ سے نہ صرف ادارہ کی علمی و ادبی خدمات کا پتہ چلتا ہے بلکہ حیدرآباد کی علمی سرگرمیوں اور اردو نوازیوں کا ایک خاکہ پیش نظر ہو جاتا ہے۔

کتابت و طباعت بہت ہی نفیس اور پاکیزہ ہے

تعداد تصاویر ۲۵ خوشنما جلد اور گرد پوش بھی ہے

تعداد صفحات (۳۴۴)　　قیمت صرف ۲؍

گل بوٹے

ایک "رومانیت" بھرے بزرگوار جنھوں نے نام خدا زندگی کی صرف سائٹھ بہاریں ہی دیکھی ہیں' اپنی خزاں کو بہار کا سندیسہ سمجھ کر ساتویں دہائی میں بھی گھر بسانا چاہتے ہیں' ماشاءاللہ سے آپ بالکل "صحیح سالم" ہیں' البتہ کسی قدر لرزہ براندام رہتے ہیں' لقوہ سے منہ کچھ ٹیڑھا سا ہو گیا ہے مگر منہ میں دانت نہ ہونے سے بدنمائی پیدا نہیں ہوئی ہے' بصارت کی کمزوری آپ کے لئے کوئی نئی بات نہیں ہے مگر عمر کے بڑھنے سے "بصیرت" بڑھ گئی ہے' کانوں سے برابر سنائی دیتا ہے' صرف چلانا پڑتا ہے۔

آپ کے کئی عدد چھوٹے چھوٹے لڑکے اور لڑکیاں ہیں' سب سے بڑے لڑکے نے پچھلے مہینہ چالیسویں برس میں قدم رکھا ہے اور سب سے چھوٹی لڑکی اٹھائیسویں سال میں کھیل رہی ہے ان سب کو آپ نے "اعلیٰ تعلیم" دلائی ہے' بڑا لڑکا انگریزی میں تار کا مضمون اچھی طرح سمجھ لیتا ہے' اردو تو "پدری زبان" ٹھیری! اس میں سب کو کافی مہارت ہے' البتہ بعض "پیچیدہ" الفاظ کی املا میں ایک آدھ حرف کی غلطی ہو جاتی ہے' جیسے آم کو "ع" سے' سلام کو "ص" سے' صبح کو "س" سے اور عقل کو "الف" سے بھی لکھا جاتا ہے' انگریزی لکھنے کا کام نہیں پڑتا اس لئے اس کی املا میں کسی غلطی کا امکان ہی نہیں! بولنے میں عادت نہ ہونے کی وجہ سے ذرا تکلف ہوتا ہے' اس لئے "یس" اور "نو" پر ہی گفتگو ختم ہو جاتی ہے۔

اعلیٰ تعلیم کے ساتھ ساتھ لڑکوں کی تربیت کی طرف بھی پوری پوری توجہ کی گئی ہے اور بڑی کوشش سے ان میں "اعلیٰ کردار" اور "بلند اخلاق" پیدا کئے گئے ہیں' یہی وجہ ہے کہ یہ آج کل کی "شریف" صحبتوں میں دن رات گھنٹوں بیٹھے اعلیٰ درجہ کے "مہذب" کھیل مثلاً برج' پوکر' فلش وغیرہ میں جی کھول کر حصہ لیا کرتے ہیں' موسمی تفریحیں مثلاً گھوڑ دوڑ اور بارش کے سٹے پر بھی تھوڑی بہت ہار جیت ہوا کرتی ہے' ایسے موقعوں پر ایک گونہ بےخودی پیدا کرنے کے لئے "بنت عنب" کو بھی دعوت دی جاتی ہے' "ولایتی" سے زیادہ رغبت ہے کیونکہ "دیسی" صحت کو بگاڑ دیتی ہے' جب یہ "میم صاحبہ" جلوہ گر ہوتی ہیں تو سارا گھر اُن کے عشوہ و ادا کی کافرماجرائی پر مرمٹتا ہے' یہاں تک کہ پدر عالی مقام بھی ان کے حسن جہاں سوز سے اپنی بےنور آنکھیں سینک لیا کرتے ہیں۔

بچوں کی "سعادت مندی" کا یہ عالم ہے کہ ابا جان کتنا ہی خفا ہوں خاموش رہتے ہیں' کبھی غصہ آجاتا ہے تو صرف ڈیم فل' بلڈی فل وغیرہ کہہ دیا کرتے ہیں' اس قسم کے انگریزی لفظ جب بچوں کے منہ سے پھول بن کر جھڑتے ہیں تو پدر بزرگوار پھولے نہیں سماتے اور فرماتے ہیں "بچہ اب اچھی انگریزی بولنے لگا ہے"!

لڑکیوں کی لیاقت لڑکوں سے کچھ ہی کم ہے' مگر سب کی سب پڑھی لکھی ضرور ہیں' ان کی تعلیم میں بھی آپ نے کافی روپیہ صرف کیا ہے' اس لئے جب کبھی کسی لڑکے کی جانب سے جہیز وغیرہ کا سوال ہوتا ہے تو آپ بہت برہم ہوتے ہیں اور فرماتے ہیں۔

"تعلیم یافتہ لڑکی کی بھی خواہش کی جاتی ہے اور پھر جہیز بھی مانگا جاتا ہے' اگر جہیز جمع کیا جاتا تو ایسی "اعلیٰ تعلیم" کیسے دلائی جاتی"؟

مگر اب تک آپ کو ایک بھی ایسا اعلیٰ خیال "علم دوست برخوردار" داماد نہیں ملا جو آپ کی کسی لڑکی سے محض اس کی "مخصوص" اعلیٰ تعلیم کی وجہ سے بیاہ کرنا پسند کرے' حالانکہ بھی میں بڑی لڑکی

کے لئے پیغام آیا تھا مگر شرط یہ تھی کہ ایک "اشد ضروری" قرض کی ادائی کے لئے فی الحال صرف پندرہ ہزار رُپے دئے جائیں' ایک اور صاحب بہادر نے یورپ جانے کے لئے بارہ ہزار رُپے طلب کئے تھے' آج کل کے یہ "تعلیم یافتہ" صاحبزادے بیویوں کے رپے سے اپنی دنیا سنوارنا چاہتے ہیں' معلوم نہیں ایسے شرمناک مطالبوں کا کب منہ کالا ہوتا ہے اور کب آپ کی صاحبزادیوں کے سہرے کے پھول کھلتے ہیں۔

لڑکیوں کا بیاہ کچھ تو ان کی "کم سنی" اور کچھ پدر بزرگوار کے بیاہ پر بیاہ کی مصروفیت کی وجہ سے آج تک نہ ہوسکا' آپ کے عزیز اور دوست کبھی ان کے بیاہ کی طرف آپ کو متوجہ کرتے ہیں تو مسکرا کر فرماتے ہیں۔

"ابھی بچے ہیں جلدی کیا ہے"!

مگر ان معصوم بچوں نے چپکے چپکے اپنے بیاہ کر لئے ہیں' اور بڑی بہنیں جوان ہیں کے بعد "بازار" سے اپنے اپنے جوڑے خرید لائے ہیں' والد محترم کے بقول جوانی دیوانی ہوتی ہے اور ایسے کھیل تو سبھی کھیلتے ہیں!

بعض احمق لوگ اپنی لڑکیاں آپ کے اعلیٰ تعلیم یافتہ سعادت مند اور ہونہار لڑکوں کو اس لئے دینا پسند نہیں کرتے کہ وہ بے روزگار ہیں حالانکہ اللہ کا دیا سب کچھ موجود ہے' دوسری "نامعقول" وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ بچوں کے بچے ہوگئے ہیں' مثل مشہور ہے "آج کا بچہ کل کا باپ ہوتا ہے"! اس میں تعجب کی کیا بات ہے!! این سعادت بزور بازو نیست!!!

خیر کوئی اپنی لڑکی دے کہ نہ دے' جو پسلی کا جوڑا ہے ایک دن جوتیاں چٹخانے آئے گا اور ضرور آئے گا! اس لئے آپ نے لڑکوں کے بیاہ کا خیال ہی چھوڑ دیا ہے' لڑکے بھی باپ کے ہم خیال ہیں اور فی الحال افزائش نسل "دوبارہ" میں مصروف ہیں' ان کی کوششیں خوب پروان چڑھ رہی ہیں اور گھر میں کچھ عجیب "میلہ" لگ رہا ہے۔

چند روز سے باپ بیٹوں میں ذرا چشمک ہوئی ہے بچے چاہتے ہیں کہ ابا جان "نئی امی جان" کو نہ لائیں مگر یہ کیسے ہوسکتا ہے؟ جوانی کی یہ راتیں اور مرادوں کے یہ دن آخر کس طرح کٹیں! اس لئے کسی ایسی موزوں امی جان کی تلاش جاری ہے جو برس پندرہ یا سولہ کی ہو!!

جب سے لڑکوں نے ابا جان کے بیاہ کی خبر سنی ہے وہ بھی اپنے اپنے جوڑے بدلنے کی فکر میں ہیں' خدا وہ دن جلد لائے کہ ان سب کی فکریں دور ہوں اور باپ بیٹے اپنی اپنی مرادیں پائیں! آمین!!

"باغباں"

اُردو مثنوی کا ارتقاء

پروفیسر عبدالقادر سروری ہمارے شکریہ کے مستحق ہیں کہ انھوں نے اس کتاب میں اُردو مثنوی کی پیدائش سے لے کر موجودہ دور تک اس کی ترقیوں اور تبدیلیوں کی مختصر تنقیدی تاریخ پیش کردی ہے۔ اور ہر عہد کی خصوصیات پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ **شاہکار** لاہور۔ نومبر ۱۹۴۰ء

ادارۂ ادبیات نے اس کتاب کو شائع کرکے اُردو ادب میں ایک گرانقدر اضافہ کیا ہے۔ امید ہے کہ صاحب ذوق حضرات اس کتاب سے فائدہ اٹھائیں گے۔ **سہیل** گیا۔ مئی ۱۹۴۰ء

صنف مثنوی کے متعلق جس قدر تالیفات اب تک شائع ہوئی ہیں۔ ان میں یہ کتاب تفصیل تنقید و تشریح کے لحاظ سے امتیازی حیثیت رکھتی ہے۔ **البیان**۔ مئی ۱۹۴۰ء

مثنویوں پر پُرمغز تبصرہ کیا گیا ہے۔ یہ کتاب اُردو ادب کے طلبہ کے لئے ناگزیر ہے **جامعہ** جولائی ۱۹۴۰ء

فطرت کا انتقام

اک زمانہ وہ بھی تھا' یا د تو ہوگا اے ہمنشیں
کائناتِ حسن و نغمہ تھی مرے زیرِ نگیں

ہائے کیا دن تھے بہ فیضِ شہرتِ شعر و سخن
میری ہمراہی پہ نازاں تھے عروسانِ چمن

کتنے پھولوں کو دیا تھا میری نظروں نے شباب
کتنی کلیاں بن گئیں تھیں چاند تاروں کا جواب

کتنے گل میرے لئے کھل کھل مرجھاتے رہے
کتنے دل میری جواں سالی کو بہلاتے رہے

کتنی آوازوں کی مے میرے لئے بہتی رہی
کتنی آنکھوں کی جوانی بارِ غم سہتی رہی

کتنے جلوے میری نظروں میں سما کر کھو گئے
کتنے چہرے نذرِ بے مہریٔ مبہم ہو گئے !

کتنے معصوموں کے دل ہنس کر چرالاتا تھا میں
کتنے ساغر آنکھوں ہی آنکھوں میں پی جاتا تھا میں

پھول سے چہرے رہے غم آشنا میرے لئے
پنکھڑی سے لب رہے وقفِ دعا میرے لئے

ہر نظر اک جلوۂ تازہ میں کھو جاتا تھا میں
ہر قدم اک منزلِ نو کی خبر لاتا تھا میں

ہر نفس پیغامِ سرمستی سناتا تھا مجھے
کھیلنا تھا' کھیلنے میں لطف آتا تھا مجھے

اِس طرف یہ رنگ تھا اور اُس طرف فطرت کا قہر
میرے جامِ زندگی میں بھر رہا تھا کوئی زہر

کیا خبر تھی ایسے دن' ایسی گھڑی بھی آئے گی
زندگی کی بادشاہی بھی کہیں جھک جائے گی

کیا خبر تھی عشق میں ایسا بھی اک دن آئے گا
جو کہیں جھکتا نہ تھا' ہائے وہ سر جھک جائے گا

بے نیازیٔ خاک چھانے گی دو عالم کی نظرؔ
قیصریت بھیک مانگے گی درِ محبوب پر

شادمانی جان دے گی' درد کے آغوش میں
زہر کی تلخی بھی ہوگی' بادۂ سرجوش میں

وقف ہوں گے قہقہے آنسو بہانے کے لئے
رات آئے گی تو آئے گی جگانے کے لئے

گاہ شکرِ غم نوازی' گاہ کربِ انتظار
گاہ آنسو' گاہ مجبوری کا دامن تار تار

لاکھ ہشیاری میں بھی سویا کرے گی زندگی
حلقۂ احباب میں رویا کرے گی زندگی

نیند ایسی آئی' کوئی صبح چونکاتی نہیں
کوئی عالم ہو طبیعت جوش میں آتی نہیں

فکرِ مستقبل' خیالِ یار' دردِ روزگار !
لب فسردہ' روح خوابیدہ' نگاہیں بے قرار

ایک دل اور اِس قدر رنج و تعب میں مبتلا
کتنی ظالم ہے مشیت' کتنا جابر ہے خدا

نظرؔ

اُردو کی نئی کتابیں

۱۔ گنجینۂ صحت (جلد اوّل) از حکیم بشیر احمد ۹۶ صفحات۔ بھوشن پرنٹنگ پریس۔ جگادھری۔

۲۔ مجربات سلطانی (حصہ سوم) از حکیم محمد یار خاں۔ ۲۴۰ صفحات تعلیمی پرنٹنگ پریس لاہور

۳۔ مجربات جیلانی (جلد سوم) از حکیم غلام جیلانی۔ ۱۶۰ صفحات آفتاب برقی پریس۔ امرتسر۔

۴۔ تحفۂ مقبول۔ جلد اوّل (طبی نسخے) از پیر مقبول عالم ۱۷۲ صفحات حجازی پریس۔ لاہور

۵۔ سائیکلوپیڈیا آف ہومیوپیتھک ورکس (حصہ اوّل) از کاشی رام ۹۵۰ صفحات۔ قائمین پریس۔ لکھنو

۶۔ اقتصادی ہند۔ از برج نرآن ۲۶۹ صفحات۔ امرت الکٹرک پریس لاہور

۷۔ ہمزاد کے درشن (سحر و طلسم) از پنڈت سادھو رام ۲۱۶ صفحات حجازی پریس۔ لاہور

۸۔ کامل جدید موٹر گائیڈ۔ از ایم ایس ظفر آغا۔ ۱۰۴ صفحات حجازی پریس۔ لاہور

۹۔ اشک خونیں (نظمیں) از رامیشور پرشاد بسمل ۹۴ صفحات وزیر ہند پریس۔ امرتسر۔

۱۰۔ سرودِ غم (نظمیں، سلام وغیرہ) از سیماب اکبرآبادی ۱۰۰ صفحات قیمت ۱۲/ دفتر رسالہ شاعر۔ آگرہ۔

۱۱۔ حیات محمد عبدہ (سوانح) از محمد مظہر الدین ۲۰۳ صفحات قیمت ۱۲/ دفتر اقبال اکیڈمی۔ لاہور۔

۱۲۔ بادۂ سر جوش (مجموعۂ کلام) از پنڈت لبھو رام جوش ۲۰۴ صفحات قیمت ۱۲/ مرکز تصنیف و تالیف۔ نکودر۔ جالندھر۔

۱۳۔ بھگوت گیتا۔ مترجمہ پروفیسر محمد اجمل خاں۔ قیمت عمہ کتاب گھر۔ الہ آباد۔

۱۴۔ ترتیب نزول قرآن کریم۔ مترجمہ پروفیسر محمد اجمل خاں قیمت (صہ) کتاب گھر۔ الہ آباد

۱۵۔ بستان تجلیات (مجموعہ کلام) از میر غضنفر علی شاہ بیتاب ۱۷۶ صفحات قیمت (عاں) حمایت دکن پریس۔ حیدرآباد دکن۔

۱۶۔ بشریٰ (آنحضرتؐ کی نسبت توریت اور انجیل وغیرہ کی بشارتیں) از۔ عنایت رسول عباسی۔ ۳۰۴ صفحات۔ شروانی پرنٹنگ پریس۔ علی گڑھ۔

۱۷۔ افتتاح الاندلس (تاریخ) مترجمہ پروفیسر جمیل الرحمٰن ۱۶۴ صفحات قیمت (عہ) کتابستان۔ الہ آباد

۱۸۔ خلافت اور سلطنت (تیسری صدی ہجری کے واقعات) از ڈاکٹر امیر حسن مترجمہ سبطین احمد۔ ۱۳۷ صفحات۔ دار المصنفین۔ اعظم گڑھ۔

۱۹۔ مشاہیر عالم کی داستان مصیبت (سولہ مشاہیر کے حالات) از آتش گوجرانوالیہ ۱۶۰ صفحات قیمت عہ۔ نرائن دت سہگل۔ لاہور۔

۲۰۔ سنہرے سپنے (۶۲ گیت) از تنویر قریشی۔ ۲۰۷ صفحات قیمت ۱۲/ نرائن دت سہگل۔ لاہور۔

۲۱۔ مسافر کی ڈائری با تصویر (سفرنامہ) از خواجہ احمد عباس ۱۹۲ صفحات قیمت عہ۔ حالی پبلشنگ ہاؤس۔ اُردو بازار۔ دہلی

۲۲۔ جاہ و جلال (ڈراما) مترجمہ صوفی غلام مصطفےٰ۔ قیمت عمہ ڈرامیٹک کلب۔ گورنمنٹ کالج۔ لاہور

۲۳۔ بہار داغ (داغ کا منتخب کلام) مرتبہ سید نذیر نیازی قیمت عہ۔ کتب خانہ علم و ادب۔ دہلی۔

۲۴۔ علم خانہ داری۔ از محمودہ صدیقی۔ ۱۵۰ صفحات۔ قیمت عہ۔ سب رس کتاب گھر۔ خیریت آباد حیدرآباد دکن

مرزا سیف علی خاں

تنقید و تبصرہ

شہید کربلا قرآن کی روشنی میں

از ابو محمد مصلح ناشر ادارۂ عالمگیر تحریک قرآن مجید حیدرآباد۔ ۲۷۲ صفحات۔ قیمت تین روپے۔

اس چھوٹی سی کتاب میں حضرت امام حسین علیہ السلام کے حالات زندگی کو قرآنی نقطۂ نظر سے دیکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ سید الشہداء کی پوری زندگی ان کے باپ اور نانا کی زندگیوں کی طرح اس عظیم الشان کلام الٰہی کی تفسیر تھی اور اس موضوع پر اتنا مواد مل سکتا ہے کہ زیر نظر کتاب سے کئی گنا ضخیم کتابیں لکھی جا سکتی ہیں۔ ابو محمد مصلح صاحب نے امام حسینؑ کی حیات ایک نئے پیرائے سے لکھی ہے اور اسی جدت کی حد تک وہ قابل مبارکباد ہیں۔ لیکن کتاب کی ترتیب اور فراہمی مواد موضوع کے شایان شان نہیں ہے۔ یہ ایک ایسا کام ہے کہ بغیر تلاش و جستجو اور قدیم کتابوں کے مطالعہ کے تکمیل کو نہیں پہنچ سکتا اور اس کے لئے کافی وقت اور صبر کی ضرورت ہے۔ محمد مصلح صاحب کے یہاں بظاہر اتنا وقت نہیں کہ وہ صرف اسی موضوع کے لئے ایک عرصے تک وقف ہو جائیں۔ اسی لئے اس کے مطالعہ سے واضح ہوتا ہے کہ کتاب رواروی میں لکھی گئی ہے۔ لیکن اس کا اسلوب شگفتہ اور کتابت و طباعت شائستہ ہے۔ ان لوگوں کے لئے جو مطالعہ کے لئے زیادہ وقت نہیں نکال سکتے یہ کتاب بہت دلچسپ اور مفید ثابت ہوگی اور اس وقت تک جب کہ اس موضوع پر کوئی بسیط کتاب شائع نہ ہو یہی بہت سی مفید معلومات کا ذریعہ بنی رہے گی۔ اس کتاب کو مصلح صاحب نے مولوی سید محمد حسین صاحب جعفری ناظم تعلیمات سرکار عالی کے نام معنون کیا ہے اور اس کے ذریعہ سے قوم کے ان نوجوانوں کے نام ایک پیام پہنچانے کی کوشش کی ہے جو قرآن کی روشنی میں حکومت الٰہیہ کے قیام کے لئے کچھ کرنا چاہتے ہیں۔ کتاب کی قیمت میں کمی کی کافی گنجائش ہے۔

سفینۂ نجات

از مسعود بیگم عالیہ بنت مولانا ... ۴۸ صفحات مطبوعہ شمس المطابع حیدرآباد۔

اس چھوٹی سی کتاب میں تقریباً پچاس نوحے درج ہیں۔ یہ اس میں اس سے قبل دو بار چھپ چکی ہے۔ پہلی مرتبہ ۱۹۱۲ء میں اور اس کے بعد ۱۹۳۲ء میں ان دونوں طباعتوں کے نسخے مفت تقسیم کر دئے گئے تھے اور غالباً اس تیسری طبع کے نسخے بھی ہدیۃً ارسال کئے جا رہے ہیں۔ اس میں مناجات، نعت اور سلام کے بعد نوحے درج کئے گئے ہیں۔ جن پر یہ صراحت کر دی گئی ہے کہ کونسے نوحے کن تاریخوں میں پڑھے جائیں۔ اس طرح پہلی سے دسویں محرم اور پھر بارھویں اور بیسویں محرم اور ۲۸ صفر کو پڑھنے کے قابل نوحوں کی کافی تعداد اس کتاب میں شائع کی گئی ہے۔

سراج اور اُن کی شاعری

از عبد القادر سروری۔ مطبوعہ عہد آفریں برقی پریس۔ ۲۰۰ صفحات قیمت ایک روپیہ چار آنے۔

اس کتاب میں اورنگ آباد کے مشہور صوفی شاعر سید شاہ سراج الدین سراجؔ کے حالات زندگی اور خصوصیات سخن تفصیل سے درج کئے گئے ہیں پہلا حصہ جو شاعر کی زندگی سے متعلق اعلیٰ پایہ تحقیقات پر مشتمل ہے تاریخ ادب اردو سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے ایک خاص چیز سمجھا جائے گا۔ اس میں خاص تلاش و جستجو کے بعد سراجؔ اور ان کے ماحول اور ان کے حالات سے متعلق تفصیلی معلومات درج کی گئی ہیں یہ حصہ ابتدائی ۶۵ صفحوں پر پھیلا ہوا ہے۔ دوسرا حصہ شاعری سے متعلق ہے اور تقریباً اتنے ہی صفحات اس کے لئے وقف کئے گئے ہیں۔ اس میں یہ دکھایا گیا ہے کہ سراجؔ نے کس طرح حافظؔ اور ولیؔ کے رنگ میں شاعری کی اور سراجؔ کے بعد کے شاعروں مثلاً میرؔ اور غالبؔ کے کلام میں سراجؔ کا رنگ کس طرح جگہ جگہ جھلکتا ہوا نظر آتا ہے یہ کتاب اس قابل ہے کہ اردو ادب کا ذوق رکھنے والے اس کو خرید کر پڑھیں

پڑھیں گے اور مصنف کی محنت اور قابلیت کی داد دیں گے۔

فکر مت کرو از قاضی محمد زین العابدین۔ ۱۵۰ صفحات قیمت ۸ - مطبوعہ اعظم اسٹیم پریس۔

یہ ڈراما ۱۹۱۷ء میں اس وقت لکھا گیا تھا جب کہ اس کے مصنف سیول سروِیس کی ٹریننگ کے لئے امراوتی ابرار میں مقیم تھے۔ اس وقت یورپ کی جنگ عظیم زور و شور سے جاری تھی اور اس کے شعلے مشرق تک پہنچ چکے تھے۔ ہندوستان بھی اس زمانے میں حکومت برطانیہ کی طرف سے اس معرکہ میں کود پڑا تھا۔ اور اس کے ہر صوبے میں سپاہیوں کو بھرتی کرنے کی کوششیں کی جارہی تھیں۔ اسی سلسلے میں مصنف نے کمشنر صاحب برار کی فرمائش پر یہ ڈراما قلمبند کیا تھا۔ اس میں ایک لطیف پیرائے میں جنگ میں شریک ہونے کے لئے ترغیب دلائی گئی ہے۔ اگرچہ اس کا اصل موضوع ترغیبی ہے لیکن پورا ڈراما ادبی لطافتوں اور خاکہ کی خوبیوں سے معمور ہے۔ اور جگہ جگہ مزاح کی چاشنی بھی موجود ہے۔

یہ ڈراما عرصہ تک برار میں اسٹیج پر بھی پیش ہوتا رہا ہے۔ اس میں مصنف نے ہندستان کی موجودہ سیاست اور اہل ہند کی معاشرتی حالت کی طرف بھی بلیغ اشارے کئے ہیں۔ اس کے مطالعہ سے یہ احساس قوی ہوجاتا ہے کہ ہندستان اسی وقت آزاد ہوسکتا ہے جب کہ اس کے رہنے بسنے والے جوانمردی اور ایثار کے لئے تیار ہوں۔ جب تک یہ جوہر پیدا نہ ہوگا اہل ہند نہ اپنے پاؤں پر آپ کھڑے ہوسکتے ہیں اور نہ ان لوگوں کی مدد کرسکتے ہیں جو انھیں بیرونی آفتوں اور داخلی [illegible] سے بچانا چاہتے ہیں۔

آئندہ زمانہ از محمد فضل الرحمن۔ ۱۱۲ صفحات قیمت ایک روپیہ مطبوعہ اعظم اسٹیم پریس۔

یہ دو ایکٹ کا ڈراما ہے۔ جس میں ہماری سماج پر نہایت [illegible] میں نکتہ چینی کی گئی ہے۔ معاشرتی اور سماجی نقائص پر اسی قدر ضرب لگانے کی ضرورت ہے۔ اس ڈرامے کو دیکھنے سے اب اس امر

اس کے بعد جب لنگایت مذہب کو شہرت حاصل ہونے لگی تو کنڑی ادب کا دوسرا دور شروع ہوا۔ اور اس دور کا آغاز کرنے والے لنگایت مذہب کے پیرو تھے۔

کنڑی شاعری کا تیسرا دور پندرھویں صدی عیسوی سے شروع ہوتا ہے۔ جب کہ کنڑی بولنے والوں میں برہمنی مذہب کو مقبولیت حاصل ہونی شروع ہوئی۔

اس رسالے میں مولف نے جدید کنڑی شاعری کی زبان صنایع و بدایع اور مطالب و موضوعات سخن پر دلچسپ پیرائے میں اظہار خیال کیا ہے۔ ضرورت ہے کہ اسی طرح ملک کی دوسری مقامی زبانوں کے ادب پر بھی پُر از معلومات مضامین شائع ہوں۔ ...

بس تو اور بھی زیادہ کمی نظر آتی ہے۔ اسی ضرورت کو پیش نظر رکھ کر ادارۂ ادبیات اُردو نے محترمہ محمودہ صدیقی صاحبہ سے یہ کتاب مرتب کرا کے شائع کی ہے۔ یہ دس فصلوں پر منقسم ہے جن میں جسم اور اعضائے جسمانی حفظ صحت، ہوا، پانی اور غذا، گھر اور اس کی نگہداشت امراض اور ان کی روک تھام، تیمارداری اور فرسٹ ایڈ۔ گھر کا انتظام اور کھانوں کے نسخے وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ ہر عنوان کے تحت کئی ذیلی سرخیاں قایم کرکے سلیس اور سادہ زبان میں مفید معلومات فراہم کردی گئی ہیں۔ اس کتاب کا دیباچہ مولوی فیض محمد صاحب نے لکھا ہے جس میں اس موضوع سے متعلق اس وقت تک جو اردو کتابیں موجود ہیں ان پر تبصرہ کرکے زیر نظر کتاب کی خصوصیات اور اس کی افادیت کو واضح کیا ہے۔ ہر پڑھی لکھی خاتون کے لئے اس کا مطالعہ ناگزیر ہے۔ ادارۂ ادبیات اردو کا یہ عمدہ تحفہ دنیائے ادب میں مقبولیت کا درجہ حاصل کرے گا۔ سہیل گیا۔ جنوری ۱۹۴۱ء

حبِ مقام مسرت ہے کہ ادارۂ ادبیات اُردو نے جناب سید علی منظور صاحب کے کلام کا مجموعہ اس نام سے شائع کیا ہے۔ سید صاحب جدید طرز کے شعرا میں بہت بلند پایہ ہیں ان کا کلام ہمایوں میں چھپا رہتا ہے۔ ہمایوں بابت ماہ ۱۹۴۰ء

تنقید و تبصرہ

شہید کربلا قرآن کی روشنی میں

از ابو محمد مصلح ناشر ادارۂ عالمگیر تحریک قرآن مجید حیدرآباد د۔ ۲۷۲ صفحات۔ قیمت تین روپے۔

اس چھوٹی سی کتاب میں حضرت امام حسین علیہ السلام کے حالات زندگی کو قرآنی نقطۂ نظر سے دیکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ سید الشہداء کی پوری زندگی ان کے باپ اور نانا کی زندگیوں کی طرح اس عظیم الشان کلام الہٰی کی تفسیر تھی اور اس موضوع پر اتنا مواد ... ...

عرفان حافظ

از شیاما چرن داس۔ ۵۰ صفحات مجلد قیمت ایک روپیہ۔ مطبوعہ دہلی پرنٹنگ پریس۔ دہلی۔

اس چھوٹی سی کتاب میں حافظ کے کلام سے مختلف موضوعوں سے متعلق اشعار منتخب کرکے توضیح و تشریح کے ساتھ شایع کئے گئے ہیں اس کے مولف شیاما چرن داس صاحب کو ادب کا اچھا ذوق ہے۔ انھوں نے اپنے دیباچہ میں لکھا ہے کہ ان کے مطالعہ کے دوران میں تین کتابیں انھیں سب سے زیادہ پسند آئیں۔ ایک دیوان حافظ (۲) بھگوت گیتا (۳) ایمرسن کا کلام۔ وہ لکھتے ہیں کہ :۔

"دیوان حافظ عشق حقیقی کی تعلیم کا نادر و نایاب خزانہ ہے اور خواجہ حافظ کو دنیا کا وسیع تجربہ ہے۔ اس پر ان کی قادر بیانی

تمہ جب کہ اس موضوع پر کوئی بسیط کتاب شائع نہ ہو یہی بہت سی مفید معلومات کا ذریعہ بنی رہے گی۔ اس کتاب کو مصلح صاحب نے مولوی سید محمد حسین صاحب جعفری ناظم تعلیمات سرکار عالی کے نام معنون کیا ہے اور اس کے ذریعہ سے قوم کے ان نوجوانوں کے نام ایک پیام پہنچانے کی کوشش کی ہے جو قرآن کی روشنی میں حکومت الٰہیہ کے قیام کے لئے

اس طرح آگے چل کر لکھتے ہیں :۔

" اس خاک پا نے بیس سال کے مطالعۂ حافظ اور محنت شاق کے بعد دیوان حافظ میں سے ان تمام اشعار کے انتخاب کرنے کی کوشش کی ہے جو عشق حقیقی کے مختلف مراحل سے تعلق رکھتے ہیں۔ انتخاب کے بعد ان اشعار کو چوبیس فصلوں میں تقسیم کیا ہے۔ تاکہ طالبان حق کے لئے عشق حقیقی کی مکمل تعلیم اختصار کے ساتھ اس طرح تیار ہو جائے کہ وہ باسانی روزانہ وظیفہ کر سکیں "۔

خود مولف کی اس وضاحت کے بعد اس کتاب کے متعلق صرف اتنا لکھ دینا کافی ہے کہ یہ واقعی محنت و مطالعہ کا نتیجہ ہے اور خواجہ حافظ شیرازی کے اشعار کی جو توضیح کی گئی ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مولف کو تصوف کا اچھا ذوق ہے۔ اس موضوع سے دلچسپی رکھنے والے اصحاب میں یہ کتاب ضرور مقبول ہو گی۔

اُردو رسم خط

از محمد سجاد مرزا ایم اے (۴۸) صفحات قیمت ۸ر مطبوعہ انتظامی مشین پریس

اس چھوٹے سے رسالے میں رسم خط سے متعلق نہایت تحقیقی اور اہم معلومات درج کی گئی ہیں اور مختلف خطوں کے جو نمونے دے گئے ہیں ان کی وجہ سے اس کتاب کو خاص اہمیت حاصل ہو گئی ہے۔ اردو میں اپنے موضوع سے متعلق یہ پہلی کتاب ہے جس میں اتنے اہتمام اور حسن ذوق کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔ مختلف عنوانوں مثلاً رسم خط کی ابتدا اور ارتقاء۔ اردو رسم خط کے پیش رو اور خود اردو رسم خط کے تحت مفید معلومات ایک جا کر دی گئی ہیں۔ اور اُردو کے لئے ایک نئے خط کی ضرورت دکھاتے ہوئے مولوی شیخ حسین صاحب مشہدی دختاہ آبادی کے بنیادی رسم خط سے متعلق جو نمونے اور تجویز پیش کی گئی ہے وہ بھی اردو کے لسانی ارتقاء جیسے مسائل سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے قابل مطالعہ ہے۔

نقش اولیں طلبہ کلیہ ورنگل کا نقش ماہی رسالہ۔ مدیر سید اختر حسین ایم اے۔

ورنگل کالج سے اس سے قبل بھی ایک رسالہ شایع ہوتا رہا ہے
لیکن اس سال سے اس نے نئی وضع اور جدید تراش خراش حاصل
کرکے اپنے پیشروؤں کی صف میں ایک ممتاز جگہ حاصل کرلی ہے۔ اور
جس انداز سے اب نکل رہا ہے اگر یہ جاری رہ سکے تو یقین ہے کہ یہ
رسالہ ان تمام رسائل سے بازی لے جائے گا جو مملکت حیدرآباد میں
طلبہ کی طرف سے شایع کئے جاتے ہیں۔ اس مجلہ کی کامیابی کا سہرا اس کے
مدیر سید اختر حسین ایم اے اور نائب مدیر سید شاہ بلیغ الدین کے سر ہے۔
اس رسالے کے تمام مضامین دلچسپ اور مفید ہیں۔ اگرچہ اس میں زیادہ تر
طلبہ کو حصہ لینا چاہیے لیکن دوسرے اصحاب کے مضامین کی شرکت
بھی ضروری ہے۔ تاکہ طلبہ ان کے مطالعہ سے اپنے ذوق ادب اور
معلومات میں اضافہ کرسکیں۔ نظموں کا حصہ بھی بلند پایہ ہے۔ توقع
ہے کہ اس رسالہ سے ورنگل کالج کے طلبہ کے علاوہ دوسرے اصحاب بھی
اور خاص کر دوسرے مدرسوں کے طلبہ ضرور استفادہ کریں گے۔

کنڑی شاعری کے جدید رجحانات از ڈی کے بھیم سین راؤ ایم۔ اے۔ مطبوعہ
اعظم اسٹیم پریس۔ (۱۶) صفحات۔

یہ اصل میں مجموعہ تحقیقات علمیہ جامعہ عثمانیہ کے ساتویں
سالنامہ کا چھپا ہوا حصہ ہے جس کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے
کہ ریاست حیدرآباد کی ایک مقامی زبان کنڑی کی شاعری کس
خوبی کے ساتھ ترقی کرتی جارہی ہے۔ کنڑی ادب کو عموماً تین
حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ اس کی ابتدا کرناٹک میں اس وقت
سے شروع ہوئی جب کہ پانچویں صدی عیسوی میں جین مذہب کو
عروج حاصل تھا۔ چنانچہ کنڑی کی اکثر ابتدائی کتابیں جین مذہب
ہی کے شاعروں کی لکھی ہوئی ہیں۔ یہ دور ۱۱۶۰ء تک جاری رہا۔
اس کے بعد جب لنگایت مذہب کو شہرت حاصل ہونے لگی تو
کنڑی ادب کا دوسرا دور شروع ہوا۔ اور اس دور کا آغاز
کرنے والے لنگایت مذہب کے پیرو تھے۔

کنڑی شاعری کا تیسرا دور پندرھویں صدی عیسوی سے
شروع ہوتا ہے۔ جب کہ کنڑی بولنے والوں میں برہمنی مذہب
کو مقبولیت حاصل ہونی شروع ہوئی۔

اس رسالے میں مولف نے جدید کنڑی شاعری کی
زبان صنایع وبدایع اور مطالب و موضوعات سخن پر دلچسپ
پیرائے میں اظہار خیال کیا ہے۔ ضرورت ہے کہ اسی طرح ملک کی
دوسری مقامی زبانوں کے ادب پر بھی پُر از معلومات مضامین
شایع کئے جائیں۔ **شعبۂ تنقید**

نمود زندگی

یہ جناب سید علی منظور صاحب حیدرآبادی کی ایک سو ایک
نظموں اور غزلوں اور رباعیوں کا دوسرا بیش بہا مجموعہ ہے۔ جناب
موصوف حیدرآباد کے مشہور و معروف اور پختہ گو شاعر ہیں اُردو کا شاید
ہی کوئی ایسا بلند پایہ رسالہ ہوگا جو آپ کے کلام کی اشاعت سے محروم
رہا ہو۔ علی منظور صاحب قدیم و جدید رنگ شاعری کی معتدلانہ روش
پر نہایت استقلال کے ساتھ چل رہے ہیں اور آپ اس رنگ میں جو کچھ
کہتے ہیں خوب کہتے ہیں۔ صوفیانہ جذبات کی سادگی اور مشق سخن کی
پختگی آپ کے کلام کی نمایاں خصوصیات ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ
ادارۂ ادبیات اُردو کا یہ عمدہ تحفہ دنیائے ادب میں مقبولیت کا
درجہ حاصل کرے گا۔ **سہیل گیا۔ جنوری ۱۹۴۱ء**

مقام مسرت ہے کہ ادارۂ ادبیات اُردو نے جناب سید علی منظور صاحب
کے کلام کا مجموعہ اس نام سے شایع کیا ہے۔ سید صاحب جدید طرز کے شعرا
میں بہت بلند پایہ ہیں ان کا کلام ہمایوں میں چھپتا رہتا ہے۔ **ہمایوں اپریل**

لفافے بدلنا

(ایک تنقیدی نظر)

جناب احمد علی خاں صاحب مجاہد نے سب رس بابت [illegible] میں ایک مضمون " لفافے بدلنا " تحریر فرمایا ہے۔ اس کے متعلق کچھ عرض کرنے کی جرات کر رہا ہوں۔ اس کی وضاحت بھی ضروری خیال کرتا ہوں کہ نہ مجھے جناب مجاہد سے کوئی پرخاش ہے اور نہ حضرت جگر کے کلام کا ضرورت سے زیادہ معتقد ہوں۔

اگر کسی قوم یا کسی جماعت کے افعال پر انگشت نمائی کی جاتی ہے تو اس کے کسی ایک ہی فرد کو " اپنے دعوے کی دلیل میں " نہیں پیش کیا جاتا۔ خواہ اسی ایک فرد میں وہ تمام برائیاں کیوں نہ یکجا ہوں جو تمام قوم میں ہیں۔ لیکن اگر اس جماعت کی مجموعی مثال نہیں پیش کی جاسکتی تو اس جماعت کے متعدد افراد پر نکتہ چینی کر کے تمام جماعت کے متعلق نتیجہ اخذ کیا جاتا ہے۔ اپنے تمام مضمون میں محترم نقاد نے ایک عام کمزوری کے متعلق خاص طور پر حضرت جگر کو اپنا نشانہ بنایا ہے۔ اور محض ان کی غزل گوئی میں نکتہ چینی پر ہی بس نہیں کیا بلکہ جگر جیسے بڑے اور قابل شاعر کو

" جہاں متقدمین کا کوئی اچھا شعر نظر آئے
بس رال ٹپکنے لگی ' فوراً چوری کے مال کو گلا دیا
الفاظ بدل دیے بحر و ردیف تبدیل کر دی
تخلص ٹھونس دیا "

جیسے سبک الفاظ سے مخاطب کیا ہے۔ اگر کسی جماعت میں انفرادی برائیاں نکالنا جائز قرار دیا جائے تب بھی ادب و احترام اور طریقہ تنقید کو بالائے طاق رکھنا کہاں کا انصاف ہو۔

اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ قابل نقاد کا مقصد ایک عام کمزوری کو ظاہر کرنا تھا تو تمام محلہ میں صرف ایک مکان کو نشانہ بنانا کہاں کا طریقہ ہے؟

اب رہا فی نفسہ " لفافے بدلنے " کا سوال تو ظاہر ہے کہ دوسرے سے سیکھ کر ہی کچھ آسکتا ہے۔ ایک طرف اگر انسان کی فطرت میں جدت طرازی ہے تو دوسری طرف اپنے سے بہتر چیز کی نقل کرنا یا دوسرے کی اچھی چیز کی برائیوں کو اپنی اس سے کم اچھی چیز کی اچھائیوں سے چھپا لینا بھی اس کی فطری عادت ہے جب وہ دیکھتا ہے کہ ایک پھل کا زیادہ تر حصہ اچھا اور کم تر حصہ سڑا ہوا ہے تو بجائے تمام پھل کو پھینک کر دوسرے کو تلاش کرنے کے اسی پھل کے سڑے ہوئے حصے کو نکال کر پھینک دیتا ہے اور اچھے حصے کو کھا لیتا ہے۔ اسی طرح وہ شاعر اصلی معنیٰ میں شاعر نہیں کہا جا سکتا جو دوسروں کے اشعار کو اپنی شاعری کے سانچے میں ڈھال کر پیش نہ کرے۔

بہر حال قابل مضمون نگار کا یہ نظریہ کہ شاعر میں جدت اور اپجناٹی ہونی چاہیے بڑی حد تک درست ہے اور بہترین شاعر وہی ہے جو اپنی شاعری میں ایک انوکھا پن پیدا کر دیتا ہے

مصطفیٰ کمال خاں شروانی

ادارہ کی خبریں

اُردو امتحانات

اس سال ادارہ کے اُردو امتحانات (اُردو دانی، اُردو عالم، اُردو فاضل خوش نویسی، املا و انشا و کتابت) ۲۱، ۲۲، ۲۳ اگست ۱۹۴۱ء مطابق ۱۵، ۱۶، ۱۷ مہر ۱۳۵۰ف کو لئے جائیں گے۔ اور درخواستیں بھیجنے کی آخری تاریخ یکم ۔ ۲۶ ستمبر مقرر کی گئی ہے۔ اب تک متعدد مقامات سے شریک ہونے والے امیدواروں کی درخواستیں وصول ہو چکی ہیں۔ جو اصحاب ان امتحانوں میں شریک ہونا چاہتے ہیں انھیں چاہیے کہ دفتر ادارہ سے مطبوعہ فارم (ایک آنے کا اسٹامپ روانہ کر کے) منگوالیں اور خانہ پُری کرنے کے بعد فیس کے ساتھ جلد دفتر میں داخل کریں۔

جملہ بہی خواہان اُردو سے توقع ہے کہ اپنی خواتین کو ان امتحانات کی تیاری میں مدد دیں گے۔ اور اپنے جملہ ملازمین کو خواندہ بنا کر کم از کم اُردو دانی کے امتحان میں ضرور شریک کرائیں گے تاکہ ملک میں اُردو بولنے والوں کی تعداد میں اضافہ ہو۔ اور اہلِ ملک کا معیار شائستگی و خواندگی بڑھے۔

تعلیم کا انتظام اور تقریریں

ادارہ کے اُردو امتحانات کی تعلیم شہر حیدرآباد کی مختلف درسگاہوں (مثلاً درسگاہ ادبیہ بیگم بازار، درسگاہ لمعات شرقیہ بیرون یاقوت پورہ، مرکز ادبیہ سلطان پورہ وغیرہ) کے علاوہ اضلاع میں بھی پربھنی، کپل، گلبرگہ، کنگتی، کلیانی، دانگل، خانہ پور، عثمان آباد وغیرہ میں دی جا رہی ہے۔ دیگر مقامات میں بھی جو اصحاب اس قسم کا قومی کام کرنا چاہتے ہوں وہ ادارہ سے مراسلت کریں تاکہ ان کو مفید مشورہ دیا جا سکے۔

تعلیمی انتظامات کے علاوہ گذشتہ سال کی طرح اس سال بھی حیدرآباد ریڈیو سے مفید تقریروں کا انتظام کیا گیا ہے جو [illegible] کو پیش نظر رکھ کر مختلف ماہرین فن اصحاب سے دلوائی جا رہی ہیں۔ ان تقریروں کا تفصیلی نظام نامہ اسی ہفتہ مقامی اخباروں میں چھپ چکا ہے اور سب رس کے اس شمارے میں صفحہ ۶۲ پر درج ہے۔

اِدارے کے شعبے

اس دوران میں ادارہ کے کئی شعبوں کے جلسے ہوئے جن میں سے چند کا تذکرہ یہاں درج کیا جاتا ہے۔

شعبۂ زبان

اس شعبے کا جلسہ ۲ فروری ۱۹۴۱ء مطابق ۱۹ فروردی ۱۳۵۰ف کو منعقد ہوا۔

حاضرین:۔ مولوی قاضی عبدالغفار صاحب، ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور
مولوی سید محمد صاحب، ڈاکٹر یوسف حسین خاں صاحب
مولوی ضیاء الدین احمد صاحب انصاری، مولوی نور الحسن صاحب
پنڈت ونشی دھر صاحب، نواب سیف علی خاں صاحب
مولوی عبدالقادر صاحب سروری، ڈاکٹر محمد راحت اللہ خاں صاحب

ف ۱ سابقہ جلسے کی روئداد پڑھی گئی اور اراکین نے اس کی توثیق فرمائی۔

ف ۲ مندرجہ ذیل امور بغرض تصفیہ پیش ہوئے:۔

(۱) حسب تحریک مولوی سید محمد صاحب بالاتفاق طے پایا کہ مردم شماری اور اُردو زبان کے متعلق موجودہ حالت کے پیش نظر حسب ذیل قرارداد منجانب ادارہ مقامی اخباروں میں شائع کرائی جائے:۔

"ادارۂ ادبیات اُردو مردم شماری کے موجودہ حالات کو پیش نظر رکھ کر اہل ملک کو خاص طور پر یہ مشورہ دینا ضروری سمجھتا ہے کہ جہاں تک زبان کا تعلق ہے تمام لوگ جن کی مادری زبان اُردو ہے عام اس سے کہ وہ کسی فرقہ یا مذہب سے تعلق رکھتے ہوں، اس امر کا خاص طور پر لحاظ رکھیں کہ

مردم شماری کی خانہ پری میں مادری زبان صحیح طور پر لکھوائی جائے کیونکہ اردو زبان کی ترقی کا بہت کچھ انحصار آئندہ مردم شماری کے اعداد پر ہونے والا ہے۔ اسی طرح جن لوگوں کی مادری زبان اُردو نہیں لیکن جو اُردو زبان بولتے اور سمجھتے ہیں وہ بھی اس کا اندراج صحیح طور پر کرائیں اور تحقیق کے ساتھ دیکھ لیں کہ ان کے منشا کے مطابق اندراج ہوا ہے یا نہیں"۔

(۲) مصطلحات الفاظ اور اصطلاحوں کے اردو ترجموں کے متعلق بالاتفاق طے پایا کہ اس سلسلے میں ذیلی مجلس کے اجلاس ہر مہینے کے پہلے پنجشنبہ کو دفتر پیام میں شام کے وقت منعقد ہوا کریں۔ مولوی قاضی عبد الغفار صاحب آئندہ سے اس مجلس کے داعی ہوں گے۔ یہ طے پایا کہ مولوی محمد سجاد مرزا صاحب پرنسپل ٹریننگ کالج کو بھی اس جلسے میں مدعو کیا جائے۔

(۳) اراکین مجلس نے سرکاری اداروں وغیرہ کے مزید چند ایسے نام پیش کئے جو مدرسہ "کور وکر و کنگ" کی طرح ثقیل اور غیر مانوس ہیں مثلاً قانون انسداد بیرحمی بر جانوران وغیرہ۔ بالاتفاق طے پایا کہ ایسے ناموں کی ایک فہرست تیار کی جائے تاکہ حکومت سرکار عالی اور متعلقہ محکموں سے ایسے ناموں میں مناسب اصلاح ترمیم یا تبدیلی کی استدعا کی جاسکے۔

(۴) دکنی مخطوطوں وغیرہ کے سلسلے میں بالاتفاق طے پایا کہ بغرض تشریح نواب سیف علی خان صاحب کے پاس بھی فہرستیں روانہ کی جائیں تاکہ تشریح کا کام جلد ممکن ہوسکے۔

شعبۂ زبان کی ذیلی مجلس

پنجشنبہ ۶ مارچ کو ادارۂ ادبیات اُردو کی ضمنی کمیٹی اصطلاحات جدیدہ کا جو جلسہ قاضی عبد الغفار صاحب ایڈیٹر پیام کے یہاں منعقد ہوا تھا اس میں قابل توجہ الفاظ کی فہرستیں پیش ہوئی تھیں۔ کمیٹی نے ان فہرستوں کے بعض اجزاء پر غور کیا اور بعض ترجمے وضع بھی کئے گئے لیکن آخر میں یہ رائے قرار پائی کہ ان تمام الفاظ کی پھر ایک فہرست مرتب کر کے تمام اراکین کمیٹی کی خدمت میں بھیج دی جائے تاکہ وہ کافی غور و فکر کے بعد آئندہ جلسے میں تشریف لائیں۔

اراکین سے یہ بھی توقع کی جاتی ہے کہ وہ اس قسم کے اور بھی انگریزی الفاظ جمع کرتے رہیں گے جن کا ترجمہ ہونا چاہیے کام کو جلد ختم کرنے کے خیال سے شعبہ زبان کی اس کمیٹی کا آئندہ جلسہ ۱۲ ار اردی بہشت یوم پنجشنبہ کو بوقت (۵) بجے شام دفتر "پیام" میں منعقد ہوگا۔

شعبۂ امتحانات

مجلس امتحانات کا جلسہ ۱۰ فروری ۱۹۴۱ء روز دوشنبہ (۹) بجے صبح محکمۂ نظامت تعلیمات میں مولوی سید علی اکبر صاحب کی صدارت میں منعقد ہوا۔ صدر اور معتمد کے علاوہ مولوی سجاد مرزا صاحب، مولوی غلام ربانی صاحب، مس جیسی سندی صاحبہ، نواب میر اکبر علی خان صاحب بیرسٹر ایٹ لا، ڈاکٹر سید محی الدین قادری صاحب زورؔ، پروفیسر عبد المجید صاحب صدیقی اور پروفیسر سید محمد صاحب ایم اے نے شرکت فرمائی۔

حسب ذیل امور طے پائے:۔

(۱) آئندہ امتحانات کیلئے ۱۴ اور ۱۵ اگست ۱۹۴۱ء مطابق ۵ و ۱۶ ر ۱۷ ار مہر ۱۳۵۰ف کی تاریخیں مقرر کی گئیں۔

(۲) امتحان خوش نویسی کے نصاب حسب ذیل کتابیں مقرر ہوئیں۔

اداروں کی جو سے ذیل امور طے پائے :-

مولوی سید محمد صاحب اور مولوی سید بادشاہ حسین صاحب کو اس خیمہ میں شریک کرنے کی توثیق کی گئی حسب ذیل مصنفین کی کتابوں کی اشاعت کا مسئلہ پیش ہوا اور ان کے متعلق حسب ضرورت مناسب تصفیے کئے گئے۔

بیرون ریاست کے مصنفین:- (۱) مجنوں گورکھپوری مختلف کتب

(۲) غلام جیلانی برق کمبل پور دو کتابیں

(۳) عبدالوسیع عصری بنگلور ڈرامے

(۴) محمد ابراہیم زبیری برار اشتراکیت

(۵) مخمور عثمانی دہلی زندہ لاش

(۶) عزت رامپوری افسانے

(۷) الطاف مشہدی لاہور بدیت کے گیت

(۸) زرخ ش مرحوم کلام

اضلاع کے مصنفین:- (۱) عطا کلیانوی رباعیات

(۲) مراد علی طالع بجکنڈہ درس عبرت

(۳) سید عبدالقادر چیتور بالغوں کی پہلی کتاب

(۴) انور شاہ آبادی نغمۂ معصوم

(۵) حمید اللہ خاں شید ایڈیٹر سوانح حیات بہادر جنگ

(۶) علی بن عبدالحبیب الحضری سچ کا جادو

(۷) صیادق نواب عماد الملک کی تعلیمی سرگرمیاں

بلدہ کے مصنفین:- (۱) مرزا عصمت اللہ بیگ فن کتابت طباعت

(۲) ابوالقاسم سرور مجموعۂ مضامین

(۳) ناصر علی ایم اے معاشیات

(۴) اعجاز الحق قدوسی بنات رسول

(۵) میر حسن ایم اے۔ تہذیب و تمدن کے اجزائے لطیف

(۶) شجاع احمد قائد کشمش ثانی

(۷) شجاع احمد قائد بات چیت

(۸) عزیزہ رضوانی سراب

(۹) غلام جیلانی گاندھی جی

(۱۰) علی شاکر مضامین اور افسانے

(۱۱) جلال الدین اشک از بعثت تا برلن۔

ان کے علاوہ حسب ذیل تجویزوں پر غور اور تصفیہ کیا گیا۔

(۱) بدر شکیب صاحب ترجمہ اے شارٹ ہسٹری آف سائنس

(۲) عزیز الحق صاحب بہترین مضمونوں اور نظموں کا انتخاب اور ترتیب

باقی صاحب نے اطلاع دی کہ کتاب اے مینگ اف لائف کا نصف سے زیادہ ترجمہ کر چکے ہیں لیکن اب وہ اس کی اشاعت کو پسند نہیں کرتے اس لئے وہ ایک دوسری کتاب ای کامبی کی ٹریجڈیا آف گریٹ پوٹری کا ترجمہ کر کے ادارہ کو بغرض اشاعت دیں گے۔ پروفیسر فضل حق صاحب نے میاتھیو آرنلڈ کے مضمون آن پوئٹری کا جو ترجمہ کیا ہے اس کے متعلق طے پایا کہ رسالہ سب رس میں بالاقساط شایع کیا جائے۔

مسز نائیڈو کے حالات زندگی ترتیب دینے کی سفارش کی گئی۔

شاخیں ادارے کے شاخیں برابر سرگرم عمل ہیں۔ پربھنی کی شاخ کی طرف سے طلبہ اُردو دانی، اُردو عالم، اُردو فاضل کے درس کا انتظام کردیا گیا ہے اور پابندی سے اساتذہ اور طلبہ مصروف عمل ہیں۔ زنانہ مرکز بھی قایم کردیا گیا ہے۔ محترمہ رحیم النسا بیگم صاحبہ صدر معلمہ نسوان اُردو پربھنی کی جدوجہد لایق صد آفریں ہے کہ موصوفہ نے باوجود اپنی شدید مصروفیات کے زنانہ مرکز قائم کرنے میں بڑی مدد کی اور اُردو دانی اور اُردو عالم کی طالبات کو تعلیم دینے کا بھی وعدہ کیا ہے اور موصوفہ کی کوششوں سے اُردو عالم میں چار اور اُردو دانی میں [illegible] طالبات نے شرکت کی ہے امید ہے کہ زنانہ مرکز قائم ہو جانے سے [illegible] طالبات شریک ہوں گی، دوسرا مرحلہ تعلیم [illegible]

جب کی تشہیر ضرورت تھی خدا کا شکر ہے کہ اس کی تعلیم اور طلبہ کی فراہمی کا بھی انتظام ہو گیا جس کے لئے مولانا سید محمد صاحب ذکی فاضل دیوبند صدر امام مسجد مہتاب علی شاہ پربھنی لائق تشکر ہیں کہ مولانا نے باوجود اپنی گوناگوں مصروفیات کے طلبہ کی فراہمی اور ان کی تعلیم میں خاص طور پر حصہ لینے کا وعدہ فرمایا ہے اور درس کا آغاز ہو چکا ہے اب تک (۱۷) طلبہ شریک درس ہیں۔

ادارۂ ادبیات اردو شاخ پربھنی کے دارالمطالعہ کے لئے مولوی محمد عبدالجلیل صاحب بی ایس سی، اے، جی مددگار کاٹن ریسرچ اسسٹنٹ محبوب باغ پربھنی نے اپنے عزیز مولوی سید مرتضیٰ صاحب مرحوم گرداور کی تقریباً (۵۰) عدد کتابیں عوام کے افادہ کے لئے مرحمت فرمائیں۔ جس کے لئے ہم موصوف کے مشکور ہیں۔

مولوی عبدالسلام صاحب اہلکار دفتر ماہر چیف صدر مزرعۂ زراعت پربھنی نے دو عدد مڈل عطا کرنے کا اعلان فرمایا ہے یہ مڈل ان طالبات کو دیئے جائیں گے جو زنانہ مرکز شاخ پربھنی سے اردو دانی اور اردو عالم میں درجۂ اول کامیاب ہوں گے جس کے لئے ہم موصوف کے مشکور ہیں۔

۲ مارچ ۱۹۴۹ء کی شب میں مارکٹ پولیس ہال میں شاخ پربھنی کی طرف سے ایک نہایت کامیاب مشاعرہ ہوا جس کے لئے حسب ذیل مصرع طرح دیا گیا تھا۔

آباد محبت کا ویرانہ ہوا آخر

مختلف شعراء مثلاً مسرت، شباب، پیکر، ماجد، معتبر، خیال اور سحر نے اپنی غزلیں سنائیں (مرسلہ حمیداللہ خاں شمیم معتمد)

کتب خانہ

[illegible] کتب خانہ کو مولوی خلیفہ حمیداللہ خاں صاحب [illegible] مہاراجہ بہادر کی تصنیف بزم خیال کا [illegible] اور مولوی ابو محمد سید اسمٰعیل [illegible]

کے توسط سے مولوی عبدالحق صاحب محتسب بلدہ کی عطیہ پانچ قلمی کتب (۱) نکات مرزا بیدل (۲) رسالہ اصلاح مسلمانان (۳) رسالہ شرک بدعت (۴) دیوان بیدل (۵) رسالہ ظہوری اور تین مطبوعہ رسائل زیارت قانع۔ (۲) ام العرفان اور (۳) عیسیٰ مرے اور چند مختلف کاغذات بطور عطیہ وصول ہوئے جس کے لئے ان سب اصحاب کا نواب مرزا سیف علی خاں صاحب ناظم اعزازی کتب خانہ شکریہ ادا کرتے ہیں۔

ادارتِ سب رس

ہمیں افسوس ہے کہ ہمارے پرانے رفیق صاحبزادہ میر محمد علی خاں صاحب میکش گزشتہ ماہ سے مجلس ادارت میں شریک نہیں ہیں۔ یہ ماہ نامہ دراصل انہی کی خواہش، جذبۂ عمل اور ابتدائی اخراجات سے جاری ہوا تھا لیکن چند ماہ بعد جب ان کا سرمایہ ختم ہو گیا اور انہوں نے خواہش کی کہ اس کو بالکلیہ ادارے کی ملک قرار دے دیا جائے تو ادارہ نے از سر نو اس کی بقا کا انتظام کیا۔ بعد کو جب میکش صاحب سرکاری ملازمت کی مصروفیتوں کی وجہ سے اس کام کے لئے زیادہ وقت نہیں دے سکتے تھے تو یہ کام ایک مجلس ادارت کے تفویض کیا گیا جو اب تک یہ کام انجام دے رہی ہے۔ اس اثناء میں میکش صاحب نے مصروفیتوں کی بناء پر بارہا خواہش ظاہر کی کہ ان کا نام مجلس ادارت سے خارج کر دیا جائے اس لئے بادل ناخواستہ گزشتہ مہینے کے پرچے سے ان کا نام شریک رسالہ نہیں کیا جا رہا ہے آئندہ سے سب رس کے بارے میں جملہ مراسلت مہتمم سب رس رفعت منزل خیریت آباد کے پتے سے کی جائے۔

اردو امتحانات کی تقریریں

ادارۂ ادبیات اردو کے امتحانات اردو عالم و اردو فاضل وغیرہ ۱۵ تا ۱۶ [illegible] ۱۹۴۹ء کو منعقد ہوں گے ان کے سلسلے میں ادارے نے حسب ذیل تقریروں کا انتظام

[illegible] امیدواروں کے علاوہ دوسرے اہل ذوق بھی مستفید ہو سکتے ہیں کیونکہ ان سے نصاب کے علاوہ علم وادب سے متعلق عام دلچسپ معلومات کی اشاعت بھی مقصود ہے۔

عنوانات	مقررین	تاریخ
۱۔ اردو ادب کا قدیم دور	ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور	۴ اپریل
۲۔ اردو ادب کا درمیانی دور	مولوی سید محمد صاحب	۷ ر ر
۳۔ جدید اردو ادب	مولوی عبدالقادر سروری صاحب	۱۱ ر ر
۴۔ اردو کے ڈرامے	مولوی سید بادشاہ حسین صاحب	۱۸ ر ر
۵۔ اجتماعی زندگی	مولوی عبدالمجید صدیقی صاحب	۲۲ ر ر
۶۔ اردو کے ناول اور افسانے	مولوی عبدالقادر سروری صاحب	۲۵ اپریل
۷۔ معاشیات کے ابتدائی مسائل	مولوی میرزا ناصر علی صاحب	۲ مئی
۸۔ روزمرہ کی سائنس	مولوی فیض محمد صدیقی صاحب	۹ ر ر
۹۔ جذبات اور احساسات	مولوی صلاح الدین صاحب	۱۶ ر ر
۱۰۔ ادبی تنقید	مولوی عبدالقیوم خاں صاحب باقی	۲۳ ر ر
۱۱۔ اردو کے عناصر اربعہ	مولوی سید محمد صاحب	۳۰ ر ر
۱۲۔ فن شعر	مولوی ابو ظفر عبدالواحد صاحب	۶ جون
۱۳۔ ر	ر ر ر	۱۳ ر ر
۱۴۔ ر	ر ر ر	۲۰ ر ر
۱۵۔ آج کل کے ادبی رجحانات	مولوی میر حسن صاحب یا مولوی مخدوم محی الدین صاحب	۲۷ ر ر

ادارہ کی سرگذشت

ادارۂ ادبیات اردو کی دس سالہ سرگذشت (مرتبہ خواجہ حمید الدین صاحب شاہد)

کے سب چند ہی نسخے دفتر میں رہ گئے ہیں۔ اس کتاب نے اردو دنیا میں کافی شہرت حاصل کی اور ادارہ کی ناموش مصروفیتوں سے متعلق واقفیت پیدا کرنے کے علاوہ اردو زبان اور ادب کی ٹھوس خدمت کرنے کے انھیں طریقوں سے بھی اہل اردو کو واقف کیا۔ جن اصحاب کو اردو کی تاریخ سے دلچسپی ہے وہ اس کتاب کا ضرور مطالعہ کریں۔ اسی لئے تین سو سے زیادہ صفحات کی کتاب کی قیمت صرف ۱۲ر رکھی گئی ہے۔

اس کتاب کے متعلق اور ادارے کی مصروفیتوں کے نسبت ہمارے معاصرین نے جو رائیں ظاہر کیں ان کے چند اقتباس یہاں درج کئے جاتے ہیں:-

"حیدرآباد میں ادبیات اردو کے نام سے ایک مجلس چند سالوں سے قائم ہے جس نے نہایت قلیل عرصے میں نہایت اہتمام کام کیا ہے اس مجلس کی زیر نگرانی ایک ماہنامہ "سب رس" بھی جاری ہے متعدد کتابیں انجمن شائع کر چکی ہے۔ اور یہ سرگذشت درحقیقت اس ادارے کے کارناموں کی تفصیل ہے۔ ہندوستان بھر میں جہاں کہیں بھی چھوٹی بڑی علمی انجمنیں قائم ہوں یا جو لوگ اس سلسلے میں کام کرنا چاہیں انھیں یہ کتاب منگوا کر ضرور مطالعہ کرنا چاہیے۔ تاکہ ان میں بھی کام کرنے کا جوش اور ہمت پیدا ہو۔ ہمیں افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ پنجاب میں اس قسم کی ایک بھی انجمن قائم نہیں۔ اس سے قبل میاں بشیر الدین صاحب (مالک و مدیر "ہمایوں") نے انجمن ترقی اردو کی شاخ لاہور میں قائم کی تھی تو خیال تھا کہ اس سلسلے میں کچھ عملی کام بھی ہوگا۔ لیکن اب تک کوئی قابل ذکر نتیجہ نہیں نکلا اور انجمن ترقی اردو پنجاب ایک قرار دادیں منظور کرنے والی انجمن ہو کر رہ گئی ہے جس کا سال بھر میں ایک آدھ پرائیویٹ جلسہ ہو جائے یا سال بھر میں ایک دو آرٹیکل محترم میاں صاحب تحریر فرما دیا کریں۔ ضرورت ہے کہ انجمن ترقی اردو سرگذشت ادارۂ ادبیات اردو کا مطالعہ کر کے اس سے بھی بڑے پیمانے پر کام کی ابتدا کرے [illegible]

نیرنگ خیال [illegible]

... ادبیات اردو ... زبان اردو
ادب کی توسیع و حفاظت کے پیش نظر قایم کیا گیا تھا۔ ادارہ ان
دس سال کے عرصہ میں ادارۂ مذکور نے نہایت ہی قابل رشک
کام کیا ہے۔ سرگذشت اسی ادارہ کے گذشتہ دس سال کے کام
کی تفصیل ہے۔

اس وقت اردو کی توسیع و حفاظت کے مرکز دو ہیں۔
پنجاب اور حیدرآباد دکن۔ ادارہ ادبیات اردو کی گذشتہ دس
سالہ کارروائی سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر خاموشی اور استقلال سے
کام کرنے والے ایسے ہی چند ادارے اور ہوں تو اردو نہ صرف
ہندوستان کی قومی زبان بن سکتی ہے بلکہ دنیا کی بڑی بڑی زبانوں
میں شامل ہونے کا دعویٰ کر سکتی ہے۔ دس سال کی قلیل مدت میں
ادارے نے مختلف موضوعوں پر (۶۹) کتابیں شائع کی ہیں۔
یہ سرگذشت سلسلہ ادارہ ستروین کتاب ہے۔ ان اہم مطبوعات
میں تاریخ، تاریخ ادب، تذکرہ، تنقید، نظم و نثر، افسانے
ناول اور ڈرامے غرض کہ ہر شعبۂ فن کی کتابیں شامل ہیں۔
اور اکثر کتابیں قابل قدر اور اردو ادب میں ایک مفید اضافہ ہیں۔

سرگذشت ادارۂ ادبیات اردو اس لحاظ سے بے حد
قابل قدر چیز ہے کہ اس میں ایک ایسے ادارے کی دس سالہ
زندگی کی مکمل تفصیل موجود ہے جس نے قابل رشک کام کیا ہے
جو لوگ اردو زبان و ادب کی خدمت کرنا چاہتے ہیں ان کے
لئے یہ کتاب ایک رہنما کا کام دے گی جس کے مطالعہ سے ادارۂ ادبیات اردو کی
طرز پر زبان و ادب کی خدمت خوش اسلوبی سے کر سکیں گے۔"

مشیر [illegible] لاہور۔ ۱۲ مارچ ۳۸ء

"تقریباً دس سال تک خاموشی کے ساتھ کام کرنے کے بعد
اب ادارہ کی خدمات کا دلچسپ خاکہ ان اوراق میں پیش کیا گیا ہے
[illegible] کے لئے ادارۂ ادبیات

جو کچھ کام کیا ہے اس سے اب ملک کافی واقف ہو چکا ہے
ادارہ کی یہ سوانح عمری جو سرگذشت کے نام سے شائع کی گئی ہے
اس کی مصروفیات کے ہر شعبہ پر حاوی ہے اور اس کے مطالعہ
سے معلوم ہوتا ہے کہ گذشتہ نو سال کی پر سعی جد و جہد اور مصروفیت
کے بعد ادارے نے اتنے شاندار نتائج حاصل کر لئے ہیں کہ اب حیدرآباد
میں اس کی مرکزی حیثیت مسلم ہو گئی ہے۔ ان اوراق میں
ادارے کے ہر شعبے کی خدمات کے نتائج کو پیش کیا گیا ہے اور
ہمیں امید ہے کہ ملک کے بہت سے "انجمن باز" ان اوراق کا
مطالعہ کر کے اس ... حقیقت سے روشناس ہو سکتے ہیں کہ
محض اخباری پروپگنڈے سے زیادہ موثر اداروں کا ٹھوس
کام ہوتا ہے جو بجائے خود سب سے زیادہ موثر اور [illegible]
پروپگنڈا ہے۔ ادارۂ ادبیات اردو نے ملک میں جو حیثیت
حاصل کر لی ہے۔ اس کی بنیادیں اس لئے مضبوط ہیں کہ ایک
مرکز پر ٹھوس کام کیا جا رہا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ ادارۂ
ادبیات کو ملک کے تعلیم یافتہ نوجوانوں کی زیادہ تائید حاصل ہے
اور اسی لئے اس کا دائرہ عمل زیادہ وسیع ہوتا جاتا ہے۔
سرگذشت کے صفحات اس امر کی تصدیق کرتے ہیں کہ اس میں
کوئی شبہ نہیں کہ ادارے نے نہ صرف بہت سی اچھی کتابیں شائع
کی ہیں بلکہ حیدرآبادی ارباب قلم کی پر جوش ادبی [illegible] کو
صحیح سمت میں بہت آگے بڑھا دیا ہے۔ نو سال کی مختصر مدت
میں تقریباً ۷۲ کتابوں کی اشاعت کے یہ معنی ہیں کہ ادارہ
تقریباً ۸ کتابیں ہر سال شائع کرتا رہا ہے۔ تاریخی شعبہ میں
ادارے نے ملک کو اس کی قدیم تاریخ سے روشناس کرانے کی
بہت قابل تحسین کوشش کی ہے اور ہم امید کرتے ہیں کہ یہ سلسلہ
[illegible] میں دکن کی تاریخ کا بہترین مواد جمع کر دے گا۔"
ہم ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور اور آپ کے مخلص

[illegible] ہیں کہ انھوں نے اس ادارے کو [illegible] کا ایک مضبوط مرکز بنا دیا ہے اور ہم امید کرتے ہیں کہ [illegible] کی عام رائے ادارے کی جد و جہد میں اس کی پہلے سے زیادہ تائید کرے گی۔

[illegible] اردو کے امتحانات کا جو نیا سلسلہ ادارے نے شروع کیا ہے وہ ہم امید کرتے ہیں کہ اس کو عام رائے سے اور بھی زیادہ قریب کر دے گا اور اس طرح اس کی تحریکات کو عوام تک پہنچانے کے نئے راستے پیدا ہو جائیں گے۔ **پیام** حیدرآباد۔ ۲ر فروری [illegible]

تین سو صفحات سے زاید کی یہ نفیس چھپی ہوئی مجلد و مصور کتاب ادارۂ ادبیات اردو کی سرگرمیوں کا نہایت روشن مرقع ہے۔ اس کتاب میں ادارۂ ادبیات کے مختلف شعبوں اور مختلف کارکنوں کے متعلق دلچسپ معلومات ملتی ہیں اس کے علاوہ اندازہ ہوتا ہے کہ نوجوانان دکن کا یہ ادارہ کتنا منظم اور بلند پایہ ہے۔

ادارۂ ادبیات اردو کی سرگذشت پڑھنے کے قابل ہے اور حوصلہ افزائی اور تقلید کے بھی۔ اہل اردو کو ایسے ادارے کی دل کھول کر سرپرستی کرنی چاہیے **ہمایوں** لاہور۔ مارچ [illegible]

ادارہ کی مطبوعات

اس مہینے ادارے کی طرف سے دو کتابیں رسائل طیبہ اور انوار شایع ہوئی ہیں۔ یہ کتابیں ایک عرصے سے زیر طبع تھیں۔ اور کوئی نہ کوئی بات ایسی پیدا ہو گئی کہ یہ اس سے قبل شایع نہ ہو سکیں۔

رسائل طیبہ

یہ کتاب (۳۱۲) صفحات پر مشتمل ہے۔ اور محترمہ طیبہ بیگم صاحبہ مرحومہ کے مضمونوں، تقریروں اور خطوں کا مجموعہ ہے مرحومہ طیبہ بیگم جس پایہ کی ادیبہ اور اہل ذوق تھیں اس کا اندازہ محض اس واقعہ سے ہو سکتا ہے کہ ان کا ایک [illegible] "حقوق النساء" علامہ عبد اللہ یوسف علی کے مقدمہ اور دوسرا [illegible] مولوی [illegible] ترقی اردو کے مقدمہ کے ساتھ شایع ہوا۔

مرحومہ نے حیدرآباد میں علم و ادب اور تہذیب و معاشرت کی ترقی و اصلاح میں بڑے بڑے مفید کام کئے ہیں۔ ان کی زندگی کیسی سرگرمیوں اور خلق خدا کے فلاح و بہبود میں گزری اس کا اندازہ ان مفید اور اخلاقی و اصلاحی مضامین اور تحریروں کے مطالعہ سے ہو سکے گا جو اس مجموعہ "رسائل طیبہ" میں شامل ہیں۔ کتاب میں

. . . .

ان کی تحریروں کے عکس بھی شامل ہیں۔ اس کتاب کا مطالعہ خواتین کی علمی، سماجی اور مذہبی اصلاح و بہبودی کا ضامن ہوگا۔

انوار

حضرت علی اختر . . . کی غزلوں اور نظموں کا پہلا مجموعہ ہے جو نہایت ہی آب و تاب کے ساتھ شایع کیا گیا ہے۔ علی اختر صاحب ہندستان کے چوٹی کے شاعروں میں اپنا بلند مقام رکھتے ہیں۔ ان کا کلام ان کے دل کی آواز اور تجربات زندگی کی سچی تصویر ہے۔ وہ نہ صرف ایک کہنہ مشق اور پرگو شاعر ہیں بلکہ حیات اور شباب پر ان کی نظر بہت وسیع ہے۔ ان کے کلام کے مطالعہ سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ہر شعر ان کے دھڑکتے ہوئے دل کی آواز ہے۔ موجودہ زمانے میں سوائے جوش کے کوئی شاعر ان کی ٹکر کا نہیں۔

۱۲۸ صفحات قیمت [illegible]

عظیم اسٹیم پریس میں چھپ کر شایع [illegible]

[illegible]	[illegible]	احمد ندیم قاسمی بی اے	۳۸
[illegible]	[illegible]	سید علی شاکر ایم اے	۳۹
[illegible]	[illegible] (افسانہ)	صابر کوسنگوی	۴۳
۲۰	چھاپہ خانہ	مرزا عصمت اللہ بیگ	۴۹
۲۱	گل بوٹے	باغبان	۵۴
۲۲	نئی کتابیں	نواب مرزا سیف علیخاں	۵۶
۲۳	ادارہ کی خبریں	ادارہ	۵۷
۲۴	شعبۂ طلبہ	"	۵۷
۲۵	شعبۂ شعراء و مصنفین دکن	"	۵۷
۲۶	شعبۂ نسواں	"	۵۸
۲۷	شاخ گلبرگہ	"	۵۹
۲۸	شاخ پربھنی	"	۶۱
۲۹	شاخ کشلگی	"	۶۲
۳۰	اردو انسائیکلوپیڈیا	"	۶۳

قطعۂ تاریخ وفات حسرت آیات علیا حضرت مادرِ دکن نوراللہ مرقدہا

تو اے ذاتِ علیا کہ در تربتی | بہ عالم ہمان سایۂ رحمتی
کند عرض تاریخ رحلت جلیل | دعا الحق الا وادخلی جنتی

سنہ ۱۳۶۰ھ

(دیگر)

طالبِ مولا کہ بودہ بر درِ مولا رسید | طائر روحش بہ اوجِ عالم بالا رسید
رفت آن قدسی شمائل گفت تاریخش جلیل | مادرِ ظلِ خدا در سایۂ زہرا رسید

سنہ ۱۹۴۱ع

فصاحت جنگ جلیل

تعزیتی قرار دادیں
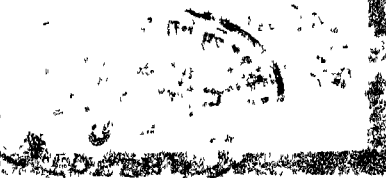
ادارۂ ادبیات اردو کے شعبہ طلبہ کا ایک تعزیتی جلسہ بتاریخ ۱۶ر خورداد ۱۳۵۱ف شام میں پانچ بجے ڈاکٹر زور صاحب معتمد اعزازی ادارہ و صدر شعبہ کی صدارت میں منعقد ہوا جس میں اراکین شعبہ طلبہ اور کارکنان ادارہ نے بھی شرکت کی حسب ذیل قرار داد تعزیت منظور کی گئی۔

"شعبہ طلبہ ادارۂ ادبیات اردو کا یہ جلسہ اعلیٰ حضرت جلالۃ الملک سلطان العلوم نواب میر عثمان علیخاں بہادر خلد اللہ ملکہ وسلطنتہ کی والدۂ ماجدہ حضرت بڑی بیگم صاحبہ مرحومہ ومغفورہ کے انتقال پر ملال پر اپنے انتہائی رنج والم کا اظہار کرتا ہے۔ اور دست بدعا ہے کہ مرحومہ ومغفورہ کو خداوند تعالیٰ اپنے جوار رحمت میں جگہ دے۔ اور اعلیحضرت شاہ ذیجاہ اور خانوادۂ آصفی کو صبر جمیل عطا ہو۔ آمین

معین الدین احمد انصاری

(معتمد شعبہ)

ادارہ کے شعبۂ نسوان کا جلسہ جو ۲۰ر اپریل ۱۹۴۲ء کو محترمہ رابعہ بیگم صاحبہ کی صدارت میں منعقد ہوا اُس میں حسب ذیل قرار داد تعزیت منظور کی گئی۔

"ادارۂ ادبیات اردو کے شعبہ نسوان کی اراکین نسوانی دنیا کی ایک عظیم الشان اور بے نظیر ہستی یعنی حضرت بڑی بیگم صاحبہ قبلہ مرحومہ ومغفورہ کے سانحہ ارتحال پر اپنے دلی رنج و ملال کا اظہار کرتی ہیں۔ اور دست بدعا ہیں کہ خدا مرحومہ کو اعلیٰ علیئین میں مقام ارفع اور شاہ ذیجاہ کو صبر جمیل اور ہم سب کو ان کی تقلید کی توفیق عطا فرمائے۔" آمین

سکینہ بیگم

معتمد شعبہ

سانحۂ عظیم

یہ نظم بتاریخ ۲۴ اپریل ۱۹۴۱ء انجمن خواتین اسلام کے جلسۂ تعزیت کے موقع پر سنائی گئی تھی۔

(سکینہ بیگم)

ملکِ دکن پہ چھائیں گھٹا ٹوپ بدلیاں ۔۔۔ رنج و الم اُداس فضاؤں سے ہے عیاں

چہرے اُداس، خاک بسر اور چشم تر ۔۔۔ اہلِ دکن ملول و پریشاں ہیں سر بسر

دفتر، دکانیں، مدرسے، بازار بند ہیں ۔۔۔ مندا ہے کاروبار، سبھی فکرمند ہیں

اس سرزمیں پہ صبح سے جھاڑو نہیں ہوئی ۔۔۔ کنگھی کو فکرِ زینتِ گیسو نہیں ہوئی

ماتم کدہ پرانی حویلی ہے رات سے
محشر بپا ہے "امِ دکن" کی وفات سے

بے چین و بے قرار و پریشاں ہیں حضور! ۔۔۔ فرطِ الم سے جسمِ معلّیٰ ہے چور چور

دل ہل گئے، پرانی حویلی کا در کھلا ۔۔۔ وابستگانِ ملک کا سیلاب امنڈ پڑا

کہرام مچ گیا کہ چلیں مادرِ دکن! ۔۔۔ چلنے نصیب قبر کے، سوتی ہے انجمن

ہمراہی جلوس ہیں گو فاصلہ ہے دور ۔۔۔ اللہ رے احترام! کہ پیدل چلے حضور

ہر سمت تذکرے تھے یہی خاص و عام میں ۔۔۔ کتنا وقار "ماں" کا ہے قلبِ نظام میں

منظر وہ ہائے "مسجدِ جودی" کے سامنے ۔۔۔ سرکار آگے آئے سواری کو تھامنے

مقبول بارگاہ میں ماں کی دعا ہوئی!
فرزند ہی سے آخری خدمت ادا ہوئی!

اس دور میں کہ حفظِ مراتب کا کال ہے ۔۔۔ ماں باپ کے حقوق کا کس کو خیال ہے

لیکن حضورِ والا نے جو حق ادا کیا — دنیا کو درس خدمتِ مادر سکھا دیا

فرزند! اور وہ بھی ریاست کے حکمراں — قلب و دماغ امورِ ریاست سے سرگراں

پھر بھی یہ ذوق و شوقِ اطاعت کمال تھا — بیمار ماں کا ہر گھڑی، ہر دم خیال تھا

جس وقت سے کہ ماں کی طبیعت خراب تھی — کیا بے قرار، ذاتِ جلالت مآب تھی

آرام تھا نہ نیند۔ نہ کچھ بھوک پیاس تھی — رہتے اُداس اُداس، یہ صحت کی آس تھی

تبدیلیٔ مزاج پہ ہر لحظہ تھی نظر — تیمار داریوں میں رہے رات رات بھر

موجود جاں نثار اگرچہ ہزار تھے — لیکن دوا پلاتے تھے خود اپنے ہاتھ سے

رحمت خدا کی اُس شہ عالی مقام پر!
ماں نے دعائیں جس کے لئے کی ہوں عمر بھر!

اے خوش نصیب مادرِ شہ، مادرِ دکن! — کس کو نصیب ہے ترے مرنے کا بانکپن!

اے مہرباں ماں! تری شفقت کی یاد میں — غمگین اور اُداس عروس البلاد ہے

چاروں طرف سے تعزیتی تار آئے ہیں — دلداریٔ حضور کا پیغام لائے ہیں

ماتم کی مجلسیں ہیں کہیں بزمِ تعزیت — سلطاں کے ساتھ سوگ میں ہے ساری سلطنت

یہ موت وہ ہے جس پہ کہ ہے زندگی نثار — ہے کارنامہ تیرا سیاست کا شاہکار

دم سے ترے وقارِ دکن کو ثبات ہے — بیٹے کے کارناموں میں ماں کی حیات ہے

دنیا کبھی نہ بھولے گی اُس نیک نام کو
ترکے میں جس نے چھوڑا ہے سابع نظام کو

بشیر النساء بیگم بشیر

مہاراجہ بہادر اور سر محمد اقبال کے غیر مطبوعہ خط

واٹرلون ویسٹفیلڈ روڈ بمبئی۔

مائی ڈیر اقبال! شاد باش و شاد زی از فضل رب۔

ای وقت تو خوش کہ وقت ما خوش کردی۔ اس یاد فرمائی کا تہ دل سے ممنون ہوں۔ مجھ جیسے ناچیز و حقیر کو جس طرح آپ دل سے چاہتے ہیں، خدا کی مہربانی بھی آپ پر دونی رہے۔ بھئی اقبال۔ سچے دوست کی یہی تعریف ہے کہ ایک ناچیز اور ہیچ میرز دوست کے ساتھ دوستی نباہ دے۔ مجھے اب تک اس کا عقدہ نہ کھلا کہ آپ سے مجھے کیوں دلی خلوص ہے بجز اس کے کہ آپ ہی کا خلوص اس کا باعث یا عقدہ سمجھوں۔ مگر افسوس ہے کہ میں اپنے ایسے دوست کی کوئی خدمت نہ کر سکا، نہ اس قابل ہوں۔ اس سفر میں زیر باری بہت ہوئی امید ایک حبہ کی نہیں۔ زر می طلبی سخن درین است۔ نہ اجمیر کے دربار میں حاضر ہو سکا نہ اپنے، نہ امرتسر میں اپنے احباب سے ملا، نہ ہردوار کے منظر کے درشن ہوئے۔ ہائے۔ اس قید بے زنجیر کا ستیاناس ہو انسان دنیوی اغراض کے لئے کس قدر مجبور ہو جاتا ہے۔ اور آزاد ہو کر غلامی قبول کرتا ہے۔ یا اللہ جس قدر عمر باقی ہے اس کو تو ہی آزادی میں بسر کرا دے۔ اب میں باز آیا۔ ایسی امارت سے توبہ توبہ۔ بجز اس کے کہ ملک کی حلالی میں رو سیاہی کی یہی طرح ہر طرح ہو سکتی ہے۔ سرخروئی محال ہے۔ الامان! پیشاہ شاد میں اگر جاذبہ کی قوت ہوتی تو پھر کیا پوچھتے۔ مگر شاد تو ہر طرح ناکارہ ہے۔ کوئی بات بھی حاصل نہ کی۔ صرف فضل کا امیدوار ہے۔ اگر خلوص ہے تو خدا کی ذات سے امید ہے کہ اقبال سے حیدرآباد کا اقبال چمک جائے گا۔ ہوائی جہاز کا نظر بے شک اچھا ہوا ہوگا۔ مگر یہ تو کہئے کہ سب کے حواس قایم تھے یا ہوائیوں کے ساتھ ہوا ہو گئے۔ بہرحال آپ ہر طرح کے تماشے دیکھئے اور ہمیں ترسائیے۔ ایک غزل تازہ مرسل خدمت ہے۔ مالک یوم الدین کہاں ہیں ان کی خدمت میں کہہ دیجئے ایاک نعبد و ایاک نستعین۔

بڑے ہوشیار نعبد کے مطلب کو تو قبول کر لیتے ہیں مگر نستعین پر انجان ہوتے ہیں۔ اللہ ان کو شاد و آباد رکھے۔

مہرماہ کو انشاء اللہ تعالیٰ بندہ یہاں سے راہی حیدرآباد ہوگا۔ مہربانی آپ کے بچوں کی تصویریں اور اپنی ایک تصویر ضرور بھیجئے۔ یوں تو میرے دل میں آپ کی تصویر ہے مگر اپنے احباب کو اگر دکھانا منظور ہو تو کس طرح دکھاؤں کیسے اقبال شاہانہ ہے۔ خدا حافظ

۸

جوابِ علامہ سر اقبال

(لاہور، مارچ ۱۹۱۶ء)

سرکارِ والا تبار تسلیم مع التعظیم!

والا نامہ پرسوں مل گیا تھا جس میں سرکار دولت مدار کے حیدر آباد واپس جانے کی خبر تھی لہٰذا یہ عریضہ حیدر آباد ہی کے پتہ پر لکھتا ہوں کہ سرکار دہلی سے رخصت ہو جائیں گے۔

فارسی غزلوں کے لیے سراپا سپاس ہوں۔ آپ کا والا نامہ بار دوم میں ملا تھا۔ یہاں کے وکالت پیشہ احباب میں بعض ذوقِ سخن رکھتے ہیں۔ اہلِ پنجاب کے دلوں پر آپ کا نقش تو پہلے سے ہے۔ فارسی غزل "کیستم من" جب پڑھی گئی تو ارباب ذوق سرمست ہو گئے۔ واقعی لاجواب غزل ہے۔ انہیں باتوں سے اقبال آپ کا گرویدہ ہے۔ امارت، عزت و آبرو، جاہ و حشم عام ہے مگر دل ایک ایسی چیز ہے کہ ہر امیر کے پہلو میں نہیں ہوتا۔ کیا خوب ہو اگر سرکار عالی کا فارسی دیوان مرتب ہو کر دیدہ افروزِ اہلِ بصیرت ہو۔

مجھے جو خلوص سرکار سے ہے اس کا راز معلوم کرنا کچھ مشکل نہیں یہ راز مضمر ہے اس دل میں جو اللہ تعالیٰ نے آپ کو بخشا ہے۔ سرکار کی قبائے امارت سے میرے دل کو مسرت ہے مگر میری نگاہ اس سے پرے جاتی ہے اور اس چیز پر جا ٹھہرتی ہے جو اس قبا میں پوشیدہ ہے۔ الحمد للہ کہ یہ خلوص کسی غرض کا پردہ دار نہیں اور نہ ان شاء اللہ ہوگا۔ انسانی قلب کے لیے اس سے بڑھ کر زبوں بختی اور کیا ہو سکتی ہے کہ اس کا خلوص پرور دہ اغراض و مقاصد ہو جائے۔ ان شاء اللہ العزیز اقبال کو آپ حاضر و غائب اپنا مخلص پائیں گے۔ اللہ نے اس کو نگاہ بلند اور دل غیور عطا کیا ہے جو خدمت کا طالب نہیں اور احباب کی خدمت کو ہمیشہ حاضر ہے۔ اللہ اکبر سے دو چار روز ہوئے ملاقات ہوئی تھی آپ کا تذکرہ بھی ہوا تھا۔ ایاک نستعین کا دور دورہ پھر ہو جائے گا مطمئن رہیے۔ آج کل لاہور میں سلطان کے سرائے میں ایک مجذوبہ نے بہت لوگوں کو اپنی طرف کھینچا ہے۔ کسی روز ان کی خدمت میں بھی جانے کا قصد ہے۔ شاد کا پیغام بھی پہنچا دوں گا۔

تپ سے گھبرانا کیا! اس کی شدت ان شاء اللہ لطفِ آزادی کو دوبالا کر دے گی۔ عرصہ ہوا میں نے پھول سے خطاب کیا تھا۔

"اگر منظور ہے تجھ کو خزاں نا آشنا رہنا ۔۔۔ تو کانٹوں میں الجھ کر زندگی کرنے کی خو کر لے
صنوبر باغ میں آزاد بھی ہے پا بگل بھی ہے ۔۔۔ انہیں پابندیوں میں حاصل آزادی کو تو کر لے"

تصویر ابھی کوئی پاس نہیں، نئی بنوا کر سرکار کی خدمت میں حاضر کروں گا۔ لڑکا دہلی کالج میں پڑھتا ہے۔ ذہین و طباع ہے مگر کھیل کود کی طرف زیادہ راغب ہے۔ آج کل اس فکر میں ہوں کہ اس کو کہیں مرید کرا دوں یا اس کی شادی کر دوں کہ اس کے ناز میں نیاز پیدا ہو جائے۔

ناز تا ناز است کم خیزد نیاز ۔۔۔ ناز ہا سازد بہم خیزد نیاز

اس کی تصویر بھی ان شاء اللہ حاضر ہو گی۔ والسلام مخلص قدیم

محمد اقبال

مزدور

وہ جو پسینے میں شرابور دن رات محنت میں مصروف ہے،
مزدور کہلاتا ہے۔
اس کا نغمہ اس کا رونا۔ اس کی روزی ہے۔
وہ بادشاہت کا دشمن ہے۔
شہنشاہ کے خلاف آواز بلند کرنا اس کا کام ہے۔
پر وہ سکّہ جس پر بادشاہ کی تصویر کندہ ہے،
اسے حاصل کرنا اس کا مقصد ہے۔

چغتائی

ٹوٹا ہوا ریکٹ

پانی کا اک بُلبلا جیسے
حد سے زیادہ پھول گیا ہو!
میلا سا اک قمقمہ جیسے
کوئی فضا میں بھول گیا ہو!
جیسے اک ننھا غبارہ اُڑ اُڑ کر نغمے گاتا ہے!
دل میں ایک بڑا نیارہ دو جانب آتا جاتا ہے!
صاف زمیں پر جال ہے اس پر دل کی اک دنیا اڑتی ہے
یہ "تارا" کی "گیند" نہیں ہے، یہ میری آشا اڑتی ہے!
حسرت رکھنے والی ناگن
جالی اور گل کاری کا بن
حرکت کی آتی ہے آہٹ
وہ اٹھا اک "نازک ریکٹ"!!
گاہے اچھا ہاتھ لگا کر اپنے اوپر اِتراتی ہیں
گاہے ضربیں "خالی" پا کر غصے میں شرما جاتی ہیں!
دوسری جانب کھیلنے والے پہلے خود موقع دیتے ہیں
کچھ لمحے کے بعد ہرا کر غصے کی لذت لیتے ہیں!
کالج کے رومانی لڑکے پاس ہی سے آتے جاتے ہیں
دیکھ کے "ٹینس لان" کی جانب سیگل کے گانے گاتے ہیں!
پوچھ رہی ہیں ساتھی سے وہ، بولو کیسا کھیل رہی ہوں؟
سوچ رہی ہیں اپنے جی میں سب سے اچھا کھیل رہی ہوں!
ہاں، یہ کیسی گیند کی تیزی
کیا اب کھیل ترقی پر ہے؟

یہ متواتر ضربیں کیسی
کیا مقصود اپنا جو ہر ہے!
لیکن یہ کیا کھیلنے والے کیسے اچانک رک سے گئے ہیں!
کچھ ہنس کر کچھ پوچھ رہے ہیں، کچھ تارا کو دیکھ رہے ہیں!
چپ ہیں وہ ماتھے پہ پسینہ ان کے جیسے چھوٹ گیا ہے
کھیلتے کھیلتے جانے کیسے ان کا ریکٹ ٹوٹ گیا ہے!
"ٹینس لان" کو جاؤں کیسے، میں کب اس سوسائٹی کا ہوں
بس ان کا "ٹوٹا ہوا ریکٹ" دور، یہاں سے دیکھ رہا ہوں!

سلام (مچھلی شہری)

غزل

حسن بھی چارہ ساز ہو نہ سکا — غم سے دل بے نیاز ہو نہ سکا
حسن سے ترکِ ناز ہو نہ سکا — اہتمامِ نیاز ہو نہ سکا
حسن ہو کر عیاں، عیاں نہ ہوا — عشق کا راز، راز ہو نہ سکا
فطرتِ عشق بندگی ہی تو ہے — حسن بندہ نواز ہو نہ سکا
کیا قیامت ہے ان جفاؤں پر — تجھ سے میں بے نیاز ہو نہ سکا
دہر ہے ناشناسِ لذتِ درد — غم ترا جاں نواز ہو نہ سکا

اک حقیقت ہے زندگی، یعنی!
میں رہینِ مجاز ہو نہ سکا

سلیمان اریب

ایک خط

جسے منزل سمجھ کر چل پڑے تھے وہ نہیں ملتی
اگر جائیں تو ہم اب کس طرف اے ہم سفر جائیں

روحنا ـــــ نمستے!

مگر تم کہو گی ہم نہیں سمجھتے۔ اور حقیقت میں کوئی کیونکر سمجھے۔ "ن" خود اپنے اندر انکاری خصوصیت رکھتا ہے۔ خیر چھوڑو اس ہندی اردو کے قضیے کو ع

وہ اپنی خو نہ چھوڑیں گے ہم اپنی وضع کیوں بدلیں

تو تم کو انسان انسان میں تمیز کرنی آگئی ہے۔ اچھا یک ہے! مگر انسان کا پہچاننا اتنا ہی مشکل ہے جتنا اپنے نفس پر قابو پانا۔ تم نے بھی کھیل سمجھا ہے شاید اس کو۔ بعض لوگوں کو کبھی تم نے کسی کا مذاق اڑاتے نہیں دیکھا؟ یعنی بہ الفاظ دیگر محفل میں چار لوگوں کو دیکھ کر کسی "ایک" کو بنانے کی کوشش کرنا۔ کسی کی بیماری کا ٹٹول کرنا۔ کسی کے درد و کرب کو سن کر اپنی تنگ نظری و بے حسی کا ثبوت دینا۔ اس طرح کہ سننے والے کے دل کو ٹھیس لگے۔ مگر روحنا۔ ایسے لوگ آنکھوں میں سے گر جاتے ہیں۔ ان کی سوسائٹی میں کوئی قدر و قیمت باقی نہیں رہتی۔ سماج ایسی ذہنیت والوں کو حقارت سے دیکھتی ہے۔ انسان کو انسان سے ہمدردی کے صرف دو بول کی امید ہی تو رہتی ہے۔ ایسے لوگ اپنی ہر دلعزیزی کے موقع کو بھی کھو دیتے ہیں، جو سب سے بڑی طاقت ہے۔ دوستوں کے دلوں کا پھٹ جانا معمولی بات نہیں ہے۔ مگر ایسوں کو دوست کون سمجھتا ہے۔ فرض کرو تمہارے سر میں درد ہے اور میں کہوں "اوہو! آپ کے سر میں درد بھی ہوتا ہے۔ یہ تو کوئی ایسی بڑی چیز نہیں۔ ہمیں بخار آتا ہے۔ دنوں رہتا ہے۔ دھیما دھیما ٹمپریچر۔ جو طبی نقطۂ نظر سے ۱۰۴° بخار سے زیادہ خطرناک ہے۔ اور میں تمہاری حرارت کو سن کر تمہارا اس طرح مذاق اڑاؤں "سنا ہے آپ کو بخار ہے اور ٹمپریچر کچھ ایسا زیادہ بھی نہیں۔ ارے ہم تو ۱۰۲° بخار میں سینما دیکھتے ہیں۔ چلتے پھرتے ہیں۔ یہ تو کوئی ایسی بات نہیں"۔ میری ان سفاکانہ سفلی باتوں کو سن کر تم اخلاقاً مسکرا دو گی۔ کیونکہ بعض مواقع زندگی میں ایسے بھی آتے ہیں کہ کوئی چیخ چیخ کر رونا چاہتا ہو اور اس کو مجبوراً مسکرانا پڑتا ہے۔ مگر تمہارے دل سے پوچھو اس وقت کیا کہتا ہے اور اس کے پاس میری کیا عزت یا وقعت باقی رہی ہے۔ دکھ بیماری کوئی اپنے بس کی بات تو ہے نہیں۔ یہ ہمارے اور نیچر کے ساز باز ہیں۔ ہم نیچر کے خلاف چلتے ہیں۔ اس کے اصول کی پابندی نہیں کرتے۔ نیچر ہمارا انتقام لیتی ہے۔ تو اس میں کسی میرے کا بے معنی، بے ہنگام و بے موقع دخل کتنی تضیع اوقات کا باعث ہے۔ اصولاً میری ایسی باتوں سے تمہارا دل ٹوٹ جاتا ہے۔ برسوں کی دوستی پر پانی پھر جاتا ہے۔ ان سب کے ہوتے ہوئے بھی تم مجھے انسان سمجھو تو پھر مجھے تمہیں انسان سمجھنے میں مجبوراً پس و پیش ہوگا۔

بعض وقت کسی "ایک خاص شخص" سے سوسائٹی کے ایک گروہ کو کچھ حسد یا جلاپا سا ہو جاتا ہے۔ بس اس کے پیچھے تو یہ جاہل اور ناسمجھ ٹکڑی ہاتھ دھو کے پڑ جاتی ہے۔ کوئی کچھ کہتا ہے کوئی کچھ۔ جتنی جتنی سمجھ اتنی اتنی ان بچاروں کی باتیں۔ لیکن تم ان پست فطرت ہستیوں کی فطری و جبلی کمزوری کو کیسے بدل سکتی ہو۔ ؎

وحشت نہ یہ جنون نہ یہ اختلاج ہے   یہ ددد وہ ہے درد ہی جس کا علاج ہے

غرض انسان' نام ہی کا بس انسان ہے روحنا۔ وہ اس کے اوصاف و کردار میں تو انسانیت کا کوئی جوہر نہیں۔ منطق کے پرچہ میں ایک سوال آیا تھا "ایک احمق' انسان نہیں ہوسکتا۔ اس لئے کہ انسان ایک ذی عقل ہستی ہے"۔

اسی طرح نفسیات کے اس سوال نے تو واقعی میرے ہوش گم کر دیے تھے "ہم ہر چیز کو دو آنکھوں سے دیکھتے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود وہ چیز ایک ہی دکھائی دیتی ہے"۔ میں نے تو یوں تیوں اس کا جواب دے کر ممتحن کو تشفی دے دی تھی، لیکن تم بتا سکتی ہو کہ یہ کیونکر ہوتا ہے؟

اسی طرح ایک اور سوال تھا "انسانی فرد بجائے خود ایک جماعت ہے۔ تم بہ حیثیت ماہر نفسیات اس معمہ کو کس طرح حل کروگے؟" تم کہو گی اسی چیز کو تو غالب نے بہت دنوں پہلے بتا دیا تھا ؎

ہے آدمی بجائے خود اک محشر خیال
ہم انجمن سمجھتے ہیں خلوت ہی کیوں نہ ہو

خیالات ملتے جلتے ہیں، لیکن ڈگر علیحدہ، ایک کا راستہ شاعری ہے دوسرے کا نفسیات لیکن بات تو پتہ کی ہے اور یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جس پر ماہر نفسیات ہی بن کر غور کرنے کی ضرورت ہے۔ نفسیات ایک ضروری علم ہے خصوصاً ان لوگوں کے لئے جو انسان کو پہچاننا چاہتے ہیں —— اور جب تک تمہارا اپنا ظاہر و باطن یکساں نہ ہوگا تمہیں دوسرے میں نیک و بد کی تمیز مشکل ہو جائے گی۔ ہیرے کو ہیرا کاٹتا ہے۔ ایک ایسے شخص کا دل جو دوسرے کے دل کو دکھاتا ہے، میرے نزدیک ایک پتھر سے بدتر ہے جو تمام دن تمہارے صحن میں پڑا ہوا تمازت آفتاب سے جلتا رہتا ہے، وہ جلتا ہے۔ جلاتا نہیں۔ تم کبھی کبھی بچوں کی سی باتیں مت کرو روحنا۔ حالانکہ جماعت میں جب کبھی معلمہ پوچھتیں کہ "سمجھ لیا نا آپ نے؟" اور تم اپنی سوا گز کی گردن زور زور سے ہلا دیتیں، مطلب یہ کہ ہاں میں سمجھ گئی۔ لیکن مجھے معلوم تھا تمہارے خیالات کہیں دور دور بھٹکتے رہتے اور صرف ان کو خوش کرنے تم سفید جھوٹ کہتیں اور اپنی گردن ہلا دیتیں۔ تم کہتی ہو "ظرافت اور مزاح میں ایسا کیا فرق ہے؟" زمین آسمان کا فرق ہے۔ ظرافت کا سلسلہ خوش خلقی اور تواضع سے ملتا ہے۔ ظریف خوش مزاج ہوتا ہے دل شکن نہیں ہوتا۔ وہ ہنساتا ہے۔ رلاتا نہیں۔ اس کے برعکس مزاح کا تعلق ٹھٹھول، بے جا ہنسی، بھونڈے اور دل گداز مذاق سے ہے۔ جو صرف آزاد منش بے حس لوگ ہی گوارا کر سکتے ہیں۔ جن کے دلوں کی حس قریب قریب مردہ ہے۔ حساس طبیعتوں کے لئے ایسی صحبتیں وبال جان ہو جاتی ہیں۔

ہاں مرجانا مشکل ہے، لیکن زندہ رہنا بھی تو کوئی آسان کام نہیں۔ فرض مجبوری کا دوسرا نام ہے۔ تم اس کو نہیں جانتیں۔

اسی لئے کہتی ہوں کہ تم مجھے خط تو لکھو لیکن اس کے جواب کی توقع مت رکھو۔ میں اظہار بیان میں بہت بھٹک جاتی ہوں۔ دریا کا بند جب ٹوٹ جاتا ہے تو سیلاب مشکل سے رکتا ہے، اور یہ اسی وقت رکتا ہے، جب کہ طوفان تلاطم میں کمی ہو جاتی ہے۔ دکھتی ہوئی رگ کو مت چھیڑو اب ختم کر دوں گی —— فقط

جہاں بانو بیگم

مہذب چور

(ایک مختصر نثری ڈراما)

کردار

(۱) شیردل ۔ ایک سائنس داں مہذب چور۔

(۲) ناصر ۔ شیردل کا ساتھی۔

(۳) ڈاکٹر توفیق مرزا۔ جو جسم انسانی پر ریڈیم کی شعاعوں کے اثر کی تحقیق کرنی چاہتے ہیں۔

(۴) صدر جلسہ اور سامعین۔

مناظر

منظر اول۔ شیردل اور ناصر کی گفتگو۔

منظر دوم۔ ڈاکٹر توفیق مرزا کی تقریر۔

منظر سوم۔ شیردل اور ناصر کی دوبارہ گفتگو۔

منظر چہارم۔ ڈاکٹر کا چور کو پکڑنا۔ دونوں کی بحث۔

منظر پنجم۔ چور پر ڈاکٹر صاحب کا تجربہ ٹیلیفون کے ذریعہ گفتگو۔

منظر ششم۔ ڈاکٹر صاحب خود تجربہ خانے میں۔ ٹیلیفون پر مکالمہ۔

پہلا منظر

ناصر۔ آج کل تو بہت سوکھی گزر رہی ہے۔ بہت دنوں سے کوئی شکار ہاتھ نہیں لگا۔ بھئی شیردل اب تو تمھاری باری ہے۔

شیردل۔ ہاں ٹھیک ہے اب میری ہی باری ہے۔ مجھے خود اس کی فکر ہے۔ ممکن ہے قریب میں ایک صورت نکل آئے۔

ناصر۔ آخر میں بھی تو معلوم کروں تم نے کیا منصوبہ باندھا ہے؟

شیردل۔ تم نے آج کا اخبار تو دیکھا ہی ہوگا۔

ناصر۔ مگر اس میں تو کوئی ایسی بات نہ تھی۔

شیردل۔ کیوں کیا ڈاکٹر توفیق مرزا کے متعلق کوئی خبر نہیں پڑھی۔

ناصر۔ بس یہی کہ آج شام کو ٹاؤن ہال میں ان کی تقریر ہے۔ شاید کچھ ریڈیم منگوایا ہے۔ کچھ تحقیق کرنی چاہتے ہیں۔

شیردل۔ ہاں۔ ریڈیم کوئی بیس ہزار روپیوں کا ہے، اور یہ میرے لئے کافی ہے۔

ناصر۔ مگر وہ تم کو ملے گا کیسے؟ اور پھر ریڈیم جیسی تیز شعاعوں والی چیز کا اٹھالانا بھی تو ممکن نہیں۔

شیردل۔ ان سب باتوں کو تو ہم پر چھوڑ دو۔ ہم نے بھی سائنس پڑھی تھی آخر وہ کس دن کے لئے؟ اچھا اب میں تو ٹاؤن ہال تقریر سننے کے لئے جاتا ہوں۔ تم ذرا ڈاکٹر کے گھر جاؤ۔ مکان کا نقشہ ذرا تفصیل سے دیکھ کر آؤ۔ میں بھی تقریر کے بعد یہیں واپس آتا ہوں۔

ناصر۔ اچھی بات ہے۔ (دونوں جاتے ہیں۔ پردہ گرنے کی آواز)

دوسرا منظر

(ٹاؤن ہال میں جلسہ)

صدر جلسہ :۔ حضرات!

بزم سائنس عظیم آباد کی جانب سے آج کا جلسہ اس غرض سے منعقد کیا گیا ہے کہ ڈاکٹر توفیق مرزا ریڈیم کے متعلق ایک عام فہم تقریر فرمائیں۔ اب میں ممدوح سے

ملتمس ہوں کہ ہم کو اپنے خیالات سے مستفید کریں۔

(تالیاں)

ڈاکٹر: جناب صدر و معزز حاضرین!

میں بزم سائنس کا ممنون ہوں کہ مجھے اپنے خیالات کے اظہار کا اس طرح موقع عطا فرمایا گیا۔ مجھے اس وقت کوئی طویل تقریر کرنی نہیں ہے۔ ریڈیم کے متعلق میں نے جو سرسری معلومات حاصل کی ہیں ان کے بیان پر اکتفا کروں گا۔ میں نے خود کچھ ریڈیم منگوایا ہے اور تحقیقاتی کام کرنا چاہتا ہوں۔ اگر میں اس میں کامیاب رہا تو شاید مزید معلومات پیش کرسکوں گا۔ آج کی تقریر گویا ایک تمہید ہے۔

۱۸۹۶ء میں پیرس کے مشہور سائنس داں پروفیسر بیکوریل نے غیر بصری شعاعوں کا پتہ چلایا۔ ایک مرتبہ رات کو انھوں نے یورینیم کی شیشی اتفاقاً ایک عکسی تختی کے قریب رکھ دی تھی۔ دوسرے دن انھوں نے دیکھا کہ باوجود تاریکی کے تختی پر تصویر کا خاکہ بن گیا۔ پروفیسر صاحب نے خیال کیا کہ شاید اس دھات میں سے کوئی ایسی شعاع نکلتی ہے جو ہمیں نظر نہیں آتی۔ اس تجربے کا حال سن کر پروفیسر کیوری اور ان کی بیوی میری کیوری نے تحقیق شروع کی ان دونوں نے معلوم کیا کہ بعض اور دھاتیں بھی ہیں جن سے ایسی غیر بصری شعاعیں نکلتی ہیں۔ کچھ عرصہ بعد پروفیسر کیوری نے تو انتقال کیا لیکن ۱۹۱۱ء میں ان کی خاتون میری کیوری نے دنیا کی سب سے قیمتی دھات ریڈیم کا انکشاف کیا۔ یہ دھات اس قدر کمیاب ہے کہ آج بھی دنیا میں اس کی مجموعی مقدار ۲۰ تولے سے زیادہ نہیں ہے۔

ریڈیم چاندی کی طرح سفید اور چمکدار دھات ہے۔ اس سے تین قسم کی غیر بصری شعاعیں نکلتی ہیں۔ بعض شعاعیں ایسی تیز ہوتی ہیں کہ لوہے کی ٹھوس تختی بھی ان کو روک نہیں سکتی۔ ریڈیم کی تیز شعاعوں سے سرطان کا علاج کیا جاتا ہے۔ جب شعاعیں قریب سے ڈالی جاتی ہیں تو سرطان میں داخل ہوکر جراثیم اور فاسد مادے کو جلا دیتی ہیں۔

طبی نقطۂ نظر سے اب اس امر کی تحقیق کرنی ہے کہ ایک محفوظ فاصلے سے جسم انسانی پر ریڈیم کی شعاعوں کا کیا اثر ہوتا ہے۔ تجربوں کے ذریعہ جب ہم یہ معلوم کرلیں گے کہ انسان کتنے فاصلے سے اور کتنی دیر تک شعاعیں برداشت کرسکتا ہے تو یقین مانیے کہ ہم تمام امراض پر غلبہ حاصل کرلیں گے۔ مجھے یقین ہے کہ ایسی تحقیق سے ایک نیا طبی دور شروع ہو جائے گا اور دنیا میں کوئی ایسا مرض باقی نہ رہے گا جس کو ہم لاعلاج قرار دیں۔

(تالیاں)

تیسرا منظر

ناصر۔ تقریر تو ۹ بجے ختم ہوچکی ہوگی، مگر شیر دل کا اب تک پتہ نہیں۔

(شیر دل داخل ہوتا ہے)

شیر دل۔ معاف کرنا ناصر تمھیں انتظار کرنا پڑا۔ ایک ضروری کام کی وجہ سے میں وقت پر نہ آسکا۔ کہو تم مکان دیکھ آئے۔

ناصر۔ ہاں، اچھی طرح سے۔ یہ مکان کا نقشہ ہے۔ دیکھو یہ نیا تجربہ خانہ ہے۔ بالکل جدید وضع کا۔ مگر اس میں داخل ہونے کا

صرف ایک دروازہ ہے اور اس پر چور گھنٹی لگی ہے کوئی اس دروازے کے قریب گیا اور گھنٹی خود بخود بجنی شروع ہوئی

شیر دل ۔ اچھا۔ اور یہ کمرہ تجربہ خانے سے کتنی دور ہوگا۔ (نقشے پر انگلی سے بتاتا ہوا)

ناصر ۔ یہی کوئی دو سو قدم پر۔ اچھا کہو تو تقریر میں کوئی کام کی بات بھی سنی۔

شیر دل ۔ ہاں ہاں میرا جو قیاس تھا وہ صحیح نکلا۔

ناصر ۔ پھر ہمیں بھی تو بتاؤ۔

شیر دل ۔ بھئی ناصر اب وقت تنگ ہے۔ مجھے جانے دو۔ میں یہ نقشہ بھی ساتھ لے جاتا ہوں۔ پھر کل ہیں ملیں گے۔

ناصر ۔ اچھی بات ہے، کل ہی سب تفصیل معلوم ہوجائے گی۔

(شیر دل چلا جاتا ہے)

چوتھا منظر

ڈاکٹر ۔ (اپنے کمرے میں بیٹھے ہوئے غور و فکر کرتے ہوئے آہستہ سے کہتا ہے)

میں سمجھتا ہوں کہ انسان ۱۰ فٹ کے فاصلے پر ایک گھنٹے تک زندہ رہ سکتا ہے۔ مشکل یہ ہے کہ تجربہ اندیشناک ہے۔ کوئی کیوں اپنی جان خطرے میں ڈالے گا۔

(کمرے سے کچھ دور کسی کے دبے پاؤں چلنے کی آواز)

ڈاکٹر ۔ (چونک کر) اس وقت تجربے خانے کی طرف یہ پیروں کی آہٹ کیسی!

(چور گھنٹی بجتی ہے ٹرر ۔ ۔ رر ۔ رر ۔ رر ۔ رر ۔ رر ۔ ۔)

ڈاکٹر دوڑتا ہے۔ چور بھی دوڑتا ہے (دونوں کے پیروں کی آواز)

ڈاکٹر ۔ ٹھیر جاؤ ورنہ میں طمنچہ چلا دوں گا۔

(چور رک جاتا ہے)

ڈاکٹر ۔ "تم کون ہو؟" (ذرا غصے سے)

چور ۔ "آپ کی طرح ایک انسان" (اطمینان کے ساتھ)

ڈاکٹر ۔ "اتنی رات گئے تمھارا یہاں کیا کام؟"

چور ۔ "اس خیال سے آیا تھا کہ کچھ ہاتھ لگے تو لیتا جاؤں"

ڈاکٹر ۔ "چہرے اور لباس سے تو تم ایک مہذب آدمی معلوم ہوتے ہو، معمولی حالات میں تو شبہ بھی نہ ہو کہ تم اس قدر ڈھیٹ ڈاکو ہو۔"

چور ۔ "ڈاکٹر صاحب۔ خانگی افکارات اور پریشانیاں ایک مہذب آدمی کو بھی چوری پر مجبور کر دیتی ہیں۔"

ڈاکٹر ۔ "مگر مہذب ہونے کا دعوٰی تم کو پولیس کی گرفت سے نہیں بچا سکتا۔ تم پولیس کے حوالہ کئے جاؤ گے۔"

چور ۔ "ڈاکٹر صاحب میں ایک شریف آدمی ہوں، تباہ حالی، مفلسی اور کثیر العیالی نے مجھے مجبور کر دیا ہے۔ آخر انسان اپنے بچوں کو کب تک بلبلاتا ہوا دیکھ سکتا ہے؟ آپ ایک شریف اور ہمدرد انسان ہیں۔ میری خطا معاف کر دیں۔"

ڈاکٹر ۔ "میں تمھاری باتوں میں نہ آؤں گا۔ چور ایک سماجی مجرم ہوتا ہے۔ سماج کی عافیت کے مدنظر تم کو پولیس کے حوالے کر دینا میرا فرض ہے۔ مجھے معاف کرنے کا کوئی حق نہیں۔"

چور ۔ "ڈاکٹر صاحب اس سے تو بہتر یہ ہے کہ آپ مجھے ختم ہی

کروں۔ باوجود مفلسی کے مجھے اپنی عزت جان سے زیادہ عزیز ہے
خدا کے لئے آپ میری عزت بچا لیجئے۔

ڈاکٹر۔ "نہیں نہیں۔ (پھر ذرا سوچ کر) تمہاری رہائی کی
صرف ایک صورت ہے۔ اگر تم میری شرط منظور کر لو"

چور۔ "ڈاکٹر صاحب آپ جو شرط چاہیں پیش فرمائیں مجھے
ہر طرح منظور ہے"

ڈاکٹر۔ میں ایک طبی تجربہ کرنا چاہتا ہوں۔ (خوش ہو کر)
مگر یہ واضح کر دینا ضروری ہے کہ اس تجربے کے دوران
میں آپ کو جسمانی تکلیف ہو گی۔ اگر آپ اس کو قبول
کر لیں تو مجھے بڑی مدد ملے گی اور میں بہت ممنون ہونگا۔

چور۔ "ڈاکٹر صاحب۔ میں گرفتاری اور بے عزتی کے مقابلہ
میں سخت سے سخت تکلیف برداشت
کرنے کے لئے تیار ہوں۔ (خوش ہو کر)

ڈاکٹر۔ آپ اس تجربہ خانے میں چلے جائیے میں باہر سے
دروازہ بند کر دوں گا پھر تجربہ ختم ہونے تک آپ
باہر نہ آئیں گے۔ میز پر ریڈیم رکھا ہے۔ سامنے
کرسی رکھی ہے۔ قریب میں تھرمامیٹر اور گھڑیال
رکھی ہے۔ ٹیلیفون کے ذریعہ میں کوئی آدھے گھنٹے
کے فاصلے سے کیفیت دریافت کروں گا۔ آپ تفصیل
سے بیان کریں۔

چور۔ بہت خوب۔

پانچواں منظر

ڈاکٹر۔ ہالو!

چور۔ ہالو ڈاکٹر صاحب۔

ڈاکٹر۔ آدھا گھنٹہ گزر چکا۔ بتائیے اب کیا کیفیت ہے۔

چور۔ ڈاکٹر صاحب تپش ۱۰۴° ہو گئی ہے۔ گھبراہٹ
بڑھ رہی ہے۔ اتنے ہوش نہیں کہ نبض شمار کروں۔

ڈاکٹر۔ گھبرائیے نہیں، میں آدھے گھنٹے کے بعد پھر آپ سے
بات کروں گا۔ اب آپ کچھ گانا سنئے۔

(ٹیلیفون رکھ دیتا ہے)

(کوئی دس سکنڈ کا وقفہ)

ڈاکٹر۔ ہالو! اب ایک گھنٹہ ہو چکا، کہئے کیا حال ہے۔

چور۔ مردود، موذی۔ قاتل آخر تیرا ارادہ کیا ہے۔ کیا
مجھے یوں ہی مار ڈالے گا!

ڈاکٹر۔ میں نے آپ سے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ آپ کو تکلیف
ہو گی پھر آپ کا اتنا بگڑنا کس طرح درست ہو سکتا ہے!
آپ ایک اہم تحقیقات میں مدد دے رہے ہیں تھوڑی
سی تکلیف اور سہی۔

چور۔ تیری تحقیق کی ایسی تیسی۔ میں تو مرا جا رہا ہوں اور
تجھ پر تحقیق کا بھوت سوار ہے۔ ارے ظالم اختلاج بہت
بڑھ گیا ہے معلوم ہوتا ہے کہ دل سینے سے باہر نکل
آئے گا۔
بدمعاش۔ خونی جانور کو بھی تو اس بری طرح نہیں
مارتے۔ اُف۔ اُف۔ اوف (دھڑام)

(کرسی پر سے گر جاتا ہے)

ڈاکٹر۔ (ٹیلی فون رکھتے ہوئے) او ہو بے ہوش ہو گیا (گھبرا کر)
کہیں مر نہ جائے۔ مجھے جلد وہاں جانا چاہیے (تیز تیز
قدم اٹھاتا ہوا جاتا ہے)

(تجربہ خانے کا دروازہ کھولتا ہے دیکھو سرسراہٹ ہوتی ہے)

ڈاکٹر۔ یہاں تو سب اندھیرا پڑا ہے۔ (کھٹکا دبا کر روشنی کھولتا ہے)
ہائیں یہاں نہ تو وہ چور ہے اور نہ ریڈیم۔

(باہر سے کوئی دروازہ بند کر لیتا ہے)

ڈاکٹر۔ (گھبرا کر) ہائیں یہ باہر سے دروازہ کس نے بند کیا۔
(دوڑ کر کھولنے کی کوشش کرتا ہے)

چھٹا منظر

ٹیلیفون کی گھنٹی بجتی ہے۔

ڈاکٹر۔ ہلو۔ کہاں سے۔

شیر دل۔ "کہیے جناب ڈاکٹر صاحب آپ کی تپش اور نبض کی رفتار کیا ہے؟" (الفاظ پر زور دیتے ہوئے طنزاً)

ڈاکٹر۔ "تم بڑے موذی اور نالائق ہو" (نہایت گرم ہو کر)

شیر دل۔ "دیکھیے ڈاکٹر صاحب آپ کو ایسے الفاظ زیب نہیں دیتے۔ میز کے خانے میں تپش پیما رکھا ہے۔ براہ کرم اپنی تپش سے مطلع کیجیے۔ آپ ایک ایسی تحقیق میں مدد دے رہے ہیں جو بنی نوع انسان کے لئے بے حد مفید ثابت ہوگی اور آپ کا نام تاریخ تحقیقات میں سنہری حرفوں سے لکھا جائے گا" (طنزاً)

ڈاکٹر۔ "میں تجھے ابھی پولیس کے حوالے کرتا ہوں" (برہم ہو کر)

شیر دل۔ ہا ہا! معاف فرمایئے اب وقت گزر چکا۔ آپ کمرے میں ہر طرح محفوظ ہیں۔ پولیس تک آپ نہیں پہنچ سکتے۔ میں نے دروازہ باہر سے مقفل کر دیا ہے۔

ڈاکٹر۔ "شیر دل پاجی تو جاتا کہاں ہے۔ میں ابھی پولیس اسٹیشن کو ٹیلیفون سے اطلاع دیتا ہوں"

شیر دل۔ "اس کی زحمت نہ کیجیے۔ آپ نے نہایت دور اندیشی سے تجربہ خانے کے ٹیلیفون کو صرف اس کمرے سے وابستہ رکھا تھا تا کہ جو غریب آپ کے تجربے کا شکار ہو اس کی آہ و فغاں کوئی سن نہ سکے۔ اپنی اس دور اندیشی کی داد مجھ سے لیجیے۔ اب آپ کسی اور سے گفتگو نہیں فرما سکتے صرف میری تحقیقات میں مدد فرما سکتے ہیں۔ فرمایئے گھبراہٹ تو نہیں محسوس ہوتی؟ ہونٹ، زبان اور حلق میں خشکی تو نہیں معلوم ہوتی؟"

" مردود۔ نالائق۔ پاجی۔ کمینے " (برافروختہ ہو کر)

" میں آپ کی کیفیت پوچھ رہا ہوں اور آپ اپنے صفات عالیہ گنائے جا رہے ہیں جناب عالی براہ کرم اپنی کیفیت واضح طور پر بیان کیجیے "

ڈاکٹر۔ " بدمعاش۔ چور۔ ڈاکو " (اور برافروختہ ہو کر)

شیر دل۔ "جناب عالی۔ میں نہ بدمعاش ہوں نہ ڈاکو۔ ایک مہذب، شائستہ اور چالاک انسان ہوں۔ خدا نے عقل دی ہے، کم عقلوں سے فائدہ اٹھا لیتا ہوں۔ اس عمل کو چوری جیسے گھٹیا لفظ سے تعبیر کرنا کتنی بڑی غلطی ہے"

ڈاکٹر۔ " بدمعاش۔ چور میں اور تجھ میں کیا فرق ہے؟"

شیر دل۔ " ڈاکٹر صاحب یہ ایک علمی بحث ہے۔ اس میں اتنا الجھنا چاہیے۔

[چور میں اور مجھ میں وہی فرق ہے جو ایک مہتر اور ڈاکٹر میں ہوتا ہے۔ مہتر آپ کے بول و براز کو صاف کرتا ہے، ڈاکٹر بھی قارورے اور فضلے کا امتحان کرتا ہے۔ اگر آپ محض اس سطحی مماثلت کی بنا پر ڈاکٹر کو مہتر کی طرح حقیر خیال کرنے لگیں تو کتنی بڑی غلطی ہوگی؟]

بات یہ ہے کہ حقارت نفس عمل سے نہیں ہوتی بلکہ اس طریق عمل کے لحاظ سے ہوتی ہے جس کے ذریعے کوئی عمل کیا جائے۔ آپ نے روپیہ کے ذریعے دیئے ہوئے

کیا تھا اور میں نے تدبیر کے ذریعے۔ دو مین چوڑا اور
ڈ آپ چونکہ آپ جسم انسانی پر اس کے اثرات کی
تحقیق کرنی چاہتے تھے مگر ناکام رہے۔ البتہ میں
اپنی تحقیق میں کامیاب رہا۔

ڈاکٹر۔ "چلیا بلاہ۔ دغاباز۔ چوری کو تحقیق کہتا ہے؟"

شیر علی۔ "نہیں ڈاکٹر صاحب نہیں۔ بس آپ تو ناحق خفا
ہی ہو گئے۔ سنئے تو، میں نے یہ معلوم کیا تھا کہ جب
ریڈیم کی اشعاعی قوت زائل ہو جاتی ہے تو وہ
سیسہ بن جاتا ہے۔ پس میں نے اندازہ لگایا کہ
اس کی شعاعیں سیسے میں سے نہ گزر سکتی ہوں گی۔
چنانچہ میں نے سیسے کی ایک ڈبیہ پورے اہتمام کے
ساتھ تیار کروائی اور اپنے خیال کی تصدیق کے لئے
یہاں حاضر ہوا۔ جب آپ نے مجھے تجربہ خانے
میں بند کیا تو میں نے نہایت احتیاط سے ریڈیم کو ڈبیہ میں
منتقل کیا۔ چنانچہ جب میں گھنٹے بھر سے ہے میرے
جسم پر کوئی مضر اثر نہیں ہوا۔ اس لحاظ سے میں اپنی
تحقیق میں کامیاب رہا۔ بہرحال خوش ہونا چاہیے کہ آپ
کی محنت ٹھکانے لگی۔ تحقیق ہو چکی۔ آپ نے نوکی مہینے
کی، صبح تک اپنے تجربہ خانے میں آرام فرمائیے مجھے اس
ریڈیم کے کئی حصے کر کے پوری احتیاط کے ساتھ مختلف
شہروں کو بھیجنا ہے۔ خدا حافظ"

حبیب احمد فاروقی

(حیدرآباد ریڈیو اسٹیشن سے نشر کیا گیا)

غزل

احساس بے خودی تک پہونچی ہیں سرد آہیں — ناسازگارِ الفت ہیں میری التجائیں
توبہ کے توڑنے کو جی چاہتا ہے میرا — مجبور کر رہی ہیں اٹھتی ہوئی گھٹائیں
جور و جفا نے ان کی کیا سحر کر دیا ہے — اب دل کی دھڑکنیں بھی دینے لگیں دعائیں
تاریک ہو رہی ہے دنیائے رنج و فرقت — نالوں کی بجلیاں ہیں آہوں کی ہیں گھٹائیں
محشر اٹھا رہی ہیں، فتنے جگا رہی ہیں — رکتی ہوئی نگاہیں، جھجکی ہوئی ادائیں

عظیم حیدرآبادی

مہاراجہ بہادر کی شاہ پرستی

اور دیگر حالات

سطورِ ذیل اس لیے قلم بند کرکے اشاعت کے لیے بھیجی جارہی ہیں کہ وہ آپ کے رسالہ کے ذریعے محفوظ ہوجائیں۔

اس وقت تو سب ہی یہ جانتے ہیں کہ مہاراجہ کے چراغِ ہستی نے جو رونق و ضیا ر دکھلائی، اور جس جود و سخا اور خلق و مروت سے ایک جہان کو مسخر کرلیا، وہ صرف دربارِ آصفیہ کا تصدق تھا، اور عالی قدر سلطانِ دکن آصفجاہ سادس و سابع کی ایک ادنیٰ نظرِ التفات تھی کہ اس کی بدولت مہاراجہ وہ سب کچھ بن گئے، جس سے اب ایک دنیا واقف ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ان کی اس کامیاب زندگی میں ان کی فطری صلاحیتوں اور خوبیوں کو بھی دخل تھا، مگر اس سے کون انکار کرسکے گا کہ بے نظیر مردم شناس اور قدر داں شاہانِ جلیل القدر نے ان کو ان کے ان صفات و کمالات کا وہ صلہ عنایت فرمایا، جو سلطنت میں اس سے بڑھ کر نہیں ہوسکتا، اور دمِ آخر تک الطافِ شاہانہ برابر مبذول رہے، مہاراجہ کا علاج معالجہ توجہ شاہی کا مرکز بنا رہا، اور حضور پر نور ہر وقت اطبا کے نام فرامین اور ہدایات جاری فرماتے رہے۔ عیادت کے لیے خود سواری مبارک آیا کرتی۔ جب وہ سانحہ پیش آگیا، جو لابدی تھا، تو اپنے ایک قدیم وفادار اور بے مثل شخص کی موت سے حضرت پیر و مرشد کو بے حد رنج پہنچا۔ ؎

شہنشاہِ جہاں را از وفاتش دیدہ پرنم شد
سکندر اشکِ حسرت ریخت، کا فلاطون زعالم شد

صدارتِ عظمیٰ سے سبکدوشی کے بعد، مہاراجہ بہادر کا اکثر وقت علمی و تفریحی مشاغل میں صرف ہوتا تھا، اور قریباً ہر روز شب میں سکندرآباد کسی ایک سینما تشریف لے جاتے، اور رات کے بارہ ساڑھے بارہ بجے ایوانِ شاد کو واپسی عمل میں آتی تھی، جس واقعہ کا ہم ذکر کرنا چاہتے ہیں، وہ ماہِ ربیع الاول [illegible] کا ہے، اور جسے راقم الحروف کے ایک دوست نے اس کے وقوع پذیر ہونے کے دوسرے یا تیسرے ہی دن ہم سے بیان کیا۔ وہ راوی ہیں کہ حسبِ عادت مہاراجہ بہادر کی سواری، جب رات میں سکندرآباد سے واپسی کے وقت چار مینار سے گزرتی، تو ایک بڑھیا، جو ایک مینار کے پائین میں بیٹھا کرتی ہے، صدائیں لگاتی، اور کہتی کہ "اللہ میرے سچے والے راجہ کو سلامت رکھے عمر و اقبال میں ترقی دے" مہاراجہ بہادر اپنی فطری عادت کے موافق اسے سرفراز فرماتے، اور سواری گزر جاتی تھی۔ قریباً ہر روز رات میں یہ بڑھیا دستِ سوال دراز کرتی، اور سخی راجہ دستِ کرم بڑھا دیتے۔

ایک رات جب کہ ساڑھے بارہ بج رہے تھے مہاراجہ کی سواری چار مینار کے شرقی مینار کے قریب سے (جو یونانی صدر شفاخانہ کی جانب ہے) گزر رہی تھی، مینار کے پائین سے حسبِ عادت یہ صدا آئی کہ "اللہ میرے سچے والے سخی راجہ کو عمر و اقبال میں ترقی دے" موٹر سے سخی داتا کا ہاتھ اٹھا اور ابرِ جود و سخا بن کر برس گیا، گاڑی کچھ ہی آگے بڑھی تھی، حکم ہوا کہ لوٹالو، اور اس مینار کے قریب اس

بڑی بی کے پاس لے چلو۔ ملازمین موٹر کا دروازہ کھولتے ہیں، اس کے باوجود کہ موٹر میں بیٹھنا اٹھنا ان کے لئے سخت مشکل تھا، بدقت تمام نیچے اتر پڑے۔ اور بڑھیا سے خطاب کرکے فرمایا کہ:۔

"تم ہر روز مجھ ایسے بوڑھے کو عمر و اقبال کی ناحق دعائیں دیتی ہو، میں تو امروز فردا کا مہمان ہوں، بلکہ تمہاری سچی اور دلی دعائیں اس بادشاہ کے حق میں ہونی چاہئیں، جس کے در پر مجھ سے ہزاروں غلام اور کتے پڑے ہیں۔ دعا کرو کہ اللہ پاک اس ریاست کے بادشاہ سلامت اور ان کے شہزادگاں و شہزادیاں کے عمر و اقبال میں ترقی عطا فرمائے، اور اس ریاست کو دشمنوں اور بلاؤں سے محفوظ رکھے"۔

یہ فرمانے کے بعد بڑھیا سے اصرار فرمایا کہ وہ ان دعاؤں کو ان کے سامنے اپنی زبان سے دہرائے۔ چنانچہ اس نے دہرانا شروع کیا، اور اس کے ساتھ ہی مہاراجہ نے دونوں ہاتھ آسمان کی طرف اٹھائے، اور اس بڑھیا کے ساتھ ساتھ خود بھی ان فقروں کو دہراتے جاتے اور آمین کہتے جاتے تھے، آنکھوں سے آنسو رواں تھے اس وقت ان پر کچھ اس طرح بے کلی اور اضطراب کا عالم طاری تھا کہ ایک عجیب رقت انگیز کیفیت نمایاں ہو رہی تھی۔ اس پیرانہ سالی کے باوجود کہ لوگوں کو انھیں سہارا دینا پڑتا تھا، بڑی دیر تک کھڑے روتے رہے تھے، اور جسم تھرا رہا تھا، پیر لڑکھڑاتے تھے۔ جب کچھ سکون ہوا، ملازمین کے سہارے موٹر میں سوار ہو گئے، اور گاڑی ایوان شاد روانہ ہو گئی۔ مجھ سے اور لوگوں نے اس کی تصدیق کی کہ روز راتوں میں اس مینار کے پاس ایک بڑھیا بیٹھا کرتی ہے۔

مہاراجہ نے زندگی بھر داد و دہش کی، اور ہر روز خزانہ سے روپے آتے اور تقسیم ہو جاتے۔ بیمار ہونے سے قبل تک اس طویل عمر میں کسی دن یہ بے نظیر عادت ترک نہ ہوئی اور یہ ان کے لئے بمنزلۂ فریضہ بن گئی تھی۔ دوسرے راوی نے مجھ سے بیان کیا کہ تین دن تک چونکہ مہاراجہ بالکل بیہوش رہے، اس لئے خیرات ملتوی رہی۔ ۵ ربیع الثانی دوشنبہ کے دن روح پرواز کرنے سے کچھ دیر قبل کسی نے کہا کہ سرکار کی عادت کے خلاف تین چار دن سے آج تک غربا پر کچھ تقسیم نہ ہوا، اور سرکار مرض کی شدت کے باعث سخت تکلیف میں مبتلا ہیں، چنانچہ اس پر توجہ کی گئی، اور اکنیوں سے بھری ہوئی تھیلیاں منگوائی گئیں، اور ملازمین کو حسب قرار تقسیم کرنے کے لئے دی گئیں جو سیکڑوں کی تعداد میں ڈیوڑھی کے سامنے جمع تھے۔ ان لوگوں نے ان پر تھیلیاں لٹا دیں اور جونہی کہ ادھر یہ تقسیم ختم ہوئی ادھر مہاراجہ کی روح پرواز کر گئی، عقیدت مند کہنے والوں نے کہا کہ شاید سرکار کی روح زندگی بھر اس صفت حسنہ کے ناغہ ہونے کو پسند نہ کرتی تھی، اس لئے جسد خاکی چھوڑنے پر آمادہ نہ تھی، جوں ہی کہ خیرات ختم ہو گئی، نزع کی کیفیت دور ہو کر، روح نے خوشی سے جسم کا ساتھ چھوڑ دیا۔

مہاراجہ اپنی علمی قابلیت میں ایسے فرد فرید تھے کہ اس دور میں ہندوستان میں اس طرح "مجمع العلوم و الکمال" افراد بہت کم پیدا ہوئے، اور اتنی خوبیوں کا ایک شخص کی ذات میں جمع ہو جانا فی الحقیقت ایک حیرت انگیز بات ہے۔ مہاراجہ فارسی، انگریزی، عربی، مرہٹی، کنڑی، ہندی اور

پنجابی زبانوں پر کافی عبور رکھتے تھے، اور اول الذکر دو زبانوں میں اہلِ زبان کی طرح گفتگو کرتے ہوئے ان کو بہت سے آدمیوں نے دیکھا ہے۔ خصوصیت سے فارسی کا لب و لہجہ بالکل ایرانیوں کا سا تھا۔ اردو ان کی مادری زبان تھی۔ مختلف فنون میں انھیں بلا مبالغہ استادانہ منصب حاصل تھا۔

(۱) ان کا خطِ نسخ و نستعلیق ایک ماہر کے درجہ کو پہنچ چکا تھا۔ امرا میں نواب لطف الدولہ وغیرہ ان کی ہمسری کرتے تھے۔ لیکن خطِ شکستہ نہایت پختہ اور عجیب شان رکھتا تھا، ضعیفی کے باوجود آخر عمر تک بھی اس کے رنگ میں فرق نہ آیا۔ مولٰنا محمد علی، اور ڈاکٹر اقبال کا خط بھی عمدہ تھا۔ ہمارے پاس مہاراجہ کے بیسیوں خطوط ہیں، اور ہماری رائے ہے کہ ان کا خط ان حضرات سے بھی بڑھا ہوا ہے۔ ان کے دستخط بھی خوبصورت اور خاص شان کے مالک تھے۔

(۲) ایک اچھے مصور بھی تھے، ہم نے ان کے کھینچے ہوئے قلمی فضا و بر و مناظر دیکھے ہیں۔ اپنے بعض مقربین کو جنھیں وہ چاہتے تھے۔ ان کی تصویریں بنا کر انھیں مرحمت فرمائی تھیں۔

(۳) فنون طبیہ میں، مشرقی اور مغربی دونوں طرز کی طبابت کی، اور اپنے ابتدائی دور میں باضابطہ مطب بھی کیا تھا۔ بیسیوں نسخے خود اپنی ذاتی صلاحیت سے مرتب کیا کرتے۔ میں نے ان کی مرتبہ و مرکبہ چوبِ شاد اور دیگر معاجین وغیرہ دیکھی ہیں۔

(۴) اپنے نانا کی توجہات پر فن موسیقی میں بھی مہارت حاصل فرمائی تھی۔ راجہ نریندر بہادر نے ایک دفعہ ایک صوفی صاحب کے روبرو مہاراجہ بہادر سے ارشاد کیا کہ بابا ہمیں ہمارے دادا (یعنی چندولال) نے شاکر علی، باقر علی نامی دو بڑے مشہور گویوں سے تعلیم دلائی تھی، تم بھی اس فن کو سیکھو۔ فقیر صاحب جو اس وقت موجود تھے، انھوں نے سن کر یہ کہا مہاراج آپ بھی غضب کرتے ہیں، یہ گانا سیکھ کر کیا کریں گے، اس پر راجہ نریندر بہادر نے مسکراتے ہوئے کہا دیا کہ اجی شاہ صاحب یہ بہت بڑا اور اعلیٰ فن ہے افسوس ہے کہ گویوں اور طوائف کے اس کو اختیار کر لینے سے حقیر سمجھا جانے لگا، اگر یہ اس کمال سے واقف نہ ہوں گے تو کل اہل فن کی قدر کرنا کیا جانیں گے۔ چنانچہ مہاراجہ کشن پرشاد نے نانا کی ان توجہات کے باعث ستار وغیرہ بجانے میں خوب مشق بہم پہنچائی، باجوں میں انھیں سب سے زیادہ روشن چوکی پسند تھی اور اس کے بیحد دلدادہ تھے۔ اچھے اچھے منتخب بجانے والوں کو ڈیوڑھی پر ملازم رکھا تھا۔ اور اکثر و بیشتر اس کے بخشش انعام سے سرفراز ہوتے تھے۔ ہمارے شہر کے اکثر لوگ اس باجے سے ان کی دلچسپی کا حال خوب جانتے ہیں۔

(۵) فنونِ حرب میں بھی کسی سے پیچھے نہیں تھے، بنوٹ، نشان اندازی، شمشیر زنی، تیر افگنی میں دستگاہ بہم پہنچائی تھی۔ میر عظمت علی مندوزی نے انھیں بنوٹ اور تیر اندازی سکھائی تھی، ایک دفعہ کا ذکر ہے جبکہ ان کے نانا راجہ نریندر بہادر زندہ تھے اور کبوتر اڑا رہے تھے، انھوں نے اپنے چہیتے نواسے کو حکم دیا کہ نشانہ لگاؤ، حکم کا ملنا ہی تھا کہ نشست سے تیر چھوٹا، اور ایک کبوتر کے پیوست ہو گیا، جو اڑتے اڑتے زمین پر گر پڑا، راجہ نریندر بہادر بیحد خوش ہوئے استاد میر عظمت علی خاں کو دوشالہ مرحمت کیا۔

شعر کا سنگار پسندِ خاطر تھا، گر تصوف کی چاشنی، اور علم و ادب کے شغف نے انھیں اس میں انہماک سے باز رکھا۔

(۶) اپنے دور کے پختہ مشق شاعر، اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں شعر گوئی فرمائی۔ کلام کا بیشتر حصہ اردو زبان میں ہے،

جس میں مثنوی، قصیدہ، مخمس، مسدس، غزل، وغیرہ سب ہی شامل ہیں، حضرت آصف (غفران مکان علیہ الرحمہ) سے شرف تلمذ حاصل فرمایا تھا۔ ایک بلند درجہ انشا پرداز و مصنف کی حیثیت سے بھی ان کو دنیا جانتی ہے۔ ان کے مکتوبات کا ایک مجموعہ ان کی مدار المہامی کے دور میں چھپا تھا۔ جواب بہت کمیاب ہوگیا ہے جو اردو زبان کی ایک گراں قدر یادگار رہے گا۔ اس کے پڑھنے سے ان کے زور قلم اور زور بیان کا اندازہ ہوتا ہے، جس میں غالب کے طرز پر اپنا ایک اچھوتا ڈھنگ اختیار کیا ہے۔ ان کی تصانیف بہت سے فنون پر حاوی ہیں، جو تصوف، فلسفہ، تاریخ، ادب، اخلاق، ناول اور سفر نامے وغیرہ پر مشتمل ہیں۔

(۷) علم نجوم میں بھی مہارت حاصل تھی۔ ڈیوڑھی کے بہت سے لازم جب کبھی انھیں کوئی لڑکا تولد ہوتا تو ایک درخواست گزرانتے کہ سرکار فدوی زادہ کے لئے، ستاروں کے سعد و نحس کو دیکھ کر کوئی نام تجویز فرمائیں۔ صرف حسب درخواست نام ہی سرفراز نہیں ہوتا بلکہ درخواست گزار کے پاس اس کے ساتھ عطار بھی پہنچتی تھی۔ کبھی کبھی تاریخی نام بھی مرحمت ہوتے تھے۔ ملازمین پر اس کا اثر اتنا ہوتا کہ ان کے دلوں سے بے اختیار یہی دعائیں نکلتی تھیں۔

مہاراجہ کے اس فن میں اچھی مہارت سے متعلق ایک ایسے واقعہ کا ذکر یہاں مناسب ہوگا، جو خود راقم الحروف پر گزرا ہے۔

اخفر کے والد بزرگوار (اللہ ان کی قبر کو نور سے منور رکھے) کو مہاراجہ کی پیشی میں حاضری کا اختصاص حاصل تھا، اور اللہ عمر کا زمانہ تھا۔ ایک دن میرے ہم عمر احباب نے مجھ سے تفریح کے لئے چلنے کی فرمائش کی، اور بہت مجبور کیا۔ میں نے یہ پایا کہ فلاں دوست کے گاؤں چلیں گے، جو شہر سے کافی دور تھا۔ اس وقت میرے لئے یہ دقت تھی کہ مجھے شہر سے باہر دور از مقامات پر جانے کی اجازت نہ تھی، میں نے ساتھ چلنے سے انکار کیا، اور اپنی مجبوری ظاہر کی، سید سجاد حیدر یلدرم نے ایک مضمون میں جس کا عنوان ہی یہ ہے کہ "مجھے میرے دوستوں سے بچاؤ" بالکل بجا لکھا ہے۔ اسی طرح میرے تمام حضرات مصر ہوگئے، اور کہا گیا کہ کسی نہ کسی طرح ساتھ چلنا ہی پڑے گا، اور تفریحاً "عثمان ساگر" جانے کے بہانے سے اجازت حاصل کرلی جائے۔ حضرت والد ماجد قبلہ اس روز گھر پر موجود نہ تھے، بلکہ مہاراجہ بہادر کی پیشی میں حاضر تھے، اسی لئے میں نے والدہ صاحبہ سے اسی حیلہ کو پیش کرکے اجازت حاصل کرلی، اور شام تک گھر لوٹ جانے کا یقین دلایا۔ غرض یہ کہ رفقاء کی جماعت نکلی، بجائے عثمان ساگر کے اس گاؤں کو پہنچی، جہاں چلنا پہلے ہی سے طے کرلیا گیا تھا، سارا دن لطف و مسرت سے بسر کیا، چونکہ مجھ پر پابندیاں عائد تھیں، جب شام کی تاریکی بڑھنے لگی، تو سب سے پہلے میں نے لوٹ جانے کا تقاضا شروع کیا، کچھ اور ساتھی بھی اس پر آمادہ ہوگئے، مگر خدا ان دوست کا بھلا کرے، جن کا وہ گاؤں تھا، انھوں نے یہ ضد شروع کی، اور کہنے لگے کہ "بھلا یہ کیسے ہوسکتا ہے آپ حضرات میرے پاس آئیں، اور یوں ہی لوٹ جائیں، آپ سب تھک چکے ہیں، اس لئے شب یہیں بسر کیجئے، اور صبح ناشتہ کرکے نکلئے، میں نے سارا انتظام کرلیا ہے"، میں کس صورت سے اپنے گھر جانے دوں گا۔ یہ سنتے ہی میری پریشانی کی انتہا نہ رہی، جیسے جیسے وقت گزرتا جاتا، میرا خوف بھی بڑھتا جاتا تھا۔ ایک طرف والدہ صاحبہ کے انتظار اور ان کی پریشانی کا خیال تھا، تو دوسری طرف والد صاحب کا خوف لگا تھا۔ میں تنہا کیا کرسکتا، جب کہ ساری جماعت بدل گئی ہو۔

چار و ناچار رہنا ہی پڑا۔ اور صبح ناشتے کے بعد ہم شہر لوٹنے کے لئے نکلے۔

چونکہ میں نے والدہ صاحبہ سے عثمان ساگر جانے اور سر شام لوٹنے کی اجازت لی تھی آپ جانتے ہیں کہ ہمارے یہاں کی بڑی بوڑھی عورتیں کسقدر وسوسہ والی ہوتی ہیں۔ اسلئے میرے واپس نہ ہونے سے انکی پریشانیوں کی کوئی حد نہ رہی۔ مجھے اسوقت تک تیرنا بھی نہ آتا تھا، وہ سمجھنے لگیں کہ یہ لوگ تالاب گئے تھے، خدا جانے کیا بات پیش آئی، جواب نہ لوٹے۔ جب صبح تک بھی میں گھر نہ پہنچا تو انتہائی اضطراب کے عالم میں انھوں نے والد صاحب قبلہ کے پاس یہ ماجرا لکھکر آدمی کو مہاراجہ بہادر کی ڈیوڑھی دوڑایا۔ حضرت اسوقت پیشی میں حاضر تھے، چونکہ یہ چٹھی تشویشناک تھی، اسلئے وہیں پیشی میں ان کے پاس پہنچائی گئی، جسکو پڑھکر وہ بھی سخت پریشان ہوئے اور مہاراجہ بہادر سے عرض حال کرکے جانے کی اجازت مانگی تو فرمایا کہ ٹھیریے۔ کاغذ اور پنسل طلب کیا اور دائرہ وغیرہ کچھ بنایا۔ والد صاحب سے میرا نام دریافت کیا، اور میرے گھر سے نکلنے کا وقت اور دوسرے متعلقہ سوالات فرمائے۔ ان کے جوابات کے بعد نتیجہ استخراج کرکے فرمایا کہ آپکا لڑکا کسی پانی کے مقام پر نہیں گیا ہے، بلکہ وہ شرقی رُخ کے کسی ایک دیہات کیطرف گیا ہے، اپنے احباب کیساتھ بخیر و عافیت ہے۔ آپکے یہاں سے اپنے گھر پہنچنے سے قبل ہی وہ لوٹ جائیگا۔ اطمینان سے جائیے کوئی فکر کی بات نہیں۔

حضرت والد ماجد قبلہ ڈیوڑھی سے نکل کر کوئی دن کے ۱۲ بجے گھر تشریف لائے اور میں ان سے زیادہ سے زیادہ دس منٹ قبل گھر پہنچ چکا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی خفگی کا اظہار ہوا چونکہ مرحوم شرقی طرز کے سخت پابند تھے اسلئے اس کے بعد مجھ پر جو گزرا، جو لڑکپن کی حرکتوں کے سبب کیلئے ضروری تھا۔

مہاراجہ بہادر کے ان سب کمالات کے سوا، ان کے حسن خلق، نیک دلی، اور ہر فرد واحد کیساتھ (جب کبھی کہ وہ ان کے آستانہ پر پہنچتا) ایسی ہمدردی، دریا دلی نے خلائق کے دلوں میں گھر پیدا کر لیا تھا۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ ایک بڑھیا درخواست لیکر حاضر ہوئی کہ میرا لڑکا فلاں محکمہ میں نوکر ہے، آپ وہاں اس کی سفارش فرمادیں۔ حاکم کا نام معلوم ہونے کے بعد فرمایا کہ افسوس ہے مجھ میں اور ان میں اتفاق سے آج کل صفائی نہیں، ورنہ میں تمھارے لڑکے کی خود سفارش کردیتا۔ تو بڑھیا مایوس ہوکر پھر اصرار کیا تو وہی جواب مرحمت ہوا، اسپر اس نے یہ عرض کیا کہ سرکار اگر سفارش نہیں فرماسکتے تو کم از کم اپنے قلم مبارک سے اسی درخواست کو لکھدیں میں وہاں کے افسر کو دیدونگی، اور میرا کام یقیناً بنجائیگا۔ مہاراجہ بہادر یہ عجیب و غریب فرمائش کو سنکر حیران ہوگئے، دریافت فرمایا کہ بڑی بی تمھیں کس نے یہ ترکیب بتائی، اسپر بڑھیا نے کہا کہ سرکار کسی نے مجھے یہ ترکیب نہیں بتائی، بلکہ میرا دل یہ کہتا ہے کہ میں سرکار کے قلم مبارک سے اس درخواست کو لکھا لوں، اتنے بڑے آدمی کے خط کو دیکھ افسر کیسے میرا کام نہیں نکالیگا۔ یہ ایسی فرمائش تھی جو سو سفارشوں سے بڑھ کر تھی نیک دل راجہ نے کاغذ طلب فرمایا، اور اس کے منشا کے مطابق درخواست منشا کرکے اسیوقت مرحمت فرمادی۔

ہم سمجھتے ہیں کہ یہ سارے صفات انکے تصوف سے لگاؤ کی بدولت درجۂ کمال پر پہنچ گئے تھے اور بڑے بڑے صوفیا کی خدمت کرکے انھوں نے اپنے میں یہ بات پیدا کی تھی بعض بزرگوں سے تصوف کی کتابیں بھی پڑھی تھیں چنانچہ مولوی حکیم مقصود علی صاحب جلال ناظم سررشتۂ طبابت یونانی کے والد بزرگوار مولانا حکیم منصور سلیمان صاحب (علیہ الرحمہ) سے حضرت شیخ اکبر کا ایک رسالہ وحدت الوجود پڑھا تھا۔ اور انکی کمال عزت فرمایا کرتے تھے۔ حضرت خواجہ حسن نظامی دہلوی سے بیعت تھی اور انھوں نے مہاراجہ کو ۱۳۴۲ھ میں خاموش شاہ کا لقب عطا کیا تھا۔ راقم الحروف کے والد کو جو انکے علمی سرپرست تھے اکثر تحریر کیکر بھیجا کرتے کبھی زبانی حکم ہوتا کہ آج فلاں صوفی صاحب کو دیکھ آئیں، اور مجھے اطلاع دیں کہ انکے حالات کیا ہیں، ذکر و شغل کیا ہے اور وہ کس رنگ میں رہتے ہیں۔ ان معلومات کے بعد وہ اکثر اوقات میں بھیس بدل کر پایل ہی ان فقراء کے پاس پہنچتے اور ان کی خدمت کیا کرتے تھے، رات میں تشریف لیجاتے ہوئے تو بہت سے لوگوں نے دیکھا ہے۔ [illegible] مقالے کے متعلق میں نے ایک مادۂ تاریخ لکھا ہے جو نہایت [illegible]

آہ راجۂ راجایاں کشن پرشاد

معین الدین [illegible] فاروقی

چونکہ اس میں ہمزہ کا ایک عدد شریک ہے۔

خوابِ بیداری

وہ ایک ایسے گھرانے میں پیدا ہوئی تھی جہاں مغربی اور مشرقی تعلیم و تہذیب نے مل جل کر ایک بالکل جداگانہ طرزِ زندگی کی بنیاد قائم کر دی تھی۔ پردے کی بے جا بندشیں ختم ہو چکی تھیں۔ اسکولوں اور کالجوں کی تعلیم عام تھی۔ مخلوط پارٹیاں کوئی عجیب بات نہ سمجھی جاتی تھیں۔ موسیقی اور ساز نوازی کو پسند کیا جاتا تھا۔ بے جا تکلف اور غیر ضروری جھجک خلافِ تہذیب و شائستگی خیال کی جاتی تھی۔ آزادیٔ خیال اور آزادیٔ رائے کو سراہا جاتا تھا۔ لباس میں زیادہ سے زیادہ سادگی و مناسبت اور اس کی قطع و برید میں ضرورت سے زیادہ نزاکت کو دخل ہو گیا تھا۔ چال ڈھال میں ایک بے پرواسی خرامی پیدا ہو چکی تھی۔ گفتگو میں مذاق کے لطیف پہلو اور مذاق میں سنجیدگی کے ہلکے نقوش بار بار نمایاں ہو جاتے تھے۔ طبیعتوں پر مہربانی اور ہمدردی کا رنگ چھایا ہوا تھا۔ برتاؤ میں خوش مزاجی جھلکتی تھی۔ قوتِ فیصلہ نے بڑھ کر کردار کو ایک انفرادی شان بخش دی تھی۔ اور اس مثالی ماحول کی مکمل تخلیق نوعمر اور خوبصورت فرزانہ تھی۔ جو اپنی کشتیٔ حیات میں تنہا بیٹھی موجوں سے کھیل رہی تھی۔ جو جذبہ اس کی تمام دوسری خصوصیات پر حاوی تھا وہ زندگی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مسرت کے خزانوں پر کامل قبضہ کر لینے کا پُرجوش جذبہ تھا۔

آج اس کی بیسویں سالگرہ کا خوش آئند دن تھا۔ وہ صبح سے مسرتوں کی فراوانیوں میں ڈوبی ہوئی تھی۔ شام ہوئی تو اس کی ڈاک اس کے لئے بہت سارے دعائیہ اور مسرت بخش خطوط لائی۔ اور اس وقت وہ اپنے خط پڑھنے کے بعد لباس خانے میں کھڑی اپنے طویل اور سنہرے بالوں کی آرائش میں مصروف تھی۔ اس کا سارا دن نت نئے رنگین اور خوش گوار مشاغل میں گزر گیا تھا اور اب کہ رات قریب تھی اپنے دوست احباب کو خوش آمدید کہنے کے لئے تیار ہو رہی تھی۔ طمانیت کے دیرپا اثر سے اس کے گال تمتما رہے تھے اور آنے والی مسرتوں کا احساس اس کی آنکھوں میں شرارے بن کر تیر رہا تھا۔ اس کے احساس ہونٹوں پر ایک بے جانی بوجھی مسکراہٹ اپنا پرتو ڈال رہی تھی۔

جب وہ دیوان خانے میں پہنچی تو بہت سارے مہمان جمع ہو چکے تھے۔ جیسے ہوائیں درخت کے پتوں کو یکساں چھوتی ہوئی گزرتی ہیں، اسی طرح وہ ہر ایک سے نہایت ہی خندہ پیشانی کے ساتھ ملتی ملاتی اپنی عزیز سہیلیوں میں جا بیٹھی۔ ہر شخص نے اپنی جگہ یہی سمجھا کہ فرزانہ کو صرف اسی سے مل کر سب سے زیادہ خوشی ہوئی ہے۔ مغالطہ آمیز برتاؤ کا یکساں جادو تہذیبِ جدید کا وہ کارنامہ ہے جس کی تعریف نہیں ہو سکتی۔

کمرے میں ہر طرف غیر اہم لیکن دل خوش کن گفتگو کا آغاز ہو چکا تھا "فرزانہ کا اصرار ہے" شیلا نے کہا "کہ آج ایسے خوش گوار موقع پر کسی دلچسپ پکچر کا آخری شو ضرور دیکھ ڈالا جائے"۔ اور یہ کہہ کر شیلا نے مسکرا کر فرزانہ کی طرف دیکھا۔ ظاہر تھا کہ یہ تجویز فرزانہ کی نہ تھی۔ "یہ ایک نہایت ہی شاندار خیال ہے" ایک گورے چٹے لیکن ضرورت سے زیادہ دبلے پتلے نوجوان نے زور دے کر کہا۔ فرزانہ کا ابنِ عم شمیم بول اٹھا "آج کل ایک پکچر (Idiot's delight) چل رہا ہے۔ میرے خیال میں اس خاص موقعہ کے لئے وہ بہت زیادہ موزوں ثابت ہوگا"۔ سب مسکرا دئے۔ فرزانہ بھی مسکرائی پھر ایک دم مصنوعی سنجیدگی اختیار کرتے ہوئے اس نے کہا "مگر بھائی جان آپ کو ہر ایک کی پسند کا خیال رکھنا چاہئے۔ آپ لوگ تو خیر ظاہر ہے کہ اس پکچر سے فطرتاً خوب لطف اندوز ہوں گے۔

لیکن ہم اور شیلا کیا کریں گے ؟" اس سوال پر مسکراہٹ ہنسی میں تبدیل ہو گئی۔ کسی نے رفعت (فرزانہ کی ہم جماعت) سے کہا "کیوں رفعت یہ پوچارم تو بڑا اچھا مقام معلوم ہوتا ہے۔ چند ہی دنوں میں تمھاری صحت نکھر گئی ہے۔ آخر وہ ہے کدھر ؟

اتنے میں ایک طرف سے آواز آئی کہ "سر دقد کھڑے ہو جاؤ سمیع بھائی تشریف لا رہے ہیں" فرزانہ نے سب کے ساتھ مسکراتے ہوئے دروازے کی طرف نظر ڈالی۔ دیکھا کہ واقعی سمیع بھائی اپنے خاص انداز میں بڑھتے چلے آ رہے تھے۔

ان کے متعلق یہ روایت مشہور تھی کہ اللہ میاں نے جب تمام آدمیوں کو بنا ڈالا تو ان کے پاس کچھ مٹی بچ رہی۔ مٹی کی مقدار اتنی تھی کہ اگر اس سے دو آدمی بنائے جاتے تو عام سائز سے ذرا کم ہو جاتے تھے چنانچہ اللہ میاں نے سوچا کہ لاؤ اس کا ایک ہی آدمی بنا ڈالوں بیٹھے بٹھائے لوگوں کو میری قدرت کا نمونہ بھی نظر آ جائے گا اور یہ مٹی بھی ٹھکانے لگ جائے گی۔ یہ سوچ کر اس مٹی سے اللہ میاں نے سمیع بھائی کی تخلیق کا کام شروع کر دیا۔ جب سمیع بھائی بن کر تیار ہو گئے تو اللہ میاں نے انھیں ٹھوک بجا کر زمین پر چھوڑ دیا۔ اس وقت سے سمیع بھائی چلتے پھرتے نظر آتے ہیں اور ایک مدرسے میں لڑکوں کو 'موسم'، جگہ اور زمین کی خصوصیات سمجھایا کرتے ہیں یعنی جغرافیہ پڑھاتے ہیں۔ جب وہ کمرے میں داخل ہوئے تو ایک شور محشر نے ان کا استقبال کیا۔ رفعت کو موقع ہاتھ آیا کہنے لگی "لیجئے اب تو ہمارے سمیع بھائی تشریف لے آئے۔ ان سے دریافت کر لیجئے کہ پوچارم حیدرآباد میں کس طرف واقع ہوا ہے۔" سمیع بھائی کو خیال ہوا کہ مذاق کرنے کا یہ بہترین موقع ہے، بولے "حیدرآباد کے جغرافیہ سے آپ اس قدر ناواقفیت کیوں ظاہر کر رہی ہیں۔ آپ کو تو اسے یاد کئے ہوئے کچھ زیادہ دن نہ گزرے ہوں گے آپ ہی بتا دیجیے۔"

رفعت بولی "بتانے کو تو خیر میں بتا دوں گی مگر میں نے خیال کیا کہ آپ بھی ضرور حیدرآباد کے جغرافیہ سے واقف ہوں گے، میری غلط فہمی کو معاف فرمائیے گا۔" اس پر ایک قہقہہ پڑا اور سمیع بھائی کچھ مسکرانے اور ہنسنے کی کوشش کرتے کرتے بری طرح شرما گئے۔ کسی نے کہا "سمیع بھائی سنا ہے کہ گرمیوں کی چھٹیاں گزارنے آپ بمبئی جانے والے ہیں۔ پانی کی تو وہاں کمی ہوگی نہیں" ایک دوسری آواز آئی "سمیع بھائی کو تمھاری طرح کوئی گھڑوں پانی کی ضرورت تھوڑی ہے انھیں تو چلو بھر ہی کافی ہو جائے گا۔ کیوں سمیع بھائی" سب بظاہر سنجیدگی کے ساتھ سمیع بھائی کی طرف متوجہ ہو گئے۔ سمیع بھائی بولے "بھئی تم لوگوں کی زبان خوب چلتی ہے۔ اب میں کیا کہوں" فرزانہ کا بھائی ریاض بول اٹھا "جانے بھی دیجئے سمیع بھائی۔ یہ لوگ بڑے نامعقول ہیں۔ اپنے کو بڑا ہمہ دان سمجھتے ہیں حالانکہ میں کہتا ہوں کہ اگر گدھوں کے کان کاٹ کر انھیں سوٹ پہنا دیا جائے تو ان لوگوں میں اور آپ میں مطلق کوئی فرق نہ کر سکے۔" سب لوگ پھر ہنسنے لگے اور سمیع بھائی کو خیال گزرا کہ ان کی مفروضہ بزرگی اور برتری معرضِ خطر میں ہے اس لئے انھوں نے پہلو بدل کر کسی قدر برا مانتے ہوئے کہا "بس اب ختم کرو۔ ذرا تم لوگوں کو موقعہ دیا کہ چل نکلتے ہو۔ اسی لئے میں کسی کو منہ نہیں لگاتا۔" شمیم بولا "آپ سب حضرات کو سمیع بھائی کی بات پر کامل یقین ہونا چاہئے یہ واقعہ ہے کہ وہ کسی شخص کو کیا کسی چیز کو بھی منہ نہیں لگاتے۔ لیکن کھانے کی میز پر وہ اپنا یہ اصول بڑی شد و مد سے تبدیل کر دیتے ہیں اور یہ کہنا کہ وہ کھانے کی میز کے علاوہ بھی کہیں اپنا اصول بدلتے ہوں گے سمیع بھائی پر بہتان لگانا ہے۔" سمیع بھائی آمادۂ فساد نظر آنے لگے اس وقت ایک خدمتگار نے ایک لفافہ لا کر ریاض کو دیا۔ پڑھنے کے بعد ریاض نے تحریر فرزانہ کو دے دی۔ یہ ریاض کے ایک پرانے دوست ممتاز کی تحریر تھی۔

ڈیر ریاض!

نہیں بتا سکتا کہ مجھے آج بہن فرزانہ کی سال گرہ میں شریک نہ ہوسکنے کا کس قدر سخت افسوس ہے۔ بات دراصل یہ ہے کہ میرا دوست سلیمان آج ہی دہلی سے آیا ہے اور میں اسے چھوڑ کر نہیں آسکتا۔ تم کہوگے کہ میں اسے ساتھ لا سکتا ہوں! درست ہے۔ مگر وہ بھی تو چلنے پر آمادہ ہو۔ حضرت نے عجیب دماغ پایا ہے۔ تم تو غالباً انھیں کسی قدر جانتے ہو۔ خیر۔ بہن فرزانہ کو میری طرف سے بہت بہت سلام اور مبارک باد پہونچا دینا اور نہ آسکنے کے لئے معذرت کر دینا۔ یہ نہ سمجھنا کہ میں ان کی اور تمھاری مسرتوں میں شریک نہیں ہوں۔ تمھارا

ممتاز

فرزانہ یہ تحریر پڑھ کر چند لمحوں کے لئے خاموش رہ گئی۔ اس نے سوچا یہ سلیمان صاحب بھی عجیب آدمی ہے۔ نہ جانے انھیں اور کیا دلچسپ مصروفیتیں ہیں۔ اور لوگ تو ہمارے تعارف کو باعث فخر خیال کرتے ہیں۔ ان سے اصرار بھی کیا گیا تو یہاں آنے پر آمادہ نہ ہوئے، خوب مگر وہ ہمیں جانتے بھی تو نہیں ہیں۔ نئے آدمی ہیں۔ فرزانہ نے خط اپنے بھائی کو واپس دے دیا اور پھر گفتگو کی دلچسپیوں میں کھو گئی۔ اتنے میں فرزانہ کے والدین کمرے میں داخل ہوئے۔ سب خاموش ہوگئے اور اٹھ کر استقبال کیا۔ فرزانہ کے والدین کمرے میں داخل ہوئے۔ سب خاموش ہوگئے اور اٹھ کر استقبال کیا۔ فرزانہ کے والدین بے حد خوش نظر آرہے تھے اور بڑے تپاک سے مہمانوں سے ملے کھانے کے بعد مہمان ایک ایک کرکے رخصت ہوگئے۔

سب کے آخر میں شیلا نے اجازت چاہی۔ اور عین اس وقت جب کہ فرزانہ اسے خدا حافظ کہہ کر واپس آرہی تھی۔ ایک موٹر مکان کے احاطے میں داخل ہوا اور اس کے سامنے ہی آکر ٹھیر گیا۔

ممتاز ہنستا ہوا موٹر سے اترا۔ "ہلو۔ فرزانہ بہن" اس نے کہا، ادھر سے جاتے جاتے میں نے ضروری سمجھا کہ چند منٹ ٹھہر کر آپ کی مسرتوں میں شرکت کا حق پیدا کرلوں۔ امید کہ بہت کامیاب اور پر لطف پارٹی رہی ہوگی" فرزانہ نے مسکرا کر اس کا اقرار کیا پھر وہ ممتاز کو اپنے بھائی کے پاس اندر لے گئی۔ جاتے جاتے اس نے دیکھا کہ ممتاز کی موٹر میں کوئی اور شخص بھی تھا جو اندر کی سیٹ پر خاموشی سے بیٹھا ہوا تھا۔ نہ تو وہ ان لوگوں کی طرف دیکھ رہا تھا اور نہ ہی ان کی باتیں سنتا معلوم ہوتا تھا روشنی کی کمی کی وجہ سے وہ صاف طور پر نہ دیکھ سکی کہ وہ کون تھا۔

ریاض سے ممتاز نے کہا "بھئی سلیمان بھی ساتھ آیا ہے۔ دراصل ہم لوگ اس طرف سے گزر رہے تھے اور بڑے اصرار سے میں نے سلیمان سے یہ اجازت لی ہے کہ کھڑے کھڑے تم لوگوں سے مل لوں۔ وہ خود اترنے پر کسی طرح تیار نہ ہوا۔ عجیب شخص ہے" ریاض نے کہا "واہ یہ بھی کوئی بات ہے۔ چلو وہ نہیں اترتے تو میں ہی ان سے مل لوں" ریاض اور ممتاز باہر چلے گئے۔ فرزانہ کمرے میں تنہا رہ گئی۔ اس کا جی چاہا کہ وہ بھی جا کر سلیمان سے ملے۔ دیکھو وہ کیسا آدمی ہے۔ لیکن وہ نہیں گئی۔ اسے اچھا نہ معلوم ہوا کہ سلیمان پر ظاہر ہو جائے کہ وہ بہت ہی متجسس اور بے باک لڑکی ہے۔ اس نے سوچا یہ سلیمان کوئی بہت ہی شرمیلا سا نوجوان ہوگا۔ جب ہی وہ مجھ سے ملتے ہچکچاتا ہے۔ خیر ہوگا۔ مجھے اس سے کیا لینا فرزانہ سونے کے لئے چلی گئی۔ سونے سے پہلے وہ پھر سوچنے لگی۔ میں بھی کس قدر بے خوف ہوں۔ بھائی جان تو کہہ رہے تھے کہ ممتاز صاحب کے دوست کئی سال تک انگلینڈ وغیرہ میں بغرض تعلیم قیام کر چکے ہیں۔ بھلا وہ مجھ سے ملتے ہوئے ہچکچانے اور شرمانے کیوں لگے۔ شاید وہ کوئی مغرور آدمی ہیں اور جب تک ان سے خاص مراسم نہ ہوں کسی سے ملنا پسند نہ کرتے ہوں۔ کچھ ہوگا۔ وہ نہیں ملنا چاہتے

تو کیا ہم ان سے ملنے کے لئے بے قرار ہیں۔ یہ سوچتے سوچتے فرزانہ سو گئی۔

ایک مرتبہ فرزانہ اپنے بھائی کے ساتھ شہر کے باہر ایک پر فضا مقام پر تفریح کی غرض سے گئی ہوئی تھی۔ وہیں شام کے وقت اتفاق سے ممتاز اور سلیمان بھی پہونچ گئے۔ ریاض نے بڑھ کر دونوں سے ہاتھ ملایا۔ ممتاز نے فرزانہ اور سلیمان کا ایک دوسرے سے تعارف کرایا۔ سلیمان نے مسکراتے ہوئے اس تعارف کو قبول کیا۔

سلیمان ایک خوبصورت شخص تھا صرف اس لئے نہیں کہ اس کا رنگ بہت گورا اور اس کا ناک نقشہ نہایت سجل اور موزوں تھا بلکہ اس لئے کہ وہ ایک پراثر شخصیت کا کا مالک تھا۔ وہ ایک مضبوط، تندرست، طویل القامت اور شاندار نوجوان تھا، اور اس کی آواز میں ایک دلفریب بلندی وعظمت پائی جاتی تھی۔ فرزانہ نے حسب عادت بے باکی سے ہنستے ہوئے سلیمان سے باتیں کیں۔ مگر کچھ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سلیمان فطرتاً سنجیدہ مزاج ہے اور کسی موقعہ پر بھی اپنی فطرت کو بہت زیادہ تبدیل کرنا پسند نہیں کرتا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ بہت زیادہ ہنسی کی بات پر بھی صرف مسکرا دیتا تھا۔ تاہم جب وہ ایک دوسرے سے علحدہ ہوتے تو دوست کیسے جاسکتے تھے۔

فرزانہ نے ممتاز سے کہا "ممتاز صاحب کل شام کی چائے پر ہم آپ کا انتظار کریں گے اور سنئے اگر سلیمان صاحب ہمارے ہاں اترنا پسند نہ کریں تو کوئی بات نہیں ہیں ان کی چائے موٹر تک پہونچادوں گی۔ کیوں سلیمان صاحب آپ کو اس انتظام میں کچھ خرابی تو نظر نہیں آتی۔" سلیمان مسکرانے لگا۔ اس نے کہا "آپ کی نوازش ہے۔ سنا کرتا تھا کہ کنواں پیاسے کے پاس نہیں آیا کرتا۔ مگر بیسویں صدی ہے بہت سے اصول تبدیل ہو چکے ہیں اور آئے دن ہو رہے ہیں۔

تعجب کی گنجائش ہی کیا ہے۔" فرزانہ اس مذاق پر غیر معمولی طور پر شرما گئی۔

سلیمان کبھی کبھی آجایا کرتا تھا۔ اور جب کبھی آتا تھا کوئی نہ کوئی بات ایسی ضرور کہہ دیتا تھا کہ فرزانہ اس کا کوئی مناسب جواب نہ دے پاتی تھی۔ سلیمان اس کے بے پروا قہقہوں کو سنجیدہ مسکراہٹوں میں تبدیل کر دیتا تھا۔ فرزانہ کی سمجھ بوجھ حیران تھی۔ اس کا دل و دماغ ہچکولے لے رہا تھا۔ اور اس کی روح ناقابل قیاس رفعتوں پر پرواز کر رہی تھی۔

ایک دن بارش ہو رہی تھی۔ سلیمان کئی روز سے نہ آیا تھا۔ فرزانہ عجیب بے چینی محسوس کر رہی تھی۔ اس نے سوچا یہ بارش کا موسم بھی عجیب فضول موسم ہوتا ہے۔ دن میں برسے تو کچھ ہرج نہیں۔ یہ کم بخت پانی شام میں کیوں برستا ہے۔ کچھ نہیں تو انسان کا دل چاہتا ہی ہے کہ باغ میں گشت لگائے۔ اب کوئی تنہا اس اداس کمرے میں کب تک بیٹھا رہے، پھر وہ اپنے کمرے میں چلی۔ اور وہاں اپنے دریچے کے سامنے رات گئے تک طرح طرح کے تصورات میں کھوئی ہوئی خاموش بیٹھی رہی۔

فرزانہ تیزی سے دوڑی چلی جارہی تھی۔ کسی نے اس کے پاؤں میں زنجیریں ڈال کر اسے روک لیا۔ فرزانہ اپنی کشتی آپ چلا رہی تھی۔ کسی نے اس کے ہاتھ سے چپو چھین لیا۔ اور عجیب بات تو یہ تھی کہ اسے اپنی آزادی کے چھن جانے کا مطلق غم نہ تھا۔ اپنی خود مختاریوں کے ختم ہو جانے کی ذرہ برابر پروا نہ تھی۔ وہ اپنی گرفتاری اور مجبوری ہی میں مسرت تلاش کر رہی تھی۔ لیکن تھوڑے دنوں بعد جب اس نے اپنے آس پاس نظر ڈالی تو مسرت اور سکون اس کے پاس سے پرواز کر چکے تھے اور ایک دل کو کھا لینے والا اندوہ اسے اپنی لپیٹ میں لے چکا تھا۔

فرزانہ بہت کچھ بدل گئی تھی۔ یوں دیکھنے میں کچھ نہیں بدلا تھا۔ نہ ماحول، نہ زمانہ، نہ حالات۔ دوست احباب بھی تھے۔ کالج کی مصروفیتیں اور سہیلیوں کی خوش گپیاں بھی تھیں۔ دعوتیں بھی تھیں۔ تفریحی مشاغل سے بھی دل بہلایا جاتا تھا۔ خود فرزانہ ہنستی بھی تھی مذاق بھی کرتی تھی۔ بہت کم خاموش نظر آتی تھی۔ دیکھنے والوں کو اس میں کوئی فرق محسوس نہ ہوتا تھا۔ مگر دراصل فرزانہ بدل گئی تھی۔ وہ جانتی تھی اور اس کی تنہائیاں جانتی تھیں کہ وہ بالکل بدل گئی ہے۔ ایک رات وہ بستر پر لیٹے لیٹے سوچ رہی تھی۔ زندگی بھی کیسے کیسے دھوکے دیتی ہے بہت دن نہیں ہوئے مجھے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ حیات اور مسرت کی نہ کوئی حد ہے نہ انتہا۔ مجھے خوشی اور طمانیت کا کبھی انتظار ہی نہ کرنا پڑتا تھا۔ ہر وقت یہ چیزیں میرے اندر موجود رہتی تھیں۔ میری دنیا کس قدر وسیع تھی۔ زمین سے لے کر آسمان تک مجھے اپنی حکومت نظر آتی تھی۔ آسمان کے اس طرف بھی میرا ہی سکہ چلتا تھا۔ کم از کم مجھے ایسا ہی معلوم ہوتا تھا، اب مجھے کیا ہو گیا ہے مجھے بہت کم باتوں سے خوشی ہوتی ہے۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ موزوں ہے کہ ہوتی ہی نہیں۔ کوئی نہیں جانتا کہ مجھ میں کتنا تغیر ہو گیا ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ میں اپنے عمل پر قادر ہوں۔ سب پر ظاہر کر سکتی ہوں کہ میں ویسی ہی ہوں جیسی پہلے تھی۔ انھیں کچھ پتہ نہ چلے کہ میں کیا سے کیا ہو گئی ہوں۔ ان آئے دن کے ہنگامہ آفریں جلسوں سے میں کس قدر تنگ ہوں، پر تکلف دعوتوں کی شرکت سے میں گھبراتی ہوں۔ کسی تفریحی مشغلے میں میرا جی نہیں لگتا۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ سب بالکل سطحی اور فضول چیزیں ہیں۔ زندگی کا مقصد اس کے علاوہ کچھ اور ہے۔ بہت ہی اہم اور بہت ہی مقدس۔ اب تک میں نے اس کے متعلق سوچا تک نہ تھا اب سوچتی ہوں تو میری تمام دوسری مصروفیتیں میرا مذاق اڑاتی معلوم ہوتی ہیں۔ مسرتوں کے گرداب میں پھنس کر میں بھول گئی تھی کہ زندگی کی تعمیر محبت سے ہوئی ہے اور محبت کے نغمے میں ہنسنا، رونا اور سوچنا سب ہی شامل ہے۔ بھائی جان تک کو معلوم نہیں۔ امی جان کو بھی خبر نہیں۔

البتہ مجھے معلوم ہے۔ میں جانتی ہوں کہ جب سلیمان آ جاتا ہے تو میری مصنوعی مسکراہٹوں میں حقیقت کی جھلک کیوں پیدا ہو جاتی ہے۔ سلیمان کو بھی پتہ نہیں۔ وہ تو یہ سمجھتا ہے کہ میں ایک نہایت ہی خوش گفتار، خوش مزاج اور خوش پوش لڑکی ہوں۔ سوچتا ہو گا کہ تہذیب جدید کی ہر ادا اور ہر انداز پر میں بری طرح مفتوں ہوں۔ میرے اندر میرا اپنا کچھ بھی نہیں ہے۔ اسے بس طنزیہ باتیں کرنا اور میرا دل دکھانا آتا ہے۔ میرے ساتھ اسے ذرا سی ہمدردی تک نہیں ہے۔ وہ مجھ سے ایسی ایسی باتیں کہہ دیتا ہے جس پر میرا دل گھنٹوں اداس رہتا ہے۔ وہ میری اصلیت سے ناواقف ہے۔ وہ اکثر اشارتاً مثالی لڑکیوں کے متعلق اپنی رائے دے چکا ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ اسے شریر اور بے باک لڑکیاں پسند نہیں ہیں۔ تو میں کیا کروں۔ سلیمان کو میری پروا ہوتی تو بتاتی کہ میں دراصل وہ نہیں ہوں جو وہ سمجھتا ہے۔ اب اگر میں ایک دم سے اپنے طور طریقوں کی بے باکیوں کو کم کر دوں تو کیا ہو گا سلیمان یہی خیال کرے گا کہ میں نے اسی کی خاطر یہ رنگ اختیار کیا ہے۔ وہ یہ کبھی نہ سمجھ سکے گا کہ میں ایسا کرنے پر مجبور تھی۔ پھر جب وہ مجھے نہیں چاہتا تو میں کیوں ظاہر کروں کہ میں اسے چاہتی ہوں۔ یہ تو میرا راز ہے۔ اس کے اظہار سے سوائے اس کے کہ میں اپنے آپ کو گرا دوں اور کیا حل ہو جائے گا۔ سلیمان بڑا مغرور اور خود پسند ہے۔ میری روح اور میرا دل مغرور نہیں ہے تو کیا ہوا، تعلیم اور تربیت نے مجھے استغنا اور بے نیازی سکھائی ہے۔ محبت اور چاہت نے مجھے وقار اور سربلندی کا سبق پڑھایا ہے۔ محبت کچھ مجبوری کا سودا تو ہے نہیں۔ وہ تو آزادی اور خود مختاری کی فضاؤں میں سانس لیتی ہے۔ اگر سلیمان کو معلوم ہو جائے کہ میں اس سے محبت کرتی ہوں تو کیا وہ مجھ سے محبت کرنے لگا؟ محبت کچھ کرنے سے تھوڑی ہوتی ہے۔ اگر اسے مجھ سے محبت ہو سکتی تھی تو اب تک ضرور ہو چکی ہوتی۔ یہ سوچتے سوچتے فرزانہ کے آنسو بہنے لگے۔ تنہا محبت کرنا بھی کس قدر دشوار ہے نہ کوئی امید نہ

کوئی فلسفی کہتے ہیں کہ حقیقی محبت صرف وہی ہوتی ہے جس میں ملاپ کا خیال نہ ہو۔ مگر مجھے سلیمان سے کچھ عشق حقیقی تو ہے نہیں۔ میں اسے چاہتی اس لئے ہوں کہ اس کے خیالات اور تصورات مجھے اچھے لگتے ہیں۔ اس کی شخصیت مجھے بھاتی ہے' اس کی آواز مجھے دلکش معلوم ہوتی ہے۔ اس کی باتیں میرے دل میں اتر جاتی ہیں۔ اس کی نگاہیں میرے قلب کے پار ہو جاتی ہیں۔ میرا جی چاہتا ہے کہ وہ ہر وقت میرے ساتھ رہے۔ وہ اپنے ہر ارادے اور ہر خواہش میں مجھے اپنا شریک بنائے۔ کبھی میں اس سے علحدہ نہ ہوں۔ اس کا فائدہ میرا فائدہ ہوجائے اور میرا نقصان اسے اپنا معلوم ہو۔ مختصر یہ کہ میں جو کچھ چاہتی ہوں اس میں خوش گفتار دیوں اور مشغلے پسند شاعروں کے دور از کار اقوال کا دور دور تک پتہ نہیں ہے۔
میں اچھی طرح جانتی ہوں کہ میں صرف اسی وقت خوش ہو سکتی ہوں کہ جو میرا اور میں اس کی ہو جاؤں اور جتنی محبتیں میں اسے دوں اتنی ہی مجھے واپس بھی ملیں۔ یہ نہیں ہوسکتا اس لئے یہ بھی نہیں ہو سکتا کہ میں اپنا رویہ بدل دوں۔ میری نسوانیت کے بھی تو آخر مجھ پر کچھ حقوق ہیں۔ میں اپنی خودداری اور وقار سے کیسے بے پروا ہو جاؤں میری قسمت میں تاریکی ہے تو یونہی سہی۔ میری دنیا مجھ پر تنگ ہورہی ہے تو ہوا کرے۔ ان تاریکیوں اور تنگیوں پر ماتم کرنے کی تھوڑی سی فرصتیں تو کم از کم میری اپنی ہیں۔ شاید وہ وقت بھی آئے کہ میرا دکھ حد سے گزر جانے پر میرے لئے دوا ہو جائے ابھی تو میرے پاس رونے کے لئے آنکھیں اور دل دونوں موجود ہیں۔" فرزانہ کے رخسار جو خشک ہوگئے تھے پھر بھیگ گئے۔

عجیب دلفریب موسم تھا۔ بارش ہوچکی تھی اور اب مطلع بالکل صاف تھا۔ شام کا وقت تھا اور فرزانہ دیوان خانے میں ایک دریچے کے سامنے کھڑی باغ کے سرسبز درختوں پر نظر جمائے ہوئے تھی۔ اور غیر معمولی طور پر خیالات میں غرق تھی ریاض اپنے والد کے ساتھ باہر گیا ہوا تھا۔ آج کوئی ملاقاتی بھی دیوان خانے میں نظر نہ آتا تھا۔ فرزانہ تنہا کھڑی ہوئی نہ جانے کیا کیا سوچ رہی تھی۔

"ہلو مس فرزانہ۔ آج آپ بہت خاموش ہیں آخر بات کیا ہے۔" سلیمان نے غیر متوقع طور پر خاموشی سے داخل ہوتے ہوئے کہا "معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے دوستوں نے آج آپ کے خلاف کوئی سازش کر رکھی ہے۔ دیکھئے تو آپ کا دیوان خانہ کس قدر خالی پڑا ہے" اور یہ کہتے کہتے سلیمان عجب طرح سے مسکرایا۔ فرزانہ نے اپنے غمگین تصورات کو جھٹک کر علحدہ کردیا۔ بولی "ہاں دیکھئے تو ایسے لطیف موسم میں سب کے سب مجھے تنہا چھوڑ کر چل دیئے۔ اچھا ہوا آپ آگئے۔ تشریف رکھئے۔ کہئے مزاج تو اچھا ہے؟"

"بالکل۔ شکریہ۔" سلیمان ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ فرزانہ دریچے ہی میں بیٹھ گئی۔ سلیمان نے کہا "کہئے آپ کی آئندہ دعوت کی فہرست میں میرا نام بھی ہے کہ نہیں۔ ریاض کہہ رہے تھے کہ آپ موسم بہار کی آمد کے سلسلے میں ایک جشن ترتیب دے رہی ہیں۔"

"جی ہاں۔ اور آپ کا نام کیسے نہ ہوگا۔ آپ ضرور آئیے گا کہیں پچھلی دفعہ کی طرح عین وقت پر باہر نہ چلے جائیے گا۔" سلیمان پھر مسکرانے لگا "نہیں انشاءاللہ اب کے ایسی غلطی نہ ہوگی۔ سوچتا ہوں تو یہ مجھے اپنی مکمل بدقسمتی معلوم ہوتی ہے کہ میں نے ایک ایسی دعوت کا لطف کھو دیا۔ سنا ہے آپ نے اپنی شیریں آواز سے لوگوں کو بہت محظوظ کیا۔ ممتاز بے انتہا تعریف کر رہے تھے۔ مجھے اب تک نہیں معلوم تھا کہ آپ کو فن موسیقی سے بھی اس قدر لگاؤ ہے۔" فرزانہ نے محسوس کیا کہ سلیمان کے لہجے میں ایک چھپا ہوا طنز ہے۔ اس نے اس سے پہلے بھی اکثر اس کو محسوس کیا تھا لیکن اس نے کبھی

جواب دینے کی کوشش نہ کی تھی۔ کیونکہ وہ سلیمان پر کبھی یہ ظاہر کرنا نہ چاہتی تھی کہ وہ اس کی گفتگو کی اصلی روح کو سمجھ گئی ہے۔ لیکن آج وہ بے اختیار ہو گئی۔ اس نے کہا "فن موسیقی سے مجھے جیسا کچھ لگاؤ ہے اس کا تو خیر آپ کو کسی آئندہ موقعہ پر اندازہ ہو ہی جائے گا۔ رہ گیا یہ کہ میری شیریں آواز سے لوگوں نے بہت لطف اٹھایا تو ممکن ہے یہ بھی درست ہو۔ لوگوں کو خوش کرنا جتنا آپ سمجھتے ہیں اس سے بہت زیادہ آسان ہے۔" وہ باوجود کوشش کے اپنے لہجے سے طعن آمیز سنجیدگی کے عنصر کو دور نہ کر سکی۔

"تو آپ کا خیال ہے کہ لوگوں کو خوش کرنے کے معاملے میں میں بہت سست رفتار ہوں؟" سلیمان نے ہنستے ہوئے کہا "آپ بڑی ذہین ہیں یعنی اگر آپ مجھے نہ بتائیں تو مجھے اپنی فطرت کا یہ راز ایک طویل عرصے تک نہ معلوم ہوتا۔" فرزانہ کو غصہ آ رہا تھا کہ آخر اس نے ایسی بات کیوں کہہ دی کہ سلیمان کو اپنی شخصیت سے بحث کرنے کا موقع مل گیا۔ سلسلۂ کلام کو جاری رکھتے ہوئے سلیمان نے کہا۔ "یہ تو بڑی بری بات ہوئی کہ آپ کو میری کمزوریوں کا پتہ لگ گیا اب تو میرے لئے آپ کو خوش کرنا اور بھی دشوار ہو جائے گا۔" اس آخری فقرے پر فرزانہ کا چہرا سرخ ہو گیا۔ تاہم اس نے اپنے آپ کو سنبھال کر کہا۔ "تو کیا ہوا۔ میری طرح آپ بھی ایک ساتھ بہت سارے دلوں کو خوش کیا کیجئے۔ بہت دنوں کے تجربے کے بعد میں نے یہ بات معلوم کی ہے کہ یہ کام نسبتاً ..... زیادہ آسان ہے۔" فرزانہ نے یہ کہنے کو تو کہہ دیا لیکن اس کی آواز اس قدر خشک تھی کہ بعد میں اسے افسوس ہونے لگا۔ پھر جب کچھ دیر تک اسی اپنی بات کا کوئی جواب نہ پایا تو نظر اٹھا کر سلیمان کی طرف دیکھا سلیمان اس کی طرف بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ فرزانہ کا چہرا ایک کھلی ہوئی کتاب ہے جسے وہ پڑھنا چاہتا ہے۔ اس کے چہرے پر اس کی مخصوص طنزیہ مسکراہٹ کے بجائے ایک سنجیدہ تمعق چھایا ہوا تھا اور اس کی آنکھوں میں ایک والہانہ جوش چمک رہا تھا۔ فرزانہ چونک پڑی۔ گھبرا گئی۔ اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ کیا کہے اور کیا کرے۔ کچھ دیر کی کوشش کے بعد اس نے کہا "چائے کا وقت ہو گیا ہے، میں آپ کے لئے چائے لے آؤں" یہ کہہ کر وہ جانے کے لئے اٹھی کہ سلیمان نے اپنی باعظمت اور پر وقار آواز میں اسے مخاطب کیا "فرزانہ۔ ٹھیرو۔ ابھی نہ جاؤ"۔ فرزانہ رک گئی۔ لیکن اس نے نہ کچھ کہا اور نہ سلیمان کی طرف نظر اٹھا کر دیکھا۔ وہ بالکل خاموش کھڑی، دریچے سے باہر باغ کو دیکھتی رہی پھر اس نے محسوس کیا کہ سلیمان اس کے قریب ہی کھڑا ہے۔ "فرزانہ" سلیمان نے کہا اور اس کی آواز میں بڑا گداز اور بڑی مٹھاس تھی۔ "اگر میں تم سے کہوں کہ اس جشن کا خیال ترک کر دو تو تم کیا کرو گی؟" دھیمی آواز میں فرزانہ نے کہا

"میں آپ سے پوچھوں گی کہ آخر میں ایسا کیوں کروں؟"

"اور اگر میں تم سے التجا کروں کہ تم میری خاطر جشن کا خیال چھوڑ دو اس وقت تم کیا کرو گی؟"

"میں پوچھوں گی کہ آپ مجھ سے کیوں التجا کرتے ہیں؟"

"تو میں کہوں گا۔ اس لئے کہ میں تمھیں چاہتا ہوں، پھر تم کیا کرو گی؟"

ایک طویل وقفے تک کوئی جواب سنائی نہیں دیا پھر طوفانِ مسرت میں کانپتی ہوئی ایک شیریں آواز بلند ہوئی۔

"پھر آپ جو کہیں گے میں وہی کروں گی"

رابعہ اکبر حسن

غزل

دل دیا دل کو غمِ عشق سے آباد کیا
تم سمجھتے ہو کہ تم نے مجھے برباد کیا

مہرباں! حسنِ نوازش نہ سہی جور سہی
کچھ تو ہو جس سے میں سمجھوں کہ مجھے یاد کیا

آج ہے محویتِ شوق کا عالم کچھ اور
جانے کیا شمع نے پروانے سے ارشاد کیا

دل بہلنے کے ہوئے دہر میں سامان بہت
میں نے ہر رنگ میں اے درد تجھے یاد کیا

کچھ اس انداز سے اس شوخ نے انگڑائی لی
میں یہ سمجھا کہ مری روح کو آزاد کیا

ہر گھڑی دل میں رہا جس کا تصور کاوش
مری تقدیر کہ اس نے نہ مجھے یاد کیا

کاوش

یاسمن

آج ڈیڑھ سال بعد ــــ خواب گاہ کی کھڑکی کے نیچے یاسمن میں آج کلیاں پھوٹی تھیں۔ ہر روز صبح حسینہ ـ یادِ محبوب میں آنسوؤں کے چند قطرے یاسمن پر ٹپکا دیتی ۔ اور ــــ ہر روز یاسمن کی محبت حسینہ سے بڑھتی ہی جاتی ــــ ناکام محبت وہ کلی سے پھول میں تبدیل ہو گئی ــــ نارسا محبت ــــ لیکن حسینہ نے نہ کبھی اپنی نازک انگلیوں سے اسے چھوا اور نہ ہی ایک پھول توڑ کر اپنے سینے پر آویزاں کیا ــــ آخرکار ــــ ایک دن مالی نے اپنے سخت ہاتھوں سے اسے توڑ لیا ۔ وہ بازار میں جا کر نیلام ہوئی ۔ عطار نے اس کی روح کشید کی ــــ شاعر نے کہا "میں محبوب کی مشامِ جان تک پہنچنا چاہتا ہوں ــ" عطار نے کہا "روحِ یاسمن سے بڑھ کر کوئی وسیلہ نہیں ــــ" شاعر نے کہا "میں محبوب کی شفاف جلد میں خوشبو بن کر سما جانا چاہتا ہوں ــــ" عطار نے کہا "روحِ یاسمن سے عمدہ کوئی خوشبو نہیں ــ" شاعر نے کہا "میں محبوب کو بالکل مدہوش بنا دینا چاہتا ہوں ــ" عطار نے کہا "روحِ یاسمن سے زیادہ کوئی مدہوش کن نہیں ــ"

عشق کارگر ہوا ــ یاسمن کی روح زندگی ایک خوبصورت اور نازک شیشے کے ملبوس میں حسینہ کے سنگھار میز پر جا پہنچی ــ مشامِ جان تک پہنچنے کے لئے ۔ ضم ہو جانے کے لئے ــــ مدہوش کرنے کے لئے ــ اور ایک شام ــــ حسینہ نے خوشبوئے محبت سے بے تاب ہو کر کہا

"میں تجھ سے محبت کرتی ہوں" یاسمن کی روح کھل کھلا کر ہوا میں بکھر گئی ـ پپیہے نے کہا ــ پیہو ـ پیہو ــــ

(ماخوذ)

شمیم

تصنیف و تالیف

پیشے کے مفہوم میں عام طور پر ایسے تمام مشاغل داخل کئے جاتے ہیں جو انسان سوچ سمجھ کر اپنی فطری مناسبت کے لحاظ سے عمر بھر کے لئے اختیار کرتا ہے۔ اور اس سے اس کا مقصد اپنی بسر اوقات کے لئے معاش پیدا کرنا ہوتا ہے۔ پیشے میں یہ دوسرا جز اس قدر اہم ہے کہ اگر اس کو خارج کر دیجئے تو کسی مشغلے کو پیشہ کہنے میں تامل ہوگا۔ چنانچہ اگر کوئی شخص یہ کہے کہ میں نے ایک ایسا پیشہ اختیار کیا ہے جس کو روپے پیسے سے کوئی تعلق نہیں اور کوئی مادی مفاد نہیں رکھتا تو شاید آپ اس کے خبط پر زہرخند کریں۔ ایسی چیزوں کو "ہابی" یعنے دلچسپی کے مشاغل سے موسوم کیا جاتا ہے۔

یہ سچ ہے کہ تمام پیشے خواہ وہ نجاری ہو کہ لوہاری کفش دوزی ہو کہ تجارت، معلمی ہو کہ تعلقداری یا نظامت سب کسی نہ کسی مادی فائدے کو پیش نظر رکھتے ہیں اس کے باوجود ہماری ذہنی کیفیت یہ ہے کہ جس مشغلے کا تعلق براہ راست روپیہ پیدا کرنے سے ہو اس کی اہمیت ہماری نظر میں گھٹ جاتی ہے۔ اس کے برخلاف ایسے تمام مشغلے جو علمی اور عقلی ہوتے ہیں یا جن کا مقصد براہ راست روپیہ پیدا کرنا نہیں معلوم ہوتا، زیادہ وقعت کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں۔ ایسے مشغلوں کے ساتھ "پیشہ" کی اصطلاح استعمال کرنے میں بھی اکثر تامل ہوتا ہے۔ مثلاً کوئی یہ نہیں کہتا کہ فلاں شخص کا پیشہ شاعری ہے۔ یا اس نے تصنیف و تالیف کا پیشہ اختیار کر رکھا ہے۔ اسی طرح ہم پروفیسری، نظامت، منتری یا وزارت کا ذکر بھی پیشے کی اصطلاح میں عام طور پر نہیں کرتے۔ اگر کسی ماہر موسیقی مصور یا شاعر کے ساتھ آپ پیشے کے لفظ کا استعمال کریں تو اس سے آپ کا مقصد اس کے فن کی قدر کو گھٹانا ہوتا ہے۔ چنانچہ کہتے ہیں شاعری اس کا پیشہ ہو گیا ہے یعنے وہ شاعری کے ذریعہ کچھ پیدا کرنا چاہتا ہے۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ تمام ذہنی اور علمی مشغلے جن کے متعلق کسی نہ کسی وجہ سے ہمارے ذہنوں میں یہ عقیدہ قایم ہو گیا ہے کہ "مادی فائدہ کے حاصل کرنے سے انھیں کوئی واسطہ نہیں ہے، پیشہ کے مفہوم سے اونچے ہیں۔ نجاری، لوہاری، کفش دوزی وغیرہ جن کا کوئی علمی رشتہ نہیں انھیں ہم جرأت کے ساتھ پیشہ کہہ دیتے ہیں۔ گویا ہماری نظر میں پیشے بھی اسی اصول کے تحت جچتے ہیں جس اصول سے فنون لطیفہ کے مدارج طے کئے جاتے ہیں۔ وہ اصول یہ ہے کہ "جو فن جس قدر زیادہ ٹھوس اور مادی ہوگا فنون لطیفہ میں اس کا درجہ اسی قدر ادنیٰ ہوگا" اسی طرح پیشوں کے متعلق ہم یہ اصول وضع کر سکتے ہیں کہ "جو پیشہ جس قدر زیادہ ٹھوس اور مادی ہوگا، پیشوں میں اس کا رتبہ اسی قدر گھٹیا ہوگا"۔

اسی طرح کا کوئی اصول ضرور ہمارے ذہن میں موجود ہوتا ہے جس کی بنا پر ہم ایک معمار کے مشغلے پر معلم کے مشغلے کو ترجیح دیتے ہیں اور شاعر اور مصنف کے مشاغل کو ہم سب پر فضیلت دیتے ہیں کیونکہ ہم سمجھتے ہیں کہ اس کا مقصد اس کا کارنامہ ہی ہے۔ اور اسے مادی فائدوں سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ہر زمانے میں ہمارے خیال کے مطابق کچھ نہ کچھ مصنف موجود رہے لیکن عام طور پر بڑے بڑے مصنفین کا مقصد بھی کوئی نہ کوئی مادی فائدہ رہا ہے۔ شکسپیر جس کے ڈرامے مجسم الہام سمجھے جاتے ہیں،

خاص کاروباری شخص تھا۔ ڈرامے لکھنا اور انھیں اسٹیج پر پیش کرنا اس کا پیشہ ہوگیا تھا۔ اس سے اس کی بُرائی مقصود نہیں۔ اگر مصنفین اور مولفین کے حالات ٹٹولے جائیں تو اسی طرح کے واقعات ملیں گے۔ مثلاً انگریزی زبان کا مشہور شاعر اور ناول نویس سر والٹر اسکاٹ ویورلی ناولوں سے اپنے اہل و عیال کی پرورش کا سامان فراہم کرنا چاہتا تھا۔ شاعر کی حیثیت سے جب اسکاٹ کو کافی شہرت حاصل ہوگئی اور اس کا پہلا قصہ بھی عام طور پر مقبول ہوا تو اس نے آئندہ ناول نگاری پر ساری توجہ صرف کرنے کی کوشش کی۔ اس کی وجہ معاش کے ذریعے وسیع نہ تھے اس لئے اس نے اپنے ایک سابق ہم جماعت جیمس بیلنٹائین کی مدد سے ایک چھاپہ خانہ کھولنا چاہا بعد میں اس میں اشاعت خانے اور کتب فروشی کی دکان کا بھی اضافہ ہوا۔ لیکن ناتجربہ کاری کی وجہ سے یہ کاروبار بیٹھ گیا اور حصہ داروں پر کئی ہزار کا قرضہ عائد ہوگیا۔ اسکاٹ نے اپنے احساس فرض کی وجہ سے اس قرضے کو پائی پائی ادا کرنے کی ٹھان لی اور اپنے قصوں کی تکمیل شروع کی۔ اس زمانے میں وہ جس بے جگری کے ساتھ کام کرتا تھا اس کا نقشہ اسکاٹ کے سوانح نگار نے نہایت نفیس کھینچا ہے۔ اسکاٹ کو کھڑکی کے پاس بیٹھے اور کام کرتے دیکھ کر ایک شخص کہتا ہے "جب سے ہم یہاں بیٹھے ہیں میں غور سے دیکھ رہا ہوں۔ وہ ہاتھ چلا ہی جارہا ہے اور کبھی نہیں رکتا صفحہ کے بعد صفحہ ختم ہوتا ہے اور مسودوں کے ڈھیر پر پھینک دیا جاتا ہے پھر بھی وہ بے تکان چلا ہی جاتا ہے۔ اور اس وقت تک چلتا رہے گا جب تک چراغ روشن نہ ہولیں اور اس کے بعد خدا جانے کب تک یہی حال ہر رات کا ہے۔"

اس محنت شاقہ نے اسکاٹ کو لب گور پہنچا دیا اور اور مرنے ہی کے بعد اس سے پیچھا چھوٹا۔ اردو کے اسکاٹ عبدالحلیم شرر کو بھی اس کاروبار کے تمام رازوں پر بڑا قابو حاصل تھا۔ ان کا اپنا چھاپہ خانہ تھا اشاعت خانہ اور کتب خانہ تھا اور رسالہ دلگداز تھا۔

عوام کی دلچسپی کو قابو میں رکھنے کے لئے وہ دلگداز میں کسی نہ کسی قصے کا سلسلہ جاری رکھتے۔ اور جب وہ ختم ہو جاتے تو علحدہ کتاب کی شکل میں شایع کر دیتے۔ ان کے جیسے کثیر تصنیف دنیا کی اور زبانوں میں بھی کم ہی ہوں گے۔

شاہ نصیر دہلوی کے متعلق مشہور ہے کہ وہ غزلیں لکھتے اور معاوضے پر لوگوں کو فروخت کرتے تھے۔ یہ معاوضہ روپیہ کی شکل میں ہو یا تحفے کی شکل میں شاگردوں سے بھی وہ فرمایشیں کیا کرتے تھے۔ کسی نے ان پر اعتراض کیا تو انھوں نے جواب دیا ... اس فرمایش کا اتنا فائدہ ہوتا ہے کہ روز کے آنے والے چوتھے دن غزل لاتے ہیں اس کے علاوہ انسان جس کام کو خرچ کرکے سیکھتا ہے اس کی قدر بھی ہوتی ہے اور شوق بھی پکا ہوتا ہے۔ اور جو کچھ لکھتا ہے جانکاہی سے لکھتا ہے اس کا تو دوہرا فائدہ ہوا میرا یہ فائدہ ہوا کہ لے آیا تو چیز آگئی نہ لایا تو میرا پیچھا چھوٹا۔"

غالب نہایت فراخ حوصلہ انسان تھے ان کی آمدنی ان کی داد و دہش سے رو براہ نہیں ہو سکتی تھی۔ اس لئے انھیں ہمیشہ تنگی کی شکایت رہتی۔ لیکن روپیہ آئے تو کس طرح؟ شاعری تجارت تو نہیں تھی۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہو سکتا تھا کہ بہادر شاہ ظفر کے دربار میں رسائی ہو جائے اور کچھ مشاہرہ مقرر ہو جائے۔ لیکن ان کی ٹیڑھی ترچھی چالوں کی شہرت ان کا تیکھا پن، خودداری اور سب سے بڑھ کر یہ کہ استاد ذوق سے چشمک اس میں حارج تھی۔ بہ ہزار دقت رسائی ہوئی بھی تو

دربار سے کچھ ملنے ملانے کا وہ انداز تھا جس کا نقشہ غالب نے اپنے قطعہ میں کھینچا ہے۔

بارے نوکر بھی ہو گیا صد شکر نسبتیں ہو گئیں مشخص چار

لیکن تنخواہ کا کیا حال ہے۔ فرماتے ہیں۔

میری تنخواہ جو مقرر ہے اس کے ملنے کا ہے عجیب ہنجار
رسم ہے مردے کی چھ ماہی ایک خلق کا ہے اسی چلن پہ مدار
مجھ کو دیکھو تو ہوں بقید حیات اور چھ ماہی ہو سال میں دوبار

آخر میں درخواست کرتے ہیں۔

میری تنخواہ کیجیے ماہ بماہ تا نہ ہو مجھ پہ زندگی دشوار

میر تقی میر سنتے آئے تھے ہر زمانے میں بادشاہ اور امرا، شعرا کی بڑی قدر کرتے تھے کسی امیر نے ایک شاعر کو اشرفیوں میں تلوا دیا تو کسی بادشاہ نے اپنے ملک الشعراء کا منہ موتی سے بھر دیا۔ لیکن خود ان کے کمال فن کی کیا قدر تھی۔ کوئی اس کا باعزت خریدار نظر نہیں آتا تھا۔ جیسا کہ فرماتے ہیں۔

حرف و سخن سے مطلق یاں گفتگو نہیں ہے
پیارے سوا ہم کو آئے نظر نفر سب !

اس لئے وہ ریختہ کو پیشہ بنا کر ہمیشہ پچھتاتے رہے چنانچہ ایک شعر میں کہتے ہیں۔

کسب اور کیا ہوتا عوض ریختہ کے کاش
پچھتائے بہت میر ہم اس کام کو کر کر

اسی طرح کی مثالوں نے اہل قلم اور شاعروں کے افلاس کو ضرب المثل بنا دیا ہے، ظاہر ہے کہ جب کوئی شخص کسی فن میں کمال حاصل کر لے اور وہ اس کی وجہ معاش کا براہ راست ذریعہ نہ بن سکتا ہو تو اس کی زندگی بڑے عذاب میں پڑ جائے گی۔

تنگی اور عسرت کی یہ شکایت اردو یا فارسی زبان کے شاعروں کے ساتھ ہی مخصوص نہیں ہے: انگریزی کے بڑے بڑے شاعر اور مصنف بھی اکثر اس کا شکار رہے۔ چنانچہ ڈاکٹر جانسن، گولڈ اسمتھ اور ان کے اکثر معاصرین مالی پریشانیوں کی وجہ سے زندگی بھر تکلیفوں میں رہے جانسن نہایت ضابط آدمی تھا تاہم لارڈ چیسٹر فیلڈ کو اس نے جو خط لکھا ہے اس سے تصنیف و تالیف کی بے قدری کا بھی پتہ چل سکتا ہے۔ گولڈ اسمتھ نے انگریزی ادیبوں کی کس مپرسی کا ایک نہایت نفیس خاکہ اپنے ناول "د ویکار آف ویکفیلڈ" میں کھینچا ہے۔ ویکار کا بیٹا جارج جو ایک نوجوان فلسفی ہے لندن میں تصنیف و تالیف کے ذریعہ نام پیدا کرنے کا خیال خام لکاتا ہوا وہاں وارد ہوتا ہے اس کا ایک عزیز اس کو مشورہ دیتا ہے۔

"تم ہمت والے اور پڑھے لکھے نوجوان ہو میری طرح تصنیف کا پیشہ کیوں نہیں اختیار کر لیتے۔ اس میں شک نہیں کہ تم نے کتابوں میں پڑھا ہوگا کہ بڑے بڑے ذہین لوگ اس پیشے میں قدم رکھنے کے بعد بھوکوں مر گئے۔ لیکن اس وقت میں تم کو بتا سکتا ہوں کہ شہر میں کوئی چالیس کے قریب نہایت غبی لوگ ایسے ہیں جو تاریخ اور سیاست پر لکھتے ہیں اور نہایت خوش حالی کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ یہ ایسے لوگ ہیں کہ اگر موچی کے گھر پیدا ہوتے تو تمام عمر جوتے درست کرتے رہتے لیکن انھیں جوتا بنانا نہ آسکتا"

یہ سن کر جارج تصنیف و تالیف کی طرف ڈھل جاتا ہے اور سب سے پہلی کتاب جو وہ لکھتا ہے اسے کوئی نہیں پوچھتا۔ اس کی بے قدری کی شکایت وہ ان الفاظ میں کرتا ہے" ہر شخص اپنے دوستوں کی اور اپنی تعریف میں اور اپنے دشمنوں کی مذمت میں مصروف تھا اور چونکہ میں نہ دوست تھا اور نہ دشمن اس لئے سب سے زیادہ تکلیف دہ عذاب یعنے کس مپرسی میں مبتلا ہوا" ایک مہم پسند شخص جارج سے "ٹیک کا فی ہوز" میں

ملتا ہے اور اسے علم و فضل سے آراستہ پاکر اس سے امداد چاہتا ہے اور اپنی تجویزیں سناتا ہے کہ کس طرح وہ کتابیں لکھ کر زندگی بسر کرسکتا ہے ۔ وہ کہتا ہے ۔

"تم شہر سے ناواقف معلوم ہوتے ہو ان تجویزوں کو سنو ۔ ان کی بدولت میں نے اپنی عمر کے بارہ سال آرام سے بسر کئے ہیں ۔ جونہی کہ کوئی نواب سفر سے واپس آیا میں چندہ کے لئے پیچھا کرتا ہوں پہلے میں خوشامد سے اس کے دل کا محاصرہ کرتا ہوں اور جو رخنہ پڑتا ہے اس میں اپنی تجویزوں کو داخل کرتا ہوں ۔ اگر وہ پہلی دفعہ امداد کردے تو دوسری دفعہ میں کتاب کے ڈیڈیکیشن کے نام سے کچھ اور اینٹھ لیتا ہوں ۔ اگر یہ بھی مل جائے تو پھر تیسری دفعہ اس کے نشان کو سرنامے پر چھاپنے کے لئے رقم وصول کرتا ہوں ۔ اس طرح مزے سے زندگی گذارتا ہوں اور رہتا ہوں ۔ ابھی ابھی اٹلی سے ایک امیر آدمی وارد ہوئے ہیں وہ میری تجویزوں سے واقف ہیں اس لئے تمہاری مدد چاہتا ہوں ۔ اگر ہم کامیاب ہوئے تو مال غنیمت کو آپس میں تقسیم کرلیں گے"۔

تصنیف و تالیف کی یہ کس مپرسی ڈکنز کے زمانہ تک جاری رہی ۔ اور اس کا بڑا سبب یہ تھا کہ اس وقت تک اس پیشے کا انحصار زیادہ تر دربار اور امیروں کی امداد پر تھا ۔ احتیاج زندگی فراہم کرنے کے لئے بعض وقت مصنفین کو طرح طرح کی چالیں چلنی پڑتی تھیں ۔ لیکن ظاہر ہے کہ بلند حوصلہ مصنف ایسی رکیک حرکتیں نہیں کرسکتا تھا اس لئے مالی حیثیت سے پریشانیوں میں گھرا رہتا تھا خواہ اس کے کارناموں کا رتبہ کتنا ہی بلند کیوں نہ ہو ۔

مصنفین کی ان مشکلات میں بڑی کمی طباعت اور اشاعت کی آسانیوں کی وجہ سے پیدا ہونے لگی اس کی بدولت تصنیف و تالیف کا کام اپنے بل بوتے پر جاری رکھنے کے قابل بن سکا ۔ اب اس کاروبار کو نہ سلاطین کی سرپرستی کی اتنی ضرورت باقی رہی اور نہ امرا کی امداد کی ۔ اس کی بڑی قوت اس کا وہ اثر ہوگیا جو وہ عوام پر پیدا کرسکتا تھا ۔ اس کا ایک لازمی نتیجہ یہ تھا کہ مصنفین کا رخ اعلیٰ طبقوں سے عوام کی طرف پھر گیا ۔ وہی دراصل ان کے موضوع اور ان کے مخاطب بننے لگے ۔ چنانچہ ڈکنز کے اکثر ناول اس رجحان کی ابتدا کو ظاہر کرتے ہیں ۔

اردو کی ابتدائی تصنیف و تالیف کا انحصار بھی تمام تر سلاطین اور امرا کی سرپرستی پر رہا ۔ متوسط دور میں جب سرپرستوں کے مواقع محدود ہونے لگے تو بڑے بڑے شاعروں نے زحمتیں اٹھائیں ۔ رفتہ رفتہ تصنیف و تالیف کا رخ دربار سے پھر کر مخصوص علمی طبقوں کی طرف ہوگیا ۔ اس زمانے میں مسجع اور مرصع عبارتوں کے قصے اور اخلاقی کتابیں لکھی گئیں لیکن طباعت اور اشاعت کے کاروبار کو جب سے ترقی ہونے لگی ہمارے مصنفین بھی عوام کی طرف رجوع ہونے گئے اور اپنی کامیابی کے لئے انھیں کو اپنا سہارا سمجھنے لگے ۔ چنانچہ شرر، حالی نذیر احمد، شبلی، اقبال، پریم چند، راشد الخیری، رتن ناتھ سرشار سرور جہاں آبادی غرض موجودہ زمانے کے تمام مصنفین مولفین اور شاعروں کا بھروسہ اپنی ذات اور اپنے قلم پر رہا اور اسی کی بدولت بعضوں نے تھوڑی بہت آرام کی زندگی بسر کی ۔ یورپ کے مشہور مصنفین یا خود ہندوستان کے بعض لکھنے والوں جیسے رابندرناتھ ٹیگور کی سی خوش نصیب زندگی ہمارے ہاں کم مصنفین کو حاصل ہو سکی اس کا بڑا سبب یہ ہے کہ ہمارے عوام میں پڑھنے کا چسکا ابھی تک پیدا نہیں ہوا ایسی چیز کسی مصنف کی کامیاب زندگی کی ضامن ہوتی ہے ۔ اگر یہ

نہ ہو تو کوئی اور چیز نہیں جو مصنفین اور مولفین کے شوق کار کا باعث ہو سکے۔ لا محالہ اوپری جن کی کوششیں روز بروز منظر عام پر آتی رہتی ہیں عوام میں پڑھنے کا شوق نہ ہونے کی وجہ سے ان کا ذوق بھی اونچا نہیں ہو سکتا ورنہ ایسے کارنامے زیادہ سے زیادہ لکھے جانے شروع ہو جاتے جو ہر حیثیت سے بلند پایہ ہوں اشاعت خانوں کی تنظیم نے تصنیف و تالیف کے کام کی خاطر خواہ خدمت انجام دی۔ اس میں شک نہیں کہ ناشر کی وجہ سے مصنف کے منافع کا ایک حصہ مارا جاتا ہے، لیکن سچ پوچھو تو بہت سے مصنفین جو اپنی کتاب کو چھاپنے کی استطاعت نہیں رکھتے ان کے کارنامے گمنامی میں پڑے رہنے کے خطرے سے محفوظ ہو گئے۔ بعض وقت یہ کہا جاتا ہے کہ ناشر کے شامل ہو جانے کی وجہ سے مصنف کی خود ارادیت متاثر ہو رہی ہے۔ ممکن ہے یہ صحیح ہو۔ لیکن بڑے مصنفین اور سمجھ دار ناشر ایسی چیزوں کو تصنیف و تالیف میں داخل ہونے نہیں دیتے جن سے ان کی عظمت میں فرق آئے۔ اس کے برخلاف بعض وقت ناشر ہونہار مصنفین کی بڑی اچھی رہبری بھی کر سکتے ہیں۔

اردو اشاعت خانوں کی تعداد یوں بھی بہت محدود ہے جو کچھ موجود ہیں ان کا دائرہ عمل وسیع نہیں ہے۔ بعض کے حساب کتاب اور معاملات قابل بھروسہ نہیں ہیں۔ اس لئے اہل تصنیف و تالیف کو اس تقسیم کار اور امداد باہمی کے مفید اصول سے کچھ زیادہ فائدہ نہیں پہنچ رہا ہے۔ اس زمانے میں تصنیف و تالیف کے کاروبار کی اگر صحیح مدد ہو سکتی ہے تو وہ اچھے اشاعت خانوں کی تنظیم سے۔ اسی کی ہمارے مصنفین اور ہمارے ملک کو سخت ضرورت ہے۔ اس کے بغیر موجودہ زمانے میں تصنیف و تالیف کے پیشے کی کامیابی مشکل ہے۔

عبدالقادر سروری

صدائے نشور

اسرارِ عشق نے مرا ایماں بنا دیا
اللہ رے کفر، جس نے مسلماں بنا دیا

پھیلا کے ایک خرمن گل ہائے آرزو
مجھ کو اسیرِ تنگیٔ داماں بنا دیا

اللہ رے التفات کہ اندازِ شرم نے
ہر جنبشِ نگاہ کو ارماں بنا دیا

فکرِ معاملات نہ اندیشۂ حساب
اچھا ہوا کہ سوختہ ساماں بنا دیا

کیا بات ہے ترے لئے تکمیلِ آرزو
اے وہ کہ تو نے خاک سے انساں بنا دیا

تیرے تخیلات نے محفل کو اے نشور
آئینہ رکھ کے سامنے حیراں بنا دیا

نشور واحدی (گورکھپوری)

قطعات

(۱)

ولولوں کا نقیب، عہدِ شباب
اور پیری ہے، منبر و محراب
یہ جہاں ہے تغیّرات کا نام
زندگانی ہے، رعشۂ سیماب

(۲)

تجھ سے کس کو گلا ہے میرے رفیق
مدتوں سے ہے یہ جہاں کا طریق
فاش کر کے فریبِ زندیقی
بن گیا ہوں میں کافر و زندیق

(۳)

میرے ہونے میں کیا زیاں تیرا
روندتا ہے مجھے جہاں تیرا
مجھ سے دوری تجھے نہیں پھبتی
میں تو ہوں ایک ترجماں تیرا

(۴)

قطرہ ہوں مجھ کو بے کنار نہ کر
رہنے دے مجھ کو شرمسار نہ کر
اور اگر تو یہ کھیل کھیلے گا!
حشر میں میرا انتظار نہ کر

(۵)

دل جو اک دن تھا گرمیٔ محفل
کب کا ہے منتظر، لبِ ساحل
جب کوئی موج سر اٹھاتی ہے
آہ بھرتا ہے اک بصد مشکل

(۶)

چار جانب ہے شورِ رستا خیز
سوچ میں غرق ہے دلِ پرویز
اور افلاس کے ستائے ہوئے
کرتے پھرتے ہیں نوکِ خنجر تیز

(۷)

کس قدر ہے بلند میرا مقام
نقشِ پا ہے مرا یہ ماہِ تمام
عرش کے اس طرف ہے میرا وطن
میرے مذہب میں بے لبی ہے حرام

احمد ندیم قاسمی

مُدیریات

ادارت ایک ایسا مستقل فن ہے جسے صرف مدیر ہی بہ حسن و خوبی انجام دے سکتے ہیں، اگر خدا نخواستہ کوئی تاجر اس فن کو ہاتھ لگائے تو نہ صرف فن کے خراب ہو جانے کا اندیشہ ہے بلکہ خود تاجر صاحب کو بھی سخت نقصان اٹھانا پڑتا ہے اور اگر کوئی کاریگر اس میں دخل دے تو سمجھئے کہ بس خیر ہی خیر ہے، کیونکہ ایک طرف تو اس کو خود منہ کی کھانی پڑے گی دوسری طرف اس کے اوزار بیکار پڑے پڑے یا تو زنگ آلود ہو جائیں گے یا کند۔ اسی طرح ہر اس شخص کا حال ہوگا جو غیر مدیر ہو کر بھی مدیر بننا چاہتا ہے، چنانچہ ایسا ہی کچھ حال ہمارا بھی ہوا کہ اس میدان کارزار میں قدم رکھتے ہی ہمیں بھی ایک رسالہ نکال کر رنگ برنگ کی آفتیں مولنی پڑیں۔

تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ ناظرین کو یاد ہوگا کہ ایک عرصہ پہلے ہم نے خاص کر ناظرین ہی کے مطالعہ کے لئے "چلم گزٹ" کے نام سے ایک رسالہ نکالا تھا، مگر وہ مسلسل اس لئے نہیں چل سکا کہ جیسا کہ ہم ابھی عرض کر چکے ہیں، ہم مدیر نہیں ہیں، اس لئے نمونتہً ایک رسالہ نکال کے اب تک خریداروں کا انتظار کرتے بیٹھے ہوئے ہیں لیکن افسوس ہے کہ اس جنگ کے زمانے میں بھی ہمارے رسالے کی طرف کوئی توجہ نہیں کر رہا ہے حالانکہ جنگ کے زمانہ میں رسالہ سے زیادہ توجہ کا مستحق اور کون ہو سکتا ہے، لہٰذا توقع ہے کہ ناظرین جلد سے جلد ہم غریبوں کی مدد کر کے ہمارے دکھے ہوئے دل کی دعا لیں گے اور ثواب دارین حاصل کریں گے۔

مدد کا طریقہ یہ ہو سکتا ہے کہ جو رسالہ ہم نے غلطی سے نکال دیا ہے، حضرات اس کے صفحات کو "وار بانڈز" (War bonds) کے طور پر خرید لیں۔ ناظرین کی سہولت کے مدنظر ہم نے ایک صفحہ کی قیمت پچیس روپے اور ایک ورق کی قیمت پچاس روپے تجویز کی ہے جو حضرات اس سے زیادہ دینا چاہیں خوشی سے دے سکتے ہیں۔ مدد کا ایک اور طریقہ یہ ہے کہ تنخواہ یاب حضرات آدھی تنخواہ خود رکھ لیا اور آدھی ہمارے پاس بھیج دیا کریں، اس سے دونوں کو سہولت ہوگی۔ ساتھ ہی ساتھ قربانی کے وقت بھی ہم غریبوں کو نہ بھولیں، گوشت، چمڑا، ہڈی، کھر جو بھی آپ روانہ فرما دیں قبول کر لیا جائے گا۔ بس اس سے زیادہ اور کیا عرض کریں، یاد رکھئے کہ جو کچھ ہم کر رہے ہیں آپ ہی کے لئے کر رہے ہیں کیونکہ رسالہ آپ ہی کے لئے تو ہوگا۔ اور پھر جس معیار کا وہ رسالہ ہوگا اس کا اندازہ تو آپ دیکھ کر ہی بخوبی لگا سکیں گے۔

افسوس ہے کہ آج کل ادب کی حالت اس قدر تباہ ہو رہی ہے کہ اس کی صحیح حالت کا نقشہ کھینچنا اپنے منہ میاں مٹھو بننا ہے، لیکن پھر بھی ایک مقدمہ کتاب کے طور پر یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ہم اس کا نقشہ کھینچ کر ہی رہیں۔

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ شہروں اور ملکوں کی آب و ہوا کا اثر وہاں کی معاشرت و اخلاق شعر و ادب پر بھی پڑتا ہے۔ اس لئے کسی ملک کا نقشہ کھینچنا گویا وہاں کے شعر و ادب کا بھی نقشہ کھینچنا ہے۔ پس ہم ہندستان کا ادب معلوم کرنے کے لئے ضروری سمجھتے ہیں کہ ہندستان کا نقشہ کھینچ دیں۔

چنانچہ ہندستان ایک وسیع جزیرہ نما ہے، جس کے تین طرف پانی اور ایک طرف پہاڑ ہے یعنے شمال میں کوہ ہمالیہ کا سر بہ فلک پہاڑی سلسلہ ہے، جنوب میں بحر ہند، مشرق میں خلیج بنگال اور مغرب میں بحیرۂ عرب واقع ہے۔

چونکہ ہندستان خط استوا سے قریب واقع ہوا ہے یہاں کی آب و ہوا گرم سمجھی جاتی ہے، اور جہاں گرمی زیادہ ہوتی ہے وہاں کے لوگ عموماً غسادی، بدطینت اور خود غرض واقع ہوتے ہیں، لیکن یہ بات کچھ غلط سی معلوم ہوتی ہے، کیونکہ ہندستان میں عموماً لیڈر اس کام کو انجام دیتے ہیں، اور لیڈروں کی قوم پرستی، سیاسی جوش، باہمی رواداری، معاشی ترقی، اور ابنائے وطن سے ہمدردی کے جذبات ان کی زبان کے ہر ہر لفظ سے ٹپکے پڑتے ہیں، پھر کوئی وجہ نہیں کہ یہاں کے جھگڑے فساد اور قتل و خون وغیرہ کو ان کے نام نامی سے معنون کرنے کی عزت حاصل کی جائے، جس کے وہ بجا طور پر مستحق ہیں۔

حدود اربعہ، موقعہ محل اور آب و ہوا کے بعد یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ یہاں کی پیداوار کا بھی سرسری طور پر ذکر کر دیا جائے۔

پیداوار میں یہاں کئی چیزیں قابل ذکر ہیں، مثلاً باجرہ، مکئی، جوار، چاول، گیہوں، روئی، آم، انگور، میتھی کی بھاجی، سویا، پالک، اروی، ترئی، بھینڈی وغیرہ۔ ان میں بھی چاول، گیہوں، روئی وغیرہ بہ کثرت ہوتے ہیں اور ان سے بڑھ کر آدمیوں کی پیداوار کے لئے ہندستان خاص طور پر مشہور ہے، آدمیوں کی کثرت معاشی خوش حالی کی مانع ہے، اور معاشی بدحالی خوبیٔ دماغ میں حارج اور قصور دماغ ارتقائے ادب میں حائل۔ یہی وجہ ہے کہ آج کل جتنے رسالے نکل رہے ہیں، ان سب کا معیار گرا ہوا ہے، اگرچہ رسالے والوں کو دعویٰ ہے کہ وہ ادب کی بہت بڑی خدمت کر رہے ہیں، مگر صحیح معنے میں تو کسی کا بھی نہ پرستی، سطحی شہرت، خود غرضی اور چند لچر چیزیں پیش کر کے پیسے کمانے کے سوا اور کوئی مقصد نہیں۔

البتہ بعض ایسے بھی ہیں جن کے متعلق کہا جا سکتا ہے کہ ادب میں بھی کافی حصہ لے رہے ہیں مگر ان کی حالت بھی اس معیار پر نہیں پہنچی جس پر کہ پہنچنی چاہیے۔

غرض ان ہی خامیوں کو محسوس کر کے قومی جوش اور ادبی خروش نے ہمیں مجبور کر دیا کہ علم و ادب کا ایک ایسا رسالہ جاری کیا جائے جو اپنی نظیر آپ سمجھا جائے۔

پس ناظرین میں یہ خبر وحشت اثر مسرت سے سنی جائے گی کہ ہم بھی ایک رسالہ نکال رہے ہیں۔ نکال کیا رہے ہیں، یوں سمجھ لیجئے کہ نکال چکے ہیں، لیکن صحیح معنے میں ابھی منظر عام پر نہیں آیا ہے پھر بھی اس کی مانگ اور ہر دلعزیزی کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ صرف پہلی اشاعت کے متعلق دنیا کے گوشہ گوشہ سے اتنے تعریفی خطوط آ رہے ہیں کہ یہاں ان کی تشریح کو ہم خلاف تہذیب سمجھتے ہیں۔ اس کے علاوہ گنجائش اتنی کھپ جائے گی کہ مفید مضامین نہ دئے جا سکیں گے، البتہ اگر ان آنے والے خطوط کی رفتار یہی رہی تو ہم آئندہ سے ان خطوط کا بھی ایک ماہوار رسالہ نکالنا شروع کر دیں گے، اور یقین ہے کہ ایسے خطوط تو ضرور ہی آیا کریں گے کیونکہ یہ ہر مدیر کا طریقہ رہا ہے کہ جب کبھی وہ رسالہ نکالتا ہے تو فوراً پہلی ہی اشاعت سے۔ بلکہ بسا اوقات تو اشاعت کے خیال ہی سے —— اس کے پاس تعریفی خطوط آنے شروع ہو جاتے ہیں، البتہ خریدار نہیں ملتے، پس، اگر ہمارے رسالہ کو بھی خطوط آئیں تو اس میں تعجب کی کیا بات ہے؟

غرض، ان حالات کے تحت آپ ہی اندازہ کر سکتے ہیں کہ ہمارا رسالہ کتنی آسانی اور تیزی سے لوگوں کے دلوں پر چڑھ جائے گا۔ فی الحال تو اس کے ہاتھ پاؤں اور کھر پیچھے پیدا ہو رہے ہیں تاکہ جو حضرات نرم دل ہیں ان کے دلوں پر ہاتھ پاؤں ہی سے چڑھنے میں آسانی رہے، اور جو سخت دل ہیں ان کے دلوں پر چڑھنے کے لئے کھر پنجوں کا استعمال کیا جا سکے

مخفی مبادکہ یہ کھنڑ پنجوں سے جڑھنے کا تخیل ہمارے رسالے نے بکری اور بلی سے لیا ہے۔

یوں تو آپ نے دیکھا ہوگا کہ ہر مدیر اپنے رسالہ کے متعلق یہی لکھتا ہے کہ اس کے پاس تعریفی خطوط آرہے ہیں، لیکن جب آپ غور کریں گے تو معلوم ہو جائے گا کہ لوگوں کے لکھنے اور ہمارے لکھنے میں کتنا بڑا فرق ہے۔

اس کے ثبوت کے لئے ہم یہاں چند مشاہیر عالم کے خطوط پیش کر دینا چاہتے ہیں تاکہ آپ کو تصفیہ کرنے میں آسانی ہو، لیکن چونکہ اصلی خطوط پیش نہیں کئے جاسکتے، مجبوراً ذیل میں ان کی نقل لکھ دینے کی کوشش کی جاتی ہے:۔

غور کیجئے، کیا لکھتے ہیں عالی جناب نواب "عماد البیگ" صاحب چیچک بردار آف تعلقہ آرمور:۔

"حضرت ایڈیٹر صاحب!

میں سن رہا ہوں کہ آج کل آپ ایک رسالہ نکال رہے ہیں۔ میں توقع کرتا ہوں کہ وہ رسالہ بہت اچھا ہوگا۔ براہ کرم میرے نام پر ایک سال کے لئے جاری کرکے ممنون فرمائیے گا ۔ چندہ کے متعلق آپ اطمینان رکھیں کہ جب میں وہاں آؤں گا تو آپ کو اور آپ کے بچوں کو چیچک کے ٹیکے لگا دوں گا۔ ٹیکوں کی فیس میں سے رسالہ کا چندہ نکال کر جو کچھ بچ رہے خاکسار کو دیدیجئے گا۔ خیر!

آپ کے رسالہ کا منتظر

"عماد البیگ"

مولنا انتشار الدین خاں صاحب سینٹری انسپکٹر موضع کھام گاؤں:۔

گرامی مدیر!

پس از ادائے آداب و تسلیم، بندہ عرض پرداز ہے کہ آپ کا مکتوب گرامی پہنچا، کوائف مندرجہ سے آگاہی بخشا۔

دیگر کیفیت یہ ہے کہ بندہ یہاں بفضل خدا مع خورد و کلاں خیریت سے رہ کر خیریت آپ جمیع خورد و کلاں کی بہ درگاہِ کریم و کارساز سے شب و روز، ہمیشہ نیک چاہتا ہوں۔

دیگر کیفیت یہ ہے کہ آپ کے رسالے کا نسخہ پہنچا۔ بہت بہت شکریہ۔ امید ہے کہ آئندہ بھی اسی طرح آتا رہے گا۔

آج کل مصروفیت اس قدر بڑھی ہوئی ہے کہ میں آپ کا رسالہ نہیں دیکھ سکا۔ آپ نے مجھ ناچیز سے اس کے متعلق رائے طلب کی ہے۔ بھلا میں کیا، اور میری رائے کیا۔ بہر حال معلوم ہوتا ہے کہ رسالہ اچھا ہی ہوگا، کیونکہ آپ جیسا قابل شخص نکال رہا ہے۔

شروع میں مشاہیر کی رائے اور تقریظ بھی لکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ یہ بہت اچھا اقدام ہے، کیونکہ اس سے ہم جیسے سیدھے سادے لوگوں پر اچھا اثر پڑنے کا امکان ہے۔ باقی خیریت۔

خیر اندیش

فدوی "انتشار الدین خاں"

مولوی اعتبار میاں صاحب ہیزم فروش محلہ قصاباں، بوندی

مکرمی!

آپ کا رسالہ ملا۔ پسند آیا۔ خصوصاً اس میں لکڑی کے کرتب، تجارت اور نرخ کا جو خاص باب رکھا ہے، وہ غیر معمولی طور پر مفید ہے، نہ صرف شعر و ادب کے لحاظ سے، بلکہ فنون سپہگری اور امور خانہ داری کے اعتبار سے بھی۔ میں آپ کو اس قابلانہ کوشش پر مبارکباد دیتا ہوں۔

آپ کی حسب خواہش ہمارے کھاتے میں ایک رسالہ ہمارے نام جاری کرکے ممنون فرمائیے۔

افسوس ہے کہ ہیمہ سوختنی کی بہت سی ہنڈیاں

آئی ہوئی ہیں، اس لئے کوئی تفصیلی جواب نہیں لکھ سکتا معاف فرمائیے گا۔

یہ سن کر مسرت ہوئی کہ آپ کا رسالہ پہلے ہفتہ وار تھا پھر نیم ماہی ہوا اور اب ماہانہ — خدا کرے کہ اسی طرح ترقی کرتے کرتے سہ ماہی، ششماہی بلکہ سالانہ تک پہنچ جائے۔

خاکسار

"اقتبار"

ان مشاہیر مقامی کے علاوہ حسب ذیل مشاہیر عالم نے بھی سنا ہے، ہمارے رسالہ کے متعلق اپنے گراں قدر خیالات کا اظہار فرمایا ہے:-

اقبال "رسالہ اچھا ہو تو اچھا ہے"
ٹیگور "رسالہ کافی ہے"
جناح "ادب میں رسالہ اور رسالہ میں ادب ہے" (وغیرہ)

ان آراء کے اظہار کے بعد ہم ذیل میں اس رسالہ کے چند اہم مقاصد گنا دینا چاہتے ہیں، تاکہ لوگوں پر اس کی اہمیت واضح ہو جائے:-

(۱) ادب میں ایک غیر معمولی اضافہ کرنا (۲) بہترین معیاری نظم و نثر شایع کرنا (۳) ہندی اردو کے جھگڑے کو ہندستان کی سرحد سے بڑھانا (۴) تمام سادہ لوح حضرات سے کسی نہ کسی طرح چندہ وصول کرنا (۵) قوم اور لیڈروں کی خدمت کرنا۔ (۶) اضلاع کے خریداروں کو ٹپہ کے ذریعہ بھیجنا (۷) ہر قسم کی دواؤں، کتب فروشوں اور کوک شاستروں کے اشتہارات شایع کرنا (۸) مضامین شایع کرنے کے لئے معاوضہ لینا۔ (۹) ٹائیٹل پر نہایت دلکش اور جاذب نظر تصویریں کھینچنا۔ (۱۰) ملک کے مشاہیر کی اموات کی خبریں شایع کرنا، تعزیتی قرارداد پیش منظور کرنا، اور مرحوم کے لئے "صبر جمیل" اور اس کے پس ماندوں کے لئے دعائے مغفرت مانگنا (۱۱) اگر کبھی بارش نہ ہو تو امساکِ باراں کے لئے دعا کرنا (۱۲) ہندو مسلم اتحاد کے لئے بے جا کوشش کرنا (وغیرہ)

وہ مقامات جہاں یہ رسالہ جاتا ہے:- امریکہ، آفریقہ آسٹریلیا، یورپ، ایشیا، بھاگل پور، جاپان، وزیرستان انگلستان، بلجیم، اٹلی، جرمنی وغیرہ۔

اس سے بھی رسالہ کی مقبولیت کا اندازہ ہو سکتا ہے، لیکن افسوس ہے کہ ملکی رسالہ ہونے کے باوجود غیر ممالک میں اس کی اس قدر مانگ ہے اور ہندستان میں کوئی پوچھ کر بھی نہیں دیکھتا۔ ہم امید کرتے ہیں کہ ناظرین کرام بہت جلد اس کی طرف توجہ فرمائیں گے۔

سالانہ چندہ ممالکِ یگانہ سے پچیس روپے اور ممالکِ بیگانہ سے پچاس شلنگ۔

اور جو حضرات بہ یک وقت دو رسالے منگائیں انھیں محصول ڈاک معاف کر دیا جائے گا، اور جو تین منگائیں انھیں رسالے کے خاص نمبروں کے علاوہ سالانہ ایک نسخہ "قیومی جنتری" اور ایک لکس (LUX) صابن کی ٹکیہ بہ طور انعام دی جائے گی، اور جو حضرات انعام کے نام سے نہیں لینا چاہتے، انھیں "مدیر کے تبرک" کے نام سے پیش کی جائے گی۔

باقی خیریت البتہ آرڈر کا انتظار بے چینی کے ساتھ رہے گا

خاکسار

"مدیر رسالہ"

سیّد علی شاکر

عید کے دن

بندرگاہ عدن کے مشرقی ساحل پر بنے ہوئے' دور تک ملاحوں اور ماہی گیروں کے جھونپڑے بڑا دلکش منظر پیش کرتے ہیں طلوع آفتاب کے وقت کنارے پر بسنے والے ملاحوں کے لڑکے ریتی سے کھیلتے یا پانی میں ڈبکی لگاتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں' ان کے گندمی جسم پر ایک ہی قسم کا موٹا تہمد بندھا ہوتا ہے' جو ہر لحاظ سے ان کے لئے موزوں سمجھا جاتا ہے۔ ان دلفریب قدرتی نظاروں کی سیر میں اپنے دوست مسعود کے ساتھ کئی دنوں تک کرتا رہا مسعود کے والد الیاس محمود نے ایک عرصے سے عدن اور اس کے نواح میں موٹریں چلانے کا ٹھیکہ حکومت سے لے رکھا تھا۔ وہاں ان کا کاروبار نہایت سرگرمی اور بہترین طریقے کے ساتھ چل رہا تھا۔ اب انھوں نے عدن میں ایک عالیشان جرمنی وضع کی کوٹھی بھی تیار کر لی تھی' انھیں ہندستان چھوڑے ہوئے تقریباً بارہ سال گذر گئے لیکن مسعود اپنی تعلیم کے سلسلے میں الہ آباد ہی میں اپنے چچا کے یہاں مقیم رہا۔ اب جب کہ وہ اپنی بہن کی شادی میں شرکت کی غرض سے گھر جا رہا تھا مجھے بھی اپنے ساتھ چلنے پر مجبور کیا' کالج کو موسمی چھٹیاں مل چکی تھیں' اس لئے مجھے اس کا ساتھ دینے میں کوئی عذر نہ تھا۔

ہم دونوں اس کے والد کی موٹر میں بہت دور دور تک ریتیلے میدانوں اور سمندری ساحل پر گھوما کرتے' یا بعض وقت چھوٹی چھوٹی کشتیوں پر بیٹھ کر سمندر کی سیر کیا کرتے اور رات گئے تک ان دلچسپ مناظر سے لطف اندوز ہوتے۔۔۔۔

مسعود جدہ جا رہا تھا' جہاں اس کی بہن بیاہی گئی تھی' مگر اپنی ناسازیٔ طبع کی وجہ سے اس کے ساتھ جا سکا' دوسرے دن میں تنہا ہو ٹل کے گھر سے نکلا دوپہر ہو چکی تھی' لیکن سورج کی تیز روشنی میں ریت کے فرات ابھی تک چمک رہے تھے' مختلف مقامات کی سیر کرتا ہوا میں ان ملاحوں کے جھونپڑوں کے قریب پہونچا' جہاں ساکن سمندر دور نگاہ تک تخت نور بچھا ہوا تھا۔ سورج ساحل سمندر پر غروب ہو رہا تھا' شفق کی زر پاش کرنوں سے ساری فضا رنگینیوں میں ڈوبی ہوئی تھی۔ اس دلکش نظر فریب نظارے نے میرے جذبات کو ابھارا اور مجبور کیا کہ ایسے سنہری موقع کو ہاتھ سے نہ جانے دوں'

ایک چھوٹی سی کشتی میں نے کرایہ پر لی' اور سیر کی ٹھانی' اف' کس قدر ولولہ خیز منظر تھا وہ' ہر طرف کیف و نور کی بارش ہو رہی تھی' آبی پرندے میری کشتی کا طواف کر رہے تھے' سورج آدھے سے زیادہ پانی میں ڈوب چکا تھا اک بیخودی کے عالم میں میں اپنی کشتی کو تیزی کے ساتھ کھینے لگا' تنہائی کا خیال بالکل میرے دل سے مٹ چکا تھا یہاں تک کہ میں ساحل سے ایک فرلانگ آگے نکل گیا۔ شام کی سیاہی آہستہ آہستہ شفق جا رہی تھی۔ پانی میں بھیگی ہوئیں خنک ہوائیں میرے دل میں ایک گدگدی سی پیدا کر رہی تھیں میں اب گا رہا تھا شاید ع

آ شوخ سنہری موجوں سے ۔۔۔ ہم دل کی نیا کھیویں گے

چند لمحوں کے اندر اندر ہواؤں نے اپنا رخ بدلا' اور موجوں میں ایک اضطراب سا پیدا ہو گیا جس کی وجہ سے میری کشتی میں بھی ہلچل پیدا ہو گیا' میں گھبرا سا گیا' معاً کئی خوفناک خیالات نے میرے سکون و مسرت کی دنیا کا شیرازہ بکھیر دیا' اتنی تاریک رات ان طوفانی ہواؤں کے تھپیڑوں میں بلا تکلف مہیب موجوں کی زد میں۔ اف خدا میرا دل کانپ اٹھا فوراً میں نے کشتی کا رخ ساحل کی طرف پھیر لیا اور تیز تیز چپو گھمانے لگا' ہواؤں کا زور بدستور بڑھ رہا تھا۔

۔ ادھر پانی کی موجیں خود بخود درندوں کی طرح خوفناک آواز کے ساتھ میری کشتی پر حملہ کرنے کے لئے جھپٹ رہی تھیں' بہت ہی جلد ممکن ہو سکا میں نے کنارے پہونچنے کی کوشش کی سردی کی شدت سے میرا

سارا بدن تھر تھرا رہا تھا۔ اور چپو چلانے والے ہاتھ کسی قدر شل ہوگئے تھے، لیکن میں نے ہمت و استقلال کو کام میں لاکر دل کو ڈھارس دی، اور جوں توں کرکے ساحل کے قریب تک پہونچا لیکن تاریکی میں میری کشتی طوفانی موجوں کی زد میں آکر ساحل سے ٹکرا گئی اور میں بے تحاشا کنارے پر آگرا، ایسا معلوم ہوا کہ کسی نے مجھے زبردست گھونسے کے ساتھ نیچے گرادیا ہو میری آنکھوں میں اندھیرا سا چھا گیا اور نہ معلوم اس کے بعد کیا ہوا لیکن صبح جب آنکھ کھلی تو اپنے آپ کو ایک جھونپڑے میں لیٹا ہوا پایا، اس وقت میرے تمام اعضا میں شدت کے ساتھ درد ہو رہا تھا، مری حیرت واستعجاب میں ڈوبی ہوئی نگاہیں، جھونپڑے کے کونے کونے کا جائزہ لے رہی تھیں، میرے قریب ایک سن رسیدہ شخص کھڑا ہوا تھا، میں یہاں کہاں ؟ مجھے کیا ہوگیا تھا، تم کون ہو ؟ میری کار کہاں ہے ؟ بدحواسی کے عالم میں میں نے متواتر سوالات اس سے کئے، آپ بے فکر رہیں بڈھے نے ہمدردی کے لہجے میں کہا، آپ میرے مہمان ہیں لیکن یہ بتاؤ مجھے کیا ہوگیا تھا، میں نے پھر اس سے سوال کیا۔

رات آپ ہمارے جھونپڑے کے قریب بے ہوش پڑے ہوئے تھے شاید آپ کی کشتی ساحل سے ٹکرا گئی ہوگی۔ آپ مطمئن رہئے، جناب آپ کی گاڑی بالکل محفوظ حالت میں ہے۔ آپ بڑے مہربان ہیں میں نے اٹھ کر اس سے مصافحہ کیا، میں آپ کا ممنون ہوں آپ نے میری جان بچائی،

یہ ہمارا فرض ہے جناب، میں نے اپنی عمر میں کئی ڈوبنے والوں کی جانیں بچائی ہیں، بڈھے کی دھنسی ہوئی کمزور آنکھیں غرور و تمکنت سے چمک اٹھیں، ایک دفعہ تو —— خیر ان باتوں کو چھوڑیئے آپ تھکے ہوئے معلوم ہوتے ہیں، آرام کیجئے۔ نہیں، میں بالکل اچھا ہوں، آپ مجھے گھر جانے کی اجازت دیجئے۔ یہ کیسے ہوگا حضور، آپ بغیر کھائے پیئے ہمارے گھر سے نہیں جاسکتے۔

میری لڑکی ابھی کچھ دیر میں آپ کے لئے تازہ غذا لے آئے گی اور وہ اب آتی ہی ہوگی جناب آپ اس سے ملکر بہت خوش ہوں گے، وہ بہت اچھے اخلاق کی خوبصورت لڑکی ہے اس کی ماں اسے تین سال کی عمر میں میرے سپرد کرکے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے چلی گئی بڈھے کی آنکھیں بھولی ہوئی باتوں کو دہراتے ہوئے نم آلود ہوگئیں۔

یہی لڑکی میرے اندھیرے گھر کا اجالا ہے، اس نے اپنے سکڑے ہوئے گالوں پر ڈھلکنے والے آنسو پونچھے۔

' دیکھو! وہ آرہی ہے' بڈھے نے اپنی جگہ سے اٹھ کر دروازے کے قریب جاکر کہا، میں نے دیکھا، واقعی وہ آنے والی لڑکی حسین ہے اس کی چال میں غضب کی شوخی تھی، بے پروائی کے ساتھ اس نے اپنے بال دونوں شانوں پر بکھیر رکھے تھے، لڑکی نے دور سے مجھے اپنے جھونپڑے میں کھڑے ہوئے دیکھا، اس کی ادھر اُدھر گھومنے والی نگاہیں زمین کے ذرات کا جائزہ لینے لگیں اس کی رفتار میں قدرے کمی آگئی تھی " آؤ سمیہ!" بڈھے باپ نے محبت بھرے لہجہ میں کہا، ہمارے مہمان بڑے اچھے آدمی ہیں، لڑکی اندر داخل ہوئی، اور دلربایانہ انداز کے ساتھ اپنی ٹوکری کو باپ کے سامنے لا رکھا، آپ نے فضول تکلیف کی، میں نے اخلاقاً بڈھے سے کہا، بڈھے ماہی گیر نے شاید میرے جملے کو نہ سنا ہو، لڑکی پانی لینے کے لئے باہر گئی ہوئی تھی، انجیر بہت زیادہ لذیذ ہوتے ہیں، اور یہ کھجور بھی، ہاں، یہ نعمت تو صرف خدا نے آپ لوگوں کو دی ہے۔ کھائیے حضور، لیکن اتنے زیادہ میں کیسے کھا سکتا ہوں، آپ لوگ بھی۔ میں نے لڑکی کی طرف نگاہ کی جو پانی کا برتن لئے کھڑی تھی۔ ہم لوگ یہ نہیں کھاتے، لڑکی نے دبی ہوئی آواز میں شوخی کے ساتھ کہا، باپ مسکرادیا، اس کے بے ترتیب دانت باہر نکل کر بدنما دکھائی دینے لگے، ہاں جناب ہم غریب ہیں، ایسی چیزیں روز کہاں سے کھائیں، یہاں امیر غریب کی بات ہی کیا ہے؟ بڈھے نے کہا نہیں،

اور لڑکی کی لگاہیں جھک گئیں ' میں آپ کے بغیر ایک پھل بھی نہیں کھاؤں گا ' لیکن ہم اتنے سویرے کھانے کے عادی نہیں ' اور مجھ سے بھی اتنے سویرے نہ کھایا جائے گا آپ نے فضول زحمت کی' مجبوراً بڈھا اور اس کی بیٹی راضی ہوئے ' ناشتہ ختم کرکے میں اپنے عزیز محسنوں کا شکریہ ادا کرکے رخصت ہوا ' میں ان کے بلند اور پاکیزہ اخلاق سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہا ۔ تقریباً میں ہر روز ان سے ملنے کے لئے سمندر کے کنارے آتا اور گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ ان کی پرلطف صحبت میں گزار کر واپس ہوتا '

بڈھا ابراہیم اور اس کی بیٹی سمیہ دونوں دن بھر مچھلیوں کا شکار کرتے ' اور شام کو انھیں بازار میں فروخت کرکے اپنی روزمرہ کی ضروریات کو پورا کرتے ۔ مسعود چار دن جدہ میں گزار کر واپس آیا ' میں نے اس سے اپنی زندگی میں انقلاب پیدا کرنے والے واقعات بیان کئے ' وہ بھی ابراہیم اور اس کی بیٹی سمیہ سے ملنے کے لئے مشتاق تھا ' مسعود کے گھر اس سال عید کی تیاریاں بڑے شاندار طریقے سے کی جا رہی تھیں ' اس کے والد نے اس سلسلے میں اپنے کئی ایک احباب کو بھی مدعو کیا تھا ' جن سے میرا تعارف کرانا چاہتے تھے ۔ عید کے ایک دن پہلے میں اور مسعود سمیہ سے ملنے کے لئے روانہ ہوئے ' ہماری موٹر اس کے جھونپڑے کے قریب جا رکی ' سمیہ موٹر کی ہارن کی آواز سن کر دوڑی ہوئی آئی ' لیکن مسعود کی موجودگی سے قدرے جھجک گئی ۔

سمیہ ' یہ میرے دوست مسٹر مسعود ہیں ' ان کے والد یہاں کی موٹر کمپنی کے مالک ہیں ' مختصر سے تعارف کے بعد سمیہ ہم دونوں کو اندر جھونپڑے میں لے گئی ' اس کا باپ سو رہا تھا اس نے مسعود سے تعارف کروانے کی خاطر جگانا چاہا ' لیکن میں نے اسے منع کیا کہ پھر کبھی وہ ان سے مل لیں گے ' پھر سمیہ نے ہمارے آگے مچھلی کے بھونے ہوئے کباب اور قہوہ پیش کیا ' ہم نے نہایت مسرت کے ساتھ اس کی دعوت قبول کی ' کھانے سے فارغ ہو کر ہم تینوں پانی کے قریب کی چٹان پر بیٹھ گئے ۔

شاید کل ہم نہ آسکیں گے ' سمیہ ' کیوں ؟ کل آپ کہاں جا رہے ہیں سمیہ نے دریافت کیا ' کل ہمارے یہاں عید ہے ' اوہ ' کیا آپ کے یہاں عید میں کسی سے ملنے کی اجازت نہیں ' اس کے پیر پانی کی سنہری موجوں سے کھیل رہے تھے ' نہیں یہ بات نہیں ' مسعود نے کہا ' کل دن بھر ابا کے دوستوں سے ملنا ہوگا وہ سب ہمارے گھر بلائے گئے ہیں ' اور تم نہیں آؤ گی سمیہ میں نے اس سے دریافت کیا ' ؟ ہم آکر کیا کریں ' سمیہ نے معصومانہ انداز میں کہا ' مل لو گی ' اور کیا ؟ یہاں ابا اکیلے رہیں گے اس نے مغموم چہرہ بنا کر کہا ' آپ نہیں آئیں گے کیا ؟ ہمارے یہاں بھی عید ہے ' کیوں نہیں ضرور آئیں گے ' مسعود نے جواب دیا ' ہم تین چار بجے مہمانوں سے نبٹ کر تم سے ملنے آئیں گے ' ہم اس سے رخصت ہو کر موٹر میں آبیٹھے ' دور تک سمیہ اپنا ہاتھ ہلاتی رہی ۔

نماز کے بعد جو مہمانوں کا تانتا لگا رہا تو مشکل سے چار بجے رہائی ملی ۔ مسعود کے والد الیاس محمود آج بڑے مصروف اور خوش نظر آ رہے تھے ' انھوں نے ہر ایک سے میرا تعارف کروایا ۔ میں اور مسعود سمیہ سے ملنے کے لئے بے چین تھے ' اور موقع کے متلاشی تھے کہ کسی طرح کوئی بہانہ تراش کر رفوچکر ہو جائیں ۔ آج ہم شکار کھیلنے جائیں گے ' مسعود نے اپنے ابا سے ڈرتے ڈرتے کہا ' دن بھر تھکنے کے بعد ' اس کی والدہ نے ڈانٹ کر کہا ' نہیں چچی ہم شکار نہیں کھیلیں گے ۔ میں نے موقع کا لحاظ کرتے ہوئے پہلو بدل کر کہا ' ویسے ہی سمندر کی سیر کرنے جائیں گے ۔ ذرا جلدی چلے آنا بیٹا ' ہمیں اجازت مل گئی ۔ ہم خوش خوش سمیہ سے عید ملنے کے لئے روانہ ہوئے ' نہ جانے سمیہ کب سے ہمارے لئے اپنے مکان کے سامنے والی چٹان پر مجسمہ انتظار بنی بیٹھی تھی ' دور سے اس نے ہماری موٹر کو آتے دیکھا تو اس کی خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی ' دوڑی ہوئی وہ موٹر تک آئی ' وہ بے حد حسین معلوم ہو رہی تھی ' عربی لبوں اس کے تبسم پر کھلا جا رہا تھا '

بے ساختہ وہ مجھ سے چمٹ گئی، اس کی بڑی بڑی آنکھیں غیر معمولی خوشی کا اظہار کر رہی تھیں، سمیہ عید مبارک، مسعود نے اس سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا، آپ نے بہت دیر لگا دی، اس نے شکایتی لہجہ میں کہا، میں نے خیال کیا شاید آج آپ نہیں آئیں گے، چلئے ابا آپ کا کب سے انتظار کر رہے ہیں۔ ہم تینوں جھونپڑے میں داخل ہوئے، بڈھا ماہی گیر کھجور کی چٹائی پر بیٹھا ہوا والہانہ جذبات میں عربی گیت گا رہا تھا، اس کی آواز سوز و گداز میں ڈوبی ہوئی رقت آمیز تھی اور آنکھیں نم آلود ابا جعفری آگئے، لڑکی نے اپنے باپ کے گلے میں باہیں حمائل کرتے ہوئے کہا، بڈھا فرط مسرت سے میری طرف بڑھا، قبل اس کے کہ میں اس کے سامنے سر کو خم کروں اس نے مجھے چمٹا لیا، اس کے سینے کے اتار چڑھاؤ سے میں نے محسوس کیا کہ وہ سسکیاں بھر رہا ہے، سمیہ اس منظر کی تاب نہ لا سکی، اس نے آنسوؤں کے چند قطرے اپنے دامن میں جذب کر لئے مسعود بھی ہماری محبت سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہا

ان سے ملئے ابا آپ جعفری صاحب کے دوست مسٹر مسعود ہیں، سمیہ نے تعارفی لہجہ میں باپ سے کہا، ابراہیم مسعود سے بغلگیر ہوا، بیٹھ جاؤ بیٹا، اس نے کہا، سمیہ آج بے انتہا خوش تھی، اس کی آنکھوں کی چمک ہونٹوں کی مسکراہٹ، غیر معمولی مسرت کا اظہار کر رہی تھی، اس نے ہمارے آگے مچھلی کے کباب، روٹی اور دودھ میں بھیگے ہوئے کھجور اور کچھ تازہ پھل لا رکھے، آج آپ کی دعوت ہے، اس نے سادگی کے لہجہ میں کہا، دوشیزگی کی رعنائیاں اس پر نثار ہو رہی تھیں بے پروائی کے ساتھ اس نے اپنے بالوں کو سینہ پر لا ڈالا تھا،

بہت خوب، ہم ضرور کھائیں گے، بڈھا ابراہیم بھی آج ہمارے شریک طعام رہا۔ یقین مانئے ایسی پر لطف دعوت ہم نے کبھی نہیں کھائی، ایک غیر معمولی خوشی ہم اس دعوت میں محسوس کر رہے تھے، سمیہ کے باپ نے معدے کا عذر کر کے صرف دودھ ہی پر اکتفا کی کھانے کے بعد سمیہ نے کہا، ابا آج ہم سمندر کی سیر کریں گے۔

نہیں سمندر کی فضا کچھ خراب سی معلوم ہوتی ہے، کچھ ہو ہم سمندر کی سیر ضرور کریں گے۔ نادان لڑکی اس کے باپ نے ذرا تند لہجے میں کہا، تو اپنے ساتھ دوسروں کو بھی پریشان کرنا چاہتی ہے، میں نے کہا اچھا سمیہ ہم پھر کبھی سمندر کی سیر کریں گے اب جانے دو پھر کبھی کب؟ اس نے منہ بنا کر کہا، اور آج کیا کریں گے ہم، آج گائیں اور بجائیں گے مسعود نے کہا، بھولی سمیہ کھلکھلا اٹھی ۔ کون آپ؟ نہیں آپ کے دوست جعفری! یہ شاعر ہیں اور گاتے بھی خوب ہیں، لیکن انصاف کی بات اگر پوچھی جائے، بڈھے ماہی گیر نے کہا، سمیہ گانے بجانے میں آپ حضرات سے کم نہیں، اچھا تو سمیہ سناؤ پھر ہیں، ابا جھوٹ کہتے ہیں، مجھے گانا وانا کچھ نہیں آتا، باپ نے مجبور کیا، بیٹا اب نہیں تو پھر کب؟ ان سے شرم ہی کیا ہے، آپ کہیں تو میں باہر چلا جاؤں مسعود نے طنزاً اٹھتے ہوئے کہا، نہ نہ آپ تشریف رکھئے، سمیہ ضرور آپ کو اپنا گانا سنائے گی۔ سمیہ جھونپڑے کے کونے میں رکھا ہوا گرد آلود بربط اٹھا لائی اور ہمارے مقابل بیٹھ گئی، تاروں کو آہستہ آہستہ جنبش دیتے ہوئے اس نے ایک راگ چھیڑا، اس کی آواز میں ایک قسم کا درد اور ارتعاش پنہاں تھا۔ اس نے گانا شروع کیا، کسی نظم کے چند شعر جن کا مطلب یہ تھا، عید کی صبح کیف و نور کی بارش ہو رہی ہے، بچے، جوان اور بڈھے سب کے سب بادۂ مسرت سے جھوم رہے ہیں، ان کے قیمتی رنگین ملبوسات ان کی خوشیوں میں مزید اضافہ کر رہے ہیں، اور دنیائے مسرت کا ذرہ ذرہ انھیں نغمۂ مسرت سنا رہا ہے، اور خوبصورت مقدس حوریں ان کی خدمت میں مبارک بادی کے پرمسرت تحفے پیش کر رہی ہیں۔ یہ اشعار بے حد متاثر کن اور دلچسپ پیرایہ میں گائے گئے تھے، ہم میں سے ہر ایک متاثر ہوئے بغیر نہ رہا۔ آفتاب افق مغرب سے ڈھلک چکا تھا، اور تاریکی آہستہ آہستہ روئے زمین پر مسلط ہو رہی تھی، ہم دونوں سمیہ اور اس کے باپ سے رخصت ہو کر گھر چلے آئے۔

دو دن تک ہم باہر نہ نکل سکے کیونکہ عید کے دوسرے دن سے مسعود بخار میں مبتلا ہوگیا تھا جس کی وجہ سے وہ کچھ کمزور سا ہوگیا تھا، جیسے وہ کئی دنوں کا بیمار رہا ہو۔ تیسرے دن مسعود کے نام ہندوستان سے تار آیا کہ کالج دو ستمبر کو کھلنے والا ہے فوراً چلے آؤ، ہندوستان جانے سے ایک دن پہلے میں سمیہ سے ملنے کے لئے گیا، مسعود میرے ساتھ نہ آیا وہ سفر کی تیاری میں لگا رہا۔ "کل ہم جا رہے ہیں سمیہ" میں نے اس کے نازک سے ہاتھوں کو تھام کر کہا، جب کہ ہم دونوں سمندر کے کنارے والی چٹان پر بیٹھ گئے تھے۔ "کل کہاں؟ ہندوستان" اس نے غمگین لہجے میں کہا، "ہاں اپنے وطن، دو ہفتے کے بعد ہمارا کالج کھلنے والا ہے" "کاش آپ مجھ سے نہ ملے ہوتے!" اس نے حسرت و یاس کے ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔ "سمیہ تم تردد نہ کرو، ہم یقیناً پھر ملیں گے" "شاید حشر کے دن" اس کا لہجہ مایوسی لئے ہوئے تھا، سمیہ کے یہ الفاظ مجھے متاثر کئے بغیر نہ رہے، وہ مجھ سے بے اختیار چمٹ گئی، اس کی آنکھوں سے محبت کے چشمے پھوٹ نکلے "آہ کیا معلوم تھا کہ آپ اس قدر جلد جدا ہوں گے، میں نے آپ سے کیوں محبت کی، آپ پردیسی ہیں دور سمندر پار کے رہنے والے، لیکن پیارے جعفری میں مجبور تھی، تمہارے بلند اخلاق نے مجھے گرویدہ بنا لیا۔ ابا کو آپ کی جدائی شاق گذرے گی، آہ اب کیا ہوگا" مسلسل آنسو بہہ بہہ کر اسے نڈھال کر رہے تھے۔ "سمیہ خدا کے لئے صبر کرو، جانتی ہو صبر کا پھل کتنا میٹھا ہوتا ہے، میرا ضمیر گواہی دے رہا ہے کہ ہم پھر ضرور ملیں گے" "آپ نہیں جانتے جعفری! دنیا میں کیسے کیسے انقلاب ہوتے ہیں" "لیکن سمیہ ہر حال میں خدا کی قدرت پر بھروسہ رکھو، امید بڑی چیز ہے" "آہ پیارے جعفری آپ میرے دل کو ڈھارس دے کر زندہ رکھنا چاہتے ہیں، میں مجبور ہوں، میرا دل اندر ہی اندر سینے میں بیٹھا جا رہا ہے، مجھے تو یہ معلوم ہو رہا ہے کہ ہم عمر بھر کے لئے ایک دوسرے سے جدا ہو رہے ہیں، کوئی زبردست طاقت ہمیں جدا کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔ میرا دل شکوک کا ہجوم ہے" "سمیہ تم بیکار کے خیالات نہ کرو، یقین مانو، تمہاری محبت میرے دل سے کبھی نہیں مٹ سکتی" "آہ کیا معلوم تھا کہ ہماری محبت اس قدر ادھوری رہ جائے گی" "سمیہ اٹھو اب ابا سے چلو مجھے تمہارے ابا سے چند ضروری باتیں کرنی ہیں" "اللہ جانے پھر خدا معلوم آپ کب ملیں گے، آپ مجھ سے خوب باتیں کیجئے" "مجھے اپنے سینے سے لگا رکھئے، اف اتنی طویل مدت عمر کا نامعلوم حصہ، یہ نہ کٹنے والی جدائی کی پہاڑ سی راتیں، میں کیسے برداشت کر سکوں گی، آہ میرا ضعیف باپ مجھے اس حالت میں کیسے دیکھ سکے گا، خدا اس پر رحمت کے پھول برسائے۔" میں بڈھے ماہی گیر سے جا ملا اور اس سے اپنا ارادہ ظاہر کیا، بڈھا کسی خیال کے تحت بہت زیادہ متفکر نظر آ رہا تھا۔ "خدا تمہیں خوش رکھے" اس نے یاس آمیز لہجے میں کہا، "لیکن بیٹا ہمیں بھولنا نہیں میرے بعد سمیہ — تمہاری ..." بڈھا آگے کچھ نہ کہہ سکا، اس پر رقت سی طاری تھی — بے ساختہ میں اس سے چمٹ گیا اور بچوں کی طرح سسکیاں بھر کر رونے لگا، "زیادہ نہ رو بیٹا، خیر سے اپنے وطن سدھارو، کبھی کبھی اپنی خیریت کی چٹھی بھیجا کرنا، سمیہ تمہارے لئے پریشان رہے گی اسے تم سے محبت ہے" "آہ! غریب لڑکی" بڈھا ابراہیم مجھے وداع کرنے کے لئے دروازے تک آیا، ایک بار پھر وہ مجھ سے چمٹ گیا، "جاؤ بیٹا خدا حافظ" "آپ بزرگ ہیں دعا کیجئے" میں نے آنسو بہاتے ہوئے کہا "خدا کارساز ہے وہ بچھڑوں کو ملاتا ہے" سمیہ دور تک میرے ساتھ چلتی رہی، اس کی محبت بھری آنکھیں اب بھی دریا بہا رہی تھیں، اس نے ہچکیاں بھر بھر کر کہا "اچھے جعفری مجھے بھول نہ جانا، میں تمہارا انتظار کروں گی، عید کے دن اسی چٹان پر بیٹھی ہوں گی۔" میں اس سے وداع ہو کر موٹر میں بیٹھ گیا، میں نے دیکھا سمیہ موٹر کے نظروں سے اوجھل ہونے تک اپنے رومال کو جنبش دیتی رہی۔ دل پر رنج و غم کا بار لئے ہوئے گھر پہنچا، اور صبح جانے والے جہاز سے میں اور مسعود ہندوستان روانہ ہو گئے۔

ہندوستان آ کر میں نے دو خطوط سمیہ کے یہاں روانہ کئے اور اس کے جواب میں مجھے اس کا ایک خط ملا جس میں اس نے [illegible]

پریشانیوں کا اور اپنے باپ کی طویل علالت کا ذکر کیا تھا کہ اس کا باپ دن بھر گھر میں پڑا رہتا ہے اور وہ تمام دن محنت کرکے روزی حاصل کرتی ہے۔ میں نے اس کے لئے یہاں سے کچھ روپے روانہ کئے اور ہفتے میں ایک مرتبہ خط لکھنے کی تاکید کی، دو ماہ کے بعد سمیہ نے میرے پاس ایک پریشان کن خط لکھا:۔

"باپ اپنی طویل علالت کے بعد مجھے اس دنیا میں اکیلی چھوڑ کر چلا گیا۔ سمندر کے اس پار سنہری ساحل کے قریب، فرشتوں کی نورانی بستی میں، آہ جعفری! مجھے اس دنیا میں تنہا مصائب کی کڑیاں جھیلنے کے لئے زندہ درگور کرکے۔ بتاؤ جعفری اس دنیا میں میرا کون ہے، اگر تم، بہت دور جہاں سے آنے کے لئے پندرہ دن کی مدت درکار ہے بتاؤ پیارے تم کب آؤگے؟ شاید عید کے دن میں تمہارا انتظار کروں گی یہیں سمندر کے کنارے والی چٹان پر۔

میں نے اس کے جواب میں بہت کچھ تشفی آمیز جملے لکھے، یہ کہ مسعود ہر سال اپنے والدین سے ملنے کے لئے عید کو آیا کرتا ہے۔ میں بھی ضرور اس کے ساتھ تم سے ملنے کے لئے آؤں گا۔ مسعود گھر جانے کی تیاریاں کر رہا تھا، ایک ہفتہ پیشتر میں اپنی والدہ کی علالت کے سلسلے میں وطن چلا آیا تھا، اس نے مجھے لکھا، آج رمضان کی بارہ تاریخ ہے تم مجھ سے سولہ تاریخ کو ممبئی میں ڈپٹی صاحب کے گھر پر ملو۔ دن بہت کم رہ گئے ہیں، عید کے دن ہمیں عدن پہونچنا ہے۔ والدہ کا مزاج بہت زیادہ خراب تھا، ڈاکٹر نے انہیں پہاڑی مقام پر لے جانے کی رائے دی تھی، والد نے اپنی گوناگوں مصروفیات کی وجہ سے یہ کام میرے ہی ذمہ رکھ چھوڑا، اور مجبوراً مجھے اس اہم فرض کو انجام دینا پڑا۔ میں نے مسعود کو اپنا حال لکھ بھیجا، اور یہ بھی لکھا کہ تم خود جاؤ، میری مجبوریوں سے تم اچھی طرح واقف ہو، سمیہ کو میرا پیام پہونچا دینا میں بہت جلد اس سے ملنے کی کوشش کروں گا۔ مسعود گیا اور آیا بھی، اس نے اپنے سفر کے واقعات بیان کئے اور سمیہ کے بھی، عید کے ایک دن پہلے وہ اپنے گھر پہونچا، اس کے گھر والوں نے اب کی دفعہ میرے نہ آنے پر اظہار

افسوس کیا۔ عید کی شام مسعود سمیہ سے ملنے کے لئے گیا، دور سے اس نے سمندر کے کنارے چٹان پر ایک لڑکی کو بیٹھے ہوئے دیکھا، وہ اسے پہچان نہ سکا، وہ کچھ بیمار سی دکھائی دے رہی تھی، اس کے گلابی گال خزاں دیدہ پتوں کی طرح زرد پڑ گئے تھے، اور آنکھوں کے گرد سیاہ گہرے حلقے، قریب جاکر اس نے پہچانا وہ سمیہ ہے۔ سمیہ نے غور سے مسعود کو دیکھا، اس کی زبان سے بے ساختہ نکل پڑا جعفری۔ جعفری ہندستان میں ہیں وہ نہ آسکے، ان کی والدہ بہت سخت بیمار ہیں، آہ۔ وہ نہ آسکے۔ اس عید کے دن بھی۔ سمیہ تم زیادہ رنج نہ کرو، وہ آئیں گے ضرور آئیں گے وہ تم سے ملنے کے لئے بہت زیادہ بے چین ہیں۔ ہاں آئیں گے مسعود بھیا میرے مرنے کے بعد، وہ ضرور آئیں گے، جعفری تم آؤگے ضرور آؤگے۔ میری نعش پر آنسو بہانے کے لئے، وہ چپ ہو گئی۔ شدت غم سے اس کی عجیب حالت ہو گئی تھی، عید کے دن اس نے کوئی اچھا لباس بھی نہ پہنا تھا ہچکیوں سے اس کا دم گھٹا جا رہا تھا، بے تابانہ وہ ریت پر گر پڑی۔ مسعود بھیا، اس نے کراہتے ہوئے کہا۔ میرا آخری پیام ان تک پہونچا دو۔

"سمیہ نے تمہارا انتظار کیا، اس سمندر کے کنارے چٹان پر، عید کے دن وہ تمہاری محبت میں جان سے گذر گئی، تم اسے معاف کردگے نا اب زیادہ انتظار کی تاب اس میں باقی نہ تھی، اس کی دلی آرزو ہے کہ تم اسے بھول جاؤ، اس نے خوشی خوشی اپنی جان دی، اس لئے کہ حشر کے دن وہ تم سے ضرور ملے گی'

غم نے اسے بالکل نڈھال کر دیا تھا، اس کا نازک سا دل پیہم حوادث کی تاب نہ لاسکا اور وہ .... ہمیشہ کے لئے روٹھ کر چلی گئی۔

کہا جاتا ہے کہ آج تک اس شہر میں اس طرح کا شاندار جنازہ کسی کا نہیں نکلا، سمندر کے کنارے جہاں سینکڑوں جہاز اس کے قریب سے گذرتے ہیں، ہر شخص کی آنکھیں اس کے مزار کے قریب کی تختی پر لکھے ہوئے حروف دیکھ کر نم آلود ہو جاتی ہیں۔ "اس نے عید کے دن اپنی جان دی اس سمندر کے کنارے چٹان پر۔ اس کی پاک روح خوبصورت پریوں کے ساتھ کھیل میں مصروف ہے وہ بہت خوش ہے کیونکہ وہ یہ جانتی ہے کہ حشر کے دن اپنے محبوب سے ضرور ملے گی"

صابر کوسگوی

چھاپہ خانہ

ایک فرانسیسی ماہر کا قول ہے کہ کسی ملک کی دماغی پیمائش خیالات کے ارتقا اور علوم و فنون کا صحیح اندازہ لوگوں کی زرق برق پوشاکوں اور عالی شان عمارتوں سے نہیں بلکہ وہاں کی تصنیف و تالیف اعلیٰ طباعت اور دیدہ زیب تصویروں اور اشکال سے کیا جاتا ہے۔

متمدن ممالک میں روزنامے، قدیم تصویریں اور نئے علوم کے انکشافات پر روز آنہ بیسیوں کتابیں شائع ہوتی رہتی ہیں، جن کی طباعت دیکھ کر آنکھوں میں نور اور دل میں سرور پیدا ہو جاتا ہے۔ پھر لطف یہ ہے کہ ہر نقشہ ہر تصویر اور ہر شکل اپنی نوعیت اور خصوصیت کے لحاظ سے ایک دوسرے سے مختلف کاغذ پر اور ایک دوسرے سے مختلف طریقوں پر چھپی ہوتی ہے! ہر ایک کا رنگ ایک دوسرے سے مختلف ہوتا ہے مگر بہ حیثیت مجموعی دیکھو تو ان میں یکسانی ہم رنگی اور ہم آہنگی پائی جاتی ہے۔

جب چھاپے خانے نہیں تھے تو کتابیں ہاتھ سے لکھی جاتی تھیں۔ وہ بہت قیمتی ہوتی تھیں۔ اس لئے ان سے صرف دولت مند لوگ ہی فائدہ اٹھاتے اور بے چارے غریب محروم رہ جاتے تھے۔ ٹائپ ایجاد ہونے کے بعد ہزاروں چھاپہ خانے کھل گئے، ہر جگہ طباعت ہونے لگی، گھنٹوں کا کام منٹوں میں انجام پانے لگا اور چھوٹا بڑا، امیر و غریب غرض یہ کہ ہر شخص علم کی دولت سے مالا مال ہو گیا۔ اس قسم کے چھاپے خانوں نے دوسرا بڑا احسان یہ بھی کیا کہ مصنفوں کو کاتبوں کے پنجے سے نجات دلا دی اور کتابوں کو غلطیوں سے پاک و صاف کر دیا۔

کاتبوں کی غلطیاں ضرب المثل ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ وہ کاتب ہی نہیں جو غلطی ہی نہیں بلکہ فاش غلطی نہ کرے۔ ان کے بعض واقعات نے تو لطیفوں کی شکل اختیار کر لی ہے۔ چنانچہ شیخ آذری کا مشہور واقعہ ہے کہ اس نے اپنا دیوان، اینائے کاتب سے لکھوایا۔ مکمل ہونے کے بعد دیکھا تو ہر جگہ غلطیاں پائیں۔ یہ دیکھ کر اسے بہت رنج ہوا اور یہ قطعہ کہہ کر اپنے دیوان کے آخر میں لکھ دیا۔

دیوان بندہ را کہ اینا سواد کرد	تنہا درونِ شعر مجدد نوشتہ است
در نظم و نثر ہر چہ بطبعش خوش آمدہ	دیوان بندہ پر ز خوش آمد نوشتہ است
ہر جا کہ لفظ بد مثلاً دید در سخن	دست تصرفش ہمہ را بد نوشتہ است
اکنوں شریک بہتر دیوانِ بندہ است	زیرا کہ بیشتر سخن خود نوشتہ است

یعنی میرا دیوان اینائے کاتب نے لکھا ہے اس میں نہ صرف اس نے اپنی طرف سے اشعار گھڑ گھڑ کر لکھ دیئے ہیں بلکہ نظم و نثر میں سے جو کچھ اس کو اچھا معلوم ہوا میرے دیوان میں بلا تکلف داخل کر دیا۔ مثلاً جس جگہ لفظ بد لکھا دیکھا اس کو ہر جگہ بد لکھ دیا ہے۔ مختصر یہ ہے کہ اب وہ میرے دیوان کا شریک غالب ہے کیونکہ اس میں زیادہ کلام اس کا ہی ہے۔

غرض یہ کہ کاتب اپنی دھن میں کچھ کا کچھ لکھ جاتا ہے۔ اگر کہیں شہر بئر ہے تو وہ شیر ببر لکھتا ہے اور اگر کہیں استغاثہ کا ذبہ لکھا ہے تو وہ اسے استنجہ کا ڈبہ لکھ دیتا ہے۔ اسی طرح آلو کی جگہ "الو" بابر کی جگہ "بابو" نشتر کی جگہ "نشو" اور انڈسٹریل کی جگہ "اینڈ سٹیل" لکھنا تو اس کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ بعض اوقات تو یہ لوگ

جوش میں آکر بڑے بڑے لوگوں کے نام بھی غلط لکھ جاتے ہیں' چنانچہ ایک جگہ لکھا تھا "مولانا شبلی" تو کاتب صاحب نے لکھا مولانا شبلی اور لطف یہ ہے کہ وہی کتاب میں بھی چھپ گیا اور بعض حلقوں میں یہ بحث چھڑ گئی کہ حقیقت میں مولانا کا اصلی نام مولانا شبلی تھا یا مولانا ستلی۔ اسی طرح ایک صاحب اپنی کتاب میں مولوی علی حیدر صاحب طبا طبائی کی اصطلاح سازی کی خدمات کا ذکر کرنا چاہتے تھے۔ کاتب نے اصطلاح سازی کو اصلاح سازی بنا دیا۔

مختصر یہ ہے کہ جہاں ٹائپ یا اس قسم کی دوسری طباعت رائج ہے وہاں یہ غلطیاں ہونا ناممکن ہیں۔ اگر کوئی انگریزی قسم کا چھاپہ خانہ دیکھو تو حیرت سے آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ جاتی ہیں۔ اس میں بیسیوں شعبے ہیں' بس یہ معلوم ہوتا ہے کہ دنیا بھر کے مختلف چھاپے خانے لاکر یہاں جمع کر دیے ہیں۔ آرٹسٹ' ایچر' انگریور' پروف ریڈر' کمپوزیٹر سب کے سب اپنے اپنے شعبوں میں سر جھکائے کام میں مصروف ہیں۔ آگے چلو تو لیتھو سیکشن ہے۔ اس میں فوٹو لیتھو' زنکو گرافی' ہیلیو زنکو' وینڈایک سسٹم اور کورو سسٹم پر کام ہو رہا ہے۔ دوسری طرف دیکھو تو ٹائپ کا شعبہ ہے' لائنو ٹائپ' انٹر ٹائپ اور مونو ٹائپ پر آپریٹر کام کر رہے ہیں۔ کہیں لائن بلاک' ہاف ٹون بلاک اور سہ رنگی بلاک تیار ہو رہے ہیں' کہیں فوٹو گریور (Photo gravure) اور روٹو گریور (Roto gravure) کی پلیٹیں تیار کی جا رہی ہیں' کہیں چاک پلیٹ پروسس سے کارٹون اور نقشے تیار ہو رہے ہیں' کہیں ویکس انگریونگ سے فوٹو کی پلیٹیں بنائی جا رہی ہیں' کہیں اسٹیریو ٹائپنگ ہو رہا ہے تو کہیں الیکٹرو ٹائپنگ سے بلاک تیار کئے جا رہے ہیں۔ یہ تمام پلیٹیں تیار ہوتی ہیں اور مشین روم میں طباعت کے لیے بھیج دی جاتی ہیں۔

اب ذرا مشین روم کی سیر کیجئے تو ہر نمونے کی مشینیں دیکھ لیجئے۔ پروف پریس' ہینڈ پریس (Hand press)' پلیٹین (Platin) اور ٹریڈل مشینیں برقی قوت سے چل رہی ہیں اور ان کی آواز سے کمرہ گونج رہا ہے۔ کہیں فلیٹ بیڈ مشین پر طباعت ہو رہی ہے تو کہیں آفسٹ مشینوں پر کام ہو رہا ہے۔ ایک طرف زبردست ملٹی کلر روٹری پریس ہے جہاں وقت واحد میں پورا کا پورا رسالہ چھپ جاتا ہے' وہیں مڑتا ہے' وہیں جزو بندی ہوتی ہے' وہیں کٹتا ہے اور وہیں سے سل کر مکمل حالت میں نکلتا ہے یہ سب کام مشینوں کے ذریعے انجام پاتا ہے اور کسی کو ہاتھ لگانے کی ضرورت نہیں پڑتی۔

مختصر یہ ہے کہ موجودہ زمانے میں جدید ترین آلات اور مشینوں سے بے حد تیزی اور کثرت سے طباعت ہو رہی ہے۔ کاغذ کی فراہمی کے لئے رات دن جنگل پر جنگل کٹتے چلے جا رہے ہیں' روزانہ سیکڑوں اخبار میگزین اور رسالے کروڑوں کی تعداد میں چھپتے ہیں' چھوٹے سے چھوٹے ٹکٹ سے لے کر بڑے سے بڑے پوسٹر ہماری نظر سے گزرتے ہیں مگر ہمیں خیال تک نہیں ہوتا کہ وہ کس طرح چھپتے ہیں۔ اس لئے طباعت کے مختلف طریقے اور ان کی تدریجی ترقی پر ایک سرسری نظر ڈالنی نہایت ضروری ہے جس سے چھاپے خانوں کی طباعت اور ان کے کاروبار کا ایک دھندلا سا خاکہ ہماری آنکھوں کے سامنے کھنچ جائے گا۔

عام طور پر طباعت تین قسم کی ہوتی ہے ایک تو ریلیف پرنٹنگ (Relief printing) یعنی ابھری ہوئی طباعت، دوسری انٹیلیو پرنٹنگ یعنی گہری طباعت اور تیسری سرفیس پرنٹنگ یعنی سطح سطح پر طباعت۔

ریلیف پرنٹنگ میں تحریر سطح سے ابھری ہوئی ہوتی ہے اور اس ابھری تحریر پر سیاہی لگا کر داب دیتے ہیں جس سے وہ تحریر چھپ جاتی ہے۔ اس میں متحرک ٹائپ، وڈ بلاک (Wood Block) لائن بلاک اور ہاف ٹون بلاک وغیرہ شامل ہیں۔ متحرک ٹائپ سے عام طور پر لوگ واقف ہیں۔ یہ چوکور ٹکڑے لکڑی کے ہوتے ہیں یا ایک خاص قسم کی دھات کے ہوتے ہیں جو سیسا، سرمہ، ٹین اور کچھ تانبا ملا کر بنائی جاتی ہے۔ ان کے سروں پر حروف یا ڈیزائن ڈھال لیا جاتا ہے یا کسی نوک دار چیز سے کاٹ کر ابھار لیا جاتا ہے۔ انگریزی اور نسخ ٹائپ کے نمونے عموماً اوسط درجوں کے چھاپے خانوں میں ہوتے ہیں اور فاؤنڈریوں میں ڈھالے جاتے ہیں۔ یہی وہ ٹائپ ہے جو متحرک ٹائپ کے نام سے مشہور ہے۔

کہتے ہیں کہ متحرک ٹائپ چینیوں نے ایجاد کیا تھا اور چھٹی صدی عیسوی میں وہ لوگ عام طور پر اسی ٹائپ سے طباعت کرتے تھے مگر چند روز کے بعد اس طریقہ طباعت کو انھوں نے ترک کر دیا اور بھول گئے۔ اب حالیہ دریافت سے معلوم ہوا ہے کہ ۱۴۵۰ء میں جان گوٹنبرگ نے بلا کسی علم و اطلاع کے از خود متحرک ٹائپ بنایا۔ یہ جرمنی کا مشہور و معروف کاریگر تھا۔ ابتدا میں اس نے لکڑی پر حروف کھود کر طباعت کی پھر لکڑی کے ٹکڑوں پر حروف تراشے اور اس کے بعد کسی خاص دھات کا ٹائپ بنا کر پہلی مرتبہ انجیل چھاپی۔ چند روز کے بعد یہ ٹائپ عام ہو گیا کچھ عرصہ کے بعد کیکسٹن (Caxton) نامی شخص نے انگریزی ٹائپ بنا کر ایک چھاپہ خانہ کھولا اور پھر سیکڑوں چھاپے خانے کھل گئے اور ہر جگہ ٹائپ کے ذریعے طباعت ہونے لگی۔

دوسرا طریقہ انٹیلیو پرنٹنگ یعنی گہری طباعت کے نام سے مشہور ہے یہ ریلیف پرنٹنگ کے بالکل برعکس ہے۔ اس میں تانبے یا فولاد کی سطح پر گریور کے ذریعہ تحریر یا نقش کھودتے ہیں۔ ان نقوش میں سیاہی بھر کر سطح کو بالکل صاف کر دیتے ہیں۔ پھر اس پر کاغذ رکھ کر دونوں کو لوہے کے بھاری سلنڈروں کے بیچ میں سے گزارتے ہیں۔ جب ان کھدے ہوئے مقاموں پر داب پڑتی ہے تو سیاہی اندر سے نکل کر کاغذ کی سطح پر بیٹھ جاتی ہے۔ اس طریقہ سے طباعت کرنے میں وقت بہت صرف ہوتا ہے اور اخراجات بھی زیادہ بیٹھتے ہیں۔ اس لیے بعض لوگ اسے فضول خرچی میں شمار کرتے ہیں مگر واقعہ یہ ہے کہ انٹیلیو پرنٹنگ دورِ حاضرہ کی تہذیب میں داخل ہو گئی ہے۔ جو خوبصورتی اور نزاکت اس میں پائی جاتی ہے وہ کسی اور طریقے سے لاغیر ممکن ہے۔ حروف سطح سے اس طرح ابھرے رہتے ہیں کہ گویا کاغذ پر موتی جڑ دیئے ہیں۔

انٹیلیو پرنٹنگ سے صرف وزیٹنگ کارڈ اور مونوگرام ہی نہیں چھاپے جاتے بلکہ تقریباً تمام جمالیاتی طباعتی فنی اور نمائشی کام آج کل اسی طریقے سے چھاپا جا رہا ہے۔ چنانچہ شادی کے رقعے، دعوتی کارڈ، شاہی فرمان، سرکاری اعلان

ویڈنگ ہوم کے کارڈ، بینک نوٹس، چیک، مراسلات کی پیشانیاں ٹائیٹل پیج اور کرسمس کارڈ وغیرہ کی اسی طریقے سے طباعت کی جا رہی ہے۔

ابتدا میں تصویریں وغیرہ بھی تانبے پر کھود کھود کر چھاپتے تھے مگر ۱۸۲۷ء میں اور نیپفور (Nieep hore) نے میکانی طور پر پلیٹ بنانے کی کوشش کی پھر تیس سال کے بعد ٹالبیٹ (Talbot) نے جیلیٹن اور پوٹاشیم بائی کرومیٹ کے خواص معلوم کرکے تصویر، راست پلیٹ پر منتقل کی اور آئرن پر کلورائڈ سے کھود کر پلیٹ تیار کر لی۔ یہ طریقہ فوٹو گریور (Photo gravure) کے نام سے مشہور ہے اور بعض چھاپے خانوں میں اب تک بجنسہٖ اسی طرح رائج ہے۔

فوٹو گریور سے چھپی ہوئی تصویروں میں حسن کا تاثرات اور مصورانہ شان پائی جاتی ہے۔ تصویر کے خد و خال اور ہائی لائٹ اور شیڈ کی کیفیت دیکھنے کے قابل ہوتی ہے۔ مندرجہ بالا طریقہ پر پلیٹ تو بہت جلد تیار ہو جاتی تھی مگر اس کے چھاپنے میں بڑی دقتیں اٹھانی پڑتی تھیں یعنی دن بھر میں تقریباً تین سو یا چار سو کاپیاں طبع ہوتی تھیں اس لئے اسے تجارتی اصول پر چلانے کے لئے ایک اور طریقہ ایجاد کیا گیا جس سے اب چار ہزار کاپیاں فی گھنٹہ طبع ہو جاتی ہیں، یہ طریقہ روٹو گریور (Roto gravure) کے نام سے مشہور ہے۔

اسی طریقے سے اخبار، میگزین، مصور ماہنامے، پوسٹر، فہرستیں، اشتہارات، پوسٹ کارڈ، سادے کام، رنگین کام غرض یہ کہ جو کچھ فوٹو گریور اور ہاف ٹون وغیرہ کے ذریعہ طبع ہو سکتا ہے وہ تمام کام نہایت حسن و خوبی کے ساتھ، جامہ اور سستے داموں میں طبع کیا جا سکتا ہے۔ پھر بڑی بات یہ ہے کہ ٹائپ میٹر، تصویریں اور اشکال سب کے سب ایک ہی سلنڈر پر منتقل کر کے ایک ساتھ ہی چھپ جاتی ہیں۔

تیسرا طریقہ سرفیس میتھڈ یا پلینو گرافی کے نام سے مشہور ہے۔ اس میں لیتھو گرافی، ہیلیو ٹیفیو گرافی اور کولو ٹائپ وغیرہ شامل ہیں۔

لیتھو گرافی سے مطلب پتھر پر لکھنے یا پتھر کے ذریعہ چھاپنے کے ہیں اس طریقہ طباعت کو ۱۷۹۶ء میں الائے سنفیلڈر نے معلوم کیا تھا۔ الائے سنفیلڈر بوہیما کے پایۂ تخت پراگ میں پیدا ہوا تھا۔ اس کی طبیعت کا رجحان زیادہ تر علم موسیقی کی جانب تھا۔ وہ ہمیشہ اس جستجو میں رہتا تھا کہ اپنی نظموں کو کسی آسان طریقہ سے چھاپ کر پبلک میں پیش کرے۔ چنانچہ اس نے بجائے جست کے پتھر پر طباعت کا کام شروع کیا۔

پہلے اس نے تحریر کو پتھر کی سطح پر کھودی جس طرح مہریں یا ڈائیاں کھودتے ہیں۔ پھر اس نے تیزاب کی مدد سے اس طرح کھودا جس طرح لکڑی کے چھاپوں پر نقش ابھرے ہوئے رہتے ہیں۔ اور چند روز کے بعد اسے یہ پتا چل گیا کہ تحریر پتھر کی ہموار سطح پر بھی چھپ سکتی ہے نہ تو حرفوں کو کھودنے کی ضرورت ہے اور نہ انھیں ابھارنے کی حاجت۔

اب دیکھو تو پتھر کی سطح پر حرف لکھا ہوا نظر آتا ہے۔ چھاپتے وقت ایک شخص پتھر کی سطح کو پانی کا پچارا دے کر تر کر دیتا ہے، دوسرا سیاہی کا بیلن پھیر دیتا ہے۔ تیسرا کاغذ جما کر پریس چلا دیتا ہے اور اس طرح کتابت چھاپا چلا جاتا ہے

جب چھاپے کی کامیابی اس نوبت پر پہنچی تو سنیفلڈر نے ۱۸۰۰ء میں جرمنی، آسٹریلیا اور انگلینڈ میں اپنے حقوق محفوظ کرا دئے، پھر تو دن دونی اور رات چوگنی ترقی ہونے لگی۔ انیسویں صدی کے آخری دور میں فوٹو لیتھوگرافی کے ذریعے طباعت ہونے لگی۔ رنگین تصویریں چھپنے لگیں، پتھری دور ختم ہوا اور چھاپے خانوں میں بجائے پتھر کے جست اور ایلومینیم کی چادریں استعمال ہونے لگیں، لکڑی کے پریس جلا دیئے گئے، اور اسٹیم سلنڈر پرنٹنگ پریس نے طباعت کی دنیا میں ایک بجلی کی لہر دوڑا دی۔

آج کل ہر قسم کی طباعت میں یورپ کے چھاپے خانے برابر ترقی کرتے چلے جا رہے ہیں مگر یقیناً اس مختلف طباعتوں کے موجد یعنی گٹنبرگ، کیکسٹن، نیسی فر، البرٹ اور سنیفلڈر وغیرہ آجائیں اور کسی اچھے چھاپے خانے کا مشاہدہ کریں تو یقین ہے کہ وہ خود اپنی ایجادوں کو بھول جائیں گے اور جن طریقوں سے آج کل چھپائی ہو رہی ہے اس کو نئی ایجاد تصور کرنے لگیں گے۔

مرزا عصمت اللہ بیگ

(اکاسکی نشر گاہ حیدرآباد سے نشر کیا گیا)

اقبال نمبر

اس نمبر میں شاعر مشرق علامہ اقبال مرحوم کی حیات اور کلام کے مختلف پہلوؤں کو واضح کیا گیا ہے۔ اقبال کی شاعری اور فلسفہ کو مختلف اہل قلم نے نہایت تحقیق اور محنت سے واضح کیا ہے۔ بڑے بڑے شاعروں کی نظمیں اقبال سے متعلق شائع کی گئی ہیں۔ بین الاقوامی شہرت رکھنے والے حضرات کے بیانات بھی شامل ہیں۔ حیدرآباد میں یوم اقبال کے مضامین کا اقتباس بھی دیا گیا ہے۔

اقبال کے بعض اشعار کو مصور بھی کیا گیا ہے۔ خان بہادر عبدالرحمن چغتائی نے اقبال کی ایک رباعی کو اپنے مخصوص اندازِ حسن کاری میں مصور کیا ہے۔ خاص کر اقبال کی ایک نایاب تصویر شائع کی گئی ہے جس میں اقبال اپنے اصلی رنگ میں جلوہ گر ہیں۔ اس تصویر کی سارے ہندوستان میں دھوم مچ گئی۔ اکثر رسائل نے سب رس سے مستعار لے کر اس کو شائع کیا ہے۔

کتابت طباعت وغیرہ نہایت نفیس اور علامہ اقبال کے شایانِ شان۔

تعداد صفحات (۱۶۸) تعداد تصاویر (۷) قیمت ۸ آنہ

ایک دن ہمارے ایک پڑوسی کچھ عجب صورت بنائے، منہ لٹکائے، آنکھوں میں آنسو بھرے، وحشت زدہ ادھر اُدھر دیکھتے

"حیراں ہوں دل کو روؤں کہ پیٹوں جگر کو میں
مقدور ہو تو ساتھ رکھوں نوحہ گر کو میں"

گنگناتے ہوئے ہمارے گھر قدم رنجہ ہوئے اور اپنی "پریشانی خاطر" سنا کر ہم سے مشورہ مانگنے لگے۔

واقعات یہ ہیں کہ موصوف کا بیاہ ہو کر پونے نو سال ہوتے ہیں، اس مدت میں آپ کو صرف پون درجن بچے ہوئے جن میں دو لڑکے اور سات لڑکیاں ہیں، یہ سب کے سب بفضلہ تعالیٰ زندہ ہیں۔ آپ کی آمدنی کی تفصیل یہ ہے کہ تنخواہ تو دو ڈھائی سو روپے سے "زیادہ" نہیں ہے مگر "بالائی آمدنی" معقول ہوا کرتی ہے، افسوس ہے کہ اس آمدنی میں کچھ عرصہ سے غیر معمولی کمی ہوتی جا رہی ہے، یہ غالباً ملک کی اقتصادی پستی کا سبب ہے، جہاں کسی معاملہ میں ہزاروں ملا کرتے تھے اب سیکڑوں پر نوبت آ گئی ہے، اس کمی کا آپ کے بجٹ پر خاص اثر پڑا ہے اور آمد و خرچ کا توازن بگڑ گیا ہے اس سلسلہ میں آپ کی بیگم کے مزاج کا توازن بھی بگڑتا جا رہا ہے، اور وہ بہت تلون مزاج ہوتی جا رہی ہیں، ان کے غصہ کا پارہ ایک سو دس ڈگری تک پہنچ گیا ہے، کبھی آپ کو دفتر میں دیر ہو جائے یا راستہ میں کسی دوست کے پاس ٹھیر کر دیر سے گھر آئیں تو ایسی موسلا دھار برس پڑتی ہیں کہ ساون بھادوں کا مینہ بھی مارے شرم کے پانی پانی ہو جاتا ہے، گرجنے کڑکنے اور برسنے کے علاوہ آپ کے آستین و گریبان کی بھی خیر نہیں!! اس تقریب میں آپ کے ایک دو قمیص ہر ہفتہ شوز صاف کرنے اور برتن پونچھنے کے کام آتے ہیں آپ کے جسم پر بعض جگہ زخموں کو دیکھ کر بیساختہ زبان پر آتا ہے۔

نظر لگے نہ کہیں ان کے دست و بازو کو!

خیر آپ کی "تواضع" تو اسی طرح ہوتی رہے گی کیونکہ آں محترمہ کی عادت تو چھوٹنے سے رہی! مگر اب سوال موصوف کے آمد و خرچ کے توازن کو برابر کرنے کا ہے!! خرچ جو اب تک ہوتا رہا ہے وہ تو کم ہونے سے رہا! اور "وضعداری" بھی یہی ہے کہ خرچ کو گھٹا کر اپنے ہم چشموں میں ذلیل نہ ہوں۔ اس کے علاوہ جیسے جیسے بچے بڑے ہوں گے خرچ بھی اللہ رکھے بڑھتا جائے گا اس لئے بڑے سوچ بچار کے بعد ہم نے موصوف کی خدمت میں یہ رائے پیش کی ہے کہ آپ کسی ایسے دفتر میں اپنا تبادلہ کرائیں جہاں "بالائی آمدنی" آپ کے بڑھتے ہوئے اخراجات کی کفیل ہو سکے تاکہ آمد و خرچ کے توازن کے ساتھ آپ کی بیگم صاحبہ کے مزاج کا توازن بھی برقرار رہے، تبادلہ کی کارروائی میں "دو چار ہزار صرف کرنے پڑیں تو کوئی مضائقہ نہیں، برس چھ مہینے میں اتنی رقم آپ مع سود حاصل کر سکتے ہیں۔

موصوف قسم کھا کر کہتے ہیں کہ آں محترمہ کے گلے پڑنے سے پہلے "بالائی آمدنی" کو آپ حرام کی کمائی سمجھتے تھے اور اب بیگم کی نت نئی خواہشوں اور آپ کی فرماں برداریوں نے حلال و حرام میں امتیاز باقی نہیں رکھا،

اس کے ساتھ ساتھ آپ کا یہ بھی خیال ہے کہ گھر کی "برکت" اور دل کا "چین" دونوں رفوچکر ہوگئے ہیں۔

بیاہ کے بعد دو چار مہینے تک آپ کا بیان ہے کہ آپ کا غریب خانہ ان کے دم قدم سے رشک ارم بنا رہا اور آپ کے گھر میں واقعی "بہار" آئی ہوئی تھی مگر بے تکلفی شروع ہوتے ہی آپ کی "شامت" آگئی اور وہ اپنے اصلی روپ میں جلوہ گر ہوگئیں! جس طرح "لال مرچ" دیکھنے میں نہایت حسین ہوتی ہے مگر ذرا منہ لگائیے تو بس خدا یاد آجاتا ہے!! بالکل اسی طرح وہ بھی نکلیں!!! دیکھنے میں نہایت بھولی بھالی، صورت دیکھ کر فرشتے یاد آتے تھے اور جی چاہتا تھا۔

اس کو بٹھا کے سامنے یاد خدا کروں!!!

مگر شادی اور ہٹ کی اس قدر بگڑی کہ خدا کی پناہ! بموجب "کانا چا" "بچپن" جب یاد آتا ہے تو فرماتے ہیں کہ سینہ پر الٹے سانپ لوٹ جاتے ہیں، اس وقت وہم و گمان بھی نہ تھا کہ کسی دن آپ کا بھی بیاہ ہوگا اور ایسی "لال مرچ" صفت بیوی سے پالا پڑے گا! جب آپ کو اسی عہد سیمنت عہد کا خیال آتا ہے تو زبان سے بے اختیار نکل جاتا ہے!

"وہ بھی کیا دن تھے کہ بیوی گھر میں جب آئی نہ تھی
رنج سے واقف نہ تھے غم سے شناسائی نہ تھی"!!

باغباں

فن تقریر

ادارہ نے فن تقریر سے متعلق ایک نہایت مفید کتاب شائع کی ہے جو چند ابواب اور تقریباً سو صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں جگہ جگہ تصویریں بھی شامل ہیں جن کی مدد سے تقریر کرتے وقت ٹھیک طور پر کھڑے ہونے اور حرکات و سکنات کے سلسلے میں مفید معلومات حاصل ہوتی ہیں اردو زبان میں یہ پہلی کتاب ہے۔ طلبار کے فائدے کے لئے اس کی قیمت بہت ہی کم رکھی گئی ہے۔

قیمت ۸ر

نئی کتابیں

۱۔ مضامین نہرو مرتبہ آنند نرائن ۲۵۴ صفحات قیمت عالہ۔ انڈین پریس۔ الٰہ آباد۔
۲۔ مختصر تاریخ ادب اردو (دوسرا ایڈیشن) مرتبہ پروفیسر اعجاز حسین ۲۰۰ صفحات قیمت عالہ انڈین پریس آلہ آباد۔
۳۔ اسلام کا اقتصادی نظام از محمد حفیظ الرحمٰن ۲۶۴ صفحات قیمت عہ ندوۃ المصنفین۔ دہلی۔
۴۔ باغ دلکش (مجموعہ کلام) از سید مسعود حسن محمود ۸۰ صفحات حشر بکڈپو۔ ملتان
۵۔ گلبانگ آزادی (رباعیات) از نہال سیوہاروی ۵۷ صفحات قیمت ۸ر مکتبہ برہان۔ دہلی۔
۶۔ پیام کیف (مجموعہ کلام) از مرزا احسان احمد احسان وکیل قیمت عہ از مصنف۔ اعظم گڑھ۔
۷۔ رہنمائے تاریخ اسعد (تاریخ گوئی کے اصول) از محمد عبدالقادر وکیل قیمت ۱۲ر از مصنف بنارس۔
۸۔ تحفۂ ربیع الاول (اسلامی تعلیم) از محمد بدرالدین خاں ۱۶۰ صفحات قیمت ۸ر بیگم بدرالدین خاں سب جسٹرار دربھنگہ۔ بہار۔
۹۔ ہندوستانی تہذیب کی تکمیل (مجموعہ تقاریر) از کالیداس کپور قیمت ۸ر نولکشور پریس۔ لکھنؤ۔
۱۰۔ اصول تجارت (تجارت کے اصول) از لالہ نرنجن داس قیمت ۸ر از مصنف گوجرانوالہ۔ پنجاب۔
۱۱۔ آفتاب رسالت (منظوم سیرت) از راؤ بہادر حاجی عبدالحمید خاں منظر ۱۳۰ صفحات قیمت ۸ر حشر بکڈپو۔ ملتان
۱۲۔ سنکلپ ودشن (صحت کے سوال) از پروفیسر جگدیش متر ۲۰۸ صفحات قیمت عہ سنموہنی آشرم۔ لاہور
۱۳۔ خیابان البشیر (احوال سید البشیر) مرتبہ ہمدرد بکڈپو ۵۵۲ صفحات قیمت سے ہمدرد بکڈپو۔ نیو مارکٹ۔ بنگلور سٹی۔
۱۴۔ شہنشاہیت (شہنشاہی کا آغاز اور اس کا ارتقار) از مظفر شاہ خاں ظفر ۲۰۰ صفحات قیمت عہ ندوۃ المصنفین دہلی۔
۱۵۔ اخلاق اور فلسفہ اخلاق از حفیظ الرحمٰن ۳۴۵ صفحات قیمت للعہ ندوۃ المصنفین۔ دہلی۔
۱۶۔ چار فن (کپڑوں کی دھلائی اور صفائی وغیرہ) مرتبہ راجستان ٹریڈنگ کمپنی قیمت عہ از مرتب۔ فرنگ۔ لاہور۔
۱۷۔ نازیت (نازیت کی تشریح) از شاہد حسین رزاقی قیمت عہ۔ مکتبہ جامعہ دہلی۔
۱۸۔ نئے افسانے از سید حسن ریاض قیمت عہ " " "
۱۹۔ درو انبساط (مجموعۂ کلام) از عبدالودود ودود بریلوی قیمت عہ " "
۲۰۔ آسمانی گھڑی (سورج اور چاند سے وقت معلوم کرنے کے طریقے) قیمت ۴ر مکتبہ جامعہ دہلی۔
۲۱۔ یورپ، مہابھارت (موجودہ جنگ کے حالات) از حامد علی ایم اے ۱۴۴ صفحات قیمت عہ از مصنف اردو کلب جامع مسجد بلد
۲۲۔ ترقی کی پہلی سیڑھی (تجارت کے اصول) از ایس اے خالق ۴۳ صفحات از مصنف اردو کلب۔ دہلی
۲۳۔ تعلیمات اقبال از یوسف سلیم ۲۰۶ صفحات قیمت عہ اقبال اکیڈیمی لاہور
۲۴۔ رہنمائے وراثت از قاضی میران بخش قیمت عہ از مولف۔ نائب تحصیلدار۔ ڈیرہ اسمٰعیل خان
۲۵۔ نئی پود (کہانیاں) از ازہر قدوائی۔ شرکت ادبیہ۔ دہلی۔

مرزا سیف علیخاں

فیصلہ شعبہ کے بڑھتے ہوئے کاموں کے باعث نظم مجلس عاملہ کی رکنیت میں اضافہ کی رائے ہوئی۔ محترمہ بلقیس بانو صاحبہ کا نام رکنیت کے لئے تجویز ہوا اور یہ طے پایا کہ ان سے استدعا کی جائے۔

شاخ کلیانی

کلیانی کی شاخ کے معتمد صاحب نے حسب ذیل روئداد روانہ کی ہے:

صدر ادارہ کے منشا کے مطابق عالیجناب نواب صاحب بہادر کلیانی کے زیر صدارت تقسیم اسناد کا جلسہ منانے کا خیال ایک عرصہ سے تھا اگر چونکہ نواب صاحب ممدوح کلیانی میں تشریف نہیں رکھتے تھے اس لئے یہ خیال جلد عمل میں آ نہیں سکا، یہ مبارک ساعت آگئی۔ شاخ کے معروضہ کو جو جلسہ کی صدارت سے متعلق تھا نواب صاحب بہادر نے شرف قبول بخشا۔ یہ جلسہ بتاریخ ۲۸ مارچ ۱۹۴۱ء یوم جمعہ بوقت ۵ ساعت شام بمقام مدرسہ وسطانیہ منایا گیا جس میں شرکاء کا خاصہ اجتماع تھا ابتداء تلاوت کلام مجید سے کی گئی اس کے بعد معتمد شاخ نے رپورٹ پڑھ کر سنائی۔ گلپوشی کے بعد نظموں کا سلسلہ شروع ہوا جس میں مولوی مرزا محمد بیگ صاحب مرزا، مولوی سجاد حسین صاحب جاہل، مولوی غلام معین الدین صاحب معین اور شیخ صالح صاحب صبیح نے اردو کے عنوان پر اپنے خیالات کا اظہار فرمایا۔ مولوی تمیز الدین صاحب نے تاریخ اردو پر ایک مضمون سنایا اور حمید الدین صاحب متعلم اردو عالم نے خوش الحانی سے ایک نظم پڑھی۔ آخر میں معتمد شاخ نے بطور عقیدت عالی جناب نواب صاحب بہادر کی شان میں ایک قصیدہ سنایا۔ نواب صاحب بہادر نے بنفس نفیس اسناد تقسیم فرما کر کامیاب طلبہ کو سرفراز فرمایا۔ چائے نوشی کے بعد جلسہ برخاست ہوا۔

شاخ ادارۂ ادبیات کلیانی کا یہ جلسہ ہر طرح کامیاب رہا۔ اس کو کامیاب بنانے میں مولوی غلام معین الدین صاحب معین، مولوی خیر الدین صاحب مولوی قاضی الدین صاحب، مولوی تمیز الدین صاحب اور مولوی محسن علی صاحب نے بطور خاص حصہ لیا۔ رپورٹ کا اقتباس ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

محترم صدر، حاضرین جلسہ!

آج کا دن ادارۂ ادبیات اردو شاخ کلیانی کی زندگی میں ایک یادگار اور مسعود دن ہے کہ اس کے جلسۂ تقسیم اسناد کی صدارت ہمارے آقائے محترم عالیجناب نواب سید محمد جلال الدین حسین خان بہادر دام اقبالہٗ والی اسٹیٹ کلیانی فرما رہے ہیں جن کی ذات مرکز کمالات و مصدر فیوض و برکات ہے۔

قبل اس کے کہ میں شاخ کلیانی کی کارگزاریوں کا اجمالی تذکرہ آپ کے گوش گزار کروں یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ صدر ادارۂ ادبیات اردو سے بھی آپ کو متعارف کرایا جائے کہ وہ کیوں اور کب عالم وجود میں آیا اور اس کے قیام کے اغراض و مقاصد کیا ہیں! اور اس نے اب تک کیا کام کئے، اگرچہ یہ داستان طویل ہے مگر یہاں صرف اشارتاً چند اہم واقعات کا اظہار کیا جاتا ہے۔ بمصداق

قیاس کن ز گلستان من بہار مرا

ادارۂ ادبیات اردو ۱۹۳۱ء میں عالم وجود میں آیا اور اس کا قیام جناب ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور ایم اے۔ پی ایچ۔ ڈی لنڈن کا رہین منت ہے آپ نے چند دردمند علم دوست اور اردو پرست حضرات کے تعاون سے اس کی طرح اندازی کی جن کے اسماء حسب ذیل ہیں:

(۱) مولوی عبدالمجید صدیقی ایم اے۔ ال ال بی

(۲) مولوی عبدالقادر صاحب سروری ایم اے۔ ال ال بی

(۳) مولوی عبدالقادر صاحب صدیقی ایم اے شعبۂ دینیات۔

(۴) مولوی نصیر الدین صاحب ہاشمی منشی فاضل۔

(۵) ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور ایم اے پی ایچ ڈی لنڈن معتمد اعزازی۔

یہ ادارہ بالکل غیر سیاسی اور خالص علمی و ادبی اغراض لے کر میدان عمل میں آیا ہے یہی وجہ ہے کہ اس کے سرپرستوں میں ملک کے

جلیل القدر ہستیاں شامل ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس ادارہ نے مختصر وقت میں ایک قلیل مدت میں وہ کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں اور وہ علمی خدمت کی ہے کہ کسی اور قومی ادارہ کو یہ سعادت حاصل نہ ہو سکی۔

اس کے سرپرست اعلیٰ ہز ہائنس والاشان نواب میر حمایت علی خاں اعظم جاہ بہادر شہزادہ برار و سپہ سالار افواج آصفیہ ولیعہد سلطنت آصفیہ ہیں۔ دیگر سرپرستوں میں حسب ذیل مقتدر ہستیوں کے اسماء شامل ہیں۔

(۱) رائٹ آنریبل ڈاکٹر سر اکبر حیدری نواب حیدر نواز جنگ بہادر صدر اعظم باب حکومت۔

(۲) عالیجناب نواب میر یوسف علی خاں بہادر سالار جنگ ثالث سابق صدر المہام سلطنت آصفیہ۔

(۳) عالیجناب نواب معین الدین خاں اعانت جنگ معین الدولہ بہادر امیر پائیگاہ۔

(۴) عالیجناب راجہ شام راج راجونت بہادر سابق صدر المہام تعمیرات دولت آصفیہ۔

ادارہ کی مجلس انتظامی، معاونین و رفقار وغیرہ میں ایسے ایسے صاحبان علم و فضل شریک ہیں جن سے ادارہ کا دامن ادبی دولت سے مالا مال ہو رہا ہے ان کے اسماء کی فہرست باعث تطویل ہے اس لئے نظر انداز کی جاتی ہے۔

ادارہ کے اغراض و مقاصد حسب ذیل ہیں

(۱) اردو زبان اور ادب کی ترویج و حفاظت۔

(۲) سرزمین دکن میں اردو زبان اور ادب کا صحیح مذاق پیدا کرنا۔

(۳) نوجوانان ملک میں انشاء پردازی اور شاعری کا صحیح ذوق پیدا کر کے تصنیف و تالیف میں رہبری اور مدد کرنا۔

(۴) عوام میں اردو کی تعلیم اور مطالعہ کا شوق پیدا کرنا اور اس کے لئے ضروری وسایل اختیار کرنا۔

(۵) اردو کو مختلف علوم و فنون سے روشناس کرنا۔

(۶) تاریخ دکن کی خدمت اور ملک کے تاریخی و ادبی آثار کی حفاظت۔

(۷) ایک ایسا مکمل کتب خانہ قایم کرنا جس میں اردو کی بالعموم اور خاص طور پر دکن کی تمام تحریریں اور آثار محفوظ ہو سکیں۔

ادارہ نے اپنے کام کو بہ لحاظ سہولت مختلف شعبوں میں تقسیم کر دیا ہے اور ہر شعبہ ایک معتمد اور چند اراکین پر مشتمل ہے۔ فی الوقت ۱۲ شعبے قایم ہیں اور ہر شعبہ برابر مصروف عمل ہے اور اپنے مفوضہ کام کو دلچسپی سے انجام دیتے ہوئے ٹھوس اور علمی سرمایہ فراہم کرتا جا رہا ہے۔

میں تفصیلات میں جانا نہیں چاہتا صرف شعبۂ امتحانات کی حد تک مختصراً بحث کروں گا۔ کیونکہ آج کا جلسہ انہی امتحانات کے نتائج کے سلسلہ میں انعقاد پذیر ہوا ہے۔

"اردو زبان اور ادب کی حفاظت، بقا اور ترقی کے سلسلہ میں ضروری ہے کہ اردو مطالعہ کا ذوق عام کیا جائے اور ان مسن لوگوں یا نوجوانوں کے لئے جو کسی جامعہ یا سرکاری ادارہ کی زبان اردو کی تعلیم سے بہرہ مند نہیں ہو سکتے ایسے نصاب اور امتحانات مقرر کئے جائیں جن کی پابندی اور شرکت سے وہ اپنی اردو قابلیت اور ادبی ذوق کی تکمیل ایک باضابطہ معیار کے مطابق کر سکیں۔"

اسی مقصد کے تحت ادارہ ادبیات نے دیگر شعبوں کے ساتھ امتحانات کا شعبہ بھی قایم کر رکھا ہے جو بلا تفریق مذہب و ملت امیدواروں کا امتحان لیتا اور کامیابوں کو اسناد عطا کرتا ہے۔ اس شعبہ کے تحت فی الحال حسب ذیل امتحانات قایم کئے گئے ہیں۔

(۱) اردو دانی (۲) اردو عالم (۳) اردو فاضل [illegible] (۴) منشی

(۵) خطاطی و کتابت۔

ادارہ کی جانب سے جب امتحانات کا اعلان ہوا تو ملک نے اس کا پرجوش خیر مقدم کیا۔ طلبا نے اس میں شرکت کی۔ اخبارات نے اس پر مبسوط افتتاحیات سپرد قلم کئے اور دیگر اکابرین ملک نے اس کی افادی حیثیت کو تسلیم کرتے ہوئے زرین آرا کا اظہار کیا۔

صدر ادارہ کی اس مختصر روداد کے بعد اب شاخ کلیانی کی مجملاً آپ بیتی بیان کی جاتی ہے۔ اس شاخ کی اساس کا سہرا مولوی عبدالکریم صاحب مدرس کے سر ہے جنھوں نے اپنے رفقائے کار مولوی غلام معین الدین صاحب معین اور مولوی تاج الدین صاحب مدرس انجمن اور مولوی خیر الدین صاحب خیر کی معیت میں اس کی داغ بیل ماہ دے ۱۳۴۹ف میں ڈالی۔ یہ حضرات حتی المقدور شاخ کی خدمت کر رہے ہیں اور اس کی ترقی کا بے پناہ جذبہ اپنے سینہ میں موجزن پاتے ہیں۔ چنانچہ یہی جذبۂ عمل اور اردو پرستی تھی کہ یہاں آج ایک مدرسۂ شبینہ اور ایک دار المطالعہ شاخ کی جانب سے قائم ہے۔

الغرض امیدواروں کو امتحانات ۱۳۴۹ف میں شریک کیا گیا اور انھیں مفت تعلیم دی گئی چنانچہ امتحان اردو عالم میں (۹) شریک اور (۵) امیدوار کامیاب ہوئے امتحان اردو دانی میں (۳۲) شریک اور (۲۷) کامیاب ہوئے۔

چونکہ امیدواروں کو کافی تعداد میں شریک امتحان کیا گیا تھا اس لئے کلیانی کو ہی مرکز امتحان قرار دیا گیا جس کی وجہ سے امیدوار سفر حیدرآباد کے مصارف سے بچ گئے۔ سال حال میں بھی یہی سلسلہ بدستور جاری ہے علم دوست حضرات سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ اپنے متعلقین کو اس میں شریک کرا کر اردو کی توسیع و ترقی میں شامل ہوں اور ملک سے بے علمی کی جہالت کو دور کرتے ہوئے خواندہ اشخاص کی تعداد میں اضافہ کا موجب بنیں۔

یہ امر شاخ ہذا کے لئے موجب طمانیت ہے کہ امسال کے انتظام پر پروفیسر عبد المجید صدیقی نے جو بحیثیت معتمد نگران امتحانات کلیانی تشریف لائے تھے اظہار استحسان فرمایا۔ موصوف کی سفارش پر صدر ادارہ نے شاخ کے مطالعہ کے لئے اپنی مطبوعات کی ایک کثیر تعداد بلا قیمت مرحمت فرمائی یہ کتب دار المطالعہ میں رکھی گئی ہیں۔

آخر میں شاخ ہذا کی جانب سے حضرت سرکار فیض آثار نواب صاحب بہادر کی بارگاہ علم پرور میں صدارت کی قبولیت اور کارکنان شاخ کی عزت افزائی کا بہ صمیم قلب شکریہ ادا کرتا ہوں جن کے ورود مسعود سے یہ جلسہ بہمہ وجوہ کامیاب ثابت ہوا جناب مولوی احمد حسین صاحب تعلقدار صدر شاخ ہذا اور جناب مولوی سید سبط نبی صاحب منصف عدالت و دیگر عہدہ دار بھی مستحق تشکر ہیں جن کی نگاہ الطاف سے شاخ بہرہ مند ہو رہی ہے۔

رپورٹ کے اختتام سے قبل میں پھر باشندگان کلیانی کی خدمت میں التماس کروں گا کہ وہ اس شاخ کی امداد و اعانت سے دریغ نہ فرمائیں گے کیونکہ یہ انہی کے فلاح و بہبود کے لئے قائم کی گئی ہے۔

شاخ پربھنی | پربھنی کی شاخ کے معتمد صاحب نے حسب ذیل روداد روانہ کی ہے۔

ادارۂ ادبیات اردو شاخ پربھنی کا ایک جلسہ زیر صدارت مولوی عارف الدین حسن صاحب مہتمم آبکاری ضلع پربھنی مارکٹ پویلین ہال میں منعقد ہوا۔

حمید اللہ خاں صاحب شیدا معتمد شاخ پربھنی نے ایک مختصر تقریر کے بعد یہ تحریک پیش کی کہ ادارہ ادبیات اردو شاخ پربھنی کے جو طلبا و اراکین اپنے لئے ایک خاص قسم کا امتیاز [illegible]

تجویز کی تائید کی۔

مولوی عبدالرزاق صاحب فاروقی نے اس کی پرزور تائید کرتے ہوئے کہا کہ اس کو عملی جامہ پہنانا چاہیے۔ جس کی تائید مولوی وجاہت علی صاحب نے فرمائی۔ اور کہا کہ اگر بلدی شاخ والے اس کی بنا رہوگی تو اس کا سہرا شاخ پرنبی کے سر ہوگا۔ آخر میں جناب صدر مولوی عارف الدین حسن صاحب نے طلبا کے جذبات اور جوش کی ستائش کرتے ہوئے اس تحریک کو منظور فرمایا۔ اور کہا کہ اس تحریک کو صدر ادارہ میں روانہ کیا جائے۔ تاکہ وہ ایک ایسا نمونہ تجویز کرے کہ جس کو ہر شاخ کے طلبہ اختیار کریں۔ اس کے بعد جناب صدر نے نصیحت کی کہ علمی کام میں زیادہ حصہ لو اور طلبہ کو زیادہ تعداد میں شریک کرو۔ ساڑھے نو بجے شب جلسہ برخواست ہوا۔

شاخ کشنگی کا جلسہ تقسیم اسناد

ادارہ ادبیات اردو شاخ کشنگی کا ایک غیر معمولی جلسہ تقسیم اسناد بہ صدارت عالیجناب پنڈت بلونت راؤ صاحب گھاٹے بی اے ایل ایل بی منصف تعلقہ کشنگی بتاریخ ۱۰ خورداد ۱۳۵۰ف بمقام جوبلی ہال منعقد ہوا۔ ۴ بجے سے لوگوں کی آمد کا سلسلہ شروع ہوا۔ تقریباً تمام عہدہ داران مقامی نے شرکت کی جن میں سے جناب تحصیلدار صاحب، جناب ڈاکٹر صاحب، جناب صدر مدرس صاحب و منتظم صاحب پولس بطور خاص قابل ذکر ہیں۔ نیز جملہ وکلا صاحبان و مقامی خوش باش ساہوکاروں کا کثیر مجمع شریک جلسہ رہا۔ ان کے علاوہ تعلقہ ہذا کے قصبات مثلاً تاور گیرہ، دوئی ہال، چلگیرہ و دیگر مواضعات سے باوجود سخت گرمی و دوری مسافت کے حصول امتیاز کے شوق میں کامیاب طلبہ کی کئی جماعتیں آئیں۔ جو سب کی سب جوبلی ہال کے میدان میں جمع ہوئیں۔ میدان میں بنچوں اور کرسیوں کا کافی انتظام کرنے کے باوجود بیشتر شرکا جلسہ کھڑے رہے۔ ان کامیاب طلبا میں سب کی نظریں ایک کمسن رسیدہ طالبعلم پر بطور خاص پڑ رہی تھیں۔ جو ہر شخص کا مرکز نظر بنا ہوا تھا۔ یہ وہ تشنۂ علم تھا جس نے اپنی زندگی کی تقریباً ۹۰-۹۵ منزلیں طے کرنے کے باوجود اس کے ذوق علم نے اس کو امتحان اردو دانی میں شریک ہونے پر مجبور کیا تھا۔ آفرین اور صد آفرین ہے۔ اس کی ہمت اور ذوق علمی پر کہ اس نے امتحان میں کامیابی حاصل کی۔ اور آج وہ سند لینے کے لئے ۲۰ سالہ عمر ضعیف کو دس میل اپنے ساتھ کھینچ لایا تھا۔ اس ضعیف اور کامیاب طالب علم کو جلسہ کا ہر شخص بڑی حیرت اور حسرت سے دیکھ رہا تھا۔

غرض ٹھیک ½۵ بجے سے جلسہ کا آغاز ہوا۔ سب سے پہلے تحریک صدارت پر ایک قرارداد تعزیتی منظور کی گئی جس میں علیا حضرت بڑی بیگم صاحبہ کے سانحہ ارتحال و صدمۂ جانکاہ پر گہرے رنج و ملال کا اظہار کیا گیا۔ اور دعا کی گئی کہ خدائے قدوس مرحومہ کو اپنی جوار رحمت میں جگہ دے۔ نیز اعلیٰ حضرت بندگان عالی و خانوادۂ آصفی کو صبر جمیل عطا کرے۔ آمین

حاضرین نے قرارداد کو ایستادہ ہوکر متفقہ منظور کیا۔ اس کے بعد جلسہ کا آغاز جناب محمد اکبر صاحب ڈرائنگ ماسٹر کی نظم سے ہوا۔ نظم نہایت سلیس سادہ و برمحل تھی جس میں زبان اردو کی تعریف اور اس کی ہمہ گیریت کا تذکرہ تھا۔ حاضرین نے اس نظم کو بیحد پسند کیا۔ مسٹر بھیم سین آچاری صاحب وکیل نے مولوی سید علی اکبر صاحب صدر شعبہ امتحانات اردو کا مختصر خطبہ پڑھ کر سنایا۔ قابل صدر نے اس خطبہ میں اردو امتحانات کی ابتدائی زندگی اور اس کے ترقی منازل کا مفصل حال بیان فرمایا ہے۔ بعد ازاں معتمد ادارہ نے شاخ کی سالانہ رپورٹ سنائی جس میں

صدیقیہ ادارہ حیدرآباد کی بنیاد کا حال اور بانی ادارہ جناب ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور کی بار آور کوششیں اور اہل ذوق اصحاب کا ادارہ کے ساتھ تعاون عمل اور ان قلیل عرصہ میں ادارہ کے درخشاں کارناموں کا مفصل ذکر درج تھا۔ نیز شائع کنندگی کے قیام اور اس کی سرگرمیوں میں جن علم دوست اور ادب نواز حضرات نے اپنی قیمتی امداد و اعانت سے مستعد کا ہاتھ بٹایا تھا۔ ان سب کا شکریہ ادا کیا گیا تھا۔ اختتام رپورٹ پر [illegible] تالیوں کی گونج میں کامیاب طلباء کو انعامات و اسناد تقسیم فرمائے۔

اس کے بعد جناب مولوی واجد علی صاحب وحید سب رجسٹرار مولوی خواجہ قمرالدین صاحب، مولوی نوراللہ بیگ صاحب، مولوی محمد حسین صاحب منشی فاضل نے علم و ادب پر بڑی دلچسپ تقریریں کیں۔

آخر میں جناب صدر نے اپنا معلومات آفریں خطبۂ صدارت پڑھا جس کے ہر ہر جملہ میں موصوف کے علمی و ادبی خدمت کے جذبات موجزن تھے۔ صاحب ممدوح نے تعلیم بالغاں کی اہمیت اور اس کی ابتدائی عملی دشواریوں پر کافی روشنی ڈالتے ہوئے حاضرین جلسہ پر اس امر کی سخت ضرورت کا اظہار فرمایا کہ ہر پڑھے لکھے کا یہ فریضہ ہونا چاہیے کہ وہ اپنے فرصتی اوقات بجائے لغویات اور فضولیات میں گزارنے کے صرف پڑھنے یا پڑھانے میں گزارے۔ نیز علم و فن کی برکتوں پر تفصیلی روشنی ڈالی۔ اور اس کے حصول کے کئی مختلف اور آسان ذرائع بتلائے۔ اور [illegible] مدت [illegible] علم [illegible] ذکر کرتے ہوئے سلطان العلوم کی عدیم النظیر علم نوازی کا [illegible] ہر فقرہ پر [illegible] پیش فرمایا۔ اس طرح آپ نے بصیرت افروز خطبہ کو حضرت سلطان العلوم خلد اللہ ملکہ کی صحت و سلامتی کی دعا پر ختم فرمایا۔ حاضرین جلسہ نے خطبہ کو گرمجوشی سے سنا۔ اس موقع پر ہر فرد یہ محسوس کر رہا تھا کہ [illegible] کی تاریخ میں یہ پہلا جلسہ ہے جو خالص علمی و ادبی مقاصد کا حامل ہونے کے اعتبار سے اپنی آپ نظیر ہے [illegible] زمانہ ماضی میں ایسی کوئی نظیر پیش نہیں کر سکتا۔ مختصر یہ کہ جلسہ بیحد کامیاب رہا۔ یہاں کی عام پبلک اور صاحبزادگان نے کارکنان جلسہ کی دل کھول کر داد دی۔ آخر میں جناب صدر مدرس صاحب نے اپنی تقریر کے بعد حاضرین جلسہ کا شکریہ ادا کیا۔ اور خسرو دکن خلد اللہ ملکہ و سلطنتہ و خاندانہ آصفی کے لئے دعائے صحت و سلامتی پر جلسہ برخاست ہوا۔

[illegible]

اردو انسائیکلوپیڈیا

[illegible]

کے نئے [illegible] کی ہے

[illegible] علوم و فنون کے بارہ شعبوں [illegible] [illegible]

چونکہ اس کی ترتیب و تالیف کے لئے متعدد علوم و فنون کے ماہرین کے اشتراک عمل کی ضرورت تھی اس لئے سب سے پہلے اس نے ہندوستان کے متعدد ماہرین علوم و فنون کو قلمی اعانت پر آمادہ کیا۔
انسائیکلو پیڈیا کی ترتیب و تالیف میں اس کا خاص طور پر خیال رکھا جا رہا ہے کہ مختلف علوم و فنون کے الفاظ ماہرین ہی سے لکھوائے جائیں اس سلسلہ میں ساری انسائیکلو پیڈیا کو مختلف علوم و فنون کے متعدد شعبوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے اور ہر شعبہ کی نگرانی ایک ماہر کے تفویض کر دی گئی ہے جو معاونین کی مدد اور مجلس انتظامی کی عام نگرانی میں شعبے کے جملہ الفاظ پر نوٹ مرتب کر رہا ہے۔ فی الوقت حسب ذیل ماہرین اور علما اپنی نگرانی میں مضامین متعلقہ کا کام شروع کر چکے ہیں۔
معاشیات۔ ڈاکٹر انور اقبال صاحب قریشی ایم اے آکسن بار ایٹ لا صدر شعبہ معاشیات جامعہ عثمانیہ تاریخ۔ پروفیسر ہارون خاں صاحب شروانی ایم اے آکسن بار ایٹ لا صدر شعبہ تاریخ جامعہ عثمانیہ تہذیب و ثقافت۔ ڈاکٹر ایشور ناتھ صاحب ٹوپا ایم اے پی ایچ ڈی، پروفیسر انڈین کلچر جامعہ عثمانیہ ریاضی۔ ڈاکٹر رضی الدین صاحب صدیقی ایم اے، پی ایچ۔ ڈی۔
سائنس۔ ڈاکٹر قاضی معین الدین ایم ایس، سی پی ایچ، ڈی۔ پروفیسر نظام کالج و ڈاکٹر رام لال ایم ایس سی پی ایچ، ڈی۔ السنہ قدیم و جدید ڈاکٹر محمد راحت اللہ خاں صاحب ایم اے، ڈی فل مہتمم کتب خانہ آصفیہ۔ فلسفہ ڈاکٹر میر ولی الدین صاحب ایم اے پی، ایچ، ڈی۔
تعلیمات و تدریسات مولوی سجاد مرزا صاحب ایم اے پرنسپل ٹریننگ کالج۔ طب ڈاکٹر منور علی صاحب یف آر سی یس، ڈاکٹر قاسم حسین صاحب صدیقی ایم آر، سی، ایس، یل آر، سی، پی (لندن) کاروز بلدہ۔
لسانیات مس جیسی سندی بی اے آنرز آکسن۔ کھیل۔ یس یم ہادی بی اے کیمبرج۔ اردو زبان و ادب ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور ایم اے، پی ایچ، ڈی (لندن) و پروفیسر عبدالقادر سروری ایم اے، ایل ایل بی ہندی ادب اور دیوالا پنڈت ونشی دہر ودیا النکار کنٹری و مرہٹی وغیرہ۔ رگھوناتھ راؤ بھاری ایم اے، ڈی، کے بھیم سین راؤ ایم اے، انڈکس کی ترتیب اور مقالے لکھوائے جانے کا انتظام تیزی کے ساتھ جاری ہے ان کے علاوہ بہت سے مشاہیر علما و فضلا ہندوستان کے گوشہ گوشہ سے دوسرے علوم و فنون کے ضمن میں قلمی اعانت فرما رہے ہیں ان میں سے چند کے نام یہ ہیں۔
ڈاکٹر محمد باقر ایم اے، پی ایچ، ڈی، لاہور۔ پروفیسر مسعود حسن رضوی ایم اے، لکھنؤ۔ احمد شاہ بخاری پطرس ایم اے، دہلی۔ ڈاکٹر عبداللہ چغتائی پونا اور پروفیسر وارا الہ آباد وغیرہ۔ ترتیب و تالیف کی نوعیت اور معیار کا صحیح اندازہ پیش کرنے کے لئے زیر اشاعت انسائیکلو پیڈیا کے چند اوراق بطور نمونہ الگ شائع کر کے ہفتہ عشرہ میں صاحبان ذوق و نظر کی خدمت میں بغرض تبصرہ بھیجے جائیں گے۔
اردو انسائیکلو پیڈیا جیسی علوم و فنون کی ضخیم کتاب کی ترتیب و تدوین کے لئے ہمیں بیسیوں ماہرین کی قلمی اعانت درکار ہے اس لئے ہم بے حد ممنون ہوں گے اگر وہ علما و فضلا جن کا اب تک ہمیں تعاون حاصل نہیں رہا اور جو ازراہ علم دوستی ہمارا ہاتھ بٹانا چاہتے ہیں مطلع فرمائیں کہ انہیں کن کن علوم و فنون سے دلچسپی ہے تاکہ ہم ان کی قابلیتوں سے استفادہ کر سکیں۔"

نوٹ

چونکہ ایشیا کثیر الاشاعت ہے، اور ہندوستان کے گوشے گوشے میں پہونچتا ہے اس لئے تجارت کو ترقی دینے کا بہترین ذریعہ ہے۔ تاجروں کے لئے نرخ اشتہارات مناسب اور مقابلۃً کم مقرر کئے گئے ہیں۔

منیجر ایشیا ادبی مرکز میرٹھ

ماہنامہ **تندرستی** پڑھا کیجئے

تندرستی میں ہر ماہ حفظ صحت کے مضامین دلچسپ پیرایہ میں بیان کئے جاتے ہیں۔
تندرستی میں جڑی بوٹیوں کی مکمل تشخیص اور فوائد درج کئے جاتے ہیں۔
تندرستی میں ورزش کے اسباق تصویروں کے ذریعے دئے جاتے ہیں۔
تندرستی میں دلچسپ اور سبق آموز افسانے پیش کئے جاتے ہیں۔
تندرستی میں چیدہ چیدہ غزلیات اور نظمیں شایع کی جاتی ہیں۔
تندرستی میں عورتوں کے لئے مفید مضامین بھی دئے جاتے ہیں۔
تندرستی میں کشتہ جات پر مفصل روشنی ڈالی جاتی ہے۔
تندرستی میں صنعت و حرفت و تجارت پر مفید عام مضامین چھاپے جاتے ہیں۔
تندرستی میں سوالات و جوابات کا سلسلہ بھی قایم ہے۔
تندرستی ہر انگریزی ماہ کی پہلی کو اعلیٰ کاغذ پر خوش نما لکھائی چھپائی سے شایع ہوتا ہے۔
تندرستی کا چندہ باوجود ان خوبیوں کے صرف ڈیڑھ روپیہ سالانہ ہے۔
تندرستی کا نمونہ ناظرین "سب رس" کو مفت روانہ ہوگا۔

مینجر رسالہ تندرستی ریلوے روڈ جالندھر شہر

منزل (دہلی) (نمونہ مفت)

ہر ماہ کی پندرہ کو دہلی سے شایع ہوتا ہے دار السلطنت کا سب سے عمدہ اور دلچسپ اور کم قیمت ماہ نامہ ہے۔ سبق آموز افسانے، معلومات سے پُر علمی مضامین، روح پرور نظمیں، دور حاضرہ کے شعرا کا کلام اور اہم سیاسی مقالات اس کے خاص عنوانات ہیں۔ قیمت سالانہ ایک روپیہ چار آنے نمونہ مفت طلب کریں شاید آپ کو پسند آجائے۔ **مینجر رسالہ "منزل"** (بلیماراں دہلی)

ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد دکن کا ماہنامہ

نشان ٹپہ آصفیہ ۱۵۳
نشان ٹپہ برطانیہ M 3950
ٹیلیفون نمبر ۲۲۰۹
چندہ سالانہ چار روپے آٹھ آنے
بچوں کا سب رس ایک روپیہ آٹھ آنے

سب رس

زیر نگرانی
ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور
مجلس ادارت
خواجہ حمید الدین شاہد
سکینہ بیگم
عبدالحفیظ صدیقی بی ایس سی

جلد (۴) — بابت ستمبر ۱۹۴۱ء — شمارہ (۹)

فہرست مضامین

مضمون	مصنف	صفحہ
۱۔ ٹیگور — فانی	ادارہ	۲
۲۔ امیر مینائی	ماہر القادری	۳
۳۔ غزل	حفیظ قتیل بی اے (عثمانیہ)	۵
۴۔ غزل	نواب عزیز یار جنگ بہادر	۶
۵۔ غزل	باقی ایم اے	۷
۶۔ رکشا والا	محمد حبیب الدین احمد	۸
۷۔ پٹرولیم کا رومان	محمد ابراہیم بی ایس سی	۹
۸۔ فتح آباد پر ایک نظر	ابوالفیض قاضی اشرف الدین فاروقی فیضی	۱۱
۹۔ شاہکار	عبدالقادر فاروقی	۱۵
۱۰۔ کپاس کی صنعت نے ہندوستان میں جنم لیا	میر لطیف علی (ورنگل)	۱۸
۱۱۔ یاد ماضی (نظم)	ظفر (عثمانیہ)	۲۱
۱۲۔ مرد کہاں ہے (افسانہ)	رشید قریشی بی اے	۲۲
۱۳۔ امید اور شادی	اقبال انصاری ایم اے ریسرچ اسکالر (لکھنؤ)	۲۵
۱۴۔ تصور (غزل)	منظر قریشی	۳۰
۱۵۔ مجنوں کی آپ بیتی	ایس بی اختا	۳۱
۱۶۔ پاگل (نظم)	مرزا سیمابی عالم پوری	۳۲
۱۷۔ پکوان اور خانہ داری	مسز اسد الزماں خاں	۳۳
۱۸۔ راکٹ اور سیارے	سید ظہیر الدین رونق (عثمانیہ)	۳۵
۱۹۔ نئی کتابیں	نواب مرزا آصف علی خاں	۴۰
۲۰۔ آہ! یہ زندگی	ساحر	۴۱
۲۱۔ ہندوستان کی ناپید صنعتیں	محمد ناصر علی ایم اے	۴۲
۲۲۔ انقلاب (سانیٹ)	احمد ندیم قاسمی	۴۷
۲۳۔ تنقید و تبصرہ	"یس"	۴۸
۲۴۔ ادارہ کی خبریں	ادارہ	۴۹

خواجہ حمید الدین شاہد کے اہتمام سے اعظم اسٹیم پریس میں چھپکر دفتر ادارہ رفعت منزل خیرت آباد سے شایع ہوا۔

ٹیگور ——— فانی

زندگی انساں کی ہے مانندِ مرغِ خوش نوا ٭ شاخ پر بیٹھا کوئی دم چہچہایا اڑ گیا (اقبال)

ٹیگور اسی سال چند ہی مہینے پہلے ڈاکٹر ٹیگور کا اسی سالہ جشن سالگرہ منایا گیا اور کسی کو کیا خبر تھی کہ سالگرہ کی یہ تقریب آخری ہوگی اور اس کے بعد صفِ ماتم بچھانی پڑے گی اگست ۱۹۴۱ء کے پہلے ہفتہ میں وہ علیل ہوئے اور روز بروز حالت بد سے بدتر ہی ہوتی گئی۔ ۷ اگست کی صبح مایوس کن تھی۔ ساڑھے دس بجے کے بعد سے وہ موت سے قریب تر ہوتے گئے اور دوپہر میں ساڑھے بارہ بجے کے قریب وہ موت کی آغوش میں پہنچ گئے۔

رابندرناتھ ٹیگور ۷ مئی ۱۸۶۱ء کو کلکتہ میں پیدا ہوئے۔ کہتے ہیں کہ ٹیگور نے اپنی شاعری کی ابتدا آٹھ سال کی عمر سے کی۔ واقعہ یہ مشہور ہے کہ ان کے پھوپھی زاد بھائی "جیوتی" نے ان سے شعر کہنے کی فرمائش کی۔ پہلی دفعہ یہ غیر متوقع فرمائش ٹیگور کے لئے حیرانی کا باعث ہوئی لیکن انھوں نے جب اس کی تکمیل کی کوشش کی تو انھیں خود شاعری سے فطری لگاؤ محسوس ہونے لگا

پہلی دفعہ ٹیگور کی نظم "گیانانکر" نامی ایک ماہوار رسالے نے شائع کی اور پہلی کتاب ایک طویل نظم کی شکل میں "کویکا ہنی" (شاعر کی کہانی) کے عنوان سے شائع ہوئی۔ اس کے بعد سے ان کی تصانیف کا سلسلہ قائم ہوگیا۔ انگلستان کے پہلے سفر میں مغربی تنقید اور مغربی خیالات سے وہ مستفید ہو چکے تھے لیکن مشرقیت کا رنگ ان پر اتنا چھایا ہوا تھا کہ نظم، نثر، افسانوں اور ڈراموں میں وہ ایک مشرقی مفکر ہی نظر آتے ہیں

"گیتان جلی" انھوں نے جس وقت شائع کی ان کی ادبی زندگی کا ایک دور ختم ہو چکا تھا لیکن شاعر کو یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ بنگالی زبان میں تو ابھی پہلا اڈیشن ختم نہ ہوا تھا اور انگریزی ترجمے کے کئی اڈیشن انگریزی سمجھنے والے ملکوں میں ختم ہو چکے تھے۔ انگلستان کے بڑے بڑے نقاد اور بڑے بڑے شاعر نظموں کے اس مجموعہ میں ایک نئی دنیا پا گئے تھے۔ شہرت اور مقبولیت کی انتہا یہ تھی کہ ۱۹۱۳ء میں ٹیگور کو "نوبل پرائز" دیا گیا۔ آج تو خیر ہندوستانی نوبل پرائز سے واقف ہو چکے ہیں، ہندوستانیوں کو یہ انعام دوبارہ مل بھی چکا ہے اور آئندہ وہ اس کے دعویدار بھی ہیں لیکن ۱۹۱۳ء میں یہ انعام نہ صرف ہندوستان کی عظیم الشان کامیابی تھی بلکہ سارے مشرق کیلئے طرۂ امتیاز تھا۔

ٹیگور کی موت نے وہ آواز بند کر دی جس کی صدائے بازگشت دنیا کے ہر متمدن گوشے میں سنائی دیتی تھی اور وہ طرۂ امتیاز چھین لیا جس کے آگے مغربی مفکر بھی اپنے پُر غرور سر کو نیچا کر لیتے تھے!

فانی ٹیگور کے انتقال کے ٹھیک بیس دن بعد یعنی ۲۷ اگست ۱۹۴۱ء کی شام میں فانی بدایونی بھی دارِ فانی سے دارِ بقا کی طرف کوچ کر گئے۔ کم و بیش انھوں نے ساٹھ سال کی عمر پائی تھی۔ یوں تو ان کی صحت ایک عرصہ دراز سے خراب تھی لیکن پچھلے چند دنوں سے مرض کی شدت اور عام جسمانی کمزوری نے انھیں صاحبِ فراش کر رکھا تھا۔

شوکت علی خاں فانی نے جب شاعری شروع کی تو عام طور پر لوگ غزل سے اکتا کر نظم کی طرف مائل ہو رہے تھے لیکن انھوں نے اپنی طبیعت کا لحاظ کرتے ہوئے غزل ہی کو اظہارِ خیال کا ذریعہ بنایا اور نہ صرف آخر عمر تک اپنی روش پر کاربند رہے بلکہ اپنے لئے ایک طرزِ خاص بھی نکال لی۔ ان کے معاصرین میں حسرت موہانی، اصغر گونڈوی مرحوم، جگر مراد آبادی اور جوش ملیح آبادی نے خاص طور پر قبولیتِ عام حاصل کی۔ حسرت موہانی کی غزلوں میں متوسطین کا رنگ پختہ نظر آتا ہے، اصغر مرحوم کے رنگِ تغزل میں عرفانی رنگ زیادہ تھا، جگر میں ایک بانکپن ہے اور جوش غزل سے زیادہ نظم کی طرف مائل ہو گئے۔ فانی اپنے ان معاصرین میں ایک خاص درجہ رکھتے تھے۔ حزن و ملال جو غزل کو موثر بنانے کے بہترین ذرائع ہیں فانی کے کلام کے خاص اجزاء ہیں۔ اس کے سوا زندگی کے فلسفہ پر فانی نے متعدد زاویوں سے روشنی ڈالی ہے۔ غالب کا ظاہری اسلوب جس میں فارسی کی چست بندشیں اور معنی آفریں ترکیبیں شامل ہیں، اور میر کا داخلی رنگ جس میں آہوں کا اثر زیادہ نظر آتا ہے، فانی کے ہاں کچھ اس توازن کے ساتھ سموئے گئے ہیں کہ ایک خاص رنگ پیدا ہو گیا جو فانی کا اپنا کہا جا سکتا ہے۔

فانی کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ انھوں نے اپنے لئے موزوں طرز کا انتخاب کیا تھا اور اسی پر مستقل مزاجی کے ساتھ عمر بھر طبع آزمائی کرتے رہے جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ یہ رنگ آئے دن مشق سے پختہ اور پختہ تر ہوتا گیا۔

ادارہ

امیر مینائی

حضرت امیر مینائی کے ساتھ ' ارباب ذوق اور اہلِ نقد و نظر نے اچھا سلوک نہیں کیا' فصیح الملک حضرت داغ کی شاعرانہ عظمت کو ذہن میں رکھتے ہوئے یہ فرض کر لیا گیا ہے کہ " امیر مینائی کے یہاں لکھنؤ کی نزاکتوں اور صنعتوں کے سوا کوئی اور تخیلی نہیں پائی جاتی اور جہاں امیر نے داغ کا اتباع کیا ہے' وہاں ٹھوکر کھائی ہے ۔"

میں بھی بہت دن تک اسی پروپگنڈے اور افسوسناک مفروضہ کا شکار رہا' اتفاق کی بات کہ ایک دن مولانا ابوالکلام آزاد کے ایک مقالہ میں' مندرجہ ذیل شعر میری نظر سے گزرا :-

شب وصال بہت کم ہے آسماں سے کہو
کہ جوڑ دے کوئی ٹکڑا شبِ جدائی کا

میں نے کتاب بند کر دی اور بہت دیر تک اس شعر کو گنگناتا رہا' بعض احباب سے بھی اس شعر کا ذکر کیا' سب نے داد دی' بعد میں معلوم ہوا کہ یہ " تیر " امیر مینائی کے ترکش کا ہے ۔ حیرت ہوئی کہ امیر مینائی بھی ایسا شعر کہہ سکتے ہیں ! اس کے بعد حضرت امیر کا کلام پڑھنے کا شوق پیدا ہوا' ایک دوست کی عنایت سے' امیر کے حالات' منتخب کلام کے ساتھ مل گئے ! کلام پڑھا اور بار بار پڑھا' وجدان اور روح نے لذت حاصل کی' بہت سے شعر نشتر کی طرح دل میں ٹوٹ کر رہ گئے' کسی شعر پر پلکیں بھیگ گئیں اور کسی شعر نے ہونٹوں پر مسکراہٹ پیدا کر دی ۔ امیر مینائی کی شاعری کے متعلق سنی سنائی باتوں نے جو دل و دماغ پر پردے ڈال رکھے تھے' وہ اٹھ گئے اور دنیا کی ناقدر شناسی پر میرے وجدان نے ماتم کیا ۔

حضرت داغ کو حضرت امیر سے ٹکرانا' فنِ نقد و نظر کی توہین ہے ۔ دونوں اہلِ کمال اپنی جگہ منفرد شخصیت کے مالک ہیں' داغ کی سلاستِ بیان اور روزمرہ کا جس طرح جواب نہیں' اسی طرح امیر مینائی کی معنی آفرینی اور نازک خیالی اپنی آپ ہی نظیر ہے ۔ داغ اور امیر دونوں' آسمانِ تغزل کے آفتاب و ماہتاب ہیں' اردو زبان پر دونوں کا احسان ہے' افسوس ہے کہ تقابل کرنے والے' توازن کی حد سے گزر جاتے ہیں ۔

حضرت امیر کے ان چند شعروں کو پڑھیے :-

ہم اپنی خاک سے بعدِ فنا یہ کام لیتے ہیں — غبارِ راہ بن کر ان کا دامن تھام لیتے ہیں
رہو تم شوق سے عہدِ شباب و دورِ مستی میں — ہم اپنے سر بلائے گردشِ ایام لیتے ہیں

عجب دلچسپ نقشہ عالمِ ایجاد رکھتا ہے — جو آنکھیں دیکھ لیتی ہیں' اسے دل یاد رکھتا ہے

دیکھ جو کچھ سامنے آجائے منہ سے کچھ نہ بول		آنکھ آئینہ کی پیدا کر دہن تصویر کا
حسن کھلتا ہے حسینوں کا جسے جتنی لگاؤ		جس قدر دیکھو ابھرتا ہے بدن تصویر کا

قریب ہے یار روزِ محشر، چھپے گا کشتوں کا خون کیونکر		جو چپ رہے گی زبانِ خنجر، لہو پکارے گا آستیں کا

جو نگاہ کی تھی ظالم تو پھر آنکھ کیوں چرائی		وہی تیر کیوں نہ مارا جو جگر کے پار ہوتا

کیا اتنے بلند اور لطیف شعر کہنے والے کو "متشاعر" یا "چھچلے اور ضلع جگت کا شاعر" کہنا حقیقت کا انکار اور انصاف سے بغاوت نہیں ہے!

مجھے تو امیر کے اشعار پڑھ کر حیرت ہوئی کہ "قبا بر دوش، درود برلب، تسبیح در دست اور مصحف در بغل انسان" "معاملہ اور تغزل" کے اس قدر چبھتے ہوئے اشعار کس طرح کہہ سکتا ہے؟ زہد اور رندی، سنجیدگی اور چھیڑ چھاڑ کا اتنا لطیف امتزاج بہت کم دیکھنے میں آیا ہے۔ امیر شراب بھی پلاتے ہیں، آگ بھی برساتے ہیں، ہنساتے بھی ہیں اور چٹکی بھی لیتے ہیں۔ جہاں تک زبان کے سنوارنے اور ادب کی خدمت کا تعلق ہے ان کی شاعری کا ایک رخ (Classical) ہے۔ ان کے بہت سے اشعار "ضرب المثل" بن چکے ہیں۔ زبان کا چٹخارہ، محاورات، روزمرہ، اور الفاظ کا برمحل استعمال، یہ تمام چیزیں امیر کے یہاں پائی جاتی ہیں۔

میں اربابِ ذوق اور شعر فہم حضرات سے سفارش کروں گا کہ وہ حضرت امیر مینائی کے کلام کا سبقاً سبقاً مطالعہ فرمائیں۔ ادب اور زبان کو جتھا بندی اور پارٹی بازی سے بلند ہونا چاہیے، میری یہ نظم بھی میرے ان ہی خیالات کی "ناتمام ترجمانی" ہے۔

تاریخ ہے زبان کی افسانۂ امیر		ہے دفترِ ادب خطِ پیمانۂ امیر
کتنے چراغ اب بھی ہیں پروانۂ امیر		ہے کعبۂ خیال صنم خانۂ امیر

اربابِ فن کو اس کے تخیل پہ ناز ہے
ہر شعر جس کا نغمۂ فطرت نواز ہے

جس نے زبانِ بلبل و گل میں دیا پیام		جس کے تخیلات کا پرتو اودھ کی شام
تھا صاحبانِ علم و معانی کا جو امام		اردو ادب میں ہے سرِ فہرست جس کا نام

جس نے گرہ حقایقِ الفت کی کھول دی
قند و نبات ساغرِ اردو میں گھول دی

جس نے وصال و ہجر کے منظر دکھا دئے		رنگینیٔ خیال کے گلشن کھلا دئے
دلکش محاورات کے دریا بہا دئے		اردو زبان کے ہند میں سکے بٹھا دئے

شعر و ادب کے چہرے کی رنگت نکھار دی
جس نے زباں کی زلفِ پریشاں سنوار دی

جس نے شرابِ شعر کو دو آتشہ کیا
جس نے بڑھایا اور محبت کا سلسلہ

جس نے فروغ انجمنِ فکر کو دیا
جس نے سنایا عشق کا افسانہ برملا

جس نے غزل میں شوخ مضامیں سمو دئے
دل کی رگوں میں دشنہ و خنجر چبھو دئے

اشعار جس کے ملک میں ضرب المثل بنے
جس نے رُخِ حیات سے پردے اٹھا دئے

جس کی زباں سے عیش کے نغمے سنے گئے
پیدا ہوا جو شوخ مضامین کے لئے

شعروں میں جس کے کیف بھی ہے اور درد بھی
نغمہ کے ساتھ ساتھ ہے اک آہ سرد بھی

احسان ہے زباں پہ "امیر اللغات" کا
ہر سطر جس کی راہِ طلب کی ہے رہنما

دامن ادب کا گوہرِ معنی سے بھر دیا
اس واسطے کہ اس کا تخلص امیر تھا

مرقد پہ اس کے ابرِ کرم کا نزول ہو
ماہر کی یہ دعا ہے الٰہی! قبول ہو

ماہر القادری

غزل

تکلیفِ التفات گوارا نہ کیجئے
برہم سکونِ یاس کی دنیا نہ کیجئے

آخر نگاہِ شوق نے بے پردہ کر دیا
کیوں ہم کہا نہ کرتے تھے پردہ نہ کیجئے

دادِ کمالِ حسن ہے ناکامیٔ نظر
شرمندۂ مجال تماشا نہ کیجئے

حسرت گناہ ترکِ رضا یاس کفرِ عشق
حیران ہیں کہ کیجئے کیا کیا نہ کیجئے

اذنِ جفائے خاص بھی دیگانہ رشکِ غیر
بیگانہ وار بھی مجھے دیکھا نہ کیجئے

مٹ بھی چکا قتیلِ غمِ عشق آپ کا
اب زحمتِ کرم کا ارادہ نہ کیجئے

حفیظ قتیل

غزل

سیرِ صحرا کیا کریں کیا دیکھیں گلشن کی بہار
یاد ہے اے جوشِ وحشت چاکِ دامن کی بہار

ہائے وہ نیچی نگاہیں دلفریب و دل نواز!
اور وہ بانکی ادائیں تیکھی چتون کی بہار

اے صبا صیاد سے کہہ دے نہ آئے اس طرف
خار کی مانند کھٹکے گی نشیمن کی بہار

شعلۂ دل کا بھی آخر نازِ تابش بڑھ گیا
دیکھ کر چلمن سے باہر روئے روشن کی بہار

جس نے دیکھی ہیں خزاں کی بھی بہاریں اُن سے پوچھ
سامری کیا جانے تیری چشمِ پُرفن کی بہار

کچھ خبر ہے دیکھ او خورشید طلعت آئینہ
عقدِ پرویں سے نہیں کم تیری سمرن کی بہار

دیکھئے کب آئے گی، پھر کب دکھائے گا خدا!
لالہ و گل کی مہک، نسرین و سوسن کی بہار

اوپر اوپر ہی یہ کیا آتش بیانی جائے گی؟
پھول برسائے گی میرے ساتھ ساون کی بہار

دیکھ لے زاہد مئے گلرنگ کا اعجاز دیکھ ؟
بڑھ گئی تردامنی سے اور دامن کی بہار

کس کے نقشِ پا الٰہی بن گئے نقشِ طلسم!
اور ہی کچھ آج کل ہے کوئے دشمن کی بہار

چٹکیاں لیتی ہیں رہ رہ کر کلیجے میں عزیزؔ
ہائے رت برسات کی وہ، ہائے ساون کی بہار

نواب عزیز یار جنگ بہادر

غزل
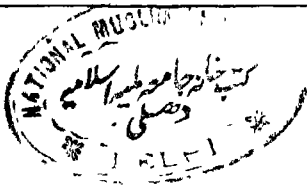
کیا بات ہے اے بیتابیٔ دل، یاں ساز کوئی خاموش نہیں
نغموں سے بھرے ہیں ارض و سما، سننے کا مگر کچھ ہوش نہیں

پیمانہ بہ کف آیا تھا کوئی، مخمورِ محبّت ہونے کو
کہنے لگا پینے والے ہیں مجبورِ ہوس، مے نوش نہیں

دنیا پہ تبسم کیا کیجے، یوں ناز کا ماتم کیا کیجے
سر اپنا بھی ہے محوِ انا، لیکن یہ وبالِ دوش نہیں

کچھ اور ہے رنگِ ذوقِ طلب، کچھ اور ہے جینے کا مطلب
میخانۂ ہستی ویراں ہے، یاں شورِ نا و نوش نہیں

اک طور تھا اور اک موسیٰ تھے، وہ وقت گیا، وہ بات گئی
اے برقِ ازل مایوس نہ ہو، اب بزم میں ہم مدہوش نہیں

ہاں شاعرِ دل، وہ گیت سنا، جس میں محبت کی باتیں
اس تیری صدائے عریاں میں، وہ مد نہیں، وہ جوش نہیں

کچھ بول حدیثِ شوق ہے تو، کچھ دیکھ، نگاہِ ذوق ہے تو
نغماتِ فلک خاموش نہیں، انوارِ فلک روپوش نہیں

اس بزمِ طرب میں اے باقیؔ، رکھتے ہیں بڑے ارمان ہیں ہم
وہ عشق جو ہم آواز نہیں، وہ حسن جو ہم آغوش نہیں

باقیؔ

رکشا والا

بنگڑیاں میرے لئے کب لا دو گے رامو.... ! دیکھو تو یہ نگوڑے ہاتھ کیسے برے لگتے ہیں۔ ؟ سہاگ کی قسم جلد لا دیجو!

ہاں... چھایا ـــــ میری رانی... لادیں گے۔ ... پیٹ بھرتے پیسے ہی نہیں ملتے تو کیا سہاگ اور کیسی بنگڑیاں ....؟

اُف .. نا.... میرے رام ایسی باتیں بھلی نہیں لگتیں.... کہو تو نہ لاتی ہوں.... اچھا چھوڑو کیا فائدہ ان باتوں سے ... کہو کتنے پیسے جگا لائے؟ دیکھو نیمو تو بھوکوں ہی بلک بلک کر سو گیا.... لاڈلا میرا .. !

چھایا.. ! میں رکشا والا جو ہوں نا ۔!

ہاں ـــ کون نہیں جانے ہے۔ کہو نا سیدھی سیدھی جو کہنی ہو! پھر ایسے سے کوئی کیا توقع رکھے یہی نا۔ چھ آنے ... دھوپ ـــ آندھی ـــ کیچڑ ـــ پانی ـــ یہ سب ہی تو سر سے گزر جاتے ہیں دن تمام کی خاک چھاننے میں۔ چھایا ـــ! ملنے کا کیا... روپیہ، سوا روپیہ مل ہی جاتے ہیں.... مگر... !

مگر کیا۔ کہاں کھو آتے ہو یہ سارے پیسے۔ جاؤ تم بھی بڑے وہ ہو.... پی جاتے ہو گے ؟

اے ایشور! بھلا ہو پاپیوں کا ـــ اری پگلی.. ساہوکار کو دے جو آتا ہوں۔

کون ہے یہ ساہوکار! موئے کو غریبوں کے پیٹ پر پتھر ڈالتے شرم نہیں آتی ـــ ؟

نہیں۔ چھایا۔ ! ان دھن ناگون کو برا نہیں بولتے ـــ! رامو!!!!.... اپنا موہن....!!

نہیں. ... دودھ .... چھایا۔ ! .... مگر ان پر کیا شکوہ ـــ یہ قسمت اور اس کے بنانے والے کا انصاف ہے..... ایک ..... پرندوں کی چوں چوں کے ساتھ اپنے اور اپنے کالے بچوں کے پیٹ کی پوں پوں بجانے کی فکر لئے اٹھتا ہے. بارش کی پرواہ کیسے.... جاڑے کا لحاظ کیسا .... بدن پر چھیتڑے وہ بھی مشکل سے.... ! باپو کو پیٹھ پر لادے چھ میل پھرے تب کہیں چھ پیسے کسوٹی پر بندھے ـــ ! دن کی بارہوں گردشوں تک ایسے کتنے چھ میل دیکھنے نہیں کٹتے ہوں گے. .. کتنا پسینہ بدن پر سوکھ نہ جاتا ہوگا.... کتنا سانس پھول کر سرد نہ پڑ جاتا ہوگا...... پھر بھی شاباش.. واہ ری قسمت .. . باپو ناخوش ہی رہے..... کیوں ؟ دیر جو ہو گئی نا ـــ ! موٹر کر لیتے تو کبھی کے فارغ نہ ہو چکتے... اچھا کیا باپو نے۔ جو بھاؤ آٹھ پیسے کا ٹھیرا تھا سو چھ ٹکے چکائے ..... قصور ہی تو تھا.... اور کیا .... ہا ہا ہا! ہا ہا ہا ...... ہا ہا ہا ہا ہا ـــ!

ہاں تو رامو اچپ ہو گئے ... کیا سوچنے لگے تم ـــ!

ارے یہ چوٹ .... ! اے پربھو! دنیا اندھی ہے ... کہ.... ؟

تو چھایا .. ! دن میں ایسے کتنے ہی باپو اپنی گاڑھی کمائی مجھے دیتے گڑتے ہونگے .. مگر... میں ! ... سچ ... سرمایہ دار کو اپنا خون ... ! .. نہیں ... چھلنی دل سے پسی ہڈیاں پچان کر دیتے ہوئے بھی ہر وقت ہنستا ہی تو رہتا ہوں ..... سوچ تو ذرا ... ! . .

لیکن . وہ بے چارہ ـــ مجھے مارے نہیں اور ... خود لُٹوے نہ بھاٹے تو ... کیا کرے ... آخر اس کے بھی تو بال بچے ہیں ... آخر وہ شریف ہے ... شرافت ! .... شرافت ..!

بس ـــ ! چھایا ... ! آخر ہم کمینے ہی تو ٹھیرے ..... کمینے ! ... غربت ـــ کمینی ... ! کمینی ... غربت .....!

محمد حبیب الدین احمد رحمانیہ

پٹرولیم کا رومان

جس طرح کوئلہ نباتی اجزا پر جراثیمی عمل کا حاصل ہے، اسی طرح پٹرولیم حیوانی مادہ پر جراثیمی عمل سے وجود میں آتا ہے۔ اگرچہ بعض سائنس داں کو صرف اس قدر اختلاف ہے کہ اس کی پیدائش میں حیوانی اور نباتی دونوں مادے حصہ لیتے رہیں۔

اس کی تاریخ بڑی قدیم ہے۔ ڈیوڈ ولومی میں چٹانوں سے تیل کے بہنے کا تذکرہ ہے۔ یہ اس زمانے میں بعض دواؤں کی تیاری اور اشیاء کے محفوظ رکھنے کے لئے استعمال کیا جاتا تھا۔ ہیروڈوٹس، پلینی اور بعض دیگر مصنفین نے اس کا حوالہ دیا ہے۔ تیرھویں صدی عیسوی کا مشہور سیاح مارکوپولو لکھتا ہے کہ لوگ کس طرح تیل لینے کے لئے دور دراز مقامات سے باکو جایا کرتے تھے۔ اس سے بھی قدیم تر زمانے میں حضرت نوح کی کشتی کے متعلق لکھا ہے کہ اس پر تیر (Pitch)، جو پٹرول کا تلچھٹ ہوتا ہے، لگایا گیا تھا تاکہ وہ پانی کے اثرات سے محفوظ رہ سکے۔ یہی عمل حضرت موسیٰ کے اس جھولے پر کیا گیا تھا جس میں وہ بزمانۂ طفولیت دریائے نیل کے کنارے جھولا کرتے تھے۔ [illegible] کی تعمیر میں جو رقیق مادہ استعمال کیا گیا تھا وہ یہی تیر تھا۔ برما میں دریائے ایراوادی کے کنارے جو کنویں ہیں ان کی نسبت کہا جاتا ہے کہ وہ دنیا کے قدیم ترین ہیں۔ حضرت عیسیٰ کی پیدائش سے بہت زمانہ قبل چین میں بھی کنوؤں (Artesian wells) سے پٹرولیم حاصل کیا جاتا تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ [illegible] میں آگ کی پوجا سے حاصل کئے ہوئے پٹرولیم سے چراغ روشن کئے جاتے تھے۔

پٹرولیم کی جدید دریافت اٹھارویں صدی کے اواخر میں ہوئی جب کہ ممالک متحدہ امریکہ کے مغربی حصوں میں چشمہ ہائے نمک کی تلاش جاری تھی۔ نمکین پانی زمین میں سے پمپ کیا جاتا اور سطح پر چھوڑ دیا جاتا تھا تاکہ وہ بخارات بن کر اڑ جائے اور نمک کے قلم رہ جائیں۔ مگر بعض موقعوں پر اس پانی کے ساتھ روغنی مادہ بھی پایا گیا جس نے ان چشموں کو بیکار کر دیا۔ یہی پٹرولیم تھا۔

۱۸۲۶ء میں میٹلن نامی ایک شخص اپنے دوستوں کے ساتھ شکار کو گیا ہوا تھا۔ ایک نمک کے چشمے کے قریب جی بھر کر شکار کھیلنے کے بعد اس نے رات وہیں بسر کی۔ رات میں اتفاقیہ طور پر اس کی بندوق چل گئی اور گولی زمین میں دھنس گئی۔ صبح میں میٹلن نے دیکھا کہ اس سوراخ میں سے ایک تیز بو کا روغنی مادہ ابھر رہا ہے۔ جب اس نے آگ سلگائی تو کچھ شعلے اس تیل کی طرف بھی پہنچے جس سے ایک مہیب شعلہ اٹھا۔

اس واقعے کے پورے دو سال بعد ایک اور امریکی فرم نامی نے اس کی افادیت کو پہچانا اور ۱۸۵۴ء تک اس نے ایک طریقہ معلوم کر لیا جس سے پٹرولیم کی تقطیر اس طرح ہو جائے کہ اس کی روشنی کی خاصیت جاتی رہے اور جلنے میں جو ناقابل برداشت تیز بو پیدا ہوتی تھی اس کا ازالہ ہو جائے۔ نیویارک میں ایک کمپنی قائم کی گئی اور تھوڑی سی ناکامیوں کے بعد یہ لوگ اس قابل ہوئے کہ روزانہ کافی ڈبے پٹرولیم کے زمین سے نکال سکیں۔ تیل کی تلاش دیوانہ وار بڑھنے لگی اور اس اثنا میں بعض ایسے کنویں دریافت ہوئے جن میں سے روزانہ ہزاروں ڈبوں سے زیادہ تیل نکلنے لگا۔

آج کل سالانہ تقریباً ۲۰ کروڑ ٹن پٹرولیم زمین سے نکالا جاتا ہے۔ اس مقدار کا نصف حصہ ممالک متحدہ امریکہ سے نکلتا ہے، اس کے بعد دوسرے بڑے محفوظ سوتے روس [illegible]

میکسیکو، ونیز ویلا، ایران، شرق الہند اور رومانیہ ہیں۔
اس سے نہ صرف مختلف استعمال کے لئے ایندھن ہی حاصل ہوتا ہے بلکہ بہت سے قسم کے ہلکے تیل، چکنائیاں اور پیرافین وغیرہ دستیاب ہوتے ہیں۔

بعض بعض دفعہ اتفاقیہ آتشزدگی کی وجہ لرزہ براندام مناظر پیدا ہوئے اور ہوتے رہتے ہیں۔ کیلیفورنیا کے تیل کے مخزن میں ۱۹۲۶ء میں بجلی کے گرنے سے آتشزدگی ہو کر جو نقصان ہوا اس کا اندازہ چار کروڑ روپے لگایا گیا ہے۔ رومانیہ کے ایک کنویں کو آگ لگنے کے بعد مسلسل تین سال تک جلتا رہا اس کے بعد کہیں اس کو قابو میں لایا جاسکا۔ شہر اوکلاہوما کے تیل میں جب آگ لگی ہے تو اس سے ۶۰ فٹ سے زیادہ بلند شعلے اٹھے، قریب تھا کہ شہر کو جلا کر خاک سیاہ کردے مگر خوش قسمتی سے اس زمانہ میں ہوا کا رخ دوسری جانب تھا۔ کام کرنے والوں نے ایک خاص قسم کے لباس اور ابرک کا خود پہنے ہوئے بڑی بے جگری سے ایک دو ٹن وزنی ڈاٹ کو کامیابی کے ساتھ اس پر بٹھا کر قابو پالیا۔ مشرقی ٹیکساس کے نئے کنویں میں جب آگ لگی ہے تو رات کے وقت پچاس میل اطراف واکناف اس سے منور ہوجاتے تھے۔ مسلسل دو ماہ کی کوشش کے بعد اس پر قابو حاصل ہوسکا مگر اس وقت تک تقریباً سات لاکھ روپے کا نقصان ہو چکا تھا۔ ٹیکساس کے ایک اور کنویں میں ایک ہتھوڑے سے نکلی ہوئی چنگاری سے جو آگ لگی تھی اس نے چودہ آدمیوں کے نشانات کو صفحۂ ہستی سے مٹا دیا۔

لانگ بیچ واقع کیلیفورنیا کے ایک کنویں میں جو آتشزدگی ہوئی اس میں یہ اندازہ لگایا گیا ہے کہ ہر گھنٹہ کم از کم ۶۲۵ ڈبے پٹرول سطح زمین سے ۱۲۰ فٹ بلندی پر پھینکا جاتا تھا یہ ایک زہرہ گداز منظر تھا۔ دس آدمیوں نے تین سو روپے فی کس فی گھنٹہ کے معاوضہ پر اس آفتِ ناگہانی سے دوچار ہونے پر آمادگی ظاہر کی۔ یہ ایک جان جوکھوں کا کام تھا مگر وہ کود پڑے اور اس پر قابو پانے میں کامیابی حاصل کی یہ اور چیز تھی کہ تیل کی بوچھار نے عارضی طور پر ان لوگوں کی بصارت کھو دی تھی۔

(ماخوذ)

محمد ابراہیم

سرگزشت ادارۂ ادبیات اردو

"ادارۂ ادبیات اردو، حیدرآباد دکن پچھلے چند سال سے زبان اردو کی جو گراں قدر خدمات سرانجام دے رہا ہے "البیان" کے صفحات میں کئی بار اُن کا تذکرہ ہو چکا ہے۔ یہ کتاب ادارہ کی خدمات کی مفصل تاریخ پر مشتمل ہے۔ اس کے مطالعہ سے معلوم ہوا کہ ادارے کا کام سات شعبوں (یعنی زبان، تنقید، تالیف و ترجمہ، تاریخ دکن، شعراء و مصنفینِ دکن، سائنس اور علومِ نسوانی، تعلیم اطفال، امتحانات وغیرہ) پر مشتمل ہے۔ ہر شعبہ اپنے اپنے علوم کے ماہرین کی نگرانی میں اردو ادب کی بیش قرار خدمات سرانجام دے رہا ہے۔ ہماری دانست میں اس کتاب کی وسیع اشاعت کا انتظام ہونا چاہیئے۔ اگر یہ سرگزشت چند ہزار کی تعداد میں مفت بھی تقسیم ہوجائے تو کیا حرج ہے؟" ماہنامہ البیان امرتسر اگست ۱۹۴۱ء

فتح آباد پر ایک نظر

میرے دوست ابوالفیض قاضی سراج الدین احمد صاحب نیر نے مندرجۂ بالا عنوان سے ایک مضمون تحریر فرمایا تھا جو ماہنامہ سب رس بابتہ ستمبر ۱۹۹۲ء میں شائع ہوا ہے۔ اور جس کا ذکر سرگزشت ادارہ کے صفحہ ۶۵ پر بھی کیا گیا ہے۔ ہم یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ فاضل مضمون نگار سے کتبہ جات کی قرأت اور تاریخی حالات کی صحت میں غلطی ہوگئی۔ کیونکہ موصوف کی دریافت میں جو کچھ معلوم ہوسکا وہی سپردِ قلم کیا گیا ہوگا۔ اگر ادارہ ہماری اس جرأت کو مناسب خیال فرمائے تو ہم اپنے وطن مالوف سے متعلق غلط مواد کی تصحیح اور مزید حالات قلمبند کرنے کی کوشش کریں گے۔

مسجد سنگین یہ مسجد فتح آباد کی قدیم آبادی موسومہ قصبہ (دھارور) کے جنوبی سرے پر واقع ہے۔ جس کو ایک قدِ آدم چبوترے پر سلطان محمد تغلق کے جنرل نے ہندی وضع پر تعمیر کروایا تھا۔[1] مسجد میں تیس سنگین چوگوشہ ستون ہیں۔ چھت بھی سنگین ہے۔ شاہراہِ عام کی طرف جو صدر دروازہ ہے۔ اس کا چوکٹ بھی پتھر ہی کا ہے۔ اس پر ایک کتبہ ہے۔ جس کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس مسجد کی تعمیر ۷۲۷ھ میں ہوئی ہے۔ اکثر عہدہ داران دورہ کنندہ اس کتبہ کا اٹھوا کر اپنی قیام گاہ تک منگواتے ہیں۔ اس میں خطِ نسخ استعمال کیا گیا ہے۔ عبارت درجِ ذیل ہے۔

پہلی سطر۔ ایں عمارت در عہدِ خلافت ...... خلیفۂ زماں وارث ملکِ سلیمان ابوالمجاہد۔

دوسری سطر۔ محمد بن تغلق شاہ السلاطین خلافت ملک تاج الدین محمد عرف ...... لار

تیسری سطر۔ بامید ...... دیدار بنا کردہ بندۂ محتاج محمد حاجی العشرین شعبان سنہ سبع وعشرین وسبع ہجریہ۔

یہ مسجد عام طور پر "ملاؤں کی مسجد" کے نام سے مشہور ہے۔ کیونکہ چراغ بتی، جاروب کشی، آب داری اور بانگ و صلوٰۃ کا انتظام ملاؤں ہی کے ذمہ ہے۔ جس کے لئے ملا بدرالدین صاحب وغیرہ کے نام سروے نمبرات (۲۰، ۶۹، ۷۰) لعہ بکر ۱۴ اگنٹہ محاصل للعہ کے انعامات سرکار سے بحال ہیں۔

جامع مسجد یہ مسجد بستی کی جدید آبادی پیٹھ (فتح آباد) میں ڈونگر جیس کے راستے پر لب سڑک واقع ہے۔ پوری مسجد سنگ بستہ ہے۔ سامنے ٹین کا سائبان ہے جس میں آہنی شہتیر لگے ہوئے ہیں۔ مسجد اور صدر دروازہ کے درمیان ایک کنواں بھی ہے۔ صدر دروازہ پختہ اور سنگ بستہ ہے۔ اس کے کتبے کے دیکھنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ مسجد خاندانِ نظام شاہیہ کے دسویں حکمران مرتضیٰ نظام شاہ دوم (۱۰۰۸ھ تا ۱۰۲۹ھ) کے عہدِ حکومت میں تعمیر ہوئی ہے۔ جس کو "خدا داد" نامی شخص نے تعمیر کروایا ہے۔ کتبہ نستعلیق خط میں ہے۔ تیسرے شعر کے پہلے مصرعہ سے بانیٔ مسجد کے نام کو اور آخیر سطر سے سنِ تعمیر کو کسی کوربا طن اور تنگ دل شخص نے ہتوڑے سے بگاڑنے کی کوشش کی ہے۔ کتبہ درجِ ذیل ہے۔ لفظ "غیب" سے سنِ تعمیر برآمد ہوتا ہے۔

اللہ محمد علی

زغیب آمدہ شد تاریخ مسجد	بکن تحقیق از مصراع اول
ولی بشمار ازاں لفظ تحسین	بود مصراع اول لفظ اول

---

[1] گزیٹیر ممالک محروسہ سرکار عالی سنہ ۱۹۱۵ء صفحہ ۲۲۱ و تحقیقات ہندوستان قلمی ص ...

بنائی کرد نور اللہ مسجد ز فیض فاتحِ فیصلِ مفضلی
[illegible] مسجد جمعہ بنیۂ مستجاب

مسجد کی خدمت کے لئے سلاطین سلف نے کثیر انعامات عطا فرمائے تھے جو ضبط ہوتے چلے گئے۔ آخر حافظ رسول خان صاحب نے اس مسجد کا رسہا انعام ازخدمت پیش (۱۱ی) خرید لیا۔ اب ان کے پوتے حاجی کریم خاں صاحب اور ان کی برادری کے نام سروے نمبرات (۱۰، ۱۱) مصے کیرو ۲ گنٹہ محاصل مقطعہ بشرط خدمت بحال ہیں۔

مسجد قلعہ یہ مسجد نظام شاہی خاندان کے چوتھے بادشاہ مرتضیٰ نظام شاہ اول (۹۷۲ھ تا ۹۹۵ھ) کے عہد میں سنجر خاں قلعدار نے تعمیر کروائی تھی۔ جیسا کہ آگے چل کر اس کے کتبے سے ظاہر ہوگا۔

اس سنگین مسجد کی لداو چھت گر پڑنے کے بعد [illegible] میں مرزا احمد یار خاں نائب قلعدار شرف الدولہ بہادر نے اس کی مرمت کروائی۔ مگر جب وہ بھی گر پڑی تو امیر [illegible] الدولہ بہادر جاگیردار و قلعہ دار وقت نے [illegible] میں دوبارہ تعمیر کروائی۔ امتدادِ زمانہ سے اب اس مسجد کی صرف دیواریں کھڑی ہیں۔ صحن میں ایک مختصر سا حوض بھی ہے جس کا کارنجہ اکھڑ چکا ہے۔ مسجد کا قدِ آدم اور سنگ بستہ دروازہ کھڑا ہے۔ جس پر نستعلیق خط میں یہ اشعار کندہ ہیں۔

در عہدِ نظام شاہ عالی مقدار آں شاہ جہاں پناہ خورشید لقب
بانی بنائے خیر شد سنجر خاں آں منبع خلق و لطف و احسان و ادب
تاریخ بنائے خیر اگر می خواہی از قبلۂ اہلِ عجز و اخلاص طلب

اردو کے جلیل القدر انشا پرداز اور مورخ مولوی بشیر الدین احمد دہلوی سے اس کتبے کے سلسلے میں دو فروگذاشتیں ہوئیں۔ چنانچہ وہ اپنی تصنیف واقعاتِ مملکتِ بیجاپور میں اس کتبے کے پہلے شعر کے مصرعۂ ثانی میں "پناہ" کے بجائے "پیغام" لکھتے ہیں۔ دوسرا تسامح [illegible] کے [illegible] واقع ہوا ہے۔ مصرعۂ مذکور اس طرح ہے۔ مع

از "قبلۂ اہلِ عجز و اخلاص طلب"

فاضل مورخ نے پہلے حرف "از" اور آخری لفظ "طلب" کو بھی مادۂ تاریخ میں شمول کر کے [illegible] برآمد فرمائے۔ حالانکہ یہ اس قدر موٹی اور سطحی غلطی تھی کہ وہلۂ اول ہی میں انھیں متنبہ ہو جانا چاہئے تھا۔ حقیقی سنہ [illegible] نہیں بلکہ [illegible] ہے۔ جو مادۂ تاریخ سے صاف طور پر مستنبط ہوتا ہے۔

اس مسجد کی جاروب کشی اور چراغ بتی کے لئے سید عبدالقادر و سید راجہ صاحبان کے نام سروے نمبرات (۲۲۹، ۲۴۰) ہونے یکونہ ۲ گنٹہ محاصلی مقطعہ کی سالانہ معاش مقرر و جاری تھی مگر ویرانی مسجد کی وجہ یہ معاش [illegible] سے بجار کی مسجد پر منتقل ہوئی ہے۔ صاحبانِ معاش وہاں شرطِ خدمت ادا کرتے ہیں۔

مسجد چوک زمانۂ سابق میں یہاں صرف ایک چھپر تھا۔ جس میں خاص کر جھارے (نیار یئے) نماز ادا کرتے تھے۔ اس لئے ایک زمانے تک "جھارے کی مسجد" سے موسوم رہی۔ حضرت قاضی عبدالوہاب صاحب کے نسبی پوتے مولوی صلاح الدین صاحب کے فرزند مفتی محمد بہاء الدین صاحب فاروقی نے [illegible] میں اپنے ذاتی صرفہ سے اس مسجد کی تعمیر کروائی جو ساٹھ سال تک قایم رہی۔ [illegible] میں محلے کے چند مخیر اور ہمدرد اصحاب کے چندے سے اس کو پختہ اور سنگ بستہ تعمیر کروایا ہے۔ یہ مسجد آج کل چوک کی مسجد کے نام سے موسوم ہے۔ حسب فرمانِ خسروی جلالت الملک آصف جاہ سابع بذریعہ جریدۂ غیر معمولی مشتہرہ یکم شعبان [illegible] ([illegible]) سالانہ کی

معاش بوجہ ویرانی مسجد قلعہ، اس مسجد پر منتقل کی گئی ہے۔ حید عبد القادر زادہ سید زادہ صاحبان خدمت ادا کرتے ہیں۔

مسجد قاضی

فتح آباد کے قاضی محمد امین فاروقی کے بڑے صاحبزادے قاضی عبد الوہاب فاروقی، بانی قاضی پورہ (کمرٹ کالی) ایک عالم باعمل، صاحب دل بزرگ اور باکمال شاعر تھے۔ آپ نے حضرت اورنگ زیب عالمگیر کے عہد حکومت اپنی حویلی سے متصل ذاتی صرفہ سے [illegible] میں ایک مسجد تعمیر کروائی تھی۔ جو "قاضی مسجد" کے نام سے مشہور ہے۔ یہ مسجد فتح آباد کی قدیم آبادی (قصبہ) کے شمالی سرے پر واقع ہے۔ صدر دروازہ پر جو شاہراہ عام کی جانب ہے۔ بانی مسجد کا طبع زاد قطعہ نستعلیق خط میں کندہ ہے۔ عبارت کتبہ درج ذیل ہے۔ "موجب اسباب فضل دیں" سے سن تعمیر برآمد ہوتا ہے

لا الہ الا اللہ محمد الرسول اللہ

خادم شرع متین کرد از کمال صدق بنا — مسجدی احداث بہر مقدم حق آلہ
ہاتف فرخ سخن پرور بگوش ہوش گفت — "موجب اسباب فضل دین" بگو تاریخ آں

بانی مسجد خادم شرع عبد الوہاب [illegible]

قاضی عبد الوہاب صاحب کی وفات کے بعد [illegible] سے شاہان مغلیہ نے اس مسجد کے لئے معاش جاری فرمایا تھا۔ چنانچہ آج تک قاضی صاحب مرحوم کے ورثاء قاضی اکبر احمد اور اشرف الدین فیضی وغیرہ کے قبضہ نمبرات (۱۲۵، ۱۸۳، ۱۸۴، ۱۸۵، ۱۸۶، ۱۸۷) [illegible] محاصل بابت کا معاش بحال ہے۔ صدر دروازہ جیسا مضبوط اور ایک شان لئے ہوئے ہے مسجد ویسی ہی ردی حالت میں ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اصل عمارت کے منہدم ہو جانے پر یہ ٹین پوش عمارت کھڑی کر دی گئی۔ بانگ و صلوٰۃ جماعت تمام ہوتی ہے۔

مقبرہ قلعدار خاں اورنگ جنگ

قلعہ فتح آباد عرف دھارور کی قلعداری پر ربیع الثانی [illegible] میں نور محمد عرب کا تقرر ہوا مغل بادشاہ شاہجہاں نے انہیں عرب خاں کے خطاب سے سرفراز فرمایا تھا اپنی قلعداری کے زمانے میں بطور یادگار بستی کے قریب ایک باغ لگوا کر اسے اپنے نام سے موسوم کیا جو آج تک "نور باغ" کے نام سے مشہور ہے۔ جب [illegible] میں نور محمد عرب کا انتقال ہوا تو اسی نور باغ میں دفن کئے گئے۔

مرزا علی عرب الہی کے صاحبزادے تھے جو صاحب قران ثانی کے عہد میں پانصدی منصب اور دو سو پچاس سواروں کی افسری سے ممتاز تھے۔ اورنگ زیب عالمگیر کے ابتدائی سنہ جلوس میں با فزائش منصب قلعدار خاں خطاب ملا اور حراست صوبہ داری اورنگ آباد پر متقرر ہوئے پھر قلعدار قندہار ہوئے۔ وہاں سے فتح آباد دھارور کی قلعداری پر تبدیل ہو کر مقام فتح آباد دھارور انتقال فرمایا۔ ان کے والد عرب خاں مغفور کی قبر کے برابر ان کی بھی قبر ہے۔[1]

قلعدار خاں کی قبر پر چار کمانیں بنی ہوئی ہیں۔ ان کمانوں پر بیرونی جانب سے چار اشعار کندہ ہیں۔ یہ

صفا ای قبہ قدسی طواف

سے اس مقبرے کا سنہ تعمیر [illegible] برآمد ہوتا ہے۔ کتبہ درج ذیل ہے۔

۱۔ مشرقی کمان — اس کمان کا وہ حصہ جس پر کتبہ تھا۔ اب وہ منہدم ہو چکا ہے۔ منہدم ہونے سے پہلے راقم الحروف نے اس پر جو شعر کندہ دیکھا تھا اس کا مصرعہ اولیٰ حافظہ میں محفوظ ہے جو یہاں لکھا جاتا ہے۔

---

[1] تاریخ قندھار دکن مولفہ منشی امیر حمزہ صاحب صفحہ (۱۸۰، ۲۰۱)

چوں پے سیر جنت الماوی رواں

۲۔ جنوبی کمان ـــــ ثانی عالی قدر قلعہ دار خاں

آنکہ چوں فردوس دارد احتکاف

۳۔ شمالی کمان ـــــ شد بنا از فضل معمار قدر

گنبدی برسر قدش گردوں طواف

۴۔ مشرقی کمان ـــــ گفت ہاتف سال تاریخ بنا

حبذا ای قبۂ قدسی طواف

مُراد باؤلی یہ باؤلی دھارور کی (قصبہ) آبادی کے ایک فرلانگ کے فاصلے پر جانب شرق واقع ہے۔ اس کو منوچہر خاں قلعہ دار قلعہ فتح آباد عرف دھارور کے چچا زاد بھائی مراد خاں نے ۱۱۰۰ھ میں تعمیر کروایا تھا۔ جس میدان میں یہ باؤلی ہے وہ تلاوڑی کے نام سے موسوم ہے جس پر سات پشت سے راقم الحروف اور اس کی برادری کا قبضہ ہے۔ اور انہی افراد سے متعلق قبرستان بھی ہے۔ اس باؤلی میں ایک کتبہ بھی ہے جو درج ذیل ہے۔

بدور حضرت اورنگ زیب عالمگیر ایں چشمہ بنا کرد مراد ابن کبیر
در سنہ چہل و یک از جلوس معدلت معلی مطابق سنہ یکہزار و یکصد و نہ ہجری

مقبرہ بنا کردہ محمد خاں قدیم عیدگاہ سے تھوڑے فاصلہ پر تالاب کے قریب ایک عالیشان گنبد؛ ایک سنگ بستہ چبوترے پر بنا ہوا ہے۔ گنبد میں جانے ایک چھوٹا سا دروازہ ہے۔ مگر یہ نہ معلوم ہو سکا کہ یہ کس شخص کا مقبرہ ہے اور کب تعمیر ہوا ! کتبہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ "محمد خاں" نامی کسی صاحب نے بنوایا تھا۔ جناب مولوی محمد اسمٰعیل خاں صاحب مہتمم سرائے فتح آباد پرانی تہذیب کی ایک آخری یادگار رہ گئے ہیں۔ موصوف کا خیال ہے کہ یہ "اعتبار الملک" کا مقبرہ ہے۔ کیونکہ اس مقبرہ سے متصل ایک انعام ہے جو "اعتبار الملک" کے نام سے موسوم ہے۔ مگر ابھی ہم مزید تحقیق کر رہے ہیں۔ اس مقبرے کا کتبہ درج ذیل ہے۔

رواق باصفا چوں حسن دلبر

خجالت بردہ از وے قصر قیصر

بنا کردہ محمد خاں بانام

رسانیدہ بفیض لطف داور

جہاں تاریک و چشم خود پر نم خلائق زانہ و حسرت او پر غم
چل براوج فلک جائے تو باشد ملک را رائے بارائے تو باشد
سفر کردی ازیں دنیائے فانی بہشت عدن جائے تست دانی
چوں تاریخ و ناتش فکر کردم زہجرت چند بودہ ذکر کردم
ولا جو ز من سبحان اسری اگر گرفت ملک مکان اعلیٰ

اس کتبہ کا آخری شعر صاف طور پر پڑھا نہیں جاتا۔ ہم ابھی اس پر غور کر رہے ہیں۔ تاکہ صحت کے ساتھ اس کا سن تعمیر برآمد ہو سکے۔ انشاء اللہ تعالیٰ دوسرے مضمون میں یہاں کے قلعہ کے حالات اور اس سے متعلقہ کتبہ جات پر روشنی ڈالی جائے گی۔

ابو الفیض قاضی اشرف الدین فاروقی فیضی

اطلاع

جن اصحاب کا چندہ ختم ہو گیا ہے وہ براہِ کرم جلد روانہ فرما دیں یا سب رس تقسیم کرنے والے کو چندہ دے کر باضابطہ مطبوعہ رسید حاصل فرمائیں۔

شاہکار!

وہ مصور تھا۔ مصورِ فطرت! اس نے فطرت کے ہر پہلو کو اپنی لانبی اور پتلی انگلیوں اور گوناگوں رنگوں کی مدد سے تصویروں کی شکل میں اجاگر کرنے کا عزم صمیم کر لیا تھا۔ نیم شگفتہ پھولوں پر منڈلاتی رنگ برنگی تتلیاں، ہوا کے مست جھونکوں میں لہراتے ہوئے پتے، شبنم کی بوندوں میں بھیگے ہوئے سبزے، شام کے قرمزی بادل، سیاہ آسمان پر جھلملاتے تاروں یا دوسرے قدرتی مناظر کے سوا اس نے کبھی کسی مرد یا عورت کی تصویر نہیں بنائی تھی۔ اس کی چھوٹی سی، گندی اور کثیف کوٹھڑی میں تصویروں کے انبار لگے ہوئے تھے۔ سیل کے مارے کئی تصویروں کا رنگ گیلا ہو کر پھیل گیا تھا۔ بارش کے دنوں میں چھت سے ٹپکتے ہوئے پانی میں بھیگ کر کئی تصویریں سڑے ہوئے کاغذوں کے ڈھیر میں مل گئی تھیں۔ جن سے سخت بدبو نکل رہی تھی۔ ایک ٹاٹ کے چیتھڑے میں لپٹی ہوئی کئی تصویریں جھینگروں اور کیڑوں کا شکار ہو رہی تھیں۔ بہت سی تصویروں کو چوہوں نے کتر کتر کر ٹکڑے کر ڈالا تھا۔ کوٹھڑی کے فرش پر مختلف رنگوں کے چھوٹے بڑے دھبے تھے۔ رنگ کی پیالیاں ادھر ادھر بکھری پڑی تھیں۔ لیکن اسے ان ساری باتوں کی کچھ پرواہ نہ تھی۔ وہ دن بھر پہاڑوں اور جنگلوں میں گھومتا اور رات کو اپنی اس مخصوص کوٹھڑی کے اندر ایک چٹائی کے ٹکڑے پر بیٹھ کر دیے کی دھندلی روشنی میں تصویر بنایا کرتا۔ رنگ بکھرے پڑے رہتے اور اس کی کہنہ مشق انگلیاں گھنٹوں تصویر کشی کرتی رہتیں۔ جب تصویر تیار ہو جاتی تو وہ کچھ دیر اسے دیکھتا اور پھر قریب پڑی ہوئی تصویروں کے ڈھیر میں پھینک دیتا۔ چراغ کی دھندلی روشنی میں تصویریں بناتے بناتے اس کی دھنسی ہوئی آنکھوں کی قوت گھٹ گئی تھی۔ اس کی اپنی دھن اور جنونِ تصویر کشی کے سبب اس کی صحت خراب ہو گئی تھی۔ پچکے ہوئے گالوں پر داڑھی کے خشک بال بکھرے ہوئے تھے۔ سر کے بال دھول میں اٹ کر بری طرح الجھ گئے تھے ——

حسبِ معمول آج بھی وہ ہڈیوں کا پنجر اپنی کوٹھڑی میں بیٹھا تصویر بنانے میں محو تھا۔ کوٹھڑی کا دروازہ یوں ہی بند تھا۔ دیوار کے شگافوں سے آتی ہوئی ہوا کی پتلی سی لہر چٹائی کے سرے پر رکھے ہوئے چراغ کی لو کو آہستہ آہستہ ہلا رہی تھی۔ اس کانپتی ہوئی پیلی اور مدھم روشنی میں مصور کی پتلی اور مشاق انگلیاں ایک ہری بھری پہاڑی پر سے گرتے ہوئے جھرنے کا ایک نہایت ہی دلفریب منظر کھینچ رہی تھیں ——

رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی۔ مگر مصور ابھی تک اپنی تصویر بنانے میں ہی منہمک تھا ——

کوٹھڑی کا دروازہ آہستہ سے کھلا اور ادھیڑ عمر کی ایک عورت ہاتھ میں مٹی کا پیالہ لیے ہوئے داخل ہوئی۔ عورت بھی مصور ہی کی طرح ہڈیوں کا ڈھانچہ تھی۔ اس کی میلی ساڑی کا تار تار منت کشِ پیوند تھا۔ میلی کچیلی کرتی پھٹ کر چھلنی ہو گئی تھی۔ ایک ہاتھ میں کانچ کی ایک پتلی سی چوڑی تھی۔ اور دوسرا ہاتھ جس میں وہ مٹی کا پیالہ لیے ہوئے تھی کمزوری کے مارے غیر محسوس طریقہ پر کانپ رہا تھا —— عورت مصور کے پاس آ کر بیٹھ گئی!

"کیا ہے؟" مصور نے چونک کر کہا۔

"تھوڑے سے چنے ابال کر پانی لائی ہوں، پی لو! جانے دن بھر کہاں کہاں جنگلوں میں پھرتے رہے ہو اور رات کو تصویر کشی سوجھتی ہے۔ کچھ اپنا بھی خیال ہے یا یوں ہی تصویریں بناتے بناتے پاگل ہو جاؤ گے؟"

مصور نے بیوی کے ہاتھ سے مٹی کا پیالہ لے لیا اور دو تین گھونٹ میں خالی کر کے زمین پر رکھ دیا ——

"تم نے بھی کچھ کھایا پیا؟"

"کھانا کیا تھا، کل سے بخار میں جلتی جا رہی ہوں۔ آج شام کو ٹھیکیدار کی بیوی کے کپڑوں کی سلائی کے پیسے آنے والے تھے گئی تھی۔ ان پیسوں سے ملے آنے تو تمہارے کاغذ والے نے لے لئے اور ڈھائی آنے رنگ والے نے۔ آدھ آنہ کے چنے لائی تھی۔ ابھی کو پانی نہیں دے رہی ہوں"

مصور برش کو پانی میں بھگو کر رنگ کی ٹکیا پر پھیرنے لگا۔

"کوئی میرے بیاہ سے تمہارا بخار بلائے۔ ایسی حالت میں بھی محنت مزدوری کر کے جو دو پیسے لاتی ہوں وہ تمہارے کاغذ برش اور رنگ کی بھینٹ چڑھ جاتے ہیں۔ کہتی ہوں دو چار تصویریں ہی دے دو۔ شاید ان کے بیچنے سے چار پیسے آنے مل جائیں۔ لیکن تمہیں تو ان کا سڑنا منظور ہے مگر بیچنا گوارا نہیں"

"پھر وہی پرانی بات۔ میں ان ناقص تصویروں کو دنیا کی نظروں سے پوشیدہ رکھنا چاہتا ہوں۔ میرا شاہکار جب بازار میں پہنچے گا تو تم مالا مال ہو جاؤ گی، سمجھیں؟"

"نہ جانے تمہارا شاہکار کتنے برسوں سے تیار ہو رہا ہے! کیا ابھی اس کا وقت نہیں آیا؟ شاید وہ میری موت تک بھی تیار ہوگا؟"

"نہیں، اب زیادہ دیر نہیں ہے۔ تھوڑے دن اور کسی طرح کام چلاؤ۔ پھر تم ملکہ بن جاؤ گی۔ تمہیں کسی بات کی کمی نہ ہوگی"

ایک پھیکی سی ہنسی اس کی عورت کے [illegible] ہوئی۔ [illegible] کی پیلی [illegible] میں ابھی کے [illegible] پر گرم گرم آنسو ٹپک پڑے۔

(۲)

مصور کے کمرے کے آگے ایک چھوٹا سا برآمدہ تھا۔ اور سامنے تقریباً اتنا ہی صحن۔ صحن میں خشک پتوں، ٹہنیوں اور کوڑا کرکٹ کے ڈھیر لگے تھے۔ کونے میں دو اینٹیں رکھ کر چولھا بنا لیا گیا تھا۔ اس کے چاروں طرف راکھ پھیلی ہوئی تھی۔ صحن کی چار دیواری جگہ جگہ سے ٹوٹی ہوئی تھی۔ اور بوسیدہ اینٹوں کے ٹکڑے مٹی اور چونا جگہ جگہ سے ڈھلک رہا تھا۔ چار دیواری کے برآمدے کے ٹھیک سامنے والا حصہ آم کے ایک درخت کی وجہ سے ابھی کافی اچھا تھا۔ دیوار کا وہ حصہ درخت کے تنے کو دونوں طرف سے دبائے ہوئے کھڑا تھا۔ درخت کی ٹہنیوں میں چھپے ہوئے پتے صحن میں جھول رہے تھے ——

برآمدے کے ایک گوشہ میں مٹی کا ایک گھڑا تھا۔ دو ایک ٹوٹے پھوٹے برتن اور بستر کی ایک چیکٹ گٹھری تھی۔ دوسری طرف بان کی ایک چارپائی تھی۔ جس کی ڈوریاں جگہ جگہ سے ٹوٹ کر لٹک رہی تھیں ——

کڑاکے کا جاڑا تھا اور اس پر سرد اور کپکپا دینے والی ہوا۔ مصور کی بیوی برآمدہ کے ایک کونے میں سمٹی سمٹائی بیٹھی تھی۔ بخار کی حدت سے سارا جسم پھنک رہا تھا گویا کسی نے اس کے روئیں روئیں میں آگ لگا دی ہو۔ سردی کے مارے اس کی ہڈیاں تک کانپ رہی تھیں ——

آم کے درخت کی پیلی پیلی پتیاں ایک ایک کر کے صحن میں گر رہی تھیں۔ گویا اس عورت کی زندگی کی گھڑیاں پھسل پھسل کر بکھر رہی تھیں ——

یکایک مصور صحن میں داخل ہوا۔ اس نے محسوس کیا کہ حرارت [illegible] عورت درخت کی طرف دیکھ کر بڑبڑا رہی ہے [illegible]

"اس کی پتیاں [illegible] ٹھیک تو ہے۔ میرا آخری وقت رفتہ رفتہ قریب آ رہا ہے۔ زندگی کے پل ایک ایک

کرکے کم ہو رہے ہیں۔" ہوا کا ایک تیز جھونکا آیا۔ ایک خشک ٹہنی کے سوائے دو پتوں کے سب کے سب پتے ایک ساتھ ہی گر پڑے۔ عورت کے ہاتھ پاؤں بالکل سرد ہو گئے۔ دل کی دھڑکن رفتہ رفتہ بند ہونے لگی۔ ہوا کا ایک دوسرا جھونکا آیا ان دو پتوں میں سے ایک پتہ چار دیواری سے ٹکراتا ہوا کھڑکھڑا کر صحن میں آگرا۔ وہ خشک ٹہنی ہلی اور وہ آخری پتہ بڑے زور سے کانپ اٹھا۔

"ہاں۔ اب ایک ہی لمحہ کی تو دیر ہے ....!"

عورت کے منہ سے ایک دھیمی چیخ نکلی اور بے ہوشی کے سبب اس کا سر ایک طرف کو ڈھلک گیا۔ مصور کمرہ میں جا کر اپنی تختی، رنگ کی پیالی اور برش اٹھا لایا۔

۳

دوسرے دن جب مصور کی عورت کی آنکھیں کھلیں تو اس نے دیکھا کہ وہ آخری پتہ جوں کا توں ٹہنی سے چمٹا لٹک رہا تھا۔ وہی پتہ تھا ـــــ کنارے مڑے ہوئے تھے۔ سرا کچھ آگے سے ٹوٹا ہوا تھا۔ آدھی سبز اور کچھ کچھ زرد رگیں ابھری ہوئی تھیں۔ بیچ میں کیڑے کا کھایا ہوا چھید صاف دکھائی دے رہا تھا۔ وہی پتہ تھا۔ بالکل وہی! ہوا کافی تیز تھی لیکن پتہ بالکل ساکن تھا۔ اس کے دل میں امیدوں کا ایک طوفان سا مچ گیا ـــــ کیا سچ مچ ابھی میری زندگی کا آخری وقت دور ہے؟" بڑی ہی تکلیف سے وہ اٹھی اور درخت کی طرف بڑھی، دیکھا ـــــ درخت کے تنے کے پاس اپنی اینٹھی ہوئی انگلیوں میں برش تھامے مصور مرا پڑا تھا اور چار دیواری کی ایک اینٹ پر ایک زرد پتے کی تصویر کھنچی ہوئی تھی ـــــ

یہ تھا مصور کا شاہکار!

(او۔ ہنری)

محمد عبدالقادر فاروقی

کپاس کی صنعت نے ہندوستان میں جنم لیا

انسان کی زندگی کی اہم ضرورتیں کھانا، کپڑا اور گھر ہیں امیر و غریب کسی کو بغیر ان کے چارہ نہیں، فرق اگر ہے تو درجہ کا چنانچہ جھونپڑی کے رہنے والوں کا لباس موٹا اور ستر پوش ہوتا ہے اور ان کی غذا بہت معمولی ہوتی ہے اس کے برعکس محلوں کے مکینوں کا کپڑا بڑھیا اور نفیس ہوتا ہے اور کھانا ذائقتاً قسم قسم کا بہترین ہوتا ہے، ماہرین معاشیات اس بات کے قائل ہیں کہ جو ملک اپنے باشندوں کو محض ضروریاتِ زندگی وافر فراہم کر سکتا ہے اس کا اخلاقی معاشی اور سیاسی حیثیت سے درجہ بلند ہوتا ہے، ہندوستان چند صدیوں قبل ایسے ممالک کے نمو میں شامل تھا۔ جنگِ عظیم میں اور اس کے بعد بھی اسے وہ درجہ نصیب نہ ہوا۔ حالیہ جنگِ عظیم تر اسے خود مکتفی ہونے کے مواقع فراہم کر رہی ہے۔ اگر اب بھی وہ سابقہ حیثیت حاصل نہ کر سکا جس کا کبھی وہ حامل تھا تو وائے بر حالِ ہندوستان۔

کپاس صنعت بافندگی کی وہ بنیادی شئے ہے جس کے کپڑوں میں دنیا کی نوے فیصدی آبادی ملبوس ہوتی ہے۔ کپاس کو ڈھونڈ نکالنے اور اس سے پہلی مرتبہ تاگا کاتنے اور کپڑا بنانے کا سہرا ہندوستانیوں کے سر ہے۔ زمانۂ وید میں ایک دنیا فنِ پارچہ بافی سے واقف تھی تاگا کاتنے کا گھر گھر رواج تھا اور پچاس فیصدی گھروں میں کپڑا بنا جاتا تھا اور یہ کپڑا اتنا مہین اور نفیس ہوتا تھا کہ آج وہی ہندوستانی اس کے بننے پر قادر نہیں بلکہ موٹے کپڑے میں صفائی و لطافت کے لیے لنکا شائر اور مانچسٹر کے مرہونِ منت ہیں۔

زمانۂ وید میں جلاہوں کے سوا عالم اور شاعر بھی اس فن سے واقف تھے اس فن کے عام ہونے کی اس سے زیادہ بڑی دلیل اور کوئی نہیں ہو سکتی۔

ویدک کتابوں سے چند فقرے یہاں درج کیے جاتے ہیں جو اس زمانہ کے طریقۂ بافندگی اور کپڑے کی ساخت پر بھی روشنی ڈالتے ہیں۔

(۱) "فکر مجھے اس طرح کھاتی ہے جیسے چوہا جلاہے کے تاگے کو کاٹ کھاتا ہے۔"

(۲) "دن اور رات اپنی روشنی اور اندھیرا اس وسیع زمین پر اس طرح پھیلاتے ہیں جیسے دو مشہور جلاہنیں کپڑا بنتی ہیں۔"

یہ طریقۂ کار ابھی تک ہندوستان میں رائج ہے اور راقم نے نانڈیڑ میں اس طرح دو عورتوں کو کام کرتے ہوئے دیکھا ہے بلکہ بڑے پنے کے مال کے لیے دو آدمیوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ گویا اس زمانے میں بڑے پنے کا مال بھی تیار ہوتا تھا۔ پہلے فقرہ میں جلاہا مذکر ہے اور دوسرے فقرہ میں جلاہنیں جمع مونث ہے۔ معلوم ہوا کہ پورا خاندان اس کام میں مصروف رہتا تھا۔ مشہور کا لفظ دنیا کی بساط کے مشہور مہرے ساس اور بہو کو پیش کرتا ہے یا اس فن کے عام رواج کو ظاہر کرتا ہے۔

(۳) "بہترین کپڑوں میں ملبوس کہ آسمان والے رشک کریں۔"

یہ فقرہ اس زمانے کے کپڑے کی ساخت کو ظاہر کرتا ہے۔ بقول شاعر ایسا مہین و نفیس کپڑا فرشتوں کو بھی نصیب نہیں۔

وید کی تاریخ تصنیف نامعلوم ہے۔ کہا جاتا ہے کہ چار ہزار سال قبل مسیح اور بارہ سو سال قبل مسیح کے درمیان کوئی تاریخ

یہ کتاب تصنیف ہوئی ہے۔ اس کتاب میں کہیں یہ پتہ نہیں چلتا کہ کپڑے کن ریشوں سے تیار کئے جاتے تھے۔ بعد کی کتابیں رامائن اور مہابھارت اور قوانین منو (ایک ہزار سال قبل مسیح) میں جا بجا ریشوں کا ذکر موجود ہے۔ رامائن میں سیتا کی شادی کے تحائف کی تفصیل دی گئی ہے۔ یہ تحفہ جات اونی مال، پوستین (FURS)، قیمتی پتھر، رنگ برنگی مہین ریشمی (ریشم نما) پوشاک، بیش بہا زیورات اور مکلف گاڑیوں پر مشتمل تھے۔

رنگ برنگی ریشمی (KSHAUMAVASA) پوشاک میں شاید سوت کا میل ہوتا تھا یا صرف سوت کے کپڑے اتنے مہین ہوتے تھے کہ ریشم جیسے دکھائی دیں اگر یہ دونوں بھی نہ ہوں تو یہ ظاہر ہے کہ کپاس کے سوا ریشم اور اون کے کپڑے بھی اس زمانے میں بنتے تھے اور رنگائی کا رواج تھا۔ "رنگ برنگی" سے ظاہر ہوتا ہے کہ رنگائی ترقی یافتہ تھی۔

مہابھارت میں ریشہ کے ساتھ ساتھ اس کے کپڑے کا مقام تیاری کا ذکر بھی پایا جاتا ہے۔ شہنشاہ یودھشٹرا کو باجگزار شاہزادے تحائف روانہ کرتے تھے۔ ان کا ذکر مہابھارت میں موجود ہے۔ ہندوکش کا پوستین (FURS) گجرات کے اہیرا کی طرف سے اونی شال، بھیڑ اور بکری کے اعلیٰ کپڑے کے بنائے ہوئے تاگے (ریشم) اور پودے کے ریشے (سن) کے کپڑے جو شمال مغربی ہمالیہ کے قبائل کے بنائے ہوئے ہوتے تھے۔ ملائم کتان کے کپڑے بنگال، کرناٹک اور میسور کی رعایا کی طرف سے شہنشاہ کو تحائف میں روانہ کئے جاتے تھے۔

قوانین منو میں ریشہ جات پارچہ بافی اور رنگائی کے متعلق تذکرے موجود ہیں۔ ایک مقام پر گنجی یا ماٹ کا ذکر کیا گیا ہے۔ آج گنجی صرف تاگے کو پارچہ بافی کے قابل بنانے کے لئے نہیں لگائی جاتی بلکہ کپڑے کو وزن دار اور اس کی جھلملاہٹ چھپانے کے لئے بھی یہ طریقہ آج سے تقریباً تین ہزار سال پہلے بھی تھا فرق اتنا ہے کہ یہ فعل اس وقت برا سمجھا جاتا تھا اور آج کوئی عیب نہیں۔ بلا روک ٹوک چینی مٹی کا استعمال وزن کے لئے کیا جاتا ہے۔ غرض جو قانون "قوانین منو" میں زیادہ گنجی کی روک تھام کے لئے درج ہے۔ حسب ذیل ہے۔

قوانین منو (باب ۸ جلد ۳۰) ایک جولاہا جسے دس پلے سوتی تاگا دیا گیا ہے اجازت دی جاتی ہے کہ وہ اسے چاول کے پانی (کانجی) سے یا اسی قسم کی اور کوئی شئے سے جو پارچہ بافی میں استعمال ہوتی ہے۔ گیارہ تک بڑھا کر واپس دے سکتا ہے۔ وہ جو اس کی خلاف ورزی کرائے گا اسے ۱۲ پنے جرمانہ ادا کرنا ہوگا۔"

قوانین منو کے اس قانون سے یہ پتہ چلتا ہے کہ ایک ہزار سال قبل مسیح ہندوستان میں سوت کو بننے کے قابل بنانے کے لئے کانجی یا اس قسم کی دوسری شئے لگاتے تھے پھر کپڑا بنتے تھے۔ چند جلاہوں نے زیادہ گنجی لگا کر دھوکا دینا شروع کیا تو اس کی روک تھام قانون کے ذریعہ کی گئی۔

غرض رامائن اور مہابھارت اور قوانین منو سے پتہ چلتا ہے کہ کپاس کے ساتھ ساتھ دیگر ریشہ جات، ریشم، اون، کتان کے بھی کپڑے اس زمانے میں تیار ہوتے تھے۔ رنگائی اس درجہ ترقی یافتہ تھی کہ کپڑے رنگ برنگ کے تیار ہوتے تھے۔

تاریخ صنعت کپاس انگلستان میں تحریر ہے کہ صنعت کپاس کی ابتدا ہندوستان میں ہوئی اور اس صنعت کو مستند تاریخ لکھے جانے سے قبل کمال حاصل ہو چکا تھا۔

(۴۸۴ - ۴۲۸ قبل مسیح HERODOTUS)

ہیروڈوٹس یونان کے مشہور فلسفی سیاح اور پہلے مورخ نے جلد دوم

بھی کپاس کے متعلق اس طرح ذکر کیا ہے کہ اس ملک (ہندوستان) کے جنگلی پودوں کا پھل اون ہوتا ہے۔ جو خوبصورتی اور نفاست میں بھیڑ کے اون سے بدرجہا بہتر ہے۔ اور ہندوستانی اس کا بنایا ہوا کپڑا پہنتے ہیں۔

تھیوفراسٹس (۳۷۰ تا ۲۸۰ قبل مسیح ارسطو کا چیلہ) کپاس کے متعلق اس طرح لکھتا ہے۔ "ہندوستانی جس پودے سے کپڑے بناتے ہیں اس کے پتے سیاہ شہتوت کے مماثل ہوتے ہیں۔ مگر پورا پودا (DOG ROSE) کتا گلاب کے مشابہ ہوتا ہے۔ وہ لوگ انھیں کھیتوں میں قطار در قطار لگاتے ہیں جو دور سے انگور کی بیل کے مشابہ نظر آتے ہیں۔ ان پودوں کو پھل نہیں لگتا بلکہ وہ خول جس میں اون رہتا ہے بند حالت میں تقریباً سیب کے سائز کا ہوتا ہے اور جب پکتا ہے تو پھٹ جاتا ہے تاکہ اون کو نکال دے جس سے سستے اور قیمتی کپڑے بنے جاتے ہیں۔" یورپ کے سیاح جو صرف اون سے واقف تھے۔ کپاس کو دیکھ کر اون پھولوں سے یا خول سے دستیاب ہوتا ہے کہا کرتے تھے۔

روما کی عظیم الشان سلطنت ہندوستان سے کپڑا خریدا کرتی تھی۔ خاص طور پر مہین ململ۔ سلک۔ زربفت اور اس کی قیمت اس کے ہم وزن سونے میں ادا کرتی تھی۔

پلینی (PLINY ۲۳-۷۹ عیسوی) پلینی اپنی تاریخ قدرت میں (Historia naturalis) جس کی تاریخ اشاعت ۷۷ عیسوی ہے لکھتا ہے: "کوئی سال ایسا نہیں ہوتا جس میں ہندوستان سلطنت روما کے ایک سو سسٹرس (ایک کروڑ پانچ لاکھ روپیہ کلدار) نہ کھینچ لے جاتا ہو۔" بقول پلینی سلطنت روما کی دولت ہندوستان بہہ کر چلی آ رہی تھی۔ اور یہ صرف یہاں کے کپڑوں کی بدولت جو یہاں کی کپاس کے بنے ہوئے ہوتے تھے۔

مسٹر جے، اے مان (J. A. MANN) جرنل آف دی رائل ایشیاٹک سوسائٹی (Journal The Royal Asiatic society) جلد ۱۲ ۱۸۶۰ء میں ہندوستان کے متعلق تحریر فرماتے ہیں کہ وہ "کپاس کے پودے کا پہلا مقام اور صنعت کپاس کا پیدائشی گھر ہے۔"

غرض مسٹر رچرڈ مارسڈن (Richard marsden) کے الفاظ میں "بہترین تاریخی مواد جو فراہم ہو سکا ہندوستان کو صنعت پنبہ کا پیدائشی مقام بتاتا ہے مگر کب یہ شروع ہوئی اور کب تک خالص دستی صنعت رہی یا کس تاریخ پہلی مرتبہ گنوار و میکانی اوزار استعمال کیے گئے یہ وہ اس کی تاریخی تفصیلات ہیں جو قدیم ترین زمانہ کے اطراف چھائے ہوئے کہر میں نہ ملنے کے لئے غائب ہو گئی ہیں۔" جب یہ کہر کسی قدر ہٹا تو موہن جی دارو کی کھدائی نظر آئیں اور قبل تاریخ کے تمدن کا انکشاف ہوا اور پھر سے یہ کہر محیط ہو گیا۔ ان کھدائیوں سے دیگر اشیاء کے ساتھ سوتی کپڑا اور سوتی تاگا بھی دستیاب ہوا ہے۔ کراچی سے تقریباً دو سو میل شمال مشرق علاقہ سندھ میں دریائے اندلس کی وادی میں موہن جی دارو واقع ہے۔ کتبات جو ان کھدائیوں سے دستیاب ہوئے ہیں ان سے یہ پتہ چلا ہے کہ پانچ ہزار سال قبل یہاں متمدن اقوام بستی تھیں جو کپاس کے بنائے ہوئے کپڑوں میں ملبوس ہوتی تھیں۔ سر جان مارشل (Sir John Marshall) ناظم آثار قدیمہ فرماتے ہیں۔ بابلی سوفی اور یونانی کپاس کے نام (سندھو اور سندن علی الترتیب) ہمیشہ وادی اندلس کو کپاس کے اگنے کا مقام بتاتے رہے ہیں۔ کھدائیوں سے حاصل کیا ہوا سوتی کپڑا اور تاگا اس کی تصدیق کرتے ہیں۔ انڈین سنٹرل کاٹن کمیٹی کا رسالہ اسی سلسلہ میں

عکاسی کرتا ہے یہ آثار بتاتے ہیں کہ جو کپاس موہن جو دارو میں حاصل ہوئی ہے وہ (۸۰۰ آٹھ سو سال قبل مسیح) مقرر کردہ تاریخ سے کہیں زیادہ پرانی ہے۔ اس کی تاریخ تین ہزار سال قبل مسیح ہونی چاہیئے۔

تصنیف وید کی اوسط تاریخ (۶۰۰ ۲ سال) قبل مسیح نکلتی ہے جو کاٹن کمیٹی کی معین کی ہوئی تاریخ ۳۰۰۰ ہزار سال قبل مسیح سے قریب تر ہے۔ اور وید کے اور دیگر حوالوں سے یہ بتایا جا چکا ہے کہ اس زمانہ میں یعنی آج سے تقریباً پانچ ہزار سال قبل ہندوستانی صرف کپاس کو جانتے ہی نہ تھے بلکہ اس کے کپڑے بنانے میں ماہر بھی تھے۔ اور اس فن کا رواج عام تھا۔ یہ تو رہا صنعت کپاس کے کمال کو پہونچنے کا زمانہ اور اس کی ابتدا بقول مسٹر مارسڈن "کہر" میں ہے۔ تاریخ کبھی اور متعلقہ تحقیق یہ نہیں بتاتی کہ اس مقام پر پانچ ہزار سال قبل صنعت کپاس (عروج کا ذکر ہی کیا) ابتدائی حالت میں تھی، جب صورت حال یہ ہو تو ہر مورخ مجبور ہے یہ کہنے پر جو مسٹر اے، ایس، پیرس (A. S. Pearse) نے اپنی کتاب دی کاٹن انڈسٹری آف انڈیا (The cotton Industry of India) میں کہا ہے ہندوستان پاس عظیم الشان (صنعت کپاس) کا پیدائشی مقام ہے جو آج دنیا کے ہر متمدن خطہ میں پھیل گئی ہے۔

میر لطیف علی

یادِ ماضی

ہم بھی کبھی اسیر تھے گیسوئے اعتبار میں
اب وہ لطافتیں کہاں جلوۂ نوبہار میں

حاصلِ زندگی عشق یعنی متاعِ دو جہاں
بکھرے ہوئے ہیں لختِ دل دامنِ تار تار میں

دے نہ پیامِ فصلِ گل ڈوب چکی ہے نبضِ دل
کیسے بنائیں آشیاں رکھا ہے کیا بہار میں

عقل و خرد کا درس دے مجھ کو نہ پیرِ مدرسہ
خضرِ جنوں ہے راہبر منزلِ یادِ یار میں

قصۂ غم کا ہو بُرا وہ بھی نہ تاب لا سکے
تارے سے کچھ جھلک اٹھے نرگسِ شرمسار میں

ہے یہ کرشمۂ نگاہ عرصۂ کائنات کیا
ہے یہ فریبِ رنگ و بو کچھ بھی نہیں بہار میں

ہستی کو میری اے ظفر سمجھیں گے اہلِ عرش کیا
دل ہوں مگر بشکلِ غم سینۂ روزگار میں

محمد مظفر الدین ظفر

کہاں ہے مرد؟

مس نوشابہ ملک کی مشہور مقرر تھیں .... جیسی دلکش اور اثر آفریں ان کی شخصیت ویسی ہی دلکش اور اثر آفریں ان کی تقریر ... ان کی آنکھوں اور زبان دونوں میں جادو تھا۔ ان کی تقریروں کو سننے والے کچھ تو صرف انھیں دیکھتے رہتے اور کچھ صرف سنتے رہتے ... سب سے مزے میں وہ رہتے جو دیکھتے رہتے اور سنتے رہتے، سنتے رہتے اور دیکھتے رہتے۔ لیکن دیکھنے اور سننے والے ان کے ہمجنس ہی ہوتے۔ مردوں کے مجمع کو انھوں نے آج تک مخاطب نہیں کیا۔ ان کی ساری تقریریں، طبقۂ نسواں، کے لئے مخصوص ہوتیں۔ چند دنوں سے مس نوشابہ، کسی غیر معمولی واقعہ سے متاثر نظر آتی تھیں ذہنی کشمکش کا ایک وسیع جال پھیلا ہوا تھا، جس سے چھٹکارا پانے کے لئے مس نوشابہ تڑپ رہی تھیں، مچل رہی تھیں۔ لیکن مایوسی ہر طرف مسکراتی نظر آتی ... جس دن انھیں ایک جلسہ میں خاص طور پر بلایا گیا تھا۔ وہ دن ان کی امیدوں کا آخری سہارا تھا.. اس کے بعد ان کی زندگی ایک ڈراؤنا خواب ہو کر رہ جاتی۔ اجڑا ہوا باغ بن جاتی۔ مس نوشابہ صحن میں ٹہل رہی تھیں۔ جلسہ میں جانے کا وقت قریب آ رہا تھا .. انھوں نے اپنی ماما کو آواز دی "کوئی خط ؟" مس نوشابہ نے بے چینی کے ساتھ پوچھا "جی نہیں"۔ "کچھ ..." ... جی کچھ نہیں " ... "ڈرائیور سے کہو وہ موٹر لائے" چار بج رہے تھے۔ مس نوشابہ جلسہ کی شرکت کے لئے روانہ ہو گئیں۔ ان کا ذہن موٹر کے انجن سے زیادہ تیز رفتاری سے اپنا کام کر رہا تھا۔ "کوئی خط نہیں، کوئی خبر نہیں ... اوہ میں نے بیٹھے بٹھائے کیا مصیبت مول لی ... خیر ... میں عورت ہوں میں سمجھ لوں گی ...."

مس نوشابہ مردوں کی طرف سے نہ جانے کیوں بخار کھائے بیٹھی تھیں .. ان کی اکثر تقریریں ایسی ہوتیں، جن میں "بیچارے" مرد خواہ مخواہ گھسیٹے جاتے۔ اور کسی نہ کسی عنوان سے ان پر تبرا کیا جاتا .. اگر دوران تقریر میں مس نوشابہ بھاپ سے بھری کیتلی کی طرح اچھلتی دکھائی دیں، یا ان کے چہرے کا سرخ و سفید رنگ صرف سرخ اور وہ بھی شوخ سرخ ہو جائے اور ان کی بھنچی ہوئی مٹھیاں میز سے "مکہ بازی" کرنے لگیں تو یقین مانئے وہ مردوں ہی کا ذکر خیر ہو گا "ایسے ہوتے ہیں، ویسے ہوتے ہیں یہ کرتے ہیں" اور وہ کہتے ہیں۔ اور اب ہمیں یہ کرنا چاہیئے، وہ کرنا چاہیئے۔" اور "انتقام" "انتقام" کی چیخوں سے "کمرۂ تقاریر" گونجنے لگے۔

اس دن تو ان کی تقریر نے ایسا جوش پھیلایا کہ معزز خواتین، میں سے ہر ایک نے بہ آواز بلند مردوں کے خلاف تحریک ملامت "منظور کی۔ غضبناک چہرے .. دہکتی ہوئی آنکھیں ... کٹکٹاتے ہوئے تیز تیز دانت ... سب ڈھونڈ رہے تھے "کہاں ہے مرد؟" اس وقت کسی مرد کی نظر اس مجمع پر پڑ جاتی تو عورتوں کو پردہ میں رکھنے کی مصلحت" حفظ ما تقدم" کے سوا کچھ اور سمجھ میں نہ آتی۔ یہی مجمع "انتقام" "انتقام" چیختا ہوا، چار دیواری کے باہر ہو جائے تو ! کیا کچھ آفت نہ مچے ..

"مردوں کا کوئی کام مصلحت سے خالی نہیں ہوتا" مس نوشابہ .. نے اپنے ہاتھ کو فضا میں بلند کرتے ہوئے کہا۔ ایک کونہ میں کچھ ہلچل سی پیدا ہوئی۔ مس نوشابہ نے تقریر روک دی .. ان کا چہرہ اس رکاوٹ اور انتشار پر غصہ اور ناپسندیدگی کا اظہار کر رہا تھا۔ جو بے چینی ایک منہ زور اور سرکش گھوڑے کو تھامنے والے سوار کو ہوتی ہے۔ مس نوشابہ اپنی تقریر کے رک جانے سے کچھ اسی قسم کی بے چینی محسوس کر رہی تھیں۔ مصیبت

یہ تھی کہ مس نوشابہ کے جملہ نے ایک خاتون کو ہچکیاں لے لے کر رونے پر مجبور کر دیا۔ بازو بیٹھنے والیوں نے دم دلاسا دے کر پوچھا کہ "آخر کیا بات ہے؟" ہچکیوں کی آڑ میں جن لفظوں نے اپنی آواز سنائی وہ یہ تھے۔ "وہ جو... نوکری پہ... مجھے اکیلا چھوڑ کر... گئے... مصلحت... ہے... کیا؟ ہائے...."

اور... دھاڑیں مار کر رونا جسے کہتے ہیں، وہ شروع ہو گیا۔ انھوں نے تقریر سے پہلے ہی اپنی سہیلیوں سے کہہ دیا تھا کہ وہ ایک بار رونا شروع کر دیتی ہیں تو کوئی قوت انھیں روک نہیں سکتی... گھنٹوں روتی رہتی ہیں۔" اب بھلا انھیں چپ رہنے پر آمادہ کرنا کس کے بس کا تھا۔ مس نوشابہ نے چیخا۔ "رونے دھونے سے کام نہیں چلتا۔ اب رو رو کر نہیں ہنس ہنس کر مردوں کو رلانے کا وقت آ گیا ہے۔ اپنی حالت اور قسمت پر آنسو نہ بہاؤ میں کہتی ہوں اب وہ وقت دور نہیں جب کہ زمانہ کروٹ بدلے... ہم مرد کی جگہ اور مرد ہماری جگہ نظر آئے۔ مرد نے جی کھول کر ہمیں ستا لیا... اب مظلوموں کی باری ہے کہ وہ بدلہ لیں...

ہچکیاں تالیوں کی آواز اور چوڑیوں کی جھنکار میں گھل مل گئیں... اور اس کے بعد خاموشی طاری ہو گئی۔ مس نوشابہ کی آواز بجلی کی لہر کی طرح ساری فضا کو لرزا رہی تھی۔" ... بہنو! زمانہ تمھارا ساتھ دے گا۔ علم کے ہتیار اٹھا لو... ہر میدان میں کود پڑو... اس کائنات کے وارث تم بھی ہو۔ دل تمھارے سینوں میں بھی ہیں... آنکھیں تمھارے چہروں پر بھی ہیں... تمھارے دل جل جل کر اور گھٹ گھٹ کر ٹھٹھرنے کے لئے نہیں۔ تمھاری آنکھیں دیواروں کی سفیدی کو دیکھ دیکھ کر پھوٹنے کے لئے نہیں۔ تم دنیا کی زینت ہو... دنیا اگر باغ ہے تو تم پھول ہو... ہواؤں میں جھومو، فطرت کے نظاروں میں لہلہاؤ۔ تم... میری پیاری بہنو! تم زندہ رہو... تمھاری موجودہ زندگی اس مٹی کی زندگی ہے، جو "نمائش" کے لیے مقفل اور پہرہ دار عمارتوں میں رکھی جاتی ہے۔ جس میں جان نہیں ہوتی۔ جس کے جسم کو محفوظ رکھا جاتا ہے۔ جو صرف نمائش کے لئے ہوتی ہے، جس سے زندگی چھن جاتی ہے...

میری بہنو" مس نوشابہ کی آواز بھر گئی، آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ انھوں نے پانی کا ایک گھونٹ پیا۔ اور دستی سے آنکھیں صاف کیں۔ "ہوں" انھوں نے مجمع پر نظر ڈالی، کونسی آنکھ تھی... جن میں آنسو نہ تھے؟ کونسی کسی تھی جو تر نہ تھی؟ کونسا گلا تھا جو ہچکیوں سے گھٹ نہ رہا ہو؟ مس نوشابہ کو رحم سے کام لینا چاہیے تھا۔ مردوں کے حق میں نہیں... ان کی بہنوں... عورتوں کے لئے، سب کی سب ہلکان ہوئی جا رہی تھیں..... بھلا یہ بھی کوئی تقریر ہے کہ سننے والے کو روئی کی طرح دھنک کر رکھ دیا جائے۔ مگر مس نوشابہ تو اپنے سینے میں طوفان کو روکے ہوئی تھی... وہ اپنا پورا جوش دکھائے تو ان کی تقریر بھی ختم ہو۔ "ہمیں مرد جانور سمجھتے ہیں..." ان کی آواز ہچکیوں اور ہو ہو کے دھیمے شور میں، آہستہ آہستہ گرنے والے پرنالوں میں بجلی کی کڑک کی طرح سنائی دی۔ "ہماری عزت ان کی نظر میں لونڈیوں کی سی ہے... حالانکہ ہمارے حسن کے آگے چاند شرماتا ہے۔ ہماری مسکراہٹوں پر پھولوں کی چٹک نثار ہوتی ہے۔ ہمارے جسموں کی لطافت حوروں کی نظروں کو چندھیاتی ہے۔ ہماری آنکھوں میں بجلیوں کی چمک ہوتی ہے۔ ہمارے دل نورانی ہوتے ہیں۔ ہم وہ ہیں جن کی قوت کے آگے دنیا کا ذرہ ذرہ مسحور نظر آتا ہے... مگر آدم کا ناخلف بیٹا مرد... عورت کو کھلونے سے بڑھ کر نہیں سمجھتا۔ کم سمجھ سمجھتا ہے... اور دنیا کو اکیلا سنبھالنا

چاہتا ہے، مگر جب تک میں زندہ ہوں۔ ایسا کبھی نہ ہوگا۔ جہالت نے ہماری عقلوں کو ہم سے چھین لیا تھا ہماری آنکھوں پر پٹی باندھ دی تھی۔ ہم بھول گئی تھیں کہ ہم عورت ہیں۔ عورت ہیں۔ کھلونا نہیں ہیں غلام نہیں ہیں۔ کم سمجھ نہیں ہیں۔" مس نوشابہ کی آواز میں غصہ کی کڑک رہی تھی اور کمرہ کی چھت لرزنے لگی تھی "میری پیاری بہنو" مگر پیاری بہنو کے کان گنگ تھے۔ ان کے جسم بید کی طرح کانپ رہے تھے۔ اور وہ صرف پھٹے ہوئے دیدوں سے مس نوشابہ کے جوش کو دیکھ رہی تھیں۔ ان کے دل شعلوں کی طرح جل رہے تھے۔ اور ان کے غضبناک چہرے، دہکتی ہوئی آنکھیں اور تیز تیز دانت، سب مرد کو ڈھونڈ رہے تھے "کہاں ہے مرد؟" پانی کا ایک گھونٹ حلق سے اتار کر مس نوشابہ نے دھیمے لہجہ میں کہنا شروع کیا "مرد کی قوت کو توڑنا آسان نہیں ہے۔ ہمیں ساری دنیا کی قوت کو توڑنا پڑے گا۔ ہمیں اپنے حقوق منوانے پڑیں گے۔ اپنی آزادی کو ان کے مضبوط ہاتھوں سے چھین لینا پڑے گا۔ ہم مردوں کو قید کرنا نہیں چاہتیں ہم انھیں آزاد دیکھنا چاہتی ہیں۔ لیکن ہم دیکھنا چاہتے ہیں کہ وہ ہمیں اپنے برابر نہیں تو اس قدر پست بھی نہ سمجھیں۔ ان سے وعدے لے لیں کہ وہ عورتوں کے نازک دلوں کو بیوفائی کی "گرم انگارہ" سلاخوں سے چھلنی نہ کریں۔۔۔ دھوکہ بازی، مکر فریب اور جھوٹ سے توبہ کر لیں۔ شادی کا وعدہ کریں تو شادی کر لیں۔۔۔ مگر مرد "شادی کرنا چاہتے ہیں اور شادی نہیں کرنا چاہتے۔ اس مقام پر مس نوشابہ کی نظروں میں کسی کا تصور کوند گیا۔ مس نوشابہ نے جوش کے ساتھ کہنا شروع کیا۔ "ان سے کہہ دوں گی کہ میں ان شرائط پر صلح کرنے آمادہ ہوں" حاضرین میں بے چینی کے آثار پیدا ہونے لگے۔ اور سب تعجب سے مس نوشابہ کی طرف دیکھنے لگیں "مجھ سے انھوں نے جو وعدہ کیا ہے۔ انھیں پورا کرنا ہوگا۔ ورنہ۔۔ ورنہ۔۔۔ میں ساری دنیا کے مردوں سے بدلہ لوں گی۔ اتنے میں باہر سے ان کی ماما آئی۔ تیز تیز قدم اٹھائی وہ مس نوشابہ تک پہنچی۔ اور میز پر ایک چٹھی رکھ کر الٹے پاؤں لوٹ گئی۔ مس نوشابہ نے چٹھی اٹھائی۔ اور پڑھنے لگیں۔

"پیاری بہنو، میں نے تمہارا قیمتی وقت ضائع کیا۔ گھروں میں تمہارا انتظار کیا جا رہا ہوگا۔ آج میں جوش میں جانے کیا کیا کہتی رہی اور سمع خراشی کا باعث بنی۔ لیکن میری بہنو۔ مجھے خوشی ہے کہ جو آگ میرے سینے میں اندر ہی اندر سلگ رہی تھی۔ آج تقریر بن کر نکل گئی۔۔ اور مجھے اور بھی خوشی ہوگی اگر اس آگ کی چنگاری ہر سننے والی کے دل میں سلگتی رہے۔ تمھیں دنیا کی ساری حقیقتوں سے انکار ہو لیکن اپنی مظلومی سے انکار نہ ہونا چاہیئے۔۔۔ اور مردوں کے خلاف جو میں نے کھری کھری سنائی ہے۔ اس کے لئے میں معافی چاہتی ہوں۔ کیونکہ ان مردوں میں۔۔ وہ مرد بھی شامل ہوگئے۔۔۔ جن میں ہم" دبے ہوئے قہقہوں کی آواز نے مس نوشابہ کو شرما دیا۔۔۔۔

"جی ہاں۔ بعض مرد ایسے بھی ہوتے ہیں۔ جنھیں معاف کیا جا سکتا ہے۔ جو عورتوں کے لئے دنیا سے لڑ سکتے ہیں۔ یہ چٹھی جو ابھی آئی ہے۔۔ وہ ۔۔ کی ہے۔۔ اس نے لکھا ہے کہ سوسائٹی، رشتہ دار، دوست احباب۔۔ دنیا، ان سب کی اس کو پروا نہیں۔۔۔ اسے اگر پروا ہے۔ تو میری ہے۔ ایک عورت کی۔۔ وہ مجھے لینے آیا ہے۔۔ مجھے اجازت دیجئے۔ تالیوں کی گونج میں مس نوشابہ نے دروازہ کا رخ کیا۔ کمرۂ تقریر میں ہنسی دل لگی، گانے اور ہلکی ہلکی چیزوں کی عملداری قایم ہوگئی۔۔ اور عورت اپنی مظلومی، اور مرد کی جفا کاری۔۔ سب کچھ بھول گئی۔

رشید قریشی

امید اور شادی[1]

امید ہمیں زندگی کی کسی منزل پر بے آسرا نہیں کرتی۔ مہدسے لحد تک مسلسل اور تکلیف دہ ناکامیوں کے باوجود ہم نعمت و ثروت، استراحت و صحت، حظوظ و لذائذ کے متمنی و متوقع رہتے ہیں اور وہ بھی اس یقین کے ساتھ کہ ہم کبھی اپنی خواہش کو کوشش و استحقاق کا ممنون نہیں کرتے۔ میں جانتا ہوں تمام امکانی کوشش کے باوجود تحریر میں شکسپیر جیسی قدرت نہیں حاصل کر سکتا، سپہ سالاری اور فن قشون پردازی میں ہنی بال (Hannibal) کا ثانی نہیں ہو سکتا، روحانیت میں مارکس آرلیس (Marcus Aurelius) کی نظیر نہیں بن سکتا لیکن کبھی کبھی افق دماغ پر امید کے خطوط احمر دکھائی دیتے ہیں جن کی ہلکی شعاعیں بتاتی ہیں کہ ایک وقت آسکتا ہے جبکہ ان تینوں باکمالوں کی خصوصیتیں شخص واحد میں بیک وقت جمع ہو جائیں اور آیندہ نسلوں کے سامنے میں فتح یابی اور کامرانی کا تاج پہنے ہوئے دکھائی دوں۔ یہ امید ہی کی خوشیاں اور شعبدہ بازیاں ہیں کہ وہ رفعتیں جو ہماری بلند پروازیوں سے باہر ہیں وہاں بھی ہماری امید پہونچ ہی جاتی ہے اور ہمارے لئے معراج کی نوید لاتی ہے۔ سن رشد میں ہم باوجود شکستوں کے اپنے حوصلوں اور حیلوں پر ایک روانی نظر ڈالتے ہیں اور دیدہ و دانستہ امید کے دھندلے لیکن خوشگوار خیال میں اپنے نفس کو مقید کر دینا واقعات کو عقل کی عینک سے دیکھنے کے مقابلہ میں زیادہ قابل ترجیح سمجھتے ہیں۔ شباب کے اس روحانی خواب و خیال کی مثال ٹام سویر (Tom Sawyer) کی زندگی ہو سکتی ہے جو عشق میں رقابت اور ذلت کے باوجود بھی محض وقتی موت کا خواہشمند تھا تاکہ کچھ دنوں کی غیبت اسے پھر عشق سے روشناس اور دنیاوی تعلقات سے دوچار کرا دے۔ یہ تو ہمارے حوصلوں کی حالت ہے اب ہماری حماقت کو دیکھو کہ ہم گناہ کرتے ہیں اور آیندہ بچنے کے لئے فوراً توبہ کر لیتے ہیں لیکن وہ توبہ اسقدر عارضی ہوتی ہے کہ تھوڑی ہی دیر بعد ہم پھر اس کے مرتکب ہو جاتے ہیں۔ اور آیندہ امید کرتے ہیں کہ تائب ہو جائیں گے۔ لڑکپن کی یہ خام خیالی جا ہے ہم زندگی اور بلندی کی آخری منزل ہی پر کیوں نہ پہونچ جائیں ہم سے مفقود نہیں ہو سکتی جس طرح صدیوں کی تہذیب و تمدن کے باوجود کچھ نہ کچھ بربریت و حیوانیت ہم میں موجود رہتی ہے اسی طرح جوانی کی کیف آور وجدانیات اور خیال کی نیرنگیاں ہمارے دماغی سکون پر ہمیشہ محیط رہتی ہیں یقیناً لڑکپن ہی ہماری زندگی کا ابتدائی اور آخری زمانہ ہے اس لئے کہ اس کے خیالات اور توہمات ہم مدت العمر زندہ و باقی رکھتے ہیں۔ ورڈزورتھ (Wordsworth) نے ایک جگہ کیا خوب کہا ہے۔

Child is the father of the man

بچپن اور بڑھاپا یعنی ہماری زندگی کے آغاز و انجام کی تشبیہ اس سے ہو سکتی ہے کہ ایک فوج یوں منظم کی جائے کہ مقدمۃ الجیش ساقہ کے بالمقابل ہو جائے۔ یہی حالت ہماری بھی ہے۔ ہم تمام دشواریوں کے باوجود بڑھاپے میں بھی گذشتہ خیالات اور نیرنگیوں کا خواب دیکھا کرتے ہیں اور شباب کے خوش منظر و سحر کن حوصلوں کی دلربا منزل کی طرف واپس آتے رہتے ہیں۔ جوانی میں امیدوں کی فراوانی اور عقل کی کمی ہی کا نتیجہ ہے کہ ہم خیالی پلاؤ پکایا کرتے ہیں۔ ہم ہر گناہ کو آخری جانتے اور ہر سال کو اپنی زندگی کی اصلاح کا پیش خیمہ سمجھتے

---

[1] یہ مضمون آر۔ ایل۔ اسٹیونسن (R. L. Stevenson) کی کتاب ورجینی بس (Virginibus) Puerisque کے دوسرے مقالہ کا ترجمہ ہے جو درحقیقت پہلے مقالہ "ازدواجی زندگی" کا تکملہ ہے۔

ہیں لیکن پھر گناہ کر ڈالتے ہیں۔ شرابی شراب سے توبہ کرتا ہے اور جلد ہی ساغر و مینا بدست دکھائی دیتا ہے (Pepys) نے مدتوں اپنے اعمال ناشائستہ کے چھوڑنے کے عہد و پیمان کئے اور پھر مبتلا ہوگیا۔ پلگرمس پروگرس (Pilgrims progress) میں مسٹر لنگر آفٹرلسٹ (Mr. Linger after lust) اسّی برس تک گناہ کا ارتکاب اور توبہ کرتا رہا لیکن آخر وقت تک تائب نہ ہوسکا۔ گناہ کرنا اور آیندہ اس سے بچتے رہنے کی امید اور اچھا بننے کی خواہش کرنا سوائے اس کے کہ ہم ہمیشہ گناہوں میں مبتلا رہیں اور کچھ نہیں۔

توبہ کے بعد گناہوں کا شکار نہ ہونا اتنا ہی ناممکن ہے۔ جتنا کہ ہم کسی تیغ سے متموج دریا کے سیلاب کو روکنے کی ناممکن کوشش کریں۔ اخلاقیات میں سحر آفرینیاں او بازیگریاں کام نہیں آسکتیں اس میں محض پہاڑ کا ثبات او سمندر کا سکوت کام دے سکتا ہے۔ ارادوں کی تولید و تزلزل اور پھر توبہ و نیک اعمالی کی امید محض خیالی چیزیں ہیں بعضوں کا خیال ہے کہ شادی انسانی طبیعت کو متلون مزاجی اور گناہوں سے بچانے میں اکسیر کا اثر رکھتی ہے لیکن تجربے ہمیں بتاتے ہیں کہ یہ بھی انسان کی فطرت کو نہیں بدل سکتی۔ میری اس بات کو لوگ غلط سمجھیں گے اس لئے کہ شادی کی اتنی دلچسپیاں ہیں کہ بادی النظر میں یہ نہایت آسان اور مسرت بخش معلوم ہوتی ہے بالخصوص اس وقت جب ہم ایک شریک حیات پاکر تنہائی کے خیالات سے نجات حاصل کرلیتے ہیں۔ شادی سے قبل محبوبہ سے نظر بازی اور معاشقہ کس قدر عمدہ معلوم ہوتا ہے اور ازدواجی زندگی کا تصور ہی اس خیال کو مستحکم کردیتا ہے کہ ہم آیندہ سدھر جائیں گے اور برائیاں دور ہوجائیں گی لیکن افسوس ہم اس قدر سادہ لوح اور بھولے واقع ہوتے ہیں کہ شادی کی اہمیت ہی کو نہیں سمجھتے۔ دنیا میں اس سے بدتر اور حماقت کا کیا کوئی دوسرا کام بھی ہوسکتا ہے؟ جو انسان کہ مجرد زندگی میں اپنے اعمال و کردار کو درست نہ کرسکا کیا وہ شادی کے بعد صحیح راستہ پر آسکتا ہے؟ ممکن ہے کہ ایک انسان فطرتاً اچھا ہو، اس کے خیالات بھی عمدہ ہوں اس وقت قوت ارادی کی کمی اسے خوبیوں کا حامل نہ ہونے دے گی۔ وہ ان باتوں کا عادی ہوجائے گا جن سے ایک وقت بیزار تھا۔ عمدہ جذبہ رکھتا اور عمل نہ کرسکتا انسان اور اس کے ضمیر میں ایک زبردست جنگ پیدا کرادے گا جس کی وجہ سے سکون قلب اس سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہوجائے گا۔ راتوں کو وہ ڈراؤنے خواب دیکھے گا اور گناہوں کی بھیانک تصویریں اسے ہمیشہ مضطرب رکھیں گی۔ اگر وہ مرد ہے تو تکلیفوں کو سکوت کے ساتھ برداشت کرلے گا اور اگر کم ظرف ہے تو دوسری قوتوں اور اسباب کو اپنے افعال کا ذمہ دار بناکر مطمئن ہوجائے گا۔

بہرحال ان تمام باتوں کے باوجود کہ تم نہایت نیک طبع ذکی و ذی حس انسان ہو، تمہاری طبیعت میں شر و فساد نہیں، اور تم عمدہ باتوں سے اپنی بدقسمتی کی وجہ معذور رہے ہو، پھر بھی ہم تو یہ کہیں گے کہ تم نے شادی کیوں کی؟ جب تم مجرد زندگی کو کامیاب نہ بناسکے تو دو زندگیوں کو کیونکر منظم و مربوط رکھ سکتے ہو؟ ایک شہر میں تو امن قائم نہ رکھ سکے کس منہ سے دس شہروں کی حکومت مانگتے ہو؟ کیا تم تنہا زندگی کی ناکامیابی کے بعد اس بات کی امید رکھتے ہو کہ ازدواجی زندگی کو لطف و محبت کا نمونہ بناسکو گے؟ کیا دہر کی ٹھوکروں نے تمہیں زیادہ عقلمند بنادیا ہے؟ نہیں ہرگز نہیں! شادی کرکے تم ان تمام الزاموں کی آماجگاہ بن گئے ہو جنکی عالم تجرد میں عذرخواہی کرسکتے تھے۔ بغیر شادی کے محض تم ہی اپنے کیفر کردار کو پہونچتے لیکن شادی کرکے اپنے گناہوں کی پاداش کے لئے ایک اور شریک لاتے ہو کیا تمہیں کوئی حق ہے کہ دوسرے تمہارے گناہوں کی سزا بھگتیں؟ تنہا زندگی میں تم یہ بھی کہہ سکتے

تھے کہ ماحول اور مقدر نے تمھیں گناہوں کی ترغیب دی، خدا ہی نے تمھیں ایسا بنا دیا تھا کہ تم مجبور اور قسمت کے ہاتھوں میں ایک کٹ پتلی تھے۔ تمھاری حیثیت مثل ایک خادم کے تھی اور خدا تم سے جو کراتا تھا تم کرتے تھے۔ لیکن ازدواجی زندگی میں یہ عذر لنگ قابلِ پذیرائی نہیں۔ خدا نے تمھیں بنایا تھا لیکن اس نے تمھاری شادی تو نہیں کردی تھی۔ اس کا کون ذمہ دار ہے؟ ذمہ داری محض تمھارے اوپر ہے کہ تم نے اپنی حماقت اور اس جری اقدام سے اپنے کو اور ساتھ ہی ساتھ ایک اور بے گناہ کو تباہی و بربادی کے گھاٹ اتار دیا۔ یہ بھی یاد رہے کہ اس جرم کی اہمیت یوں اور بھی بڑھ جاتی ہے کہ جس کی خوشی تمھارا نصب العین ہوتا، جس کو زندگی کے نشیب و فراز اور تباہی سے متنبہ کرنا تمھارا فرض تھا اور جس کے لئے تم جان تک سے دریغ نہ کر سکتے تھے، جس کی شادی اگر کہیں اور ہو جاتی تو تم یقیناً جان دیدیتے۔ ایسے متبرک اور پیارے محبوب کو تم اپنی حماقتوں سے برباد اور گناہوں کی قربان گاہ پر چڑھانے کو تیار ہو گئے ہو ذرا اپنے دل پر ہاتھ دھرو اور پوچھو کہ اگر یہی سلوک کوئی تمھاری بہن کے کرتا تو کیا تم برداشت کر سکتے؟ کیا تم قصاص لینے اور اس کے ہلاک کرنے کے لئے تیار نہ ہو جاتے؟

شادی شدہ کی زندگی ناکتخدا کی زندگی سے بڑا فرق رکھتی ہے۔ زندگی کی شاہراہ میں پہلے تمھارے لئے لبے اعتدالیوں کے گلزار موجود تھے جہاں تم قدرے استراحت کر سکتے تھے لیکن اب قبر تک راستہ سیدھا ہے۔ پہلے تم سیدھے راستہ سے کج بھی ہو سکتے تھے تمھارا کوئی دیکھنے والا نہیں تھا لیکن اب جب پھر تم اپنی طبیعتِ ثانیہ کے تقاضے سے جرم کرو گے تو اس کا کیا نتیجہ ہوگا؟ ناکتخدا کے لئے جوانی میں جو باتیں طرۂ امتیاز تھیں اور جن کو وہ بلا ارادہ کیا کرتا تھا اب ان کا اعادہ کتنا تکلیف دہ ہوگا تمھیں اپنے کو روکنا پڑے گا ورنہ اعتبار و اعتماد کی پائیدار دیوار جس کو بیوی ابھی تک نہایت مستحکم و استوار سمجھتی تھی اس کی نظروں میں متزلزل و منہدم دکھائی دیگی اور تم بیوی کی نظروں میں سبک و ذلیل ہوکر رہ جاؤ گے۔ پہلے تم اپنے فعلِ قبیح کو "ہوں ہاں" کہہ کر ٹال سکتے تھے گر اب تو ایک رازدار موجود ہے وہ کیا خیال کرے گی؟ غریب تمھیں محض بری نظروں ہی سے نہ دیکھے گی بلکہ بہ جبر تمھارے گناہوں کے مہلک نتیجہ کا شکار بھی ہو جائے گی۔ تم نے زمانہ تجرد کے گناہوں کو صیغۂ راز میں رکھا اور زمانہ کو دھوکہ دے کر محبوبہ کی نظروں میں اپنے کو وقیع بنایا لیکن آج ساری قلعی کھل گئی۔ تم کہو گے کہ ازدواجی اور مجرد زندگی دونوں تمھارے لئے یکساں ہیں اس لئے کہ پہلے تمھیں تمھارا ضمیر اور خدا کا خوف روکتا تھا اور آج ان کی جگہ بیوی نے لے لی ہے وہ بھی بآسانی تمھیں ارتکاب گناہ سے منع کر سکتی ہے۔ لیکن غور تو کرو ان دونوں باتوں میں کتنا فرق ہے۔ ضمیر ایک وہمی و خیالی تصویر ہے۔ بیوی ایک زندہ جیتی جاگتی نگران ہے جو تمھارے ہر کام میں حاضر و ناظر ہے۔ وہ تمھیں نصیحت کرے گی، تمھارے مظالم پر روئے گی اور تمھارے گناہوں کی بیداد پر گھٹ گھٹ کر ختم ہو جائے گی۔ تم اس کی شکایتوں کو ٹھکرا نہیں سکتے۔ وہ تمھاری ہمزاد ہے جو تمھارے ہر گناہ کو لکھتی رہے گی۔ ایسی حالت میں تمھارے لئے اب زندگی میں کوئی چارہ نہیں تم خودکشی بھی نہیں کر سکتے سوائے اس کے کہ اپنے کو سدھارو لیکن اس کے لئے بھی قوت ارادی اور ضبط کی ضرورت ہے جو تم میں مفقود ہے۔

مجرد انسان سے بہ نسبت ایک شادی شدہ کے ہم خوبیوں کی زیادہ توقع کر سکتے ہیں اس لئے کہ کنوارا بس اپنے ضمیر کی پیروی کرتا ہے کسی کا محکوم نہیں۔ لیکن شادی شدہ کے سامنے دو نظریے پیش رہتے ہیں یعنی اپنی خواہش اور بیوی کی مرضی۔

عموماً لڑکے اور لڑکی کی نشو و نما متضاد ماحول میں ہوتی ہے۔ لڑکی گھر کی چار دیواری میں اپنے عزیز و اقارب کے سایہ میں پرورش پاتی ہے۔ انہیں کے احکام کی مطیع و فرمانبردار رہتی ہے۔ ان کا حکم اس کے لئے بمنزلۂ قانون ہے وہ نہ دنیا سے واقف اور نہ اپنی ذمہ داری سمجھ سکتی ہے۔ اسے محض والدین کی کورانہ تقلید پر مجبور ہونا پڑتا ہے اور اپنی ذاتی رائے کو نظر انداز کردیتی ہے۔ مرد اپنی رائے کا مالک اور مختار کل ہے۔ اپنی زندگی کی چھوٹی سی سلطنت پر جس طرح جی چاہتا ہے حکومت کرتا ہے اپنے اخلاق کو جیسا جی چاہتا ہے ڈھال لیتا ہے اور تمام امور میں اپنے ضمیر کا اتباع کرتا ہے چاہے وہ غلط راستہ پر لیجائے یا صحیح پر۔ جب دو اس قسم کی متضاد طبیعتیں باہم منسلک کردی جائیں گی تو اس کا نتیجہ بدیہی ہے۔ قدم قدم پر اختلاف اور جھگڑوں کا پیدا ہونا لازمی ہے جسے کوئی قوت وطاقت نہیں روک سکتا۔ مرد عورت کو ہم مزاج نہیں بنا سکتا، عورت اپنی قدامت پرستی نہیں چھوڑ سکتی۔ ایک دوسرے کی رائے کے خلاف کام کرے گا۔ عورت کمزور ہے مرد کو اس کے مقابلہ میں دبنا پڑیگا اپنے ارادوں اور رایوں میں ترمیم اور خواہشوں کو زائل کرنا ہوگا تاکہ بیوی کو تکلیف نہ ہو۔ مرد ہمیشہ آزاد رہا ہے وہ ان قیود کو کیونکر برداشت کرسکتا ہے اور کیونکر دیکھ سکتا ہے کہ بیوی دوسری راہ پر جائے اور اس کے خلاف کرے؟ اور پھر یہ بات بھی رہ جاتی ہے کہ اگر مرد تنہا زندگی میں گناہوں کا مرکز بنا رہا ہے تو اس وقت وہ کیسے یک بارگی تائب ہوجائے گا؟ دیوِ شہوت کیونکر روح القدس بن جائے گا؟ نتیجہ یہ ہوگا کہ زن و شوہر روز بروز اپنے بلند معیار زندگی سے پست ہوتے جائیں گے۔ مزاج شناسی اور ہم آہنگی ہر وقت کم ہوتی جائے گی۔ کچھ عرصہ تک اس اختلاف و نفرت کے باوجود ناؤ چلتی رہے گی لیکن تابکے۔ جلد وہ زمانہ آئے گا کہ یہ کشتی اختلاف کے گرداب میں امواج مخالف کا نشانہ بن جائے اور عشق دونوں دلوں کی بستی سے صدائے رحیل بلند کرے۔ شوہر و بیوی دونوں کو اپنی اپنی جگہ پر خود احساس ہوگا کہ انھوں نے کتنی بڑی غلطی کی۔ بیوی کو معلوم ہوجائے گا کہ اس کا شوہر جس کی اس نے اتنے عرصہ تک پرستش کی ہے کتنا برا ہے اور شوہر اپنی بیوی کے حسن ظن اور شادی سے قبل کے زرین و خوش آیند خیالات کو بالکل محو کردیگا۔ عشق ان کی زندگیوں کو خیرباد کہہ دے گا اور دونوں کے درمیان نفرت کی وہ خلیج حائل ہوجائے گی جسے دنیا کی کوئی قوت پر نہ کرسکے گی۔

کبھی کبھی مرد نسائیت پسند ہوتا ہے لیکن پھر بھی دونوں انسانی خوبیوں کے دو مستقل ابواب ہیں۔ مرد مرد ہی ہے اور عورت عورت ہی کیسے ایک دوسرے میں ممزوج ہو سکتے ہیں؟ اس لئے کہ دونوں کی نمایاں خصلتیں ایک دوسرے سے قطعاً مماثلت نہیں رکھتیں۔ مرد اپنے حاکمانہ برتاؤ کو روا رکھے گا اس لئے کہ یہ اس کی فطرت ہے۔ عورت اس سے بغاوت کرے گی اور متنفر رہے گی اس لئے کہ وہ سمجھتی ہے کہ کوشش کے باوجود وہ مرد کو عورت تو بنا نہیں سکتی۔ اسی طرح ممکن ہے کہ مرد کسی عورت میں مردانہ عنصر زیادہ پائے اور خوش رہے لیکن ایک روز اسے معلوم ہوجائے گا کہ عورت درحقیقت وہ شئے نہیں جس کا وہ متلاشی تھا۔ خوبیوں کا مسئلہ ایک دوسرے جنس سے ناواقفیت کی وجہ سے اور بھی زیادہ تاریک ہوجائے گا اور اسی طرح عورت و مرد لیٹن (Latin) اور ٹیوٹانک (Teutonic) نسلوں کی طرح کبھی بھی ایک دوسرے سے ہمدردی اور ہم آہنگی نہیں پیدا کرسکتیں۔

مرد عورت کو حور سمجھتا ہے جس کی پرورش فردوس میں ہوتی ہو، جو من و سلویٰ کے علاوہ دنیاوی غذا کو جانتی ہی نہ ہو۔ جو ازلی و ابدی نغمے کے علاوہ دنیا کی کسی چیز سے واقف ہی نہ ہو،

تبرک اور مقدس ہونے میں اپنا جواب نہ رکھتی ہو۔ ایسی عورت کو چڑیل سمجھنا بڑے کفر کی بات ہو گی لیکن حقیقت خود ظاہر کر دے گی کہ وہ چڑیل سے بھی بدتر ہے اس وجہ سے کہ وہ شرابی، جھوٹی، چور اور سیکڑوں عیوب رکھتی ہے ہاں بس اس کے سینہ میں دل نہیں۔ مثال کے لئے جارج ایلیٹ (George Eliot) کے ناول مڈل مارچ (Middle march) میں لیڈگیٹ (Lydgate) کو دیکھو کہ وہ شادی سے قبل روزامنڈ ونسی (Rosamond Tincy) کو حور سمجھتا تھا لیکن اسے جلد معلوم ہوا کہ وہ خباثت کی مجسمہ اور ہزاروں گناہوں اور بدکاریوں کی حامل تھی۔ عورتوں کو ملکوتی سمجھنا مرد کے لئے نہایت خطرناک اور مغالطہ انگیز ہے۔ شادی کرتے وقت عورت کو بس یہ سمجھو کہ تم زندگی میں ایک ایسا شریک پیدا کر رہے ہو جو عالم علوی اور لاہوتی کی باشندہ نہیں، تمہاری ہی طرح ایک مخلوق ہے ویسی ہی ناقص و نامکمل۔ وہ بھی تمہاری ہی طرح ہڈی و گوشت کا ایک ڈھانچہ ہے، تمہاری ہی طرح خواہشوں کا مرکز اور آرزوؤں کی قیام گاہ ہے۔

تعلیم، زن و شوہر میں نفرت کی خلیج زیادہ عمیق کرنے والا ایک دوسرا عنصر ہے۔ تعلیم کا تو اصل مقصد یہ ہونا چاہئے تھا کہ ہم میں روشن خیالی اور جودت پیدا ہو، مزاج شناسی اور مادۂ ہمدردی و جذبۂ ایثار رونما ہو جس سے کہ ہم ایک دوسرے کی لغزشوں کو نظر انداز کر دیں۔ انسان محض پیٹ ہی نہیں رکھتا اسے روحانی غذا کی بھی ضرورت ہے جس کی ذمہ دار تعلیم ہے لیکن موجودہ نظام تعلیم کہاں تک اس مقصد کو پورا کرتا ہے۔ شروع ہی سے بچوں کو کچھ معینہ چیزیں پڑھائی جاتی ہیں اور ابتدا ہی سے ان کے نظریے ایک دوسری جنس سے مختلف کر دیئے جاتے ہیں۔ لڑکی کی پرورش ایک محدود حلقہ میں ہوتی ہے، اسے دنیا کی کوئی واقفیت حاصل نہیں کرنے دی جاتی۔ لڑکوں کے لئے زندگی ایک سربمہر کتاب نہیں وہ اسے پڑھتے اور اپنے خیالات کو ذاتی تجربوں سے ہم آہنگ کرتے رہتے ہیں اور یوں بہ نسبت لڑکیوں کے وہ زیادہ سمجھدار ہو جاتے ہیں۔ ماحول کے اختلاف کی وجہ سے لڑکی اور لڑکے دو متضاد نظریوں کے مالک ہو جاتے ہیں، جن کی پسند مختلف، جن کے طرز و طریقے مختلف اور جن کے تجربے مختلف۔ اس قسم کی تعلیم و تربیت کے بعد جب دونوں کی شادی ہو گی تو اس کی یہی مثال ہو گی کہ ایک گاڑی پر دو خودرائے مسافر ایک ایک لگام ہاتھ میں لئے بیٹھے ہوں اور گھوڑے کو اپنی اپنی مرضی کے مطابق چلانا چاہیں یہاں تک کہ گاڑی گڑھے میں گر جائے۔ مزاج اور طبیعت کے فرق سے ان دونوں کی ناؤ بھنور میں پڑ کر ڈوب جائے تو تعجب نہ کرو، تعجب اس کا کرو کہ وہ کیونکر سلامتی کے ساتھ بندر نجات تک پہونچ گئی، اس لئے کہ [illegible] کی حالت تو یہ تھی کہ مرد بڑے سے بڑے گناہ کو حقیقت سمجھتا تھا، عورت محض تصور ہی پر کانپ جاتی تھی۔ عورت جس بات کو اخلاق کا شاہکار سمجھتی تھی مرد اسے ذلیل ترین نظریہ قرار دیتا تھا۔ اس زبردست اختلاف کے متلاطم سمندر سے وہ اپنی کشتی کو کھیتے ہیں، ایک دوسرے کی عزت ملحوظ رکھتے ہیں، بال بچے ہوتے ہیں اور جب وہ بھی بڑے ہوتے ہیں تو والدین ہی کے نقش قدم پر چلتے ہیں۔

ان باتوں کے لکھنے کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ تم شادی نہ کرو۔ اگر تم میدان جنگ سے موت کے خوف سے بھاگو گے تو بزدل اور ذلیل کہلاؤ گے۔ پہاڑ سے ٹکر لینا اور فنا ہو جانا اس سے بہتر ہے کہ تم پہاڑ کی عظمت سے ہمیشہ مرعوب رہو۔ تکلیف سے انسان بہتر ہی بنتا ہے یہ کسی طرح مضر نہیں۔ مصیبت سے بچنے کے لئے تم خدا سے دعا کرو لیکن مصیبت سامنے آجائے اور تم اس کا مقابلہ نہ کرو یہ

یقیناً ذلت و بزدلی کی دلیل ہے اور اسی وجہ سے Browning کی نظم (Ring & the Book) میں (Pope) کا (Caponsacchi) کو قابلِ عزت قرار دینا یقیناً صحیح ہے اس لئے کہ اس نے اگرچہ شکست کھائی لیکن مصیبت کا بہادری سے مقابلہ تو کیا۔ ضمیر بغیر شجاعت و تہور کے قابلِ نفرین ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ تم شادی سے خائف اور بھاگتے رہو بلکہ اس کے خطرات سے آگاہ ہو جاؤ۔ خطرے سے ڈرانا اور چیز ہے اور اس سے آگاہ کر دینا اور چیز ہے دونوں کو ایک نہ سمجھو۔ میرا مطلب محض اتنا ہے کہ تم شادی کی اہمیت سے واقف ہو جاؤ اس کی بنیاد امید پر نہ رکھو بلکہ مذہب پر اس لئے کہ امید اگرچہ خوش منظر ہے لیکن ساتھ ہی ساتھ نہایت گمراہ کن، اس کے برخلاف مذہب سنجیدہ تجربہ کار اور ہمدرد ہے۔ امید کی تخمیر جہالت کے آب و گل میں ہوتی ہے، مذہب ٹھوس حقایق پر قائم ہے۔ امید محض کامیابی کا خواب دیکھتی ہے، مذہب شکستوں کے بعد تمہیں کامیابی سے روشناس کراتا ہے تاکہ آیندہ تم شکستوں کا تدارک کر سکو۔ امید آسمان پر چڑھنے کی ترغیب دیتی ہے اور وہاں سے گرنے کے بعد تمہیں بدحواس کر دیتی ہے، مذہب تمہارے ارادوں اور حوصلوں میں اعتدال پیدا کر دیتا ہے اور تمہاری کمزوریوں کو بتا کے بعد تمہیں معزز کر دیتا ہے۔ امید بیوی کو حور و ملک بتاتی ہے، مذہب کہتا ہے کہ وہ بھی ہماری ہی ایسی ایک مخلوق ہے۔ دوران تعلیم میں تم بڑے بڑے حوصلے کرو، بڑی بڑی امیدوں سے وابستہ رہو لیکن شادی سے قبل اس پر غور کر لیا کرو کہ دنیا میں خوبیاں نہیں ہیں، بلکہ اچھائی اور برائی کا زبردست تعاون عمل نظامِ عالم میں کارفرما ہے۔ محض مذہب پر شادی کی بنیاد قایم کرکے تم سمجھ سکتے ہو کہ تمہاری بیوی حور نہیں اس میں بھی اچھائی اور برائی دونوں موجود ہیں اور بہرحال وہ ایک انسان مرکب خطا و نسیان ہی ہے۔ اس خیال کے ساتھ یقیناً ازدواجی زندگی کامیاب ہو سکتی ہے اور میاں بیوی خوبیوں کی طرف تیزی سے گامزن نظر آئیں گے۔

اقبال انصاری
(لکھنؤ یونیورسٹی۔ لکھنؤ)

تصور

آئی جو ایک بار تو آتی چلی گئی — دنیائے دل کو یاد دلاتی چلی گئی
آغاز کرکے قصۂ دیرینۂ جنوں — ماضی کی یاد رنگ جماتی چلی گئی
گاہے گھٹا کے پردے سے گاہے نظر سے — مکھڑا حسین اپنا دکھاتی چلی گئی
کھلنے نہ پائے تھے ابھی اسرارِ حسن و عشق — وحشت ہی سوزِ دل کو بڑھاتی چلی گئی
مجھ سے نظر ملا کے بہ اندازِ بے خودی — ساغر لیے ہوئے کوئی آتی چلی گئی
مجھ کو شرابِ ناب کا ساغر پلا کے سحر — وہ کون تھی جو مست بناتی چلی گئی

مظہر قریشی سحر

چیخوف کی آپ بیتی

یہ آپ بیتی انطون چیخوف کے ایک خط مورخہ ۱۱ر اکتوبر ۱۸۹۹ء سے لی گئی، جو کہ ڈاکٹر جی، آئی رسولی موکا موسومہ ہے۔ ۱۸۸۴ء میں جن ڈاکٹروں نے ڈگریاں لی تھیں ان میں چیخوف بھی شامل ہے، ڈاکٹر رسولی موان لوگوں کی ایک انجمن امداد باہمی کے خزانہ دار تھے۔ اس خط میں چیخوف لکھتا ہے: "جناب میری آپ بیتی طلب فرماتے ہیں، ناچیز تو آپ بیتیوں کا مریض ہے۔ اپنے مخصوص حالات کا مطالعہ، اس پہ مصیبت یہ کہ ان کو طبع کرنے کی غرض سے قلمبند کروں، میرے لئے انتہائی تکلیف دہ امر ہے۔ تاہم ایک علیلی کا عذر پر میں نے اپنی زندگی کے چند حقایق پیش کر دیئے ہیں۔ جناب! اس سے زیادہ کچھ لکھنا میرے امکان سے قطعی باہر ہے۔"

میرا نام انطون چیخوف ہے۔ میری پیدائش ۱۷ر جنوری ۱۸۶۰ء کو بمقام ٹگن راگ ہوئی۔ میری ابتدائی تعلیم کنگ کنسٹانٹین چرچ میں ہوئی۔ اس کے بعد ٹگن راگ گرامر اسکول میں پڑھتا رہا۔ ۱۸۷۹ء میں ماسکو یونیورسٹی کے شعبۂ طب میں داخل ہوگیا۔ اس زمانے میں مختلف فنون کے متعلق عام طور پر میری کوئی مستقل رائے نہیں تھی۔ شعبۂ طب کو میں نے کیوں پسند کیا، اس کی کوئی وجہ مجھ کو یاد نہیں۔ لیکن اس انتخاب سے مجھ کو بعد میں کوئی تاسف نہیں ہوا۔ ابھی میں سالِ اول میں تھا کہ میں نے روزناموں اور ہفتہ وار پرچوں میں مضامین شایع کرنے شروع کر دیئے۔ اور اوائل ۱۸۸۰ء میں ان مصروفیات نے مستقل اور پیشہ ورانہ صورت اختیار کر لی۔ ۱۸۸۸ء میں مجھ کو "پشکن پرائز" سے سرفراز کیا گیا۔ ۱۸۹۰ء میں مجرمین کی مقامی نو آبادی کے متعلق کتاب لکھنے کی غرض سے سگھالین گیا۔ میری بیس سالہ ادبی خدمات مختصراً یہ ہیں: "بے شمار قانونی پوشیدہ تبصرے، چھوٹے بڑے مضامین، اطلاعات اور جو کچھ بھی آئے دن جرائد میں شایع کیا کرتا، ان سب کو تلاش و جمع کرنا دشوار امر ہے، ان کے سوا بشمول ناول و افسانہ، تین سو کتابیں شایع کیں۔ میں نے تھیٹر کے لئے ڈرامے بھی لکھے ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ میڈیکل سائنس کے مطالعہ نے میری ادبی خدمات پر نہایت گہرا اثر ڈالا، اس سے میرے غور و تفکر میں وسعت حاصل ہوئی اور قیمتی معلومات سے بہرہ اندوز ہوا۔ بحیثیت مصنف میرے نزدیک ان کی جو قدر و وقعت ہے، اس کا صحیح احساس اسی شخص کو ہو سکتا ہے جو خود بھی ڈاکٹر ہو۔ اس میں میں ہدایت و رہنمائی کی قوت محسوس کرتا رہا۔ اور شکر ہے کہ خواص الادویہ کے علم نے مجھ کو اکثر غلطیوں سے پاک رکھا۔ طبعی علوم کی معلومات اور سائنٹفک قواعد و ضوابط میرے لئے ہمیشہ نگران کار و نگہبان ثابت ہوئے۔ جہاں تک ہو سکا میں نے سائنٹفک اصول کو پیش نظر رکھا، اور جب کبھی یہ ممکن نظر نہیں آیا تو میں نے کچھ نہ لکھنے ہی کو ترجیح دیا۔ برسبیل تذکرہ میں یہ خیال ظاہر کرتا ہوں کہ آرٹ سے پیدا کی ہوئی کیفیتیں، سائنٹفک اصول سے ہمیشہ مماثلت نہیں

رکھتیں۔ مثلاً زہر کھانے کے بعد فی الحقیقت جو واقعات ظہور پذیر ہوتے ہیں، ان کی صحیح تصویر اسٹیج پر کھینچنا ناممکن ہے، لیکن ایسی تمثیل میں بھی سائنس کے حقائق کا احساس لازمی ہے۔ یعنی پڑھنے اور دیکھنے والے کے لئے یہ امر بالکل صاف ہونا چاہیے کہ یہ محض تمثیل ہے، مگر اس کا سابقہ ایک ایسے مصنف سے ہے جو صورت حال سے بخوبی باخبر ہے۔ میرا شمار ان قصہ نویسوں میں ہے جو سائنس کے متعلق منفیانہ پہلو اختیار کرتے ہیں، اور نہ میرا تعلق اس جماعت کے افراد سے ہے" جو ہر چیز کے متعلق صرف اپنی ہی سمجھ سے نتیجہ اخذ کرتے ہیں

(نوٹ از مترجم:- چیخوف کو آپ بیتی لکھنے سے دلی نفرت تھی۔ اس کی پوری تحریرات میں صرف اتنا ٹکڑا مسلسل ملتا ہے۔ اس کی زندگی کے آخری اہم واقعات یہ ہیں۔ سنہ ۹۱-۱۸۹۰ء میں اس نے ایشیا اور مغربی یورپ کی سیر و سیاحت کی۔ سنہ ۱۸۹۷ء میں ڈاکٹروں نے اس کے مرض دق میں مبتلا ہو جانے کی تشخیص کی، اور ان کے مشورے سے سنہ ۱۸۹۹ء میں بمقام کریمیا منتقل ہو گیا سنہ ۱۹۰۱ء میں ماسکو آرٹ تھیٹر کی ایک ایکٹرس سے شادی کر لی۔ سنہ ۱۹۰۴ء میں بمقام بیڈن ویلر (جرمنی) اس عظیم الشان ہستی نے اپنی لازوال خدمت اور شہرت کو چھوڑ، اس دار فانی سے عالم جاودانی کی راہ لی۔ تجہیز و تکفین کی رسم ماسکو میں عمل میں لائی گئی)

ایس۔ بی۔ انفتا

پاگل

بے چین یہ نگاہ یہ اکھڑے ہوئے قدم — کچھ تو بتا مجھے! تجھے کس بات کا ہے غم

بکھرے ہوئے ہیں بال، بدن پر ملی ہے خاک — آنکھیں ہیں سرخ سرخ، گریباں ہے چاک چاک

ہاتھوں میں کس لئے ہے یہ پتھر لئے ہوئے — اور پیچھے پیچھے شورشِ محشر لئے ہوئے

تو کس کی جستجو میں پریشاں ہے صبح و شام — اک جا نہیں ہے تیری سکونت، ترا مقام

پروا نہیں مصائب و آفات کی تجھے — خواہش نہیں جہاں میں کسی بات کی تجھے

یہ کیوں لگی ہے لب پہ ترے مہرِ خامشی — گرم سخن تھا محفلِ دنیا میں تو کبھی

شاید یہاں نہیں ہے کوئی تیرا ہم زباں
ہے اس لئے نگاہ تری سوئے آسماں

مرزا سیمابی عالمپوری

پکوان اور خانہ داری

جس طرح انتظام خانہ داری عورت کے اہم فرائض میں داخل ہے اسی طرح پکوان سے واقف ہونا بھی ضروریات زندگی میں سے ہے۔ کیونکہ جب تک پکانے سے پوری پوری واقفیت اور اس کا تجربہ نہ ہو انتظام خانہ داری مکمل نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ اپنی اس ضرورت اور کمی کو محسوس کرتے ہوئے بھی اس طرف غور کرنے کی کوشش نہیں کی جاتی اور اس لئے یہ ہنر جو خاص عورتوں کے لئے ہے توجہ کا محتاج بن کر رہ گیا ہے۔

ایک عام بات ہے کہ گھر والی سے گھر ہوتا ہے۔ لیکن جب گھر والی ہی اپنی ذمہ داریوں سے غافل اور بے پرواہ ہوگی تو وہ گھر چلے گا کیسے؟ اور بعض دفعہ یہ معمولی سی غفلت زندگیوں کی تباہی کا باعث ہو جاتی ہے۔ چونکہ سب کی طبیعتیں یکساں نہیں ہوتیں اس لئے بعض اگر ہر حال میں خوش رہنے کے عادی ہوتے ہیں تو بعض ایسے بھی ہوتے ہیں جو گھر اور اس کی ہر چیز کو مکمل دیکھنا چاہتے ہیں۔ اور ایسی صورت میں ذرا ذرا سی غلطیاں رائی کا پہاڑ بن جاتی ہیں جس کو نفاق کی جڑ سمجھنا چاہئے۔ حالانکہ ایسے واقعات بہت کم ہوتے ہیں لیکن ان کا ہونا ممکنات سے ہے۔ اس لئے ان ذمہ داریوں کو جو ہمارے جزو زندگی ہیں کبھی فراموش نہیں کرنا چاہئے۔

آج کل کی تعلیم یافتہ اور روشن خیال لڑکیاں کبھی خانہ داری اور پکانے کی طرف توجہ نہیں کرتیں۔ بلکہ گھر کے کام کاج کو ذلیل اور اپنی شان کے خلاف سمجھ کر اس سے گریز کرتی ہیں۔ جس کا ان کی آئندہ زندگی پر کافی برا اثر پڑتا ہے۔ میں نے بارہا دیکھا ہے کہ اگر ایسی لڑکیوں کو گھر والوں نے کہہ سن کر کبھی کبھار باورچی خانے میں بھیجدیا ہے تو اس کے سوا نتیجہ کچھ نہیں نکلا کہ کبھی ہاتھ جلے یا کپڑے اور جو چیز وہ پکا رہی تھیں ادھوری چھوڑ چھاڑ کر چلی آئیں۔ اور پھر گھر والوں نے ایسی توبہ کی کہ چولہے کے پاس بھیجنے کا نام نہ لیا۔ اب بتائیے کہ لڑکیوں کو پکانے یا خانہ داری کا سلیقہ آئے تو کیونکر؟ پہلے لڑکیوں کو معمولی تعلیم کے ساتھ امور خانہ داری اور پکانے میں خاص طور سے لگا دیا جاتا تھا۔ اور جہاں لڑکی بڑی ہونے لگی اور ماں نے اس سے رفتہ رفتہ گھر کے کام کاج لینے شروع کئے اور اس طرح اس کی عمر کے ساتھ اس میں انتظام خانہ داری اور پکوان کا تجربہ اور سلیقہ کافی پیدا ہو جاتا تھا جس کی وجہ سے وہ اپنے گھر میں ایک منتظم بیوی ثابت ہوتی تھی۔ مگر اب ایسا زمانہ آیا ہے کہ سب نے اپنی ذمہ داری اور فرض کو بھلا کر اپنی لڑکیوں کو انگریزی تعلیم اور فیشن کے سپرد کر دیا ہے۔ اور کبھی بھول کر بھی یہ خیال نہیں کیا جاتا کہ جس چیز کو وہ غیر ضروری سمجھ کر نظر انداز کئے ہوئے ہیں اس کا لڑکی کی آئندہ زندگی پر کتنا برا اثر پڑے گا۔

میرا یہ مطلب بھی نہیں کہ لڑکیوں کو اعلیٰ تعلیم نہ دی جائے بلکہ ضرورت اس کی ہے کہ تعلیم کے ساتھ ساتھ ان کو پکوان اور امور خانہ داری سے بھی بخوبی واقف کرایا جائے۔ تاکہ وہ اپنے گھر کا انتظام حسن و خوبی سے انجام دے سکیں۔

یہاں مجھے ایک واقعہ یاد آگیا جو دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

ایک تعلیم یافتہ لڑکی کی شادی ہوئی اور میاں شادی کے تھوڑے دن بعد ہی اس کو ضلع پر اپنے ساتھ لے گئے۔ کچھ دنوں تو انھوں نے اپنی بہن کو ساتھ رکھا کہ نئی دلہن پر جاتے ہی گھر کا بار نہ پڑے آخر بہن بھی کب تک رہتی؟ کچھ دن کے بعد وہ بھی چلی گئی۔ اور اب گھر کی دیکھ بھال مکمل طور پر بیوی کے سپرد کر دی گئی۔ جس گھر میں عرصے سے مردوں اور وہ بھی نوکروں کا لے ڈھنگا راج ہو وہاں کی بد انتظامی کا پوچھنا ہی کیا۔ چنانچہ بیوی نے گھر سنبھالنا چاہا اور جو سمجھ میں آتا کرتی رہیں۔ لیکن ناتجربہ کاری سے اکثر کام بگڑ جاتے اور یہ دل ہی دل میں خفیف ہو کر رہ جاتیں اور اپنی ناتجربہ کاری

اور غلط اندازے کی وجہ ہمیشہ پریشان رہتیں۔

آخر انھوں نے یہی مناسب سمجھا کہ فی الحال گھر کو نوکروں کے بھروسے پر ہی چھوڑ دینا چاہئے تاکہ ان کی جان اِس عذاب سے بچے الغرض اس طرح وہ گھر جو اچھے انتظام اور سلیقہ کا محتاج تھا جوں کا توں ہی رہا۔ ایک دن میاں نے اپنے چند دوستوں کو کھانے پر بلایا۔ اور بیوی سے اچھے اور نفیس کھانوں کی فرمائش کی اور خاص طور سے میٹھے پکانے کو کہا۔ اور ساتھ ہی وقت پر کھانا تیار کروا دینے کی بھی تاکید کر دی۔ اب بیوی کی سنئے کہ بچاری نے نہ کبھی خود پکایا تھا اور نہ پکوانے کا تجربہ رکھتی تھی۔ خیر دوسری چیزیں تو نوکروں نے تیار کرنے کی حامی بھری لیکن میٹھے بیگم صاحبہ کی پسند پر رکھے گئے۔ میٹھے تو اِن کو بہت سے معلوم تھے لیکن کبھی پکائے نہیں تھے۔ اس لئے نوکروں کو جو الٹا سیدھا یاد تھا بتا دیا اور انھوں نے جس طرح دل چاہا تیار بھی کر دئے۔ غرض کھانا مہمانوں کے سامنے چنا گیا اور جب میٹھا کھانے کی نوبت آئی تو میٹھے میں مکھیوں کے پر اور کوڑے بھرے ہوئے۔ بچارے مہمان بغیر کھائے اٹھ کھڑے ہوئے۔ اصل وجہ یہ تھی کہ نوکروں نے حسب عادت شکر اور گھی وغیرہ کھلا رکھ دیا تھا جس کی وجہ سے مکھیاں اور کوڑے اس میں پڑ گئے اور جلدی میں نوکروں نے اس کی طرف غور نہ کیا اور ویسے کا ویسا جھونک دیا۔ اور اس طرح لگی لگائی لاگت بھی خراب ہوئی اور غریب گھر والوں کو ندامت و شرمندگی الگ۔ دوست بھلا کب چوکنے والے تھے دنوں اپنے میزبان کو ستاتے اور بناتے رہے۔ لیکن اس واقعہ کے بعد سے اس لڑکی کو اپنی سب سے بڑی ذمہ داری کا احساس اتنا ہوا کہ وہ گھر کے ہر کام میں خود حصہ لینے لگی اور کسی موقعہ پر بھی کبھی نوکروں پر بھروسہ نہ کرتی۔ اور خود کام کرنے کی وجہ سے تھوڑے عرصے میں خاصا تجربہ اور ہر چیز کا اندازہ ہو گیا۔ اور اب میٹھے میں کبھی مکھیوں کے پر اور کوڑے نظر نہیں آتے۔

کاش لڑکیاں اور لڑکیوں کی مائیں اس طرف خاص طور سے توجہ کریں اور لڑکیوں کو ضرور پکوان سے واقف ہونے کا موقعہ دیں۔ بڑی خوشی کی بات ہے کہ پھر از سر نو خانہ داری اور پکانے کا شوق پیدا ہو رہا ہے اور ہر مدرسے میں تعلیم کے ساتھ اِس کی تعلیم بھی باقاعدہ ہو رہی ہے جس میں خاص طور سے مدرسۂ صنعت و حرفت میں ہر قسم کے پکوان اور خانہ داری کے ساتھ اور بہت سے مختلف کام بھی سکھائے جا رہے ہیں اور محترمہ مسز باقر علی خاں مہتمم مدرسہ کی دلی خواہش یہ ہے کہ جملہ کاموں کے ساتھ لڑکیاں پکوان اور خانہ داری سے پوری طرح واقف ہوں۔ چنانچہ کثرت سے لڑکیاں پکوان سیکھ رہی ہیں اور دوسری ضروری معلومات بھی حاصل کر رہی ہیں۔

میری آرزو ہے کہ ہر لڑکی علم کے ساتھ ایک باسلیقہ بیوی ثابت ہو جو اپنے گھر کو حسن انتظام سے قابلِ نظیر بنا سکے۔

مسز اسد الزماں خاں

راکٹ اور سیارے

معلوم یہ ہوتا ہے کہ دنیا والوں کی طبیعت اب دنیا سے سیر ہو چکی ہے۔ وہ اب قدرت کے دوسرے شاہکار کرّوں سے روشناس ہونا چاہتے ہیں چنانچہ اِس صدی کے سائنسدان پوری دماغی محنت کے ساتھ اس کوشش میں لگے ہوئے ہیں کہ کسی طرح ان ستیاروں کی سیر کریں جو اِس وقت ہماری کمزوریوں کے باعث صرف آسمانی جگنو بنے ہوئے ہیں۔

نیوٹن کی دریافت ممکن ہے اس نئے دور کے بسنے والوں کے لئے نئی ہو مگر قدیم یونانی عالم یہ جانتے تھے کہ زمین میں کشش ہے۔ اور ستیارے بھی اس صفت کے حامل ہیں۔ نہ صرف یہی بلکہ انہوں نے محض اِس کششی نظام کی بنیاد پر نجوم جیسا وسیع علم تمام و کمال تحقیق کے ساتھ رائج کر رکھا تھا اور اس علم کا جاننا تعلیم یافتہ طبقے کے ہر فرد کے لئے اسی قدر لازمی تھا جتنا کہ آج ہندستان میں سرکاری ملازمت حاصل کرنے کے لئے انگریزی جاننا۔ مگر اب جب کہ یونانی علوم، ہندستانی فنون کی طرح ماہران مرحوم کے ساتھ دفن ہو چکے ہیں، علم نجوم نے فلکیات کے نام سے پھر ایک نئی نوعیت کا جنم لیا ہے۔

ان کوششوں کے سلسلے میں جو فلکیات کی تحقیق کے لئے کی گئی ہیں، فرانس، انگلینڈ، روس، جرمنی اور امریکہ کے سائنسداں خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ دوسری کوششوں سے قطع نظر کرتے ہوئے ہم صرف اِن تجربوں پر غور کرتے ہیں جو سیّاروں تک پہنچنے کے لئے کئے گئے ہیں۔

ہوائی جہاز کی ایجاد نے حضرت انسان کو یقین دلادیا کہ وزنی اجسام بھی زمین کی کشش کے خلاف نقل مکان کر سکتے ہیں۔ مگر اس میں توازن کے شرائط اور ہوا کو پیچھے ڈھکیلنے کی ضرورت نے یہ سمجھنے پر مجبور کر دیا تھا کہ خلا میں یعنی ایسی جگہ جہاں ہوا نہ ہو، پرواز ناممکن ہے۔

۱۹۰۳ء میں جب رائٹ برادرس نے پہلی دفعہ پرواز میں کامیابی حاصل کی تو ایک روسی سائنسداں زیالکوسکی نے راکٹ ایجاد کر کے نظریۂ پرواز میں عظیم تبدیلی پیدا کر دی۔ راکٹ کو ہم ایک جلدی جلدی چلنے والی بندوق کے مماثل تصور کر سکتے ہیں۔ اگر کسی منجمد جھیل کی چکنی سطح پر ایک پہیہ دار توپ رکھی جائے اور اس سے پے در پے فائر کئے جائیں۔ تو توپ ایک معتدبہ رفتار سے پیچھے کی سمت حرکت کرنے لگے گی۔ راکٹ کی مشین اسی اصول پر مبنی ہے۔ اس کا نوکدار سرا آسمان کی طرف ہوتا ہے اور نچلے حصے سے زمین کی طرف پے در پے دھماکے پیدا کئے جاتے ہیں۔ ان دھماکوں کے ردِ عمل کے طور پر راکٹ آسمان کی طرف اڑ جاتی ہے۔

درحقیقت زیالکوسکی نے کوئی نئی بات دریافت نہیں کی بلکہ اس نظریہ سے چین کے باشندے ہزار سال پیشتر ہی واقف تھے دھماکو اشیا سب سے پہلے چینیوں نے بنائیں۔ مگر وہ اس کا استعمال تیر کے گھمانے میں کیا کرتے تھے۔ ان کا تیر کمان سے ایسا ہی نکلتا تھا جیسے رائفل کی گولی گھومتی ہوئی نکلتی ہے۔ یورپ میں بارود کا استعمال پندرھویں صدی عیسوی سے شروع ہوا۔ پہلے پہل اس کو کھیل تماشوں کے کام میں لایا گیا مگر بعد میں جنگی ضروریات کے لئے اس کی اہمیت کا احساس ہوا۔ ہوائی یا انار امندل جو آج بھی ہندستانی باراتوں میں چھوڑے جاتے ہیں پندرھویں صدی میں یورپ میں جنگی اغراض کے لئے استعمال ہوئے۔ نپولین نے انگلستان کے ساتھ لڑائی کی تو سر ولیم کانگر یونانی سائنسداں کی ایجاد کردہ ہوائیاں آتشباری کے طور پر شہروں پر برسائی گئیں۔ شہر بولون جسے حالیہ جرمن فرانسیسی

لڑائی کے سبب کافی شہرت حاصل ہو چکی ہے پہلی دفعہ ان ہوائیوں کا شکار بنا اور برباد ہوا۔

مسٹر کے۔ ای۔ زیالکوسکی کے نظریہ کی اشاعت سے کئی سائنسدانوں نے اس میں دلچسپی لینی شروع کی ۱۹۱۹ء میں رابرٹ گڈارڈ نے ایک پمفلٹ شائع کیا جس کا عنوان تھا "ممکنہ بلندی تک پہنچنے کا طریقہ" اس کی اشاعت نے ہر طرف عملی تجربوں کا آغاز کر دیا اور سیاروں تک رسائی ممکن سمجھی جانے لگی۔ ۱۹۲۳ء میں ایک آسٹرین سائنسداں مسٹر ہرمن آبرتھ نے جو ان تجربوں سے بالکل بے خبر تھا ایک کتاب شائع کی جس میں اس نے بتلایا کہ تمام سیاروں کے درمیان راکٹ کے ذریعہ آمد و رفت کا سلسلہ جاری کیا جا سکتا ہے۔ اس کے چار سال بعد میکس ویلر نے جرمن مین سیارات سوسائٹی کی بنیاد ڈالی اور عملی کام شروع کر دیا۔

مارچ ۱۹۲۸ء میں فرٹز نان اوپل موٹروں کے کارخانے کے مالک نے ایک راکٹ کار بنائی یعنی ایسی موٹر جو بغیر انجن کے صرف دھماکوں سے چلتی تھی۔ اس کار کو روسل شیم کے ریس ٹراک Race Track پر چلایا گیا۔ اس کامیابی کے چند ہی مہینوں بعد مسٹر اوپل نے برلن کے قریب ایوس اسپیڈ وے نامی مقام پر ایک راکٹ کار کے ذریعہ فی گھنٹہ ۱۰۲ میل کی رفتار کا مظاہرہ کیا چند ہی دنوں بعد پہلی دفعہ جرمنی میں اس نظام کو پرواز میں استعمال کیا گیا فریڈرک اسٹھامر نامی ایک شخص نے ایک گلائیڈر یعنی بغیر مشین کے ہوائی جہاز کو تقریباً ایک میل تک دھماکوں کے ذریعہ چلایا۔ اس اثنا میں اوپل نے اپنے تجربے جاری رکھے اور ایک گاڑی ریل کی پٹریوں پر دھماکوں کے ذریعہ ڈیڑھ سو میل فی گھنٹہ کی رفتار سے چلائی۔ فبروری ۱۹۲۹ء میں خود میکس ویلر نے ایک راکٹ کار بنائی جو برف پر ڈھائی سو میل فی گھنٹہ کی رفتار سے چلنے میں کامیاب ہوئی۔ گرچند ہی دنوں بعد ایک تجربے کے دوران میں دھماکے سے میکس ویلر کی جان ضائع ہو گئی۔ یہ پہلا آدمی تھا جس نے اس تحقیقات پر اپنی جان کی بھینٹ چڑھائی۔ مگر اس قربانی سے یہ معلوم ہو گیا کہ بارود اس کام کے لئے ناموزوں ہے۔ کیونکہ جب ایک دفعہ بارود سلگ جاتی ہے تو بجھ نہیں سکتی۔ اور راکٹ کار اس وقت تک قابو میں نہیں آسکتی جب تک کہ بارود ختم نہ ہو جائے۔

۱۹۳۰ء کی ابتدا میں جرمن سیارات سوسائٹی کے دو ممبروں نے مائع آکسیجن اور پیٹرول کے آمیزے کو راکٹ میں استعمال کیا۔ اس سے جو دھماکہ ہوا وہ تمام دھماکوں سے بازی لے گیا۔ ساتھ ہی یہ محفوظ بھی تھا۔ اس سے ایک راکٹ ہوا میں چھوڑا گیا جو ۱۵۰۰ فیٹ کی بلندی تک جا سکا۔ گو کہ یہ بہت کم بلندی تھی مگر اس سے یہ معلوم ہو گیا کہ اس میں زمین کی کشش کے خلاف کام کرنے کی قابلیت ہے۔

ادھر فرانس میں رابرٹ اینیو پلٹے نے فرانسیسی فلکی سوسائٹی میں دوسرے سیاروں تک راکٹ کے ذریعہ سفر کے امکانات پر ایک تقریر کی اور چند ہی دنوں بعد اس کی مکمل تحقیقات شائع بھی کر دی گئی اور اس کو ایک مستقل مضمون قرار دے کر اس کا نام اسٹرانائکس (Astronautics) رکھا گیا۔ اینڈرے ہرش، نامی ایک بینکر نے ہر سال پانچ ہزار فرانک کا انعام اس شخص کے لئے رکھا جو اسٹرانائکس پر بہترین تحقیقات کرے چنانچہ ۱۹۲۹ء میں پہلی دفعہ پروفیسر آبرتھ کو یہ انعام دیا گیا۔

۱۹۲۹ء کے اختتام پر روس میں بھی دو سوسائٹیاں قائم ہوئیں۔ ایک پروفیسر نکولاس اور ڈاکٹر جیکوو کی مشترکہ صدارت میں اور دوسری ایوان پی فارٹیکاف کی۔

اسی زمانے میں ڈاکٹر گوڈارڈ نے مائع دھماکو شئے کی ایک

راکٹ چھوڑی جو نو سو فیٹ کی بلندی پر پھٹ گئی چند ہی دن بعد ایک امریکن کروڑپتی لگن ہیم نے بیس ہزار پونڈ ڈاکٹر گوڈارڈ کو دئے تاکہ وہ تحقیقات جاری رکھے۔

۱۹۳۰ء میں نیویارک میں بھی ڈیوڈ لیسر کی صدارت میں ایک بین سیارات سوسائٹی قائم ہوئی جس کا نام آج کل امریکن راکٹ سوسائٹی ہے۔ اس سوسائٹی نے ۱۹۳۳ء میں پہلی دفعہ راکٹ چلایا جو زیادہ کامیاب نہیں رہا۔ مگر دوسرا راکٹ ڈھائی سو فیٹ کی بلندی تک پہنچ گیا جس سے ان کی ہمت افزائی ہوئی اور کام بڑے پیمانے پر شروع ہوگیا۔

اکتوبر ۱۹۳۳ء میں برطانوی بین سیارات سوسائٹی مسٹر پی۔ ای۔ کلیٹر کی صدارت میں قائم ہوئی۔ اس سوسائٹی کو برطانوی وزارت مالیہ نے کسی قسم کی امداد دینے سے انکار کردیا جس کی وجہ سے اسے بڑی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔

ان سائنسدانوں نے یہ محسوس کیا کہ راکٹ کو روکنے والی سب سے طاقتور چیز زمین کی کشش ہے۔ اگر کوئی راکٹ پچیس ہزار میل فی گھنٹہ کی رفتار سے زمین کی سطح سے اٹھے تو وہ زمین کی کشش کے حدود سے باہر ہو جاسکتا ہے۔ مگر یہ عملی طور پر ناممکن ہے۔ کیونکہ اول تو اس رفتار سے کوئی آدمی راکٹ میں سفر نہیں کرسکتا، دوسرے ہوا کی رگڑ سے اتنی گرمی پیدا ہوجاتی ہے کہ راکٹ جل پڑے گا۔ اس لئے یہ طے پایا کہ راکٹ کو اپنی رفتار پر اختیار ہونا چاہیئے۔ تاکہ وہ کم رفتار کے ساتھ کرۂ ہوائی سے باہر نکلے اور اس کے بعد اپنی رفتار بڑھائے اس کے لئے مسٹر کلیٹر نے ایک ماڈل بتلایا مگر اس ماڈل کو واپس لانے کے لئے ایک اسٹیشن کی ضرورت تھی اور اس پورے کام کے لئے دو کروڑ پونڈ کی ضرورت تھی اس لئے یہ اس وقت تک کے لئے مسترد کردیا گیا جب تک کہ اس لاگت کو گھٹانے کی کوئی صورت نہ دریافت ہوجائے۔

دوسرا سوال یہ تھا کہ کیا کوئی انسان اس رفتار پر زندہ رہ سکتا ہے؟ جرمن سائنسدانوں نے یہ ثابت کردیا کہ اگر رفتار آہستہ آہستہ بڑھے اور بڑھتے بڑھتے آٹھ دس منٹ میں پچیس ہزار میل فی گھنٹہ ہوجائے تو انسان زندہ رہ سکتا ہے۔ کیونکہ خود اس میں رفتار پیدا ہوجاتی ہے۔ بعینہ اس طرح جیسے کہ ہم زمین پر زندہ ہیں جو بہت بڑی رفتار سے حرکت کررہی ہے۔ یہ بھی خیال کیا جاتا ہے کہ کرۂ ہوائی کے باہر چند ایسی برقی امواج چلتی ہیں، جو ممکن ہے راکٹ کو کوئی نقصان پہنچائیں گو ابھی اس کا یقین نہیں ہے۔

سورج کی آزاد کرنوں سے جب سابقہ پڑے گا تو امکان ہے کہ وہاں گرمی اتنی زیادہ ہو کہ راکٹ پگھل جائے۔ ایسے بھی طریقے ہیں کہ اس گرمی کے مقابلے کے لئے راکٹ میں کوئی انتظام کیا جاسکے مثلاً راکٹ دوہری دیواروں کا بنایا جائے یا کسی اور مصنوعی طریقے پر ٹھنڈا رکھا جائے۔

سورج سے صرف حرارت ہی نہیں خارج ہوتی بلکہ بعض ایسی شعاعیں بھی نکلتی ہیں جو زمین تک پہنچ جائیں اور وہ خطرناک ہوتی ہیں۔ امکان ہے کہ ان سے بھی راکٹ کو کوئی نقصان پہنچے۔ شہاب ثاقب بھی ایک خطرناک رکاوٹ سمجھے جاسکتے ہیں کیونکہ چھوٹے سے چھوٹے شہاب کی ٹکر راکٹ کو تباہ کرسکتی ہے۔ مگر تباہی کا اندیشہ انسان کی ہمت کو پست اور تجسس کو فنا نہیں کرسکتا۔ جو لوگ اس پر یقین نہیں رکھتے وہ ان جاہلوں کی مانند ہیں جنھوں نے کولمبس سے کہا تھا کہ اگر تم اپنا جہاز افق کی طرف لے جانے کی ہمت کروگے تو زمین کے کونے پر پہنچ کر گر پڑوگے۔

۲۵ ہزار میل فی گھنٹے کی رفتار سے چلنے والی راکٹ میں بیٹھے ہوئے آدمی کو اپنا وزن اتنا زیادہ معلوم ہوگا کہ اسے تکلیف

ہونے لگے گی اگر کشش حدود سے باہر نکلنے کے بعد اسے اپنا وزن محسوس ہی نہ ہوگا۔ یعنی وہ بے وزن مسافر ہو جائے گا۔ لیکن بے وزنی نظام بدن پر کوئی اثر نہیں پیدا کرے گا۔ وزن کا تخیل صرف کشش کے ساتھ قائم ہے کشش کے بدلنے کے ساتھ ساتھ وزن بھی بدلتا جائے گا۔ کسی جسم کا وزن اگر زمین پر بارہ سیر ہے تو اسی جسم کا وزن چاند پر دو سیر اور زہرہ پر دس سیر ہوگا۔ یعنی راکٹ کو چاند کی سطح سے اٹھنے کے لئے جتنی قوت درکار ہے اس سے چھ گنی قوت زمین سے اٹھنے کے لئے چاہیئے۔

زمین کی کشش کے حدود سے باہر ہونے کے بعد اگر راکٹ کا انجن بند کر دیا جائے اور وہ کسی دوسرے سیارے کی کشش کی وجہ سے اسی کی طرف جا رہا ہو، ایسی حالت میں اگر مسافر راکٹ کا دروازہ کھول کر باہر کود پڑے تو بھی وہ راکٹ سے جدا نہیں ہو سکتا کیونکہ مسافر اور راکٹ یکساں رفتار سے حرکت کرتے رہیں گے۔ یعنی نظری طور پر یہ ثابت ہوتا ہے کہ انسان اپنی جان گنوائے بغیر راکٹ میں سفر کر سکتا ہے۔

ایک اور خدشہ یہ بھی ہے کہ اگر راکٹ اپنے مقام مقصود کو اس خلائے بسیط میں نہ پہچان سکے تو اس کا کیا حشر ہوگا۔ بظاہر تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ کوئی شئے اسے تباہی سے نہیں بچا سکتی۔ یا تو وہ سورج کی طرف کھنچ کر جل جائے گا یا کسی اور سیارے کے اطراف ہمیشہ کے لئے گردش کرنے لگے گا۔ جیسے چاند زمین کے اطراف گھومتا ہے۔ یا کسی دوسرے سیارے سے جا ٹکرائے گا۔ ان خطرات کو جانتے ہوئے اپنے مقام مقصود کو نہایت احتیاط سے معین کئے بغیر خلاء میں صرف وہی لوگ پرواز کر سکتے ہیں جو خودکشی پر تلے ہوئے ہوں۔ خودکشی کا یہ ایک نیا طریقہ تو ہوگا مگر اس میں مرنے والے کو کثیر مصارف برداشت کرنے پڑیں گے۔

چاند پر پہنچنا بہ نسبت اور سیاروں پر جانے کے بہت آسان ہے نہ صرف اس لئے کہ وہ ہم سے قریب ہے بلکہ اس لئے بھی کہ وہ زمین کے ساتھ ساتھ سورج کے گرد گھومتا ہے کسی سیارے کی طرف جس وقت جی چاہے پرواز نہیں کی جا سکتی کیونکہ اس کے لئے اس وقت کا انتظار کرنا پڑے گا جب کہ وہ اپنے مدار کے ایسے مقام پر آجائے جہاں جانا ہمارے لئے آسان ترین ہو۔ مثلاً مریخ پر ہم جانا چاہیں اور ایسے وقت جب کہ سورج، زمین اور مریخ کے درمیان ہو نکلیں تو ہمیں پہلے سورج سے سابقہ پڑے گا۔ دوسرے یہ فاصلہ ۲۴ کروڑ پچاس لاکھ میل ہوگا، برخلاف اس کے ہم ایسے وقت نکلیں جب کہ زمین مریخ اور سورج کے درمیان ہو تو ہمیں صرف پانچ کروڑ میل طے کرنے پڑیں گے۔ مگر ہمیں رفتار کم از کم ۵۰ ہزار میل فی گھنٹہ رکھنی پڑے گی تاکہ دو دن میں پہنچ جائیں۔

ایسے مسافر کو وقت کا اندازہ رکھنا ضروری ہے۔ ظاہر ہے کہ کشش حدود کے باہر کوئی گھڑی کام نہیں کر سکتی۔ ہاں لاسلکی کے ذریعہ امکان ہے کہ زمین والے اسے وقت بتلاتے رہیں۔

جب راکٹ کسی سیارے کے کشش حدود میں داخل ہو جائے گی تو وہ اس قدر تیزی سے اس کی طرف چلے گی کہ اس کا روکنا مشکل ہو جائے گا۔ ایسے موقع پر راکٹ کو پلٹا کر اس کا انجن اسٹارٹ کر دینا پڑے گا تاکہ اس کا عمل سیارے کی کشش کے خلاف ہو اور وہ آہستہ آہستہ سطح پر اتر پڑے۔

اس وقت جو دھماکو اشیا معلوم ہیں وہ ان سفروں میں اتنی خرچ ہو جائیں گی کہ اس قدر مقدار ساتھ نہیں رکھی جا سکتی اس لئے یہ سفر اس وقت تک کے لئے ملتوی ہیں جب تک کوئی ایسی شئے نہ دریافت ہو جائے جو نسبتاً کم مقدار میں زیادہ دھماکہ پیدا کر سکے۔ ممکن ہے کہ برقی قوت کے استعمال سے یہ مشکل آسان ہو جائے۔

بعض سائنسدانوں کا خیال ہے کہ اگر کسی سیارے پر طبعی حالات ایسے ہوں کہ وہاں زمین کا بسنے والا زندہ رہ سکے اور ایک دفعہ وہاں تک راکٹ کے لے جانے میں کامیابی حاصل ہو جائے تو ہم وہاں ایک ایسا اسٹیشن تعمیر کر سکتے ہیں جہاں بہت سا دھاکو مادہ جمع رکھا جاسکے اور اس طرح آمد و رفت کا سلسلہ قائم کیا جاسکتا۔

اگر ہم قریب ترین سیارے یعنی چاند پر غور کریں تو معلوم ہوگا کہ چاند کا نصف حصہ ہمیشہ روشن اور نصف ہمیشہ تاریک رہتا ہے روشن حصہ کی تپش ۲۱۶ درجہ فارن ہیٹ اور تاریک کی ۔۲۴۳ درجہ فارن ہیٹ ہے۔ ان دونوں تپشوں پر زندگی ناممکن ہے۔ مگر چاند کی سطح آتش فشاں مادے کی بنی ہوئی ہے اور یہ مادہ حرارت کے لئے بہت ناقص موصل ہے۔ اس کا امکان ہے کہ اس مادے میں ایسے تہ خانے بنائے جاسکیں جہاں کا درجۂ حرارت حسب مرضی رکھا جاسکے۔

سیاروں میں عطارد، سورج سے بہت قریب ہے۔ اس لئے بہت گرم۔ زحل، مشتری، یورانس، نپچون وغیرہ بہت دور اور سرد بھی ہیں، صرف زہرہ اور مریخ ہی اس قابل ہیں کہ وہاں زندگی ممکن سمجھی جاسکے۔ مگر زہرہ کی سطح بادلوں سے اس قدر گھری ہوئی رہتی ہے کہ اس کے بارے میں کچھ اندازہ نہیں کیا جاسکا۔ مگر چونکہ وہ حجم کے لحاظ سے زمین سے بہت ملتا جلتا ہے اس لئے ممکن ہے وہاں کے طبعی حالات زمین سے مشابہ ہوں۔ مریخ کی تپش ۷۰ درجہ فارن ہیٹ اور منفی ۴۰ درجہ فارن ہیٹ کے درمیان رہتی ہے جہاں انسان زندگی گذار سکتا ہے وہاں آکسیجن اور پانی بھی موجود ہے اس لئے مریخ پر جانے کی کوشش کی جاسکتی ہے۔

اس وقت تک تو یہ باتیں محض خیالی ہیں مگر حضرتِ انسان سے کس حرکت کی امید نہیں۔

آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا

سید ظہیر الدین رونق

سب رس کے متعلق رائے:۔

کتابت اور طباعت جاذبِ نظر۔ پیٹ اپ دیدہ زیب نظر فریب۔ فنکارانہ طرز۔ اور اس کے ساتھ ہی افسانہ اور تغزل کی رنگینیاں یہ وہ چند خوبیاں ہیں۔ جو حیدرآباد دکن کے مشہور ادبی ماہ نامہ "سب رس" کو دیکھتے ہی تصور میں آتی ہیں۔ اس کے تازہ شمارے میں علی اختر کی نظم ہے۔ مجنوں گورکھپوری کا افسانہ ہے۔ نواب عزیز یار جنگ کی غزل ہے۔ عطاء مشہدی کی مختصر نظم ہے۔ ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور کا ادبی مقالہ ہے۔ اور "سب رس" کی طرز خصوصی کے دیگر مضامین ہیں جو اس کی انفرادیت کو نمایاں کرتے ہیں۔ ایک خصوصیت سے میں سب رس کو تمام ماہ ناموں سے اونچا درجہ دیتا ہوں۔ اور وہ اس کا ادبی ادارہ ہے۔ "سب رس" ادارۂ ادبیات اردو نے جو سیدھی تعمیری اور ٹھوس کام زبان کی خدمت کا کیا ہے شاید ہی کسی اور ماہ نامے نے کیا ہو "سب رس" خصوصیت سے ان ترقی پسند ماہ ناموں کے لئے ایک مثال ہے جو محض بھوک کے افسانوں کو ادب اور فن کا نام دینے ہیں۔ اور جن کے قلمی معاون اقبال کے اس شعر کی زندہ تفسیر ہیں ؎

ہند کے شاعر و صورت گر و افسانہ نویس
آہ بیچاروں کے اعصاب پہ عورت ہے سوار

سب رس کی ان انفرادی اور تعمیری خوبیوں کے لئے میں اس کے ادارہ کو اعماقِ قلب سے مبارکباد دیتا ہوں۔

اسٹار لاہور ہفتہ وار [illegible]

نئی کتابیں

۱۔ رسائل طیبہ (مجموعہ مضامین طیبہ بیگم خدیو جنگ مرحوم) مرتبہ سکینہ بیگم ۲۸۰ صفحے قیمت عہ/ سب رس کتاب گھر خیریت آباد حیدرآباد دکن

۲۔ سفرۂ عام (اقسام کے پکوان) از منجولا بائی گورک شکر ۲۴۳ صفحے قیمت ۱۲/ خواجہ احمد معین الدین کتب خانہ معینیہ حویلی قدیم روڈ۔ کمان نواب سالار جنگ بہادر۔

۳۔ ہمارے مزدور (مزدوروں کے معاشی مسائل) از محمد عبدالقادر لکچرار جامعہ عثمانیہ ۷۶ صفحے۔ انجمن ترقی اُردو۔ دہلی۔

۴۔ رشوت خواروں کا حشر از محمد شمس الدین صدیقی سابق منصف ۸۰ صفحے از مصنف۔ کالی کمان حیدرآباد دکن

۵۔ شمع (ناول) از اے۔ آر خاتون دہلوی۔ ۵۰۴ صفحے قیمت عہ/ از مصنفہ۔ جلال منزل۔ کوچہ پنڈت۔ دہلی۔

۶۔ موج طہور (مجموعہ کلام) از بہزاد لکھنوی قیمت عسم۔ ساقی بک ڈپو۔ دہلی۔

۷۔ مورخ کے افسانے از سید محمود مورخ قیمت عسم۔ گل فروش پبلشنگ ہاؤس۔ دہلی۔

۸۔ نازیت کے کھلے راز مترجمہ نصیر یوسفی۔ ملک دین محمد اینڈ سنز۔ لاہور۔

۹۔ قدرتی علاج مرتبہ حکیم حافظ محمد سعید دہلوی۔ قیمت ۱۲/ ہمدرد دواخانہ۔ لال کنواں۔ دہلی۔

۱۰۔ بین الاقوامی سیاسی معلومات از اسرار احمد آزاد ۳۳۰ صفحے قیمت ہے/ مکتبۂ برہان۔ نئی دہلی۔

۱۱۔ صدگان گہر (رباعیات) از عشرت گیاوی قیمت ۱۰/ سید آل نبی حسنین منزل۔ گیا۔ صوبہ بہار۔

۱۲۔ باعیش و عشرت (مجموعۂ کلام) از عشرت گیاوی قیمت عا/ سید آل نبی حسنین منزل۔ گیا۔ صوبہ بہار۔

۱۳۔ ذکر و فکر (مضامین اور کہانیاں) از مقصود زاہدی ۱۲۸ صفحے قیمت ۸/ مکتبۂ ساغر۔ ادبی مرکز۔ میرٹھ

۱۴۔ تفسیر پارۂ عم۔ مرتبۂ ادارہ دارالاسلام ۹۶ صفحے ہدیہ ۸/۔ "دارالاسلام" پوسٹ آفس جمال پور۔ پنجاب

۱۵۔ اسلام اور مسیحیت از مولوی ثناء اللہ امرتسری ۲۴۰ صفحے قیمت ۱۲/ دفتر اہلحدیث۔ امرتسر۔

۱۶۔ سیاست ملیہ (مسلمانان ہند کی سیاست کی تاریخ) از محمد امین زبیری ۶۰۰ صفحے از مولف۔ سمول لائین علی گڑھ۔

۱۷۔ کام کی کتاب تو حصے (بے سیک اردو) از واحدہ خانم ۱۰۳۴ صفحے قیمت عا/ مکتبۂ قرانیہ۔ نمبو بازار۔ بنگلور سٹی۔

۱۸۔ دیہاتی تصویری کہانیاں دو حصے (دیہات سدھار) قیمت ۸/ اردو مرکز بک ڈپو۔ فلمنگ روڈ۔ لاہور۔

۱۹۔ صحتی تصویری کہانیاں (تعلیم بالغان) حصہ اول۔ دوم و سوم قیمت عسم اردو مرکز بک ڈپو۔ لاہور۔

۲۰۔ سائنٹفک تصویری کہانیاں (تعلیم بالغان) قیمت ۳/۵/ اردو مرکز بک ڈپو۔ فلمنگ روڈ۔ لاہور

۲۱۔ بچوں کی پھلواری (کہانیاں) قیمت ۵/ اردو مرکز بک ڈپو۔ فلمنگ روڈ۔ لاہور۔

۲۲۔ خطوط محمد علی۔ مرتبہ پروفیسر محمد سرور ۳۲۰ صفحے قیمت مجلد عا/ مکتبہ جامعہ دہلی۔

۲۳۔ مبادی سیاسیات (دوسرا ایڈیشن) از ہارون خاں شروانی ۶۰۸ صفحے قیمت صہ مکتبہ جامعہ۔ دہلی۔

۲۴۔ بچوں کی بہادر نظمیں از خواجہ فیض محمد فیض ۴۴ صفحے قیمت ۲/ ریاض بک ڈپو۔ لاہور۔

۲۵۔ آہیں (افسانے) از دکھی پریم نگری۔ قیمت عا/ مکتبۂ ناہید۔ بانکا بمبئی

۲۶۔ سسکیاں (" ") از قمر تسکین۔ " عا/ " " " "

مرزا سیف علی خاں

آہ! یہ زندگی

دُھک۔ دُھک۔ دُھک.........

بڑی پریشانی کی حالت میں آنکھ کھلی، دل زور زور سے بے طرح دھڑک رہا تھا۔ اس کی مسلسل دھڑ دھڑ دماغ پر ہتھوڑے کا کام کر رہی تھی۔ بدن پسینہ میں تر بتر تھا اور میں پلنگ پر نیم افتادگی کی حالت میں پڑا تھا۔ لیٹے لیٹے میں نے تھکی ہوئی مضمحل نظروں سے آہستہ آہستہ کمرے کا جائزہ لیا۔ تاریکی ہر طرف چھائی ہوئی تھی، ہوا بند تھی، ہر طرف خاموشی طاری تھی۔ کبھی کبھی اس خاموشی میں دور کتوں کے بھونکنے کی آواز مخل ہوتی تھی۔

بستر پر سیدھے لیٹے ہوئے میں نے سوچنا شروع کیا کہ آخر وہ کیا چیز تھی جس نے مجھے اتنا پریشان کر دیا تھا۔ دل کی دھڑکن بتدریج کم ہوتی جاتی تھی، لیکن اس کی جگہ خیالات نے لے لی، خیالات کی ایک برقی لہر تھی کہ دماغ میں بہی جاتی تھی۔ صبا رفتار گھوڑے تھے کہ اڑے جاتے تھے۔ پھر اس منتشر لشکر نے ذرا ترتیب و تنظیم پائی تو مجھے یاد آیا کہ میں نے ایک خواب دیکھا تھا۔ آہستہ آہستہ مجھے پورا خواب یاد آ گیا، مجھے اس کی جزئیات تک یاد آنے لگیں۔ کیا خواب دیکھا تھا! ــــ اچھا چلئے۔

یہی مکان ہے، بازو مولوی عبدالسمیع صاحب کا شاندار بنگلہ ہے۔ شام کا وقت ہے۔ میں اپنے بالاخانے کی کھڑکی کے پاس کھڑا ہوں ــــ عبدالسمیع صاحب کے مکان کی کھلی چھت پر کچھ صورتیں نظر آتی ہیں۔ یہ ان کی بیوی ــ یہ ان کی والدہ ہیں۔ یہ کوئی خادمہ ہے جو ہاتھ میں کچھ لئے کھڑی ہے۔ یہ کون! ــــ او ہو! یہ ان کی صاحبزادی ہیں ــــ میرا دل دھڑکتا ہے، زور زور سے دھڑکتا ہے۔ کھڑکی کے پاس سے ہٹ آتا ہوں میرا دل رونا چاہتا ہے۔ پھر بے قرار ہو کر کھڑکی کے پاس جا تا ہے ..... اے لو! وہ واپس جا رہی ہیں۔ تاریکی بڑھ رہی ہے۔ ارے ــــ یہ کوئی اکیلا پیچھے رہ گیا ہے۔ شاید خادمہ ہے ــ نہیں ــــ میرا دل اور زور سے دھڑکتا ہے ــــ تاریکی اور بڑھ رہی ہے۔ ایک دھندلی سی شکل پچھلے پاؤں پلٹی ہے اور چھت کی منڈیر پر بیٹھ جاتی ہے ــــ میں الف لیلیٰ کے "بغدادی چور" کی طرح دبے پاؤں، گر نے کے خوف سے بے پروا، بے خوف کھڑکی کے راستے سے نکل کر سمیع صاحب کے مکان کی چھت پر نظر آتا ہوں ــــ ایک لمحہ بعد ــــ میں چھت کی سطح پر گھٹنے ٹکائے اور میرا سر منڈیر پر بیٹھے ہوئے شخص کی آغوش میں ــــ میں زار زار رو رہا ہوں۔ ایک نرم، شیریں، گھبرائی ہوئی آواز مجھ سے التجا کر رہی ہے۔ "دیکھو، روؤ نہیں، ارے ... روتے کیوں ہو؟ ــــ رونے کی آواز پر کوئی آ نہ جائے۔ دیکھو، بس کرو ــــ بس ــــ" میں خاموش رہنے کے بدلے اور روتا ہوں، روتا ہوں، آغوش سے سر ہٹا کر پیروں پر رکھ دیتا ہوں، اُدھر سے کوشش ہوتی ہے کہ میں پیر چھوڑ دوں، میں پیروں کو آنکھوں سے لگائے ان کو آنسوؤں سے دھوتا ہوں، ان کو بوسے دیتا ہوں ــــ اتنے میں، پیچھے سے ایک کرخت بھونڈی، بھدی آواز آتی ہے ــــ کیا تھا؟ کوئی مردِ قبر سے چلا آتا تھا یا کوئی کتا بھونکتا تھا ــــ ایک سخت اور کھردرے ہاتھ نے میری کلائی پکڑ لی..... میں گھسٹتا چلا جا رہا ہوں.....

جب آنکھ کھل گئی تو نیاں تھا نہ سود تھا

"نیندیں اچاٹ دیتی تیری کہانیاں ہیں!......" ہائے محبت بھی کیا چیز ہے، اس نعمت اور سعادت کا حال کچھ ان سے پوچھو جو اس دولت سے سرفراز ہوئے ہیں۔ میرے دل سے ایک صدائے احتجاج بلند ہوتی ہے "یہاں کسی کو نہ چاہنا اور کسی سے چاہا نہ جانا کیسی بدبختی اور بدنصیبی ہے!"

بے چینی بہت بڑھ گئی تو اٹھا، کمرے میں ٹہلنے لگا، کھڑکی کھول دی، باہر جھانکا ــــ سڑک سنسان اور خاموش تھی۔ سمیع صاحب کا شاندار، اونچا بنگلہ رات کی تاریکی میں سیاہ بھوت کی طرح کھڑا تھا۔ دور کسی گھڑیال نے ٹن ٹن، دو بجائے۔ تھوڑی دیر تک اس کی آواز فضا میں گونجی۔ پھر ہر طرف وہی خاموشی ہی خاموشی تھی ــــ

بستر پر جا لیٹا، پھر اٹھا، پھر لیٹا، ایک خلش تھی، ایک کھٹک تھی، ایک چبھن تھی، دل پر ایک گرانی تھی اور ایک گھٹا سی چھائی تھی، ایسی گھٹا جو نہ کھلتی ہے اور نہ برستی ہے، بس دم گھوٹنا جانتی ہے۔ دل گریہ کناں ماتم آرزو کرتا تھا "یہاں کسی سے چاہا نہ جانا بڑی بدبختی ہے...... یہاں کسی ایک کا نہ ہو رہنا بڑی بدنصیبی ہے!"

دور گھڑیال کی زبان نے اس خوفناک سکوت کو توڑا ...۔ ٹن۔ ٹن۔ ٹن ...... سوچتا تھا۔

کہاں میں، کہاں عبدالسمیع صاحب! وہ ٹھیرے دولت مند مرفہ الحال، مشہور، معروف ــــ میں ٹھیرا دفتر کا ایک ادنیٰ ملازم، ایک حقیر کلرک ــــ دن بھر دفتر کی مسلوں میں جان کھپاؤ تو مہینے پر تیس روپیوں کی صورت دیکھنی نصیب ہو۔ اس غدار اور معمور شہر میں گمنام، تنہا، لاوارث جس کا نہ کوئی آگے نہ کوئی پیچھے۔ دنیا میں بے طلب بھیجا گیا۔ جن کے پاس بھیجا گیا، وہ بھی میری آمد سے کچھ خوش نہ تھے۔ ماں نے جنا، آگے بس اللہ میاں کی حفظ و اماں۔ گاؤں میں رہا، گاؤں میں پڑھا، گاؤں ہی میں بڑا ہوا۔ قسمت میں شہر کا آب و دانہ تھا، اس نے اپنا رنگ دکھایا ــــ اس بڑے شہر میں، جہاں ہزاروں اور لاکھوں آدمی بستے ہیں، میں اپنے آپ کو تنہا اور اکیلا پاتا ہوں۔ کسی نے خواہش کی تھی، رہیئے اب ایسی جگہ جہاں کوئی نہ ہو۔ اس وسیع دنیا میں میرا کوئی نہیں۔ میں ہزاروں اور لاکھوں کی آبادی میں بھی رہ کر کسی پاسباں اور ہم سخن کو نہیں پاتا، بیمار پڑتا ہوں تو کوئی تیماردار نہیں آتا ــــ اور مر بھی جاؤں تو کوئی نوحہ خواں نظر نہیں آتا۔ سب ہنستے ہیں، بولتے ہیں، زندگی کے مزے اٹھاتے ہیں۔ مگر ہائے میری زندگی بالکل بے روح ہے۔ بجائے گوشت پوست کے انسان کے میں کل کا پتلا معلوم ہوتا ہوں۔ صبح اٹھنا، ناشتہ کرنا، دفتر جانا، دفتر سے آنا، شام کا کھانا کھانا، ادھر ادھر کے چند رسالے، یا افسانے، یا ناول پڑھ لینا، بستر پر کروٹیں بدلنا، رات گئے سو جانا ــــ سو جانا کیسا، منہ لپیٹے پڑ رہنا۔ یہ ہے زندگی۔ وہی آفتاب جو آج نکلا تھا، کل پھر نکلے گا، آہستہ آہستہ اپنی روشنی پھیلائے گا، دوپہر ہوگی، دن آہستہ آہستہ ڈھلتا جائے گا، سہ پہر ہوگی، شام ہوگی، رات آئے گی، بارہ بجیں گے، پھر ایک بجے گا، دو بجیں گے..... دن نکل آئے گا۔ یہی زندگی ہے؟ اسی کو زندگی کہتے ہیں؟ یہی جینا ہے؟ اسی جینے پر لوگ مرتے ہیں؟ ــــ بیماری، مفلسی، بے کسی، بے بسی ــــ ان کا مجموعہ ہے زندگی ــــ

ٹن، ٹن۔ ٹن۔ ٹن..................

مرغ بانگ دے رہے ہیں، راستے پر وقفے وقفے سے

راہگیروں کے پیروں کی چاپ سنائی دیتی ہے۔ بعض مسجد یا مندر جا رہے ہوں گے، بعض خرابات سے اٹھ کر آ رہے ہوں گے۔ کیسے خوش نصیب ہیں یہ لوگ کہ یہ پہاڑ جیسی رات اپنے محبوب کی آغوش میں بسر کر چکے ہوں گے ....

آہ، یہاں کسی سے چاہا نہ جانا کیسی بدبختی اور بدنصیبی ہے! کاش! میرا بھی کوئی ہوتا یا میں کسی کا ہو رہتا، کسی کو اپنا کر رہتا، اور یہ دو روزہ، نہیں نہیں، میرے لئے دو روزہ نہیں، دو صد سالہ، بے روح اور بدمزہ زندگی یوں نہ کاٹتا۔ بیمار پڑتا تو کوئی اپنے ہاتھ سے دوا پلاتا، اور میں ایسے کے ہاتھ سے دوا پیکر دوا پلانے والے پر سے سو نہیں، ہزار لاکھ صحتیں نثار کرتا۔ مفلس ہوتا تو کوئی کہتا ـــــ "غم نہ کرو۔ دیکھو میں تمہاری ہوں" سرشار ہو کر یہ الفاظ سنتا اور کہنے والے پر ہر وہ چیز جو میرے قبضہ و اختیار میں ہوتی صدقے اور نثار کر دیتا۔ بے کس ہوتا تو کوئی کہتا ـــــ "دیکھو، ہم ایک دوسرے کے لئے ہیں۔ ایک دوسرے کے لئے بنے ہیں، ہمیں دنیا سے کیا کام؟ تم ہو اور میں۔ بس، یہی ہماری دنیا ہے۔" میرا خیال ہے، خوش بیاں اور جادو زبان واعظ جس جنت کا نقشہ کھینچتے ہیں، وہ بھی اس کے آگے، میری جنت کے آگے، ہیچ ہوتی!

زندگی واقعی یہی ہے جیسی کہ میں بسر کرتا ہوں تو ایسی زندگی کو سلام ـــــ دن بھر محنت کروں! کس لئے؟ رات کو پسوؤں، کھٹملوں کی ایذا سہوں؟ کیوں سہوں؟ جاڑے میں ٹھٹھروں، برسات میں بھیگوں، گرمی میں جھلسوں! کیوں؟ دنیا بھر کے لوگوں کی جھڑکیاں، سختیاں، اور ہر طرح کی ذلتیں اٹھاؤں؟ کیوں؟ کیا فائدہ؟ پیٹ کے لئے یہ کھٹ کھٹ، یہ دوڑ دھوپ! یعنی تاکہ اس معدے میں ایندھن ڈال کر زندگی کی مشین کو چلایا جائے؟ زندہ ہی کیوں رہوں؟ کس کے لئے زندہ رہوں؟ ـــــ ساری محنت، ساری مشقت، ساری ذلت اس لئے ہے اس کے نتائج کسی کے قدموں پر نثار کر دئے جائیں، اور اس کے بدلے میں ایک دل نواز مسکراہٹ، ایک جاں بخش تبسم سے خوش کام ہوں۔ ساری سردی، ساری گرمی، اس لئے سہی جاتی ہے کہ کسی کی موجودگی میں فطرت کی رنگا رنگی، بوقلمونی، اور تنوع کا لطف اٹھایا جائے۔ اگر ایسا نہیں تو اس بے روح، خشک اور تاریک زندگی اور زندہ درگوری میں کیا فرق رہ جاتا ہے۔ قبر کا کونا، سرد، بے روح، تنگ، تاریک، حشرات الارض سے بھرا ہوا ...... آہ، یہاں کسی کو نہ چاہنا، کسی سے چاہا نہ جانا کیسی بدبختی اور بدنصیبی ہے ..... آہ، آہ! کسی سے چاہا نہ جانا، ...... کسی سے چاہا نہ جانا، ..... کیسی بدنصیبی ہے .... کیسی بدنصیبی، کیسی بدنصیبی ہے...

آنکھ کھلی تو دیکھا دن کی تیز روشنی، کھلی کھڑکی سے ہو کر آنکھوں پر پڑ رہی تھی، ہاتھ بڑھا کر گھڑی اٹھائی، نو بجکر بیس منٹ ہوئے تھے۔ لوگ خدا کا نام لے کر بستر سے اٹھتے ہیں، میں ایک ٹھنڈی سانس بھر کر بستر سے اٹھتا ہوں۔ ہاتھ منہ دھوؤں گا، پاس کے ہوٹل میں ناشتہ کروں گا، دفتر کو یقیناً دیر ہو جائے گی، جاتے ہی منتظم صاحب کی ڈانٹ استقبال کرے گی ـــــ!!

ساحر

ہندوستان کی ناپید صنعتیں

موجودہ زمانے میں ہندوستان کی حیثیت ایک پس ماندہ ملک کی ہے۔ ترقی یافتہ ممالک کے مقابلے میں یہاں کی صنعت وحرفت نہایت ادنیٰ اور معمولی ہے۔ آبادی کا ایک کثیر حصہ دیہاتوں میں رہتا ہے اور زراعت یہاں کا عام پیشہ ہے' ان حالات کے پیش نظر بعض لوگ اس خیال کے حامی ہوگئے ہیں کہ ہندوستان ایک زرعی ملک ہے اور قدرت نے اس کو زراعت ہی کیلئے بنایا ہے لیکن یہ خیال درست نہیں۔ یہ خیال درحقیقت ان لوگوں کا ہے جو ہندوستان کی قدیم صنعتی عظمت سے یا تو واقف ہی نہیں یا واقف ہونے کے باوجود ذاتی مفاد کے تحت اس کو ایک زراعتی ملک بنائے رکھنا چاہتے ہیں۔

ہندوستان کی صنعتی تاریخ بہت قدیم ہے۔ موجودہ زمانے کے اکثر و بیشتر ترقی یافتہ ممالک جب کہ تہذیب و تمدن کے ابتدائی دور میں تھے' ہندوستان کی تہذیب و تمدن مقابلتہً بہت ہی ترقی یافتہ تھی۔ ملک کے طول و عرض میں مختلف قسم کی مصنوعات تیار کی جاتی تھیں، جن سے نہ صرف ملک کے باشندے مستفید ہوتے تھے بلکہ یہ دور دراز مقامات پر روانہ کی جاتی تھیں۔ بیرونی ممالک کے تاجروں کو ہندوستانی اشیاء کی تجارت سے بہت فائدہ ہوتا تھا۔ چنانچہ ان کی ممکنہ کوشش یہ ہوتی تھی کہ ہندوستان کی تجارت کسی طرح ان کے ہاتھ سے جانے نہ پائے۔ اس جد و جہد کا نتیجہ باہمی بغض و عداوت کی صورت میں نمودار ہوتا تھا اور بالآخر ہندوستانی تجارت کا اجارہ حاصل کرنے کے لئے مختلف لڑائیاں ہوتی تھیں جن سے تاریخ کے طالب علم بخوبی واقف ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ تمام باتیں اسی لئے تھیں کہ پیداوار خام اور مصنوعات کے لحاظ سے ہندوستان کو مقابلتہً بہت اہمیت حاصل تھی۔ بعض انگریز مورخین نے ہندوستانی مصنوعات کی خوبی و نفاست کا نہایت فراخ دلی کے ساتھ اپنی مختلف تصانیف میں ذکر کیا ہے۔

ہندوستان کی قدیم صنعتوں میں سوتی صنعت بہت مشہور ہے۔ یہاں کے صناعوں نے اس صنعت میں وہ کمال دکھایا ہے کہ عقل حیران رہ جاتی ہے۔ ڈھاکہ ململ جس کا نام آج بھی سنا جاتا ہے اس قدر باریک اور نفیس تیار کیا جاتا تھا کہ اس کی سات تہہ جسم پر ڈالنے کے بعد بھی جسم نہیں ڈھنک سکتا تھا۔ چنانچہ اس زمانے کا یہ واقعہ مشہور ہے کہ ایک مرتبہ شہنشاہ اورنگ زیب اپنی بیٹی پر یہ کہتے ہوئے خفا ہوا کہ کپڑوں کے نیچے سے اس کا جسم نظر آرہا تھا۔ شہزادی نے جواب دیا کہ وہ اس وقت ململ کے سات کپڑے پہنے ہوئی تھی۔ موجودہ زمانے میں مشین کے ذریعے باریک ململ تیار کیا جاتا ہے مگر اس میں قدیم ہندوستانی ململ کی باریکی' نفاست اور عمدگی نہیں پائی جاتی۔ اس زمانے میں ململ کے نام بھی عجیب تھے۔ مثلاً "آب رواں" "بافت ہوا" "شبنم" وغیرہ ——— یہ ایسے نام ہیں جن سے کپڑے کی باریکی اور نفاست کا پتہ چلتا ہے۔ ایک انگریز مورخ نے لکھا ہے کہ ہندوستانی ململ اس قدر باریک ہوتا تھا کہ بیس گز لمبے ٹکڑے کو لپیٹ کر ایک انگوٹھی میں سے بہ آسانی گزارا جاسکتا تھا۔ کپڑے کی بنائی کے لئے سوت اس قدر باریک تیار کیا جاتا تھا کہ وہ بعینہٖ مکڑی کے جال کے مشابہ ہوتا تھا۔ ہندوستانی ململ کی باریکی اور نفاست کا ذکر کرتے ہوئے ایک انگریز مورخ نے لکھا ہے کہ اس کپڑے کو جب مانچسٹر کے صناعوں نے دیکھا تو وہ کہہ اٹھے کہ ہندوستان کا ململ' ململ نہیں بلکہ اس کا سایہ ہے۔

اسی طرح ایک اور انگریز مورخ تعجب خیز لہجہ میں کہتا ہے کہ ہندوستانی ململ یا تو پریوں کا بنایا ہوا ہے یا کیڑے مکوڑوں کا ـــــ انسان سے تو یہ کام ناممکن ہے!! ـــــ یہ تھی اعلیٰ مہارت ہمارے صناعوں کی عہد قدیم میں۔ اس قسم کے صناع اور اس قسم کی مصنوعات موجودہ زمانے میں ناپید ہو چکی ہیں۔

سوتی صنعت کے علاوہ ہندوستان کی اونی صنعت بھی بہت مشہور تھی۔ کشمیر کے شال مقبول عام تھے۔ یورپی ممالک کو بکثرت روانہ کئے جاتے تھے۔ خصوصاً فرانس ان کا بڑا خریدار تھا۔ موجودہ زمانے میں بھی یہاں پر شال تیار کئے جاتے ہیں مگر قدیم کاریگر اور ان کی دستکاری معدوم ہو چکی ہے۔ رام پور کی چادریں، کشمیر، لودھیانہ اور سندھ کے جینے، ملتان، مچھلی پٹن، کوکناڈا اور ورنگل کے قالین بہت مشہور تھے۔ سنہ ۱۸۵۱ء میں جو نمائش لندن میں کی گئی تھی، اس میں ورنگل کے قالین سب سے بہتر ثابت ہوئے۔ اس میں شک نہیں کہ اب بھی ورنگل اور دیگر مقامات میں قالین تیار کئے جاتے ہیں لیکن ان کا بازار محدود ہو چکا ہے اور ان کی اہمیت صرف مقامی رہ گئی ہے۔

ریشم کی صنعت کو بھی ہندوستان میں خاص اہمیت حاصل رہی ہے۔ ٹسر، مونگا اور ایری مختلف ریشمی کپڑوں کے نام ہیں۔ ان سے ریشم نکالا جاتا تھا اور طرح طرح کے خوبصورت کپڑے بُنے جاتے تھے۔ ریشم اور سونے چاندی کے تاروں کو ملا کر اعلیٰ قسم کے قیمتی کپڑے تیار کئے جاتے تھے۔ ان کپڑوں پر بہترین قسم کی گل کاری کی جاتی تھی جس کی نفاست اور پاکیزگی اپنی نظیر نہ رکھتی تھی۔ کمخواب، ہمرو، مشجر اور مشروع اسی زمانے کی یادگار ہیں۔ مغلیہ دور میں یہ صنعتیں بہت ہی ترقی یافتہ حالت میں تھیں۔ درباری سرپرستی کی وجہ سے کاریگروں کا خوب ہمت افزائی ہوتی تھی اور جدت کا میدان روز بروز وسیع ہوتا جاتا تھا۔ گوناگوں حالات کی بنا پر یہ صنعتیں ناپید ہو چکی ہیں۔

ہندوستان میں لوہے اور فولاد کی صنعت بھی بہت ہی قدیم زمانے سے مروج ہے۔ دہلی میں لوہے کی موجودہ لاٹ سمودرگپت کے زمانے کی یادگار ہے۔ اس لاٹ سے پتہ چلتا ہے کہ آج سے (۵۰۰ ۴) سال قبل ہندوستانی صناع لوہے کی صنعت میں کس قدر مہارت رکھتے تھے۔ ایک مستند مورخ نے لکھا ہے کہ آج سے دو ہزار سال قبل بھی ہندوستان میں لوہے اور فولاد کی صنعت انتہائی عروج پر تھی۔ چھوٹی اور بڑی ہر قسم کی اشیاء نہایت خوبصورتی اور عمدگی کے ساتھ تیار کی جاتی تھیں جن سے نہ صرف ملک کے باشندوں کی احتیاجات پوری ہوتی تھیں بلکہ یہ بیرونی ممالک کو بھی روانہ کی جاتی تھیں۔ آسام میں بڑی سے بڑی توپوں کی نالیاں ڈھالی جاتی تھیں۔ توڑے دار بندوق اور نہایت عمدہ قسم کی تلواریں، پنجاب، سندھ، بنگال اور مدراس وغیرہ کے علاقوں میں تیار کی جاتی تھیں۔ کشمیر اور کچھ میں خوبصورت اور مضبوط زرہ بکتر تیار کئے جاتے تھے۔ احمد نگر کا علاقہ تیر کے نیزوں کے لئے خاص طور پر مشہور تھا۔

تلوار اور دیگر قسم کے آلات اور اوزار کے دستوں اور پلڑوں پر سونے چاندی کا نقشی کام کیا جاتا تھا۔ گلٹ سازی اور میناکاری کی صنعت میں بھی ہندوستانی صناعوں کو کافی مہارت حاصل تھی۔ جے پور، بھاول پور اور کچھ میں سونے کا کام ہوتا تھا۔ ملتان، لکھنؤ اور رام پور چاندی کے کام کیلئے مشہور تھے۔

مذکورہ صنعتوں کے علاوہ ہندوستان میں شیشہ سازی کی صنعت بھی مروج تھی۔ مورخین نے لکھا ہے کہ شیشہ سازی کی صنعت ہندوستان کی قدیم صنعتوں میں سے ہے۔ چنانچہ

راتھ شاستر اور رگ وید جیسی قدیم کتابوں میں بھی اس صنعت کا ذکر ہے۔ دورِ مغلیہ میں یہ صنعت بہت ہی ترقی پذیر حالت میں تھی۔ عمدہ قسم کے آئینے، شیشے کے جھاڑ، کونڈے اور طرح طرح کا آرائشی سامان تیار کیا جاتا تھا جس سے امیر امرا کے محل سجائے جاتے تھے۔ رنگین شیشے کے خوبصورت برتن بھی تیار کئے جاتے تھے۔ بیجاپور میں شیشے کے گلاب دان اور حقے برآمد ہوئے ہیں جن کے متعلق خیال کیا جاتا ہے کہ وہ سولھویں صدی کے بنائے ہوئے ہیں۔

شکر سازی کی صنعت کے متعلق بعض مورخین کا کہنا ہے کہ اس کی ایجاد سب سے پہلے ہندوستان میں ہوئی۔ قدیم زمانے میں شکر کی برآمد دور دور ممالک کو ہوتی تھی۔ خصوصاً یورپ میں شکر کی سربراہی ہندوستان اور اس کے گرد و نواح سے ہوتی تھی۔ قدیم یونان میں شکر کو "ہندوستان کا میٹھا نمک" کہا جاتا تھا۔ ساتویں صدی سنہ عیسوی میں شہنشاہ چین نے اپنے ہاں کے چند افراد کو ہندوستان میں بمقام بہار روانہ کیا تھا تاکہ فنِ شکر سازی میں مہارت حاصل کریں۔

جہاز سازی بھی ہندوستان کی قدیم صنعت ہے۔ چنانچہ ہمیں اس کا ثبوت مختلف مورخین کی تصانیف سے ملتا ہے۔ چھوٹی کشتیوں سے لیکر بڑے بڑے جہاز تیار کئے جاتے تھے۔ ساحلی تجارت کے علاوہ دور دراز مقامات کی تجارت ہندوستانی جہازوں کے ذریعہ کی جاتی تھی۔ انگلستان اور دیگر یورپی ممالک کے مابین اسباب کی نقل و حمل میں ہندوستانی جہازوں سے مدد لی جاتی تھی۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے زمانے میں بھی ہندوستانی جہاز انگلستان کو مال لے جاتے تھے۔ ۱۸۱۱ء میں ایک فرانسیسی سیاح نے لکھا ہے کہ "قدیم زمانے میں ہندوستانیوں نے فنِ جہاز سازی میں خوب کمال دکھایا تھا۔ اس فن میں یہ لوگ اب بھی یورپی افراد کی رہنمائی کر سکتے ہیں۔ انگریزوں نے ہندوستانی فنِ جہاز سازی کا بغور مطالعہ کیا اور اس کے ذریعہ اپنی صنعت میں بہت کچھ اصلاح کی۔"

ہندوستان کی قدیم صنعتوں میں سے صرف چند کا ذکر کیا گیا ہے۔ ان کے علاوہ تہذیب و تمدن کی گوناگوں ضروریات سے متعلق مختلف چھوٹی چھوٹی قابلِ قدر اور غیر معمولی مہارت طلب صنعتیں جاری تھیں۔ ان میں سے اکثر معدوم ہو چکی ہیں اور بعض کس مپرسی کی حالت میں پڑی سسک رہی ہیں۔ یہاں پر یہ سوال ہو سکتا ہے کہ ہندوستان کی قدیم صنعتیں کیوں معدوم ہوئیں؟ اس کے مختلف وجوہ ہیں۔ حکومت مغلیہ کے زوال کے بعد درباری سرپرستی اٹھ گئی۔ اشیاء کی کھپت میں غیر معمولی کمی ہو جانے کی وجہ سے صناع بیکار ہو گئے۔ ابتداً ایسٹ انڈیا کمپنی کی یہ پالیسی تھی کہ زیادہ سے زیادہ مصنوعات ہندوستان سے انگلستان لیجائی جائیں۔ لیکن بعد میں قومی مفاد کے تحت یہ پالیسی بدل دی گئی۔ اب یہ کوشش کی جانے لگی کہ انگلستانی مصنوعات کے لئے ہندوستان میں بازار فراہم کئے جائیں۔ چنانچہ اس کے لئے ہندوستان کی مختلف مصنوعات پر انگلستان میں بھاری محاصل عاید کئے گئے اور مختلف تدابیر کے ذریعہ انگلستانی مصنوعات، ہندوستان میں فروخت کی جانے لگیں۔ صنعتی انقلاب کی بدولت مختلف قسم کے آلات، اوزار اور مشین ایجاد ہوئے۔ جس کے ذریعہ کم سے کم مصارف میں زیادہ سے زیادہ اشیاء تیار کی جانے لگیں۔ ہندوستان کی دستی مصنوعات انگلستان کی مشین کی بنی ہوئی ارزاں اشیاء کا مقابلہ نہ کرسکیں اور بالآخر یہاں کے صناعوں کو

اپنا پیشہ ترک کرکے زراعت یا کسی اور پیشے کی طرف متوجہ ہونا پڑا۔ یہ رجحان بتدریج بڑھتا گیا حتیٰ کہ کچھ عرصہ بعد ہندوستانی آبادی میں قابل لحاظ اضافہ ہوگیا تو ہندوستان کو زرعی ملک کے نام سے یاد کیا جانے لگا۔ یہ خیال غلط ہے کہ ہندوستان صرف زراعت ہی کے لئے موزوں ہے۔ ہندوستان کو قدرت نے ایسے ذرایع عطا کئے ہیں جن کی بدولت وہ ایک طرف تو زرعی لحاظ سے ترقی کرسکتا ہے تو دوسری طرف صنعت و حرفت میں بھی موجودہ ترقی یافتہ ممالک کا ہم پلہ ہوسکتا ہے۔

محمد ناصر علی

(لاسلکی نشرگاہ حیدرآباد سے نشر کی گئی)

انقلاب

(سانیٹ)

دل کش بجھتے ہی دل افروز نظارے نہ رہے
آبشاروں کے ترنم میں ہے وحشت سی نہاں
مست جھونکوں میں ہیں جھجکی ہوئی آہیں لرزاں
بھولی چڑیوں کے وہ بے باک طرارے نہ رہے
خلوتِ شب میں ستاروں کے اشارے نہ رہے
رامش و رنگ کے فردوس پڑے ہیں ویراں
نکہت و نور کی دنیا ہے نظر سے پنہاں
کالے بادل کے وہ گلرنگ کنارے نہ رہے
ایک جھلسا ہوا لاشہ ہے چمن زارِ حیات
اک دہکتا ہوا انگارا ہے ہنستا ہوا پھول
سبز اشجار ہیں کملائے ہوئے خشک ببول
زندگی تند گھٹاؤں کی ستائی ہوئی رات
ان کے جانے سے وہ احساس نے پلٹا کھایا
میں نے ہنسنا بھی اگر چاہا تو رونا آیا

احمد ندیم قاسمی

تنقید و تبصرہ

شمیم کے سو شعر ۔ (سید مظفر حسین شمیم کی غزلوں کے منتخب شعر) مرتبہ سید جمیل الدین۔ پاکٹ ایڈیشن حجم ۳۶ صفحہ قیمت ۴ پتہ غنا تیکڈپو ۲۔ محمد علی بلڈنگ بمبئی۔

اس چھوٹی سی بیاض میں جناب شمیم کی کوئی چالیس غزلوں کے سو منتخب شعر درج ہیں۔ شمیم صاحب کے کلام میں جذبات کی اچھی ترجمانی کی گئی ہے۔ کلام کا معیار بھی بلند ہے بعض اشعار میں انقلابی رنگ کی جھلک بھی پائی جاتی ہے۔ اس کتاب کا پیش لفظ بمبئی یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کے صدر پروفیسر نجیب اشرف ندوی نے لکھا ہے۔

عشرت گیاوی کے سو شعر ۔ جیبی سائز۔ مرتبہ سید محمد اسمٰعیل رسا ہمدانی حجم ۳۲ صفحہ قیمت ۲ پتہ سید آل نبی حسنین منزل۔ گیا۔ صوبہ بہار۔

الف کی ردیف کی حد تک کوئی تیس غزل کے سو شعر چنے گئے ہیں۔ انتخاب اچھا ہے۔ ہر غزل میں سے دو دو چار چار شعر لئے گئے ہیں بعض غزلوں سے کچھ زیادہ بھی چنے گئے ہیں۔ جناب عشرت کے کلام میں سوز و گداز کے ساتھ ساتھ اعلیٰ جذبات کی تصویریں موجود ہیں کلام میں تنوع، پختگی اور اعلیٰ تخیل کی اچھی مثالیں پائی جاتی ہیں۔

ذکر و فکر ۔ از مقصود زاہدی حجم ۱۴۴ صفحہ قیمت ۵ پتہ مکتبہ ساغر ادبی مرکز۔ میرٹھ۔

اخلاقی، معاشرتی، نفسیاتی مضامین اور کہانیوں کا یہ مجموعہ مقصود زاہدی کی پہلی تصنیف ہے۔ جناب ساغر نظامی نے اپنے پیش لفظ میں مصنف کا تعارف کرایا ہے۔ ساغر صاحب لکھتے ہیں " اس کتاب کے مضامین اور چھوٹی کہانیاں صاف بتا رہی ہیں کہ مدہوش جوانی کے مقابلے میں زندگی کے تلخ تجربات مقصود کے دل پر گہرا نقش چھوڑتے ہیں ..... مقصود زندگی کی ان گلیوں میں گھوم کر آیا ہے جہاں رومان زادوں کا دم گھٹتا ہے"۔ اس مجموعہ کے مضامین میں " ہندوستان میں طبقاتی تقسیم " اور " تربیت خیال " خاص طور پر پڑھنے کے قابل ہیں۔ کہانیاں بھی نتیجہ خیز ہیں۔ طرز بیان دلچسپ ہے۔ بعض الفاظ کی تکرار گراں گزرتی ہے مثلاً " لوک باگ "۔ اگر اسی طرح مشق جاری رہے تو بقول ساغر صاحب کے کسی دن ایک جلیل مصنف مقصود کی روح میں بیدار ہو جائیگا۔ مقصود کو اپنا یہ سفر جسکی پہلی منزل سامنے ہے جاری رکھنا چاہیئے۔

ادب لطیف (افسانہ نمبر) بابتہ مئی و جون مرتبہ چودھری برکت علی بی اے چودھری نذیر احمد حجم ۱۶۰ صفحہ قیمت ۱۲ پتہ مکتبہ اردو۔ لاہور۔

لاہور کے مشہور ماہنامہ کے اس خاص نمبر میں ہیں افسانے شریک ہیں۔ " ہمارے افسانے " کے عنوان سے پروفیسر فیض احمد فیض نے افسانوں اور فن افسانہ نگاری پر ایک مختصر مفید مضمون لکھا ہے۔ افسانوں میں اکثر کہنہ مشق لکھنے والوں کے افسانے شامل ہیں۔ ڈاکٹر رشید جہاں، پروفیسر احتشام حسین، کرشن چندر، سعادت حسن منٹو، راجندر سنگھ بیدی، اوپندر ناتھ اشک، اختر انصاری، شکیلہ اختر، احمد ندیم قاسمی، علی عباس حسینی، محمد امین شرقپوری وغیرہ کے افسانے کافی دلچسپ اور سبق آموز ہیں۔ ترجموں میں انگریزی، روسی، چینی اور دوسری زبانوں کے عمدہ افسانے شریک ہیں بحیثیت مجموعی یہ افسانہ نمبر بہت دلچسپ ہے اور کاغذ کی گرانی کے اس دور میں بلحاظ حجم کے بہت سستا ہے۔

نبی عربی صلعم از قاضی زین العابدین سجاد میرٹھی حجم ۹۶ صفحہ قیمت ۱۲ پتہ منیجر ندوۃ المصنفین۔ دہلی۔

تاریخ اسلام کے مختصر نصاب کی یہ پہلی کتاب ہے جسکو مسلمان لڑکوں اور لڑکیوں کے لیے حسب فرمائش ناظم ندوۃ المصنفین جناب مؤلف نے مرتب کیا ہے۔ اس کتاب میں سیرت رسول اکرم سے متعلق اہم واقعات اختصار کے ساتھ درج کئے گئے ہیں جملہ مضامین عربی کی مستند کتابوں سے اخذ کئے گئے ہیں اور سلیس زبان میں تاریخی ترتیب کے لحاظ سے لکھے گئے ہیں بچوں کے علاوہ بڑے بھی اس مختصر سیرت سے مستفید ہو سکتے ہیں

افسانہ نمبر اسٹار ہفتہ وار لاہور باتصویر مرتبہ قمر جلال آبادی حجم ۱۰۰ صفحہ قیمت ۸ سالانہ چندہ چار روپیہ پتہ دفتر اسٹار ہسپتال روڈ لاہور۔ اسٹار کا دیدہ نظر، رنگ کا پرچہ افسانہ نمبر کے نام سے شائع کیا گیا ہے۔ اس میں کئی دلچسپ فسانے کہانیاں نظمیں فلمی خبریں وغیرہ ہیں۔ بعض افسانوں میں تھوڑی سی عریانیت آگئی ہے یہ حذف کر دیا جاتا تو نوخیز لڑکوں اور لڑکیوں کے جذبات میں اس قسم کے افسانے پڑھنے سے جو ہیجان پیدا ہوتا ہے اس کا اندیشہ باقی نہیں رہیگا۔

س

ادارہ کی خبریں

شعبے

اس مہینے ادارے کے دو شعبوں کی مجلس انتظامی کے اجلاس منعقد ہوئے

شعبۂ نسواں بتاریخ یکم مہر ۱۳۵۱ف ادارۂ ادبیات اردو کے شعبۂ نسواں کا اجلاس دفتر ادارہ میں منعقد ہوا۔

حسب ذیل خواتین موجود تھیں ۔

(۱) رابعہ بیگم صاحبہ صدر شعبہ

(۲) بلقیس بانو بیگم صاحبہ

(۳) تصدق فاطمہ صاحبہ

(۴) سکینہ بیگم صاحبہ معتمد شعبہ

بسلسلۂ انتظام امتحانات ادارۂ ادبیات اردو واقع ۱۵،۱۶،۱۷،۱۸ مہر ۱۳۵۱ف طے پایا کہ چونکہ محترمہ سکینہ بیگم صاحبہ معتمد اب واپس آگئی ہیں اس لئے بہ حسب سابق وہی صدر نگران کار کی خدمت انجام دیں گی اور مسز سروری صاحبہ، تصدق فاطمہ صاحبہ و محترمہ بلقیس بانو بیگم صاحبہ بحیثیت مددگار نگران کاران کی مدد کریں گی۔

رابعہ بیگم صاحبہ ۱۵ مہر ۱۳۵۱ف کو بمعیت تصدق فاطمہ صاحبہ و بلقیس بانو بیگم صاحبہ اردو دانی کے امیدواروں کا تقریری امتحان لینگی

شعبۂ انسائیکلوپیڈیا ادارے کے شعبۂ انسائیکلوپیڈیا کی مجلس انتظامی کا ایک اجلاس بتاریخ ۸ مہر بروز شام کے پانچ بجے بصدارت ڈاکٹر سید محی الدین قادری صاحب زور دفتر ادارہ میں منعقد ہوا جس میں حسب ذیل اصحاب نے شرکت کی

(۱) ڈاکٹر محمد راحت اللہ خاں صاحب ایم اے ڈی فل

(۲) عبدالقادر صاحب صدیقی ایم اے

(۳) سید شاہ محمد صاحب ایم ایس سی

(۴) عبدالقادر صاحب سروری ایم اے ایل ایل بی

(۵) سید محمد صاحب ایم اے

حسب ذیل امور طے پائے ۔

(۱) طے پایا کہ اردو انسائیکلوپیڈیا کے لئے ایک بورڈ آف ایڈیٹرز بنایا جائے جو مختلف علوم و فنون کے ماہرین پر مشتمل ہو اور جس کے ارکان کی فہرست مرتب کر کے آیندہ مجلس اسطامی کی منظوری حاصل کیجائے۔

(۲) اعراب کے مسئلہ کو شعبۂ زبان کے سپرد کیا جائے اور ایسے الفاظ کی فہرستیں طلب کی جائیں جن میں اختلاف ہے۔

(۳) زبان کی یکسانیت کو قائم رکھنے کے لئے حسب ذیل حضرات کی ایک کمیٹی بنائی گئی جو انسائیکلوپیڈیا کے مضامین پر اس نقطۂ نظر سے غور کرے گی۔

(۱) ڈاکٹر زور صاحب ایم اے پی ایچ ڈی

(۲) سروری صاحب ایم اے ایل ایل بی

(۳) شاہ محمد صاحب ایم ایس سی

(۴) سید محمد صاحب ایم اے

(۵) لطیف احمد فاروقی صاحب ایم اے ایل ایل بی ۔

شاخیں

اس مہینے حسب ذیل چار مقامات میں ادارہ کی شاخوں کے قیام کی منظوری صادر کی گئی۔ کیل، پرلی، ہمناباد، سیتاپور۔

ادارے کی شاخوں کی مصروفیتیں

شاخ پرلی یکم تیر ۱۳۵۱ف دن کے چار بجے حکیم مولوی فخرالدین صاحب منشی فاضل کی صدارت میں ایک جلسہ منعقد کیا گیا۔

مولوی غلام حسن صاحب صدیقی خطیب پرلی نے ادارۂ ادبیات اردو کے

اغراض ومقاصد کی تشریح فرمائی ۔اس بعد مولوی اشرف الدین صاحب فیضی نے اردو زبان اور ادب کی حفاظت اور ترقی کے سلسلے میں جامعہ عثمانیہ کے مائیہ ناز سپوت ڈاکٹر سید محی الدین قادری صاحب زورؔ اور فخر ملک فناد شاہی پروفیسر عبدالقادر صاحب سروری کی کوششوں کو واضح طور پر سمجھایا

فاضل صدر جلسہ نے بھی اردو امتحانات کی اہمیت پر کافی روشنی ڈال کر حاضرین کے شوق پر ایک تازیانہ کا کام کیا۔ باتفاق آرا حسب ذیل عہدہ داروں کا انتخاب عمل میں آیا۔

صدر ـــــ حکیم مولوی فخر الدین صاحب منشی فاضل (پنجاب)

معتمد ـــــ مولوی غلام حسن صاحب صدیقی اردو عالم (ادارہ)

اراکین ـــــ (۱) مولوی سید عبدالرزاق صاحب جعفری اردو عالم

(۲) مولوی اشرف الدین صاحب فیضی اردو عالم (ادارہ)

(۳) مولوی افلاطون خاں صاحب امین

(۴) ابوالخیر فاروقی

(۵) محترمہ طاہرہ بیگم صاحبہ صدر معلمہ مدرسہ نسواں اردو

آخر میں معتمد صاحب نے امیدواران اردو فاضل، اردو عالم اور اردو دانی کے درس وتدریس کے لئے اپنا دیوان خانہ مرحمت فرمایا جہاں امیدواروں کو بلا اجرت تعلیم دی جاتی ہے۔ اور ازراہ عنایت غریب امیدواروں کے لئے ہر قسم کی امداد کا وعدہ فرمایا۔

(اقتباس از رپورٹ مورخہ ۱۲ شہریور ۱۳۵۰ف روز جمعہ جو شاخ ادارۂ ادبیات اردو پرلی کے ماہانہ جلسہ میں سنائی گئی)

اس شاخ نے مقامی تاریخی تحقیقات کو بھی اپنے پروگرام میں شامل کرلیا ہے۔ اس سلسلہ میں معتمد نے "پرلی" کے تاریخی حالات لکھنے شروع کردئے ہیں یہ ایک قدیم تاریخی مقام ہے۔ اور یہاں ہندوستان کے بارہ جوتر لنگوں میں سے ایک جوتر لنگ ہے۔ جو سری ویجناتھ جی کے نام سے موسوم ہے۔

مولوی اشرف الدین صاحب فیضی "تاریخ فتح آباد" پر کام کر رہے ہیں۔ سب رس بابتہ اپریل ۱۹۴۱ء میں "فتح آباد" پر ایک نظر" کے عنوان سے مولوی سراج الدین صاحب نیر کا ایک مضمون شائع ہوا ہے۔ چنانچہ اس جلسہ میں فیضی صاحب نے اپنا وہ مضمون سنایا جس میں نیر صاحب کے مضمون کی غلطیوں کی اصلاح کی گئی ہے۔

تیر کے آخری ہفتہ میں ہمارے ادارہ کے سرگرم رفیق، مولوی اشرف الدین صاحب فیضی نے اردو امتحانات کے سلسلے میں نیک نور، فتح آباد اور سائیگاؤں جاگیر کا دورہ کرکے وہاں سے اردو امتحانات کے لئے امیدوار ہی فراہم نہیں کئے بلکہ ان کی تعلیم کا بھی خاطر خواہ بندوبست کردیا۔

شاخ پربھنی

آنریبل سید عبدالعزیز صاحب صدر المہام عدالت وامور مذہبی کے استقبال کی اعلیٰ پیمانے پر تیاری کی گئی تھی۔ مارکٹ ٹاؤن ہال کو نہایت سلیقہ سے سجایا گیا تھا اردو کے قدیم وجدید ادبا وشعرا کی تصاویر لگائے گئے تھے۔ ادارۂ ادبیات اردو کے تمام شعبوں کو اجاگر کرکے یہ بتلایا گیا کہ ادارہ اردو زبان وادب کی خدمت میں کس قدر سرگرم عمل ہے۔ مقامی شاخ کی ڈیڑھ سالہ جد وجہد سے جو کام انجام دئے گئے ہیں ان کی تفصیل دکھلائی گئی کہ سال ۱۹۴۰ء میں شاخ ہذا سے پندرہ طلبا امتحان اردو عالم میں شریک رہے جن میں ایک درجہ اول اور باقی تیرہ درجہ دوم میں کامیاب ہوئے۔ اس کے ساتھ ساتھ ایک دارالمطالعہ قائم کیا گیا ہے جس میں ملک وبیرون ملک کے متعدد رسائل اور اخبارات منگوائے جاتے ہیں تا ۱۲ تیر ۱۳۴۹ف سے ۹ شہریور ۱۳۵۰ف تک (۱۱۷۳) ناظرین کی تعداد رہی اور کتب کے مطالعہ کرنیوالوں کی تعداد (۷۱۱) رہی۔ نیز صحافی کی کلاس قائم کی جاکر ۸ طلباء کو جلد سازی سکھلائی گئی اب تعلیم بالغان کا مسئلہ زیر غور ہے۔ سال حال اردو دانی میں (۴۲) اردو عالم میں (۲۴) اور اردو فاضل میں (۲) طلباء خوشنویسی میں ایک جملہ (۶۹) طلبہ شریک ہوئے ہیں۔

آنریبل عبدالعزیز صاحب ۱۰ شہریور ۱۳۵۰ف کو ٹھیک ساڑھے چھ بجے رونق افروز ہوئے مستقر ضلع کے تقریباً تمام عہدہ داران شریک تھے۔ خاص طور پر مولوی ولی حسن صاحب اول تعلقدار، پیام جو صدر شاخ ہیں

ناظم عدالت ۔ حبیب الرحمن صاحب زائد ناظم عدالت ۔ غلام دستگیر صاحب مددگار ناظم انجمن اتحاد باہمی ۔ محمد عارف الدین حسن صاحب مہتمم آبکاری ۔ مولوی ابرار حسین صاحب صدر مدرس فوقانیہ وغیرہ وغیرہ موجود تھے ۔ ان کے علاوہ وکلاء و معزز شہریوں کی کثیر تعداد شریک جلسہ تھی ۔ کمیٹی استقبالیہ کی جانب سے مولوی عارف الدین حسن صاحب مہتمم آبکاری و حمید اللہ خاں صاحب شیدا معتمد اعزازی شاخ پربھنی و مولوی محمد منظر علیخاں صاحب وکیل ہائیکورٹ نائب صدر بزم نے استقبال کیا ۔ گلپوشی کے بعد مولوی محمد منظر علیخاں صاحب وکیل نے ادارہ ادبیات اردو کے شوروم کا معائنہ کرایا ۔ اور ادارہ کے کام کا تفصیلی جائزہ لیا ۔ موصوف نے دلچسپی سے ملاحظہ فرماکر اپنی مسرت کا اظہار فرمایا ۔ اور شاخ پربھنی کی سرپرستی قبول فرماکر ایک سو دس روپیہ کا عطیہ عطا فرمایا ۔ جس کے جواب میں ادارہ کی جانب سے مولوی محمد منظر علیخاں صاحب وکیل نے ہدیۂ تشکر پیش کیا ۔

شاخ خانہ پور | یہ شاخ کوشش کر رہی ہے کہ مسلمان اور ہندو طلبہ کی ایک کثیر تعداد کو شرکت امتحان کے لئے تیار اور اردو عالم و فاضل کی تعلیم کا مناسب انتظام کیا جائے ۔

اردو انسائیکلوپیڈیا

کمیٹی نسائیات | شعبۂ نسائیات کا دوسرا جلسہ ۲ ستمبر سنہ ۴۱ء ۴½ بجے شام میں ادارہ کے دفتر پر منعقد ہوا ۔ حسب ذیل خواتین و حضرات نے شرکت کی ۔

(۱) محترمہ مسز جبار
(۲) محترمہ مسز میر حسن
(۳) ۔ مس خورشید ویکاجی
(۴) مولوی نصیر الدین صاحب ہاشمی
(۵) ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ ۔
(۶) مولوی فیض محمد صاحب صدیقی بی اے ۔ ایم ایڈ
(۷) سید بادشاہ حسین

مس ویکاجی نے اپنا مرتب کیا ہوا "پکوان" کا انڈکس کمیٹی میں پیش کیا ۔ چونکہ "آ" کے الفاظ پر نوٹ مرتب کروانے کی بہت عجلت ہے اسلئے حسب ذیل الفاظ فہرست سے منتخب کئے گئے اور ان پر نوٹ مرتب کرنے کا کام بھی موجودہ خواتین ہی میں تقسیم کیا گیا ۔

آچار ـــــ مسز میر حسن
آب شولہ ـــــ مس خورشید ویکاجی
آئسکریم ـــــ مس خورشید ویکاجی
آ ئنگ ـــــ مس خورشید ویکاجی
آداب گھریلو ـــــ مسز جبار

طے پایا کہ مس خورشید ویکاجی کی فہرست پر معتمدین نظر ثانی کرکے مسز میر حسن کے ہاں بھیجیں گے اور مس ویکاجی اور مسز میر حسن کے باہمی مشورہ سے کام کی تقسیم ہوگی ۔ فی الوقت مس خورشید ویکاجی اپنے شرکار کار کی فہرست مرتب کریں گی اور بجائے مسز جبار کی نگرانی کے وہ خود کام کی نگرانی کریں گی ۔

طے پایا کہ حلوائی کی فہرست مسز میر حسن کے پاس بھیجی جائے تاکہ وہ مکمل کرسکیں ۔ کیونکہ اس کے الفاظ پر نوٹ وہی مرتب کریں گی

طے پایا کہ ترکاریوں کے ناموں کے ساتھ جو نباتیاتی نوٹس ہوں گے ان کے ساتھ ان ترکاریوں کے پکوان کے ناموں کی فہرست شامل کردی جائے گی ۔

طے پایا کہ مولوی ہاشمی صاحب کی فہرست زیورات پر معتمدین نظر ثانی کرکے ایسے الفاظ کا تعین کرینگے جن پر الگ الگ نوٹس لکھے جائیں گے ۔

طے پایا کہ آئندہ اجلاس تک دوسرے مضامین کی فہرستیں بھی طلب کرلی جائیں گی اور ان کو دوسرے اراکین کے ہاں گشت کردیا جائے گا

کمیٹی نباتیات

بتاریخ یکم مہر ۱۳۵۰ف اردو انسائیکلوپیڈیا (شعبہ نباتیات) کا ایک جلسہ منعقد ہوا جس میں حسب ذیل حضرات نے شرکت کی۔

بصدارت پروفیسر سعید الدین صاحب صدر شعبہ نباتیات جامعہ عثمانیہ

مولوی عبد الباری صاحب ایم ایس سی۔
مولوی معین الدین صاحب ایم ایس سی
مسٹر مہندر راج سکسینہ ایم ایس سی
مولوی عبد السلام صاحب ام' ایس سی
ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور
فیض محمد معتمد اردو انسائیکلوپیڈیا

اس جلسہ میں نباتیات کے الفاظ کی مرتبہ فہرست پر نظر ثانی کی گئی اور طے پایا کہ مکمل فہرست صدر موصوف اپنی نگرانی میں تیار کریں گے۔ نیز مقالوں کی ترتیب کے متعلق ضروری امور طے کرلئے گئے اور صدر جلسہ نے بڑی حد تک کام بھی تقسیم کردیا

طب مغربی

۵ مہر ۱۳۵۰ف شام کے پانچ بجے ادارہ کے دفتر پر شعبہ طب مغربی کا پہلا جلسہ ہوا حسب ذیل اصحاب شریک تھے۔

(۱) ڈاکٹر برج موہن لال صاحب پرنسپل میڈیکل کالج
(۲) ڈاکٹر آر۔ آر سکسینہ ایم بی بی ایس
(۳) ڈاکٹر منور علی ایف آر سی ایس
(۴) ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور
(۵) سید بادشاہ حسین معتمد اردو انسائیکلوپیڈیا

ڈاکٹر بکٹ چندرا اور بعض دوسرے ڈاکٹروں نے جنھیں اس اجلاس میں شرکت کی دعوت دی گئی تھی اپنی اتفاقی اور غیر معمولی مصروفیات کی وجہ سے شرکت سے معذرت چاہی اور ساتھ ہی یقین دلایا کہ جو کام ان کے تفویض کیا جائے گا وہ بخوشی کرنے آمادہ ہوں گے۔

(۱) طے پایا کہ کارڈیز کے ترجموں کی نظر ثانی اس فہرست کی مدد سے کرلی جائے۔ جو میڈیکل کالج میں مرتب ہورہی ہے اور ان اصطلاحوں کی نقلیں مقالہ نگاروں کے ہاں بھیج دی جائیں تاکہ وہ اصطلاحوں میں یکسانیت کا خیال رکھیں۔

(۲) طے پایا کہ اشاریہ کی تکمیل کے بعد (فی الحال الف کی حد تک) کمیٹی کا دوسرا جلسہ طلب کیا جائے اور کام کی تقسیم مکمل کی جائے۔

(۳) طے پایا کہ آئندہ جلسہ کا وقت رات کے آٹھ بجے کے بعد رکھا جائے کیونکہ ڈاکٹروں کو ان کی کثیر مصروفیات کی وجہ سے دن میں شرکت کے مواقع نہیں مل سکتے۔

(۴) طے پایا کہ ڈاکٹر بدر الدین صاحب بدر، ڈاکٹر عزیز حسن صاحب، ڈاکٹر شاہنواز صاحب، ڈاکٹر فضل کریم صاحب، ڈاکٹر ہیگل اور ڈاکٹر علی حسین صاحب سے بھی اشتراک عمل کی درخواست کی جائے۔

مقالہ نگاروں کو ہدایتیں

اردو انسائیکلوپیڈیا کی پہلی جلد کے لئے الفاظ و مصطلحات کا انتخاب ہوچکا ہے۔ اور مضامین کی ترتیب کا کام جاری ہے۔ حیدرآباد اور ہندستان کے سیکڑوں علما اور ماہرین علوم و فنون اس عظیم الشان کام میں ہاتھ بٹا رہے ہیں۔ اور روزانہ متعدد مقالے اور مضمون وصول ہورہے ہیں۔ اس سلسلہ میں مرتبین کی سہولت کے لئے حسب ذیل ہدایتیں شایع کی جاتی ہیں۔

(۱) ہر مضمون یا نوٹ میں صرف مستند مواد اور واقعات درج ہوں۔ ذاتی رائے قیاس یا رجحان کو قطعاً داخل نہ کیا جائے۔

(۲) عبارت واضح صاف اور سلیس ہو۔ انشا پردازانہ یا صحافتی یا مبہم اسلوب بیان سے احتراز کیا جائے۔

(۳) مضمون کے آخر میں حوالے کی کتابوں کے علاوہ کتابیات کے

عنوان کے تحت اس موضوع سے متعلق دیگر کتب کے نام بھی درج کئے جائیں۔

(۴) حوالے کی کتابوں کا سنہ طباعت اور اگر ضرورت محسوس ہو تو ان صفحوں کے نمبر بھی لکھے جائیں جن سے مرتب نے مواد حاصل کیا ہے۔

(۵) ختم مضمون پر کتابیات کے آخر میں مضمون نگار اپنے نام کے سرحرف (جو وہ رکھنا چاہتے ہوں) درج کریں۔

(۶) اگر کسی انسائیکلوپیڈیا یا اسی قسم کی کسی دوسری کتاب سے مواد حاصل کیا گیا ہو تو حتی الامکان اس امر کی کوشش ہونی چاہیے کہ ان اصل کتابوں کا بھی مطالعہ کیا جائے جن سے اس ماخذ نے مواد حاصل کیا ہے۔

(۷) انگریزی یا دوسری زبانوں کے الفاظ پہلے اردو رسم الخط میں اور بعد کو (قوسین میں) اصل زبان کے رسم الخط میں لکھے جائیں۔

(۸) غیر زبان کی اصطلاحوں کے ساتھ اردو اصطلاح یا تشریح ضرور درج کی جائے۔

(۹) دوسری زبانوں کے علاوہ وہ الفاظ جو انگریزی کے توسط سے اس وقت تک اردو میں آچکے ہیں ان کا تلفظ انگریزی کے مطابق لکھا جائے۔ لیکن ساتھ ہی قوسین میں اصل زبان کا تلفظ بھی لکھ دیں مثلاً وکٹر ہیوگو (فرانسیسی۔ وکتور ایوگو)

(۱۰) دوسری زبانوں کے الفاظ کا صحیح تلفظ ظاہر کرنے کے لئے اعراب کا خاص طور پر خیال رکھنا ضروری ہے۔ ادارہ کی مختلف مجلسیں اعراب اور علامتوں کے تعین پر غور کر رہی ہیں۔ قریب میں ان کی نسبت قطعی تصفیوں کا اعلان کیا جائے گا۔ اور اس طرح اردو زبان کی ایک اہم ضرورت کی تکمیل ہو سکے گی۔

چند نئے مقالہ نگار

اردو انسائیکلوپیڈیا کی پہلی جلد کے لئے جو اصحاب الف ممدودہ سے شروع ہونے والے الفاظ و اصطلاحات پر نوٹ تحریر کر رہے ہیں وہ ختم ماہ مہر تک اپنے مضامین روانہ فرمائیں اس سلسلہ میں یہ خبر اردو دنیا میں مسرت سے سنی جائے گی کہ مسٹر محمد علی جناح سے اقلیت پر، مہاتما گاندھی سے اہمسا پر، مسز سروجنی نائیڈو سے آزادی پر، مولانا ابوالکلام آزاد سے آدم پر، پنڈت جواہرلال نہرو سے اشتراکیت پر، نواب بہادر یار جنگ بہادر سے اتحاد المسلمین پر، اور مسٹر کے ایم منشی سے اکھنڈ ہندوستان پر، اردو انسائیکلوپیڈیا کے لئے مضامین اور مقالے لکھوائے جا رہے ہیں۔

معاشیات کے مقالے

معاشیات کے مختلف موضوعوں پر حسب ذیل اصحاب مقالے تحریر کریں گے۔ یہ ہندوستان کے بہت بڑے ماہرین معاشیات ہیں۔

۱۔ ڈاکٹر پرشوتم داس صاحب	بمبئی
۲۔ بی ایس لکشا تم صاحب	مدراس
۳۔ ڈاکٹر جی کے مدن صاحب	بمبئی
۴۔ جے جے انجیرا صاحب	بمبئی
۵۔ بی کے آر وی۔ راؤ صاحب	الہ آباد
۶۔ بی۔ کے ادارکر صاحب	شملہ
۷۔ ڈاکٹر کاروے صاحب	پونا
۸۔ وی پی کالے صاحب	"
۹۔ بی۔ ال۔ پنجابی صاحب	بمبئی
۱۰۔ ڈاکٹر گنگولی صاحب	دہلی
۱۱۔ کے۔ جی امبیگکر صاحب	کانپور
۱۲۔ ڈاکٹر جے ای گریگری	شملہ
۱۳۔ آنریبل سر منوہر لال صاحب	"
۱۴۔ ایس کے رودرا صاحب	الہ آباد

۱۵۔ ڈاکٹر جی. آر. مسرا صاحب　بنارس
۱۶۔ ڈاکٹر آر. کے مکرجی صاحب　لکھنؤ
۱۷۔ پروفیسر مرنجان صاحب　بمبئی
۱۸۔ سی. ایس. وکیل صاحب　"
۱۹۔ کے. ٹی. شاہ صاحب　"
۲۰۔ ڈاکٹر بالکرشنا صاحب　بنگلور
۲۱۔ ایس. ایم. سبا راؤ صاحب　"
۲۲۔ پی. جی. ٹامس صاحب　مدراس
۲۳۔ ایچ. ال. ڈے صاحب　ڈھاکہ
۲۴۔ جے. پی نیوگی پروفیسر اکنامکس　کلکتہ
۲۵۔ آنریبل ڈاکٹر پرامتھم بنرجی ممبر کونسل　دہلی
۲۶۔ جی. بی بیری صاحب پروفیسر اکنامکس　بمبئی
۲۷۔ ام. ای حسین صاحب " "　"
۲۸۔ ڈاکٹر ایس ام. داس صاحب گپتا لکچرار اکنامکس　ڈھاکہ
۲۹۔ بی. ین نائیڈو صاحب پروفیسر اکنامکس　چدم برم
۳۰۔ وی. ال. ڈی. سادعنا صاحب پروفیسر اکنامکس　میسور
۳۱۔ گوپال سامی صاحب مہاراجا کالج　میسور
۳۲۔ ڈاکٹر جی گیڈگل پولٹائز آف اکنامکس　پونا
۳۳۔ ایس. اے محمد پروفیسر اکنامکس　بنگال
۳۴۔ ڈاکٹر ایس. سی جسیں صاحب اکنامکس　لاہور
۳۵۔ پروفیسر برج نرائن صاحب " "　"
۳۶۔ ڈاکٹر ایس. ام کھیر پروفیسر اکنامکس　"
۳۷۔ کیو. ام فرید صاحب پرنسپل اسلامیہ کالج　پنجاب
۳۸۔ خان بشیر احمد خاں صاحب سکرٹری پنجاب کارپوریشن مونٹ　لاہور
۳۹۔ ڈاکٹر ال. کے. حیدر صاحب چیرمن شعبۂ اکنامکس　علیگڑھ
۴۰۔ محمد عاقل صاحب قرول باغ　دہلی
۴۱۔ احمد حسین صاحب مارکٹنگ آفسر جیوٹ کمپنی　کلکتہ
۴۲۔ ڈاکٹر گیان چند صاحب پروفیسر اکنامکس　پٹنہ
۴۳۔ پریم چند صاحب ہندو یونیورسٹی　بنارس
۴۴۔ شیخ عطاء اللہ صاحب مسلم یونیورسٹی　علیگڑھ
۴۵۔ ایس. یم. شفیع صاحب " "　"
۴۶۔ احمد مختار صاحب اسمٰعیل کالج اندھیری　بمبئی
۴۷۔ ایس. یم اختر صاحب اسلامیہ کالج　لاہور
۴۸۔ سر موہن لال صاحب کے. ٹی. فینانس ممبر　شملہ

اردو امتحانات

اس سال ادارے کے اردو امتحانات تیئس زنانہ و مردانہ مرکزوں میں منعقد ہوئے۔ اور ہر مرکز میں ایک صدر نگران کار صاحب ادارہ کی طرف سے روانہ کئے گئے جنھوں نے مقامی عہدہ دار اصحاب کی خواتین کی مدد سے زنانہ مرکزوں کی نگرانی کا انتظام کیا۔

پربھنی۔ سید بادشاہ حسین صاحب۔
پرلی۔ سید مہدی علی صاحب ایم ایس. سی۔
پرینڈہ۔ سید معین الدین صاحب ایم ایس. سی
کپل۔ مولوی خیر الدین صاحب
کشتگی۔ اکبر الدین صاحب صدیقی بی اے
گلبرگہ۔ مہندر راج صاحب سکسینہ ایم ایس سی
خانہ پور۔ ڈاکٹر غفار بیگ صاحب
کلیانی۔ عبدالمجید صاحب صدیقی یم۔ اے۔ ال ال بی
نرسی۔ خواجہ نصر اللہ صاحب ایم ایس. سی
کاماریڈی۔ میر کاظم حسین صاحب بی. اے
زنانہ ہائی اسکول نام پلی۔ سکینہ بیگم صاحبہ
سٹی کالج بلدہ۔ سید محمد صاحب ایم اے۔

امتحانات کے نتائج

ادارۂ ادبیاتِ اردو کی طرف سے چار ادبی امتحانات (اردو دانی۔ خوشنویسی۔ اردو عالم۔ اردو فاضل) دو ہفتہ قبل تیس مختلف مرکزوں میں مختلف مقامات پر منعقد ہوئے تھے۔ ان کے نتائج ماہ اکتوبر کے دوسرے ہفتہ میں شائع کئے جائیں گے۔

اس بارے میں امیدوار علیا یا ان سے متعلق اصحاب کو ادارے سے استفسارات کرنے کی زحمت نہیں اٹھانی چاہیے۔ دفترِ ادارہ اس قسم کے خطوط کا جواب نہیں ادا کر سکتا اور نہ اس قسم کی یاددہانیوں سے نتائج وقت سے پہلے شائع ہو سکتے ہیں۔ کیونکہ ممتحنین میں متعدد ایسے ہیں جو بیرونِ ممالک محروسہ کے ہیں۔

نئی مطبوعات

میر محمد مومن۔ سلطنت قطب شاہیہ کے مشہور پیشوا، سلطان محمد قلی قطب شاہ کے وزیر اعظم، حیدرآباد کے مشہور تعمیر کار اور مصلح اور بانیٔ دائرہ میر مومن کے حالاتِ زندگی اور علمی و رفاہی اور سیاسی کارناموں کا مفصل تذکرہ جناب ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ صدر شعبۂ اردو جامعہ عثمانیہ نے مرتب کر کے شائع کیا ہے۔ یہ ضخیم کتاب جو تین سو سے زیادہ صفحات اور ۴۴ عکسی تصاویر پر مشتمل ہے۔ کئی سال سے زیرِ طبع تھی۔ دکن کی علمی و سیاسی تاریخ سے دلچسپی رکھنے والے حیدرآباد کے اس سابق وزیر اعظم کے کارناموں کے مطالعہ سے مفید معلومات حاصل کر سکتے ہیں۔

بلقان۔ ادارۂ ادبیاتِ اردو نے عام معلومات کی کتابوں کا جو سلسلہ شروع کیا ہے یہ کتاب اس کی آٹھویں کڑی ہے۔ اسے مولوی حنیف صدیقی صاحب بی۔ اے (آنرز) رکن ادبیات اردو نے سب کے لئے ... کی ایک ... [illegible] کیا ہے۔

شعبۂ طلبہ گلبرگہ [illegible]

تقریریں "پردے کی اچھائیاں اور برائیاں" پر ہوئیں۔ محرک سید محمد نور الحسن تھے اور ان کی مخالفت حمید الدین نے کی۔ اس کے بعد دونوں پہلوؤں پر مختلف طلبہ نے تقریریں کیں۔ بڑا دلچسپ مباحثہ رہا۔ اعتراضات بھی اچھے تھے اور ان کا جواب بھی محرک صاحب نے معقول و دلچسپ دیا۔

بعد ازاں صدر صاحب جلسہ نے دونوں پہلوؤں پر سیر حاصل تبصرہ کیا اور پھر بہ غلبۂ آرا یہ طے پایا کہ پردہ ضروری ہے۔

مولوی نصیر الدین صاحب نظامی لکچرار گلبرگہ کالج ہمارے ادارہ و شعبہ کی ترقی کے لئے ہر ممکنہ کوشش کر رہے ہیں۔ اور وقت بوقت اپنے قیمتی مشوروں سے رہنمائی فرماتے ہیں۔

یہاں اراکین شعبہ سرگرم کار ہیں۔ چنانچہ (قاضی محلہ) میں ایک شاخ شعبۂ طلبہ گلبرگہ قائم ہونے والی ہے۔

شعبۂ طلبہ بیدر کی جانب سے ایک جلسہ منعقد ہونے والا ہے جس کی اطلاع مقامی اخباروں میں چھپ جائے گی۔

اردو انسائیکلوپیڈیا کے متعلق نئی رائیں

اردو انسائیکلوپیڈیا کی گو کہ پچھلے کئی سالوں سے کئی جگہ یہ کام شروع ہوا لیکن ابتدائی منازل ہی میں ختم ہو گیا۔ اب ادارۂ ادبیاتِ اردو حیدرآباد دکن نے یہ بارِ عظیم اپنے سر لیا ہے۔ اردو انسائیکلوپیڈیا کا ابتدائی نمونہ اس وقت میرے سامنے ہے اس کے مطالعہ سے واضح ہوتا ہے کہ ہر جہتی علوم و فنون کا یہ خزینہ اگر شائع ہو گیا تو واقعی اردو کو سر بلند کر دے گا۔ اس انسائیکلوپیڈیا کی تیاری میں حیدرآباد اور ہندوستان کے ماہرانِ علوم و فنون کا زیادہ سے زیادہ ہاتھ ہے۔ تمام شعبہ جات تقسیم کر دئے گئے ہیں ... تقسیم ... امید ... کہ ادارۂ ادبیات ضرور اس اہم خدمت کو انجام دے سکے گا۔ ابتدائی ... [illegible] اطمینان ہے ... انسائیکلوپیڈیا ... [illegible]

افراد کو خدا ہمت و استقلال عطا فرمائے اور ادارۂ ادبیات اردو اس شہرۂ خدمت کے صلہ میں شہرت دوام حاصل کرے۔

شاعر آگرہ، جولائی ۱۹۴۱ء

سرزمین دکن جہاں سب سے پہلے اردو یونیورسٹی بنی اب ہاں سے اردو انسائیکلو پیڈیا کی اشاعت وتدوین کی خبر آئی ہے ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور ایم اے پی ایچ ڈی اور ان کے دیگر رفقائے کار نے اردو انسائیکلو پیڈیا کی طباعت اور اشاعت کا کام اپنے کندھوں پر اٹھایا ہے اس کتاب کی ترتیب کا کام کوئی آسان بات نہیں ہے۔ مرہٹی انسائیکلو پیڈیا کا جب کام شروع کیا گیا تھا تو ایک مخلص مرہٹہ نوجوان نے تمام ملک کا دورہ کرکے کتاب کے دو ہزار گاہک بنائے سے جب اسے یقین ہوگیا وہ کتاب کو دوسو روپے فی جلد سے فروخت کرسکیگا تو اس نے ایک باقاعدہ دفتر پونہ میں قائم کرکے کام شروع کردیا تھا مسٹر کیلکر کا نام اس مرہٹی انسائیکلو پیڈیا کے ساتھ ہمیشہ زندہ رہے گا۔

اردو انسائیکلو پیڈیا کے لئے بھی ایسی کوشش ہونی چاہیئے۔

اس کام کے دو پہلو ہیں ایک علمی اور دوسرا اقتصادی علمی کام کرنیوالے لوگوں سے یہ توقع نہیں کرنی چاہیے کہ وہ غریب روپیہ پیسہ کا بھی خود انتظام کرینگے ادارۂ ادبیات اردو کو چاہیے کہ علمی کام کرنیوالے لوگوں سے علحدہ ایک علمی کام کرنیوالوں کی کمیٹی بنائے جو اس عظیم الشان کام کے سرانجام دینے کیلئے سرمایہ جمع کریں امید ہے کہ حیدرآباد گورنمنٹ بھی اس کام کو انجام دینے کیلئے ادارہ کا ہاتھ بٹائیگی یا دارالترجمہ حیدرآباد سے ضروری تعاون کی امداد دلائیگی خدا کے فضل سے حیدرآباد کی یونیورسٹی میں اسوقت کافی پروفیسر موجود ہیں جن میں سے کم وبیش سب صاحب اس علمی اور ملکی ضرورت کو پورا کرنے میں حصہ لیں گے۔ ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد کو ہم اس کی اس سعی پر مبارک باد دیتے ہیں۔

پیسہ اخبار لاہور ۳ جولائی ۱۹۴۱ء

ادارۂ ادبیات اردو نے اردو کی ایک عظیم الشان خدمت اپنے ذمہ لی ہے۔ حیدرآباد میں جدید و قدیم علوم و فنون کے اساتذہ اور ماہرین کی ایک بہت بڑی جماعت موجود ہے جن کی موجودگی میں اس کام کے انجام کی پوری توقع کی جاسکتی ہے۔ ضرورت ہے کہ اردو کے ہمدرد اور بہی خواہ اس کام میں اس کی ہمت بڑھائیں۔

معارف اگست ۱۹۴۱ء

اس وسیع علمی مہم کو ادارۂ ادبیات اردو نے اپنے ہاتھ میں لیا ہے جس کو دونوں سہولتیں حاصل ہیں۔ سرمایہ بھی۔ اور قابل کام کرنے والوں کا اشتراک بھی۔ اس لئے ہمیں امید ہے کہ یہ کام ادارہ کے ہاتھوں بہترین طریقہ پر انجام پائے گا۔ اردو انسائیکلو پیڈیا کا جو نمونہ ملا ہے پیش نظر ہے اسے دیکھ کر ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس کی اشاعت سے اردو زبان کی ایک بہت بڑی کمی پوری ہوگی۔ اس کی مجلس انتظامی کے اراکین و معاونین میں ہمیں ملک کی وہ تمام ہستیاں نظر آتی ہیں جو اپنی علمی قابلیت کا جواب نہیں رکھتیں۔ اور ان کے اشتراک سے جو چیز نکلے گی وہ یقیناً لاجواب ہوگی۔ ہم اردو داں حضرات سے پُرزور سفارش کرتے ہیں کہ وہ اس کی خریداری قبول فرماکر اس عظیم الشان مہم میں ادارہ کا ہاتھ بٹائیں۔

رسالہ ہل الہ آباد اگست ۱۹۴۱ء

یہ نمونہ، لمبی اور چوڑی تقطیع کے ۱۵ صفحوں پر چھپا ہے۔ ہر صفحہ میں تین گنجان کالم ہیں لیکن کتابت وطباعت صاف اور اتنی ضخامت میں چھوٹے بڑے ۱۹ مقالے درج ہیں۔ زبان صاف، بیان واضح، مضامین سب کے سب سنجیدہ، پُر معلومات، مستند، ایک انسائیکلو پیڈیا کی شایان شان۔ مجلس ادارت کے صدر، اردو کے مشہور خادم و کارکن، ڈاکٹر زور ہیں، دو معتمد ہیں اور چھ ارکان کی کمیٹی ان کے علاوہ کل فہرست مباحث ۲۶ ابواب میں تقسیم ہے۔ ان میں سے ہر شعبہ متعدد ماہرین فن کے ہاتھ میں ہے۔ کم از کم یہ نمونہ جس معیار کو پیش کررہا ہے، وہ ہماری توقعات سے بلند تر ہے۔ اردو زبان کی یہ کوشش، سنجیدہ اور قابل قدر خدمت اسلئے ہر ہوا خواہ کی تائید اور عملی ہمدردی کی مستحق ہے۔

صدق جون ۱۹۴۱ء

نواب سالار جنگ بہادر کا معائنہ اِدارۂ ادبیات اُردو

پہلی صف - مولوی سید علی اکبر صاحب - ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور - نواب سالار جنگ بہادر
نواب خسرو جنگ بہادر - مولوی حسن علی خان صاحب - مولوی سید محمد اعظم صاحب

دوسری صف - معین الدین احمد صاحب انصاری - مولوی سراج الدین احمد صاحب - مولوی عبدالمجید صاحب صدیقی
نواب مرزا سیف علی خان صاحب - خواجہ حمید الدین صاحب شاہد - مولوی عبدالقادر صاحب سروری

تیسری صف - مولوی فیض محمد صاحب صدیقی - مرغوب الدین احمد صاحب - مولوی سید محمد صاحب - جمال الدین صاحب
مولوی سید بادشاہ حسین صاحب - میر عارف علی خان صاحب

ادارہ ادبیات اردو حیدرآباد دکن کا ماہ نامہ

نشان ٹپہ آصفیہ ۱۵۳
نشان ٹپہ برطانیہ M 3950
ٹیلیفون نمبر ۲۲۰۹
چندہ سالانہ چار روپیہ آٹھ آنے
بچوں کا سب رس ایک روپیہ آٹھ آنے
اکتوبر ۱۹۴۱ء

زیر نگرانی
ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور
مجلس ادارت
حمید الدین شاہد
سکینہ بیگم
عبدالحفیظ صدیقی بی ایس سی

جلد (۴) بابت اکتوبر ۱۹۴۱ء شمارہ (۱۰)

	عنوان	مصنف	صفحہ
۱	تین گھنٹے ٹیگور کے ساتھ	سید بادشاہ حسین	۲
۲	حیات بعد الممات	ایم اسلم	۹
۳	وطن کی امانت ... نظم	الطاف مشہدی	۱۲
۴	مجبوریاں	سعیدالنساء بیگم	۱۵
۵	پھول سا ہاتھ ... نظم	راجہ مہدی علی خاں	۱۶
۶	مقدس شہر!	محمد عبدالقادر فاروقی	۱۷
۷	سوز و ساز ... افسانہ	کاظم علی خاں بی اے	۱۸
۸	سحر ... نظم	سید ناظم علی ناظر	۲۰
۹	ننگ نوازش } نظم	سید ظہیر الدین رونق	۲۱
۱۰	تین تغیر سبق	شنکر موہن لال ماتھر	۲۲
۱۱	محرومی } ... نظم جذبۂ اضطراب	کاوش	۲۴
۱۲	ہندی اور مسلمان	اقبال انصاری ایم اے	۲۵
۱۳	نشری تقاریر	ظفرالحسن بی اے	۳۱
۱۴	برکھارت ... نظم	صغرا عبدالسبحان	۴۰
۱۵	اندازِ عمل ... مسدس	سید ابوالقاسم سرور	۴۱
۱۶	گل بوٹے	باغباں	۴۴
۱۷	بھولنے والے سے ... نظم	جوہر فریادی	۴۵
۱۸	نئی کتابیں	نواب مرزا سیف علی خاں	۴۶
۱۹	تنقید و تبصرہ	[illegible]	۴۸
۲۰	ادارہ کی خبریں	ادارہ	۴۹

حمید الدین شاہد کے اہتمام سے اعظم اسٹیم پریس میں چھپ کر دفتر ادارہ خیریت آباد سے شائع ہوا

تین گھنٹے ٹیگور کے ساتھ!

چند برس پہلے کی بات ہے کہ سید محمود صاحب اور میں مہمان خانہ "راک لینڈ" کے برآمدے میں کھڑے حسب ذیل اعلان پڑھ رہے تھے۔

اعلان

سوء اتفاق سے ڈاکٹر ٹیگور کچھ علیل سے ہو گئے ہیں اور ڈاکٹروں کے مشورے کے مطابق انھیں آرام کی ضرورت ہے اس لئے وہ ملاقاتیوں کو وقت دینے کے قابل نہیں ہو سکیں گے، براہ کرم انھیں معاف فرمایا جائے۔ معتمد

میں نے اس اعلان کو لاپروائی سے پڑھا لیکن سید صاحب پر اس کا کافی اثر معلوم ہوتا تھا۔ زبان سے تو میں کچھ نہ کہہ سکا لیکن مسکرا کر یہ ظاہر کرنا چاہا کہ یہ کوئی نئی بات نہیں ہر بڑے آدمی کی آمد پر اسی قسم کا اعلان کیا جاتا ہے تاکہ ملنے والوں کا ہجوم ضرورت سے زیادہ تکلیف دہ نہ ہو جائے۔

"صاحب! آپ لوگ اگر آٹوگراف لینے آئے ہیں تو اپنی کاپیاں چھوڑ جائیے" نوکر نے پڑھایا ہوا سبق دہرایا "تین چار روز بعد معتمد صاحب ان پر دستخط لے لینگے اور آپ کسی وقت آکر انھیں لے جائیں۔"

سید صاحب نے اس کو لطف خاص جانا اور فوراً ہی جیب سے آٹوگراف بک نکال کر نوکر کے حوالہ کر دی۔

"سوچ کیا رہے ہیں آپ! دے کیوں نہیں دیتے بیاض" سید صاحب نے گویا موقع سے فائدہ اٹھانے کا طریقہ یاد دلایا" میں سوچ رہا تھا کہ آپ بھی بیاض کیوں نہ واپس لے لیں" میں نے کہا "پھر کسی روز آکر ہم خود دستخط کرا لیں گے" "اب رہنے بھی دو" سید صاحب بولے "دوبارہ کون آئے اور پھر کیسے معلوم کہ ملاقات ہو بھی سکے یا نہیں۔" سید صاحب کی اس ترغیب کے باوجود میں نے بیاض نہیں دی۔

تھوڑی دیر بعد پھر راک لینڈ پہنچا۔ سیڑھیاں چڑھ کر میں برآمدے میں پہنچا ہی تھا کہ سامنے آنکھ کے گوشے سے دیکھا اس دفعہ بھی وہی اعلان موجود تھا۔ میں نے بغور پڑھا کہ شاید الفاظ میں کسی قسم کی تبدیلی کی گئی ہو مگر وہی الفاظ بدستور باقی تھے البتہ نہ کوئی مہمان خانہ کا ملازم تھا اور نہ ٹیگور کا معتمد۔ چند لمحے باہر انتظار کرنے کے بعد میں ملحقہ کمرے میں پہنچا اور ٹوپی میز پر چھوڑ کر سگریٹ جلایا۔ ایک آرام دہ کرسی پر لیٹ کر سوچنے لگا کہ کس طرح ٹیگور تک پہنچنا ممکن ہے!

جب دوسرا سگریٹ بھی ختم ہوا اور کوئی ملازم خبر لینے نہ آیا تو مجھے خیال ہوا کہ تھوڑی سی بے تکلفی برتنی چاہیے۔ بغیر کسی قسم کا خاص منصوبہ سوچے میں مہمان خانہ کے اندرونی حصہ کی طرف گیا فی الوقت تو مجھے نوکر کی تلاش تھی لیکن جب کوئی نظر نہ آیا اور ادھر ادھر گھومنے کے بعد ایک برآمدے میں ڈاکٹر ٹیگور نظر آئے تو طبیعت بے چین ہو گئی۔ ایک آرام کرسی پر وہ لیٹے ہوئے تھے بازو ایک تپائی پر تازہ [illegible] تھیں۔ صندلی رنگ کے لبادہ پر ان کی سفید [illegible] پیدا کر رہی تھی اخبار ان کے ہاتھ میں تھا اور میں سمجھتا ہوں کہ [illegible] پڑھ رہے تھے۔ میری آمد کو انھوں نے محسوس کیا لیکن پروا نہ کی۔ دل بے اختیار چاہتا تھا کہ حسن اتفاق سے جو موقع ملا ہے اس سے پورا پورا فائدہ اٹھاؤں مگر جھجک اور تکلف کی وجہ سے قدم اٹھتے نہ تھے۔ میں گہری سوچ میں تھا لیکن ان کے سامنے اس طرح کھڑے ہو کر سوچتے رہنا بھی بے موقع سا تھا۔ قطعی فیصلہ کرنے کے لئے وقت درکار تھا اس لئے میں نے مناسب سمجھا کہ برآمدے میں اسی طرح بے معنی طور پر گھومتا رہوں۔ نوکروں کا دور تک پتہ نہ تھا۔ میں ادھر ادھر گھوم کر پھر ٹیگور کے سامنے سے گزرا مگر اب بھی کوئی قطعی فیصلہ نہ کر سکا تھا۔ ایسے میں ایک آواز میرے کان میں آئی "آواز دھیمی، سریلی اور رس بھری تھی۔

"ایک منٹ کے لئے تکلیف کریں گے آپ!" ٹیگور پوچھ رہے تھے۔

اس آواز نے مجھے چونکا دیا۔ میں نے جواب [illegible] کچھ بھی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ ٹیگور کس سے مخاطب ہیں [illegible] میرے سوا کوئی بات وہاں نظر نہ آتا تھا اور میں اجنبی تھا [illegible]

ٹیگور اسی کی طرف اشارہ کرنا تو نہیں چاہتے؟ دفعتاً مجھے خیال آیا اور ساتھ ہی مجھے اس طرح بلا اطلاع گھس آنے پر ندامت سی محسوس ہونے لگی۔

"میں آپ کو ذرا سی تکلیف دینا چاہتا ہوں" میں نے اس نوجوان کو مخاطب کیا۔ ابھی میں نے دیکھا کہ ٹیگور مجھ سے مخاطب ہو کر بولے "بہت اچھا ابھی آیا" کہنے کی میں نے ہمت کی۔

"معاف کیجئے یہاں کوئی نوکر نظر نہیں آتا"

"جی ہاں میں بھی نوکر ہی کی تلاش میں تھا ——— بوائے! بوائے!!

——— نوکر کو پکارتے ہوئے میں نے کہا" فرمائیے نا آپ کو کس چیز کی ضرورت ہے معلوم ہوتا ہے کہ نوکر سب ناشتہ کر رہے ہیں، میرے لایق کوئی خدمت؟"

"میرا معتمد او پر ہے یا باہر چلا گیا، ذرا دیکھ لیجئے"

"بہت بہتر"

میں فوراً اوپر گیا لیکن چونکہ یہ معلوم نہ تھا کہ معتمد صاحب کس کمرے میں رہتے ہیں اس لئے بڑی مشکل ہوئی ان کی تلاش میں۔ بالآخر جب بغیر کچھ معلوم کئے ہوئے واپس ہو رہا تھا ایک نوکر اتفاقاً ملا۔ اس سے پوچھنے پر معلوم ہوا کہ معتمد صاحب آدھ گھنٹہ پہلے جا چکے ہیں۔

"معتمد صاحب آدھ گھنٹہ پہلے جا چکے ہیں" میں نے واپس ہو کر اطلاع دی۔

"شکریہ! آپ کو بڑی تکلیف ہوئی"

"جی نہیں، آپ اس کا خیال نہ فرمائیں ——— آپ کو کس چیز کی ضرورت معلوم ہوتی ہے، اگر آپ مناسب سمجھیں تو مجھ سے فرمائیں"

"شکریہ کوئی خاص بات نہیں، ضرورت ہوگی تو آپ سے مدد لوں گا"

اتنے میں باہر [illegible] کی آواز سنائی دی۔

"میں سمجھتا ہوں کہ آپ کو اس وقت میری مدد کی ضرورت ہے۔"

ٹیگور [illegible] ایک صاحب [illegible]

مدراسیوں کی وضع کا پٹکا ساپھا باندھے اور ستار ہاتھ میں لئے میرے منتظر کھڑے تھے

"میں کوی کے چرنوں میں بیٹھ کر ستار پر ایک راگنی بجانا چاہتا ہوں" پنڈت جی نے کہا۔

"مگر ان کی طبیعت ناساز ہے ——— دیکھئے نا یہ اعلان" یہ کہہ کر میں نے اعلان ان کی آنکھوں کے آگے کر دیا جس کو پڑھ کر انھوں نے سلسلہ جاری رکھا۔

"مگر پرسوں ان کے سکریٹری صاحب نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ کسی طرح آج وہ مجھے موقع دیں گے"

"سکریٹری صاحب اس وقت موجود نہیں ہیں، آپ پھر کسی وقت ان سے مل کر اس کا تصفیہ کریں" یہ کہہ کر میں واپس ہونا ہی چاہتا تھا کہ وہ بولے "کرپا کیجئے صاحب کرپا، میں سکندر آباد سے ٹکسی پر آیا ہوں، اس سے پہلے بھی چکر کر چکا ہوں میں زیادہ تکلیف نہ دوں گا، صرف دس منٹ ستار بجاؤں گا۔ یقیناً کوی خوش ہوں گے، سنتا ہوں کہ انھیں ستار سے بڑی دلچسپی ہے ——— مہربانی کیجئے، میں بڑا ممنون ہوں گا" ستار تپائی پر رکھ کر وہ دونوں ہاتھ جوڑ کر پیشانی تک لے گئے۔

"میری بڑی آرزو ہے، آپ دیا کریں تو مجھے موقع مل جائے گا" مجھے سوچ میں دیکھ کر انھوں نے سلسلۂ کلام جاری رکھا۔

"ایک صاحب آپ کو ستار سنانا چاہتے ہیں، دس منٹ سے زیادہ وقت نہ لینے کا وعدہ کرتے ہیں" میں نے واپس ہو کر ٹیگور کو اطلاع دی۔ میں نے ٹالنے کی کوشش کی مگر انھیں اصرار ہے کہ موقع دیا جائے"

"اچھی بات ہے بلا لیجئے"

پنڈت یہ مژدہ سن کر خوشی سے پھول گئے۔ ٹیگور کی اجازت ملتے ہی طور پر بڑے سلیقہ سے پرنام کیا اور کوی کے چرنوں میں آ کر بیٹھ گئے اور فوراً ہی تار چھیڑنے شروع کئے [illegible] انھوں نے کیا ہی راگنی کہ میں [illegible]

"ڈاکٹر صاحب شامل نہیں ہوئے تھے" میں نے جرات آمیز قدم اٹھایا۔
"لیکن گانے کو دبان سے زیادہ تعلق نہیں" پنڈت جی نے فوراً ہی جواب دیا۔

دس منٹ تک وہ گاتے رہے ختم کرتے ہی ٹیگور نے ان کا شکریہ ادا کیا اور استادی بھانے کی بڑی تعریف کی اور اس اخلاقی تعریف کو حسن طلب سمجھ کر دوسری گت چھیڑنے ہی والے تھے کہ ٹیگور نے انہیں منع کیا۔ کہہ کر آپ تکلیف نہ کریں اس وقت میری طبیعت کچھ زیادہ راغب نہیں معلوم ہوتی۔

پنڈت جی جاتے جاتے چرن چھوئے، پرنام کیا اور دل بھر کر مسکرا لیا۔
جب یہ چلے گئے تو ٹیگور نے مجھ سے پوچھا "آپ کو بھی موسیقی سے کچھ لگاؤ ہے؟"

"اس حد تک لگاؤ ہے کہ سن لیتا ہوں اور بغیر سمجھے بوجھے جتنا لطف لی سکتا ہے حاصل کر لیتا ہوں" میں نے جواب دیا۔ وہ ہنس پڑے اور کہنے لگے "آپ کے ہاں موسیقی کا کیا حال ہے؟"

"اتنا شوق تو نہیں جتنا بنگال میں ہے" میں نے کہنا شروع ہی کیا تھا کہ وہ بولے "آپ کھڑے کیوں ہیں؟ کرسی لے لیجئے نا ——— معاف کیجئے آج آپ کو مہمان خانے کی نگرانی کے سوا میرے معتمد کے خدمات بھی انجام دینے پڑ رہے ہیں۔"

اب مجھے معلوم ہوا کہ ایک طرف ٹیگور مجھے اس مہمان خانہ کا منتظم سمجھ رہے ہیں اور دوسری طرف طرفاتی مجھے ان کا پرائیوٹ سکریٹری سمجھتے ہیں۔
"نہیں کوئی بات نہیں، آپ ہمارے مہمان ہیں اور مہمان کی ہر طرح خاطر اور خدمت کرنا ہمارا فرض ہے" میں نے گول گول الفاظ میں جواب دینا مناسب سمجھا۔

"ہاں تو آپ موسیقی کے بارے میں کیا کہہ رہے تھے" ٹیگور بولے۔
"میں عرض کر رہا تھا کہ ہمارے ہاں گانے کا اتنا شوق نہیں جتنا کہ بنگال میں عام شوق اور آندھرا میں ہے۔"
"آپ کے ہاں مدارس میں موسیقی تو شامل نہیں ہوگی"

"جی نہیں ——— لیکن اب بعض مدارس میں ابتدائی جماعتوں میں اس کی تعلیم دی جانے لگی ہے۔"
"کوئی موسیقی کا اسکول ہے یہاں؟"
"جی نہیں کوئی خاص اسکول نہیں۔"
"یہی وجہ ہے ——— بنگال میں ایسے بے شمار مدارس ہیں جہاں باضابطہ طور پر صرف موسیقی ہی سکھائی جاتی ہے۔"
"درست ہے اسی وجہ سے زیادہ چرچا ہے ——— اور آپ کے شانتی نکیتان کا کیا حال ہے؟"
"شانتی نکیتان؟ ——— آپ نے دیکھا ہے مدرسہ؟"
"جی نہیں، مجھے بدقسمتی سے موقع نہیں ملا۔"
"آپ کلکتہ آئے ہیں؟"
"نہیں شمال مشرقی ہندوستان کی طرف جانے کا اتفاق نہیں ہوا۔"
"اس مدرسے سے دلچسپی ہے آپ کو"

"بہت"
"یہاں لوگ عام طور پر کیا خیال کرتے ہیں ——— بعض مقامات پر تو میں نے سنا کہ لوگ اسے تفریح گاہ سمجھتے ہیں۔"
"سنجیدہ طبقہ تو اسے قدر کی نگاہ سے دیکھتا ہے اور طریقۂ تعلیم میں اس کو ایک انقلابی زینہ سمجھتا ہے"
"سنجیدہ طبقے کو چھوڑیئے، ہمیں تو عوام سے واسطہ ہے۔"
"عوام بھی اتنے بدظن نہیں"
"اتنے نہیں مگر ہیں ضرور، کیوں یہی ہے نا مطلب"
میں مسکرا رہا تھا اور ڈاکٹر صاحب ہنس رہے تھے۔
"آیئے تا کسی وقت! آپ دیکھ کر بہت خوش ہوں گے۔ اب تو اس کے کئی شعبے ہو چکے ہیں اور آپ اس کو مشرقی دنیا کا ایک مدرسہ پائیں گے"
بات یہاں تک پہنچی تھی کہ ایک لڑکی دوڑتی ہوئی آئی اور کہنے لگی کہ ایک

میم صاحب آپ سے ملنا چاہتی ہیں۔ میں نے وہ اعلان دکھایا مگر اتفا نہیں۔" میں اٹھ کر باہر گیا۔ ایک لمبی ترنگی ادھیڑ عمر کی مغربی نژاد عورت بے چینی کے ساتھ ٹہل رہی تھی۔ مجھے آتا دیکھ کر وہ لپکی اور مسکراہٹ کو ہر لحظہ اضافہ کرتے ہوئے بولی۔

"صبح بخیر! میں مس ــــ ہوں" افسوس کہ مجھے اس کا نام اب یاد نہیں رہا۔ میں نے بھی سلام کا جواب سلام سے اور مسکراہٹ کا جواب مسکراہٹ سے دیا اور اس کو اعلان دکھانے میں جلدی کی۔

"یہ تو میں دیکھ چکی ہوں" اس نے سلسلہ کلام جاری رکھا "آپ نے میرا نام سنا ہوگا؟"

"جی ہاں یاد تو پڑتا ہے لیکن" میں نے اخلاق میں جھوٹ کی آمیزش کی۔

"مجھے یقین ہے کہ ڈاکٹر ٹیگور بھی میرے نام سے ناواقف نہ ہوں گے" اس نے فوراً بات کاٹ کر کہا۔

"ممکن ہے"

"اور یہ بھی آپ کو معلوم ہوگا کہ امریکہ سے ہندوستان تفریحی سفر پر آئی ہوں۔ تصویریں کھینچنا میرا محبوب ترین مشغلہ ہے۔ ابھی تک میں نے ہندوستان کے مختلف مقامات کی سیکڑوں تصویریں کھینچی ہیں۔ ان میں مناظر بھی شامل ہیں اور شخصیتوں کی شبیہیں بھی شامل ہیں"

کہنے کو جھوٹ کہہ چکا تھا کہ میں اس کے نام سے واقف ہوں لیکن اب معلوم کر کے ایک گونہ اطمینان ہوا کہ وہ خیر سے مصورہ ہے۔

"کیا آپ ٹیگور کی تصویر کھینچنا چاہتی ہیں؟"

"جی ہاں بالکل صحیح ہے"

"اس کے لیے آپ کو کچھ دن ٹھہرنا پڑے گا"

"نہیں نہیں میں بہت جلد حیدرآباد سے جانے والی ہوں۔ [illegible] آپ [illegible] کیا ڈاکٹر ٹیگور بستر پر ہیں؟"

[illegible]

"تب تو ٹھیک رہے گا ــــ میں اسی حالت میں تصویر کھینچ لوں گی۔ خاص نشست کی ضرورت نہیں۔"

"پھر بھی"

"کچھ نہیں صرف بیس پچیس منٹ کا معاملہ ہے۔ آپ میری مدد فرمائیں۔ آپ کو رشوت میں ایک دوسری تصویر دوں گی یا آپ کی خود کھینچ دوں گی" وہ مسکرا کر بولی۔

میں نے واپس ہو کر ٹیگور کو حالات سے آگاہ کیا۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ اچھا بلا لو۔ ٹیگور کے سامنے پہنچنے تک اس نے میرا کئی دفعہ شکریہ ادا کیا۔ ٹیگور اس کی تعظیم کے لیے اٹھنا چاہتے تھے مگر وہ مانع ہوئی۔

"کیا میں پوچھ سکتی ہوں کہ میری تصویروں کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے؟" اس نے آس پاس کا ماحول درست کرتے ہوئے ٹیگور سے پوچھا

"معاف کیجیے اس وقت مجھے آپ کی تصویریں یاد نہیں"

مصورہ نے بعض رسائل کے نام لیے جن میں اس کی تصویریں ابھی حال میں شایع ہوئی تھیں اور ٹیگور نے بمشکل یاد کیا کہ ان میں سے بعض ان کی نظر سے گزری ہیں۔

"آپ کی پنسل کاری واقعی خوب ہے" ٹیگور بولے

"شکریہ! میں زیادہ تر پنسل کاری ہی کرتی ہوں خصوصاً آپ کے ملک کی تصویریں تو میں نے پنسل ہی سے کھینچی ہیں ــــ مسٹر حسین! کیا میں یہ تپائی ہٹا کر اس طرف قریب کر سکتی ہوں"

"کیوں نہیں ــــ کیا کسی چیز کی اور ضرورت ہوگی؟"

"نہیں ــــ البتہ دو ایک تکیے مل سکتے تو شاعر کی گردن کے نیچے رکھ دیے جاتے تاکہ چہرہ ابھرے"

"اچھی بات ہے ــــ" بولتے! دیکھو اندر سے دو تین تکیے لا کر [illegible] ٹیگور نے کہا "اگر آپ کو یہ ماحول پسند نہیں تو میں اندر کمرے میں چلا جاؤں"

"جی نہیں [illegible] مناسب ہے"

آپ آرام سے تشریف رکھیں" مصورہ بولی اتنی دیر میں نوکر تکیے لے کر پہنچ گیا۔

"آپ کو تکلیف دے سکتی ہوں" مصورہ بولی اور اس نے تکیے ٹیگور کی گردن کے نیچے رکھ دیے۔

"تصویر پوری کھینچیں گی یا صرف بسٹ؟" ٹیگور نے دریافت کیا۔

"میں سمجھتی ہوں کہ بسٹ تو اس "پوز" میں اچھا نہیں رہے گا، کرسی سمیت تصویر کھینچوں گی ——— ڈاکٹر صاحب آپ نے بھی کبھی اسکیچ کھینچے ہیں؟"

"کھینچے تو ہیں لیکن بہت ہی کم ——— آپ نے میری تصویریں دیکھی ہیں؟"

"ہاں، کئی تصویریں"

"کیا خیال ہے آپ کا ان کے متعلق؟"

"میرا"

"میرا مطلب یہ ہے کہ میں آپ کے ملک والوں کے خیالات معلوم کروں۔" "بیشک ان کے لئے میری تصویریں بالکل ہی غیر متوقع ہیں، میری تصویروں میں مادیت عنصر بالکل نہیں ہوتا"

"جی ہاں ہندو فلسفہ ہوتا ہے۔"

"ہندو فلسفہ کا ذکر نہیں بلکہ میری تصویریں اصل خیال کا سایہ ہوتی ہیں۔ انسان کے تخیل میں وہ تنظیم اور وہ مادیت نہیں ہوتی جو عام طور پر تصویروں میں ظاہر ہوتی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ تخیل کی دھندلی تصویروں کو اصلی خدوخال اور رنگ اور شکل میں ظاہر کروں ———"

"تو گویا آپ کی تصویریں بھی اشعار ہوتی ہیں" میں نے کہا۔

"ہاں، بالکل صحیح ہے" ٹیگور بولے۔

"اسی وجہ سے آپ مصوری کے عام اصولوں کی پیروی نہیں کرتے" مصورہ نے پھر کہا۔

"جی ہاں، عام اصول تو کیا میں خاص اصول کی بھی پیروی نہیں کرتا، مطلب یہ ہے کہ میں اپنے آپ کو مصور ان معنوں میں نہیں کہتا جن معنوں میں دوسرے لوگ مصور ہیں۔"

مصورہ نے اس وقت تک ایک بڑے ڈرائنگ پیپر کو لکڑی کے تختہ پر لگا لیا تھا۔ کئی زاویوں سے شاعر کو دیکھ کر اس نے ایک زاویہ پسند کیا اور ایک کرسی پر بیٹھ کر اس نے خاکہ کشی کی اجازت طلب کی۔

"کیا میں اس اثنا میں کتاب پڑھ سکتا ہوں کیونکہ آپ کی طرف دیکھتے رہنا میرے لئے بہت بار ہوگا،" ٹیگور نے پوچھا "ضرور ضرور کیوں نہیں"

ٹیگور کی نظریں کتاب پر جمی تھیں، مصورہ اپنی قلم کاری میں مصروف تھی اور میں نے اجازت طلب کر کے ایک سگرٹ جلا لیا۔ رہ رہ کر میری آنکھیں کبھی مصورہ کی پنسل کو دیکھتی تھیں اور کبھی شاعر کے چہرہ کو۔ پانچ ——— دس۔ پندرہ ——— بیس ——— پچیس منٹ اسی طرح گزرے۔ اس اثنا میں ٹیگور کے معتمد صاحب بھی تشریف لا چکے تھے۔ محفل کا یہ رنگ دیکھ کر کچھ حیران سے تھے لیکن ان کو علیحدہ لے جا کر میں نے انھیں سمجھایا کہ دو گھنٹے سے میں ان کے فرائض بجا لا رہا ہوں۔ ان کے لئے سوائے اظہار ممنونیت کے اور کوئی چارہ نہ تھا۔ دبی زبان سے انھوں نے یہ پوچھ لیا کہ شاعر ان کی غیر حاضری کو محسوس تو نہیں کر رہے تھے کیونکہ انھوں نے کافی دیر لگا دی تھی۔ میں نے اطمینان دلایا کہ میری موجودگی میں ٹیگور نے ان کی غیر حاضری محسوس نہ کی۔

کوئی آدھ گھنٹہ میں مصورہ نے پنسل اسکیچ مکمل کر لیا۔

"معاف کیجئے، میں نے آپ کو بڑی تکلیف دی" انھوں نے تصویر ٹیگور کو دکھاتے ہوئے کہا "دیکھوں تو آپ اسے کیسے پسند فرماتے ہیں؟"

کچھ دیر تک ٹیگور دیکھتے رہے اور میں بھی قریب ہو کر دیکھتا رہا۔

"بڑی اچھی تصویر بنائی آپ نے، کافی مشق معلوم ہوتی ہے" بالآخر ٹیگور بولے۔

"شکر ہے کہ آپ نے پسند کی، میں سمجھتی ہوں کہ میری محنت ٹھکانے لگی ——— ابھی اس پر ایک آدھ گھنٹہ اور کام کروں گی گھر جا کر۔"

"کیا یہ آپ شاعر کو تحفہ دیں گی؟" میں نے پوچھا

"یہ نہیں، اس کو تو اپنے پاس رکھوں گی، ہاں اس کی ایک نقل بھیج دوں گی۔"

تصویر ابھی تک ٹیگور کے ہاتھ میں تھی۔ معصومہ نے قلم شاعر کے ہاتھ میں دیتے ہوئے خواہش کی کہ وہ اس پر اپنے دستخط فرما دیں جس کو ٹیگور نے خوشی سے منظور کیا۔ تصویر لے کر وہ خوش خوش روانہ ہوئی

"آپ کے پرائیوٹ سکریٹری آچکے ہیں، فرمایئے تو انہیں بلاؤں" میں نے پوچھا۔

"ہاں ضرور بلوایئے"

میں نے نوکر کو آواز دی اور معتمد صاحب کو بلوا بھیجا۔ ڈاک آچکی تھی۔ معتمد صاحب اپنے ساتھ کئی خطوط اور متعدد اخبار ساتھ لے آئے۔ ٹیگور نے بعض خطوط کے جواب لکھوائے اور بعض کے جواب معتمد کو اپنی طرف سے دینے کے لئے کہا۔ ان میں آخری خط کسی پبلشنگ ہاؤس کا تھا، افسانوں کے مجموعہ کی اشاعت کی اجازت طلب کی تھی۔ مجھے فوراً اپنا ایک واقعہ یاد آیا۔

"اگر اجازت ہو تو ایک بات کہوں، اس خط سے یاد آگئی" میں نے پوچھا۔

"ضرور ——" وہ مسکرا کر بولے۔

"پچھلے سال میں نے آپ کے بعض افسانے اردو میں ترجمہ کئے تھے اور ان کو مجموعہ کی شکل میں چھاپنے کی اجازت کے لئے آپ کو لکھا تھا لیکن آپ نے "لانگ مین" سے اجازت حاصل کرنے کی ہدایت کی"

"مجھے آپ کے خط کا خیال نہیں مگر اتنا ضرور یاد ہے کہ میرے بعض افسانوں کا حق اشاعت "لانگ مین" کے پاس محفوظ ہے، اسی لئے میں نے لکھا ہوگا آپ ان ہی سے اجازت لے لیں۔"

"ترجمہ کا حق بھی آپ نے ان ہی کو دے رکھا ہے"

"ہاں ترجمہ بھی حق اشاعت ہی میں شامل ہوتا ہے —— لیکن یہ آپ نے نہیں بتایا کہ کمپنی نے آپ کو اجازت دی یا نہیں؟"

"نہیں —— انھوں نے روپیہ مانگا"

"ہاں مانگا ہوگا"

مگر آپ ... [illegible]

نہیں ہوتا کہ ترجمے حق اور اشاعت کے اخراجات برداشت کرنے کے بعد مترجم کے لئے کچھ بچ رہے بلکہ نقصان ہونے کا اندیشہ رہتا ہے"

ٹیگور ہنسنے لگے اور بولے "اردو زبان ہی پر کیا موقوف ہے میں سمجھتا ہوں کہ ہندوستان کی دوسری زبانوں کو بھی یہی شکایت ہے۔ تو پھر کیا ہوا آپ نے کتاب چھاپی نہیں؟"

"جی نہیں، چھاپنے کی کس طرح جرأت کر سکتا"

"آپ کو میرے افسانے بہت پسند ہیں"

"جی ہاں بہت"

"آپ کچھ طبع زاد بھی لکھتے ہیں"

"جی ہاں لکھتا ہوں"

"افسانوں کے سوا ادب کی کسی اور صنف سے بھی دلچسپی ہے"

"ڈراموں سے خاص دلچسپی ہے، تنقیدی مضامین بھی لکھتا ہوں"

"شاعری کا ذکر نہیں کیا آپ نے؟"

"جی نہیں میں شعر نہیں کہتا"

"عجیب بات ہے، میں نے سنا کہ اردو زبان میں نثر نگاروں کی بہ نسبت شاعر بہت زیادہ ہیں"

"صحیح ہے —— لیکن افسانوں کے ترجموں کی اجازت کا سوال رہ جاتا ہے"

"میرے نوجوان دوست! جن افسانوں کے حقوق میں کمپنیوں کو دے چکا ہوں ان کے بارے میں مجھے مجبور سمجھو البتہ نئے افسانوں کے متعلق میں کوئی انتظام کر سکتا ہوں۔"

"کوئی نیا مجموعہ زیر ترتیب ہے کیا؟"

"میرا مطلب یہ ہے کہ جب کبھی میرا نیا افسانہ چھپے اور تم اس کا ترجمہ کرنا چاہو تو فوراً ہی مجھ سے اجازت حاصل کر لو تاکہ میں کمپنی کو حقوق بیچتے وقت اس کی اطلاع دے سکوں۔"

"بہت بہتر —— ایک خواہش اور ہے اگر آپ ... [illegible]

"وہ کیا"

"یہ میری آٹوگراف بک ہے"

"لائیے میں بڑی خوشی سے دستخط کردوں"

"دستخط نہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ کوئی شعر لکھیں"

"شعر؟"

"جی ہاں اور وہ بھی تازہ ترین شعر۔ بلکہ میری آرزو یہ ہے کہ آپ خاص طور پر میرے لئے ہی ایک شعر کہیں اور اس کے سارے حقوق بھی مجھ ہی کو حاصل ہوں"

"عجیب دل چسپ بات ہے" ٹیگور ہنسنے لگے "میں ضرور کوشش کرتا۔ مگر فرمائش پر شعر نہیں کہا جاتا ـــــ مگر دیکھئے میری بھی ایک بات سنئے"

"فرمائیے"

"ایک شعر کہنا میرے لئے بہت مشکل ہے اور پوری نظم آٹوگراف بک کے ایک صفحہ میں نہیں ـــــ ایسا کیجئے تاکہ میں نے پرسوں ہی ایک تازہ نظم کہی ہے۔ ابھی اس کو اشاعت کے لئے نہیں بھیجا۔ اس میں کا ایک شعر آپ کو دیتا ہوں"

"اور وہ شعر آپ اس نظم میں شامل نہیں فرمائیں گے"

"نہیں ـــــ وہ شعر تو آپ کا ہو جائے گا"

میں نے بیاض دی اور انھوں نے ایک شعر اس پر لکھ دیا۔ اس بیاض کا پورا صفحہ بھر گیا۔ اسی دوران میں باہر موٹر کی آواز سنائی دی اور فوراً ہی معتمد نے اطلاع دی کہ شریمتی سروجنی آئی ہیں۔ ٹیگور مجھے بیاض دے کر اٹھنے لگے۔

"اجازت دیجئے اب" میں نے کہا

"اچھی بات ہے شکریہ"

میں نے واپس ہوتے ہوئے دیکھا کہ شریمتی سروجنی اپنی دونوں لڑکیوں مس پدماجا اور مس لیلامنی اور لڑکے بابا کے ساتھ آ رہی ہیں اور دور سے مجھے سروجنی کے یہ الفاظ سنائی دیے۔

"اوہ! آپ یہاں ورانڈے میں بیٹھے ہیں، موسم کا لطف اٹھا رہے ہوں گے، کوئی نظم تو نہیں ہو رہی تھی"

سید بادشاہ حسین

ٹیگور اور ان کی شاعری

ٹیگور کی شاعرانہ عظمت سے کون واقف نہیں ان کی شاعری نے بین قومی مقبولیت حاصل کرلی ہے۔ یہ شاعرِ مشرق پر سب سے پہلی مستقل کتاب ہے جس میں مولوی مخدوم محی الدین صاحب ایم اے نے ٹیگور کی شخصیت، ان کی ادبی زندگی کے گوناگوں پہلوؤں اور ان کے فلسفۂ زندگی پر روشنی ڈالی ہے ٹیگور کا پیام، گاندھی اور ٹیگور اور شانتی نکیتن پر علحدہ ابواب میں تفصیلی بحث کی ہے اس کتاب کے لئے خود شاعر نے اپنی ایک نفیس تصویر بھیجی تھی جو اس میں شایع کی گئی ہے۔

یہ کتاب شاعر کی زندگی میں لکھی گئی تھی جو بہت مقبول ہوئی۔ اس کے صرف چند نسخے باقی رہ گئے ہیں۔ ممکن ہے کہ چند دن بعد یہ سب ختم ہو جائیں۔

تعداد صفحات (۱۲۰) مع تصویر شاعر قیمت ؎ہ

حیات بعد الممات

لوگوں میں ایک غلط خیال پیدا ہوگیا ہے کہ " بھوت " اور " روح " دو جدا جدا چیزیں ہیں. عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ جن چیزوں سے انسان کو خوف محسوس ہو یا ان سے نقصان پہنچنے کا احتمال ہو ہم انھیں بھوت کے کارنامے تصور کرتے ہیں. اس طرح سب سود مند کام " روح " سے منسوب کئے جاتے ہیں. حالانکہ حکماء یورپ جنھوں نے سائنٹیفک طور پر اس موضوع کی داغ بیل ڈالی ہے دونوں چیزوں میں مطلقاً کوئی فرق نہیں مانتے.

لیکن اگر کچھ امتیاز پیدا کرنے کی ضرورت محسوس ہو تو پھر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ " روح " وہ چیز ہے جو ہم دیکھ نہیں سکتے. لیکن جب ارواح وجود اثیری میں نمودار ہو کر سامنے آئیں تو ہم انہیں بھوت کہہ سکتے ہیں.

حیات بعد الممات پر جن لوگوں نے دماغ ریزی کی وہ ایک مدت کی تحقیق اور جستجو کے بعد آج اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ اس آسمان کے ورے ایک دنیا اور بھی ہے. اور اب کچھ عرصہ سے یہ خیال یا یقین بھی تقویت پکڑتا جاتا ہے کہ ارواح ہم سے میل جول کرنے کے کسی قدر آرزو مند بھی رہتے ہیں. رہی یہ بات کہ یہ غیر فانی موجودات کس طرح یا کس طریق سے ہم سے میل جول کرتی ہے. صرف مثالوں سے ثابت کی جا سکتی ہے.

یہ بات انسان کی فطرت ہے کہ جو بات سمجھ میں نہ آئے اسے تسلیم کرنے میں پس و پیش کرتا ہے. یا بعض اوقات اس کے وجود یا صحت سے انکار کر دیتا ہے. اور بیان کرنے والے کو " دروغ گو کہا خلاب لقا ہے. لیکن دل میں ہم اسی بات کو " بعید از فہم " یا " پراسرار " ضرور باور کرتے ہیں.

لارڈ کیلیون کا قول ہے:-

" جس بات کو ہم بعید الفہم کہتے ہیں دراصل ہم اس کا مفہوم یا مطلب سمجھنے سے قاصر ہوتے ہیں."

لارڈ موصوف کا یہ قول ایک ایسی حقیقت ہے کہ اس سے انکار ہو ہی نہیں سکتا. اگر ہم غور و فکر کرنے کے خوگر ہوں تو ہر عقدہ کی کسی نہ کسی روز گرہ کشائی کر سکیں گے.

لیکن یہ بھی تو نہ ہو کہ جتنا سوچو گے اتنا ہی ڈوبو گے.

پروفیسر آسف حال فرماتے ہیں:-

" کیا ضرورت ہے کہ ہم اپنے عقائد کی اصلاح کے لئے پادریوں سے مشورہ کرتے پھریں. اس کائنات میں ہر صاحب ذوق کے لئے تحقیق اور جستجو کا میدان کھلا ہوا ہے."

ارواح کا وجود اثیری میں نظر آنا یعنی مادی حالت میں دکھائی دینا کوئی عجیب بات نہیں. لیکن اس کے ساتھ یہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ ارواح ہمیشہ نظر نہیں آیا کرتے اور یہ بھی مشکل ہے کہ ہمارے وہ عزیز جنھیں دیکھنے کو آنکھیں ترس رہی ہوں. حسب خواہش ہمیں نظر آجایا کریں. ان کا نظر آنا محض محبت کے معیار پر منحصر ہے. اس جگہ یہ واضح کر دینا بھی ضروری ہے کہ ارواح کے کارناموں کو " بھوت یا جن " کی کارستانیاں نہیں سمجھ لینا چاہیئے.

مذہب " جن " کے وجود کے متعلق کہہ چکا ہے. لیکن سائنس نے ابھی تک جنات کے وجود کو تسلیم نہیں کیا. بات صرف یہ ہے کہ ارواح ہم سے جدا ہو کر جب چاہیں ہم پر اپنے قرب کا احساس " پیدا کر سکتے ہیں. یا مادی حالت اختیار کر کے (وجود اثیری) ہم کو اصلی روپ میں نظر آ سکتے ہیں. اعدا [illegible]

سمجھیں تو ہم سے ہم کلام بھی ہو سکتے ہیں یا اپنا پیغام اشاروں سے سمجھا سکتے ہیں۔

افسوس تو یہ ہے کہ ہم لوگ جب کسی روح کو دیکھ پاتے ہیں تو ہمارا خیال یا ذہن فوراً بھوت کی طرف منتقل ہو جاتا ہے اور ہم اس سے گریز کرنے لگتے ہیں۔ حالانکہ جیسے پہلے بیان کیا جا چکا ہے۔ بھوت اور روح دو مختلف چیزیں ہرگز نہیں۔ ہاں اس میں کچھ کلام نہیں کہ ارواح بعض اوقات ہماری دستگیری کے لئے اس عالم رنگ و بو میں نمودار ہوتے ہیں اور کبھی انتقام لینے کے لئے بھی۔

ممکن ہے کہ اس خشک مضمون کا مطالعہ اکثر حضرات کو بار معلوم ہو۔ اس لئے میں چند واقعات پیش کرکے بھوت کے وجود پر روشنی ڈالنے کی کوشش کروں گا۔ اور واقعات بھی ایسے مستند جن کی سچائی کی شہادت اکثر حکمائے مغرب دے چکے ہیں۔

ٹیلیفون کا پیغام

مسٹر ایلیٹ او ڈانل جن کا بیان بھوت کے وجود کے متعلق حکمائے مغرب کے یہاں بہت مستند سمجھا جاتا ہے ایک واقعہ اس طرح بیان کرتے ہیں۔

میرا ایک دوست ڈاکٹر تھا۔ ایک روز وہ رات کے گیارہ بجے کے قریب ایک مریض جس کا نام رچرڈ تھا کو دیکھ کر گھر آ رہا ہی تھا کہ ٹیلیفون کی گھنٹی بجنے لگی۔ ڈاکٹر نے رسیور اٹھا کر پوچھا کہ کون ہے آواز آئی۔

"مسٹر رچرڈ کی حالت بہت خراب ہے۔ جلد تشریف لائیے۔"

ڈاکٹر نے کہا کہ میں تو ابھی ابھی ان کے پاس سے آ رہا ہوں۔ وہ تو بہت اچھے تھے۔

آواز آئی۔

"آپ جلد تشریف لائیں ان کی حالت مخدوش ہو رہی ہے"

ڈاکٹر پھر اپنا بیگ اٹھا کر رچرڈ کے مکان پر پہنچا نوکر دروازہ کھولا۔ اور ڈاکٹر کو دیکھ کر کہنے لگا۔

"شکر ہے! آپ ابھی واپس نہیں گئے۔ مسٹر رچرڈ کی حالت بہت خراب ہے۔"

ڈاکٹر نے کہا کہ میں تو گھر سے آ رہا ہوں۔ مکان پر سے کس نے ٹیلیفون جو کیا تھا؟"

"نہیں جناب!" نوکر نے حیران ہو کر "کسی نے ٹیلیفون نہیں کیا۔"

ڈاکٹر نے اندر جا کر مریض کو دیکھا۔ مریض پلنگ پر لیٹا ہوا تھا۔ اور دل کی حرکت بہت بے قاعدہ سی ہو رہی تھی۔ ڈاکٹر نے جلدی سے ایک انجکشن دیا۔ کچھ دیر بعد مسٹر رچرڈ کی طبیعت سنبھل گئی۔

ڈاکٹر نے کہا۔ "یہ تو بہت اچھا ہوا کہ میں گھر پر موجود تھا۔ ورنہ آپ کو پریشان ہونا پڑتا۔ میں ٹیلیفون سنتے ہی چلا آیا۔"

مسٹر رچرڈ نے حیران ہو کر کہا کہ ٹیلیفون کرنے کی ضرورت ہی کیا تھی میں تو بھلا چنگا تھا۔ اچانک دل پر کچھ بوجھ سا محسوس ہونے لگا۔ ساتھ ہی آپ تشریف لے آئے۔ پھر اس نے اپنے نوکروں سے پوچھا کہ کس نے ٹیلیفون کیا تھا لیکن سب نے لاعلمی ظاہر کی۔ جب دوسرے لوگوں میں اس بات کا چرچا ہوا تو بہت سوچ بچار کے بعد یہ رائے قایم کی گئی کہ کسی غیر مادی روح کی طرف سے ڈاکٹر کو پیغام دیا گیا تھا۔ بہرکیف یہ ایک مشہور واقعہ ہے اور اسے غلط کہہ دینا محض کور باطنی ہو تو ہو۔

امتا

ایک اور حیرت انگیز واقعہ سنئے۔

[illegible] میں یورپ میں ایک کتاب "گھوسٹلی وزیٹرز" کے نام سے شایع ہوئی تھی۔ یہ واقعہ اسی کتاب میں سے لیا گیا ہے راوی بیان کرتا ہے۔

مسٹر بی میرا بہت عزیز دوست تھا۔ اس کے چار بچے تھے۔ لیکن چوتھے بچے کی پیدائش ماں کے لئے پیغام موت لائی۔ بیوی کے مرنے کا میرے دوست کو اتنا صدمہ ہوا کہ وہ آبائی گھر چھوڑ کر کسی اور جگہ جا رہا۔ اور بچوں کی پرورش کے لئے انا رکھ لیں۔ ماں کے مرنے کے باعث بچے کسی قدر بے قابو سے ہو گئے۔ نوکر چاکر تو کام کاج میں لگے رہتے۔ انا چھوٹے بچے کو کھلاتی۔ باقی تینوں دن بھر مکان میں کھیلتے۔ کبھی اوپر کبھی نیچے۔ ایک روز تینوں بچے کھیلتے کھیلتے تہ خانے میں چلے گئے۔

تہ خانے کا کمرہ بہت بڑا تھا۔ روشنی صرف ایک دو سوراخوں سے آتی تھی۔ وہ بھی دھندلی دھندلی سی۔ اس کمرے کی دیواروں پر کچھ مناظر کشی کی گئی تھی۔ یہ تصویریں دیکھتے ہوئے اچانک بچوں کے دل میں خوف محسوس ہوا اور وہ وہاں سے بھاگ کر ایک دوسرے کمرے کی طرف گئے۔ لڑکی جو سب سے بڑی تھی اور آگے تھی دروازہ پر پہنچ کر اچانک رک گئی اور چلا کر بولی۔ امی! امی جان!" بچے اور بھی دہشت زدہ ہو کر وہاں سے بھاگے اور باپ کے پاس آ کر دم لیا۔ لڑکی نے سارا ماجرا باپ سے کہا کہ وہ اس کمرے میں گھسنے ہی کو تھی کہ اس نے اپنی ماں کو دروازے میں کھڑے ہوئے پایا۔ وہ دونوں ہاتھ اٹھا کر انہیں اندر آنے سے روک رہی تھی۔

مسٹر بی یہ سن کر ایک خادم کو ساتھ لے کر تہ خانے میں گیا۔ اور شمع روشن کر کے ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ اس کمرے میں جس کے دروازے میں بچوں نے اپنی ماں کو کھڑے دیکھا تھا ایک کنواں سا تھا۔ یہ کنواں آج تک کسی نے نہیں دیکھا تھا۔ اس واقعہ کو اکثر لوگوں نے مستند خیال کیا ہے۔ اور ارواح کی بحث میں مثال کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ ہم واقعات کی نوعیت پر غور کرتے ہوئے یہ ماننے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ بچوں کی ماں کی روح یا "بھوت" اپنے بچوں کو خطرے سے بچانے کے لئے اس دروازے میں آ کر کھڑا ہو گیا ہوگا۔ بچی جس نے ماں کو دیکھا تھا مشکل سے نو یا دس سال کی تھی انصاف تو فرمایئے کہ معصوم بچی کو جھوٹ کہنے سے کیا حاصل ہو سکتا تھا۔

ایم اسلم

وطن کی امانت

یہ آنکھوں میں پھیلے ہوئے سرخ ڈورے یہ لبریز ساغر یہ رنگیں کٹورے
یہ مہکے ہوئے نرم ہونٹوں کی باتیں شرابوں میں کھوئی ہوئی مست راتیں

مجھے ان سے کوئی لگاؤ نہیں ہے
وطن کی امانت ہے میری جوانی

یہ ٹھنڈی ہوائیں یہ بہتے سفینے یہ پینے کے دن یہ بہکتے مہینے
یہ ساقی یہ مطرب یہ میٹھے ترانے نگاہوں میں کروٹ بدلتے فسانے

مجھے ان سے کوئی لگاؤ نہیں ہے
وطن کی امانت ہے میری جوانی

یہ لچکیلی انگڑائیاں یہ جوانی یہ بوتل یہ بوتل میں پھولوں کا پانی
یہ مواج سینے سرکتے دُپٹے سنبھلتے، مچلتے، تھرکتے دُپٹے

مجھے ان سے کوئی لگاؤ نہیں ہے
وطن کی امانت ہے میری جوانی

یہ باہیں یہ باہوں میں گاتے سے جوڑے مدھر راگنی گنگناتے سے جوڑے
یہ شانے یہ شانوں پہ لہراتے گیسو یہ ناگوں کی مانند بل کھاتے گیسو

مجھے ان سے کوئی لگاؤ نہیں ہے
وطن کی امانت ہے میری جوانی

یہ پلکیں یہ پلکوں کی اوٹوں میں اک شے یہ ہنسی یہ ہنسی کے ہونٹوں پہ اک لے
یہ بربط یہ نغموں کی آباد بستی تبسّم کا جادو، ترنم کی مستی

مجھے ان سے کوئی لگاؤ نہیں ہے
وطن کی امانت ہے میری جوانی

یہ ساون کی رُت یہ نشیلی فضائیں یہ میخانہ بر دوش کالی گھٹائیں
یہ ریشم میں لپٹے ہوئے نرم بازو یہ پھولوں سے ملتے ہوئے گرم بازو

مجھے ان سے کوئی لگاؤ نہیں ہے
وطن کی امانت ہے میری جوانی

یہ مسکاتا جوبن یہ شرماتی آنکھیں یہ نیچی یہ ترچھی یہ گھبراتی آنکھیں
یہ پازیب کے ساز کا گنگنانا حسینوں کا چلتے میں محشر اٹھانا

مجھے ان سے کوئی لگاؤ نہیں ہے
وطن کی امانت ہے میری جوانی

یہ نیندوں کا عالم یہ خوابوں کی دنیا ہرے، سرخ، نیلے نقابوں کی دنیا
یہ پردوں کے پردے میں اک بیحیائی یہ ساغر بکف جھومتی پارسائی

مجھے ان سے کوئی لگاؤ نہیں ہے
وطن کی امانت ہے میری جوانی

یہ معبد یہ ملّت فروشی کے اڈّے خصومت، کدورت فروشی کے اڈّے
یہ لیڈر ہمارا دیا کھانے والے یہ قومیں کی قومیں نگل جانے والے

مجھے ان سے کوئی لگاؤ نہیں ہے
وطن کی امانت ہے میری جوانی

یہ ملّا گدائی سکھانے کے ماہر یتیموں کو رہزن بنانے کے ماہر
یہ بیواؤں کی عصمتوں کے محافظ یہ سوئی ہوئی قسمتوں کے محافظ

مجھے ان سے کوئی لگاؤ نہیں ہے
وطن کی امانت ہے میری جوانی

یہ پنڈت ہوئی قوم بیمار جن سے لگا ہم کو غربت کا آزار جن سے
یہ چاندی کے ٹکڑوں پہ جاں دینے والے غریبوں کا خوں چوسنے والے لالے

مجھے ان سے کوئی لگاؤ نہیں ہے
وطن کی امانت ہے میری جوانی

وطن کیلئے مجھ کو پالا ہے ماں نے (۲) جوانی کے سانچے میں ڈھالا ہے ماں نے
جوانی مری زلزلوں کی جوانی حوادث کے ہونٹوں پہ میری کہانی
میں مردوں کو جینا سکھا کر رہوں گا
وطن کی امانت ہے میری جوانی

امیری کو نیچا دکھا کر رہوں گا جھکا کر رہوں گا مٹا کر رہوں گا
یہ ذلت کی گودی میں سو کر رہے گی یہ ٹکڑوں میں تبدیل ہو کر رہے گی
میں مُردوں کو جینا سکھا کر رہوں گا
وطن کی امانت ہے میری جوانی

قضا سے لگا ہیں ملاتا رہوں گا مصائب کو آنکھیں دکھاتا رہوں گا
تبسم کے موتی لٹاتا رہوں گا مسرّت کی شمعیں جلاتا رہوں گا
میں مردوں کو جینا سکھا کر رہوں گا
وطن کی امانت ہے میری جوانی

جوانی مری بیکسوں کا سہارا وطن کے غریبوں کی آنکھوں کا تارا
یہ شعلوں پہ لہرا کے باقی رہے گی یہ توپوں سے ٹکرا کے باقی رہے گی
میں مردوں کو جینا سکھا کر رہوں گا
وطن کی امانت ہے میری جوانی

یہ مردوں کو جینا سکھا کر رہے گی یہ مرقد کو ایوان بنا کر رہے گی
وطن اس کے ہاتھوں سے دلشاد ہو گا وطن اس کے کرنے سے آزاد ہو گا
میں مردوں کو جینا سکھا کر رہونگا
وطن کی امانت ہے میری جوانی

الطاف مشہدی

مجبوریاں

دنیا میں سب ہی خوش رہنا چاہتے ہیں۔ کون ہے جو مسرتوں میں زندگی گزارنا نہیں چاہتا۔ کیا کسی نے کسی کو رنج و مصیبت حاصل کرنے کی جد و جہد کرتے دیکھا ہے۔ انسان زندگی کی ہر ہر گھڑی کو خوشی میں بسر کرنا چاہتا ہے۔ اس کی کوشش مسرت و سکون کے لئے ہوتی ہے۔ اس کو رنج و غم سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ وہ مصیبت سے کوسوں دور بھاگتا ہے اس کو رنجوں سے سابقہ ہوتا ہے۔ یہ کیوں؟ اگر رنج و راحت صرف انسانی کوششوں کا نتیجہ ہوتے تو آج دنیا میں ہم کسی کو مبتلائے الم نہ دیکھتے۔ کوئی جان

بوجھ کر مصیبت میں نہیں پڑتا لیکن
اتفاقات ہیں زمانے کے

مجبوری اسی کا تو نام ہے کہ ہم اپنی طبیعت کے بالکل برخلاف حرکت کرنے پر تیار ہو جائیں۔ مجبوریاں انسان سے کیا نہیں کرواتیں۔

دنیا کے واقعات اور اس کی رفتار یکساں نہیں۔ زندگیوں میں انقلاب آجاتے ہیں۔ زندگی سے آزادی چھین لی جاتی ہے لیکن پھر بھی زبان نہیں ہلا سکتے اس لئے کہ خود زندگی مجبوری کا دوسرا نام ہے۔ کوئی اپنی عزیز ترین چیزوں کو خود اپنے ہاتھوں برباد کر دیتا ہے۔ کوئی اپنے مطمح نظر کو خود نظروں سے دور کر دیتا ہے۔ اس لئے کہ وہ مجبور ہے۔ کسی کا سرمایہ لوٹ لیا جاتا ہے عمر بھر کی پونجی تباہ ہو جاتی ہے۔ لیکن اس کو خاموش رہنا پڑتا ہے۔ اس لئے کہ وہ مجبور ہے۔ کوئی دنیا کے خلاف کام کرتا ہے۔ دنیا والے اس کو برا سمجھتے ہیں۔ نکتہ چینیاں کرتے ہیں مگر کوئی کیا جانے کہ وہ اپنے کردار میں کس قدر مجبور ہے۔

واقعات کسی کو چوری کرنے پر مجبور کرتے ہیں۔ لوگ اس کو چور کہتے ہیں لیکن وہ کیا جانیں کہ وہ مجبور ہے۔

ایک بُری حرکت کو دیکھنے والے برا اس لئے کہتے ہیں کہ وہ دنیا کی نظروں میں برا ہے مگر انھیں کیا معلوم کہ کرنے والا مجبور ہے۔ قدرت جب خود فطرت کی مخالف ہے تو یہ مجبوریاں کیوں ختم ہوں۔

فطرت انسانی اور قضا و قدر کا بیر تو ازل سے ہے۔ تم چاہتے کچھ ہو، ہوتا کچھ ہے تم اپنی سہولت کے مطابق لائحہ زندگی بناتے ہو۔ لطیف تصورات میں وقت بسر ہوتا ہے۔ شیریں خواب مست بنا دیتے ہیں۔ آنے والی خوشی کے صرف خیال سے تم اپنے آپ کو دنیا کی سب سے خوش نصیب ہستی سمجھنے لگتے ہو لیکن زمانہ اپنا کام کرتا ہے۔ وہ وقت آتا ہے جب یہ خیالی طلسم ٹوٹ جاتا ہے۔ تصورات کی لطافت گم ہو جاتی ہے۔ شیریں خواب بھیانک تعبیر پیش کرتے تمھارے دل کو ٹیس لگتی ہے۔ زندگی کا خاکہ الٹ جاتا ہے۔ تم مجبور کرائے جاتے ہو کہ ان آلام کا مقابلہ کرو۔ کیونکہ تمھاری زندگی مجبور کرتی ہے کہ تم کسی طرح اپنی زندگی کی کشتی کو چلاتے رہو گو اس کی رفتار تمھاری فطرت کے کتنی ہی مخالف کیوں نہ ہو۔

تم گرمی میں سرد پانی کی ضرورت محسوس کرتے ہو لیکن قدرتی طور پر تمھیں گرم پانی ملتا ہے۔ سردیوں میں جب کہ تم فطری طور پر گرمی ڈھونڈتے ہو سرد ہوائیں قدرت کی ستم ظریفی کا ثبوت دیتی ہیں۔

زندگی مجبوریوں میں بسر ہوتی ہے اور مجبوریوں میں ختم بھی ہو جاتی ہے۔ سولی کے تختہ پر کھڑا ہوا شخص اپنی جان کا بیر

دے رہا ہے لیکن کچھ نہیں کہہ سکتا۔ اس لئے کہ مجبور ہے۔

بستر مرگ پر پڑا ہوا انسان جانتا ہے کہ اب ہر چیز کو چھوڑنا پڑے گا لیکن کیا کرسکتا ہے۔ انسان دنیا سے جاتا بھی ہے تو مجبور ہوکر۔

موت بھی تو مجبوری کا دوسرا نام ہے خواہ وہ فطرت کی موت ہو یا خواہشات کی یا تصورات کی ہو یا زندگی کی۔ مرجانا مجبور ہوجانا ایک ہی تو ہے قدرت اور فطرت میں خود جب تضاد موجود ہے تو پھر زمانے کی چال سے سرتابی کیوں اس کی سرد مہریوں کا شکوہ کس لئے؟

رنج و غم سے بھاگنے کی کوشش کس بھروسہ پر؟ زمانے کے خلاف مقابلہ کرنے کی آرزو کس برتے پر؟ اس کی چال بجا اس کا ستم روا۔ اس کی ستم ظریفی جائز اس کا طریقہ قابل آفریں۔

زمانہ با تو نہ سازد تو با زمانہ بہ ساز

سعید النساء بیگم

پھول سا ہاتھ

نہ شرما دیکھ ادھر اپنا بڑھا ہاتھ
مرے ہاتھوں میں دے یہ پھول سا ہاتھ
نگہ کو پیار اس پر آ رہا ہے
شکیب و صبر دل سے جا رہا ہے
حیا سے خوبصورت سر جھکا دے
بڑھا دے ہاتھ ادھر ظالم بڑھا دے
کہ مجھ کو اس سے الفت ہو گئی ہے
مری روح آہ اس میں کھو گئی ہے
اجازت ہو تو ہونٹوں سے لگا لوں
نہیں بجھتی لگی دل کی بجھا لوں
کلی سے بھی ہے نازک یہ حسیں ہاتھ
یہ نازک پیارا پیارا مخملیں ہاتھ

دُھلا ہے یہ ستاروں کی چمک سے
معطر ہے ہوا اس کی مہک سے
نزاکت کی حسیں تصویر ہے یہ
مرے ہر شعر کی تفسیر ہے یہ
مرے باغ محبت کا ہے یہ پھول
کہ ہے یہ باغ جنت کا حسیں پھول
مری فردوس! میری مہ لقا سُن
مری پیاری مری شیریں ادا سُن
مرے ہاتھوں میں دیگی تو اگر ہاتھ
نہ چھوڑوں گا ترا میں عمر بھر ہاتھ
نہ شرما دیکھ ادھر اپنا بڑھا ہاتھ
مرے ہاتھوں میں دے یہ پھول سا ہاتھ

راجہ مہدی علی

مقدس شہر!

میں اپنے عنفوان شباب میں سنتا تھا کہ ایک ایسا شہر ہے جس کے بسنے والے آسمانی صحیفوں کے مطابق بالکل مذہبی زندگی بسر کرتے ہیں۔ میں نے دل ہی دل میں کہا ـــــ میں اس شہر کو ڈھونڈ نکالوں گا اور اس سے برکت حاصل کروں گا۔

یہ شہر بہت دور و دراز فاصلہ پر تھا۔ اس تک پہنچنے کے لئے مدت درکار تھی۔ میں نے سفر کا پورا سامان تیار کر لیا۔ اور فلک نیلگوں پر صبح کے ستارے کے نمودار ہوتے ہوتے چل پڑا ـــــ چالیس دن کے بعد میری متجسس نگاہوں نے شہر کو دیکھ لیا۔ اکتالیسویں دن سورج کے ساتھ ساتھ میں بھی شہر میں داخل ہو گیا۔ میری حیرت کا کوئی ٹھکانا نہ رہا جب میں نے یہاں کے باشندوں کے صرف ایک آنکھ اور ایک ہی ہاتھ دیکھا۔ میں نے حیرت زدہ ہو کر اپنے آپ سے کہا ـــــ " اتنے مقدس شہر کے باشندوں کا صرف ایک ہاتھ اور ایک آنکھ!"

میں نے دیکھا کہ وہ خود حیرت و استعجاب کے بحر بے پایاں میں غوطہ زن ہیں۔ میرے دو ہاتھوں اور میری دو آنکھوں نے انھیں بھونچکا سا کر دیا تھا۔ وہ میرے متعلق چہ میگوئیاں کر رہے تھے تو میں نے پوچھا ـــــ " تمھارا یہ حال کیونکر ہوا؟ تمھاری داہنی آنکھ اور داہنا ہاتھ کیا ہوا؟ ـــــ "

وہ میرے سوال پر اور بھی متعجب ہوئے اور کہنے لگے۔ "چلو ہمارے ساتھ اور دیکھو اس کی کیا وجہ ہے؟" میں ان کے ساتھ ہو گیا۔ وہ مجھے ایک عبادت گاہ میں لے گئے۔ یہ عبادت گاہ شہر کے بالکل وسط میں تھی۔ میں نے اس عبادت گاہ کے عین بیچ میں آنکھوں اور ہاتھوں کا ایک بہت بڑا ڈھیر دیکھا۔ ان میں کچھ سڑ اور گل گئے تھے تو جن سے پیپ اور پانی رس رہا تھا! میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ میں نے غمگین لہجے میں کہا ـــــ " افسوس تمھارے ساتھ ناانصافی کی گئی"۔

لیکن ان لوگوں نے ذرا بھی افسردگی کا اظہار نہ کیا۔ ایک بڈھے نے آگے بڑھ کر کہا ـــــ " یہ ہمارا اپنا کام ہے۔ کسی برتر و اعلیٰ قوت کا نہیں! خدائے تعالیٰ نے ہمیں اس حالت میں گناہوں اور برائیوں پر فتح بخشی ہے۔" یہ کہہ کر وہ مجھے ایک بلند مقام پر لے گیا باقی سارے لوگ ہمارے پیچھے تھے۔ اوپر لیجا کر مجھے ایک کتبہ دکھایا ـــــ " اگر تمھاری داہنی آنکھ تمھیں ٹھوکر کھلائے تو اسے نکال باہر پھینکو۔ کیونکہ سارے جسم کے مسموم ہونے کے بجائے ایک عضو کا نقصان اچھا ہے۔ اور اگر تمھارا داہنا ہاتھ تمھیں جرم اور گناہ پر مجبور کرے تو اسے کاٹ ڈالو۔ کیونکہ زہر اور پاپ کی پوٹ ـــــ ایک عضو ہی الگ ہو جائے اور سارا جسم متاثر ہونے نہ پائے تو بہتر ہے۔"

اس عبارت کو پڑھ کر میں سب کچھ بھانپ گیا۔ میں نے منہ پھیر کر سارے لوگوں کو مخاطب کیا۔ تم میں کوئی عورت یا مرد ایسا نہیں جس کے دونوں ہاتھ اور دونوں آنکھیں ہوں۔ لوگوں نے جواب دیا ـــــ " نہیں۔ ہم میں کوئی ایسا نہیں! یہاں ان بچوں کے سوا جو کم عمر ہونے کی وجہ اس کتبے کو پڑھنے اور اس پر عمل کرنے کے قابل نہیں کوئی شخص صحیح سلامت نہیں ہے۔"

جب ہم عبادت گاہ سے باہر آئے۔ تو میں فوراً ہی اس "مقدس شہر" سے بھاگ آیا۔ کیونکہ میں بچہ نہ تھا۔ اس کتبہ کو اچھی طرح پڑھ سکتا تھا ـــــ !

(ترجمہ) خلیل جبران ـــــ محمد عبدالقادر فاروقی

سوز و ساز

رضیہ نے آنسو بہاتے ہوئے کہا "ڈاکٹر صاحب میرا وقت قریب آچکا ہے اس لئے میں چاہتی ہوں کہ اپنی داستان زندگی آپ سے بیان کردوں وہ کہانی جس میں میری زندگی کا راز پنہاں ہے۔ ممکن ہے اس کے کہہ دینے سے میرے دل میں لگی ہوئی آگ کچھ سرد پڑجائے۔ غور سے سنئے میری کہانی دلچسپی اور عبرت سے معمور ہے:"

میں ایک متوسط گھرانے سے تعلق رکھتی ہوں آج سات سال کا عرصہ ہوتا ہے کہ میں اپنے گھر دار کو چھوڑنے پر مجبور ہوئی اور پھر قسمت کی گردش نے مجھے نئے نئے روپ دکھائے۔ میرے والدین مجھے بہت عزیز رکھتے تھے۔ جب میں انٹرنس کا امتحان کامیاب ہوئی تو میرے والدین کو میری شادی کی فکر دامنگیر ہوئی۔ آہ کسے معلوم تھا کہ یہی کامیابی اور اس کی مسرت میری تباہی اور بربادی کا پیش خیمہ بنے گی: بچپن ہی سے مجھے اپنے چچازاد بھائی ممتاز سے محبت تھی اور جب ہم بڑے ہوئے تو ہماری یہ محبت عشق کی نوبت تک پہونچ گئی۔ ممتاز کے ساتھ گزری ہوئی ایک ایک ساعت اب تک میرے سینے پر نقش ہے اس کے الفاظ محبت "ابھی تک برابر میرے کانوں میں گونج رہے ہیں۔ میری دلی آرزو تھی کہ اپنے جسم و جان کو ممتاز کے قدموں پر نچھاور کردوں۔ مگر میرے والدین اس چیز کے لئے تیار نہ تھے کہ میری شادی ممتاز کے ساتھ ہو۔ کیونکہ ممتاز کی مالی حالت زیادہ اچھی نہ تھی۔ــــ قصہ مختصر میرے ہزار انکار اور نارضامندی کے باوجود مجھے ایک ایسے شخص کے حوالے کردیا گیا جو مجھے کسی طرح پسند نہ تھا۔ــــ آپ اسے جو چاہے کہیں مگر یہ انسانی فطرت ہے کہ انسان ہمیشہ اچھی چیز کو پسند کرتا ہے میرے شوہر اور مجھ میں کچھ مناسبت ہی نہ تھی۔ میں نوجوان، تھوڑی بہت حسین اور تعلیم یافتہ تھی اور وہ نہ صرف انپڑھ اور جاہل تھے بلکہ سیاہ فام عمر رسیدہ اور کج فہم البتہ وہ مالدار ضرور تھے۔ اور ان کی یہی دولت نے میری روح کو نہیں میرے جسم کو ــــ ایک بے حس جسم کو خرید لیا تھا ــــ امیروں کی دولت غریبوں کی آزادی اور زندگی خریدنے کے لئے ہی تو ہوتی ہے۔ اپنی دولت ہی سے تو وہ غریبوں کی عصمت اور عزت سے کھیلا کرتے ہیں ــــ بہرحال میرا ان کا نباہ ناممکن تھا۔ میں دولت کی بھوکی نہ تھی بلکہ محبت کی ــــ میرا دل تو ممتاز کی نذر ہوچکا تھا ــــ نتیجہ یہ ہوا کہ ایک سال کے اندر ہی مجھے طلاق دے دیا گیا ــــ والدین کے دروازے میرے لئے بند تھے ــــ اپنی عزت اور دوشیزگی کو چور چور کرنے کے بعد میری صورت ممتاز کو دکھانے کے قابل نہ تھی۔ کسی شخص سے نکاح یا شادی کا خیال کرنا سماج اور دنیا والوں اور "نیک بندوں" کی لعنتوں اور ملامتوں کا مرکز بننا تھا۔ــــ

رضیہ کے گال پر آنسو ڈھلک رہے تھے: "ڈاکٹر صاحب" اس نے کہا ــــ "یقیناً میری کہانی آپ کے لئے تعجب خیز ہوگی خیر اور آگے سنئے ــــ اب میرے لئے فلم کمپنیوں کا دروازہ کھلا ہوا تھا ــــ میں نے اسی کو غنیمت جانا کیا کرتی پیٹ بھرنا تھا۔ــــ فلم کمپنی میں پہونچ کر مجھ جیسی تعلیم یافتہ اور حسین عورت کا مشہور ہونا کوئی تعجب کی بات نہ تھی لیکن ساتھ ہی ساتھ مجھے اپنی عزت اور عصمت کی قربانی کرنی پڑی شہرت اور دولت کی ترقی کے لئے یہ چیز ضروری تھی ــــ کیا کرتی مجبور تھی ــــ غرض کامل تین سال تک میں فلم کمپنی میں نوکر رہی اور کئی ایک فلموں میں کام کیا ــــ مگر اس سے بھی میری طبیعت اکتا گئی۔ــ میں نے

نوکری چھوڑ دی ـــــ تھوڑی بہت دولت جو جمع ہوئی تھی اس میں زندگی گزارنے لگی ـــــ فلم کمپنی کی ملازمت نے میرے شوق آرائش میں اور اضافہ کر دیا تھا چنانچہ میں روزانہ بناؤ سنگھار کر کے آئینے کے سامنے کھڑے ہوتی اپنے لوچدار جسم اپنے قدرتی حسن، آرائش و زیبائش کو دیکھتی تو جذبات سے مغلوب ہو جاتی عین اس وقت مجھے میرا ممتاز یاد آتا ـــــ کاش اس وقت وہ میرے پاس موجود ہوتا ـــــ مگر وہ کہاں اور میں کہاں ـــــ

میرے لئے حسن پرستوں کی کمی نہ تھی صبح سے شام تک میرے چوکھٹ پر مجمع لگا رہتا ـــــ مگر اب میری حیثیت ایک بازاری حسن فروش سے زیادہ نہ تھی۔ شرافت اور عزت کے آئینے چکنا چور ہو چکے تھے ـــــ صبح سے شام تک اہل غرض میری زنجیر در کھٹکھٹاتے اور چند چاندی کے ٹکڑوں کے لئے مجھے وہ سب کچھ کرنا پڑتا جو کسی شریف کو نہ کرنا چاہئے ـــــ میں ان کی خاطر کرتی ان کو خوش کرنے کے لئے ہنستی اور ہر طرح کی خوشامد کرتی مگر میرا دل روتا تھا ـــــ میرے تبسم میں میرے دل کی آہیں پنہاں ہوتیں اور میری باتوں میں میرے دل کے درد بھرے ہوئے ہوتے ـــــ ذرا غور تو کیجئے کہ کیسے کیسے لوگ میرے در پر جبیں سائی کرتے تھے۔ وہی لوگ جن کو اپنی شرافت نسبی و حسبی پر زعم تھا۔ وہی لوگ جو بڑے باعزت اور نیک نفس مشہور تھے، زاہدوں اور عابدوں کا زہد و تقویٰ بھی شاید میرے دروازہ پر کئی مرتبہ ٹوٹ گیا ـــــ نوجوانوں کا تو ذکر ہی کیا ایسے لوگ بھی میری پابوسی کرتے جن کے چہرے نورانی ڈاڑھی سے منور تھے اور جو بزرگ اور نیک مشہور تھے انھوں نے دنیا کی آنکھ میں خاک جھونک کر اپنے آپ کو "نیک" مشہور کیا تھا۔

مگر میرے آگے ان کے سب طلسم ٹوٹ چکے تھے، مجھے ان لوگوں سے سابقہ تھا جو شراب کے نشہ میں چور میرے کمرے میں لوٹتے پھرتے ـــــ میں ان کی باتیں سنتی، ان کی مار پیٹ سہتی انکو سمجھاتی ـــــ غرض سب کچھ کرتی ـــــ آہ وہی لوگ جن کو معذوروں، محتاجوں اور فقیروں کو ایک پیسہ دینا بار معلوم ہوتا میری معمولی اور مصنوعی ادا پر سیکڑوں روپے تصدق کر دیتے۔ میں دنیا کا تماشا دیکھ رہی تھی۔ کیا انصاف کے یہی معنی ہیں کہ عبادت گزاروں، محتاجوں اور غریبوں کو تو پیٹ بھر کھانا نصیب نہ ہو لیکن عیاشوں، حسن پرستوں اور بدکاروں کی جیبیں دولت سے بھاری ہوں ـــــ غرض زمانہ گزرتا گیا۔ تقریباً چار سال تک عصمت فروشی میرا ذریعۂ معاش رہا لیکن یقین جانئے ممتاز کی یاد میرے دل سے لحہ بھر کے لئے بھی جدا نہ ہوئی۔ میں خود اپنی اس زندگی سے متنفر اور شرمندہ تھی مگر کیا کرتی پیٹ پالنا تھا۔ کچھ دن بعد ہی اس زندگی سے بیزار ہو گئی اور اس "پیشہ" کو چھوڑ دیا۔ پھر زمانے کے ہاتھوں طرح طرح کے مصائب اٹھانے کے بعد میں پیٹ بھر کھانے کے لئے محتاج ہو گئی۔ یہی نہیں بلکہ بیمار پڑی تو دوا کے لئے ایک پھوٹی کوڑی بھی نہ تھی ـــــ غور کیجئے میری اس تباہی، بربادی اور گناہ آلودہ زندگی کا باعث کون ہے؟ یہی میرے "والدین" اور میرا "سماج" ـــــ وہی والدین جنھوں نے دولت کی حرص میں مجھے ایسے شخص کے حوالے کیا جس کے ساتھ گزر ناممکن تھی ـــــ اور میرا سماج وہ ہے جس میں لڑکی کو اپنے حق میں کچھ کہنے کی اجازت نہیں اگر کچھ کہے تو پھر چو طرف سے انگشت نمائی ہوتی ہے ـــــ بے حیائی، بے شرمی اور بے عزتی کے دھبے اس کے دامن پر لگائے جاتے ہیں۔ غور تو کیجئے کہ ایک معصوم ہستی کی زندگی کا سودا ہو رہا ہو اور خود اس کو کچھ کہنے کا حق

نہ ہو ـــــ انصاف فرمائیے ایک نوجوان اور محتاج بیوہ اگر نکاح کا ارادہ کرتی ہے یا نکاح کرنے پر مجبور ہوتی ہے تو سماج اس کو گری ہوئی نظروں سے دیکھتا ہے اس کو ذلیل وحقیر کیا جاتا ہے لیکن اگر ایک حریص بڈھا دو دو بیویاں رکھنے کے باوجود جب تیسرا نکاح کرتا ہے تو کیوں اس وقت سماج کی آنکھوں پر پٹیاں بندھ جاتی ہیں کیوں اس وقت سماج اندھا اور گونگا ہو جاتا ہے؟ ـــــ

بہرحال میری حالت زار پر رحم کرکے ڈاکٹر صاحب آپ نے اپنے پاس مجھے پناہ دی اور آپ کی انتہائی کوشش کے باوجود میں صحت نہ پا سکی مگر آپ نے مجھ پر جو احسان کیا ہے اس کا بدلہ خدا آپ کو ضرور دے گا۔ آپ میرے بے غرض محسن ہیں۔ کاش میری اس داستان سے میرے والدین بھی واقف ہو جائیں وہ ابھی زندہ ہیں۔ کاش ان کو معلوم ہو جائے کہ ان کی حرص وہوس نے ان کی بیٹی کو کس نتیجہ پر پہونچا دیا۔ کاش میری اس دردبھری کہانی سے دنیا سبق حاصل کرے ـــــ رضیہ کا دم پھولنے لگا اس کی آنکھیں پھرنے لگیں اور ایک ہچکی کے ساتھ وہ ڈاکٹر کے چہرے پر ایک حسرتناک نظر ڈالتے ہوئے ہمیشہ کے لئے سو گئی ـــــ ڈاکٹر حیرت اور رنج کے عالم میں کھڑا ہوا تھا اس کی آنکھوں میں آنسو چمک رہے تھے ـــــ

کاظم علی خاں

سحر

اندھیرے کی رانی چلی جا رہی ہے — جوانی کے ڈھلنے پہ غم کھا رہی ہے
ستاروں کی دنیا مٹی جا رہی ہے — پھریرا اڑاتے سحر آ رہی ہے

سحر ہو رہی ہے سحر ہو رہی ہے

رخِ ماہ پھیکا پڑا جا رہا ہے — شبِ غم پہ نورِ سحر چھا رہا ہے
زمانے میں اک انقلاب آ رہا ہے — وہ دریا پہ ملّاح کچھ گا رہا ہے

سحر ہو رہی ہے سحر ہو رہی ہے

صبا، باغ میں پھول مہکا رہی ہے — کلی اپنی مستی میں اترا رہی ہے
محبت ہر اک شے میں شرما رہی ہے — جوانی، جوانی نظر آ رہی ہے

سحر ہو رہی ہے سحر ہو رہی ہے

سید ناظم علی ناظم

سنگ تراش

سنگ تراش اپنے تصور سے کھیل رہا تھا۔ بے ڈول پتھر کا ٹکڑا آہستہ آہستہ ایک حسین صورت میں تبدیل ہو رہا تھا۔

وقت یکساں رفتار سے دوڑ رہا تھا۔

بالآخر مجسمہ تیار ہو گیا۔ حُسن کی وہ تمام باریکیاں جنھیں ظالم زمین نے ڈھانک لینے کی کوشش کی تھی پھر ایک بار سنگ تراش کی نظروں کے سامنے تھیں۔

دریچے میں پھولوں کا گلدستہ دیکھ کر ایک تتلی آئی۔

سنگ تراش اسے دیکھنے لگا۔

مگر وہ پھول پر نہ بیٹھی۔

سنگ تراش کی ہنسی ختم ہونے لگی جب اس نے دیکھا کہ تتلی مجسمہ کے ہونٹوں پر بیٹھ رہی ہے وہ غصہ میں بھرا ہوا اٹھا۔

"یہ میری تخلیق ہے۔ رقابت میں برداشت نہیں کر سکتا۔"

وہ دوڑا کہ تتلی کو پکڑ لے۔

اس کے زبردست ہاتھ تتلی پر پڑے اور وہ مجسمہ کے ہونٹوں پر چپک کر رہ گئی..... مگر... مجسمہ نیچے گر پڑا....

پتھر کے ٹکڑے زمین پر بکھر گئے۔

سنگ تراش نے ایک چیخ ماری اور ٹکڑوں پر گر پڑا۔

ٹوٹے ہوئے مجسمے کے لب صحیح و سالم ایک طرف پڑے تھے۔ اور۔

ان پر مری ہوئی تتلی اسی حالت میں موجود تھی۔

"آہ" سسکتے ہوئے سنگ تراش نے تتلی کی طرف دیکھ کر کہا "تو نے وہ کیا جو مجھ سے بھی نہ ہو سکا۔"

فقیر

دُور افق کی پہاڑیاں پیچھے کی طرف ہٹنے لگیں تاکہ دنیا والے شاہ خاور کا چہرہ دیکھ سکیں۔ مرطوب ہوائیں جس کے فراق میں رات بھر نالہ و شیون کرتی رہیں اور جن کے آنسو ابھی تک سبزہ پر بکھرے پڑے تھے۔ کلیوں کی پتیاں جنھیں ان کے جذبۂ محبت نے رات کی تاریکی میں ایک دوسرے سے چمٹائے رکھا تھا، شرماتی ہوئی علٰحدہ ہونے لگیں۔ اور بلبل نے ان کا مذاق اڑانا شروع کیا۔

فقیر اپنی جھونپڑی سے باہر نکلا۔ یاس کی روندی ہوئی جوانی اس کی بڑھی ہوئی ڈاڑھی اور مونچھوں کے پیچھے سے جھانک رہی تھی۔

ہاتھ میں کاسہ لئے وہ بستی کی طرف چلا۔

دن بھر مارا مارا پھرنے کے بعد وہ واپس ہوا۔ خیرات اس کی جھولی میں تھی..... اس کی دن بھر کی کمائی...... مغرب کی طرف افق کی لکیر بے چینی سے سورج کی طرف بڑھ رہی تھی

ببول کے درخت پر ایک قمری کا جوڑا بیٹھا ہوا تھا۔ کبھی کبھی ان کی چونچیں ایک دوسرے کے قریب ہو جاتیں جیسے وہ دن بھر کی روئداد ایک دوسرے کو سنا رہے ہیں۔

فقیر نے انہیں دیکھا اور اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔

"کاش میں بھی کسی کو اپنی دن بھر کی محنت کا ثمر بتلا سکتا....

بھلا ہو اس کا جس نے مجھے فقیر بنایا" وہ پلٹا اور آہستہ آہستہ جھونپڑی کی طرف روانہ ہوا۔ یکایک کچھ سوچ کر وہ واپس ہوا۔ جھولی میں سے کچھ چاول اور روٹی کے ٹکڑے نکالے اور درخت کی طرف پھینک دئے۔ معصوم پرندے حیرانی سے ایک دوسرے کی طرف دیکھ رہے تھے۔

فقیر کچھ دور چلا گیا۔

قمری کا جوڑا نیچے اترا اور کچھ دانے کھا لئے۔

فقیر مسرت سے ان کی طرف دیکھ رہا تھا۔

"مقدر میں تمھیں اپنی محنت کی روئداد سنا [illegible] تھا۔ مگر کہیں تم بھی [illegible]"

تین سبق

مدتیں گزریں جب دنیا کمسن تھی اس قدیم زمانے میں جب طلوع آفتاب سے قبل ستارے نغمہ سرا ہوتے تھے اس وقت ان کے گیت صاف سنائی دیتے تھے کیونکہ دنیا بالکل خاموش تھی اور آسمانوں کی موسیقی میٹھے میٹھے سروں میں پہاڑوں اور وادیوں میں سے آب جو کی مانند بہتی ہوئی دنیا کو اپنے رمزوں سے بے کھٹکے سیراب کرتی تھی۔ کہ ایک ننھے سے انسانی بچے نے اپنی آنکھیں کھولیں اور چلانے لگا۔ اس نے دنیا کی طرف دیکھا اور حیران ہو گیا آسمان کی نیلی نیلی وسعتوں پر نگاہ دوڑائی اور اپنی تنہائی کو محسوس کیا۔ اس نے چاہا کہ وہ کسی تاریک غار میں گھس جائے یا جنگل میں گنجان درختوں کے سایہ میں اپنے آپ کو چھپائے۔ کیونکہ وہ خائف ہو رہا تھا اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ وہ کیوں ڈر رہا ہے۔

یکایک خدا نے اس بچے کو آواز دی۔ وہ اب ڈرتا نہیں تھا اور اس کے دل میں تاریک غار یا گنجان جنگلوں میں چھپنے کی خواہش بھی نہ رہی تھی۔ اس نے جواب نہ دیا کیونکہ وہ اس سے آگاہ نہ تھا۔ کہ جواب کیونکر دیتے ہیں ۔

اور خدا نے کہا۔

تجھے ایک سبق سیکھنا ہے اپنا پہلا سبق پڑھ اور دن بھر اسے یاد کرتا رہ جب رات کا سایہ اس راستے پر دراز ہونے لگے جس پر تو گامزن ہے، تو تھک جائے اور چل نہ سکے تو میں تجھے سلا دوں گا اور جب تو جاگے گا تو میں تجھے دوسرا سبق دوں گا۔ بچے نے خدا سے سبق لیا اور یہ آسمان کے تاروں کی طرح چمک رہا تھا اس کی آنکھوں کو یہ ایک باب زرین کی طرح نظر آیا جو کھلا ہوا ہو لیکن دور، دور، بہت دور...... اتنی دور کہ کوئی ستارہ بھی اتنی دور نہ ہوگا اور اس دروازہ میں سے اسے ایک سفید نورانی روشنی نظر آئی اور ایک عجیب و غریب طریقے سے بچے کے دل نے محسوس کیا کہ ایک نہ ایک دن وہ ضرور وہاں پہونچ کر رہے گا۔ نظارہ آہستہ آہستہ اس کی آنکھوں سے اوجھل ہو گیا مگر سبق اس کے پاس ہی رہا۔

اور وہ سبق یہ تھا "میں میں ہوں" بڑا مشکل اور ادق سبق تھا بچے نے گھنٹوں اس پر صرف کر دئے اور اس میں اس قدر منہمک تھا کہ اسے معلوم بھی نہ ہوا کہ دن ڈھل چکا ہے اور روشنی بتدریج کم ہوتی جا رہی ہے وہ اپنا سبق یاد کرتا رہا جو اسے خدا نے دیا تھا یہاں تک کہ آفتاب غروب ہو گیا اور وہ تھک کر چور ہو گیا لیکن اب وہ چھوٹا بچہ نہ تھا کیونکہ دن بہت طویل تھا اور عمر کی وجہ سے اس کا جسم نحیف ہو کر جھک گیا تھا اس کے بال سفید ہو چکے تھے پیشانی پر جھریاں نمودار ہو چکی تھیں اور وہ کہہ رہا تھا۔ "میں بہت تھک گیا ہوں"

اور خدا نے مسکرا کر کہا

"اب سو جا اور آرام کر"

انسان سو گیا اور پھر اٹھا مگر اس دفعہ اس میں خوف کا شائبہ تک نہ تھا نہ اسے اپنے آپ کو چھپانے کی خواہش تھی اس نے اپنے اوپر جگمگاتے ہوئے نیلے آسمان کو دیکھا اور اس کی طرف اپنے ہاتھ پھیلا دیے۔ کیوں؟ آہ! اسے یہ معلوم نہ تھا وہ کچھ سننے کا منتظر تھا!

اور خدا نے کہا

دیکھ یہ تیرا دوسرا سبق ہے اسے پڑھ اور جب شام ہو اور تو تھک جائے تو یہاں آنا۔ میں پھر تجھ پر نیند طاری کروں گا۔ بچے نے خدا سے سبق لے لیا اور دنیا میں چلا گیا اور دنیا کے درختوں پھولوں اور اس کی زندہ مخلوقات کو دیکھتا رہا اور ساتھ ساتھ اپنا سبق بھی یاد کرتا رہا ــــــ دوسرا سبق یہ تھا "تو تو ہے"۔

اس دن کے لمحے بھی تیزی کے ساتھ گزر گئے کیونکہ جب اس نے یہ سبق پڑھا تو اسے آسمانی دنیاؤں کی موسیقی اور صبح کے ستاروں کے نغمے سنائی دینے لگے۔ جب اس کے پاؤں نئی نئی دنیا کو چھوتے تھے اور وہ اپنے سبق کو دہراتا تھا۔ تو شاید یہ عظیم الشان کائنات کے نغمے کی صدائے بازگشت تھی یا اس کے اپنے دل کی کہ وہ پھولوں اور سبزے میں سے موسیقی بن کر نکلتی تھی۔ اس وقت وہ پہلی مرتبہ مسرت سے آشنا ہوا اور خوشی اس کے دل میں پیدا ہوئی لیکن ابھی زیادہ عرصہ نہ گزرا تھا کہ شام کا سایہ اس کے راستہ میں محیط ہونے لگا آفتاب غروب ہوگیا تب انسان نے اپنا چہرہ آسمان کی طرف اٹھایا اور مسکرا کر کہا۔

"اے خدا ہم بہت تھک گئے ہیں"

اور خدا نے کہا۔

سو جا اور آرام کر کل میں تجھے اور سبق پڑھاؤں گا۔

جب تیسرے دن بچہ جاگا۔ اس نے انگڑائی لی اور اپنی آنکھیں ملیں لیکن اس نے اوپر کی طرف دیکھا نہ اپنے ہاتھ آسمان کی طرف پھیلائے اس نے اپنے آس پاس نگاہ ڈالی اور کہا۔

میرا ساتھی کہاں ہے۔

پھر خدا نے اسے تیسرا سبق دیا۔ اور آہ! یہ مشکل ترین سبق تھا اور جب اس نے اس کو دیکھا تو اسے چند لمحوں کے لئے غش آگیا پھر ایک عجیب لرزہ اس کے جسم پر چھا گیا اور اپنی چھڑی ہاتھ میں لے کر وہ تکل کھڑا ہوا۔

تیسرا سبق یہ تھا "یہ نہ کر وہ نہ کر"

شام کے وقت جب سورج چھپ گیا تو وہ بہت افسردہ ہوگیا تھا اور اس کے بال برف کی طرح سفید ہو گئے تھے شاید یہ اس کے بالوں کی سفیدی تھی۔ یا ڈوبتے ہوئے سورج کی آخری کرن مگر ایک روشنی تھی جو اس کے ہونٹوں اور ابروؤں پر کھیل رہی تھی۔ وہ سو گیا اور اپنی نیند میں ایک چھوٹے بچے کی طرح مسکراتا رہا:۔

دن کے بعد دن گزرتے گئے جب صبح ہوتی اور بچہ جاگتا تو اس کی آنکھ ایک نئی دنیا پر پڑتی لیکن کبھی اس کے دل میں یہ سوال پیدا نہ ہوا کہ اب اسے خوف کیوں نہیں معلوم ہوتا وہ اپنے بھائی بندوں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مسکراتا رہا۔ اور جواب میں وہ بھی مسکراتے رہے لیکن انہیں کبھی خیال نہ آیا۔ کہ کیوں!

لیکن چند روز بعد بچہ اپنے سبق سے غافل ہوگیا۔ خدا ہر روز اسے سبق دیا کرتا تھا مگر چند دن وہ سبق لینا بھول گیا اور اپنی بھول میں وہ اس سیدھے راستے سے بھٹک گیا جو نور جاوداں اور باب زریں کی طرف جاتا تھا۔ وہ مرغزاروں میں سنہری تیتریوں کے پیچھے بھاگتا رہا یا شہابا کی چمک کے پیچھے دوڑتا رہا۔ پھر جب رات ہوئی تو وہ مسکرا نہ سکا۔ وہ سو گیا۔ جب جاگا تو اس نے پھر وہی سبق دہرانا شروع کیا۔

کچھ روز وہ اپنے راستے سے بھٹکا رہا پھر اس نے الٹے پاؤں صعوبتوں اور تکلیفوں میں سے گزر کر راستے کو ڈھونڈ لیا۔ کیونکہ انسان ہمیشہ آزاد تھا۔ کیا اس نے پہلے ہی سبق میں یہ نہ پڑھا تھا "میں میں ہوں"

("ریلیجن آف" کے زرین خیالات کا ترجمہ اور اقتباس)

شنکر موہن لال ماتھر

محرومی

ہمنشیں! کیونکر سناؤں اپنی رودادِ حیات　　آہ ہے تاریک تر مجھ سے جبینِ کائنات!
اب مری ہر سانس میں لہرا رہی ہیں بجلیاں　　دل نہیں ہے دل مگر اک مرکزِ دردِ نہاں
خود ہی میرے حال پر گریاں ہے میرا حالِ زار　　دردِ محرومی ہے پیشانی سے میری آشکار
زندگانی بن گئی ہے سربسر تصویرِ یاس　　میں جواں ہوں پھر بھی ہمدم میری آنکھیں ہیں اداس
پھول کھلتے ہیں مگر میں مسکرا سکتا نہیں
خاک ہے وہ بحر جو طوفاں اٹھا سکتا نہیں

جذب و اضطراب

محسوس ہو رہا ہے یہ اب بے خودی کے بعد　　اک زندگی ملی ہے مجھے زندگی کے بعد
نامحرمی، دلیل خبر تھی خدا گواہ!!!　　حسنِ یقیں سے دور ہوں نامحرمی کے بعد
میں ہوں وہ نامرادِ محبت، ہزار حیف!　　رازِ فریب کچھ نہ کھلا دوستی کے بعد
اب میں حیات و موت کے جھگڑوں سے ہوں بلند　　دنیا بدل گئی ہے مری بے کسی کے بعد!
وہ التفاتِ یار کا موسم گزر چکا!　　اب وہ رُخِ حیات نہیں بے رخی کے بعد
دنیا، حجابِ حسن و لطافت میں تھی نہاں　　یعنی جنونِ ہوش نہ تھا بے خودی کے بعد
کیونکر کہوں کہ عہدِ جوانی گزر گیا!
دو اشک بھی ضرور ہیں کاوشؔ ہنسی کے بعد

کاوش

ہندی اور مسلمان

اردو ہندی کی نزاع قدیم ہے۔ اس کا تصفیہ اگرچہ ناممکن نہیں مگر مشکل ضرور ہو گیا ہے اس لئے کہ یہ جھگڑا جہاں تک سمجھ میں آتا ہے سیاسی نہیں بلکہ قومی ہے اور غالباً یہی سبب رہا ہو کہ آنریبل سر تیج بہادر سپرو کو یہ کہنا پڑا کہ یہ دونوں دو مختلف زبانیں ہیں اور فریقین کو الگ الگ اس کی ترقی کی کوشش کرنی چاہیئے۔ میں یہاں موصوف کے اصل الفاظ نقل کرتا ہوں

"اپنا دل بہلانے کے لئے اب ہم نے یہ وتیرہ اختیار کیا ہے کہ جب اردو اور ہندی کا تذکرہ ہوتا ہے تو ہم یہ کہتے ہیں کہ یہ دونوں ایک ہی زبان ہیں اور ہم کو بجائے اردو اور ہندی کے لفظ ہندوستانی استعمال کرنا چاہیئے میرے خیال میں اس لفظ کے استعمال سے یا تو اپنے دل کا بہلانا مقصود ہے اور یا ایک دوسرے کو دھوکا دینا۔ واقعہ یہ ہے کہ اس وقت اردو اور ہندی دو مختلف زبانیں بنتی چلی جا رہی ہیں۔ اردو کے ادیب اپنا یہ فرض سمجھتے ہیں کہ اردو میں فارسی اور عربی کے غیر مروج اور غیر مانوس الفاظ کی بھرمار کر دیں۔ اسی طرح ہندی کے ادیب اپنا یہ فرض سمجھتے ہیں کہ ہندی میں بھی غیر مروج اور غیر مانوس سنسکرت کے الفاظ بھر دئے جائیں لہٰذا میرے لئے یہ مان لینا غیر ممکن ہے کہ ایسی اردو یا ایسی ہندی کو ہم ہندوستانی کا لقب دے سکتے ہیں[1]"

سچ تو یہ ہے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں نے مل کر جس زبان کی آبیاری کی اور جو تقریباً اٹھارہویں صدی تک خالص ہندوستانی کہی جانے کی مستحق تھی آج پامال ہو رہی ہے، اور یہ محض اس لئے کہ ہم واقعات کو اپنی ذاتی خواہشوں پر قربان کر رہے ہیں۔ ہندوستانی کی ترویج میں جتنا ہندوؤں کا حصہ رہا ہے اس سے کچھ زیادہ ہی مسلمانوں کا بھی تھا لیکن اب مسلمانوں کی ہندی خدمات پس پشت ڈال دی گئی ہیں اور ان پر یہ عام اعتراض ہے کہ انھوں نے زبان ہندی کو اپنا نہیں سمجھا، ان کی شاعری میں ہندی عنصر اور ہندوؤں کے کلچر کی کوئی نمایندگی نہیں، ہندی مسلمانوں کی زبان نہیں اس لئے کہ ان کے جذبات اور زبان ہندی میں ہم آہنگی ناممکن ہے وغیرہ وغیرہ۔ یہ چند اعتراضات ہیں جو عموماً کئے جاتے ہیں۔ عرصہ ہوا رسالہ "الندوہ" اور "ہندوستانی" نے بعض غلط فہمیوں کا پورا پورا ازالہ کر دیا تھا لیکن ہٹ دھرمی ہے کہ لوگ اب بھی یہی کہے چلے جاتے ہیں۔ اس لئے بیجا نہ ہوگا اگر مسلمانوں کی ہندی خدمات پر ایک نگاہ بازگشت ڈال لی جائے اور بالترتیب ان خدمات کا اعادہ کیا جائے۔

اگر ہم ذرا بھی غور کریں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ مسلمانوں کا طبعی میلان ہندی کی طرف تھا۔ خلفائے عباسیہ میں شروع سے یہ جذبہ موجود تھا اور ان کے یہاں سنسکرت کا چرچا بھی ہو چکا تھا۔ ہارون رشید کے زمانہ میں جید علما مناظرے کے لئے ہندوستان بھیجے جاتے تھے، جن کے سنسکرت کے اسکالر ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔ سنہ ۱۰۰۰ء اور ۱۰۴۰ء کے درمیان مسلمانوں کا جو گروہ وارد ہندوستان ہوا اسی میں ابوریحان بیرونی جیسا اسکالر موجود تھا جس کی سنسکرت دانی اس پایہ کی تھی کہ اس نے مختلف عربی کتابوں کا سنسکرت میں ترجمہ کیا، اور سنسکرت علوم و فنون کے متعلق جو کتابیں اس نے لکھیں اس کے لئے اس نے سنسکرت کی بیشتر اور اہم مستند کتابوں سے مواد اخذ کیا۔ یہ بات بھی قابل یادداشت ہے کہ خلافت عباسیہ میں ہندوستان اور سندھ میں مسلمانوں کی مستقل سکونت ہو چکی تھی، بعد میں وہ اندرون ملک گھسے اور پنجاب، صوبہ متحدہ، ملیبار اور دکن میں قیام کر کے ہندی و سنسکرت سیکھنی شروع کر دی تھی اور بے شمار فاضل و شاعر

---

[1] "ہندوستانی" بابتہ جولائی سنہ ۱۹۳۹ء

مسلمانوں میں پیدا ہوئے۔

تمام تذکرے متفق اللفظ ہیں کہ مسعود سعد سلمان جو دور غزنویہ کا مشہور شاعر گزرا ہے مسلمانوں میں سب سے پہلے اسی نے بھاشا زبان شروع کی۔ یہ واقعہ امیر خسرو سے تقریباً ۲۰۰ برس پہلے کا ہے۔ مسعود سعد سلمان نے ایک دیوان ہندی میں بھی لکھا تھا مگر افسوس کہ وہ مفقود ہے اگر مل سکتا تو اس وقت کے مسلمانوں کی ہندی دانی کا اندازہ ہو سکتا۔ صاحب مجمع الفصحا نے اس شاعر کے متعلق یہ لکھا ہے کہ

"الحاصل وے راسہ دیوان بود تازی، ہندی، پارسی"

مسعود گو خاندان کے لحاظ سے ایرانی تھا لیکن پیدا لاہور میں ہوا تھا اس لئے ایک ہندی نژاد کا ہندی میں باکمال ہونا محل تعجب نہیں۔

مسعود کے بعد حضرت امیر خسرو آئے۔ انھوں نے سنسکرت اور بھاشا میں جو کمال پیدا کیا وہ ظاہر ہے۔ مثنوی "نہ سپہر" میں انھوں نے خود اپنے سنسکرت پڑھنے اور سیکھنے کا ذکر کیا ہے۔ تذکرہ عرفات میں لکھا ہے کہ امیر خسرو کا جتنا کلام فارسی میں ہے اتنا ہی ہندی میں بھی ہے۔ لیکن بدقسمتی سے بھاشا کا خالص کلام ناپید ہے محض وہ کلام مشہور ہے جس میں انھوں نے فارسی اور ہندی کو جذب کر دیا ہے یہ ہندی میں پہیلی کے موجد ہوئے ان کی پہیلیاں، مکرنیاں، انمل، ڈھکوسلے وغیرہ سب اختصار کے ساتھ آب حیات میں درج ہیں۔

امیر خسرو کے بعد کبیر آئے۔ یہ راما نند کے چیلے تھے۔ ابھی تک ان کا ہندو یا مسلمان ہونا ثابت نہیں ہو سکا ہے۔ اور اگر وہ ہندو کہے جا سکتے ہیں تو ایک گروہ مسلمان ماننے کے لئے بھی تیار ہے خیر چھوڑیئے اس بحث کو ان کا سکندر لودی کے زمانہ میں موجود ہونا مسلم ہے جس نے کبیر کو لامذہبیت کی وجہ سے قید کر دیا تھا اور بعد کو رہا کیا۔ شاعرانہ حیثیت سے کبیر کا درجہ بہت ممتاز ہے۔ ان کا کلام اس قدر مشہور ہے کہ صرف ایک دو ہرے پر اکتفا کی جاتی ہے۔ ؎

دین گوایو دنی سے دنی نہ آئیو ہاتھ
پیر کلہاڑی ماریو گا پھل اپنی ہاتھ

کبیر سر پر سرائے دنیا ہے کیوں سوتے سکھ چین
کوچ نگارا سانس کا باجت ہے دن رین

سکندر لودی کی وفات پر رجب ۹۱۵ھ میں سلطان ابراہیم حسین لودی تخت نشین ہوا تو اسی کے زمانے میں بابر نے ہندوستان پر حملہ کیا۔ بابر کو فتح ہوئی اور ابراہیم لودی کھیت رہا۔ اس کی وفات کی بہت سی تاریخیں کہی گئیں لیکن قوم بقال کے کسی شخص نے ہندی میں یہ تاریخ بھی بے مثل کہی[1] ؎

نو سے اوپر تھا بتیسا   پانی پت میں بھارت دلیا
اٹھواں رجب بار سکروارا   بابر جیتے براہیم ہارا

ہندوستان میں بابر کی آمد آمد کے ساتھ تیموریہ آفتاب طلوع ہوا۔ بابر ہندوستان کے لئے اجنبی تھا۔ یہاں کے رسم و رواج، طرز معاشرت، نباتات، حیوانات وغیرہ کو اپنے یہاں کے مقابلہ میں بالکل مختلف پاتا اور ان سے دلچسپی لیتا۔ وہ ہندوستان کی ان اشیاء کا جو اس کے لئے عجیب و غریب تھیں نام پوچھتا تھا اور اگرچہ صحیح تلفظ نہیں ہو سکتا تھا تاہم اپنے وقائع میں ان کو اسی طرح لکھنے کی کوشش کرتا تھا۔ وہ یہاں کی زبان کی طرف توجہ کرتا۔ اسے ہندوستان میں نہایت قلیل عرصہ تک رہنے کا اتفاق ہوا تاہم اس نے یہاں کی زبان اور لسانیاتی خصوصیات سے کچھ نہ کچھ واقفیت حاصل کر رکھی تھی اور کثرت کے ساتھ بابر نامہ میں ایسے الفاظ ملتے ہیں جن میں سے سوائے معدودے چند آج بھی بولے جاتے ہیں مثلاً ہاتھی، کالہرن (کالا ہرن) کویل۔ کرنی (کمرنی) گدہل (گرڈ ہل) بڑہل (بڑہل)، کروندہ، چرونجی۔ کنیر۔ کیوڑا۔ ڈاک، چکی۔ کہار وغیرہ۔ ان تمام ہندی الفاظ سے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ اردو زبان ان ایام میں بولی جاتی تھی۔ بابر کا ایک دیوان بھی موجود ہے۔ ایک شعر ملاحظہ ہو ؎

---

[1] حیات جلیل

مجکانہ ہواکچ ہوس مانک و موتی

فقراںیغہ بس بولنوسید و پانی و روتی

پہلے مصرعہ کو آج کل یوں کہہ سکتے ہیں "مجھ کو نہ ہوتی کچھ ہوس مانک و موتی" دونوں مصرعوں کا مطلب یہ ہوا کہ مجھے لعل اور موتیوں کی پروا نہیں۔ فقیروں کے لئے صرف پانی اور روٹی کفایت کرتے ہیں۔[1]

بابر کے وقت میں یوسفی ہندوستان میں موجود تھے۔ فنِ طب میں ریاض الادویہ ان کی بہت مشہور کتاب ہے۔ چھپ بھی چکی ہے۔ اس کے علاوہ رسالۂ ماکول و مشروب، فوائدالاخیار۔ جامع الفوائد رسالۂ قارورہ۔ رسالہ نبض وغیرہ ہیں۔ فنِ انشا میں ان کی مشہور تصنیف انشائے یوسفی ہے۔ ان کتابوں کے علاوہ اور بھی کتابیں ہیں۔ ان کی ایک دلچسپ تالیف "قصیدہ در لغات ہندی" ہے جس میں کل چوالیس شعر ہیں اور جو خالق باری کے رنگ میں ایک منظوم نصاب ہے۔[2]

حکیم یوسفی کے ہم عصر مولنا جمالی ہیں ان کا حسب ذیل ریختہ ملاحظہ ہو۔

.....ہر دو تیرا کتا ہے	موتیا بن بر درِ تو سُتا ہے
خوار شدم نار شدم لٹ گیا	در رہِ عشق تو کرُٹا ہے
گرچہ بدم گفت رقیب کُٹن	اس کا کہا مت کرو یہ جُھٹا ہے
گاہ نگفتہ کہ جمالی تو بیٹھ	تم کرو کیا اپنا کرم پھوٹا ہے

حکیم یوسفی اور جمالی کے بعد دورِ شیر شاہی میں ملک محمد جائسی نے مثنوی پدماوت تصنیف کی۔ جائسی۔ کبیر کی تعلیمات سے متاثر تھے۔ ان کی مثنوی کے متعلق لوگوں کا خیال ہے کہ وہ قدرت زبان اور سادگی کے لحاظ سے راماین سے کسی طرح کم نہیں۔

ہندی کی ترقی کا یہ سلسلہ برابر جاری رہا یہاں تک کہ اکبر کا زمانہ آیا۔ اکبر کو اوائل عمر ہی سے ہندوستان میں رہنے کا موقعہ ملا اس وجہ سے اسے ہندوستانی زبان سے کافی واقفیت ہو گئی تھی۔ ترکی اس کی گھریلو زبان تھی، فارسی میں اسے کافی مہارت تھی اور ہندی سے بھی وہ ناآشنا نہیں تھا۔ اس لئے کہ پہلی بات تو یہ کہ اگر ہندی نہیں جانتا تھا تو محل کی ہندو رانیوں سے کس زبان میں گفتگو کرتا تھا، ترکی اور فارسی کو تو وہ سمجھ بھی نہیں سکتی تھیں۔ اس کے علاوہ وہ ہندی موسیقی سے بیحد شوق رکھتا تھا، ہندی مطربوں اور شاعروں کی سرپرستی کرتا تھا۔ برہمنوں کا اس کے دربار میں عروج تھا اور اکبر انکو سنسکرت کی خدمت اپنا فرض سمجھتا تھا۔ یہی نہیں اکبر خود بھی سنسکرت کا بیحد دلدادہ تھا وہ سنسکرت میں شاعری بھی کرتا تھا اور ہندی شاعری میں اپنا تخلص اکبر رائے رکھا تھا۔ اسی بادشاہ کی بے دریغ فیاضیوں کا نتیجہ تھا کہ مسلمانوں میں سنسکرت کا ذوق پیدا ہوا اور بیسیوں سنسکرت کتابوں کا مسلمانوں نے ترجمہ کر ڈالا۔ دربار کے عمائدین، امراء و شعراء سنسکرت سے کماحقہ، واقف تھے۔ شیخ مبارک ہی کو لیجئے تو ان کے متعلق عام اتفاق ہے کہ وہ شعر و سخن، عروض و معما، تاریخ و انشاء تفسیر اور سنسکرت میں ہندوستان کیا دنیا میں اپنا جواب نہیں رکھتے تھے۔ فیضی انہیں کے بڑے بیٹے ہیں۔ علم حساب و ہندسہ کی مشہور کتاب لیلاوتی اسی کی احسان مند ہے جس کا ترجمہ اس نے فارسی میں سنسکرت سے کیا تھا۔ یہ کتاب بیدر کے مشہور پنڈت بھاسکر کی باکمال لڑکی کی تصنیف کہی جاتی ہے۔ حساب کی ایک دوسری کتاب بیج سنسکرت سے فارسی میں منتقل کی اور بھگوت گیتا کا بھی فارسی میں ترجمہ کیا۔ اکبر ہی کی سنسکرت نوازی کا نتیجہ تھا کہ رامائن اور مہابھارت کا فارسی میں ترجمہ ہوا اور تزک میرزائی کا ترجمہ سنسکرت میں کیا گیا۔

اسی طرح ابوالفضل کا ہندی میں فاضل ہونا صرف آئین اکبری

---

[1] اورنٹیل کالج میگزین بابت مئی ۱۹۳۲ء۔ [2] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو۔ پروفیسر مسعود حسن رضوی کا مضمون اردو زبان کی لغت" ہندوستانی ۱۹۳۳ء

ہی سے ظاہر ہے کہ اس میں سیکڑوں ہندی کے الفاظ۔ میووں، درختوں پھولوں، غلہ، ترکاریوں، کھانوں، کپڑوں، ہتھیاروں کے نام اور بہت سی دوسری اصطلاحیں ایسی ملتی ہیں جو ہندی ہیں اور آج بھی وہ برابر استعمال ہوتی ہیں۔ ابوالفضل کی ہندی دانی کا ایک ثبوت یوں اور بھی دیا جا سکتا ہے کہ وہ خود آئین اکبری میں لکھتا ہے کہ علم ہیئت کی ایک کتاب کا ترجمہ حسب الحکم بادشاہ ہندی زبان میں کیا۔

اکبر کے زمانے میں یقیناً ہندی کو غیر معمولی ترقی ہوئی اور یہ حالت ہو گئی تھی کہ عمائدین اور شہزادے ہندی زبان میں شاعری کرنے لگے تھے۔ شہزادۂ دانیال کے متعلق تزک جہانگیری میں ہے کہ

"بہ نغمۂ ہندی مائل بود۔ گاہے بزبان اہل ہنود بہ اصطلاح ایشان شعری گفت۔"

اسی طرح عبدالرحیم خانخاناں کی سنسکرت اور ہندی دانی، عربی و فارسی میں مہارت تزک جہانگیری سے ثابت ہے۔

"خانخاناں در قابلیت و استعداد یکتائے روزگار بود۔ زبان عربی، ترکی، فارسی و ہندی میدانست و از اقسام عقلی و نقلی حتیٰ کہ علوم ہندی بہرۂ وافی میداشت۔ بزبان فارسی و ہندی شعر نیکو می گفت"

عبدالرحیم خود بھی شاعر تھا اور شاعر نواز بھی تھا چنانچہ مشہور شاعر "گنگ کوی" کا مربی بھی تھا۔

تعجب معلوم ہوتا ہے کہ ہندی کا اکبر کے یہاں یہ عروج ہوا کہ ہندوستانیوں کے علاوہ ایرانیوں کو بھی اس کا چسکا لگ گیا تھا۔ فارسی شعرا جو اس وقت دربار میں موجود تھے اکثر ہندی الفاظ نظم کرتے اور بولتے تھے۔ ملا دوپیازہ کو دیکھیے کہ ایرانی النسل ہونے کے باوجود ظرافت کے پیرایہ میں برابر ہندی میں شاعری کیا کرتے تھے چنانچہ کلام کا نمونہ دیکھیے۔

وہ گورا گورا لڑکا بامن کا شوخ گھونا　　ایسا لگے ہے مجکو جوں کھانڈ کا کھلونا
شوخی نپٹ کرت ہے نک چھکنی ہاتھ لیکر　　تیں تاک شیخ کینتی ایسی طرح ملونا
دوپیازہ اندل و جاں قربان کرد انبا شم　　جوبن لے ادھکا ما ماہ سا نولا سلونا

اس وقت کی شاعری کا ایک نمونہ اور دیکھیے۔ ملا نوری فیضی کے دوست تھے۔ اعظم پور کے قاضی زادوں میں سے ہیں۔ شاعر فارسی کے تھے اور فن بدیع و معما میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔ ریختہ میں بھی ان کی کئی غزلیں محمد شاہی عہد تک مشہور تھیں چنانچہ قائم[1] نے ذکر کیا ہے۔ ایک شعر نوری کا ملاحظہ ہو۔

ہر کس کہ خیانت کند البتہ بترسد
بیچارۂ نوری نہ کرے ہے نہ ڈرے ہے

جہانگیر بھی اکبر کی طرح ترکی سے واقف تھا۔ فارسی میں اتنی دستگاہ رکھتا تھا اور ایسے ذوق سلیم کا مالک تھا کہ اساتذہ کے مصرعوں پر برجستہ مصرعہ لگا دیا کرتا تھا۔ ہندی سے بھی یقیناً واقف تھا اس وجہ سے کہ وہ ایک ہندو ماں سے پیدا ہوا اور ابتدا ہی سے ایک ہندی ماحول میں رہا۔ دوسرا ثبوت ہندی دانی کے متعلق یہ ہے کہ تزک جہانگیری میں ہندی الفاظ اس کثرت سے ملتے ہیں کہ اس سے اس کا ہندی زبان پر عبور معلوم ہوتا ہے دو چار الفاظ دیکھیے۔

"شیرمار۔ روپ سندر۔ ہنسراج۔ تالاب۔ گھڑی۔ کالا پانی۔ بن مانس" وغیرہ وغیرہ جن میں سے اکثر اس وقت بھی مستعمل ہیں اس عہد کی شاعری کا نمونہ دیکھنا ہو تو خاکی نامی درویش[2] کا یہ ریختہ دیکھیے۔

ٹھانی ہے اپنے من میں اب تو یہی سریجن
سجن پیم کی گلی میں خاکی کو خاک ہونا

سلاطین مغلیہ عموماً جس طرح شاہی زبان یعنی فارسی کی

---

[1] مخزن نکات۔ [2] تذکرۂ میر حسن

سرپرستی کرتے تھے اسی طرح بھاشا کی بھی عزت افزائی اپنا فرض سمجھتے تھے۔ چنانچہ جہانگیر کا خود بیان ہے کہ ایک اچھوتے مضمون کی نظم کے صلے میں اس نے ایک ہندو شاعر کو ایک ہاتھی فرط خوشی سے انعام میں دیا۔ ہندی تصانیف کے ساتھ مغلوں کا شغف اس قدر زیادہ ہو گیا تھا کہ لوگ ہندی کی مشہور کتابیں یاد کر لیا کرتے تھے۔ چنانچہ میر ہاشم محترم مہابھارت کے صفحے کے صفحے زبانی سنا دیا کرتے تھے ہفت اقلیم کی عبارت سنئے۔

"امروز در ہندوستان است تمام کتاب مہابھارت را کہ متجمع اسامی غریبہ و حکایات است در ذکر دارد"

جہانگیر کے بعد شاہجہاں بھی ہندی سے واقفیت رکھتا تھا۔ فارسی تو اس کی خاص زبان تھی ہی مگر فارسی کے علاوہ لوگوں سے ہندوستانی میں بھی گفتگو کرتا تھا۔ عبدالحمید لکھتا ہے۔

"بیشتر بہ فارسی در کمال فصاحت و بلاغت تکلم می فرمایند و بہ بعضے ہندوستانی زبانان کہ فارسی ندانند بہ ہندوستانی"[۱]

شاہ جہاں نامے اور دوسری کتابیں بھی اس وقت کے بہت سے ہندی الفاظ کی حامل تھیں جو آج بھی متروک نہیں ہوئے ہیں مثلاً پھول کٹورہ۔ دل بادل۔ چبوترہ۔ پالکی۔ رتھ وغیرہ۔

حیرت ہوتی ہے کہ اورنگ زیب کو لوگ ہندوؤں کی طرف متعصب و متہتک بتاتے ہیں لیکن بھاشا کی ترقی اس کے وقت میں بھی کچھ کم نہیں ہوئی۔ ایران کا مشہور شاعر ضمیر اسی زمانہ میں ایران سے آیا اور بھاشا میں انتہائی کمال پیدا کر کے ہندی راگ کی مشہور کتاب پارجاتک کا ترجمہ فارسی میں کیا۔ آزاد بلگرامی ان کے متعلق لکھتے ہیں۔

"..... بواسطۂ جودت ذہن نظم مسلم ہندی طبع اول آں قدر نخل شد کہ از جملہ استادان فن برآمد۔ زبانش بہ تلفظ ایں زبان خوب نمی گردید اما نظم او بسیار پختہ واقع می شد۔ ترجمہ پارجاتک در فن نغمہ لغات ہندی از وست۔ در ہندی پنہتی تخلص میکرد"[۲]

اورنگ زیب کے زمانہ میں بقول مولوی نورالحسن صاحب نیر کاکوروی بھاشا کی زباں دانی کا چسکا اس قدر زیادہ پڑ گیا تھا کہ بڑے بڑے علماء و حضرات اولیا و صوفیا سب کے سب اس میں کمال پیدا کرتے تھے۔[۳]

اورنگ زیب کے بعد اعظم شاہ اور فرخ سیر کے زمانے میں بھی ہندی نوازی اور ادبیات میں کمی نہیں ہوئی تھی۔ جعفر زٹلی ناصر علی سرہندی، میر عبدالجلیل بلگرامی، سید غلام نبی اور خود آزاد بلگرامی سب کے سب ہندی میں ماہر رہے ہیں انھوں نے ہندی کتابیں بھی لکھیں۔ یہی جذبہ محمد شاہی دور تک قائم رہا چنانچہ آزاد بلگرامی[۴] لکھتے ہیں کہ ہندوستان کے علماء نے جے سنگھ کے حکم سے شرح چغمنی اور دوسری کتابوں کا جو علم ہیئت اور ہندسے میں تھیں عربی زبان سے ہندی میں ترجمہ کیا۔

یہاں تک مسلمانوں کی ہندی اور سنسکرت خدمات دکھانے کے بعد ہم اس بات کی قدرے کوشش کریں گے کہ مسلمانوں کی شاعری میں ہندی عنصر کی موجودگی اور ہندو کلچر کی نمایندگی ظاہر کریں۔ یہ بھی ایک عام اعتراض ہے کہ مسلمانوں کی شاعری فارسی سے متاثر ہے۔ اس میں وہی لالہ و گل کی بہاریں ہیں، بلبل و قمری کے نغمے ہیں۔ شیریں و فرہاد کی داستانیں ہیں اور رستم و سہراب کی نوحہ خوانی ہے۔ لیکن یہ بات صحیح نہیں۔ اگرچہ مسلمانوں کی شاعری کے اکثر عناصر عجمی ہیں تاہم ہندی کلچر کا کوئی ایسا پہلو نہیں جس کے اثرات مسلمانوں کے یہاں نہ ملتے ہوں مثلاً ہندو تہذیب، معاشرت، مذہب، آداب و رسوم اور جملہ ہندی عناصر اس میں موجود ہیں ہندی کے سیکڑوں لفظ ولی، حاتم، آبرو، مضمون اور فائز دہلوی[۵] کے یہاں جو شمالی ہند کا سب سے قدیم شاعر ہے کثرت سے ملتے ہیں۔ یہی میر، انشا، سودا، مظہر، امانت، منیر وغیرہم کی حالت ہے۔

۱؎ شاہجہاں نامہ جلد اول ۲؎ ایضاً

۳؎ ہندوستانی اکتوبر ۱۹۳۶ء ۴؎ سبحۃ المرجان فی آثار ہندوستان ۵؎ صدرالدین فائز دہلوی پر پروفیسر مسعود حسن رضوی نے ایک نہایت جامع مقالہ ہندی کانفرنس میں پڑھا تھا اور ثابت کیا تھا کہ وہ شمالی ہند کا سب سے پہلا شاعر ہے اس لئے اس کا دیوان ۱۱۲۶ھ میں ولی سے پانچ سال قبل مدون ہو چکا تھا۔

سودا کے متعلق آزاد دہلوی لکھتے ہیں کہ "مرزا اکثر ہندی کے مضمون اور الفاظ نہایت لطیف طور پر تضمین کرکے زبان ہندی کی اصلیت کا حق ادا کرتے ہیں (آب حیات) چنانچہ ان کی پہیلیاں، مرثیوں اور قصیدے سے ظاہر ہے۔ ان پہیلیوں کو دیکھئے جن کی زبان باوجود زمانہ کے فرق کے امیر خسرو کی زبان سے ملتی جلتی ہے۔

شمشیر کی پہیلی

(۱) سر پر ختم کمر پر بار ؛ اس نار کا ہے یہی بچار
جیتے ہم کرے وہ دُو ؛ جب وہ ناری پیاری ہوتے

سپر کی پہیلی

(۲) ایک نار بھونرا سی کالی ؛ کان نہیں وہ پہنے بالی
ناک نہیں وہ سونگے پھول ؛ جتنا عرض اتنا ہی طول

باز کی پہیلی

(۳) بعض بات کہی نا جائے ؛ ناری ہوکر نر کہلائے

قندیل کی پہیلی

(۴) سہرا باندھا پاؤں پر اور سنگ ہوئے اس کے سائی
پیٹ میں واکے آگ لگا دی گلے میں کس ڈالی پھانسی

اسی طرح ہندی شاعری کے تشبیہ و استعارے بھی پوری طرح سے مسلمانوں کے یہاں دکھائی دیتے ہیں۔ ان کی شاعری میں بحریں بھی ہندی اثرات سے تبدیل ہوئیں۔ مثنویاں ہندو قصوں اور افسانوں پر لکھی گئیں۔ مسلمان شعراء میں نظیر اکبرآبادی کی شخصیت ہندوانہ موضوعوں پر نظمیں لکھنے میں بہت نمایاں ہے جنھوں نے "بل دیو جی کا میلہ" "کنھیا جی کی شادی" "ہر کی تعریف" "درگا جی کے درشن" "مہادیو کا بیاہ" وغیرہ عنوانات سے اکثر و بیشتر نظمیں لکھیں اور ان سے ہندو مذہب کے بہت سے رسوم اور حالات معلوم ہوتے ہیں۔ اسی طرح مختلف قسم کے زیورات، توہمات، ہندو رسوم، رنڈاپا، شادی بیاہ، ہندو تیوہار۔ سب قسم کی نظمیں موجود ہیں مگر طوالت کے لحاظ سے مثالیں نظر انداز کی جاتی ہیں۔

غرض کہ اگر ہم انصاف سے دیکھیں تو شعراء سے لے کر مسلمان بادشاہوں تک کا کلام اور معاشرت ہندوستان کی تہذیب اور معاشرت کی آئینہ دار ہے۔ اکبر، جہانگیر، شاہجہاں، اورنگ زیب اور واجد علی شاہ[1] سب کے یہاں ہندی تہذیب کے نشانات نہایت واضح ہیں۔ ان تمام باتوں سے معلوم ہوا کہ مسلمانوں نے ہندی ادب کی ترویج میں کوئی کمی نہیں کی ان کا فطری میلان بھی ایک حد تک اسی کی طرف تھا اور خود ان کی شاعری و ادب ہندی اثرات اور تمدن و تہذیب و معاشرت کا پرتو ہے۔ رسالہ کی گنجائش مضمون کی وسعت کے ساتھ سازگار نہیں اسلئے اختصار مدِنظر رہا ورنہ اگر اس موضوع کی تفصیل کردی جائے تو مستقل ضخیم کتابیں تیار ہو جائیں۔

اقبال انصاری

---

[1] واجد علی شاہ، اختر تخلص کرتے تھے۔ موسیقی پر کئی کتابیں لکھیں۔ ہندی شاعری سے بے حد دلچسپی تھی ٹھمریاں اور گیتیں ان کی بہت مشہور ہیں۔ کل کتابیں ایک سو بیس[120] سے زیادہ ہیں۔ واجد علی شاہ کی تقریباً پچاس تصنیفیں پروفیسر مسعود حسن رضوی کے کتب خانہ میں موجود ہیں جنھوں نے بیس سال کی کوشش کے بعد ان جواہر پاروں کو اکٹھا کیا ہے اور ایک مبسوط مقالہ واجد علی شاہ کی "ادبی خدمات" پر لکھنؤ یونیورسٹی میں پڑھ چکے ہیں۔

اطلاع

جن اصحاب کا چندہ ختم ہوگیا ہے وہ براہ کرم جلد روانہ فرمادیں یا سب رس تقسیم کرنے والے کو چندہ دے کر باضابطہ مطبوعہ رسید حاصل فرمالیں۔

نشری تقاریر

ہماری زبان کا ایک ایک لفظ ایک گولی ہے جو ہمارے منہ سے نکل کر سننے والوں کے دماغوں میں پیوست ہو جاتی ہے۔ اب یہ ہمارا فرض ہے کہ اس کی اہمیت کو محسوس کریں۔ اگر دس منٹ کی تقریر دس لاکھ سامعین سنیں تو انھوں نے تقریباً دو سال کا وقت دیا ہے۔ اس دو سال کی مدت کو قوم کا نہایت قیمتی سرمایہ سمجھئے۔ اول تو ارباب نشر خود اس کو گوارا نہیں کرتے کہ غیر معیاری تقریریں نشر کروا کے اپنے سامعین کا وقت ضایع ہونے دیں اور اگر کبھی ان سے چوک ہو جائے تو خود مقرروں پر کتنی بڑی ذمہ داری عاید ہوتی ہے۔ وہ قوم کے آگے کتنا بڑا گناہ کر رہے ہیں۔ نشریات کو شہرت اور آمدنی کا ذریعہ سمجھنے والوں کو اپنے اخلاقی اور قومی فرایض پر سب سے پہلے نظر ڈالنی چاہیے۔ خود پر قومی خدمت کی پابندی عاید کر کے نشریات کے میدان میں قدم رکھیئے تو ان شرطوں کو پورا کرنے یا ان اصولوں پر عمل کرنے میں کافی آسانی ہوگی جو اربابِ نشر نے بنائے ہیں۔

صداقت نشریات کی سب سے پہلی شرط ہے۔ اس مقالہ کی ابتدا کچھ واعظانہ اور لیڈرانہ انداز لیے ہوئے ہے مگر یہ واقعہ ہے کہ نشریات کو آج کل قومی خدمت سمجھنے کی بجائے منفعت اور شہرت حاصل کرنے کا آلہ سمجھا جا رہا ہے۔ ہر نشرگاہ میں تقریروں، ڈراموں، فیچروں، مکالموں، مباحثوں، کہانیوں، قصوں، افسانوں وغیرہ کے مسودوں کا اتنا انبار ہو جاتا ہے کہ اربابِ نشر ان کو مسترد کرتے کرتے تنگ آ جاتے ہیں۔ دوسری طرف نقالوں، اداکاروں، شاعروں اور ان سے بہت زیادہ مقرروں کی کثرت پریشان کر دیتی ہے۔ میرا روئے سخن ان تمام فن کاروں اور اداکاروں اور ادیبوں کی طرف ہے جو ناتجربہ کار اور نوسیکھ ہیں مگر چاہتے ہیں کہ جلد سے جلد شہرت بھی حاصل کر لیں اور فائدہ بھی۔

نشریات نے بہت ترقی کر لی ہے اس کے ہر شعبے کے اجزا پروگرام کی تکنیک مرتب ہو گئی ہے۔ ان ہی میں سے ایک تقریروں کا شعبہ ہے جو مختلف حیثیتوں سے بے حد اہم ہے۔ اس کی یہی اہمیت کیا کم ہے کہ انسانی جذبات اور تاثرات ہماری زبان اور الفاظ کے ذریعہ پیش ہوتے ہیں۔ دنیا کا اہم سے اہم واقعہ الفاظ ہی کی وجہ سے عوام کو معلوم ہوتا ہے۔ ہمارا منہ ایک جسم اور اس سے ادا ہونے والا لفظ روح ہے۔ جسم اور روح کی کثافت کس قدر زہر پھیلا سکتی ہے یہ آپ ضرور جانتے ہوں گے۔ ہماری زبان اور قلم سے جو الفاظ ادا ہوتے ہیں ان کی دو شکلیں ہیں۔ تقریر اور تحریر۔ نشریات نے تقریر اور تحریر دونوں کو ملا کر ایک نئی چیز پیدا کی ہے جو "نشری تقریر" کہلاتی ہے۔

پلیٹ فارم اور اسٹوڈیو

جو اصحاب پلیٹ فارم اور نشرگاہ کے اسٹوڈیو سے واقف ہیں وہ ان دونوں کی ظاہری ہیئت اور شکل کے پیش نظر بھی ان دونوں میں نمایاں فرق محسوس کرتے ہوں گے۔ پلیٹ فارم کی تقریر کو انگریزی میں اسپیچ کہا جائیگا۔ اور اسٹوڈیو کی تقریر ٹاک کہلائیگی۔ پہلی تقریر ایک قسم کا لکچر اور دوسری ایک طرح کی گھریلو بات چیت ہے۔ لکچر اور بات چیت میں اس کے سامعین کے نظریے بھی فرق کیا جائے گا۔ پلیٹ فارم سے جو تقریر ہوگی اس کے سننے والوں کی تعداد بہت زیادہ رہے گی اس کے برخلاف بات چیت سننے والے دو چار ہی ہوا کرتے ہیں۔ لکچر سننے والے تقریر کے سامنے اور اس سے کافی قریب ہوں گے۔ اسٹوڈیو کی نشری بات چیت سننے والے غائب اور سیکڑوں میل کے رقبے میں پھیلے ہوئے

گر مجموعی طور پر ان کی تعداد ہزاروں اور لاکھوں ہوتی ہے۔

اس پلیٹ فارم کا تصور باندھئے جس کے سامنے سامعین بیٹھے تقریر کا انتظار کر رہے ہیں۔ اس مجمع میں تقریر یا مقرر کے موافق، مخالف اور غیر جانب دار سب ہی ہوں گے۔ موافقین اور مخالفین نے موافقت یا مخالفت کرنے، نعرے لگانے، تالیاں بجانے، شور مچانے، حوصلہ افزائی کرنے یا پست ہمت کرنے کے بہت سے طریقے سوچ لئے ہوں گے۔ کمزور سے کمزور استدلال پر موافقین کا شور مخالفین کو خاموش کر سکتا ہے۔ معقول سے معقول دلیل پر کثیر مخالفین اتنی گڑبڑ کر سکتے ہیں کہ مقرر کو کچھ اور بولنے کی جرأت نہ ہو سکے۔ غیر جانبداروں کا سکوت مفید بھی ہو سکتا ہے اور مضر بھی۔ مقرر کے نام کا اعلان ہوتے ہی یا تقریر کے شروع میں مجمع جس انداز میں اس کا خیر مقدم کرتا ہے اس سے پوری تقریر پر اثر پڑتا ہے۔ کالج کے مباحثوں میں اکثر دیکھا جاتا ہے کہ بعض مقرروں سے طالب علموں کو خدا واسطے کا بغض ہوتا ہے۔ وہ اس غریب کو بولنے ہی نہیں دیتے۔ کالجوں میں ہی بعض مقرر ایسے ہوتے ہیں جن کو بے وقوف بنانے کیلئے لڑکے نعروں اور تالیوں کی گونج سے طلب کرتے اور عین تقریر کے دوران میں جلے کس کر زمین پر پیر پٹخ کر تال کے ساتھ تالیاں بجا کر ان کو بے نیل مرام واپس کر دیتے ہیں۔ مختصر یہ کہ ناظرین کی موجودگی مقرر پر طرح طرح کی ذمہ داریاں عاید کرتی ہے۔ پلیٹ فارمی مقرر کو غیر معمولی طور پر چوکس رہنا پڑتا ہے۔ وہ اپنے حاضرین کے ردِ عمل کو نظر انداز کرنے کی ہمت نہیں کر سکتا۔ اعلیٰ سے اعلیٰ مقرر مجمع کی مرضی کے خلاف طویل تقریر نہیں کر سکتا۔ تقریر کی طوالت یا اختصار کا دار و مدار بالعموم مجمع کے مزاج پر ہوگا۔ اگر مقرر کے خیالات مجمع کے خیالات سے مختلف ہوں تو ان کی انتہائی معقولیت اور افادیت کے باوجود مقرر کو "شان دار پسپائی" ہوگی۔ گو ایک پلیٹ فارم کے حالات دوسرے سے الگ ہوتے اور ہو سکتے ہیں نیز جلسوں اور تقریروں کی نوعیت اکثر بدلی ہوئی ہوتی ہے اس کے باوجود حاضرین اور ان کا ردِ عمل ہر جلسے اور محفل میں ملے گا۔ کالج کا مباحثہ، کونسل کے جلسے دارالعوام کی بحثیں، تعزیتی جلسے خیر مقدمی جلسے، احتجاجی جلسے وغیرہ ایک دوسرے سے الگ ضرور ہیں مگر ہر جلسے کے حاضرین کا ردِ عمل ہوگا۔ کہیں متین کہیں شوخ، کہیں مہذب کہیں غیر مہذب۔ کالج کے جلسوں میں چھچھورا پن مذاق ملے گا، تعزیتی جلسوں میں خموشی اور سنجیدگی، احتجاجی جلسوں میں شور و غوغا اور برہمی، خیر مقدمی جلسوں میں خوشی اور مسرت۔ تعزیتی جلسوں کی رقت مقرر کو اس قدر متاثر کر سکتی ہے کہ وہ جوش میں آجائے، احتجاجی جلسوں کی برہمی مقرر پر یہ اثر ڈال سکتی ہے کہ مقرر اپنے احتجاج میں اور شدت پیدا کر دے اور مجمع کو زیادہ برہم بنا دے۔ حاضرین کے اس ردِ عمل سے تقریر کا دوران، مقرر کا لب و لہجہ اور انداز بیان بھی متاثر ہوتا ہے۔ اگر حاضرین موافق نظر آئیں اور پروگرام کے مطابق وقت کی کوئی پابندی نہ ہو تو ممکن ہے اس موافقت سے فائدہ اٹھا کر مقرر دس بارہ منٹ اور تقریر کرے یا خود صدرِ جلسہ مقرر کو مزید وقت دیدے۔ مخالفت کی صورت میں دانشمند مقرر خود اپنی تقریر جلد ختم کر دے گا۔ اگر سننے والے نعروں اور تالیوں سے اپنے خیالات ظاہر کر دیں تو مقرر کا انداز بیان اور لب و لہجہ موافقت کی صورت میں اور شگفتہ ہو جائے گا، الفاظ اور خیالات زیادہ روانی کے ساتھ نکلیں گے۔ اگر مخالفت ہو تو انداز بیان سے پژمردگی ظاہر ہوگی اور یہ محسوس ہوگا کہ مقرر کو باوجود کوشش کے اظہار کے لئے مناسب الفاظ نہیں ملیں گے۔ یا یہ کہ اس کی زبان میں لکنت پیدا ہو گئی ہے۔ یہ تو تھا مختصر سا خاکہ پلیٹ فارم کا۔ اب ذرا اسٹوڈیو کے حالات پر غور کیجئے۔

اسٹوڈیو ایک نہایت خاموش کمرہ ہے جہاں سے مقرر اپنی تقریر نشر کرتا ہے۔ اس میں وہ اپنی تقریر سے چند منٹ پہلے پہنچا دیا جاتا ہے۔ داخلے کے وقت بھی اسٹوڈیو میں وہی خموشی رہتی ہے جو تقریر کے دوران میں ہوتی ہے۔ نہ کوئی ہمت بڑھانے والا اور نہ مرعوب کرنے والا۔ متعلقہ جان دار چیزوں میں ایک اناؤنسر اور بے جان میں تقریر کی ایک کاپی ہوتی ہے۔ مقرر چاہے دو چار منٹ پہلے پہنچے یا آدھ گھنٹہ پہلے وہ خود کو ایک ہموار، موافق اور نہ بدلنے والی فضا میں محسوس کرے گا۔ کسی قسم کی کوئی تبدیلی یا غیر معمولی بات نہ ہوگی۔ میز کے قریب بیٹھ کے مقرر سرخ روشنی اور اناؤنسمنٹ کا انتظار کرے گا۔ سرخ روشنی ہوئی، اناؤنسمنٹ دیا گیا اور اس نے بلا کسی تذبذب، اختلاج، تکلیف یا تامل کے اپنی تقریر شروع کر دی۔ پلیٹ فارم کی طرح یہ نہیں کہ مقرر اپنی ٹوپی درست کر رہا ہے، تالیوں کے رکنے کا انتظار کر رہا ہے یا بے چین حاضرین کو اطمینان سے بیٹھ جانے کا موقع دے رہا ہے، اپنے تیار کئے ہوئے نوٹس الٹ پلٹ کر رہا ہے، حلق صاف کر رہا ہے، اپنی مسکراہٹ، سنجیدگی، اکڑ یا لاابالی پن ظاہر کر کے حاضرین کو اپنا بنا رہا ہے یا مرعوب کر رہا ہے۔ اسٹوڈیو کا مقرر خود کلام یعنی (monologist) ہے مگر اس کے سننے والے ہزاروں اور لاکھوں کی تعداد میں ادھر ادھر پھیلے ہوئے مختلف ماحول میں تقریر سن رہے ہیں۔ پلیٹ فارمی مقرر کے حاضرین کے برخلاف جو ایک ہی ہال میں ایک خاص ماحول اور فضا میں تقریر سنتے ہیں نشری مقرر کی تقریر مختلف حالات میں سنی جاتی ہے۔ [illegible] رہا ہے، میاں تقریر سننا چاہتا ہے مگر بیوی [illegible] کان پڑے آواز سنائی [illegible] باہر [illegible]

خوف سے نہایت کم حجم کے ساتھ ریڈیو سن رہے ہیں۔ موسم ناخوشگوار ہے، ریڈیو کی کھڑکھڑ میں الفاظ سنائی نہیں دیتے۔ تقریر کے دوران میں کسی نے بجلی بند کر دی اور تقریر کا بہترین حصہ سنا نہ جا سکا۔ عین اناؤنسمنٹ کے وقت کسی نے اتنی زور سے دروازہ بند کیا کہ مقرر کا نام معلوم نہ ہو سکا۔ خاموش کمرہ میں صرف ایک شخص نہایت عمدہ ریڈیو پر مزہ میں تقریر سن رہا ہے۔ غرض ہزاروں گھروں میں مختلف حالات ہوتے ہیں۔ پلیٹ فارمی تقریر ناپسند ہوئی تو [illegible] نعرے بلند ہوئے اور مقرر سہم گیا۔ اسٹوڈیو کی تقریر بری لگی تو آپ نے اپنا ریڈیو بند کر دیا یا دوسری نشرگاہ کا پروگرام سننے لگے۔ مقرر پر رتی برابر بھی اثر نہ ہوا۔ نشری مقرر تعریف و تنقیص دونوں سے بے نیاز۔ اسٹوڈیو میں اس کی گنجائش نہیں کہ عین نشر کے وقت کوئی نیا خیال یا نکتہ یاد آیا اور مقرر اس کو بیان کرنے لگا۔ تقریر پہلے سے لکھی ہوئی اور ارباب نشر کی منظور کردہ ہوتی ہے۔ یہ بھی ممکن نہیں کہ اپنی تقریر کو مجمع کے مزاج کے مطابق فوراً ڈھالنے لگے۔ حاضرین کا ردعمل محسوس ہی نہیں ہوتا۔ نہ خیال بدلنا پڑتا ہے نہ لب و لہجہ نہ اختصار کی حاجت نہ طوالت کی ضرورت۔ مقررہ رفتار نشر میں کمی بیشی بھی نہیں کی جا سکتی۔ پندرہ منٹ کی تقریر کو پندرہ منٹ میں ختم کرنا ہے۔ جہاں تک سامعین کا تعلق ہے اسٹوڈیو کے مقرر کے مقابلہ میں پلیٹ فارمی مقرر کے پاس امکان کی دنیا ہی نہیں۔ ہال میں جو لوگ جمع ہیں ان کی شخصیت اور ردعمل دونوں محسوس ہوتے ہیں۔ اسٹوڈیو کے مقرر کے آگے امکانات کی بہت وسیع دنیا ہوتی ہے۔ ممکن ہے اس کی تقریر بادشاہ، وزیر اعظم، شاعر، فلسفی، طالب علم، چائے خانے والے، موٹر کے قلی، افسران بالا دست محنتی پیشے ور [illegible] غریب سن رہے ہوں۔ اس کے برخلاف ہال [illegible] لوگ [illegible] سامنے رہتے ہیں۔ حاضرین کی [illegible] تقریر [illegible]

آرٹس میں اسی لئے ان کے اصول بھی الگ الگ ہیں ان ہی اصولوں کے تحت مقرر کی شخصیت، تقریر کا عنوان، مواد و متن، اندازِ بیان زبان، لب و لہجہ، رفتار، آواز کا حجم وغیرہ خاص توجہ کے محتاج رہتے ہیں۔ ان میں سے کسی کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا اور اگر کیا گیا تو اس کا اثر مقرر اور ارباب نشر دونوں پر پڑے گا۔ تقریر اگر غیر دلچسپ یا غیر معیاری ہو تو صرف یہی نہیں ہو گا کہ سامعین مقرر کی قابلیت اور صلاحیت پر حملہ کریں گے بلکہ وہ ارباب نشر سے بھی پوچھیں گے کہ ایسے مقرر کو کیوں موقع دیا گیا۔

تقریری زبان

تقریر اور تحریر میں خواہ اس کا تعلق کسی زبان اور ادب سے ہو کافی فرق ہے۔ بہت سے الفاظ اور اشارے ایک کے لئے مناسب اور دوسرے کے لئے غیر موزوں اور غلط ہوں گے۔ اردو کی تحریروں میں اکثر "مندرجۂ ذیل" "مندرجہ بالا" "حسب ذیل" "مندرجہ صدر" جیسے الفاظ ملیں گے۔ ذیل، بالا اور صدر تو ایسی جگہ استعمال ہو سکتے ہیں جہاں کوئی رقبہ ہو۔ کاغذ کا جس پر لکھا جاتا ہے رقبہ ہوتا ہے اس کے اوپر اور نیچے والے حصے ہوتے ہیں مگر تقریر کا کوئی رقبہ نہیں۔ بات چیت میں ایسے الفاظ استعمال نہیں ہوتے۔ "بالا" اور "ذیل" کو "پہلے" اور "بعد" میں بدل دینا چاہیے۔ یا جملہ کو اس طرح ڈھال لینا چاہیے کہ اگلے یا پچھلے کا حوالہ معلوم ہو۔ چونکہ نشری تقریر پہلے سے لکھ لی جاتی ہے اس لئے لکھتے وقت عام طور پر تحریر کے اصول نظر کے سامنے رہتے ہیں۔ رو اور بے خیالی میں ایسے الفاظ لکھ لینا کوئی تعجب کی بات نہیں مگر یہ الفاظ مائکروفون پر بولے نہیں جا سکتے۔ اسی طرح چند اور مثالیں غور طلب ہیں۔

(الف) "پچھلے اوراق میں ذکر کیا گیا ہے" (ب) "آئندہ صفحوں میں بیان کیا جائے گا" (ج) "اوپر کی دلیلوں سے ثابت ہوتا ہے" (د) "نیچے کے استدلال سے یہ نتیجہ نکلے گا"۔ الف اور ب پر یہ واجبی اعتراض ہو گا کہ اوراق اور صفحوں کا ذکر کرکے سننے والوں پر تقریر پڑھنا ظاہر کیا گیا جس سے تقریر کی کافی قدر گھٹ گئی۔ ج اور د پر دونوں اعتراض ہوں گے یعنی رقبہ کا سوال اور پھر تقریر کا پڑھا جانا۔ ان جملوں کو اس طرح بدلا جا سکتا ہے۔ (الف) "اس سے پہلے ذکر کیا گیا ہے" (ب) "ابھی تھوڑی دیر میں بیان کیا جائے گا" (ج) "پچھلی دلیلوں سے ثابت ہوتا ہے" (د) "اگلے استدلال سے یہ نتیجہ نکلے گا"۔

اکثر تحریروں میں ہم کو کچھ حصہ قوسین میں ملے گا۔ بظاہر وہ حصہ نامکمل اور تشنہ محسوس ہو گا مگر تحریر کی بعض روایتوں سے ہم اتنے مانوس اور واقف ہو گئے ہیں کہ فوراً مطلب سمجھ میں آ جاتا ہے اور دراصل کوئی تشنگی نہیں ہوتی۔ مثلاً

"جہانگیر کا عہد حکومت (۱۶۰۵ - ۱۶۲۷) اپنی گوناگوں ترقیوں کی وجہ سے مغلوں کی تاریخ میں کافی امتیاز رکھتا ہے"

اس تحریر کو سمجھنے میں کسی کو کوئی دقت نہ ہو گی۔ مطلب واضح ہے۔ جملہ میں نہ تو کوئی غلطی ہے اور نہ ابہام۔ مگر یہی جملہ نشر کے لئے اس طرح لکھا اور پڑھا جائے گا۔

"جہانگیر کا عہد حکومت جو ۱۶۰۵ سے شروع ہو کر ۱۶۲۷ پر ختم ہوتا ہے اپنی گوناگوں ترقیوں کی وجہ سے مغلوں کی تاریخ میں کافی امتیاز رکھتا ہے"

قوسین کی ایک دوسری مثال دے کر ہم یہ ثابت کریں گے کہ قوسین کی وجہ سے مفہوم بدل سکتا ہے۔

• ہر ہفتہ داری میں [illegible]
[illegible]
[illegible]

جن کو معلوم ہے کہ میدک کو گلشن آباد بھی کہتے ہیں وہ تو سمجھ جائیں گے مگر جن کو علم نہیں وہ یہ تصور کر سکتے ہیں کہ مقرر سے کوئی غلطی ہوئی ہے۔ یا تو تلنگانہ میں تین صوبے ہیں یعنی (۱) میدک (۲) گلشن آباد (۳) ورنگل یا پھر ان تینوں میں سے کوئی ایک نام غلطی سے لیا گیا۔ شبہ نہ ہونے کی خفیف سی کوئی امید ہو سکتی ہے تو اس طرح کہ میدک اور گلشن آباد کو اس طرح ملا کر اور تیزی سے پڑھا جائے کہ دونوں ایک نام معلوم ہوں۔ قوسین حذف کر کے وضاحت کے ساتھ اس طرح بیان کیا جا سکتا ہے۔

"مرہٹواڑی میں دو صوبے ہیں۔ اورنگ آباد اور گلبرگہ
اسی طرح تلنگانہ میں بھی دو صوبے ہیں۔ ورنگل
اور میدک جس کا دوسرا نام" (یا" میدک کا دوسرا
نام") "گلشن آباد ہے"

ایک اور مثال پر غور کیجیے جہاں اردو ترجمہ قوسین میں دیا گیا ہے۔

"سائبیریا کے شمالی حصہ میں بہت کم جانور پائے
جاتے ہیں۔ رین ڈیر (بارہ سنگھا) سفید ریچھ،
لومڑی اور سیل (دریائی بچھڑا) قابل ذکر ہیں"

ایسے جملوں کو نشر کرتے وقت قوسین کا بدل لفظ "یعنی" ہوگا۔ یا پھر یہ کہا جا سکتا ہے "جس کا ترجمہ .... ہے" یا "جس کو .... میں .... کہتے ہیں" وغیرہ۔

میں ذاتی طور پر نشری تقریر میں اشارۂ قریب کا بہت مخالف ہوں۔ گو مقرر کی آواز سے جو ریڈیو پر سنی جاتی ہے یہ محسوس ہوتا ہے کہ مقرر بہت قریب ہے مگر اصل میں وہ ہوتا بہت دور ہے۔ مقرر جن افراد چیزوں یا مقامات کا نام لیتا ہے [illegible] بہت [illegible] ہوتے ہیں۔ [illegible]

"یہاں جو دریا بہتے ہیں ان میں مچھلی کثرت سے
پائی جاتی ہے۔ یہ علاقہ سائبیریا کے جنگلوں کا علاقہ
کہلاتا ہے۔ یہاں کے باشندے زیادہ ادھر ادھر
نہیں پھرا کرتے"

اشارۂ قریب تحریروں میں جائز ہو یا نہ ہو نشری تقریروں میں تو کبھی جائز نہیں سمجھا جائے گا۔ ذرا غور تو کیجیے جس مقام پر دریا بہتے ہیں، جن دریاؤں میں مچھلی کثرت سے پائی جاتی ہے، جو علاقہ سائبیریا کے جنگلوں کا علاقہ کہلاتا ہے، جہاں کے باشندے زیادہ ادھر ادھر نہیں پھرا کرتے ان میں مقرر میں اور سامعین میں کتنا فصل ہے۔ اگر ہم کسی خاص کمرہ کی کوئی خاص کتاب منگانے کے لئے کہیں تو اس طرح کہیں گے ـــــ "اس کمرہ میں جو کتابیں ہیں ان میں سے فلاں کتاب لاؤ"

ہم نے "اس" اور "ان" اس لئے استعمال کیا کہ کمرہ اور کتابیں ہم سے دور ہیں۔ بالکل اسی طرح مندرجۂ بالا جملہ میں بھی تبدیلی ہونی چاہیے کیونکہ زیر بحث مقام اور اشیا سامعین سے دور ہیں۔ جملہ کو اس طرح نشر کرنا چاہیے۔

"وہاں جو دریا بہتے ہیں، ان میں مچھلی کثرت سے
پائی جاتی ہے، وہ علاقہ سائبیریا کے جنگلوں کا علاقہ
کہلاتا ہے، وہاں کے باشندے زیادہ ادھر ادھر
نہیں پھرا کرتے"

یہ بات اور ہے کہ سائبیریا کے اس مقام پر جس کا ذکر کیا جا رہا ہے یہ جملہ سنا جائے تو سننے والے اشارۂ بعید کو کچھ عجیب سا محسوس کریں مگر نشر میں ہمیشہ اکثریت کا خیال رکھا جاتا ہے۔ "اس" "ان" "یہ" "یہاں" وغیرہ کا استعمال اکثر نشری تقریروں میں غلط محسوس ہوگا۔

[illegible]

یا یاد کرانے کے لئے بعض باتیں پیراگرافوں کے ساتھ نمبروں میں تقسیم کی جاتی ہیں۔ ان نمبروں کی وجہ سے یاد کر لینا یا ایک نکتہ کو دوسرے نکتہ سے الگ کرنے میں سہولت ہوتی ہے۔ اعلیٰ اور عمدہ تحریر کے مختلف خیالات اور مضامین میں نمبروں سے فرق اور امتیاز پیدا نہیں کیا جاتا۔ بلکہ پیراگراف بدلا جاتا ہے۔ اسی طرح نشری تقریر میں بھی کوشش کی جانی چاہیے کہ بلا وجہ نمبرات نہ دئے جائیں۔ نمبر کہنے سے ایک تو تقریر کی علمی قدر و قیمت گھٹ جاتی ہے دوسرے بعض صورتوں میں تو غلط فہمی کا بھی خدشہ ہے غلط فہمی کی ایک صورت یہ ہو سکتی ہے۔

"دشمن کے نقصانات یہ ہیں۔ (۱) دس ہوائی جہاز (۲) تین ٹینک (۳) چار موٹر دستے (۴) پانچ مشین گنیں"

اگر دس، تین، چار، پانچ کے ساتھ ایک، دو، تین، چار ملا کر پڑھا جائے تو اس کا امکان ہے کہ بعض سننے والے یہ سمجھیں کہ دشمن کے دس ہوائی جہازوں، دو تین ٹینکوں، تین چار موٹر دستوں اور چار پانچ مشین گنوں کا نقصان ہوا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ چیزوں کے نام اور تعداد بتانے سے پہلے نمبر ایک، نمبر دو، نمبر تین اور نمبر چار کہا جائے تو بعض سامعین اچھی طرح سمجھ لیں اور ان کو کوئی غلط فہمی نہ ہو مگر یہ بھی ممکن ہے نمبر کہنے کے باوجود کچھ لوگ سمجھنے میں غلطی کر جائیں۔ قطع نظر اس کے نمبرات کہنے میں جو وقت صرف ہوتا ہے اس کو کیوں نہ بچایا جائے۔ اعلیٰ نشری تقریر کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ کم سے کم الفاظ میں زیادہ سے زیادہ متعلقہ باتیں کہی جائیں۔ نمبروں کو حذف کر کے ایک جملہ میں اس طرح ادا کیا جا سکتا ہے کہ مطلب سمجھ میں آجائے ــــــ مثلاً "دشمن کے دس ہوائی جہازوں، تین ٹینکوں، چار موٹری دستوں اور پانچ مشین گنوں کا نقصان ہوا۔"

نمبروں کی اس لئے بھی ضرورت نہیں کہ پیراگرافوں کی حد بندی انداز بیان سے معلوم ہو جاتی ہے۔ ہر نئے پیراگراف کو ایک خاص انداز میں شروع اور ختم کیا جاتا ہے۔ دونوں کے درمیان مقررہ وقفہ ہوتا ہے۔ دوسرے یہ کہ نئے پیراگراف میں ایک نئی بات یا خیال پیش کیا جائیگا اور پچھلے پیراگراف کا تعلق بھی شامل رہیں یہ بات ثابت کر دیگی کہ مختلف پیراگرافوں کی حد کہاں [illegible]

شروع اور ختم ہوئیں۔

ایسی تقریروں کو جنھیں پیشہ ور ادیب لکھ کر فروخت کر دیتے ہیں اور خریدنے والا اپنے نام سے نشر کرتا ہے "گوسٹیڈ ٹاکس" Ghosted Talks کہتے ہیں۔ ہندوستان میں ایسے ادیب اور مقرر نہیں ہیں مگر معتمد یا مددگار تقریریں تیار کر کے دیتے ہیں۔ ایسی تقریروں میں اس کا خیال رکھنا چاہیے کہ الفاظ جس طرح ادا کئے جانے والے ہوں بالکل اسی طرح لکھے جائیں۔ اعراب لگا کر ان کا تلفظ سمجھانے میں مدد دیجئے ان کی تحریری اور تقریری شکل میں کوئی فرق نہ ہو۔ ذیل کی عبارت ملاحظہ ہو۔

"فنا ہونے کی دو حالتیں ہیں۔ ایک یہ کہ آہستہ آہستہ فنا ہوتی ہیں دوسرے اچانک حادثہ کی وجہ سے فنا ہوتی ہیں۔ مرنے کو انسان حیوان روز مرتے ہیں لیکن کبھی کوئی سخت حادثہ، بیماری یا جنگ ایسی پیش آجاتی ہے کہ کشتوں کے پشتے لگ جاتے ہیں۔"

اس تحریر میں بظاہر کوئی سقم یا کمزوری نہیں مگر یہ جب نشر کی جائیگی تو اس امر کے تحت کہ جو لفظ جس طرح لکھا گیا ہے اسی طرح پڑھا جائے لفظ "حادثہ" تلفظ پہلی اور دوسری مرتبہ بالکل ایک قسم کا ہو کیونکہ دونوں ایک طرح لکھے گئے ہیں۔ حالانکہ اصل میں پہلی مرتبہ "حادثے" پڑھا جائے گا اور دوسری مرتبہ "حادثہ"۔ ایک اور مثال ہے ــــــ "پلیگ ہیضہ اور انفلوئنزا نے لاکھوں جانیں تلف کیں" اس جملہ میں "ہیضہ" کو "ہیضے" پڑھا جائے گا۔

اگر کوئی تحریر سمجھ میں نہ آئے تو اس کو ایک سے چار مرتبہ پڑھئے ٹھیک ایک لفظ پر رک رک کر غور کرنے یا کسی اور سے مطلب پوچھنے کا موقعہ ملتا ہے نشر میں اس کی گنجائش نہیں۔ جو لفظ یا جملہ سمجھ میں نہ آیا یا وہ ہو سکا وہ ہمیشہ کے لئے گیا۔ اس لئے نشری تقریر تیار کرتے وقت اس کا خاص لحاظ رکھنا چاہیے کہ سننے والے کوئی دقت محسوس نہ کریں۔ [illegible]

"زید، بکر، عمرو اور خالد [illegible]
[illegible]
مطلب [illegible] حیثیت پر

غور کیجیے جس کو ناموں کی ترتیب یاد نہ رہی یا وہ رقم کی ترتیب بھول گئے۔ ترتیب کی ذرا سی لغزش سے ایک کا سرمایہ دوسرے کا ہو جائے گا۔ یہاں تک غلطی ہو سکتی ہے کہ زید کے چار سو روپے بکر کے ڈھائی سو عمرو کے سوا سو اور خالد کے صرف پچاس ہو جائیں۔ اگر ذیل کی طرح لکھا اور پڑھا جائے تو سننے والوں کو نہ تو دماغ پر بار ڈالنا پڑے گا اور نہ غلط فہمی کا زیادہ خدشہ رہے گا۔

"زید نے پچاس روپوں سے بکر نے سوا سو سے عمرو نے ڈھائی سو اور خالد نے چار سو سے کاروبار شروع کیا۔"

عام طور پر نشری تقریروں میں اعداد و شمار، روپے آنے پائی یا پونڈ شلنگ پنس نہ ہوں تو بہتر ہے۔ اگر ان کا بیان کرنا ناگزیر ہو تو تفصیل میں نہ جائیے بلکہ "تقریباً" کہہ کر ختم کر دیجیے۔ اس سے کیا فائدہ کہ آپ نے کہنے کو تو کہہ دیا کہ تنگبھدرا پراجکٹ پر اتنے لاکھ اتنے ہزار اتنے سو روپے اتنے آنے اتنی پائیاں صرف ہوئیں مگر کسی نے یہ یاد رکھنے کی بھی کوشش نہ کی یا یاد نہ رکھ سکا کہ رقم کتنے لاکھ تھی۔ حساب نہ تو یاد رہتا ہے اور نہ کوئی یاد رکھنا چاہتا ہے۔ ملکوں کا حدود اربعہ، وہاں کی آبادی، سڑکوں کا طول وغیرہ بیان کرنا بھی بے سود ہوتا ہے۔

تقریر کے جملوں کے متعلق کوئی خاص قاعدہ پیش نہیں کیا جا سکتا ہر لکھنے والے کا اپنا ایک اسلوب ہوتا ہے دوسرے یہ کہ تقریر کے موضوع کو بھی زبان میں دخل ہوتا ہے۔ طویل جملوں کا بھی وہی اثر ہو سکتا ہے جو مختصر جملوں کا ہوگا۔ کامیاب ناشر طویل جملوں کو بھی خوبی کے ساتھ ادا کر سکتا ہے اور مختصر جملوں کو بھی۔ اس کا دارومدار خود ناشر پر ہے۔ نیویارک ٹائمز کے ریڈیو ایڈیٹر نے سینیٹر ولیم ای بورہ Senator William E. Borah کی [illegible] والی تقریر پر تبصرہ کرتے ہوئے [illegible] لکھا تھا کہ اس کے جملے بہت مختصر [illegible]

اوون ڈی ینگ (Owen D. Young) ایک مشہور امریکی صناع ہیں انھوں نے ۹ر نومبر ۱۹۳۲ء کو ایک تقریر نشر کی تھی جس کے جملے طویل بھی تھے اور مختصر بھی۔ اس کے متعلق سننے والوں اور مشاق ناشروں کا خیال تھا کہ وہ بہترین نشری تقریر تھی۔ جملے چھوٹے ہوں یا بڑے سیدھے سادے ہوں یا پیچیدہ اس کا جواب خود ناشر کی تقریری صلاحیت دے سکتی ہے۔ چھوٹے جملوں کو اس بری طرح ادا کیا جا سکتا ہے کہ ایک لفظ سمجھ میں نہ آئے اور طویل جملوں کو اس خوبی اور عمدگی سے پیش کیا جا سکتا ہے کہ ایک ایک لفظ ذہن نشین ہو جائے۔ اتنا ضرور ہے کہ مختصر جملوں کی تقریر میں نسبتاً مواد کم ملے گا کیونکہ اس میں اختصار کی وجہ سے اسم فعل ضمیر وغیرہ زیادہ استعمال ہوں گے۔ جملے اگر چھوٹے ہوں تو زبان کو آسان بھی کیا جا سکتا ہے۔ اضافتیں بھی کم ہو جائیں گی۔

انداز بیان

نشری تقریر کی ترتیب کے بعد اس کا پیشکش بھی ایک اہم مرحلہ ہے۔ پیشکش کے سلسلے میں انداز بیان، رفتار نشر اور آواز کا حجم خاص اجزا ہیں جو اس کو کامیاب یا غیر دلچسپ بنا سکتے ہیں۔

انداز بیان کے متعلق کوئی بھی قطعی طور پر نہیں کہہ سکتا کہ وہ کیسا ہو۔ جس طرح کرکٹ کا بلّے باز گیند انداز کے ہاتھ سے گولا نکلتے ہی فیصلہ کر لیتا ہے کہ وہ گولے کو کس سمت میں مارے گا یا جس طرح فٹ بال کا کھلاڑی گولا قریب پہنچتے ہی اپنی شوٹ کا زاویہ متعین کر لیتا ہے بالکل اسی طرح تقریر تیار کرتے ہوئے یا تیار کرنے کے بعد مقرر کو یہ طے کر لینا چاہیے کہ اس کا انداز بیان کیا ہو۔ تقریر کی ترتیب اور پیشکش دونوں اہم اور مشکل ہیں۔ اچھے نشری مقرر ناکام ادیب اور [illegible] ممتاز ادیب غیر دلچسپ ناشر ثابت ہوئے ہیں [illegible]

ان کا خیال ہے کہ اب بھی جب کہ نشریات کو اتنی مقبولیت حاصل ہوگئی ہے بہت کم نشری مقرر کامیاب کہے جا سکتے ہیں۔ مسٹر ویسن اے۔ ڈنسٹر کو بہترین مقرر سمجھتے ہیں اگر میں اناؤنسر نہ ہوتا تو اس معاملہ میں اپنی رائے ضرور دیتا۔ جس طرح ہر شخص کے لکھنے کا طرز الگ الگ ہوتا ہے اسی طرح بولنے کا انداز بھی جدا جدا ہوتا ہے اس کے باوجود چند اصول مشترک ہیں مثلاً یہ کہ انداز بیان متن کی مناسبت سے ہو ہر لفظ واضح طور پر ادا کیا جائے، موزوں لفظ پر زور دیا جائے، جملوں اور پیراگرافوں کے درمیان مناسب وقت وقفہ کے طور پر لیا جائے وغیرہ۔ یہ بتانے کی تو شاید ضرورت نہیں کہ نشر میں "فٹ نوٹ"، "حاشیہ" اور "غلط نامہ" وغیرہ نہیں ہوتا۔

نشر کی رفتار

نشری تقریر کی رفتار کا تعلق تقریر کے موضوع اور مقرر کے اپنے انداز بیان سے ہے۔ ایک مقرر مساوی ضخامت کی دو مختلف تقریروں کو مختلف دوران میں ختم کر سکتا ہے۔ ہر ایک کی صوتی شخصیت (Voice Personality) جدا ہوتی ہے۔ مقرر کا منہ ایک مشین گن ہے جس سے مسلسل الفاظ نکلتے رہتے ہیں۔ ان الفاظ کا اچھی طرح سنانا اور سمجھ میں آنا ضروری ہے۔ رفتار میں یکسانیت رکھنا ہمیشہ مفید ہوگا مگر نہ اس طرح کہ خیال اور اظہار خیال میں فرق ہو جائے۔ ایک امریکی ماہر کا کہنا ہے کہ دو ہزار دو سو پچاس الفاظ کی انگریزی تقریر پندرہ منٹ میں خوبی کے ساتھ پڑھی جانی چاہیے۔ امریکہ کے ایک مشہور مبصر مسٹر لاول ٹامس دو ہزار چار سو الفاظ کی تقریر کے لئے تیرہ منٹ لیتے ہیں۔ ان سے زیادہ تیز پڑھنے والے اسی دوران میں پچیس سو سے اٹھائیس سو الفاظ تک ادا کرتے ہیں۔ انداز بیان اور رفتار نشر کے معاملہ میں دو مقرروں کی تقلید سود مند نہیں ہو سکتی۔

حجم

رفتار بتانے کے لئے موٹر میں ایک میٹر لگا ہوا ہوتا ہے جس کو اسپیڈو میٹر کہتے ہیں۔ جیسے جیسے موٹر کی رفتار گھٹتی یا بڑھتی جاتی ہے اسپیڈو میٹر کی سوئی صفر کی طرف پیچھے ہٹتی یا آگے بڑھتی جاتی ہے۔ اگر موٹر چالیس میل کی رفتار سے دوڑ رہی ہو تو میٹر کی سوئی چالیس کے ہندسہ پر قایم رہے گی بالکل اسی طرح ایک "پروگرام میٹر" ہوتا ہے۔ مگر یہ میٹر رفتار نہیں بلکہ آواز کا حجم (Volume) ظاہر کرتا ہے۔ جس طرح کسی ٹھوس چیز کا وزن ہوتا ہے اسی طرح آواز کا بھی وزن ہوتا ہے جس کو ہم حجم کہتے ہیں۔ آواز چاہے مقرر کی ہو یا مطرب کی، جان دار کی ہو یا کسی بے جان کی اپنا وزن یعنی حجم رکھتی ہے۔ پروگرام میٹر کا کام اسی کو پیش کرنا ہے۔ موٹر کا میٹر ایک حد تک اور کچھ وقفہ تک ایک ہی ہندسہ پر قایم رہ سکتا ہے مگر انسان نہ تو ہمیشہ ایک ہی حجم سے بولتا ہے اور نہ حجم کو قایم رکھ سکتا ہے اس لئے پروگرام میٹر کی سوئی بھی آگے بڑھتی اور پیچھے ہٹتی رہتی ہے۔ جس وقت تک زبان سے الفاظ یا اسٹوڈیو سے آوازیں نکلتی رہیں گی پروگرام میٹر کی سوئی کام کرتی رہے گی۔ جب بالکل خاموشی ہو جائے گی سوئی صفر پر آجائے گی۔ تقریر میں ایسے بہت سے موقع نکلتے ہیں جب کہ کچھ بھی سنائی نہیں دیتا —— مقرر سانس لینے کے لئے، لب و لہجہ بدلنے کے لئے یا کسی اور ضرورت سے سکنڈ کے پچاسویں حصہ کے لئے بھی رک جائے تو سوئی صفر پر آجائے گی۔ مقررین کا یہ جان لینا ضروری ہے کہ آواز کا حجم گھٹتا کیوں ہے۔ مقرر کی آواز کی صلاحیت، مائکروفون کی قوت حس اور اسٹوڈیو کے فضائی حالات (Acoustics) کے علاوہ مقرر اور مائکروفون کا درمیانی فاصلہ [illegible] چونکہ مناسبت سے فاصلہ [illegible]

کچھ دیر بعد محسوس ہوا کہ آواز کے حجم میں فرق ہوگیا ہے۔ اس فرق کے کئی اسباب ہو سکتے ہیں مثلاً

(الف) مقرر نے معینہ فاصلہ کو نظر انداز کردیا اور مائکروفون سے زیادہ قریب ہوگیا جس کی وجہ سے آواز کا حجم بڑھ گیا۔

(ب) مقرر مائکروفون سے دور ہوگیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ حجم گھٹ گیا ـــــ فاصلہ بڑھ جائے تو حجم گھٹ جائے گا اور کم ہو جائے گا تو حجم بڑھ جائے گا۔

(ج) باہمی فاصلہ پہلے کی طرح قایم ہے مگر تقریر کے دوران میں مقرر نے ایک دم بلند آواز میں بولنا شروع کردیا۔

(د) ایک دم آواز دھیمی کردی اور بہت آہستہ بولنے لگا۔

(ہ) مقرر نے اس کو جس زاویے سے بٹھایا گیا تھا، اسے بدل دیا یا صرف اپنا منہ پلٹا لیا یا اپنے اور مائکروفون کے درمیان کوئی چیز حائل کردی۔

مائکروفون کے فاصلہ اور آواز کی کمی بیشی حجم کے فرق کو پروگرام میٹر اور ریڈیو پر محسوس کرا سکتی ہے۔ پروگرام میٹر میں ایک کھٹکا لگا ہوتا ہے جس کو فیڈر یونٹ (Fader unit) کہتے ہیں۔ پروگرام میٹر کے قریب بیٹھ کر جو انجنیر کام کرتا ہے وہ میٹر کو نہایت غور سے دیکھتا رہتا ہے۔ موٹر ڈرائیور یا انجن ڈرائیور اپنی مشین کی رفتار سے بے اعتنائی نہیں برت سکتا کیونکہ یہ بے اعتنائی دعوتِ خطر ہے۔ پروگرام میٹر سے لاپروائی کرنے میں بھی خطرہ ہے۔ انجنیر یہ دیکھتا رہتا ہے کہ جس قدر بلند آواز سے بولنا یا گانا چاہیے اس سے تجاوز تو نہیں کیا جا رہا ہے۔ اگر تجاوز محسوس ہو تو آواز کو کم کردے گا یا اگر آواز دھیمی ہو تو اس کو ممکنہ حد تک بلند کردے گا۔ یہ دونوں کام فیڈر یونٹ کے ذریعے کیے جاتے ہیں [illegible]

جس قدر بلند کرسکتا ہے اس سے زیادہ کنٹرول انجنیر کرسکتا ہے۔ انجنیر آواز کو دھیمی اور ناقابلِ سماعت بھی کرسکتا ہے۔ مقرر دورانِ نشر میں اپنی آواز بلند کردے تو اس کا لہجہ بدل جائے گا اور اگر کنٹرول انجنیر بلند کردے تو مقرر کا لب و لہجہ تو اسی طرح قایم رہے گا البتہ مقرر کے قریب سے بولنے کا احساس ہوگا۔ مقرر آہستہ بول رہا ہو تو کنٹرول انجنیر اس کو کنٹرول کرتے ہوئے صرف تیز اور آہستہ کرسکتا ہے۔ ایسی صورت میں بھی مقرر کا لہجہ اسی طرح قایم رہے گا مگر یہ احساس ہوگا کہ مقرر کسی دور مقام سے بول رہا ہے۔ فیڈر کے ذریعہ آواز بلند یا دھیمی کی جاسکتی ہے۔ دوسرے الفاظ میں حجم گھٹایا اور بڑھایا جاسکتا ہے مگر اس کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔ ایک موٹر ایک گیلن پٹرول میں ستائیس میل چلتی ہو تو اس کو اور ٹھیک ٹھاک کرکے یا کچھ پرزے بدل کر ایک گیلن میں تیس بتیس میل چلایا جاسکتا ہے مگر یہ نہیں ہوسکتا کہ وہ چالیس پینتالیس میل یا اس سے زیادہ جانے لگے۔ بالکل اسی طرح مقرر کی آواز میں قدرتی صلاحیت ہوتی ہے بعض طالبِ علم چیخ کر پڑھتے ہیں۔ بعض آہستہ بولتے ہیں، کسی جماعت کے طالب علموں سے مضمون پڑھوا کر دیکھئے آپ کو بلند اور پست آواز کا فرق معلوم ہوگا یا گھر کے دو چار بچوں کو کھیلتے وقت یا آپس میں گفتگو کرتے وقت سنئے۔ دیکھئے سب کے سب مختلف لہجوں سے باتیں کریں گے۔

اسٹوڈیو میں مکمل خاموشی ہونے کے باوجود بہت سی ہلکی آوازیں ایسی نکلتی رہتی ہیں جو مقرر کو محسوس نہیں ہوتیں۔ اگر آواز کا حجم بہت کم ہو اور اس کو فیڈر زیادہ کھول کر بلند کیا جائے تو اسٹوڈیو کی خفیہ آوازیں مثلاً مقرر کی سانس کی آواز، ہونٹوں کے ملنے کی آواز، صفحہ الٹنے کی صدا وغیرہ سنائی دینے لگیں۔ ان خفیہ آوازوں کے کھل جانے سے مقرر کی آواز خراب [illegible]

ہو جائے گی [illegible] دی ہوئی کر دی ہو تو وہ صرف اس حد تک بڑی کروائی جا سکے گی جتنی کہ اس کے شیشے (Negative) میں صلاحیت ہے۔ صلاحیت سے زیادہ بڑی کروائی جائے تو خراب اور ہلکی ہو جائے گی۔ دوسرے عیب مثلاً دھبے وغیرہ دکھائی دیں گے۔ تالاب کا بند باندھا جاتا ہے۔ پانی خارج کرنے کے لئے اس میں چند دروازے لگائے جاتے ہیں۔ اگر تالاب میں پانی زیادہ ہو جائے تو ان دروازوں کو کھول دیا جاتا ہے مگر وہ جتنے کھولے جائیں گے اتنا ہی پانی خارج ہوگا۔ فیڈر کو دروازہ اور آواز کو خارج ہونے والا پانی سمجھئے۔ تالاب کا پانی زیادہ ہو جائے تو بند اور دروازے توڑ کر نکل جائے گا۔ آواز ضرورت سے بہت زیادہ ہو تو اس سے ٹرانسمیٹر کو نقصان پہنچے گا جس کو سائنس کی اصطلاح میں (over modulation) کہتے ہیں۔ میں یہ سمجھانے میں کافی مشکل محسوس کر رہا ہوں کہ آواز کا حجم کتنا ہو۔ مضمون کے ذریعہ کم اور زیادہ حجم کا فرق اور اس کے اچھے برے اثرات سمجھائے جا سکتے ہیں مگر خود حجم کو الفاظ میں قید نہیں کیا جا سکتا۔ اس کا تعلق آواز کی عملی دنیا سے ہے۔

مرزا ظفر الحسن

(باقی آئندہ)

برکھا رت

رت ہے سہانی مست ہوا ہے
مست ہوا میں ساری فضا ہے
ڈالی ڈالی جھوم رہی ہے
دنیا ساری ناچ رہی ہے
برکھا کی پھر رت ہے آئی!

اودے اودے، کالے کالے
دیکھو بادل آئے، چھائے
پھر وہ پپیہا پی پی بولے
کوک کوئل کی ہوئے ہولے
برکھا کی پھر رت ہے آئی!

گونجے بلبل کے نغمے ہیں
بھونرے کے کیا کہنے ہیں
روٹھے من بھی آج منے ہیں
غنچے چٹک کر پھول بنے ہیں
برکھا کی پھر رت ہے آئی!

پی، پی پپیہا کی سن سن کر
دل میں درد اٹھے رک رک کر
اور کوئل کی کو، کو سن کر
آنکھوں میں آنسو آئے بھر کر
برکھا کی پھر رت ہے آئی!

بلبل کے نغمے نالے ہیں
بھونرے کے گیت تو بس نالے ہیں
آنسو برستے آج ملے ہیں
جو نہیں تھمنے والے ہیں
برکھا کی پھر رت ہے آئی!

[illegible]

اندازِ عمل

(عرب کی بہیمیت و بربریت)
"ایک طویل نظم کے چند بند"

اہلِ دانش کو تحیر ہے کہ وہ ملکِ عرب　　جہل و افلاس کا رہتا تھا جہاں لہو و لعب
حسنِ اخلاق، نہ تہذیب، نہ کچھ علم و ادب　　ایک ویرانہ تھا معمورۂ آلام و تعب
جور و بیداد کا افسانہ فضا کہتی تھی
خوف و دہشت کی اسی بن میں بلا رہتی تھی

منزلوں سایۂ اشجار نہ پانی کا نشاں　　اس پہ گرمی وہ ستم کی کہ نہیں تابِ بیاں
ریگِ تفتہ سے ہوئے جاتے تھے ذرّے بریاں　　اخگرِ کورۂ حداد کا تھا جن پہ گماں
قلب بھنتے تھے، جگر بر میں طپاں رہتے تھے
ایسے آلام میں یہ سوختہ جاں رہتے تھے

دستِ مفلس کی طرح رہتے تھے خالی جنگل　　جس طرف دیکھا، نظر آتا تھا میداں چٹیل
اگر ایسا ہی نمو نے کیا پرزورِ عمل　　جھنڈ اگ آئے ببولوں کے یہ ہاتھ آیا پھل
آفتیں قحط کی ہر سال جو پیش آتی تھیں
کھیتیاں زیست کی پامال ہوئی جاتی تھیں

آب نایاب تھا اک ریگ کا دریا تھا رواں　　نام چشمے کا کہیں اور نہ کہیں کوئی کنواں
ابرِ رحمت سے اگر بھر گئے چھتر اس آن　　ہوگئی عید، ملا راحت و عشرت کا نشاں
ایک میلا سا لبِ آب لگا رہتا تھا
گدلے پانی کو جو دریائے لبن کہتا تھا

کملیاں تان کے آ بستے تھے پانی کے قریں　　پہلے جو آتا تھا ہو جاتی تھی مِلک اس کی زمیں
بعد والوں کو نہ ملتی تھی جگہ جب کہ کہیں　　خانۂ حسرت و اندوہ کے ہوتے تھے مکیں
تلخیاں سہتے تھے اور خونِ جگر پیتے تھے
قابضِ آب کے الطاف پہ یہ جیتے تھے

دور دست اور قبائل جو رہے ان کے سوا　　قابضِ آب کے قبضے ہی میں تھی ان کی بقا
منتیں کرنے پہ جب اذن انھیں ہوتا تھا　　مردہ اجسام میں آجاتی تھیں جانیں گویا
آئے دن جانِ عطش کے جو الم سہتی تھی
آمد و رفت لب آب یونہی رہتی تھی

ایسے آلام و مصائب میں یہ تھا ان کا حال　　شعلہ خو، عربدہ جو، مستعدِ جنگ و جدال
یونہی سی بات بڑھی اور انھیں آیا جلال　　کشت و خوں ہونے لگا خون سے میداں ہوا لال
رن وہ پڑتے تھے کہ صدہا کے گلے کٹتے تھے
دشت پٹجاتا تھا کشتوں سے تو جب ہٹتے تھے

کبھی گھڑ دوڑ میں ان بن ہوئی تکرار بڑھی　　فیصلے کے لئے شمشیرِ شرر بار بڑھی
اور کبھی گھاٹ کے جھگڑے پہ یہ گفتار بڑھی　　لڑنے مرنے کے لئے قومِ جفا کار بڑھی
تیغ کے گھاٹ سے جانیں اماں پاتی تھیں
زورقیں عمر کی ڈوبی ہوئی رہ جاتی تھیں

تغلب و بکر کی آپس میں نزاعِ لفظی　　بڑھتے بڑھتے ہوئی یہ حد کہ کٹی نصف صدی
مٹ گئے نام قبائل کے چھڑی جنگ ایسی　　مدتوں ملک میں اک آگ پڑی بھڑکا کی
مرغِ وحشی قفسِ تن سے اڑے جانوں کے
شمعِ ارماں کے قریں ڈھیر تھے پروانوں کے

بارشِ خوں یہ نہ تھی سیم و گہر کی خاطر　　نہ یہ کوشش تھی بلاؤں سے مفر کی خاطر
خوں فشانی یہ نہ تھی دردِ جگر کی خاطر　　نہ یہ ہنگامہ کسی دفعِ ضرر کی خاطر

یہی علت تھی کہ سب علم سے بیگانے تھے
جہل کے دیو تھے، کج فہم تھے، دیوانے تھے

آپ ہی آپ رہا کرتے تھے اکثر تن تن　　ان کے اجناس خصائل میں معائب کے تھے تن
چین سے بیٹھنے کی تھی نہ کسی وقت بھی دھن　　ان کے نغمات مفاسد کی شرانگیز تھی دھن
رقص بسمل کے تماشے یہ پسند آتے تھے
ٹھٹ کے ٹھٹ گھاٹ یہ شمشیر کے لگ جاتے تھے

فرش تھا پاس نہ کچھ اور ہی سامان گزر　　کملیاں دوش پہ رہتی تھیں فقط آٹھ پہر
وہی بستر تھیں، وہی فرش، وہی پردۂ در　　اور وہی وقت ضرورت تھیں بجائے چادر
وہی اونٹوں پہ کسی جاتی تھیں محمل کی طرح
وہی بارش میں بھی کام آتی تھیں منزل کی طرح

دوش ہستی پہ دھرے جہل کے یہ پشتارے　　لیے پھرتے تھے اس دشت میں مارے مارے
وحشیوں کے سے تھے اخلاق و خصائل سارے　　گھاٹیاں گونج اٹھیں مل کے جو نعرے مارے
بز کوہی تھے پہاڑوں میں تھا مسکن ان کا
بربریت سے نجس رہتا تھا دامن ان کا

شہ نشینیں تھیں، نہ رہنے کو محل اور نہ قصور　　نہ امارت کا حشم اور نہ حکومت کا ظہور
نہ کہیں دبدبۂ شان و شکوہ تیمور　　ان کی ایام گزاری کا عجب تھا دستور
بے نتھے بیل تھے جو چاہتے تھے کرتے تھے
آئے دن آپ ہی آپس میں کٹے مرتے تھے

حسن اخلاق نہ تہذیب نہ رسم تعظیم　　نہ تمدن کا چمن اور نہ اوامر کی نسیم
نہ سیاست کے شگوفے نہ عطا کی تسنیم　　چتر اجلال کہیں اور نہ تخت و دیہیم
فوج ہی فوج تھی جس کا کوئی سردار نہ تھا
کوئی اس قافلے کا قافلہ سالار نہ تھا

سید ابو القاسم سرور

گل بوٹے

ہمارے ایک دوست کو کرایے کے مکان کی ضرورت تھی، ایک روز ہمیں ان کی ہمرکابی کی عزت حاصل ہوئی اور علی الصباح مکان کی تلاش میں نکل پڑے کئی مکان دیکھ ڈالے مگر ایک بھی پسند نہ آیا۔

مارکٹ کی شان دار گھڑی ٹن ٹن بارہ بجا رہی تھی کہ ایک مکان پر "کرایہ پر دیا جاتا ہے" دیکھ کر موٹر سے اتر پڑے اور کمپونڈ میں داخل ہوئے۔

پہلی نظر ایک بھینس پر پڑی جو ورانڈے کے کھمبے سے بندھی ہوئی تھی، دوسرا کھمبا ایک بکری کی حفاظت کر رہا تھا۔ ورانڈے کے قریب جا کر ہم نے پکارا۔

"کوئی ہے؟"

دروازے کا ایک پٹ کسی قدر کھلتا نظر آیا، اندر سے کسی نے جھانکا اور نہایت فصاحت سے فرمایا "اوئی ماں مٹی پڑو دو مردوے کھڑیں، اری مردار گل بہار! جا دیکھ! باہر تیرے کون باوایاں آئیں؟" ایک چھوٹی سی آٹھ برس کی گل بہار باہر نکلی اور ہم سے پوچھا۔

"کون ہے کیا ہونا"؟

ہم نے کہا "کسی مرد کو بھیجو مکان دیکھنے آئے ہیں، کرایہ پر لینا چاہتے ہیں"!

اندر سے آواز آئی "بس یہی کام ہے! تو آتا میں آتا مکان میں کیا ہیرے موتی جڑیں! مکان سری کا مکان ہے! جا بول مردوا نیرے سرکار کو"!!!

اس اثنا میں ہمیں ورانڈے کی آرائش پر غور کرنے کا جو موقع ملا تو ہم نے صاحب خانہ کے سلیقہ کی دل ہی دل میں خوب داد دی، ایک تخت پر دسترخوان بچھا ہوا تھا جس پر چند پلیٹ اور چمچے بکھرے پڑے تھے، ایک صراحی جو صافی سے بے نیاز تھی ایک طرف رکھی ہوئی تھی، صراحی سے لگا ہوا ایک المونیم کا گلاس تھا جو ایک عرصہ سے شرمندۂ صفائی نہ ہوا تھا، تخت سے ذرا ہٹ کر ایک "کموڈ" فوری امداد کے لئے تیار رکھا تھا تخت کے نیچے جوتی، بھوسے اور بنولے کے دوچار تھیلے پڑے تھے، ایک کونہ میں ہری گھاس اور کچھ "برگ سبز" اپنے اندر "معرفت کردگار" کا ایک دفتر لئے ڈھیر ہو رہے تھے، دیوار پر چار انگرکھے کچھ کرتے، پاجامے اور لنگیاں لٹکی ہوئی تھیں، الگنی پر ساڑیاں ہوا کھا رہی تھیں۔

ورانڈے کی اس آرائش و زیبائش کو ہم ابھی بنظر غور دیکھ ہی رہے تھے کہ "گل بہار" کے مولوی نما سرکار برآمد ہوئے۔ سر پر شاندار عمامہ اور اس کے نیچے ایک فٹ کی گھنی کھچڑی داڑھی، ہاتھ میں جلتے تنکوں کی لانبی تسبیح، جسم پر ڈھیلا ڈھالا کرتہ، ٹانگوں میں ٹخنوں سے اونچا شرعی پاجامہ، کاندھے پر تیلیا رومال۔

ہمیں دیکھ کر مولویانہ انداز سے "سلام علیکم" کہا، سلام کا جواب دے کر ہم نے اپنے آنے کی وجہ بتائی اور مولانا کے حسب الحکم ہم ان کے پیچھے ورانڈے سے ملے ہوئے ایک کمرے یا مولانا کے "ڈرائنگ روم" میں داخل ہوئے۔

صوفوں اور کرسیوں کے عوض اس کمرے میں ہم نے چند نادر چیزیں دیکھیں۔ مثلاً اناج کے تھیلے، مرچ اور املی کے بورے، غلہ رکھنے کے ڈبے، گھی اور تیل کے پیپے، تمباکو کے گٹھے، آم کے اچار کے مٹکے اور مربے کے کئی روغنی گھڑے، غرض کہ کمرہ کیا تھا "نانک رام" کی دوکان تھا، اس کمرے کے دونوں جانب چھوٹے چھوٹے دو کمرے تھے، ایک مولانا کی عبادت گاہ معلوم ہوتا تھا، اس میں ایک طرف

مصلّے بچھا ہوا تھا، اور ایک کونے میں چند کتابیں منوں گرد و غبار کے نیچے دبی پڑی تھیں، دوسرے کمرے میں "گل بہار" کی بیگم صاحبہ "گل بہار" سے یوں مخاطب تھیں۔

"اری حرام زادی! ایسچ پیاز کاٹتی! چھلٹہ (چھلکا) تک بروبر (برابر) نیں (نہیں) نکلا۔ کیری کے ٹکڑے دیکھو کاٹی سو!! اری مردار، نحام پارہ، کام چور نوالے حاضر! کیسے دیکھتے بڈی (بڈھی) ہوگئی پن تیرے کو ابی (ابھی) تک پیاز کاٹنا آیا نہ کیری کترنا آیا۔ اب تو مکان میں لوگاں (لوگ) ہے بول کو چپ بیٹھیوں، ماری نیں پھر کو ایسچ کری تو مارتے مارتے فرش کر دیوں گی، اتے (اتنے) جوتیاں ماروں گی سر میں ایک بال بی نیں ہوں گا سمجھ کو ہوا!! ایک دن تیری ناک چوٹی کاٹ کو گھر سے بارہ (باہر) دھکیلے باہر نیں کر دی تو میرا نام پلٹ کو رکھنا!!!"

اس پرلطف گفتگو میں ہم کچھ ایسے محو ہو گئے کہ گھر دیکھنے کے عوض جی چاہ رہا تھا کہ بس ان "ارشادات عالیہ" کے انمول موتیوں سے اپنا دامن بھرتے جائیں، مولانا کی بے چینی سے ظاہر ہوتا تھا کہ کسی صورت ہم کو جلد دفع کرنا چاہتے ہیں، مگر ہم وقت کی "نزاکت" کا خیال کر کے ہر کمرے کو بڑے اطمینان سے دیکھ رہے تھے۔ مولانا کے "تیور" کہہ رہے تھے کہ وہ "غیر محرموں" کا ان کی ایک عدد "محرم" کی پرائیوٹ "گفتگو سننا مولانا پر بڑا شاق گزر رہا تھا مکان کا معائنہ ہم نے ختم ہی کیا تھا کہ اندر سے ارشاد ہوا۔

"اری مردار جا دیکھ!! وہ موئے ڈی کئے گئے نئیں؟ اندر بیٹھے بیٹھے خفکان (خفقان) ہو گیا! سرکار سے پوچ (پوچھ) کو آ "آج کھانا کھاتیں یا بھکے (بھوکے) رہتیں؟ ہنڈیاں چلے (چڑھے) پڑیں ہوئد (اُدھر) اپنے ٹھک ٹھک کو مکان بتا رئیں!!"

"باغبان"

"بھولنے والے سے"

زمیں پر زندگانی بدلیاں جس وقت برسائیں
ربابِ آسمانی پر ستارے مل کے جب گائیں
درِ میخانہ جس دم چھاؤں میں تاروں کے کھل جائے
سحر کے راگ کا دیوتا رسیلے سُر میں جب گائے
مہکتی بُو فضا جس وقت خوشبوئے گُلِ تر سے
گھٹا برسات کی میدان میں جب جھوم کر برسے
تو پھر اے بھولنے والے ہمیں بھی یاد کر لینا!

کوئی سازِ جنوں پر زندگی کے راگ جب گائے
سنہری وادیوں میں کیف کی بجلی سی لہرائے
چمن میں ڈالیوں پر جب پرندے چہچہاتے ہوں
کنارِ آب جو مہکے ہوئے جھونکے جب آتے ہوں
دلوں میں ولولے اٹھ اٹھ کے جب بے چین کرتے ہوں
بہارِ رنگ و بو کے جس گھڑی گیسو سنورتے ہوں
تو پھر اے بھولنے والے ہمیں بھی یاد کر لینا!

نہالِ تازہ جب رقص ہوا سے جھوم کر مچلیں
جگا دیں خواب سے روحوں کو جب گاتی ہوئی شامیں
ہوائیں رقص کرتی ہوں، فضا جب گنگناتی ہو
کوئی آنکھوں میں پھرتا ہو کسی کی یاد آتی ہو
تو پھر اے بھولنے والے ہمیں بھی یاد کر لینا!

جوہر فریادی

نئی کتابیں

۱۔ تینتس دن میں اردو۔ (اردو، ہندی، انگریزی اور بنگلہ ایڈیشن) قیمت ۱۲ر مینیجر شمسی پریس بکڈپو گیا۔

۲۔ الف لیلیٰ کی ایک رات (افسانے) قیمت ۸ر مکتبۂ بہار۔ گیا۔

۳۔ کیا خوب آدمی تھا (مشاہیر کی نسبت ریڈیائی تقریریں) حجم ۱۲۰ صفحے قیمت ۸ر حالی پبلشنگ ہاؤس۔ دہلی۔

۴۔ قلم نما (قلم کے متعلق تنقیدی مضامین) از نصیر الدین ہاشمی حجم ۸۸ صفحے قیمت ۶ر کتاب خانہ۔ عابد روڈ

۵۔ اقبال کشیدہ کاری (سلائی کے نمونے اور طریقے) مرتبہ ادارہ سہاگ قیمت عہ۔ سہاگ انڈسٹری ہاؤس۔ بلال گنج لاہور۔

۶۔ شہد کی مکھیوں کا کارنامہ از نواب منظور جنگ ۹۶ صفحے قیمت مجلد ۱۲ر کتاب خانہ۔ عابد روڈ۔

۷۔ تذکرۂ حبیبی حصہ اول و دوم (شاہ حبیب حیدر قلندر کے حالات) حجم ۲۹۲ صفحے قیمت ئے۔ کتب خانہ انوریہ۔ کاکوری، لکھنو

۸۔ براہین وحی از محمد حسین عرشی و محمد اقبال حجم ۱۰۲ صفحے قیمت عہ دفتر امت مسلمہ۔ امرت سر۔

۹۔ گناہ کے افسانے از خوشتر قیمت عہ۔ پریم شاستر بکڈپو۔ لاہور

۱۰۔ میں افسانہ کیونکر لکھتا ہوں۔ مرتبہ حکیم محمد یوسف حسن قیمت عہ اردو اکیڈیمی پنجاب۔ لاہور

۱۱۔ کلیات اکبر تین حصے (جدید ایڈیشن) از اکبر الہ آبادی قیمت للعہ کتاب خانہ۔ عابد روڈ۔

۱۲۔ شب حسرت دو جلد (ناول) از تیرتھ رام فیروزپوری قیمت عہ دائرہ ادبیہ۔ لاہور۔

۱۳۔ گناہ کی راہ (ناول) از تیرتھ رام فیروزپوری قیمت عہ۔ دائرہ ادبیہ لاہور

۱۴۔ گسٹاپو (ناول) مترجمہ بشیر احمد حجم ۲۲۴ صفحے قیمت عہ۔ ہاشمی بکڈپو لاہور

۱۵۔ پارس (افسانے) از گورکھ ناتھ حجم ۱۶۰ صفحے قیمت عہ کتاب خانہ عابد روڈ۔

۱۶۔ خانہ بربادی (افسانے) از میاں وجودی حجم ۲۰۰ صفحے قیمت ۱۲ر دائرہ ادبیہ۔ لاہور

۱۷۔ طوفان (افسانے) از رابندرناتھ ٹیگور حجم ۲۴۰ صفحے قیمت ۱۲ر دائرہ ادبیہ۔ لاہور

۱۸۔ وفا کی انتہا (ناول) مترجمہ میر حسین علی حجم ۱۰۸ صفحے قیمت ۱۲ر دائرہ ادبیہ۔ لاہور

۱۹۔ پاکیزہ محبت (ناول) از ملک راج حجم ۲۴۸ صفحے قیمت عہ دائرہ ادبیہ۔ لاہور

۲۰۔ بھوک (افسانے) از حمید الدین حجم ۱۲۸ صفحے قیمت عہ دائرہ ادبیہ۔ لاہور

۲۱۔ محقق خاتون (ناول) از حاجی حفیظ الدین ۲۴۴ صفحے قیمت عہ دائرہ ادبیہ۔ لاہور

۲۲۔ ذرۂ عظیم (ناول) مترجمہ برج کماری ۱۳۶ صفحے قیمت عہ دائرہ ادبیہ۔ لاہور

۲۳۔ طوفان جنگ (تاریخی ناول) از شیو برت لال ۲۲۲ صفحے قیمت عہ۔ دائرہ ادبیہ۔ لاہور

۲۴۔ لکھنوی پریاں (ناول) از حامد حسین ۲۰۰ صفحے قیمت عہ دائرہ ادبیہ۔ لاہور۔

۲۵۔ جوش وطن (قومی نظمیں) از الوپ چند آفتاب قیمت ۱۲ر از مصنف رسی پاتی

۲۶۔ محاسن سجاد (سوانح محمد سجاد مرحوم) مرتبہ مسعود عالم ندوی قیمت عہ الہلال بکڈپو بانکی پور۔ پٹنہ

میرزا سیف علیخاں

تنقید و تبصرہ

سالنامہ رسالہ جدید اردو باتصویر بابت ۱۹۴۱ء

مرتبہ پرویز شاہدی و محمد ظہور احسن قاضی حجم ۱۰۴ صفحات قیمت ۱۲ پتہ ۱۸/۳ سارسنگ اسٹریٹ کلکتہ

رسالہ "جدید اردو" نے اس دفعہ اپنے سالنامے کو کافی دلکش اور دلچسپ بنایا ہے۔ کاغذ کی روز افزوں گرانی کے باوجود عمدہ چکنے کاغذ پر یہ سالنامہ صاف ستھری لکھائی چھپائی کے ساتھ شایع ہوا ہے ادبی اور تاریخی مقالے، اخلاقی افسانے، معیاری ڈرامے، اخلاقی نظمیں، نغمہ غزلیں، رباعیاں قطعے۔ غرض کہ اس سالنامہ میں وہ سب کچھ موجود ہے جو ایک معیاری ادبی پرچہ میں ہونا چاہیے۔ جناب پرویز شاہدی اور ظہیر احسن قاضی کی کوششیں پروان چڑھ رہی ہیں اور اردو کا یہ نونہال پھولنے اور پھلنے لگا ہے۔

رسالہ سہیلی

لاہور کا باتصویر "اولاد نمبر" بابتہ مئی و جون ۱۹۴۱ء مرتبہ زہرا سعدیہ حجم ۰۰ صفحے چندہ سالانہ پانچ روپیہ پتہ برانڈرتھ روڈ۔ لاہور۔

رسالہ سہیلی کے اس خاص نمبر میں اکثر مضمون بچوں کی پرورش، تعلیم و تربیت، ورزش اور ان کی صحت کے متعلق تجربہ کار مضمون نگاروں نے لکھے ہیں۔ دودھ پلانے کے طریقے اور اوقات، زچہ اور بچہ کی نگہداشت، بچوں کی خوراک، حفظان صحت کے اصول، بچوں کی مخصوص بیماریاں اور ان کے علاج کے متعلق بہت سی کارآمد باتیں بتائی گئی ہیں چند اچھی اخلاقی نظمیں ایک مختصر مزاحیہ ڈراما اور ایک طویل دلچسپ افسانہ بھی پڑھنے کے قابل ہے، اس کے علاوہ عورتوں کی مغرب زدگی، ذمہ داریاں فرائض اور ان کی صحت کے متعلق بھی چند اچھے مضمون لکھے گئے ہیں۔ رسالہ کے آخر میں ڈاکٹر خدیجہ بیگم کا وہ خطبۂ صدارت درج ہے جو انہوں نے زنانہ اسلامیہ کالج انجمن حمایت اسلام میں پڑھا تھا، اس خطبہ میں موصوفہ نے اسلام کی روشنی میں طالبات کو جو نصیحتیں کی ہیں اور اخلاق کے جو سبق دئے ہیں وہ اس قابل ہیں کہ غور سے پڑھے اور سمجھے جائیں۔

روح مکاتیب حصہ اول

مرتبہ ساغر نظامی حجم ۲۵۰ صفحے قیمت عہ پتہ مکتبہ ساغر۔ ادبی مرکز۔ میرٹھ۔

رسالہ "ایشیا" میرٹھ بابتہ ماہ جون ۱۹۴۱ء کا یہ خاص نمبر ہے اس میں ملک کے مشہور انشا پردازوں اور شاعروں کے وہ خطوط درج ہیں جو مرتب کے نام لکھے گئے تھے۔ اس نمبر کا آغاز راجندر ناتھ شیدا ایم اے کے قابل مقالے سے ہوتا ہے جس میں جناب شیدا خطوں کی اہمیت پر زور دیتے ہوئے لکھتے ہیں "خطوط بعض خود بھی ادب کی عمدہ مثالیں ہوسکتے ہیں، وہ تفصیل و اختصار کی قیدوں سے بے نیاز ہوتے ہیں اور طبیعت کی بیساختہ تراوش ہونے کی وجہ سے اپنے لکھنے والوں کی فطرت کو ایک بڑی حد تک بے نقاب کرتے ہیں، ان میں وہ تمام موضوع معرض بحث میں آسکتے ہیں جو کسی بھی اونچے ادب کا الگار خانہ ہیں"

اس مجموعہ کی خصوصیت بقول جناب ساغر یہ ہے کہ "یہ اپنی نوعیت کی پہلی کتاب ہے جس میں بیک وقت متعدد اسالیب نظر آتے ہیں، دوسرے یہ کہ اس میں" جماعت مکتوب نگار ہے اور فرد مکتوب الیہ یعنی ایک شخص (جناب ساغر نظامی) کو بہت سے اشخاص مخاطب کرتے ہیں" بہرکیف یہ مجموعہ اس قابل ہے کہ چھوٹے سے چھوٹے کتب خانے میں بھی اس کی ایک جلد ضرور رہے۔

رشوت خواروں کا حشر

مرتبہ محمد شمس الدین صدیقی سالق منصف حجم ۰۰ صفحے قیمت لکھی نہیں ہے پتہ از مولف کالی کمان حیدرآباد دکن۔

یہ رسالہ مولف نے حکومت سرکار عالی میں انسداد رشوت ستانی کے اقدام کو اخبار میں پڑھ کر لکھا ہے۔ اس میں نواب مختار الملک مرحوم، نواب میر لایق علی خاں مرحوم، نواب سر آسمانجاہ مرحوم کے زمانے میں انسداد رشوت ستانی کے سلسلہ میں جن عہدہ داروں کو معطل اور برطرف کیا گیا

اس کی تفصیل جریدۂ اعلامیہ کے حوالہ سے لکھی گئی ہے اس کے علاوہ مولف کے چند اخلاقی مضامین بھی ہیں۔

محبت کے افسانے | مرتبہ محمد یعسوب الحسن حجم ۰۰ صفحے چھوٹی تقطیع قیمت ۵ ملنے کا پتہ دفتر خضر راہ ۔ مارو گا اسٹریٹ ۔ لاہور۔

رسالہ "خضر راہ" کا یہ خاص نمبر ہے۔ اس میں قاضی عبدالغفار، سدرشن، محمد لطیف، پروفیسر عابد علی عابد۔ ڈاکٹر اعظم کریوی وغیرہ کے مختصر افسانے اور کہانیاں ہیں۔

تذکرہ تاج الاولیا | مرتبہ محمد حسام الدین حجم ۱۹۴ صفحے قیمت ملنے کا پتہ مکتبہ ابراہیمیہ۔ عابد روڈ حیدر آباد

ناگپور کے مشہور بزرگ حضرت بابا تاج الدینؒ کی سیرت اور ملفوظات کا یہ مجموعہ ہے جس کو موصوف کے بھتیجے نے مرتب کیا ہے۔ اس میں بابا صاحب کا خاندان۔ ان کی ولادت، تعلیم، ریاضت کرامات وغیرہ کے متعلق صراحت سے بیان کیا گیا ہے۔ "س"

نقش اول | مرتبہ بیگم صالحہ عابد حسین حجم ۲۳۲ صفحے ۔ دو حصوں میں منقسم ہے قیمت عہ (مجلد) حالی پبلشنگ ہاؤس دہلی سے مل سکتی ہے۔

لائق مصنفہ کے انداز بیان میں گھلاوٹ، بیساختہ پن، سادگی و جاذبیت بلا کی ہے۔ حصہ اول چھ افسانوں پر مشتمل ہے اور حصہ دوم میں بھی چھ افسانے ہیں اس طرح اس پوری تصنیف میں ۱۲ بارہ افسانے گویا مشتری کے بارہ چاند ہیں جو اپنی آب و تاب سے اس کی درخشانی میں اضافہ کر رہے ہیں۔ یوں تو ہر افسانہ ایک طویل و بسیط تنقید کا اہل ہے لیکن دامان باغباں میں اتنی گنجائش کہاں کہ ان سب پھولوں کی پوری پوری سرگذشت سمیٹ لے۔ مختصر یہ کہ اس کا ہر افسانہ اپنی نوعیت کے لحاظ سے ایک جداگانہ حسن و جاذبیت کا حامل ہے۔ اور ان کی خصوصیت یہ ہے کہ زندگی ــــ ہر شخص کی زندگی جو بذات خود ایک افسانہ ہے۔ ان کے مطالعے سے اس کی اخلاقی، اصلاحی و تمدنی اصلاح ہو جاتی ہے۔ نری مضمون نگاری یا افسانہ نویسی و انشاپردازی کسی مصرف کی نہیں ہوتی تاوقتیکہ اس کا مواد کسی پڑھنے والے کی رہبری نہ کرے جیسے کسی زبردست شعر کی مقبولیت اسی وقت ہو سکتی ہے جبکہ سننے والا بول اٹھے کہ اگر میں شاعر ہوتا تو ایسا ہی شعر کہتا ــــ اسی طرح سے ایک افسانہ یا مضمون کی خوبی یہ ہے کہ پڑھنے والا یہ محسوس کرنے لگے کہ واقعی ہم بھی ایسا ہی لکھتے اگر کبھی ہمیں لکھنے کا اتفاق ہوتا۔ بعض وقت ان کا پلاٹ آپ بیتی کا پرتو لئے ہوئے اپنی ہی آنکھیں کھول دیتا ہے۔

میرے خیال میں اگر زندگی میں کسی کو ذرا سا بھی موقع مل جائے تو وہ اپنی اولین فرصت میں نقش اول کا ضرور مطالعہ کرے "بڑے میاں" "تارہ" اور "شیشہ کا گھر" سے واضح ہوتا ہے کہ انگریزی زبان میں کتنا مسالہ بھرا پڑا ہے جس سے ہم اپنی زبان اور اپنے خیالات کو وسعت دے سکتے ہیں۔ خوبی تو مترجم کی ہے جنھوں نے بڑے حسن و سلیقہ سے اسکو اپنا لیا ہے۔ "محبت کی فتح" سے ثابت ہوتا ہے کہ دھن دولت، ذات پات حسب نسب پریم نگری میں بے معنی سے بول ہیں۔ "یک نک" تو ایک خاصہ کی چیز ہے۔ اور "آنکھ کا ڈاکٹر" ایک دلنشیں ڈراما۔ "سیدہ" ہر گھرانہ میں کاش ایسی ایک ہی لڑکی کم از کم ہو جائے۔ "ایک پیسہ" ــــ اف! یہ سرمایہ داری وافلاس کا بدنما داغ۔ دیکھیے کب یہ دھبہ مٹتا ہے۔ "خان بہادر" ہانک پکار رہے کہتا ہے "بترس از آہ مظلوماں ــــ الخ" "شادی" ایک کامیاب افسانہ ہے۔ غرض کہاں تک کہوں تو جتنی ہے جیاں ہے۔

اگر ہر گھر میں اس تصنیف کے ان دلچسپ افسانوں کو ہر شخص پڑھ لے تو اسکی زندگی کیا سے کیا ہو جائے۔ لائق مصنفہ قابل مبارکباد ہیں۔

"ج"

ادارہ کی خبریں

نواب سالارجنگ بہادر کا معائنہ ادارہ

حیدرآباد کے امیر اعظم نواب میر یوسف علی خاں بہادر سالارجنگ سرپرست ادارہ نے بتاریخ ۸ ستمبر ۱۹۴۲ء مطابق ۲۵ شعبان ۱۳۶۱ھ ادارہ کا معائنہ فرمایا۔ اس تقریب میں ادارہ کی طرف سے ایک پرتکلف عصرانہ دیا گیا تھا جس میں نواب خسرو جنگ بہادر صدرالمہام فوج سرکارعالی مولوی سید محمد اعظم صاحب ناظم تعلیمات، مولوی حسین علی خاں صاحب پروووسٹ جامعۂ عثمانیہ، مولوی سید علی اکبر صاحب نائب ناظم تعلیمات، اور ادارہ کے اکثر معتمدین شعبہ جات و دیگر اراکین نے شرکت کی۔ اس موقع پر ایک گروپ فوٹو لیا گیا جو سب رس کی اس اشاعت میں شریک کیا جا رہا ہے۔ نواب صاحب معزز نے ادارہ کے ہر شعبہ کا تفصیل سے معائنہ فرمایا اور ادارہ کی مجوزہ عمارت کے "سالارجنگ ٹاور" کا نقشہ بھی پسند فرمایا۔ ادارہ کے کتب خانہ کی قلمی کتابوں کو بھی نواب صاحب معزز نے دیر تک ملاحظہ فرمایا اور اس بارے میں نواب مرزا سیف علی خاں صاحب ناظم اعزازی کتب خانہ ادارہ سے تبادلۂ خیال بھی فرمایا۔

نواب معین الدولہ بہادر کی وفات

یہ خبر نہایت افسوس کے ساتھ سنی جائے گی کہ ادارہ کے قدیمی سرپرست اور حیدرآباد کے امیر اکبر نواب امانت جنگ معین الدولہ بہادر نے اس مہینے کی ۴ تاریخ مطابق ۲۱ رمضان المبارک ۱۳۶۱ھ کو فالج کے حملہ کی وجہ سے اچانک وفات پائی۔ نواب صاحب مرحوم کو ادارہ سے ذاتی دلچسپی تھی۔ اور وہ سب رس کے قدیم ترین قلمی معاون تھے۔ چنانچہ ان کی متعدد غزلیں سب رس میں چھپ چکی ہیں۔ اور ایک نظم "شیر" بھی سب رس میں شایع ہوکر بڑی مقبولیت حاصل کر چکی ہے۔ نواب صاحب نے اس نظم کے لئے ادارہ سب رس کی فرمایش پر ایک خاص تصویر اتروا کر روانہ فرمائی تھی جس میں ان کے شکار کئے ہوئے چار شیر بھی نمایاں تھے۔ نواب معین الدولہ بہادر کو ادارہ سے جتنی دلچسپی تھی اس کا اندازہ اس واقعہ سے ہو سکے گا کہ انھوں نے ادارہ کے مشاعرے میں جو ان کی وفات سے صرف ۲ روز قبل منعقد ہوا تھا اپنی ایک خاص غزل روانہ فرمائی تھی۔ یہ غالباً ان سخن ور اور علم دوست نواب صاحب کی آخری غزل تھی۔ ان کی وفات سے حیدرآباد کی علمی دنیا اور خاص کر ادارہ ادبیات اردو کو بڑا نقصان پہنچا۔ چند سال قبل انھوں نے اپنا دیوان "معین سخن" مرتب کر کے شایع کیا تھا جس پر ادارہ کے معتمد ڈاکٹر زور صاحب سے بڑے اصرار کے ساتھ مقدمہ لکھوایا تھا۔

نواب معین الدولہ بہادر کی وفات سے جو نقصان پہنچا ہے وہ اگرچہ ناقابل تلافی ہے لیکن ایک حد تک تسلی ہوتی ہے جب یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کے فرزند اکبر نواب محمد ظہیرالدین خاں بہادر بی اے امیر پائیگاہ مقرر ہوئے ہیں جو ادارۂ ہذا کے قدیمی رفیق ہیں اور توقع ہے کہ وہ نواب معین الدولہ بہادر کی جگہ ادارہ کی سرپرستی قبول فرمائیں گے۔ نواب ظہیرالدین خاں بہادر بقول اعلیٰ حضرت بندگان عالی آصفجاہ سابع ایک نیک کردار جوان صالح ہیں۔ ان کا سفرنامۂ یورپ و امریکہ اردو زبان کی ایک دلچسپ اور مقبول کتاب ہے جو چند سال پیشتر شایع ہوئی تھی۔ وہ شمس الامراء بہادر کی علمی خدمات پر بھی ایک کتاب تحریر فرما رہے ہیں جو شایع ہونے کے بعد اردو ادب کی تاریخ کے لئے ایک نعمت غیر مترقبہ ثابت ہوگی۔

ہز اکسلنسی نواب صاحب چھتاری صدر اعظم بہادر کی سرپرستی ادارہ

ادارہ کے بہی خواہوں اور کارکنوں کے لئے یہ خبر باعث مسرت ہوگی کہ ہز اکسلنسی کرنل ڈاکٹر سر محمد احمد سعید خاں بہادر ایل ایل ڈی نواب چھتاری و صدر اعظم دولت آصفیہ نے از راہ علم پروری ادارۂ ادبیات اردو کی سرپرستی قبول فرمائی ہے۔ یقین ہے کہ یہ "دور سعید" ادارہ کی

علمی وادبی خدمات اور اردو کی تبلیغ و اشاعت کے لئے مسعود و مبارک ثابت ہوگا اور ارباب ادارہ حسب دلخواہ اپنی مساعی میں کامیابی حاصل کریں گے۔

مشاعرہ

ادارۂ ادبیات کی طرف سے ۱۱ ستمبر ۱۹۴۱ء مطابق ۲۲ شعبان کو ایک خاص مشاعرہ ترتیب دیا گیا تھا۔ جس میں ادارہ کے اکثر معاونین و رفقا و معتمدین شعبہ جات نے شرکت کی۔ اس ادبی صحبت میں شرکت کی عام اجازت تھی چنانچہ دور دور سے بلا امتیاز مذہب و ملت لوگ آئے اور اس خاص محفل سے استفادہ کیا۔

شعرا میں نواب عزیز یار جنگ بہادر عزیزؔ، نواب شہید یار جنگ بہادر شہیدؔ، قاضی زین العابدین صاحب عابدؔ، حضرت امجدؔ، حضرت علی اخترؔ، ماہر القادری صاحب، مخدوم محی الدین صاحب، محمد علی صاحب تیرؔ، ڈاکٹر سکینہ صاحب، آزادؔ صاحب، نظرؔ صاحب، محبتؔ صاحب، عابد علی صاحب سعیدؔ، مہندر راج صاحب، علی احمد صاحب، مشاق احمد صاحب، خیراتؔ صاحب، الہامؔ صاحب، طالبؔ صاحب، وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ نواب معین الدولہ بہادر معینؔ نے بھی اپنی خاص غزل روانہ کی تھی

سامعین میں ہندو، مسلمان، طلبہ اور اعلیٰ عہدہ دار سب دوش بدوش شریک تھے۔ جدید ترقی پسند نظموں کے ساتھ ساتھ قدیم طرز کی معیاری غزلیں مساوی داد حاصل کر رہی تھیں۔ غرض ہر قسم کے امتیازات کو دور کرکے ادارہ کی اس ادبی محفل نے حیدرآباد میں ایک اچھی روایت قائم کی ہے۔

افتتاحی تقریر

مشاعرہ کے آغاز سے قبل مولوی عبدالقیوم خاں صاحب باقیؔ ایم اے ریسرچ اسکالر استاد اردو جامعہ عثمانیہ نے ایک تعارفی تقریر کی جو ذیل میں درج کی جاتی ہے۔

حضرات۔ اردو زبان اور ادب کی خدمت میں ادارۂ ادبیات اردو جو کچھ حصہ لے رہا ہے وہ محتاج تعارف نہیں۔ آج کا مشاعرہ بھی اس جذبہ کا ایک روشن اظہار ہے۔

آپ کو علم ہوگا کہ قدیم زمانے سے مشاعرہ ایک کھلا میدان رہا ہے، جہاں نہ صرف شاعر کی تربیت ہوتی تھی، بلکہ سامعین کا ذوق بھی جلا پاتا تھا خوشی کی بات ہے کہ حیدرآباد میں دور قدیم کے اس ادارے کو مقبولیت حاصل ہو رہی ہے۔ یہ ایک حیثیت سے مقام شکر بھی ہے، کیونکہ جہاں ایک طرف زمین کا نصف مغربی کرہ جنگ کی آتشباریوں سے جل رہا ہے، وہاں مشرق کے اس بعید گوشے میں ہم بحمداللہ فنون لطیفہ کی خوشگوار خدمت کرنے کے قابل ہیں۔

آج سے ادارہ ادبیات اردو نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ وقتاً فوقتاً ایسے خاص مشاعرے منعقد کرے جہاں اساتذہ اور نوخیز شاعر دونوں ایک خاص جذبہ عمل لیکر جمع ہوں، اور شاعری کے ذریعے اردو ادب کی کچھ خدمت کریں۔

آج کل کے مشاعروں کی نوعیت کچھ خاص ہے وہ شاعر جو ادب کے جدید رجحانات سے متاثر ہیں، اور ترقی پسندی کا جذبہ رکھتے ہیں، ایک جوش اور جدت کے ساتھ، قدیم اسلوب شعر گوئی میں کچھ تبدیلیاں کر رہے ہیں، اور اپنا ایک علحدہ محاذ قائم کرنا چاہتے ہیں۔ ان کا مشاعرہ بھی ترقی پسندی یا تغیر پسندی کا ایک پرجوش مظاہرہ ہوتا ہے۔ ترقی پسندی کا جذبہ عموماً نوجوانوں میں پایا جاتا ہے کیونکہ آج کل کے نوجوان، ہماری تیزی سے بدلتی ہوئی دنیا کی پیداوار ہیں۔ بعض مشاعرے اس قسم کے منعقد ہونے کی کوشش کی جاتی ہے، اور ہوتے بھی ہیں، جہاں قدیم انداز کے شاعر جمع ہوں، اور پرانی روایات کے مطابق بزم شعر و سخن گرم کریں۔ ان دو جدا جدا تحریکوں کے باوجود، خوشی کی بات یہ ہے کہ ہمارے قدیم دبستان کے شاعر اور بہت سے بزرگ ایسے ہیں جو آہستہ آہستہ نوجوانوں کا ساتھ دینے اور ان کا ہاتھ بٹانے آمادہ ہیں۔ آج کا مشاعرہ غالباً قدیم

جدید ذوق کی ہم آہنگی کا آئینہ دار اور سنگم ثابت ہوگا۔

جدید شاعروں کی ایک خصوصیت ترنم سے پڑھنا ہے۔ لیکن قدیم شاعروں کی تحت اللفظ غزل خوانی بھی اپنی ایک خاص حیثیت رکھتی ہے۔ اگر شاعروں میں سامعین دونوں طرز کے پڑھنے والوں کی قدر افزائی کریں تو اچھا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ ترنم شعر کے لطف میں اضافہ کر دیتا ہے لیکن یہ بھی درست ہے کہ تحت اللفظ پڑھنے سے شعر کی خامیاں چھپ نہیں سکتیں۔ ایک علمی خیال یہ ہے کہ مشکل اور تفکری شاعری گو اعلیٰ ادب کا اہم عنصر ہوتی ہے، گر مشاعروں کے موزوں نہیں ہوتی کیونکہ یہاں ایک قسم کی مجموعی ذہنیت سے براہ راست سابقہ پڑتا ہے لیکن میرا خیال ہے کہ مشکل ادب کو مشاعرے کے قابل بنانا خود اہلِ ذوق کا کام ہے۔ حیدرآباد میں ذوق شعری اگر ترقی کر رہا ہے تو ضرورت ہے کہ ہم مشاعرے میں خاص قسم کے ادبی کارناموں کو بھی توجہ سے سننے کے لیے تیار ہوں۔ آج کے مشاعرے میں تنوع ہے کہ ایک طرف ہم غزل کی قدیم صنف میں اہلِ ذوق کی خیال آرائی سنیں گے، تو دوسری طرف نظم کے قالب میں جدید شاعر کے جذبات اور احساسات کا مطالعہ کر سکیں گے۔ چونکہ شعرا بہت ہیں اس لیے توقع کی جاتی ہے کہ حضرات شعرا ایک غزل یا ایک نظم سے زیادہ سنانے کی زحمت گوارا نہ فرمائیں گے۔

میں آخر میں آپ کو خوشخبری سناؤں گا، وہ یہ ہے کہ تغیر پسند ادب کا ساتھ دینے میں پرانے شعرا نوجوانوں سے آگے نکل جانا چاہتے ہیں۔ وہ اس طرح کہ شاعری کی قدیم روایات کے برخلاف جہاں بڑے بوڑھوں اور اساتذہ کو آخر وقت تک بیٹھنا پڑتا تھا، آج ان کی خواہش ہے کہ وہ پہلے اپنے کلام سے ہمیں محظوظ فرمائیں۔ یہ ایک انقلابی صورت ہے، اور میں سمجھتا ہوں کہ انقلاب کے علمبردار ہمارے بزرگوں کے اس جذبے اور جوش کا زیادہ سے زیادہ خیر مقدم کریں گے!

حضرات! حیدرآباد میں حضرت ڈاکٹر عبدالحق صاحب کو "اردو کے بوڑھے" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس موقع پر ہمارے ملک کے ہونہار فرزند اور اردو ادب کے سرگرم کارکن، ڈاکٹر زور کو ان کی حالیہ مصروفیتوں کی مبارکباد دیتے ہوئے ہم یہ کہنا چاہتے ہیں ——
خدا ہمارے "**اردو کے نوجوان**" کو سلامت رکھے!

قرار داد تعزیت حضرت فانی

اس تقریر کے بعد باقی صاحب نے حضرت فانی کی وفات حسرت آیات پر جو قرار داد تعزیت پیش کی اور جس کو مجاز شرکائے مشاعرہ نے ایستادہ ہو کر منظور کیا وہ درج ذیل ہے۔

مشاعرے کے آغاز سے قبل ہم ہندوستان کے ممتاز شاعر حضرت فانی مرحوم کی یاد تازہ کرنا چاہتے ہیں، جو چند روز ہوئے ہم سے جدا ہو گئے اور اگر وہ زندہ رہتے تو یقیناً آج زینتِ محفل رہتے۔ ان کی وفات حسرت آیات پر حسب ذیل قرار داد تعزیت منظور فرمائیں۔

"ہم حضرت فانی مرحوم جیسے مفکر شاعر کے انتقال پُرملال پر اپنے گہرے رنج و غم کا اظہار کرتے ہیں۔ مرحوم نے اپنی بلند پایہ غزلوں میں زندگی کے یاس و الم کا جو نقشہ کھینچا ہے وہ ہمارے دلوں کی گہرائیوں میں موجود ہے۔ آپ کی وفات سے اردو زبان کا ایک محسن اور بزم سخن کا ایک ممتاز رکن گم ہو گیا۔ ہماری دعا ہے کہ خداوند کریم مرحوم کی روح کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے اور ان کے پس ماندگان کو صبرِ جمیل عطا فرمائے۔" آمین

مجلس ادبیات اطفال یہ ادارہ کا ایک شعبہ ہے جو علحدہ شاخ کی حیثیت سے کام کر رہا ہے اس کی صدارت نامور فاضل سید علی بلگرامی مرحوم کی دختر نیک اختر محترمہ رقیہ بیگم صاحبہ بی اے آنرز کیمبرج (بیگم نواب مدین یار جنگ بہادر) صدر کلیہ اناث جامعہ عثمانیہ کے تفویض ہے اور اس کے معتمد مولوی میر حسن صاحب ایم اے ہیں۔ اس مہینے بتاریخ ۱۰ ستمبر ۱۹۴۱ء اس کا ایک اجلاس ادارہ کے دفتر میں منعقد ہوا جس میں طے پایا کہ اس مجلس کی پہلی کتاب چیونٹی معتمد کے مقدمہ کے بعد شائع کر دی جائے۔

۲۔ لطیف النساء بیگم صاحبہ ایم اے رکن مجلس کی مصنفہ بچوں کی نظمیں ایک باتصویر مجموعہ کی شکل میں جلد شائع کی جائیں۔ مجموعہ کے نام اور نظموں کی تعداد اور تصویروں کے بارے میں مصنفہ سے مشورہ کر لیا جائے۔

۳۔ "عرب اور دنیائے اسلام" کا مسودہ ڈاکٹر زور صاحب کے سپرد کیا گیا تاکہ موصوف اس کی زبان پر نظر ثانی کر کے اس کو بچوں کے مطالعہ کے قابل بنائیں۔ مولوی مجتبیٰ حسین صاحب نقوی مہتمم تعلیمات سے استدعا کی جائے کہ وہ اس کے لئے تصویروں کا انتظام فرمادیں۔

۴۔ "کشمکش نانی" از شجاع احمد صاحب قائد چار تصویروں کے ساتھ چھپوائی جائے۔

۵۔ ڈاکٹر زور صاحب سے استدعا کی گئی ہے کہ وہ اردو کے ایک قدیم شاعر محمد قلی قطب شاہ اور ایک جدید شاعر اقبال پر بچوں کے لئے دو علحدہ علحدہ کتابیں تحریر فرمادیں تاکہ دسمبر تک شائع کی جاسکیں۔

۶۔ مسیح الدین خاں متین کی بچوں کی نظموں کا مجموعہ مولوی میر حسن صاحب ایم اے معتمد مجلس کو نظر ثانی کے لئے تفویض کیا گیا۔

چیونٹی مجلس ادبیات اطفال کے سلسلہ مطبوعات کی پہلی اور ادارہ ادبیات اردو کے سلسلہ مطبوعات کی تہترویں (۷۳) کڑی ہے جس کو ادارہ کے رفیق رائے مہندر راج صاحب سکسینہ ایم ایس سی نائب صدر انجمن طیلسانین عثمانیہ و استاد شعبۂ نباتیات جامعہ عثمانیہ نے بڑے سلیقہ سے تالیف کیا ہے۔ اس میں تقریباً بیس (۲۰) عکسی تصویریں شریک ہیں۔ کتاب کا سرورق بھی بچوں کی دلچسپی کے لئے رنگین بنایا گیا ہے۔ کتاب میں چیونٹی کی سوانح عمری، سماجی زندگی، گھریلو زندگی، عام عادتیں اور مصنوعی چیونٹی گھر بنانے کے عنوانات کے تحت بڑی مفید اور دلچسپ معلومات شامل ہیں۔

عقیل جنگ میڈل ادارۂ ادبیات اردو کے امتحان اردو فاضل میں اول آنے والے طالب علم کو ایک طلائی تمغہ ہر سال عطا کیا جائے گا جو نواب سر عقیل جنگ بہادر صدر المہام (نائب صدر اعظم) دولت آصفیہ نے از راہ علم نوازی عطا فرمایا ہے۔

اردو انسائیکلوپیڈیا اس عظیم الشان تالیف کا کام روز افزوں ترقی کر رہا ہے۔ اس اثنا میں بعض مشاہیر نے اس کام کی نسبت جن اچھے خیالات کا اظہار فرمایا ہے ان میں سے بعض کے اقتباسات یہ ہیں۔

مسٹر محمد علی جناح صدر آل انڈیا مسلم لیگ۔ "مجھے یہ معلوم کر کے بڑی مسرت ہوئی کہ متعدد مشاہیر نے بھی اس اردو انسائیکلوپیڈیا کے لئے مختصر مقالوں کی تحریر کا وعدہ کر لیا ہے۔ میں دوبارہ اس عظیم الشان کارنامے کی تکمیل اور ہر طرح کی کامیابی کی توقع کا اظہار کرتا ہوں۔"

مسز سروجنی نائیڈو۔ "آپ کا ادارہ اردو زبان اور ادب کی ترقی و تحفظ کے لئے جو نمایاں کام انجام دے رہا ہے اس کی قدر کرتے رہنے میں مجھے ہمیشہ دلی مسرت حاصل ہوتی رہے گی۔"

پروفیسر نجیب اشرف صاحب ایم اے پروفیسر اردو اسمٰعیل کالج بمبئی تحریر فرماتے ہیں:۔ "آپ نے انسائیکلوپیڈیا کا کام اپنے ذمہ لے کر اپنے لئے غیر فانی عزت اور نیک نامی کا سامان پیدا کر لیا ہے۔ اور جب تک اردو زندہ ہے اردو دنیا آپ کے اس احسان سے سبکدوش نہیں ہوسکتی۔ اللہ پاک آپ کو اور آپ کے رفقائے کار کو زندگی و صحت دے کہ وہ اس کو مکمل کریں۔ حیدری مرحوم کے عہد میں انسائیکلوپیڈیا کا جو تصور تھا وہ ان کے مضمون سے ظاہر ہے۔ بلکہ ۱۹۱۶ء میں دار المصنفین نے اس بات کی کوشش شروع کی تھی اور خیال تھا کہ مرحوم راجہ صاحب محمود آباد اس کے لئے کم از کم ایک لاکھ روپیہ دیں گے لیکن کوئی نتیجہ نہ ہوا۔ اس کے بعد جب مرہٹی انسائیکلوپیڈیا شائع ہوئی اور اس کے چیف ایڈیٹر نے یہ اعلان کیا کہ اگر ہندی اردو والوں نے جلد اس کا ترجمہ نہ کیا تو وہ خود یہ کام انجام دے گا۔ لیکن اس پر بھی رگ حمیت و غیرت کو جنبش نہ ہوئی۔ البتہ سیرت سے متعلق مضمون پر بعض اعتراضات کئے گئے۔ شاید قضا و قدر کے کارکنوں کو یہ منظور تھا کہ یہ کام بھی اسی ادب نواز علم پرور سرزمین میں ہو جہاں کی عثمانی فیاضی کا کوئی جواب نہیں۔ اردو کی واحد جامعہ کی اس سے بڑھ کر کیا کامیابی ہوسکتی ہے کہ اس کے اساتذہ اس کے تعلیم یافتہ نوجوان اور دوسرے ہمدرد ایک ایسے عظیم الشان کارنامے کا اس جوش ولولے۔ نظام۔ اور استقامت کے ساتھ بیڑا اٹھائیں۔ آپ کی مختلف کمیٹیوں کی جو روئداد سب رس میں چھپتی رہتی ہے وہ اس کی وسعت اور ہمہ گیری کی دلیل ہے۔ اللہ پاک اس چیز کو تکمیل تک پہنچائے۔"

پروفیسر سید مسعود حسن صاحب رضوی ادیب ایم اے صدر شعبۂ فارسی و اردو لکھنؤ یونیورسٹی اردو انسائیکلوپیڈیا کے لئے خواجہ حیدر علی آتش اور انیس و دبیر پر مقالے تحریر فرما رہے ہیں۔ آتش کے مقالے کے سلسلہ میں تحریر فرماتے ہیں کہ "آپ کے کارناموں کو دیکھ کر خوش ہوتا ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ خدا وند عالم آپ کی قوت عمل میں اور اضافہ فرمائے۔ اور آپ کو تا دیر زندہ و سلامت رکھے۔ آپ سے اردو کو بہت کچھ فائدہ پہنچ رہا ہے۔ اور انشاء اللہ بہت دنوں تک پہنچتا رہے گا۔"

شعبۂ زراعت و باغبانی | بتاریخ پندرہ ستمبر ۱۳۴۷ف شام کے پانچ بجے دفتر ادارہ میں اردو انسائیکلوپیڈیا کے شعبۂ زراعت و باغبانی کا ایک اجلاس منعقد ہوا۔ جس میں حسب ذیل اصحاب نے شرکت فرمائی۔

۱۔ ڈاکٹر کالی داس سہانی ایم ایس سی۔ پی ایچ ڈی ناظم زراعت (تحقیقات)
۲۔ رائے مہندر بہادر بی اے۔ ایم ایس سی ناظم زراعت (تبلیغ)
۳۔ مرزا محی الدین بیگ صاحب بی اے سی ٹی پرنسل مددگار ناظم زراعت۔
۴۔ ڈاکٹر وحید الدین حسن صاحب ایم ایس سی۔ پی ایچ ڈی۔
۵۔ ڈاکٹر میر حسین علی صاحب رضوی بی اے جی۔ پی ایچ ڈی۔
۶۔ ڈاکٹر قادر الدین خان صاحب ایم ایس سی۔ پی ایچ ڈی۔
۷۔ مولوی رسول سلطان صاحب ایم ایس سی۔
۸۔ مولوی عبدالمجید صاحب بی اے جی۔
۹۔ ڈاکٹر بی جی کرشنانی ایس سی۔ پی ایچ ڈی۔
۱۰۔ جناب اردشیر بہمن جی مہرجی خورشید بی اے۔ ایم ایس سی۔
۱۱۔ مولوی عاقل خاں صاحب ایل اے جی۔
۱۲۔ ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور۔
۱۳۔ سید بادشاہ حسین معتمد اردو انسائیکلوپیڈیا۔

طے پایا کہ اسماء اور مصطلحات کی جو فہرست محکمۂ زراعت میں موجود ہے اس سے ادارہ کے مرتب کردہ کا رڈز کا مقابلہ کر لیا جائے اور ان کارڈوں کے مندرجہ الفاظ و مصطلحات کی ایک نقل مولوی مرزا محی الدین بیگ صاحب کی خدمت میں روانہ کی جائے تاکہ وہ ان الفاظ کی فہرستوں کا مقابلہ کریں اور متعلقہ اصحاب کے مشورے سے اور ڈاکٹر کالی داس سہانی اور رائے مہندر بہادر ناظمان زراعت کی نگرانی میں ان کی تکمیل

فہرست زراعت و باغبانی سے متعلقہ الفاظ کی تیار فرمائیں۔ اور بعجلت ممکنہ الف ممدودہ سے شروع ہونے والے الفاظ کا انتخاب کر کے مطلع کریں تاکہ آیندہ کمیٹی میں ان پر مضمون لکھوانے کی نسبت عملی تصفیے کئے جائیں۔

شعبۂ قانون بتاریخ ۲۹ ستمبر ۱۹۴۲ء صبح کے نو بجے دفتر ادارہ میں اردو انسائیکلوپیڈیا کے شعبہ قانون کا ایک اجلاس منعقد ہوا۔ جس میں حسب ذیل اصحاب نے شرکت فرمائی۔

۱۔ جسٹس ڈاکٹر نواب ناظر یار جنگ بہادر ایل ایل ڈی رکن ہائی کورٹ
۲۔ جسٹس رائے بشیشور ناتھ صاحب بی اے ایل ایل بی رکن جوڈیشل کمیٹی۔
۳۔ خواجہ زین العابدین صاحب بی اے بیرسٹرایٹ لا۔
۴۔ مولوی احمد عبداللہ صاحب مسدسی بی اے۔ ایل ایل بی وکیل ہائیکورٹ۔
۵۔ ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور۔
۶۔ سید بادشاہ حسین معتمد اردو انسائیکلوپیڈیا۔

ڈاکٹر میر سیادت علی خان صاحب ایم اے۔ ایل ایل بی بی سی ایل۔ پی ایچ ڈی۔ اور پنڈت سری پت راؤ صاحب ایڈوکیٹ نے بذریعہ تحریر اور مولوی عبداللہ صاحب وکیل تاپوری نے بذریعہ ٹیلیفون شرکت سے معذرت چاہی اور آیندہ اجلاس میں شرکت کا وعدہ فرمایا ہے۔

طے پایا کہ جن قانونی الفاظ کے اب تک ترجمے نہیں ہو سکے ہیں۔ ان کے ترجمے اور جن اصطلاحوں کے ترجمے ہو چکے ہیں ان کی نظر ثانی کا کام راجہ بشیشور ناتھ صاحب اور عبداللہ صاحب تماپوری کے تفویض کیا جائے۔ راجہ صاحب نے وعدہ فرمایا کہ اس کام کی تکمیل کے بعد اپنی رائے سے مطلع فرمائیں گے کہ کون کون سے قانونی الفاظ اردو انسائیکلوپیڈیا میں شریک کئے جائیں۔ الفاظ کے تعین کے بعد آیندہ اجلاس میں یہ طے کیا جائے گا کہ کون کون سے الفاظ پر کن اصحاب سے مضامین اور مقالے مرتب کرائے جائیں۔

شعبۂ حیوانیات بتاریخ ۴ ستمبر ۱۹۴۲ء شام کے پانچ بجے دفتر ادارہ میں اردو انسائیکلوپیڈیا کے شعبۂ حیوانیات کی مشاورتی کمیٹی منعقد ہوئی جس میں حسب ذیل اصحاب نے شرکت کی۔

۱۔ ڈاکٹر بی کے داس۔ ڈی ایس سی صدر شعبۂ حیوانیات جامعہ عثمانیہ۔
۲۔ مولوی مہدی علی صاحب ایم ایس سی استاد حیوانیات و ایڈیٹر اردو انسائیکلوپیڈیا
۳۔ مولوی محمد عابدی صاحب استاد حیوانیات۔
۴۔ رائے ستیہ نارائن سنگ صاحب ایم ایس سی استاد حیوانیات۔
۵۔ ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور
۶۔ مولوی فیض محمد صاحب صدیقی بی اے ایم ایڈ معتمد اردو انسائیکلوپیڈیا۔
۷۔ مولوی سید بادشاہ حسین صاحب۔

اس وقت تک شعبۂ حیوانیات سے متعلق ڈاکٹر محمد بابر مرزا صاحب ایم ایس سی پی ایچ ڈی۔ اور مولوی مہدی علی صاحب ایڈیٹران

شعبۂ حیوانیات نے اس فن سے متعلق اسما و مصطلحات کی فہرستوں کی تکمیل کرلی ہے اور مختلف ذیلی شعبوں کے کام کی تفصیل بھی کر دی ہے۔ اس کی نسبت تبادلۂ خیال کیا گیا اور معلوم ہوا کہ اس شعبہ کا کام بڑی خوبی سے انجام پا رہا ہے۔ ڈاکٹر داس صاحب نے اس کی تکمیل میں ممکنہ امداد دینے اور سرگرمی کا اظہار فرمایا۔

معتمدین شعبہ جات کی طرف سے دعوت

چونکہ ادارۂ ادبیات اردو کے معتمد اعزازی عالیجناب ڈاکٹر سید محی الدین قادری صاحب زور ماہ اگست میں صدارت شعبۂ اردو جامعہ عثمانیہ پر فائز ہوئے اس لئے ادارہ کے معتمدین شعبہ جات نے اس ترقی کی مسرت میں بتاریخ ۲۲ ستمبر ۱۹۴۱ء ایک عشائیہ کا انتظام کیا تھا جس کے رقعے نواب مرزا سیف علی بیگ صاحب جاگیردار و ناظم اعزازی کتب خانہ ادارہ نے منجانب معتمدین تقسیم فرمائے۔ اور یہ عشائیہ نواب مرزا علی حسین خاں صاحب بی اے کے مکان واقع نارائن گوڑہ روبرو وائی ایم سی اے ترتیب دیا گیا تھا جس میں اکثر معاونین و رفقا و اراکین ادارہ نے شرکت فرمائی اور متعدد اصحاب اور شعبوں کی طرف سے ڈاکٹر صاحب موصوف کو پھول پہنائے گئے۔

اردو امتحانات کی ایک نئی درس گاہ

اردو سیکھنے کے شائقین کی سہولت کے لئے درس گاہ اردو امتحانات کے نام سے ایک تعلیمی ادارہ محلہ بیدڑواڑی میں قایم کیا گیا ہے جہاں محمود احمد صاحب انصاری روزآنہ بعد مغرب اردو زبان و ادب کی مفت تعلیم دیتے اور ادارۂ ادبیات اردو کے اردو امتحانات کے لئے طلبہ کو تیار کرتے ہیں۔

اردو امتحانات کے مرکزوں کی روئدادیں

اردو امتحانات کے مرکزوں کی نگرانی کے لئے جو حضرات تشریف لے گئے تھے ان میں سے چند کی روئدادوں کے اقتباسات درج ذیل ہیں۔ باقی ماندہ روئدادیں آئندہ شائع کی جائیں گی۔

مرکز کلیانی

پروفیسر عبدالمجید صاحب صدیقی ایم اے ایل ایل بی تحریر فرماتے ہیں :- گزشتہ سال کی طرح امسال بھی کلیانی کا مرکز میرے سپرد تھا۔ ۲۰ اگست ۱۹۴۱ء کو چہارشنبہ کے دن میں اپنی گاڑی میں حیدرآباد سے روانہ ہوا۔ میرے ساتھ عبدالکریم صاحب بھی تھے جو شاخ ادارہ کلیانی کے بانی ہیں۔ ہم شام کے پانچ بجے ہمنا باد پہنچے اور رات وہیں بسر کی۔ ۲۱ اگست کی صبح کو تقریباً ۸ بجے کلیانی پہنچے اور مسافر بنگلہ میں دم لیا۔ عطاء اللہ صاحب منتظم اور دوسرے حضرات سے ملاقات ہوئی۔ ہیضے کی وجہ سے ہر جگہ پریشانی پھیلی ہوئی تھی۔ کچھ اسی وجہ سے ادارہ کا ارادہ یہ تھا کہ اس سال کلیانی میں امتحان نہ ہو یا اگر امیدوار امتحان دینا چاہیں تو ان کو حیدرآباد یا کسی قریبی مرکز میں منتقل کر دیا جائے لیکن اہل کلیانی کا اصرار تھا کہ امتحان حسب دستور اسی جگہ ہونا چاہیے۔ اس لئے وہیں امتحان کا انتظام کیا گیا اور مجھے عالم مجبوری میں جانا پڑا لیکن وہاں پہنچنے کے بعد معلوم ہوا کہ حالات امتحان کے متقاضی نہ تھے۔ امیدوار، ان کے سرپرست، اور نگران کار بہت پریشان تھے۔ بہت سے امیدوار غیر حاضر تھے۔ اور اکثر اہل کلیانی اور نگران کار دیکھتے دیکھتے ہیضے میں مبتلا ہو گئے جن کا جان بر ہونا دشوار تھا۔

جوں توں ۲۱ اگست کو امتحان لیا گیا۔ اردو دانی کے جو امیدوار حاضر تھے انھوں نے صبح کو تحریری امتحان دیا اور دوپہر کو زبانی امتحان کی تکمیل کی گئی۔ اس کے ساتھ اردو عالم کے بھی دو پرچے ہو گئے۔ امتحان سے فارغ ہو کر میں حفظ ماتقدم کی خاطر ستاپور میں جا کر ٹھیرا جو کلیانی سے پانچ میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ ۲۲ اگست کو جمعہ تھا۔ اور روقت نامے کے بموجب ڈھائی بجے سے امتحان تھا۔ ستاپور سے میں ایک بجے کے قریب

کلیانی آیا اور وقت پر اردو عالم کا پرچہ دیا گیا اور امتحان ختم کر کے پرستا پور پہنچ گیا۔ بنگلہ پہنچنے کے بعد مجھے پیٹ میں کچھ تکلیف محسوس ہوئی اور مقامی لوگوں کے مشورے سے میرا بلدہ فوراً آنا ضروری سمجھا گیا۔ ۲۳ اگست کے دو پرچے جو اردو عالم سے متعلق تھے۔ مولوی احمد حسین صاحب تعلقدار کلیانی کے سپرد کر کے میں تقریباً ۸ بجے شب کے راہی بلدہ ہوا۔ دوسرے روز ۲۴ اگست شنبہ کو احمد حسین صاحب نے امتحان کی تکمیل کردی اور سربمہر جوابی بیاضیں میرے ہاں روانہ کردیں جو ہر طرح قابلِ اطمینان تھیں۔ موصوف شاخ ادارہ کے صدر ہیں اور مقامی عہدہ دار اعلیٰ ہونے کی حیثیت سے ہر طرح قابلِ اعتماد ہیں اور مجھ سے زیادہ اہمیت رکھتے ہیں اور اسی اطمینان کی وجہ سے میں بلدہ واپس آگیا۔ موصوف ادارہ کے شکریہ کے مستحق ہیں۔ توقع ہے کہ موصوف کی سرپرستی میں شاخ ادارہ کلیانی بہت سرسبز ہوگی حسب ذیل حضرات نے امتحان کی نگرانی کی۔

معلمہ تمنا عبدالکریم صاحب، قاضی الدین صاحب، عطاء اللہ صاحب، محمد بیگ صاحب، شیخ صالح صاحب، ترل راؤ صاحب۔

مرکز پربھنی مولوی سید بادشاہ حسین صاحب تحریر فرماتے ہیں:- مدرسہ فوقانیہ پربھنی میں امتحانات کا مرکز رہا۔ دو کمرے مردوں کے لئے اور دو کمرے زنانہ کے لئے مخصوص کئے گئے۔ معقول انتظامات کی وجہ سے امتحانات میں بڑی سہولت ہوئی۔

زنانہ ہال میں حسب ذیل خواتین نے نگرانی کی۔

۱۔ حلیم النساء بیگم صاحبہ صدر معلمہ نسوان اردو تحتانیہ پربھنی۔ سوشیلا دیوی صاحبہ صدر معلمہ نسوان تحتانیہ مرہٹی پربھنی۔ جمال بی صاحبہ صدر معلمہ نسوان اردو تحتانیہ محلہ مومن پورہ پربھنی۔ اور حسب ذیل اصحاب نے مردانہ ہال کی نگرانی میں میرا ہاتھ بٹایا۔

محمد قاسم صاحب مدرس مدرسہ فوقانیہ پربھنی۔ سید امیر الدین صاحب مدرس مدرسہ فوقانیہ پربھنی۔ شیخ عبدالقادر صاحب مدرس مدرسہ فوقانیہ پربھنی مسٹر مانک راؤ مدرس مدرسہ فوقانیہ پربھنی۔ مسٹر ریکا داس مدرس مدرسہ فوقانیہ پربھنی۔

ان کے سوا معتمد صاحب شاخ بھی پورے امتحانات میں صبح سے شام تک برابر موجود رہے جس سے انتظامات میں سہولت ہوئی۔ اس ضمن میں میں ضروری سمجھتا ہوں کہ ادارہ کی جانب سے متذکرۂ بالا خواتین و حضرات کا نگرانی امتحانات کے لئے شکریہ ادا کیا جائے۔ بے موقع نہ ہوگا اگر صدر مدرس صاحب (ابرار حسین صاحب) کا بھی شکریہ ادا کیا جائے۔ انھوں نے مدرسہ کے کمروں کے استعمال کی اجازت دی گو کہ وہ خود مستقر پر موجود نہ تھے۔

پربھنی کی شاخ کھلے میدان میں ایک موزوں عمارت میں قائم ہے معتمد صاحب شاخ کی کوشش اور مہتمم صاحب آبکاری کی توجہ سے یہ عمارت شاخ کو مل سکی۔ خاصا اچھا مطالعہ گھر ہے۔ روزنامے، ہفتہ وار اور ماہوار جرائد آتے ہیں اور روزآنہ کافی تعداد میں لوگ مطالعہ کرتے ہیں۔ انتظام بہت اچھا اور ہر چیز سلیقہ سے رکھی گئی ہے۔ ادارہ کی اکثر و بیشتر اور اردو کے دوسرے مصنفین کی تصاویر یہاں آویزاں ہیں اور امتحانات کے زمانہ میں طلبا رات میں بڑی دیر تک یہیں مطالعہ کیا کرتے ہیں کیونکہ روشنی کا معقول انتظام ہے۔ مقامی عہدہ دار بھی ادارہ کی اس شاخ اور امتحانات سے واقف ہو گئے ہیں۔

مختصر یہ کہ اس شاخ کو کامیاب بنانے میں معتمد صاحب شاخ کی پرخلوص کوششوں اور مہتمم صاحب آبکاری کی مخلصانہ دلچسپیوں کو بڑا دخل ہے۔

ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد دکن کا ماہنامہ

نشان ٹپہ آصفیہ ۱۵۳
نشان ٹپہ برطانیہ M 395
ٹیلیفون نمبر ۲۲۰۹
چندہ سالانہ چار روپے آٹھ آنے
بچوں کا سب رس ایک روپیہ آٹھ آنے

سب رس

زیر نگرانی
ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور
مجلس ادارت
خواجہ حمید الدین شاہد
سکینہ بیگم
عبدالحفیظ صدیقی بی ایس سی

جلد ۴ — بابت نومبر ۱۹۴۱ء — شمارہ ۱۱

۱	غزل	نواب امانت جنگ معین الدولہ مرحوم	۲
۲	گارساں دتاسی (اردو کا پہلا پروفیسر)	ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور ایم اے پی ایچ ڈی (لندن)	۳
۳	لاقوۃ الا باللہ	حکیم الشعراء سید احمد حسین امجد	۷
۴	غزل	نواب عزیز یار جنگ بہادر عزیز	۸
۵	یاس (افسانہ)	عزیزہ رضوانہ	۹
۶	آئیں گے (نظم)	علی اختر	۱۶
۷	تحفہ (افسانہ)	سید علی شاکر ایم اے	۱۷
۸	خزانہ باؤنی بٹیر	محمد ابراہیم بی اے ایم ایس سی بی ای اے ایم آئی ای انجینیر سرکار عالی [illegible]	۲۵
۹	نشری تقاریر	مرزا ظفر الحسن بی اے	۲۷
۱۰	ٹیگور (نظم)	مرزا سیمابی عالمپوری	۳۱
۱۱	ٹیگور اور موت (")	سردار علی الہام	۳۲
۱۲	من کے مندر کا پجاری (افسانہ)	سلیم النساء بیگم بی اے بی ٹی (گلبرگہ)	۳۳
۱۳	عشرت حزیں (نظم)	نظر حیدرآبادی	۳۵
۱۴	انیسویں صدی کے بعض سیاسی افکار	اکرام قمر بی اے (ہوشیارپوری)	۳۶
۱۵	علم ہیئت وجغرافیہ	سید اسمٰعیل فارغ التحصیل	۴۲
۱۶	عید (نظم)	سید محمد حسین آزاد	۴۶
۱۷	حیات نو (")	سید اختر حسن ایم اے (نظام کالج)	۴۷
۱۸	[illegible] (")	مظفر الدین ظفر (شاہد)	۴۹
۱۹	[illegible]	عابدہ زاہدہ سعید علی خاں	۴۸
۲۰	[illegible]	ادارہ	۴۹

غزل

یہ غزل نواب معین الدولہ مرحوم نے ادارہ کے مشاعرے منعقدہ ۱۵ ستمبر ۱۹۴۱ء کے لئے بطور خاص خانہ باغ پبلک سے آغازِ مشاعرہ سے کچھ دیر قبل روانہ فرمائی تھی جس کو اہلِ محفل نے بہت پسند کیا۔
یہ حیدرآباد کے اس سخن دوست امیر پائیگاہ کا آخری کلام ہے۔ (مدیر)

جسے غم ہو فرقتِ یار سے، جسے عشق ہو رخِ یار سے
اسے کیا خزاں سے ہے واسطہ، اسے کیا غرض ہے بہار سے

کبھی ایسا رنگِ جنوں نہ تھا، کبھی ایسا سوزِ دروں نہ تھا
کہوں کیا میں ہائے بہار کو، یہ لگی ہے آگ بہار سے

یہ جو دل میں ایک سرور ہے، یہ جو دل کو ایک سکون ہے
ترے بھولے پن کے نثار میں، نہ چمن سے ہے نہ بہار سے

مرا آشیانہ ہی جل گیا، مرا دل ہی سب سے اتر گیا
مجھے ضد ہے باغ کی سیر سے، مجھے چڑ ہے نام بہار سے

میں ہوں ایسے رنگ سے باغ میں، کہ کسی طرح کا بھی واسطہ
نہ تو گل سے ہے نہ تو خار سے، نہ خزاں سے ہے نہ بہار سے

ترے حسن پر ہیں نثار گل، ترے رخ پہ غش ہیں ہزار گل
مرے حق میں تو ہی بہار ہے، مجھے کام کیا ہے بہار سے

یوں ہی دن خزاں کے دکھائے گی یوں ہی سر پہ آفتیں لائیگی
جو چمن میں آئے بہار پھر، تو میں آنا پوچھوں بہار سے

نہ تو جیب رہا مرا، نہ تو پیرہن رہا پیرہن
جو بہار کا یہی رنگ ہے، تو خزاں ہی اچھی بہار سے

میں خیالِ پیرِ مغاں میں ہوں معینؔ رنگِ بیخودی کیا کہوں
نہ خزاں سے ہے مجھے آگہی، نہ میں آشنا ہوں بہار سے

نواب معین الدولہ مرحوم

اصغر یار جنگ نواب محمد ظہیر الدین خاں بہادر بی۔ اے (عثمانیہ)
رفیق ادارۂ ادبیات اردو و سابق صدر بزم اردو جامعہ عثمانیہ

گارساں دتاسی

(اردو کا پہلا پروفیسر)

ذیل کا مضمون ڈاکٹر زورصاحب کی زیر طبع کتاب کا ایک حصہ ہے۔ (مدیر)

گارساں دتاسی صحیح معنوں میں اردو کا پروفیسر تھا۔ اس نے اس زبان کی بہی خواہی کا ہر وہ کام کیا جو ایک مخلص پروفیسر کو کرنا چاہئے۔ نہ صرف اپنے طلبہ میں اردو کا ذوق پیدا کیا، بلکہ ہمیشہ اس امر کی کوشش کی کہ مختلف مقامات میں اردو کی درسگاہیں اور اردو کی پروفیسری قائم کی جائے اور زیادہ سے زیادہ لوگوں میں اردو کا ذوق پیدا ہو۔ لندن اور انگلستان کی دوسری قدیم یونیورسٹیوں کا تذکرہ کرتے ہوئے اس نے ۴ رفروری سنہ ۱۸۶۱ء کے خطبے میں اس امر پر زور دیا کہ آئرلینڈ، اسکاٹ لینڈ اور امریکہ میں بھی اردو کی پروفیسری قایم ہونی ضروری ہے۔ وہ کہتا ہے :-

"انگلستان کی قدیم ترین یونیورسٹیوں میں لندن میں اردو زبان کی تعلیم کو ناگزیر سمجھ کر رائج کیا گیا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ ڈبلن یونیورسٹی، اسکاچستان کی یونیورسٹیوں، اور امریکہ کی یونیورسٹیوں میں بھی اس کی طرف جلد توجہ کی جائے گی۔"

اسی طرح اس نے اس امر کی بھی تحریک کی کہ انگلستان کی یونیورسٹیوں میں ہندوستانیوں کو بھی اردو پڑھانے کے لئے مقرر کرنا چاہیے تاکہ انگریز صحیح اردو تلفظ اور لب و لہجہ سے واقف ہو جائیں۔ اس نے کہا :-

"بہتر ہوگا اگر کیمبرج یا اکسفورڈ میں کہیں ایک ایسا پروفیسر رکھا جائے جو اردو کا صحیح تلفظ اور تحریر و تقریر کی مشق کرائے جیسے کہ ہمارے ہاں (پیرس کے مدرسۃ السنہ میں) ایک زمانے میں دتاسی کے ساتھ مصری فاضل رفائل مونا شس اہل زبان ہونے کی حیثیت سے عربی کا تلفظ وغیرہ سکھاتے تھے۔" (تقریر ۴ رفروری سنہ ۱۸۶۱ء)

دتاسی نے یورپ اور خاص کر انگلستان کے ان کتب خانوں اور ان کے نگران کاروں کا بھی موقع بہ موقع ذکر کیا ہے جہاں اردو کتابیں اور قلمی نسخے محفوظ کئے جا رہے تھے۔ وہ ہر ایسی خبر سے خوش ہوتا تھا جس کا تعلق کسی نہ کسی طرح اردو سے ہوتا۔ اردو کتابوں کی اشاعت اور اخباروں کے اجرا کی جو اطلاع اسے ہندوستان سے ملتی اس کی خوشی میں اضافہ کا باعث ہوتی۔ سنہ ۱۸۶۰ء میں جب اس کو یہ معلوم ہوا کہ ہر اس انگریز کے لئے اردو پڑھنا لازمی کر دیا گیا ہے جو فوجی ملازمت کے لئے ہندوستان جانا چاہتا ہے تو دتاسی کو بے حد مسرت ہوئی۔ چنانچہ اس نے اپنے ۴ رفروری سنہ ۱۸۶۱ء کے خطبے میں بڑی خوشی سے اس کا اعلان کیا کہ :-

"یہ بھی خوشی کی بات ہے کہ آیندہ سے ان انگریزوں کے لئے جو ہندوستانی افواج میں نوکری کرنا چاہتے ہیں یہ لازمی قرار پایا ہے کہ اردو کے تین اقتباسات کا جن سے پہلے سے وہ واقف نہیں، انگریزی زبان میں ترجمہ کریں اس کے ساتھ ہی انھیں نظم و نسق کے متعلق کسی عبارت کا اردو سے انگریزی اور انگریزی سے اردو اور ہندی میں ترجمہ کرنا ہوتا ہے۔ یہ ترجمہ ایسا ہونا چاہئے کہ ہندوستانی آدمی بھی اس کی عبارت کا مفہوم سمجھ سکے۔ اس امتحان میں کسی ایک انگریزی خط کا اردو میں فی البدیہہ مطلب بھی بیان کیا جاتا ہے۔ ساتھ ہی امتحاناً ہندوستانیوں کے ساتھ اردو زبان میں گفتگو کرائی جاتی ہے۔"

اسی طرح ۱۸۶۵ء میں جب دتاسی کو معلوم ہوا کہ ہندوستان میں جگہ جگہ مقامی عدالتیں قایم کی جا رہی ہیں تو اس نے انگریزوں کو توجہ دلائی کہ وہ قانون پڑھ کر ہندوستان جائیں ۔ وکالت اور بیرسٹری کے ذریعہ سے قسمت آزمائی کریں لیکن اس ترغیب میں بھی اس کا اصل مقصد یہ تھا کہ لوگ اردو لکھنا پڑھنا سیکھیں چنانچہ ساتھ ہی بڑی خوبی کے ساتھ اس کی بھی تبلیغ کر دی ۔ وہ کہتا ہے :-

"ہندوستان میں آج کل مقامی عدالتیں ہر جگہ قایم ہو رہی ہیں ۔ ان نوجوان انگریزوں کے لئے جن کی اپنے وطن میں قدر نہیں یہ موقع ہے کہ وہ اس وقت ہندوستان میں اپنی قسمت آزمائیں ۔ لیکن اس سے پیشتر کہ وہ ہندستان جانے کا ارادہ کریں یہ ازبس ضروری ہے کہ وہ دیسی لوگوں کی زبان کو مطالعہ کے ذریعے سیکھیں انہیں ہندستانی لوگوں کے ان محاوروں کو جاننا چاہئے جو ہر وقت گفتگو میں استعمال ہوتے ہیں ۔"

۲۳ر جنوری ۱۸۶۰ء کو جب انڈین میل میں سید عبداللہ پروفیسر اردو (لندن یونیورسٹی) نے سر اسٹفورڈ نارتھ کوٹ (سکریٹری آف اسٹیٹ برائے ہند) کے نام ایک خط شایع کیا کہ "آیندہ سے حکومت ہند سول سروس کے مقابلہ کے امتحان میں ہندوستان کی بعض مروجہ اور زندہ زبانوں کو لازمی قرار دے" تو گارساں دتاسی نے اس کی پُر زور تائید کی اور سنسکرت اور عربی کے مقابلہ میں اردو جاننے کے جو عملی فوائد ہیں ان کو واضح کیا ۔ اس نے اپنی ۵ر دسمبر ۱۸۶۰ء کی تقریر میں کہا کہ "میں سید عبداللہ کے اس خط کے مضمون کے ساتھ بالکل متفق ہوں" اور اس کے بیان کی وضاحت کرتے ہوئے اس کی تائید کرتا ہے کہ :-

"سید عبداللہ نے اپنے اس خط میں یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ سول سروس کے ہر امیدوار کے لئے یہ لازمی قرار دینا چاہئے کہ وہ ملکی زبان میں پوری دسترس حاصل کرے ۔ شکستہ تحریر بآسانی پڑھ سکے ۔ اور اس زبان سے انگریزی میں اور انگریزی سے اس زبان میں بخوبی ترجمہ کر سکے ۔ در اصل یہ تمام باتیں نہایت ضروری ہیں ۔ چنانچہ زمانے ایسٹ انڈیا کمپنی نے ہیلی بری کالج کے طلبہ کے لئے انھیں لازمی قرار دیا تھا ۔"

اس بحث کو ختم کرتے ہوئے اس قسم کے مباحث کے فوائد اور حکومت کو متوجہ کرتے رہنے کی ضرورت جس طریقہ سے ظاہر کی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ گارساں دتاسی اردو کے حقوق کی حفاظت اور اس کی تائید کے لئے کس شدت کے ساتھ کمربستہ رہتا تھا ۔ وہ کہتا ہے کہ :-

"حکومت کو اس جانب توجہ دلاتے رہنا مفید ہے ...... اس واسطے کہ ہندستانی ہی ملک کی مشترک زبان ہے اور جیسا کہ میں بارہا پہلے بتا چکا ہوں اہل ہند کا ایک بڑا اور اہم طبقہ اس کے ذریعے اظہار خیال کرتا ہے ۔ اور ملک کے طول و عرض میں اس کے بولنے اور سمجھنے والے ملتے ہیں ۔ ان تمام امور کو مد نظر رکھتے ہوئے ان لوگوں کو جو حکومت کی خدمت انجام دے رہے ہیں اس زبان کا سیکھنا ازبس ضروری ہے ۔"

گارساں دتاسی اردو اور ہندی دونوں کا یکساں ماہر تھا ۔ اس نے ابتدا ہی سے دونوں زبانوں سے متعلق کتابیں لکھیں ۔ لیکن ان دونوں میں وہ اردو کو ترجیح دیتا تھا اور انگریزوں کے اس رجحان کی مخالفت کرتا تھا جو ہندی کو اردو کے مقابلے میں لاکھڑا کرنے کے لئے روز بروز شدت پکڑتا جا رہا تھا ۔ اس نے اپنی اکثر تقریروں میں اس رجحان کی مذمت کی ۔ تقریباً پچاس سال کے تجربہ اور اردو اور ہندی دونوں کی تعلیم و تعلم نے

اس کو اپنے ایقان میں پختہ بنا دیا تھا۔

چنانچہ وہ کسی مسئلہ میں اس شدت اور آزادی سے اپنے خیالات کا اظہار نہیں کرتا تھا جتنا کہ اردو کی تائید کے لئے کرتا۔ اس کی آخری تقریروں سے ایک (۲ر دسمبر ۱۸۶۹ء) میں اس نے اردو، ہندی جھگڑے کے ذکر میں علی الاعلان کہا کہ :۔

"اردو نے ہندستان میں جو حیثیت قایم کرلی ہے وہ باقی رہے گی۔ وہ اگر چاہیں کہ لوگوں کو عربی اور فارسی الفاظ ترک کرنے پر آمادہ کریں تو اس میں بھی انہیں کامیابی نہیں ہو سکتی۔ اس واسطے کہ اسلامی حکومت کے زمانے میں صدیوں سے جو الفاظ عام زبان پر چڑھ گئے ہیں وہ آسانی سے ترک نہیں کئے جا سکتے۔ ان کی کوشش بالکل ایسی ہوگی جیسے انگریزی فضلاء یہ فیصلہ کریں کہ ان کی قوم ان فرانسیسی الفاظ کا استعمال ترک کر دے جو انگریزی زبان میں نارمن فتوحات کے بعد گھل مل گئے ہیں۔"

اس بحث پر بطور نوٹ کے گارساں دتاسی لکھتا ہے کہ "مئی ۱۸۶۹ء کے کلکتہ ریویو میں میری ناچیز رائے سے موافقت کا اظہار کیا گیا ہے جو میں نے کلکتہ کی ایشیاٹک سوسائٹی کے اس جلسہ کے متعلق ظاہر کی تھی جس میں اس پر بحث ہوئی تھی کہ آیا اردو کو زیادہ اہمیت حاصل ہے یا ہندی کو۔ اس ریویو نے لکھا ہے کہ :۔

"موسیو گارساں دتاسی نے اردو کی حمایت میں جو اظہار خیال کیا ہے وہ ہمیں ٹھیک معلوم ہوتا ہے۔"

۴ر جولائی ۱۸۶۹ء کے "بمبئی پولا" میں میرے خیالات کو بنظر استحسان دیکھا گیا ہے۔" اس مذکورۂ بالا تقریر کے سلسلہ میں گارساں دتاسی نے کہا :۔

"میں اور مسٹر بیمز (M. Beams) اردو کی حمایت میں تنہا نہیں ہیں...... ہم نہ اس کے قایل ہیں کہ عربی، فارسی الفاظ اردو میں سے خارج کر دئے جائیں اور نہ ہم ہندی کو بے وجہ اردو پر فوقیت دینا مناسب سمجھتے ہیں۔"

اس تقریر سے دو سال قبل ۴ر دسمبر ۱۸۶۷ء کا افتتاحی خطبہ شروع کرتے ہی اس نے اردو، ہندی جھگڑے کی طرف اشارہ کیا اور کہا کہ :۔

"بہر نہج لوگوں کا خیال ہندستانی کی نسبت چاہے کچھ بھی ہو لیکن اس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ وہ سارے ہندستان کی مشترک زبان بن گئی ہے۔ روز بروز اس کی جو ترقی ہو رہی ہے اس کی وجہ سے وہ پورے دیس کی زبان کہی جا سکتی ہے۔ اس مسئلہ کی نسبت کپتان ایچ مور (H. Moore) نے اپنی رائے سے مجھے مطلع کیا ہے۔ موصوف مرکزی حکومت میں ترجمان کے عہدے پر فائز ہیں۔ آپ کے الفاظ یہ ہیں :۔

"اس زبان کے توسط سے لاکھوں اہل مشرق تبادلۂ خیالات کرتے ہیں۔ ریل کی وجہ سے جو اندرون ملک میں ہزار میل کی مسافت پر پھیل گئی ہے اور بھی ہندستان اور وسط ایشیا کے لوگوں کو ملنے جلنے کا موقع ملا ہے۔ چنانچہ جب یہ لوگ ملتے ہیں تو ایک مشترک زبان کی ضرورت کو محسوس کرتے ہیں۔ ہندستانی زبان اس مقصد کو بطریق احسن پورا کرتی ہے۔ اس لئے کہ اس کی ساخت میں ہندی، فارسی اور عربی کے عنصر شامل ہیں۔ اس زبان میں بدرجۂ اتم یہ صلاحیت پائی جاتی ہے کہ ہندو اور مسلمان دونوں کے مقاصد کو پورا کرے۔"

غرض کہ اپنے [illegible] کے خیالات بیان کرنے کے بعد دتاسی نے اس بحث کی وضاحت کی [illegible]

جس کو وہ اپنا چہیتا موضوع کہتا ہے۔

"میں اب اپنے چہیتے موضوع کی طرف رجوع کرتا ہوں یعنی اردو کی ہندوستان میں اہمیت"

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اردو کا کتنا دلدادہ تھا۔

دتاسی نے آج سے ستر سال قبل ہندستان کے اردو ہندی جھگڑے کی نسبت جو صحیح اندازہ قایم کیا تھا وہ آج کل کے بڑے بڑے حامیانِ اردو کے لئے سبق آموز ہے اور سچ تو یہ ہے کہ کچھ عرصہ سے بعض اصحاب نے اس جھگڑے کی علمبرداری کر کے جو شہرت اور اہل اردو کی جو ہمدردیاں حاصل کی ہیں وہ گارساں دتاسی ہی کی ان تحریروں کے مطالعے اور اس کے دلائل کے استعمال کا نتیجہ ہے۔ عہد حاضر کا اردو کا بڑے سے بڑا سیاسی مدبر بھی دتاسی ہی کا خوشہ چیں ہے۔ وہ اردو کی تائید میں ایسی مدلل، ثقہ اور وزنی تحریریں لکھ گیا ہے جو ہمیشہ اردو کی تائید اور مدافعت کرنے والوں کا مضبوط حربہ ثابت ہوں گی۔ اس نے اپنے ۹ر دسمبر ۱۸۶۹ء کے خطبہ میں کہا تھا۔

"عجیب بات ہے کہ جس طرح آج کل یورپ میں ایک تحریک اٹھی ہے جس کا نصب العین یہ ہے کہ پھر سے ازمنۂ وسطیٰ کی طرف رجوع کیا جائے اور ان زبانوں کو زندہ کیا جائے جو اب بولیاں ہو کر رہ گئی ہیں اسی طرح ہندستان میں بھی ازمنۂ وسطیٰ کو زندہ کرنے کی کوشش ہو رہی ہے ...... ہندوستان میں بھی ازمنۂ وسطیٰ کی ادبیات کو قدر اور احترام کے ساتھ دیکھا جا رہا ہے۔ اس وقت ہندی کی حیثیت بھی ایک بولی کی سی رہ گئی ہے جو ہر گاؤں میں الگ الگ طریقے سے بولی جاتی ہے چنانچہ ہندوؤں کی کوشش ہے کہ اردو کی بجائے ہندی کو فروغ دیا جائے حالانکہ اردو بہ نسبت ہندی کے زیادہ شستہ ہے۔ لیکن ہندی ان کے نزدیک خالص ہندستان کی زبان ہے اس واسطے کہ وہ سنسکرت سے نکلی ہے۔ ان کو یہ نہیں سوجھتا کہ اردو زبان میں فارسی اور عربی کی ساری خوبیاں جمع ہو گئی ہیں۔ یہ دونوں زبانیں (فارسی وعربی) اسلامی مشرق کی قابل احترام السنہ ہیں اور دنیا کے تمام علما و فضلا ان دونوں کو ہمیشہ سے اسی نظر سے دیکھتے آئے ہیں"

اس کے بعد دتاسی نے اہل اردو اور اہل ہندی کے دلائل کا ایک دوسرے سے مقابلہ کیا ہے اور آخر میں برطانوی حکومت کی حمایت ہندی کی اس طرح تشریح کرتا ہے:-

"برطانوی حکومت اس تحریک کے موافق معلوم ہوتی ہے حکومت کا خیال ہے کہ ہندی کی موافقت سے ہندو لوگ خوش ہو جائیں گے اور چونکہ ہندستان کی آبادی کی کثرت انہی پر مشتمل ہے اس لئے ہندی کی تائید ملکی مصالح پر مبنی ہے"

ہندی کی تائید میں انگریزی اخبارات میں جو اداریے اور مقالے شایع ہوتے تھے ان کا ذکر کر کے دتاسی نے ان کی مخالفت کی ہے اور کہتا ہے کہ:-

"میرے خیال میں اس مقالہ میں ہندی کی تائید میں جو استدلال پیش کیا گیا ہے وہ صحیح نہیں اور جو دعوے پیش کئے گئے ہیں ان پر بحث کی جا سکتی ہے لیکن اس جگہ میں اسے چھیڑنا نہیں چاہتا۔ اس مقالے میں اردو کے متعلق کم از کم یہ تو تسلیم کیا گیا ہے کہ اس نے ہندوستان میں وہی حیثیت حاصل کر لی ہے جو فرانسیسی زبان کو یورپ میں حاصل ہے۔ عدالتوں اور شہروں میں اردو بولی جاتی ہے۔ مصنفین اپنی کتابیں اسی زبان میں تصنیف کرتے ہیں اور اسی کی غزلیں گائی جاتی ہیں اردو ہی کے ذریعے اہل ہند یوروپین لوگوں سے گفتگو کرتے ہیں۔ غرض کہ اگر ان تمام امور کو پیش نظر رکھا جائے تو اردو

کو ہندی پر فضیلت حاصل رہتی ہے جسے تسلیم کیے بغیر چارا نہیں۔"

غرض اسی طرح اردو کی موافقت میں دتاسی نے طویل بحثیں کی ہیں جو اس خطبے کے کئی صفحات پر مشتمل ہیں اور دوسری تقریروں میں بھی جگہ جگہ اس قسم کی بحثیں اور دلیلیں نظر سے گزرتی ہیں۔ چونکہ اس کے خطبات کے اردو تراجم شائع ہو چکے ہیں اس لئے یہاں مزید مثالوں کی ضرورت نہیں۔

سید محی الدین قادری زور

لاقوۃ الا باللہ

کسی پردے یا اوٹ کے پیچھے سے اگر کبھی کوئی لکڑی نمودار ہو کر ہم کو مارے۔
اور لکڑی کے سوا دوسری کوئی چیز نظر ہی نہ آئے تو اس وقت ہم کہتے ہیں کہ

ہم کو لکڑی نے مارا

(۲) اس کے بعد اگر صرف کوئی ہاتھ نمودار ہو کر ہم کو لکڑی سے مارے تو اس وقت ہم کہتے ہیں کہ "ہم کو ہاتھ نے مارا"

(۳) اس کے بعد اگر کوئی شخص یا ذات برآمد ہو کر ہم کو لکڑی سے مارے تو اس وقت ہم کہتے ہیں کہ ہم کو "فلاں شخص نے مارا"

ان تینوں صورتوں میں ضرب کا صدور تو لکڑی ہی سے ہوا ہے لیکن صورت اول میں

ضرب کا فاعل لکڑی کو ٹھرایا ہے ؛

صورت دوم میں ہاتھ کو فاعل ٹھرایا ہے۔

صورت سوم میں ذات یا شخص کو فاعل ٹھرایا ہے۔ ھذا مبلغھم من العلم

رباعی

برہان و دلیل سب معطل ہو جائیں　　جتنے جھگڑے ہیں دم میں فیصل ہو جائیں

ہر چند بہت سوال لاینحل ہیں　　تم سامنے آجاؤ تو سب حل ہو جائیں

امجد حیدرآبادی

غزل

تم کو سوجھی ہے دل لگی کیسی　　میرے رونے پہ یہ ہنسی کیسی

جان پر بن گئی محبت میں　　موت ہے! موت! عاشقی کیسی

رس بھری آنکھ تیری اے ساقی　　مست کردے گی بے خودی کیسی

گلشنِ حسن ہے چمن کیسا　　دہنِ تنگ ہے کلی کیسی

عقدہ قسمت کا کھل نہیں سکتا　　یہ گرہ تم نے ڈال دی کیسی

پی لیا ڈگ ڈگا کے ساغرِ مے　　میکشوں کی ہے میکشی کیسی

چھا گیا حسن تم پہ یہ کیسا　　آ گئی تم میں نازکی کیسی

میرے ہی واسطے مرے ساقی　　یہ بخالت یہ جز رسی کیسی

جگمگاتی ہیں آج تک آنکھیں　　برقِ نورِ جمال تھی کیسی

طالبِ دید ہو اگر موسیٰ　　ہوش میں آؤ بے خودی کیسی

کھل گیا غنچۂ مرادِ عزیزؔ
یہ ہوا آج چل گئی کیسی

نواب عزیز یار جنگ بہادر عزیزؔ

یاس

"سوچتی کیا ہو شہناز۔ دو ایک روز سے میں تمھیں کھوئی کھوئی سی دیکھ رہی ہوں" صالحہ نے شہناز کے گلے میں محبت سے اپنی باہیں ڈالتے ہوئے کہا۔ "ہاں ——— چند حسین تصورات میں" شہناز نے جواب دیا۔

"حسین تصورات؟" صالحہ متعجب ہوگئی۔ "کیوں خیر تو ہے؟ کیسے تصورات؟ کاہے کے تصورات؟"

"ایسے تصورات صالحہ جن کی ابتدا مسرت آمیز رہی لیکن انتہا نہایت رقت انگیز اور المناک۔"

"تمھیں ہو کیا گیا ہے شہناز؟ ایسی اکھڑی اکھڑی باتیں کیوں کرتی ہو؟ ——— معلوم ہوتا ہے زندگی سے بیزار آگئی ہو۔" صالحہ ہنس کر بولی۔

"ہاں کچھ یوں ہی ہے بہن صالحہ! اگر زندگی صرف سانس کی آمد و شد کا نام ہے۔ حیات انسانی اگر کسی بڑی قوت کا کھیل ہے تو پھر خیر سے میں یہ دعا کروں گی کہ یہی ساعت میری زندگی کی آخری ساعت ہو جائے اور اسی وقت میں بقید مرگ ہو جاؤں ——— زندگی کے ستم اب مجھ سے اٹھائے نہیں جاتے۔"

"آج کیا بات ہے۔ میں نے اس سے پہلے تو تمھیں کبھی اس قسم کی باتیں کرتے سنا نہیں ——— ماجرا کیا ہے۔ کچھ کہو گی بھی" صالحہ نے شہناز کے سرخ گالوں کو چوما۔

"اوتھ۔ ماجرا" شہناز نے میز پر رکھی ہوئی کتابوں کو گھورتے ہوئے کہا "کہا نا کہ بس زندگی سے اکتا گئی ہوں ——— اچھا چلو تھوڑی دیر پائین باغ میں تفریح کر لیں ——— نرم ہوائیں دماغ کو کچھ سکون تو پہنچائیں گی" یہ کہہ کر [illegible] صالحہ نے [illegible] سے پھر سے کرسی پر بٹھا دیا۔

"میری جان کی قسم" اس نے ٹھیٹ نسوانی انداز میں کہا "تمہیں آزردہ دیکھ کر میرا دل نہیں کہتا کہ تفریح کروں۔ دل تڑپ رہا ہے کہ تسلی بخش گفتگو سے تمہارا دل بہلاؤں اچھا کیا تم نے کسی سے محبت ....."

"تم نے مجھے پھر سے ایک عجیب کشمکش میں ڈال دیا" شہناز نے جواب دیا "خدا کے لئے یہ باتیں چھوڑو کہیں پھر پرانے جذبات عود نہ کر آئیں۔ اور پھر گزرے ہوئے واقعات کی تجدید نہ ہو جائے تمہاری قسم! ذرا مجھے پائین باغ میں چلی جانے دو۔"

"سمجھ گئی" صالحہ نے زیر لب مسکراتے ہوئے کہا۔ "تو پھر تم نہ کہو ——— مگر یاد رکھو ——— نہ مانو گے تو روٹھ جاؤ گے"

"اور پھر بیٹھے ہی اس لئے ہیں" شہناز نے گویا عالم ناامیدی میں کہا "حزن و یاس ہماری سرشت ہی میں لکھے ہیں ——— اری تم کیا آئی ہو منانے"

"اچھی بہن شہناز" صالحہ نے شہناز کی پیشانی چومتے ہوئے کہا "اس سے غیریت جیسے تم اپنا جانتی ہو۔ اس سے پردہ ہیچ تم نے کبھی بے اعتمادی کا گمان تک نہیں کیا۔ اس سے حجاب جس کی رفاقت پر تمھیں ناز ہے ———"

"درد بھرے نالے سن کر کیا کروگی صالحہ"

"تمہارے دل کا بوجھ ہلکا کروں گی۔ اور میں کر ہی کیا سکتی ہوں ——— یہ لو ننھی اری تو کدھر آ نکلی۔"

"امی آپ کو بلاتی ہیں" ننھی نے اپنی گڑیا سنبھالتے ہوئے کہا۔ "اچھا چل میں ابھی آتی ہوں" صالحہ نے جواب دیا ——— ننھی دوڑتی ہوئی کمرے سے باہر ہوگئی۔ شہناز۔ آسمان پر چھائے ہوئے نیلے بادل فضا میں ایک عجیب کدورت پیدا کر دیتے ہیں اور جب تک یہ ہٹ نہ جائیں فضا صاف نہیں ہوتی ——— میں کہتی ہوں کہ [illegible] کرنے کا ایک طریقہ [illegible]

ہو سکتا ہے تم رو دیا ہو —'

'ابھی صالحہ' شہناز کی آنکھوں سے دو گرم آنسو نکل کر اس کے گالوں پر بہنے لگے دنیا میں اگر کوئی میرا ہوتا! باپ کو تو مرے کئی برس گزر گئے۔ اگر ماں بھی جی جاتیں تو میں اس جانکاہ صدمے کو ان کی خدمت میں لگ کر بھلا دیتی۔ بھائیوں بہنوں سے تو خدا نے محروم ہی رکھا۔ اب وہ جو خالہ زاد بھائی بہنیں ہیں تو انھیں مجھ سے کیا دلچسپی۔ میں تو ان کے لئے عذاب جان ہوں' ایک بلائے ناگہانی ہوں —— تمھیں اب لے دے کے میری ادھوری ہو —— بتاؤ صالحہ ابدی حیات حاصل کرنے کا کوئی تدابیر —— موت کو دعوت دینے کی کوئی ترکیب —— اس دنیا میں کتوں کی سی زندگی گزارنے سے فائدہ۔ —— جسے اپنا سمجھ کر دل دیا تھا۔ وہ بھی بے وفا نکلا ——' صالحہ نے شہناز کے ساتھ ٹپ ٹپ آنسو بہائے —— 'میرے ماں باپ تھوڑی بہت پونجی نہ چھوڑتے تو شاید بی اے کا امتحان دینے کے لئے میں کبھی لاہور کی صورت بھی نہ دیکھتی —— صالحہ پیاری۔ شدت غم مجھے کھائے جاتا ہے۔ اپنی داستان میں نے آج تک کسی کے آگے بیان نہیں کی۔ لیکن تم مجھے مجبور کرتی ہو تو لو سنو۔ لیکن جانو! میں اسے کسی افسانے کی صورت بیان کروں گی اور نہ .... ہاں۔ صنوبر کے درخت جب ہوا کے تھپیڑوں سے جھومنے لگتے ہیں تو ان کے ان جھونکوں سے ایک عجیب رومانی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ زندگی کا ہر سانس پوشیدہ خواہشوں کو عمل کا جامہ پہنانے کا متمنی ہوتا ہے۔ رعنائی انگڑائیاں لیتی ہے۔ دل مچلتا ہے —— حسن تڑپتا ہے۔ عشق کروٹیں بدلتا ہے —— زندگی کی وہ حسین شام —— آہ میں کبھی بھول نہیں سکتی —— تمناؤں کی وہ بے چینی —— مجھے ہمیشہ یاد رہے گی —— اور پھر دل کو ایک سکون —— میں کبھی فراموش نہیں کر سکتی —— صنوبر کے سایہ میں میرے دل کے ارمانوں کی تڑپ —— کیسے حسین دن تھے وہ بھی' محبت بھرے ارمان بھرے۔ "فضا" میں نے شام کی ڈھلتی ہوئی دھوپ میں ایک سائے کو رینگتے ہوئے کہا۔ 'ذرا ادھر دیکھئے'۔ میرا دل بیٹھ گیا سائے نے پلٹ کر جواب دیا 'معافی چاہتا ہوں۔ شاید آپ کو دھوکا ہوا ہو نا تو ن —— میرے رب! —— 'معافی کی خواستگار ہوں' میں نے لجاجت سے اپنی ساری کی کور کو سلتے ہوئے کہا۔ 'مجھ سے غلطی ہو گئی'۔ نیلے آسمان!۔ 'اوہ شہناز' سایہ میری طرف بڑھنے لگا۔ اور ایک تعجب خیز مسکراہٹ سے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈالا۔ 'تم نے مجھے شاید ارشد سمجھا —— این'

"ہاں —— نہیں تو —— بہرحال آپ مجھے معاف کریں' میں نے سائے سے التجا کی" میں نے جسارت سے کام لیا۔'

'ان کتابوں کی قسم' سائے نے اپنی کتابیں میری طرف بڑھائیں' تم سے ایسی کونسی غلطی ہو گئی جو معافی مانگتی ہو۔'

'غلطی! —— جی ہاں —— فاش غلطی —— کر دیجئے نا معاف'

"تمھاری یہی خواہش ہے تو پھر لو معاف کیا —— ارشد کو ڈھونڈھ رہی تھیں ؟ ——'

'نہیں تو' میں نے جواب دیا۔' میں ارشد کو نہیں ڈھونڈ رہی تھی —— صنوبر کے سایوں میں زندگی کے لطیف جذبات کو ابھار رہی تھی —— خیالات میں بلند پروازی پیدا کر رہی تھی۔ دل کی دبی ہوئی چنگاریوں کو سرے سے مشتعل کرنے کی سعی کر رہی تھی —— لیکن یہ سعی کچھ ناکام ہی رہتی نظر آتی ہے —— اور معاف کیجئے گا۔ میں آپ سے یکایک آج کھل گئی —— پہلی ہی گستاخی کیا کر رہی تھی جو میں نے —— زندگی بھر میں پہلی بار آج ایسی سیٹھی باتیں سننے کا اتفاق ہوا ——

اور تم کہتی ہو کہ یہ گستاخی ہے، غلطی ہے گناہ ہے ــــ اگر گناہ بھی ہے تو مقدس گستاخی بھی ہے تو پاکیزہ، غلطی ہے تو قابل فراموش ــــ سایہ مجھ سے قریب ہوتا گیا۔ میرے دل کی دھڑکن ایک نامعلوم خیال کے تحت تیز ہوتی جا رہی تھی ــــ میرے مالک!

"شہناز ــــ" ایک دبی ہوئی آواز فضاء میں گونجی۔ اور مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے کسی نے غیر ارادی طور پر اپنے بڑے بڑے ہاتھ میرے برہنہ بازوؤں پر رکھ دیئے ــــ ایک پھریری سی میرے جسم نے محسوس کی ــــ میں بدستور اپنی آسمانی رنگ کی کور کو مسل رہی تھی ــــ ؎

گونجتے ہیں شباب کے نغمے
مستیٔ بے حساب کے نغمے

افق مغرب پر سورج کی سرخ ٹکیہ پیام وداع دے رہی تھی۔ ہوا کے نرم نرم جھونکے دل اور دماغ میں ایک تازگی سی پیدا کر رہے تھے۔ اور سائے ڈھل رہے تھے! او خدا کیا دل کو موہ لینے والا منظر تھا ــــ صنوبر کے درخت اسی نزاکت کے ساتھ جھول رہے تھے۔

"کیسی حسین شام ہے ــــ" اظہر نے فرحت بخش ہواؤں کے نرم تھپیڑوں سے متاثر ہو کر کہا ــــ

"حسین ترین" میں نے جواب دیا ــــ اور میری نظریں خود بخود اٹھ گئیں ــــ دوچار ہوئیں ــــ ایک عالم مدہوشی تھا ــــ ایک حسن پوشیدہ بے نقاب ہو رہا تھا ــــ اور پھر یکایک دونوں کی نظریں جھک گئیں ــــ ؏

نیچی نظروں میں کیا نہیں ہوتا ــــ

اس دل کے تصدق جو محبت سے بھرا ہو
[illegible] بھی

زندگی کا ساز چھڑ گیا۔ دل کی وادیوں میں مسرت کے نغمے گونجنے لگے۔ اور نا امیدیوں کا گھٹا ٹوپ اندھیرا انبساط اور خوشی کی روشنی میں تبدیل ہونے لگا ــــ رباب حیات کا تار تار والہانہ انداز میں کرشمے دکھا رہا تھا ــــ آہ کتنی مسرور شام ــــ "شہناز ــــ" اظہر کہنے لگا ــــ "ذرا رک رک کر ــــ ... پیاری ..... شہناز ــــ محبت کے گرم سانس اثر کئے بغیر نہیں رہتے۔ محبت لافانی ہے۔ انسانی حیات کی ہر خزاں رسیدہ شام محبت ہی کی بدولت صبح بہاراں میں بدلتی ہے ــــ محبت ہی راجا ہے اور محبت ہی پرجا ــــ محبت ہی کی کڑی خالق و مخلوق کو ایک دوسرے سے قریب تر کرتی ہے ــــ محبت ہی ایک ایسا جذبہ ہے جو دلوں کو گرماتا ہے۔ خالق عالم نے اگر محبت کی تخلیق نہ کی ہوتی تو حیات انسانی کا وجود ہی نہ ہوتا۔ اور اگر ہوتا بھی تو محض بے کار ــــ ایک سوکھے ہوئے تالاب کی طرح بے سود۔ پت جھڑ درختوں کی طرح بے فائدہ ــــ یہ صنوبر کے درخت جو مستانہ وار جھوم رہے ہیں محض ایک چنگاری سے مشتعل ہو کر ــــ وہ محبت کی چنگاری ہے' اپنے خالق کی محبت! کائنات کا ذرہ ذرہ خود میں ایک وسعت لئے ہوئے، ساقی عالم کی محبت میں سرشار ہے ــــ کہو شہناز ــــ کیا تم اپنے دل کو اس نعمت غیر مترقبہ سے مملو نہیں پاتیں ــــ! کیا تم میں محبت کا خیال کروٹیں نہیں لیتا ــــ کیا تمہارا دل محبت کی غیر فانیت سے متاثر نہیں؟"

"اظہر ــــ تم میرے دل کی خوابیدہ جذبات کو جگا رہے ہو ــــ مجھے ایک ایسی غیر فانی دنیا میں گھسیٹ رہے ہو جہاں کا ذرہ ذرہ محبت ہی کے نشے میں چور ہے جہاں زندگی کی کشتیاں محبت ہی کے حسین آغوش میں کھیتی ہیں ــــ جہاں حسن ہے محبت ہے عشق ہے اور پھر دل ہیں ــــ عشق کی

گہرائیوں میں ڈوبے ہوئے محبت کی منور شعاؤں سے روشن ــــ حسن کی نگاہوں کے گھائل ــــ ہاں اظہر آج کی شام نہایت حسین ہے ــــ اتنی حسین جتنے ــــ محبت کا ایک دھندلا تصور مجھے اظہر کے قریب دھکیل رہا تھا۔

" ہاں تم روشن ضمیر ہو شہناز" اظہر کے خوبصورت ہونٹوں پر تبسم کھیل رہا تھا" ــــ آج سے ٹھیک ایک سال پہلے کا وہ دن مجھے اب تک یاد ہے جب تم نے اپنے تیر نظر سے مجھے محبت کے دیوتا کی دنیا میں لا بسایا تھا مجھے وہ دن اب تک یاد ہے جب تم پہلی مرتبہ ہمارا کرکٹ میاچ دیکھنے آئی تھیں ــــ اُف کیسا دن تھا وہ بھی ــــ آسمان پر بادل چھائے ہوئے۔ ہلکی ہلکی پھوار، سرد ہوائیں، ہماری جیت کے آثار ــــ اور سب سے بڑھ کر تمہارا خوشی میں وہ تالیاں بجانا۔ وہ مسرت اور شادمانی میں اچھلنا کودنا ــــ مجھے اب تک یاد ہے وہ دن شہناز ــــ لیکن ارشد ــــ شائد یہ کہہ کر وہ رک گیا ــــ اور دو آنسو گہر آبدار کی طرح اس کی عینک کے نیچے سے ہوتے ہوئے اس کے گالوں پر آ ٹھیرے ــــ میں بیتاب ہو گئی۔

' بخدا اظہر' میں نے اس کے آہنی بازوؤں کو اپنی گرفت میں لے لیا' ارشد میرا بھائی ہے۔ چھوٹا بھائی ــــ سچ جانو ــــ وہ میرا خالہ زاد بھائی ہے۔ میں اس کے ساتھ بطور ــــ بطور اس کے گران پھرا کرتی ہوں ــــ اپنی خالہ کے حکم سے ــــ اسی دن سے یہ دل تمہارے بے پناہ حسن اور محبت کے ایک ہی حقیقی جذبہ سے متاثر ہے ــــ کہو کیا تمہیں یقین نہیں آتا ــــ آہ کاش میں اپنا دل نکال کر تمہارے آگے رکھ سکتی ــــ '

' اچھی شہناز' اظہر نے کہا ــــ اور پھر ہم دونوں ایک دوسرے سے قریب ہو گئے۔ میں نے پہلی بار محسوس کیا کہ میری زندگی مسرت وانبساط سے مخمور ہے۔

چودھویں رات کا چاند ضوفشانی کر رہا تھا۔ اور اس کی روپہلی کرنیں صنوبر کے درختوں سے چھن چھن کر گنگا جمنی منظر پیدا کر رہی تھیں۔ ستارے آسمان کے سیاہ پردے پر ایک عجیب شان سے جھلملا رہے تھے ــــ ع

زندگی کی ہائے وہ اک رات کیا پرکیف تھی

' یہ ہماری محبت کی نشانی' اظہر نے میری پیشانی کو چوم چوم لیا۔ میں ندامت اور خوشی کے بے پناہ سیلاب میں ڈوب گئی۔ 'تم نے آج تک مجھ سے شرارت کی۔ میں اب تک خاموش رہا کہ مبادا تمہاری دل آزاری ہو۔ اور ابھر آنے والے جذبات کے ایک ریلے کو دل میں روکے رکھا ــــ تم نے بھی بھڑک اٹھنے والے ان شعلوں کو دبائے رکھا ــــ میں تخیلات میں گم رہا۔ اور تم اندر ہی اندر میرے تخیلات کی ان سوکھی ہوئی کلیوں کی آبیاری کرتی رہیں ــــ لیکن آج ــــ "

" آج کا دن دنیا بھر کے لئے مسرت کا دن ہے" ہم دونوں ایک زبان ہو کر بول اٹھے" لیکن نہیں ــــ صرف ہماری ہی دنیا کے لئے مسرت کا دن ہے" اظہر نے میری طرف دیکھ کر کہا۔ ' ٹھیک ہے ــــ اور آج کی شام بھی نہایت حسین ہے۔ بہت حسین' وہ مجھے چھوڑ کر چلا گیا ــــ

رہزنی ہے کہ دل ستانی ہے
لے کے دل دلستاں روانہ ہوا

ہماری محبت کا رشتہ قایم رہا اور سچ کہو تو یہ کڑی روز بروز مضبوط ہی پکڑتی جاتی تھی۔ کالج کی کیف آور اور مست فضاؤں میں ہماری محبت کی صدائیں گونجنے لگیں۔ سچ اظہر کے بادل بہت جلد چھٹ گئے۔ اور دلچسپیاں بڑھتی گئیں ــــ اب امتحانات کے دن قریب آ چکے تھے ــــ لیکن ہم دونوں

محبت میں ایسے مست، عشق کی فضا میں ایسے مگن اور مسرت آمیز خیالات کے سیلاب میں ایسے بہے جا رہے تھے کہ نہ ہمیں امتحان کی فکر تھی اور نہ کامیابی کا خیال ــــ اظہر نے تو خیر کچھ تیاری کی بھی تھی۔ لیکن میری یہ حالت، کہ جیسی کوری کالج میں داخل ہوئی تھی ویسی کی ویسی ہی رہی ــــ بادلِ ناخواستہ امتحان تو دے دیا ــــ دیکھو کیا ہوتا ہے۔

میری اس حالت کو دیکھ کر چو طرف سے اظہارِ تاسف ہونے لگا۔ اور ہر ایک کو مجھ سے ہمدردی ہو گئی ــــ صبیحہ نے اپنی زریں نصیحتوں سے مجھے واپس اس راستہ پر لانا چاہا جہاں سے میں نے اس سفر کا آغاز کیا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ اس مقام سے میرے لئے کوئی اور راستہ تجویز کرے ــــ لیکن پیاری صالحہ! سچ جانو۔ صبیحہ کی باتیں صبیحہ کی ہمدردانہ گفتگو، اس کی پاک محبت۔ اس کی نصیحتیں، کوئی چیز کام نہ آ سکی۔ میں نے اتنی لانبی مسافت طے کر لی تھی کہ واپس ہونا مجھے دوبھر معلوم ہو رہا تھا۔ خوش گوار سفر تھا ــــ آہ کتنا خوش گوار سفر ــــ صالحہ سچ کہتی ہوں استادوں کی گھرکیاں اور پرنسپل صاحب کی شفقت آمیز تقریریں بھی ہماری راہِ محبت میں حائل نہیں ہو سکیں۔

اس واقعہ کے پندرہ بیس روز بعد ــــ میں اپنے کمرے میں بیٹھی اظہر کی خیالی تصویر اپنی نظروں کے آگے کھینچ رہی تھی کہ کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا ــــ میرا تنفس تیز ہو گیا اور میں سمجھی کہ شاید اظہر ہے۔ میں نے اندر سے دریافت کیا کون ہے، جواب آیا "میں صبیحہ"۔

تب میں نے ٹھنڈا سانس لیا، اور اٹھ کر دروازہ کی چٹخنی کھولی۔ صبیحہ پیاری ــــ میں نے مسکراتے ہوئے کہا "آؤ آج تم کہاں

تھیں اتنے دنوں سے۔" "اری میں تو اپنے ماں باپ کے گھر گئی تھی ــــ" اس نے کہا "میری یہاں اور کیا دلچسپی ہو سکتی ہے۔ کسی کو اپنا بنا لیتی تو ایک بات بھی تھی۔" اور مسکراتے ہوئے میری طرف کنکھیوں سے دیکھنے لگی۔ "ہاں تو اندر آ سکتے ہیں؟"

"کیوں نہیں" میں نے جواب دیا "دیدہ و دل فرشِ راہ"

"اس خیال سے پوچھ لیا کہ کہیں تمہارے کاموں میں میری طرف سے خلل نہ آ جائے"، اس نے کمرے کا دروازہ بند کیا اور ایک کرسی کھینچ کر بیٹھ گئی۔

"نوج! تمہیں تو ہمیشہ مذاق ہی سوجھتا ہے۔ کیسے کام، کاہے کا خلل"۔

"یہی شاید کسی کو خط لکھ رہی ہوں گی اور ......"

"بس خاموش رہو۔" میں نے سنجیدگی سے کہا "یہاں تو بنی ہے اور تمہیں بنانے کی سوجھی ہے۔"

"ارے اللہ" اس نے اپنی کرسی میرے قریب کی۔ "اتنی سی بات پر اتنی خفگی۔ اچھا لو ہم آئندہ سے کبھی ....."

"کبھی کیا کرو گی۔"

"کبھی اظہر میاں کا نام نہ لیں گے" اور وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ "سچ کہتی ہوں شہناز! ــــ اب کبھی جو اس مردوے کا نام ــــ لیا تو جو چور کی سزا وہ میری سزا!"

"ہٹاؤ بھی صبیحہ" میں نے کہا "کیا بکواس لئے بیٹھی ہو"

اب اس نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیا اور مجھ سے قریب ہو گئی۔ "شہناز پیاری!"

اس نے کہا "ایک بات بتاؤ گی ــــ پوچھوں؟ ــــ یہ تمہیں صرف اوقات میں کیا لطف آتا ہے؟"

"صرفِ اوقات کیا؟" میں نے دریافت کیا۔

"اظہر آئیں تو کیا؟" اس نے جواب دیا "یہ محبت اور

یہ عشق تھا یہ جنوں......"

"ہائے کمبخت تو نے پی ہی نہیں"

"اونہہ۔ تم تو پوری فلسفی بن گئی ہو———"

"خاموش رہو صبیحہ"

"شہناز۔ اگر اتنی محبت تمھیں خدا سے ہوتی تو شاید تمھارے لیے جنت کے سارے دروازے کھل جاتے——— اور پھر تمھارے طفیل میں ہم گنہگاروں کی بھی عید ہو جاتی"

"صبیحہ تم ناصح نہ بنو" میں نے ذرا تیز ہو کر کہا "مجھے اپنے حال پر چھوڑ دو"

"تو گویا تم اس بت کافر کا پوجنا نہیں چھوڑو گی"

میں نے کہا "ہاں!"

"چھوڑوں گی میں نہ اس بت کافر کا پوجنا"

"چھوڑے نہ خلق گو مجھے کافر کہے بغیر؟" اس نے کہا۔

"نہ چھوڑوں گی۔ نہ چھوڑوں گی۔ ایک نہیں ہزار مرتبہ کہہ دیا"

"شہناز۔ بچوں کی سی باتیں نہ کیا کرو" صبیحہ آہستہ آہستہ سنجیدگی اختیار کر رہی تھی "ساری دنیا تمھیں کیا کہے گی۔ اپنا منہ کالا کرنے سے کیا فائدہ۔ کالج کے جس کونے میں جاؤ تمھارے ہی چرچے۔ ہر کس و ناکس کی زبان پر تمھارا ہی نام——— ذرا اپنی حیثیت کا تو خیال کرو"

"بہت خیال کر چکی" میں نے کہا "زیادہ نہ کہو"

"تمھاری قسم خفا نہ ہو شہناز۔ میں تمھارے ہی بھلے کے لئے کہتی ہوں"

"میں اپنے بھلے برے کو خوب سمجھتی ہوں صبیحہ"

"یہ دیکھو کہ کالج کے سارے اساتذہ اور استانیاں تم سے ناراض۔ ساری لڑکیاں تم سے خائف اور تمھاری محبت تھے کنارا کش——— لڑکے تو خیر———" اس جملے پر وہ مسکرا اٹھی اور میں بھی مسکرائے بغیر نہ رہ سکی۔ پھر اس نے سنجیدہ ہو کر کہا "یاد کرو وہ دن جب تم نے پہلی مرتبہ کالج کے صحن میں قدم رکھا تھا۔ کیسی بھولی بھالی لڑکی تھیں تم، نہ کسی سے واسطہ نہ کسی سے تعلق۔ تم تھیں اور تمھاری کتابیں۔ اب تمھیں کیا ہو گیا ہے کہ بی۔ اے کا امتحان دینے کے لئے بھی تم نے کچھ تیاری نہیں کی۔ یہ گن ٹھیک نہیں بہن۔ یاد رکھو اگر تم میرا کہا نہ مانو گی اور اس نگوڑے اظہر کی محبت سے......"

"خاموش رہو صبیحہ" میں نے ترش رو ہو کر کہا "یہ کیا بات ہے کہ تم ہمیشہ اظہر کو کوستی رہتی ہو۔ اس نے تمھارا کیا بگاڑا"

"اور کیا بگاڑتا" صبیحہ نے جواب دیا "تمھیں جو تباہ کر دیا"

"تو تمھیں کیا اس سے"

"میری ایک دنیا لٹ گئی" اس کی آواز گلوگیر ہو گئی "تم نہیں جانتیں شہناز مجھے تم سے کتنی الفت ہے۔ تمھاری بدنامی کے چرچے میرے دل پر ٹھیس لگاتے ہیں۔ میں جب سنتی ہوں کہ میری شہناز کو فلاں نے یوں کہا اور فلاں نے اسے بری نظروں سے دیکھا تو میرے دل پر جیسے گھونسا لگتا ہے——— اور تم کہتی ہو کہ تمھیں کیا اس سے!———

——— خیر بہن دنیا ہی بے وفا ہے۔ تم سے کا ہے کا گلا ——— اچھا لو۔ میری باتوں سے تمھیں تکلیف پہنچتی ہے تو میں خود یہاں سے چلی جاؤں" میری آنکھوں میں بھی دو آنسو چھلک آئے——— وہ اٹھی اور دروازے کے قریب گئی۔ لیکن مجھے سسکیاں بھرتی دیکھ کر رک گئی "یہ تو نہیں شہناز——— رونے کون موقع ہے۔ آئندہ سے تم کبھی مجھے اس بارے گفتگو کرتے نہیں سنو گی" اس نے اپنی دوستی سے ... آنسو پونچھا...

جانے ہی کو تھی کہ باہر سے ایک شور و غل اور دوڑنے بھاگنے کی آوازیں آنے لگیں۔

"یہ کیا ہوگیا" اس نے کھڑکی سے باہر جھانکتے ہوئے کہا "اری کیا ہوگیا شاما ــــــ" میں بھی کھڑکی کے قریب آگئی۔

"ٹکر ہوگئی ہے موٹر سے" شاما نے نیچے سے بہ آواز بلند کہا۔ "کس کی ؟"

"اظہر کی" بلند آسمان ! اظہر کا نام سنتے ہی میرے پیروں تلے کی زمین نکل گئی۔ ہاتھ میں رعشہ پڑگیا۔ اور نہ جانے کس حالت میں بھاگتے ہوئے دوسری منزل سے میں میدان میں اتر آئی۔ دنیا کی ساری چیزیں مجھے تاریک نظر آرہی تھیں۔ اور صرف اظہر کا تصور میرے دل و دماغ پر مسلط تھا ــــــ میں اس مجمع کو چیرتی پھاڑتی جو اظہر کے اطراف جمع تھا وہاں پہونچی ــــــ آہ میرا اظہر! صالحہ ــــــ وہ کس حالت میں پڑا تھا ــــــ میں شاید بیان نہ کرسکوں ــــــ خون میں لت پت ــــــ آنکھیں آسمان سے لگی ہوئیں۔ زبان پر اس بے وفا شہناز کا نام۔

"شہناز۔ مجھے یاد رکھنا" یہ اس کے آخری الفاظ تھے۔ اور اس کی روح زندگی کے غیر فانی آسمانوں کی سیر کررہی تھی۔

"آہ میرے اظہر" اور میں اس پر گر پڑی۔ اس کے بعد مجھے خود پتہ نہیں کہ کیا ہوا ــــــ

"چار، چھ گھنٹے بعد جب میری آنکھیں کھلیں تو میں نے خود کو ارشد کے کمرے میں لیٹا پایا۔

"بہن شہناز" ارشد نے میرے چہرے سے اپنا چہرہ قریب لاکر کہا "کیسی ہے طبیعت ؟" دو گرم آنسو میرے چہرے پر سے ہوتے ہوئے نیچے گرے اور گر کر زمین میں جذب ہوگئے۔

صبیحہ پلنگ کے دوسرے بازو پر بیٹھی اپنے آنسو پونچھ رہی تھی ــــــ

"آہ او حسین شام" شہناز کہنے لگی

یہ کیا دستور ہے یارب تری آباد دنیا میں کہ کوئی برباد کرتا ہے کوئی برباد ہوتا ہے

صالحہ نے اپنے دامن سے آنسو پونچھ کر کہا۔

"بہت ارمان ایسے ہیں جو جی کے جی میں رہتے ہیں"

"آپ کو امی کب سے بلاتی ہیں آپا جان" ننھی نے بھیڑ سے کمرے میں داخل ہوکر کہا۔ "نہیں آئیں گی آپ ؟" ــــــ "چل ننھی چل"

عزیزہ رضوانہ

آئیں گے

ابھی میں سوچ رہا تھا کہ آپ آئیں گے

یہی نگاہ، یہی شوخیاں، یہی انداز   یہی جمال، جبیں پر یہی تجلئ ناز !
اسی طرح سے سرِ دوش رقصِ زلفِ دراز   قدم قدم پہ بتاتے ہوئے حیات کا راز

ابھی میں سوچ رہا تھا کہ آپ آئیں گے

نقاب اٹھائے ہوئے موجِ رنگ و بو ہو کر   چمن فروش بہاروں کی آرزو ہو کر
جہانِ شوق میں عنوانِ جستجو ہو کر   حیاتِ نو کا طرب آفریں لہو ہو کر

ابھی میں سوچ رہا تھا کہ آپ آئیں گے

یہی ادائے جوانی، یہی غرورِ جمال   دماغِ شاعرِ فطرت میں اک لطیف خیال
چمن کی چاندنی، راتوں میں رقصِ بادِ شمال   نسیمِ صبح کا عالم، شعاعِ مہر کا حال

ابھی میں سوچ رہا تھا کہ آپ آئیں گے

لبوں پہ نورِ تبسم، نظر میں رازِ شباب   ہوا کی رو میں کھلتا ہو جس طرح سے گلاب
شمیمِ صبح سے مہکی ہوئی بہار کا خواب   فضائے شام میں گاتی ہوئی روانئ آب

ابھی میں سوچ رہا تھا کہ آپ آئیں گے

اسی خیال میں تھا میں کہ آپ آئیں گے   چھپے ہوئے تھے جو اسرارِ شوق پائیں گے
مرے تصورِ رنگیں پہ آ کے جائیں گے   نشاطِ روح مری روح میں سمائیں گے

ابھی میں سوچ رہا تھا کہ آپ آئیں گے

خدا سے مانگ سکا میں نہ عشرتِ کونین   مرے نصیب میں تھی آج نعمتِ کونین
بتاؤں آپ کو کیا ہے حقیقتِ کونین   اس اک نگاہ پہ قربان دولتِ کونین

ابھی میں سوچ رہا تھا کہ آپ آئیں گے

علی اختر

تحفہ

دنیا ساری کوزے میں دریا بند کرتے پر اکڑتی ہے تو میں نے سوچا لاؤ میں گلاس میں ساری دنیا کو بند کر دوں، اس میں بھلا خاک رکھا تو کیا کمال ہوگا، کہئے گلاس کی بات کہ دیکھنے میں کچھ بھی نہیں لیکن سچ پوچھئے تو یہی سب کچھ ہے، اور اسی سے سب کچھ ہے۔ دو آنکھوں سے کیا کیا دیکھئے گا، فی الحال تو صرف اتنا دیکھ لیجئے کہ ایک باپ، ایک بیٹا، اور ایک بھانجی ہیں گلاس سے کتنا تعلق ہے، رہے باقی اور تو پھر کبھی سہی ۔۔ باپ تھے حکیم صاحب، بیٹے تھے سراج میاں، اور بھانجی تھیں صفیہ حکیم صاحب یوں تو حکمت کے لحاظ سے بھی بُرے نہ تھے لیکن حق یہ ہے کہ حکمت سے زیادہ وہ اپنی وضعداری کیلئے مشہور تھے، اسبابِ مایحتاج کا جہاں تک تعلق ہے فطرت نے حکیم صاحب کو نوازنے میں ذرا بھی کوتاہی نہ کی تھی، اس پر مستزاد ان کا خاندانی وقار، وافر اولاد، فکرِ معاش سے بے نیاز، قدیم روش کے آدمی، گو جدید اثرات سے بھی بیگانہ نہیں، سلیم الطبع، پیر متقطع، قبیلہ پرور، مذہب پرست، غرض ایسی ہی کئی خصوصیات تھیں کہ اپنے حلقہ میں دور دور تک وہ ایک مثالی حیثیت رکھتے تھے اور اس پر انہیں ناز بھی تھا کہ سب گھر تو بیٹیوں کو پیام جاتا ہے، اور ان کے گھر بیٹیوں کو پیام آتا تھا۔ چونکہ اساس اخلاقی میں تعلقاتِ ازدواجی کو وہ بہت دخیل سمجھتے تھے۔ اور لڑکیاں سُستی اور اچھی ملتی تھیں، ایک چھوڑ تین تین بیٹیوں کی شادی انھوں نے ہنسی ہنسی میں نمٹا کر دی۔ اک رہ گئے تھے ان کے چھوٹے صاحبزادے، ان سے بڑی صاحبزادی اور سب سے چھوٹی بھانجی [illegible] دیکھئے ان کی شادی کو دیر لگ گئی تھی، اس کی وجہ یہ نہ تھی کہ خدانخواستہ ان میں کوئی کھوٹ کسر تھی، بلکہ بیٹی کے لئے اچھے سے اچھے بر کی تلاش تھی، اور بیٹا بھانجی حکیم صاحب کے گھر کی عام روش کے خلاف آزاد خیال و روشن دماغ واقع ہوئے تھے، صاحبزادے نے صاف انکار کر دیا کہ گریجویٹ ہونے سے پہلے وہ شادی نہ کریں گے، اور بڑی بیٹی سے پہلے چھوٹی بھانجی کی شادی یوں بھی بے موقع تھی، اس لئے انھوں نے ان ہی کی مرضی پر ان کی شادی چھوڑ دی تھی، یوں بھی یہ دونوں انھیں ضرورت سے زیادہ عزیز تھے، بھانجی یوں کہ مرحوم بہن کی واحد یادگار تھیں، اور بیٹے کا تو کیا پوچھنا، زر سے قسمت کھلا لائے تھے، پہلے تو کئی اولادوں کے مرنے کے بعد پیدا ہوئے پھر اس دن پیدا ہوئے جس دن اُن کے خاندان کے سب سے بڑے بزرگ کوئی سراج السالکین پیدا ہوئے تھے، اور جس دن یہ پیدا ہوئے اسی دن ان کے پاس منصب کے اجرا کے احکام خلاف توقع آئے جس کے لئے وہ ایک عرصہ تک لڑ، تھک کر بیٹھ رہے تھے، اس پر حکیم صاحب کا گمان کہئے یا خدا کی شان کہ ان کی پیدائش کے بعد سے حکیم صاحب کی حکمت کو بھی بہت فروغ ہوا، پھر ان آثار رشد و ہدایت سے متصف تھے جو ہمیشہ اس عمر کے بچوں سے غیر متوقع ہوتے ہیں، تقریباً ہر امتحان میں اوّل آئے ہر دفعہ انعام لائے، اور جو بڑی جماعتوں میں آئے تو وظیفے پائے، ایسی صورت میں ان کے جتنے الله تلّے نہ ہوتے کم تھے، اور یہی باعث تھا کہ ان کا اصلی نام تو کبھی غصہ میں ہی یاد آتا یا بیگانوں میں، ورنہ اتنے لاڈ کے نام مقرر تھے کہ ناموں میں اب تھوڑی سی کسر باقی رہ گئی تھی، کبھی سراج میاں کبھی سراج پاشا، کبھی منصبدار، کبھی چھوٹے میاں، کبھی چھٹیا غرض اتنے میاں کہ اس کے بعد کسی میاں کی آرزو باقی نہ رہی

لیکن ان سب باتوں کے باوجود جیسے جیسے دن گزرتے گئے حکیم صاحب محسوس کرتے گئے کہ ان کے لاڈلے بچے بے راہ ہوئے جاتے ہیں، یا تو یہ خود جدید وضع کے لوگوں سے اتنی نفرت رکھتے تھے کہ اسی سبب سے وہ اپنے مرشد کے سوا بہت کم کسی سے ملتے تھے یا یہ ہوا کہ خود ان کا لڑکا لڑکی فیشن کی پتلی بننے لگے، یہ گویا ایک طرح قدرت نے ان کی رعونت کی سزا دی تھی، آدمی دوسروں کے لئے تاکید کرتا ہے، اور اپنے لئے تاویل، جہاں یہ اوروں کو تنبیہ کیا کرتے تھے اب اپنے لئے تاویلیں کرنے لگے کہ ابھی تو بچپن ہے، سمجھ آئے گی تو یہ باتیں جاتی رہیں گی، پھر جو اصول اساسی میں وہ ان سے مختلف نہیں تو وجہ ظاہر کی حد تک شوق کر لیں، اس میں ہرج ہی کیا ہے، غرض اس چشم پوشی سے کہئے یا خبث باطن سے، ان بچوں نے فائدہ اٹھایا اور وہ رنگ نکھارا کہ اچھے کیا ہو گئے "ماڈل" معلوم ہونے لگے، اب وہ پچھتانے لگے کہ انھوں نے بیجا کیا کہ جدید تعلیم کے ڈھرے لگا چھوڑا جس میں اور کچھ ہو نہ ہو تربیت کا تو نام نہیں، اور جس تعلیم سے تربیت نہ ہو اندھے کی آنکھوں پر عینک لگانے کے مساوی ہے، سراج کالج میں کیا آئے اپنے آپ کو پروفیسر سمجھنے لگے، اور صفیہ ہائی اسکول میں کیا آئیں اپنے آپ کو گویا یونیورسٹی سمجھنے لگیں، اور کچھ انھوں نے سیکھا نہ سیکھا، یہ تو لوگوں نے دیکھا کہ ان کے مزاج میں نزاکت، طبیعت میں نفاست، کمر میں لچک، چال میں ٹھسک اور بات میں چٹک پیدا ہو گئی ہے، اور اگر واقعات نے ساتھ دیا تو علم و فضیلت کے لحاظ سے وہ روشن خیال عورتوں کے ادعا کے مطابق "مردوں کے دوش بدوش" چلیں نہ چلیں، لیکن رعونت و حماقت کے اعتبار سے "مردوں کے پابدوش" چلنے میں بھی دریغ نہ کریں گی، یہ تھے حکیم صاحب کے خیالات ان کے متعلق، اور ان خیالات کو تقویت دینے کے لئے ان لونڈوں نے اسباب بھی عجیب پیدا کر لئے، صفیہ نے نفاست کی انتہا یہ کر دی کہ گھر میں اپنے لئے ایک کمرہ علٰحدہ مخصوص کر لیا، جس میں سوائے بہن کے اور کسی کا آنا انھیں گوارا نہ تھا، اور جانے کس سہیلی کو انھوں نے ایسا کرتے دیکھ لیا کہ خود بھی اپنے پانی کا علٰحدہ انتظام کر لیا، ایک نہایت خوبصورت صراحی منگائی، اس پر ریشمی جالی چڑھائی، ماموں سے کہہ کر کوزے اور گلاس کا چاندی کا کیس تیار کروایا، اور اپنے کمرہ میں الگ رکھنے لگیں۔ یہ باتیں حکیم صاحب جیسے آدمی کو فطرتاً تلخ لگنی چاہیے تھیں، اور واقعات نے انھیں تلخ تر کر دیا۔

جس طرح عموماً دو مشترک صفات کے طالب علموں میں چھیڑ ہوا کرتی ہے، سراج اور صفیہ میں بھی ہوتی رہتی تھی۔ ایک دن جو سراج صفیہ کے کمرہ میں داخل ہوا صراحی گلاس کو دیکھتے ہی قریب جاتے ہوئے بول اٹھا "اوہو! یہ ٹھاٹ! کہاں سے چرا لائیں صفی!"

بہن بھی بیٹھی تھیں، بولیں "ارے بھئی، کہیں تم ہاتھ نہ لگانا، ورنہ یہ بگڑ جائیں گی، انھوں نے بڑے اہتمام سے اپنے پانی کا انتظام الگ کر لیا ہے!"

"تو پھر ہم بھی پی کر دیکھیں کہ انتظام ٹھیک ہے یا نہیں!"

صفیہ نے انھیں "دیکھئے چھوٹے میاں، براہ کرم آپ یہاں پانی پینے کی تکلیف نہ کیجئے!"

"کیوں بھئی، کیا یہ نہر فرات کا پانی ہے؟ یا خدا نخواستہ آپ کے دشمن کوئی یزید ہیں؟ آپ نے میری تعریف کا، سو بھلا پانی پینے میں بھی کوئی تکلیف ہوتی ہے [illegible]

ٹھنڈک کی بات ہے! اور پھر ایسی صراحی گلاس سے کہیں اچھی ہے پانی کو چھوڑ کر کوزے گلاس ہی کو پی جائیں!"

یہ کہتے ہوئے اس نے گلاس میں پانی ڈالا، صفیہ چھیننے کے لئے جھپٹیں، اس وقت تک وہ ایک دو گھونٹ پی چکا تھا، صفیہ نے جھنجھلا کر فریاد اٹھائی "دیکھئے بوا جی، آپ انھیں جتا دیجئے!"

بات کچھ بھی نہ تھی، لیکن ضد نے رنگ دیا۔ بہن نے کہا "سراج پاشا، بھلا یہ بھی کوئی ضد ہے کہ کوئی آپ سے کترائے اور آپ اس کے سر ہوئے جائیں! سنا ہے ان کی استانیوں نے تعلیم دی ہے کہ ایک کا پانی دوسرا پیئے، نہ ایک کے گلاس میں دوسرا پیئے، یہ صحت اور صفائی دونوں کے خلاف ہے، اس لئے انھوں نے الگ انتظام کر لیا ہے!"

ایک قہقہہ مارتے ہوئے "بھئی، صفائی کی بھی ایک ہی کہی، میں سن چکا تھا کہ اسکول جا کر تعلیم کا نام تو صاف، انھوں نے یہ نئے چوچلے سیکھے ہیں، اس لئے آج صبح جب یہ نہیں تھیں، میں نے اسی صراحی میں، اسی صفائی کے خیال سے ناک چھنک دی تھی!"

صفیہ کراہت و غصہ کے مارے آپے سے باہر ہو گئیں، گو تاڑنے والے یہ بھی سمجھ سکتے تھے کہ اس غصہ کی تہہ میں کچھ گدگدیاں بھی چھپی ہیں، تن تناتی ہوئی گئیں، صراحی مانجھی، غلاف دھویا، گلاس مانجھا اور پھر سے پانی بھر لائیں۔

سراج میاں نے فیصلہ سنایا "بھئی، ہم تو آج سے اسی برہمنی کا پانی پیا کریں گے، واقعی صفائی کا بہت خیال رکھتی ہے!"

بی منہ دھو رکھئے!

[illegible]

بات تو محض وقتی اور معمولی تھی، لیکن دونوں کی ضد نے اسے ایک مستقل چیز کی صورت دے دی، صفیہ جتنی چڑتیں، سراج اتنے ہی ان کا پانی پینے پر تلتے، اور دونوں میں ٹھن جاتی، حتی کہ انھوں نے دسترخوان پر بھی پانی پینا چھوڑ دیا، ماما نے جو پانی پیش کیا، کہا "نہیں بھئی، ہمارا پانی تو وہاں (صفیہ کے کمرے کی طرف بتاتے ہوئے) رکھا ہے! یہ پانی پینا صحت اور صفائی دونوں کے خلاف ہے!"

"ارے، لاحول ولا، برف بھی بھلا کوئی پینے کی چیز ہے، میں تو (صفیہ کی طرف کن انکھیوں سے دیکھتے ہوئے) انگارے ڈال کر پیتا ہوں، انگارے!"

یہ کہا اور صفیہ کے کمرے کی طرف چلے۔ صفیہ چڑ چڑا کر رہ گئیں، لیکن ساتھ ہی انھوں نے ماما کو بھی چپکے سے کچھ اس طرح دیکھا، جیسے بس چلے تو اسے کچا ہی کھا جائیں، اور جب سراج پانی پی نکلے تو یہ الجھتے ہوئے اٹھیں، کوزے گلاس کو دھویا، اور پھر سے پانی بھر دیا۔ یہ بھی ایک عجیب قسم کا مذاق تھا اور سبھی کو اس سے دلچسپی ہو گئی تھی، کبھی مزے لیتے، اور کبھی فہمائش بھی کرتے کہ "بھئی پاشا، کسی کو اس طرح دق کرنے سے کیا فائدہ۔ میں سوچتی ہوں کہ آخر تمھاری اور بی بی کی بنتی کیوں نہیں!"

"کہیں ہندو مسلمان کی بھی بنتی ہے ایسی بات!"

صفیہ ان باتوں سے بظاہر تو بہت جلتیں، لیکن یہ بھی ایک عجیب اتفاق تھا کہ اب وہ پانی کا پہلے سے زیادہ اہتمام کرنے لگیں، جب سے ماما نے برف کی آس دلائی تھی، انھوں نے ہر کھانے سے پہلے گلاس میں برف بھی ڈال کر رکھنا شروع کیا، اور جب سراج میاں پانی پی لیتے تو الگ چیختیں کہ دیکھئے اتی جان، چھوٹے میاں نے میرا برف کا پانی پی لیا، اب تو کوزے کا غلاف بھی بدل دیا اور اس پر اپنے ہاتھ سے

ایک نہایت خوبصورت " S " بھی کاڑھ دیا تھا۔

یہ مذاق یا چھیڑ، چھیڑ کی حد تو کافی دلچسپ سہی، لیکن آگے چل کر ایک دن اس نے ایسی خطرناک صورت اختیار کرلی جس نے حکیم صاحب اور ان کے سارے گھر کی زندگی و تخیلات میں ایک غیر معمولی انقلاب پیدا کر دیا، اور حکیم صاحب وغیرہ کے دلوں کو ایسا دھکا دیا کہ عمر بھر کو توبہ کرلی۔

بات یوں ہوئی، جیسا کہ میں نے کہا ہے، تعلیم اور لاڈ نے جہاں صفیہ کے دماغ کو خراب کر دیا تھا وہاں سراج کے دماغ کو بھی صحیح نہ رکھا تھا، آزادی و خود مختاری کی اسپرٹ نے ان کو بظاہر ایک شتر بے مہار بنا دیا تھا، اس لئے وہ باپ کی ساری پابندیوں اور وضعداری کو ایک خرافات اور رسم مافات سمجھنے لگے، اس سے باپ روز بروز ناراض ہوتے جا رہے تھے، اس پر غضب یہ ہوا کہ سراج میاں جہاں بیڈمنٹن کھیلتے تھے، اسی سے لگا ہوا ان کے کالج کے چپراسی کا مکان تھا، ایک دن گیند اس کے گھر میں چلی گئی، اور یہ بھی بے سوچے سمجھے اسے لانے کے لئے لپکے، چونکہ انھیں معلوم تھا کہ چپراسی انھیں جانتا ہی نہیں، بلکہ بڑی حد تک ان کا فیضیاب بھی ہے۔ جیسے ہی داخل ہوئے۔ انھوں نے دیکھا کہ ایک پلنگ پر بڈھا چپراسی اور اس کے بازو ایک حسین اور نوخیز لڑکی بیٹھی ہے۔ کہتے ہیں کہ نوجوان خون کو پتنگ کی گھٹی بڑا تیز اثر کرتی ہے، لیکن میں نہیں سمجھتا وہ اتنا تیز اثر کر سکتی ہے، جتنا کہ ایک حسین و نوجوان عورت کے نظارے کے بعد عشق کی گولی، ایک تو نوجوانوں کی نظر پھر طالب علمانہ نظر، سراج میاں نے دفعتاً ایک کشش سی محسوس کی، اور ٹکٹکی لگا کر رہ گئے، پھر دوسرے ہی لمحے جو انھیں خیال آیا کہ وہ حکیم صاحب کے لڑکے ہیں، اور اس کے ساتھ ہی ایک بزرگ چپراسی کے سامنے، تو یک دم سنبھل گئے۔ ان کا خیال تھا کہ لڑکی چپراسی کی کوئی نواسی، پوتی لگتی ہوگی، لیکن ان کی حیرت کی کوئی حد نہ تھی جب انھیں معلوم ہوا کہ وہ اس کی بیوی ہے۔ اب التفات کے ساتھ ساتھ ان میں انسانی ہمدردی امنڈ آئی، چنانچہ اس کے بعد سے جب کبھی موقع ہوا انھوں نے اس ہمدردی کا صرف اس پر کرنا شروع کیا۔ طینت میں صداقت ہو تو خلوص کا جواب ہمیشہ خلوص سے ملتا ہے، اس لئے اگر اس لڑکی کو بھی ان کے ساتھ الفت معہود سے زیادہ انس ہو گیا تو کوئی تعجب کی بات تھی، نہ غیر فطری، لیکن چوں کہ غیر معاشری تھی اس نے کئی دلوں میں شرارے بھڑکا دیئے۔ حکیم صاحب جیسی تقدس مآب ہستی اس بات کو کیسے گوارا کر سکتی تھی جب کہ ان کے خلاف کی پشتوں میں بھی کبھی ایسے واقعات کی توقع نہ تھی۔ بہت کڑھنے لگے، بھر بھاوج کا نون مرچ ان کے زخموں پر الگ چڑکے لگاتی تھی۔ لیکن حکیم صاحب ان کو صفت بردباروں میں سے تھے جنھیں شاید ہی کبھی غصہ آتا ہو، اور جب آجائے تو کسی کی جان کی بھی شاید ہی پروا کرتا ہو۔ وہ بگڑتے تھے، لیکن سوچتے تھے کہ اس کے تدارک کے لئے کیا اقدام مناسب کیا جائے، اپنے پرایوں کی انگلیاں الگ نشتروں کا کام کرتی تھیں، بالآخر تنگ آکر انھوں نے بیٹے کو ایک دو وعظ کے خوراک بھی پلا دیکھے اس کا اثر نہ پایا تو ڈانٹ ڈپٹ تبائی، لیکن نتیجہ یہ ہوا کہ لڑکا جو کچھ چھپے دبے کرتا تھا، اب کھلے بندوں کرنے لگا، چنانچہ ایک دفعہ صفیہ نے سب کو خوش کرنے کے لئے جو طعنہ دیا "کہئے آپ کی چپراسن کیسی ہے؟" تو بول اٹھا "بخدا آپ سے تو ہزار درجہ اچھی ہے!" یہی نہیں بلکہ وہ خاندان کی اور لڑکیوں اور عورتوں سے بھی جھگڑ، مذاق کرنے لگا۔ حکیم صاحب کو اب اس حرکت سے نفرت بڑھتی جا رہی تھی، التفات [illegible]

رسم گفتار بھی ترک کردی، پھر جیب خرچ جو خود دیا کرتے تھے، اب اپنی لڑکی صفیہ کے ہاتھ سے دلانے لگے، اور ادھر ایک عرصہ سے تو دینا ہی بند کر دیا، بلکہ وہ خود بھی جو وظیفہ لاکے پیش کرتا اسے ایک حقارت سے لینے لگے، سراج ان سب باتوں پر دل میں مسکراتا اور یہ سمجھتا کہ گویا یہ سب اس کے سامنے ہیچ ہیں۔ اور جب واقعات کی اصلیت پر سے پردہ ہٹے گا تو یہ سب اکڑ فوں خود بخود جاتی رہے گی، لیکن صورت حال کچھ اور ہی پیش آئی۔ حالات کی نوعیت سے فائدہ اٹھا کر بھاوج نے دیور کو اور بھی اکسانا شروع کر دیا تھا کہ سراج اور صفیہ کا یہ میل ملاپ، یا چھیڑ مذاق بھی ایک غیر شریفانہ نوعیت رکھتا ہے۔ بیوہ بھاوج کی عظمت حکیم صاحب کے دل میں ویسے ہی زیادہ تھی، اور اب تو اور بھی بڑھتی جا رہی تھی، لیکن ابھی تک وہ غور ہی کئے جا رہے تھے۔

ایک دن کی کرنی ایسی ہوئی کہ سراج صفیہ کے کمرہ میں داخل ہوا، بہن بھی موجود نہیں، حسب عادت اس نے گلاس اٹھایا، اور صفیہ بپھرنے لگیں، جناب، رہنے دیجئے، یہ آپ کا ہمیشہ کا مذاق!"

چونکہ لہجہ میں کسی قدر ترشی تھی، اس نے گلاس میں کلی کر کے رکھ دیا کہ "لو بھئی، تمھارا پانی واپس کرتے ہیں، روتی کیوں ہو!"

منہ میں پان تھا، اس لئے کلی سے سارا پانی لال ہو گیا، صفیہ کراہت سے جھلا اٹھیں "لاحول ولا، غلاظت کی بھی کوئی انتہا ہے!"

"ارے، تم اسے غلاظت کہتی ہو! کرامت کہو کرامت کہ ایک کلی میں تمھارے سڑے پانی کو شربت بنا دیا ہے شربت!" صفیہ غصہ کو پیتے ہوئے اس طرح بڑھیں گویا گلا

کو بھینچ دیں گی، سراج نے غضب یہ کیا کہ اس کے گالوں کو ہاتھ میں پکڑ کے نرمی سے کہنے لگا "ارے ہے، میری رانی تمھارا غصہ بھی کتنا میٹھا ہے، لیکن بگڑتی کیوں ہو، لو اب سے نہیں چھیڑیں گے!"

صفیہ نے ایسا محسوس کیا گویا اس کے سارے جسم میں بجلی سی دوڑ گئی ہو۔ وہ شاید ایک لفظ بھی نہ بول سکتی، لیکن معاً اسے خیال آیا کہ وہ بہن کے سامنے ہے، اور اس سے بڑھ کر اس کی نظر جو چچی پر پڑی جو دروازہ میں کھڑی یہ سب تماشا دیکھ رہی تھیں تو اس کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی کیوں کہ جانتی تھی کہ حکیم صاحب کی ان محترم بھاوج میں جرمنی کے پانچویں کالم کی ساری خصوصیات موجود ہیں۔ غصہ سے سراج کا ہاتھ جھٹکا اور بولی "چھوٹے میاں، آپ شاید نہیں دیکھتے کہ آپ اپنی حد سے بہت آگے بڑھ رہے ہیں، میں آج ہی ابا جان سے آپ کی اس حرکت کا ذکر صاف نہ کر دوں تب کہنا!"

"ارے، تم کہہ کے کیا کر لوگی میرا؟ یہ دیکھا! (جیب میں سے ایک رقعہ بتاتے ہوئے) آج وہ چیز پیش کرنے والا ہوں کہ اگر آج تمھیں قتل بھی کر دوں تو ابا جان مجھے انعام ہی دیں گے!"

یہ واقعہ فی الوقت تو رفت و گزشت ہو گیا، لیکن، جانے کیوں صفیہ کا دل ضرورت سے زیادہ دھڑکنے لگا۔ اسے کھٹکا تھا کہ اگر حکیم صاحب گھر میں ہیں تو بھاوج فوراً بڑے لگا جائیں گی، لیکن وہ یہ دیکھ کر کچھ مطمئن ہوئی کہ وہ اس وقت گھر میں نہیں تھے، اور بھاوج اپنی دیورانی سے باتیں کرتی بیٹھی تھیں۔ اس نے گلاس دھویا اور پڑھنے میں لگ گئی۔ بہت دیر کے بعد حکیم صاحب بڑے دروازے سے داخل ہوئے جس سے صفیہ نے اندازہ لگایا کہ بھاوج کے پاس سے نہیں آ رہے ہیں کیونکہ تھوڑی دیر بعد بھاوج پچھلے دروازہ سے آئیں

غصہ میں دیکھ کر اسے کچھ دہشت سی ہو رہی تھی، پھر اس نے دل کو سمجھایا کہ شاید یہ اس کے گمان کی وجہ ہو، یا حکیم صاحب کے دھوپ میں سے آنے لگی۔ چونکہ بھاوج صاحبہ آ گئی تھیں اسے خیال آیا کہ کہیں وہ ذکر نہ کر دیں، اس لئے اپنی بریت کے طور پر خود اس نے کہہ دینا مناسب سمجھا، وہ حکیم صاحب کے پاس آ کر رکتے رکتے لاڈ سے کہا "دیکھئے ابا جان، آپ چھوٹے میاں سے کہہ دیجئے کہ وہ ہمیں نہ ستایا کریں!"

"ہاں، اب وہ تمھیں کیا کسی کو بھی نہیں ستا سکیں گے!" ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ کہتے ہوئے ان کی آنکھوں سے شرارے نکل رہے ہیں، صفیہ ٹھٹک کر رہ گئی۔ اسی غصہ کے عالم میں انھوں نے پوچھا "سراج کہاں ہے؟"

بھاوج بولیں "ہوں گے اسی چپراسن کے پاس، اور کہاں ہوں گے!"

"ہوں!" حکیم صاحب نے غصہ کو نمایاں کیا۔

اتنے میں سراج گاتا، گنگناتا مکان میں داخل ہوا، باپ کو دیکھ کر خاموش ہو گیا، اور اپنے عادتی بھولے پن اور مسرت کے ساتھ "یہ دیکھئے، ابا جان!" کہتے ہوئے رقعہ پیش کیا۔

باپ نے غصہ سے رقعہ کو اٹھا کر پھینک دیا، اور آگے بڑھ کر چھڑی اٹھائی، بیٹا ٹھٹک کر رہ گیا، باپ آگے بڑھے اور بغیر کچھ بولے، چھڑی سے ہاتھ مانگا اور پیٹنا شروع کیا، لڑکا بھی بغیر کسی سوال کے ہاتھ دیتا گیا، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ حکیم صاحب آج کوئی "معجونِ وحشت" ضرورت سے زیادہ کھا گئے ہیں۔ وہ یہ جلاد ماحول میں صفیہ تاب نہ لا سکی، اور روتے ہوئے اپنے کمرے میں چلی گئی۔ اسے رہ رہ کر یہ خیال ہوتا تھا کہ اسی کی شکایت سے حکیم صاحب کو اتنا غصہ آیا، اور سراج کو سزا مل رہی ہے۔ سب کے سب ہی مبہوت تھے، لیکن نہ کوئی کچھ کہہ سکتا تھا، نہ روک سکتا تھا، حکیم صاحب کو اس کا بھی خیال نہ ہوا کہ لڑکے کے ہاتھ پھٹ کر خون نکل رہا ہے، البتہ جب چھڑی چرچر گئی تو مجبوراً ہاتھ روکنا پڑا۔ لڑکا آتنا نازوں کا پلا، اور نازک مزاج، کہاں تک تاب لاتا، آخر آنسو ڈھلکنے لگے، باپ نے جب سزا روکی تو فیصلہ سنایا "کمینہ پن کی بھی ایک حد ہوتی ہے، اگر تم میں ذرا بھی شرافت ہے تو اب تم میرے گھر میں نہ رہو گے! سمجھے؟"

"تعمیلِ حکم میں مجھے کوئی عذر نہیں، لیکن میں اس کا سبب نہ معلوم کر سکا، ابا جان!"

باپ نے غصہ سے تن کر صفیہ کی طرف ہاتھ بتاتے ہوئے کہا "یہ صفیہ سے پوچھو!"

اب دفعتہً اسے خیالات آنے لگے کہ شاید آج صبح کی حرکت نے صفیہ کو اس قدر برہم کر دیا، اس کی زندگی نے عجب پلٹا کھایا، انجش محسوس کیا کہ بے کا باپ بھی ساتھی نہیں، اور یہ کہ جس نازوں اور سہاروں کا اسے غرہ تھا وہ سب ہیچ ہیں، اور یہ کہ دنیا میں وہ اکیلا ہے، سب سے بڑھ کر اسے اس بات کی خلش تھی کہ اس نے صفیہ کی اتنی دل آزاری کر دی، حالانکہ یہ اس کی نیت نہیں تھی، انھیں خیالات میں غرق وہ صفیہ کے کمرہ کی طرف بڑھا اور دروازہ میں کھڑے ہو کر اجازت مانگی "صفیہ بیگم" میں حاضر ہو سکتا ہوں؟"

صفیہ جو رو رو کر بے جان ہو رہی تھی، دفعتہً چونک پڑی، اور آنسو پونچھ کر سنبھلنے کی کوشش کرتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔ سراج اندر گیا، اور بولا "مجھے معاف کیجئے، مجھ سے بڑی غلطی ہوئی، لیکن میں نے محض دل لگی میں ایسا کر دیا تھا، ورنہ مقصود آپ کی توہین نہیں تھی!"

صفیہ جو پہلے ہی سے بدحال تھی، یہ سنتے ہی بے تاب ہو گئی اور جس طرح جھرنا بھرتا ہے، اس کے آنسو بھر نے لگے، ایسا معلوم

ہوتا تھا کہ وہ بولنے کی انتہائی کوشش کے باوجود بھی بے بس ہے۔

اور سراج نے معافی کے لئے جو ہاتھ جوڑے تو ہتھیلیوں سے رستا ہوا خون کہنیوں تک بہہ آیا تھا۔ صفیہ کی نظر کبھی اس پر ہے تو کبھی سراج کے چہرہ پر۔ زبان جب عاجز ہو جاتی ہے تو آنکھوں کو گویائی اور دل کو سماعت مل جاتی ہے، سراج کو خیال ہوا کہ شاید اس نے یہ نہ کہا ہو۔ جانے کیا سوجھی کہ اس نے بھی خون کو دیکھا اور بولا "اُو! کیا آپ براہ کرم تھوڑا سا کپڑا عنایت فرمائیں گی؟"

ایسا معلوم ہوتا تھا کہ صفیہ گویا ایسے ہی سوال کی منتظر تھی، جھٹ سے اس نے اپنی ساڑی کا دامن پھاڑا اور شاید باندھنے کے لئے آگے بڑھی، سراج نے کچھ سوچ کر کہا "جی نہیں، آپ تکلیف نہ کیجیے، میں دھو کے باندھ لوں گا!" اور کپڑا لے لیا۔

دسترخوان چنا جا چکا تھا، لیکن اس بے ہودگی میں کافی دیر ہو گئی، کھانے کی خواہش کسے تھی، جھوٹے منہ جا بیٹھے۔ اس اثنا میں ماما نے سراج میاں کے ہاتھ دھو کر پٹی باندھی، پھر رکتے رکتے بولی "خاصہ حاضر ہے!"

"ابھی مجھے بھوک نہیں ماما جی، ٹھہر کر کھا لوں گا، جلدی کیا ہے!"

"آپ کی جیسی مرضی ہوتی، لیکن بڑی بیگم بہت دکھی ہیں، اور آپ کو یاد فرماتی ہیں!"

"اچھی بات ہے چلو!"

لوگوں کو اندیشہ تھا کہ وہ مخالفت کرے گا، لیکن اب وہ نہایت سنجیدہ ہو گیا تھا "آن بیٹھا"، ہاتھ سوج گئے تھے، پٹی الگ بندھی تھی، [illegible] آیا تھا، کیا کھاتا، کچھ کھانے میں بھی بہت تکلف ہوتا تھا۔

ماں نے نرمی سے پوچھا "میں کھلا دوں سراج؟"

"جی نہیں امی جان، آپ فکر نہ کیجیے، میں کھا لوں گا!"

مشکل سے دو چار چمچے کھائے ہوں گے، ایک لقمہ لب تک گیا تھا کہ انگلیاں تھرتھرائیں اور چمچہ ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ ماں کا دھکا ویسے ہی ناقابل برداشت تھا، جھٹ سے اٹھیں، اور بے قابو ہو کر بیٹے کو گلے سے لگایا اور رونے لگیں۔ سب کے سب آبدیدہ ہو گئے۔

لوگوں کی بہتیری کوشش تھی کہ کسی طرح سراج جانے نہ پائے لیکن دوسری ہی صبح انھوں نے دیکھا کہ وہ غائب ہے۔ سب کے ہوش اڑ گئے۔ حکیم صاحب کی حالت اب سب سے زیادہ ردی تھی۔ اور حق تو یہ ہے کہ جانے کس اضطراری یا جنونی حالت میں انھوں نے یہ حرکت کر دی۔ ورنہ ان سے زیادہ سراج اور کس کو عزیز ہو سکتا تھا، اب وہ ندامت و رنج سے روتے تھے اور ہاتھ ملتے تھے، اور ان سے بڑھ کر صفیہ بدحال ہوئی جاتی تھی، ہر چند سہیلی یا بہن نے اصل واقعہ دریافت کر کے سمجھایا کہ وہ بالکل بے قصور، اور ساری کارستانی چچی صاحبہ کی ہے لیکن اس کے ذہن میں یہی بیٹھ گئی کہ سب قصور اسی کا ہے، جتنا سمجھاتی، اتنا ہی اس کا رونا بڑھتا، اب اس نے پانی کا انتظام بھی ترک کر دیا، اور کچھ وحشی وحشی سی رہنے لگی۔

مشکل یہ آن پڑی تھی کہ بات پھیلنے کا بھی ڈر تھا، اور لڑکے کی تلاش بھی لازم تھی، اور یہ دونوں متضاد چیزیں تھیں یا سب ہی نے کافی احتیاط سے پتہ لگانا چاہا، لیکن یہ بغیر ذرائع کے کس طرح ممکن تھا، کالج میں دریافت کرنا بھی حکیم صاحب مصلحت کے خلاف سمجھتے تھے۔ جب الجھن زیادہ بڑھتی تو [illegible] لگتے، اسی غم کے عالم میں جب وہ دوسرے تیسرے دن پہنچے

آخر کار اس جگہ آئے جہاں انھوں نے لڑکے کو سزا دی تھی، تو بہت دیر تک گم سم کھڑے رہے، پھر جو نظر اٹھائی تو مقابل کی الماری کے نیچے کسی چمکتی ہوئی چیز پر جا ٹھیری، قریب گئے تو ایک لفافے سے کوئی سنہری چیز چمکتی نظر آئی، معاً انھیں اس لفافے کا خیال آیا جو ان کے لڑکے نے سزا سے پہلے نہایت ادب و مسرت سے پیش کیا تھا، دل کو ایک دھکا سا لگا، اٹھایا اور کھولا تو ایک سونے کا تمغہ، سند اور اپنے ایک دوست کا خط ملا۔

"مجی،

تسلیم۔

ایک سند اور ایک طلائی تمغہ ملفوف کر رہا ہوں، کئی دن سے ارادہ ہے کہ نیاز حاصل کروں، مگر جب سے یہاں آیا ہوں، دوری اور گھر اگ کچھ ایسے بڑھ گئے ہیں کہ موقع ہی نہیں ملتا، خیر اس بات پر آپ کو فخر ہونا چاہیے، اور ہمیں رشک کہ خدا نے آپ کو ایک ایسے سعید و ذہین دلبند سے سرفراز فرمایا ہے جو آپ کے خاندان ہی کی نہیں بلکہ سارے ملک کی ناک ہوگا۔ مجھے خبر نہ تھی کہ وہ علمی قابلیت کے ساتھ ساتھ تقریر میں بھی ایسا باہنر نکلے گا کہ بین الکلیاتی تقریری مقابلہ میں اول آئے، حالانکہ یہ اس کی پہلی تقریر تھی۔ خدا عمر و اقبال دے! لڑکا آپ کا ہے اور مسرت ہمیں ہوتی ہے۔

تفصیل تو کسی ملاقات پر ہوگی، اتنا سن لیجیے کہ پرنسپل صاحب خود اتنے متاثر ہوئے کہ جب تقریر ختم ہوئی تو اچھل کر اسٹیج پر گئے، پہنچ کر لڑکے کو گلے سے لگایا، بہت دیر تک تعریف کرتے رہے، دوسرے ہی دن یہ تمغہ اور اپنے دستِ خاص کی یہ تعریفی سند عطا فرمائی، مبارک ہو!

لیکن اس خط لکھنے کا اصل مقصد یہ ہے کہ سند اور تمغہ لیکر وہ سیدھا میرے پاس آیا، میں نے بھی بے ساختہ گلے سے لگا لیا اور کہا "خوش رہو بیٹا، تم نے مجھے بہت خوش کیا!"

"ہاں، ہاں، کیوں نہیں؟ ضرور!"

"تو پھر ارادہ ہے کہ ایسی تقریب میں وہ موٹر سیکل والی بات بھی چھیڑ دوں!"

"ضرور!"

"مگر چچا، اپنی زبان سے کہتے ہوئے طبیعت جھجکتی ہے، انکار کر دیں تو میری کیا باقی رہ جائے گی! اگر مناسب سمجھیں تو آپ ہی کبھی تحریک کر دیجیے نا!"

"اچھی بات ہے، لاؤ، میں ایک ترکیب کروں، اچھا ایک خط اور تحریک کو ان کے ساتھ ملفوف کر دوں۔ نہ تمھاری زبان جائے، نہ میری۔ جائے تو تحریر ہی جائے!" ہنسنے لگا۔

اب اس کے بعد بھی کچھ کہنے کی ضرورت ہوئی تو بلا لیجیے گا، لیکن جب تک کہ میں آؤں مٹھائی تیار رہے! بچوں کو دعا، بڑوں کو آداب۔

مخلص

"سرور"

ایسا معلوم ہوتا تھا کہ خط کی ہر سطر نے حکیم صاحب کی آنکھوں میں آنسوؤں کی ایک قطار باندھ دی ہے، حکیم جی خط تو ختم کر چکے، لیکن آنسوؤں کو نہ ختم کر سکے، کسی کی آہٹ سنی تو پھر اوپر چلے گئے۔

(باقی آئندہ)

سید علی شاکر

خزانہ باؤلی بیڑ

آج سے کوئی تین سو ستر برس پہلے ۱۹۹۱ھ میں بیڑ کے جاگیردار اور احمد نگر کے وکیل السلطنت صلابت خاں نے اس انوکھے خزانہ آب کی تعمیر کرکے اس زمانہ کے لوگوں کو محو حیرت بنا دیا تھا۔ چار صدیاں گزر نے آئیں اور فن انجنیری ترقی کرکے آج اپنے معراج کمال پر ہے مگر اس شہ کار میں کسی نقطۂ نظر سے کسی قسم کا نقص نہیں اور بلا کسی ترمیم و تعمیر کے یہ اپنی تعمیری غرض کو پورا کر رہا ہے۔

بیڑ سے کوئی ساڑھے چار میل دور جانب شمال ایک پختہ اور سنگ بستہ مدور باؤلی بنائی گئی ہے۔ سطح زمین سے اس کی گہرائی کوئی ۷۰ فٹ ہے پہلے ۱۲ فٹ میں اس باؤلی کا قطر کوئی ۶۰ فٹ کا ہے اور نچلے حصہ میں ۴۱ فٹ کا جیسا کہ خاکہ میں بتلایا گیا ہے۔

زمین
سطح
۶۰
۴۱
پانی

اس باؤلی کے نہ صرف اطراف میں پختہ بندش کی گئی ہے بلکہ اس کے نچلے حصے میں بھی کنکریٹ ڈال دی جاکر سوتوں کو روک دیا گیا ہے۔ لیکن تین نہریں جن میں سے ہر ایک کوئی ۴ فٹ چوڑی اور ۱۰ تا ۱۵ فٹ گہری اور مختلف طول کی اس کی تین سمتوں میں بنائی گئی ہیں۔ ان میں سے دو نہریں فراہمی آب کے لئے ہیں اور تیسری اخراج کے لئے۔ اول الذکر میں سے ایک بند پڑی ہے اس وقت صرف ایک نہر سے پانی باؤلی میں داخل ہوتا اور دوسری سے خارج ہوتا ہے۔

دوسرے کالم میں ملاحظہ کیا جائے ←

سیڑھیاں
اطراف کا چبوترہ
بند
پانی کی آمد
نہر
نہر
باؤلی
پانی کا اخراج
نہر
اساوی

اس زمانہ میں یہ چیز ایک معمہ تھی اور لوگ اس کو ایک عجوبہ خیال کرتے تھے۔ زمانۂ موجودہ کی وسیع معلومات نے اس ندرت میں کچھ کمی کردی ہے لیکن یہ حیرت ہنوز باقی ہے کہ آج تک اس طریقۂ کار میں اضافہ نہ کیا جا سکا۔ اس کو مختصراً اس طرح سمجھایا جا سکتا ہے۔ زمین پر کچھ بارش ہوتی ہے اس کا تقریباً ۶۰ فیصد حصہ بہہ جاتا ہے اور باقی ۴۰ فیصد حصہ زمین میں جذب ہو جاتا ہے اس مقدار میں کمی یا بیشی زمین کے کم یا زیادہ مسام دار ہونے پر منحصر ہے۔ یہ پانی زمین کی مختلف گہرائیوں میں پہنچ کر جس طرف اس کی پرتوں کی ڈھال ہوتی ہے، اس سمت میں بہتا رہتا ہے۔ یہی پانی ہے جو ہم کو باؤلیوں اور کنوؤں سے حاصل ہوتا ہے۔ اورنگ آباد، برہان پور وغیرہ کے کاریز آبرسانی جس اصول کے رہین منت ہیں خزانہ باؤلی کی تعمیر میں بھی اسی قدرتی اصول سے فائدہ اٹھایا گیا ہے۔ اس خزانۂ آب کے لئے ایک ایسے مقام کا انتخاب کیا گیا جہاں تین طرف سے زمین کا ڈھلان اس کے جانب ہے۔ اور اس کے اوپر قریب سے ہی دھنسرا ندی بہتی ہے ایک زمین دوز نہر اس ندی کے قریب تک بنائی گئی ہے اسی نہر کے ذریعہ زمین کا جذب شدہ پانی بہہ کر خزانہ باؤلی میں داخل ہوتا ہے۔ ایک اور نہر بھی اسی غرض کے لئے بنائی گئی تھی مگر وہ ایک زمانہ دراز سے

بند پڑی ہے۔ تیسری نہر جو تقریباً تین میل طویل ہے یہ بھی زیر زمین ہے۔ اسی کے ذریعہ پانی خارج ہوتا ہے مگر چونکہ یہ نہر ندی کے نچلے حصے میں واقع ہے اس لئے ندی کا جذب شدہ پانی اس میں داخل ہو کر مقدار آب میں کافی اضافہ کرتا ہے۔ اس کا تمام پانی چھن کر اور تقطیر ہو کر آتا ہے اور اس میں سطح زمین کے پانی کے راست شامل ہونے کا امکان نہیں اس لئے یہ نہایت مصفا ہوتا ہے۔ اس نہر کو بیڑ کی آبادی تک پہنچانے کے لئے ضروری تھا کہ اس کو جسرا ندی میں سے عبور کیا جائے، چنانچہ وہاں بھی اس کو زمین دوز اور اس قدر مضبوط بنایا گیا ہے کہ نہ تو ندی کا پانی اس میں داخل ہو سکے اور نہ طغیانی کا اس پر کوئی اثر ہو سکے۔ کوئی تین میل کے بعد یہ نہر بتدریج اپنی گہرائی میں کم ہوتی ہوئی سطح زمین سے آکر مل گئی ہے اور یہاں سے کھلی نہروں میں پانی زراعتی اغراض کے لئے لیا جاتا ہے اور کوئی پانچ سو ایکڑ زمین کو جو برگ زار کے نام سے موسوم ہے سیراب کرتا ہے۔

اس نہر کی نگہداشت کے لئے معائنہ کی باؤلیاں (Inspection wells) بنائی گئی ہیں جن میں سے نہر کے اندر اتر کر اس کی حالت کا معائنہ کیا جا سکتا ہے۔ یہ باؤلیاں بیڑ میں اساوی کے نام سے مشہور ہیں۔ ایک زمانہ تھا کہ برگ زار سے آگے ایک پختہ نہر کے ذریعہ بیڑ کی آبادی تک اس کا پانی پہنچایا گیا تھا اور احمد نگر دروازہ کے قریب ایک مقام پر جو کارنجہ کے نام سے اب بھی مشہور ہے ایک خوبصورت ہشت پہلو حوض میں یہ پانی چھوڑا جاتا تھا۔ عدم نگرانی اور عدم توجہ کی وجہ اس نہر میں شکست و ریخت ہو کر اس حوض تک پانی کا آنا بند ہو گیا، بجائے اس کے کہ اس کی معمولی ترمیم کی جا کر اس حوض میں دوبارہ پانی چھوڑا جاتا ایک تعلقدار وقت نے اس حوض کو پاٹ دے کر اس پر ایک بھونڈا سا گھنٹہ گھر بنوا کر اپنے [illegible] ہے۔ ایک زمانہ دراز کے بعد جب یہ باؤلی محکمہ کی

سے محکمہ تعمیرات کی نگرانی میں آئی تو ۱۳۴۲ف میں، میں نے ان نہروں کی صفائی کرائی۔ اخراجی نہر جسرا ندی تک تقریباً صاف تھی مگر اس کے بعد سے وہ تقریباً کیچڑ اور روڑوں سے پٹی پڑی تھی جس کی وجہ پانی کی روانی بہت متاثر ہو گئی تھی، اس کو میں نے صاف تو کرا دیا لیکن یقین نہ آسکا تھا کہ خود بہ خود اس نہر میں خرابی پیدا ہو رہی ہے۔ تجسس و کرید کے بعد معلوم ہوا کہ بہت دنوں پہلے ایک نیک نیت تعلقدار صاحب نے اس نہر میں اضافہ آب کے خیال سے بند نہر کے ایک حصہ کو توڑ کر اس میں جسرا ندی کا پانی داخل کرایا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ندی کے گدلے پانی، کیچڑ اور پتھر نے اس نہر میں داخل ہو کر بتدریج اس کو بھرنا شروع کر دیا تھا۔ نیم حکیم خطرۂ جاں کی مثل شاید اس سے زیادہ کہیں اور صادق نہ آئے۔ محکمہ تعمیرات کی نگرانی میں آنے کے بعد سے اس قدیم خزانہ کی حفاظت و سلامتی کا یقین ہو گیا ہے۔

اس مضمون کو ختم کرنے سے پہلے اس باؤلی کے متعلق جو روایت مشہور ہے اس کا تذکرہ خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔ کہتے ہیں کہ اس باؤلی سے ایک نہر احمد نگر تک بنائی گئی ہے اور اس طرح صلابت خاں نے اپنے بادشاہ کی خدمت میں یہاں کے پانی کو بطور تحفہ پیش کیا تھا۔ اس کے ثبوت میں ایک قصہ بیان کیا جاتا ہے کہ ایک سیاح اس باؤلی پر تشریف لائے تھے پانی پینے کے لئے نیچے اترے ان کے ہاتھ میں ایک عصا تھا وہ باؤلی میں گر پڑا اور نہر میں بہہ گیا، یہ وہاں سے مایوس ہو کر نکلے اور گھومتے گھومتے جب احمد نگر پہنچے تو ایک تالاب میں اس عصا کو تیرتا ہوا پایا۔ ان روایتوں اور قصوں پر کسی قسم کی تنقید غیر ضروری ہے۔

محمد ابراہیم

نشری تقاریر (سلسلہ گزشتہ)

نشری تقریر کی ترتیب اور پیشکش کا کچھ حصہ اربابِ نشر سے اور کچھ مقرر سے متعلق ہوتا ہے مثلاً عنوان، مقررہ تاریخ، وقت اور دورانِ نشر وغیرہ کا انتخاب و تعین۔ یہ سب جب ہو جائیں تو پھر مقرر کے فرائض شروع ہوتے ہیں۔ اس کو مقررہ دوران وقت اور تاریخ کے لئے ایک ایسی مستند تقریر تیار کرنی ہوتی ہے جس کا کوئی جزو اصول نشریات کے منافی نہ ہو یا جس سے نشرگاہ کے کسی قاعدہ پر مضر اثر نہ پڑ رہا ہو اور جو نہایت آسان "تقریری زبان" میں لکھی گئی ہو۔ نشرگاہ کا احتساب بعض مقرروں کو ناپسند ہوتا ہے وہ اس کو گوارا نہیں کرتے کہ ان کی تقریر میں کوئی دوسرا شخص ترمیم یا اضافہ کرے۔ میں اپنے دو استادوں کی مثالوں سے آپ کو دو مختلف ذہنیتوں کا فرق بتاؤں گا۔ میرے ایک استاد کو یہ پسند نہ تھا کہ میں جو ان کا شاگرد رہ چکا تھا، ان کی تقریر میں نشریات کے فنی نقطۂ نگاہ سے بھی کسی قسم کی تبدیلی کروں۔ میرے ایک دوسرے استاد نے اپنی تقریروں کے سلسلہ میں مجھ سے کہا تھا "تم میرے شاگرد ہو تم کو شاگردی کا حق اب اس طرح ادا کرنا چاہیے کہ مجھے نشری تقریر کی فنی باتیں سکھلاؤ"۔ یاد رکھئے جب کوئی نشرگاہ آپ کو دعوتِ نشر دیتی ہے تو اس کے معنی ہی یہ ہیں کہ وہ آپ کی قابلیت کی معترف ہے اور آپ کو استادِ فن سمجھتی ہے مگر جب تقریر میں اضافہ یا ترمیم کی جاتی ہے تو اس کی کوئی نہ کوئی معقول وجہ ضرور ہو گی۔ یا تو اس کا دوران کم یا زیادہ ہو گا، یا اس کی زبان ادق اور غیر تقریری ہو گی یا اس کی فنی معلومات کو زیادہ سہل انداز میں پیش کرنے کی ضرورت ہو گی وغیرہ۔ اربابِ نشر نہ تو کسی کے استاد بننا چاہتے ہیں اور نہ ان کے پاس اتنا وقت ہے۔ روزانہ

(ترتیب اور پیشکش)

پچاسوں مسودات دیکھنے پڑتے ہیں۔ بلا وجہ یا تفریحاً تقریر پر قلم چلانے کے لئے وہ کس طرح وقت نکال سکتے ہیں۔ اور اس سے حاصل؟ کیا اربابِ نشر کی ترمیم و اضافہ کو نشر کرتے وقت یہ کہہ دیا جاتا ہے کہ یہ ترمیم اربابِ نشر نے کی ہے؟ دنیا کی ہر نشرگاہ کو احتساب کا حق حاصل ہے اور فنی امور کے پیش نظر حاصل رہنا اور اس کو سختی سے استعمال کرنا چاہیے۔

پیشکش کے اصول مظاہرے کے ذریعہ بہتر طریقہ پر سمجھائے جا سکتے ہیں۔ نشریات میں علم اور عمل دونوں کا راج ہے۔ کوئی شخص کتابی ہدایتیں پڑھ کر اچھا موٹر ڈرائیور نہیں بن سکتا۔ شاستر کے اصول اور راگ راگنیوں کے سرگم یاد کر کے اچھے مطرب ہونے کی امید نہیں کی جا سکتی۔ اسی طرح نشر ایک بالکل نئی دنیا ہے یہاں صرف ہدایتوں کو پڑھ کر کامیاب نشری مقرر بننے کی توقع بے جا ہے۔ اس دنیا کا ہر بسنے والا کچھ اپنا اور کچھ قدرت کا محتاج رہتا ہے۔ نشری قاعدوں کو پیش نظر رکھ کر عمدہ تقریر تیار کرنے اس کے بعد مضمون کے مطابق اس کو ادا کرنے، آواز کے حجم، تنوع، مناسب رفتارِ نشر، پابندیٔ وقت، مقرر کے دوران میں محذوں وقفوں اور الفاظ کو واضح طور پر ادا کرنے کی حد تک وہ خود اپنا محتاج ہے۔ آواز اور لب و لہجہ قدرت کی طرف سے ملتا ہے۔ اگر قدرت نے عطا میں سخاوت کی اور ناشر نے اکتساب میں لاپروائی یا تساہل نہ کیا تو اس کا مستقبل یقینی روشن ہو سکتا ہے۔ ذیل کے اشارات کو نشری تقریر کی ترتیب و پیشکش کے سلسلہ میں یاد رکھئے۔ ان سے آپ کو مختصر طور پر معلوم ہو جائے گا کہ مقرر کو کیا کرنا چاہیے اور کیا نہ کرنا چاہیے۔

ترتیب

(۱) مقرر کی شخصیت ضرور اہمیت اور دلکشی رکھتی ہے مگر اس سے یہ ضمانت نہیں ملتی کہ پوری تقریر سنی جائے گی۔ اس لئے تقریر کے مواد کا خاص طور پر خیال رکھئے۔ بالعموم تقریر کا متن ہی سامعین کو سننے پر زیادہ مجبور کرتا ہے۔

(۲) تعمیری خیالات زیادہ بھلے لگتے ہیں۔ تنقیص و تخریب سے سامعین کو الجھن ہوتی ہے۔

(۳) راست، آسان اور مدلل پیام دیجئے۔ اعداد و شمار سنہ اور فنی امور دلچسپی گنوا دیتے ہیں۔ یاد رکھئے ہوا پر زبردست مقابلہ ہو رہا ہے۔ اچھے اچھے گانے، ساز، فلمی ریکارڈ، آپیرا، آرکیسٹرا، ڈرامے، فیچر ـــــ سب ہی سننے کو ہے۔

(۴) اپنی دلیلوں میں کسی جگہ تشنگی یا خامی نہ چھوڑئیے۔ سننے والا سنتے ہوئے سمجھتا ہے اور غور کرتا ہے۔

(۵) ایک نشر میں مختلف عنوانوں پر خیال آرائی کی کوشش نہ کیجئے ورنہ اصل مقصد فوت ہو جائے گا۔

(۶) صرف اسی عنوان پر لکھئے جس پر آپ کو قدرت اور کامل اعتماد ہو۔ نشر ہونے والے مواد کا مستند اور لکھنے والے کا ماہر ہونا ضروری ہے۔

(۷) پیشین گوئی اور پیش قیاسی سے احتراز کرنا مفید ہوگا۔

(۸) تقریر فلسکیپ کے آدھے صفحہ پر لکھی جائے تو صفحوں کے الٹنے میں آسانی ہوگی۔

(۹) صفحہ کے ایک ہی رخ پر لکھئے۔

(۱۰) ترتیب کے وقت اسے نہ بھولئے کہ نشر کا دوران کیا مقرر کیا گیا ہے۔ اسی کی مناسبت سے لکھئے۔ لکھنے کے بعد بار بار پڑھ کر ٹھیک دوران معلوم کر لیجے۔ بعض مقرروں کو اپنی تقریر کا کچھ حصہ طوالت کی وجہ سے کم کیا جانا برا معلوم ہوتا ہے۔ اگر تیاری کے وقت ہی دوران کا لحاظ رکھا جائے تو کمی بیشی کی ضرورت نہ ہو۔

(۱۱) تقریر نشر سے کافی پہلے لکھ لیجے۔ لکھئے بالکل اسی طرح جس طرح آپ بولنے والے ہیں یا آپ کو بولنا چاہیے۔ زبان تقریری ہو نہ کہ تحریری۔

(۱۲) غلطی ہو جانے کے بعد اس کی تصحیح ممکن نہیں اس لیے ابتدا ہی سے کافی جانچ اور احتیاط کیجیے۔

(۱۳) تقریر کا کوئی حصہ ایسا نہ ہو جس سے سامعین کے جذبات کو ٹھیس لگے۔ آپ کی تقریر سننے والوں میں چند آپ سے کم لائق ہوں گے اور چند زیادہ۔ اور یوں بھی کسی کے متعلق بری رائے قائم نہیں کی جا سکتی۔

(۱۴) مقرر کو ایک ماہر اور عالم کی حیثیت سے پیش کیا جاتا ہے۔ اس کا بلا وجہ انکسار اور تکلف یا اپنی لاعلمی یا بے بضاعتی کا اعتراف تقریر کی قدر گھٹا دے گا۔

(۱۵) تحریر و تقریر میں غیر ضروری "شاعری" کبھی مفید نہیں ہو سکتی۔ سیدھی سادی زبان لکھئے اور اسی انداز سے پڑھیے۔ نہ لفاظی چل سکتی ہے اور نہ ترنم متاثر کر سکتا ہے۔

(۱۶) تقریر سننے والوں میں دوست دشمن ہوا خواہ اور بدخواہ سب ہی ہوتے ہیں اس لیے جو کہیے مکمل یقین کے ساتھ کہیے۔

(۱۷) طویل جملوں کو "مگر" "لیکن" "اور" وغیرہ کی مدد سے مختصر جملوں میں تقسیم کر دیجے۔

(۱۸) تقریر میں ایسے الفاظ استعمال کیجیے جو آپ کو پسند ہوں جن سے آپ کی زبان اور کان اچھی طرح آشنا ہوں اور جو آپ کی آواز کے آتار چڑھاؤ کے لئے موزوں ہوں۔

(۱۹) تقریر لکھنے کے بعد گھر میں اسے بار بار پڑھئے۔ اگر کسی جملہ یا لفظ پر آپ رک جائیں اور یہ محسوس کریں کہ اس کی ادا نامناسب

معذوں نہیں ہے تو اسے ضرور بدل دیجیے۔

(۲۰) تقریر کو اس طرح ترتیب دیجیے کہ زیادہ اہم حصہ کے بعد کم اہم حصہ نہ آئے۔

(۲۱) نشرگاہ کے احتساب سے مقرر کو ناراض نہ ہونا چاہیے۔ ارباب نشر تقریر میں ہمیشہ کسی نہ کسی ضرورت کے تحت ترمیم یا اضافہ کرتے ہیں۔

(۲۲) بہتر ہوگا اگر ایک جملہ کو پہلے صفحہ کی آخری اور دوسرے صفحہ کی پہلی سطر میں تقسیم نہ کیا جائے۔ پورا جملہ پہلے یا دوسرے صفحہ پر لکھا جائے۔

(۲۳) جن الفاظ یا جملوں پر زور دینا ہو ان کے نیچے اشارہ کے لئے خط کھینچ دیجیے۔ ایسے دو جملوں کے درمیان ایک لکیر کھینچیے جہاں آپ کو کچھ وقفہ دینا ہو۔

پیشکش

(۲۴) اپنے من بھاتے اور فطری انداز میں نشر کیجیے۔

(۲۵) ایک ایک لفظ اتنی وضاحت سے ادا کیجیے کہ سمجھ میں آجائے۔

(۲۶) ایک جملے اور دوسرے جملے کے درمیان ضرورت کے مطابق مناسب وقفہ دیجیے۔

(۲۷) دو مختلف خیالوں یا پیراگرافوں کے طرز بیان میں فرق رکھئے اور موزوں وقفہ دیجیے۔

(۲۸) وقفہ کی حد تک یہ یاد رکھئے کہ اسٹوڈیو میں ایک سکنڈ کا وقفہ ریڈیو پر تین چار سکنڈ محسوس ہوگا کیونکہ مقرر دکھائی نہیں دیتا۔ سامعین کی دلچسپی کا سامان صرف آواز ہے۔

(۲۹) مائکروفون کو عیوب پھیلا کر اور بڑا کرکے پیش کرنے کی بری عادت ہے۔ آپ ذرا زور سے سانس لیجیے۔ مائکروفون سامعین کو یہ محسوس کرائے گا کہ آپ کی سانس پھول گئی ہے یا آپ کو زور سے سانس لینے کی عادت ہے۔

(۳۰) سامعین کو رلانے کی ناکام کوشش نہ کیجیے۔ وہ رونا نہیں چاہتے۔ ان سے گھریلو انداز میں بات چیت کیجیے۔

(۳۱) واعظانہ انداز بیان اور قدیم شان خطابت کو مائکروفون اور سامعین دونوں ناپسند کرتے ہیں۔

(۳۲) اس یقین کے ساتھ مائکروفون کے سامنے آئیے کہ اپنی تقریر مخالفین کو بھی سننے پر مجبور کر دے۔

(۳۳) مائکروفون ان اصحاب کے لئے ایک رحمت ہے جو شخصیت نہ ہونے کی وجہ سے پلیٹ فارم کے مقرر نہیں بن سکتے۔ ہوائی دنیا میں آواز کی شخصیت اور دلیل کی حکومت چلتی ہے۔

(۳۴) نشر کے وقت صفحے اس طرح الٹیے کہ ان کی آواز سنائی نہ دے۔ اگر کاغذوں کو کاغذ کی آواز سنائی دے تو تقریر کا کافی اثر جاتا رہے گا۔

(۳۵) جب آپ صفحہ کی آخری دو سطروں کے قریب تک پڑھ لیں تو وہ صفحہ نیچے کی طرف ذرا سا کھسیٹ لیجیے تاکہ اگلے صفحہ کی ابتدائی چند سطریں دکھائی دیں۔ اس کی وجہ سے آخری لفظ ادا کرتے ہی اگلے صفحہ کی پہلی سطر کے پہلے لفظ پر فوراً پہنچ جانے میں نہ تو کوئی مشکل ہوگی اور نہ وقت لگے گا۔

(۳۶) اناؤنسر یا کسی دوسرے متعلقہ شخص نے آپ میں اور مائکروفون میں جو فاصلہ مقرر کر دیا ہے اس کو کبھی نہ بدلئے۔

(۳۷) رفتار نشر اور آواز کے حجم میں بھی بلا وجہ تبدیلی نہ کیجیے۔ تبدیلی ہو بھی تو اتنی نمایاں نہیں کہ پیشکش متاثر ہو۔

(۳۸) نشر سے عین پہلے نہ تو کھانا کھائیے اور نہ پان۔ کھانے کی وجہ سے ڈکار آنے کا امکان ہے اور پان کی پیک وغیرہ سے ایک خاص قسم کی آواز نکلتی ہے۔

(۳۹) مائکروفون پر انگلی سے مارنے یا اس کو پکڑے رہنے کی کوشش نہ کیجیے۔ اگر مائکروفون تقریر کے وقت ہلایا جائے تو

اس سے نہایت کرخت آواز نکلتی ہے۔

(۴۰) کم ضخامت کی تقریر کو رفتار دھیمی کرکے اور زیادہ ضخامت کی تقریر کو رفتار تیز کرکے مقررہ دوران پورا کرنے کی کوشش کبھی کامیاب نہ ہوگی۔ دوران سے زیادہ اہمیت رفتار کی ہے۔ ریہرسل کے وقت ہی ضخامت اور رفتار کا تعین کرلینا چاہیئے۔

(۴۱) سننے والوں کی کئی قسمیں ہوتی ہیں۔ صنف، عمر، تمدن، مذہب، قابلیت اور ذوق کے فرق کے علاوہ مقام سماعت کا ماحول بھی مختلف ہوتا ہے۔ نشر کی رفتار ایسی رکھئے کہ ہر ایک سمجھ سکے۔

(۴۲) ریہرسل ضرور کیجیے اس میں انداز بیان، رفتار، حجم وتفوں کا تعین کرلیجیے۔ ریہرسل کے وقت اگر کوئی جملہ کی ساخت کی وجہ سے مشکل محسوس ہو یا طرز ادا [illegible] تو اس کا بدل دیا جانا ضروری ہو، اگر کوئی لفظ ثقیل یا ناخوشگوار معلوم ہو یا آپ کو کسی لفظ کا صحیح تلفظ ادا کرنے میں دقت ہو تو تبدیلی کر لیجیے ورنہ عین نشر کے وقت وہی مشکل اور دقت پیش آئے گی۔

(۴۳) نشر کے وقت اپنی گھڑی میز پر یا مائی کروفون کے قریب نہ رکھیے۔ اس کی ٹک ٹک کی آواز بھی سنائی دے سکتی ہے۔

(۴۴) میز پر اپنے ہاتھ یا زمین پر پیر نہ پٹخئے۔ یہ آوازیں تقریر کے ساتھ بالکل بے معنی محسوس ہوں گی اور سننے والوں کو بری لگیں گی۔

(۴۵) تقریر کے الفاظ کو غور سے دیکھتے ہوئے پڑھیے۔ اپنے حافظ پر اعتماد کرکے لاپروائی نہ کیجیے۔ مقرر کا بلا وجہ ایک سکنڈ کے لیے رکنا بھی مناسب نہیں۔

(۴۶) سرخ روشنی اس کی علامت ہے کہ اسٹوڈیو چالو ہے۔ یہ روشنی ہونے سے پہلے ہی اپنا گلا صاف کرلیجیے، کرسی پر آرام سے بیٹھ جائیے اگر کالر تنگ ہو تو اسے کھول لیجیے، عینک استعمال کرتے ہوں تو پہلے سے نکال کر لگا لیجیے۔ صفحوں میں پن یا کلپ لگی ہو یا تاگا بندھا ہو تو اس کو نکال لیجیے۔ اگر وہ صفحے جڑے ہوئے ہوں تو ان کو الگ کردیجیے۔

(۴۷) تقریر کے وقت صرف تقریر کے الفاظ ادا ہوں۔ دوسری آوازیں مثلاً سانس، کھانسی، چھینک وغیرہ بہت بری معلوم ہوتی ہیں۔ اسٹوڈیو میں سرخ روشنی اور اناؤنسمنٹ کے انتظار میں بالکل خاموش بیٹھیے۔ جو کچھ پوچھنا ہو اناؤنسر سے پہلے ہی پوچھ لیجیے۔ تقریر سے دو تین منٹ پہلے ہی خاموش ہوجانا اچھا ہے۔ روشنی ہوجانے کے بعد جب اناؤنسر آپ کا تعارف کرادے تو بلا تکلف کامل اطمینان کے ساتھ تقریر شروع کردیجیے۔ تقریر کے ختم پر جس وقت اناؤنسر اختتامی اناؤنسمنٹ دیتا ہے اس وقت بھی بالکل خاموش بیٹھے رہیے۔ جب تک اسٹوڈیو کی سرخ روشنی گل نہ ہو تو اسٹوڈیو چالو رہتا ہے۔ اناؤنسر جب بول رہا ہو اس وقت اگر مقرر اپنے کاغذات جمع کرنے لگے یا زور سے سانس لینے، کھانسنے یا چھینکنے لگے یا عینک کا کیس زور سے بند کردے یا کوئی اور آواز نکالے تو اسی سے غریب اناؤنسر چپٹ میں آجائے گا۔ تقریر کے وقت اگر اناؤنسر کھٹ پٹ کرے تو وہ مقرر کی سمجھی جائے گی اور اناؤنسمنٹ کے وقت مقرر کچھ گڑبڑ کرے تو اناؤنسر پکڑا جائے گا۔ سامعین مقرر کو قابل معافی سمجھیں گے کیونکہ وہ گاہے ماہے تقریر کے لئے آتا ہے۔ مگر اناؤنسر کو معاف نہیں کریں گے۔ یہ بھی عجیب ستم ظریفی ہے۔

(۴۸) بالعموم اناؤنسر کی آواز اور انداز بیان پسندیدہ ہوتا ہے۔ تقریر کے شروع میں اور ختم پر مستقل اناؤنسر ہی بولتا ہے۔ مقرر کو یہ خیال رکھ کر تقریر کرنا چاہیے کہ اس کا مقابلہ اناؤنسر سے ہے۔

(۴۹) تقریر نشر کرنے کا ایک خاص انداز بنا لیجیے۔ ہر ناشر اپنے لئے مخصوص طرز پیدا کرسکتا ہے۔ ہر طرز بیان کی انفرادیت

(۵۰) اچھی یا بری نشر جہاں مقرر کی نیک نامی یا بدنامی کا باعث ہوتی ہے وہیں وہ نشرگاہ کی شہرت کو بھی متاثر کرتی ہے۔ فرد کے مقابلہ میں ادارہ کو بہت اہمیت حاصل ہے۔

نشرگاہ سے بالعموم تین قسم کی تقریریں ہوتی ہیں۔ پہلی تو وہ جو خود اربابِ نشر مقرر کرتے ہیں۔ سال بھر کے تقریری پروگرام کو دو تین حصوں میں تقسیم کرکے اسی مناسبت سے عنوانوں کا تعین کیا جاتا ہے جس کے بعد مقرروں کی تلاش ہوتی ہے۔ ایسے مقرروں کو ڈھونڈا جاتا ہے جو استاد اور ماہرِ فن ہوں، جن کی آواز ذمکر دفون کے لئے موزوں ہو جو دعوتِ نشر کو رد نہ کریں، وقت پر مقرروں کے مسودے بھیجدیں، ریہرسل کے لئے آئیں غرض نشرگاہ کے تمام قاعدوں کی پابندی کریں۔ دوسری قسم میں وہ تقریریں آتی ہیں جو مضمون نگار اپنے طور پر لکھ کر نشر کی غرض سے بھیجتے ہیں۔ تیسری قسم ان تقریروں کی ہے جو اچانک ہو جاتی ہیں۔ کوئی ممتاز ادیب پہنچ گیا، کل ہند اہمیت کا شاعر، فلسفی، پروفیسر، سیاح، مورخ، مدبر، سیاس آگیا۔ اگر اس کے قیام کے دوران میں تقریر نہ کروائی جائے تو وہ چلا جائے گا اور پھر بڑی مدت تک اس کی تقریر کروانے کا موقعہ نہ ملے گا اس لئے پروگرام کی تقریر منسوخ کر کے، ریکارڈوں کا وقت کم کر کے یا موسیقی کا کچھ وقت لے کر وہ تقریر کروائی جاتی ہے۔ متذکرہ اصولوں کی پابندی تینوں قسم کے مقرروں کو کرنی ہوگی۔ البتہ اپنے طور پر مضمون بھیجنے والوں کو خود اپنے مفاد میں ایک بات کا خاص طور پر خیال کرنا چاہیے۔ وہ پوری تقریر لکھ کر بھیجنے کی بجائے اس کا ایک سرسری خاکہ لکھ کر بھیجدیں تاکہ پہلے یہ معلوم ہو جائے کہ اس عنوان کو پروگرام میں جگہ مل سکتی ہے یا نہیں۔ اربابِ نشر جب اپنی پالیسی کے پیشِ نظر تمام امور پر غور کرکے مطلع کریں تب تقریر بھیجی جائے۔

اس سے کیا فائدہ کہ آپ اپنی جان کھپا کر نہایت دلچسپ مضمون لکھ بھیجیں مگر وہ نشرگاہ کے پروگرام اور پالیسی کی وجہ سے شریک نہ کیا جاسکے۔

مرزا ظفر الحسن

ٹیگور

ٹیگور نے پائی تھی تعلیم محبت کی
دیکھی نہ کبھی اس نے دشمن کی کدورت بھی
دنیا نے بہت اس کی تعظیم کی عزت کی
خالق نے اسے دی تھی دولت بھی وجاہت بھی

لاتا تھا وہ ہر جرعہ کوثر کے کناروں سے
رہتا تھا خیال اس کا جنت کی فضاؤں میں
پیدل تھا مگر اکثر آگے تھا سواروں سے
نغموں کا بہاتا تھا سیلاب ہواؤں میں

کھینچی ہیں فسانوں میں جذبات کی تصویریں
گیتوں میں جھلکتا ہے اک نور حقیقت کا
ہر رنگ کی حامل ہیں ٹیگور کی تحریریں
تا عمر رہا گلچیں وہ گلشن فطرت کا

مشرق سے وہ چمکا تھا گو شمع ادب بن کر
مغرب کے ادب پر بھی اک خاص اثر ڈالا
وہ پیکر صد نغمہ وہ شعر کا پیغمبر
دامانِ تفکر کو اخلاق سے بھر ڈالا

اے ہند کی خاکستر اندیشۂ فردا کر
مٹی میں ملے کیا کیا نایاب ترے گوہر

مرزا سیمابی جالپوری

ٹیگور اور موت

ہنستے ہیں اسی طرح سے بکھرے ہوئے تارے
ہنس ہنس کے جہاں والوں کو کرتے ہیں اشارے
برسات کا پیغام سناتی ہیں گھٹائیں
اٹھلاتی ہوئی چلتی ہیں مستانہ ہوائیں
اک گیت سناتا ہے یہ بہتا ہوا دریا
آباد کناروں پہ ہے ملاحوں کی دنیا
منظر ہیں جہاں کے وہی دنیا بھی وہی ہے
محسوس یہ ہوتا ہے کسی شے کی کمی ہے
لاتی ہے کبھی ہنستے ہوئے موت تباہی
رکتے ہی نہیں ہیں عدم آباد کے راہی
اس موت کے نغمات انوکھے ہیں نرالے
اک بہتا ہوا دھارا ہے سب کچھ جو بہا لے
چھینے ہیں بہت گوہر نایاب اسی نے
دریا کو کیا علم کے پایاب اسی نے
افسوس کہ ہم نے بھی وہ سب بہا کھویا
اس موت کی آغوش میں ٹیگور بھی سویا

سردار علی الہام

من کے مندر کا پجاری

من کے مندر کا پجاری اپنی دیوی کو چھوڑ ہمیشہ کے لئے چلا گیا ... بہت دور ... جب دیوی کی پوجا ہی اس کی زندگی کا سہارا تھی اور دیوی بھی اس کی پوجا سے خوش تھی تو ایسا کیوں ہوا ؟

بستی کے لوگ پجاری کو اس مندر سے نکالنا چاہتے تھے ۔ ان کی نظروں میں وہ گنہگار تھا ۔ صرف اس لئے کہ وہ ذات کا برہمن نہ تھا ۔ ان کا عقیدہ تھا کہ چھتری لڑنے کے لئے پیدا ہوا ہے نہ کہ پوجا کے لئے مگر وہ یہ نہ سمجھ سکے کہ دیوی کی پوجا کے لئے ایک ایسا بہادر نوجوان چاہیے جو دیوی کے من میں جگہ پا سکے ۔ دیوی کو ذات پات کی کیا پرواہ تھی ۔ سب اس کے تھے اور وہ سب کی ۔ جو مندر میں اس کا دھیان لئے ہوئے داخل ہوتا اس کی قدر کرتی اور جس کو چاہتی اپنے چرنوں میں جگہ دے سکتی تھی !

بستی والوں نے ایک برہمن کو جسے بستی کے لوگ مقدس سمجھتے تھے دیوی کی پوجا کے لئے مقرر کر دیا ۔ اس کو دیوی بہت پسند تھی ، پہلے بھی جب کبھی وہ پوجا کے لئے اس مندر میں داخل ہوتا تو دیوی کو تکتا اور پہروں تکتا اور اس کا دل بے اختیار چاہتا کہ وہ اس دیوی کا پجاری ہو جائے مگر اس نے اپنی اس خواہش کو کسی پر نہ ظاہر ہونے دیا کیونکہ اس کی رگوں میں شریف خون دوڑ رہا تھا ۔ وہ چھتری نہ سہی برہمن تو تھا ۔ بستی والوں نے پنچایت گھر میں اس کا تصفیہ کیا ۔ اور سب نے ہم زبان ہو کر کہا کہ ایسی مقدس دیوی کا پجاری برہمن ہی کو ہونا چاہیے ۔

دوپہر کا وقت تھا جب معمول پجاری اپنی دیوی کی پوجا میں کھویا ہوا تھا کسی نے آکر اس کے کان میں چپکے سے کہا کہ کل سے مندر میں دوسرے پجاری کا راج ہوگا ۔ اس خبر کے سنتے ہی پجاری کے دل پر ایک غم کی بجلی گری جس کی تپش نے اس کو بے ہوش کر دیا ۔ وہ بہت دیر تک اسی حالت میں پڑا رہا اور جب اس کو ہوش آیا تو اس نے محسوس کیا کہ اس کا تمام جسم پسینے سے تر بتر ہو گیا ہے وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھا اور انگڑائی لیتے ہوئے ، شام کے دھندلکے میں مندر کی پھلواری کی طرف بڑھا ۔ وہ مندر چھوڑنے سے پہلے دیوی کی آخری پوجا سے اپنے دل کی تسکین چاہتا تھا ۔ اس نے بہترین گلاب اور بیلا جو مندر سے ہم آغوش باغ کی بہار تھے ، توڑے اور دیوی کو گلاب میں نہلا کر مانگ میں سیندور اور ماتھے پر ٹیکا لگایا ۔ ایک بیش بہا رنگین ساڑی اور قیمتی جواہرات سے اس کا سنگار کیا ۔ کافوری شمع جلائی اور آرتی لیکر آخری بار اپنی دیوی پر نثار ہونے کے لئے پروانہ وار جھومنے لگا ۔ آج اس کی ہر ادا میں مجنونانہ پن تھا ۔ اس کے پیر لڑکھڑا رہے تھے ۔ بھجن میں پہلے سے زیادہ سوز تھا ۔ اتنا سوز کہ سننے والوں کے دل کو جلا کر خاکستر بنا دے ۔ کیوں نہ ہو یہ تو اس کا آخری بھجن تھا ۔ جب بھجن ختم ہوا تو آرتی کی تھال اس کے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے زمین پر آرہی اور وہ اس عالم بے خودی میں جھکتا ہوا آگے بڑھا اور دیوی کے چرنوں سے لپٹ کر بوسے لئے ۔ اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کا ایک دریا رواں ہو گیا اس خیال نے اس کو بے چین کر دیا تھا کہ اس کے ہونٹ دیوی کے چرنوں کو پھر نہ چھو سکیں گے ۔ دیوی کے پاؤں آنسوؤں سے نم ہو گئے ۔ وہ اب دیوی کے سامنے گھٹنوں کے بل ہاتھ جوڑے کھڑا تھا اور غم کی شدت میں گھگھیا رہا تھا ۔

" میری دیوی بستی والے نہیں چاہتے کہ تو میری ہو کر رہے ۔ جب میں تیرے پاس تھا تو مجھے یہ معلوم نہ ہو سکا کہ پریم کی دنیا اتنی دکھیاری ہوتی ہے ۔ دیوی تیرا پجاری اس پریم روگ کو من میں بسائے وہ اپنی اجڑی دنیا ختم کرنے کے لئے جا رہا ہے ۔ مجھے صرف یہ

معلوم کرنے کی ضرورت ہے کہ میری پوجا کو تو نے قبول کیا ہے یا نہیں اور اپنے من کے مندر میں مجھے جگہ دی ہے یا نہیں۔ یہ کہکر اس نے حسرت واسی سے دیوی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالیں محبت کی آگ پتھر کے سینے میں بھی بھڑک سکتی ہے۔ اور وہ بھی موم کی طرح پگھل سکتا ہے۔ دیوی من مگن ہوئی اور آرتی کے پھول نیچے آ رہے اور اس کی آنکھوں میں آنسو چھلک اٹھے اور اس کے منہ سے ایک آہ نکلی اور ہونٹوں پر آکر رک گئی مگر وہ دیوی تھی انسان نہیں تھی اور زیادہ نہ بول سکی۔ اس کے پجاری کے لئے اتنا بھی بہت زیادہ تھا۔ جدائی کا غم اور محبت کی کامیابی کی خوشی دونوں نے مل کر اس کے دل میں ایک ہنگامہ برپا کر دیا اور اس کی آخری نظریں آنسوؤں کے بادل کو چیرتے ہوئے دیوی پر پڑیں اور وہ اپنی چھاتی پر صبر کی سل رکھ کر اپنی گٹھڑی سنبھالے مندر سے چل پڑا۔ رات ہو چکی تھی۔ فطرت بھی دو محبت بھرے دلوں کی جدائی کو دیکھ کر تڑپ اٹھی، آندھی اٹھی، بجلی کڑکی، بادل گرجے، اور موسلا دھار بارش ہونے لگی۔ آسمان بھی اس سماں کی تاب نہ لاکر رونے لگا۔ مگر آسمان صرف آنسو بہانا جانتا ہے۔ اس کو تڑپانے میں ہی مزا ملتا ہے۔ ہنسانے میں نہیں۔ وہ محبت اور اس کی گہرائیوں کو کیا سمجھ سکتا ہے۔

برہمن پجاری نے اپنے من کی مراد پائی اور دوسری صبح مندر میں اپنی دھونی رمائی۔ وہ جانتا تھا کہ دیوی کو کونسا پجاری پسند ہے۔ اس لئے وہ اپنی پوجا میں ایسی مقناطیسی قوت پیدا کرنا چاہتا تھا جو دیوی کے دل کو اس کی طرف کھینچ لائے۔ وہ پو پھٹنے سے پہلے اٹھتا اور شبنم سے لدے ہوئے خوبصورت تیکھے پھول دیوی کی پوجا کے لئے توڑ لاتا۔ دیوی کے جسم کو عطر و عنبر سے مہکا دیتا۔ اس کی مانگ میں سیندور بھرتا۔ ماتھے پر تلک لگاتا۔ ہر روز دیوی میں ایک نیا روپ بھرتا اور تقدس کے پھول اس کے چرنوں میں رکھ کر آرتی اتارتا اور گڑگڑا کر اس سے التجا کرتا کہ اے دیوی تو مجھے اپنا بنا لے۔ مگر اس کو یہ دیکھ کر حیرت ہوتی کہ اتنی التجا پر بھی دیوی نہ مسکراتی! یہ کیوں؟ اس لئے کہ دیوی کو ان پھولوں میں اگلی سی بوئے محبت نہ آتی اور نہ عطر میں وہ خوشبو جس سے اس کا دماغ تازہ ہو جاتا تھا۔ جب پجاری کے ہاتھ سیندور لگانے کے لئے اس کے ماتھے سے مس ہوتے تو غصے اور نفرت کی آگ اس کی آنکھوں سے نکلتی اور پجاری کے دل میں دیوی کے غصے کی دھاک بیٹھ جاتی اور اس کے قدم لڑکھڑا جاتے اور وہ اپنا سر ہاتھوں میں لئے بیٹھ جاتا۔ اس کا شیشۂ دل چور چور ہو جاتا۔ ان ٹکڑوں کو دوبارہ جوڑنے کی فکر میں دیوی کے چرنوں پر اپنا سر رکھ دیتا۔ اس امید میں کہ شاید دیوی پھر کبھی مسکرا دے اور ان ٹکڑوں کو باہم جوڑنے مسالہ مل سکے۔ مگر پجاری کی امیدوں پر پانی پھر گیا۔ دیوی کبھی نہ مسکرائی پجاری کی آرتی دیوی کو کیوں پسند نہ آئی۔ کیا اس کے پھولوں میں تازگی اور عطر میں خوشبو سچ مچ نہ تھی۔ پجاری حیران ہو گیا۔ دل میں کہتا کہ پھول تو اسی بیل سے توڑ لایا ہوں، عطر وہی، سیندور وہی، بھجن وہی، مگر دیوی کیوں نہیں مسکراتی؟ اس کی بھونڈی سمجھ اس راز کو نہ پہچان سکی اگر وہ دل سے سوال کرنے کے بجائے اپنے ضمیر سے سوال کرتا تو یہ جواب ملتا کہ دیوی کی پوجا کا حق دار تو نہیں اور نہ دیوی تیری پوجا کو قبول کر سکتی ہے۔ اس کے پجاری کو تیری وجہ مندر سے نکالا گیا۔ وہ روتا تڑپتا، آہ بھرتا بہت دور ہمیشہ کے لئے چلا گیا۔ کیا پجاری کمزور تھا کیا اس کے بازوؤں میں اتنی طاقت نہیں تھی کہ وہ تیرا مقابلہ کرتا۔ نہیں وہ تنہا تھا اور تیرے ساتھ بستی کے سب لوگ۔ وہ چاہتے تھے کہ تو اس کا پجاری بنے۔ ہاں صرف تو۔ مگر انھوں نے دیوی سے کیوں نہ پوچھا کہ اس کو کونسا پجاری پسند ہے۔ دیوی بول بھی نہ سکی۔ اس کو ڈر تھا کہ بستی کے لوگ اس کو مندر سے نکال باہر نہ کر دیں اور مندر میں دوسری دیوی کا راج ہو وہ دیوتا نہیں بلکہ دیوی تھی۔ حسد کی آگ اس کے دل میں بھڑک اٹھی اور اس نے اپنے دل میں ٹھان لیا کہ چاہے کوئی میری پوجا کرے بستی کے لوگ تو مندر میں آئیں گے۔ میری پرستش ہوگی۔ آرتی اتاری جائے گی۔ دعائیں مانگی جائیں گی۔ وہ تو ہے

خوش ہوں گے کہ میں نے ان کے پجاری کو مندر میں جگہ دی۔ ہاں مندر میں۔ دل میں نہیں۔ پجاری ان کا ہے میرا نہیں۔ وہ مندر میں بیٹھا کرے۔ پھول چڑھایا کرے۔ آرتی اتارا کرے اور بھجن گایا کرے۔ مجھے کیا! میں نہیں مسکراتی اور نہ مسکرانے کے لئے میرا دل چاہتا ہے۔ مجھے تو اپنے پجاری کی پوجا چاہیے۔

دن بیت گئے۔ پجاری امید میں رہا کہ میری پوجا قبول ہوگی اور دیوی اسی امید میں رہی کہ شاید میرا پجاری میری محبت سے مجبور ہوکر ایک دن میرے درشن کو آنکلے۔ مگر افسوس کہ وہ کبھی نہ آسکا اس کو بستی والوں کا، پجاری کا، اور ضمیر کی ملامت کا ڈر تھا۔ وہ نیک تھا۔ نتیجہ کے تصور نے اس کو ایسی حرکت سے باز رکھا۔

آخر کیا ہوا! ایک دن پجاری نے اپنی ان تھک پوجا سے تنگ آکر دیوی کے چرنوں پر جان دے دی اور دیبی نے محبت کی آگ سے پژمردہ ہوکر اور ندامت کی تاب نہ لاکر اپنا گلا گھونٹ لیا۔ مگر خطا کس کی تھی! نہ تو دیوی کی اور نہ اس کے پجاری کی .... بستی والوں کی.... اگر بستی والے دیبی کے من کے مندر کے پجاری کو مندر میں رہنے دیتے تو آج دیوی کے درشن سے محروم نہ ہوتے اور ایک نوجوان پجاری کی جان بھی نہ جاتی!!

سلیم النساء بیگم

عشرتِ حزیں

حلقۂ احباب میں جب جھومتی ہو زندگی
قہقہوں کی گونج میں کھو جائے آہوں کا خروش
گر رہے ہوں آسماں سے جب ہزاروں آبشار
آسماں پر بن رہے ہوں کہکشانی راستے
سیلِ موسیقی میں بہہ جائے سکوتِ کائنات
اور ایسے میں کسی کی مست نظروں کا پیام
سو گئی ہو حال کے زانو پہ جب فکرِ مآل
نور کے سانچے میں ڈھل جائے فضاؤں کا جمال
چاندنی کی گود میں سو جائے فطرت کا جلال
نیم وا کلیوں میں جاگے پھول بننے کا خیال!
ڈھل گئی ہو جب دلوں سے خود بہ خود گردِ ملال
ہاں فقط میرے لئے بن جائے مبہم سا سوال

پھر کسی صورت دلِ شاعر بہلتا کیوں نہیں
نغمہ و انوار کی زد میں مچلتا کیوں نہیں!!

نظر حیدرآبادی

انیسویں صدی کے بعض سیاسی افکار

(۱) انفرادیئے (Individualists)

انیسویں صدی کے نصف اول میں انفرادیت کے تخیل نے ایک نمایاں سیاسی نظریہ کی حیثیت اختیار کرلی تھی۔ یورپ میں انقلابی انفرادیت کا جذبہ ترقی پر تھا۔ ایک طرف اعتدال پسند جمہوری بھی اس کے علمبردار تھے تو دوسری طرف انتہا پسند جمہوری بھی اس کے حامی تھے فشتے اور کانٹ نے بھی اس نظریہ کی درمیانی صورت کو انسانی صفات سے متصف کیا۔ مشہور مفکر ولہم فان ہمبولڈٹ (۱۸۳۵-۱۷۶۹ء) نے اس نظریہ کو اپنی کتاب "اختیارات مملکت کی تحدید" میں ایک اعتدالی رنگ میں پیش کیا۔ اس نے یہ بتایا ہے کہ حکومت ایک ناگزیر برائی ہے اور حکومت کے فرائض کو صرف جان و جائداد کی حفاظت تک محدود رہنے چاہئیں۔ اس کا خیال ہے کہ ایک فرد کی غیر محدود آزادی گفتار و کردار انسانیت کی ترقی کے لئے ضروری ہے۔ انگلستان میں بھی انفرادیت کا یہ سخت گیر مزاجی نظریہ کچھ اہمیت حاصل کرچکا تھا۔ چنانچہ طامس پین کی تصانیف متعدد بار شائع ہوئیں اور انہیں برطانوی انتہا پرستی کی انجیل سمجھا جاتا تھا۔ رچرڈ کارلائل (۱۸۴۳-۱۷۹۰ء) نے پین کے نظریوں کی اشاعت کو اپنی زندگی کا مقصد بنالیا تھا۔ اس کے جریدہ "دی ریپبلیکن" (۱۸۱۹ء) نے بہت مقبولیت حاصل کی مگر اسے ضبط کرلیا گیا۔ میجر جان کارٹرٹ (۱۸۲۴-۱۷۴۰ء) بھی اس سلسلے میں قابلِ ذکر ہے جو روسو کا ایک جوشیلا شاگرد تھا۔ بنتھم نے "انسانی حقوق" کو ایک "مزاجی افترا" قرار دیا۔ مگر اس کے باوجود ایک عرصہ تک کارٹرٹ نے "انسانی حقوق" کے نظریہ کی تبلیغ کی۔

انگلستان میں انفرادیت کا جو نظریہ رائج تھا وہ بنتھم کا اصلاح کردہ افادی (Utilitarian) نظریہ تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ انتہا پسند فلسفیوں کا وہ نظریہ بھی رائج تھا جو بنتھم سے ماخوذ تھا۔ یہ انفرادی[1] نظریہ تباہ کن حکومتی "مداخلت" کا ردِعمل تھا جو اٹھارویں صدی میں نمایاں حیثیت اختیار کرچکی تھی۔ یہ مداخلت غیر دانشمندانہ تھی۔ اس مداخلت کا مقصد محض مخصوص اشخاص اور سرمایہ دار طبقوں کا مفاد تھا۔ یہ تباہ کن مداخلت مذہب میں بھی کی جارہی تھی۔ یہ تاجرانہ مداخلت، اقتصادیات پر بھی حاوی تھی۔ اس مزدورکُش مداخلت کا دائرۂ عمل صنعت تک بھی پہنچ چکا تھا۔ یہ مستبدانہ مداخلت اندرونِ ملک اور سمندر پار کے مقبوضات کے معاملات میں بھی جاری تھی۔ فطری حکومت کے حامیوں نے فرانس میں اس حکومتی مداخلت کے خلاف اور آزادئ کامل کے حق میں آواز اٹھائی۔ انگلستان کے وہ پراٹسٹنٹ بھی اس تحریک سے متاثر ہوئے جو کلیسائے انگلستان کے رکن نہ تھے ان میں گاڈون اور اڈم سمتھ جیسے ماہرین اقتصادیات بھی شامل ہیں فرانسس پلیس جیسے لیبر لیڈروں نے بھی اس تحریک سے دلچسپی ظاہر کی۔ بنتھم اور اس کے شاگردوں کے سے سیاسی مصلحین نے بھی اس نظریہ کو اختیار کیا۔ ملکہ وکٹوریہ کے عہد کے اولین دور تک یہ نظریہ عام تھا۔ اور یہ بلا مبالغہ کہا جاسکتا ہے کہ اس نظریہ نے انتہا پسندوں کو بیدار کیا کہ وہ پرانی ناانصافیوں اور دیرینہ کمزوریوں کو ختم کردیں۔

بنتھم کے تمام شاگردوں میں جیمز مِل سب سے بڑا آدمی تھا۔ اس کی زندگی کا اہم مقصد بنتھم کی تصانیف کا انگریزی ترجمہ کرنا تھا

---

[1] اس نظریہ کی رو سے ہر فرد کو عمل کی آزادی ہونی چاہیے۔ (مترجم)

اور اس طرح اس نے بنتھم کی دقیق اور مشکل تصانیف کو ایک اوسط فہم کے انگریز کے لئے قابل مطالعہ بنا دیا۔ اس نے اپنے استاد کے اصولوں میں بہت کم اضافہ کیا اور کہیں کہیں تھوڑا بہت اضافہ صرف بنتھم کے اصولوں کی نفسیاتی بنیادوں کو مستحکم کرنے کیلئے کیا تھا۔ ہابس کی طرح اس کا بھی یہی خیال تھا کہ انسان ایک خود غرض حیوان ہے اور اس کی نمایاں خصوصیات آزادی کی محبت اور قوت کی طمع ہیں۔ اس طرح اس نے یہ ثابت کیا کہ اگر اس منفعت اندیش فرد نے ایک مملکت کے قیام اور ایک حکومت کے استوار کرنے میں مدد دی تو اس نے یہ کام محض ذاتی خواہشات اور افادی مقاصد کے تحت کیا۔ اور افادی مقاصد اپنی زندگی، آزادی اور ملکیت کے دفاع و تحفظ پر مشتمل تھے۔ اس نے یہ بھی بتلایا کہ جن انسانوں کو حکومتی اقتدار تفویض کیا گیا ہے وہ سب لازمی طور پر زیادہ قوت حاصل کرنے کی خواہش کریں گے اور اپنی رعایا کی مختلف آزادیوں کو غصب کرنے کی کوشش کریں گے۔ چنانچہ اس نے اپنے ہمسایہ شہریوں کو بیدار مغز اور چوکس رہنے کی تلقین کی اور انہیں یہ مشورہ دیا کہ قوت حاملہ کو کمزور کرنے کے لئے صرف ایک نمائندہ ایوان ہونا چاہیے، رائے دہندگان کا حلقہ وسیع ہونا چاہیے، انتخابات اکثر ہونے چاہئیں اور رائے خفیہ طریقہ سے دی جائے۔

جیمز مل ایک تندخو اور زبردست منطقی مفکر تھا۔ اس کا بیٹا جان سٹوارٹ مل (۱۸۰۶ء تا ۱۸۷۳ء) نرم دل تھا اور اس کے ذہنی تخیلات باہم خلط ملط ہو چکے تھے۔ وہ طبعاً سریع الفطرت تھا لیکن بچپن میں اسے بہت زیادہ تعلیم دے کر اس کی یہ فطرت کچل دی گئی۔ مگر پھر بھی اس کی طبیعت تاثر پذیر رہی۔ لیکن اس کے تعمیری و تنظیمی جذبات ختم ہو گئے۔ سب سے پہلے اس نے بنتھم اور جیمز مل کے افادی نظریہ کو قبول کیا۔ پھر کالرج کی روحانیت کو اخذ کیا۔ بعد ازاں کارلائل کے تخیل کو اپنایا۔ کومت کی ثبوتیت[1] کو اختیار کیا۔ مسز ٹیلر کی نسائیت کے اثر کو قبول کیا۔ اور سینٹ سائمن کی نیم اشتراکیت سے استفادہ کیا۔ اس طرح اس کے ذہنی تخیلات باہم خلط ملط ہو گئے۔ مل ایک ایسا افادیت پسند ہو گیا جو خوشی کے کیفیتی اور کمیتی امتیازات کا اعتراف کرتا تھا۔ وہ ایک ایسا اتامی (Empiricist) (جو شخص محض تجربہ کی بناء پر کام کرتا ہوا ور نظریات و استدلال کا قائل نہ ہو) بن گیا جو وجدان و بداہت کی قوت کو محسوس کرتا تھا۔ وہ اس قسم کا حقیقت پسند ہو گیا جس کے اندر بلند تخیل کارفرما تھا۔ وہ ایک ایسا دہریہ بن گیا جو مذہب کا احساس رکھتا تھا۔ وہ ایک ایسا انفرادیت پسند ہو گیا جو اشتراکیت کی طرف واضح رجحان رکھتا تھا۔ تاہم وہ ایک انفرادیت پسند تھا۔ اس کے طبعی مزاج کا انتہائی جذبہ شخصی آزادی سے محبت کی بناء پر تھا۔ اس کی بہترین سیاسی تصنیف آزادی پر گراں قدر مقالہ ہے۔ اس مقالہ میں وہ پوری قوت کے ساتھ آزادیٔ گفتار اور آزادیٔ عمل کو پیش کرتا ہے۔ وہ آزادی جو دیگر افراد کی مساویانہ آزادی میں مداخلت نہیں کرتی ــــ وہ اس مقالہ میں شخصیت کی اہمیت پر زور دیتا ہے اور خوشی کی بجائے خود شناسی کے جذبہ کو زندگی کا انتہائی مقصد قرار دیتا ہے۔ اس نے اس مقالہ میں حکومت کی اس قوت پر جو وہ ایک فرد پر استعمال کرتی ہے سخت پابندیاں عائد کی ہیں۔ اس کی دوسری زبردست سیاسی تصنیف "نمائندہ حکومت" (۱۸۶۱ء) ہے۔ اس کتاب میں وہ جمہوری طرز حکومت پر بحث کرتا ہے اور یہ ثابت کرتا ہے کہ عام حق رائے دہی سے عوام کو جو تعلیم ملتی ہے صرف وہی تعلیم

---

[1] (Positivism) آگسٹ کومت کا نظام فلسفہ جس کی رو سے صرف ان چیزوں کا وجود تسلیم کیا جاتا ہے جو دیکھی اور ثابت کی جا سکیں۔ (مترجم)

جمہوریت کو دوسری ہر قسم کی طرزِ حکومت پر ترجیح دینے کے لئے کافی ہے۔

جب جان اسٹوئرٹ مل آزادی اور اشتراکیت میں ہم آہنگی پیدا کر رہا تھا اس وقت ہربرٹ اسپنسر (۱۸۲۰ء-۱۹۰۳ء) پرزور طریقہ پر یہ ثابت کر رہا تھا کہ آزادی اور اشتراکیت ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ اپنی تصانیف "معاشرتی اعداد و شمار" (۱۸۵۰ء) اور "انسان اور مملکت" (۱۸۸۴ء) میں اس نے قانون سازوں کی غلطیوں کی مذمت کی ہے۔ حکومت کی مسلسل غاصبانہ حرکات پر افسوس کیا ہے۔ کھوئی ہوئی آزادیوں کا ماتم کیا ہے۔ اور اس امر پر زور دیا ہے کہ مملکت کے فرائض پرانی حدود کے مطابق صرف انسان کی زندگی، آزادی اور ملکیت کے قدرتی حقوق کے تحفظ تک محدود رہنے چاہئیں۔ پروفیسر ہکسلے اپنے دوست اسپنسر کے اس نظریہ کو "انکارِ قوتِ انتظامیہ" قرار دیتا ہے۔

(۲) اجتماعیئے (Collectivists)

اسپنسر نے "انسان اور مملکت" میں یہ ظاہر کیا تھا کہ انسان اور مملکت باہم متضاد ہیں۔ یہ وہی نظریہ تھا جس پر روسو نے اظہارِ تاسف کیا اور جس کے شبہات کو دور کرنے کی اس نے بہت کوشش کی تھی۔ یہ امر یاد رکھنا ضروری ہے کہ انسان اور مملکت کے بین تضاد کو دور کرنے کی روسو نے جو کوشش کی تھی یہ اسی کا نتیجہ تھا کہ قوم کی مشیتِ عامہ کے وجود کا اقرار کیا گیا اور اس مشیتِ عامہ کو قوم کے ہر فرد کی رائے کے مترادف سمجھا گیا۔ اس نظریہ کی بنا پر مملکت کو میکانکی کی بجائے نامیاتی سمجھا جانے لگا۔ اور مملکت کو دانش و تدبر، ضمیر اور قوتِ ارادی کی مالک شخصیت سمجھا جانے لگا۔ روسو کے اس شاندار تخیل نے کانٹ کی زبردست اور موثر ذہانت پر اثر کیا۔ اس نے اسے قانون کے ایک کلیہ کی شکل میں پیش کیا۔ اور یہ ثابت کیا ہے کہ قانون آزادی کے خلاف نہیں بلکہ آزادی کی ناگزیر شرط ہے۔ روسو نے اپنی انقلابی تعلیم کے انفرادی پہلو میں جس نظریۂ آزادی کا اظہار کیا تھا وہ کانٹ کی تعلیمات کا اصلِ اصول بن گیا۔

کانٹ کا قابل ترین اور جوشیلا شاگرد جے، جی فشٹے (۱۷۶۲ء-۱۸۱۴ء) بھی اپنی زندگی کے ابتدائی دنوں میں اسی نظریۂ آزادی کی دھن میں لگا رہا۔ فشٹے ایک وسیع المشرب شخص تھا۔ اس نے انفرادیت پر زور دیا۔ روسو کی مدح و ثنا کی۔ اور انقلابِ فرانس کا خیر مقدم کیا۔ اپنی زندگی کے اس دور میں فشٹے نے "انقلابِ فرانس" (۱۷۹۳ء) اور "اصولِ قانونِ فطرت" (۱۷۹۶ء) نامی کتابیں لکھیں۔ جب فرانس نے جرمنی پر حملہ کیا اور "جنگِ جینا" میں پروشیا کو آزادی سے محروم کر دیا تو فشٹے کے نظریہ میں بھی تبدیلی پیدا ہو گئی۔ اس نے اپنی مشہور کتاب "جرمن قوم سے خطاب" میں اپنے ہموطنوں کو لڑائی اور انتقام کے لئے ابھارا۔ وہ قوم پرست اور سیاسی رجعت پسند بن گیا اور انفرادی آزادی کی بجائے اس نے قوم کے اتحادِ مقصد و عمل پر زور دینا شروع کیا۔ اس نے یہ تبلیغ شروع کر دی کہ قوتِ اقتدار کی ضرورت ہے۔ اطاعت لازمی ہے۔ فوجی خدمت ضروری ہے۔ اس نے مملکت کی قربانی کی بہت تعریف کی اور کہا کہ حفاظتی محاصل عاید ہونے چاہئیں تاکہ قوم کے ذرائع آمدنی میں وسعت پیدا ہو۔ یہ سب امور اجتماعیت کی صفات خصوصی ہیں۔

لے اس نظریہ کے حامی کہ ملکیت اجتماعی ہونی چاہیے (مترجم)

مکمل تبدیلیٔ خیال کی بہترین مثال اس کی مذکورہ بالا اولین تصنیفات اور خود "مختصر صنعتی مملکت" (۱۸۰۰ء) اور "اصولِ قانون" (۱۸۱۲ء)
میں موجود ہے۔ تاہم ان متعدد نظریوں کے باوجود وہ کانٹ کی بجائے روسو کا معتقد رہا۔ اس نے صرف روسو کی تعلیمات کے قومی پہلو
—— یعنی مملکت کے نامیاتی وجود، قوم کی فرد پر قوتِ اختیار، اور مشیتِ عامہ کی حاکمیت —— پر زور دیا تھا۔ یہ سب اس بات
کا بین ثبوت ہیں کہ وہ ایک انفرادیت پسند سے اجتماعیت پسند بن گیا تھا۔

فشٹے کے نظریۂ اجتماعیت کو ہیگل نے پایۂ تکمیل کو پہنچا دیا۔ ہیگل انیسویں صدی کا موثر ترین فلسفی تھا اور جامعہ برلن
میں فشٹے کا جانشین مقرر ہوا تھا۔ اپنی کتاب "فلسفۂ قانون" (۱۸۲۱ء) اور پھر "فلسفۂ تاریخ" میں اس نے مملکت کی اس قسم پر زور
دیا جس میں فرد کی حیثیت مکمل طور پر اطاعت گزار کی ہو اور فرد کو اجتماعی مقصد کے حصول کا ایک ذریعہ ثابت کیا ہے۔ ہیگل خیالی دنیا میں
بسنے والا ایک انسان تھا جو یہ یقین رکھتا تھا کہ کائنات کی بنیاد روح —— یعنی ایک معقول رائے پر ہے۔ وہ ایک ایسا ارتقائی تھا
جس نے اسپنسر اور ڈارون سے بھی پہلے اس امر کا اعلان کیا تھا کہ تاریخ لا منفک اور قادرِ مطلق قوتِ ارادی کے مسلسل ارتقا کی شاہد
ہے۔ وہ ایک ایسا اطلاقی تھا جو یہ خیال کرتا تھا کہ ارتقا کا عالمگیر طریق، حریت اور قوتِ اقتدار، قانون اور آزادی، قیام اور حرکت
استبدادیت اور جمہوریت، اور زندگی و موت کی طرح کے مخالف و متضاد اصولوں کا منطقی عمل اور ردِ عمل ہے۔ اور یہ کہتا تھا کہ حقیقتِ
مطلق ان تمام بین متضاد امور کی ہم آہنگی و توافق پر مشتمل ہے۔ وہ یہ سیاسی فلسفہ پیش کرتا تھا کہ آزاد رائے فرد اور مملکت دونوں
کی بنیاد ہے۔ اس کا یہ خیال تھا کہ اس بنیادی آزادی کا احساس و اظہار پہلے پہل خارجی قانون میں ہوتا ہے، پھر داخلی اخلاق
میں، بعد ازاں معاشرتی اصولِ اخلاق میں۔ اور بالآخر کار اس بنیادی آزادی کا احساس و اظہار ریاست کے سیاسی اصولِ اخلاق
میں ہوتا ہے۔ اس کے نزدیک انسان کے ثقافتی ارتقا کی انتہائی منزل مملکت ہے۔ اور یہ مملکت مطلق العنان ہے جس میں ہر فرد کی
کی حقیقی رائے اور بحیثیتِ مجموعی قوم کی رائے عامہ کے درمیان ہم آہنگی موجود ہوتی ہے۔ اور صرف مملکت ہی میں فرد آزادی کامل
حاصل کرتا ہے —— اور یہ حقیقی آزادی صفاتی ارتقا اور ادائیگیٔ فرض ہے۔ ہیگل کی تعلیمات کی شکل میں سیاسی نظریہ
افلاطون کی تعلیمات پر واپس آ گیا ہے۔

ہیگل نظریہ انیسویں صدی کے نصفِ آخر میں ایک عجیب بوقلموں تاریخ کا حامل ہے۔ جب ترئیشک نے ہیگل کی تشکیلی مملکت کو
ہوہن زولرن شہنشاہیت کے مترادف قرار دیا تو بسمارک، بنہارڈی اور ہر ایک جنگِ عظیم کے لئے راستہ صاف ہو گیا۔ جب فیڈرک
اور کارل مارکس نے کائنات کی اساس کے روحانی ہونے سے انکار کیا اور اسے مادی قرار دیا تو انھوں نے اشتمالیت اور پرولتاری آمریت
کے لئے راستہ صاف کر دیا۔ جب آکسفورڈ میں طامس ہل گرین اور اس کے شاگردوں نے ہیگل کے اس نظریہ کو جو اس نے اپنی
کتاب "فلسفۂ قانون" میں پیش کیا ہے افلاطون، ارسطو، کانٹ، فشٹے، کارلائل اور مارس کے قدیم نظریوں کے ساتھ ملایا تو اجتماعیت
کے حق میں ایک جوش پیدا ہو گیا جس نے آخر کار نئے تعین اشتراکیت کی شکل اختیار کر لی۔

طامس ہل گرین (۱۸۳۶ء تا ۱۸۸۲ء) ایک زبردست اور شریف الطبع انسان تھا مگر اعلیٰ پایہ کا مفکر نہ تھا۔ اس کی تحریر میں
کی صفت موجود نہیں تھی۔ اس نے جرمن فلسفہ کو دوبارہ زندہ کیا۔ "مبادیاتِ اخلاقیات" اور "سیاسی ذمہ داری کے اصول"

میں اس نے ہیوم کی مادیت، بنتھم کی افادیت، اسپنسر کی انفرادیت جی ایچ لے ویس کی ثبوتیت کی مخالفت کی ہے۔ اس کا خیال ہے کہ انسان ایک روحانی ہستی ہے جو لاانتہا قیمت اور غیر محدود امکانات رکھتی ہے۔ اس کی ترقی کامل کے لئے آزادی کا ہونا ضروری ہے اور یہ آزادی صرف مملکت ہی میں قایم رہ سکتی ہے۔ نیز مملکت کا مقصد اعلیٰ ان رکاوٹوں کو دور کرنا ہے جو ایک فرد کی منتشر زندگی کے راستہ میں حائل ہیں۔ گرین کے سیاسی فلسفہ میں کانٹ کا اثر ہیگل سے زیادہ نمایاں ہے۔

(۳) اشتراکی (Socialists.)

اس میں شک نہیں کہ انیسویں صدی کے نصف اول میں انفرادیت کا نظریہ عروج پر تھا۔ مگر اس نظریہ کے ساتھ ساتھ اشتراکیت (سماج کو ملکیت کی مساوی تقسیم کی بنیادوں پر دوبارہ قایم کرنا اور مقابلہ کی بجائے شراکت کا اصول جاری کرنے کا نظریہ) کی تین چھوٹی چھوٹی شاخیں بھی نمودار ہوتی گئیں اور آخرکار یہ تینوں شاخیں مارکسی اشتمالیت کی شکل میں متحد ہوگئیں۔

اشتراکیت کی پہلی شاخ فرانسیسی تھی۔ اس کا ماخذ روسو کی غیر فانی تعلیمات تھیں۔ روسو نے منجملہ دیگر باتوں کے یہ بھی کہا تھا کہ انسانی تاریخ کے فطری دور میں تمام انسان آزاد اور ایک دوسرے کے برابر تھے۔ تمام اشیا مشترکہ سمجھی جاتی تھیں اور ہر فرد اپنی ضرورت کے مطابق ذخیرۂ عامہ سے چیزیں لے لیا کرتا تھا۔ جب شخصی ملکیت کے ادارہ کا قیام عمل میں آیا تو انسان کی مسرت اور اس کی معصومیت کا خاتمہ ہوگیا۔ مارلے نے اپنی کتاب "قانونِ فطرت" (۱۷۵۵ء) میں اور مابلے نے اپنی کتاب "اصولِ قانون" (۱۷۷۶ء) میں روسو کے نظریۂ اشتمالیت کو اور ترقی دی۔ علاوہ ازیں انقلابی عہد میں بابوف (۱۷۹۶ء) نے اس نظریہ کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش کی۔ لیکن انقلابِ فرانس بنیادی طور پر ایک انفرادیت پسند تحریک تھی ـــــ اس کی اساس مساوات کی بجائے آزادی پر رکھی گئی تھی ـــــ اس لئے اشتمالیت کو کچھ عرصہ کے لئے پس پشت ڈال دیا گیا۔ جب یہ انقلابی دور ختم ہوگیا تو اشتمالیت ایک اعتدال پسند اور دلآویز شکل میں دوبارہ نمودار ہوئی۔ کومٹ ڈی سینٹ سائمن ([illegible]۔۱۸۲۵ء) نے یہ نظریہ پیش کیا کہ غریب طبقہ کا مفاد اس امر میں مضمر ہے کہ زمین، زر اور پیداوار کے تمام ذرایع مشترک ہوں۔ ہر شخص اپنی بساط و قابلیت کے مطابق کام کرے اور اس کی خدمات کے مطابق اسے معاوضہ دیا جائے۔ اسی زمانہ میں سی، ایم، فورئر ([illegible]ء) نے تجویز پیش کی کہ تمام بنی نوع انسان کو فیلانستری[1] (فورئر کے نظامِ اشتراکیت کے پیرو) دوبارہ منظم کریں۔ تمام کرۂ ارض پانچ پانچ سو خاندانوں میں تقسیم کر دیا جائے، ہر حصہ مکمل بالذات اور اشتمالی اصولوں پر مبنی ہو۔ پی، جے، پرودھوں ([illegible]ء) نے شخصی ملکیت اور حکومت پر شدید نکتہ چینی کی۔ اس کا خیال تھا کہ حکومت کا وجود صرف شخصی ملکیت کے ادارہ کے قیام کی وجہ سے ہے۔ اس نے اس امر کا اعلان کیا کہ قیمت کا واحد معیار اور اساس مزدوری ہے۔ لوئی بلینک (۱۸۱۱ء[illegible]) نے مزدوروں کو گلڈ[2] اشتراکیت کے اصولوں پر منظم کرنے کی ایک جامع تجویز پیش کی۔

---

[1] اشتراکیت کی قسم جس کی رو سے سارے سماج کو مختلف پیشوں کی برادریوں میں تقسیم ہونا چاہیے اور ہر پیشہ کی حکومت اسی کی [illegible] کے ہاتھ میں ہو۔ (مترجم)

اشتراکی رجحان کی دوسری شاخ انگلستان میں نمودار ہوئی۔ گزشتہ زمانہ کے مفکر جان بال کے اعتراضات، مور کی تصنیف "یوٹوپیا" اور ہیرنگٹن کی کتاب "اوشیانا" کے سے تخیل، ایویرڈ اور ونسٹینلے کی طرح کے سترھویں صدی کے اشتمالیوں کی تصنیفات و تجربات، اور ولیم اوگل وی اور طامس سپنس کے سے اٹھارویں صدی کے مفکرین کے خیالات پر اس شاخ کی بنیادیں استوار کی گئیں۔ یہاں طامس پین اور ولیم گاڈون کا ذکر کرنا کچھ موزوں معلوم نہیں ہوتا۔ انھوں نے اپنے انفرادیت پسند نظریوں کے دوران میں چند بے ربط اور غیر متناسب اشتمالی خیالات پیش کئے ہیں۔ انیسویں صدی کے ربع اول میں چھ عظیم الشان ہستیوں نے ترقی پسند اشتراکی لائحہ عمل کو پایۂ تکمیل تک پہنچا دیا۔ ان شخصیتوں کی زندگیوں اور کارناموں سے مفصل آگاہی حاصل کرنے کے لئے قارئین کو پروفیسر فاکس وال کی کتاب "رائٹ ٹو دی ہول پروڈکس آف لیبر" (مطبوعہ لے میگزین ۱۸۹۹ء) کا اور ایم۔ بیر کی تصنیف "تاریخ اشتراکیت برطانیہ" (۱۹۱۹ء) کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ ان مفکرین کے نام چارلس ہال، رابرٹ اوون، ولیم تامپسن، طامس ہاج سکن، جان گرے اور جان فرانسس برے ہیں۔ اپنے نظریات میں انھوں نے اکثر اقتصادی غلطیاں اور سراب آسا انکشافات کئے ہیں۔ کارل مارکس کی تعلیمات کی بنیاد انھیں غلط اقتصادی نظریوں اور انکشافات پر ہے۔ یہ امر بھی قابل توجہ ہے کہ ۱۸۴۸ء کی تحریک منشوریت میں اشتمالی عنصر غالب تھا۔ لڈلو، مارس اور کنگسلے کی پیش کردہ عیسوی اشتراکیت بھی کچھ عرصہ (۱۸۵۴ء) تک مقبول رہی حالانکہ اس عیسوی اشتراکیت کا بنیادی نظریہ اشتراکیت کی بجائے تعاون تھا۔

اشتراکی رجحان کی تیسری اور آخری شاخ جرمنی میں پیدا ہوئی۔ اس کی بنیاد ہیگلی فلسفۂ مملکت اور اس کے واسطے سے روسو کے نظریہ پر تھی۔ جرمن اشتراکیت کے مندرجہ ذیل تین علمبردار تھے!۔

(۱) "کارل مارلو" (پروفیسر ونکل بلیچ ۱۸۶۰ء) اپنے زمانہ کی اقتصادی برائیوں کا علاج اس نے اجتماعی ملکیت تعاونی پیداوار، دولت کی تمام قوم میں تقسیم اور آبادی کو حد سے بڑھنے نہ دینے میں پایا۔

(۲) کے۔ جے۔ روڈ برٹس (۱۸۷۵ء) اس نے قیمت کا مزدوری نظریہ پیش کیا۔ دولت کے سود اور زمین کے لگان اور کرایہ کو ایک ظلم قرار دیا۔ اس نے مستقبل کی ایک ایسی اشتمالی ملکت کا نقشہ پیش کیا جس کا قیام اگرچہ مستقبل قریب میں ناممکن تھا مگر اس مملکت میں ہر فرد ایک دوسرے کے برابر ہوگا اور ہر شخص کو اس کی سماجی خدمت کے مطابق معاوضہ دیا جائے گا۔

(۳) فرڈینڈ لازیل (۱۸۶۴ء) اس نے اگرچہ پرودھون، بلینک، مارلو اور روڈ برٹس کی تعلیمات میں چنداں اضافہ نہیں کیا۔ مگر اس نے اشتراکیت کی نشر و اشاعت نہایت فصاحت و بلاغت اور جوش و خروش سے کی۔ ۱۸۶۳ء میں اس نے "انجمن مزدوراں" بنا کر "جرمن سماجی جمہوریت" قائم کی۔

اشتراکی رجحانات کی یہ تینوں شاخیں کارل مارکس (۱۸۸۳ء) کی اشتمالیت کی شکل میں متحد ہو گئیں۔ مارکس کا لاطینی نام مرد ڈیشیا تھا۔ وہ ٹریوس کے مقام پر پیدا ہوا۔ اس نے بون اور برلن کی جامعات میں ہیگلی فلسفہ کی تعلیم حاصل کی۔ وہ شروع شروع میں ایک انقلابی صحافی کی حیثیت رکھتا تھا۔ اس کی زندگی کا یہ دور مختصر کشمکش تھا۔ چنانچہ وہ پیرس بھاگ گیا اور وہاں (۱۸۴۳ء) پرودھون اور دیگر فرانسیسی اشتراکیوں سے ملا۔ ... کی تعلیم کے متعلق بہت کچھ سیکھا۔ ۱۸۴۸ء سے ۱۸۸۳ء تک اس نے جلیم میں معاشی

قیام گیا۔ [illegible] میں جرمنی واپس آکر ایک مختصر سا عرصہ رہا اور پھر لندن چلا گیا۔ وہاں اس نے اپنی زندگی کے بقیہ ایام [illegible] مطالعہ، تصنیف، تنظیم اور تحریک میں صرف کئے ـــــــ یہ سب کام اس نے معاشرتی انقلاب اور عالمگیر اشتمالی دولتِ متحدہ کے قیام کے لئے کئے۔ اس کی تجاویز کے معاشرتی عناصر فرانسیسی، اقتصادی اجزا انگریزی اور سیاسی اصول المانوی تھے۔ اس نے اپنی تعلیمات و تجاویز کو مشہورِ عالم "اشتمالی منشور" [illegible] کی شکل میں بہترین و موثر پیرایہ میں پیش کیا ہے۔ لندن میں [illegible] میں ایک اشتمالی کانفرنس ہوئی تھی اس کے نتیجہ کے طور پر مارکس کی تصنیف "سرمایہ" [illegible] "اشتمالی منشور" سے ضخیم ہے۔ اس کتاب کا اندازِ بیان نہایت مشکل ہے۔ مگر "اشتمالی منشور" میں پیش کئے ہوئے سیاسی نظریہ کے علاوہ اور کوئی نیا سیاسی نظریہ اس کتاب میں موجود نہیں ہے۔

مارکسی تعلیم کے مندرجۂ ذیل پانچ اجزا ہیں:۔

(۱) تاریخ کے متعلق مادی نظریہ۔ اس نظریہ کے مطابق انسانیت کا ارتقا خیالات کی بجائے جسمانی ضروریات کی وجہ سے ہوتا رہا ہے اور ہو رہا ہے۔

(۲) طبقاتی جنگ کا نظریہ۔ اس نظریہ میں تہذیب کے عروج و زوال، مملکتوں کے عروج و زوال، اور معاشرتی نظاموں کی تبدیلیوں کو بیان کیا گیا ہے۔

(۳) قیمت اور فاضل قیمت کا مزدوری نظریہ۔ اس نظریہ کی رو سے طبقاتی جنگ کو درست اور جائز قرار دیا گیا ہے۔

(۴) اقتصادی جبریت کا نظریہ۔ اس نظریہ میں مارکس نے سرمایہ دار تہذیب کا زوال ناگزیر بتایا ہے اور پرولتاری جنت کی پیشین گوئی کی ہے۔ اور (۵) ایک اشتمالی لائحہ عمل جسے بہت جلد بروئے کار لانے کو کہا گیا ہے تاکہ سرمایہ دار تہذیب کا ناگزیر زوال جلد تر وقوع میں آئے اور بے رحم قسمت کا ارتقا آسان ہو۔

(ترجمہ)

اکرام قمر ہوشیارپوری

اطلاع

جو اصحاب اپنے مضامین سب رس میں اشاعت کے لئے بھیجتے ہیں، اگر وہ قابلِ اشاعت قرار پائیں تو ان کو سلسلہ وار شائع کیا جاتا ہے۔ جو مضامین ناقابلِ اشاعت ہوتے ہیں ان کو واپس نہیں کیا جاتا۔

براہ کرم مضمون نگار اصحاب اپنے ہاں مضامین کی نقل رکھیں۔

علم ہیئت و جغرافیہ

(اس مضمون میں جو دلیلیں پیش کی گئی ہیں اڈیٹر کا ان سے اتفاق ہونا ضروری نہیں۔ جو صاحب بھی اس کا جواب لکھیں اس کو شکریہ کے ساتھ شائع کیا جائے گا۔)

شاہ دکن نے علوم و فنون کے وہ دریا بہائے کہ جو لوگ پہلے سے علمی کاموں میں مشغول تھے، وہ میدان علم میں اور آگے بڑھ گئے۔ سو دو سو صدیاں گزرنے پر بھی علم و فن سے ناآشنا تھیں علم و فن کے میدان میں داخل ہوئیں اور آگے بڑھنے والوں نے اپنی جگہ خالی کی تو ان شائقین جدید نے ان کی جگہ لے لی۔ ہر کس و ناکس تحصیل علم و کمال میں مشغول نظر آتا ہے اور ملک میں ایسے افراد پیدا ہوئے ہیں کہ زمانہ ان پر فخر کرسکتا ہے ایسی حالت میں ضرورت ہے کہ جن علوم و فنون کی کتابیں اس وقت زیر درس ہیں ان کو بھی ایک قدم آگے بڑھایا جائے۔ اور جن ابتدائی مضامین کے عامۃ الناس عادی ہوگئے ہیں۔ اور ابتدائی منزل کو معراج کمال سمجھے ہوئے ہیں ان کے آگے علم و فن کا نیا باب کھول دیا جائے۔ اور یہی سلسلہ ترقی جاری رہے۔ تاکہ میدان علم و فن کو دانہ تقلید کا اڈہ نہ بنا رہے۔ علم ہیئت و جغرافیہ بھی ایک فن ہے۔ اس فن کی جس قدر کتابیں زمانے میں پڑھائی جاتی ہیں، ان کا نظریہ ہے کہ زمین اور چاند مل کر ایک ہی سیارہ ہے اور زہرہ و عطارد تین سیارے، شمس کے اطراف چکر لگاتے ہیں اور شمس کے تابع ہیں۔ اور دور حاضر نے اس کا نام نظام شمسی رکھا ہے۔ اس کے سوا اور بہت سے نظریے ہیں۔ مثلاً فیثاغورس کا نظریہ۔ بطلیموس کا نظریہ اور دور حاضر یعنی ہئیت قدیم، متوسط، جدیدہ ان نظریوں پر تنقید اور غور و فکر کرنا رصدگاہ میں ایک زمانہ گزارنے کا نتیجہ ہے۔ اس نظریہ کی رو سے تمام سیارے زمین کے اطراف چکر لگاتے ہیں، جس میں بعض کی سیر مشرق سے مغرب کی طرف اور بعض کی مغرب سے مشرق کی طرف ہے۔ اس لحاظ سے اس نظام کا نام نظام ارضی قرار دینا زیادہ موزوں ہوگا۔ نظام ارضی کا یہ نظریہ ماہران و نقادان فن ہئیت و جغرافیہ کے آگے پیش کیا گیا اور اس کے دلائل عقلی و نقلی جو تجربہ و مشاہدہ سے ثابت ہیں دکھائے گئے اور ذکی الحس ماہران فن ہئیت و جغرافیہ نے اسے تسلیم کیا۔ اور بعض متحیر و متردد ہیں۔ یہ چند سطور ان کے تحیر و تردد کو رفع کرنے کی غرض سے لکھی جاتی ہیں۔ جغرافیہ پڑھانے کا پسندیدہ طرز تعلیم اور اصول تفہیم یہ ہے کہ جغرافیہ کی ابتداء ساکن مسکن اور اس کے ماحول سے کی جائے۔ مثلاً ایک شخص اپنے گھر میں رہتا ہے تو جغرافیہ کی ابتدا اسی کے گھر سے کی جائے۔ پھر شہر، پہاڑ، دریا، سمندر وغیرہ دکھائے جائیں۔ نیوٹن کا قول ہے کہ حرکت کشش کے بغیر پیدا نہیں ہوتی حکما و فلاسفہ بھی اس رائے سے متفق ہیں۔ اور ٹائیکو براہی جو محققین فن ہئیت میں بہت بڑا پایہ رکھتا ہے..........

.......اس نظریہ سے اتفاق کرتے ہوئے کہتا ہے کہ زمین ساکن ہے۔ اور تمام سیارے اس کے گرد چکر لگا رہے ہیں ٹائیکو براہی کو اپنی رائے پر اتنا وثوق تھا کہ جب اس کے پاس نظام شمسی کے قائلین مارگلیسر، کوپرنیکس، کیپلر، نیوٹن نے دوائر فلکیات کے تجربات کر کے نظام شمسی کی تصدیق پیش کیا تو اس نے ان تجربات کو بغور ملاحظہ کرنے کے بعد بھی جواب میں یہی کہا کہ میرا پہلا قول ہی صحیح ہے یعنی زمین ساکن ہے۔ اور تمام سیارگان زمین کے اطراف چکر لگا رہے ہیں۔ اس کا بیان کسی اور وقت وضاحت سے آئے گا۔

یہ تمام خیالات و افکار پہلے لوگوں کے ہیں جو ان کے تجربوں پر مبنی ہیں لیکن اس خیال کی تقلید ضروری نہیں۔ تحقیق کا دروازہ ہمیشہ کے لئے کھلا ہے۔ انسان کو کسی خیال پر اس وقت تک قائم نہ ہونا چاہیے جب تک خود بھی اس کی تحقیق و تجربہ

مذکورہ نظریہ کے تحت ہم نے تحقیق کا دروازہ کھٹکھٹایا نظامِ شمسی کے نظریہ پہ پہلے زمین سے پتھر اٹھایا اور آسمان کی طرف پھینکا وہ زمین پر آ رہا۔ اتفاقاً وہاں ایک بلند پہاڑ پر آم کا درخت تھا اوپر کی ڈالی سے ایک آم ٹوٹا خیال ہوا شاید آم آفتاب میں جگہ لے گا لیکن وہ بھی زمین پر آ پڑا۔ بعد خیال آیا کہ طیارے ہوا میں ہزاروں فٹ بلندی پر پرواز کرتے ہیں۔ اگر ان میں سے کوئی چیز پھینکی جائے تو شاید سورج میں پہنچ جائے گی لیکن تجربہ نے بتلایا کہ وہاں سے بھی زمین پر ہی آ گرتی ہے۔ پھر خیال نے پرواز کی کہ طیارہ شکن توپیں سمت الراس کی طرف گولا پھینکتی ہیں اور فی ثانیہ ان کے گولے میلوں بلند پہنچتے ہیں ممکن تھا کہ کسی وقت ان کا گولا غلطی ہی سے کبھی آفتاب میں ٹھہر جاتا لیکن تجربہ نے اس کی نفی کی۔

حالیہ جنگ میں یہ ہو رہا ہے کہ طیارے بجائے بم اندازی کے توپیں سر کر رہے ہیں اگر ایسا طیارہ پوری بلندی پر بھی چلا جائے اور وہاں سے ادھر کی طرف توپ سر کی جائے تو اس صورت میں بھی تجربہ میں کوئی اضافہ نہ ہو سکے گا اور نہ گولا آفتاب میں جگہ لے سکے گا۔ بلکہ وہ بھی زمین پر آ رہے گا پھر یہ فکر دامن گیر رہی کہ اور کون سا تجربہ کیا جائے جس سے سورج کی کشش کا پتہ چلے۔ خیال کی جولان گاہ میں ایک بات آئی کہ شہابِ ثاقب جو فضا ءبسیط سے نکلتے ہیں وہ کہاں جاتے اور کہاں جمع ہوتے ہیں۔ دوربین سے دیکھا گیا بلکہ رصدگاہ کی اس دوربین سے دیکھا گیا جس سے یورانس اور نیپچون (فلک الثوابتہ اور فلک الافلاک) کا مشاہدہ کیا جاتا ہے۔ جو ہئیت جدید ومتوسط اور قدیم کے آرا کے لحاظ سے ساری کائناتِ عالم کا انتہائی نقطہ ہے۔ ایسی دوربین سے دیکھنے پر بھی شہابِ ثاقب فضائے بسیط سے زمین پر ہی آتے ہوئے دکھائی دیئے۔ نظر تو آسمان کی طرف لگی ہوئی تھی ایک سال تک یہی عمل جاری رہا سال بھر تک تمام رات جاگتے جاگتے ختم کی گئی لیکن کبھی ایسا مشاہدہ نہ ہوا کہ کوئی شہابِ ثاقب سورج میں جاتا تو درکنار زمین کی مخالف سمت جاتا یا بازو سے کتراتا ہوا گزر رہا ہو بلکہ ہوا کی مخالفت کے باعث ترچھا ہوتا ہوا زمین پر گرتا ہوا دکھائی دیا۔ بسا اوقات اس کے ذرات بلکہ ایک ایک پونڈ کے ٹکڑے زمین پر پائے گئے جس سے ثابت ہوا کہ ان سب کا میلان گاہ زمین ہی ہے اور ہونا بھی چاہیئے کیونکہ زمین ہی ہر چیز کا میدان ہے۔ اور وہی اس کا معاد قرار پائے گی۔ اور ان تمام تجربات سے زمین کی کشش ثابت ہوتی ہے جب سائنٹیفک تجربہ نے بتایا کہ سب چیزیں زمین پر گرتی ہیں کوئی سورج کی طرف نہیں جاتی۔ تو معلوم ہوا کہ ساری کشش زمین میں ہے نہ کہ آفتاب میں۔

فیثاغورس اور دورِ حاضر کے ماہرین فن ہئیت وجغرافیہ جو ماہر فلکیات بھی تھے ان کا نظریہ یہ ہے کہ زمین مع چاند کے اور زہرہ عطارد یہ تینوں سورج کی کشش میں ہیں اگر ان کا یہ نظریہ درست رہتا تو مذکورہ تجربات میں سے کوئی چیز کبھی تو اپنا گھر سورج میں بناتی گو غلطی سے ہی۔

ہماری رائے ہے کہ فیثاغورس کو مذکورۂ بالا خیال اس وقت سے پیدا ہوا جب کہ وہ رصدگاہ میں بیٹھا ہوا زہرہ اور عطارد کو آفتاب کے مقابل دیکھ رہا تھا۔ اس کو آفتاب میں سیاہ دھبہ نظر آیا۔ اور جب یہ مقابل سے جاتا رہا تو آفتاب میں سیاہ دھبہ کا وجود نہ تھا۔ اور زہرہ وعطارد بھی اس وقت نظر سے اوجھل تھے۔ یہیں سے اس کو یہ خیال پیدا ہوا کہ زہرہ وعطارد اور زمین مع چاند کے آفتاب کا چکر لگا رہے ہیں۔

کیونکہ آفتاب زمین سے جسامت میں بہت بڑا اور زمین کی بہ نسبت آفتاب مختلف خوبیوں کی بدولت ممتاز ہے اور زمین کے

حیوانات و نباتات جہاں تک آفتاب کی روشنی رہتی ہے زندہ ہیں اور غالباً ایسے ہی تصورات کی بنا پر آفتاب کی پرستش کی گئی جس کا نمونہ اب تک موجود ہے یہ بھی ممکن ہے کہ فیثا غورس اور دور حاضر کے ماہرین کا نظریۂ نظام شمسی محض تفہیم کے لئے ہو۔ جو بطور مثال کے اختیار کیا گیا ہے۔ تاکہ بات جلد سمجھ میں آجائے اور فن سے لگاؤ پیدا ہو۔ ان کا خیال یہ ہوگا کہ آئندہ نسلیں تحقیق کریں گی اور معلومات حاصل کرکے اس پر اضافہ کریں گی، اس کے قطع نظر ان لوگوں کو آلات مثل جہاز طیارہ، کیمرا، اور دوربین، ریڈیو وغیرہ جو فی زمانہ موجود ہیں نہ مل سکے۔ تاہم فیثا غورس اور دور حاضر کے ماہرین نے محنت جانکاہ سے کواکب و سیارگان کے عکوس نقشہ جات، محوری گردش دریافت کرنے کے آلات وغیرہ تیار کئے ہیں۔ جو خراج تحسین حاصل کرنے کے مستحق اور تاریخ عالم کے صفحات پر آب زر سے لکھے ہوئے ہیں۔ ان حالات کے مدنظر صرف ایسے پرانے خیالات پر اس روشن زمانہ میں قناعت کرنا اور ان کی کورانہ تقلید کرنا درست نہ ہوگا۔
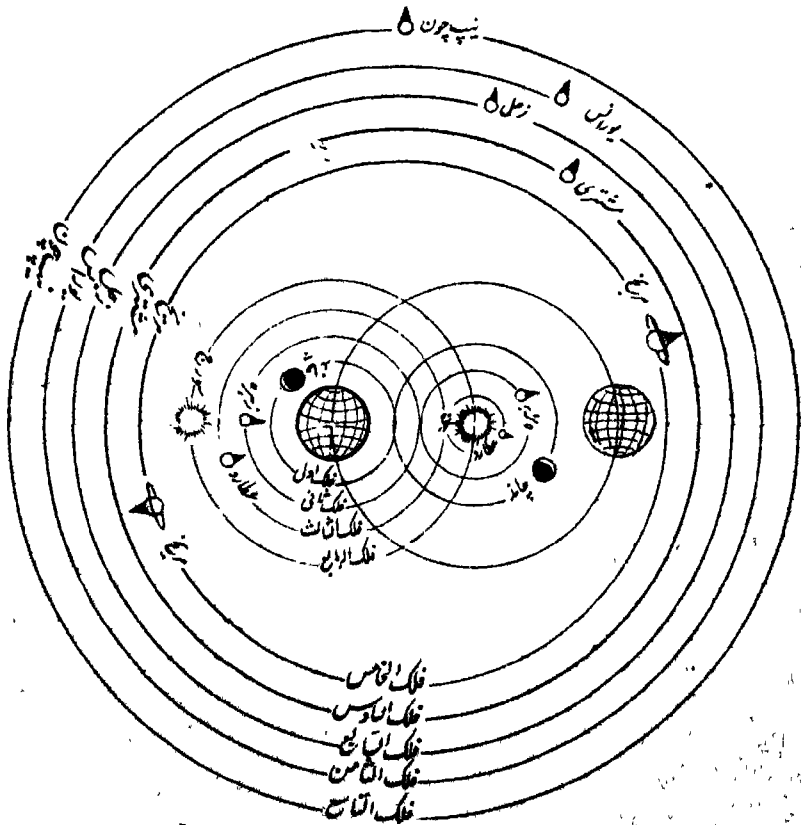
جو آلات فی زمانہ استعمال ہوتے ہیں ان کی مدد سے تحقیق کو آگے بڑھانا ہمارا فرض قرار پاتا ہے چنانچہ ہم نے اس سلسلہ میں ایک کتاب

لکھی ہے جس میں اپنی تحقیقات کے دلائل واضح طور پر پیش کئے ہیں جو براہین نظریہ محسوسہ۔ سمعیہ۔ لامسیہ۔ بصریہ پر مشتمل ہیں۔ اور جو بالکل سائنٹفک تجربہ پر مبنی ہونے کے باوجود عام فہم بھی ہیں۔ جس طرح یہ کتاب عقل و نقل و درایت کے مطابق اور صاحبان معقول و ارباب منقول دونوں کے لئے مفید ہے۔ نیز اس کتاب میں دوائر فلکیات کثرت سے دیئے گئے ہیں۔ جس کے منجملہ ایک شکل ضرور درج کی گئی ہے۔ جس سے معلوم ہوگا کہ رصادان عالم کو کہاں کہاں غلط فہمی ہوئی ہے۔ امید کہ نقادان فن ہئیت ہماری اس تحقیق و تدقیق پر غور کریں گے۔ جو دوائر متنازعہ فیہ ہیں، وہ دوائر زہرہ عطارد اور شمس ہیں اس لئے ان کے دوائر بھی علحدہ علحدہ بتا دیئے گئے ہیں۔ (نقشہ گزشتہ صفحہ پر ملاحظہ ہو)

ان دونوں کواکب کی تصویروں سے اس بات کی کیفیت کا اندازہ ہوگیا ہے کہ کوئی سیارہ جب دوسرے کے لئے حاجب ہوتا ہے تو محجوب میں کیا کیفیت ہوتی ہے۔ اس سے ظاہر ہوجاتا ہے۔ نیز موسم کا پیدا ہونا اور اس کا تغیر و تبدل۔ تواریخ شمسی و قمری چاند گہن و سورج گہن کے مسائل بتائے گئے ہیں اور ان کو دلائل معقول و منقول سے ثابت کیا گیا ہے۔ اور ایسے نظریے جن کے ثبوت میں کوئی معقول دلیل نہیں نظر انداز کئے گئے ہیں۔ چونکہ ہمارا مذہب معقول ہے ہم معقول بات کو پسند کرتے ہیں۔

سید اسمٰعیل

عید

عید کا دیکھو نظر آیا ہے چاند
عید کی لے کر خبر آیا ہے چاند

اک طرف شان امیری رقص و رنگ
اک طرف دنیا غریبوں کی ہے تنگ

اک طرف عیش و نشاط بے پناہ
اک طرف عسرت ہے حالت ہے تباہ

اک طرف سرمایہ داری باغ باغ
اک طرف مزدور کا دل داغ داغ

اک طرف خوش حالیاں اور واہ واہ
اک طرف بدحالیاں ہیں آہ آہ

اک طرف فرعونیت آزادگی
اک طرف ہے بندگی بے چارگی

اک طرف شور مبارک باد ہے
اک طرف بس نالہ و فریاد ہے

اک طرف وہ قہقہوں کا زور ہے
اک طرف آہ و بکا کا شور ہے

اک طرف پوشاک رنگا رنگ ہے
اک طرف عریانیوں کا رنگ ہے

اک طرف خوش حالی و آسودگی
اک طرف بدحالی و فرسودگی

اک طرف تحفہ ہے عطر اور پان کا
اک طرف بس خون ہے ارمان کا

اک طرف سب صاف ہیں اور پاک ہیں
اک طرف سب سر سے پا تک خاک ہیں

شیر خرما اور سوئیاں اک طرف
قلب سوزاں چشم گریاں اک طرف

دیکھکر یہ عید اور ہیچ اور نیچ کی
عید کی آزاد نے بھی ہیچ کی

ہے مہ خوبی تو ناز عید ہے
عشق تیرا بے نیاز عید ہے

عیدگاہ ما غریباں کوئے تو
انبساط عید دیدن روئے تو

سید محمد حسین آزاد

حیاتِ نو

نہ رو اے ہمنشیں! آئیں گے دن خوشیاں منانے کے
نئے انداز سیکھے گی یہ دنیا، مسکرانے کے!

لکھی جائیں گی تازہ داستانیں حسن و الفت کی
فسانے محو ہو جائیں گے سب اگلے زمانے کے!

مسرت پھول برسائے گی باغِ زندگانی پر
نظر افروز منظر ہوں گے سارے کارخانے کے!

نئے انداز ہوں گے حسنِ خود بیں کی اداؤں میں
نئے عنوان ہوں گے عشق و الفت کے فسانے کے!

بدل جائے گا سب کچھ، عیش کے دن، ہجر کی راتیں
عجب کچھ کیف پرور روز و شب ہونگے زمانے کے!

مسرت صفحۂ ہستی سے نقشِ غم مٹا دے گی
گزر جائیں گے یہ مایوس دن رونے رلانے کے!

حیاتِ نو کے ہونٹوں پر تبسم کھیلتا ہو گا
بدل جائیں گے یہ بدلے ہوئے تیور زمانے کے!

زمیں کا چپہ چپہ غیرتِ باغِ ارم ہو گا
لٹائے گا دُر و گوہر فلک اپنے خزانے کے!

غرض سارے اصولِ زندگی بدلے ہوئے ہوں گے
قفس کی تیلیاں تنکے بنیں گی آشیانے کے!

اختر

فریبِ تمنّا

شکارِ گردشِ دوراں بنا ہوا ہوں میں
تغیرات کے سانچے میں ڈھل رہا ہوں میں

کچھ ایسے سازِ شکستہ کی اک صدا ہوں میں
دلوں میں درد کی صورت سما گیا ہوں میں

سمجھ سکے مجھے کیوں کر کوئی کہ کیا ہوں میں
وہ ابتدا ہوں کہ خود رازِ انتہا ہوں میں

ہنوز وہ ہیں اور ان کا فریب جلوہ گری
کہ شاخِ گل پہ نشیمن بنا رہا ہوں میں

مرے وجود سے قائم ہے نظمِ دو عالم
زمانہ عکس ہے میرا اور آئینہ ہوں میں

نشاطِ ہستیٔ موہوم کچھ نہیں ہے ظفر
فقط فریبِ تمنا ہے کھا رہا ہوں میں

ظفر (عثمانیہ)

نئی کتابیں

۱۔ بیانِ غالب (مجموعہ شرح کلام غالب) از آغا محمد باقر ۴۰۴ صفحہ قیمت عالہ۔ شیخ مبارک علی تاجر کتب۔ لاہور۔

۲۔ پاکیزہ محبت (ناول) از پنڈت دگپال و مکھراج مسرا ۲۴۴ صفحہ قیمت عمہ پریم سنگھ کشن لال تاجران کتب لوہاری منڈی لاہور

۳۔ خمخانۂ رباعیات از شفق عمادپوری ۲۴۴ صفحہ قیمت عہ شفق بک ڈپو۔ حاجی پور۔ رفیق گنج۔ گیا۔

۴۔ میلادِ شہید (منظوم) (قصائد و نظمیں) مرتبہ انتظام اللہ اکبرآبادی ۴۸ صفحہ قیمت ۴ر مصطفائی بکڈپو متصل میوہ کٹرہ۔ آگرہ۔

۵۔ منتخب داغ حصہ اول و دوم (انتخاب کلام داغ) مرتبہ احسن مارہروی ۲۴۰ صفحہ قیمت عہ انوار احمدی پریس۔ الہ آباد

۶۔ پھریری (افسانے) از عظیم بیگ چغتائی قیمت عالہ، کتب خانہ تاج آفس۔ محمد علی روڈ بمبئی نمبر ۳۔

۷۔ قومی تحریکیں (انقلابی تحریکیں) از اطہر امرتسری۔ ۲۰۰ صفحہ قیمت عہ۔ عالمگیر بکڈپو۔ لاہور۔

۸۔ نادرشاہ اور ستارہ (تاریخی ناول) از عبدالرحیم شبلی ۲۵۰ صفحہ قیمت عہ " " "

۹۔ سرگزشت اعظم کاروان (تاریخی ناول) از سید احسان علی شاہ ۲۰۰ صفحہ قیمت عہ " " "

۱۰۔ تاریخی افسانے از مولانا احمد ایم۔ اے ۲۰۰ صفحہ قیمت عہ " " "

۱۱۔ روسیو کی داستانِ عشق مرتبہ ادارہ عالمگیر قیمت ۱۲ر " " "

۱۲۔ علم الحروف از حکیم محمود علی خاں ماہر ۲۵۰ صفحہ قیمت سے محمود منزل۔ روشن آرا روڈ۔ دہلی۔

۱۳۔ کلیاتِ میر (نیا ایڈیشن) مرتبہ عبدالباری آسی و سید جعفر علی ۱۰۶۰ صفحہ قیمت عہ۔ نولکشور پریس۔ لکھنؤ۔

۱۴۔ مجموعہ قوانین دیوانی و مال جدید ترمیم شدہ قیمت ۵ر۔ شمس المطابع۔ نظام شاہی روڈ۔ حیدرآباد

۱۵۔ ضابطہ ملازمت سیول سرکار عالی جدید مرتبہ قیمت عالہ۔ " " "

۱۶۔ ماورا (نظمیں) از ن۔ م۔ راشد قیمت عمہ ۔ مکتبۂ اردو۔ لاہور

۱۷۔ پرواز لق لق (مزاحیہ) از حاجی لق لق قیمت عمہ۔ " " "

۱۸۔ حسن کی قیمت (نیا ایڈیشن) از حکیم احمد شجاع قیمت عہ " " "

۱۹۔ مشین اور مزدور از باری قیمت ۲ر " " "

۲۰۔ جاگیرداری از عبداللہ ملک۔ قیمت ۲ر " " "

۲۱۔ ہندوستان کے لیڈر از یوسف مہر علی مترجمہ اکرام قمر بی اے قیمت ۲ر " " "

۲۲۔ روزنامچوں کے اوراق (مختلف زندگیوں کا نفسیاتی مطالعہ) از مقصود زاہدی۔ مکتبہ ساغر۔ ادبی مرکز۔ میرٹھ

۲۳۔ مدح مکاتیب (مشاہیر کے مکتوب) مرتبہ ساغر نظامی۔

۲۴۔ کاروان (انقلابی نظمیں) از قمر جلال آبادی ۴۲ صفحہ قیمت ۸ر دفتر اخبار اشارہ ہسپتال روڈ۔ لاہور

۲۵۔ پریم پجاری (نیا ایڈیشن) (ایڈیشن ہشتم [illegible] کے حالات) قیمت ۸ر دفتر رسالہ چاند۔ اردو نگر۔ سہارنپور۔

۲۶۔ [illegible] (افسانوی مجموعہ) از میرزا ادیب [illegible] صفحہ قیمت [illegible] [illegible] لاہور

مرزا [illegible]

ادارہ کی خبریں

اردو امتحانات

امیدوارانِ امتحانات اس سال ادارہ کے اردو امتحانات میں حسب تفصیل ذیل امیدواروں نے شرکت کی۔

امتحان	شریک	حاضر	کامیاب	درجہ: اول	درجہ: دوم	درجہ: سوم
اردو فاضل	۵۵	۴۷	۳۶	۰	۱۴	۲۴
اردو عالم	۱۱۵	۹۹	۶۵	۱	۲۴	۴۰
خوشنویسی	۲۲	۱۹	۱۱	۴	۲	۶
اردو دانی	۴۳۵	۳۴۳	۳۱۷	بہ امتیاز ۶۸		کامیاب ۲۴۹

نتائج امتحانات

اردو فاضل

ناموں کی ترتیب بلحاظ نشانات محصلہ کی گئی ہے۔

رول نمبر	نام		درجہ
۲۱	محمد حسین اظہر	(بلدہ)	دوم
۳۹	سید محمد نور الحسن انور	(گلبرگہ)	دوم
۲۲	محمد عبدالغنی فاروقی	(بلدہ)	دوم

۱۔ مرکز حیدرآباد (سٹی کالج)

رول نمبر	نام	درجہ
۱۰	مغل مرزا نذیر بیگ	دوم
۱۵	سید فدا اللہ حسینی	"
۱۴	میر محبوب علی خاں	"
۱۲	سید احمد محی الدین	"
۷	محمد عبدالعزیز	"
۱۹	محمد عبدالوہاب اکمل	سوم
۱۸	سید محمود شاہ قادری	"
۱۳	محمد یوسف	"
۴	حکیم شیخ منصور علی	سوم
۲	محمد مسعود مرزا خاں	سوم
۲۰	محمد عزیز الدین مبشر	سوم
۶	میر حبیب علی امدادی	سوم
۹	محمد غوث الدین داؤدی	سوم
۱	محمد احمد سعید خاں	سوم

۲۔ مرکز حیدرآباد (مدرسۂ فوقانیہ نسواں نامپلی)

رول نمبر	نام	درجہ
۱۱	سیدہ بدر راقعہ	دوم
۳	طیبہ بیگم	سوم

۳۔ مرکز پربھنی

رول نمبر	نام	درجہ
۲۴	سید مظفر علی رضوی	دوم
۲۷	شیخ امیر	سوم
۲۵	عبدالمجیب خاں	سوم
۳۳	محمد ناصر انصاری	سوم

۳۴ گلشن ناؤ — سوم

۱۸ محمد عبدالرزاق فاروقی — سوم

۴۰ سید صدرالدین ہاشمی — "

۳۲ صالح بن محمد — "

۲۹ امین الدین احمد — "

۳۹ محمد نصیرالدین فاروقی — "

۴ - مرکز گلبرگہ

۳۶ سید محمد نورالحسن انور — دوم

۳۹ ملا ممتاز الدین احمد انصاری — سوم

۵ - مرکز ناندیڑ

۴۱ محمد شمس الدین خاں — دوم

۶ - مرکز نرسی

۴۳ محمد نذیر الدین — دوم

۴۴ قاضی محمد شریف الدین — "

۴۵ محمد عبدالکریم — سوم

۷ - مرکز پرلی

۵۳ اشرف الدین فیضی — دوم

۵۲ غلام حسن صدیقی — سوم

اردو عالم

۱ محمد ظہورالحق معین الدین احمد انصاری (بلدہ) اول

۵۴ سید داؤد (پربھنی) دوم

۱۰ شوکت النساء بیگم (بلدہ) دوم

۱- مرکز حیدرآباد (سٹی کالج)

۱۶ محمد بن عمر باکلکا ساکت — دوم

۱۱۵ محمد عبدالرحمن فاضل — دوم

۱۵ سید عبدالغنی — دوم

۲۹ رنگیا دیو ورگی — دوم

۱۱۳ غلام محمد — سوم

۱۴ سید حمد — سوم

۲۴ محمد خواجہ معین الدین — سوم

۱۱ سید نورالحسنین — سوم

۲- مرکز حیدرآباد (مدرسہ فوقانیہ نسواں نام پلی)

۲۰ شوکت النساء بیگم — دوم (مرکز میں اول)

عطیہ — دوم (" " دوم)

۹ رضیہ بیگم — دوم (مرکز میں دوم)

۳ شمیم آرا — دوم

۳۴ وحید النساء بیگم — دوم

۸ عاشوری بیگم — دوم

۲۳ فاطمہ صغریٰ — سوم

۱۲ سیدہ رحیم النساء بیگم — سوم

۲۲ ساجدہ بیگم — سوم

۴ تمیز النساء بیگم — سوم

۳- مرکز کلیانی

۳۵ سید منظور احمد — دوم (مرکز میں اول)

۳۶ محمد حمید الدین — دوم

۳۴ محمد علی خاں — دوم

۳۳ خواجہ شمس الدین — سوم

۳۷ سید مہر علی — سوم

۴۔ مرکز پربھنی

۴۵ سید داؤد — دوم (مرکز میں اول)
۵۳ غلام احمد — دوم
۵۱ محمد عبدالرزاق عثمانی — سوم
۴۳ محمد عبید اللہ خاں — سوم
۵۰ سید عیسیٰ — سوم
۵۵ محمد علیم الدین — سوم
۵۸ محمد انصاری — سوم
۴۲ محمد عبدالکریم — سوم
۵۲ تاج محی الدین — سوم
۳۹ سید شمس الضحیٰ — سوم
۵۷ محمد بشیر — سوم
۴۷ سید حسین — سوم
۳۸ محمد عبدالوہاب — سوم

۵۔ مرکز گلبرگہ

۶۴ محمد عبدالغنی افسر — دوم (مرکز میں اول)
۶۳ سید امیر مہدی نقوی — دوم
۶۲ سید حسام الدین — دوم
۶۵ محمد رحمت اللہ — سوم

۶۔ مرکز کشتگی

۶۶ سعد الدین خاں — سوم

۷۔ مرکز خانہ پور

۷۹ سید ناظر علی — دوم (مرکز میں اول)
۷۶ محمد عبدالحمید خاں عثمانی — سوم
۷۸ محمد عبدالشکور خاں — سوم

۸۱ محمد عبدالوہاب — سوم
۸۷ محمد عبدالجبار خاں — سوم

۸۔ مرکز نرسی

۸۳ سید غلام دستگیر — سوم (مرکز میں اول)
۹۲ عبدالکریم خاں — سوم
۸۹ عبدالرحیم — سوم
۹۰ سید عثمان — سوم

۹۔ مرکز پرلی

۹۴ سید عبدالخالق — دوم (مرکز میں اول)
۹۵ سید شریف الحسن — سوم

۱۰۔ مرکز پرینڈہ

۹۶ عبدالرشید — سوم (مرکز میں اول)
۱۰۱ سید محمد ابراہیم — سوم
۱۰۰ محمد یونس — سوم

۱۱۔ مرکز کیل

۱۰۵ محمد عبدالمجید — دوم (مرکز میں اول)
۱۰۸ محمد عبدالرشید — دوم
۱۰۳ محمد شرف الدین — دوم
۱۰۴ سید اسمٰعیل علوی — دوم
۱۰۷ سید محبوب حسین — سوم
۱۱۱ محمد عبدالحق — سوم
۱۱۰ محمد امین الدین — سوم
۱۱۲ محمد عبدالقیوم — سوم

۱۲۔ مرکز کیل (نسواں)

۱۰۹ سیدہ حبیب النساء بیگم — سوم

خوشنویسی

۴	محمد غیاث الدین	(بلدہ)	اول	
۳	محمد جہانگیر الدین	(")	اول	
۲۱	سید مرتضیٰ قادری	(کپل)	اول	
۲	محمد صلاح الدین	(بلدہ)	اول	

۱۔ مرکز حیدرآباد

۱	سید اظہر حسین	دوم

۲۔ مرکز پربھنی

۹	سید شمس الضحیٰ	دوم

۳۔ مرکز کشتگی

۲۲	سید تاج الدین	سوم

۴۔ مرکز کاماریڈی

۱۴	سید عزیز الدین	سوم

۵۔ مرکز خانہ پور

۱۶	محمد قطب الدین	سوم
۱۹	شیخ داؤد	سوم

۶۔ مرکز کپل

۲۰	محمد مردان	سوم

اردو دانی

۲۳	فاطمہ	(حیدرآباد)	اول
۲۴	کلثوم فاطمہ	(")	دوم
۲۵	قیصر سلطانہ	(")	سوم

۱۔ مرکز حیدرآباد (سٹی کالج)

حسب ذیل امیدوار بدرجۂ امتیاز کامیاب ہیں۔

۱۲	مظہر القدوس
۴۶	محمد فضیل الدین

حسب ذیل امیدوار کامیاب ہیں۔

۱۳	برج موہن لال
۱۵	محمد صلاح الدین
۱۷	خواجہ عقیل احمد
۱۸	خواجہ جمیل احمد
۳۶	محمد حنیف
۴۳	موہن راؤ
۴۴	محمد اسمٰعیل
۴۵	عبدالرحیم
۴۷	امیر الدین
۴۸	محمد ابراہیم
۴۹	منگاسم راؤ
۵۰	محمد علیم الدین
۵۱	شیخ ابراہیم
۵۲	شیخ مولانا
۵۳	محمد مولانا
۵۴	محمد جلال الدین
۵۶	میر شوکت علی
۵۷	محمد معین الدین
۵۸	خواجہ مصلح الدین صابری
۶۴	راج نگم

۹۲ محمد حسین
۹۳ سید فضل اللہ حسینی
۷۲ گنگا دیال
۷۳ آر بجرنگ پرشاد
۷۵ لکشما ریڈی
۷۶ کے نرسلو
۷۷ بی ویربھدریا
۷۸ محمد علی
۷۹ مرزا خواجہ بیگ
۸۰ محمد عبدالرشید
۸۱ ایشورایا
۹۲ نرہری
۹۳ حبیب الدین
۹۴ جگناتھ
۹۵ غوث محی الدین احمد
۹۷ ڈی وینکیا
۱۰۰ مرزا محمد علی بیگ
۱۰۱ پانڈورنگیا
۱۰۲ راملو
۱۰۳ ایم ایس لنگیا
۱۰۵ محمد مولانا
۱۰۶ بندہ علی
۱۰۷ قمرالدین
۱۰۸ شیخ جہانگیر
۱۱۰ حبیب اللہ خاں
۱۱۱ حیدر محی الدین علی

۱۱۲ محمد قاسم
۱۱۵ محمد ہارون الرشید فاروقی
۱۱۸ محمد طاہر رشید فاروقی
۲۰۲ محمد اظہر الدین

۲- مرکز حیدرآباد (مدرسہ فوقانیہ نسواں نامپلی)

بدرجۂ امتیاز کامیاب

۹ امت المنان صداقت النساء
۱۰ امت المومن عصمت النساء
۱۱ حنیفہ بی
۱۴ رام دلاری سکینہ
۱۹ سعید النساء بیگم
۲۰ امام النساء بیگم
۲۱ حفیظ النساء بیگم
۲۶ اقبال جہاں بیگم
۲۷ نزہت آرا
۲۸ رضیہ
۲۹ فاطمہ بی
۳۱ روزان
۳۲ کرلین
۳۵ پشپا
۳۷ کنیز فاطمہ
۳۸ سیدہ راحت فاطمہ
۳۹ سیدہ عفت فاطمہ
۴۱ اظہر النساء بیگم
۴۲ امت الرافع فصیح النساء
۵۴ ملکہ بیگم

۶۴ وحید النساء
۶۵ خورشید النساء
۶۶ ذکی النساء
۶۷ عزیز خاتون
۶۸ سکینہ بیگم
۶۹ صفیہ بیگم
۷۱ لطیفہ بیگم
۸۳ حفیظہ بی
۸۴ ہاجرہ بانو
۸۵ نورجہاں
۸۶ آمنہ بیگم
۸۷ عائشہ بیگم
۸۸ بلقیس بیگم
۹۰ صالحہ بیگم
۱۱۴ رضیہ سلطانہ
۱۱۷ افسر سلطان

کامیاب

۶ انور بیگم
۷ حسینی بیگم
۸ افتخار جہاں بیگم
۲۲ تلاوت النساء بیگم
۳۰ روزا
۳۳ شریزہ
۳۴ داؤمنی
۴۰ سیدہ فیاض فاطمہ
۵۵ بی پاشا

۷۰ خورشید بیگم
۸۲ اقبال بیگم
۹۰ امیر النساء بیگم
۹۱ جہانگیر بی
۱۱۳ خورشید سلطانہ

۳- مرکز کلیانی (ذکور)

کامیاب

۱۸۰ نظام الدین (مرکز میں اول)
۱۲۰ بھیما
۱۲۱ عبدالقادر باگ
۱۲۲ نیلکنٹ پرشاد
۱۲۴ محمد عبدالرحیم
۱۲۵ جہادپا
۱۳۰ عبدالقادر
۱۳۲ محمد عبدالرزاق
۱۳۶ محمد ستان
۱۳۷ میر محمود علی
۱۴۸ دستگیر حسین
۱۵۶ محمد حمید الدین
۱۵۷ سید اسمٰعیل
۱۵۸ مانک راؤ
۱۵۹ خواجہ حبیب اللہ خاں
۱۶۰ ساجی
۱۶۳ دتو شنگھ
۱۶۴ سید اقبال حسین
۱۶۷ میر افضل علی

۱۳۹ محمد فخر الدین
۱۶۰ محمد عظمت اللہ خاں
۱۶۱ محمد عبدالرحیم
۱۶۲ محمد اکبر خاں
۱۶۳ محمد عبدالقادر
۱۶۶ نذیر الدین
۱۶۸ نذیر علی
۱۶۹ محمد اسمٰعیل

۴- مرکز کلیانی (اناث)

۱۴۱ زیب النساء بیگم (مرکز میں اول)
۱۳۹ زلیخا بیگم
۱۴۰ زاہدہ بیگم
۱۴۲ بیگم جانی
۱۴۴ محمودہ بیگم
۱۴۵ فرخندہ بی
۱۴۶ کریمہ بی
۱۵۲ سردار النساء بیگم
۱۵۳ خواجہ بانو

۵- مرکز پربھنی (ذکور)

بدرجۂ امتیاز

۱۸۲ سید حسین (مرکز میں اول)
۱۸۳ مرزا واحد بیگ
۱۸۹ غلام ادریس

کامیاب

۱۸۴ شیخ محی الدین
۱۸۸ عبدالعزیز

۱۹۹ محمد ابراہیم
۲۰۱ سید روشن ہاشمی

۶- مرکز پربھنی (اناث)

کامیاب

۱۹۱ احمدی بیگم (مرکز میں اول)
۱۸۹ حمیدہ بیگم
۱۹۰ رابعہ بیگم
۱۹۲ حبیب النساء بیگم
۱۹۳ مہر النساء بیگم
۱۹۴ فاطمہ بی
۱۹۵ محمدی بیگم
۱۹۶ افسر بیگم
۱۹۷ رضیہ سلطانہ
۱۹۸ مصطفیٰ بیگم
۲۰۰ حلیمہ بی

۷- مرکز گلبرگہ (ذکور)

کامیاب

۲۰۷ محمد عبدالقادر (مرکز میں اول)
۲۰۴ محمد عثمان علی
۲۰۵ محمد عبداللہ
۲۱۵ سید سجاد احمد
۲۱۶ محمود علی
۲۱۷ محمد عبدالرحمن

۸- مرکز گلبرگہ (اناث)

کامیاب

۲۰۳ قمر النساء بیگم (مرکز میں اول)

۲۱۴ کنیز فاطمہ

۹۔ مرکز کشنگی (ذکور)

بدرجۂ امتیاز

۲۴۷ شیخ اسمٰعیل (مرکز میں اول)

کامیاب

۲۲۰ سدپا
۲۲۱ سدراما
۲۲۲ کرسدپا
۲۲۸ شیخ حسین
۲۴۹ ڈھونڈی با

۱۰۔ مرکز کشنگی (اناث)

کامیاب

۲۳۶ رضیہ بیگم (مرکز میں اول)
۲۴۵ عالم بی

۱۱۔ مرکز کاماریڈی (ذکور)

بدرجۂ امتیاز

۳۰۰ منگیا (مرکز میں اول)
۲۷۴ شیخ علی حسین

کامیاب

۲۵۴ بچومیا
۲۵۵ محمد ابراہیم
۲۵۶ شیخ حیدر
۲۵۰ اے ایس آر انجینو
۲۵۹ پنڈھریمن
۲۶۱ سید حمید اللہ
۲۶۲ شیخ [illegible]
۲۶۳ شیخ احمد دوم
۲۶۴ سید کریم الدین
۲۶۵ محمد اعظم
۲۷۲ غلام محی الدین
۲۷۶ سید باقر علی
۲۷۷ محمد عبدالرزاق
۲۷۸ میر حسین علی
۲۷۹ محمد رفیع الدین
۲۸۰ سید واحد علی
۲۸۱ میراں محی الدین
۲۸۲ لوکا ملیا
۲۸۳ ایاوار ہنیا
۲۸۷ شنکر پا
۲۸۸ گنگا ریڈی
۲۹۲ شیخ سمیع اللہ
۲۹۵ نرسلو
۲۹۷ راگھو راؤ
۲۹۸ پی ستاریڈی
۲۹۹ گلہ ونکیا
۳۰۲ غلام احمد

۱۲۔ مرکز کاماریڈی (اناث)

بدرجۂ امتیاز

۳۰۸ نفیس فاطمہ (مرکز میں اول)

کامیاب

۳۰۹ لکشمی

۱۳۔ مرکز خانہ پور (ذکور)

بدرجۂ امتیاز

۳۱۷ عبدالصمد (مرکز میں اول)
۳۱۶ عبدالصمد

کامیاب

۳۱۰ ظہور علی خاں
۳۱۱ محمد عثمان
۳۱۲ سید اکرام حسین
۳۱۳ سید احمد
۳۱۹ سید اظہر حسین
۳۲۰ محمد عبدالستار
۳۲۱ محمد خواجہ
۳۲۲ گنگا دھر راؤ

۱۴۔ مرکز خانہ پور (اناث)

بدرجۂ امتیاز

۳۲۴ خیر النسا بیگم (مرکز میں اول)
۳۲۷ بسم اللہ بیگم
۳۲۶ عزیز النسا بیگم
۳۲۹ رشیدہ بیگم
۳۳۱ شہزادی بیگم
۳۳۳ حمیدہ بیگم

کامیاب

۳۱۸ محبوب بانو
۳۲۸ زیب النسا بیگم
۳۳۰ مریم بیگم
۳۳۲ کریم النسا بیگم

۳۳۳ [illegible] بیگم

۱۵۔ مرکز ترسی (ذکور)

کامیاب

۳۴۹ سید امین (مرکز میں اول)
۳۳۶ مصطفیٰ خاں
۳۳۷ محمد ابراہیم
۳۴۴ ایوب علی
۳۴۵ شیخ چاند
۳۴۶ محمد ابراہیم
۳۴۷ جبار علی خاں
۳۴۸ عابد خاں
۳۵۰ سید ولی اللہ حسینی
۳۵۱ عبد الکریم
۳۵۳ رحمت علی خاں

۱۶۔ مرکز ترسی (اناث)

بدرجۂ امتیاز

۳۴۰ رفیع النساء (مرکز میں اول)
۳۳۸ اقبال النساء

کامیاب

۳۳۹ کرم النساء
۳۴۲ اقبال النساء بیگم
۳۴۳ میمونہ خاتون

۱۷۔ مرکز پرلی (ذکور)

بدرجۂ امتیاز

۳۵۴ شیخ امیر (مرکز میں اول)
۳۶۱ خواجہ صدیق احمد

۳۷۰ ابوالخیر فاروقی

کامیاب

۳۵۵ محمد اسحاق
۳۵۶ سید رحیم الدین
۳۶۰ ملا محمد اسحاق
۳۶۴ سید عبد الباسط قادری
۳۶۸ اننت
۳۶۹ عبد الغنی
۳۷۱ سید اسد اللہ حسینی
۳۷۲ عبد الرب
۳۷۳ محمد ہاشم
۳۷۴ نصیر الدین
۳۷۵ ڈگمبر
۳۷۶ سلطان خاں
۳۷۷ باپو
۳۷۸ محمد قاسم
۳۷۹ کشن راؤ
۳۸۰ شیخ محبوب
۳۸۱ رؤف الحق
۳۸۳ تاج خاں

۱۸۔ مرکز پرلی (اناث)

بدرجۂ امتیاز

۳۶۶ فاطمہ امت العزیز (مرکز میں اول)
۳۵۸ قمر النساء بیگم
۳۸۴ اقبال النساء بیگم

کامیاب

۳۵۷ اقبال بیگم
۳۵۹ سرلا دیوی
۳۶۲ زیتون بی
۳۶۳ عزت فرزانہ بیگم
۳۶۵ اصغر سلطانہ
۳۶۷ عائشہ امت الحمید
۳۸۵ حقانی بیگم
۳۸۶ امت الہادی بیگم
۳۸۷ افسر النساء بیگم
۳۸۸ وحید النساء بیگم
۳۸۹ صابرہ بیگم

۱۹۔ مرکز پرینڈہ

بدرجۂ امتیاز

۳۹۳ محمد خلیل (مرکز میں اول)
۴۰۶ سید احمد علی

کامیاب

۱۴۷ محمد قاسم
۳۹۰ بشیر الدین
۳۹۱ بھگوان راؤ
۳۹۲ شبیر علی
۳۹۴ محمد مظفر حسین
۳۹۶ محمود
۳۹۷ عطاء الرحمن
۳۹۸ محمد یونس
۳۹۹ عبد الغنی

۴۰۰ شیخ محمد
۴۰۱ محمد حنیف
۴۰۲ محمد عبدالرحمٰن
۴۰۴ محمد امیرالدین
۴۰۸ نذیرالدین

۲۰۔ مرکز کیل (ذکور)

بدرجۂ امتیاز

۴۳۲ خواجہ معین الدین (مرکز میں اول)
۴۱۲ چندو حسین
۴۱۳ ترمبک راؤ
۴۱۹ سید معین الدین علوی
۴۲۰ محمد فخرالدین

کامیاب

۴۰۹ سید سلطان محی الدین
۴۱۰ محمد عبدالرشید شاہ نوری
۴۱۴ سید حسین علوی
۴۱۵ سید فیاض الدین
۴۱۶ سید شاہد علی
۴۱۷ محمد رفیع الدین
۴۱۸ سید حسین کوتوال
۴۲۱ گنگپا نائک
۴۲۲ محمد جعفر
۴۲۳ محمد عبدالغفور
۴۲۴ محمد عبدالسلام
۴۲۶ داسدیو
۴۲۷ محمد حنیف
۴۲۸ محمد بادشاہ
۴۲۹ ایم سیویا
۴۳۰ سید قربان حسین
۴۳۱ محمد مخدوم علی
۴۳۵ سیویا

۲۱۔ مرکز کیل (اناث)

کامیاب

۴۳۳ امت العزیز

تمغے | سنہ ۱۹۴۱ء کے کامیاب امیدواروں کے لئے مختلف عمدہ دست اصحاب کی طرف سے جو تمغے عطا کئے جا رہے ہیں ان کی تفصیل یہ ہے۔

اردو فاضل

نشان سلسلہ	معطی	قسم تمغہ	نام حاصل کنندہ	وجہ تمغہ
۱	آنریبل سر عقیل جنگ بہادر	طلائی	محمد حسین اظہر	اول بہ امتحان
۲	محمد فاروق صاحب دوم تعلقدار	نقرئی	سید مظفر علی رضوی	اول بہ مرکز پربھنی
۳	محمد احسان اللہ صاحب	نقرئی	اشرف الدین فیضی	اول بہ مرکز پرلی

اردو عالم

نشان سلسلہ	معطی	قسم تمغہ	نام حاصل کنندہ	وجہ تمغہ
۱	آنریبل عبدالعزیز صاحب	طلائی	معین الدین احمد انصاری	اول بہ امتحان
۲	بزم رندان پربھنی	نقرئی	سید داؤد	اول بہ مرکز پربھنی
۳	نواب محمد جلال الدین حسین خاں بہادر اول تعلقدار گلبرگہ	نقرئی	سید منظور احمد	اول بہ مرکز کلیانی
۴	شیخ حسین صاحب	نقرئی	سید عبدالخالق	اول بہ مرکز پرلی
۵	[illegible] صاحب گماشتہ [illegible]	نقرئی	سعد الدین خاں	اول بہ مرکز کشتگی
۶	[illegible]	نقرئی	عبدالرشید	[illegible]

خوش نویسی

۱	ادارۂ ادبیات اردو	نقرئی	محمد غیاث الدین	اول بہ امتحان
۲	سید سجاد حسین صاحب زراعتی تحصیلدار	نقرئی	سید تاج الدین	اول بہ مرکز کشتگی

اردو دانی

۱	احمد عبداللہ صاحب انسپکٹر آبکاری	نقرئی	منگیا	اول بہ مرکز کاماریڈی
۲	نرساگوڑ صاحب متاجر آبکاری	"	نفیس فاطمہ	اول بہ مرکز " (اناث)
۳	محمد حسین صاحب سب انسپکٹر آبکاری	"	رضیہ بیگم	اول بہ مرکز کشتگی (اناث)
۴	قاضی محمد حسین صاحب سب انسپکٹر آبکاری	"	شیخ اسمٰعیل	اول بہ مرکز " (ذکور)
۵	سبط نبی صاحب منصف کلیانی	"	زیب النساء بیگم	اول بہ مرکز کلیانی (اناث)
۶	احمد حسین صاحب تعلقدار "	"	نظام الدین	" " " (ذکور)
۷	عارف الدین حسن صاحب مہتمم آبکاری	"	احمدی بیگم	اول بہ مرکز پربھنی (اناث)
۸	عبدالجلیل صاحب مددگار زراعت	"	سید حسین	" " " (ذکور)
۹	سید فیاض الدین صاحب سررشتہ دار عدالت منصفی	"	محمد خلیل	" " پرینڈہ
۱۰	سید قدرت اللہ صاحب قادری صدر مدرس تحتانیہ جالول (نقرئی)		عبدالرشید	دوم " "

ان کے علاوہ امتحان اردو دانی میں امتیاز کے ساتھ کامیاب ہونے والے جملہ امیدواروں کو ادارہ کی طرف سے آسان اور دلچسپ کتابیں بطور انعام دی گئیں۔

تبدیلی کتب نصاب

اردو امتحانات کی مجلس نصاب کی تحریک اور مجلس انتظامی کی منظوری کے بعد اردو عالم، اردو فاضل اور خوشنویسی کی نصابی کتابوں میں حسب ذیل تبدیلی عمل میں آئی ہے۔ سنہ ۱۳۵۲ف م سنہ ۱۹۴۲ع کے امتحانوں کے لئے انہی تبدیل شدہ کتابوں کی تیاری لازمی ہے۔

امتحان	پرچہ	سابقہ کتاب	حالیہ کتاب
امتحان اردو عالم	پہلا	سی پارۂ دل یا	باغ و بہار مطبوعہ
"	"	چٹکیاں و گدگدیاں	اعظم اسٹیم پریس
"	"	قواعد اردو حصہ دوم	قواعد اردو حصہ سوم
"	دوسرا	تکمیل حروف یا عصر نو	بلاغت
امتحان اردو عالم	چوتھا	دنیا کی کہانی	اجتماعی زندگی کی ابتدا
"	پانچواں (خوشنویسی)	رسم الخط نذیر احمد	اردو رسم الخط سجاد مرزا صاحب
امتحان اردو فاضل	پہلا	مضامین چکبست	آب حیات
"	تیسرا	آب حیات	جدید اردو شاعری
"	چوتھا	اجتماعی زندگی کی ابتدا	دنیا کی کہانی
"	"	آئین حکومت	ا۔ سیاسیات کی پہلی کتاب
"	"	"	[illegible] داستان [illegible]
"	"	"	برطانوی حکومت

" " پانچویں پرچہ میں [illegible] کے لئے حسب ذیل دو مصنفین میں سے کسی ایک کا تفصیلی مطالعہ [illegible] اقبال، شبلی

امتحان خوشنویسی۔ ایک پرچہ کی جگہ دو پرچوں میں لیا جائے گا۔ جس کا نصاب حسب ذیل ہے۔

پہلا پرچہ۔ ۱۔ انشائے نور احمد ۲۔ رسم خط آموز اظہر الدین صاحب

دوسرا پرچہ۔ ۱۔ رسم خط از سجاد مرزا صاحب۔ ۲۔ رسم خط از نذیر احمد ۳۔ قواعد اردو حصہ سوم سررشتہ تعلیمات کا آخری حصہ متعلقہ اوقاف۔

ایک نئے امتحان کا آغاز یعنی امتحان اردو زباندانی

ادارہ ادبیات اردو کی مجلس انتظامی منعقدہ ۱۴ آذر ۱۳۵۱ف نے مجلس اردو امتحانات کی حسب ذیل تجویز منظور کر لی ہے جس کی بنا پر ۱۳۵۱ف م ۱۹۴۲ء کے امتحانات کے ساتھ اردو زبان دانی کا بھی امتحان لیا جائے گا جس کی تفصیل یہ ہے۔

گزشتہ دو سال کے عرصہ میں اردو امتحانات کے متعدد مرکزوں اور ادارہ کی شاخوں نیز بیسیوں امیدواروں کی استدعا اور درخواست کی بنا پر یہ مجلس ایک ایسے امتحان کے قیام کی سفارش کرتی ہے جو اردو دانی اور اردو عالم کے امتحانوں کے درمیان ان امیدواروں کی سہولت کے لیے لیا جائے گا جنھوں نے اردو دانی کا امتحان کامیاب کرنے کے بعد اپنی تعلیم جاری رکھی ہے اور جو چاہتے ہیں کہ علم کے اس ذوق میں اضافہ کریں جو امتحان اردو دانی کی تیاری اور لکھنے پڑھنے کی دنیا میں داخل ہونے کی وجہ سے پیدا ہوا ہے۔

(۱) اس امتحان کا نام امتحان اردو زبان دانی ہوگا۔

(۲) اس کا معیار سررشتہ تعلیمات (کمشنری امتحانات) کے امتحان زبان دانی کے مماثل ہوگا۔ اور حکومت سرکار عالی کے جو دوسرے سررشتے اردو زبان دانی کا امتحان لیتے ہیں ان کے امتحانات سے بھی اس کی مماثلت برقرار رکھنے کی کوشش کی جائے گی۔

(۳) اس امتحان میں حسب ذیل دو پرچے تین تین گھنٹے کے ہوں گے اور ان کے علاوہ سو نشانات زبانی امتحان کے لئے مختص رہیں گے۔

پہلا پرچہ۔ نثر و نظم و قواعد ---------------- ۱۰۰ نشانات

دوسرا پرچہ۔ پہلا حصہ (لازمی) مضمون نگاری و خلاصہ نویسی ---------------- ۵۰ "

اس حصہ میں مضمون نگاری کے لئے ۳۵ اور خلاصہ نویسی کے لئے ۱۵ نشانات مخصوص رہیں گے اور اس میں جملہ امیدواروں کا امتحان لیا جائے گا۔

دوسرا حصہ۔ (اختیاری) ---------------- ۵۰ نشانات

اس حصہ کے لئے حسب ذیل مضامین میں سے کسی ایک کی تیاری کرنی ہوگی۔

(۱) ترجمہ تلنگی یا مرہٹی یا کنڑی سے اردو میں۔

(۲) عام معلومات۔

(۳) ابتدائی اصول خانہ داری (برائے طبقۂ اناث)

(۴) امتحان اردو زبان دانی میں کامیابی کے لئے کل نشانات ۳۳ فیصد اور کسی پرچے میں ۲۵ فیصد سے کم نہ ہوں گے۔

(۵) اس امتحان کی فیس شرکت عام امیدواروں سے چار روپے اور ان امیدواروں سے چھ روپے لی جائے گی جو کسی مرکز کی طرف سے اس امتحان میں شریک کئے جائیں گے۔

(۹) اس امتحان کے ہر دو تحریری پرچوں کا نصاب حسب ذیل ہوگا۔

پہلا پرچہ۔ نظم و نثر و قواعد۔ ۱۔ اردو کی چھٹی کتاب مرتبہ انجمن ترقی اردو۔ ۲۔ قواعد اردو حصہ اول مرتبہ مولوی محمد اسمٰعیل صاحب

دوسرا پرچہ۔ عام معلومات کے لئے "شہری اور دیہی معلومات" از غلام رسول صاحب اور ابتدائی امور خانہ داری کے لیے "خانہ داری" مرتبہ ادارہ ادبیات اردو۔

امتحان کے مرکزوں کی رودادیں

مرکز خانہ پور ڈاکٹر عبدالغفار بیگ صاحب بی ڈی ایس کی رپورٹ کا اقتباس یہ ہے۔

میں بحیثیت صدر نگران کار مرکز خانہ پور بتاریخ ۱۹ اگست ۱۹۴۲ء شام کی لوکل ٹرین سے نظام آباد روانہ ہوا۔ اسٹیشن پر ڈاکٹر زور صاحب، پروفیسر سروری صاحب، مسٹر لطیف محمد، مسٹر غلام جیلانی اور مہتمم صاحب ادارۂ ادبیات اردو نے خدا حافظ کہا۔ رات کے گیارہ بجے ٹرین نظام آباد پہونچی اسٹیشن پر ناظر علی صاحب سے ملاقات ہوئی جو مرکز خانہ پور سے مجھ کو لینے آئے تھے۔ صبح چھ بجے کی بس سے براہ نرمل ناظر علی صاحب کے ساتھ روانہ ہوا ساڑھے دس بجے بس نرمل پہونچی۔ یہاں عبدالوہاب صاحب سے ملاقات ہوئی۔ جو مثل ناظر علی صاحب میرے لینے کے لئے مرکز خانہ پور سے آئے تھے۔ خانہ پور بس اسٹانڈ پر شریک معتمد صاحب، طلبا، مدرسین، سب انسپکٹر صاحب آبکاری وغیرہ موجود تھے مہتمم صاحب جنگلات کے مکان پر میرے قیام و طعام کا انتظام کیا گیا تھا۔ جہاں میرا تعارف حسب ذیل اصحاب سے کرایا گیا۔ مہتمم صاحب جنگلات، تحصیلدار صاحب، انسپکٹر آبکاری، منتظم صاحب پولیس، ڈاکٹر صاحب وغیرہ۔ ادارۂ ادبیات کی خصوصیات اور ساتھ ہی اردو انسائیکلوپیڈیا کے کام کا ذکر رہا۔

لوکل مدرسہ میں فرنیچر کی کمی کی وجہ سے امتحان مہتمم صاحب جنگلات کے مکان میں منعقد کیا گیا۔ امتحان خیر و خوبی سے ختم ہوا۔ زنانی امتحان تحصیلدار صاحب کے مکان میں لیا گیا جس کا انتظام مسز نورالدین اور مہر النسا بیگم صاحبہ نے کیا تھا۔ خانہ پور کی آبادی تقریباً ۳۰۰۰ کے لگ بھگ ہے۔ اس گاؤں کے اطراف گھنا جنگل ہے۔ جہاں ہر وقت خصوصاً رات کے وقت درندوں کا ڈر لگا رہتا ہے۔ اس مقام پر افلاس زیادہ ہے اس موضع کے لوگ زیادہ تر لکڑی کی تجارت کرتے ہیں۔ اور یہاں لکڑی کا کام بھی اچھا ہوتا ہے۔ امتحان ادارہ کے مطبوعہ اعلان کے بموجب مقررہ دنوں اور تاریخوں میں لیا گیا مہر زدہ لفافہ پرچہ جات دو گواہوں کو دکھانے کے بعد اور ان کے دستخط لینے کے بعد چاک کیا گیا۔ جسٹس لچھما ریڈی رکن عدالت العالیہ نے جو بغرض تفریح خانہ پور آئے ہوئے تھے امتحان گاہ اور اس کے انتظام کو دیکھ کر مسرت کا اظہار کیا۔ خاص خصوصیت اس مرکز کی یہ تھی کہ تمام امیدوار جو امتحان میں شریک تھے سفید شیروانیوں میں ملبوس تھے۔

نورالدین صاحب بی اے، ایل ایل بی (عثمانیہ) اس تعلقہ کے تحصیلدار ہیں اور جب کبھی آپ مستقر پر رہتے ہیں طلبا کو درس دیا کرتے ہیں۔ الحاج عبدالکریم صاحب مہتمم جنگلات دفتری معلومات کی تعلیم دیا کرتے تھے اور آیندہ بھی اپنا مشغلہ کو جاری رکھنے کا وعدہ کیا ہے۔ ڈاکٹر محمد خلیل صاحب جو مستقر کے ڈاکٹر ہیں طلبا کو سائنس کا درس دیا کرتے تھے اور آئندہ بھی اپنی فرصت میں اس مشغلہ کو جاری رکھنے کا وعدہ کیا ہے۔

شمس الدین صاحب منتظم پولیس خود امتحان اردو فاضل میں شریک تھے۔ اور انھوں نے طلبا کو دامے، درمے، سخنے۔ غرض ہر طرح کی مدد کی ہے۔ اور سچ کہا جائے تو یہی اس مرکز کے روح رواں ہیں۔

عبدالرشید صاحب شاخ کتنا پُب معتمد ہیں اور معتمد صاحب کی غیر حاضری میں معتمدی کے فرائض انجام دے رہے تھے۔

تحصیلدار صاحب کی بیگم صاحبہ لڑکیوں کو سینے اور پکانے کی بھی تعلیم دیتی ہیں۔ اور ساتھ ہی امتحان اردو دانی کے لئے تیار بھی کیا ہے۔

مہر النسا بیگم نے بھی جو زنانہ مدرسہ کی معلمہ ہیں لڑکیوں کو امتحان اردو دانی کے لئے تیار کرنے میں مدد کی تھی۔

مرکز کاماریڈی | مولوی سید کاظم حسین صاحب بی اے (مدراس) اپنی رپورٹ میں تحریر فرماتے ہیں کہ :- مرکز کاماریڈی سے اس سال امتحان اردو دانی میں مجموعی ۴۰ درخواست گزاروں کے ۳۶ نے شرکت کی جن میں طلبہ کی تعداد ۳۴ اور طالبات کی ۲ رہی۔ امتحان ۱۵ و ۱۶ ار پریل سنہ ۱۹۶۱ء کو مدرسہ وسطانیہ کاماریڈی میں منعقد ہوا۔ مولوی احمد عبداللہ صاحب انسپکٹر آبکاری نے قبل از قبل نشستوں کا معقول انتظام کیا تھا۔ مولوی عبدالرزاق صاحب نے جو دفتر انسپکٹر آبکاری کے اہلکار ہیں نگرانی میں کافی مدد دی۔

امیدواروں میں اکثر و بیشتر اطراف و اکناف کے قصبہ جات کے رہنے والے تھے۔ ہر امیدوار تھوڑی بہت اردو بولنے اور سمجھنے کی صلاحیت رکھتا تھا۔ مولوی احمد عبداللہ صاحب نے فرمایا کہ اگر انھیں کافی موقع ملتا تو ممکن تھا کہ وہ زیادہ سے زیادہ امیدواروں کو فراہم کرسکتے انھوں نے کاماریڈی میں ادارہ کی شاخ قایم کرنے کا خیال بھی ظاہر فرمایا۔ کاماریڈی میں گو انجمن اتحاد المسلمین کی ایک شاخ قایم ہے لیکن اس سے اردو امتحانات کو عوام میں مقبول بنانے میں کسی قسم کی توقع نہیں۔ البتہ اگر ادارہ کی شاخ قایم ہو جائے تو آئندہ ترقی کے امکانات زیادہ ہو جائیں گے۔

مدرسہ وسطانیہ کاماریڈی کے اساتذہ صاحبان ہمارا ہاتھ بٹا سکتے ہیں بشرطیکہ انھیں اس پر آمادہ کیا جائے اور یہ کام آسانی سے ہو سکتا ہے۔

یہ بات قابل ذکر ہے کہ اس سال امتحان اردو دانی میں ایک گریجویٹ یعنی طیلسانی بھی شریک تھے۔

مولوی واحد علی صاحب سب انسپکٹر آبکاری نے بھی اپنے حلقے سے چند امیدوار امتحان میں شریک کروائے۔

مرکز کشتگی | مولوی اکبر الدین صاحب صدیقی بی اے کی رپورٹ کا اقتباس ہے :- میں کشتگی بر وقت پہنچا اور پرچوں کی تقسیم بر وقت عمل میں آئی۔ امتحان کا مرکز مدرسہ کی عمارت مخصوص کی گئی تھی۔ اکثر کا امتحان تو بہت زیادہ نہ تھا لیکن وہاں کی امرض اور مقامات ہنگام کی وجہ سے امتحان کے وقت متعدد غیر حاضر تھے نگرانی کا معقول انتظام کیا گیا۔ اردو دانی کے امتحان کے دن مولوی محمد حسین صاحب صدر مدرس وہاں کے ایک مددگار نگرانی کے لئے موجود رہے اور بعد کے دو دنوں میں دوسرے دو مدرسین نے نگرانی کے فرائض انجام دئے۔ مقامات ہنگام نے تو اب یہاں تک نوبت پہنچادی ہے کہ سڑک کے علاوہ دور دراز کے کچے راستوں پر تنہا سفر خطرے سے خالی نہیں۔ کشتگی پہنچنے پر معلوم ہوا کہ ان کو تعلیم دینے کے فرائض بھی عہدہ داران مقامی نے اپنے تفویض کر لئے تھے اور رات میں دس بجے تک درس و تدریس کا شغل جاری رہتا تھا۔ لیکن ان میں بھی حاضر رہنے والے وہی لوگ ہوتے جن کا مستقر ہی کشتگی ہے اور جو متوسط طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ گزشتہ دونوں امتحانات کے موقعوں پر عہدہ داران مقامی نے نہ صرف شرکا امتحان ادارہ کو ممکنہ سہولتیں بہم پہنچائیں بلکہ دوران امتحان میں امتحان ہال میں تشریف لاکر اپنی علم دوستی کا ثبوت دیا اور نہ صرف علم دوستی کا بلکہ میرے المکلف الداعی بن کر مہمان نوازی کا بھی۔

میرے محترم میزبانوں کے خلوص کا یہ عالم تھا کہ مجھے اس وقت ان کا شکریہ ادا کرنے کے لئے ویسے پرخلوص الفاظ بھی نہ مل سکے۔

مرکز کپل | مولوی خیرالدین صاحب وکیل روداد کی روداد مرکز کا خلاصہ یہ ہے :- اسٹیشن کپل پر مولوی مرزا سرفراز علی صاحب بی اے ڈپٹی انسپکٹر تعلیمات ضلع کپل و دیگر اراکین ادارہ موجود تھے موصوف نے میرے قیام اور دیگر امتحانات سے متعلق جملہ امور میں میری پوری امداد فرمائی۔

امتحانات مدرسہ فوقانیہ کی عمارت میں لئے گئے۔ ٹھیک وقت مقررہ پر بموجودگی مولوی سید عبدالحی صاحب مہتمم کرتوالی و مولوی بہادر خاں صاحب وکیل و مولوی مرزا سرفراز علی صاحب امتحانات کے پرچے جو سربمہر تھے کھولے گئے اور طلبہ کو تقسیم کئے گئے اور ختم وقت پر جملہ کاپیاں امتحان گاہ میں سربمہر کی گئیں اور یہی عمل جملہ پرچہ جات کے لئے کیا گیا۔

مرکز اناث مدرسہ سے قریب ایک مدرس صاحب کے مکان میں تھا اس کی نگران کار ایک کلرک صاحب کی اہلیہ تھیں۔

ختم امتحان پر ۱۸ اپریل سنہ ۱۹۶۱ء کو ۴ بجے شام کو مدرسہ فوقانیہ

کپل میں امتحانات ادارہ کے فوائد کے عنوان پر ایک تقریر کے لئے جلسہ قرار ہوا گیا جس کی صدارت پنڈت وینکوب راؤ صاحب اول تعلقدار ضلع کپل نے فرمائی۔ ابتداءً میں نے اردو امتحانات پر ایک تقریر کی جو بہت پسند کی گئی۔ اس کے بعد مسٹر لکشمن اچاری وکیل اور ایک دوسرے وکیل صاحب اور مرزا سرفراز علی صاحب مہتمم تعلیمات کپل کی تقریریں ہوئیں صدارتی تقریر میں تعلقدار صاحب نے اردو کے امتحانات سے اپنی دلچسپی کا اظہار فرمایا۔ اور ادارہ و مقرر کا شکریہ ادا کیا۔ اس جلسہ میں تمام عہدہ داران کپل معززین علماء و طلبہ کا کافی مجمع تھا۔

مرکز کپل کے امتحانات میں ایک امر نہایت مسرت بخش قابل اظہار ہے کہ مدرسہ فوقانیہ سے عالیجناب نواب سالار جنگ بہادر کی خدمت میں تحریک کی گئی تھی کہ امتحانات ادارۂ ادبیات اردو مدرسہ کی عمارت میں لینے کی اجازت دی جائے۔ عالیجناب نواب صاحب نے اس کی اجازت بطیب خاطر عطا فرمائی جس سے ان کی اردو سے دلچسپی ظاہر ہے۔

ادارے کی شاخیں

ہمنا باد | ۲۰ آبان ۱۳۵۵ف کو ہمنا باد میں ایک جلسہ کیا گیا جس میں ادارے کی شاخ کے لئے حسب ذیل عہدہ داروں کا انتخاب عمل میں آیا۔

۱۔ سید اسمٰعیل صاحب وکیل ہائیکورٹ .... صدر
۲۔ مولوی سید شیر الزماں صاحب سوداگر .... معتمد
۳۔ مرزا اکبر محمد بیگ صاحب .... رکن انتظامی
۴۔ " احمد خان صاحب .... " "
۵۔ " سید امیر محمد صاحب سوداگر .... " "
۶۔ " محمد مستان علی صاحب سوداگر .... " "

کپل | حسب تحریک مولوی مرزا سرفراز علی صاحب بی اے تیچر ڈپلومہ ہولڈر (لندن) مہتمم تعلیمات ضلع کپل تاریخ ۱۱ر فرودی ۱۳۵۵ف اس شاخ کا آغاز ہوا۔

مولوی محمد حسین صاحب مدگار وظیفہ یاب نے معتمدی و مولوی حاجی عبدالرزاق صاحب پیش امام مسجد یوسفیہ نے نائب معتمدی و مولوی قاضی امین الدین صاحب نے منظمی کے فرائض کو انجام دیتے ہوئے اراکین ادارہ ہذا مولوی میر سعادت علی صاحب و مولوی سید امین الدین صاحب وکلاء و مولوی سید فیض علی صاحب و عبدالرشید صاحب مدرسین مدرسہ فوقانیہ کے تعاون سے کپل کو مرکز قرار دینے میں انتہائی جدوجہد سے کام لیا جو مدرسہ فوقانیہ عثمانیہ کپل کی عمارت میں حسب منظوری عالیجناب نواب سالار جنگ بہادر دام اقبالہٗ مرکز قرار پایا۔

مولوی خیر الدین صاحب نے صدر دفتر ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد کی جانب سے اس مرکز کی صدارت کی اور بطور امداد عالیجناب مہتمم صاحب تعلیمات و مولوی سید اختر علی صاحب بی اے و مولوی فیض علی صاحب مولوی کامل و مولوی محمد قمر الدین صاحب بی اے مسٹر نارائن راؤ صاحب بی ایس سی و ہنمنت راؤ صاحب گنگا وتی سرینواس راؤ صاحب مدرسین مدرسہ فوقانیہ اور زنانہ کے لئے مولوی سید فیض علی صاحب کی اہلیہ محترمہ نے نگرانی کی۔

بعد ختم امتحان بتاریخ ۱۰ر مہر ۱۳۵۵ف بوقت ۵ بجے شام منجانب ادارہ جلسہ منعقد ہوا جس میں جملہ معزز عہدہ داران مقامی و وکلا و دیگر شریک رہے حسب تحریک مہتمم صاحب تعلیمات و تائید مولوی قمر الدین صاحب عالیجناب وینکوب راؤ صاحب تعلقدار ضلع کپل نے کرسی صدارت کو شرف بخشا۔

صدر نگران کار مولوی خیر الدین صاحب نے موضوع "امتحان" کی تشریح فرماتے ہوئے ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد اور اس کے امتحانات کا تعارف کرایا۔ پھر مسٹر لکشما چاری صاحب وکیل نے تقریر کی۔ آخر میں انھوں نے اپنی مادری زبان کی تحصیل کی اہمیت اور ساتھ ہی ساتھ امتحان ادارہ کے تحصیل کی ترغیب دی پنڈت جنار دھن راؤ صاحب ایل ایل بی نے تشریح کی کہ پنڈت موصوف کے خیالات سے ہمیں فائدہ معلوم نہیں ہوتا ہے ہندوستان اور خاص کر

وکیلوں کو اردو کی تحصیل سے ضروریات زندگی کی تکمیل ہوسکتی ہے۔ اس کے
بعد مہتمم صاحب تعلیمات کپل کی تقریر نے تضیع اوقات کرنے والوں اور فاقلوں
کو تازیانہ کا کام کیا۔ یہ فرمایا کہ "بیکار نہ رہ کچھ تو کیا کر" کا مفہوم اس طرح
ادا ہوگا اور کچھ نہ کچھ تو کیا بہت کچھ حاصل ہو جائے گا اور ثابت کر دیا
کہ انسان حصول علم سے انسان کہلانے کا مستحق ہے لہذا موقع کو غنیمت
جان کر ان امتحانات میں شریک ہونے اور انسان بننے کی طرف تشویق
دلائی جس سے علم سے گریز کرنے والوں میں بھی شوق پیدا ہوگیا۔
عالیجناب پنڈت وینکوب راؤ صاحب تعلقدار صدر نشین جلسہ نے
قیام شاخ ادارہ سے خوشنودی ظاہر فرماتے ہوئے شرکاء کو مبارکباد
دی اور حوصلہ افزا الفاظ سے جلسہ کو کامیاب بنایا۔

۲۰ مہر ۱۳۴۹ف کو ایک جلسہ منعقد ہوا جس میں باتفاق آرا شاخ
ہذا کے حسب ذیل عہدہ دار منتخب ہوئے۔

صدر۔ مولوی سید فیض علی صاحب مولوی کامل
معتمد۔ " محمد حسین صاحب مدرس وظیفہ یاب
نائب معتمد۔ حاجی عبدالرزاق صاحب پیش امام
منتظم۔ محمد امین الدین صاحب قاضی و مدرس

اراکین :-

۱۔ مولوی محی الدین شریف صاحب قاری
۲۔ " اختر علی صاحب بی اے
۳۔ مسٹر نادائن راؤ صاحب بی ایس سی
۴۔ مولوی میر سعادت علی صاحب وکیل
۵۔ محمد عبداللہ خان صاحب رئیس کپل
۶۔ " فضل الرحمٰن صاحب حکیم یونانی
۷۔ " حسین شریف صاحب وکیل
۸۔ " محمد ... صاحب صدر تحصیل کپل
۹۔ " محمد ... قادری صاحب ...
۱۰۔ محمد عبدالرشید صاحب مدرس
۱۱۔ مسٹر بشنو پنت صاحب ناظر تعلیمات ضلع کپل
۱۲۔ مولوی عبدالسبحان صاحب مدرس
۱۳۔ " محمد سرور صاحب مدرس
۱۴۔ " شرف الدین صاحب "
۱۵۔ " محمد عبدالملک صاحب تاجر اسٹیشنری مارٹ
۱۶۔ " عبدالحق صاحب صدر مدرس یلبرگہ
۱۷۔ " سید محبوب حسین صاحب صدر مدرس ہٹن ہال

پرلی شاخ ادارۂ ادبیات اردو پرلی کا ایک غیر معمولی جلسہ بصدارت
حکیم مولوی فخر الدین صاحب منشی فاضل (پنجاب) بتاریخ ۲۳ مہر ۱۳۴۹ف
روز جمعہ منعقد ہوا جس میں پرلی کے اصحاب ذوق اور علم دوست حضرات
کے علاوہ محمد یٰسین صاحب جلالی اور سید داؤد صاحب ہاشمی اراکین ادارۂ
ادبیات اردو پربھنی نے بھی شرکت فرمائی۔

معتمد شاخ پرلی نے تفصیلی رپورٹ سنائی جس کا اقتباس یہ ہے:
یکم تیر ۱۳۴۹ف کو ایک جلسہ منعقد ہوا اور باتفاق آرا طے کیا گیا کہ پرلی میں
ایک شاخ قائم کی جائے جس کے صدر حکیم مولوی فخر الدین صاحب منشی فاضل
(پنجاب) معتمد غلام حسن صدیقی خطیب اور اراکین مولوی سید عبدالرزاق صاحب
جعفری، مولوی افلاطون خاں صاحب امین، مولوی اشرف الدین صاحب
فیضی، ابوالخیر فاروقی اور محمد مرطاہر حسین صاحب مقرر کئے گئے۔

حضرات! حقیقت یہ ہے کہ ادارۂ ادبیات اردو کی قدر و قیمت
اور اس کی حقیقی اہمیت نے ہمیں بھی واقعیت پسند اور حقائق آشنا بنا دیا
ہے۔ ہمارا یہ مقصد نہیں تھا کہ صرف برائے نام پرلی میں شاخ قائم کر دی
جائے اور کام کی جگہ خالی رہے۔ جب شاخ کا قیام ہو چکا تو ہم لوگ بے
تحاشا کام کی طرف دوڑ پڑے، چنانچہ حالیہ امتحان میں یہاں سے اردو دانی
میں (۳۶) امیدوار شریک ہوئے، جن میں مرد، عورت، بچے، بوڑھے
اور ہندو مسلم سب ہی شریک ہیں۔ اسی امتحان کے ایک امیدوار کا ذکر

پر شاید بے ہوتے تصور نہ فرمایا جائے گا۔ یہ صاحب ایک متمول اور سربرآوردہ خاندان کے سرپرست اعلیٰ ہیں ان کی عمر اندازاً و تخمیناً نہیں بلکہ حقیقت میں (۵۰) سال ہے ہماری کوششوں کا داؤ ان پر بھی چل گیا۔ چنانچہ وہ اس امتحان میں شریک ہیں اور اپنی مثال سے دوسرے ان پڑھ نوجوانوں کو درس شوق دے رہے ہیں۔

حضرات! یہ امتحان "اردو دانی" کا ذکر تھا۔ "اردو عالم" میں سرآغاز کار گیارہ امیدوار تعلیم پاتے ہے ان سب کی تعلیم اور باقاعدہ تدریس کا مفت بندوبست کیا گیا تھا۔ اسی طرح "اردو فاضل" میں چار امیدوار تعلیم پاتے ہے ان کی تعلیم کا بھی مفت انتظام کیا گیا تھا مگر بعض موانع کی وجہ سے دو شریک امتحان ہوئے۔

محترم حضرات! آخر میں، میں ایک مکتوب کا مختصر اقتباس آپ حضرات کو سنانا چاہتا ہوں۔ خط لکھنے والی ایک تعلیم یافتہ اور روشن خیال خاتون سیدہ عزیز النساء بیگم ہیں اور مدرسہ نسوان اردو میڈیم بیڑ کی صدر معلمہ ہیں۔ اس اقتباس سے آپ حضرات اس امر کا اندازہ فرما سکتے ہیں کہ اس قلیل مدت میں اس شاخ نے کس قدر شہرت اور اس کے کام نے کس قدر مقبولیت حاصل کر لی ہے۔ اقتباس درج ذیل ہے۔

"قابل فخر ہیں ڈاکٹر زور اور وہ ہستیاں جنھیں طبقہ اناث کی تعلیم و ان میں بیداری پیدا کرنے کا خیال آیا۔ مجھے یہ سن کر دلی مسرت ہوئی کہ ضلع بیڑ میں اس کام کی پہل مولوی غلام حسن صاحب صدیقی اور آپ (مولوی اشرف الدین صاحب فیضی) نے کی، پہلی امتحان گاہ سے ملے آنے والی امیدوارہ کو میں انعام دوں گی۔"

حضرات! اس سال یہاں جو امتحانات ہوئے ان کی صدر نگرانی کے فرائض جناب پروفیسر مہدی علی صاحب نے انجام دیئے۔ صاحب موصوف نے یہاں تک تکلیف گوارا فرما کر اور ہمارے ناچیز کام کا عینی مشاہدہ فرما کر صرف یہی نہیں کہ ہم کو ممنون کرم فرمایا ہے بلکہ ہماری ہمتوں میں ایک نئی تازگی اور ہماری طبیعت میں اک تیزی کی روح پھونک دی ہے۔ ہمیں محترم پروفیسر صاحب سے توقع ہے کہ ہماری شاخ کے مخصوص حالات اور ہماری پرخلوص خدمات ادب، ارباب ادارۂ ادبیات اردو پر ظاہر فرمائے جائیں گے۔ اس موقع پر اگر میں ایک باہمت شخص کی پیہم کوششوں اور سنت نئی جد وجہد کا ذکر نہ کروں تو میری احسان فراموشی ہوگی حقیقت یہ ہے کہ یہ سب کیا دھرا مولوی اشرف الدین صاحب فیضی کا ہے، ان کی کوشش اور قدم قدم پر رہنمائی اگر شامل حال نہ ہوتی تو کچھ بھی نہ ہوتا۔

حسب احکام صدر ادارہ نشان ۱۵۸۴ مورخہ ۱۰ مہر ۱۳۵۰ف حسب ذیل کابینہ کا انتخاب عمل میں آیا۔

صدر، حکیم مولوی فخر الدین صاحب منشی فاضل (پنجاب) معتمد، غلام حسن صدیقی۔ خازن، مولوی محمد نواز الدین صاحب کتب خانہ دار، مولوی سید عبد الرزاق صاحب جعفری اراکین:- مسٹر وینائک راؤ جوہر کے (عثمانیہ) مولوی افلاطون خاں صاحب امین مولوی شیخ حسین صاحب، محترمہ طاہرہ بیگم صاحبہ، محترمہ نیاز النساء بیگم صاحبہ، مولوی اشرف الدین صاحب فیضی فتح آبادی۔

اس کے بعد جناب صدر نے ایک معلومات آفریں صدارتی تقریر فرمائی آخر میں مولوی اشرف الدین صاحب فیضی نے معزز مہمانوں اور حاضرین کا شکریہ ادا کیا اور اعلیٰحضرت سلطان العلوم، خانوادۂ آصفی اور بانی ادارہ محترم ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور کی صحت و سلامتی کی دعا پر جلسہ ختم ہونے کا اعلان فرمایا۔

عطیۂ مخطوطات | عالیجناب نواب عنایت جنگ بہادر نے ازراہ قدردانی ادارہ ادبیات اردو کے کتب خانہ مخطوطات کے لئے قدیم دکنی اردو کی قلمی اور نادر حسب ذیل اکیس مجلد کتابیں عطا فرمائی ہیں۔

تحفۃ الاحباب، راجی۔ سیف الملوک، غواصی۔ پنچھی باچا، جعفری۔ محبوب القلوب، دین دیپک، الفت۔ روضۃ الشہدا، ولی۔ حملۂ حیدری۔ صفا۔ چندر بدن مہیار، مقیمی۔ چندر بدن مہیار، محمد باقر۔ دیوان شیر محمد خاں ایمان۔ ترجمہ شرح ملتقی۔ دیوان میر (فارسی و اردو) کلیات سودا۔ چہار درویش، دیوان داؤد۔ قصہ ارگل۔ ہمیشہ بہار، نواب میر حسین علیخاں۔ رقعات بہار عالم، مرغوب نواب میر حسین علیخاں۔ چہار درویش نواب میر حسین علیخاں۔ مذہب عشق۔ مثنوی بدر منیر۔

ادارہ کی طرف سے نواب صاحب موصوف کی خدمت میں ہدیۂ تشکر پیش کیا جاتا ہے۔

ادارہ ادبیات اردو حیدرآباد دکن کا ماہنامہ

نشان ٹپہ آصفیہ ۱۵۳
نشان ٹپہ برطانیہ M 3950
ٹیلیفون نمبر ۲۲۰۹
چندہ سالانہ چار روپے آٹھ آنے
بچوں کا سب رس الگ ملتا ہے

سب رس

جلد ۴ بابت دسمبر ۱۹۴۱ء شمارہ ۱۲

فہرست مضامین

۱۔ قطعہ تاریخ جلسہ فانی — سردار سلطان نواب فصاحت جنگ بہادر جلیل — ۲
۲۔ پھول (نظم) — الطاف مشہدی — ۲
۳۔ ہمدردان اردو سے ایک گزارش — سید محمود موسیٰ بی اے — ۳
۴۔ ریچہ (رباعی) — خلیم الشعرا سید احمد حسین امجد — ۸
۵۔ پانچ کہانیاں (مسلسل مصالے) — صابر کوسگوی — ۹
۶۔ بلیاں — نجم الدین انصاری بی آیچ سی ایس — ۱۰
۷۔ آمد (نظم) — راجہ مہدی علی خاں — ۲۱
۸۔ غزل — رشید احمد (عثمانیہ) — ۲۱
۹۔ ہندوستان کے فقیر اور سادھو — محمود صدلقی (اردو عالم) — ۲۲
۱۰۔ روح فانی کی خدمت میں ہدیۂ عقیدت — سعیدہ منظر (کلیانات) — ۲۶
۱۱۔ غم فانی (رباعی) — سردار علی الہام — ۳۱
۱۲۔ افسانہ در افسانہ (نظم) — سلام مچھلی شہری — ۳۲
۱۳۔ تحفہ (افسانہ) — سید علی شاکر ایم اے — ۳۳
۱۴۔ بات شکستہ — جہاں بانو بیگم ایم اے — ۳۸
۱۵۔ غزلیں — مسعود الحسن تابش دہلوی — ۳۹
سلیمان اریب — ۳۹
۱۶۔ خان آرزو کا رسالہ سراج منیر — اقبال انصاری ایم آئی سیرچ اسکالر (مکتوب) — ۴۴
۱۷۔ محسوسات ماہر (غزل) — ماہر القادری — ۴۷
۱۸۔ محتسب اور میں (نظم) — احمد ندیم قاسمی — ۴۸
۱۹۔ پیمان وفا (افسانہ) — مسٹر سید حسین زیدی — ۴۹
۲۰۔ تنقید و تبصرہ — ج، ن، س — ۵۳
۲۱۔ نئی کتابیں — نواب مرزا سیف علی بیگ — ۵۶
۲۲۔ ادارہ کی خبریں — ادارہ — ۵۷

خواجہ حمید الدین شاہد کے اہتمام سے اعظم اسٹیم پریس میں چھپکر دفتر ادارہ رفعت منزل خیریت آباد سے شایع ہوا۔

ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد دکن کا ماہنامہ

نشان ٹپہ آصفیہ ۱۵۳
نشان ٹپہ برطانیہ M 3950
ٹیلیفون نمبر ۲۲۰۹
چندہ سالانہ چار روپے آٹھ آنے
بچوں کا سب رس ایک روپیہ آٹھ آنے

سب رس

جلد ۴ بابت ڈسمبر ۱۹۴۱ء شمارہ ۱۲

فہرست مضامین

۱۔ قطعہ تاریخ رحلت فانی — استاد السلطان نواب فصاحت جنگ بہادر جلیل — ۲
۲۔ بھوک (نظم) — الطاف مشہدی — ۲
۳۔ ہمدردان اردو سے ایک گزارش — سید محمود موج بی اے — ۳
۴۔ روپیہ (رباعی) — حکیم الشعراء سید احمد حسین امجد — ۸
۵۔ پانچ کہانیاں (مسلسل افسانے) — صابر کوسگوی — ۹
۶۔ بلبلیاں — نجم الدین انصاری بی آرچ سی ایس — ۱۸
۷۔ آمد (نظم) — راجہ مہدی علی خاں — ۲۱
۸۔ غزل — رشید احمد (عثمانیہ) — ۲۱
۹۔ ہندوستان کے فقیر اور سادھو — محمودہ صدیقی (اردو عالم) — ۲۲
۱۰۔ روح فانی کی خدمت میں ہدیۂ عقیدت — سعیدہ مظہر (کلیہ اناث) — ۲۶
۱۱۔ غم فانی (رباعی) — سردار علی الہام — ۳۱
۱۲۔ افسانہ در افسانہ (نظم) — سلام مچھلی شہری — ۳۲
۱۳۔ تحفہ (افسانہ) — سید علی شاکر ایم اے — ۳۳
۱۴۔ رباب شکستہ — جہاں بانو بیگم ایم اے — ۳۸
۱۵۔ غزلیں — مسعود الحسن تابش دہلوی — ۳۹
سلیمان اریب — ۳۹
۱۶۔ خان آرزو کا رسالہ سراج منیر — اقبال انصاری ایم اے ریسرچ اسکالر (دکن) — ۴۴
۱۷۔ محسوسات ماہر (غزل) — ماہر القادری — ۴۷
۱۸۔ محتسب اور میں (نظم) — احمد ندیم قاسمی — ۴۸
۱۹۔ پیمان وفا (افسانہ) — مسز سید حسین زیدی — ۴۹
۲۰۔ تنقید و تبصرہ — ج، ق، س — ۵۳
۲۱۔ نئی کتابیں — نواب مرزا سیف علیخاں — ۵۶
۲۲۔ ادارہ کی خبریں — ادارہ — ۵۷

خواجہ حمید الدین شاہد کے اہتمام سے اعظم اسٹیم پریس میں چھپکر دفتر ادارہ رفعت منزل خیریت آباد سے شائع ہوا۔

قطعۂ تاریخ رحلت مولوی شوکت علیخاں فانی

شاعرِ نامی و صورت گرِ فطرت فانی — وصل باقی کے لئے کر گئے رحلت فانی

لوحِ تربت پر لکھو مصرعِ تاریخ جلیل — دہرِ فانی سے سدھارے سوئے جنت فانی

۱۳۶۰ھ

فصاحت جنگ بہادر جلیل

بھوک

روزہا ہے میرے ہمسائے کا بچہ کیا کروں

جی میں آتا ہے طبیعت کی روانی بیچ دوں
ایک دوشیزہ کی الفت کی کہانی بیچ دوں
جو کبھی نرم و حسیں باہوں میں گھبراتی رہی
ایک روٹی کے عوض وہ نوجوانی بیچ دوں
جو دھڑکتی چھاتیوں میں آرزو بن کر بسی
چند ٹکڑوں کے لئے وہ زندگانی بیچ دوں
جو کسی کی مدھ بھری آنکھوں میں محوِ رقص ہے
دل یہ کہتا ہے وہ انگوروں کی رانی[1] بیچ دوں
جو جوانی کے اجڑ جانے پہ بھی محفوظ ہے
آج کوئی لے تو وہ اشکوں کا پانی بیچ دوں
جو جوانی نے عطا کی ان کی چشمِ مست کو
میرے بس میں ہو تو وہ جادو بیانی بیچ دوں
یہ زمیں یہ آسماں یہ رفعتیں یہ عظمتیں
ایک بچے کے لئے دنیائے فانی بیچ دوں
روزہا ہے میرے ہمسائے کا بچہ کیا کروں

الطاف مشہدی

[1] شراب

نواب علی یاور جنگ بہادر بی۔اے (آکسن)
معتمد محکمۂ امور دستوری و سابق پروفیسر تاریخ جامعہ عثمانیہ
صدر شعبہ تاریخ دکن انڈین ہسٹری کانگریس

(اجلاس پنجم منعقدہ حیدرآباد)
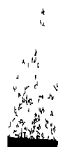
ہمدردانِ اردو سے ایک گزارش

رکھیو غالبؔ مجھے اس تلخ نوائی میں معاف
آج کچھ درد مرے دل میں سوا ہوتا ہے

اس وقت ملک کے طول و عرض میں مسلمانوں نے پاکستان کا نعرہ بلند کر رکھا ہے ان کا مطالبہ ہے کہ جن صوبوں میں ان کی اکثریت ہے وہاں انھیں اپنی حکومت قایم کرنے کی اجازت دی جائے مجھے اس وقت مسلمانوں کے اس مطالبہ کے حسن و قبح سے بحث نہیں یہ ایک قطعاً جداگانہ موضوعِ بحث ہے۔ اگر ایڈیٹر صاحب ماہنامہ "سب رس" نے اجازت دی تو اس پر پھر کبھی اپنی رائے پیش کروں گا۔ اس وقت البتہ اس قدر ضرور عرض کروں گا کہ ہندوستانی مسلمانوں کی روحِ عمل سے بیگانہ سیاست کو دیکھتے ہوئے اس تمنا کے برآنے کی بظاہر کوئی توقع نہیں ہے۔ میں نہایت افسوس اور رنج کے ساتھ دیکھ رہا ہوں کہ جس چیز پر مسلمانوں کے مستقبل کا انحصار ہے مسلمان اسی کی طرف سے غافل اور لاپروا ہیں۔ اگر آپ نے کبھی ہندوستانی سیاسیات پر غور کیا ہے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان جھگڑے کی نوعیت مذہبی نہیں بلکہ لسانی ہے۔

زبان اور ادب کی اہمیت و ضرورت پر میں اس سے قبل ہی اپنی رائے پیش کر چکا ہوں۔ ہندوؤں نے اس معاملہ کو پوری طرح سمجھ لیا ہے اس لئے وہ اب اپنی تمام کوششیں ہندی ہی نہیں بلکہ سنسکرت زدہ ہندی کو آگے بڑھانے پر صرف کر رہے ہیں۔ اور میری ذاتی رائے یہی ہے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان منافرت و کدورت کا پہلا بنیادی پتھر ٹھیک اس وقت رکھا گیا جب ہندوؤں نے زبان اور ادب کی ضرورت اور اہمیت کو محسوس کر کے اردو کو مسلمانوں کا رسم خط کہنا شروع کیا۔ اور اس کی جگہ پر سرکاری اور غیر سرکاری تحریروں میں دیوناگری رسم خط کو نافذ کرنے پر اصرار کیا اس کے بعد نہایت منظم طور سے ان تمام اثرات کو ایک ایک کر کے مٹا دینے کی مسلسل کوشش شروع کر دی جو مسلمانوں کے ساتھ رہنے سہنے سے ہندوستانی زبان پر پڑ چکے تھے۔ یعنی عربی اور فارسی کے عام فہم، رائج اور مشہور الفاظ کو خارج کر کے ایک جدید زبان کی تشکیل کا خیال پیدا ہوا۔ اور اس زبان کا نام ہندی قرار پایا۔ ابتدا میں اس ہندی اور اردو میں صرف رسم خط کا فرق تھا مگر رفتہ رفتہ اس نے اپنا چولا بدلنا شروع کیا۔ پنڈت مدن موہن مالویہ۔ بابو راجندر پرشاد جیسے لوگوں نے بھی جو اچھی خاصی اردو لکھتے اور بولتے تھے ہر عربی اور فارسی لفظ کے لئے سنسکرت کا لفظ ڈھونڈنا شروع کیا۔ اس جدید زبان میں کتابیں لکھی گئیں رسالے جاری کئے گئے۔ ہندو یونیورسٹی بنارس اور گجرات وغیرہ کے ودیا پاٹھوں میں اس زبان کی تعلیم شروع ہوئی۔

جس تیز رفتار کے ساتھ اردو اور ہندی دو قطعاً جداگانہ زبانیں بنتی رہیں اسی رفتار کے ساتھ ہندو اور مسلمانوں کے درمیان غیریت اور جدائی کی ایک بہت وسیع خلیج حائل ہو گئی۔ زبان کے اس سوال نے دونوں قوموں کو ایک دوسرے سے کاٹ کر الگ کر دیا جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ آج دونوں قومیں ایک دوسرے کے جذبات اور احساسات سے ناآشنا ہو گئی ہیں۔ زبان کے سوال نے ہندوؤں اور مسلمانوں کو کائی کی طرح پھاڑ دیا ہے۔ ہندی اور اردو کا امتیاز دراصل زبان کا امتیاز نہیں بلکہ دلوں کا امتیاز تھا۔ جوں جوں زبانیں دو ہوتی گئیں دلوں میں بھی فرق آتا گیا۔ زبان کے اس جھگڑے کو چند لفظوں کا جھگڑا قرار دینا غلطی ہے۔ یہ دراصل ہندوؤں اور مسلمانوں کے باہمی احساسات کا بیرونی مظہر ہے۔ یا یوں کہئے کہ ہندی زبان نام ہے زندگی کے ہر شعبہ میں مسلمانوں سے کٹ کر الگ ہو جانے کی عملی کوشش کا۔

الغرض ہندوؤں نے اپنے عمل سے اس بات کا بالکل صاف اعلان کر دیا ہے کہ وہ اپنی دنیا مسلمانوں سے بالکل الگ ہو کر بسانا چاہتے ہیں۔" اور ہندوستان میں صرف اسی کو زندہ رہنے کا مستحق سمجھتے ہیں جو گاتری کا جاپ کر سکتا ہے اور گائے کی پوجا ——— ہندو اب کھلے طور پر اردو کو مسلمانوں کی زبان اور ہندی کو اپنی زبان کہتے ہیں۔ موجودہ ہندی نصف صدی کی انتھک محنت کے بعد تیار کی گئی ہے۔ اس لئے وہ اسے چھوڑنے کو کیسے رضامند ہو سکتے ہیں۔ لہٰذا اب ہندوؤں سے اس بات کا شکوہ ہی بالکل فضول ہے کہ وہ اردو کے مقابلہ میں ہندی کو کیوں بڑھا رہے ہیں وہ اس بات کو تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں کہ اردو ہندوستان کی قومی زبان ہے اور ہندوؤں اور مسلمانوں کے ملاپ کی نشانی اب یہ توقع بھی عبث اور بے کار ہے کہ آئندہ کبھی ہندوؤں میں سرشار اور سر تیج بہادر سپرو جیسے لوگ پیدا ہوں گے۔ اب وہ آپ کے ساتھ مکتبوں میں بیٹھ کر گلستاں اور بوستاں پڑھنے کے لئے تیار نہیں اور نہ آپ کسی طرح انھیں اس بات پر مجبور کر سکتے ہیں اندریں حالات یہ سوال اٹھانا کہ اردو کو ہندو کیوں مٹا رہے ہیں؟ ایک بے کار بات ہے اب یہ دیکھنا چاہیے کہ اردو اگر مسلمانوں کی زبان ہے اور مسلمان اسے زندہ رکھنا چاہتے ہیں تو وہ اس کے لئے کیا کر رہے ہیں؟ اور اردو کے احیاء و بقا اور نیز اس کی نشر و اشاعت کے لئے مسلمانوں کو کیا طرز عمل اختیار کرنا چاہیے؟

اس میں شک نہیں کہ جہاں تک شور و غل مچانے اور زبانی ہمدردی کرنے کا تعلق ہے ہمدردانِ اردو کسی سے پیچھے نہیں ہیں۔ مجھے اعتراف ہے کہ ہر صوبہ، ہر شہر اور ہر قصبہ کے مسلمانوں نے "ہندوؤں کی اردو سے دشمنی" کے خلاف اس قدر شور و غل مچایا ہے کہ زمین و آسمان کو سر پر اٹھا لیا ہے۔ مگر ہندوؤں نے اپنے کان بند کر لئے ہیں۔ وہ آپ کے اعتراضات اور احتجاجات کو کوئی اہمیت نہیں دیتے ہیں۔ لہٰذا اب ان باتوں سے مسلمانوں یا ان کی زبان کو مطلق کوئی فائدہ نہ ہوگا۔ علاوہ ازیں مسلمانوں کو یہ بات نہ بھولنی چاہیے کہ موجودہ صدی زبانی ہمدردی کی نہیں بلکہ عملی جدوجہد کی ہے۔ اس زمانہ میں صرف اسی کو زندہ رہنے کا حق ہے جو عملاً اپنے آپ کو اس کا اہل ثابت کر دے۔

یہ تو آپ کو معلوم ہی ہے کہ اردو اور ہندی کا جھگڑا کوئی جدید سوال نہیں ہے۔ بلکہ تقریباً نصف صدی سے ہندو نہایت خاموشی لیکن پورے جوش انہماک اور استقلال کے ساتھ ہندی کو بڑھانے کی طرف اپنی پوری توجہ مرکوز کئے ہوئے ہیں۔ پنجاب۔ یو۔پی اور بہار کو اردو کا وطن ہونے کا فخر حاصل ہے۔ دبستان دہلی اور دبستان لکھنؤ میں ہی اردو پروان چڑھی ہے لیکن جب ہم ان صوبوں کی سالانہ رپوٹوں کا مطالعہ کرتے ہیں تو واضح ہوتا ہے کہ ہر سال ہندی کی مطبوعات میں اضافہ ہوا ہے اور ہو رہا ہے۔ اور برخلاف اس کے اردو کی مطبوعات کی تعداد میں ہر سال نمایاں کمی ہو رہی ہے۔ یہاں تک کہ سنہ ۱۹۴۰ء میں صوبجات متحدہ آگرہ و اودھ میں اردو مطبوعات کی تعداد انگریزی مطبوعات کی تعداد سے بھی کم تھی۔ اور ان میں سے بھی زیادہ کتابیں مذہبی اختلافات اور سنی و شیعہ نزاع کے متعلق تھیں۔ کیا یہ حقیقت اور انکشاف ہی خواہاں و ہمدردانِ اردو کے لئے باعث شرم و ندامت نہیں؟ میں آپ سے دریافت کرتا ہوں کہ اردو مطبوعات کی تعداد میں کمی کی وجہ کیا ہے؟ یا یہ بھی برادرانِ وطن کی اردو دشمنی کا نتیجہ ہے؟ فرمائیے آپ کے پاس ان کا کیا جواب ہے غالباً یہی کہ یہ ہولناک انجام ہے مسلمانوں کی غفلت اور بے عملی کا۔ ورنہ کس نے ان کا قلم پکڑا ہے اور کس نے ان کو کتابیں تصنیف کرنے اور شایع کرنے سے منع کیا ہے۔

مسلمان کہتے ہیں کہ اردو ہندوستان کی قومی زبان ہے۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کے اتحاد کا نتیجہ اور ان دونوں کی مشترکہ کوششوں کا پھل ہے۔ اس لئے ہندی کی بجائے اردو کو ملک کی قومی زبان ہونا چاہیے۔ اردو کی ہندی پر برتری کے ثبوت میں مسلمان اردو رسائل وجرائد کی تعداد پیش کیا کرتے ہیں، مجھے اس سے انکار نہیں کہ ہندی کی اس قدر ترقی کے باوجود آج بھی ہندی رسائل وجرائد کے مقابلہ میں اردو رسائل وجرائد کی تعداد بہت زیادہ ہے، لیکن کیا کبھی آپ نے اس تلخ اور ناگوار حقیقت پر بھی غور کیا ہے کہ جو تعداد آپ پیش کر رہے ہیں اس میں سے نصف تعداد ان رسائل وجرائد کی ہے جن کا وجود اور عدم برابر ہے۔ اور بقیہ نصف کی حالت یہ ہے کہ ان کی زندگی کا کوئی اعتبار نہیں۔ بہی خواہاں اور ہمدردان اردو کی بے عملی اور غفلت کی وجہ سے ان کی مالی حالت حد درجہ کمزور اور پست ہے وہ گداگری اور ضمیر فروشی کرکے یا زیادہ سے زیادہ بلیک میلنگ کے ذریعہ زندہ ہیں۔ اب آپ ایک نظر ہندی رسائل وجرائد پر بھی ڈالیں۔ میں نے مانا کہ ان کی تعداد کم ہے لیکن یہ ایک ناقابلِ تردید حقیقت کہ ہندو ہندی کو اپنی قومی زبان سمجھتے ہیں وہ ہندی کی ترقی کے ساتھ اپنے مستقبل کو وابستہ کئے ہوئے ہیں۔ اور ہندی کی سرپرستی کرنا اپنے لئے باعث فخر خیال کرتے ہیں۔ اسی وجہ سے ہندی رسائل وجرائد کی مالی حالت اس قدر مستحکم اور اطمینان بخش ہے کہ وہ اپنی پوری توجہ اور انہماک کے ساتھ اپنی قوم اور اپنی زبان کی خدمت کر رہے ہیں۔ اب یہاں یہ سوال اٹھتا ہے کہ اردو رسائل وجرائد کی حالت اس قدر پست وزبوں کیوں ہے؟ کیا یہ بھی برادرانِ وطن کی اردو سے دشمنی کا انجام ہے؟ کیا کوئی ایسا قانون موجود ہے جس نے آپ کو اردو رسائل وجرائد خریدنے ان کا مطالعہ کرنے اور ان کی سرپرستی کرنے سے روکا ہے؟ اس سلسلہ میں ایک بات اور قابلِ غور ہے کہ اردو کے وہ رسالے اور اخبار جن کے مالکان اور اڈیٹر ہندو ہیں مسلمانوں کے رسائل وجرائد کے مقابلہ میں ہزار درجہ بہتر حالت میں ہیں۔ روزنامہ "انقلاب" لاہور، روزنامہ احسان" لاہور کے مقابلہ میں روزنامہ "ملاپ" اور روزنامہ "پرتاب" کی اشاعت بہت زیادہ اور آخرالذکر اخباروں کی مالی حالت اس قدر مستحکم ہے کہ وہ حکومتِ پنجاب کی گراں قدر مالی امداد حاصل کرنے کی بھی ضرورت محسوس نہیں کرتے ہیں۔ اسی طرح ماہنامہ "ہمایوں" اور ماہنامہ "عالمگیر" کے مقابلہ میں "مست قلندر" اور "حسن پرست" کی نہ صرف اشاعت بہت وسیع ہے بلکہ ان کی مالی حالت بھی قابلِ رشک ہے۔ کیا بہی خواہان وہمدردانِ اردو اور بالخصوص مسلمان اس سے عبرت حاصل نہ کریں گے؟

اب ایک نظر اردو کتب خانوں پر ڈال لیجئے۔ یہ دیکھ کر بیحد افسوس ہوتا ہے کہ اردو مطبوعات کی تعداد میں ہر سال قابلِ شرم حد تک کمی ہو رہی ہے۔ اردو کی نشر واشاعت کے لئے جو پروپگنڈا ہو رہا ہے اس کا اثر بالکل الٹا پڑ رہا ہے اور ان چند سو مطبوعات میں بھی زیادہ تعداد بازاری ناولوں، گندے اور مخرب الاخلاق صنفی ونوعی لٹریچر، تھرڈ کلاس افسانوں اور مذہبی مباحث کی ہے۔ ٹھوس علمی وادبی مطبوعات کی سالانہ تعداد ایک یا دو درجن سے زیادہ نہیں ہے اور یہ بھی اپنے اپنے ناشرین کے لئے ایک بار بنی ہوئی ہیں۔ اگر انفرادی کوششوں کو نظر انداز کر دیا جائے تو پھر یہ کہنا بالکل صحیح ہے کہ اس وقت اردو کے چار مرکز ہیں۔ لاہور۔ دہلی۔ لکھنؤ اور حیدرآباد۔ انہی چار مقامات سے اردو کی کتابیں شایع ہوتی ہیں۔ اب آپ دیکھیں کہ لاہور سے جو سیکڑوں کتابیں ہر سال شایع ہوتی ہیں وہ تمام کی تمام افسانہ اور ناول پر مشتمل ہیں۔ علمی وادبی مطبوعات کی تعداد نہ ہونے کے برابر ہے۔ دہلی میں البتہ جامعہ ملیہ کے کتب خانہ سے چند علمی وادبی کتابیں شایع ہوئی ہیں۔ مکتبہ برہان نے بھی تقریباً نصف درجن قابلِ قدر کتابیں شایع کی ہیں۔ لیکن بقیہ کتب خانوں نے اس وقت تک کوئی ایسی کتاب شایع

نہیں کی ہے جسے اردو ادب کے خزانہ میں گراں بہا اضافہ قرار دیا جا سکے۔ اور یہی حال لکھنؤ کے کتب خانوں کا ہے۔ اس سلسلہ میں حیدر آباد کے کتب خانے ضرور قابلِ قدر خدمت انجام دے رہے ہیں۔ ادارۂ ادبیات اردو نے تقریباً چھ درجن مفید کتابیں شائع کی ہیں۔ لیکن علمی و ادبی کتابوں کی مانگ مارکٹ میں جس قدر کم ہے اس پر قلم اٹھاتے ہوئے شرم آتی ہے۔ ہماری غفلت، لاپروائی اور بے عملی نے آج اس قدر افسوسناک صورت اختیار کر لی ہے کہ ملک میں بہت ہی کم کتب خانے ایسے ہیں جو بلا پس و پیش علمی و ادبی کتابیں شائع کرنے پر رضامند ہوں۔ کیونکہ اب یہ بات ہر شخص کو معلوم ہے کہ اردو داں حضرات کا مذاق اس قدر پست اور گندہ ہے کہ ملک میں علمی و ادبی کتابوں کی مانگ ہی نہیں۔ اگر کوئی علمی و ادبی کتاب شائع کی جائے تو وہ برسوں الماریوں کی زینت بنی رہے گی۔ اس لئے کس میں اتنی ہمت ہے کہ وہ ایسی تجارت پر اپنی کمائی لگائے جس سے فائدہ کی کوئی توقع نہ ہو۔ آپ کسی کتب فروش سے دریافت کر لیں۔ یہی جواب ملے گا کہ فی زمانہ عریاں اور گندے ناولوں اور افسانوں کی مانگ تو پھر بھی کافی ہے لیکن علمی و ادبی کتابوں کے خریدار ہزار میں ایک بھی نہیں۔ میرا ذاتی تجربہ بھی یہی ہے گزشتہ سات سال کے دوران میں گل فروش پبلشنگ ہاؤس نے تقریباً سات ہزار کتابیں فروخت کی ہیں۔ اور ان میں ٹھوس علمی و ادبی کتابوں کی تعداد ایک درجن سے زیادہ نہیں ہے۔ اب آپ ہی غور کریں کہ اردو داں پبلک کا ذوقِ ادب اس قدر پست کیوں ہے؟ کیا یہ بھی کانگریس یا برادرانِ وطن کی اردو سے دشمنی کا اثر ہے؟

اردو کے انشا پردازوں کی حالت جس قدر نازک اور افسوس ناک ہے اس پر اب کچھ لکھنا بے کار ہے یہ نہیں کہ اردو میں ٹھوس علمی و ادبی کتابیں تصنیف و تالیف کرنے والوں کی کمی ہے نہیں بلکہ اردو کے گر جانے کی وجہ ہماری غفلت اور بے عملی ہے۔ اہلِ قلم حضرات کو معلوم ہے کہ ان کے علمی و ادبی کارناموں کا کوئی قدرداں نہیں۔ اس لئے وہ اس میدان میں قدم رکھنے کی ہمت ہی نہیں کرتے ہیں۔ اور جو بھول کر یا غلطی سے کوئی علمی و ادبی کتاب لکھ لیتے ہیں تو اس دماغی محنت، کاوش اور جانفشانی کی وجہ سے انھیں مالی نقصان بھی اٹھانا پڑتا ہے اور پیٹ پر پتھر باندھنے پڑتے ہیں۔

اب جب کہ اردو داں پبلک کی بدذوقی، غفلت اور بے عملی کی حالت اس قدر افسوسناک ہے تو پھر یہ بات میری سمجھ میں نہیں آتی تو پھر ہم کس طرح اس بات کی شکایت کرنے میں حق بجانب ہیں کہ برادرانِ وطن اردو کے دشمن ہیں اور اردو کو مٹا رہے ہیں۔ اس باب میں میری ذاتی رائے تو یہی ہے کہ نہ کوئی اردو کا دشمن ہے اور نہ کوئی اردو کو مٹا رہا ہے اور نہ اردو کسی غیر کے مٹانے سے فنا ہو سکتی ہے۔ البتہ خود ہماری ہی بے عملی اور غفلت اردو کے حق میں پیغام موت بنی ہوئی ہے۔

مجھے اس وقت وقتی سیاسیات پر بحث کرنی مقصود نہیں لیکن اتنا ضرور عرض کروں گا کہ اگر ہندوؤں اور مسلمانوں کی باہمی کشیدگی اور سیاسیات کے موجودہ رخ کو دیکھتے ہوئے اس بات کی پیشین گوئی کرنے کے لئے کسی نبی یا رسول کی ضرورت ہی نہیں ہے تو وہ دن دور نہیں کہ جب ہندوؤں اور مسلمانوں کے تعلقات وہی ہوں گے جو فرانس اور جرمنی یا اسٹریا اور ہنگری کے ہیں۔ اور کوئی کوشش بھی ان دونوں قوموں کو متحد کر کے ایک حکومت کے زیر سایہ زندگی بسر کرنے پر رضامند نہ کر سکے گی۔ اب جس طرح فرانس اور جرمنی کی زبانیں ایک دوسرے سے بالکل علحدہ ہیں اور ان دونوں ملکوں کو اپنی اپنی زبانوں کو ترقی دینے کا پورا حق حاصل ہے۔ اسی طرح ہندوؤں اور مسلمانوں کی زبانیں بھی اپنی اپنی ہیں۔ اس لئے ہندوؤں کو ہندی کو ترقی دینے کا پورا حق حاصل ہے۔ اب اگر ہندوستان کے مسلمان اردو کو اپنی زبان تسلیم کرتے ہیں تو اپنی کوششوں سے اسے بڑھائیں۔ کون انھیں ایسا کرنے سے منع کرتا ہے۔ کون ان کی راہ میں حائل ہے۔ البتہ اگر ہندوستان کے مسلمان یہ چاہتے ہیں کہ وہ خود تو ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھ جائیں اور برادرانِ وطن اپنی زبان یعنی ہندی کو چھوڑ کر اردو کو بڑھائیں تو ان کی یہ خواہش احمقانہ ہے اور کبھی پوری نہ ہوگی۔

میں نہیں کہہ سکتا کہ ہندوستان کے مسلمان اس حماقت میں مبتلا ہیں۔ لیکن حالاتِ موجودہ کا عمیق مطالعہ ظاہر تو یہی کرتا ہے۔ لہٰذا اگر درحقیقت مسلمانوں کی خواہش یہی ہے تو پھر اردو کے مٹ جانے میں شک کرنا کفر ہے۔ بہتر ہوگا کہ ابھی سے اردو کے مزار پر فاتحہ پڑھ لی جائے کہ بہت ہی شیریں زبان تھی۔ عربی و فارسی کی گود میں کھیلی کودی اور پروان چڑھی تھی، پہلے ہندی لنگوٹی سے اسے انس تھا پھر انگریزی سوٹ پر جان دینے لگی۔ غالب، اکبر اور اقبال ایسے مایۂ ناز شاعرانِ مشرق کے خیالات کی ترجمان بنی۔ نذیر احمد، سرشار، شرر، آزاد اور پریم چند نے یہاں باغ اور چمن لگائے مگر افسوس جب یہ جوان ہوئی اور اس چمن کی خوشبو کے چار دانگِ عالم میں پھیلنے کا وقت آگیا تو قبل اس کے کہ غنچہ کھل کر پھول بنتا اس قوم کی جسے ہندوستانی مسلمان کہا جاتا ہے غفلت، بے عملی اور بد ذوقی نے جوانی ہی میں اسے موت کے گھاٹ اتار دیا خدا اسے کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے، آمین

ہندوستانی مسلمان کو یہ بات گرہ میں باندھ لینی چاہیے کہ یہ زمانہ باتیں بنانے اور شور و غل مچانے کا نہیں ہے بلکہ عملی جدوجہد کا ہے۔ اس لئے آپ ہزاروں اردو کانفرنسیں کریں، لاکھوں جلسے کرکے برادرانِ وطن کو برا بھلا کہہ لیں۔ اور ان کو اردو کا دشمن بتا کر اپنا کلیجہ ٹھنڈا کرلیں۔ کانگریس کی اردو دشمنی کا خوب ڈھنڈورا پیٹ لیں لیکن کان کھول کر سن لیں کہ اس قسم کی فضول باتوں سے نہ پہلے کبھی اردو کو فائدہ ہوا ہے اور نہ آئندہ کبھی ہوگا۔ اس لئے بہتر ہے کہ شور و غل مچانا چھوڑ دیجئے، دوسروں کو برا بھلا نہ کہئے کسی کو اپنا یا اپنی زبان کا دشمن قرار نہ دیجئے بلکہ نہایت خاموشی اور صبر و استقلال کے ساتھ اپنے آپ کو اور اپنی زبان کو بڑھانے کے لئے عملی جدوجہد شروع کردیجئے۔ آپ کو چاہیے کہ یہ دیکھیں اور غور کریں کہ وہ لوگ جن کو آج آپ اپنا دشمن کہہ رہے ہیں وہ اپنے آپ کو بڑھانے کے لئے کیا طریقہ اختیار کئے ہوئے ہیں، آپ اس کا ردِ عمل سوچیں اور اپنے آپ کو بڑھانے کے لئے اس سے بھی زیادہ جوش، سرگرمی، توجہ، انہماک اور استقلال کے ساتھ عملی کام شروع کردیں۔ اس صورت میں یقیناً نہ کوئی آپ کی یا آپ کی زبان کی دشمنی کرنے کی ہمت کرسکے گا اور آپ کی ان عملی کوششوں کا انجام بھی بہت خوش گوار نتائج کا حامل ہوگا۔

اگر آپ اردو کو نہ صرف اپنی بلکہ قومی زبان تسلیم کرتے ہیں تو اس کی خدمت کیجئے۔ اور اسے بڑھائیے۔ آپ کو ایسا کرنے سے کون منع کرتا ہے کس نے آپ کا ہاتھ یا قلم پکڑا ہے۔ لیکن افسوس ہو یہ رہا ہے کہ زبانی ہمدردی تو بہت کچھ ہے لیکن ٹھوس عملی خدمت نام کو بھی نہیں۔ پھر آپ کی زبانی ہمدردی بھی آپ کی بے عملی کی وجہ سے اردو کے حق میں بجائے مفید ہونے کے مضر ہی ثابت ہو رہی ہے آپ نے جواباً اپنی زبان کی عملی خدمت کرنے کی بجائے "قومی تعصب اور ہٹ دھرمی" کا نعرہ لگا کر ایک ایسے جذبہ کو بیدار کردیا ہے کہ وہ چند سو یا چند ہزار ہندو جو اب تک اردو کو اپنی زبان سمجھے ہوئے تھے اور اس کی خدمت کر رہے تھے، آپ نے ان کو بیدار کرکے انھیں اس بات پر مجبور کردیا ہے کہ وہ اپنی قوم کا ساتھ دیں اور پنڈت جواہر لال نہرو جیسے لوگ بھی اب ہندی ہی کو اپنی زبان بتانے پر مجبور ہوگئے ہیں۔

کان کھول کر سن لیجئے کہ پانی گردن تک آگیا ہے اس لئے اگر اب بھی ہمیں ہوش نہ آیا اور ہم نے اپنے باہمی اختلافات کو مٹا کر اپنے احیا و بقا کے لئے عملی جدوجہد نہ کی اور صرف شور و غل مچانے کو کافی سمجھا تو پھر نہ صرف اردو کی بلکہ ہندوستانی مسلمانوں کی موت میں شک کرنا کفر ہے۔ میری یہ مخلصانہ گزارشات ممکن ہے کہ بعض طبع کو ناگوار گزریں کیونکہ حق کی بات ہمیشہ تلخ محسوس ہوا کرتی ہے لیکن افسوس میں اپنی قوم کو دھوکے میں رکھنا اور ان کی سمجھ پر غفلت کا پردہ ڈالنا نہیں چاہتا۔ اس لئے میں نے اپنے تاثرات کو بغیر رد و رعایت کے قلمبند کردیا ہے۔

سید محمود متوخ

دسمبر ۱۹۴۱ء

سیدی مولوی وحید الدین صاحب

السلام علیکم - آپ کے بدر سیکو ھ

ایک مسخر القلوب تعویذ لکھ رہا ہوں،

روپیہ

مولوی زور صاحب کو ان کے معنی علم زور کی طرف سے سلام دعا کہیے"

عارف کی تمنا ہے "کہ خدا مل جائے"

عاشق کی ہوس ہے "کہ دلربا مل جائے"

ہم ـــ اپنے بھی دل کی بات کہدیتے ہیں

وہ ـ یہ کہ :ـ

کہیں سے روپیہ مل جائے

نوشتہ امجد

۱۹

پانچ کہانیاں

(مسلسل افسانے)

علی گڈھ یونیورسٹی ہاسٹل کے ایک وسیع شاندار کمرے میں پانچ زندہ دل افراد، مسعود، آفتاب، مظفر، مشتاق اور انور علحدہ علحدہ صوفوں پر بیٹھے ہوئے پرلطف گفتگو کے مزے لے رہے تھے، یہ سب کے سب امتحانات سے فارغ ہوکر وطن جانے کی خوشی میں پھولے نہ سمارہے تھے، چونکہ کل صبح کی ٹرین سے یہ تمام احباب ایک دوسرے سے رخصت ہونے والے تھے اس لئے آج شب کی یہ یکجائی کل کی جدائی کے سلسلہ میں منعقد کی گئی تھی، بذلہ سنجی اور پرمذاق گفتگو سے ہٹ کر بالآخر سبھوں نے یہ طے کیا کہ ہم میں سے ہر ایک اپنی زندگی کا اہم اور انوکھا واقعہ بیان کرے، "اس طرح رات کا طویل حصہ پانچ کہانیوں کے سننے اور کہنے میں بہت جلد بیت جائے گا" "تجویز معقول ہے" ہر ایک نے ہاں میں ہاں ملائی۔

پہلی کہانی

ابتدا مسعود صاحب سے ہوئی، یہ حضرت خوش رو خوش پوش ہونے کے علاوہ خوش مزاج بھی واقع ہوئے تھے، ان کے انداز بیان میں لطافت اور رنگینی کوٹ کوٹ کر بھر دی گئی تھی، کرسی سے سیدھا ہوکر بیٹھے، حلق کو صاف کیا، اور اس طرح اپنی داستان حیات سنانے لگے ـــــ

پچھلے سال کی بات ہے، گرمیوں کی چھٹیاں ختم کرکے علی گڈھ آرہا تھا، چونکہ میں وقت سے پہلے ہی مکان سے نکل کر اسٹیشن پہنچ گیا تھا ٹکٹ خرید کر پلیٹ فارم پر بچھی ہوئی آہنی بنچ پر دراز ہوکر ٹرین کے انتظار میں، اپنی ایک نظم کے چند شعر گنگنا رہا تھا مشکل سے چند منٹ گزرے ہوں گے، کسی کی سریلی آواز نے مجھے اپنے خیال سے چونکا دیا، "اوہ ـــــ معاف کیجے گا" دفعتاً ایک لڑکی گزرتے ہوئے میرے سامنے آکر رک گئی "آپ ـــــ نہیں، نہیں" اس نے کچھ گھبراہٹ کی حالت میں کہا، "آپ وہ نہیں، مجھ سے غلط فہمی ہوئی۔"

"کوئی بات نہیں" میں نے کہا ـــــ

"وہی آواز، وہی صورت، ـــــ میں سمجھی" ـــــ

"کوئی دوست ہیں" ـــــ میں نے جملہ کی تکمیل کی ـــــ

"جی ہاں ـــــ عجیب اتفاق ہے"

"مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑا کہ آپ ناکام رہیں۔"

"میں اپنی اس غلط فہمی اور بیجا مداخلت کی وجہ سے معافی چاہتی ہوں" یہ کہہ کر وہ مڑی اور چل دی۔

ایک لمحے میں یہ سب کچھ ہوا میرے لئے یہ منظر حیرت ضرور تھا۔ اور میں اس اجنبی لڑکی کے متعلق کوئی رائے بھی قائم نہ کرنے پایا تھا کہ میری نظریں بے ساختہ نیچے گرے ہوئے کاغذ کے ٹکڑے پر جا پڑیں۔

"ارے! میری زبان سے نکلا، "یہ ملاقاتی کارڈ" شاید اس اجنبی خاتون کا ہوگا، پھر یہاں کیسے؟ گر گیا ہوگا؟ نہیں گرا دیا گیا ہوگا، ایک سکنڈ میں کاغذ میری انگلیوں کی گرفت میں تھا، "شہناز فیروز" اس حسین و جمیل نام کے طلسمی اثرات نے مجھے چند ثانیوں تک محویت میں رکھا، میں حیران تھا، کون؟ ـــــ اور کہاں جاتی ہے؟ کہہ نہیں سکتا، میں کتنی دیر ان خیالوں میں کھویا رہا۔ ٹرین کی آمد کی اطلاعی گھنٹی نے مجھے اپنے خیالوں سے چونکا دیا، فوراً

میں اپنی کتابوں کا بیگ سنبھال کر ٹرین کی طرف بڑھا پلیٹ فارم پر مسافروں کا اچھا خاصہ ہجوم تھا۔ میں نے کسی اچھے آرام دہ ڈبہ کی تلاش میں پلیٹ فارم کی دو تین چکریں لگائیں دفعتاً میری نظریں سکنڈ کلاس کے ایک خالی ڈبہ پر پڑیں، جس میں وہ پُراسرار خاتون تنہا بیٹھی ہوئی تھی۔ جس کے نام کا کارڈ ہنوز میرے جیب میں محفوظ تھا۔ ایک سکنڈ کے لئے میں رُک گیا۔

''آئیے گا'' اس نے مجھے دیکھ کر کہا، جس کے جواب میں میں اُسے معنی خیز نظروں سے دیکھتے ہوئے ڈبہ میں سوار ہوا، اور مقابل کی نشست پر اپنا قبضہ جما یا وہ بولی — "معاف کیجئے گا" — آپ نے کیا خیال کیا ہوگا؟ عجیب لڑکی ہے یہ، میرے ایک عزیز ہیں، بالکل آپ کی طرح — یہ صاحب، مجھ سے اس اسٹیشن پر ملنے والے تھے" "اور بدقسمتی سے میں مل گیا'' میں نے ہنستے ہوئے کہا' —

"عجیب اتفاق ہے، میں خوش ہوں کہ ہمارا یہ سفر آپ کی رفاقت اور ہمراہی کی وجہ سے طمانت بخش ثابت ہوگا، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم باہم متعارف ہوجائیں'' یقین مانیے! میری حیرت لحظہ بہ لحظہ بڑھتی جارہی تھی، یا اللہ! یہ عجیب لڑکی ہے، میں کوئی خواب تو نہیں دیکھ رہا ہوں، یا طلسم ہوش رُبا کا کوئی رنگین باب میری نظروں کے سامنے پیش کیا جارہا ہے۔ لڑکی حُسن و شباب کا مکمل نمونہ لئے ہوئے رنگینیوں اور نگہتوں میں ڈوبی ہوئی تھی، اس کا حُسن شعر اور افسانوں کا موضوع لئے ہوئے روح پرور واقع ہوا تھا۔

ع شفق میں ڈوبے ہوئے نور میں نہائے ہوئے۔

"سنئے! اُس نے ترنم خیز لہجہ میں کہا' میرے شوہر، ڈاکٹر فیروز طبیعیات کے پروفیسر ہیں۔"

"وہ — آپ کے شوہر! میں نے کسی خیال کے تحت کہا۔

"آپ جانتے ہیں ڈاکٹر فیروز کو"

''شاید'' — میں نے ویسے ہی کہا۔

"آپ کو اُن سے مل کر مسرت ہوگی، وہ ایک اچھے اخلاق کے مالک ہیں، اب مجھے آپ سے متعارف ہونے کی عزت حاصل ہوگی"

"میری تعریف، میں نے متین تبسم کے ساتھ کہا، علی گڈھ یونیورسٹی کا معمولی درجہ کا طالب علم"۔

''حیدرآباد سے آرہے ہیں آپ''

''جی ہاں اپنے وطن سے''

"آپ نے اپنا نام تو نہیں بتایا"

"مسعود خالد پکار سکتے ہیں آپ"

"خوب گاتے ہیں آپ" میرے متعلق اپنی رائے کا اظہار کیا،

"میں اور گانا — البتہ شعر پڑھ لیتا ہوں"

"آپ جو گا رہے تھے — کیا شعر تھا وہ — بھلا سا — ہاں، اُن کی نظر نوازاداؤں کا شکریہ — پوری غزل تو آپ کو یاد ہوگی"

"مجھ سے — اس نے حسین تبسم کے ساتھ کہا" میں شاعرہ تو نہیں"

بے تکلفی معاف — میں نے ذرا شوخ لہجہ میں کہا "شاعر کا خیال تو ضرور ہیں۔ جملہ کے اختتام پر وہ کچھ شرما سی گئی۔

واقعات دلچسپ ہوتے گئے لیکن حضرات! پیش قدمی زیادہ تر اُن صاحبہ کی طرف سے ہورہی تھی، لڑکی حد درجہ فیشن ایبل اور مغرب زدہ واقع ہوئی تھی، یورپ کی تعلیم نے اُسے آزاد خیال اور نڈر بنا دیا تھا۔ رات کا کھانا ہم نے ایک ساتھ ختم کیا' آپ خوب جانتے ہیں، ایک نوجوان مرد اور حسین عورت کی قربت اس تنہائی کے موقع پر کتنی ولولہ خیز اور جذبات انگیز ہوتی ہے، پہلی مرتبہ اس کا خوبصورت سر دریچے کے قریب بے اختیار میرے شانہ سے ٹکرایا، ایک بجلی سی چھو گئی' خون کی روانی میں تیزی آگئی'

میں نے فوراً اپنے آپ کو سنبھالا ۔

اور جب دوسری مرتبہ، اس کی خواہش پر دریچہ بند کرنے جو اٹھا، میرا ہاتھ اُن کی حنائی انگلیوں سے مس ہو کر رہ گیا، جو دریچہ کے پٹ تھامے ہوئے تھیں، تھرماس میں پانی ختم ہو چکا تھا میں پانی لینے کے لئے ایک درمیانی اسٹیشن پر اتر پڑا، میرے واپس آنے تک انجن نے سیٹی دی، اور گاڑی حرکت کرنے لگی میں فوراً اس کے ہاتھوں کا سہارا لئے ہوئے اوپر چڑھ آیا،

اچھا ہوا شہ ناز تم نے مجھے تھام لیا ۔ ورنہ گر پڑتا، میں نے بدستور اُسے تھامے ہوئے کہا، مخمور کن نظروں سے مجھے دیکھ رہی تھی ۔ آہ وہ منظر کتنا پرکیف حشر خیز تھا، وہی اپنی نشستوں پر جا بیٹھے، مجھ پر وہی کیفیت و مستی کا جذبہ طاری تھا "شہ ناز" میں نے اس کی خوبصورت کلائی کو اپنی گرفت میں لے کر کہا اس نے محبت بھری نظروں سے میری طرف دیکھا اُف میری پاکبازی ہرن ہوگئی شیرازۂ ضبط وسکون بکھر کر رہ گیا جذبات کا طوفان بڑی حد تک دل ودماغ میں ایک ہنگامہ مچا رہا تھا،

ارے یہ خاموشی تا بہ کے ۔ میں نے اس سے سوال کیا ۔

ایک خاص قسم کا ملکوتی تبسم ۔ جو اکثر دوشیزاؤں کے ہونٹوں پر نمودار ہوتا ہے، اس کے احمریں ہونٹوں پر ناچ رہا تھا، "جی" ۔ وہی مستی بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا گیا، "آپ خوب سمجھتے ہیں"

حضرات! آپ خوب سمجھتے ہیں، اس میں میرا کیا دوش ہے، ایسے منظر اور فضا میں رہ کر فرشتے بھی گناہ کئے بغیر نہیں رہ سکتے، میں تو رہا انسان اور وہ انسان جو جذبات انگیز شباب کے دور سے گذر رہا ہو ۔ میرا پائے استقامت لڑکھڑائے بغیر نہیں رہا ۔ اور ساغر ضبط وسکون چھلک پڑا ہم ایک دوسرے کے پرستار بن گئے آہ کتنے رنگین اور پرکیف تھے وہ لمحاتِ محبت جو سرور و بدمستی میں ڈوبے ہوئے جذبات انگیز ثابت ہوئے اور بہت جلد بیت گئے ۔ صبح ایک اسٹیشن پر ہم بیدار ہوئے، وہ اپنا سب کچھ کھو کر بھی بےحد حسین اور مطمئن نظر آ رہی تھی، رحم اور ہمدردی میں ملے جلے جذبات اب میرے دل میں اس کے لئے بڑے زور شور کے ساتھ لہریں لے رہے تھے ناشتہ کے بعد ہم نے لباس تبدیل کیا، ملاقات گہری ہوتی گئی، اس اثنا میں مختلف راز افشا ہوکر رہے، ایک گھنٹہ کے اندر ہم ناگپور پہنچ گئے پلیٹ فارم پر ایک صاحب جن کی عمر تخمیناً ۵۵ سالہ ہوگی منتظر تھے ۔

"مسعود صاحب! شہ ناز نے تعارفی لہجہ میں کہا، یہ میرے شوہر ڈاکٹر فیروز ہیں"

اور یہ ـــ میرے دوست ـــ مسٹر مسعود خالد ۔

میں حیران تھا ـــ آہ ـــ شہ ناز اور فیروز ۔ کتنا بے ڈھب جوڑا ۔

شہ ناز نے اصرار کیا کہ میں دو ایک روز اُن کے یہاں ٹھیروں ـــ اور اُس کے شوہر نے بھی اپنی بیوی کی تائید کی لیکن اس میں عذر لنگ کی آڑ لے کر کہ کل میری حاضری ہے اُن دونوں کو مطمئن بنانے میں کامیاب ہوگیا! بھیگی ہوئی پلکوں کے ساتھ شہ ناز مجھ سے رخصت ہوئی، واقعہ کو گزرے ہوئے ایک سال ہوا، مہینہ میں ایک مرتبہ ضرور اس کا ایک خط ملتا رہا، اس اثنا میں ہم نے کئی مرتبہ ایک دوسرے سے ملاقات کی اور بدستور اپنے جذبات محبت کی حوصلہ افزائی کرتے رہے، ـــ لیکن آہ ـــ ایک ہفتہ ہوا مجھے اُس کی ایک درد انگیز تحریر ملی، سنئے وہ لکھتی ہے ۔

"پیارے مسعود! ایک ہفتہ ہوا میرا بوڑھا شوہر اپنے کمزوریٔ قلب کے باعث انتقال کرگیا ۔ اُس کا بے حس دل زندگی میں میرے

ئے ویسا ہی تھا، جیسا کہ اب ۔۔ اس کی موت اور زندگی میرے لئے برابر تھی، لوگ کہتے ہیں بیوہ ہوگئی، اور میں کہتی ہوں جب کیا میرا سہاگ قائم تھا۔ اب رہی آزادی ۔۔۔ کوئی پابندی جب تھی ۔۔ نہ اب

سماج نے میری زندگی ایک ایسے بوڑھے مالدار کے ہاتھوں فروخت کردی تھی، جس میں جوانی اور محبت کا نام و نشان تک نہ تھا ''عورت کا دل'' آپ جانتے ہیں، دولت سے سیر نہیں ہوسکتا، وہ محبت سے محبت کرتا ہے۔ اور کچھ نہیں، جب میں پہلی مرتبہ آپ سے ملی' اور مل کر میں نے سب کچھ کھو کر بھی پالیا' ۔۔ یہی میری زندگی کا سرمایہ تھا۔ اب میں اپنے مستقبل کے متعلق سوچ رہی ہوں، میرے لئے کون سا بہترین راستہ ہوگا، ابھی میں نے کوئی فیصلہ نہیں کیا، دنیا میں میرے لئے کہیں بھی جگہ نہیں، والدین مر چکے، کوئی قریبی رشتہ دار نہیں سماج تو مجھے اپنی دنیا میں کبھی آنے نہ دے گا ۔۔۔ آس کا ایک دھندلا سا ستارہ ۔۔ جو آپ کی ہستی سے وابستہ ہے، میری زیست کو چمکانے کے لئے کافی ہے ۔۔ اور یہی راستہ' مجھے منزل تک پہنچا کر رہے گا۔۔۔ ورنہ بصورت مجبوری ۔۔ مجھے، اپنے دل کی پیاس'' بجھانے کی خاطر ۔۔۔ وہ سب کچھ گوارا کرنا پڑے گا' جو ایک پیشہ ور عورت کرسکتی ہے، فرق دونوں میں اتنا ہے کہ وہ بازاری عورت، اپنے پیٹ کے لئے۔ اور میں اپنے حسن و جوانی پر رحم کرنے کے لئے ۔۔

بتاؤ مسعود ۔۔۔ میں تمہارے فیصلہ کی منتظر ہوں، کونسی راہ بتاؤ گے؟

تمہاری سب کچھ شہ ناز

سن لیا آپ نے شہ ناز کا خط ۔ اب میرا فیصلہ بھی سن لیجئے۔ کل میں ناگپور پہنچ جاؤنگا، اور پھر شہ ناز۔ میری شریک حیات بنے گی۔ خواہ ایسا کرنے میں والدین، سماج اور دنیا، مجھے ٹھکرادے۔ یہ رہا میری زندگی کا اہم ترین واقعہ۔

دوسری کہانی

ایک لمحہ کے لئے کمرے میں سکوت طاری تھا سب کی نظریں آفتاب کی طرف جمی رہیں، یہ صاحب متین صورت بلند و پاکیزہ جذبات کے مالک تھے، فن لطیف ان کی زندگی کا حسین ترین مشغلہ رہ چکا تھا، اطمینان کے ساتھ سگریٹ جلایا، اور دھوئیں کے چھلے بناتے ہوئے کہنے لگے ع

ہماری زندگانی اک مرقع ہے حسینوں کا

انٹر پاس کرنے کے بعد مجھے لکھنؤ بھیجا گیا' ایف۔اے کے دو سال میں نے باتوں باتوں میں طے کئے، اس عرصہ میں والد کی بدلی لکھنؤ سے دہلی ہوگئی۔ وہ پولیس کے سپرنٹنڈنٹ تھے۔ امتحان سے فارغ ہوکر مجھے لکھنؤ چھوڑ کر دلی بسانا پڑا، دلی کی فضا نہیں کچھ راس نہ آئی، یہاں آکر والد دفعتاً علیل ہوگئے اور آن کی آن میں ایک ہفتہ کے اندر ہمیں بے سہارا چھوڑ کر جنت سدھارے' والدہ غم کی ماری دیوانی سی ہوگئیں، وہ تو اچھا ہوا کہ ماموں جان اگر ہمیں اپنے ہمراہ کانپور لے گئے، میں آسانی کے ساتھ اپنا تعلیمی سلسلہ جاری رکھ سکتا تھا۔ کیونکہ والد مرحوم نے میرے نام دس ہزار کی کثیر رقم بنک میں رکھ چھوڑی تھی، لیکن ماموں کا خیال تھا کہ میں اپنی تعلیم یہیں ختم کرکے اس رقم سے کوئی ایسا کاروبار شروع کروں جس سے دولت کا انبار لگ جائے'' اُن کی لڑکی صبیحہ بچپن ہی میں مجھ سے منسوب کی گئی تھی صبیحہ حسین کہلانے کی ضرور مستحق تھی، لیکن تعلیم کے معاملہ میں ماموں جان نے ہمیشہ بخالت سے کام لیا، والدہ یہاں آکر کچھ بیمار سی ہوگئیں، معقول علاج کرایا گیا، مگر صحت نہ ہوئی، ڈاکٹر نے انہیں

پہاڑی مقام پہ لے جانے کی رائے دی، اور میں فوراً انہیں نینی تال لے آیا چند ہی روز میں یہ مقام ہمارے لئے دلکش اور صحت افزا ثابت ہوا، والدہ کی صحت ٹھیک ہونے لگی اور تو اور میں اس جنت بدوش خطے میں پہنچ کر ایک کیف و سرور کی دنیا میں کھو گیا دن بھر حسین مناظر کا لطف اٹھایا کرتا، پھولوں سے لدی ہوئی وادیاں، برف سے ڈھکی ہوئی گھاٹیاں، شفاف جھیل کا کنارا، سورج کے طلوع و غروب کے زرین نظارے، آہ ان مناظر نے میرے شاعرانہ جذبات میں روح پھونک دی۔

ایک دن جو میں صبح کی تفریح سے لوٹا ملازم کے ذریعہ اطلاع ملی کہ والدہ ہماری بازو والی کوٹھی کی چند مستورات سے ملنے گئی ہیں، یہ لوگ کلکتہ کے مشہور تاجر ہیں، خان بہادر سلطان حبیب نے دوسرے دن مجھے اپنے یہاں چار پر مدعو کیا، اتفاق کی بات ہے یہ صاحب الد مرحوم کے ملنے والوں میں سے نکلے، ان کے دونوں لڑکے اقبال، اور سلیم حال ہی میں آئی۔سی۔ایس کے امتحانات میں آ چکے ہیں، اُن کی معیت میں یہاں بہت کچھ وقت سیر و تفریح میں کٹا۔

دوسرے دن میں علی الصباح تنہا جھیل کی طرف نکل پڑا، آج مجھ پر کچھ شعریت سی طاری تھی، حالت کیف و سرور میں میں نے ایک رومانوی نظم" وادی کی حور" کہی اور بیچو دی میں اُن اشعار کو جھیل کی ایک بڑے چٹان پر بیٹھے ہوئے گنگنا رہا تھا، دفعتہً کسی نے میرے کندھے چھوئے۔

"کون؟ سلیم صاحب، میں چونک پڑا۔"

"معاف کیجئے گا، مخل تو نہیں ہوا۔"

"کوئی بات نہیں"

"یہ کیا کاغذ ہے" سلیم نے دریافت کیا

"کچھ نہیں، جذبات دل کی دھندلی سی تصویر"

"اوہ — آپ شاعر ہیں، اقبال یہاں آؤ، میں نے اپنے چھوٹے بھائی کو آواز دی، جو ایک لڑکی ساتھ جھیل کے اُس کنارے کھڑا ہوا تھا" ارے بھئی اقبال"! سلیم نے کچھ قدم آگے بڑھا کر کہا" سُنا تم نے، یہ چھپے رستم نکلے، ہر روز جو تنہا یہاں آتے ہیں نا، اس کا بھی راز نہیں معلوم ہے، یہ دیکھو آپ شاعر ہیں — شاعر"

اقبال نے تعجب کا اظہار کیا، — واہ جناب چوری پکڑی آپ کی، چلئے اب آپ سستے نہ چھوٹیں گے، کچھ سنانا پڑے گا، "اس حسین فضا میں گناہ نہ کرنا بڑا پاپ ہے" اس کے دوسرے بھائی نے کہا، یہ لوگ حد درجہ پر مذاق اور دلچسپ واقع ہوئے تھے، دو ایک گھنٹہ کی ملاقات میں وہ سب کے سب مجھ سے گھل مل گئے، یہی وجہ ہے پہاڑ پر خوب لطف آنے لگا۔

"آپ کچھ سنائیں گے ہیں" چلو اقبال، اُس سبزہ پوش پہاڑ پر چلیں — اور نہ ہم بھی بتول، اوہ معاف کیجئے مولانا! میں اپنی بہن سے تعارف کرانا بھول گیا، بتول فاطمہ میری بہن"

"شکریہ" میں نے کہا "یہی آفتاب صاحب ہیں، جو کل جائے یہاں مدعو کئے گئے" — زمردی پہاڑی پر پہنچ کر ہم سب گھاس پر نیم دراز ہو گئے، ہاں تو — سلیم نے کہا وہی نظم، میں نے ترنم کے ساتھ سنائی — اور اس کے ایک دو شعر تو متعدد مرتبہ پڑھوائے گئے، گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے کی تفریح کے بعد ہم اپنی اپنی قیامگاہ پر لوٹ آئے، رخصت کے وقت اُن بھائیوں اور بہن نے شام کی تفریح کے لئے سینما چلنے کی دعوت دی۔

آج صبح کی موٹر سے خالو جان اُن کے لڑکے اختر آ گئے، اُن کے ساتھ گفتگو میں سارا دن کٹا، اختر کے ساتھ تیار ہو کر سلیم کے گھر پہنچا،

وہاں سے سب مل کر تماشا گھر پہنچے، رات کا کھانا سبھوں نے ایک پہاڑی ہوٹل میں کھایا، اور بہت رات گئے، چاند کی نقرئی بارش میں نہاتے ہوئے گھر پہنچے، اختر مصوّر تھا، اس نے یہاں اچھے اچھے مناظر کے عکس لئے، اپنا مختصر سا مصوّری کا سامان لئے میرے ساتھ علی الصباح جھیل کے کنارے پہنچا، یہاں بالکل غیر متوقع طور پر بتول سے مدبھیڑ ہوئی۔

"ارے آپ کدھر" اُس کی زبان سے تعجب کا کلمہ نکلا، بھیا تو آپ کو لینے گھر گئے ہیں، اختر منظر کی تلاش میں دوسری طرف چلا گیا تھا۔

"اور آپ کدھر، یہی سوال میں نے اس سے کیا — بالکل اکیلی"

"شعریت کے لئے منظر کی تلاش میں" —

"مجھے بے ساختہ ہنسی آگئی —— اوہ — آپ بھی شعر کہتی ہیں"

"آج سے ارادہ کرلیا ہے —— اگر آپ"

"ارادہ کی کیا بات ہے، شاعرانہ جذبات تو بلا ارادہ ہی پیدا ہوجاتے ہیں،

"گھنی جھاڑی کے جھنڈ میں کسی نے آواز دی، سلیم اسٹانڈ ہٹاتے ہوئے آرہا تھا، "بھیا سے اُس کا ذکر نہ کیجئے، اُس نے مدھم لہجہ میں کہا ارے تم کدھر" — اقبال نے وہیں سے آواز دی، چلو آج مچھلی کا شکار کریں،

"شکار" — میں نے ہنستے ہوئے کہا، ارے بابا! کہیں خود شکار نہ ہوجائیں، بتول نے مسکرایا،

"اِن صاحب کا جنون ملاحظہ ہو، سلیم نے اختر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا" آج یہ پوری پہاڑی کی تصویر لیتے پھریں گے"

"شوق بُرا ہوتا ہے" میں نے کہا،

جی ہاں، جیسے مچھلی کے شکار کا شوق، شاعری کا شوق، تصویر کشی کا شوق، وغیرہ وغیرہ" — اقبال کہے جا رہا تھا،

"اور ہاں بھیا" بتول بولی، گانے بجانے کا شوق، اس پر سب ہنس پڑے، یاد ہے کہ سلیم کو گانے کا شوق ہی نہیں بلکہ جنون سا ہوگیا تھا، خوب محظوظ ہوکر گھر لوٹے، رات کے کھانے پر سلیم اور بتول نے ہمیں مدعو کیا تھا، کھانے کے بعد سلیم نے باجے پر اچھے اچھے گیت سنائے، اور اس کے بعد بتول کی باری آئی، اُس نے حافظ شیرازی کی فارسی غزل سنائی، اس رات مجھ پر عجیب کیف و سرور طاری تھا، میں نے ایک طویل رومانوی نظم "فردوس خیال" کے عنوان سے کہہ کر اپنے آپ کو حد درجہ مسرور کیا، علی الصباح ہماری کوٹھی کے قریب غیر متوقع طور پر بتول ملی، اُسے میری تلاش تھی،

"آج یہ چاند کدھر نکل آیا ہے" میں نے بغیر کسی خیال کے اُس سے مذاق کیا —

"ایک نئے اُفق کی تلاش میں، اس نے برجستہ جواب دیا لیکن سویرے چاند نکلا نہیں کرتا، یہ میرا سوال کیا ؎

کہا روپ نے چاند ہے چودھویں
مگر چاند کیسے سویرے سویرے

"اگر آنکھیں ویسی ہی دیکھنے والی ہوں، تو ہر ذرّہ آفتاب ہے، جواب لاجواب کر گیا" میں آپ کے اِن بلند پاکیزہ جذبات اور شاعرانہ تخیلات کی داد دیئے بغیر نہیں رہ سکتا"

ہاں خوب یاد آیا، اس نے کہا، عرض کرنا یہ ہے، رات میں نے ایک نظم لکھی ہے" وادی گل" بس اس کے دکھانے کے لئے آپ کی تلاش میں نکل آئی، ایک چھوٹے سے ریتیلے نالے کے کنارے ہم بیٹھ گئے، نظم بحیثیت مجموعی بُری نہ تھی، بجز دو ایک خامیوں کے اور کوئی غلطی نہ تھی،

"نظم تو بڑی شاندار ہے"

"سچ" —

"بالکل سچ" — چند دن کی مشق میں آپ اچھی شاعرہ بن سکتی ہیں"

"مگر ایسے مناظر، فضائیں اور صحبتیں کہاں نصیب ہوں گی" میں نے سنا ہے کہ آپ دو ایک روز میں یہاں سے رخصت ہونے والے ہیں،

ہاں بتول! والدہ کی صحت اب رو بصحت ہو چلی ہے، اور پھر مجھے اپنی تعلیم کا سلسلہ منقطع ہونے کا بڑا قلق ہے"

"آیا آنے پر ہم بھی کلکتہ جائیں گے" اس نے کچھ متاثر ہو کر کہا، دیکھئے خدا کب ملاتا ہے،

"کوئی مشکل بات نہیں، میں نے کہا ہم ضرور مل سکتے ہیں جبکہ ہمارے دلوں میں ایک دوسرے کے لئے جگہ ہو" وہ چونک پڑی، جیسے میں نے اُس کے دل کی بات کہدی "آپ کیا کہہ رہے ہیں، ہم ایک دوسرے کے دوست بن سکتے ہیں"

ہاں سچے جذبات کے تحت ہماری دوستی برقرار رہ سکتی ہے، آپ بخوشی مجھ سے خط وکتابت کر سکتے ہیں، اب رہا ایک مرد اور عورت کے دوستانہ تعلقات اس وقت استوار نہیں ہو سکتے جب تک کہ محبّت کا عنصر اس میں شامل نہ ہو اور یہ جذبہ ایک دوسرے کی روح کی گہرائیوں میں جذب ہو کر ایثار کا مادہ پیدا کرتا ہے،

"محبت کا معیار آپ کے نزدیک کیا قدر و قیمت لئے ہوئے ہے" یہ سوال اس کا عجیب وغریب جذبات کا آئینہ دار تھا،

بتول! میرے نزدیک بڑی قدر و قیمت رکھتا ہے، بقا اور فنا کی حدود کو توڑتا ہوا ایک ایسے مرکز پر جا کر ختم ہو جائے جہاں عقل و جنون کی دوررس نگاہیں بھی چھو نہیں سکتیں،"

"اوہ ــــ آپ بہت دور پہنچ گئے، میں "پوچھتی ہوں" محبّت کا احساس کس صورت میں پیدا ہو سکتا ہے" بالکل، غیر اختیارانہ فعل ہے یہ، ایک جذبۂ بے اختیار، ایک نامعلوم حرکت، غیر محسوس دھڑکن، خلش آمیز سرور، جو آنکھوں کی راہ سے دل کی رگ رگ میں روح بن کر سما جائے ــ اور کچھ نہیں، شاعر کی زبان سے اس کی مختصر سی تعریف سنئے کہتا ہے ؎

شاید اِسی کا نام محبّت ہے شیفتہ
اک آگ سی ہے سینہ کے اندر لگی ہوئی

اور ایسی آگ پر قابو پانا اپنے بس کی بات نہیں، یہ شعر تو آپ بار بار باجے پر گاتی ہیں ؎

عشق پر زور نہیں، ہے یہ وہ آتش غالب
کہ لگائے نہ لگے اور نہ بجھائے نہ بنے

شاید محبت کے خونخوار ہاتھ ہی اس کو دبا سکتے ہیں لیکن ــ بتول میرا اپنا تو ایقان ہے ـ محبت کا تعلق جسموں سے نہیں روحوں سے ہے۔"

شکریہ آپ نے تو وضاحت کے ساتھ محبّت کی تعریف بیان کر دی اور ایک حد تک مجھے رموزِ محبّت سے واقفکار اور مطمئن بنا دیا "کچھ نہیں، محبت وہ بحرِ ناپیدا کنار ہے جس کا ساحل ہے بھی نہیں بھی" ؎

اِس بحر محبت کا ماہر ساحل بھی ہے اور ساحل بھی نہیں

"آپ شادی شدہ ہیں، یہ سوال میرے لئے بالکل نوکھا تھا

"بدقسمتی سے ابھی میں یہ عزت حاصل کرنے سے محروم ہوں، سچ تو یہ ہے کہ دنیا میں میں ایک ایسا بدنصیب انسان ہوں جو کسی کے دل میں ذرہ برابر بھی جگہ نہ نکال سکا"

"آپ کیا کہہ رہے ہو" بتول نے متاثر کن لہجہ میں کہا "میرے دل میں تو آپ کے لئے جگہ ہے،

"آپ کے دل میں" میں نے حیرت و مسرت کے ملے جلے لہجہ میں کہا،

کیوں نہیں، میرا دل کوئی پتھر اور لوہے کا ٹکڑا تو نہیں،

"گویا تم مجھ سے محبت کرتی ہو، میں نے بڑھتے ہوئے جوش میں کہا،

میرے اس سوال کے جواب میں بتول کی آنکھوں سے آنسو نکل آئے، آنسو دل کی صحیح طور پر ترجمانی کرتے ہیں، اس نے کہا،

"حقیقی معنوں میں آج ہم نے اپنی زندگی کا راز پالیا، گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے کی ملاقات میں ہم ایک دوسرے کے سچے پرستار بن گئے"، اور دوبارہ ملنے کا وعدہ کرکے رخصت ہوئے، دن بھر میں نے اپنے آپ کو محفوظ اور خوش نصیب تصور کیا "آج میں نے اپنی محبت کی قیمت پالی"،

دوسرے دن ہم پھر تنہائی میں ملے، کل ہماری یہاں سے روانگی تھی، ہم نے اس فردوس خطہ پر جہاں کے گوشے گوشے میں ہماری محبت کا راز پنہاں تھا، اپنے مستقبل کے متعلق شاندار پروگرام ترتیب دیا، اور دلوں میں جذباتِ محبت کا بے پناہ طوفان لئے ہوئے بھیگی ہوئی پلکوں کے ساتھ رخصت ہوئے)

دوسرے دن میں اپنے خاندان کے ساتھ دہلی پہنچا۔ والدہ اور خالہ کانپور چلی گئیں، اور میں علی گڈھ چلا آیا۔ سرما کی چھٹیوں میں کلکتہ پہنچ کر میں نے بتول سے کئی ملاقاتیں کیں، اب ہمارے دلوں پر جذباتِ محبت کے نقوش اس قدر گہرے ہوتے گئے کہ تا دمِ مرگ محو نہیں ہو سکتے۔

والدہ کانپور پہنچ کر پھر علیل ہوگئیں، والد کی بے وقت موت نے انہیں کہیں کا نہ رکھا، اطلاع ملنے پر میں فوراً کانپور پہنچا، یوں تو والدہ کی تیمارداری میں گھر کے تمام لوگ مصروف رہتے، لیکن صبیحہ زیادہ تر اُن کی خدمت میں لگی رہتی، ایک رات وہ میرے ساتھ زیادہ رات تک جاگتی رہی۔

"ارے یہ لڑکی" والدہ نے کہا، سوئیگی بھی یا نہیں"

"صبیحہ، میں نے کہا" اب تم چلی جاؤ —— میرے کہنے پر وہ چپ چاپ چلی گئی۔ "میری تو تمنا ہے کہ بہت جلد اس کو اپنی بہو بنالوں" اماں نے کہا،

"میں چونک پڑا —— لیکن امّی —— ابھی تو مجھے پڑھنا ہے"

پڑھائی کا کیا؟ —— یہ تو عمر بھر لگا ہے، بات معقول تھی، میرے دل پر گھونسا لگا، آخر وہی بات آئی، جس کا مجھے کھٹکا لگا ہوا تھا، خیال ہوا نینی تال کا سارا واقعہ ماں سے کہدوں، وہ تو بیماری میں اٹھ لیں گی، یہ خیال کرکے چپ ہو رہا۔ میرے چہرے پر فکر کے آثار دیکھ کر والدہ نے کہا، تمہیں نیند آگئی ہوگی جاکر سو رہو، رات بھر مجھے نیند نہ آئی، آتی بھی کیسی؟ دل و دماغ روحی اذیت میں مبتلا تھے، "محبت اور فرض" ان میں سے میں کس کو ٹھکرا دوں، اسی کش مکش میں اُجالا ہوگیا، صبح درد کی شدت سے سر پھٹا جا رہا تھا، دیر تک میں اپنے بستر پر کروٹیں بدلتا رہا۔ صبیحہ کسی ضرورت کے تحت ادھر سے گذری، میں نے اسے دیکھ کر آواز دی "صبیحہ! ماں کی طبیعت کیسی ہے؟

"آپ کو پوچھ رہی تھیں"

"سر میں بڑا درد ہے، اس لئے نہ جا سکا" میں نے کہا۔

وہ گئی —— اور ایک منٹ کے بعد سر کو لگانے کی دوا لے آئی —— اسے لگائیے، رکھ جاؤ، دوا کو میز پر رکھ وہ چپ چاپ چلی گئی —— دو تین دن سے ماں کی طبیعت سنبھل گئی —— میں اُن سے اجازت لے کر علیگڈھ چلا آیا۔

میرے کانپور سے علی گڈھ آنے کے ایک ہفتہ بعد موں کا تار ملا "والدہ کا مزاج پھر دفعتاً بگڑ گیا ہے" تار لے کر اجازت حاصل کرنے کے لئے چانسلر صاحب کے پاس پہنچا، مگر امتحانات کی وجہ سے اجازت نہ مل سکی، آہ اس کے دوسرے دن مجھے والدہ کے انتقال کی اطلاع ملی۔ فوراً میں کانپور پہنچا، میرے وہاں پہنچنے تک کچھ بھی نہ تھا سوائے ..تا

سپرد خاک ہو چکا تھا۔ دنیا میں اب میں یکا و تنہا رہ گیا بجز والدہ کی یاد کے اور کیا میرے پاس موجود تھا، میں کانپور میں زیادہ نہ ٹھیر سکا، وحشت اور دیوانگی سی مجھ پر طاری ہونے لگی، ماموں بھی کچھ بیمار تھے۔ سارے گھر میں صرف صبیحہ تھی، جو کچھ کر سکتی تھی، رخصت کے وقت وہ مجھ سے ملی، اس کی آنکھوں سے جمنا گنگا بہہ رہے تھے، آہ غریب لڑکی، والدہ کے انتقال نے اُسے بھی کافی متاثر کیا تھا سکونِ قلب کی تلاش میں میں کلکتہ پہنچا، بتول بھی والدہ کے انتقال کی خبر سن کر بہت زیادہ متاثر ہوئی، وہاں کوئی ایک ہفتہ گزار کر علی گڈہ چلا آیا، رخصت کے وقت بتول نے ضرورت سے زیادہ آنسو بہائے، اس کا خیال ہے کہ اب وہ زیادہ دن میری جدائی میں برداشت نہیں کر سکتی، اُس نے قطعی طور پر میری ہو جانے کا فیصلہ کر لیا ہے، اور اس کی یہ آواز والدین کے کانوں تک پہنچ چکی ہے، علی گڈہ پہنچکر بھی سکون و راحت کی دولت نصیب نہ ہو سکی، آہ ایک سال کے اندر میری دنیا میں بیسیوں انقلابات آئے، اب میں اپنے مستقبل کے متعلق غور کرتا ہوں وہ حد درجہ تاریک و خطرات سے بھرا ہوا نظر آیا صبیحہ کے متعلق والدہ کی نصیحت اور بتول سے شادی کرنا، یہ دو چیزیں میرے لئے عجیب کش کش کا باعث تھیں حیران تھا کہ مجھے کیا کرنا ہوگا، ایک دو مہینے تک میں اسی ادھیڑ بن میں رہا۔ آخر محبت فرض پر غالب آگئی۔ اس قسم کی میں نے ایک تحریر ماموں کے پاس روانہ کی "مجھے اس کا افسوس ہے کہ بعض حالات کے تحت میں اپنی والدہ کی نصیحت پر عمل نہ کر سکوں گا، بہتر یہ ہوگا آپ مجھ بدنصیب کو اپنی فرزندی میں لینے کا ارادہ فرمائیں" اسکے جواب میں مجھے صبیحہ کی تحریر ملی، جو ماموں کے انتقال کی اطلاع لئے ہوئے تھی، مجھے مجبوراً کانپور جانا پڑا، صبیحہ تمام رات میرے پاس بیٹھی روتی رہی، آہ بدنصیب لڑکی، بچپن میں ماں کی محبت سے محروم، ایک چہیتی پھوپی تھی اور وہ بھی اللہ کو پیاری ہو گئی، اور ایسے میں باپ بھی چھوڑ کر چلا گیا،

اب مجھے اُس کی ذات سے قدرے ہمدردی سی پیدا ہو گئی تھی، میں نے صبیحہ سے بہت کچھ حالات کہدیئے، بتول کی محبت اور اپنا ارادہ بھی ظاہر کر دیا۔ صبیحہ نیک اور بلند و پاکیزہ جذبات کی مالک تھی، اُس نے جواب دیا، "بتول ایک خوش نصیب لڑکی ہے، جو آپ کی کائنات پر چھا گئی مجھے آپ سے کوئی شکوہ ہے اور نہ گلہ، رونا تو تقدیر کا ہے جو آپ کو اپنا نہ بنا سکی، تعلیم اس قسم کی دی گئی تھی، بتول آپ کی محبت کی حقدار ہے، آپ بخوشی اس سے شادی کر سکتے ہیں، لیکن براہ خدا ان مسرتوں اور محبت کے صدقہ میں مجھے بھی کچھ بھیک دیجئے، اللہ مجھے اپنے پیروں کے پاس پڑا رہنے دیجئے، میں کچھ نہیں چاہتی، صرف آپ کی قربت"، وہ رو رہی تھی، اس کا سارا بدن ہچکیوں سے لرز رہا تھا، "سچ بتلائیے، وہ کہے جا رہی تھی، اب دنیا میں میرا کون ہے، صرف آپ" "صبیحہ" میں نے بے قرار ہو کر کہا، کیا کہہ رہی ہو تم۔ زیادہ اداس اور دلگیر نہ ہو، مجھے اپنی عزیز ترین ماں کی نصیحت کا بڑا خیال ہے، مجھے افسوس ہے کہ میں نے اتنے دنوں تک تمہیں جاننے کی کوشش نہیں کی" "نہیں" "یہ میرا قصور ہے" صبیحہ آنسو پاک کرتے ہوئے بولی، "جو آپ کو اپنا نہ بنا سکی"، خیر! ان باتوں کو جانے دو صبیحہ صبح کا بھٹکا ہوا شام کو گھر آگیا، اب صبیحہ اور بتول میری دونوں آنکھیں ہیں، اور یہ آنکھیں میرے لئے نعمت غیر مترقبہ ہیں جن کو میں اپنی زندگی میں تم سے علحدہ نہیں کر سکتا، بتول کو فوراً کانپور بلا لیا گیا۔ واقعات کی حقیقت کا اظہار میں نے نہیں صبیحہ نے کیا۔ اور بتول صبیحہ کی طرح میرے لئے قربانی دینے تیار تھی، بہت جلد وہ ایک دوسرے کی پرستار بن گئیں۔ اور میں اُن دونوں دیویوں کا پجاری بن گیا، اُن کے اصرار پر مجھے اپنی ادھوری تعلیم جاری رکھنی پڑی، اور مجبوراً یہاں چلا آیا۔ ایک ہفتہ ہوا مجھے ان کی تحریر ملی ہے۔ اُن میں سے ایک کہتی ہے "اب ہمیں ایک دوسرے کیلئے ساتھی مل گئے ہیں، ہمیں آپ کی اتنی ضرورت نہیں"، دوسری کہتی ہے "آپ کب آئیں گے"، دوستو! وہ دونوں حق بجانب ہیں لیکن مجھے تو ان کی ضرورت ہے۔

—— یہ رہی میری الاپنی کہانی

صابر کوسگومی

بلّیاں

کہا جاتا ہے کہ کسی زمانہ میں ملک اٹلی میں ایک شخص تھا جس کا قول تھا کہ جانور خواہ کسی نوع کے ہوں قابلِ احترام ہیں کیونکہ خدا نے انہیں بنایا ہے۔ عوام نے اس شخص کی بات کو ایک عرصہ تک تسلیم نہیں کیا۔ اور وہ کرتے بھی کیسے؟ وہ ایک ایسی نسل سے تھے جس کو جانوروں کے مار ڈالنے میں مزا آتا تھا۔ اور وہ آئے دن اس شغلہ میں منہمک بھی رہا کرتے۔ اس پر ہی ختم نہیں بلکہ اس نسل نے یہاں تک ترقی کی تھی کہ آدمیوں کو مار ڈالنا اُن کا اس سے بھی زیادہ خوش گوار شغلہ تھا۔ اور آدمیوں کا ایک دوسرے کو قتل کرتے ہوئے دیکھنا وہ دنیا کا ایک دلچسپ ترین کھیل خیال کرتے تھے۔ وہ سمجھ ہی نہ سکتے تھے کہ جانور مقدس کیسے ہو سکتے ہیں۔ ایسی چیزیں جو کبھی بھیڑ بکریاں کہلاتی ہیں وہی کسی وقت گوشت کہلاتی ہیں اور کھانے پکانے کی غرض سے تول سے بازار میں بکتی ہیں۔ ان کو تقدس سے کیا تعلق۔ تقدس اور احترام کا یہ پرچارک جب کبھی بازاروں سے گزرتا تو لوگ اس کا مذاق اُڑاتے اور پھبتیاں کستے۔

ایک مرتبہ ایسا ہوا یہی شخص بستی میں سے گزر رہا تھا اور اس کے پیچھے ایک بھیڑیا آہستہ آہستہ جا رہا تھا۔ اس بھیڑئے نے شہر کے خدا جانے کتنی ہی بکریاں اور آدمیوں کے بچے ہضم کئے تھے۔ چلتے چلتے یہ شخص بستی کی شاہ راہ سے ہوتا ہوا ایک بڑے چوک میں ایک گرجا کے قریب پہنچا۔ بھیڑیا بھی اس کے ساتھ ہی لنگڑاتا لنگڑاتا ہانپتا کانپتا آ پہنچا۔ چوک کے درمیان غارہ کا ایک ستون تھا اور اُس ستون پر پتھر کی ایک صلیب بنی ہوئی تھی۔ ہمارا دوست صلیب کی سیڑھیوں پر چڑھ گیا۔ بھیڑیا بھی اس کے پیچھے ہی پہنچا اور دو پیروں پر کھڑا ہو کر بہت معصوم آوازیں چوطرف دیکھنے لگا۔ اس عرصہ میں چوک میں بہت سے لوگ جمع ہو گئے تھے۔ جب مجمع ذرا بڑا ہو گیا تو بھیڑئے کے ساتھی نے ایک وعظ شروع کیا جو بہت دیر تک جاری رہا۔ اس وعظ کا خلاصہ یہ تھا کہ جانوروں کے ساتھ اچھا سلوک کرنا چاہئے۔ خصوصاً بھیڑیوں کے ساتھ کہ وہ خاص خدا کے بنائے ہوئے ہیں۔ غالباً لوگوں نے اس شخص کی بات قبول کر لی تھی۔ کیونکہ کچھ دنوں کے بعد جب وہ مر گیا تو ایک بڑے گرجا میں اس کی لاش دفن کی گئی اور اُس پر دو گرجاؤں کا اور اضافہ کیا گیا۔ اب میرا تو یہ ایمان ہے کہ یہ اسی شخص کی دعا تھی کہ فلارنس کے سان لارنزو (San Lorenzo) کی خانقاہ اور باغ میں ایک سو پرتین بلّیاں پل رہی ہیں اور کیوں نہ پلیں؟ سینٹ فرانسس کہہ گیا ہے کہ جانور تمام مقدس اور قابلِ احترام ہوتے ہیں۔ ہاں بے شک جانور مقدس ہیں لیکن بلیوں کے بچے بھی تو ہوتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ سینٹ فرانسس کے مقولہ پر جو ایمان لائے وہ ان لوگوں کے گناہوں کا کفارہ ادا کر رہے ہیں جو ایمان نہیں لائے۔

سان لارنزو کے پجاری اور خادم سینٹ فرانسس کے مقولہ پر ایمان رکھتے ہیں اور اب میرا خیال ہے کہ ایک زمانہ تک انہیں یہ بھگتان بھگتنا پڑے گا۔

یہ خانقاہ خاصی بڑی اور کشادہ ہے اور اس کے اطراف ایک برآمدہ چوطرف چلا گیا ہے۔ درمیان میں خوش رو گھاس

کا ایک تختہ ہے جس میں سرو کے درخت جا بجا لگے ہوئے ہیں۔ خانقاہ کی دیواریں اس قدر بلند ہیں کہ اوپر کی طرف نظر کی جائے تو آسمان ایک چوگوشہ ٹکڑے کی طرح کٹا ہوا نظر آتا ہے۔ برآمدہ کے متصل جگہ جگہ بادامی رنگ کے دروازے نظر پڑتے ہیں اور ہر دروازہ کے بازو پر اُس پادری کا نام اور دیگر تفصیلات ہیں جو اس کے اندر مکین ہے۔ یہ بالکل اسی اصول پر ہے جیسا کہ ویسٹ منسٹر میں ڈین کے احاطہ میں پایا جاتا ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ اس جگہ پادری اور بلیاں زیادہ ہیں۔

پادری خانقاہ کے اندر رہتے ہیں۔ بلیاں گھاس کے تختہ پر رہتی ہیں اور بعض اوقات وہیں مر بھی جاتی ہیں۔ پادریوں کی عادات کا میں نے کچھ زیادہ مطالعہ نہیں کیا۔ لیکن بلیاں بالکل ملول، اور اگر یہ نہ کہا جا سکے کہ اُن کے چہروں سے کسی غیر معمولی غم والم کی مرجھاہٹ عیاں تھی تو کم از کم وہ سب کی سب صحت مند نہ تھیں۔ لڑنے جھگڑنے سے اُنہیں کوئی تعلق نہ تھا۔ میں نے کبھی اُن کی وہ لمبی روتی ہوئی آہیں اور وہ تنہائی کی دل گرفتہ لیکن سُریلی کراہیں نہیں سنیں، جو ہماری معمولی بلیوں کا چاندنی یا اندھیری راتوں میں اگلے یا پچھلے پہر ایک ضروری مشغلہ ہوا کرتا ہے۔ ان میں وہ قناعت آمیز بے فکری بھی نظر نہ آتی تھی جو ہم کسی بہار کی صبح کھڑکی کی چوکھٹ پر بیٹھی ہوئی بلی میں دیکھ سکتے ہیں — وہ اس کی گول گول پیٹھ اور پاک صاف ریشمی دُم بگلا کے سے سفید سینے سے نکلے ہوئے سفید بے داغ پیر، نیم وا آنکھیں جو کبھی کبھی اس بے ڈھنگی اور بے وقوف دنیا سے زِچ ہو کر بند کر لی جاتی ہیں، اُس میں گو افسردگی ہے، لیکن معتدل اور خوشگوار ہے اور جس سے ایک ایسا فلسفہ ٹپکتا ہے جس میں رنج اور خوشی کو خاص توازن کے ساتھ شامل کیا گیا ہے۔

لیکن سان لارنزو کی خانقاہ میں کچھ اور ہی رنگ تھا۔ شہر کی دھوپ اور گرد و غبار سے گھبرا کر میں ایک دن اس خانقاہ میں کسی قدر سستانے کے لئے آنکلا تھا۔ میں نے دیکھا کہ ان بلیوں میں سب سے زیادہ چاق و چوبند بلی کو بھی وہ یک سُوئی نصیب نہیں ہے۔ سرد اور مرطوب اندھیروں اور پگھلا دینے والی دھوپ میں یہ اُداس اُداس سی پھرتی رہتی ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فاقہ کش بلیوں کی یہ بے چین اور آوارہ روحیں ہیں جنھیں کسی جگہ بھی قرار نہیں ہے۔ یہ رنگا رنگ کی ہیں۔ بھڑک دار زعفرانی، سیپی کے رنگ کی اور ایک آنکھ پر نمایاں سفید داغ، بھورے بادامی اور جامنی کے ملے جُلے رنگ، چھینٹے دار اور چت کبرے، پٹوں دار اور یکساں سفید اور کالی۔ لیکن وہ پُر اسرار مُردنی جو اُن کے بدن اور چہروں پر چھائی ہوئی تھی اُس نے اِس تمام بوقلمونی پر اوس ڈال دی تھی۔ اُن کی بھڑک آنکھوں کو چھپتی تھی اور اُن کی نفاست نے ماتمی لباس پہن لیا تھا۔ کوئی بلی بھی یہ توقع نہ کر سکتی تھی کہ اس کی کوئی قیمت ہو سکے گی۔ ایک جگہ سے دوسری جگہ بے ارادہ پھرنا اُن کا مشغلہ تھا چھجے کے پتلے سے پتلے کنارہ پر وہ بے لغزش اور بے آواز پا گزر جاتیں بے نیازی اور لاپروائی انتہا کی تھی۔ کبھی کبھی اتفاق سے کسی موڑ پر ایک دوسرے سے چھو کر گزرنا بھی ہو جائے تو کوئی توجہ نہ کی جاتی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ایک دُھن اور ایک مقصد نامعلوم ہے جس کی گہرائیوں میں اردگرد کی چیزیں غرق ہو چکی ہیں۔ کوئی بلی بھی اپنے ساتھی کے لئے ایک نگاہِ غلط انداز کی روادار نہ تھی اور نہ کوئی مہربانی یا عتاب ہی کی علامت ایک دوسرے کے لئے دیکھنے میں آتی تھی۔ اُن ایک سو پر تین بلیوں میں ایک بھی ایسی نہ تھی جو یہ نہ سمجھ چکی ہو کہ بقیہ ایک سو دو اس خانقاہ میں موجود نہیں ہیں۔ کتنی روح فرسا یہ حقیقت ہے۔ کیا ان میں انسانیت نام کو نہ تھی؟

یہ بے زبان اور لاوارث ہستیاں شہر کی گلی کوچوں سے ہنکائی ہوئی اس عالم گیر جائے پناہ میں بسیرا کرتی ہیں۔ یہ گویا مو کھ پتھے ہیں جو

"جھاڑ سے چار و ناچار گر جاتے ہیں۔ ایک نوالا روٹی کے لئے یہ کونا کونا پھرتی ہیں اور ایک دوسرے کو دم توڑتا ہوا دیکھ کر اُن کے مُنہ سے ایک "میاؤں" تک نہیں نکلتی۔ میں سینٹ فرانسس کو اگلے وقتوں کا ایک حکیم اور دانا خیال کرتا تھا لیکن میرے خیال کی تردید ہوگئی۔

اس وقت دن کے دو بجے تھے میں اُن کی بے معنی گھما گھمی گھنٹہ بھر تک دیکھتا رہا۔ ناگہاں میں نے محسوس کیا کہ یہ جانور چار دل طرف سے میرے قریب ہوتے جارہے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گھاس کے تختہ پر صف بہ صف یہ میری طرف بڑھ رہے ہیں۔ میرے اور اُن کے درمیان صرف ایک گڑھا تھا جو برآمدہ سے متصل چلا گیا تھا۔ میں برآمدہ پر کھڑا تھا۔ اور یہ گھاس کے تختہ پر۔ کامل ایک سو تین بُجھی ہوئی مایوس اور ہراساں بلیاں میری طرف گھور رہی تھیں۔ اُن کی بے نور حلقہ زدہ آنکھیں میرے جسم میں چُبھی جارہی تھیں۔ دو سو دو آنکھوں (ان میں سے چار صرف ایک ہی آنکھ سے کام چلاتی تھیں) کی برداشت میرے بس سے باہر تھی۔ حالانکہ میں ایک جہاں دیدہ شادی شدہ اور بال بچوں والا آدمی ہوں میں بھاگ جانے کی راہ تلاش اور حواس مجتمع کر رہا تھا کہ میں نے دروازہ میں قدموں کی چاپ سُنی۔ ایک عورت ہاتھ میں ایک سیاہ چرمی تھیلا لئے ہوئے آرہی تھی۔ ہو نہ ہو وہ کسی اور بلی کو اس گروہ میں شامل کرنے لا رہی ہوگی تاکہ روز روز کی بُش ہاش اور نصیحی سے خاندان آزاد ہوسکے۔ یہ تو ہرگز ممکن نہیں کہ وہ ان میں سے ایک آدھ بلی کو مستعار لے جانا چاہتی ہو۔ لیکن بات کچھ اور تھی۔ وہ بڑے اطمینان سے آگے بڑھی اور ہمارے اِن رفقا کی طرف مربیانہ انداز سے مسکرانے لگی۔ بلیاں اس کو مجھ سے بہتر جانتی تھیں۔ عورت بظاہر غریب لیکن اپنے صاف سُتھرے سیاہ لباس میں خوبصورت نظر آرہی تھی خصوصاً اُس کی وہ بانکی ترچھی ٹوپی جو سفید بالوں پر مرصع کاری کر رہی تھی خوب تھی۔

عورت نے تھیلے سے کاغذ میں لپٹی ہوئی کوئی چیز نکالی۔ اپنی آستینیں چڑھائیں اور ایپرن باندھا۔ اس عرصہ میں بلیوں کی بے صبری قابلِ دید تھی۔ اُن کی دُموں کی حرکت سے فضا میں تموج پیدا ہو رہا تھا اور میاؤں میاؤں کا ایک مشترکہ مسلسل شور خانقاہوں کی دیواروں سے ٹکرا رہا تھا۔ اُن کے پنجے فضا میں اُٹھتے اور خطرات بارش کی موسیقی کے ساتھ زمین پر آرہتے۔ ایک مکار نے تو حد کر دی۔ یہ کانی بلیوں کی ٹولی سے تھی۔ کسی طرح گرتی پڑتی صفوں کو چیرتی ہوئی یہ آگے بڑھی اور اس کاغذ میں لپٹے ہوئے تحفہ پر منہ مار ہی دیا۔ لیکن عورت نے چابکدستی سے ایک ہتڑ اس کے رسید کیا جو پسپائی کے لئے کافی تھا اور وہ کان کھجاتے ہوئے واپس ہوئی۔ عورت نے کاغذ میں سے مزیدار سی کھانے کی کوئی چیز نکالی اور اب تقسیم کا عمل شروع ہوا۔

بلی عام طور پر بہت سُست رفتار سے کھاتی ہے اگرچہ اپنے حصہ کو بڑے تیز جھپٹے کے ساتھ اُچک لیتی ہے۔ سانپ کے بل کی طرح ایک جھٹکا لگایا اور نوالہ اُس کا ہوگیا۔ اس کے بعد وہ اطمینان سے زمین پر لیٹ جاتی ہے۔ سر جُھک جاتا ہے، دُم کھینچ لی جاتی ہے اور آنکھیں بالکل بند کر لی جاتی ہیں۔ یہ ہیں وہ آدابِ دستر خوان جو ایک شریف اور خوش باش بلی کے ہوتے ہیں۔

لیکن مقام افسوس ہے کہ کئی دن کی صبر آزما گشت اور بہت سی ناکام گھاتیں ان ایک سو تین کی صلاحیت اور سلیقہ کا خاتمہ کر چکی تھیں سچ پوچھو تو اس وقت اُنہوں نے شرمناک مظاہرہ کیا۔ تلچھٹ بھی ملا تو اس پر یہ قحط زدہ کی طرح گریں، اس پر پنجے بے ضرورت مارے۔ بے نور آنکھیں کُھلی کی کُھلی ہیں اور ایک ہی نوالہ میں ہڑپ کر گئیں۔ اس تناول ماحضر کے درمیان غرغراہٹ حلقوم سے اس طرح نکلتی تھی

جیسے بجلی کی کڑک کسی کوہستان میں سنائی دیتی ہے ۔ وہاں اپنی باری کا انتظار کہاں تھا ۔ وہ دیر تک کھانے کا مزہ لیتے رہنے کے لئے ہونٹوں اور مچھوں کو چاٹتے رہنے کا خیال کیسے تھا ! اور پھر کھالینے کے بعد وہ عادتی کھیل کی فرصت کیسے تھی ۔ وہ یہاں بھی ہر وقت کی سی بے چین اور آتش زیر پا تھیں ۔

اُن کی دعوت کا سماں کسی اُداس اور سنسان گرجا میں غول بیابانی کی بدمستیوں کی یاد دلا رہا تھا ۔

(ترجمہ) از ماریس ہیولٹ ۔ نجم الدین انصاری

آمد

نقابِ ریشمیں ہاتھوں سے سرکاتے ہوئے آئی
سیہ خانے میں میرے نور برساتے ہوئے آئی
طلوعِ ماہِ سیمیں کا گماں ہونے لگا مجھ کو
جبینِ ناز کو اس طرح چمکاتی ہوئی آئی
زہے قسمت جسے عادت تھی مجھ سے منہ چھپانے کی
بہارِ لالۂ رُخسار دکھلاتی ہوئی آئی
کوئی اس کے خرامِ ناز کا انداز تو دیکھے
تجلّی رقص کرتی برق لہراتی ہوئی آئی
لباسِ ریشمیں کو اُس کے گر پیمانہ کہہ لیجے
شرابِ حسنِ پیکر اس سے چھلکاتی ہوئی آئی
اداؤں سے محبت کا سبق دیتی ہوئی پہنچی
نگاہوں سے حیا کے پھول برساتے ہوئے آئی
مرے اشعار کی تفسیر اس کا پیکرِ رنگیں
مجھی کو وہ مرے اشعار سمجھاتے ہوئے آئی
اسی کی سانس خوشبو بن کے سنبلستان میں رہتی ہے
فضا کو اس کی اک اک سانس مہکاتے ہوئے آئی
خموشی اس کی دلکش تھی کہیں حسنِ تکلم سے
وہ چپ ہونے پہ بھی اک راز سمجھاتے ہوئے آئی

راجہ مہدی علی خاں

غزل

مجھ سے دنیا کو بدگمانی ہے
نوجوانی ہے نوجوانی ہے
دل ہے اور موسمِ جوانی ہے
آرزوؤں کی حکمرانی ہے
غم نہیں روحِ شادمانی ہے
موت ہی اصلِ زندگانی ہے
جس کا عنواں ہے گریۂ حسرت
ہمنشیں وہ مری کہانی ہے
سُرخیاں بہ رہی ہیں عارض پر
کتنی رنگین نوجوانی ہے
پھر سے نظریں ملائیے تو سہی
ہر نظر میں نئی کہانی ہے
جور مجھ پر نہیں کرم ہے رشیدؔ
غم نہیں اُن کی مہربانی ہے

رشید احمد رشیدؔ (عثمانیہ)

ہندوستان کے فقیر اور سادھو

ہندوستان میں فقیروں اور سادھوؤں کی اتنی کثرت ہے کہ معاذاللہ۔ عام ہندوستانی خواہ وہ غریب ہوں کہ امیر۔ کسی فقیر کے سوال کو رد کرنے سے ڈرتے ہیں۔ کیونکہ اس کو وہ مذہبی گناہ سمجھتے ہیں۔ مسلمان ہوں یا ہندو۔ دونوں یہ خیال کرتے ہیں کہ فقیروں کے سوال کو پورا کرنا اور کسی نہ کسی طرح ان کی مدد کرنا ثواب ہے۔ جب کوئی سادھو یا فقیر کسی کے در پر جا نکلتا ہے اور صدا لگاتا ہے :۔

"دے داتا تیرے بچوں کی خیر"

اگر وہ مجبوری کے تحت اس سوال کو پورا نہ کر سکیں اور وہ خالی ہاتھ اُن کے در سے واپس چلا جائے تو انہیں بہت بُرا معلوم ہوتا ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ اس کے ساتھ ان کے گھروں کی برکت بھی چلی جاتی ہے۔ مسلمانوں کے یہاں یہ تک ہوتا ہے کہ جب کوئی فقیر اُن کے در پر آکر سوال کرے تو وہ پہلے اس کو شکم سیر کرنے کی فکر کرتے ہیں۔ وہ یہ تک خیال نہیں کرتے کہ اگر فقیر کا پیٹ بھر دیا جائے تو خود اُن کا پیٹ خالی رہ جائے گا۔ ایسا کرنے میں وہ بڑا مرتبہ سمجھتے ہیں۔ مشرقی لوگوں کا یہ عقیدہ ہے کہ پہلے غریبوں کا پیٹ بھرو۔ بعد اپنی اپنی فکر کرو۔

"اوّل درویش بعد خویش"

ہمارے پاس ایسے نمونے بھی ہیں کہ پہلے زمانے میں بزرگ اور خدا رسیدہ لوگ جن کے علم اور معرفت کا دور دور چرچا تھا، ان میں سے بعض خدا کے خاص پیغمبر بھی تھے جن کا یہ خیال تھا کہ وہ دو دو روز فاقہ کرتے تھے۔ پہننے کو برابر کپڑا میسر نہیں آتا تھا۔ اس کے باوجود جو کچھ مل جاتا صبر اور شکر کے ساتھ کھا لیتے اور خدائے تعالیٰ کی یاد میں مشغول ہو جاتے۔ جس وقت وہ کھانا کھاتے اگر کوئی فقیر آکر سوال کرتا تو وہ فوراً جو دے سکتے اس کو دے دیتے اور خود بھوکے رہ جاتے۔ اسی طرح ہندو مذہب میں بھی سادھوؤں اور فقیروں کا بڑا احترام کیا جاتا ہے۔ انہی وجوہ کی بنا پر ہندوستان میں فقیروں کی تعداد اتنی زیادہ ہے کہ دنیا کے شاید ہی کسی اور ملک میں ہو۔ کہنے کو تو سب ہی فقیر کہلاتے ہیں، لیکن فقیر فقیر میں فرق ہوتا ہے۔ فقیروں کی کئی قسمیں ہیں مثلاً معذور، پیشہ ور، مجبور، مجذوب وغیرہ۔

معذور فقیر وہ ہیں، جن کے ہاتھ پاؤں نہ ہوں۔ یا وہ آنکھوں سے معذور ہوں۔ یا فالج کے اثر سے کسی کام کے ناقابل ہو گئے ہوں۔ بعض لوگ پیدائشی معذور ہوتے ہیں۔ بعض غریب لوگ اپنے بچوں کو جو اچھے خاصے تندرست ہوتے ہیں، اپنا پیٹ بھرنے کا ذریعہ بنانے کے لئے معذور بنا دیتے ہیں۔ مثلاً آنکھیں نکال دیتے ہیں۔ یا ہاتھ پاؤں توڑ ڈالتے ہیں۔ غرض کسی نہ کسی طرح اُن کو بچپن ہی سے کارکے ساتھ لئے دربدر بھیک مانگتے پھرتے ہیں۔ بعض وقت ایسے معذوروں کو ایک چھوٹی سی گاڑی بنا کر اس میں بٹھا دیتے ہیں یا لکڑی کا جھولا بنا کر رسیوں سے باندھ کر اس کے اندر بٹھا دیتے ہیں۔ اور خود اس جھولے کو لے کر گلی گلی پھرتے ہیں۔ لوگ ان کی حالت پر رحم کھا کر ان کو پیسے، کپڑا لتا جو خدا دے دیدیتے ہیں۔ اس طرح ان کے پاس کافی پیسے روزانہ جمع ہو جاتے ہیں۔ بعض وقت پر فقیر اتنا کما لیتے ہیں جس سے چار، پانچ آدمی اچھی طرح پیٹ بھر کر کھا سکتے ہیں۔ یہ بھیک ہی کی لعنت ہے کہ وہ ایک ہونہار ہستی کو دنیا کی تمام لذتوں سے محروم کر کے اس کی معذوری کی نمائش کرتے اور لوگوں کے رحم کو اپنی معاش کا

ذریعہ بناتے پھرتے ہیں۔

پیشہ ور فقیروں کی قسم سب سے بدتر ہوتی ہے۔ وہ کاہل اور سست انسان ہوتے ہیں محنت کرنا نہیں چاہتے بلکہ لوگوں کے ٹکڑوں پر زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں، محنت مزدوری سے جو تکلیف ہوتی ہے اس سے بچنے کے لئے وہ یہ سارا ڈھونگ رچاتے ہیں۔

بعض فقیر خاندانی ہوتے ہیں۔ اور کسی مشہور تارک دنیا درویش صفت بزرگ سے اپنا سلسلہ جوڑ لیتے ہیں۔ اُن کے ٹھاٹ، آن بان اور فقیری شان دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ رنگ برنگ کے لباس وضع وضع کی شکلیں۔ کسی کا گیروا لباس ہے تو کسی کا ہرا بانا ہے۔ ڈاڑھیاں، پٹیاں خاص انداز سے جمی ہوئیں، صاف ستھرا لباس پہنے، عمامہ باندھے، ہاتھ میں عود بتیوں کا کٹا یا عود دان، یا چراغ لئے، اپنے خاص خاص گیت گاتے پھرتے ہیں۔

ایسے فقیروں کی بے شمار قسمیں ہیں۔ ان میں رفاعی نقشبندی بہت مشہور ہیں۔ رفاعی فقیر حضرت سید احمد رفاعی سے منسوب ہیں۔ ان کا بھیک مانگنے کا طریقہ سب سے نرالا ہوتا ہے۔ وہ ضربیں لگا کر مانگتے ہیں۔ کسی دکان پر جاتے ہیں اور اپنی آنکھ گرز کی نوک سے باہر نکال کر یا تلوار سے زخم لگا کر گالوں اور پیٹ میں سیخ چبھا کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اور جب تک اُن کی مقررہ بھیک نہ مل جائے وہاں سے نہیں ٹلتے۔

نقشبندی فقیر عموماً جمعرات کو ایک شمع لے کر نکلتے ہیں اور جو پیسہ دے، اس کی کنپٹی پر کاجل کا ایک ٹیکہ لگا دیتے ہیں۔ جو برکت یا حفاظت کا ٹیکہ ہے۔

مجبوری سے جو لوگ فقیری کا پیشہ اختیار کرتے ہیں، وہ بڑے بدنصیب ہوتے ہیں۔ بعض وقت یہ مجبوری کسی جسمانی نا اہلی کے سبب ہوتی ہے۔ اور کبھی دماغی۔ وہ ایسی بیماریوں میں بھی مبتلا رہتے ہیں جس کی وجہ سے لوگ ان کو اپنے پاس تک رکھنا تو درکنار، گھر کے اندر تک نہیں آنے دیتے۔ یہ بیماریاں عموماً جذام، سرسام، گٹھیا وغیرہ ہیں۔ جذام والے کے متعلق تو یہ حکم ہے کہ اس کو برچھے کی انی پر رکھ کر روٹی دی جائے۔ غرض ایسی بیماریوں میں مبتلا لوگوں کو مجبوراً بھیک مانگنا پڑتا ہے بعض لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جن کو بھیک مانگتے ہوئے شرم آتی ہے۔ مگر مجبوری ایسی شے ہے جس کے آگے انسان سب کچھ کرنے پر تیار ہو جاتے ہیں۔

مجذوب ان لوگوں کو کہتے ہیں۔ جو بظاہر دیوانوں کی طرح زندگی بسر کرتے ہیں۔ اور خانہ بدوشی کی زندگی گزارتے ہیں۔ بعض لوگ ابتدا میں اچھے خاصے ہوتے ہیں۔ لیکن بعد میں مجذوب ہو جاتے ہیں۔ لیکن ہر دیوانہ مجذوب نہیں ہو سکتا۔ مجذوب مجذوب میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ بعض لوگ خواہ مخواہ اپنے آپ کو مجذوب بنا لیتے ہیں۔ یہ لوگ سڑکوں پر شور مچاتے پھرتے ہیں۔ موٹروں اور گاڑیوں کے سامنے کھڑے ہو جاتے ہیں اور کہتے ہیں "کچھ دیدے تیرا بھلا ہوگا"، "یا بڑی نوکری مل جائے گی" یا "ہم کو اجمیر کے خواجہ بلا رہے ہیں۔ ٹکٹ دلا دے خدا تیرا بھلا کرے گا۔ دیکھ تیرے کو خوشی ہونے والی ہے" غرض اس طرح وہ لوگوں کو پھانسنے کی فکر میں رہتے ہیں۔ اکثر سادھو بھی یہ طریقہ اختیار کرتے ہیں۔

بعض لوگ حقیقت میں مجذوب ہوتے ہیں۔ ان کی دعا میں تاثیر ہوتی ہے جو کچھ وہ کہتے ہیں پورا ہوتا ہے۔ ایک واقعہ میں نے سنا ہے۔ لیکن آنکھوں سے دیکھا نہیں جس مجذوب کا میں ذکر کر رہی ہوں۔ وہ زندہ ہیں۔ ایک دفعہ ان کے گھر میں ان کی دادی کچھ سی رہی تھیں۔ تمام لوگ اپنے کام میں مشغول تھے۔

مجذوب صاحب نے اپنی دادی کو مخاطب کر کے کہا "اے وہاں سے ہٹ جاؤ، وہ دیوار گر جائے گی" لیکن دیکھنے میں دیوار اچھی خاصی مضبوط تھی۔ دادی پر ان کے کہنے کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ انہوں نے یہ خیال کیا کہ دیوانہ ہے۔ لیکن دیوار تھوڑی دیر میں گر گئی۔ اور بچاری دیوار کے نیچے دب کر مر گئی۔ اکثر ایسے واقعات سننے میں آتے ہیں کہ مجذوب جو کچھ کہتے ہیں وہ صحیح ہوتا ہے لیکن ع مجذوب ہی کہتے ہیں جو ہوتا ہے،

بڑے بڑے بزرگان دین دنیا سے رحلت فرماتے ہیں تو لوگ اُن کی مزار کی نگرانی کرنے لگتے ہیں۔ وہ صبح شام جھاڑو دیتے ہیں چراغ روشن کرتے ہیں۔ یہ لوگ مجاور کہلاتے ہیں اُن کی گزر کا ذریعہ وہ نذرانہ ہوتا ہے جو معتقدین چڑھاتے ہیں۔ بعض بزرگوں کے عرس بڑی دھوم دھام سے ہوتے ہیں بعض بزرگوں کے عرس تاریخ نہ ٹالنے کی غرض سے معمولی طور پر کر دیئے جاتے ہیں۔ بڑے بزرگوں کے عرس کے لئے سرکار سے سالانہ رقم مقرر ہوتی ہے۔ اور بعض وقت معتقدین کے چندوں سے یہ رسم پوری کی جاتی ہے۔

اجمیر شریف میں حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کا عرس بڑی دھوم دھام سے ہوتا ہے۔ اطراف ہند سے لوگ ہر سال زیارت کی خاطر جاتے ہیں۔ ایسے مقامات پر فقیروں کا ایک تانتا لگا رہتا ہے۔ ایسی جگہ لوگ اپنی حیثیت کے موافق فقیروں کو روپیہ، پیسہ، دھیلا وغیرہ دے کر مدد کرتے ہیں۔ ایسے موقعوں پر فقیروں کے سوال کو رد نہیں کرتے۔ اس لئے بعض فقیر وہاں عجیب عجیب طرح کی حرکتیں کرتے ہیں اور بعض وقت خوش اعتقادوں کو جیبیں خالی کراتے ہیں۔

جن بزرگان دین کی شہرت ہے وہاں جمعرات اور جمعہ کو فقیروں کا بڑا مجمع رہتا ہے۔ بہت سے لوگ عقیدت کے ساتھ جمعرات اور جمعہ کو درگاہوں پر فاتحہ پڑھنے بھی جاتے ہیں اور فقیروں کو ان کی عقیدتمندی سے فائدہ اٹھا کر مانگ کھانے کے لئے موقع مل جاتا ہے۔

اگر کسی ایک فقیر کو معلوم ہو جائے کہ فلاں مکان میں فلاں دن خیرات ہوتی ہے تو یہ خبر ایسی جلدی پھیلتی ہے کہ بس ایک اچھا خاصا مجمع اس مکان کے پاس جمع ہو جاتا ہے۔ جدھر دیکھو بھیک مانگنے والوں کا ایک اژدہام نظر آتا ہے۔

ہمارے یہاں محرم کے فقیر بہت مشہور ہیں۔ حیدرآباد کا محرم قابل دید ہوتا ہے۔ مشہور علموں کی سواریاں خاص اہتمام سے نکلتی ہیں۔ جن کو دیکھنے اضلاع کے لوگ بھی آتے ہیں۔ اس زمانہ میں بھی خیر خیرات بہت ہوتی ہے۔ اس لئے اطراف کے گاؤں کی عورتیں اور مرد بھیک مانگنے نکلتے ہیں۔ اور مرثیے پڑھ کر بھیک مانگتے ہیں۔ ان کے علاوہ اس زمانے میں امیر، غریب، شریف غرض سب فقیر بن جاتے ہیں۔ امام حسینؓ کے فقیر کہلاتے ہیں۔ یہ فقیر ہرے رنگے ہوئے کپڑے پہنتے ہیں۔ اور گلے میں آنٹیاں، جھولیاں ڈالے شان سے چلتے پھرتے دکھائی دیتے ہیں۔ یہ رسمی فقیر ہوتے ہیں۔ اور اُن کی فقیری لطف کی ہوتی ہے کیونکہ اس زمانے میں ان کو کھچڑی، قبولی، شربت، اور دٹ پونگے جیسی لذیذ چیزیں کھانے کو ملتی ہیں۔

فقیروں کی ان سب قسموں کے علاوہ ایک اور قسم مہذب فقیروں کی ہے۔ یہ لوگ صاف ستھرے اور اُجلے کپڑے پہنے سڑکوں پر گھومتے پھرتے ہیں اور جہاں کوئی شریف آدمی گاڑی میں یا پیدل نظر آگیا کہ یہ لوگ آہستہ سے

مسکین صورت بنائے اس کے قریب پہنچ جاتے ہیں۔ اور شریف آدمی کی طرح سلام کرکے رازدارانہ انداز میں کہنے لگتے ہیں "جناب ایک گزارش ہے، میں اورنگ آباد، دہلی، لکھنؤ غرض کسی دور دراز مقام کا رہنے والا ہوں" اس کے بعد ایک طویل قصہ اپنی مصیبتوں کا شروع کر دیتے ہیں۔ ایسا کہ سننے والا بیزار ہوکر پیچھا چھڑانے کے لئے روپیہ ڈیڑھ روپیہ ان کی نذر کر دے۔ کیونکہ ان کی حالت کا لحاظ کرتے اس سے کم دینے کو شرم آتی ہے۔ یہ سب سے بڑے ڈاکو ہوتے ہیں۔

بعض شریر النفس فقیر ایسے ہوتے ہیں کہ انہیں دیجئے تو اپنے ساتھیوں میں پہنچ کر آپ کو بیوقوف بناتے ہیں اور نہ دیجئے گا تو گالی دیتے ہیں۔

غرض فقیروں کی یہ اتنی قسمیں ہیں کہ ان کے متعلق ذرا ذرا بھی لکھا جائے تو ایک اچھی خاصی کتاب تیار ہو سکتی ہے۔ ان کی بے شمار قسموں کو دیکھتے ہوئے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ فقیر اور سادھو جن کو نذہباً بھیک لینے کا حکم ہے، وہ بہت تھوڑے ہیں۔ وہ کسی کو دق نہیں کرتے۔ بلکہ جو کوئی کچھ دے دے اُسے دعا دے کر قبول کر لیتے ہیں۔ اور خدا کی عبادت میں مصروف رہتے ہیں ایسے ہی فقیروں کو دینا دراصل ثواب ہے باقی اچھے خاصے تندرست لوگوں کا بھیک مانگنا اور ان کو دینا دونوں گناہ ہیں اس سے قوم اور ملک کا بڑا بھاری نقصان ہوتا ہے ایسی بے اصل بھیک کی وجہ سے کاہل اور سُست لوگوں کی ایک بڑی تعداد اس کو پیشے کے طور پر اختیار کر لیتی ہے اور وہ لوگ جن کو کچھ کام کرنا چاہئے تھا بے کار رہتے ہیں جس سے قوم کو نقصان ہوتا ہے اور آبادی کا ایک حصہ دوسرے حصے کی کمائی کو ناجائز طور پر استعمال کرکے نقصان پہنچانے کا باعث ہوتا ہے اس کا دوسرا نقصان یہ ہے کہ جو لوگ واقعی قابل رحم ہیں ان کو بھیک نہیں ملتی اور پیشے کے عیش مناتے ہیں۔

چند دنوں پیشتر سے حیدرآباد پر ہر طرف کے فقیروں اور سادھوؤں کا ایسا شدید حملہ ہو رہا ہے کہ راستے سے گزرنا، بازار جانا اور کچھ خریدنا مشکل ہو گیا ہے۔ یہ بے شرم فقیر موٹروں اور گاڑیوں کے اندر ہاتھ ڈال ڈال کر بھیک مانگتے ہیں۔ ایک سے پیچھا چھڑانے کے لئے کچھ دے دیجئے تو دوسروں کو خبر کر دیتے ہیں۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے، گاڑی کے اطراف فقیروں اور بھکاریوں کا اچھا خاصا مجمع ہو جاتا ہے۔

یہ حالت ہندوستان کے کم شہروں میں دیکھی جائے گی۔ بنارس میں بھی جو سادھوؤں کا مرکز ہے، فقیر راستہ چلنے والوں کو اس طرح دق نہیں کرتے۔ اسی کو دیکھ کر ہماری حکومت نے "قانون انسداد گداگری" ...... بنایا تھا جس کی رو سے اچھے خاصے تندرست لوگوں کا بھیک مانگنا جرم قرار دیا گیا۔ اور جو معذور تھے انہیں معذور خانوں میں بھیجنے کا فیصلہ کیا جہاں ان کی ہر طرح خبر گیری کی جاتی ہے ہٹے کٹے فقیروں کو پکڑ کر جرمانے اور قید کی سزائیں دی جائیں لیکن یہ ایسے بے غیرت ہوتے ہیں کہ انہیں اس کا بھی خوف نہیں ہوتا۔ جرمانہ دینے کی بجائے اُلٹے وہ حاکم سے بھیک مانگنے لگیں گے۔ اور اگر انہیں تو تقصیر کر کے چھوڑ دیجئے تو پھر یہ سند یافتہ فقیر بن کر شان سے نکلیں گے۔ اگر انہیں قید میں ڈال دیجئے تو بس انہیں بے فکری ہو جاتی ہے۔ گو کبھی کبھی انہیں ذرا محنت کرنی پڑتی ہے لیکن روٹی کپڑے کی ذمہ داری حکومت پر ہوتی ہے۔

فقیر بیت المعذورین میں اس لئے رہنا نہیں چاہتے کہ وہاں کی باضابطہ زندگی انہیں قید معلوم ہوتی ہے۔ پھر ان کے شوق ذوق اور طلب کا بھی کوئی انتظام نہیں ہوتا۔ بہت کم فقیر اور سادھو ایسے ہوں گے جن کو کسی نشے کی عادت نہ ہو۔ بھنگ، چرس، افیون، سیندھی، شراب، مدک غرض دنیا کی ساری نشے کی چیزیں ان پر حلال ہیں۔

اس کے علاوہ، مرغ بازی، طمبن بازی، غرض کتنے ایسے شوق ذوق کے کام ہیں، جو ان فقیروں میں عام طور پر رائج نہیں ؟

ان تمام حالات کو نظر میں رکھتے ہوئے ہم فقیروں اور سادھوؤں کو ملک اور قوم کے لئے ایک بدترین لعنت کہے بغیر نہیں رہ سکتے۔ پیشہ ور فقیروں اور سادھوؤں کی یہ لعنت شہر سے جس قدر جلد دور ہو جائے اچھا ہے۔ اسی سے ملک کو امن آمان نصیب ہوگا۔

محمودہ صدیقی

روحِ فانی کی خدمت میں ——— نذرِ عقیدت

یہ ہے میرے اس مضمون کی سرخی جو بیک وقت عقیدت خیز و درد انگیز ہے۔ مجھے اس کی سرخی بہت عجیب سی معلوم ہوتی ہے۔ ہوسکتا ہے آپ کو ایسی نہ معلوم ہوتی ہو۔ لیکن کم از کم میرے نزدیک ضرور ہے۔ اس لئے کہ آج فانی یہاں — اس دنیائے الم با آغوش میں موجود نہیں ہیں اور بجائے اس کے کہ ان کی زندگی میں ان کی اصل حقیقت کا، اُن کے بلند مقام کا، ان کی سچی خدمات کا اعتراف کرنے کے میں اُن کے گزر جانے، ہم میں سے اُٹھ جانے اور "مسندِ یاسیات" کو خالی کرنے کے بعد یہ "**ھدیۂ عقیدت**" پیش کر رہی ہوں۔

مجھے اس جذبۂ عقیدت کی ادا کے متعلق ایک عام بات یاد آئی — آج تک شاذ ہی کوئی ایسی ہستی ملے گی جس کی بڑائیوں اور نمایاں خصوصیات کا اعتراف اس کی زندگی ہی میں اسے نصیب ہوتا ہو۔ شاید ہی کوئی ایسی خوش نصیب ہستی ہوگی جس کو شہرت کے دن دیکھنے — اپنی ان دو آنکھوں سے دیکھنے نصیب ہوئے ہوں گے۔ ہر بڑے آدمی کی قدر مرے بعد ہوتی ہے۔ نیک آدمی کی قدر بہت ممکن ہے اس کی زندگی میں ہو مگر "بڑا آدمی" تو اس فیض سے بالکل محروم رہتا ہے۔ اور مشہور بات ہے کہ "نیک آدمی بڑا آدمی نہیں ہوسکتا" اور جیسے ہی وہ بزرگ ہستی، اپنی جان جان آفریں کے سپرد کرتی ہے، سارے ملک بلکہ ساری دنیا میں ایک تہلکہ مچ جاتا ہے۔ اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ آج تک یہ لوگ اصحاب کہف بنے ہوئے تھے اور اب اس عظیم المرتبت ہستی کی موت نے ایک تازیانے کا کام کر کے ان کو اس لمبی اور گہری نیند سے بیدار کر دیا۔ یا یہ کہ ان لوگوں میں اتنا مادّہ نہ تھا کہ اس بزرگ ہستی کی بلند خصوصیات کا اس کے سامنے اعتراف کر لیتے۔ اور ایسا کرنے کے لئے وہ اس دن کے منتظر تھے!

مثلاً ہم اقبال کو لیتے ہیں۔ اس "شاعرِ اعظم" "شاعرِ مشرق" "دانائے راز" کی زندگی میں کیا ہم نے ایسی نظمیں، مضامین اور غنائیہ تمثیلیں، ڈرامے پڑھے تھے جو آج ہمیں ہر چھوٹے اور بڑے پرچے میں ملتے ہیں۔ آج لوگوں نے انہیں بہت بڑے بڑے خطابات عطا کئے ہیں۔ کیا یہ کام یہ لوگ اُن کی زندگی ہی میں نہیں کر سکتے تھے؟ "اقبال" اور "جوہرِ اقبال" کے پڑھنے والے ذرا سوچیں کیا اتنے بڑے لمبے چوڑے پر معانی گہری اور وسیع نظر کے حامل مقالے اس "دانائے راز" کی زندگی ہی میں نہیں لکھے جا سکتے تھے؟ آخر کیوں نہ لوگوں نے ایسا اقدام کیا؟ کیوں یہ ہمت دنیا کے آدمیوں میں اقبال ہی کی زندگی میں نہ آئی؟

اس کے "اصل راز" کو سمجھنے کے لئے جہاں تک ہمیں علم اور تجربہ بتاتا ہے یہی محسوس ہوتا ہے کہ ہر ایسے شہرۂ آفاق شخص کی زندگی میں لوگوں پر ایک قسم کا ڈر مسلط رہتا ہے وہ ڈرتے ہیں کہ کہیں ان کے خیالات کی وہ تردید نہ کر بیٹھے یا ان کی تنقید کا منہ توڑ جواب نہ دے بیٹھے! یا اس کا ایک پہلو ہمارے سامنے یوں بھی آتا ہے چونکہ اس کی "معنوی تخلیق" کا عمل جاری رہتا ہے لہٰذا لوگ نئی چیزوں کی امید اور آس کی کشمکش میں وقت کی لہروں پر جھولا جھولتے رہتے ہیں۔ مگر موت کے بعد اس کا "مکمل تخلیقی سرمایہ" سامنے رہتا ہے اب نہ ڈر رہتا ہے اور نہ کچھ خوف۔ بلکہ اب آزادی سے جس پہلو پر اور جس زاویۂ نگاہ سے چاہیں اس کے کلام کا "تجزیہ" کر سکتے ہیں۔

کیوں نہ ہم ایک ایسا قدم اٹھائیں اس "بے حسی" کی دیوار کو پارہ پارہ کر کے رکھ دیں جس نے ہمارے آگے حقیقت بینی کے راستے کو مسدود کر رکھا ہے؟ کیوں نہ ہم ایک ایسی "نظر" پیدا کریں جن سے ہمیں ہر کھوٹے اور کھرے کی پہچان کی تمیز آ جائے؟ کیونکہ

نہ ہم اس ہستی کی جو دراصل "کچھ" ہے اس کی زندگی ہی میں پہچان کرنی سیکھ جائیں؟ اور دنیا میں وہ کون سی بات ہے، وہ کونسا ایسا معمہ ہے جو حل ہونے سے رہا! صرف "قوتِ عمل" کا صحیح استعمال درکار ہے!

یہ میری بدقسمتی ہے ـــــ کاش ایسا ہوتا کہ میں اپنے اس ارادے کو جو میں نے ساقی نومبر ۱۹۴۰ء میں ڈاکٹر عندلیب شادانی کے تنقیدی مضمون ـــ "دورِ حاضر کی اردو غزل گوئی ـــ طومارِ اغلاط" ـــ کو دیکھ کر سوچا تھا پورا کی ہوتی۔ تنقید فی نفسہٖ بری نہیں بلکہ تنقید کو بہت بڑی اہمیت حاصل ہے۔ اس لئے کہ ذرا سے غور کے بعد ہمیں تنقید کے پس منظر میں یہ چیز عیاں نظر آتی ہے کہ جس پر تنقید کی گئی تھی وہ اپنی جگہ ایک خاص اہمیت کی حامل تھی۔ لہٰذا تنقید کی زد میں اگر کوئی مضمون آجائے تو میں اُسے لکھنے والے کی ہمت کا مترادف سمجھتی ہوں۔ تو میں کہہ رہی تھی کہ تنقید ہوئی فانی کی "باقیاتِ فانی" پر ـــ اور تنقید نگار نے جوش میں آکر ایسی سخت تنقید کی کہ فنِ تنقید کے بھی چھکے چھوٹ گئے۔

تو جس وقت میں نے مضمون دیکھا ایک جوابی مضمون لکھنے کی سوجھی۔ کیونکہ فانی سے بہت قریب رہ کر میں نے ان کا کلام دیکھا اور انہی کی زبان سے سنا تھا اور اُن کے جوشِ جذبات کا جو کلام سناتے وقت ان پر طاری ہو جاتا تھا، یہ اثر تھا کہ سننے والوں پر سکتہ کا سا عالم چھا جاتا تھا اور ایسا محسوس ہوتا تھا کہ یہ فانی کی آواز نہیں ہے بلکہ دردِ خانہ کے مکین نے بربطِ یاس پر وہ درد انگیز راگ اس ولولہ خیزی کے ساتھ چھیڑا ہے کہ اس کے ہر تار سے سننے والوں کے دل کے تار مل گئے ہیں اور سوائے ایک عالمِ یاس و درد کے کچھ نہیں۔ ہم ایک ایسی لگن میں ڈوب جاتے تھے ایک ایسی لہر میں بہہ جاتے تھے کہ خود اپنے کو فراموش کر جاتے تھے۔ پھر بھلا یہ دل کی گہرائیوں سے نکلے ہوئے نغمے کس طرح اپنا کوئی مقام نہیں رکھتے؟ کوئی کیوں کر کہہ سکتا ہے کہ ان میں کوئی معنی نہیں مطلب نہیں؟

میں مضمون نہ لکھ سکی کیونکہ امتحان قریب تھا۔ اور جب اوروں کے جوابی مضامین میں نے پڑھے تو وہ جذبہ بھی سرد ہو گیا!

میں اس کو اپنی خوش قسمتی ہی سمجھتی ہوں کہ حضرت فانی میرے والد کے قریبی دوست تھے۔ اور اکثر اپنے کئی واقعاتِ زندگی سنایا کرتے تھے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے اس وقت میری عمر کوئی آٹھ سال کی ہوگی حضرت فانی کو والد صاحب نے مدعو کیا تھا اور ان کا کلام سن کر ہم نے جو لطف اٹھایا تھا اس کا اندازہ صرف وہی حضرات کر سکتے ہیں جنہیں حضرت فانی سے تقرب کی عزت حاصل تھی۔

یہ ایک قاعدہ کی بات ہے جب انسان کا دل مسلسل مصیبتیں اٹھاتے اٹھاتے ٹوٹ جاتا ہے، اور آفات کا مقابلہ کرتے کرتے انسان کی کمرِ ہمت بیٹھ جاتی ہے تو وہ اس درجہ حساس ہو جاتا ہے کہ ؎ ستاروں کی چمک سے چوٹ لگتی ہے رگِ جاں پر

ایسی حالت میں ایسا انسان ہوا کے سہارے ہی کو ایک پائیدار سہارا سمجھنے لگتا ہے۔ جہاں کسی نے دلجوئی کی اور ہمدردی ظاہر کی وہ اسی کو اپنا سب سے بڑا دوست سمجھتا ہے اور اس سکونِ دل کے سہارے دل کی بھڑاس نکال کر جی ہلکا کرنے کے لئے اپنی وہ "جیون بیتی" سنانے لگتا ہے جسے اس نے بھی بڑی احتیاط سے من کی آہنی تجوری میں محفوظ کر دیا تھا ـــ اور اپنی دانست میں اسے وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بھول جانے کا اہتمام کیا تھا چنانچہ حضرت فانی نے جس جانگداز حالاتِ زندگی کا میرے والد سے ذکر کیا تھا وہ ایک ایسا المناک افسانہ ہیں کہ شائد ہی کسی حساس دل کو اس کے سننے کی تاب آسکے!

حضرتِ فانی نے ایک دن اپنی زندگی کے اصل افسانے کو سنانا شروع کیا:۔ (اس کا خیال رہے میں حضرت فانی کا افسانۂ حیات سنا رہی ہوں

بالکل انہی کے الفاظ مجھے یاد نہیں، سارا خلاصہ ہے ان کی "آپ بیتی کا")
دنیا میں جیسا ہوتا آیا ہے ہر شخص ذات پات، رنگ و پے بین، مذہب کا لحاظ کئے بغیر محبت کرتا ہے اسی طرح حضرت فانی نے بھی محبت کی۔ مگر یہ ان کا لڑکپن کہئے کہ بچپن یا تقدیر کے کھیل کہ فانی نے محبت کو کھو کر محبت پائی — یعنی ان کی "مقصودِ حیات" جو ان کی "دولتِ دل" "سرمایۂ دل" "نورِ دل" "سرورِ دل" الغرض سب کچھ تھیں اس دنیا سے گزر گئیں۔ وہ ان کی حقیقی چچازاد بہن تھیں۔ کتنا الم انگیز اور دردناک ہے یہ افسانہ! آہ ذرا غور سے سنئے!!
وہ فانی سے محبت کرتی تھیں۔ پرستاری کے درجے سے گزر کر بندگی کے درجے کو پہنچ گئی تھیں۔ ان کی ساری دنیا سمٹ کر حضرت فانی کی ذات میں مجتمع ہو گئی تھی۔ وہ چاہتی تھیں کہ وہ ہوں اور ان کا مقصدِ زیست — اور ساری کی ساری زندگی اسی عالمِ قرب و تقرب میں گزر جائے!
حضرت فانی ایک یتیم کی حیثیت سے چچا کے ہاں رہتے تھے۔ چچا نے حضرت فانی سے ایف اے پاس کرنے کے بعد کہا کہ "میں بوڑھا ہو گیا ہوں، میری زندگی کا سہارا . . . یہی ایک لڑکی ہے . . . تم میرے بھائی کے نہیں میرے بیٹے ہو، گھر سنبھالو اور اسے بیاہ لو!" — فانی کے سر پہ حصولِ علم کا بھوت سوار تھا۔ آبِ محبت سے شجرِ دل کی آبیاری کرنے کی بجائے وہ آبِ علم سے اسے سینچنا چاہتے تھے ماتحت سعادتمند بھتیجے نے بی۔ اے کے بعد اس "کارِ خیر" کو انجام دینے کا وعدہ کیا۔
دو سال کا طویل عرصہ؟ پل بھر میں نہ جانے کیا سے کیا ہو جائے۔ کجا دو سال! اُف!! اس انتظارِ روح فرسا کے تخیل نے جانِ حزیں پر بنا دی۔ اور وہ تنِ نازنیں فرش کی زینت بن گیا۔ محبت کا یہ خونیں ڈراما زندگی کے اسٹیج پر دو سال تک کھیلا جاتا رہا۔ اور ساری گھڑیاں گنتے گنتے یہ آنکھیں پتھرا گئیں۔ بی اے کے نتیجہ کی خوشخبری لے کر فانی گھر پہنچے تو کسی نے اس خبر پر اتنی زبردست خوشی و مسرت کا اظہار کیا کہ اس خوش آیند انتظار کردہ زمانے کی خوشی نے شادی مرگ کر دی — اور وہ جانِ نازنیں اب فرش سے قبر میں گھر کر گئی۔
فانی پر بجلی گر پڑی! آسمان سر پر اتر آیا!!! روح تک کانپ اٹھی!!! زمین لرز اٹھی!!! احساسات میں زلزلہ آگیا!!! لاش میں نظر آتا تھا کہ یہ کہہ رہی ہے؂

کی مرے قتل کے بعد اس نے جفا سے توبہ ؛ ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

اس حادثۂ جانگداز نے جس کی خواب میں بھی فانی کو توقع نہ تھی فانی کی دنیا بدل ڈالی۔ وہ "رومانی شاعر" (جیسا کہ وہ خود کو بتاتے تھے) ایک دم زبردست "قنوطی شاعر" ہو کر رہ گیا۔ ان کے وہم کو بھی وہم نہ تھا کہ ان کی یہ "بساطِ امید" یوں الٹ دی جائے گی اور ان کے خبطِ علم سے ان کی زندگی کی سب سے بڑی "پونجی" یوں موت کے بیدرد ہاتھوں لٹ جائے گی۔ اور لٹے گی بھی تو ایسے جانگداز طریقہ پر کہ یاس ہو گئے "یا دجانگداز" اور کچھ نہ بچے گا! کیا عشق گناہ ہے؟ اس کی اتنی زبردست سزا ملتی ہے اور یہ شعر حقیقت آفریں کیا؂ عشق نظر آفریں او نظر معصیت ؛ عشق تمنا زاد او تمنا گناہ
مگر — مگر اب اس سے کیا؟؂ رات ہی رات میں تمام طے ہوئے عشق کے مقام ؛ ہو گئی زندگی کی شب اب میں سحر کو کیا کروں؟
اس "پیکرِ وفا" نے بازی جیت لی، اس نے خود کو اپنے "مقصدِ حیات" پر سے نچھاور کر دیا؂

آخرِ شب دید کے قابل تھی بسمل کی تڑپ ؛ صبحدم کوئی اگر بالائے بام آیا تو کیا؟

اب اگر فانی نے غم کی دنیا میں خود کو سمو دیا تو کیا ہوا؟ ان کی زندگی بجائے خود ایک رستا ہوا زخم اور ایک پکا پھوڑا بن گئی تو اس سے کیا؟ ان کی تمام ہستی یاسیات میں ڈوب گئی تو کیا ہوا؟ انہوں نے کسی کو ٹھکرایا تو کیا فطرت چپ رہتی ہے وہ انتقام لیتی ہے۔ اور ایک نہ ایک وقت اس شدت کے ساتھ کہ روح تک کانپ جائے لرز جائے!!! اور اس "گناہِ عظیم" کے کفارے میں فانی نے ایک ایسی

زندگی بسر کرنی شروع کی جو درد و غم، رنج والم اور یاس میں ڈوبی ہوئی تھی اور اس یاس انگیزی نے انہیں درد اور اس کی کسک سے لطف اندوز ہونے کا گر سکھایا۔ فانی کی دنیا کے افق پر اب سوائے درد و غم، رنج والم، حسرت و یاس کے اور کچھ طلوع نہ ہوتا تھا۔ فانی نہ تھے یہ سمجھ لیجئے مجسم "یاس و حسرت" تھے!!

اب فانی نے ایک لاابالی زندگی بسر کرنی شروع کی۔ نہ انہیں کوئی اپنا محسوس ہوتا تھا اور نہ وہ خود کسی کو نظر آتے تھے۔ فانی نے دل بہلانے کے لئے وکالت پڑھنی شروع کی اور کامیاب بھی ہوئے۔ وکیل ہو کر بریلی بھی چلے گئے۔ اس اثنا میں شاعری بڑے عروج پر تھی مگر زندگی سے جو جی اچٹ گیا تھا پھر نہ لگا۔

چونکہ فانی مجسم کشتۂ محبت تھے۔ لہذا کچھ تو ان دردبھری پکاروں کی وجہ سے جو شاعر اپنے (Counter Part) کے لئے بلند کرتا تھا — اور ان آنسوؤں، آہوں اور نالوں کے "زندہ نقوش" کی وجہ سے جو وہ گہری اندھیری اور بھری چاندنی راتوں میں بکھراکرتا تھا اور سب سے بڑھ کر بحیثیت عاشق کے لوگ انہیں بیحد چاہتے تھے۔ یہاں تک کہ کسی نے ان کی مجسم درد زندگی سے اتنا اظہار تاثر کیا ہے کہ "ساری عمر" کی دلدہی منظور کی اور فانی کی موت سے کوئی ڈیڑھ سال پہلے حقِ رفاقت ادا کر دیا!

آفریں صد آفریں بر عاشقِ صادق!! مگر اس عرصہ میں فانی کا ربابِ حیات وہی غم انگیز اور یاس خیز نغمے بکھرتا رہا۔ اس کے ان دردبھرے راگوں میں روز بروز اور اضافہ ہوتا گیا۔ فانی کی محبت نے جو درد کا پہلو اختیار کیا تھا وہ آخر تک جاری رہا۔ اور جس رنگ سے اس افسانۂ الفت و نیاز کو فانی نے سنایا ہے اس کی داد دینا ہماری کور ذوقی کا ثبوت ہے۔ فانی نے جس رنگ کو اختیار کیا اور وہ نہ ہوتا تو ہمیں فانی کے ثباتِ عشق میں لغزشیں نظر آتیں اور ایسی بے کیفی اس کے کلام پر چھا جاتی کہ اس کی موت کا بھی ہم کو احساس نہ ہوتا۔ کیونکہ آج ہم اصل ذاتِ فانی کے لئے غم کناں اور سینہ زن نہیں ہیں۔ ہم تو اس کو پیٹتے ہیں کہ آج شاعرِ فانی نہیں رہا — ایسا شاعر جس نے ہیں وہ دردبھرے نغمے سنائے کہ جن کا غم آگیں اور درد آفریں راگ ہمارے ہر تارِ دل میں ایک مسلسل ارتعاش پیدا کر رہا ہے! فانی اس درجہ گم شدۂ درد محبت ہوگئے تھے کہ انہیں ہر شئے میں درد کا پہلو روشن نظر آتا تھا۔ خود اس قدر ضم شدۂ الم ہوگئے تھے کہ ان کی ہستی اس شعر کا مصداق بن کر رہ گئی تھی۔ ؎

اس قدر خوگرِ فریاد ہوں میں صورتِ نَے　　بات بھی منہ سے نکلتی ہے تو نالہ ہو کر

فانی عسرت سے عسرت میں تھے۔ اور اگر کوئی چاہتا تھا کہ کچھ مدد کرے تو قسمیں دے دے کر، الٹی معافیاں چاہ چاہ کر شرمندہ کر دیتے انہیں اپنی بیکسی اور بدحالی سے شکایت نہ تھی۔ ان کے دل کا زخم اتنا گہرا تھا کہ اس ناسور سے زیادہ انہیں اور کوئی تکلیف دہ، جان لیوا چیز نہ ہو سکتی تھی۔ دنیا سے دل اٹھ چکا تھا۔ لہذا مصائب و آفات ان پر ذرہ برابر اثر نہ کرتے تھے، ایک دفعہ والد صاحب نے چاہا کہ کچھ شاعر کی نذر کریں اور اس کے لئے انہوں نے ان کے احساس بیکسی کو بیدار کرنا چاہا تو یہ کہا ؎

مجھ کو مرے نصیب نے روزِ ازل نہ کیا دیا ٭ دولت دو جہاں نہ دی اک دل مبتلا دیا۔ اور ہنس کر یہ شعر پڑھا ؎

"یاس" نے دردہی نہیں حق تو یہ ہے دوا بھی دی —— فانی نامراد کو موت کا آسرا دیا

"باقیات فانی" "عرفانیات فانی" خود فانی نے والد صاحب کو تحفتہً دیں مگر باہر کا باہر ہی نہ معلوم کون صاحب ہڑپ کر گئے، مجھے اس کا جتنا رنج ہے میں نہیں کہہ سکتی۔ شائد یہ سن کر حیرت ہوگی کہ میں نے یہ دونوں کتابیں کہیں نہیں پائیں۔ بازار پھر آیا

تو اسٹاک ختم۔ پھر سے اسٹاک آیا تو میرے پیسے ختم۔ غرض یہاں چند اشعار لکھتی ہوں جو انہوں نے خاص طور پر والد صاحب کو دئے تھے۔ نہ معلوم مطبوعہ ہیں کہ کیا!

گلہ زمیں سے شکایت ہے آسماں سے ہمیں — یہ دل رہے گا نکلوا کے دو جہاں سے ہمیں
ابھی یہ عذر بھی کرنا ہے پاسباں سے ہمیں — جبیں کے نقش اٹھانے ہیں آستاں سے ہمیں
ست ہمیں نفسِ واپسیں سے ہے امید — یہ ایک سانس ملا دے گی کارواں سے ہمیں
رہبر ہو خضر کا جو رہے ذوقِ خبر میں — وہ نقشِ قدم میں ہوں تری راہ گزر میں
کانٹوں میں بھی پھولوں کی اداتھی ترے آگے — اب باغ میں جو پھول ہے کانٹا ہے جگر میں
اس عالمِ تصویر کو دیکھا تو یہ دیکھا — میری ہی نظر محو ہے میری ہی نظر میں
جیسے کوئی جی کھول کے ہنسنے نہیں دیتا — لے دے کے یہ اندازِ تبسم ہے سحر میں
ہر اشک تری یاد کے جلووں سے ہے معمور — دنیا سمٹ آئی ہے مرے دیدۂ تر میں
اوراک ہے مظہر مری شوریدہ سری کا — سودا ہے بعنوانِ محبت مرے سر میں

فانی ہے مری آہ و فغاں میں اثر الٹا
شاید مری تقدیر کی گردش ہے اثر میں

اس کے علاوہ فانی کے کئی ایک اشعار ہیں، غزلیں ہیں جو اتنی مقبول ہیں کہ زبان زدِ خاص و عام ہیں۔ ان کا ذکر پھر کسی وقت کروں گی۔ فی الوقت اس مضمون کو اشاعت کے لئے دینے کا محرک ایک خاص واقعہ ہے۔ میں اسے واقعہ ہی کہوں گی بلکہ چھوٹا سا حادثہ۔ ساقی دلی سے نکلتا ہے یعنی ہندوستان کی راجدھانی سے اور جس طرح راجدھانی اپنی ہمہ گیر اہمیت رکھتی ہے اسی طرح چونکہ دلی کی خاک پاک سے یہ رسالہ وابستہ ہے اتنی ہی ہمہ گیر اہمیت و مقبولیت رکھتا ہے۔ جناب شاہد احمد صاحب اس کے ایڈیٹر ہیں۔ اکتوبر ۱۹۴۱ء کا "ساقی" مجھ تک بھی پہنچا۔ فانی جیسے شاعر کی موت کا کس کو دکھ نہ ہوا۔ کس نے اس ہستی کی جدائی کی چوٹ محسوس نہ کی؟ لہذا ہر شخص نے بقدرِ ہمت اظہارِ عقیدت کیا۔ "فانی بدایونی" کے عنوان سے ایک مضمون جناب محمد احمد سبزواری کا ساقی میں چھپا۔ بڑے شوق سے میں نے مضمون پڑھا کیونکہ یہ صاحب جامعہ عثمانیہ ہی کے ایم اے ہیں۔ اور بھوپال میں مقیم ہیں۔ مگر میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب میں نے ایک جگہ پڑھا کہ "وفات سے دو ڈھائی سال پہلے ریاست کے ایک ضلع بیڑ میں تبادلہ ہوا اور وہیں مرحوم اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔" بات یہ ہے اگر کوئی کہے کہ "دلی کرشنا ندی کے کنارے واقع ہے" تو سننے والے کا کیا حال ہوگا --- میرا خیال ہے کہ سبزواری صاحب کا یہ مضمون (Burning Topics) کے عنوان کے تحت آسکتا ہے کیونکہ فانی صاحب کو خدمت سے علحدہ ہوئے کوئی کچھ اوپر چار سال ہوئے ہیں۔ ترکِ ملازمت کے بعد سے وہ "تکئے پلی" (جو بلدۂ حیدرآباد کا ایک مشہور محلہ ہے) میں آرائش بلدہ کے مکان میں مقیم تھے۔ اسی گھر میں ان کی مخلص و وفادار بیوی نے دو سال سے زیادہ عرصہ کی جانکاہ بیماری سرطان میں مبتلا رہ کر انتقال کیا اور اسی میں خود حضرت فانی نے جان جان آفریں کے سپرد کی۔

دوسری بات جو بہت زیادہ نمایاں ہے وہ یہ ہے کہ ایک جگہ صاحب موصوف نے لکھا ہے کہ فانؔی کو زندگی بھر ایسے پُرکرد واقعات پیش آتے رہے جنہوں نے ان پر ایک خاص اثر کیا ...... دنیا ہی بدل ڈالی! اب سوچنا یہ ہے کہ وہ کون ایسے پُر درد واقعات تھے جنہوں نے فانؔی پر اتنا اثر کیا؟ جہاں تک میں سمجھتی ہوں ہر طرح کی غیر معلوم چیزوں کا کھپاؤ افسانوں' ڈراموں اور نظموں میں بخوبی ہو سکتا ہے۔ مگر کسی شاعر کے احوالِ زندگی ـــ اور پھر "شاعر یاسیات" فانی مرحوم نور اللہ مرقدہٗ ـــ پر مضمون لکھنے کو تو اتنی معلومات بھی چاہئیں۔ محض اس لئے لکھنا کہ مضمون ساقی میں چھپے گا ادب کے ساتھ کوئی اچھے سلوک کا مظہر نہیں۔

سب سے بڑا تعجب تو مجھے اس لئے ہوا کہ ایڈیٹر ساقی جیسے آدمی فانی جیسے شاعر کے حالات سے اتنے نابلد ہیں کہ ایسے مضمون کو شائع کیا؟ اس سے یہ بات تو ضرور پوری ہوئی کہ فانؔی کی موت کا اثر "ساقی" نے بھی لیا۔

میں سوچتی ہوں کہ ہندوستان کہاں ہے اور ہندوستان کے بسنے والے کہاں ہیں؟ ہمالیہ کی چوٹی برابر گڑھا بھی کھود یں تو شاید اس کی تہہ سے بھی پستی میں ہمارا پتہ نشان نہ ملے گا۔ کتنے بجس ہیں ہم؟ کیا جمود ہے ہم میں؟؟ اف!!! اچھے کی قدر نہ کبھی کی گئی نہ کی جا رہی ہے ـــ آگے کا حال اللہ جانے۔ اب تو جنگ ہو رہی ہے۔ سب مشاہیر اسی شکوے میں مرے کہ ان کا قدر داں نہیں ملتا!! فانی کی انوکھی ہستی نہ تھی بلکہ یہ ان لوگوں کی فہرست میں ایک اور اضافہ تھا جن کو زمانے کے بیدرد ہاتھوں نے جی بھر کر پامال کیا تھا۔ اور جن کی ہمتوں کو اُبھارنے کی بجائے ناقدری کی قبر میں سکون کی نیند سلا دیا گیا تھا۔

سعیدہ مظہر (زنانہ کالج)

غم فانی

غم زدوں کی زندگی کا ترجماں
عشق کے ماروں کا میرِ کارواں
غم کا پیغمبر جہاں سے اُٹھ گیا
وائے بر بدبختیٔ ہندوستاں

سردار علی الہام (عثمانیہ)

"افسانہ در افسانہ"

نقرئی فضا کو اور دل نشیں بنا دو نا ۔۔۔ تم کو چاند کی سوگند نظم اک سنا دو نا!

دور تک کھلی چھت تھی، چاندنی کی راتیں تھیں
شوق کی فضائیں تھیں، دل کی کائناتیں تھیں
کوئی بار بار اپنی نظم گائے جاتا تھا
کوئی چاند کی صورت مسکرائے جاتا تھا
جیسے تار چھڑنے پر ساز گنگنا اٹھے
تتلیوں کے گانے سے پھول مسکرا اٹھے

"ہاں، تو پھر ہوا کیا جب گیت گا چکا کوئی
جی ہی جی میں خوش ہو کر مسکرا چکا کوئی
اس شبِ محبت کا کیا سماں رہا ہوگا
جیسے ایک اک لمحہ داستاں رہا ہوگا!

اک خموش سا نغمہ چاندنی کے تاروں پر
جیسے سحر کا عالم رات کے نظاروں پر
گاتے گاتے جب اپنے گیت تھک گیا کوئی
خامشی سے اُکتا کر خود ہی کہہ اٹھا کوئی
گائیے بھی اور آگے گیت ابھی ادھورا ہے
اس حسین نغمے کا جانے ماحصل کیا ہے!

ہاں تو اس نے کیا گایا، کیا غرض تھی گانے کی ۔۔۔ اک لطیف موسیقی چاند کو سنانے کی

آہ کیا مبارک تھی، وہ حسین ساعت بھی
چاندنی بھی، نغمہ بھی، حسن بھی، محبت بھی
دو محبتوں میں یوں کاش جا پڑی ہوتی
کیسی برہمی ہوتی، کیسی دل لگی ہوتی!

"کچھ نہیں بڑی ضد پر اس نے گنگنایا پھر
اپنی اپنی ہی دھن میں ایک بار گایا پھر
حسنِ عالمِ سیمیں، اے مرے مہِ تاباں!
اے مرے تصور کے خالقِ طرب ساماں
وہ ہیں، دل کی دنیا ہے، اک حسین ساعت ہے
آہ کس طرح کہہ دوں مجھ کو تم سے الفت ہے!"

"خوب اب سمجھ پائی، کس طرح ستاتے ہو
نظم کے بہانے سے تم مجھے بناتے ہو
چاند کی ضیا دیکھو جھلملائی جاتی ہے
اب معاف ہو، مجھ کو نیند آئی جاتی ہے!"

سلام مچھلی شہری

تحفہ

(بسلسلہ گزشتہ)

یہ صدمہ الگ تھا۔ اور پھر گھر میں ہر شخص انہیں اور انکی بھاوج کو اس نظر سے دیکھنے لگا تھا جیسے برٹش امپائر کے طرفدار ہٹلر کو دیکھتے ہوں۔ کھوج بڑھ گئی لیکن سراج نے بھی کچھ ایسے غیر معروف محلہ میں ٹھکانہ کیا کہ یوں بھی پتہ لگنا مشکل تھا پھر انکی احتیاط و وضعداری تو اور بھی ایک سخت تھی مہینہ کے ختم پر سراج نے اپنا وظیفہ منی آرڈر کیا بھی تو کالج کے پتہ سے، اور یہ کالج میں اس بات کو پھیلانا نہیں چاہتے تھے، لیکن کوئی بات کب تک چھپ سکتی ہے، رفتہ رفتہ سب ہی کو خبر ہوگئی، اور سب ہی کو افسوس بھی۔ بھائیوں اور عزیزوں نے جا کے طرح طرح سے فہمائش کی لیکن سراج نے سب کو ٹال ہی دیا، باپ سب کچھ کرتے تھے لیکن یہ ابھی گوارا نہ تھا کہ خود جا کے بلا لائیں۔ آخر کو سوجھی کہ چپراسن سے اس میں مدد لی جائے لہذا اب اُس سے دوستی و مراسم بڑھنے لگے، وہی چپراسن جو کبھی ایک ذلیل و حقیر مزدور عورت تھی، اب ان سب کے سر آنکھوں پر تھی۔ یہ غرض ہے اور غرض کی ترازو میں اونچ نیچ سب برابر تلتے ہیں۔ اس نے جو سفارش کی نتیجہ یہ نکلا کہ اُس نے خود اس کے ہاں آنا چھوڑ دیا۔

اس کے بعد تجویز ہوئی کہ خود پرنسپل صاحب سے مدد لی جائے، چنانچہ سرور کے ذریعہ حکیم صاحب نے اُن سے ملاقات کی اور واقعات سمجھائے تو انہیں ان کی حرکت پر سخت رنج ہوا، لیکن پھر بھی تسلی دی کہ وہ کوشش کرینگے۔

چنانچہ باپ کے جانے کے بعد لڑکے کو بلا بھیجا اور جانتے تھے کہ کون لڑکا کس طبیعت کا ہوتا ہے، اس لئے بہت دور سے آنے کی کوشش کی تمہیدی و تعلیمی گفتگو کے بعد انہوں نے چھیڑا۔

"ایک بات میں تم سے پوچھ سکتا ہوں، گو مجھے اس کا کوئی ایسا حق بھی نہیں؟"

"یہ آپ کیا فرماتے ہیں، آپ تو میرے باپ سے بڑھ کر ہیں، فرمائیے کیا ارشاد ہوتا ہے!"

"نہیں اپنے باپ سے کوئی شکایت تو نہیں؟"

"اجازت ہو تو عرض کروں، کیا جناب نے کبھی محسوس فرمایا ہے کہ خادم کو کبھی جناب سے شکایت ہوئی ہو؟"

"نہیں!"

"پھر جب روحی باپ سے مجھے کوئی شکایت نہیں تو جسمی باپ سے کیونکر ہوسکتی ہے، خصوصاً جب کہ جسم روح کا تابع ہو!"

پرنسپل صاحب جتنے نمونۂ ہمدردی و شرافت تھے اتنے ہی نباض فطرت بھی، لڑکے کے بشرے سے بھانپ گئے کہ اس قسم کے سوالات کی ناپسندیدگی پر وہ ادب و احترام کا پردہ ڈال رہا ہے، لڑکے کی طرف ستائشی نظروں سے دیکھا، اور باپ کو صورت حال سے مطلع کر کے وہیں قصہ ختم کر دیا۔

یہ حکیم صاحب کی کوششوں کی انتہا تھی جو لڑکے کو بالواسطہ بلانے میں صرف کی جاسکتی تھیں۔ اس کے بعد وہ مایوس ہو کر بیٹھ رہے۔ اسی کشمکش میں کوئی ڈیڑھ دو سال سے زیادہ گزر گئے۔ لیکن کوئی صورت نہ بنی، پھر لڑکی کی شادی قریب آرہی تھی، لڑکی کی شادی نے لڑکے کی جدائی کے صدمہ کو اور تیز کر دیا، اور اب وہ الجھن کو دور کرنے کے لئے حضرت کی قدمبوسی کیلئے زیادہ جانے لگے۔

حضرت جدّ الابرار مولانا شاہ مرید یار خاں کو زُنیتی عمّ نوالہٗ و قلّ مثالہٗ شہر کے اُن مخصوص پیرانِ طریقت میں سے تھے جن کی ہمسری کا دعویٰ بہت کم کر سکتے تھے، اور خصوصاً اس اعتبار سے تو کوئی بھی نہیں کہ حکیم صاحب جیسے خشک عالی وقار شخص اُن کے آگے زانوئے ادب تہ کرتے تھے، حکیم صاحب کو اُن سے ارادتِ خاص تھی، اس لئے وہ اکثر اُن کی خدمت میں جایا کرتے اور سراج کو بھی ساتھ لیجاتے، اور سراج بھی ہر چند سب ڈاڑھی والوں کو ایک کوئی الگ ہی صنف کی نظر سے دیکھتا تھا، لیکن اِن حضرت سے وہ بھی بہت مانوس تھا اور سچ تو یہ ہے کہ کشف و کرامت کے لحاظ سے وہ کچھ ہوں نہ ہوں، لیکن عام مرشدوں مولویوں کے خلاف انسانی حیثیت سے وہ کافی بلند انسان تھے اور ایک انسانی دل اپنے سینہ میں رکھتے تھے۔ اپنے مرید خاص کی اس مصیبت کا حال سُنا تو بہت متاثر ہوئے۔ اور گو زبان سے کچھ نہ کہیں، لیکن اس کوشش میں لگے رہے کہ کسی طرح یہ بچھڑے باپ بیٹے مل جائیں۔

حکیم صاحب کو بھی ان کی تسلی و وعظ سے بہت کچھ غم ہلکا معلوم ہوتا اور گو وہ کبھی حضرت سے دنیوی باتیں کرنے کی جرأت نہ کرتے، لیکن اس صدمہ سے تنگ آ کر اُنہوں نے اپنے دل کا حال کہنا شروع کیا، اور جب بیٹی کی شادی قریب آئی تو اپنی الجھن حضرت سے کہہ سنائی۔ حضرت کو محسوس ہوا کہ انہیں ایک موزوں موقع ملا ہے۔ چنانچہ جب سراج ان کی خدمت میں حاضر ہوا تو باتوں باتوں میں اُنہوں نے پوچھ لیا "سراج بابا سُنا ہے تمہاری بہن کی شادی ہو رہی ہے کیا تم اس میں حصہ نہیں لو گے؟"

"جی ضرور"! کہہ کے لڑکا خاموش ہو گیا اور دوسرے دن جب آیا تو ایک لفافہ میں دو سَو کے نوٹ رکھ لایا۔ حضرت کی خدمت میں پیش کرتے ہوئے بولا "یہ ایک حقیر نذر ہے جو اپنی عزیز بہن کیلئے میں پیش کرتا ہوں، براہِ کرم آپ اسے ابا جان تک پہنچا دیں!"

حضرت نے بڑی تحسین اور دعائیں دیں، اور کہا کہ فی الحال تو وہ قبل از وقت ہے البتہ جب شادی قریب آئے تو وہ کہہ کے منگا لیں گے۔ اس کے بعد اُنہوں نے ایک دن اور وقت ایسا مقرر کیا کہ دونوں باپ بیٹے جمع ہو سکیں۔ باپ پہلے آ چکے تھے، لڑکا بھی روپیہ لے کر حاضر ہوا، جیسے ہی مسجد میں داخل ہوا باپ کی سی پیٹھ دکھائی دی پھر جو آواز سُنی تو یقین ہو گیا، یکدم ٹھٹک گیا پھر جو دیکھا کہ اور بھی مرید موجود ہیں اور حضرت کی بھی نظر پڑ چکی ہے واپسی بد اخلاقی و بدنمائی ہو گی، حضرت کی خدمت میں سر جھکائے بیٹھ گیا اور لفافہ پیش کر دیا۔ آج وہ بے طرح مضطرب تھا لیکن اضطراب پر قابو پانے کی کوشش کر رہا تھا۔ باپ نے اتنی مدت کے بعد جو اپنے نورِ نظر کو دیکھا تھا تو اُن کی کیفیت کا اندازہ کون لگا سکتا ہے دونوں ہی بے تاب تھے، لیکن دونوں ہی ہٹ دھرم تھے۔ بالآخر جب باپ رخصت ہونے کو اُٹھے تو حضرت اور سبھی اُٹھ کھڑے ہوئے، حضرت نے یہ کہتے ہوئے لفافہ دیا "یہ آپ کی خدمت میں ایک حقیر نذر ہے آپ کے صاحبزادے کی' اپنی بہن کی شادی کے سلسلہ میں!" باپ نے نوٹ ہاتھ میں پکڑے، بیٹے کی طرف بے اختیار حسرت و مسرت بھری نظروں سے دیکھا اور ایک رقیق آواز میں بولے "کیا میرے لئے یہ کافی ہے؟"

بیٹے نے اس کا مطلب کچھ اور سمجھا، اور اپنی اُسی سادگی اور بھولے پن سے کہنے لگا۔ "حضرت، مجھے اپنے وجود پر شرمندگی ہے کہ میں اپنی بہن وغیرہ کی کوئی معقول خدمت نہ کر سکا لیکن مجبوری ہے۔ آپ پر سب روشن ہے کہ ٹیوشن سے مجھے صرف پچاس کی آمدنی ہے، زیادہ کو میں [illegible] نہیں سمجھا، جس میں سے آٹھ روپے مکان کے کرایہ کے جاتے ہیں۔

آٹھ نوکر کے، اور دس بیس کھانے میں، ایسی صورت میں اس سے بڑھ کر میرے پاس اور کیا جمع ہو سکتے تھے! ..... "

حضرت کی آواز بھی بھر آئی، اُنہوں نے بات کاٹی "بابا تم نے اپنے باپ کا مطلب غلط سمجھا، ذرا اُدھر دیکھو تو!" یہ کہتے ہوئے اُنہوں نے باپ کی طرف ہاتھ اُٹھایا۔ بیٹے کی نظر جو باپ پر پڑی تو آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا رہے تھے اور وہ ساری رنگت اور رونق فنا ہو چکی تھی جو انہیں اسطرح اپنی عمر سے بہت زیادہ بوڑھا ظاہر کرنے کی بجائے کبھی بہت زیادہ جوان ظاہر کرتی تھی۔ خونی محبت نے جوش مارا، ساری رعونت جاتی رہی اور بیٹا بے ساختہ "ابا جان!" کہتے ہوئے پاؤں میں گر پڑا۔ باپ تو بے اختیار تھے ہی، اُٹھا کر گلے سے لگا اور بولے "مجھے معاف کر دو بیٹا، مجھ سے بہت بڑا قصور ہو گیا!"

"جی نہیں ابا جان، یہ آپ کیا فرماتے ہیں، میں تو آپ کا ایک ادنیٰ غلام ہوں!"

جب دونوں خوب رو چکے تو باپ نے کہا "بیٹا میرے گھر میں ایک تمہارے سوا کس بات کی کمی ہے، میں تمہارے روپے لے کر کیا کرونگا، میری سب سے بڑی دولت تو تم ہو۔ ایک بار صاف ہو کے کہہ دو کہ تم نے مجھے معاف کر دیا، اور یہ کہ اب تم میرے ساتھ چلو گے!۔ کہو چلو گے نا؟"

"جی ہاں ابا جان، آپ کا حکم میرے سر آنکھوں پر ہے!"

"مجھے تم سے زیادہ تمہاری خودداری پر ناز ہے بیٹا!"

حضرت اور سب کے سب اس واقعہ سے بیحد متاثر اور خوش ہوئے، اور جب یہ جانے لگے تو باپ نے بیٹے سے کہا کہ اس مسرت میں وہ روپے حضرت کی نذر کر دے کہ انہیں کے طفیل میں خدا نے انہیں یہ مسرت بخشی۔ اسکے بعد دونوں گھر آئے۔

آج کی خوشی کا اندازہ لگانے کیلئے حکیم صاحب اور ان کے گھر والوں کا ہی دل چاہئے۔ کسی کے شان گمان میں بھی یہ نہ تھا کہ حکیم صاحب خود آج بیٹے کو گھر لائیں گے اور وہ بھی اسطرح انجان اور آسان کہ جیسے بازار سے کوئی سودا خرید لائے ہوں۔

سارے گھر میں ایک جشن تھا، اور یہ معلوم ہوتا تھا کہ گویا بیٹی سے پہلے بیٹے کی شادی ہو رہی ہے، اور واقعہ بھی یہ تھا کہ اسی ضمن میں اب سب سراج میاں کو مجبور کرنے لگے کہ وہ شادی کے لئے ہاں کہہ دیں، اب تو نہ بڑی بہن کی شادی کا حیلہ باقی تھا نہ گریجویٹ ہونے کا، بس مہینے دو مہینے ہی کی تو بات تھی کہ یہ گریجویٹ بھی ہو جاتے اور بہن کی شادی بھی۔ لوگوں نے تنگ کرنا شروع کیا کہ اب تو عذر کرتے ہی بنے گی، انہوں نے ایک نیا حیلہ نکالا کہ ایم۔ اے کے بعد کرونگا، لیکن یہ نئی چھیڑ بھی چل نہ سکی، کہنے لگے "خیر کم سے کم نتیجہ تو نکلنے دیجئے، کیا خبر کہ پاس بھی ہوں یا فیل!" اور پہلے نتیجہ بھی نکلا اور یہ اوّل درجہ میں پاس بھی ہو گئے۔

بیٹی کی شادی کو ابھی مہینہ بھی نہ ہوا تھا کہ بیٹے کی کامیابی کا جشن آیا، سچ تو یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے حکیم صاحب کے مزہ کو تیز کرنے کے لئے بیٹے کی جدائی کا ایک چٹپٹا سا بگھار دیدیا تھا، ورنہ حکیم صاحب بڑا جم جم نصیب لائے تھے، ساری عمر خوشی میں گزری اور گزرنے کی توقع تھی۔

کامیابی کا جلسہ ہوا، لیکن نہایت "جرمن ڈزائن" یعنے بالکل نئی طرز کا۔ پارٹی دی گئی مختصر مگر نہایت شاندار۔ مہمان جمع ہوئے اور دوست احباب کے تحفے برسنے شروع ہوئے۔ اِن سے نمٹ کے سراج میاں جو گھر میں آئے تو یہاں ابھی بزرگوں اور بھائی بہنوں کے تحفوں اور پھولوں کی بھر مار تھی، غرض سراج پھولوں سے چمن اور تحفوں سے سیٹھ مگن بنے ہوئے تھے بہن نے بات چھیڑ دی "دیکھئے صاحب، اسی خوشی میں آج شادی

کی بات بھی طے ہو جانی چاہیئے !" سب نے یک زبان ہو کر اصرار شروع کیا، لیکن جانے کیا بات تھی کہ سراج میاں ٹال ہی جاتے اتنے میں بہن نے ایک سے ایک بڑے گھرانے کے پیامات سنانے اور تصویریں پیش کرنی شروع کیں، سراج نے بھی تعریفیں شروع کیں۔ لوگوں نے کہا "یہ کیا، تصویریں آپ کو تعریف کیلئے بتائی جا رہی ہیں یا انتخاب کیلئے ؟"

"بھئی دیکھئے جب ایک کام سے پوری طرح نمٹ لوں تو دوسرا کام کروں، ابھی تو تحفے ہی پورے وصول نہیں ہوئے اور آپ چاہتی ہیں کہ تصویریں پسند کروں !"

"ہیں ! اور کس کا تحفہ باقی ہے ؟"

"واہ صفیہ بیگم کا تحفہ تو ہمیں وصول ہی نہیں ہوا !"

اور حقیقت بھی یہ تھی کہ صفیہ بیگم تحفہ دینا تو کجا پارٹی ہی میں برابر حصہ نہیں لے رہی تھیں کچھ مہمانوں اور دلہا (بہنوئی) کی شرم کا حیلہ تھا، اور کچھ ان میں اب ایک تغیر سا آ گیا تھا، جانچہ سراج کے آنے کے بعد بھی ان دونوں میں تقریباً تکلف حائل ہو گیا کبھی رسمی گفتگو کر لی کر لی ورنہ خیریت، دونوں کی یہی روش تھی لوگوں نے اسے خرابی صحت پر محمول کیا کسی نے کچھ کہا اور کسی نے کچھ، غرض نہ وہ اُس وقت ان کی محفل میں موجود تھیں نہ انہوں نے تحفہ ہی دیا تھا۔ سراج کے اعتراض پر بہن بولیں "واہ آپ تو اُن سے انجان رہئے، اور وہ آپ کو تحفہ دیں گی، وہ تو کہتی ہیں کہ جب تک آپ خود اُنھیں نہ بلانے جائیں وہ نہ آئیں گی !"

"ضرور، کیوں نہیں، لیجئے ہم ہی بُلا لاتے ہیں !"

سراج میاں اُٹھ کر جانے لگے۔ بھاوج نے طعنہ دیا "لیکن کیا اب بھی آپ ان کا تحفہ قبول کرینگے ؟"

"کیوں نہیں ہم تو ضرور ان کا تحفہ قبول کریں گے، خواہ وہ کوزہ گلاس ہی کیوں نہ ہو !"

سراج صفیہ کے کمرہ میں گئے صفیہ گم سُم بیٹھی ہوئی تھیں اور یہ عادت اُن کی عرصہ سے ہو گئی تھی، گو بہن کے سوا اس کا اندازہ شاید ہی کسی کو تھا، گھُلتے تو حکیم صاحب بھی تھے، اور صفیہ بھی، لیکن مرد اور عورت کے گھُلنے میں یہی فرق ہے کہ عورت گلر کی طرح گھُلتی ہے کہ اندر سے گھُن اسے خالی کر دے، اور باہر سے تماتا نظر آئے، اور مرد باہر سے گھُلتا ہے اور اندر سے دوسری بیوی یا خوشی کیلئے تیار رہتا ہے۔

سراج کی آہٹ سُنی تو صفیہ نے پوڈر مارنے اور سنورنے کا بہانہ لیا۔ سراج نے پوچھا "کیا ہم اندر آ سکتے ہیں صفیہ بیگم ؟" وہ اُٹھ کھڑی ہوئی لیکن کوئی جواب دئے بغیر گردن جھکالی، گویا وہ اس سوال سے ایک بیگانگت کی توہین محسوس کر رہی ہو۔

"دیکھئے آپ نے ہمیں کوئی تحفہ نہیں دیا :—"

صفیہ خاموش تھی۔

"کیوں آپ خاموش ہیں ! معلوم ہوتا ہے، ابھی آپکے دل سے وہ غبار نہیں گیا، کیا آپ نے ہمیں معاف نہیں کیا ؟"

صفیہ نے دیکھا کہ زیادہ خاموشی بے موقعہ ہو گی اسلئے بولنے کی کوشش کی "میری کیا مجال ہے جو ایسا تصور بھی ذہن میں لا سکوں !"

"پھر آپ خاموش کیوں ؟"

"جی سوچ رہی تھی کہ آپ مجھ ناچیز کا تحفہ قبول فرمانا گوارا کرینگے بھی یا نہیں !"

(مسکراتے ہوئے) "جی کیوں نہیں، جب اتنے "چیزوں" کا تحفہ قبول فرمایا ہے تو ایک "ناچیز" کا تحفہ قبول فرمانے میں ہمیں کیا عذر ہو سکتا ہے !"

"شکریہ ! لیکن میں آپکو کیا تحفہ دے سکتی ہوں ؟"

"آپ جس قابل سمجھیں !"

صفیہ کی آج، جانے، ایسی حالت کیوں تھی، یہ معلوم ہوتا
تھا کہ بیم و امید، شرم و حیا اس کی رگ رگ میں متولی ہے۔ وہ
الماری کے قریب گئی، ایک نہایت خوبصورت منقوشے کا ڈبہ
نکالا، اور سراج کے قریب آکر اُس نے پھر ایک بار سراج اور
اُس کی نظروں کا جائزہ سر سے پاؤں تک لیا، اور پھر ایک بار
سہمی نظروں سے گویا یہ پوچھنا چاہا کہ "آپ کہیں اس کا بھی مذاق
تو نہیں اڑائیں گے" جیسے جیسے وہ قریب آتی گئی اُس کے ہاتھ ہی نہیں
بلکہ سارا جسم کانپ رہا تھا، اور اس کے احمریں رخسار حسن و شباب
کی انتہا سے تمتما رہے تھے تو اُسکی پیشانی شرم و حیا کی بوندوں سے
گویا سُرخ و سفید مخمل پر موتیوں کا حاشیہ ٹانک رہی تھی، اس نے
آخری بار نظر سے نظر ملائی اور یقین کرنا چاہا کہ جو کچھ وہ کرنا چاہتی
ہے اُس کی سراج کے پاس کتنی قیمت ہے۔ اس کی آنکھیں شرم
کے مارے جھکی ہوئی تھیں، اور کچھ آبدیدہ بھی، وہ ایکدم آگے
بڑھی اور جھک کر "ناچیز کا ایک ادنیٰ تحفہ" کہتے ہوئے ڈبہ کو
سراج کے قدموں پر رکھ دیا، اور پرے ہٹ گئی۔

سراج کی حالت قابو سے باہر تھی، وہ یکدم جھکا اور
"ارے یہ کیا تحفہ کو کوئی سر آنکھوں سے لگاتا ہے یا قدموں پہ
رکھتا ہے؟" کہتے ہوئے ڈبہ کو اُٹھایا، کھول کر دیکھا تو وہی ساڑی
تھی جسے صفیہ نے اُس کے زخموں کے لئے پھاڑا تھا۔

سراج کے دل میں بجلیاں سما گئیں، اور ایسا محسوس کیا
کہ اس کا بخت عرش سے پرے کسی بلندی پر ہے، جیسے ہی اُس نے
صفیہ کی طرف اس بے تابی سے نظریں اُٹھائیں اُس کی زبان سے
صرف اتنا نکل سکا "صفی، تم!"

ان دو لفظوں میں جن جذبات کے دو جہان موجود تھے
اُن کا احاطہ لفظ و قلم کی دسترس سے باہر ہے۔ وہ صفیہ کے
قریب گیا جو گردن جھکائے کھڑی تھی، اور تھرتھراتے ہاتھوں سے
اپنے گلے میں سے ایک ہار نکال کر یہ کہتے ہوئے صفیہ کے گلے میں ڈالدیا:
"صفی!"
"جی!"
دل کے ٹکڑوں کو پھول کی پتیوں سے بھی تشبیہ دے سکتے
ہیں نا صفی؟

اتنے میں آوازیں آنی شروع ہوئیں۔ "ارے بھئی کیا ہوا
کوئی تحفہ لایا نہیں؟"
"بلانے کیا گئے خود بھی اُدھر کے ہو گئے!"........
"جی ہاں، ابھی آیا!" سراج میاں نکل آئے، تھوڑی
دیر میں صفیہ بھی آبیٹھیں، بہن نے پوچھا "کہئے کیا تحفہ لائیں، کیا
صراحی گلاس تو نہیں؟"
ایک قہقہہ پڑا، اتنے میں حکیم صاحب بھی آپہنچے، "کیا بات
ہے بھئی؟"
"دیکھئے ابا جان کب سے ہم منا رہے ہیں، اور سراج میاں
ہیں کہ برہمچاری رہنے کی قسم کھا بیٹھے ہیں، کچھ آپ ہی فرمائیے نا!"
"ہاں بیٹا آج تو تمہیں ہاں کرنی ہی پڑیگی! سب ہی کی
تو خوشی ہے!"
"اچھی بات ہے ابا جان، میں شادی کرونگا!"
سب نے اس خلاف توقع جواب پر حیرت و مسرت سے
آنکھیں پھاڑلیں اور کہا "کیا سچ؟"
"جی ہاں!"
باپ کو بھی بہت حیرت و مسرت ہوئی، پوچھا "لیکن کہاں؟"
سراج پہلے تو کچھ شرما گیا، پھر یکایک کچھ سوچ کر تن کر کھڑا
ہوا اور اُسی لہجہ میں جس میں باپ نے کہا تھا غصہ کی سی صورت
بنا کر صفیہ کی طرف ہاتھ بتاتے ہوئے بولا "یہ صفیہ سے پوچھیے!"
چوں کہ سب کو وہ منظر یاد تھا، پھر ایک قہقہہ پڑا، لیکن

ہنسی سے زیادہ اس میں وہ خوشی شامل تھی جیسے اس نے سب کے دل کی بات کہہ دی ہو۔ اور جب اس جذبہ کا جائزہ صفیہ کی صورت میں لینے کیلئے اُنھوں نے اُسے دیکھنا چاہا تو وہ اپنی جگہ سے کھسک چکی تھی۔

سیّد علی شاکر

"رُبابِ شکستہ"

(۱) مصیبت کا مردانہ وار مقابلہ کرو وہ آپ ہی آپ ٹل جائیگی۔
(۲) کسی کام کو شروع کرنے سے قبل یہ نہ سمجھ لینا کہ یہ تم سے ہو نہیں سکتا۔
(۳) دشمن دوست سے بہتر ہے کہ اُس کا ظاہر و باطن تو یکساں ہے۔
(۴) جو تم کو بھول جاتا ہے اُسکو تم بھی بھلا دے سکتے ہو۔
(۵) جہاں سچائی نہیں ہوتی وہاں لفاظی بہت ہوتی ہے۔ صداقت کو کسی ملمع کی ضرورت نہیں۔
(۶) من مندر کے سپنے بڑے سہانے ہوتے ہیں اِنھیں شرمندۂ تعبیر نہ کرو۔
(۷) ہر وہ بات جو تمہارے ذہن میں آجاتی ہے کہنے کی نہیں ہوتی۔ اور یوں بھی زبان دل کی سچّی ترجمان کب ہوئی ہے۔
(۸) حسّاس آدمی کیلئے بے پروائی بدترین قسم کا سلوک ہے۔
(۹) موت ہر وقت سامنے رہتی ہے۔ مگر نزدیک نہیں آتی۔
(۱۰) نیکی کی راہ پُرخطر ہوتی ہے لیکن اُس کا انجام شاندار ہوتا ہے۔
(۱۱) سچ کہو ہمیشہ سچ۔ خواہ یہ سچ تمھیں کتنا ہی مہنگا کیوں نہ پڑے۔
(۱۲) محبت کو عام کردو۔ دل مطمئن ہو جائیگا۔
(۱۳) اپنے جذبات کا تنور اپنے سینہ میں دبائے رکھو۔ اس دبی ہوئی آگ کو بھڑکنے نہ دو۔ پھر تو سارے سنسار کا جل بھی اسکو بجھا نہ سکے گا۔
(۱۴) حسّاس آدمی اگر کبھی کسی کو دھوکا دے تو اُس کا سارا جیون دُکھی ہو جاتا ہے۔

جہاں بانو

غزلیں

مرے نصیب کی اس دن یہ زندگی نہ رہی
مذاقِ غم مرا جس دن تری خوشی نہ رہے

جلا دے برق نشیمن گلوں کا دامن بھی
چمن میں ہم بھی نہیں ہیں بہار بھی نہ رہے

بجز ستم کوئی طرزِ "ستم" نہیں کہ مجھے
وہ غم قبول نہیں جو مری خوشی نہ رہے

حیات، موت سے بدتر ہے پھر بھی زندہ ہوں
مری طرح کوئی مجبورِ زندگی نہ رہے

حجابِ جلوۂ ساقی ہے میری بے ہوشی
کچھ اور چاہیے مستی کہ بے خودی نہ رہے

دلیلِ ہوش ہے یہ فرقِ جیب و دامن بھی
جنوں تو جب ہے کہ اتنی بھی آگہی نہ رہے

مری طلب ہے ترے لطف کا سبب ساقی
وہ جام مجھ کو نہ دے جس سے تشنگی نہ رہے

نقوشِ آرزو دھندلے ہیں اس سے بہتر ہے
کہ شمعِ زیست میں اتنی بھی روشنی نہ رہے

عجب نہیں وہ کریں ترکِ جور بھی تابش
کہ عہدِ شوق و وفا استوار ہی نہ رہے

تابش دہلوی

اپنی دنیا آپ بنا لے!!
غم کی لے کو اور بڑھا لے

تیری صدا پر کان لگے ہیں
دور نہیں میں مجھ کو بلا لے

عشق کا دل اب ٹوٹ رہا ہے
دیکھ منا لے اب بھی منا لے

کس کی رہی ہے کس کی رہے گی
پیتا جا او پینے والے

تو بھی اگر مدہوش ہو ساقی
گرتے ہوؤں کو کون سنبھالے

منزل میری آ پہنچی وہ
پھوٹ گئے جب پاؤں کے چھالے

ایک ڈگر پر جینا کب تک؟
جی کو کوئی روگ لگا لے

اس کے جلوے عام ہیں ناداں
کیسی مسجد کیسے شوالے

سلطان اریب

خانِ آرزو کا رسالہ سراجِ منیر

یہ رسالہ علامہ شہیر حضرت خانِ آرزو کی تصنیف ہے جس میں اُنھوں نے مولانا ابوالبرکات منیر لاہوری کے اکثر اُن اعتراضات کا جواب دیا ہے جو مولانا نے عُرفی شیرازی۔ طالب آملی۔ ظہوری ترشیزی اور زلالی خوانساری وغیرہ پر کئے تھے۔ منیر کے عنوانِ اعتراض میں تعصب و تہتک کا پہلو بہت نمایاں ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ کسی دیرینہ کاوش کا انتقام لینا چاہتے ہیں اور قیاس بھی یہی کہتا ہے اس لئے کہ اکبر کے وقت سے ایرانی و ہندوستانی نزاع جڑ مضبوط کر چکی تھی اور شاہجہاں کے زمانہ میں اس نے مستقلاً ادبی نوعیت اختیار کر لی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ایرانیوں کی ادبی برتری اور متکبرانہ برتاؤ کے خلاف ہندی علماء نے صدائے احتجاج بلند کی اور اپنا تفوق جتانے کے لئے ایرانیوں کی جا و بیجا غلطیوں کو واضح کرنا شروع کیا۔ اُن پر تنقیدیں کیں اور یہ ثابت کیا کہ ہندی فضلا بھی اُن سے کسی حیثیت سے کم نہیں ہیں۔ چنانچہ ملا شیدا کا قدسی پر اعتراضات کرنا اور منیر کا کارنامہ تصنیف کرنا اس دعوے کے بین ثبوت ہیں۔ ظاہر ہے کہ جذباتی تصنیفیں کماحقہٗ حقیقت پر مبنی نہیں ہوسکتیں اسی وجہ سے منیر کے اکثر اعتراضات غلط اور طعن آمیز ہیں۔ خانِ آرزو نے ان اعتراضات کی نہایت دیانت داری سے تردید کی ہے۔ البتہ جو اعتراضات صحیح ہیں ان کی داد بھی دی ہے اور یہی اُن کا سب سے بڑا کمال ہے۔ خانِ آرزو خود سراجِ منیر کی تالیف کا سبب یوں بیان کرتے ہیں :—

"اما بعد میگوید خوشہ چین خرمن سخن و دریوزہ گرایں فن سراج الدین علی آرزو تخلص کہ ایں رسالہ ایست مسمیٰ بہ سراجِ منیر مشتمل بر اکثر اجوبۂ اعتراضات مولانا ابوالبرکات منیر لاہوری کہ بر بعضے از اشعار چہار کس از شعرائے متاخر نمودہ و حل معنی ابیاتے کہ آں را بے معنی تصور فرمودہ۔ چوں راقم دریں باب خالی از تعصب و اعتساف است از حق شناساں متوقع انصاف است۔ و یکے ازآں چہار سیدی محمد عرفی شیرازی است"

اس رسالہ پر تنقیدی نظر ڈالنے سے قبل اگر مولانا منیر اور علامہ خانِ آرزو کا کچھ تعارف کرا دیا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔

منیر دورِ شاہجہانی کے اُن ممتاز فضلا میں سے ہیں جن کا نام ہندوستان میں فن تنقید نگاری کے محترمین کی صف اول میں دکھائی دیتا ہے۔ شعریت و ادبیت میں وہ نہایت نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔ تذکروں نے ان کے متعلق عام طور پر بہت کم لکھا ہے۔ اس ضمن میں خود مولانا کے رقعات اور بہار سخن مصنفہٗ محمد صالح کنبوہ لاہوری نہایت اہم ہیں۔ محمد صالح شاہجہانی دور کا مورخ اور منیر کا قریبی رشتہ دار ہے اور اس سبب سے اس کا بیان بہت مستند ہے۔ بہت عرصہ ہوا پروفیسر محمود شیرانی نے ایک مضمون مولانا منیر پر لکھا تھا اور اس میں اُنھوں نے بھی انہی دو تصنیفوں ۔ انشائے منیر اور بہار سخن ہی سے مواد اخذ کیا تھا۔

منیر بروز چہارشنبہ ۱۹؍۱۰۱۹ھ کو لاہور میں پیدا ہوئے۔ ان کے باپ کا نام بقول آزاد بلگرامی اور شیر خاں لودی عبدالمجید ملتانی تھا لیکن محمد صالح ان کا نام عبدالجلیل ابن حافظ ابو اسحاق لاہوری بتاتا ہے اور یہی زیادہ صحیح ہے اس لئے کہ جیسا بیان ہو چکا ہے محمد صالح منیر کا قریبی رشتہ دار اور ہمعصر ہے۔ عبدالجلیل فن خوشنویسی میں سارے ہندوستان میں مشہور تھے اور اکبر کے یہاں خوشنویسوں کے زمرہ میں

ملازم بھی تھے۔ وہ نہایت اچھی استعداد کے انسان تھے اور اساتذہ کے مشکل سے مشکل شعر حل کرنے میں خاص ملکہ رکھتے تھے۔ منیر کے علاوہ ان کے دو اور بیٹے تھے ایک ابوالفیض متخلص بہ فیض اور دوسرے ابوالفتح متخلص بہ ضمیر۔ اس طرح منیر کا پورا خاندان علمی و ادبی فضا میں سانس لے رہا تھا اور اسی ماحول کا نتیجہ ہے کہ خود منیر بھی اپنے زمانہ کے علما میں سے ایک مانے جاتے ہیں۔

بہرحال منیر کا لاہوری ہونا مسلّم ہے۔ ابھی پانچ[۶] ہی برس کے تھے کہ مکتب میں بیٹھے۔ شعر و شاعری کی طرف فطری میلان تھا چنانچہ ابتدا ہی سے اساتذہ کے شعر حفظ کر لیا کرتے تھے جو بعد میں اُن کی شاعری کا سرمایہ بن گیا۔ چودہ[۱۴] برس کے سن میں منیر نے شعر کہنا شروع کیا اور فلکی، سنائی اور انوری کی تقلید کرنے لگے۔ ۱۰۴۵ھ میں مولانا منیر اکبر آباد گئے اور مرزا صفی مخاطب بہ سیف خاں کے یہاں دو سو بیس[۲۲۰] روپیہ ماہوار پر ملازم ہوئے۔ سیف خاں کے یہاں مولانا نسیمی۔ مولانا جلالی۔ مولانا کلامی اور مولانا بدیہی وغیرہ اہل کمال کا جلسہ رہا کرتا تھا۔ ان لوگوں نے منیر کو ہاتھوں ہاتھ لیا اور وہ سیف خاں کے یہاں فارغ البالی سے بسر کرنے لگے۔ منیر ایک دفعہ خان موصوف کے ساتھ بنگالہ بھی گئے اور یہیں اپنی مثنوی مظہر گل بنگالہ کے میووں کی تعریف میں اور کارستان سلاطین مشرق کے حالات میں تالیف کی ۱۰۴۹ھ میں جب سیف خاں کا انتقال ہوا تو علما کا شیرازہ منتشر ہو گیا مولانا نسیمی اور مولانا جلالی بہار کی طرف چلے گئے۔ مولانا منیر کچھ دنوں راج محل میں مقیم رہے اور پھر پٹنہ آئے۔ شائستہ خاں نے ان کی عزت و احترام کیا لیکن وہ وہاں نہ ٹھہرے اور اپنی خواہش اور اپنے دوست مولانا ابوالبقا کی وساطت سے جونپور میں اعتقاد خاں کے یہاں آئے اور ایک سو بیس[۱۲۰] روپے ماہوار پر ملازم ہوئے کچھ زمانہ تک جونپور میں رہنے کے بعد اعتقاد خاں کی سرد مہری سے عاجز آکر مولانا آگرہ چلے گئے اور شاہجہانی شعرا کے زمرہ میں شامل ہوئے۔ مولانا منیر نے ۱۰۵۵ھ میں چھتیس[۳۶] برس کی عمر میں انتقال کیا۔

باوجودیکہ مولانا منیر کو دنیا میں رہنے کا بہت کم موقعہ ملا تاہم انہوں نے متعدد تصنیفیں اور تقریباً ایک لاکھ شعر یادگار چھوڑے۔ ان کی تصنیفوں میں رقعات (۱۰۵۰ھ)۔ شعرائے ہند کا ایک تذکرہ (۱۰۵۲ھ و ۱۰۵۴ھ) قصاید عرفی کی ایک شرح اور کارنامہ نہایت اہم ہیں۔ بدقسمتی سے یہ سب بہت کم یاب ہیں اور تذکرہ تو مفقود ہی ہے۔ شاعری میں ایک کلیات چھوڑا جس میں اشعار کی تعداد ایک لاکھ بتائی گئی ہے مولانا آزاد بلگرامی کا بیان ہے کہ

”صاحب طبع منیر نظم و نثر دلپذیر است۔ در منشآت خود گوید من بے خانماں کہ در قلمرو سخن وطن گزیدہ ام صد ہزار بیت بلند بنیاد نہادہ ام“

مولانا منیر کی تصنیفیں اگر مل سکیں تو ان کی قابلیت اور مبلغ علم کا پورا پورا اندازہ ہو سکتا۔ رقعات اور کارنامہ (جس میں انہوں نے عرفی طالب۔ ظہوری و زلالی وغیرہ پر اعتراضات کئے تھے) کے اقتباسات سے پتہ چلتا ہے کہ منیر فن نقد و تبصرہ میں ید طولیٰ رکھتے تھے اور نثر نگاری میں بے مثل و بے نظیر تھے اور اسی مرصع و مسجع طرز میں اعتراضات بھی کرتے تھے جن میں سے اکثر غلط ہیں لیکن جو صحیح ہیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ منیر کا ذوق کس قدر سلیم تھا چنانچہ سراج منیر نے بھی بعض جگہ ان کے پاکیزہ مذاق کی داد دی ہے۔

منیر اور خان آرزو دونوں اپنے اپنے زمانہ کے علامہ رہے ہیں مگر ان دونوں میں تقریباً ایک صدی کا فرق رہا ہے اور اس فرق زمانہ نے خان آرزو کو اُس فن میں کامل بنا دیا جس کی داغ بیل منیر نے ڈالی تھی۔ منیر کے لہجہ میں وہ متانت نہیں تھی جو اساتذۂ ایران کے مرتبہ کے مطابق ہوتی نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی تنقید تنقیص ہو کر رہ گئی۔ اس کے برعکس خان آرزو نے نہایت سنجیدگی و راست بازی کے ساتھ ہمیں سمجھایا کہ صحیح تنقید کی تشکیل کن کن عناصر سے ہوتی ہے ”دیانت نقد کسے کہتے ہیں اور بے باکی تبصرہ کیا چیز ہے۔ وہ اس جذبۂ ایمانداری میں یہاں تک بڑھے ہوئے

ہیں کہ نہ عرفی و ظہوری کو چھوڑتے ہیں اور نہ منیر کی جنبہ داری کرتے ہیں ہر ایک کے تار و پود بکھیر کے رکھ دیتے ہیں۔ چونکہ میں خانِ آرزو کی علمیت و تنقید نگاری کے متعلق متعدد جگہوں پر لکھ چکا ہوں اس لئے یہاں محض مجموعۂ نغز پر اکتفا کی جاتی ہے۔ دو ایک اقتباسات ملاحظہ ہوں۔

"وے از جادو طرازانِ سحر بیانِ داستان دان نکتہ دان خاک پاک ہندوستان، و صاحب تصانیف بسیار، مالک اشعار بے شمار، واقف فروع و اصول، ماہر منقول و معقول، جمع کمالات، منبع حسنات، بحلیۂ علم و حلم آراستہ، بہ زیور دانش و بینش پیراستہ، بہ اوصاف حمیدہ موصوف، بہ اخلاق پسندیدہ معروف، نکتہ سنج، شیریں زبان، ظریف الطبع، عذب البیان بود۔ بر کتب متداولۂ علوم رسمیہ بدرجۂ عبور داشت کہ درس شرح (مطالع) و شرح حکمت العین، مانند آں کہ در آں آوان مروج بودمی داد۔ اما چوں طبع نقادش بیشتر میل بشعر داشت بشاعری نام برآورد حق آنست کہ وجود ایں چنیں کس در خاک پاک ہندوستان حکم اکسیر اعظم دارد۔ جوہر قابلیت و کتاب دانی وے از تصانیفش بر منصفان اہل سخن ظاہر است و ہویدا"

بقول قاسم تصنیفوں کی فہرست یہ ہے۔ فہرست نامکمل ہے اس لئے کہ ان کے علاوہ اور بھی بہت سی کتابیں خانِ آرزو نے لکھی ہیں۔

(۱) دیوانے درجواب بابا فغانی (۲) دیوان دیگر درجواب کمال خجند بہ بحر خفی و دیوان ضخیمے مشتمل بر انواع سخن دارد۔ تصانیف دیگرش (۳) سراج اللغۃ (۴) چراغ ہدایت (۵) تنبیہ الغافلین۔ (۶) رسالہ در علم بیان (۷) شروح بعضے کتب فارسی ہم از و یادگار است۔

خانِ آرزو فارسی کے استاد ہونے کے علاوہ زبان اردو پر بھی پورا عبور رکھتے۔ اُن کا کوئی اردو کا دیوان موجود نہیں۔ لیکن وہ ریختہ گویوں کے ابو الآبا ضرور ہیں اور اردو زبان کے اساتذہ انہیں کے شاگرد ہیں ملاحظہ ہو:۔

"نسمہ پرواز (سخن پرواز) الہام گوئی میاں آبرو و سرآمد سخن سنجان خوش نوا میرزا سودا و مملکت سخن سازی را یکہ تاز مرد خواجہ میر درد و شاعرے بے نظیر محمد تقی میر مستجلا فیض اندوزانِ آں گیہان خدیو سخن پردازی اند۔ بنا بریں کہ علما اہل حق را دامت برکاتہم عیال امام ہمام قبلہ انام ابو حنیفہ کوفی رضی اللہ عنہ می گویند اگر شعرائے ہندی زبان را عیالِ خانِ آرزو گویند می سزد ——"

یہاں تک مولانا منیر اور علامۂ خانِ آرزو پر سرسری نظر ڈالنے کے بعد آئیے اب رسالہ پر تحقیق کی نگاہ ڈالیں۔ سراج منیر جیسا میں لکھ چکا ہوں منیر کے کارنامہ کا جواب ہے۔ کارنامہ دستیاب نہ ہوسکا اس وجہ سے راقم یہ جاننے سے قاصر رہا کہ اس میں کتنے شعرا پر اعتراضات تھے، اشعار کی تعداد کیا تھی اور شعرا کس ترتیب سے رکھے گئے تھے تاہم اگر ہم سراج منیر سے قیاس کریں تو پتہ چلتا ہے کہ پہلا شاعر عرفی شیرازی ہے جس کے اٹھارہ شعروں پر منیر نے اعتراضات کئے تھے اور انہیں اٹھارہ شعروں کی تردید و تائید خانِ آرزو نے اس رسالہ میں کی ہے۔ عرفی کے چند شعر، منیر کا اعتراض اور خانِ آرزو کا محاکمہ لکھا جاتا ہے اور اس کے بعد با لترتیب اور دوسرے شعرا کا ذکر ہوگا۔

(۱) عرفی ؎ چہرہ پرواز جہاں رخت کشد چوں بحمل ‌ ‌ ‌ شب شود نیم رُخ و روز شود مستقبل

اعتراض منیر۔ منیر اس شعر کو بے معنی کہتے ہیں اور ثبوت یہ دیتے ہیں کہ جوں ہی آفتاب برج حمل میں جاتا ہے اسی وقت رات اتنی نہیں گھٹ جاتی ہے کہ "نیم رُخ" ہو جائے اور نہ دن اتنا بڑھ جاتا ہے کہ اُس پر "مستقبل" ہونے کا اطلاق ہونے لگے۔

محاکمہ خانِ آرزو۔ خانِ آرزو کہتے ہیں کہ انصاف پسندوں پر یہ بات روز روشن کی طرح ظاہر ہے کہ عرفی کا مقصد یہاں نیم رخ کہنے سے یہ ہرگز نہیں ہے کہ رات آدھی رہ جاتی ہے بلکہ اس نے کنایہ کیا ہے مطلقاً شب کے کم ہو جانے سے۔ عرفی نے "نیم رُخ" اور "مستقبل"

من حیث الایہام استعمال کیا ہے اور یہ ضروری نہیں کہ جوں ہی آفتاب برج حمل میں داخل ہو دن کافی بڑھ جائے اور رات بہت کم ہو جائے۔ عرفی کے مفہوم کی توضیح یوں ہو سکتی ہے کہ مثلاً میں کسی سے کہوں کہ آج رات کو جو میرے یہاں آئے گا پیسہ پائے گا۔ اب ضروری نہیں ہے کہ جوں ہی وہ شخص میرے یہاں آئے میں پیسہ دے دوں اور اپنا وعدہ پورا کروں بلکہ رات بھر میں کسی وقت بھی اگر دے دوں تو میں اپنے وعدے میں سچا ہی رہونگا۔ بعینہ یہی مفہوم عرفی کا بھی ہے کہ جب تحویل آفتاب ہوتی ہے تو دن بتدریج بڑھنے لگتا ہے اور رات گھٹتی جاتی ہے اُس کے کہنے کا یہ مطلب نہیں کہ فوراً دن بہت بڑھ جاتا ہے یا رات بہت گھٹ جاتی ہے۔ انوری نے عرفی سے پہلے اس مضمون کو یوں نظم کیا تھا ؎ جرم خورشید چو از حوت در آید بحمل　　اشہب روز کند اوہم شب را ارجل

یہاں ارجل کے معنی سفید گھوڑے کے ہیں اور کسی طرح یہ ممکن نہیں کہ تیر کے خیال کے مطابق یہ شعر بھی صحیح ہو۔ لیکن بہرحال یہ شعر بالکل درست ہے۔ اِن دونوں شعروں کے تقابل سے ایک نکتہ اور پیدا ہوتا ہے اور وہ یہ کہ عیب بیں نگاہیں کہیں اسے سرقہ نہ کہہ دیں اور عرفی کو موردِ الزام ثابت کریں۔ اِن کا جواب خانِ آرزو کے قول کے موافق یہ ہو سکتا ہے کہ عرفی نے سرقہ نہیں بلکہ اخذ کیا ہے۔ اخذ دو قسم کا ہوتا ہے ایک من حیث العجز والسرقہ جو مذموم ہے اور دوم من حیث الجواب والتتبع اور یہ مستحسن ہے۔ استادوں نے بھی اسے جائز رکھا ہے مثلاً شیدا کا یہ شعر ؎　چیست دانی بادۂ گلگوں مصفا جوہرے　　حسن را پروردگار و عشق را پیغمبرے

رودکی کے اس شعر سے ماخوذ ہے ؎　عشق را من پیمبرم لیکن　　حسن را آفریدگار توئی

لیکن پھر بھی شیدا کا شعر سرقہ نہیں ہے بلکہ اُس سے کہیں زیادہ بہتر ہے اور علمائے معانی نے لکھا ہے اگر پہلے شعر سے دوسرا بلیغ ہو جائے تو درست ہے جیسا کہ تلخیص المفتاح کے خاتمہ میں بھی مذکور ہے۔

عرفی (۲) شاہدِ عصمت تلاشِ صحبتِ من کے کند　　خونِ حیضِ دخترِ رز جو شد از لبہائے من

تیر کے خیال میں یہ شعر اخلاق سے گرا ہوا ہے چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ "این بیت رنگین نکتۂ الشعر حیض الرجال را آب دادہ بفتوائے انصاف زبانیکہ بایں بیت آلودہ گردد برو ے واجب است کہ از عرقِ انفعال تا ابد غسل کند۔ پیدا است کہ ازیں دستِ سخن ناپاکیزہ را رنگین نگاشتن خونِ انصاف ریختن است"

خانِ آرزو یہ جواب دیتے ہیں کہ خونِ حیض کہہ دینے سے شعر مخرب اخلاق نہیں ہو سکتا اس سے زیادہ سخت قسم کے الفاظ اساتذہ نے استعمال کئے ہیں اور جائز رکھا ہے۔ مثلاً قلتبان، انوری کے یہاں آیا ہے ؎

خسروا بندہ را چو دہ سال است　　کہ ہمیں آرزوئے آں باشد
کز ندیمانِ مجلس ار نہ شود　　از مقیمانِ آستاں باشد
تا چہ باشد کہ در ممالک شام　　شاعرِ خام قلتباں باشد

یا خاقانی ؎　از آں شد پردۂ چشمم بخونِ بکر آلودہ　　کہ یاد لعبتاں در دیدہ جنتی کرد پنہانی

عرفی (۳)　ذاتِ تو اعتدالِ سلیماں مزاجِ عدل　　عقلِ تو مغز و جوہرِ کل استخوانِ علم

تیر "استخوانِ علم" پر اعتراض کرتے ہیں اور لکھتے ہیں کہ "استخوانِ علم استعارہ ایست بے مغز"

خانِ آرزو جواب دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ "استخوانِ علم" مطلقاً استعارہ نہیں بلکہ استعارہ بالکنایہ ہے۔ علم کو ایک آدمی قرار دیا ہے اور اُس کے لئے استخوان ثابت کر دیا ایسی صورت میں "استعارہ مذکور را بمغز گفتن از بیک مغزی است" ہاں عبارت "سلیمان مزاج عدل" نہایت نامناسب الفاظ رکھتی ہے اس لئے کہ سلیمان کا تعلق عدل سے نہیں ہے بلکہ دولت و نگیں سے ہے۔ عدل کا تعلق نوشیروان سے مناسبت رکھتا ہے۔

عرفی (۴) در دہن بخت عقل ناوک لا گفتن — در کمر درسِ عشق دست نعم داشتن

منیر "کمر درسِ عشق" پر اعتراض کرتے ہیں۔ خانِ آرزو کہتے ہیں کہ یہ بھی استعارہ بالکنایہ ہے اور صحیح ہے۔

عرفی (۵) مضجع دشمنت بشرط وفات — صدر ایوانِ ربع مسکوں باد

مولانا منیر اس شعر پر اعتراض کرتے ہوئے نہایت طعن کے ساتھ لکھتے ہیں کہ "ایں بیت زندہ دلاں را خبرے از مرگ معنی میدہد۔ جائے آں دارد کہ بر لوح مزارِ او بنویسند"

خانِ آرزو منیر کے اس بے جا اعتراض اور طعن کے سبب جامہ سے باہر ہو جاتے ہیں اور لکھتے ہیں کہ "دل مُردہ باشد کہ بہ لطف لفظ و معنی ایں بیت نہ رسد و دلِ مُردہ نیز آنکہ بے معنی داند ہیچ واضح نہ شد کہ ایں نکتہ داں ایں ہمہ حرف گیری بے جا را کہ غازۂ ملامت ابدیست چرا برائے خود اختیار کردہ۔ روئے تعصب سیاہ۔"

عرفی (۶) اقبال کرم میگزد اربابِ ہمم را — ہمت نخورد نشتر آرے و نعم را

منیر اس شعر کو بے معنی ٹھہراتے ہیں اور لکھتے ہیں کہ "واقعی ایں بیت دل آویز را بیت ابروتواں خواند با ہمینی کہ معنی ندارد"

خانِ آرزو اس طنزیہ فقرہ کا جواب یوں دیتے ہیں کہ اگرچہ یہ شعر مہمل و بے معنی نہیں ہے لیکن شاعر کی بلند ہمتی کی شان سے پست ہے۔ اصل عبارت جواب کی یہ ہے "۔۔۔ ہیچ لطف شاعرانہ ندارد بلکہ باوجود تصحیح معنی خالی از اشکالے نیست۔ چہ لفظ آرے و نعم یا لا و نعم مستلزم سوال است و سوال ننگ ہمت است با آنکہ از مقام معلوم می شود کہ برائے خود اثبات ہمت می نماید"

دوسرا شاعر جس پر منیر نے اعتراض کیا ہے طالب آملی ہے جسے بلبل آمل کہتے ہیں۔ خانِ آرزو نے اس کے کل پندرہ[15] اشعار دیے ہیں اور اعتراضات کے بعد محاکمہ کیا ہے ملاحظہ ہو۔

طالب (۱) افسرد آتش دل و آب سرشک ماند — بر کیوان دیدہ خضاب سرشک ماند

منیر کہتے ہیں کہ "کیوان دیدہ" بالکل بے معنی ہے۔

خانِ آرزو کہتے ہیں کہ چونکہ منیر نے "کیوان دیدہ" کی اضافت کو اضافت مشبہ و مشبہ بہ سمجھا ہے اس لئے یہ غلطی کی ہے۔ یہ استعارہ بالکنایہ ہے اور شاعر کے مناسبِ مذاق ہے۔ اس سے مُراد مژگاں ہے۔

طالب (۲) آنم کہ طفلانِ تہ ٔ سرِ کبر نیز او ہست — تخمیر بروتم ہمہ از عنصر باد است

منیر نے اس شعر میں حشو بتایا ہے اور "تخمیر بروت" کا مضحکہ اڑایا ہے۔

خانِ آرزو نے بعض مہمل اعتراضوں کے جواب میں وہی لہجہ اختیار کیا ہے جو خود معترض کا تھا۔ چنانچہ اس کے جواب میں لکھتے ہیں کہ "بروت را مخمر و مرکب ندانستن در خندۂ عالمے بر روئے خود وا کردن است و مطلب از خمیر مایۂ رشیخند کہ خود آوردہ کم نخواہد شد۔ صدق

من قال من ضحک ضحک۔

طالب (۳) رمزکہ میرزند زمسامات غمزہ اش صد نیش چاشنی بدلِ انگبیں زند

مِیر۔ میں "مسامات غمزہ" کو کیا کہوں اور "نیش چاشنی" کو کیا لکھوں۔ اگر اس سے زیادہ عیب جوئی کروں گا تو زبونِ طبع کو مجھے نیش بغض و عناد سے ایذا پہونچائینگے۔

خانِ آرزو کہتے ہیں شعر نہ سمجھنا اور اعتراض کر دینا غلطی ہے۔ ع یارے چو عسل نمی دہی نیش مزن۔ "مسامات غمزہ" میں اضافت تشبیہی نہیں ہے۔ جس کو سمجھ کر میر نے اعتراض کیا ہے بلکہ یہ استعارہ بالکنایہ ہے اور "نیش چاشنی" نہایت نازک تشبیہ ہے۔ شعر کا مطلب یہ ہے کہ معشوق کے غمزہ کے ہر بنِ مو سے جو رمز نکلتے ہیں وہ اس قدر شیریں ہوتے ہیں کہ محض ان کی چاشنی یعنی تھوڑی سی مٹھاس شہد جیسی شیریں شئے کے دل میں بھی سیکڑوں نشتر لگاتی ہے۔ ایسی صورت میں کمال مبالغہ مقصود ہے۔

طالب (۴) خونِ اثر کہ زینت منقار بلبل است از ناخن ترنم زاغم فشردہ اند

مِیر۔ "اگر در ناخن ترنم بند کنم نشتۂ امتحان را ایں سخن ناخن بدل میزند۔ چوں ناخن کاوش می کنند و گفتار را بیک سرِ ناخن نمی پذیرند"

خانِ آرزو۔ ناخن زنِ بیجا کہ روئے سخن را خراشد و زمین غزل را کاود چوں ناخن تراشیدہ درخاک بہتر است۔

؎ برمن زبانِ طعن و سخن چیں بطبع گنج ہر کہ شود دراز چو ناخوں بریدنیست

اتنا لکھنے کے بعد خانِ آرزو نے محاکمہ کیا ہے اور لکھا ہے کہ "ناخن ترنم" استعارۂ بالکنایہ ہے۔ ہاں نسبت "زاغم" میں اُن کو بھی تردد ہے اس لئے کہ اس میں اضافتِ تشبیہی ہو نہیں سکتی اور استعارہ بالکنایہ بہت دور از کار ہوگا۔

تیسرا[۳] شاعر زلالی خوانساری ہے۔ اس کے کل ساٹھ شعر ہیں۔

زلالی (۱) قلم از من بغواصی در آمد سرِ زلفش برقاصی در آمد

مِیر کو "رقاصی سرِ زلف" پر اعتراض ہے۔ اس لئے کہ اس کے کوئی معنی نہیں۔

خانِ آرزو کہتے ہیں کہ "سرِ زلف قلم" استعارہ بالکنایہ ہے اور ممکن ہے کہ "سرِ زلف" سے مراد خط ہو ایسی صورت میں نہایت نازک تشبیہ ہوگی۔ "رقاصی سرِ زلف" کنایہ ہے زلف کی کمال خوشی سے من حیث الاستعارہ۔ لیکن دونوں مصرعوں میں کچھ ربط نہیں اس لئے اگر اعتراض کیا گیا تو بے جا نہیں ہے۔

زلالی (۲) چنیں از دود بُرد آتش از رنگ کمان و ترکش چیں بر سرِ جنگ

مِیر اس شعر کو بے معنی ٹھہراتے ہیں اور شاکی ہیں کہ کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔

خانِ آرزو بھی میر کی تائید کرتے ہیں اور لکھتے ہیں کہ انصاف آنست کہ جامۂ الفاظ بر قامت معنی لبسیار کوتاہ است و بعد بر آمدن حاصل ہیچ نیست وحق در ینجا بطرف ابو البرکات میر است۔

زلالی (۳) ز اندام ایازان شوخ خونریز مقشر میکند بادام انگیسنہ

بقول مِیر یہ شعر بے مغز ہے۔

خانِ آرزو کہتے ہیں کہ معشوق کے بدن کو بادام مغز سے تشبیہ دینا نہایت عمدہ ہے۔ ہاتفی کہتا ہے ؎

پاکیزہ تنے چو نقرۂ خام — نازک بدنے چو مغز بادام

زلالی (۴) ایاز کش بدیواں بناگوش — نوشتہ شاہ بیت غارت ہوش

نیرّ۔ میں متحیر ہوں کہ "دیوان بناگوش" کی تعریف کروں یا "شاہ بیت غارت ہوش" کی

خانِ آرزو بھی نیرّ کی تائید کرتے ہیں اور لکھتے ہیں کہ "بناگوش" کو دیوان سے تشبیہ نہیں دی جا سکتی بلکہ صفحہ یا ورق سے جائز ہو سکتی ہے لہٰذا نیرّ کا اعتراض صحیح ہے۔

چوتھا شاعر ظہوری ترشیزی جس کی تعریف میں خانِ آرزو نے بہت مبالغہ کیا ہے اور غزل میں تمام متاخرین سے بہتر و افضل قرار دیا ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا سبب ہے کہ عرفی و نظیری کو تو اس قدر مقبولیت حاصل ہوا اور ظہوری کو کوئی جانے تو ساقی نامہ و نثر کی وجہ سے۔ جہاں تک میرا خیال ہے ظہوری کی طرز ادا اور جدّت اسلوب میں وہ شگفتگی و سادگی نہیں جو عرفی و نظیری کا طرۂ امتیاز ہے۔

بہرحال خانِ آرزو نے اپنے خیال کا اظہار یوں کیا ہے :۔

"باعتقاد فقیر (آرزو) مثل وے از آدم الشعرا کہ رودکیست تا ایندم بہم نرسیدہ چہ در نظم وچہ در نثر طرز تازہ او ہنوز بکراست۔ اگرچہ طبل آملی (طالب آملی) دریں گل زمین مرغولہ ریز ترانہ گردیدہ امّا در واقع آہنگ او آب و رنگ دیگر داشتہ۔ ہر چند کسے را برآں میلے نداد ہ اند محض مسلم الثبوتے ایں سخنور بہر اکابر عصر و اساتذہ کہ بعد او آمدہ اند رسیدہ وگویا مصداق معنی ایں بیت اوست ؎

ہم چشمی ماکرا مجال است — فہمیدن شعر ما کمال است

ظہوری کے کل پندرہ[۱۵] شعر دیئے ہیں۔ ہر ایک پر محاکمہ کیا ہے اور تردید و تائید کے ساتھ تنقید کا حق ادا کیا ہے۔

ظہوری (۱) بوزیب ہنداں حنائے عجب — کہ بر کف نہی رنگ زوید ز لب

نیرّ۔ یہ شعر یقیناً پان کی تعریف میں ہے لیکن اپنے معنی نہیں دیتا۔

خانِ آرزو کہتے ہیں کہ ظہوری نے از روئے مبالغہ یہ کہا اور کس قدر عمدہ کہا ہے "بگفتن عجب از عہدۂ برآمدہ"

ظہوری (۲) بدستم دہ آں رشک یاقوت را — کہ سازد علاج عقل فرتوت را

نیرّ کہتے ہیں کہ دوسرا مصرعہ مہمل ہے۔

خانِ آرزو کہتے ہیں کہ دوسرے مصرعہ میں ناسخ کی غلطی ہے ظہوری کا مصرعہ تو یوں ہے۔ ع

کہ سازد جواں عقل فرتوت را

ظہوری (۳) فلک بہر تعمیر دیر خراب — گل شادمانی گرفتہ در آب

نیرّ کہتے ہیں کہ شادمانی کو گل سے کوئی نسبت نہیں۔

خانِ آرزو کہتے ہیں کہ "گل شادمانی" میں اضافت تشبیہی نہیں ہے جو غالباً نیرّ کا خیال ہو۔ بلکہ "گل چیزے در آب گرفتن" کنایہ ہے کسی کام کے شروع کرنے سے اور یہ اہل زبان کی اصطلاح ہے لہٰذا اصطلاحوں سے معترض کا عدم وقوف ظاہر ہے۔

ظہوری (۴)   دہد ابر تاکشت غم را آب   زباراں رواں کرد سیل شراب

نیر کہتے ہیں کہ "باراں" کو سیل شراب کہنا غلطی ہے۔ اگر سیل شراب کے بجائے "عالم آب" ہوتا تو بہت اچھا تھا۔
خان آرزو اس کا جواب یوں دیتے ہیں کہ چونکہ معترض ظہوری کے طرزِ سخن سے بیگانہ ہے اس وجہ سے عالم آب کو اپنی دانست میں مناسب سمجھا۔ یہ نیر کے خیال کے مطابق درست ہوگا ظہوری کے خیال میں نامناسب ہی تھا۔
یہ رسالہ ایک خاتمہ کے ساتھ ختم ہوگیا ہے جس میں خود خان آرزو نے نیر کے اشعار و فقروں پر اعتراضات کئے ہیں جو غالباً منتہا پر حرف گیری کرنے کے جوش میں اُنہوں نے کیا ہو۔ دو چار اعتراضات ملاحظہ ہوں۔

نیر (۱)   تعالی اللہ ازیں شہر چمن خیز   کہ یاد اوست بر دلہا فرح بیز

اعتراض خان آرزو:۔ "رنگین خیالاں می فہمند کہ چمن خیز ترانہ زاغ ایں بوم است نہ گلبانگ بلبل آن چمن"

نیر (۲)   زبانم را زمعنی آبرو دہ   زشعر ترلبم را شست و شو دہ

خان آرزو:۔ دوسرے مصرعہ کے دو معنی ہو جاتے ہیں اگر بجائے حرف (زا) بار موحدہ استعمال ہوتا تو شعر زیادہ صاف ہو جاتا۔
خان آرزو نے نیر کے جن فقروں پر اعتراض کیا ہے اس میں سے دو ملاحظہ ہوں ایک جگہ نیر نے لکھا تھا:۔
نیر (۱) "انگیز لب ما چہ توانم گفت کہ سخن از شرم لب می گزد"
خان آرزو نے یہ اعتراض کیا ہے کہ "لب گزیدن" غصہ کی حالت میں مستعمل ہے نہ کہ شرم میں
نیر (۲) "بعضے از کج طبعاں بایں بیت کہ از نزاکت ابرو نازک کردہ بکردار ابروئے خوباں ناز میکند"
خان آرزو کہتے ہیں کہ "ابرو نازک کردن" بہت کم استعمال ہوا ہے جو اصطلاح اہل زبان ہے وہ "پشت چشم نازک کردن" ہے۔

اقبال انصاری

محسوسات ماہر

جب موت زندگی سے ہم آغوش ہوگئی   ہر بات ایک خوابِ فراموش ہوگئی
فصلِ بہار میکدہ بر دوش ہوگئی   شبنم کی بوند بادۂ سرجوش ہوگئی
اللہ رے! تصورِ رنگیں کا اہتمام   موجِ خیالِ یار کا آغوش ہوگئی
پروانے اپنی دُھن میں تصدق ہوا کئے   اور شمع اس ہجوم میں خاموش ہوگئی
نظارہ و نگاہ کا منظر بدل گیا   آتے ہی اُن کے بزم ہی بے ہوش ہوگئی

اُس یاد پر ہے آج بھی ماہر کو ناز دست
جو یاد اُن کے دل سے فراموش ہوگئی

ماہر القادری

محتسب اور میں

بدل کے بھیس خداوندگا زمانے میں
یہ کون کرتا ہے دیر وحرم میں شدادی!

یہ کس کے خوف سے پانی ہے مفلسوں کا لہو
یہ کس کے پاؤں پہ دم توڑتے ہیں فریادی!

جہاں میں کس کی سفیہانہ حرکتوں کے طفیل
بدل رہی ہے غلامی کا بھیس آزادی

یہ کس کے مکر سے ہے تنگ کارگاہِ حیات
رہا ہے کس کے ارادوں کا سنگِ بنیادی

یہ کس کے دم سے بھڑکتے ہیں چار سُو شعلے
یہ کس کی روح کا مقصد ہے فتنہ ایجادی

چبا رہا ہے کلیجے یتیم بچوں کے
مچا رہا ہے ہر اک بحر و بر میں بربادی

یہ کس نے عام کئے ولولے گناہوں کے
سبق پڑھائے کمینوں کو کج کلاہوں کے

مری رگوں میں ہے ایمان کی درخشانی
مرے وجود میں جلتی ہے شمعِ عرفانی

مرے کلام کے ہر حرف میں ہیں پوشیدہ
وہ راز جن سے ہوا ہے عروجِ انسانی

مجھے تو پاس ہے اُس عادتِ کا اے ظالم
جھکے تھے میرے لئے جب فلک تک نورانی

کسی غریب کا حق چھین کر مجھے نہ دکھا
کہ یہ ہے میرے لئے موجبِ پریشانی

میں تنگدست ہوں لیکن ہوس پرست نہیں
کہ روند روند دیا میں نے تختِ خاقانی!

مجھے خدا کی قسم ہے، کہ اِک خدا کے بغیر
جھکی نہ غیر کے قدموں پہ میری پیشانی!

مجھے "شراب نگاری" کا تو نہ دے الزام
چھلک رہا ہے مقدس لہو سے تیرا جام

یہ مانتا ہوں کہ وارفتۂ خیال ہوں میں
بجا ہے، میں ہوں کسی کی نظر کا دیوانہ

یہ سچ ہے میں نے صبوحی کے ساتھ راتوں کو
ہزار بار کیا ہے طوافِ مے خانہ

یہ سب درست، تراشے ہیں وہ صنم میں نے
نثار جن پہ ہو یونانیوں کا بُت خانہ

مگر نگاہ میں ہیں وہ حسین راہیں بھی
ہے جن کے ذروں میں روحانیت کا افسانہ

کبھی حسینؓ کی بے چارگی پہ رویا ہوں
دکھا گیا ہوں کبھی جرأت خلیلانہ

گناہگار ہوں، حق سے مجھے گریز نہیں
ترے لبوں پہ ہے رقصاں ریا کا افسانہ

تو اپنے سبحہ و زنار کی حفاظت کر
ندیم کو نہ کبھی چھیڑنے کی جرأت کر

احمد ندیم قاسمی

پیمانِ وفا

"تم دنیا کی جھاڑو ہو" میں نے کپکپاتے ہوئے ہاتھوں میں جام شراب تھام کر لبوں سے لگاتے ہوئے کہا:
"کیا کہا آپ نے معلوم ہوتا ہے کہ ایک ہی جام نے آپ کو اتنا بے خبر کر دیا ہے۔ جو آپ مہملات بک رہے ہیں" امراؤ جان نے مجھ سے کہا۔
آہ! اس ایک جملے میں کائنات کے راز پنہاں ہیں۔ تم کہتی ہو یہ مہمل بات ہے۔ نہیں ایسا نہیں ہو سکتا۔
آپ کی بکواس میری سمجھ میں نہ آسکی۔
کہہ تو دیا کہ اس میں دنیا کے راز مضمر ہیں۔
دنیا! دنیا کے راز مضمر ہیں۔ اس لغو جملے میں!
ہاں! ہاں!! گناہوں کی راتیں، پاپ کے دن، انسانوں کے بھید، دنیا کی دل چسپیاں، معصوم انسانوں کی لغزشیں، غرض کہ اس مختصر جملے میں جسے تم لغو کہہ رہی ہو دنیا کی سیاہ کاریاں سما گئی ہیں۔
امراؤ نے ساغر تھاما اور میرے لبوں سے لگاتے ہوئے کہنے لگی۔ حمید پیارے حمید جلد اس جام کو خالی کر دو تمہاری تمام تکالیف خود بخود دور ہو جائیں گی۔
نہیں۔ یہ لیجاؤ پھینک دو میں کبھی نہیں پیوں گا۔ میں نے پیالے کو دور ہٹاتے ہوئے کہا۔
حمید تمھیں کیا ہو گیا اپنی مسرت خیز گھڑیوں کو کیوں وسواس میں برباد کر کے رنجیدہ ہو رہے ہو۔
وسواس نہیں۔ الہام کہو الہام۔
ہائے کمبخت دیوانہ ہو گیا ہے۔ کیسی بہکی بہکی باتیں کر رہا ہے۔ اور کہتا ہے الہام۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ حمید تم نہیں سمجھتے مسرت کی گھڑیاں خوشی کے دن، جوانی کی راتیں واپس نہیں آسکتیں۔ اس جنون سے بھاگو اپنے وسواس کو خیرباد کہو اور اپنی زندگی کو مسرت سے لبریز کر لو۔
بے شک یہ سب چیزیں واپس نہیں آسکتیں۔ میں جنون اور خبط میں دیوانہ ہو گیا تھا۔ زندگی کی منزل بربادی کے قریب پہنچ گئی تھی۔ کشتی حیات خرافات کے بحر ذخار اور سیاہ کاری کے طوفان میں ہچکولے کھاتے ہوئے اس طرح خطرہ میں تھی کہ کوئی دم میں رسوائی کا ایک جھونکا ٹکرا کر فنا کر دیتا۔ لیکن خدا نے اپنی رحمت سے بچا لیا۔
اچھا سب کچھ دیکھا جائے گا یہ تو کہو تم نے میرے لئے جڑاؤ ہار لانے کا وعدہ کیا تھا۔ لے آئے یا نہیں۔ اگر لاتے تو مسرت و شادمانی سے مجھ کو پہنا کر خراج محبت حاصل کرتے شاید اسی خفت کے مٹانے کے لئے تم نے یہ سوانگ بھرا ہے۔
(بات کاٹ کر اٹھتے ہوئے) ہاں ہاں۔ ہی۔ سمجھ لو اب ہار لے کر ہی آؤں گا۔ یہ کہہ کر میں جلد جلد قدم اٹھاتا ہوا اس ناگن کی حد سے باہر نکلنے لگا۔ میرا جسم لرز رہا تھا۔ اور قدم ڈگمگا رہے تھے۔ لیکن میں اپنے کو سنبھالتا ہوا جلد جلد قدم اٹھانے کی کوشش کر رہا تھا۔ میری اس حرکت کو وہ دیوانگی پر محمول کرتے ہوئے اپنے آدمیوں کو پکار کر کہنے لگی "اس کو باہر نکال دو۔" یہ الفاظ سن کر مجھ کو سخت تکلیف ہوئی۔ لیکن میں صبر و تحمل سے کام لے کر بغیر کچھ کہے چلتا رہا۔ اس وقت میرے دل کی حرکت اس قدر تیز تھی کہ مجھ کو گمان ہو رہا تھا کہ شاید ان رسوائیوں اور

ذلتوں کا اثر ہے اور اب وہ بھی تنگ آکر شریک حال کرنے کو ہے۔ جس کی وجہ سے مجھ کو راستہ ہی پر اپنی زندگی کو موت میں تبدیل کرنا ہوگا جب صبح ہوگی لوگ واقف ہوں گے ہسپتال لیجائیں گے۔ ڈاکٹر اپنا جراحی عمل کرنے کے بعد کہہ دیگا کہ موت قلب کی حرکت بند ہوجانے سے واقع ہوئی۔ اس کے بعد کیا ہوگا میری بیوی اس نیکیہ ہستی پر اس سانحۂ جانکاہ کا کیا اثر ہوگا۔ میرے معصوم پیارے بچے کیسے بلک بلک کر روئیں گے۔ اس خیال کے آتے ہی دل کی حالت اور خراب ہورہی تھی۔ میرے تمام گناہ اور آلودگیوں نے گویا میرے جسم کو اس طرح مفلوج کردیا تھا کہ قدم مشکل سے اٹھ رہے تھے۔

اس پریشانی میں میں اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا کہ کوئی ٹانگا موٹر بنڈی جو کچھ بھی مل جائے اس میں بیٹھ کر گھر پہنچ جاؤں۔ لیکن میدان صاف تھا۔ نظر جس طرف اٹھتی مایوس ہی واپس آتی۔ مجھ کو محسوس ہو رہا تھا کہ میرے ہی گناہوں کی سیاہی تمام کائنات پر چھاگئی ہے۔ ہاں! کہیں کہیں الو بول رہے تھے۔ جن کی منحوس آواز سن کر یہ گمان ہوتا تھا کہ میری ہی سیاہ کاریوں کا ماتم کر رہے ہیں۔ اور غافل پڑی ہوئی کائنات کو جگا کر میرا حال سنانا چاہتے ہیں۔

میں اسی طرح راستہ طے کرتا ہوا منزل مقصود تک پہنچ گیا۔ ڈگمگاتے قدموں پر دروازہ کا سہارا لیکر کھڑا ہوگیا۔ اور کانپتے ہوئے ہاتھوں سے کنڈی کھٹکھٹانے لگا۔ تمام لوگ غافل سورہے تھے۔ دوسری آواز پر دربان نے للکار کر کہا کون ہے۔ اتنی رات گئے کیا کام ہے۔ میں آہستگی سے آواز صاف کرتے ہوئے پکارا۔

"جمشید خاں دروازہ کھول دو" جمشید دوڑتا ہوا آیا۔ دروازہ کھول کر کہنے لگا کون؟ سرکار ہیں۔

میں۔ ہاں! جمشید میں ہوں" یہ کہہ کر میں سیدھا زنانے میں چلا گیا۔ نوکر بچے سب سو رہے تھے۔ لیکن بازو کے کمرے سے آہستہ آہستہ باتوں کی آواز آرہی تھی۔ میں جوتا اتار کر آہستہ قدم اٹھاتا ہوا دیوار کی آڑ میں کھڑا آواز سننے لگا۔

میری بیوی کہہ رہی تھیں" اے کائنات کے مالک تیرے ہی قبضے میں سب کچھ ہے۔ تیرے ہی لئے دونوں جہاں کی بادشاہی سزاوار ہے۔ اے رحیم تو دلوں کے حالات سے آگاہ ہے۔ میری مصیبت سے بخوبی واقف ہے۔ تجھ سے اپنا دکھڑا کہنے کی ضرورت نہیں کیونکہ تو ظاہر و باطن کا جاننے والا ہے۔ مجھ کو صرف تیری مدد کی ضرورت ہے۔ رحم کر میرے حال پر اور میری بگڑی ہوئی زندگی کو سنوار دے۔ میرے مالک مجازی کو گناہوں کی تاریکی سے نکال کر نیکی کی راہ پر ڈالدے۔ اس کے دل کو نیکیوں سے منور کردے۔" میں سنتا جارہا تھا اور ندامت و انفعال سے پسینے میں شرابور ہو رہا تھا۔ اس کی الحاح وزاری نے میرے دل میں تلاطم برپا کردیا تھا۔ میری آنکھیں اشک ندامت بہانے کے لئے بے چین تھیں۔ لیکن میں اس کی حضور قلبی میں اپنی مداخلت بیجا کو مناسب نہ سمجھتا تھا۔ جب تک وہ فارغ نہ ہوئیں اسی طرح خاموش کھڑا رہا۔ جب وہ فارغ ہوچکیں تو آنسو صاف کرتے ہوئے گہری سانس لیکر بچے کے قریب بیٹھیں۔ میں ڈرتا اور جھجکتا ہوا ان کے قریب آیا۔ اور ان کے آگے ہاتھ باندھ کر کھڑا ہوگیا۔ بیگم نے نگاہ اٹھائی، دیکھ کر چونک پڑیں۔ اور غور سے دیکھ کر کہنے لگیں "کون آپ ہیں؟" میں خلاف توقع اتنی رات گئے اچانک ان کے سامنے بحالت زار کھڑا تھا یعنی مجسم گناہ مجسم نیکی کے حضور، سیاہ کاری پارسائی کے پاس، ظلمت نور کے سامنے میری قوت گویائی سلب ہوچکی تھی۔ لیکن میں نے اعتراف گناہ کے طور پر معافی کی مجسم درخواست بنے ہوئے بیگم کے آگے سر تسلیم خم کردیا۔ بیگم نے کہا" میرے سرتاج کہئے کونسی مصیبت یا پریشانی نے آپ کو اس طرح مجھ گناہگار ذلیل ہستی کے سامنے کھڑا ہونے پر مجبور کیا۔ خدا کے لئے جلد اپنی تکلیف بیان کرکے میری پریشانی دور کیجئے۔ آپ فکر نہ کیجئے اگر آپ کی مصیبت دور کرنے میں میری جان بھی کام آئے تو میں ہرگز دریغ نہ کروں گی۔"

"بیگم خدا کے لئے اس پر رحم کرو جو اپنے اس ناروا سلوک اور ناجائز افعال سے منفعل تمہارے قدموں میں پڑا ہے۔ میں نے تمھیں بہت ستایا۔ تمھارے جائز حقوق کو تلف کرکے تمھاری امانت میں خیانت کی۔"

بیگم نے کہا "میرے سرتاج میں تمھاری گزشتہ باتوں کو فراموش کرتے ہوئے تم سے اس امر کی التجا کرتی ہوں کہ آئندہ......"

میں نے (بات کاٹ کر) کہا "ہاں! ہاں!! آئندہ کے لئے میں وعدہ بلکہ حلفی وعدہ کرتا ہوں کہ اپنے کو نیک اور باوفا شوہر ثابت کروں گا۔ انشاءاللہ تم مجھ کو اپنے وعدے پر ہمیشہ پابند پاؤگی"

"میں نے تمھیں معاف کردیا۔ خدا سے اپنی آمرزش کی دعا کرو۔" بیگم نے کہا۔

"بے شک میں خدا سے اپنے قصوروں کا اعتراف کرکے توبہ کروں گا۔ جب یقین ہو جائے کہ تم نے معاف کردیا کیونکہ خدا اپنے گناہ تو معاف کرتا ہے۔ لیکن حقوق العباد معاف نہیں کرتا جب تک کہ بندہ جس کا قصوروار ہے اس سے اپنے گناہ نہ بخشوا لے۔" میں نے بیگم سے کہا۔ "میں نے معاف کردیا۔ خدا بھی تمھیں معاف کردے۔" بیگم نے جواب دیا۔

میں بیگم کی اس فراخ دلی سے خوش ہوکر اس کا پرستار بن گیا۔ میری نظروں میں وہ آسمانی حوروں سے زیادہ پاک اور خوبصورت نظر آنے لگی۔ میری آنکھیں خوشی سے چمک اٹھیں اور اس میں مسرت کے آنسو جھلک آئے۔ دل سے ایک گہرا بوجھ اتر جانے کے بعد ہر طرف مسرت ہی مسرت نظر آنے لگی۔

اب میں خیالات کی دنیا میں گم ہوگیا اور اپنی بے راہ روی کے اسباب پر غور کرنے لگا۔ ہماری معاشرت میں جو خرابیاں ہیں ان میں شادی کی رسم سب سے زیادہ اہم ہے۔

ہمارے پاس شادی کو ایک معمولی بات سمجھا گیا ہے۔ لیکن میرے خیال میں اس سے بڑھ کر انسان کی زندگی میں کسی معاملہ کو اہمیت نہیں۔ انسان کی زندگی کا دار و مدار اس کی خوشی اور اس کا اطمینان سب کچھ اسی پر منحصر ہے۔ انسان جس کام کی ابتدا کرتا ہے اگر اس سے پہلے اس کے انجام سے واقف نہ ہو تو یقینی وہ کام بگڑ جائے گا۔ اسی طرح جب ہماری شادی ہوتی ہے تو ہم اس کے نشیب و فراز سے بخوبی آگاہ نہیں ہوتے۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر شادیاں ناکام ثابت ہوتی ہیں۔ اگر والدین اپنی اولاد کو شادی سے پہلے اس کی اہمیت سے خاطر خواہ واقف کرائیں تو میرا خیال ہے کہ جس طرح دوسری قسم کی تعلیم دی جاتی ہے ساتھ ہی ساتھ اس پر بھی کافی توجہ دلائی جائے۔ فریقین کو ان کے فرائض ذہن نشین کرائے جائیں تو خرابیوں کا انسداد ہوسکتا ہے۔ شادی کے بعد انسان بہت بڑی ذمہ داریوں کا حامل ہوتا ہے۔ اگر اس میں ذرا بھی کوتاہی ہو جائے تو بہت بُرے نتائج پیدا ہوتے ہیں۔ بیوی جو بڑی بڑی آرزوؤں کا ہجوم لئے ہوئے شوہر کے گھر آتی ہے، اگر اس کے خلافِ توقع واقعات پیش آئیں تو اس کے ارمانوں کی کھیتی سرسبز ہونے سے پہلے مرجھا جاتی ہے۔

اطمینان و راحت انسان کیلئے ضروری ہیں۔ اس کے بغیر کوئی انسان ترقی نہیں کرسکتا۔ عورت مرد کی نصف سے زیادہ زندگی پر چھائی ہوئی ہے اس کے ذمہ انسانوں کی زندگیوں کو بنانا اور بگاڑنا ہوتا ہے۔ وہ عمر کے ہر حصہ میں حکومت کرتی ہے۔ بچپن میں ماں باپ پر جوانی اور بڑھاپے میں شوہر اور بچوں پر۔ اگر ہم اس کو غلامی کی زندگی کی زنجیروں میں جکڑ کر قید کردیں گے، اس کے اعضاء اور دماغ کو مضمحل کردیں گے جو اپنی ملکیت پر غیر کا قبضہ پسند نہیں کرتی تو ہم اسکے اعتبار کو کھو کر

دوسرے کے قبضہ میں دیدیں گے اور اس کے بعد اس سے اس کے فرائض کی کوتاہی پر باز پرس کریں گے تو کیا ہم راستی پر ہیں ؟

ایسی صورت میں جو کچھ غلطی اس سے سرزد ہو اس کے لئے مرد ہی مورد الزام ہوگا۔ میری شادی کا بھی یہی حشر ہوا۔ شادی کے بعد کچھ دن تو یوں ہی گذر گئے جس میں کوئی بات قابل ذکر نہ تھی۔ لیکن چند سال سے میری طبیعت میں تغیر رونما ہوا اپنی بیوی سے میری دلچسپی کم ہوتی گئی۔ سونے کو ٹھکرا کر ملمع پڑے ہیرے کو چھوڑ کر شیشے کے ٹکڑوں پر مائل ہوگیا۔ یہاں تک کہ مجھے اپنی بیوی بچوں سے نفرت پیدا ہوگئی۔ میری اس کمزوری سے فائدہ اٹھا کر اس ذلیل فرقہ نے مجھے تباہ کر ڈالا۔ میری دولت، عقل، شرافت، عزت سب ذلت و رسوائی کی بھینٹ چڑھ گئی۔ ان بری صحبتوں سے شراب جیسی موذی چیز بھی میرے گلے پڑ گئی۔ حالانکہ میں اس سے انتہائی نفرت کرتا تھا لیکن جب انسان کا دل سیاہ ہو جاتا ہے۔ تو ضمیر پر بھی تاریکی چھا جاتی ہے۔ یہی حال میرا تھا۔ جب ضمیر ہی ظلمت میں گم ہو تو روکے کون؛

جب انسان کسی گناہ کا مرتکب ہوتا ہے تو اس کو اپنے کردار پر ندامت ہوتی ہے۔ لیکن جب وہ عادی مجرم بن جاتا ہے تو اس کے دل میں کسی قسم کا خوف باقی ہی نہیں رہتا۔ یہی حال میرا تھا۔ میں چھپ چھپا کر گناہ کرنے سے بھی جھجکتا تھا۔ مگر اب کھلم کھلا کرنے لگا۔ بیوی بچوں پر سختی اور ظلم کرتا ان کی دل آزاری کرکے مسرور ہوتا۔ شراب جیسی گندہ چیز کو پی کر مسرت کے گیت گاتا۔ گھر پھونک کر تماشا دیکھتا غرض سیاہ کاریوں نے میرے دل کو سیاہ کر دیا تھا۔ اب مجھ میں نیک و بد میں امتیاز کرنے کا شعور ہی باقی نہ تھا۔ مہینوں بیوی بچوں کو صورت تک نہ دکھلاتا۔ وہ میری صورت کیلئے ترستے اور میں اپنی سیاہ کاریوں میں مست رہتا۔ امراؤ جان طوائف جس کے دام میں پھنس کر میں نے اپنی ہستی کو بھی فراموش کر دیا تھا۔ میری ہر طرح نگران رہتی سوائے ان وقتوں کے جب اس کی فرمائشات کیلئے روپیوں کی ضرورت پڑتی، میرے اپنے گھر میں جانے کی روادار نہ ہوتی۔ بچہ بیمار تھا۔ میری یاد سے بے چین۔ جس وقت میں ایسی ہی ضرورت سے گھر میں گیا تو وہ اس کمزور حالت میں دوڑ کر مجھ سے لپٹ گیا۔ لیکن مجھ پر تو اس وقت گویا بھوت سوار تھا۔ بچے کو ہٹا دیا۔ بیگم کی آنکھیں اس کو برداشت نہ کر سکیں وہ کہنے لگیں۔ "ہائے کیا تم دنیا کی جھاڑو ہو، تمھیں اپنے گھر سے تعلق نہیں۔ بیوی بچوں سے محبت نہیں۔ ہمیں ذلیل کرتے ہو اور ذلیلوں کی منتیں کرتے پھرتے ہو۔ بیمار لڑکا جو تمھارے لئے تڑپ رہا تھا۔ اس کو تم نے اس طرح ڈھکیل کر ہمارے جذبات کو ٹھیس لگائی ہمارے دلوں کو دکھایا۔ ایک روز تمھیں بھی خدا کو جواب دینا ہے"۔ یہ سن کر میں شیر کی طرح گرجتا ہوا چلا گیا۔ شاید اس تیز روشنی کی کرن تاریکی کو چیرتی ہوئی میرے ضمیر تک پہنچ گئی جس طرح بجھتے ہوئے چراغ میں تیل پڑ جانے سے پھر روشن ہو جاتا ہے اسی طرح میری زندگی نے پلٹا کھایا۔ یہ محسوس کر کے کہ ہائے میں دنیا کی جھاڑو ہوں" میرا دل غم سے تڑپ گیا بے شک برے انسان کے لئے جھاڑو کی مثال کتنی صحیح ہے جس طرح جھاڑو ہر برے بھلے ادنیٰ و اعلیٰ کے ہاتھوں میں ہوتی ہے۔ جتنے غلیظ کام اس سے لئے جائیں گے وہ ویسی ہی نجس و ناپاک ہوتی جائے گی۔ یہی حال انسان کا ہے جیسے برے کام کرتا جائے گا اتنا ہی ذلیل اور رسوا ہوتا جائے گا جس طرح جھاڑو ہمیشہ سے ہی نجس نہیں ہوتی نجاست لگ جانے پر ہی غلیظ ہو جاتی ہے ویسا ہی انسان بھی ہمیشہ سے برا نہیں ہوتا بری صحبت اور برے افعال ہی اس کو برا بنا دیتے ہیں۔ بس ان ہی خیالات نے میرے سیاہ کار دل کو منور کر دیا۔

اب جو کبھی میں سوچتا ہوں تو سمجھتا ہوں کہ شریف بیوی سے زیادہ انسان کا مونس و رفیق کوئی نہیں ہو سکتا۔ بیوی ہی بیوی ہو سکتی ہے رنج و خوشی راحت مصیبت بیماری و صحت ہر حال کی شریک ہر مصیبت میں ساتھ دینے والی۔ یہ سب اس کے بہترین اوصاف ہوتے ہیں۔ اپنی ہستی کو مٹا دے گی لیکن ان میں سے کسی بات پر اس کے قدموں کو لغزش نہ ہوگی۔ کسی نے خوب کہا ہے کہ عورت اپنے شوہر اور اولاد پر سب کچھ قربان کر دیتی ہے۔ یہ میرا تجربہ ہے ممکن ہے دوسروں کے لئے کارآمد ہو سکے۔

مسز سید حسین زیدی

تنقید و تبصرہ

شمع | مصنفہ اے۔آر۔ خاتون دہلوی۔ ۴۰۴ صفحے قیمت عہ۔ پتہ جلال منزل کوچہ پنڈت دہلی۔ "شمع" پر تو حقیقت میں پروانہ بن کر ہی تنقید لکھنی ہوگی۔ اس ناول کی خصوصیت ہے کہ یہ اسم بامسمیٰ ہے۔ نام، انسانی زندگی میں ایک خاص اثر رکھتا ہے۔ شمع کا کام جلنا ہے اور اپنی جلن سے اپنے ماحول کو روشن و منور کرنا۔ پس اس ناول میں بھی اس کی ہیروین "شمع" اسی طرح جلتی سلگتی رہتی ہے۔ جس چیز نے اس کی زندگی کا خاتمہ بخیر کیا ہے وہ اس کی تعلیم ہے جو خودداری، بےنیازی، حلم و بردباری سکھاتی ہے۔ شمع، ان خصوصیات کا ایک جیتا جاگتا نمونہ ہے۔ حلیمہ بیگم کی جیسی خبیث کیرکٹر کی عورتوں سے خدا بچائے۔ واقعی اس طرز طریقہ کی عورتیں بڑی خطرناک ہوتی ہیں۔ ع جس جگہ بیٹھ گئے آگ لگا کر اٹھے۔ حالانکہ اپنی اس فطری کمزوری و پست فطرتی کا وقتاً فوقتاً وہ خوب نتیجہ بھگتتی ہیں۔ لیکن جب تک انھیں ایک زبردست ٹھوکر نہیں لگ جاتی جس سے وہ کم از کم منہ کے بل نہ گر جائیں، انھیں عقل نہیں آتی۔ کینہ پروری، لالچ اور انتہائی درجہ کا سفلہ پن ان کا نمایاں عیب ہے۔ سوسائٹی میں یہ مقبول نہیں ہو سکتیں۔ خاندان کے لوگ ان کے نام سے کانوں پر ہاتھ رکھ لیتے ہیں۔ گر جہاں گل ہیں وہاں خار بھی ہیں۔ اگر یہ کانٹے نہ ہوں تو پھر پھولوں کی قدر کون کرے گا۔ گر خوبی یہ ہے ؎ پھولوں کی ذرا روش تو دیکھو ؛ کانٹوں سے نباہ کر لیا ہے۔

طاہر، کا مکالمہ اور اس کی پر مذاق و دلچسپ بات چیت ہر کس و ناکس کا دل موہ لیتی ہے اور درحقیقت یہی ایک کردار ایسا ہے جس سے اس ناول کی سوگواری نیز اس کے حزنیہ قسم کے پلاٹ میں ایک رونق اور چہل پہل سی آگئی ہے۔ مذاق ایسا شستہ جس سے کسی کی دل آزاری و دل شکنی نہیں ہوتی۔ منصور کی حیا پروری، وفاداری اور نیک دلی نے اس کو انسان سے دیوتا بنا دیا ہے۔ بواہرمزی کی جیسی نمک حلال خادمائیں قسمت سے مل جاتی ہیں۔ شمع۔ جو روح رواں ہے اس ناول کی، اس کی زندگی کے نشیب و فراز یہ ثابت کرتے ہیں کہ ع زندگی کا ہے کو ہے خواب ہے دیوانے کا۔ مصائب میں اس کی ثابت قدمی، اس کا استقلال و حلم، غرض وہ ہر لحاظ سے نہ صرف "شمع" بلکہ ایک "شمع ہدایت" ہے۔

بہ لحاظ زبان و انداز بیان شمع ایک محویت انگیز ناول ہے۔ قصہ مختصر ہم لائق مصنفہ کو ان کی اس کامیاب ادبی تصنیف پر دلی مبارکباد دیتے ہیں۔ خدا کرے ان کی شمع ہر دل عزیز بن جائے تاکہ بہت سی زندگیاں سنور جائیں، اور وہ لوگ جو تعلیم نسواں کے زبردست مخالف ہیں وہ سرسوتی دیوی کا کلمہ پڑھنے لگیں۔ "ج"

ہندستانی ادب | ایڈیٹر غلام محمد خاں ایم اے عثمانیہ۔ حیدرآباد سے ایک نیا ماہنامہ ہندستانی ادب کے نام سے شایع ہو رہا ہے۔ اس کے چند شمارے اس وقت تک شایع ہو چکے ہیں۔ اس کے مضمون نگاروں میں عبدالقادر صاحب سروری۔ عبدالمجید صاحب صدیقی۔ عبدالرحمن خاں صاحب۔ عبدالقیوم خاں صاحب باقی۔ سید بادشاہ حسین صاحب خاص کر قابل ذکر ہیں۔ اسی طرح حصۂ نظم میں نواب عزیز یار جنگ بہادر عزیز۔ علی اختر صاحب۔ علی منظور صاحب۔ صفی اورنگ آبادی اور ماہر القادری کے نام جاذب توجہ ہیں۔ کتابت طباعت اچھی ہے۔ اگر یہی معیار قایم رہے اور مضامین کے انتخاب اور ترتیب میں حسن ذوق کا لحاظ رکھا جائے تو یقین ہے کہ یہ رسالہ حیدرآباد کے اچھے اردو رسالوں میں شمار کیا جائے گا۔

علم دولت | از برج نرائن ایم اے۔ ناشر لاجپت رائے اینڈ سنز لاہور۔ یہ کتاب ایک ایسے پروفیسر صاحب نے لکھی ہے جو پچیس سال سے اقتصادیات یا علم دولت پڑھاتے پڑھاتے اب اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ میں نے ساری عمر ضایع کی کیونکہ ہر سال جو سیکڑوں طالب علم علم دولت پڑھ کر پنجاب یونیورسٹی کے امتحان میں کامیاب ہوتے ہیں ان میں پروفیسر صاحب موصوف کے بیان کے مطابق شاید ایک بھی نہ نکلے جو انگریزی نہ جاننے والوں کو اپنا پڑھا ہوا پڑھا سکے یا سمجھا سکے۔ وہ کہتے ہیں کہ علم دولت انگریزی زبان میں پڑھا کر معلم اپنی عمر اور طلبہ کا وقت ضایع کرتے ہیں۔

اس خیال کو پیش نظر رکھ کر انھوں نے یہ اردو کتاب مرتب کی ہے۔ جس کی نسبت ان کا یہ دعویٰ ہے کہ اگر روزآنہ ایک گھنٹہ پڑھائی جائے تو تعلیم کی پہلی جماعت کے لڑکے دو مہینے میں بآسانی اس کتاب کو ختم کرلیں گے۔ انگریزی میں بھی مضمون پڑھانے کے لئے کم از کم چھ مہینے درکار ہوں گے۔

شہنشاہیت | مترجمہ مظفر شاہ خاں ظفر۔ ناشر مکتبہ برہان نئی دہلی۔ یہ کتاب اصل میں جدید سرمایہ داری کی ایک مبسوط تاریخ ہے اور اس کے مصنف ضلع بجنور کے قومی کارکن گووند سہائے صاحب بی کام سابق پرائیوٹ سکرٹری وزیر مال حکومت یوپی ہیں۔ اب اس کو ہندی سے اردو میں منتقل کیا گیا ہے۔
اس میں مصنف نے یورپ کی سرمایہ داری کے نقائص بیان کئے ہیں اور یہ دکھایا ہے کہ سرمایہ دار ملکوں میں کس طرح محدود جماعتیں حکومت پر قبضہ کرکے بنی نوع انسان کو اپنا غلام بناتی اور دنیا بھر کے بازاروں پر قابض ہوکر اپنی ذات کے لئے عیش و آرام کے سامان مہیا کرتی ہیں۔ چنانچہ اس وقت یورپ میں جتنی مختلف تحریکیں مثلاً فسطائیت۔ نازیت اور اشتراکیت وغیرہ کے ناموں سے جاری ہیں ان کی تاریخ بھی لکھ دی گئی ہے۔ اصل ہندی کتاب موجودہ جنگ سے پہلے قلم بند کی گئی تھی۔ اور اس میں مصنف نے اپنی وسیع معلومات کی بنا پر جنگ کی نسبت بہت سی پیشین گوئیاں کی تھیں جو صحیح ثابت ہو رہی ہیں۔

تاریخ سعید | مولفہ حاجی محمد عبدالقادر صاحب وکیل بنارس۔ اس چھوٹی سی کتاب میں آنحضرت پیغمبر اسلام اور ان کے اہل بیت اور خلفاء نیز اولیا اور مشائخین کی تاریخہائے وفات درج کی گئی ہیں۔ اور اس سلسلہ میں ہر ایک کے تھوڑے بہت سے حالات زندگی بھی ابتداء میں شریک ہیں۔ اکثر قطعات تاریخ خود مصنف کے نتائج فکر ہیں۔

جاہ و جلال | مترجمہ صوفی غلام مصطفیٰ تبسم ایم اے۔ لکچرار گورنمنٹ کالج لاہور۔ کیرل چپیک چیکوسلواکیہ کا مشہور ڈراما نگار تھا۔ جو ابھی ابھی ۱۹۳۹ء میں فوت ہوا ہے۔ اسی کے ایک ڈرامے پاور اینڈ گلوری کا یہ ترجمہ ہے جس کو پنجاب کے مشہور ادیب اور شاعر تبسم صاحب نے گورنمنٹ کالج کی ڈرامٹک کلب کے زیر اہتمام شایع کیا ہے۔ اس میں مصنف نے اپنی قوم کو اس آنے والے خطرے سے ڈرایا ہے جو بالآخر نازی حملے کی شکل میں چیکوسلواکیہ پر نازل ہوا اور اس دوبارہ غلامی کے صدمے سے خود مصنف کی وفات واقع ہوئی۔

ڈرامہ جاہ و جلال میں ہماری موجودہ سماج کے بنیادی محرکات کو واضح کرکے دکھایا گیا ہے اور اس طرح فنی بحث و مباحث کے باوجود یہ ایک خشک علمی مقالہ نہیں بننے پایا۔ بلکہ اس میں ڈرامائی دلچسپیاں موجود ہیں۔ مترجم نے اپنے مسودے کی نظر ثانی لاہور کے دیگر مشہور ادیب مثلاً امتیاز علی تاج اور پروفیسر فیض احمد فیض سے بھی کرالی ہے۔

مدرسوں اور کالجوں کے طلبہ گورنمنٹ کالج ڈرامٹک کلب لاہور کی اجازت سے اس کھیل کا اسٹیج کرسکتے ہیں۔

گلبانگ آزادی | از نہال سیوہاروی ناشر مکتبہ برہان دہلی۔ یہ چھوٹی سی کتاب جناب نہال کی ان رباعیوں کا مجموعہ ہے جو صرف آزادی کے موضوع پر لکھی گئی ہیں۔ اور جن میں سے ہر ایک کی ردیف آزادی ہی رکھی گئی ہے۔ الفاظ کے تناسب ترکیب کی چستی اور تشبیہات و استعارات کی ندرت کی وجہ سے اس مجموعے کی اکثر رباعیاں نہایت دلچسپ اور پُراثر ہیں۔ اور خوبی یہ ہے کہ ایک ہی موضوع سے متعلق ہونے کے باوجود تمام رباعیوں میں شاعرانہ رنگ جھلکتا ہے۔

کارنامۂ پہلوی | از سید محمد حسن بلگرامی۔ مطبوعہ نظامی پریس لکھنو۔ مولوی سید محمد حسن صاحب بلگرامی کو علم و فضل سے خاص شغف ہے۔ اس وقت تک ان کی کئی کتابیں چھپ چکی ہیں۔ اب باوجود ضعیفی اور آنکھوں سے معذوری کے انھوں نے اپنا سفرنامہ ایران کارنامۂ پہلوی کے عنوان سے شایع کیا ہے۔ اس میں تینتیس ابواب ہیں اور ہر باب نہایت ہی ٹھوس اور مستند معلومات پر مشتمل ہے۔ انھوں نے اس سفرنامہ کی ترتیب سے پہلے

ان تمام کتابوں کا بھی بالاستیعاب مطالعہ کیا ہے جو اس اثنا میں مملکت ایران پر لکھی گئی ہیں اس طرح سے یہ کتاب اب محض سفرنامہ نہیں بلکہ جدید ایران کی ایک مستند اور مکمل تاریخ بن گئی ہے۔

شمس المعارف جلد چہارم | مطبوعہ مرشد پریس دیوریہ۔ اس کتاب میں مولانا سید شاہ محمد سلیمان صاحب مرحوم کے مختلف خطوط شائع کئے گئے ہیں۔ جن میں سے اکثر تصوف و عرفان کے مسائل پر بڑی اچھی روشنی ڈالتے ہیں۔ چونکہ اس عہد کے ایک نہایت ہی بلند پایہ اور صاحب کمال بزرگ کے خطوط ہیں اس لئے مذہبی مسائل سے لگاؤ رکھنے والے اصحاب کے حق میں ان کو نعمت غیر مترقبہ سمجھنا چاہیے۔ افسوس ہے کہ کتاب کی طباعت اور کاغذ موضوع کے شایان شان نہیں ہے۔
"ق"

دنیائے آرزو | از مرزا ادیب بی اے ایڈیٹر "مصور" بمبئی حجم ۲۲۸ صفحے قیمت عہ پتہ نرائن دت سہگل اینڈ سنز لوہاری دروازہ لاہور۔

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ! یہ بڑی حسرت و یاس سے بھری دنیا ہے جو "سلیم" اور "شہاب" کی دو بھری افسانوی ڈائری اور "نالۂ دل" پر مشتمل ہے۔ تعلیم یافتہ طبقہ کی بیروزگاری کا حسرت ناک انجام پڑھنے والے کو آٹھ آٹھ آنسو رلاتا ہے۔ یہ افسانے نہیں ہیں ہمارے تعلیم یافتہ بے کار نوجوانوں کی مصیبت کی داستانیں ہیں، وہ نوجوان جو تلاش روزگار میں در در کی ٹھوکریں کھاتے پھرتے ہیں اور آخر کار بیروزگار رہ کر موت کی آغوش میں چین سے سو جاتے ہیں، اس ڈائری کا "نالۂ دل" پڑھنے کے قابل ہے۔ اس میں غلام ملک کے باشندوں کی زندگی کی لاجواب تصویریں ہیں، گداگری اور روحانیت پرستی پر خوب تبصرہ کیا گیا ہے۔ ہمارے ہاں کی شادی بیاہ کے اصول پر بھی اچھی روشنی ڈالی گئی ہے، غربت اور افلاس کی مختلف صورتوں کے ساتھ ساتھ قانون اور انصاف کی وہ مختلف شکلیں بھی بتائی گئی ہیں جو امیروں اور غریبوں کے ساتھ پیش آتی ہیں۔ مصنف کا یہ کہنا بہت درست ہے کہ "آج انصاف قانون کی موٹی موٹی کتابوں میں ہے۔ حاکم کے قلم میں نہیں ... مذہب کا بنیادی اصول ہے انسانیت پرستی اور اہل مذہب کا سب سے پہلا اصول ہے انسانیت کو ذبح کرنا! مذہب کا پہلا سبق ہے دنیا کے ہر انسان کو اپنا بھائی سمجھو اور موجودہ علم برداران مذہب اپنے حقیقی بھائیوں کو بھی غیر سمجھ رہے ہیں"! ادبی دنیا کی زندگی کا بھی بہت اچھا نقشہ کھینچا گیا ہے۔ پوری کتاب سبق آموز اور بصیرت افروز ہے، طرز نگارش اس قدر سوز و گداز میں ڈوبا ہوا ہے کہ پڑھنے والا متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

میں افسانہ کیونکر لکھتا ہوں | مرتبہ حکیم یوسف حسن ایڈیٹر نیرنگ خیال حجم ۱۰۳ صفحے قیمت ایک روپیہ ناشر دار الادب پنجاب بارود خانہ اسٹریٹ لاہور

اس کتاب کے پیش لفظ میں مرتب نے اپنی افسانہ نگاری کی داستان لکھی ہے اس کے بعد ہندوستان کے مشہور افسانہ نگار منشی پریم چند، نیاز فتحپوری، ایم اسلم، سلطان حیدر جوش، جلیل قدوائی، مجنوں گورکھپوری اور علی عباس حسینی وغیرہ نے افسانہ نگاری کے اپنے اپنے اصول اور طریقے لکھے ہیں اور وضاحت سے بیان کیا ہے کہ وہ افسانے کیونکر لکھتے ہیں۔ یہ کتاب اس قابل ہے کہ ہر افسانہ نگار اس کو پیش نظر رکھے۔

کملا | مترجمہ راجہ مہدی علی خاں حجم ۲۳۲ صفحے قیمت مجلد عہ پتہ نرائن دت سہگل اینڈ سنز۔ لوہاری دروازہ۔ لاہور۔

یہ دلچسپ افسانہ بنگالی زبان کے مشہور ناول "بارواری" کا ترجمہ ہے جس کو راجہ مہدی علی خاں نے بڑی قابلیت سے کیا ہے اس ترجمہ کا بال بال لیا گیا ہے۔ پڑھنے والے کو یہ محسوس ہی نہیں ہوتا کہ وہ کسی دوسری زبان کے ناول کا ترجمہ پڑھ رہا ہے۔ ہر مترجم کو ترجمہ میں یہ خوبی پیدا کرنی چاہیے۔ اس ناول کو بنگال کے بارہ مشہور افسانہ نگاروں نے لکھا ہے اسلوب بیان اس قدر دلچسپ اور دلکش ہے کہ ایک مرتبہ شروع کرنے کے بعد ختم کئے بغیر چین نہیں پڑتا۔ بیچاری بے گناہ "کملا" پر ایک بد باطن شخص کی فتنہ پردازی کی وجہ سے سماج نے جو ظلم ڈھائے اور ستم توڑے ہیں اس کا اظہار بڑے درد انگیز اور رقت خیز پیرایہ میں کیا گیا ہے آخر میں صداقت کا بول بالا ہوتا ہے اور معصوم "کملا" کی بے گناہی ثابت ہو جاتی ہے۔

"س"

نئی کتابیں

۱۔ کملا۔ (بنگالی ناول کا ترجمہ) از راجہ مہدی علی خاں۔ ۲۳۱ صفحے قیمت عہ۔ نرائن دت سہگل اینڈ سنز لاہور۔
۲۔ دولت آصفیہ اور حکومت برطانیہ (نیا ایڈیشن) از ابوالاعلیٰ مودودی قیمت عہ کتاب خانہ۔ عابد روڈ۔
۳۔ نقش اول (افسانے) از بیگم صالحہ عابد حسین ۲۳۲ صفحے قیمت عا۔ حالی پبلشنگ ہاؤس۔ دہلی۔
۴۔ غریبوں کا بہشت (افسانے) مترجمہ آتش گوجرانوالیہ قیمت عسم نرائن دت سہگل۔ لاہور۔
۵۔ موت کا راگ (افسانے) از مرزا ادیب بی۔ اے قیمت عہ " " " "
۶۔ ستارۂ صبح (افسانے) مترجمہ راجہ مہدی علی خاں قیمت عہ " " " "
۷۔ رقاصہ (ناول) از شرت چندر چڑجی قیمت عسم " " " "
۸۔ شمع دان (افسانے) مترجمہ راجہ مہدی علی خاں قیمت عہ " " " "
۹۔ دنیا کی کہانی (بارہ ملکوں کی کہانیاں) قیمت ۱۰/ پستک بھنڈار۔ لہریا سرائے۔ دربھنگہ۔
۱۰۔ ننھوں کے دیس میں (گلیور کے سفر کے حالات) قیمت ۸/ " " " "
۱۱۔ شیطانی بوتل (جادو کی بوتل کی کہانی) قیمت ۶/ " " " "
۱۲۔ دنیا کے دس بڑے آدمی۔ قیمت ۸/ پستک بھنڈار۔ لہریا سرائے۔ دربھنگہ۔
۱۳۔ قسمت کے پتلے (بہادروں کے کارنامے) قیمت ۱۲/ پستک بھنڈار۔ لہریا سرائے۔ دربھنگہ۔
۱۴۔ ایجاد اور موجد (نئی ایجادوں کی تفصیل) قیمت ۹/ " " " "
۱۵۔ زندہ چین (کہانیاں) مترجمہ تمنائی قیمت عہ۔ نیا سنسار کتاب گھر۔ بانکی پور۔ پٹنہ۔
۱۶۔ یورپ کا راون (ہٹلر کی سوانح) از کشن پرشاد ۱۸۷ صفحات نولکشور پریس۔ لکھنؤ۔
۱۷۔ تشاء (ڈراما) از کشن پرشاد کول ۲۱۰ صفحے
۱۸۔ جنگ ۱۹۳۹ء کیوں ہوئی۔ از شیخ رحمٰن بخش ۲۰۸ صفحے قیمت عہ۔ کتاب خانہ۔ حیدرآباد۔
۱۹۔ گل خنداں (مزاحیہ مضامین) از آصف جہاں بیگم ۱۷۶ صفحے قیمت ۱۲/ کتاب خانہ عابد روڈ۔
۲۰۔ مسلمانان عالم (خلافت کی تاریخ) از کے۔ اے حمید۔ ۴۰۸ صفحے علمی پرنٹنگ پریس لاہور۔
۲۱۔ موٹر وہیکلز ایکٹ بابتہ ۱۹۳۹ء مترجمہ لنت کمار ۴۹۶ صفحے۔ دین محمدی پریس۔ لاہور۔
۲۲۔ دستاویز نویسی (تیسرا ایڈیشن) از بنالال ۶۵۰ صفحے۔ سلیمی پریس۔ الہ آباد۔
۲۳۔ مجربات سیوطی از جلال الدین عبدالرحمٰن سیوطی ۲۰۴ صفحے۔ حجازی پریس۔ لاہور۔
۲۴۔ خزانۂ طلسمات (تیسرا ایڈیشن) از ڈاکٹر گنیش داس چوپڑا ۲۰۴ صفحے۔ حجازی پریس۔ لاہور۔
۲۵۔ ہومیو از سید رضا احمد جعفری، ۲۳ صفحے۔ مسلم پرنٹنگ پریس۔ لاہور۔
۲۶۔ سحر سامری۔ از پنڈت سادھو رام ۲۴۴ صفحے۔ حجازی پریس۔ لاہور۔

مرزا سیف علیخاں

اِدارہ کی خبریں

مجلسِ انتظامی

ادارۂ ادبیات اردو کی مجلس انتظامی کا اجلاس یکشنبہ ۱۹ اکتوبر ۱۹۴۱ء کو منعقد ہوا جس میں ذیل اصحاب نے شرکت کی۔

مولوی محمد لیاقت اللہ خاں صاحب ایچ سی ایس معتمد فینانس ممالک محروسہ سرکار عالی۔ نائب صدر ادارہ

مولوی سید محمد اعظم صاحب ایم ایس سی۔ بی اے آنرز۔ معتمد ناظم تعلیمات سرکار عالی۔

مولوی سید علی اکبر صاحب ایم اے (کنٹب) نائب ناظم تعلیمات سرکار عالی۔

مولوی عبد المجید صاحب صدیقی ایم اے۔ ایل ایل بی۔ شعبہ تاریخ جامعہ عثمانیہ۔

مولوی عبد القادر صاحب سروری ایم اے۔ ایل ایل بی شعبہ اردو جامعہ عثمانیہ

مولوی نصیر الدین صاحب ہاشمی۔ منشی فاضل۔ مددگار ناظم رجسٹریشن و اسٹامپس۔

ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور۔ ایم اے۔ پی ایچ ڈی۔ معتمد ادارہ۔

(۱) ادارہ کے سرپرست نواب معین الدولہ بہادر کی وفات پر قرار داد تعزیت منظور کی گئی۔

(۲) امتحان اردو زبان دانی کے قیام کے لئے مجلس اردو امتحانات کی تجویز منظور کی گئی۔

(۳) اردو انسائیکلوپیڈیا کی مجلس انتظامی کے مجوزہ قواعد و ضوابط منظور کئے گئے اور ان کی اشاعت کی اجازت دی گئی۔

(۴) اردو انسائیکلوپیڈیا کی طباعت کے انتظامات کے بارے میں تبادلۂ خیال کیا گیا اور طے پایا کہ ٹائپ میں چھاپنا بہتر ہے۔

(۵) سنہ ۱۹۴۰ء کے حسابات آمد و خرچ پیش ہوئے جن کو بعد تنقیح شایع کرنے کی اجازت دی گئی۔

(۶) ادارہ کے شعبۂ نسوان کی طرح شعبہ جات اردو انسائیکلوپیڈیا، ادبیات اطفال اور اردو امتحانات کی رقموں کو جدا جدا کھاتوں میں منتقل کرنے اور ڈپازٹ وغیرہ کے تصفیے کئے گئے۔

(۷) اردو امتحانات کے نتائج پیش کئے گئے اور جلسۂ تقسیم اسناد کے متعلق انتظامات کی منظوری دی گئی۔

(۸) نئی شاخوں کے قیام کی منظوری دی گئی۔

(۹) زیر طبع کتب کی اشاعت کی اجازت دی گئی۔

شعبۂ اردو انسائیکلوپیڈیا

یہ شعبہ سرگرمی کے ساتھ مصروف ہے اور کوشش کر رہا ہے کہ پہلی جلد جو الف ممدودہ کے الفاظ اور اصطلاحوں پر مشتمل ہے جلد شایع ہو سکے۔ اس کی طرف سے اردو انسائیکلوپیڈیا کے قواعد و ضوابط کتابی صورت میں شایع کئے گئے ہیں جو جملہ معاونین و مرتبین کی خدمت میں بغرض اطلاع روانہ کئے جا رہے ہیں۔ اس میں مجالس ادارت (ایڈیٹوریل بورڈز) اور قلمی معاونین کی فہرستیں، جملہ مجالس کے قواعد اور طریقۂ کار، اور معاونین و مبصرین کے معاوضے اور دیگر ضروری معلومات شامل ہیں۔

مجلس قانون

اردو انسائیکلوپیڈیا کے شعبہ قانون کا اجلاس چہارشنبہ ۱۲ نومبر ۱۹۴۱ء گیارہ بجے منعقد ہوا جس میں ذیل اصحاب نے شرکت کی۔

جسٹس ڈاکٹر نواب ناظر یار جنگ بہادر ایم اے ایل ایل ڈی۔ رکن ہائی کورٹ۔

جسٹس راجہ بہادر بشیشور ناتھ بی اے ایل ایل بی۔ رکن مجلس وضع قوانین۔

ڈاکٹر میر سیادت علی خاں ایم اے۔ ایل ایل بی۔ پی ایچ ڈی۔ بی سی ایل۔ سٹی مجسٹریٹ حیدرآباد

پنڈت سری پت راؤ صاحب بی اے ایل ایل بی ایڈوکیٹ۔

مولوی عبداللہ صاحب تماپوری ایڈوکیٹ

ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور ایم اے پی ایچ ڈی۔

مولوی سید بادشاہ حسین صاحب معتمد اردو انسائیکلوپیڈیا۔

نواب عسکر یار جنگ بہادر بی اے بیرسٹرایٹ لا معتمد مجلس وضع قوانین نے بذریعہ تحریر شرکت سے معذرت کی اطلاع دی۔

(۱) دھرم شاستر کے متعلق الفاظ کی فہرست مرتبہ راجہ بہادر بشیشور ناتھ پیش کی گئی اور مقالوں کی تقسیم عمل میں آئی۔

(۲) قانون انتقال جائداد کی فہرست بھی پیش کی گئی۔ اور طے پایا کہ انتقال جائداد پر ڈاکٹر میر سیادت علی خاں صاحب مقالہ لکھیں گے۔

(۳) نواب ناظر یار جنگ بہادر نے قانونی لغت مرتبہ سر سید احمد خاں مرحوم پیش کی اور تصفیہ پایا کہ اس لغت سے ضروری الفاظ منتخب کرکے راجہ بشیشور ناتھ بہادر مکمل فہرستیں تیار کریں۔

(۴) طے پایا کہ راجہ بشیشور ناتھ بہادر اور مولوی عبداللہ صاحب تماپوری کی فہرستیں وصول ہونے کے بعد تقسیم کار کے لئے کمیٹی طلب کی جائے۔

بیگم بہادر یار جنگ بہادر میڈل

ادارۂ ادبیات اردو کے امتحان اردو عالم میں اول آنے والی طالبہ کے لئے محترمہ بیگم صاحبہ نواب بہادر یار جنگ بہادر نے جنھیں نسوانی فلاح و بہبود اور علمی ترقی سے خاص دلچسپی ہے ایک طلائی تمغہ عطا فرمایا ہے۔ جو ادارہ کے جلسہ تقسیم اسناد و انعامات میں دیا جائے گا۔

کتب خانۂ ادارہ

ادارہ کا کتب خانہ روزافزوں ترقی کر رہا ہے۔ متعدد علم دوست اصحاب قلمی اور نادر مطبوعہ کتابیں بطور عطیہ رعانہ کر رہے ہیں۔ راجہ دلسکھ رام صاحب بی ایس سی آنرز افسر انجارج بمیہ سرکار عالی و معتمد اعزازی مدرسہ مفید الانام نے پچپن مطبوعہ قدیم کتب از راہ علم دوستی عطا فرمائیں۔

مولوی محبوب علی خاں صاحب نے مولوی سید محمد صاحب ایم اے لکچرار سٹی کالج کے توسط سے ایک قلمی دیوان ناسخ لکھنوی بطور عطیہ رعانہ کیا۔

نواب عنایت جنگ بہادر نے حسب ذیل قلمی کتب عطا فرمائیں۔

۱۔ انتخاب کلام مرزا نصیر۔ سودا۔ صاحبقراں۔ صاحب۔ یقین۔ یک جلد

۲۔ نظم انور۔ تنادلی۔ در یک جلد

۳۔ ایمان درپن یک جلد

۴ مثنوی شہزادہ ماہ عالم بلا جلد

۵۔ چہار درویش منظوم یک جلد

۶۔ معجزہ حضرت علی علیہ السلام مجلد

۷۔ ست گرو پرشاد مجلد

۸۔ بھاگوت گیتا کا انتخاب بلا جلد

۹۔ نظم از بہادر اولیا حسینی بلا جلد
۱۰۔ قصہ بادشاہ روم رمضان شاہ بلا جلد
۱۱۔ کلامِ عاشق بلا جلد
۱۲۔ مناقب عادل بلا جلد
۱۳۔ سالوس نامہ۔ نصاب العارفین حسینی بادشاہ فارسی۔ محتشم دو مجلس فارسی۔ عقائد مولانا فارسی۔ رسالہ عقائد دراردو۔ رسالہ اردو۔ فارسی مشترک جلد از حسینی بادشاہ وغیرہ۔
۱۴۔ غزلیات عجز۔ بلا جلد

وزارت معارف سلطنت کابل نے ایک کتاب "دکابل کالنی" ۱۳۱۹ء بطور عطیہ روانہ کی ہے۔

ان سب معطیئن کا ادارہ کی طرف سے نواب مرزا سیف علی خاں صاحب جاگیر دار ناظم اعزازی کتب خانہ بطور خاص شکریہ ادا کرتے ہیں۔

شاخیں

ادارہ کی شاخیں اردو زبان کو دور و دراز دیہات اور اضلاع میں پھیلانے کے لئے قابلِ اطمینان جد و جہد کر رہی ہیں۔

شاخ گلبرگہ

اس شاخ کے نئے معتمد مولوی محمد بن عمر صاحب ایم اے اپنے شرکاء کار مولوی نصیر الدین صاحب بی اے لکچرار اور نیاز علی خاں تیار اردو عالم کے ساتھ مولوی جمیل حسین صاحب ایچ سی ایس اول تعلقدار گلبرگہ اور مولوی ذوالفقار علی صاحب حقانی پرنسپل کی اعانت سے گلبرگہ اور اس کے اطراف واکناف میں اردو کی توسیع و اشاعت اور ادارہ کے اغراض و مقاصد کی تبلیغ میں خاص دلچسپی لے رہے ہیں۔ نواب غوث یار جنگ بہادر سابق صوبہ دار گلبرگہ نے جو اس شاخ کے سرپرست تھے اس شاخ کی صحیح معنوں میں سرپرستی فرمائی اور اپنی روانگی سے قبل اس کو اس قابل بنا دیا کہ اس کا کام اطمینان کے ساتھ جاری رہ سکے جس کے لئے منجانب ادارہ ان کا پرخلوص شکریہ ادا کیا جاتا ہے۔

گلبرگہ کے حال صوبہ دار مولوی امیر علی خاں صاحب ایچ سی ایس کو بھی ادارۂ ادبیات اردو سے خاص دلچسپی ہے اور انھوں نے گلبرگہ پہنچتے ہی اس شاخ کی نگرانی و سرپرستی کا کام شروع کر دیا ہے توقع ہے کہ ان کی ذاتی ہمدردی او تعلق اور مولوی جمیل حسین صاحب اول تعلقدار کی دلچسپیوں کی وجہ سے یہ شاخ اور بھی ترقی کرے گی۔ اور اس کے لئے گلبرگہ میں ایک مستقل مکان بھی فراہم ہو جائے گا۔

نواب غوث یار جنگ بہادر کے وداعی جلسہ میں مولوی محمد بن عمر صاحب ایم اے نے شاخ کی طرف سے تقریر کی اور نواب صاحب کو پھول پہنائے۔ نواب صاحب نے طلبہ اور معززین گلبرگہ کے ہمراہ ختم جلسہ پر شاخ کا معاینہ فرما کر اس کے انتظامات کے بارے میں خوشنودی کا اظہار فرمایا اور اس شاخ کو پچاس روپیہ اور ادارہ کی ایک دوسری شاخ واقع محلہ روضتین گلبرگہ کو بیس روپے بطور عطیہ عنایت کئے۔

تمغے

مرکز گلبرگہ سے اردو امتحانات میں اول آنے والے امیدواروں کو حسب ذیل اصحاب نے نقروی تمغے عطا فرمائے ہیں جن کا ادارہ کی طرف سے شکریہ ادا کیا جاتا ہے۔

اردو فاضل۔ نواب غوث یار جنگ بہادر۔
اردو عالم۔ مولوی احمد محی الدین صاحب انصاری ایچ سی۔ ایس۔ زائد ناظم صدر عدالت گلبرگہ۔
اردو دانی۔ مولوی محمد ابراہیم صاحب بی ایس سی مددگار مہتمم تعمیرات و آبپاشی گلبرگہ۔

یوم ادارہ و مشاعرہ

شاخ گلبرگہ ۱۵ ار ۱۶ ڈسمبر ۱۹۴۱ء کو مولوی امیر علی خاں صاحب صوبہ دار کی صدارت میں بمقام ٹاؤن ہال گلبرگہ ایک عالیشان مشاعرہ اور یوم ادارہ منا رہی ہے۔ اس کے لئے حیدرآباد سے شاہیر شعرا اور ادبا کو بھی مدعو کیا گیا ہے۔ توقع ہے کہ یہ جلسہ گلبرگہ کے شایان شان ثابت ہوگا کیونکہ مولوی جمیل حسین صاحب اول تعلقدار اور مولوی امیر علی خاں صاحب صوبہ دار اور مولوی ذوالفقار علی صاحب حقانی

پرنسپل کی علم دوستی اس کو کامیاب بنانے کی ضامن ہے۔

شاخ روشتین گلبرگہ کے محلۂ روشتین میں ایک انجمن ترقی نوجوانان تین چار سال سے کام کر رہی تھی جس کے صدر مولوی خواجہ معین الدین صاحب بی اے ایل ایل بی (عثمانیہ) ناظم اسٹیٹ روشتین اور معتمد مولوی نیاز علی خاں صاحب نیازؔ اردو عالم ہیں اس انجمن نے اپنی ایک عمارت بھی تعمیر کرلی ہے۔ اب یہ انجمن ادارہ کی شاخ کی حیثیت سے کام کر رہی ہے۔ اس میں ایک کتاب خانہ بھی ہے جو صدر انجمن کا عطیہ ہے۔ یہاں اردو امتحانات کی تعلیم دی جاتی ہے جس کے لئے مولوی ذوالفقار علی صاحب حقانی پرنسپل گلبرگہ کالج نے اردو دانی کی کتابیں اور شاخ گلبرگہ نے تقلیں اور دو اتیں عطا کی ہیں اس شاخ کو کامیاب بنانے میں حسب ذیل علم دوست بھی دلچسپی لے رہے ہیں۔

عبدالغفور صاحب صیغہ دار صوبہ داری۔ محمد حبیب اللہ صاحب شیدائی۔ محمد اسحاق صاحب بی ایس سی مددگار مدرسہ وسطانیہ مومن پورہ۔ عبدالرحمن صاحب بھنڈاری۔ عثمان علی صاحب ساہو۔

شاخ چیتاپور ماہ اکتوبر میں چیتاپور کے علم دوست اصحاب کو شاخ کے قیام کی اجازت دی گئی چنانچہ وہاں جو شاخ قایم ہوئی ہے اس کے صدر مولوی عبدالقادر صاحب تحصیلدار اور معتمد مولوی محبوب خاں صاحب یوسف زئی بی اے ڈیپ ایڈ ہیں۔ توقع ہے کہ یہ شاخ بھی ادارہ کی دوسری شاخوں کی طرح اردو کی تبلیغ و اشاعت میں کامیابی حاصل کرے گی۔ اس شاخ نے ۱۰ ستمبر کو ایک غیر معمولی جلسہ منعقد کرکے ڈاکٹر ٹیگور اور فانی مرحوم کی وفات پر قرار داد تعزیت منظور کی۔ اس شاخ میں حسب ذیل اصحاب دلچسپی لے رہے ہیں۔

مرزا قطب الدین بیگ صاحب۔ محمد شہاب الدین صاحب عبدالکریم صاحب۔ عبدالجلیل صاحب۔

دوسری شاخیں بشیر آباد، شاہ آباد، اور عادل آباد میں بھی ادارہ کی شاخیں قایم ہورہی ہیں جن کی نسبت آیندہ مہینے تفصیلی معلومات شریک کی جائیں گی۔ شاہ آباد کی شاخ سید محمد نورالحسن صاحب انورؔ اردو فاضل کی کوششوں سے انشاءاللہ بڑی کامیاب رہے گی۔

شعبۂ طلبہ ۱۹۴۱ء میں اپریل اور مئی کی گرمائی تعطیلات میں بعض اراکین نے اضلاع پر شاخوں کے قیام کی کوشش کی چنانچہ کلیانی، گلبرگہ پرلی وغیرہ میں شعبۂ طلبہ کی شاخیں قایم ہوگئیں مدرسوں کے کھلنے کے بعد اراکین کی تعداد میں بھی اضافہ ہوگیا۔

حسب ذیل طلبہ نے رکنیت قبول کرلی۔ محمود علی، مرغوب الدین، مسیح الدین خاں متینؔ، محمود علی اکبر شیرؔ، مظفر علی خاں، عارف علی خاں، عبدالمنعم، حشمت اللہ خاں، سید محمد نورالحسن، انور شاہ آبادی، محمد قطب الدین (گلبرگہ)، محمد عبدالوحید، قاضی حمیدالدین، محمد عبدالصمد، سید اکرام حسین، عبدالمجید قریشی، عزیز احمد، قطب الدین احمد، حلیم نیاز علی خاں، محمود احمد انصاری، عبدالحمید خاں، عمر خاں، عبدالرشید، خواجہ معین الدین فائزؔ، منظور احمد، عبدالرشید حاتی، معین الدین، عبدالغنی، منہاج الدین عبدالمجید، خواجہ معین الدین ارشد، امین الدین، محمد حسن مسعود، عبداللطیف، بدیع الدین، یوسف حسن، فاروق حسین، حبیب الرحمن، حامد بن احمد۔ سید حسن سجاد ابوظفر محی الدین۔ شریف الحسن، فخیرالدین، محمد عزیزالدین، مظہر حسین وغیرہ۔

۱۹ خرداد کو اردو کن کا تعزیتی جلسہ جناب ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زورؔ صدر شعبہ کی صدارت میں منعقد ہوا۔ قرار داد تعزیت سب رس میں اور مقامی اخباروں میں شایع کی گئی۔ اس کے بعد شعبہ کے نئے سال کے لئے عہدہ داران و ارکان مجلس انتظامی کے انتخابات عمل میں آئے۔

نائب صدر ــــــ محمود علی — معتمد ــــــ مرغوب الدین — نائب معتمد ــــــ مظفر علی خاں

اراکین مجلس انتظامی:۔ معین الدین احمد انصاری، شیخ رحیم الدین ظہیر آبادی، مسیح الدین خاں متینؔ، محمود علی اکبر شیرؔ، حشمت اللہ خاں، عبدالمنعم، عارف علی خاں

جائزہ لینے کے بعد شعبہ نے ایک لائحہ عمل تیار کیا۔ اس سال شعبہ کے معمولی جلسے (۴) غیر معمولی (۳) اور مجلس انتظامی کے (۵) جلسے ہوئے جلسوں میں طلبہ کی کافی تعداد رہی۔ ایک تحریری مقابلہ بھی منعقد ہوا جس کے لئے چار عنوان مقرر کئے گئے تھے۔

(۱) سائنس اور دنیا کا مستقبل (۲) ضرورت ایجاد کی ماں ہے (۳) میرا مستقبل (۴) میرا محبوب مشغلہ۔

بلدہ کے علاوہ اکثر اضلاع خصوصاً گلبرگہ وغیرہ سے بہت سے مضامین وصول ہوئے۔ اس مقابلہ میں شہاب الدین خاں اول رہے۔ اس کے بعد دو معمولی جلسے ہوئے اور گذشتہ سال کی طرح ۱۲ نومبر کو ایک تقریری مقابلہ منعقد ہوا۔ مدرسوں کی جانب سے ۱۸ طلبہ کی ۹ ٹیموں نے اس مقابلہ میں شرکت کی۔ یہ جلسہ ۱۲ نومبر کو احمدیہ جوبلی ہال افضل گنج میں ۱/۲ ۵ بجے ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور کی صدارت میں منعقد ہوا۔ ایک گھنٹہ قبل عنوان کا اعلان کیا گیا۔ ذیل کے دو عنوانوں میں سے کسی ایک پر تقریر کرنی تھی۔

(۱) ترقی کے لئے دولت سے زیادہ محنت کی ضرورت ہے۔

(۲) دنیا کو شاعروں سے زیادہ سائنس دانوں کی ضرورت ہے۔

اس مقابلہ میں مختلف مدرسے مثلاً دار العلوم، سٹی کالج، مدرسہ عالیہ، آل سنٹس، مفید الانام، دار الشفاء، گوشہ محل، مدرسہ آصفیہ کے نمائندے شریک تھے۔ حاضرین کی تعداد اتنی تھی کہ بہت سوں کو کھڑا رہنا پڑا۔ مولوی سید محمود صاحب اور مولوی حمید الدین صاحب شاہد نے حکم کے فرائض انجام دیئے۔ محمود علی نائب صدر نے گزشتہ جلسہ کی روئداد سنائی۔ اور رحیم الدین صاحب ظہیر آبادی سابق نائب صدر نے فن تقریر اور فی البدیہہ مقابلوں اور شعبہ کی نسبت تقریر کی۔ مقابلہ کا نتیجہ حسب ذیل ہے۔

(۱) مدرسہ مفید الانام اول (۲) دار العلوم دوم انفرادی طور پر حبیب الرحمٰن (مفید الانام) اول اور غلام یزدانی (سٹی کالج) دوم آئے۔

ادارہ کے جلسہ تقسیم اسناد و انعامات میں اول آنے والے مدرسہ کو کپ اور اول و دوم آنے والے طلبہ کو کتابیں انعام میں دی جائیں گی۔

اضلاع پر شعبہ کے قیام کی کوششیں مختلف طلبہ نے کی خصوصاً احمد شاہ آبادی (گلبرگہ) قابل مبارکباد ہیں کہ وہ شعبہ کو کامیابی کے ساتھ چلانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ وقتاً فوقتاً ہم کو جو اطلاعیں اور روئدادیں وصول ہوئیں وہ ذیل میں درج ہیں۔

شاخ گلبرگہ

۲۶ خورداد ۱۳۶۰ف کو شعبہ طلبہ کے انتخابات عمل میں آئے جو حسب ذیل ہیں:۔

صدر۔ نیاز علی خاں — نائب صدر۔ محمود احمد انصاری — معتمد۔ نور الحسن شاہ آبادی — نائب معتمد۔ عبد المجید خاں۔

اراکین۔ محمد عمر خاں، عبد الرشید سہروردی، خواجہ معین الدین ذاکر، منظور احمد، عبد الرشید، معین الدین، عبد الحمید، معین الدین تشنہ۔

اس کے بعد بہت سے جلسے ہوئے جس میں دلچسپ عنوان پر طلبہ نے تقریریں کیں جن کی تفصیل سب رس کے گزشتہ پرچوں میں چھپ چکی ہے۔ اس شاخ نے اپنا ایک نظام نامہ بنایا ہے جو درج ذیل ہے۔ دوسری شاخوں کو بھی ایسے ہی نظام نامے بنا کر کام کرنا چاہیے۔

نشان سلسلہ	تاریخ	وقت	نوعیت جلسہ	موضوع	مقرر
۱	۵ آذر	۱۰ بجے صبح	انعامی تحریری مقابلہ	فی البدیہہ	
۲	۲۲ آذر	۴ بجے شام	غیر معمولی	فن مباحثہ	مولوی محمد بن عمر صاحب لکچرار
۳	۱۴ دے	"	" مباحثہ	تقریر تحریر سے بہتر ہے۔	

۴	۱۰ اردے	۴ ساعت شام	غیر معمولی	صنعتی کیمپ	مولوی وزیر احمد صاحب قریشی لکچرار
۵	۱۷ اردے	" "	انعامی مباحثہ	تدریجی ترقی فوری تبدیلی سے بہتر ہے	
۶	۲۴ اردے	" "	غیر معمولی	مذہب و سائنس	حافظ مولوی محمد حامد صاحب صدیقی لکچرار
۷	۸ ربہمن	" "	مباحثہ	تعلیمی ترقی کے لئے امتحانات غیر ضروری ہیں	
۸	۷ راسفندار	" "	غیر معمولی	موجودہ جنگ کے معاشی مسائل	مولوی احمد عبدالعزیز صاحب لکچرار
۹	۱۴ ار "	۱۰ ساعت صبح	انعامی تحریری مقابلہ	اردو کی ترقی میں دکن کا حصہ	
۱۰	۴ رفروردی	۴ ساعت شام	غیر معمولی	اقبال کا فلسفۂ خودی	مولوی محمد بن عمر صاحب لکچرار
۱۱	۱۲ ار "	" "	مباحثہ	موجودہ تعلیم ناقص ہے	
۱۲	۱۹ ار "	" "	غیر معمولی	اردو شاعری کے جدید رجحانات	مولوی نصیرالدین صاحب نظامی لکچرار
۱۳	۲۶ ر "	۹ ساعت شب	مشاعرہ	طرحی	
۱۴	۲ اردی بہشت	۴ ساعت شام	تعلیمی تفریح		
۱۵	۸ ر "	" "	غیر معمولی	ٹیگور کی شاعری	مولوی سید محمد نورالحسن صاحب

شاخ پرلی | ایک جلسہ ۳ ردے ۱۳۵۰ف محمد فخرالدین صاحب منشی فاضل کی صدارت میں منعقد ہوا۔ اس دن "شہری زندگی دیہاتی زندگی سے بہتر ہے" کی موافقت اور مخالفت میں سعیدالدین صدیقی، مظہر حسین، نیرالدین، عزیزالدین، ابوظفر محی الدین، شریف الحسن نے تقریریں کیں۔

دوسرا جلسہ ۱۰ اردے کو حکیم مولوی فخرالدین صاحب کی صدارت میں منعقد ہوا۔ محی الدین صدیقی نے گزشتہ جلسہ کی روئداد سنائی اور قرأت سے جلسہ کا آغاز ہوا۔ شریف الحسن، محمد نیرالدین، محمد سعیدالدین صدیقی، عزیزالدین نے " ملازمت سے تجارت بہتر ہے" پر اپنے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

اس شعبہ کا کام محمد عزیزالدین قریشی نائب صدر، ابوظفر محی الدین معتمد، اور سعیدالدین صدیقی خازن نہایت عمدگی کے ساتھ انجام دے رہے ہیں۔ توقع ہے کہ یہ پرلی میں طلبہ برادری کو مستحکم کرنے کی انتہائی کوشش کریں گے۔

گلبرگہ میں فی البدیہہ انعامی تحریری مقابلہ | شعبہ طلبہ شاخ گلبرگہ کا ایک انعامی تحریری مقابلہ بتاریخ ۵ر آذر ۱۳۵۱ف بوقت ۱۰ ساعت صبح منعقد ہوا۔ موضوع کا اعلان اسی وقت کیا گیا اور (۱½) گھنٹہ وقت دیا گیا۔ موضوع کا عنوان تھا "کسی ملک کی ترقی کے لئے ادبی ترقی نہایت ضروری ہے۔" تقریباً ۲۰ طلبہ نے شرکت کی۔ نتیجہ حسب ذیل رہا۔

غلام محی الدین حال اول (مستحق انعام مولوی سعیدالدین صاحب لکچرار گلبرگہ کالج) فتح اللہ عثمانی - دوم (مستحق انعام مولوی محمد بن عمر صاحب لکچرار گلبرگہ کالج)

شعبہ طلبہ گلبرگہ کی مجلس انتظامی | بتاریخ ۶ ردے ۱۳۵۱ف شعبہ طلبہ کی مجلس انتظامی کا ایک جلسہ زیر صدارت مولوی محمد بن عمر صاحب معتمد شاخ ادارۂ ادبیات اردو منعقد ہوا۔ جس میں مباحثوں اور تقاریر وغیرہ کا نظام نامہ مرتب کیا گیا۔ اور طے پایا کہ اس سال کی مجلس انتظامی

حسب ذیل عہدہ داران وارکان پر مشتمل ہوگی۔

صدر۔ جناب مولوی محمد بن عمر صاحب معتمد ادارۂ ادبیات اردو گلبرگہ۔ نائب صدر۔ محمد نیاز علی خاں نیاز۔ معتمد۔ سید محمد نور الحسن شاہ آبادی۔ نائب معتمد مسعود الزماں صدیقی۔

اراکین:۔ وحید الدین احمد۔ شیخ محبوب علی۔ پی۔ جی دیسائی۔ عبد الحفیظ۔ سری راماچاری۔ قاضی حمید الدین۔ غلام محی الدین خاں۔

شعبۂ طلبہ کا غیر معمولی جلسہ

بتاریخ ۱۱ دے ۱۳۵۰ف ایک غیر معمولی جلسہ بوقت ۵ ساعت شام بہ مقام دفتر شاخ ادارہ زیر صدارت جناب مولوی محمد بن عمر صاحب منعقد ہوا۔

جناب صدر نے مولوی محمد وزیر احمد صاحب قریشی لکچرار کا تعارف کرایا اور موصوف کی تقریر کا اعلان کیا۔ فاضل مقرر نے "صنعتی کیمیا" پر ایک پُر از معلومات تقریر فرمائی۔ پہلے علم سائنس اور کیمیا کی تعریف کی اور پھر کیمیا کی درجہ بدرجہ ترقی کا ذکر کیا۔ صنعتی کیمیا کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ آپ کو یہ سن کر حیرت ہوگی کہ سنہ ۱۹۱۲ء تک انگلستان میں علم کیمیا سے حقیقی طور پر استفادہ کرنے کا خیال پیدا نہ ہوا۔ یہ خیال سب سے پہلے جرمنوں کو ہوا۔ اس سلسلہ میں صنعتی کیمیا کے فوائد اور ترقی کے متعلق نہایت بسیط تقریر فرمائی۔ اگرچہ مضمون خشک تھا مگر فاضل مقرر نے اس کو اپنے پیرایۂ بیان سے بہت دلچسپ بنایا۔ اور مسلسل ایک گھنٹہ تقریر کی۔

معتمد نے حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔ اور فاضل مقرر کا بھی جنھوں نے باوجود مصروفیات کے اپنا قیمتی وقت ہمارے لئے دیا۔ ۶ بجے جلسہ برخاست ہوا۔

شاخ کلیانی

حسب سال گزشتہ امسال بھی کلیانی میں عرس حضرت راجہ شیر سوار رحمۃ اللہ علیہ کے موقع پر درگاہ شریف کے متصل دار المطالعہ قائم کیا گیا تھا تاکہ زائرین اس سے مستفید ہوں قیام دار المطالعہ کے سلسلہ میں مولوی غلام معین الدین صاحب معین رکن تشہیر، مولوی محمد علی صاحب معلم اور معتمد و اراکین شعبۂ طلبہ بہت مصروف رہے۔ یہ اشخاص اگر اپنا عزیز وقت شاخ ہذا کے لئے وقف نہ کرتے تو دار المطالعہ کا قیام مشکل ہو جاتا۔ شاخ ان کی اس غیر معمولی خدمت کی دل سے قدر کرتی ہے۔ اور امید رکھتی ہے کہ آیندہ بھی وہ اسی طرح شاخ کے کاروبار میں زیادہ سے زیادہ دلچسپی لیں گے۔

دار المطالعہ کے لئے ایک جدید بورڈ تیار کیا گیا ہے اس میں جدت یہ کی گئی ہے کہ اس کو سب رس کے ٹائٹل کے مشابہ بنایا گیا ہے شاخ ہذا مولوی میر ظہیر الدین صاحب ہاشمی کی ممنون ہے کہ انھوں نے نہایت نفاست سے اس کو سب رس کے ٹائٹل کے مطابق بنایا۔

نواب سید محمد جمال الدین حسین خاں بہادر دام اقبالہٗ والیٔ اسٹیٹ کلیانی و سرپرست شاخ اردو کے بڑے حامی ہیں اور عرس شریف کے موقع پر شاخ ادارۂ ادبیات اردو کی طرف سے آپ کی زیر صدارت ایک مشاعرہ منعقد ہوا جو نہایت کامیاب اور پُر لطف رہا اس میں تقریباً ۳۰ شعراء نے حصہ لیا بعض شعراء کو نواب صاحب ممدوح نے انعامات سے بھی سرفراز فرمایا اور مشاعرہ کے جملہ اخراجات جیب خاص سے مرحمت فرمائے۔

اس مشاعرہ کے لئے حسب ذیل طرحی مصرعے تجویز کئے گئے تھے۔

(۱) دیوانہ کو دیوانہ بنانے کے دن آئے۔ (۲) پھر کعبہ دیکھئے نہ صنم خانہ دیکھئے۔

نواب صاحب بہادر کی غزلیں خاص طور پر پسند کی گئیں۔

امسال جدید امتحان کا جو اضافہ ہوا ہے اس کی بے حد ضرورت محسوس کی جارہی تھی اردو دانی اور اردو عالم کے درمیان کوئی امتحان نہ ہونے سے اردو دانی کے کامیاب طلبہ دوسرے سال اردو عالم میں شرکت نہیں کر سکتے تھے اب ان کا بڑھتا ہوا علمی ذوق مجوزہ امتحان سے پورا ہو سکے گا۔

شاخ پربھنی معتمد صاحب شاخ ادارۂ ادبیات اردو پربھنی اپنی رپورٹ میں لکھتے ہیں کہ "اس ماہ شاخ پربھنی میں بڑی سرگرمی اور چہل پہل رہی۔ سال حال شاخ ہذا سے کثیر تعداد میں امیدواروں کو امتحان میں شریک کرایا جارہا ہے جس کے لئے منظم کوششیں جاری ہیں۔ اردو دانی اور اردو عالم کے درس باضابطہ ہورہے ہیں۔ تعلیم بالغان کی طرف اس مرتبہ خاص توجہ کی جارہی ہے اور امتحان اردو دانی کے لئے ایک ٹولی کو تیار کیا جارہا ہے جن کی عمریں ۲۵ سال سے ۵۰ سال تک کی ہیں۔ اسی ماہ مولوی ابوالحسن صاحب صوبہ دار اورنگ آباد، مولوی خواجہ حمید احمد صاحب بی اے مددگار اعلا دشمارہ جناب ماہر القادری صاحب وغیرہ نے شاخ کا معائنہ کرکے اظہار خوشنودی فرمایا۔ مولوی طاہر الدین حسن صاحب مہتمم آبکاری شاخ ہذا میں ایک ریڈیو نصب کرانے کے لئے کوشاں ہیں تاکہ ہمارے طلبہ کی ذہنی تفریح بھی ہو سکے۔ ہم دسمبر میں شاخ کا سالانہ جلسہ کرنا چاہتے ہیں۔ اس جلسہ کی صدارت کے لئے ہم عالی جناب ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور صدر شعبہ اردو جامعہ عثمانیہ و معتمد اعزازی ادارہ سے درخواست کرتے ہیں۔ یقین ہے کہ وہ اس کو قبول فرمائیں گے۔

اخباروں میں اردو سوسائٹی کے قیام کی اطلاع پڑھی نہ معلوم لوگ کیوں بلاوجہ اس قسم کی سوسائٹیاں اور ادارے قائم کرتے ہیں۔ اب ہم سب کو ادارۂ ادبیات اردو کے تحت اردو علم و ادب کی خدمت انجام دینا چاہیے۔ جلسہ کا پروگرام عنقریب روانہ کیا جائے گا۔"

حیاتِ میر محمد مومن پر ہندوستان کے مشہور رسائل کی رائیں

حضرت میر محمد مومن کی حیات اور ان کے علمی اور سیاسی کارنامے تفصیل کے ساتھ پیش کئے گئے ہیں۔ مشہور تصاویر بھی کتاب کی زینت ہیں۔ میر محمد مومن سلطان محمد قلی قطب شاہ کے وزیر اعظم تھے۔ آپ کی زندگی کے حالات دیکھنے کے بعد یہ کہنا پڑتا ہے کہ اگر مولف ایسے صاحب صفت اور بہر جہت لائق وزیر اعظم کے حالات کو تاریکی میں رکھتا تو یقیناً میر صاحب پر بڑا ظلم ہوتا اور یہ بھی کہے بغیر نہیں رہا جاتا کہ اس وقت تک کے مورخین نے ایسی باکمال ہستی کے حالات کو منظر عام پر لانے میں جس بخل کا ثبوت دیا ہے وہ قابلِ افسوس ہے۔

ادب اردو کو ممنون ہونا چاہیے ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور کا کہ ان کی تحقیق و تجسس نے اردو کتب خانہ کو ایک انمول جواہر پارہ حیات میر محمد مومن کی صورت میں عطا کر دیا۔

لائق صد ستایش ہے ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد دکن کی یہ کوشش کہ وہ میر محمد مومن جیسی ہستیوں کے حالات کو منظر عام پر لا رہا ہے۔ یقین کیجے اگر ہمارے سیاسی رہنما ایسی کتب سے استفادہ کرنے کی کوشش کریں تو ہندوستان میں پھر وہی امن اور بحالی نظر آسکتی ہے جو اس ملک کا طرۂ امتیاز ہے اور بھلائی نہیں جا سکتی۔ رسالۂ ہل ماہ نومبر ۱۹۴۱ء

ابھی کچھ زیادہ عرصہ نہیں گزرا کہ آپ انہی صفحات میں ڈاکٹر زور کی ایک نہایت ہی اہم کتاب "محمد قلی قطب شاہ" کا ذکر پڑھ چکے ہیں۔ جن لوگوں نے اس کتاب کو پڑھا ہوگا اغلب ہے کہ ان کے دل میں ایک سوال پیدا ہوا ہو۔ محمد قلی قطب شاہ جن سماجی تمدنی اور علمی ادبی باتوں میں اپنے دوران حکومت میں دلچسپی لیتا رہا ان کے لئے اس کے پاس وقت کہاں سے آیا کہ وہ اپنی شعر و شاعری اور رنگ رلیوں کے باوجود [illegible] امن اور خوشحال عہد کیونکر بنا سکا۔ ڈاکٹر زور کی زیر نظر تالیف اسی بات کا جواب ہے۔ میر محمد مومن محمد قلی قطب شاہ کا وزیر اعظم تھا اور سیاسی [illegible] محمد قلی کا دور ایک مثالی زمانہ نظر آتا ہے۔ ڈاکٹر زور نے اپنی روائتی تحقیق اور دلچسپ انداز بیان سے کام لیتے ہوئے بادشاہ کے بعد [illegible] وزیر کے [illegible]۔ ادبی دنیا ماہ اکتوبر